عبداللہ
ہاشم ندیم

فہرست

درگاہ

(۱)

ساحل کی طرف جاتی ہوئی مرکزی شاہراہ، جو عام حالات میں کسی جوان بیوہ کی اُجڑی مانگ کی طرح بے رنگ اور سنسان پڑی رہتی تھی، اس وقت شہر کے امراء کی چند بگڑی ہوئی اولادوں کی خرمستیوں کی آماج گاہ بنی ہوئی تھی۔ فضا میں اسپورٹس کاروں اور ہیوی بائیکس کی چنگھاڑتی آوازوں نے ایک ہل چل اور طوفان سا برپا کیا ہوا تھا۔ معاملہ شہر سے ویران ساحل کی پٹی تک ریس کا تھا اور ہم میں سے کوئی بھی یہ ریس ہارنا نہیں چاہتا تھا۔ سب سے آگے صوبے کے ہوم سیکریٹری کے لاڈلے صاحب زادے وقار یعنی وکی کی مرسڈیز اسپورٹس کار تھی۔ اس کے بعد ملک کے معروف صنعت کار بختیار احمد کی اکلوتی اولاد ساحر، یعنی میری منی جیگوار تھی اور میرے پیچھے صوبائی وزیر مالیات کا بگڑا شہزادہ کاشف اپنی دوست ردا کے ساتھ ہیوی بائیک پر فراٹے بھرتا، مختلف گاڑیوں کے درمیان لہراتا اور اپنا راستہ بناتے ہوئے صرف چند انچ کے فاصلے سے میری گاڑی کے بمپر کو تقریباً چھوتا ہوا چلا آ رہا تھا۔ باقی دوست اُس سے ذرا فاصلے پر تھے۔ لوگ ہمیں دُور ہی سے دیکھ کر سراسیمہ ہو کے اِدھر اُدھر اُچھل کر اپنی جان بچانے کے لیے بھاگ رہے تھے۔ وکی نے سڑک پار کرتے ہوئے ایک ٹھیلے کو ہلکا سا چھو لیا۔ ٹھیلے والا ایک جانب کو کودا اور اُس کے ٹھیلے سے ناریل فضا میں یوں اُچھلے جیسے کسی شریر بچے نے یک دم فضا میں بہت سے خاکستری غبارے چھوڑ دیے ہوں۔ اُن میں سے ایک ناریل کسی گرینیڈ کی طرح میری کار کی ونڈ اسکرین سے ٹکرایا اور شیشے پر اگلے ہی لمحے مکڑی کے جالے جیسی رگیں اُبھر آئیں۔ میری ساتھ گاڑی میں بیٹھی گورنر کی بھتیجی اور میری بہترین دوست عینی زور سے چلائی اور اُس کے منہ سے انگریزی گالیوں اور مغلظات کا ایک طوفان وکی کی شان میں اُبل پڑا۔ میرے پیچھے آتے ہوئے کاشف کی ایک سو پچاس کی اسپیڈ سے دوڑتی ہوئی بائیک کا پہیہ ناریل کے اُوپر چڑھ گیا اور بائیک فضا میں یوں اُچھلی جیسے کسی توپ سے نکلا ہوا گولا...... لیکن کاشف نے اپنے حواس قابو میں رکھے اور بائیک کو زمین پر لگتے ہی ایک جانب کو جھکا کر اُلٹنے

سے بچالیا۔ البتہ اُس کے پیچھے آتے ہوئے دو موٹر سائیکل سوار خود کو بچا نہیں پائے۔ سڑک پر دُور تک اُن کی بائیکس کی پھسلنے کی آوازیں اور اسکریچیں گونجتی رہیں۔ شاید ریس میں شامل ایک آدھ کار بھی پھسلی لیکن میں مڑ کر دیکھ نہیں پایا، کیونکہ اُس وقت میری ساری توجہ آگے سڑک پر دوڑتی وکی کی مرسڈیز پر تھی۔ وہ جانتا تھا کہ اب ساحلی پٹی صرف چند کلومیٹر ہی دُور رہ گئی ہے، لہٰذا وہ اپنی گاڑی کو سڑک پر دونوں جانب لہراتے ہوئے آگے بڑھ رہا تھا تاکہ میری گاڑی کو آگے نکلنے کا کوئی راستہ نہ مل سکے۔ کاشف گاڑی کی کھڑکی سے ہاتھ نکال نکال کر مجھے اشتعال دلانے کے لیے مختلف اشارے بھی کر رہا تھا اور اس عمل میں اُس کے ساتھ والی سیٹ پر بیٹھی، اُس کی ولایت پلٹ کزن ٹینا بھی برابر کا ساتھ دے رہی تھی، جو عینی کو مزید مشتعل کرنے کا باعث بن رہا تھا۔ آخری دس کلومیٹر کا بورڈ دیکھتے ہی عینی نے مایوسی سے سر ہلایا۔

''نہیں ساحر...... اب ہم نہیں جیت سکتے...... فاصلہ بہت کم رہ گیا ہے۔ ہم ہار گئے ساحر...... ڈیم اٹ یار......'' میں نے عینی کو کوئی جواب نہیں دیا اور گیئر بدل کر ایکسیلیٹر پر دباؤ بڑھا دیا۔ عینی بھی جانتی تھی کہ مجھے ہار سے کس قدر شدید نفرت تھی۔ میں نے ہارنا سیکھا ہی نہیں تھا۔ ہم زندگی میں جیتنا سیکھیں، یا نہ سیکھیں، جیت ہمیں خود ہی سب سکھا دیتی ہے۔ ہاں! البتہ ہار کو باقاعدہ سیکھنا پڑتا ہے کہ ہار آپ کو خود کچھ نہیں سکھاتی۔ لیکن میں خود فی الحال اس فن سے ناآشنا تھا۔ اور کم از کم آج تو میں کسی صورت ہارنا نہیں چاہتا تھا کیونکہ مقابلے پر میرا ازلی حریف وکی جو تھا۔

اس ریس کا آئیڈیا کل رات ہی ہمارے شیطان دماغوں میں اُس وقت آیا تھا جب ہم کلب کے نیلگوں دھویں بھرے ماحول میں اپنے اپنے ''بھرے'' ہوئے سگریٹ کے کش لگا رہے تھے۔ فضا میں دھوئیں اور بیئر کی ملی جلی خوشبو پھیلی ہوئی تھی اور دھواں کشید کرنے کے اس عمل میں ہم میں سے ہر ایک کا۔۔۔۔ جوڑا بھی پورے شد و مد سے شریک تھا۔ صرف عینی ہی اُن میں ایک ایسی لڑکی تھی جس کا دم اس مخصوص دھویں کی زیادتی سے گھٹنے لگا تھا اور تب وہ میرا ہاتھ پکڑ کر زبردستی مجھے کلب روم سے باہر کھلی فضا میں کھینچ لائی تھی۔ ''اُف ساحر...... کیوں پیتے ہو یہ زہر...... نفرت ہے مجھے اس دھویں سے۔'' لیکن کل رات عینی کی بات شروع ہونے سے پہلے ہی وقار نے بحث چھیڑ دی تھی کہ اُس کے باپ نے گزشتہ ہفتے ہی اُسے جو نئی

اسپورٹس مرسڈیز لے کر دی ہے وہ اُسے ڈھائی سو کی رفتار سے دوڑاتا ہوا کالج آ سکتا ہے۔ کاشف نے چڑ کر اُسے ریس لگانے کا چیلنج دے دیا اور رفتہ رفتہ بحث نے اتنا طول پکڑا کہ ہم سب ہی نے اس ریس میں شریک ہونے کا فیصلہ کر لیا۔ اور اس کے نتیجے میں آج ہم سب کی گاڑیاں اور بائیکس اس ساحلی سڑک پر آگ اُگلتی ہوئی دوڑ رہی تھیں۔

ریس ختم ہونے والا پوائنٹ ساحل پر بنے ہوئے لکڑی کے ہٹس (Huts) کے عین سامنے جا کر ختم ہونے والی یہی کولتار کی سڑک تھی، جہاں پہلے ہی سے یونیورسٹی کا پورا ایک گروپ ہجوم کی شکل میں چیخ چلا کے اور نعرے لگا کر ہمارا حوصلہ بڑھا رہا تھا۔ انہی میں وہ دو لڑکے بھی موجود تھے جن کے ہاتھ میں سفید رومال تھے، جنہیں آخری جیت کی گواہی دینے کے لیے ہم نے بطور جج وہاں کھڑا کیا تھا۔ آخری پوائنٹ اب صرف دو کلومیٹر کی دُوری پر رہ گیا تھا اور ہماری اسپورٹس کاریں جس رفتار سے دوڑ رہی تھیں، اس حساب سے یہ دو کلومیٹر صرف دو لمحے کی دُوری پر تھے۔ وکی کسی صورت مجھے آگے نکلنے کا موقع نہیں دینا چاہتا تھا اور مجھے بس ایک لمحے کی تلاش تھی اور پھر وہ لمحہ ایک اُونچے ریت کے ٹیلے کی صورت میں مجھے نظر آ ہی گیا۔ سڑک کے اختتام سے کچھ قدم پہلے سڑک کی بائیں جانب ریت کچھ اس طرح اکٹھی ہو گئی تھی کہ ایک اُونچا سا ٹیلہ بن گیا تھا۔ میں نے گیئر بدلا اور چلا کر عینی سے کہا۔ ''سیٹ بیلٹ اچھی طرح کس لو......'' عینی نے شاید میری آنکھوں میں لپکتی چمک کو دیکھ لیا تھا۔ وہ سراسیمہ ہو کر چلائی ''نہیں ساحر...... پلیز...... فار گاڈ سیک ساحر۔'' لیکن عینی کی چیخ اُس کے گلے ہی میں گھٹ کر رہ گئی اور میری جیگوار ریت کے ٹیلے پر یوں چڑھی جیسے کوئی گلائیڈر اُونچی اُڑان اُڑنے سے پہلے کسی اُونچے پہاڑ کی چوٹی پر بنی چٹان پر دوڑتا ہے اور اگلے ہی لمحے میری گاڑی بھی کسی شاہین کی طرح فضا میں تیرتی ہوئی اختتامی حد پر لگے ہوئے سرخ جھنڈے کو کراس کر گئی۔ فضا میں تیرتے ہوئے میری نظر نیچے دو فٹ پیچھے آتی مرسڈیز میں بیٹھے وکی پر پڑی، جس نے جھنجلاہٹ میں اپنا سر زور سے اسٹیئرنگ پر دے مارا تھا۔ میری جیگوار ایک زوردار آواز اور شدید جھٹکے کے ساتھ نیچے ریتلے ساحل سے ٹکرائی اور اس کے اگلے دونوں ٹائر زوردار دھماکے کے ساتھ برسٹ ہو گئے۔ کار زور سے لہرائی لیکن اُس کے اُلٹنے سے پہلے ہی میں نے پوری قوت کے ساتھ ہینڈ بریک کھینچ لی۔ لیکن گاڑی کے بونٹ سے نکلتے ہوئے دھویں اور

گاڑی کے فریم کو دیکھ کر کوئی اناڑی مستری بھی یہ بتا سکتا تھا کہ اب یہ کار کم از کم میرے کسی کام کی نہیں رہ گئی۔ مجھے اپنی پسندیدہ گاڑی کے تباہ ہو جانے کا کوئی دُکھ نہیں تھا۔ خوشی تو اس بات کی تھی کہ میں نے ایک بار پھر وکی کو ہرا دیا تھا۔ ہینڈ بریک کھینچنے کی وجہ سے گاڑی نے گھومتے ہوئے ریت کا جو طوفان اُٹھایا تھا وہ اب تھم چکا تھا...... عینی، جس نے کار کے اُڑان بھرتے ہی اپنا چہرہ دونوں ہاتھوں میں چھپا لیا تھا، نے اپنا چہرہ اُوپر اُٹھایا اور ایک تیز جھرجھری لے کر بولی ''تم بالکل پاگل ہو ساحر...... یو آر ٹوٹلی میڈ......'' میں نے عینی کی طرف ایک مسکراہٹ بھری نظر ڈالی اور گاڑی سے نیچے اُتر آیا۔ سب دوستوں نے مجھے گھیر لیا تھا اور سب ہی شور مچا رہے تھے۔ دُور وکی کھڑا چلا رہا تھا کہ مقابلہ زمین پر گاڑی دوڑانے کا تھا نہ کہ فضا میں اُڑانے کا۔ لیکن کوئی اُس کی بات نہیں سن رہا تھا اور سبھی اُس سے شرط ہارنے کی رقم کا مطالبہ کر رہے تھے۔

ہم سب کا تعلق ایسے خاندانوں سے تھا جہاں ایسی معمولی رقم روزانہ گھر کے نوکروں میں بانٹ دی جاتی تھی، لیکن اس رقم کی حیثیت سب سے الگ تھی، کیونکہ یہ میری جیت کی رقم تھی...... تبھی میں نے اس حقیر رقم کے لیے اپنی لاکھوں روپے کی نئی امپورٹڈ گاڑی تباہ کر دی تھی۔ اور سچ یہ ہے کہ اپنی ہر جیت کے لیے میں ساری زندگی روزانہ ایسی کئی گاڑیاں تباہ کرنے کے لیے تیار تھا۔

میں اُن سب کو لڑتا جھگڑتا چھوڑ کر ایک اُونچی چٹان پر بنے پتھر کے بنچ پر جا کر بیٹھ گیا اور دُور سے آتی لہروں کو چٹان سے ٹکرا کر پاش پاش ہوتے دیکھنے میں مشغول ہو گیا۔ میری شخصیت میں ایک عجیب تضاد بھی تھا کہ ہر جیت، فتح کے فوراً بعد میرے لیے اپنی اہمیت کھو دیتی تھی۔ سو، آج بھی یہی ہوا۔ ابھی چند لمحے پہلے میں نے جس جیت کے لیے اپنے ساتھ ساتھ اپنی عزیز از جان دوست عینی کی زندگی بھی داؤ پر لگا دی تھی، اب میرے لیے ماضی بن چکی تھی اور مجھے اس فتح کی تکرار سے کوئی سروکار نہیں تھا۔ میں نے نیچے عینی گروپ اور وکی کو لڑتے جھگڑتے دیکھا اور اُکتا کر سگریٹ سلگا لی۔ دفعتہً دھوئیں کے نیلے مرغولے کے درمیان سے ہوتی ہوئی میری نظر دُور سڑک پر دوڑتی ہوئی کالے رنگ کی بڑی سی شیورلیٹ کار پر پڑی۔ اچھی گاڑیاں بچپن سے میری کمزوری تھیں اور جو لوگ کاروں کے بارے میں تھوڑا بہت علم رکھتے ہیں وہ یہ بھی ضرور جانتے ہوں گے کہ شیورلیٹ کو کاروں کی شہزادی کہا جاتا ہے، اور

نئے ماڈل کی یہ شہزادی تو اب ہمارے ہاں تقریباً ناپید ہو گئی ہے۔ میری تمام تر توجہ اُس شان دار گاڑی کی جانب مبذول ہو چکی تھی، جو اب ساحل کے کنارے موجود پہاڑی سلسلے کے اندر تراشی ہوئی سفید پتھر کی سیڑھیوں کے قریب آ کر رُک چکی تھی۔ گاڑی میں سے کچھ لوگ اُتر کر ان سنگی سیڑھیوں کی جانب بڑھ گئے جن کا اختتام پہاڑی کی چوٹی پر بنی ہوئی ایک درگاہ کے وسیع صحن میں جا کر ہوتا تھا۔ میں اس کار سے بہت دُور ایک دوسری پہاڑی چٹان پر بیٹھا ہوا تھا۔ اس لیے میں کار کی سواریوں اور اُن کے حلیے پر زیادہ غور نہیں کر سکا۔ بہرحال یہ بات میرے لیے کافی حیران کن تھی کہ اس جدید دور میں بھی ایسے اُونچے طبقے کے لوگ ایسی درگاہوں پر حاضری دینے کے لیے آتے تھے؟ ہم انسانوں نے خود کو تسلی دینے کے لیے کیسے کیسے بہانے تراش رکھے ہیں...... اچانک میرے دل میں اُس گاڑی کو قریب سے دیکھنے کی شدید خواہش اُبھری۔ ویسے بھی میں یہاں بیٹھا بیٹھا اُکتانے لگا تھا۔ میں نے چٹان سے نیچے ساحل کی جانب نظر دوڑائی تو سبھی کو مشغول پایا۔ کوئی بار بی کیو کی تیاری کر رہا تھا، تو کوئی اپنی گاڑی سے بڑے دیوقامت اسپیکر اور میوزک سسٹم اُتار رہا تھا۔ عینی نے دُور سے ہاتھ ہلا کر مجھے نیچے آنے کا اشارہ کیا۔ میں نے جواباً اُسے اشارہ کیا کہ میں ذرا گھوم کر آتا ہوں۔ چٹان سے دوسری جانب اُترنے کے بعد میں ساحل کے ساتھ ساتھ چلتا ہوا دوسری پہاڑی کے قریب پہنچ چکا تھا۔ وہ کار اب بھی وہیں کھڑی تھی اور ایک باوردی شوفر اُس کا بونٹ اُٹھائے ریڈی ایٹر میں پانی ڈال رہا تھا۔ کہتے ہیں، سواری بھی انسان کی نفاست کو جانچنے کا ایک ذریعہ ہوتی ہے۔ اور اس قول کی پرکھ اگر اُس گاڑی سے کی جاتی تو یقیناً اُس کا مالک انتہائی نفیس شخصیت کا مالک ہونا چاہیے تھا، کیونکہ گاڑی کو بڑے سلیقے سے سنبھالا گیا تھا۔ میں کچھ دیر دل چسپی سے گاڑی کو دیکھتا رہا۔ اتنے میں ڈرائیور نے میری محویت نوٹ کر لی اور مسکرا کر بولا ''کیوں صاحب...... کیا دیکھ رہے ہیں...... گاڑی پسند آ گئی ہے کیا؟'' میرے ہونٹوں پر بھی مسکراہٹ پھیل گئی۔ ''گاڑیوں کا کوئی بھی شوقین پہلی ہی نظر میں اس گاڑی کا عاشق ہو سکتا ہے۔'' ڈرائیور میری بات سن کر کھلکھلا کر ہنس دیا اور فخر سے بولا ''سچ کہا آپ نے...... دراصل ہمارے سیٹھ صاحب نے بھی ساری عمر میں یہی ایک شوق پالا ہے۔ بلکہ انہیں تو اعلیٰ سے اعلیٰ گاڑی رکھنے کا جنون ہے۔ اب اِسی گاڑی کو دیکھ لیں۔ پچھلے مہینے ہی امریکا سے منگوائی ہے۔

ہمارے صاحب کو جاپانی گاڑیاں بالکل بھی پسند نہیں۔ وہ تو کہتے ہیں کہ جاپان والوں نے گاڑیوں کو چھوٹا کر کے اُن کی توہین کی ہے۔''

ڈرائیور بات کرتے کرتے آہٹ پا کر اچانک مؤدب سا ہو گیا اور جلدی سے بونٹ بند کر کے پچھلے دروازے کی جانب لپکا۔ میں نے چونک کر ڈرائیور کی نظر کے تعاقب میں اُوپر جاتی سیڑھیوں پر نظر ڈالی اور چند لمحوں کے لیے مبہوت سا رہ گیا۔ اُوپر سے ایک اُدھیڑ عورت کے ساتھ ایک پری رُخ ماہ جبیں دھیرے دھیرے قدم اُٹھاتی سیڑھیاں اُتر رہی تھی۔ اُس کی چال میں ایک ایسا وقار تھا گویا کوئی راج ہنسنی پانی میں تیر رہی ہو۔ عورت اور لڑکی دونوں نے خود کو مناسب حد تک بڑی چادروں سے ڈھانپ رکھا تھا اور اُس عشوہ طراز نے اپنے رُخ پر باریک نقاب کی تہ بھی ڈال رکھی تھی۔ لیکن سچ تو یہ ہے کہ اس کالے نقاب نے اُس کے چہرے کا نور کہیں زیادہ بڑھا دیا تھا۔ ایسا نہیں تھا کہ میں اس سے پہلے حسن سے آشنا نہ تھا، لیکن کچھ چہرے ایسے بھی ہوتے ہیں جو حسن اور معصومیت کو نئی تعریف اور نئے معنی دے جاتے ہیں۔ وہ چہرہ بھی ایسا ہی اور لاکھوں میں ایک تھا۔ ڈرائیور نے بھاگ کر دونوں پچھلے دروازے کھول دیئے تھے۔

لڑکی نے نظر اُٹھا کر بھی میری طرف نہیں دیکھا اور اک شان بے نیازی سے چلتی ہوئی جا کر گاڑی میں بیٹھ گئی۔ ڈرائیور نے جلدی سے گاڑی کے دروازے بند کیے اور گاڑی ایک جھٹکے سے آگے بڑھ گئی۔ تبھی مجھے بھی جیسے ایک جھٹکا سا لگا اور میں اپنے حواس میں واپس آ گیا، لیکن تب تک کار کافی دُور جا چکی تھی۔ مجھے خود پر شدید غصہ آیا۔ ایسی بھی کیا بے خودی؟ کم از کم مجھے گاڑی کا نمبر تو نوٹ کر لینا چاہیے تھا۔ اس وقت میں خود اپنی اس عجیب سی بے چینی اور کچھ کھو دینے کی کسک کو کوئی بھی نام دینے سے قاصر تھا۔ میں نے زور سے سر کو یوں جھٹکا جیسے خود کو ان بے حد اُداس اور ساکت جھیل جیسی آنکھوں کے سحر سے آزاد کروانے کی کوئی ناکام سی کوشش کی ہو۔

اچانک ہی میری نظر پہاڑی کی چوٹی پر پڑی اور میرے قدم خود بخود اُن پتھریلی سیڑھیوں کی جانب بڑھ گئے، جن کا اختتام اُوپر بنی درگاہ پر ہوتا تھا۔ شاید میرے دل میں کہیں نہ کہیں یہ خواہش مچل اُٹھی تھی کہ آخر ایسی کیا بات ہے اس پتھر کی بنی سفید اور سادہ سی عمارت

میں، جس کی زیارت کے لیے اس گل رُخ کے کومل قدم اتنی دُور تک اُٹھے تھے۔ دُور سے دیکھنے میں وہ درگاہ اتنی اُونچائی پر نظر نہیں آتی تھی، لیکن جب میں آخری سیڑھی چڑھ کر درگاہ کے صحن میں پہنچا تو پسینے سے شرابور اور ہانپ رہا تھا۔ وہاں خاصے زائرین موجود تھے، جو اپنے طور پر اپنی اپنی منتوں کی قبولیت کے لیے کچھ نہ کچھ تدبیر کر رہے تھے۔ کوئی پھولوں کی چادر چڑھا رہا تھا، تو کوئی لنگر خانے میں دیگیں کھلوائے بھوکوں کو کھانا کھلا رہا تھا۔ ایک جانب ایک حاجی صاحب دودھ میں زعفران اور روح افزاء گھولے اپنی سبیل چلا رہے تھے۔ ایک جانب چند افراد مورچھل لیے درگاہ کے اندرونی حصے کی صفائی کر رہے تھے۔ مجھے ایک لمحے کو یوں لگا کہ جیسے جس کا گناہ جتنا بڑا ہے وہ اُسی حساب سے کفارہ ادا کرنے کی سعی میں لگا ہوا ہے۔ لیکن کیا یہ سب کچھ کرنے سے ہم انسانوں کی منتیں پوری ہو جاتی ہوں گی......؟ کفارے ادا ہو جاتے ہوں گے......؟ میں اپنی سوچوں میں غلطاں کھڑا تھا کہ اچانک میرے عقب سے ایک بھاری لیکن ملائم سی آواز اُبھری ''کیا میں آپ کی کچھ مدد کر سکتا ہوں......؟'' میں چونک کر پلٹا۔ میرے سامنے میری ہی عمر کا ایک نوجوان ہاتھ میں تسبیح اور ہونٹوں پر ایک میٹھی سی مسکراہٹ لیے کھڑا تھا۔ سفید رنگ کے کرتے شلوار میں ملبوس اور چہرے پر کالی گھنی شرعی ڈاڑھی خوب جچ رہی تھی۔ اُس کی آنکھوں میں ایک خاص چمک اور لہجے میں عجیب سی مٹھاس تھی۔ میں نے مسکرا کر جواب دیا۔ ''جی...... بہت شکریہ...... میں بس یونہی اس طرف چلا آیا تھا...... آپ کی تعریف......؟'' ''تعریف کے لائق تو کچھ بھی نہیں ہے میرے پاس...... ہاں البتہ تعارف کے لیے نام 'عبداللہ' ہے......''

درگاہ

(۲)

میں نے عبداللہ کا بڑھا ہوا ہاتھ تھام کر مصافحہ کیا۔ اُس نے بات جاری رکھی۔ ''اِسی درگاہ کا ایک مجاور ہوں...... خدمت کرتا ہوں یہاں آنے والے زائرین کی......'' میں نے غور سے عبداللہ کی جانب دیکھا ''آپ اپنی گفتگو سے تو پڑھے لکھے لگتے ہیں...... پھر یہ سب کچھ......'' میں نے جان بوجھ کر اپنی بات اُدھوری چھوڑ دی۔ وہ میری بات سن کر ہلکے سے مسکایا۔ ''شاید آپ بھی پڑھائی کا مقصد صرف کسی سرکاری نوکری کا حصول ہی سمجھتے ہیں۔ ویسے میں نے بھی کچھ صفحے سیاہ تو کیے تھے لیکن یہاں آ کر پتا چلا کہ اب تک صرف وقت ہی ضائع کرتا رہا...... بہرحال آپ بتائیے...... میں آپ کی کیا خدمت کر سکتا ہوں......؟'' ''نہیں کچھ نہیں...... دراصل میرے دوست نیچے ساحل پر میری راہ تک رہے ہوں گے...... آپ سے مل کر اچھا لگا......'' میں نے عبداللہ کے کاندھے پر ہاتھ رکھ کر اُسے دبایا اور واپسی کے لیے پلٹا...... پیچھے سے عبداللہ کی آواز سنائی دی۔ ''کوئی منت نہیں مانگیں گے آپ......؟'' میں مسکرا کر پلٹا ''چلیں یہ وعدہ رہا...... جب کبھی کوئی منت مانگنی ہوئی تو یہیں آپ کی اِسی درگاہ میں آ کر مانگوں گا۔ اُمید ہے شنوائی ہو گی......'' میری بات سن کر عبداللہ بھی مسکرا دیا ''مجھے انتظار رہے گا۔'' میں اُس کی جانب الوداعی انداز میں ہاتھ لہرا کر سیڑھیاں اُتر گیا۔ نیچے وہ سبھی میرے لیے فکرمند ہو چکے تھے۔ مجھے دیکھتے ہی سب سے پہلے عینی برس پڑی۔ ''ساحر...... یہ کیا مذاق ہے......؟ تم جانتے ہو ہم سب یہاں تمہاری وجہ سے کس قدر ہلکان ہو رہے تھے...... کہاں چلے گئے تھے تم...... کچھ ہمارا بھی خیال ہے تمہیں......'' وہ روہانسی سی ہو کر چپ ہو گئی۔ میں نے اُن سب کے سامنے ہاتھ جوڑے ''معاف کر دو یار...... میرا ارادہ اتنی دیر لگانے کا نہیں تھا...... بس دیر ہو ہی گئی...... میں دوسری پہاڑی کی چوٹی پر بنی درگاہ دیکھنے کے لیے چلا گیا تھا۔'' میرے منہ سے ''درگاہ'' کا نام سنتے ہی وہ سب یوں اُچھلے جیسے میں نے اُن کے عین سامنے کوئی بم پھوڑ دیا ہو۔ ''درگاہ''......؟ ''ساحر تم......؟'' ''خیریت تو ہے نا۔'' اُن سب

کی حیرت بجا تھی۔ ہم میں سے وہاں ایسا کوئی بھی نہ تھا، جس نے آج تک درگاہ تو کیا ''عیدگاہ'' کی بھی کبھی زیارت کی ہو۔ ہم وہ تھے جن کے لیے لوگ منتیں مانگتے تھے، ہمیں بھلا ایسی جگہوں سے کیا واسطہ......؟ ہم تو خود ایک ''منت'' کے طور پر اس دنیا میں وارد ہوئے تھے۔ جنہیں بن مانگے ہی اس جہاں میں سب کچھ میسر تھا۔ پھر بھلا ہمیں کیا ضرورت تھی، ان درگاہوں اور مسجدوں میں ماتھا ٹیکنے کی......؟ ہم سے تو ہمارا خدا ویسے ہی سدا کے لیے راضی تھا۔

میں نے جرمانے کے طور پر اِسی رات سب ہی کو ہالیڈے ان میں ڈنر کی دعوت دی، تب جا کر اُن لوگوں کا غصہ ٹھنڈا ہوا۔ لیکن عینی ابھی تک رُوٹھی رُوٹھی سی تھی۔ وہ مجھ پر دوسروں سے کہیں زیادہ اپنا حق سمجھتی تھی اور اِسی حق کا مان اُسے یوں رُوٹھنے پر مجبور بھی کرتا تھا۔ عینی کی یہ خاموشی واپسی پر بھی تمام راستے برقرار رہی۔ لیکن میں جانتا تھا کہ حسب معمول آدھی رات کو مجھے فون کیے بنا اُسے نیند نہیں آئے گی، لیکن اس رات تھکن کی وجہ سے میں اس قدر گہری نیند میں تھا کہ نہ جانے کتنی گھنٹیوں کے بعد فون اُٹھایا۔ دوسری جانب سے عینی کی پریشان اور کسی قدر جھنجھلائی ہوئی آواز اُبھری ''اتنی دیر کیوں لگا دی فون اُٹھانے میں......؟'' اُس کی جھنجھلاہٹ پر مجھے ہنسی آ گئی۔ ''ابھی چند گھنٹے پہلے ہی تم نے درجنوں لوگوں کی موجودگی میں یہ عہد کیا تھا کہ اب آئندہ تم مجھ سے کبھی بات نہیں کرو گی۔'' ''تم جانتے ہو نا میں تم سے بات کیے بنا نہیں رہ پاؤں گی...... اسی لیے اتنا اکڑتے ہو......؟'' ''یار میری کیا مجال کہ میں گورنر صاحب کی اکلوتی بھتیجی کے سامنے ذرا سی بھی اکڑ دکھانے کی جرأت کر سکوں......؟ مجھے جیل جانے کا کوئی شوق نہیں ہے۔'' ''مذاق مت کرو ساحر...... میں بے حد سنجیدہ ہوں۔'' میں سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔ ''اچھا بولو...... کیا چاہتی ہو۔'' دوسری جانب سے عینی کی شرارت بھری آواز اُبھری ''تمہیں......'' ''اچھا...... تو یہ تم سنجیدہ ہو......؟'' عینی نے ایک ٹھنڈی سی آہ بھری ''یہی تو مسئلہ ہے...... تم نے کبھی میری محبت کو سیریس لیا ہی نہیں......'' عینی پر ایسے دورے مہینے میں ایک آدھ بار ضرور پڑتے تھے اور لگتا تھا کہ آج کی رات پھر انہی راتوں میں سے ایک تھی جب ہماری زوردار بحث ہونے والی تھی، لیکن آج میں اُس سے بحث کے موڈ میں بالکل بھی نہیں تھا۔ ''اوہ کم آن عینی...... تم جانتی ہو کہ میں یہ محبت وغیرہ پر بالکل یقین نہیں رکھتا...... محبت صرف جسم کے حصول کی درخواست کا ایک مہذب ذریعہ ہے...... بس ایک لفظ ہے، اپنی

خواہشات پر پردہ ڈالنے کے لیے...... اور کچھ بھی نہیں......'' وہ میری بات سن کر چپ سی ہو گئی۔ پھر آہستہ سے بولی ''میں تو تمہیں یہ دعا بھی نہیں دے سکتی کہ تمہاری دل کی بنجر زمین پر یہ خودرو پودا اُگ جائے اور اس کے کانٹے تمہاری رُوح کو بھی اپنی کاٹ اور چبھن سے زخمی کر دیں...... تمہارا قصور نہیں ہے ساحر...... شاید یہ میری آزاد خیالی ہی میرے جذبے کو بے وقعت کرنے کا باعث بنتی ہے...... سویٹ ڈریمز......'' عینی نے فون کاٹ دیا۔ میں حیرت سے فون کو دیکھ رہا تھا۔ اس لڑکی کو کیا ہو گیا ہے اچانک...... آج سے پہلے تو کبھی اس نے اس قدر ٹوٹے ہوئے لہجے میں مجھ سے بات نہیں کی تھی۔ پھر میں نے خود ہی اپنے دل کو تسلی دی کہ شاید شام کی بیئر نے اپنا اثر اس وقت دیر رات کو دکھانا شروع کیا ہوگا۔ میں نے کروٹ لی اور پھر آنکھیں دھیرے دھیرے بند ہوتی چلی گئیں۔

اگلے چند دن تک میں ہر بڑی امریکن گاڑی کو دیکھ کر نہ جانے کیوں چونک سا جاتا تھا اور میری نظریں دُور تک اُس گاڑی کا پیچھا کرتی رہتیں، لیکن مجھے وہ بڑی شیورلیٹ دوبارہ نظر نہیں آئی۔ پتا نہیں، وہ اس شہر میں رہتے بھی تھے، یا پھر کہیں اور سے اس درگاہ کی حاضری کے لیے آئے تھے۔ میں خود بھی نہیں جانتا تھا کہ میری اس بے چینی کی اصل وجہ کیا تھی اور پھر سب سے پہلے کاشف نے میری یہ ''کاریاترا'' محسوس کر لی اور چوتھے دن اُس نے مجھ سے آخر کار پوچھ ہی لیا ''کیا بات ہے یار...... یہ آج کل ہر بڑی امریکن گاڑی کو دیکھ کر تم اُس کے پیچھے ہی کیوں پڑ جاتے ہو......؟'' میں نے اُس روز درگاہ پر ہونے والی تمام واردات اُسے تفصیل سے سنا دی ''اوہو...... تو یہ بات ہے...... اب سمجھا...... میرا یار دراصل گاڑی نہیں، بلکہ گاڑی والی کی تلاش میں سرگرداں ہے۔ یار کسی کو تو بخش دیا کرو...... جو حلیہ تم نے اُس لڑکی کا ابھی ابھی بیان کیا ہے، اس سے ایک بات تو کنفرم ہے کہ شی از ناٹ یور ٹائپ'' ''اوہ شٹ اپ یار...... ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ مجھے صرف ایک تجسس ہے کہ آخر اس شہر میں ایسی کون سی فیملی ہے جو میری طرح گاڑیوں کا شوق رکھتی ہے، لیکن میں اُس سے واقف نہیں ہوں......'' کاشف بولا ''یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ وہ لوگ اس شہر سے تعلق ہی نہ رکھتے ہوں...... کہیں اور کسی دوسرے شہر سے وہاں آئے ہوں......؟'' یہی تو اُلجھن ہے کہ یہ بات کیسے معلوم کی جائے کہ وہ لوگ کہاں سے آئے تھے...... پتا نہیں کیوں...... لیکن میں اُس لڑکی کی اُداس آنکھوں میں چھپی داستان

پڑھنا چاہتا تھا...... لیکن افسوس پڑھ نہیں پایا......'' کاشف کچھ دیر تک غور سے میری جانب دیکھتا رہا، پھر ایک دم اچانک کھڑا ہو گیا۔ ''چلو اُٹھو......'' ''کہاں......'' ''آؤ اس آنکھوں کی کہانی کا راز جاننے کے لیے...... چلو اب دیر نہ کرو۔'' میں کاشف کی عادت سے واقف تھا۔ ایک بار جو بات اُس کے ذہن میں بیٹھ جاتی تھی پھر اُسے نکالنا ہم میں سے کسی کے بھی بس کی بات نہیں تھی۔ کچھ ہی لمحوں بعد کاشف کی چروکی جیپ تیزی سے اُسی سڑک پر رواں تھی جو اُسی ویران ساحل کی پٹی کی جانب جاتی تھی، جہاں وہ درگاہ واقع تھی۔

کاشف نے جیپ بالکل سیڑھیوں کے قریب لا کر کھڑی کر دی۔ میں نے حیرت سے اُس کی جانب دیکھا ''ہم یہاں کیوں آئے ہیں......؟'' ''تمہیں وہ گاڑی یہیں نظر آئی تھی نا...... تو اگر ہمیں اس گاڑی کا کوئی سراغ مل سکتا ہے تو وہ یہیں سے ملے گا...... چلو اُوپر درگاہ میں چل کر کچھ سن گن لینے کی کوشش کرتے ہیں۔'' میرے پاس کاشف کی بات مان لینے کے سوا اور کوئی چارہ بھی نہیں تھا۔ ہم دونوں تیزی سے سیڑھیاں پھلانگتے ہوئے درگاہ کے صحن تک جا پہنچے۔ باہر بیٹھے ایک مجاور نے ہمیں جوتے اُتارنے کا اشارہ کیا۔ جوتے اُتارتے ہوئے میں کچھ یاد کر کے چونک سا گیا۔ اُس روز بھیڑ کی وجہ سے شاید اس دروازے پر بیٹھے مجاور کی مجھ پر نظر نہیں پڑ سکی تھی، لہٰذا میں جوتوں سمیت ہی درگاہ کے صحن میں داخل ہو گیا تھا۔ مجھے تو ان آداب کا کچھ پتا ہی نہیں تھا، لیکن عبداللہ کی نظر تو میرے جوتوں پر ضرور پڑی ہوگی۔ تو پھر آخر اُس نے مجھے جوتے اُتارنے کا کیوں نہیں کہا......؟ میں اِسی سوچ میں گم کاشف کے پیچھے پیچھے درگاہ کے صحن میں داخل ہو گیا۔ کاشف نے دھیرے سے میرے کان میں کہا۔ ''میں درگاہ کے متولی سے اُس گاڑی کا سراغ لگانے کی کوشش کرتا ہوں، تم یہیں ٹھہرو۔'' میں جانتا تھا کہ کاشف ایسے معاملات میں پیسے کی طاقت پر یقین رکھتا تھا۔ وہ ضرور متولی کے ہاتھ پر ہزار روپے رکھے گا اور اُس سے معلومات حاصل کرنے کی کوشش کرے گا۔ کاشف تیزی سے درگاہ کے پچھلے دروازے سے نکل کر کسی جانب غائب ہو گیا۔

میں نے گہری سانس لی اور پیپل کے پیڑوں کے نیچے رکھے پانی کے گھڑوں کی جانب بڑھ گیا۔ اچانک ہی پیڑوں کے پیچھے سے عبداللہ آتا دکھائی دیا۔ اُس کے ہاتھ میں چھوٹا سا فوارہ تھا۔ شاید وہ پھولوں کو پانی دے کر واپس آ رہا تھا۔ ہم دونوں کی نظر بیک وقت ٹکرائی۔

عبداللہ نے خوش دلی سے میرا استقبال کیا۔ ''ارے آپ......؟ کیا میں یہ سمجھوں کہ منت مانگنے کا وقت اتنی جلدی آ گیا......؟'' میں ہنس دیا۔ ''نہیں...... ابھی وہ وقت نہیں آیا...... دراصل کسی کی کھوج مجھے دوسری بار یہاں تک کھینچ لائی ہے۔'' عبداللہ نے غور سے میری جانب دیکھا ''میں دعا کروں گا کہ آپ کی کھوج تشنہ نہ رہے۔'' ''تھینک یو...... ویسے ایک بات کہوں، گر بُری نہ لگے...... ہم دونوں ہی تقریباً ہم عمر ہیں اور یہ آپ جناب کے چکر میں پڑ کر ہم خواہ مخواہ ہی تکلف کے دھاگوں سے بندھے جا رہے ہیں۔ اگر ہم دونوں ایک دوسرے کو تم کہہ کر مخاطب کریں تو میں بہت ایزی محسوس کروں گا......'' عبداللہ مسکرایا۔ ''چلو ایسا ہی سہی...... لفظ اور القاب تو صرف اظہار کا ایک ذریعہ ہوتے ہیں۔'' ''ایک بات بتاؤ...... اُس دن پہلی مرتبہ جب میں اس درگاہ تک آیا تھا تو اپنی لاعلمی کی وجہ سے جوتے اُتارنا بھول گیا تھا، لیکن تم نے میرے جوتے دیکھ کر بھی مجھے اُتارنے کو نہیں کہا...... کیوں......؟ ...... کیا تم نہیں سمجھتے کہ اس طرح اَن جانے ہی میں سہی، پر میں نے درگاہ کے فرش کی بے حرمتی کی تھی......؟'' ''فرش تو پھر سے دُھل سکتا ہے، سو دھو لیا گیا تھا، لیکن مجھے یہ اچھا نہیں لگا کہ تمہیں تمہاری پہلی حاضری پر ہی ٹوک دوں۔'' مجھے حیرت ہوئی کہ یہ کیسا مجاور ہے جو اپنی درگاہ کے فرش سے زیادہ دلوں کے میلے ہونے کو اہم گردانتا ہے......؟ میں نے غور سے عبداللہ کی جانب دیکھا۔ ''تم اپنے طور واطوار سے کسی بھی طرح اس درگاہ کے مجاور نہیں لگتے، کیا میں پوچھ سکتا ہوں کہ تم یہاں تک کیسے پہنچے......؟'' عبداللہ کے چہرے پر اُس کی وہی ملیح سی مسکراہٹ پھیل گئی ''بس یوں سمجھ لو کہ مجھے بھی کسی کی کھوج یہاں تک کھینچ لائی ہے۔'' ''تو کیا تمہاری کھوج ابھی مکمل نہیں ہوئی......؟'' ''میری کھوج تو شاید کبھی مکمل نہ ہو...... میں جس رستے کا مسافر ہوں، اس کی منزل آنے سے پہلے ہی زندگی کی شام ہو جاتی ہے۔ یہ درگاہ بھی صرف میرا ایک پڑاؤ ہی تو ہے، جانے کب یہاں سے بھی کوچ کرنے کا پروانہ مل جائے......''

میں حیرت سے عبداللہ کا یہ فلسفہ سنتا رہا۔ یہ میری اس نوجوان سے دوسری ملاقات تھی اور دونوں مرتبہ میں نے محسوس کیا تھا کہ عبداللہ وہ نہیں ہے، جو وہ بظاہر نظر آتا ہے۔ اتنے میں کاشف درگاہ کے عقبی حصے سے نمودار ہوا اور اُس نے وہیں سے مجھے باہر نکلنے کا اشارہ کیا۔ میں نے عبداللہ سے رُخصت چاہی۔ ''یہ ہماری دوسری لیکن تشنہ ملاقات تھی۔ اُمید ہے تیسری

ملاقات جلد ہو گی اور ہم دونوں تب ٹھیک طرح سے ایک دوجے کو جان پائیں گے۔'' عبداللہ نے مسکرا کر مجھ سے جوابی مصافحہ کیا۔ ''جب جب جو جو ہونا ہے...... تب تب سو سو ہوتا ہے۔'' میں کاشف کی وجہ سے جلدی میں تھا، لہٰذا عبداللہ کی اس گہری بات پر زیادہ غور نہ کر سکا۔ کاش میرا فہم اس وقت اس قدر وسیع ہوتا اور عبداللہ کی اس پیش گوئی کو سمجھ پاتا کہ آئندہ میری زندگی میں کیسے کیسے طوفان برپا ہونے والے ہیں۔

جب میں درگاہ سے باہر نکلا تب تک کاشف جیپ میں سوار ہو چکا تھا۔ میری بیٹھتے ہی اُس نے ایک جھٹکے سے جیپ آگے بڑھا دی۔ ''کام بن گیا ہے۔ میں نے پوری معلومات حاصل کر لی ہیں۔'' میں نے بے چین ہو کر کاشف سے وضاحت چاہی۔ ''رُکو مت...... بولتے رہو۔'' کاشف نے گاڑی ہائی وے پر ڈال کر ریس بڑھا دی۔ ''دراصل پچھلی مرتبہ جب ہم یہاں ریس کے لیے آئے تھے، تب وہ جمعرات کا دن تھا۔ اسی لیے اُس دن یہاں تمہیں بہت زیادہ بھیڑ بھی نظر آئی۔ وہ گاڑی بھی یہاں ہر جمعرات کو آتی ہے۔ گاڑی کے مالکان کے بارے میں تو میں کچھ زیادہ نہیں جان سکا، بس اتنا پتا چلا ہے کہ کوئی جدی پشتی رئیس ہیں۔ جن دو عورتوں کو تم نے دیکھا تھا وہ ماں بیٹی ہیں۔ کبھی کبھار اُن کے ساتھ لڑکی کا باپ بھی چڑھاوا چڑھانے آ جاتا ہے۔ البتہ ماں بیٹی کا گزشتہ دو برسوں سے یہ پکا معمول ہے کہ وہ ہر جمعرات کی شام یہاں آتی ہیں اور ہر ہفتے ہزاروں روپے کا چڑھاوا چڑھا کر واپس چلی جاتی ہیں۔''

''تمہیں یہ سب کچھ کس سے پتا چلا...... میرا مطلب ہے کہ جمعرات کی شام آنے والے زائرین کی تعداد تو اچھی خاصی ہوتی ہو گی، پھر اُن کے درمیان ایک خاص خاندان کو یاد رکھنے والا کون ہو سکتا ہے۔'' کاشف زور سے ہنسا۔ ''آپ کی اِسی معصومیت پر قربان جانے کو جی چاہتا ہے جناب...... یار چاہے ہر جمعرات سیکڑوں لوگ درگاہ کی زیارت کو آتے ہوں، پر اُن میں سے کوئی بھی ایسا نہیں ہو گا جو ہر بار ہزاروں روپے کی نذر دیتا ہو...... اور پھر اُن کی گاڑی اور اُن کے رکھ رکھاؤ کو تو تم نے خود نوٹس کیا ہے...... ایسے لوگ ہزاروں کی بھیڑ میں بھی ہوں تب بھی انہیں پہچانا جا سکتا ہے۔ اب اپنا زیادہ سر مت کھپاؤ...... صرف دو دن کی بات ہے...... اس جمعرات کو ہم خود یہاں درگاہ کے دروازے کے قریب ڈیرہ لگائے بیٹھے ہوں گے۔ صرف ایک بار کار کا رجسٹریشن نمبر پتا چل جائے، پھر اس خاندان کا کھوج لگانا میرے بائیں ہاتھ کا

کھیل ہے، جسٹ ویٹ میری جان......"

اگلے دو دن میری زندگی کے شاید سب سے زیادہ بے چین شب و روز تھے۔ پر "وقت کسی طور گزر ہی جاتا ہے"، سو یہ دو دن بھی کٹ ہی گئے اور جمعرات کی سہ پہر میں اور کاشف دونوں ہی اُسی پہاڑی چٹان کی چوٹی پر بیٹھے اُس کار کا انتظار کر رہے تھے، جہاں سے پہلی مرتبہ میری نظر اُس گاڑی پر پڑی تھی۔ وقت بھی اُس کچھوے کی طرح دھیرے دھیرے سرک رہا تھا، جو دُور ساحل کے کنارے پانی میں اُترنے کی کوشش میں سرگرداں تھا، لیکن ہر بار سمندر کی ایک بڑی لہر اُسے اُٹھا کر پھر سے دُور ریتیلے ساحل پر پٹخ دیتی تھی۔ میں نے بھی جتنی مرتبہ اپنی کلائی پر بندھی گھڑی دیکھی، مجھے یہی لگا کہ میری گھڑی کی سوئیوں کو بھی وقت کی ایسی ہی کوئی منہ زور لہر اُٹھا کر بار بار پیچھے پٹخ دیتی ہے۔ شاید وہ میرا تیرھواں سگریٹ تھا، جب اچانک کاشف زور سے چلایا۔ "وہ آ گئی......" میں متوقع انتظار کے باوجود یوں زور سے چونک کر پلٹا، جیسے کوئی انہونی ہو گئی ہو۔ دُور بل کھاتی سڑک پر وہی شیورلیٹ ریت اُڑاتی دوڑی چلی آ رہی تھی۔

زہرا

ہمارے درگاہ کی سیڑھیوں تک پہنچنے کے وقفے میں وہ دونوں ماں بیٹی سیڑھیاں چڑھ کر اُوپر جا چکی تھیں۔ کاشف نے جان بوجھ کر اپنی جیپ شیورلیٹ کار کے بالکل قریب لا کر کھڑی کر دی تھی۔ کار کا وہ باوردی شوفر آج بھی اُسی طرح کار کی صفائی میں مصروف تھا۔ اُس کی جیپ سے اُترتے ہوئے جب مجھ پر نظر پڑی تو اُس کی آنکھوں میں شناسائی کی ایک جھلک لہرائی۔ جلدی سے سلام کر کے بولا "ارے صاحب...... لگتا ہے آپ بھی ہماری بیگم صاحبہ کی طرح ہر جمعرات کو یہاں آتے ہیں۔" "نہیں...... ہماری تو یہ دوسری ہی جمعرات ہے...... دراصل میرے دوست کو اس درگاہ کی زیارت کا بہت ارمان تھا۔ سو، اس ہفتے اُسے یہاں لے کر آیا ہوں۔" کاشف میرا اشارہ سمجھ گیا اور گاڑی کے گرد گھوم پھر کر ڈرائیور سے باتوں میں مشغول ہو گیا۔ ڈرائیور نے چونکہ آج ہمیں خود ایک بے حد قیمتی گاڑی سے اُترتے دیکھا تھا اس لیے اُس کے رویے میں مرعوبیت کی ایک واضح جھلک دکھائی دے رہی تھی۔ میں کاشف کو ڈرائیور سے معلومات لیتا چھوڑ کر سیڑھیاں چڑھتا ہوا درگاہ کے صحن میں جا پہنچا۔ آج میں جوتے اُتارنا نہیں بھولا تھا۔ صحن میں پچھلی جمعرات کی طرح لوگوں کا ایک میلہ سا لگا ہوا تھا اور بے حد بھیڑ تھی۔ مجھے عبداللہ کہیں دکھائی نہ دیا۔ میں نے اُس ماہ رُخ کی تلاش میں اِدھر اُدھر نظر دوڑائی تو وہ دونوں ماں بیٹی مجھے درگاہ کی مرکزی عمارت کے برآمدے میں بنی پتھر کی جالی کے قریب بیٹھی ہوئی دکھائی دیں اور پھر میرے ساتھ وہی ہوا جو پہلی مرتبہ اس لڑکی کو دیکھنے کے بعد ہوا تھا۔ یکایک آس پاس کی ساری بھیڑ، سب لوگوں کا ہجوم اور اُن کا سبھی شور یک دم موقوف سا ہو گیا۔ فضا جیسے ساکت سی ہو گئی اور مجھے یوں لگا کہ جیسے اس وسیع و عریض سنگ مرمر کے دُھلے صحن میں صرف میں اور وہ ہی موجود ہیں۔ ہم دونوں کے درمیان صرف تنہائی ہے اور کائنات کا ہر ذرہ خاموش ہے، حتیٰ کہ آس پاس چلتی ہوئی پروائی بھی گونگی سی ہو کر صرف جسموں کو چھو کر گزر رہی ہے۔ اچانک کوئی سوالی مجھ سے زور سے ٹکرایا اور ایک جھٹکے سے

میرے حواس واپس آ گئے۔ میں وہیں صحن میں کھڑا تھا۔ جانے دو پل گزرے تھے، یا دو صدیاں......؟ مجھے کچھ یاد نہیں آ رہا تھا۔ لڑکی اب بھی اِسی جذب کے عالم میں دو زانوں بیٹھی جالی کی طرف منہ کیے، گڑگڑاتے ہوئے کوئی دعا مانگ رہی تھی۔ میں سحرزدہ سا اُسے دیکھتا رہا......کالی چادر نے اُس کا دمکتا نور اور بھی واضح کر دیا تھا۔ اور اگر میں شاعر ہوتا تو شاید، اِسی لمحے اُس کے ہاتھوں کی گلابی مخروطی اُنگلیوں اور لرزتی پلکوں پر پورا دیوان لکھ ڈالتا۔ رفتہ رفتہ لڑکی کا جسم ہچکیوں سے باقاعدہ لرزنے لگا اور وہ زار وقطار رونے لگی۔ اُس کی ماں نے گھبرا کر اُسے تھاما۔ آج اُن کے ساتھ شاید اُن کی کوئی خادمہ بھی آئی ہوئی تھی۔ لڑکی کی ماں نے سراسیمگی کے عالم میں اُسے پانی کی بوتل دینے کا کہا۔ خادمہ ہڑبڑاتی ہوئی سی اُٹھ کر باہر کی جانب بھاگی، شاید وہ گاڑی سے پانی لینے کے لیے گئی تھی۔ کبھی کبھی لمحے کے کسی ہزارویں حصے میں انسان کا دماغ اُسے وہ کچھ کرنے پر مجبور کر دیتا ہے جو عام حالات میں وہ کبھی سوچ بھی نہیں سکتا۔ کچھ ایسا ہی اُس وقت میرے ساتھ بھی ہوا۔ میرے قدم خود ہی یک بہ یک صحن میں درختوں کے نیچے پڑے پانی کے گھڑوں کی جانب بڑھ گئے اور میں کسی سحرزدہ رُوح کی طرح پانی کا گلاس لیے اُس لڑکی کی ماں کے پاس جا پہنچا۔ ماں نے جلدی سے بنا دیکھے گلاس پکڑ کر بیٹی کے منہ سے لگا دیا۔ پانی پی کر اُس پری کی حالت کچھ سنبھلی لیکن اُس کا رنگ اب بھی سرسوں کے کسی تازہ پھول کی مانند زرد ہو رہا تھا۔ ماں نے گلاس واپس کرتے ہوئے تشکر بھری نظروں سے مجھے دیکھا ''شکریہ بیٹا......''

میں گلاس لیے چند قدم دُور ہٹ کر کھڑا ہو گیا۔ ان چند لمحوں میں نہ جانے مجھے ایسا کیوں لگا کہ جیسے میرے سارے لفظ کہیں کھو گئے ہیں۔ مجھ سے کچھ بھی نہیں بولا گیا۔ اس ایک لمحے میں مجھے زبان اور لفظوں کی اہمیت اور قوت گویائی سے محروم بدنصیبوں کی بے بسی کا بہت شدت سے اندازہ ہوا۔ اتنے میں اُن کی خادمہ بھی دوڑے ہوئے ہاتھ میں پانی کی بوتل لیے واپس پہنچ چکی تھی۔ ماں نے چند گھونٹ پانی بوتل سے بھی لڑکی کو پلائے، خادمہ کی مدد سے لڑکی کو کھڑا کیا اور واپسی کے لیے چل پڑیں۔ ماں نے جاتے جاتے ایک بار پھر میری جانب محبت بھری نگاہ ڈالی اور زیرِ لب شاید کوئی دعا بھی دی، لیکن میں یونہی بنا پلکیں جھپکائے ساکت کھڑا رہا۔ ہوش اُس وقت آیا جب وہ تینوں درگاہ کا صحن پار کر کے بیرونی دروازے سے باہر نکل چکی تھیں۔ میں

ایک دم حواس باختہ ہو کر یوں باہر کی جانب لپکا جیسے کوئی مجھ سے میری سب سے قیمتی چیز چھین کر لے بھاگا ہو۔ لیکن جب تک میں زائرین کی بھیڑ سے اُلجھتا، راستہ بناتا ہوا باہر سیڑھیوں تک پہنچا وہ لوگ اپنی گاڑی میں بیٹھ کر جا چکے تھے۔ ڈرائیور نے کاشف سے ہاتھ ملایا اور میں نے دُور ہی سے گاڑی کو روانہ ہوتے دیکھ کر بے بسی سے ہاتھ ملے۔ اس وقت مجھے خود پر شدید غصہ آ رہا تھا۔ قدرت نے آج خود مجھے اتنا بہترین موقع دیا تھا، میں کم از کم اُس کی ماں کی دعا کا جواب تو دے سکتا تھا، اُن لوگوں کی سیڑھیوں سے اُترنے میں مدد تو کر سکتا تھا، لیکن میں تو بس کسی معذور انسان کی طرح کھڑا ہی رہ گیا۔ بوجھل دل کے ساتھ سیڑھیوں سے نیچے اُترا تو کاشف میری جانب لپکا ''کیوں شہزادے...... کچھ بات بنی۔'' میں نے کاشف کو اپنی بے بسی کا احوال سنایا تو اُس نے سر پیٹ لیا۔ ''کیا ہو گیا ہے یار......؟ اتنا بہترین موقع ضائع کر دیا......آخر تمہارے ساتھ مسئلہ کیا ہے......؟'' میں نے ایک گہری سانس لی۔ ''اگر مسئلہ ہی سمجھ میں آ جاتا تو پھر رونا کس بات کا تھا......؟'' کاشف نے اپنا سر جھٹکا۔ ''بہرحال...... میں نے ڈرائیور سے تمام ضروری معلومات حاصل کر لی ہیں۔ گاڑی کے مالک کا نام حاجی مقبول احمد ہے۔ ملک کے بہت بڑے صنعت کار ہیں۔ آباؤاجداد یو پی سے ہجرت کر کے پاکستان آئے تھے۔ اُدھیڑ عورت اُن کی بیوی اور لڑکی اُن کی بیٹی ہے۔ ایک معتدل اسلامی گھرانا ہے اور حاجی صاحب خود بھی درگاہوں اور زیارتوں پر چڑھاوے چڑھانے جاتے رہتے ہیں۔ بھارت میں حاجی علی کی درگاہ کا سالانہ عرس وہ کبھی مس نہیں کرتے۔ اُن کی بیٹی پڑھی لکھی ہے اور حال ہی میں اُس نے یونیورسٹی سے اپنا ماسٹرز مکمل کیا ہے۔ وہ پہلے کبھی اپنے ماں باپ کے ساتھ ان زیارتوں اور درگاہوں پر نہیں جاتی تھی، لیکن بقول ڈرائیور پتا نہیں، اُس کی بی بی جی کو گزشتہ دو سال سے کیا ہو گیا ہے کہ ہر جمعرات کو اس درگاہ کا پھیرا انہوں نے خود پر لازم کر لیا ہے اور ہاں......لڑکی ماں باپ کی اکلوتی اولاد ہے......''

میں نے ستائشی نظروں سے کاشف کو داد دی۔ میں جانتا تھا کہ وہ ڈرائیور سے زیادہ تر باتیں اُگلوا لے گا، لیکن اُس نے میری توقع سے کہیں زیادہ معلومات حاصل کر لی تھیں اور وہ بھی اتنے کم وقت میں۔ ''تمہاری اس اعلیٰ کوشش پر میں تمہیں انعام کا حق دار ٹھہراتا ہوں۔'' کاشف نے سعادت مندی سے سر جھکایا۔ ''آپ کی ذرہ نوازی ہے عالی جاہ...... لیکن غلام کی

بات ابھی ختم نہیں ہوئی۔ اس مخبری کا آخری حصہ سن کر آپ یقیناً اپنی پوری سلطنت میرے حوالے کر دیں گے...... میں نے لڑکی کا نام بھی ڈرائیور کی زبان سے اُگلوا لیا ہے......'' کاشف نے مجھے تنگ کرنے کے لیے ایک لمبا وقفہ لیا۔ میں دم بخود کھڑا اُس کی طرف یوں دیکھتا رہا جیسے وہ کچھ ہی دیر میں اُس لڑکی کا نام نہیں، بلکہ مجھے میری زندگی، یا موت میں سے کسی ایک پروانے کی تحریر پڑھ کر سنانے والا ہو۔ شاید میری پوری زندگی میں، میری تمام ساعتوں نے مل کر بھی کبھی کسی ایک لفظ کو سننے کی اتنی شدید تمنا نہیں کی ہو گی، جتنی اس ایک لمحے میں مجھے کاشف کی زبان سے وہ نام سننے کی آرزو تھی...... ''زہرا...... زہرا نام ہے اُس لڑکی کا......'' میں نے دھیرے سے زیرِ لب دہرایا ''......زہرا......'' اس ماہِ کامل کا کچھ ایسا ہی نام ہونا چاہیے تھا۔ مجھے یوں لگا جیسے میرے آس پاس دن ہی میں بہت سے چاند اکٹھے نکل آئے ہوں۔ کاشف غور سے میری بدلتی ہوئی حالت دیکھ رہا تھا۔ اُس نے پلٹ کر جیپ کا دروازہ کھولا۔ ''اگر میں گزشتہ پانچ برسوں میں اُن پچاسوں لڑکیوں کے نام اور پتے نہ جانتا ہوتا، جو تمہاری زندگی میں ہفتے، دس دن، یا مہینے کے لیے آ کر جا چکی ہیں، تو اس وقت تمہاری حالت دیکھ کر مجھے یہ یقین کرنے میں ایک لمحہ بھی نہیں لگتا کہ تم اُس لڑکی کے شدید عشق میں مبتلا ہو چکے ہو۔ لیکن تمہارے گزشتہ ریکارڈ کی وجہ سے میں تمہیں فی الحال اس الزام سے بری قرار دیتا ہوں۔'' میں نے جواب میں خاموش رہنا ہی بہتر سمجھا۔ جب تک ہم ساحل سے واپس شہر پہنچے تب تک شام ڈھل چکی تھی اور شہر کی روشنیاں جگمگانے لگی تھیں۔

لیکن اُس دن کے بعد میرے اندر کی تمام روشنی جیسے دھیرے دھیرے گھٹنے لگی۔ رات تک مجھے تیز بخار نے آ گھیرا۔ مما اور پاپا دونوں ہی کسی کانفرنس کے سلسلے میں جنیوا گئے ہوئے تھے۔ اُن کی واپسی اگلی شام تک متوقع تھی، لیکن میں اُن کی آمد سے پہلے ہی نڈھال ہو چکا تھا۔ مما تو میرے ماتھے پر ہاتھ رکھتے ہی بالکل بوکھلا سی گئیں۔ چند لمحوں ہی میں ہمارے فیملی ڈاکٹر، ڈاکٹر یزدانی اپنے تمام ''لوازمات'' سمیت میری خواب گاہ میں موجود تھے۔ میں نے پاپا سے احتجاج کیا ''دیکھیں نا پاپا...... یزدانی انکل پھر سے اپنی پوری لیبارٹری اُٹھا لائے ہیں۔'' ڈاکٹر یزدانی زور سے ہنسے۔ پاپا نے مسکرا کر کہا ''کیا کریں یار...... ان کے تیس سالہ کیرئیر میں صرف ہم نے انہیں اپنا فیملی ڈاکٹر ہونے کا شرف بخشا ہے۔ اب ان کے تجربے تو بھگتنا ہی

پڑیں گے۔ میری ساری ہمدردیاں تمہارے ساتھ ہیں بیٹا......'' مما نے ہم دونوں کو غصے سے گھورا اور پاپا کو ٹوکا ''توصیف آپ بھی نا...... بچے کے ساتھ بچہ بن جاتے ہیں۔ اسے شدید بخار ہے۔ یہ بات مذاق میں ٹالنے والی نہیں ہے...... ڈاکٹر یزدانی آپ پراپر چیک اپ کریں ساحر کا......'' مما کا موڈ دیکھ کر پاپا نے مجھے منہ پر اُنگلی رکھ کر چپ رہنے کا اشارہ کیا۔ مجھے اُن کی یہی بات سب سے زیادہ پسند تھی۔ انتہائی غیر معمولی دباؤ میں بھی اُن کا رویہ انتہائی نارمل رہتا تھا۔ سچ تو یہ ہے کہ وہ ایک والد سے کہیں زیادہ میرے بہت اچھے دوست تھے۔ ڈاکٹر یزدانی نے بہت تفصیل سے میرے بخار کی تمام علامات نوٹ کیں اور چند ٹیسٹ کروانے کی تاکید کی۔ لیکن ان تمام ٹیسٹوں کا نتیجہ اُن کے لیے مزید حیران کن تھا کیونکہ میرا ہر تجزیہ معمول کے مطابق تھا۔ تو پھر یہ شدید بخار میرا پیچھا کیوں نہیں چھوڑ رہا تھا۔ مما پاپا کے پیچھے پڑ گئیں کہ مجھے فوراً باہر کے کسی بڑے ہسپتال میں مزید ٹیسٹ کروانے کے لیے بھجوا دیا جائے۔ وہ تو خود بھی میرے ساتھ جانے کے لیے تیار بیٹھی تھیں۔ میں نے بڑی مشکل سے ڈاکٹر یزدانی کو اس بات کے لیے تیار کیا کہ وہ مما کو سمجھائیں کہ اب ہمارے ملک ہی میں ہر بیماری کا علاج موجود ہے، اور پھر یہ تو صرف ایک معمولی بخار تھا۔ لیکن میں مما کی طبیعت سے بھی اچھی طرح واقف تھا۔ اگر مزید کچھ دن میرا بخار نہ اُترتا تو پھر انہیں روکنا کسی کے بس کی بات نہیں تھی۔

میرے بخار کو پانچواں روز تھا کہ اچانک ہی عینی ساری چنڈال چوکڑی کے ساتھ نازل ہو گئی۔ میرا گھر ''چڑیا گھر'' میں تبدیل ہو گیا۔ انہوں نے آتے ہی سب کچھ تلپٹ کر دیا۔ میرا کمرا کچھ ہی دیر میں کسی میدانِ جنگ کا نقشہ پیش کرنے لگا تھا۔ مما نے میرے سارے دوستوں کو لنچ کر کے جانے کا کہا۔ کاشف نے ڈھٹائی سے جواب دیا کہ ''آنٹی لنچ کا وقت تو ہو ہی گیا ہے، آپ ڈنر کی تیاری بھی کر لیں کیونکہ اب ہم اس مریض کا مرض دُور کیے بنا یہاں سے نہیں ٹلنے والے......'' مما ہنستی ہوئی کمرے سے باہر نکل گئیں۔ ہیلتھ منسٹر کا پیٹو بیٹا جواد بولا ''لیکن تمہیں ہوا کیا ہے۔ ریس والے دن تو تم بھلے چنگے تھے......؟'' کاشف نے معنی خیز نظروں سے میری جانب دیکھا ''اسے روگ لگ گیا ہے...... کوئی چہرہ بھا گیا ہے اسے۔'' عینی زور سی چونکی۔ میں نے آنکھ کے اشارے سے کاشف کو منع کرنے کی کوشش کی لیکن تب تک تیر کمان سے نکل چکا تھا۔ عینی نے غور سے میری جانب دیکھا ''کیا مطلب...... میں کچھ بھی

نہیں......اور ہاں......کاشف بتا رہا تھا کہ تم دونوں اس جمعرات کو بھی درگاہ گئے تھے......کہیں یہ روگ وہیں کا پالا ہوا تو نہیں ہے......؟'' میں نے کھا جانے والی نظروں سے کاشف کو گھورا۔ کسی کے پول کا ڈھول پیٹنا تو کوئی اس سے سیکھے۔ کاشف نے گھبرا کر کندھے اُچکائے لیکن اب کیا ہو سکتا تھا۔ میں نے بات کا رُخ موڑنے کی کوشش کی۔ ''تم بھی کس ایڈیٹ کی باتوں پر یقین کر بیٹھی ہو۔ ہم درگاہ گئے ضرور تھے لیکن ایک شان دار کار کے مالک کی کھوج میں......'' لیکن عینی بھی بلا کی ذہین تھی۔ اُسے مطمئن کرنا اتنا آسان نہیں تھا۔ اُس کے چہرے پر ایک رنگ آ کر گزر گیا اور وہ دھیرے سے بولی۔ ''خدا کرے کہ یہ کھوج صرف ایک شان دار کار تک ہی محدود رہے۔'' بات آئی گئی تو ہو گئی لیکن پھر سارا دن عینی کا موڈ آف رہا۔ وہ لوگ شام تک میرے گھر میں دھما چوکڑی مچاتے رہے۔ جاتے ہوئے مما نے اُن سب سے وعدہ لیا کہ وہ لوگ اب آتے رہا کریں گے۔ ''عینی سب سے آخر میں گاڑی میں سوار ہوئی اور مجھے دیکھ کر ہاتھ ہلاتی ہوئی باقی سب کے ساتھ رُخصت ہو گئی۔ مما میرے قریب ہی کھڑی تھیں۔ انہوں نے مسکراتے ہوئے معنی خیز نظروں سے میری جانب دیکھا۔ ''نائس گرل ساحر...... ہے نا'' مجھے اُن کے انداز پر ہنسی آ گئی۔ ''آپ جیسا سوچ رہی ہیں ایسا کچھ نہیں ہے......'' ''اگر ویسا ہو بھی جائے تو ہمیں کوئی اعتراض نہیں ہو گا مائی چائلڈ......بس تم خوش رہا کرو......''

مما بھی مسکراتی ہوئی وہاں سے پلٹ گئیں۔ لیکن ہم انسانوں کا شاید سب سے بڑا مسئلہ ہی یہی تھا کہ ہم کبھی بھی خوشی کا کوئی مستقل فارمولا ہی تلاش نہیں کر پائے تھے۔ دو انسانوں میں سے کوئی ایک بات جو پہلے کے لیے خوشی کا سامان کر سکتی ہے، وہی بات دوسرے کے لیے انتہائی معمول کی خبر ثابت ہوتی ہے۔ شاید خوشی کا تعلق ہمارے اندر کی ضروریات سے ہوتا ہے۔ کوئی سڑک پر گرا ایک روپے کا سکہ پا کر بھی خوشی سے نہال ہو جاتا ہے اور کسی کو بزنس میں کروڑوں کا فائدہ بھی مہمیز نہیں دے پاتا۔ ان دنوں میرے لیے بھی خوشی کے معنی یکسر بدل گئے تھے۔ گاڑیوں کی دوڑ اور ہیوی بائیکس کی ریس، جو چند دن پہلے تک میرا جنون تھا، اب اس شغل میں بھی میرا دل نہیں اٹک رہا تھا...... جیسے جیسے جمعرات کا دن قریب آتا جا رہا تھا، میرے اندر پھر سے ایک عجیب سی بے چینی پھیلتی جا رہی تھی اور پھر جمعرات کا دن بھی آ گیا۔ مما صبح پاپا کے ساتھ ہی نکل چکی تھیں لہٰذا مجھے روکنے والا گھر میں کوئی بھی نہ تھا۔ میں نے معمول کی

طرح اپنی گاڑی نکالی اور سہ پہر ہونے سے بھی کافی قبل ساحلی درگاہ کے دروازے پر کھڑا تھا۔ آج اندر بہت زیادہ چہل پہل تھی۔ ایسے لگتا تھا جیسے کوئی خاص ہستی وہاں آئی ہوئی ہو۔ زہرا کی گاڑی عصر کے قریب وہاں آتی تھی اور ابھی تو ظہر کی اذانیں بھی ٹھیک طرح سے شروع نہیں ہوئی تھیں۔ میں نے عبداللہ کی تلاش میں یہاں وہاں نظر دوڑائی اور پھر وہ مجھے صحن کے وسط میں کسی شخص کے گرد ہجوم میں ایک جانب کھڑا نظر آ گیا۔ اُس نے مجھے دُور سے دیکھتے ہی ہاتھ کے اشارے سے قریب بلایا۔ میرا جسم بخار سے پھنک رہا تھا اور اس وقت مجھے کسی سائے کی تلاش تھی لیکن صحن کے وسط میں تو سورج عین ہم سب کے سروں کے اُوپر آگ برسا رہا تھا۔ لیکن میں عبداللہ کے بلاوے پر انکار نہ کر سکا اور اُس کی جانب قدم بڑھا دیئے۔

قریب جانے پر میں نے ایک باریش بزرگ کو لوگوں کے درمیان بیٹھے پایا۔ اس بوڑھے شخص کے چہرے پر ایک عجیب سا جلال تھا، جو انسان کو اُس کی جانب دوسری نظر ڈالنے سے روکتا تھا۔ آس پاس سبھی لوگ نہایت مؤدب بیٹھے ہوئے تھے۔ بزرگ کے ہاتھ میں تسبیح تھی، جسے وہ آنکھیں بند کیے پڑھے جا رہا تھا۔ مجھے اس سناٹے سے کچھ عجیب سی وحشت محسوس ہونے لگی تھی۔ چند لمحے یونہی گزر گئے۔ میں نے اُلجھن آمیز انداز میں عبداللہ کی جانب دیکھا۔ عبداللہ نے آنکھیں میچ کر مجھے خاموشی سے بیٹھے رہنے کا اشارہ کیا۔ اچانک اس بزرگ نے اپنی آنکھیں کھولیں اور براہ راست میری آنکھوں میں دیکھتے ہوئے زور سے گرج کر بولا

''آ گیا تو............اتنی دیر کہاں لگا دی......؟''

سب ٹھاٹھ پڑا رہ جاوے گا

میں نے گھبرا کر اپنے پیچھے دیکھا، لیکن وہ بزرگ مجھ ہی سے مخاطب تھے۔ میں نے کچھ نہ سمجھتے ہوئے عبداللہ کی جانب دیکھا۔ عبداللہ نے دھیرے سے بزرگ کے کان میں کچھ کہا۔ اُس نے زور سے اپنے لمبے بال جھٹکے اور مجھ پر ایک نگاہِ غلط ڈالی۔ ''جانتا ہوں میں...... اس ساحر کو بھی اور اس کے سحر کو بھی...... اس سے پوچھو کہ یہ یہاں کس پر اپنا سحر پھونکنے آیا ہے...... یہاں اس کی دال نہیں گلے گی......'' پھر یکایک نہ جانے اُس بوڑھے کو کیا ہوا۔ ''سب ٹھاٹھ پڑا رہ جاوے گا...... جب لاد چلے گا بنجارا......'' پھر وہ بزرگ ایک دم ہی یوں مراقبے میں چلا گیا جیسے اُسے ہم سب سے کوئی غرض ہی نہ رہی ہو۔ عبداللہ نے اشارے سے بھیڑ کو چھٹ جانے کا اشارہ کیا۔ سب لوگ خاموشی سے وہاں سے اُٹھ کر دُور ہٹ گئے۔ عبداللہ بھی میرا ہاتھ تھامے ہوئے درختوں کے سائے کی طرف چلا آیا، جہاں زمین پر ایک چٹائی بچھی ہوئی تھی۔ دفعتہً عبداللہ کو احساس ہوا کہ میرا ہاتھ تپ رہا ہے۔ اُس نے جلدی سے میرے ماتھے کو چھوا۔ ''اوہ...... تمہیں تو بہت تیز بخار ہے۔'' عبداللہ نے جلدی سے گھڑے سے پانی کا ایک گلاس نکال کر مجھے پیش کیا۔ پانی پیتے ہی مجھے یوں لگا جیسے میری رُوح تک میں اس کی تاثیر اُترتی چلی گئی ہو۔ میرا دل چاہا کہ میں عبداللہ سے پانی کا ایک اور گلاس مانگ لوں، لیکن جانے کیوں میں ایسا نہ کر سکا۔ عبداللہ نے تشویش سے میری جانب دیکھا ''یہ حالت کب سے ہے تمہاری......؟'' ''پچھلی جمعرات سے...... جب میں درگاہ سے واپس گھر پہنچا تھا، تب سے اِسی طرح اس بخار میں پھنک رہا ہوں......'' میری بات سن کر عبداللہ نہ جانے کس سوچ میں پڑ گیا۔ میں نے اُسے ٹوکا ''اچھا میری بات چھوڑو...... یہ بتاؤ یہ بڑے میاں کون ہیں...... اور اتنے جلال میں کیوں ہیں......؟'' عبداللہ میری بات سن کر چونکا اور جب اُسے میرا اشارہ سمجھ میں آیا تو ایک گہری مسکراہٹ اُس کے چہرے سے چھلک پڑی۔ ''اوہ...... وہ...... بھئی وہ بڑے میاں تو ہمارے بھی بڑے ہیں...... ہم انہیں حاکم بابا کے نام سے پکارتے ہیں۔'' ''کیا مطلب......

کیا یہی صاحب تمہارے باس ہیں؟'' باس کا لفظ سن کر عبداللہ نے بڑی مشکل سے اپنی ہنسی روکی۔ ''ہاں میاں...... باس بھی کہہ سکتے ہو...... مجھے اور مجھ جیسے اور بہت سوں کو حاکم بابا کے ذریعے ہی احکامات ملتے ہیں۔ کس نے کہاں جانا ہے، کہاں رُکنا ہے؟ کس علاقے میں کس کارندے کی ضرورت ہے، کس طرح کے لوگوں میں تعلیم کس طرح بانٹنی ہے...... یہ سارے معاملات حاکم بابا ہی طے کرتے ہیں۔'' میں حیرت سے عبداللہ کی بات سنتا رہا۔ ''کارندے......؟ کیا مطلب......؟ کیا تمہاری طرح اور بھی خدمت گار ہیں اس درگاہ کے اندر......؟ مطلب تم لوگوں کا پورا ایک نیٹ ورک ہے۔ لیکن تم نے ابھی تعلیم کی بات کی تھی...... تم لوگ کیسی تعلیم دیتے ہو لوگوں کو...... اور کیا حاکم بابا کے اُوپر بھی کوئی اور عہدے دار موجود ہے......؟'' ''تعلیم سے مراد کوئی اسکول کی پڑھائی نہیں ہے...... بس لوگوں کی خدمت کرنا ہوتی ہے...... جیسے میں اس درگاہ میں آنے والے زائرین کی مدد کرتا ہوں...... انہیں کسی چیز کی ضرورت ہو، یا کسی قسم کی معلومات درکار ہوں تو وہ میں انہیں فراہم کرتا ہوں...... جب کہ حاکم بابا سے اُوپر کے تمام انتظامات سلطان بابا سنبھالتے ہیں۔ البتہ ہمارا اُن سے رابطہ کبھی کبھار ہی ہوتا ہے۔ دراصل سلطان بابا، حاکم بابا اور ان جیسے دوسروں کے بھی 'باس' ہیں...... ہم تو اُن کے ماتحتوں کے بھی ماتحت ہیں......''

میری حیرت لمحہ بہ لمحہ بڑھتی ہی جا رہی تھی۔ مطلب یہ کہ حاکم بابا جیسے بھی دیگر کئی حکام موجود تھے۔ پھر تو سلطان بابا واقعی کوئی ہستی ہوں گے، کیونکہ میری تو آدھی جان حاکم بابا کا جلال دیکھ کر ہی نکل گئی تھی۔ جانے سلطان بابا کے رُعب اور جلال کا کیا عالم ہوگا؟ گویا ان لوگوں کی پوری ایک انتظامیہ تھی، جیسے اسسٹنٹ کمشنر کے اُوپر ڈپٹی کمشنر اور ڈپٹی کمشنر کے اُوپر کمشنر تعینات ہوتا ہے۔ اِسی طرح عبداللہ کے اُوپر کی چین آف کمانڈ بھی پوری طرح متحرک تھی۔ لیکن اس نفسانفسی کے دور میں جب بھائی اپنے بھائی کا گلا کاٹنے پر تلا ہوا ہے، ایسے بے غرض اور بے لوث لوگ بھی موجود ہیں جو صرف دوسروں کی تکلیف اور درد کو دُور کرنے کے لیے اپنا چین اور آرام تیاگ دیتے ہوں گے......؟؟ مجھے اس بات پر اب بھی پوری طرح یقین نہیں آیا تھا...... اور پھر ان لوگوں کے اپنے اخراجات بھی تو ہوتے ہوں گے۔ یہ سارا خرچہ کون اُٹھاتا ہوگا؟ کیا سلطان بابا سے اُوپر بھی کوئی عہدے دار موجود ہوگا؟ جیسے کمشنر کے اُوپر صوبے

کا چیف سیکرٹری ہوتا ہے۔ میرے ذہن میں ایسے نہ جانے کتنے سوالات کلبلا رہے تھے۔ لیکن ایک دم ہی گھنیرا سایہ سا چھا گیا۔ یوں لگا جیسے گرم تپتی دوپہر میں ٹھنڈے پانی سے بھری کوئی بدلی سورج کے عین سامنے آ کر رُک گئی ہو۔ وہ ماہ جبیں اپنے کومل قدم درگاہ کے صحن میں دھر چکی تھی اور حسبِ معمول اُس کی ماں اور خادمہ بھی ساتھ ہی آئے تھے۔ جانے موسم کی تمام شدت اور دھوپ کی ساری حدت ایک ہی پل میں کہاں غائب ہوگئی۔ مجھے یوں لگا کہ دُور سمندر کی طرف سے چلنے والی پروائی نے ساری درگاہ کے گرد اپنا گھیرا باندھ دیا ہو۔ کسی ایک شخصیت کی موجودگی ہمارے اردگرد کے موسم پر اس قدر شدت اور تیزی سے کیسے اثرانداز ہو سکتی ہے؟...... مجھے آج تک اس سوال کا جواب نہیں مل سکا۔ کیا باہر کے سبھی موسم جھوٹے ہوتے ہیں اور اُن کا تعلق صرف ہمارے اندر کے موسم ہی سے ہوتا ہے۔ وہ پری رُخ اب دھیرے دھیرے چلتی ہوئی، جیسے پانیوں پر قدم رکھتی ہوئی حاکم بابا کے بالکل سامنے جا بیٹھی تھی۔ حاکم بابا نے اُس کے سلام کے جواب میں دعا دی اور اُس کے سر پر ہاتھ پھیرا۔ مطلب یہ کہ وہ پہلے بھی حاکم بابا سے مل چکی تھی۔ حاکم بابا نے زہرا کی ماں سے کچھ پوچھا اور قریب کھڑے خادم کے ہاتھ سے پانی کا گلاس لے کر اُس پر کچھ پڑھا اور پھونک کر زہرا کو پینے کے لیے دے دیا۔ میں اُس ماہ وش کو دیکھنے میں اس قدر محو تھا کہ مجھے عبداللہ کے اُٹھ کر چلے جانے کا احساس تک نہیں ہوا۔ لیکن میں نے آج یہ تہیہ کیا ہوا تھا کہ کسی نہ کسی بہانے زہرا سے ہم کلام ہونے کی کوشش ضرور کروں گا۔ اُس سے یہ پوچھنے کی جسارت ضرور کروں گا کہ آخر وہ کون سی منت ہے جو اُسے یہاں اس ویرانے میں اتنی دُور تک کھینچ لائی ہے؟ وہ تو خود کسی منت کی طرح ہے، جس کی قبولیت کے لیے ایک عالم تا عمر سجدے میں پڑا رہ جائے...... روپ کی ایسی دولت، دنیا میں کچھ کم ہی خوش نصیبوں کو حاصل ہوتی ہے۔ وہ تو خود ایک دعا تھی...... پھر وہ اپنا وقت دعاؤں میں کیوں ضائع کر رہی تھی۔

میں جانے کتنی دیر اُس کی طرف دیکھتے ہوئے گم صم سا بیٹھا رہا۔ ہوش اُس وقت آیا جب وہ تینوں واپسی کے لیے اُٹھ کھڑی ہوئیں۔ میں جلدی سے پانی کا بھرا گلاس لے کر درگاہ کے داخلی دروازے کے قریب بھیڑ سے ذرا ہٹ کر کھڑا ہو گیا اور جب وہ تینوں میرے قریب سے گزرنے لگیں تو میں نے جلدی سے پانی کا گلاس زہرا کے سامنے کر دیا۔ وہ ٹھٹھک کر رُک

گئی۔ اُس کے پیچھے آتی اُس کی ماں اور خادمہ کو بھی رُکنا پڑا۔ میرے ہاتھ میں پانی کا گلاس تھا لیکن خود میرے حلق میں شدید پیاس کے مارے کانٹوں کا ایک جنگل سا اُگ آیا تھا۔ زہرا نے سوالیہ نظروں سے میری جانب دیکھا۔ مجھ سے کچھ نہیں بولا گیا۔ پھر شاید اُس کی ماں نے مجھے پہچان لیا کہ میں وہی ہوں جس نے پچھلی مرتبہ بھی زہرا کے لیے پانی پیش کیا تھا۔ وہ ہلکے سے مسکرا دیں اور زہرا کے کاندھے پر ہاتھ رکھ کر بولیں۔ ”لے لو بیٹا...... پانی کا انکار نہیں کرتے......“

زہرا نے چپ چاپ میرے ہاتھوں سے گلاس لے کر اپنے نازک لبوں سے لگا لیا اور چند گھونٹ پی کر واپس میری جانب بڑھا دیا۔ میں اُسے اس محویت سے دیکھ رہا تھا کہ مجھے احساس ہی نہیں ہوا کہ وہ ہاتھ میں گلاس لیے کھڑی ہے۔ مجبوراً اُسے ہلکا سا کھنکارنا پڑا اور میں چونک سا گیا۔ میں نے جلدی سے شرمندگی کے عالم میں گلاس واپس لے لیا اور نادم لہجے میں کہا، ”معاف کیجیے گا...... میرا دھیان کسی اور جانب تھا۔“ اُس نے میری بات کا کوئی جواب نہیں دیا اور چادر درست کرتے ہوئے آگے بڑھ گئی۔ زہرا کی ماں نے گزرتے وقت میرے سر پر ہاتھ رکھا اور دعا دی۔ ”جیتے رہو بیٹا...... کسی اچھے گھرانے کے لگتے ہو...... خدا تمہاری آرزو پورے کرے۔“ پتا نہیں اچانک ہی میرے منہ سے کیسے نکل گیا۔ ”کیا یہاں آ کر مانگنے سے خدا ہر آرزو پورا کر دیتا ہے......؟“ خاتون نے لمبی سی سانس لی اور دھیرے سے کہا۔ ”ہاں بیٹا...... جس کا نصیب ہو اُسے ملتے زیادہ دیر نہیں لگتی...... پر ہماری آزمائش شاید کچھ طویل ہے...... سدا خوش رہو......“ وہ مجھے دعا دے کر آگے بڑھ گئیں۔ میں نے مناسب فاصلہ رکھ کر، پیچھے دیکھا تو زہرا پہلے ہی سیڑھیاں اُتر کر گاڑی میں بیٹھ چکی تھی اور اب اُس کی ماں اور خادمہ دھیرے دھیرے سیڑھیاں اُتر کر جا رہی تھیں۔ آج پہلی بار میں نے زہرا اور اُس کی ماں کے لباس پر غور کیا۔ وہ دونوں ہی یو پی کے مخصوص اور روایتی لباس میں ملبوس تھیں۔ زہرا نے جدید وضع کا کرتا پاجامہ، جب کہ ماں نے بھاری کام دار سفید شرارہ پہنا ہوا تھا۔ اُن کے لہجے کی کھنک اور الفاظ کا چناؤ بھی خالص اُردو تہذیب یافتہ گھرانوں والا تھا۔ لیکن اُس گل رُخ کے مرمریں لب تو میری کوشش کے باوجود بھی کھل نہ سکے۔ کاش وہ ایک ”شکریہ“ کا لفظ ہی کہہ جاتی۔ آخر ایسا بھی کیا غرور، کیا گھمنڈ تھا اُسے...... لیکن پھر بعد میں، میں نے خود ہی اپنے

خیال کی نفی کر دی۔ ''نہیں...... شکریہ جیسے تکلفات میں تو وہ لوگ پڑتے ہیں، جن کا تعلق اس
دنیا سے ہوتا ہے اور اس ماہ رُو کی تو حالت صاف چغلی کھا رہی تھی کہ وہ کسی اور پرستان کی
شہزادی ہے۔ اُسے اپنا ہوش ہی کہاں تھا کہ وہ ایسے ظاہری آداب کا خیال رکھ پاتی۔ زہرا کی
گاڑی اسٹارٹ ہونے کی آواز کے ساتھ ہی میرے دل میں ایک عجیب سی خواہش اُبھری اور
میں ہاتھ میں پکڑا گلاس ساتھ کھڑے زائر کے ہاتھ میں پکڑا کر نیچے کی جانب لپکا۔ پھر ایک
ساتھ تین تین سیڑھیاں پھلانگتا ہوا گاڑی تک پہنچا اور گاڑی کو دُور ریت اُڑاتی، شہر کی طرف
جاتی، زہرا کی گاڑی کے پیچھے ڈال دیا۔

جانے یہ زہرا کا گھر دیکھنے کی خواہش تھی، یا پھر ایک مرتبہ اُس کا روپ اپنی آنکھوں میں
بھر لینے کی...... لیکن میں لگاتار اُن کی گاڑی کا پیچھا کرتا رہا، حتیٰ کہ شہر کا وہ بیش قیمت مضافاتی
حصہ شروع ہو گیا جہاں پرانی وضع، لیکن انتہائی متمول طبقے کی حویلیاں موجود تھیں۔ یہ تمام
حویلیاں کئی ایکڑ پر پھیلی ہوئی تھیں اور زنانے، مردانے اور پائیں باغ کا جو تصور اب ہمارے
بڑے گھروں میں تقریباً مفقود ہی ہو چکا تھا، وہاں اب بھی پوری آب و تاب کے ساتھ موجود
تھا۔ زہرا کی گاڑی بھی ایک ایسی ہی عظیم الشان حویلی کے پھاٹک سے اندر داخل ہو گئی۔ میں
نے اپنی گاڑی پھاٹک کے قریب لا کر روک دی۔ اندر ایک طویل سی رنگین پتھروں کی روش سے
ہوتی ہوئی زہرا کی گاڑی پورچ تک پہنچ چکی تھی۔ ڈرائیور نے جلدی سے پیچھے کے دونوں
دروازے کھولے اور زہرا اسی شان سے گاڑی سے اُتری جو اس کی شخصیت کا خاصہ تھی۔ میں
کافی دیر اسی سحر میں حویلی کے باہر اپنی گاڑی میں بیٹھا رہا اور پھر شام ڈھلے وہاں سے لوٹ آیا۔

گھر میں مما اور پاپا پریشانی کے عالم میں لان ہی میں ٹہلتے ہوئے دکھائی دیئے۔ میری
گاڑی کی آواز سنتے ہی مما تیزی سے میری جانب لپکیں۔ ''ساحر...... کہاں چلے گئے تھے تم......
کتنا پریشان تھے میں اور تمہارے پپا...... کیوں ستاتے ہو ہمیں اتنا......؟'' مما اور روہانسی سی ہو
گئیں، لیکن میں انہیں منانا خوب جانتا تھا۔ ایک عجیب بات اس دوران یہ ہوئی تھی کہ میرا بخار
نہ جانے دن کے کسی پہر میں بالکل ہی غائب ہو گیا تھا۔ میں نے مما کا ہاتھ اپنے ماتھے پر رکھ
کر انہیں یقین دلایا کہ اب میں بالکل ٹھیک ہوں۔ خدا خدا کر کے مما کی ناراضی ختم ہوئی اور ہم
تینوں نے بہت عرصے بعد اکٹھے بیٹھ کر ڈنر کیا۔ مما کی تسلی تو ہو گئی تھی لیکن پاپا کی نگاہوں میں

ابھی بہت سے سوال مچل رہے تھے۔ آخر ڈنر کے بعد جب ہم سب لان میں بیٹھے تھے تو
پاپا نے مما سے خاص اُن کے ہاتھ کی بنی ہوئی کافی کی فرمائش کی اور وہ اُٹھ کر کافی بنانے چلی
گئیں تو پاپا کو موقع مل گیا۔ انہوں نے مما کے اندر جاتے ہی جلدی سے کہا ''ہاں بھائی
جوان...... کوئی سگریٹ وغیرہ ہے تو نکالو...... ابھی تمہاری مما واپس آ جائیں گی تو اُن کے
سامنے دھواں نگلنا، اُگلنا مشکل ہو جائے گا......'' میرا اور پپا کا ایک ہی برانڈ تھا۔ میں نے
انہیں جیب سے سگریٹ نکال کر پیش کی۔ ایسے موقعوں پر ہم باپ بیٹا نہیں، بلکہ صرف بہت
اچھے دوستوں کی طرح برتاؤ کرتے تھے۔ لیکن آج میرا سگریٹ پینے کو جی نہیں چاہ رہا تھا۔ پاپا
نے سگریٹ سلگا کر ہونٹوں سے لگائی اور میری جانب غور سے دیکھا۔ ''تم نہیں پیو گے
آج......'' ''نہیں...... پاپا جی نہیں چاہ رہا......'' ''میں کچھ دنوں سے دیکھ رہا ہوں کہ تم ہر چیز
سے کچھ اُکتائے اُکتائے سے رہنے لگے ہو...... کوئی خاص وجہ......؟ اور پھر یہ بخار......؟......
مجھ سے شیئر نہیں کرو گے......؟'' میں نے ایک لمبی سی سانس لی اور مما کے آنے سے پہلے مختصراً
زہرا اور اُس درگاہ کے بارے میں ہر بات بتا دی۔ مما کافی لے کر آئیں تو ہماری گفتگو میں
کچھ دیر کا وقفہ آیا۔ کافی پینے کے بعد مما کی یو ایس اے سے ایک ضروری فون کال آ گئی اور
مجھے اور پاپا کو پھر سے کھل کر بات کرنے کا موقع مل گیا۔ ''کہیں تمہیں اس لڑکی سے محبت تو
نہیں ہو گئی......''

''محبت...... نو وے پاپا...... اُس نے آج تک کبھی مجھے نظر اُٹھا کر بھی نہیں دیکھا۔
ہمارے درمیان کبھی گفتگو تو کیا ایک آدھ نظر تبادلہ بھی نہیں ہوا...... پھر مجھے اُس سے محبت کیسے
ہو سکتی ہے؟'' ''محبت کا تعلق لفظوں اور گفتگو سے بھلا کب ہوتا ہے؟ میں تو اسے نظر سے نظر کا
رشتہ سمجھتا ہوں...... ہاں البتہ تمہارے کیس میں نظر کے اس ٹکراؤ کی بھی کمی ہے...... بہر حال
ایک بات یاد رکھنا...... محبت میں مبتلا ہونے کے لیے کسی خاص اور لگے بندھے اُصول کی کبھی
ضرورت نہیں ہوتی...... یہ کسی بھی لمحے بہتی ہوا کی طرح آپ کے خون کے خلیوں میں شامل ہو
کر نسوں میں بہنا شروع کر سکتی ہے۔ ہو سکتا ہے کہ اس لمحے تم اس جذبے کو پوری طرح سمجھنے
سے قاصر رہے ہو، لیکن جب کبھی تمہیں محسوس ہوا کہ یہ محبت ہی ہے تو ہمیں اطلاع کر دینا، ہم
اگلے ہی دن تمہارا رشتہ لے کر اُس لڑکی کے در پر سوالی بنے کھڑے ہوں گے...... جسٹ ٹیک

یور ٹائم۔" پاپا میرا گال تھپتھپا کر وہاں سے اُٹھ گئے۔ لیکن مجھے ایک نئے عذاب میں ڈا
گئے۔ وقت ہی تو نہیں تھا میرے پاس۔ نہ جانے کیوں ہر گزرتے لمحے کے ساتھ مجھے ا
محسوس ہو رہا تھا جیسے وقت میرے ہاتھوں سے ریت کی طرح پھسل رہا ہو، جیسے کوئی انہو
ہونے والی ہو۔

مجھ سے یونیورسٹی اور سب دوست تقریباً چھوٹ ہی چکے تھے۔ یہ اُنہی کی ہمت تھی کہ ک
نہ کسی طرح مجھے کہیں سے ڈھونڈ لیتے تھے۔ ورنہ میرے صبح و شام کہاں بسر ہو رہے تھے، اس ک
خبر خود مجھے بھی نہیں تھی۔ جب کبھی ہوش آتا تو خود کو زہرا کے گھر کے باہر، یا پھر درگاہ کے صح
میں بیٹھا ہوا پاتا تھا۔ ایک ایسی ہی گرم دوپہر، جب میں درگاہ کے صحن مین پہلا قدم ہی رکھ پ
تھا کہ حاکم بابا کی کڑکتی ہوئی آواز نے میرے قدم وہیں جما دیئے۔ "جا...... نکل جا یہا
سے...... اپنے نفس کے پیچھے بھاگنے والوں کے لیے اس آستانے پر کوئی جگہ نہیں ہے۔" مَی
نے گھبرا کر نظریں اُٹھائیں تو حاکم بابا کو عین اپنے سامنے کھڑے پایا۔ وہ پھر زور سے چلائے
"آخر کب تک لڑے گا...... میں کہتا ہوں ہتھیار ڈال دے......" اتنے میں اُن کے پیچھے
ایک ملائم سی آواز اُبھری۔ "حاکم...... بچے کو تنگ مت کر...... اسے اندر آنے دے......" حا
بابا سامنے سے ہٹے تو اُن کے پیچھے ایک عجیب نورانی چہرے والے سرخ و سپید رنگت وا
بزرگ کھڑے نظر آئے۔ "آؤ بچے...... اندر آ جاؤ...... میرا نام سلطان ہے...... یہ سب مج
سلطان بابا کے نام سے پکارتے ہیں۔"

جانے سلطان بابا کی آنکھوں میں ایسی کیا بات تھی۔ اُن سے نظر ملتے ہی مجھے زور کا چ
آیا اور دوسرے ہی لمحے میں ہوش کی وادیوں سے دُور چکرا کر زمین پر گر چکا تھا۔ آخری آو
جو میرے کانوں میں اُبھری وہ کسی زائر کی تھی "ارے کوئی اسے پکڑو...... لڑکا بے ہوش ہو گیا۔

محبت سی ہو گئی ہے

جب مجھے ہوش آیا تو میں شہر کے مہنگے ترین ہسپتال کے بستر پر تھا۔ پاپا، مما اور میرے سب ہی دوست پریشان سے میرے سرہانے کھڑے تھے۔ کاشف نے بتایا کہ انہیں ہسپتال ہی سے کسی نے فون کر کے یہاں بلایا تھا اور اُن کے مطابق مجھے درگاہ سے عبداللہ نامی کوئی لڑکا میری ہی گاڑی میں ڈال کر کسی ڈرائیور کے ہمراہ یہاں تک چھوڑ گیا تھا۔ اُس نے مما، پاپا کے آنے تک وہیں انتظار کیا اور پھر گاڑی کی چابی اُن کے حوالے کر کے چل دیا۔ تب تک ڈاکٹرز میرے تمام ٹیسٹ وغیرہ کروا چکے تھے اور انہوں نے عبداللہ کی موجودگی ہی میں بتایا تھا کہ "میں بالکل ٹھیک ٹھاک ہوں۔ ہوسکتا ہے دھوپ کی زیادتی کی وجہ سے چکر آ گیا ہو۔" پاپا نے ہی میرے دوستوں کو اطلاع کروائی تھی۔ وہ سب ہی مجھ سے کوئی نہ کوئی بات کر رہے تھے، سوائے عینی کے...... وہ بالکل ہی خاموش اور چپ چاپ سی ایک جانب کھڑی تھی۔ کچھ ہی دیر میں نرس نے انہیں میرے آرام کی خاطر جانے کو کہا تو وہ سب ایک ایک کر کے مجھ سے رُخصت ہو گئے۔ سب سے آخر میں عینی میرے بستر کے قریب آئی اور ہاتھ ملاتے ہوئے دھیرے سے بولی "میں خدا سے دعا کروں گی کہ وہ تمہاری درگاہ کی منت پوری کر دے۔" میں نے چونک کر اُس کی جانب دیکھا۔ اُس کی بھرائی ہوئی آنکھیں چھلکنے کو تیار ہی تھیں۔ اُس نے اپنی بات جاری رکھی۔ "مجھے کاشف نے سب کچھ بتا دیا ہے ساحر...... مجھے اپنی ہار سے زیادہ اُس لڑکی کی جیت پر خوشی ہے۔ چلو کوئی تو ہے اس دنیا میں ایسا جو پہلی ہی نظر میں تمہارے دل میں اُترنے کا ہنر جانتا ہے...... میری مانو تو اب دیر نہ کرنا...... کبھی کبھی محبت میں اک ذرا سی دیر بھی صدیوں کی مسافت بڑھانے کا سبب بن جاتی ہے...... چلتی ہوں...... اپنا بہت خیال رکھنا۔" عینی پلٹ کر چل دی۔ میں اُسے پیچھے سے آوازیں ہی دیتا رہ گیا۔ مما جو اس وسیع و عریض کمرے کی دوسری جانب ڈاکٹر سے میرے متعلق کسی بحث میں مشغول تھیں، انہوں نے غور سے عینی کو یوں پلٹ کر جاتے اور مجھے اُسے روکنے کے لیے آوازیں دیتے ہوئے دیکھا۔

اتنے میں کاشف نے اندر جھانکا تو میں نے غصے سے اُسے قریب آنے کا اشارہ کیا۔ اُس ۔
قریب آتے ہی اپنے کان پکڑ لیے اور اس سے پہلے کہ میں اُسے کچھ کہتا، وہ خود تیزی سے ف
اپنی صفائی پیش کرنے لگا۔ ''میں جانتا ہوں، تمہیں بہت بُرا لگا ہوگا، لیکن یقین کرو یار میر۔
پاس اس کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا۔ تمہاری حالت کی وجہ سے اُسے پہلے دن ہی سے تم پر شا
ہوگیا تھا اور پھر جس طرح سے تم یک دم غائب ہوگئے میرے پاس اُس کے سوالوں کا کو
جواب نہیں رہ گیا تھا۔'' ''لیکن تم نے اُس سے یہ کیوں کہا کہ مجھے زہرا سے محبت ہوگئی ہے۔
''میں نے اُس سے ایسا کچھ نہیں کہا یار...... لیکن تمہارے پاگل پن کی یہ جتنی ع
علامات ہیں، انہیں دیکھ کر کوئی بھی شخص یہی سمجھے گا کہ تمہیں محبت ہوگئی ہے۔'' میں نے کاشف
کو گھورا۔ اُس نے ڈر کر جلدی سے بات بدلی ''میرا مطلب ہے کہ محبت سی ہوگئی ہے......''
مما نے دُور سے کاشف کو آواز دی تو وہ وہاں سے ٹل گیا۔ میں کسی گہری سوچ م
ڈوبنے لگا۔ کاشف ٹھیک ہی تو کہہ رہا تھا، یہ ساری علامات اسی ایک جان لیوا بیماری کی طرف
ہی تو اشارہ کرتی تھیں، جسے عرف عام میں ''محبت'' کہا جاتا ہے اور بقول کاشف، اگر محبت
نہیں تو کم از کم ''محبت سی'' ضرور ہوگئی تھی۔

اور جب رات کو ہسپتال سے ڈسچارج ہونے کے بعد میں گھر پہنچا تو یہی بحث مما اور
میں چھڑ چکی تھی۔ پاپا میرے بے ہوش ہونے کا دباؤ برداشت نہیں کر سکے تھے اور انہوں ۔
گھبرا کر مما کو سب کچھ بتا دیا تھا اور اب مما بضد تھیں کہ اگر یہ ساری کیفیات، اُس ایک لڑکی
کی وجہ سے تھیں تو پھر مزید انتظار کرنا سراسر حماقت ہے۔ میں نے کچھ کہنے کی کوشش کی
دونوں نے جھڑک کر خاموش کروا دیا اور طے یہ پایا کہ کل ہی مما اور پاپا جا کر حاجی مقبول ۔
میرے لیے زہرا کا ہاتھ مانگ لیں گے۔ شاید میرے والدین دنیا کے سب سے الگ، س
سے منفرد اور سب سے زیادہ پیار کرنے والے والدین تھے۔ حاجی مقبول صاحب کا
معاشرے میں بڑا نام تھا۔ جانے ملک کے کتنے فلاحی ادارے اُن کے تعاون سے چل ر
تھے۔ لیکن مجھے یقین ہے کہ زہرا اگر کسی جھونپڑی میں بھی رہ رہی ہوتی تو تب بھی مما اور
اُسے جھٹ اِسی طرح اپنی بہو بنانے پر تیار ہو جاتے، صرف میری خوشی کے لیے۔ اُس ۔
مجھے اپنے لڑتے جھگڑتے والدین پر بے حد پیار آیا۔ انہوں نے ساری زندگی مجھے ہاتھ کا چھ

بنا کر پالا تھا اور پھر میرے دل اور دماغ کی جنگ کو بھی یک سر قرار سا آ گیا۔ ''زہرا میری ہو
جائے گی۔'' یہ سوچ کر ہی میرے رُوئیں رُوئیں میں سکون اور اطمینان کی ایک عجیب سی لہر
دوڑنے لگی تھی۔ تو گویا یہ محبت ہی تھی اور مجھے اس دیوی کے چرنوں میں اپنے سارے ہتھیار
ڈالنا ہی پڑے تھے، خواہ مخواہ میں نے اتنے دن تک خود کو اس دردناک عذاب سے دوچار
رکھا۔ میں ساری رات زہرا کے خیالوں میں کھویا رہا۔ پتا ہی نہیں چلا کہ کب صبح ہوئی اور کب
نوکر نے آ کر مجھے بیڈ ٹی دی۔

تیار ہو کر نیچے آیا تو مما نے بتایا کہ نہ صرف پاپا نے حاجی مقبول صاحب کو فون کر کے
اُن کے گھر آنے کی خواہش کا اظہار کیا ہے، بلکہ ہم لوگ آج سہ پہر کی چائے پر حاجی صاحب
کے گھر مدعو ہیں۔ میرے اندر ایک دم ہی جیسے ستار کے بہت سے تار جھنجھنا اُٹھے۔ حیرت کی
بات یہ تھی کہ جب تک مجھے اس جذبے کا ادراک نہیں تھا، تب تک میں اُس کی کسک اور تڑپ
سے بھی انجان تھا۔ اور اب، جب میں اس کا مسرور نشہ محسوس کر چکا تھا تو میرے لیے ایک
ایک لمحہ کاٹنا بھی دشوار ہو رہا تھا۔ دل چاہ رہا تھا کہ مما پاپا فوراً ہی مقبول صاحب کے گھر چلے
جائیں اور آج ہی واپسی پر کسی طرح زہرا کو اپنے ساتھ لے کر ہی واپس آئیں۔ خدا خدا کر کے
دن کا دوسرا پہر ڈھلا اور پاپا نے ڈرائیور کو گاڑی نکالنے کو کہا۔ میں بھی جلدی سے سیڑھیاں
پھلانگتا ہوا نیچے اُترا، لیکن پتا نہیں کیوں، میرا دل اچانک ہی بہت زور سے دھڑکنے لگا تھا۔ مما
نے میرے گال تھپتھپائے اور گاڑی میں پاپا کے ساتھ پچھلی سیٹ پر جا کر بیٹھ گئیں۔ پاپا نے
میرے جانب دیکھ کر ہاتھ ہلایا تو میرے منہ سے خود بخود نکل گیا۔ ''بیسٹ آف لک پاپا......!''

گاڑی زن سے نکل گئی اور میں وہیں لان میں اپنے بے قابو دل کی دھڑکنیں سنبھالنے
کے لیے بیٹھ گیا۔ میری حالت اس وقت پھانسی کے اُس قیدی کی طرح تھی جسے یہ پتا ہو کہ چند
گھنٹوں بعد اُسے تختۂ دار پر لٹکا دیا جائے گا۔ مجھے سادہ پانی کا گھونٹ بھی حلق سے اُتارنا
مشکل ہو گیا۔ فوراً ہی ابکائی سی آ گئی۔ وقت اپنی جگہ جیسے جامد سا ہو کر رہ گیا تھا۔ جانے کتنی
صدیوں بعد شام ڈھلی اور مغرب کے وقت تک تو مجھے یوں لگنے لگا تھا جیسے آج میرا یہ جنون
مجھے رُسوا کر کے ہی چھوڑے گا۔ اچانک ہی گیٹ کے باہر پاپا کی گاڑی کا ہارن سنائی دیا اور
چوکیدار نے جلدی سے آگے بڑھ کر گیٹ کھول دیا۔ میں گھبرا کر کھڑا ہو گیا۔ گاڑی اندر پورچ

میں آ کر رُک گئی اور مما اور پاپا نے قدم باہر رکھے، میں تقریباً دوڑتا ہوا، اُن دونوں کے پاس جا پہنچا۔ ''کہاں رہ گئے تھے آپ دونوں......؟ آخر اتنی دیر کہاں لگا دی......؟'' میں نے اُن کے اُترتے ہی سوالات کی بوچھاڑ کر دی۔ مما نہ جانے کیوں مجھ سے نظریں ملانے سے گریزاں تھیں۔ میں پاپا کی جانب لپکا ''آپ ہی کچھ بتائیے نا پاپا......کوئی مسئلہ تو نہیں ہوا نا......سب ٹھیک تو ہے نا......؟'' پاپا نے ایک گہری سی سانس لی اور میرے دونوں ہاتھ مضبوطی سے تھام لیے۔ ''ساحر بیٹا...... اُس لڑکی نے تمہارا رشتہ قبول کرنے سے انکار کر دیا ہے...... آئی ایم سوری...... ہم دونوں مل کر بھی انہیں قائل نہیں کر سکے......'' مجھے لگا، جیسے کچھ لمحوں کے لیے میری تمام سماعتیں مردہ ہوگئی ہوں، شاید میں پاپا کی بات ٹھیک سے سن ہی نہیں پایا تھا۔ بے یقینی سے انہیں پھر سے زور سے جھنجھوڑا، انہوں نے مجھے زور سے بھینچ کر گلے لگا لیا۔ ایسا وہ بچپن میں بھی تب کیا کرتے تھے جب مجھے سائیکل سے گر کر، یا کھیلتے ہوئے کوئی زوردار چوٹ لگ جاتی تھی۔ چند لمحے تو مجھے کچھ سمجھ ہی نہیں آیا۔ پھر رفتہ رفتہ جب اُن کی بات کا مفہوم واضح ہونے لگا تو چوٹ کا درد بھی دھیرے دھیرے رگوں کو کاٹنے لگا۔ میرا جی چاہ رہا تھا کہ اتنی زور سے چیخوں کہ اندر کا سارا شور ایک ہی جھٹکے میں باہر آ جائے۔ مما وہاں رُک نہیں پائیں اور آنکھیں پونچھتی ہوئی تیزی سے اندر چلی گئیں۔

لیکن کیوں......؟ زہرا نے انکار کیوں کر دیا تھا۔ میرا چند لمحوں کا ساتھ پانے کے لیے نہ جانے کتنی نازنینوں کا دل مچلتا تھا، لیکن وہ جسے میں نے عمر بھر کا ساتھ دینے کی پیش کش کی تھی، اُس نے ایک ہی لمحے میں میرا سارا غرور، سارا بھرم چکنا چور کر دیا...... کیوں...... کیا وہ مجھے بھی انہی ہزاروں عام لوگوں کی فہرست میں رکھتی تھی جو اُس کی ایک جھلک کے طلب گار ہوں گے......؟ مجھے زندگی میں پہلی مرتبہ ٹھکرائے جانے کے اذیت ناک درد کا احساس ہوا......

اس سے پہلے تو میں نے صرف جیتنا اور فتح کرنا سیکھا تھا اور میری فتوحات کی تعداد اتنی زیادہ تھی کہ اب تو مجھے نام اور چہرے بھی یاد نہیں رہے تھے۔ آج سے پہلے شاید یہ بات کسی نے میرے لیے ہی کہی تھی کہ ''وہ آیا، اُس نے دیکھا اور فتح کر لیا۔'' لیکن آج کوئی مجھے دیکھتا تو صرف اتنا کہتا ''وہ آیا، اُس نے دیکھا...... اور ہار گیا۔'' کون سوچ سکتا تھا کہ بین الاقوامی تاجر، ملک کے مشہور انڈسٹریلسٹ، فیڈرل چیمبر آف کامرس کے صدر، توصیف احمد کے بیٹے کا

رشتہ ٹھکرایا بھی جا سکتا ہے۔ میرے ذہن میں آندھیوں کے جھکڑ سے چل رہے تھے۔

پاپا نے میرا ہاتھ تھاما اور مجھے لیے لان میں بچھی کرسیوں کی طرف آ گئے اور دھیرے دھیرے سارا ماجرا گوش گزار کر دیا کہ حاجی مقبول اور اُن کے تمام گھر والے بہت وضع دار لوگ ہیں۔ مما اور پاپا کا استقبال ویسا ہی کیا گیا جیسا کہ اُن کے شایانِ شان ہو سکتا تھا لیکن لڑکی کی ماں پہلے ہی سے کچھ بجھی بجھی سی تھی۔ شاید وہ مما، پاپا کے آنے سے پہلے ہی اُن کی آمد کا مقصد جان چکی تھی، لہٰذا جب پاپا نے زہرا کو اپنی بہو بنانے کی خواہش کا اظہار کیا تو اُن کو زیادہ حیرت نہیں ہوئی۔ حاجی مقبول نے پاپا سے کہا کہ ''وہ اپنی اکلوتی بیٹی سے بے حد محبت کرتے ہیں، لہٰذا وہ اُس کی مرضی کے بغیر کوئی فیصلہ نہیں کر سکتے۔'' البتہ انہوں نے مما اور پاپا کا اس بات پر بے حد شکریہ ادا کیا کہ اتنے بڑے خاندان نے اُن کی بیٹی کو اتنی عزت دی۔ پاپا نے پھر اس بات پر اصرار کیا کہ اگر حاجی صاحب چاہیں تو اِسی وقت اپنی بیٹی کی مرضی معلوم کروا سکتے ہیں۔ مما میری تصویر لے کر گئی تھیں، انہوں نے وہ تصویر حاجی مقبول صاحب کی بیگم کے حوالے کی اور دم سادھے نتیجے کے انتظار میں بیٹھ گئیں۔ لیکن شاید زہرا کی ماں کو نتیجے کا پہلے ہی سے علم تھا، تب ہی وہ کچھ ہی لمحوں میں واپس آ گئیں۔ تب مجھے خیال آیا کہ ضروری تو نہیں کہ یہ رشتہ پہلا ہو، جو اس غزالہ کی چوکھٹ تک گیا تھا۔ مجھ سے پہلے بھی شاید یہ عمل دہرایا جا چکا ہو۔ بلکہ ایک بار نہیں، کئی بار یہ عذاب زہرا کے ماں باپ پر وارد ہو چکا ہو، تب ہی انہیں بیٹی کے انکار کا اس قدر کامل یقین تھا۔ زہرا کے انکار کے بعد مما اور پاپا کا وہاں بیٹھے رہنے کا کوئی مقصد نہیں تھا، لیکن پھر بھی مما نے ایک آخری کوشش کے طور پر زہرا سے ملنے کی خواہش کا اظہار کیا۔ زہرا کی ماں نے مما کو ساتھ لیا اور اُس کے کمرے تک جا پہنچیں اور پھر مما کو دروازے تک چھوڑ کر، خود وہیں سے واپس پلٹ گئیں، شاید مما کو زہرا سے کھل کر بات کرنے کا موقع دینے کے لیے۔ مما نے زہرا کو دیکھا تو بقول اُن کے وہ اُسے دیکھتی ہی رہ گئیں۔ اُس کا حسن ہی ایسا دل موہ لینے والا تھا، لیکن وہ دل رُبا اُس وقت بھی غم و یاس کی مکمل تصویر بنی بیٹھی تھی۔ اُس نے مما کے کچھ بولنے سے پہلے ہی ہاتھ جوڑ کر اُن سے معافی مانگ لی کہ اگر اُس کے انکار سے مما کا دل دُکھا ہے تو وہ تہِ دل سے اُن سے معذرت چاہتی ہے، لیکن اس مدعا کو مزید نہ ہی چھیڑا جائے تو بہتر ہوگا، کیونکہ اُس کا فیصلہ اٹل ہے۔ اُس نے مما کے ہاتھ تھام کر

اُن سے یہ بھی کہا کہ جو لڑکی بھی اُن کی بہو بنے گی، وہ دنیا کی سب سے زیادہ خوش قسمت لڑکی ہوگی۔ لیکن وہ خود کو اس اعزاز کے قابل نہیں سمجھتی، لہٰذا اُسے اُس کی بدنصیبی کا مزید احساس نہ دلا کر مما اُس پر احسان کریں گی۔ ظاہر ہے اس بات کے بعد مما مزید کیا کہہ سکتی تھیں۔ وہ زہرا کے سر پر ہاتھ پھیر کر اور شگون کے طور پر سونے کے جو جڑاؤ کنگن ساتھ لے کر گئی تھیں، وہ زہرا کے سرہانے چھوڑ کر چلی آئیں۔

پاپا نے مجھ سے وعدہ لیا کہ میں ایسا کوئی کام نہیں کروں گا، جس سے ہمارے، یا زہرا کے خاندان کے نام پر کوئی حرف آئے۔ میں پاپا کو کوئی جھوٹی تسلی نہیں دینا چاہتا تھا، اس لیے چپ چاپ اُٹھ کر کمرے میں آ کر بستر پر لیٹ گیا۔ اب یہ قصہ اتنی آسانی سے ختم ہونے والا نہیں تھا۔ مجھے اُسے جیتنا تھا، یا پھر اپنی ہار کی وجہ معلوم کرنی تھی۔ البتہ میں نے پاپا کی بات کا اتنا مان ضرور رکھا کہ میں نے براہ راست زہرا کے گھر جانے سے احتراز کیا۔ ورنہ میرا دل تو یہی چاہ رہا تھا کہ میں بنا کہیں رُکے، اُس کے گھر کا دروازہ کھولوں اور سیدھے جا کر اُس کے سامنے کھڑا ہو جاؤں۔ جمعرات آنے میں ابھی دو دن باقی تھے اور یہ دو دن میں نے کس طرح کاٹے، یہ میں ہی جانتا ہوں۔

تیسرے دن میں نے گاڑی نکالی اور مما کی آوازوں کی پروا کیے بنا تیزی سے گاڑی دوڑاتا ہوا ساحل کی جانب نکل پڑا۔ عبداللہ مجھے درگاہ کی سیڑھیوں پر ہی مل گیا۔ شاید وہ قریبی بستی سے اپنی ضرورت کی کچھ چیزیں لینے کے لیے درگاہ سے باہر نکلا تھا۔ مجھے دیکھ کر اُس کے چہرے پر خوشی کے تاثرات پھیل گئے۔ تب مجھے احساس ہوا کہ اُس دن بے ہوش ہونے کے بعد میں نے بے مروتی کی انتہا ہی تو کر دی تھی۔ مجھے کم از کم عبداللہ کا شکریہ ادا کرنے کے لیے تو ایک بار یہاں آنا چاہیے تھا، لیکن عبداللہ نے اپنے رویے سے ذرہ بھر بھی احساس نہیں ہونے دیا کہ ہم اتنے دن بعد مل رہے ہیں۔ میں نے عبداللہ سے کہا کہ مجھے کسی کا انتظار ہے۔ وہ اُوپر درگاہ میں میرا انتظار کرے، میں وہیں آ کر اُس سے تفصیلی ملاقات کروں گا۔ عبداللہ سر ہلا کر اُوپر چلا گیا اور میں نے وہیں پتھریلی سیڑھیوں کے پہلے پائیدان پر ڈیرہ جما لیا۔ لوگ سیڑھیاں اُترتے، چڑھتے رہے اور میں اُن کے قدموں سے اُلجھتا رہا، لیکن آج میں نے وہاں سے نہ اُٹھنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ جانے مجھے یونہی لوگوں کی ٹھوکروں میں بیٹھے کتنی دیر

گزری تھی کہ اچانک ہی دُور سے مجھے زہرا کی گاڑی ریت اُڑاتی درگاہ کی جانب آتی دکھائی دی۔ مجھے یوں لگا کہ ایک ہی لمحے میں میرے جسم کا سارا خون میری کن پٹیوں کی جانب دوڑنے لگا ہو۔ میں ہیجانی کیفیت میں کھڑا ہو گیا۔ گاڑی قریب آ کر رُک چکی تھی اور اس میں سے حسبِ معمول وہی پرانی خادمہ، زہرا کی ماں اور خود زہرا اُتر رہی تھیں۔ سب سے آگے زہرا کی ماں، پھر زہرا اور پھر سب سے پیچھے زہرا کی خادمہ دھیرے دھیرے چلتے ہوئے درگاہ کی سیڑھیوں کی طرف بڑھ رہے تھے۔ بھیڑ کی وجہ سے اُن میں سے کسی کی نظر اب تک مجھ پر نہیں پڑی تھی۔ جیسے ہی زہرا کی والدہ نے مجھے کراس کیا، میں ایک دم زہرا کے بالکل اور عین سامنے آ کر کسی چٹان کی طرح جم گیا۔ زہرا جو اپنی ہی دُھن میں سر جھکائے آگے بڑھ رہی تھی، ایک دم ٹھٹھک کر رُک گئی اور غصے میں کچھ کہنے ہی لگی تھی کہ میرے چہرے پر نظر پڑتے ہی اُس کے لفظ اُس کے سینے میں ہی گھٹ کر رہ گئے۔

میں سرسراتی ہوئی آواز میں بولا۔

"مجھے آپ سے کچھ پوچھنا ہے......"

نظر کی التجا

اُس وقت شاید خود زہرا کے وہم وگمان میں بھی نہیں ہوگا کہ میں یوں ایک دم اچانک اور سرراہ اُس کا راستہ روک لوں گا۔ چند لمحے تو وہ کچھ بول ہی نہیں پائی۔ اُس کے ماتھے پر غصے، جھنجھلاہٹ کے مارے چند شکنیں اُبھریں اور پسینے کی چند شبنمی بوندیں پھسل کر ستارہ پلکوں کو بھگو گئیں۔ زہرا کی والدہ چونکہ پہلے ہی سیڑھیاں چڑھ چکی تھیں، لہٰذا انہیں اپنے پیچھے ہوئی اس واردات کی فی الحال خبر نہ تھی۔ ویسے بھی وہاں اُس وقت زائرین کا اس قدر ہجوم تھا کہ کوئی زائر یہ بھی محسوس نہیں کر پایا کہ میں دن دہاڑے کسی عفت مآب کا راستہ روکے کھڑا ہوں۔ زہرا نے دوبارہ نگاہیں اُوپر نہیں اُٹھائیں اور اِسی طرح جھکے سر کے ساتھ لیکن لہجے میں شدید سختی لیے مجھ سے کہا ''راستہ چھوڑیں میرا...... آپ ایک اچھے گھرانے سے تعلق رکھتے ہیں آپ کو یہ سب زیب نہیں دیتا......'' میں اپنی جگہ پر جما رہا۔ ''جب تک آپ میرے سوال کا جواب نہیں دیں گی تب تک میں یہاں سے کہیں نہیں جاؤں گا۔'' اُس کی خادمہ سراسیمہ سی پیچھے کھڑی سارا ماجرا دیکھ رہی تھی۔ اُس کے ذہن میں یہ خیال بھی ضرور کھلبلی مچا رہا ہوگا کہ اُس کی بڑی مالکن اُوپر درگاہ میں صحن میں کھڑی پریشان ہو رہی ہوں گی کہ یہ دونوں پیچھے کہاں رہ گئیں؟ زہرا زچ ہو کر بولی ''آخر ایسی کون سی ضروری بات ہے جس کے لیے آپ یوں......'' میں نے درمیان ہی میں اُس کی بات کاٹ دی ''آپ نے رشتے سے انکار کیوں کیا......؟ آخر مجھ میں ایسی کون سی کمی ہے، جو آپ کو کھٹکتی ہے......؟'' ''یہ میرا ذاتی معاملہ ہے آپ میں کوئی کمی نہیں ہے...... لیکن مجھے اس بات کا پورا حق حاصل ہے کہ میں اپنی زندگی کا فیصلہ خود کروں۔'' اُس کی بات نامکمل رہ گئی اور اتنے میں بھیڑ کا ایک تیز ریلا آیا اور مجھے اپنی جگہ سے دھکیل گیا۔ زہرا کو آگے بڑھنے کا موقع مل گیا۔ خادمہ بھی اُس کے پیچھے لپکی۔ میں نے پیچھے سے چلا کر کہا، ''ٹھیک ہے، بات اگر زندگی کے فیصلے اور اس پر قائم رہنے کی ضد کی ہے تو پھر میں بھی آپ کو ہر جمعرات اسی درگاہ کی چوکھٹ پر پڑا ملوں گا۔ دیکھتے ہیں آپ کی خاموشی پہلے ٹوٹتی ہے، یا پھر

میری سانسوں کی ڈور......'' زہرا بنا پیچھے دیکھے اور بنا جواب دیے تیزی سے درگاہ کی سیڑھیاں چڑھ گئی۔ اُس وقت میرا دل چاہ رہا تھا کہ میں اس ساری دنیا کو آگ لگا دوں۔ میں اُس دن کو رو رہا تھا جب پہلی بار میرے قدم اس درگاہ کی جانب اُٹھے تھے۔ نہ میں یہاں آتا، نہ میری زہرا پہ نگاہ پڑتی اور نہ ہی آج میری یہ حالت ہوتی۔ میں تو بھکاریوں سے بھی بدتر ہو گیا تھا۔ انہیں تو پھر بھی مانگنے پر کچھ نہ کچھ مل ہی جاتا تھا، پر مجھے تو ڈھنگ سے مانگنا بھی نہیں آتا تھا۔ اِسی جھنجھلاہٹ میں اور خود کو کوستا ہوا میں جانے کب درگاہ کے احاطے میں پہنچ گیا۔

زہرا اپنی ماں کے ساتھ حسب معمول دعاؤں میں مشغول تھی۔ ایک لمحے کے لیے میرا دل پھر سے ڈوبا لیکن میں دُور گھڑوں کے پاس سائے میں بیٹھے عبداللہ کی جانب بڑھ گیا۔ عبداللہ کے سامنے بہت سی چھوٹی سیپیوں اور موتیوں کا ایک ڈھیر پڑا ہوا تھا، جن میں سے ایک ایک دانہ اُٹھا کر وہ تسبیح بن رہا تھا۔ اُس نے خوش دلی سے میرا استقبال کیا۔ ''آؤ ساحر میاں آؤ...... دیکھو میں نے تمہارے لیے یہ تسبیح بنی ہے......'' عبداللہ نے ایک چھوٹی سی مگر بے حد خوب صورت تسبیح اُٹھا کر مجھے دی۔ میں اپنے اندر کی تلخی کو اپنی زبان پر آنے سے نہ روک سکا۔ ''لیکن میں اس کا کیا کروں گا......؟ میں نے تو آج تک کبھی تسبیح پڑھی ہی نہیں......'' ''ارے تو کیا ہوا...... آج نہیں تو کل...... کل نہیں تو پرسوں...... کبھی نہ کبھی تو دل چاہے گا نا......؟...... تب تسبیح تمہارے کام آئے گی۔'' ''شاید اس کی نوبت کبھی نہ آئے...... اور پھر اگر کبھی میرا دل تسبیح پڑھنے کو چاہا بھی تو میں یوں دانوں پر گن گن کر نہیں پڑھوں گا، خدا کی یاد میں یہ مول تول کیسا......؟ اُس کی شان میں تسبیح پڑھنی ہو تو پھر یہ گنتی کیسی......؟'' عبداللہ نے چونک کر سر اُٹھایا اور پھر کچھ دیر تک مجھے عجیب سی نظروں سے دیکھتا رہا۔ ''بہت بڑی بات کہہ دی تم نے...... ہاں...... معاملہ جب اُس کی یاد کا ہو تو پھر یہ گنتی کیسی...... لیکن مجھ جیسے عام بندے تو اُس کی یاد میں بھی اس گنتی کا ڈھکوسلا شامل کر ہی دیتے ہیں...... اور پھر یہ تسبیحاں بننا تو ویسے بھی میری مجبوری ہے کیوں کہ میرے روزگار کا فقط یہی ایک ذریعہ ہے۔'' ''کیا مطلب؟ کیا تم تسبیح کی یہ مالائیں فروخت بھی کرتے ہو......؟'' عبداللہ میری حیرت دیکھ کر مسکرایا۔ ''جی ساحر میاں...... آخر اپنا اور اپنے بیوی بچوں کا پیٹ بھی تو پالنا ہوتا ہے۔'' مجھے حیرت کا ایک اور جھٹکا لگا۔ ''تمہاری بیوی اور بچہ...... کیا تم شادی شدہ ہو......؟'' ''کیوں...... اس میں حیرت کی کیا

بات ہے...... کیا میں شادی شدہ نہیں ہو سکتا......" میں گڑبڑا سا گیا...... "نہیں میرا یہ مطلب نہیں تھا...... دراصل ایسی درگاہوں اور ان میں بسنے والوں کو دیکھ کر ہمیشہ ساری دنیا تیاگ دینے والی کسی مخلوق کا خیال آتا ہے، شاید اِسی لیے مجھے حیرت ہو رہی ہے......" "جانے مجھ جیسے ہر مجاور، یا درگاہ کے متولی کو دیکھتے ہی لوگ اپنے آپ پہ کیسے باور کر لیتے ہیں کہ ہم ساری دنیا تیاگ کر یہاں آ بیٹھے ہوں گے جب کہ ہمارے مذہب میں واضح طور پر رہبانیت سے منع کیا گیا ہے۔ میں نے تمہیں پہلے بھی بتایا تھا کہ یہ درگاہ میرے سفر کا بس ایک پڑاؤ ہی تو ہے۔" "اور تمہارے بیوی بچے......؟ وہ کہاں رہتے ہیں...... شادی کب ہوئی تمہاری......"

"تین سال ہو گئے ہیں میری شادی کو...... ایک بیٹا ہے میرا...... احمد نام ہے اُس کا...... پچھلے ہفتے ہی ماشاءاللہ پورے دو سال کا ہوا ہے...... میری بیوی اور بچہ یہاں سے تقریباً ایک سو بیس کلومیٹر دُور میرے چھوٹے سے گاؤں میں رہتے ہیں۔ میں ہر پندرھواڑے پر اُن سے ملنے جاتا ہوں...... حاکم بابا مجھ پر خاص مہربان ہیں اس لیے عید، شب برأت اور دیگر چھٹیاں بھی انہیں کے ساتھ اپنے گھر میں مناتا ہوں۔" عبداللہ بولتا جا رہا تھا اور میں حیرت میں ڈوبا سن رہا تھا۔ یہ شخص ہر کروٹ پر میرے لیے اپنے اندر سے تحیر اور تجسس کی ایک پوٹلی لیے برآمد ہوتا تھا۔

میں عبداللہ کی باتوں میں اس قدر کھویا ہوا تھا کہ مجھے زہرا اور اُس کی ماں کے اُٹھنے کا پتا ہی نہیں چلا...... میں اُس وقت چونکا جب اُس عشوہ طراز کے نازک قدم میرے سامنے سے گزرے، میں نے چونک کر جلدی سے نظر اُٹھائی اور پل بھر ہی میں یہ کیا غضب ہو گیا، اُس راج ہنسنی کی ترچھی نظر بے خیالی میں میری جانب اُٹھی اور لمحے کے ہزارویں حصے میں میری رُوح کے خرمن کو جلا کر خاکستر کر گئی۔ اُس نے عبداللہ کی جانب نظر بدل کر عبداللہ کو دھیرے سے سلام کیا اور آگے بڑھ گئی اور میرے دل کو جو چند لمحوں کا قرار میسر آیا تھا، وہ سب چین، قرار اپنے ساتھ ہی لوٹ کر لے گئی۔ میرا جی چاہا کہ آگے بڑھ کر اُس کا راستہ روک لوں اور تب تک نہ جانے دوں، جب تک وہ تھک کر ہتھیار نہ ڈال دے لیکن میں اپنی جگہ سے حرکت بھی نہیں کر سکا اور وہ درگاہ کے احاطے سے نکل گئی۔ عبداللہ غور سے میرے چہرے پر آتی جاتی اس دھوپ چھاؤں کو دیکھ رہا تھا۔ اُس نے آہستہ سے کھنکار کر میرے خیالات کا تسلسل توڑ دیا۔ "میں نے ایک بات محسوس کی ہے کہ تم جب بھی اس لڑکی کو دیکھتے ہو، کسی اور ہی دنیا میں

پہنچ جاتے ہو۔ اُس دن اُسے پانی پلاتے وقت بھی تمہاری حالت کچھ ایسی ہی تھی۔" میں نے چونک کر عبداللہ کی جانب دیکھا، گویا سارے زمانے کو میری حالت کی خبر تھی، صرف میں ہی خود اپنے آپ سے بے خبر تھا۔ "سچی بات تو یہ ہے کہ میں صرف اس لڑکی کی ایک جھلک پانے کے لیے ہی آج تک اس درگاہ کے چکر کاٹتا رہا ہوں لیکن آج بھی میں اس سے اتنا ہی دُور ہوں، جتنا پہلے دن تھا۔" عبداللہ ہلکے سے مسکرایا۔ "محبت کرتے ہو اُس لڑکی سے......؟" میں نے گہری سی سانس لے کر آنکھیں بند کر لیں۔ "جانے کیا ہے...... محبت، یا کچھ اور...... اس سے بھی سوا ہے...... کبھی کبھی تو لگتا ہے کہ صرف اور صرف درد اور بے چینی کا رشتہ ہے...... میں نے اپنی پوری زندگی میں اتنی اذیت آج تک کبھی محسوس نہیں کی...... جانے یہ کیسی محبت ہے......؟ اور اگر یہی وہ جذبہ ہے جس کے اظہار کے لیے شاعروں نے دیوان کے دیوان لکھ مارے ہیں تو ایسے تمام دیوان، تمام کتب خانوں کو آگ لگا دینی چاہیے جو اس جذبے کی خوب صورتی اور حمایت بیان کرتے ہیں۔" عبداللہ میری بات سن کر ہنس دیا۔ "ارے...... ابھی سے گھبرا گئے...... شاید تم نے غالب کو زیادہ نہیں پڑھا...... چچا غالب نے تو پہلے ہی خبردار کر دیا تھا کہ

یہ عشق نہیں آساں، بس اتنا سمجھ لیجیے
اک آگ کا دریا ہے اور ڈوب کے جانا ہے

ویسے کچھ جگہوں پر تیر کر جانا بھی درج ہے......"

میں نے غور سے عبداللہ کو دیکھا "تم نے آج تک کبھی کھل کر نہیں بتایا کہ تم کتنا پڑھے ہو...... میرا مطلب ہے کوئی ڈگری وغیرہ......؟" "کیا کوئی سند ہی انسان کی شخصیت کی پہچان ہوتی ہے......؟ بہرحال تم نے تیسری مرتبہ یہ سوال پوچھا ہے تو بتائے دیتا ہوں...... میں نے اُردو ادب میں ماسٹرز کیا ہے۔" یہ ایک اور جھٹکا تھا جو اُس دن میں نے سہا۔ ویسے عبداللہ کے معاملے میں تو اب تک مجھے ان سرپرائزز کا عادی ہو جانا چاہیے تھا لیکن میں پھر بھی چونکنے سے باز نہیں آتا تھا۔

اُس جمعرات کے بعد میرا یہ معمول ہو گیا تھا کہ ہر جمعرات خصوصی طور پر زہرا کو دیکھنے اور اُس کی راہ میں بیٹھ کر اپنا سوال پھر سے دہرانے کے لیے درگاہ کے دروازے پر اُس وقت تک کھڑا رہتا جب تک وہ وہاں سے اندر داخل نہ ہوتی...... البتہ اب میں نے اُس کا راستہ

روکنے، یا اُس سے کوئی بات کرنے کی کوشش کا عمل ترک کر دیا تھا۔ زہرا کی ماں کو بھی اب اس حقیقت کا ادراک ہو چکا تھا کہ میں خاص زہرا کے لیے ہی ہر جمعرات درگاہ کی سنگی سیڑھیوں پر ڈیرہ جماتا ہوں اور خاموشی سے اُس وقت تک وہاں بیٹھا رہتا ہوں جب تک وہ نیلم پری درگاہ سے واپس لوٹ نہیں جاتی۔ پہلی مرتبہ تو زہرا کی والدہ مجھے وہاں اس اُجڑی حالت میں بیٹھا دیکھ کر بالکل گھبرا سی گئیں، میری شیو بہت بڑھ چکی تھی اور جینز اور شرٹ بھی بالکل ملگجی ہو رہی تھیں۔ اُن کی آنکھیں بھر آئیں۔ منہ سے کوئی لفظ نہیں نکل سکا اور بہت دیر تک گم صم کھڑی رہیں۔ میں اُن سے نظر نہیں ملا پایا اور وہ میرے سر پر ہاتھ رکھ کر سیڑھیاں چڑھ گئیں۔ لیکن اگر میں زہرا کی ماں سے نظر نہیں ملا پایا تھا تو دوسری جانب زہرا بھی میری طرف دیکھنے سے احتراز کرتی اور تیزی سے آگے بڑھ جاتی۔ رفتہ رفتہ میری نظر کی اس التجا اور زہرا کی نظر کے اس بے رحم احتراز کا یہ کھیل ہمارا معمول ہی بنتا گیا۔ ایک جمعرات کے بعد دوسری جمعرات آتی گئی اور میں اپنی ہر التجا، اپنی ہر بے بسی اور اپنی ہر طاقت اپنی اس ایک نظر میں سموتا گیا جو درگاہ کی ان سیڑھیوں پر بیٹھے ہر جمعرات میں اس سنگ دل کے قدموں میں نچھاور کرتا تھا لیکن اس سنگ مرمر کی مورت کو پگھلنا تھا، نہ وہ پگلی۔ لیکن میں نے بھی نظر کی اس خاموش جنگ کو اس کے منطقی انجام تک لڑنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ میری پڑھائی، دوست اور رنگا رنگ زندگی کی ہر خوشی، مصروفیت مجھ سے چھن چکی تھی۔ مما اور پاپا دن رات میری حالت دیکھ کر کڑھتے اور جلتے رہتے تھے۔ لیکن وہ دونوں بھی میری ضد اور جنون سے اچھی طرح واقف تھے، اس لیے مما کے دن رات بہتے ہوئے آنسو بھی مجھے میری دیوانگی کی راہ سے نہیں ہٹا سکے۔

پھر ایک جمعرات اک عجیب سی بات ہوئی۔ اب میں نے درگاہ کے اندر جانا تقریباً موقوف ہی کر دیا تھا اور زہرا کے آنے سے پہلے درگاہ کی بیرونی سیڑھیوں پر بیٹھ جاتا تھا۔ جب زہرا آ کر اُوپر درگاہ میں چلی جاتی، تب بھی اُس وقت تک باہر ہی بیٹھا رہتا اور زہرا کی واپسی کا انتظار کرتا۔ وہ پلٹ کر واپس چلی جاتی تو میں اپنے گھر کی راہ لیتا۔

ایک ایسے ہی دن، میں تپتی دھوپ میں بیٹھا زہرا کی راہ تک رہا تھا اور جانے کن خیالوں میں کھویا ریت پر آڑی ترچھی لکیریں کھینچ رہا تھا...... کہ اچانک ایک کڑک دار آواز سن کر چونک کر نظریں اُٹھائیں۔ کچھ دیر تک تو سورج کی کرنوں سے چندھیائی ہوئی میری نظریں اُس

شخص کے خاکے کو پہچان ہی نہیں پائیں، جو میرے سر پر کھڑا اشعر پڑھ رہا تھا

؎ تیرا چہرہ ہے جب سے آنکھوں میں
میری آنکھوں سے لوگ جلتے ہیں

اور جب اُس شخص کا چہرہ واضح ہوا تو میں حیرت سے اُچھل ہی تو پڑا، وہ حاکم بابا تھا۔ آج اُن کی آنکھوں سے اس روایتی جلال کی جگہ ایک عجیب سی نرمی چھلک رہی تھی۔ میں گھبرا کر کھڑا ہو گیا۔ انہوں نے شفقت سے میرے سر پر ہاتھ پھیرا اور کچھ دیر تک مجھے غور سے دیکھتے رہے۔ میں نے حسب معمول اُن کی آنکھوں کی چمک کی تاب نہ لا کر اپنی آنکھیں جھکا لیں۔ ''تو اندر کیوں نہیں آتا لڑکے...... یہاں باہر کیا بازار سجا رکھا ہے......؟ کسے بھسم کرنا چاہتا تھا......؟ وہ تو خود جل کر پہلے ہی راکھ ہو چکی ہے۔'' میں نے چونک کر نظر اُٹھائی...... گویا انہیں بھی میرے فسانے کا علم تھا۔ پتا نہیں اور کتنے لوگ ہوں گے جو میری اس وحشت سے واقف ہوں گے۔ صرف اُسی کو اب تک خبر نہ ہو سکی تھی جس کے لیے میرا یہ سارا جنون تھا۔ میں نے دھیرے سے سر جھکا کر انہیں جواب دیا۔ ''میرا دل نہیں چاہتا اندر آنے کو...... اور پھر اُس دن آپ نے ہی تو کہا تھا کہ اپنے نفس کے پیچھے بھاگنے والوں کے لیے اس درگاہ کے احاطے میں کوئی جگہ نہیں ہے۔'' حاکم بابا مسکرائے ''لگتا ہے تو نے ہماری بات دل پہ لے لی ہے...... چل آج سے ہم خود تجھے اجازت دیتے ہیں، جب کبھی دل چاہے تو اُوپر آ جانا...... پر یاد رکھ...... دل کسی کا دوست نہیں ہوتا...... اس کی نہ دوستی بھلی اور نہ ہی دشمنی اچھی......'' حاکم بابا کا یہ روپ میں نے آج تک کبھی نہیں دیکھا تھا۔ اتنی نرمی، حلاوت تو کبھی نہ تھی اُن کے لہجے میں۔ وہ یونہی مسکراتے ہوئے اپنے چند مریدوں کے ساتھ اُوپر درگاہ کی جانب بڑھ گئے۔ کچھ ہی دیر میں اُوپر سے ایک زائر ہاتھ میں ایک رقعہ اور چند کھجوریں لے کر نیچے اُترا اور دونوں چیزوں کو میرے حوالے کر کے واپس لوٹ گیا۔ میں نے خط کھولا تو عبداللہ کی تحریر تھی ''کہو ساحر میاں......؟ آخر ہمارے حاکم بابا پر بھی اپنا سحر پھونک ہی ڈالا؟ یہ چند کھجوریں خود انہوں نے تمہارے لیے بھجوائی ہیں...... کہتے ہیں اُس دل جلے کے لیے بھجوا دو، جو نیچے دھوپ میں بیٹھا سورج کے ساتھ اپنے مقدر کی جنگ لڑ رہا ہے...... بھئی واہ...... ایسی مہربانی تو آج تک حاکم بابا نے ہم میں سے کسی پر بھی نہیں کی...... جیتے رہو......

تمہارا دوست......عبداللہ"

عبداللہ کی تحریر نے چاہے چند لمحوں کے لیے ہی سہی، میرے ہونٹوں کو ایک ہلکی سی مسکراہٹ ضرور بخش دی تھی۔ اُس نوجوان کو گفتگو کا نایاب فن آتا تھا اور سب سے زیادہ آسانی اور سہولت سے ہم اگر کسی دوسرے کو کوئی خوشی دے سکتے ہیں تو وہ ہماری باتیں ہی تو ہیں۔ سچ ہے کہ یہ صرف لفظ ہی ہیں، جو سب کچھ بنانے اور بگاڑنے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ میں ابھی عبداللہ کی تحریر کے تانے بانے ہی میں اُلجھا ہوا تھا کہ اچانک ہی مجھے اُسی تیزی سے پروائی کے چلنے کا احساس ہوا جو ہمیشہ مجھے زہرا کی آمد کے وقت محسوس ہوتی تھی۔ میں نے چونک کر سر اُٹھایا تو اُس زہرا جبیں کی گاڑی آ کر رُک چکی تھی اور وہ اپنی خادمہ کے ساتھ گاڑی سے اُتر کر سیڑھیوں کی جانب بڑھ رہی تھی۔ لیکن آج زہرا کی ماں اُس کے ساتھ نہیں تھی۔ نہ جانے کیوں......؟ میں حسب معمول اور حسب توقع اس انتظار میں اُس کی جانب دیکھ رہا تھا کہ کب وہ ہمیشہ کی طرح میری نظر سے بچتی ہوئی اور بنا میری طرف دیکھے، درگاہ کی سیڑھیاں چڑھتی ہے۔ لیکن یہ دیکھ کر تو میرے جسم سے جیسے ساری جان ہی نکل گئی کہ اُس کا رُخ سیدھا میری ہی جانب تھا۔ وہ غصے میں تنتناتی ہوئی میری جانب بڑھی چلی آئی اور عین سامنے آ کر کھڑی ہو گئی اور پھر اُس کے یاقوتی لب ہلے......" آخر آپ مجھ سے چاہتے کیا ہیں......؟...... اس طرح مجھے بدنام کر کے آپ کو کیا مل جائے گا......؟؟"

رقیب

اتنی صدیوں کے بعد اُس نازک ادا کے نازک لب ہلے بھی تو ایک شکوے کے لیے...... غصے سے اُس کا چہرہ سرخ ہو رہا تھا اور پلکیں لرز رہی تھیں۔ میری نظر چند لمحوں کے لیے اُس کی نظر سے ٹکرائی تو اُس نے جھجک کر اپنی پلکیں جھکا لیں۔ " یہ آپ سے کس نے کہا کہ مجھ جیسا سرِ راہ بیٹھا دیوانہ بھی کبھی کسی کی بدنامی کا باعث بن سکتا ہے......؟ اور پھر آپ کو بدنام کرنا ہی میرا مقصد ہوتا تو میں یہاں اس درگاہ کے باہر بیٹھنے کے بجائے آپ کے گھر کے باہر اپنا ڈیرا جماتا...... یہاں تو آس پاس مجھ جیسے جانے اور کتنے مقدر جلے اپنی اپنی قسمت کی دھوپ سینک رہے ہیں...... پھر آپ کو مجھی سے شکوہ کیوں ہے......؟"

وہ غصے سے بولی" آپ اچھی طرح جانتے ہیں کہ مجھے یہ شکایت کیوں ہے۔ آپ کی اس ضد اور ہٹ دھرمی کی وجہ سے امی اتنی پریشان ہوگئی ہیں کہ انہوں نے بستر پکڑ لیا ہے۔ وہ اتنی بیمار ہیں کہ آج میرے ساتھ درگاہ تک آنے کی طاقت نہیں تھی اُن میں...... آپ کیا سمجھتے ہیں کہ یہاں آس پاس بسنے والے سبھی لوگ بہرے، گونگے، یا اندھے ہیں، جنہیں کچھ نظر نہیں آتا......؟ افسوس تو اس بات کا ہے کہ آپ نے ایک غلط مقصد کے لیے اس درگاہ جیسی پاک جگہ کا انتخاب کیا ہے...... شاید آپ مجھے رُسوا کر کے اپنی اس ہزیمت کا بدلہ چکانا چاہتے ہیں جو آپ کی 'ناقص رائے' میں میرے انکار کی وجہ سے آپ کو اُٹھانا پڑی ہے۔" اُس کے لفظوں کی کئی آریاں میرے دل پر چل گئیں۔ گویا میری ساری تپسیا کو ایک گھٹیا انتقام کا نام دیا جا رہا تھا۔ وہ ایسا کیسے سمجھ سکتی تھی۔ میں اپنے جذبے کی تذلیل پر ایک لمحے کے لیے جیسے سب کچھ بھول گیا اور ایک جھٹکے سے کھڑے ہو کر اُس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دل ہی باہر اُلٹ دیا۔" مجھے آپ کی والدہ کی پریشانی اور بیماری کا سن کر نہایت افسوس ہوا ہے۔ کاش میں بھی آپ کی طرح اپنی اس ساری بربادی کا الزام آپ پر ڈال سکتا۔ لیکن افسوس میں تو اتنا مجبور ہوں کہ آپ کو موردِ الزام بھی نہیں ٹھہرا سکتا۔ یہ جو کچھ بھی ہو رہا ہے، اس پر خود میرا اختیار نہیں

ہے۔ مجھے کون سا جذبہ کھینچ کر یہاں لا بٹھاتا ہے، میں خود اس سے اب تک اَن جان ہوں
کاش میرا اپنے آپ پر کوئی اختیار ہوتا تو میں کبھی خود کو یوں سرِ بازار رُسوا نہ ہونے دیتا۔"
مزید زِچ ہوگئی۔ "لیکن یہ تو زبردستی ہے۔ آپ کا جذبہ کسی دھونس دھمکی کی طرح میری راہ میں
رکاوٹیں کھڑی کر رہا ہے۔ بات اگر اختیار کی ہے تو میں خود بھی بے اختیار ہوں اور آپ میرا
بے خودی کے راستے میں زبردستی آ کھڑے ہوئے ہیں۔" مجھے اُس کم گو سے اتنی بات کی اُم
بھی نہ تھی لیکن خلاف توقع اُس کے پاس لفظوں کا ذخیرہ وسیع تھا۔ "آپ میرے سوال
جواب دے دیں، میں آپ کی راہ سے ہٹ جاؤں گا۔" لیکن اُس نے بھی جیسے میری ضد
سامنے ہتھیار ڈالنے سے پہلے اپنی شرط منوانے کا تہیہ کر رکھا تھا۔ "ٹھیک ہے لیکن آپ کو بھ
ایک وعدہ کرنا ہوگا کہ میرے جواب کے بعد آپ کوئی دوسرا سوال نہیں کریں گے اور آئند
میری راہ میں اپنے کسی جذبے کی دیوار نہیں کھڑی کریں گے۔" میں جانتا تھا کہ وہ کسی بھ
جواب سے پہلے میرے اردگرد اپنے بھرم کا آہنی قلعہ ضرور تعمیر کرے گی لیکن اُس کی بات ما
لینے کے علاوہ اس وقت میرے پاس اور کوئی چارہ بھی تو نہیں تھا۔ "ٹھیک ہے...... میں وعد
کرتا ہوں۔" ہمارے اردگرد زائرین کا ہجوم سیڑھیاں چڑھ اور اُتر رہا تھا اور آس پاس عصر
وقت درگاہ پر دی جانے والی ایک مخصوص جڑی بوٹی کا دھواں پھیلا ہوا تھا۔ ہم اتنی دیر
وہیں درگاہ کے باہر کھڑے باتیں کر رہے تھے لیکن وہاں کسی کو ہم پر توجہ دینے کی فرصت
کہاں تھی۔ زہرا نے نقاب اپنے چہرے پر ڈال کر اُسے پوری طرح ڈھک لیا۔ "میں نے آپ
کو پہلے بھی کہا تھا کہ آپ کے رشتے سے انکار کی وجہ آپ کی ذات میں کوئی کمی، یا خرابی نہیں
ہے۔ آپ ایک اعلیٰ خاندان سے تعلق رکھتے ہیں، پڑھے لکھے ہیں اور کسی بھی لڑکی کی خوش بخ
ہوگی کہ وہ آپ کے گھر کی بہو بن سکے لیکن میری قسمت میں کاتبِ تقدیر نے یہ سکھ نہیں لکھا
میری نظر میں کوئی اور سما چکا ہے اور دل کے سودوں میں زبردستی نہیں چلتی ساحر صاحب......
اُمید ہے آپ کو اپنے سوال کا جواب مل گیا ہوگا اور اب آپ بھی اپنا وعدہ پورا کریں گے۔
میرے دل پہ جیسے ایک ہی لمحے میں کئی قیامتیں آ کر گزر گئیں۔ میں وہیں کھڑے کا کھڑا رہ گ
اور وہ جانے کب کی سیڑھیاں چڑھ کر آگے بڑھ چکی تھی، حالانکہ میں گزشتہ کئی ہفتوں سے اُ
یہاں اپنی کسی منت کے سلسلے میں آتے جاتے ہوئے دیکھ رہا تھا اور اُس کی حالت ابتر، خود اُ

کا فسانہ سناتی تھی کہ ہو نہ ہو، معاملہ یہاں بھی کچھ دل کا ہی ہے۔ لیکن آج اُس کی زبانی اس
کھلے اقرار نے جیسے میرے وجود کے اندر آگ سی بھر دی تھی۔ اس اَن دیکھے رقیب کی رقابت
اور رشک کے ملے جلے جذبات نے میرے دل میں ایک طوفان سا برپا کر دیا تھا۔ کیا کوئی اس
دنیا میں اتنا خوش نصیب بھی ہو سکتا ہے، جس کے لیے زہرا جیسی پری، خود منت مانگنے کے لیے
اس درگاہ تک چل کر آتی ہے......؟ وہ گل رُخ تو خود کسی منت کی طرح تھی تو وہ کیسا ہوگا جس
کے لیے یہ منت خود اپنے گھٹنے ٹیکے اس درگاہ کی سنگِ مرمر کی جالی سے جبیں زخمی کرنے ہر ہفتے
چلی آتی ہے؟ وہ کون ہو سکتا ہے جس کا پتھر دل اس موم کی لڑکی کی پگھلتی حالت دیکھ کر بھی نہیں
پگھلتا۔ میں انہی سوچوں میں گم تھا کہ اُوپر سے ایک زائر نے آ کر عبداللہ کا پیغام دیا کہ اُوپر
سلطان بابا آئے ہوئے ہیں اور میرا پوچھ رہے ہیں۔ لہٰذا میں بھی دھیرے دھیرے سیڑھیاں
چڑھتا ہوا درگاہ کے صحن میں داخل ہو گیا۔ دھوپ ڈھلنے والی تھی اور درگاہ کے صحن میں سائے
لمبے ہو رہے تھے۔ ایسے ہی ایک سائے میں سلطان بابا، عبداللہ اور حاکم بابا مریدوں کے
جھرمٹ میں بیٹھے نظر آئے۔ زہرا بھی خواتین والی بھیڑ میں سامنے بیٹھی نظر آئی۔ سبھی عورتوں
نے سخت پردے کا اہتمام کر رکھا تھا۔ عبداللہ نے مجھے ہاتھ کے اشارے سے قریب آنے کو کہا
اور میں بھی مریدوں کے گروہ میں ایک طرف ہو کر بیٹھ گیا۔ سلطان بابا کوئی درس دے رہے
تھے اور اُن کی بارُعب آواز سارے صحن میں گونج رہی تھی۔ "گویا سارا جھگڑا ہی اس بات کا
ہے کہ انسان پہلے وجود میں آیا تھا، یا مذہب......؟ ڈارون کی تھیوری کہتی ہے کہ انسان کا ارتقا
پہلے ہوا اور وہ بھی ایک طویل جدوجہد کے بعد...... اور جب انسان کی موجودہ ہیئت میں اس کی
کمر سیدھی ہوئی اور ہاتھوں اور پیروں نے اپنی موجودہ ساخت اختیار کی تو پھر دھیرے دھیرے
مذہب کا ارتقا شروع ہوا...... ہم مسلمان حضرت آدم وحوا کی صورت میں اس عقیدے کے قائل
ہیں کہ انسان کا وجود ہی مذہب کی وجہ سے ہے اور وہ مذہب کے لیے اس کائنات میں ظہور
پذیر ہوا تھا۔ گویا مذہب انسان کی آمد سے قبل بھی کائنات میں رائج تھا اور جن اور فرشتے اپنی
عبادت کے ذریعے اس مذہب کی تعمیل میں مشغول رہتے تھے۔

ے دردِ دل کے واسطے پیدا کیا انساں کو
ورنہ اطاعت کے لیے کچھ کم نہ تھے کرّ و بیاں"

میں بہت غور سے سلطان بابا کی باتیں سنتا رہا، جس خوب صورتی سے انہوں نے ڈارو
کے نظریے اور مذہب کی آمد کے بارے میں دلائل دیئے تھے، وہ اُن کے وسیع مطالعے کا م
مظہر تھی۔ میں جب سے اس درگاہ میں آ جا رہا تھا، عبداللہ اور سلطان بابا جیسے نہ جانے کت
''پُراسرار بندوں'' سے اب تک میرا سامنا ہو چکا تھا جو بظاہر سیدھے سادے لیکن اندر سے کہ
سمندر سے بھی زیادہ عمیق اور گہرے تھے۔ کچھ ہی دیر میں سوال جواب کا سلسلہ شروع ہو گیا
بھیڑ میں سے ایک ماڈرن وضع کا لیکن بہت جوشیلا نوجوان اُٹھا اور اُس نے پہلا سوال دا
دیا۔ ''حضرت آپ کی باتیں اپنی جگہ بجا لیکن ہمارے مذہب میں تو شرک کو گناہ عظیم سے ب
عظیم تر گردانا گیا ہے تو پھر کیا آپ نہیں سمجھتے کہ اس طرح ان درگاہوں پر آ کر منتیں مانگنا ا
چادریں چڑھانا بھی اُسی شرک کے زمرے میں آتا ہے؟'' ''ٹھیک کہا تم نے...... جو لوگ یہا
اس نیت سے آتے ہیں کہ یہاں قبر میں سویا بزرگ ہی اُن کا مشکل کشا ہے اور وہی اُن
دادرسی کرے گا تو وہ واقعی اس گناہ عظیم کے مرتکب ہو رہے ہیں جسے ''شرک'' کہا جاتا ہے
خدا انہیں اس گناہِ کبیرہ سے بچنے کی توفیق عطا کرے۔ ہاں البتہ جو لوگ اس آس پر یہاں آ
گڑگڑاتے ہیں کہ وہ اللہ کے ایک عاجز بندے کے آستانے پر اس اُمید پر آئے ہیں کہ اللہ
یہ نیک بندہ، جو اس قبر میں آنکھیں بند کیے پڑا ہے، شاید اسی کے وسیلے اور سفارش سے اللہ ا
کی بھی سن لے گا اور اُن کی حاجت روا ہو گی تو ایسی حاضری میں کوئی حرج نہیں ہے۔ کیوں
بہرحال میرا، تمہارا، اس درگاہ میں دفن اس نیک بندے کا اور ہم سب کا مالک ایک ہی
میرا اللہ......''

نوجوان کے تنے ہوئے چہرے پر اطمینان کے آثار پیدا ہو گئے اور اُس کی آنکھوں
سختی یکایک سلطان بابا کے لیے عقیدت میں بدل گئی۔ پھر کچھ اور معمول کے سوال کیے گئے ا
اس سے پہلے کہ سلطان بابا دعا کے لیے ہاتھ اُٹھاتے، عورتوں کی بھیڑ میں سے زہرا کی خاد
نے ہلکے سے سلطان بابا کے خاص مرید کے کان میں کچھ کہا۔ مرید نے اُٹھ کر سلطان بابا
عرض کی۔ ''اللہ کی ایک بندی آپ سے اپنے لیے خاص دعا کی متمنی ہے۔'' سلطان بابا کے
چہرے پر بھر سے ایک مبہم سی مسکراہٹ اُبھری اور انہوں نے غور سے خادمہ کی جانب دیکھ
کہا۔ ''میری دعاؤں میں اثر ہوا تو ضرور قبول ہوں گی۔ بہرحال ایک بات ابھی سے جان

بہت ضروری ہے، یاد رہے کہ کسی کو پا لینا کبھی کبھی اُس کو کھو دینے سے بڑا غم ہوتا ہے......
دوسرے لفظوں میں یوں سمجھ لو کہ وصل، جُدائی سے بڑا المیہ ہے۔'' میں نے چونک کر سلطان
بابا کی طرف دیکھا۔ کتنی بڑی بات کہہ ڈالی تھی انہوں نے اور کہیں اُن کا اشارہ میری جانب ہی
تو نہیں تھا۔ اِسی لمحے سلطان بابا نے بھی پلٹ کر میری جانب دیکھا۔ میں نے گھبرا کر نظریں
جھکا لیں۔ وہ مجھ سے بولے ''ساحر میاں......! شاید تم کچھ کہنا چاہتے ہو؟'' تو گویا میرا نام بھی
انہیں زبانی یاد تھا۔ میں نے اُن کی جانب براہ راست دیکھنے سے حسب معمول گریز کیا۔ مجھے
حیرت بھی ہوئی کہ انہیں میرے اندر کی بات کا علم کیسے ہو گیا۔ ''جی...... یونہی...... اچانک دل
میں کچھ خیال آ گیا تھا، آپ کی اجازت ہو تو عرض کروں؟'' سلطان بابا نے سر ہلایا۔ ''بسم
اللہ......!'' میں نے دُور بیٹھی زہرا کی جانب دیکھا، وہ سر پر چادر ڈالے جھکے سر بیٹھی تھی۔ میں
نے سینے کا غبار باہر نکالنے کا فیصلہ کر لیا تھا، کلام کسی اور کا تھا لیکن معنی میرے تھے۔

اک تازہ حکایت ہے
سن لو تو عنایت ہے
اک شخص کو دیکھا تھا
تاروں کی طرح ہم نے
اک شخص کو چاہا تھا
اپنوں کی طرح ہم نے
اک شخص کو سمجھا تھا
پھولوں کی طرح ہم نے
کچھ تم سے ملتا تھا
باتوں میں، شباہت میں
ہاں تم سا ہی لگتا تھا
شوخی میں، شرارت میں
دِکھتا بھی تمہی سا تھا
دستورِ محبت میں

وہ شخص، ہمیں اک دن
غیروں کی طرح بھولا
تاروں کی طرح ڈوبا
پھولوں کی طرح ٹوٹا
پھر ہاتھ نہ آیا وہ
ہم نے تو بہت ڈھونڈا
تم کس لیے چونکے ہو
کب ذکر تمہارا ہے؟
کب تم سے تقاضا ہے؟
کب تم سے شکایت ہے؟
اک تازہ حکایت ہے
سن لو تو عنایت ہے

میں ایک جذب کے عالم میں نہ جانے کیا کچھ کہتا گیا۔ جب ہوش آیا تو ماحول پر سناٹا طاری تھا۔ زہرا اُسی طرح سر جھکائے بیٹھی ہوئی تھی اور باقی سارے مرید بھی خاموش تھے۔ پھر سلطان بابا کی ہلکی سی کھنکار نے ہی اس سکوت کو توڑا اور انہوں نے دھیرے سے زیرلب ''سبحان اللہ'' بھی کہا اور پھر محفل برخاست ہوتے سے پہلے حتمی دعا کے لیے ہاتھ اُٹھا لیے۔ باقی لوگوں نے بھی اُن کی تقلید کی اور مختصر سی دعا کے بعد سارا مجمع منتشر ہوگیا۔ وہ خوش ادا بھی اپنی تمام تر نزاکت کے ساتھ سلطان بابا سے دعائیں لیتی ہوئی قدم بڑھا گئی۔ ایک لمحے کے لیے تو میرا دل جیسے کٹ سا گیا۔ من میں آیا کہ دوڑ کر ایک بار پھر سے اُس کی راہ کی دُھول بن جاؤں اور اُس سے درخواست کروں کہ مجھے اپنے انہی نازک قدموں تلے روند کر برباد کر ڈالے لیکن میں کچھ بھی نہ کرسکا۔ ابھی کچھ دیر پہلے ہی میں نے خود ہی اُس سے اپنے جنوں کے سامنے بند باندھنے کا وعدہ کیا تھا۔ کچھ ہی دیر میں درگاہ کا صحن تقریباً خالی ہوگیا۔ میں بھی ایک ہارے ہوئے جواری کی طرح وہاں سے اُٹھا اور عبداللہ سے اجازت لے کر واپسی کے لیے پلٹ کر چل دیا۔

اچانک پیچھے سے ایک آواز اُبھری۔

؎ کھلتا کسی پہ کیوں، میرے دل کا معاملہ
شعروں کے انتخاب نے رُسوا کیا مجھے

میں چونک کر مڑا۔ درگاہ کے صحن کے عین وسط میں سلطان بابا اپنی وہی دل موہ لینے والی مسکراہٹ لیے کھڑے تھے۔ ''ساحر میاں......! واپس چل دیئے......؟ تم سے ایک ضروری کام تھا مجھے۔'' سلطان بابا کو بھلا مجھ سے کیا کام ہوسکتا تھا......؟ میرے ذہن میں ایک ساتھ بہت سے خدشے اُبھرے۔ وہ دھیرے دھیرے چلتے ہوئے میری جانب ہی چلے آرہے تھے۔ میں اپنی جگہ پر ہی جیسے جم سا گیا۔

پہلی کھوج کا خضر

میں ابھی تک اِسی کشش و پنج میں مبتلا تھا کہ آخر ایسی کون سی ضروری بات ہو سکتی ہے اور پھر میں بھلا سلطان بابا کے کس کام آ سکتا تھا۔ سلطان بابا نے غالباً میرا چہرہ پڑھ لیا...... ''تم سوچتے بہت ہو ساحر میاں...... لیکن شاید تمہیں ابھی تک سپردگی کی طمانیت کا اندازہ نہیں ہے......'' میں نے حیرت سے اُن کی جانب دیکھا۔ ''سپردگی کی طمانیت......؟'' ''ہاں میاں...... جو سکون اور اطمینان خود کو دوسرے کے فیصلے کے سپرد کر دینے میں ہے...... وہ بھلا اپنی جدوجہد اور کوشش میں کہاں...... بہتر یہی ہے کہ کسی کو اپنا راہبر مان لو اور پھر اُسی خضر کی راہ پکڑ لو......'' ''کاش میں بھی اُن خوش نصیبوں میں شامل ہوتا، جنہیں ایسے راہبر میسر آتے ہیں، یہاں تو میری منزل ہی کا کوئی ٹھکانہ نہیں۔ ابھی تو میں اپنی راہ بھی نہیں ڈھونڈ پایا، راہِ خضر تو بہت دُور کی بات ہے۔'' سلطان بابا نے میرے کاندھے پر ہاتھ رکھ کر غور سے میری آنکھوں میں جھانکا ''تمہارے اندر بڑی کھوج ہے اور تمہاری یہ کھوج تمہیں تمہاری اصل راہ سے زیادہ دیر تک دُور نہیں رکھ پائے گی...... میرا ایک کام کرو گے......'' ''جی حکم کیجیے......'' ''اگلی جمعرات کو ایک دن کے لیے میں عبداللہ کو اپنے ساتھ کسی خدمت پر لے جانا چاہتا ہوں کیا تم اگلی جمعرات یہاں درگاہ پر چند گھنٹے کی ڈیوٹی دے پاؤ گے...... کام کچھ زیادہ سخت نہیں ہے...... کچھ مستقل حاجت مند ہیں جو ہر ہفتے درگاہ میں حاضری دیتے ہیں، اُن تک کچھ خاص ہدایات پہنچانی ہوں گی۔ کچھ نذر نیاز جو جمعرات کو یہاں جمع ہوتی ہے اُسے مستحق لوگوں میں بانٹنا ہوگا اور کچھ اور اِسی نوعیت کے چھوٹے موٹے کام سرانجام دینا ہوں گے۔ اگر تمہاری اگلی جمعرات کو کوئی خاص مصروفیت نہ ہو تو......'' ''جی ضرور میں اگلی جمعرات کو صبح سویرے حاضر ہو جاؤں گا۔'' سلطان بابا خوش ہو گئے۔ ''شاباش...... لیکن جمعرات سے پہلے کسی ایک دن آ کر عبداللہ سے ساری ہدایات اچھی طرح سمجھ لینا۔'' سلطان بابا مجھے دعا دیتے ہوئے آگے بڑھ گئے۔

میں درگاہ کے دروازے سے باہر نکلا تو سیڑھیوں سے نیچے اپنی کار کے قریب عینی کو کھڑا

دیکھ کر ٹھٹکا سا گیا۔ ہم دونوں ایک دوسرے کی جانب بڑھے اور ہمارا سنگم درگاہ کی سیڑھیوں کے وسط میں ہوا۔ عینی کچھ دیر تک چپ چاپ میری ابتر حالت، بڑھی ہوئی شیو اور شکنوں بھرا لباس دیکھتی رہی۔ ''میں جانتی تھی تم مجھے یہیں ملو گے۔'' میں نے اُس کا دھیان بٹانے کے لیے مسکرا کر اُسے چھیڑا، ''اور میں جانتا تھا کہ تم مجھے ضرور ڈھونڈ لو گی......'' لیکن عینی کے چہرے کا کرب کم نہیں ہوا۔ ''ڈھونڈ ہی تو نہیں پائی تمہیں...... بس ہر لمحہ کھوتی ہی گئی...... اور آخر کار تمہیں مکمل کھو ہی دیا......'' ''لیکن میں تمہیں ان لوگوں میں نہیں سمجھتا عینی...... جو محبت کو بھی صرف سود و زیاں ہی کا سودا سمجھتے ہیں...... کبھی کبھی تو یہ درد بھی بن مانگے نہیں ملتا...... کبھی فرصت ملے تو بیٹھ کر سوچنا کہ ہماری دوستی میں تم نے کیا صرف کھویا ہی ہے......؟'' عینی نے ایک لمبا سا سانس لیا۔ ''اُدھوری خوشی کبھی کبھی مکمل غم سے بھی زیادہ اذیت ناک ہوتی ہے ساحر...... بہرحال تمہاری زبان سے ایسی باتیں سن کر اچھا لگا...... شاید یہ بھی اُس ہستی کی دین ہے...... میں اُس کی ایک جھلک دیکھنے کے لیے مر رہی ہوں، ضرور وہ کوئی پری زاد ہوگی جس کے لیے تم جیسے شخص نے بھی زمانے سے جوگ لے لیا ہے...... مجھے کب ملواؤ گے اُس سے......؟'' ''ضرور ملواؤں گا...... پہلے وہ مجھے تو شرفِ قبولیت بخش دے۔'' ''لیکن شاید تب تک بہت دیر ہو جائے ساحر...... میں نے کینیڈا کا اسکالرشپ حاصل کر لیا ہے۔ اگلے ہفتے میری روانگی ہے۔ میں اس ماحول، ان یادوں اور خود اپنے آپ سے کچھ عرصے کے لیے فرار چاہتی ہوں۔'' عینی بولتے بولتے سسک پڑی۔ مجھ سے بھی کچھ نہ بولا گیا۔ یہ محبت بھی کتنا عجیب جذبہ ہو ہے لوگ خوشی پانے کے لیے اس جذبے پر اپنے دل کے در وا کرتے ہیں اور پھر ساری زندگی روتے ہی رہتے ہیں۔ عینی پھر وہاں زیادہ دیر رُک نہیں پائی اور مجھ سے رُخصت ہو کر پلٹ گئی۔ میں اُس کے جانے کے بعد بھی بہت دیر تک وہیں ساحل پر بیٹھ کر سورج کے ڈوبنے کا نظارہ کرتا رہا۔ یہ سورج کتنا خوش تھا۔ ہر روز ڈوبنے کے بعد اگلی صبح اسے نئی زندگی مل جاتی تھی لیکن میری قسمت کا تارا تو کچھ ایسا ڈوبا تھا کہ اب اس کے دوبارہ اُبھرنے کا کوئی امکان نہ تھا۔

میں رات دیر گئے گھر پہنچا تو ڈاکٹر یزدانی کی گاڑی کو باہر نکلتے دیکھ کر ایک دم ہی پریشان ہو گیا۔ مما کو سخت بخار تھا۔ پچھلے کئی ہفتوں سے وہ میری وجہ سے جس شدید ذہنی دباؤ کا شکار تھیں، اس کا نتیجہ کچھ تو نکلنا ہی تھا۔ اُس رات میں اور پاپا سونے تک اُن کے سرہانے ہی

بیٹھے رہے اور مجھے مما سے بہت سے جھوٹے وعدے بھی کرنے پڑے۔ یہ مائیں بھی کتنی بھولی ہوتی ہیں، اچھی طرح جانتی ہیں کہ اُن کے جگر کا ٹکڑا اُن کا دل بہلانے کے لیے اُن کی ہر بات پہ "ہاں" کہتا چلا جا رہا ہے لیکن پھر بھی اُس کی ہر "ہاں" پر اُن کا دل، اُن کے چہرے کی طرح کھلا جاتا ہے۔

مما کے سونے کے بعد پاپا میرے ساتھ ہی ٹیرس پر چلے آئے۔ میں جانتا تھا کہ اُن کے دل و دماغ میں اُس وقت کیسی آندھیاں چل رہی ہوں گی، لیکن حسب معمول اُن کے چہرے پر وہی مہربان سا سکوت طاری تھا، جیسے کوئی گہرا سمندر، جو اپنی تہ میں جانے کتنے طوفان اور کتنے بھنور چھپائے ہوئے ہوتا ہے لیکن اپنی سطح پر اپنے اندر ہونے والی تبدیلیوں کا پتا آخر وقت تک نہیں چلنے دیتا۔ انہوں نے مسکرا کر مجھ سے پوچھا۔ "ہاں ینگ مین...... تمہاری جنگ کیسی جا رہی ہے؟ اُس پتھر دل پر کچھ اثر ہوا کہ نہیں......؟" میں بھی اُن کا سوال سن کر مسکرا دیا۔ "کچھ جنگیں دنوں میں نہیں...... جنموں میں جیتی جاتی ہیں پپا...... لیکن اس بات کا اطمینان ضرور رکھیے کہ آخری جیت آپ کے سپوت ہی کی ہوگی......" "میں جانتا ہوں...... میرے بیٹے نے ہارنا نہیں سیکھا...... لیکن جانے کیوں اس بار مجھے شکست سے بہت زیادہ ڈر لگ رہا ہے......" میں نے چونک کر پاپا کی جانب دیکھا۔ اُن کی آنکھوں میں کسی اَن دیکھے خوف کی پرچھائیاں سرزاں تھیں۔ "میں بہت شرمندہ ہوں پپا...... شاید میں آپ کے خوابوں کی تعبیر ثابت نہیں ہو سکا...... آپ کے کسی کام نہیں آسکا...... آپ بھی کیا سوچتے ہوں گے کہ......"

پاپا نے جلدی سے میری بات کاٹ دی۔ "نہیں...... بالکل نہیں...... میں، یا تمہاری مما ایسا کچھ بھی نہیں سوچتے...... اولاد ہمیشہ ماں باپ کے خوابوں کی بھینٹ چڑھنے کے لیے ہی تو نہیں ہوتی...... ہم تو بس تمہیں خوش دیکھنا چاہتے ہیں۔ پھر چاہے تمہاری خوشی کہیں بھی ہو......" بولتے بولتے پاپا کی آنکھیں بھر آئیں۔ اس لمحے مجھے اُن پر بے حد پیار آیا اور میں نے بڑھ کر انہیں زور سے گلے لگا لیا۔ خود میری آواز بھی بھرا سی گئی۔ "پپا...... میں کیا کروں...... مجھے اُس کے علاوہ اب اور کچھ سوجھتا ہی نہیں...... کوئی اور لبھاتا ہی نہیں...... میں اتنا بے بس تو کبھی بھی نہیں تھا...... لیکن میں آپ سے وعدہ کرتا ہوں کہ میں اس بھیڑ میں شامل نہیں ہوں گا، جو اس راہ پر ناکامی کے بعد بھٹک کر کہیں کھو جاتی ہے...... میں ان اندھیروں میں اپنی رُوح کو کبھی

بھٹکنے نہیں دوں گا...... اتنا بھروسا ضرور رکھیے گا مجھ پر......" انہوں نے میرا چہرہ اپنے ہاتھوں میں تھام لیا۔ "میں جانتا ہوں...... اور مجھے تم پر پورا اعتبار ہے......" ہم تقدیر کو کتنی آسانی سے اپنی ناکامیوں اور زندگی کی تلخیوں کا الزام دیتے رہتے ہیں لیکن کبھی تقدیر سے ان نعمتوں کی وجہ سے پیار نہیں کرتے جو اس نے ہماری زندگی میں قدم قدم پر فراہم کر رکھی ہوتی ہیں۔ میرے ماں باپ بھی تو قدرت کی ایک ایسی ہی نعمت تھے، جن کے بدلے قدرت کا ہر ستم گوارا تھا۔ مجھے اگر میرے ماں باپ کا اتنا پیار، اتنا حوصلہ نہ ملا ہوتا تو زہرا کی بے رُخی شاید بہت پہلے مجھے توڑ چکی ہوتی۔

اگلے دن میں نے درگاہ جا کر عبداللہ کو سلطان بابا کی دی ہوئی ڈیوٹی کے بارے میں بتایا اور اُس سے جمعرات کے معمولات کی تفصیل بھی معلوم کی۔ مجھے صبح سویرے درگاہ پہنچنا تھا اور معمول کے چند کام مثلاً درگاہ کے زائرین کے لیے پانی بھرنا، پودوں کو پانی اور پرندوں کو دانہ وغیرہ ڈالنا، جمعرات کے لنگر کے باورچیوں سے اپنی نگرانی میں کھانا بنوانا وغیرہ وغیرہ اور ایسے بہت سے دیگر چھوٹے چھوٹے کام سرانجام دینا تھے۔ لیکن عبداللہ نے سب سے اہم ذمہ داری کا ذکر سب سے آخر میں کیا۔ عصر کی نماز کے بعد درگاہ پر آنے والے زائرین کے نذرانے عبداللہ اپنے حجرے میں وصول کرتا تھا۔ مرد دروازے سے اندر آ کر اور عورتیں لکڑی کی جالی والی کھڑکی کے پیچھے سے اپنے نذرانے جمع کرواتی تھیں، جنہیں اُسی وقت مستحقین میں بانٹ دیا جاتا تھا۔ اس جمعرات کی شام مجھے یہ تمام نذرانے وصول کرنے تھے۔ نقدی کی فہرست بنانا تھی اور باقی تحائف کو الگ کر کے عبداللہ کی دی ہوئی فہرست کے مطابق تقسیم کرنا تھا۔ کچھ مستحقین تو خود اپنا حصہ وصول کرنے درگاہ کے احاطے میں جمع ہو جاتے تھے اور کچھ لوگوں کو بذریعہ ڈاک اُن کا حصہ بھیجنا ہوتا تھا۔ مجھے اس بات پر شدید حیرت بھی ہوئی کہ اس فہرست میں چند لوگوں کی تنخواہ کا ذکر بھی تھا۔ یا میرے خدا...... یہ کیسا نظام تھا۔ یہ کون لوگ تھے جن کی تنخواہ ایک اجنبی ہاتھ اور ایک انجانے منتظم کے تحت بٹتی تھی۔ دولت کی تقسیم کا یہ کیسا نظام تھا......؟

آخر کار جمعرات کا دن بھی آ پہنچا۔ میں صبح سویرے ہی بنا کسی کو بتائے اپنی گاڑی میں درگاہ آ گیا تھا۔ عبداللہ اور سلطان بابا مجھ سے بھی پہلے اپنے سفر پر نکل چکے تھے۔ جاتے جاتے

بھی عبداللہ میرے لیے پورا ہدایت نامہ لکھ گیا تھا۔ میں نے معمول کے تمام کام سہ پہر ہونے سے پہلے ہی نپٹا دیئے۔ میں کئی ہفتوں سے اس درگاہ میں آ رہا تھا لیکن آج تک میں نے کبھی عبداللہ کا حجرہ اندر سے نہیں دیکھا تھا۔ ایک تو وہ چھوٹا سا حجرہ درگاہ کے مرکزی صحن سے بہت ہٹ کر تھا اور دوسری وجہ یہ بھی تھی کہ عبداللہ سے میری ملاقات عموماً باہر ہی ہو جاتی تھی۔ لیکن آج چونکہ مجھے عصر کے وقت سے اِسی حجرے میں نذر اور نیاز وصول کرنی تھی لہٰذا میں نے سوچا کہ کچھ دیر پہلے ہی درگاہ کے برآمدے میں بنی لکڑی کی جالیوں سے پرے اس حجرے کو ایک نظر دیکھ ہی آؤں اور پھر ایک عجیب سی بات ہوئی جیسے ہی میں برآمدے میں بنی جالیوں کو پار کر کے حجرے کے دروازے کے قریب پہنچا تو یکایک میرے ذہن میں ایک ساتھ بہت سے جھماکے ہوئے اور اچانک ہی یہ اجنبی ماحول مجھے کچھ مانوس سا محسوس ہونے لگا اور پھر جیسے ہی میں نے حجرے کا دروازہ کھولا تو لمحے کے ہزارویں حصے سے بھی شاید کچھ پہلے مجھے اچانک ہی یوں محسوس ہوا جیسے میں اس حجرے میں پہلے بھی کبھی آ چکا ہوں، پھر تو ذہن میں جلتی بجھتی روشنیاں کچھ اتنی تیزی سے لپکنے لگیں کہ چند لمحے کے لیے تو میں سن ہو کر ہی رہ گیا۔ سب مجھے یاد آنے لگا کہ میری ایسی حالت تو اُس دن بھی ہوئی تھی، جب میں نے پہلی مرتبہ درگاہ کے صحن میں قدم رکھا تھا۔ جب میری پہلی نظر عبداللہ پر پڑی تھی اور جب پہلی مرتبہ سلطان بابا نے مجھے درگاہ کے دروازے پر کھڑا دیکھا تھا...... ہر دفعہ مجھے کچھ یوں ہی محسوس ہوا تھا جیسے میرے ساتھ یہ واقعہ پہلے بھی پیش آ چکا ہے، لیکن ہر بار میں نے اپنے ذہن کو جھٹک کر خود کو یہ تسلی دے دی تھی کہ ایسا تو کم و بیش ہر انسان کے ساتھ ہوتا ہے۔ جب اُسے کوئی واقعہ، کوئی بات اور کوئی جگہ، یا کوئی شخصیت پہلی مرتبہ ملنے، یا دیکھنے کے باوجود جانی پہچانی لگتی ہے بلکہ بعض مرتبہ تو ہمارے ساتھ یہ بھی ہوتا ہے کہ ہم کسی کے منہ سے نکلنے والی بات بھی چند لمحے پہلے جان لیتے ہیں۔ مجھے تو یہ تحت الشعور اور لاشعور کا کوئی معمول کا کھیل لگتا ہے، لہٰذا میں نے حسبِ معمول ان باتوں پر دھیان دینا بھی گوارا نہیں کیا تھا۔ لیکن عبداللہ کے حجرے میں داخل ہوتے ہی وہ انجانا احساس اس شدت سے مجھ پر حملہ آور ہوا کہ میں کچھ دیر کے لیے اپنے حواس ہی میں نہ رہ سکا۔ لیکن جتنی تیزی اور شدت سے مجھ پر اس کیفیت کا غلبہ ہوا تھا، اتنی ہی جلدی وہ جھماکا ختم بھی ہو گیا، جیسے بارود کا کوئی ڈھیر جو ایک ہی چنگاری سے لمحوں میں بھسم ہو

جائے...... کچھ دیر تو میں بالکل خالی الذہن سا کھڑا حجرے کی دیواروں کو تکتا رہا۔ یہ ایک چھوٹا سا کمرا تھا، جس میں ایک جانب ایک نیچی سی لکڑی کی کھڑکی بنی ہوئی تھی، جو باہر برآمدے کی جانب کھلتی تھی۔ کھڑکی پر بانس کے موٹے تنکوں والی چک پڑی ہوئی تھی۔ غالباً یہ وہی کھڑکی تھی جو خواتین کی نذر کے لیے مخصوص تھی، تبھی پردے کا ایسا خاص اہتمام کیا گیا تھا۔ کمرا صاف ستھرا تھا اور ایک جانب چند دینی اور کچھ معلوماتی کتب لکڑی کے ایک شیلف پر سلیقے سے رکھی ہوئی تھیں۔ پانی کی صراحی اور چھت سے لگے ہوئے مورچھل (ہاتھ سے چلنے والے پنکھے) کے علاوہ حجرے میں مزید کوئی سامان نہ تھا۔ کمر ٹکانے کے لیے زمینی دری کے اُوپر دیوار کے قریب ایک تکیہ بھی پڑا ہوا تھا۔ میں نے جیب سے عبداللہ کی دی ہوئی فہرست کو نکالا اور ایک بار پھر غور سے تمام ہدایات کو دہرایا۔

کچھ ہی دیر میں زائرین کی آمد شروع ہو گئی اور میں اُن کے دیئے ہوئے نذرانوں کی فہرست بنانے میں مشغول ہو گیا۔ ذرا سی دیر میں اچھی خاصی رقم بھی جمع ہو گئی تھی۔ پھر مردوں کا ہجوم چھٹا تو کھڑکی کے قریب سے عورتوں کی بھانت بھانت کی بولیاں شروع ہو گئیں۔ کسی کو اولاد نہ ہونے کا غم تھا تو کوئی ناخلف اولاد سے متفکر تھی، کسی کو بیٹے کی شادی کی جلدی تھی تو کوئی ارمانوں سے لائی گئی بہو کے ہاتھوں نالاں تھی۔ کوئی بیماری کی وجہ سے پریشان تھی تو کوئی پریشانی کی وجہ سے۔ عبداللہ کی ہدایت کے مطابق لکڑی کی چک کی چلمن کی دوسری جانب سے انہیں صرف ہوں ہاں میں جواب دیتا جا رہا تھا اور غالباً عورتیں اب تک مجھے عبداللہ ہی سمجھ رہی تھیں۔ عورت اپنا نام بتاتی، اپنی نذر کھڑکی سے اندر بڑھاتی اور میں عبداللہ کی دی ہوئی فہرست کے حساب سے اُس عورت کا نام پڑھ کر اُسے ہدایت، یا دعا کرنے کی تدبیر بتاتا جاتا۔ میرے لیے یہ بالکل نیا اور انوکھا تجربہ تھا۔ بظاہر اُوپر سے ہنسی کھیلتی اور خوش حال دنیا تو اندر سے بے حد زخمی اور بہت دُکھی تھی اور حیرت کی بات یہ تھی کہ سبھی کے دُکھ تقریباً ایک ہی جیسے تھے۔ میں خواتین کو ہدایات جاری کرتے ہوئے ہی کچھ چبھتی ہوئی سوچوں میں کھویا ہوا تھا کہ یکایک کھڑکی کے قریب سے ایک ملائم سی آواز اُبھری ''آداب......'' دفعتہً وہی ٹھنڈی سی پروائی چلی اور میرا سانس میرے سینے میں اٹک سا گیا۔ میری زبان گنگ ہو گئی اور میرے سارے لفظ ایک لمحے میں ہی کہیں کھو گئے۔ وہ دھیرے سے دوبارہ کھنکاری۔ میرے ہاتھ پاؤں ٹھنڈے

پڑنے لگے۔ ہاں...... یہ تو وہی تھی۔ میں نے جلدی سے عبداللہ کی دی ہوئی فہرست پر نظر ڈالی لیکن اُس میں مجھے زہرا کا نام، یا اُس کے لیے کوئی بھی ہدایت لکھی ہوئی دکھائی نہ دی۔ میں نے چلمن سے ذرا سا باہر جھانک کر دیکھا۔ ہاں...... وہی تو تھی صرف ایک دیوار کے فاصلے پر مجھ سے اتنا قریب کہ میں اُس کی سانس لینے کی مدہم آواز بھی سن سکتا تھا۔ ایک لمحے کو میرا جی چاہا کہیں وہاں سے اُٹھ کر بھاگ جاؤں لیکن میرے قدموں نے تو میرے جسم کا بوجھ بھی سہارنے سے انکار کر دیا تھا، بھاگ کر کہاں جاتا؟ زہرا بھی دوسری عورتوں کی طرح یہی سمجھ رہی تھی کہ کھڑکی کے پار عبداللہ بیٹھا ہوا ہے۔ وہ چند لمحوں تک جواب کا انتظار کرتی رہی اور پھر دھیرے سے اپنی جھرنوں جیسی گنگناتی آواز میں بولی۔ ''ہماری نیاز قبول فرمائیں۔'' میں نے چونک کر دیکھا تو اُس کا مخروطی ہاتھ چلمن سے اندر جھانک رہا تھا۔ میں نے گھبرا کر اُس کے ہاتھ میں پکڑا خط کے لفافے جیسا چھوٹا سا لفافہ لے لیا۔ شاید لفافے میں کرنسی نوٹ تھے۔ میری زبان سے صرف ایک لفظ ہی نکل پایا ''شکریہ......'' دوسری جانب سے اُس کی دل میں سیدھا اُتر جانے والی آواز اُبھری۔ ''میں آج بھی اپنے سوال کے جواب کا انتظار کر رہی ہوں......'' یا خدا...... یہ کس سوال کی بات کر رہی تھی......؟...... اب میں اُسے کیا جواب دوں...... عبداللہ سے اتنی بڑی غلطی کیسے ہوگئی۔ باقی سب کے بارے میں تو اُس نے اتنی تفصیل سے مجھے بتا دیا تھا، پھر زہرا کے بارے میں بتانا کیسے بھول گیا وہ......؟ مجھے اور تو کچھ سوجھا نہیں بس ہلکے سے کھانس کر میں نے اپنے ہمہ تن گوش ہونے کا پیغام اُس تک پہنچانے کی کوشش کی۔ اس بار مجھے زہرا کی آواز کچھ بھرائی ہوئی سی محسوس ہوئی، جیسے وہ بے حد کرب میں بول رہی ہو۔ ''میں جانتی ہوں...... آپ کے پاس میرے کسی سوال کا کوئی جواب نہیں...... میں آج بھی ہمیشہ کی طرح یہاں سے ناکام اور نامراد ہی واپس پلٹوں گی...... اگر آپ کی چپ ہی میرا مقدر ہے تو مجھے یہ خاموشی بھی قبول ہے...... لیکن ایک بات تو آپ بھی اچھی طرح جانتے ہیں...... میں عمر بھر آپ کی اس چوکھٹ پر اپنا سر پٹختی رہوں گی لیکن کسی اور کے خیال کو اپنے من کے قریب بھی نہیں پھٹکنے دوں گی۔ آپ سے محبت کی اگر یہی سزا ہے میں اسے بھی اپنے لیے جزا ہی سمجھوں گی......'' میرے دل و دماغ میں جیسے جھکڑ چل رہے تھے اور سارا کمرا بلکہ ساری دنیا ہی مجھے گھومتی ہوئی محسوس ہو رہی تھی۔ تو گویا اس زہرا جبیں کے دل

میں کوئی اور نہیں بلکہ خود عبداللہ ہی بسا ہوا تھا۔ اتنا بڑا دھوکا، ایسا عظیم فریب تو کسی جانی دشمن نے بھی نہ دیا ہوگا کسی کو...... پھر عبداللہ نے میرے ساتھ ایسا کیوں کیا؟؟؟

زہرا جانے کب اُٹھ کر جا چکی تھی۔ حسد، جلن اور کرب کے طوفان نے میری آنکھوں میں مرچیں سی بھر دی تھیں۔ میرا دل چاہ رہا تھا کہ میں اتنی زور سے چلاؤں کہ یہ ساری کائنات ہی پھٹ کر ریزہ ریزہ ہو جائے۔ میں نے ہاتھ میں پکڑے ہوئے اس لفافے پر نظر ڈالی جو ابھی کچھ دیر پہلے زہرا نے مجھے تھمایا تھا۔ بہت سے بڑے کرنسی نوٹوں کے درمیان ایک چھوٹی سی پرچی لفافے سے باہر جھانک رہی تھی۔ میں نے بے دھیانی میں پرچی باہر نکالی اور اپنی سلگتی ہوئی نظریں اس ستم گر کی شستہ تحریر پر گاڑ دیں۔ پرچی پر صرف ایک شعر لکھا ہوا تھا۔

میرے جسم بوسیدہ میں ذرا جو جان باقی ہے
کسی کے لوٹ آنے کا کوئی امکان باقی ہے
وہ چاہے راستہ بدلے، چاہے رابطہ بدلے
اُسے مجھ سے محبت ہے، میرا ایمان باقی ہے

مجھے یوں لگا جیسے وہ لفظ نہیں، چھوٹے چھوٹے سنپولیے ہیں۔ میں نے گھبرا کر پرچی وہیں پھینک دی اور تیزی سے دوڑتا ہوا حجرے سے باہر نکل گیا۔

دورِ جنوں

جب مجھے ہوش آیا تو میں اپنے ہی گھر میں بستر پر پسینے میں شرابور پڑا تھا۔ مما، پپا اور ڈاکٹر یزدانی سمیت چند ڈاکٹروں کی ٹیم میرے سرہانے کھڑی تھی۔ میں نے گھبرا کر اُٹھنا چاہا تو مما نے جلدی سے مجھے کاندھوں سے پکڑ کر زبردستی واپس لٹا دیا۔ ''لیٹے رہو میری جان...... پورے چھتیس گھنٹے کے بعد تمہیں مکمل ہوش آیا ہے۔ اب اگر تم نے بستر چھوڑا تو میں تم سے کبھی نہیں بولوں گی۔'' ۳۶ گھنٹے...... یا میرے خدا...... ابھی چند لمحے پہلے ہی تو میں درگاہ سے اپنی بھیگی اور جلتی ہوئی آنکھیں لے کر دوڑتا ہوا باہر نکلا تھا۔ میرا ارادہ زہرا کو روکنے کا تھا لیکن اُس کی گاڑی میرے باہر نکلنے سے پہلے ہی وہاں سے روانہ ہو چکی تھی۔ مجھے یاد نہیں کہ میں نے کس طرح اپنی گاڑی اسٹارٹ کی تھی اور میں کب اور کیسے اپنے گھر کے پورچ تک پہنچا تھا۔ بعد میں مما نے بتایا کہ میں گاڑی سے نکلتے ہی لہرا کر وہیں پورچ میں ہی گر پڑا تھا اور تب سے لے کر اب تک میرے بے ہوشی کے وقفے گہرے ہی ہوتے گئے تھے۔ گویا آج ہفتے کا دن تھا اور میں جمعرات کو درگاہ سے نکلا تھا۔ کبھی کبھی انسان کی زندگی سے وقت کے قیمتی لمحے کچھ اس طرح سے بھی چوری ہو جاتے ہیں کہ وہ بس سٹپٹاتا ہی رہ جاتا ہے۔ میرے ساتھ بھی اس وقت کچھ ایسا ہی معاملہ تھا اور پھر اگلے تین چار دن تک مما نے میری کچھ ایسی سختی سے نگرانی کی کہ میں واقعی بستر سے قدم تک نیچے نہ دھر سکا۔ لیکن میری رگوں میں جو انگارے بھر چکے تھے، میں اُن کا کیا کرتا؟ مجھے ہر حال میں عبداللہ سے ملنے جانا تھا۔ میں اُس دھوکے باز انسان کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر اُس سے پوچھنا چاہتا تھا کہ اگر زہرا خود اُس کی محبت میں مبتلا تھی تو پھر اُس نے آخر میرے ساتھ ہی چوہے بلی کا کھیل کیوں کھیلا؟ میری پُرخلوص دوستی کا مذاق کیوں اُڑایا؟ اگر وہ پہلے دن مجھے یہ بات بتا دیتا تو میں زہرا کی دیوانگی میں اتنا آگے تو نہ بڑھتا۔ یہ اور اس جیسے جانے کتنے سوالات تھے، جن سے میرا سر پھٹا جا رہا تھا لیکن اس بار مما اور پاپا کا پہرہ اتنا کڑا تھا کہ اُن کے علم میں لائے بنا میرا پلک جھپکنا بھی محال تھا۔ لہٰذا چوتھے

دن مجبوراً مجھے پپا کو اعتماد میں لینا پڑا کہ میرا اگلے دن یعنی جمعرات کی شام کو درگاہ جانا بے حد ضروری ہے لیکن پپا نے بھی اس مرتبہ مما کے سامنے ہتھیار ڈال دیئے تھے۔ آخرکار خوب بحث ومباحثے کے بعد وہ بمشکل اس بات پر راضی ہوئے کہ وہ مما سے مجھے درگاہ جانے کی اجازت دلوانے کی کوشش کریں گے لیکن صرف اور صرف اس شرط پر کہ وہ بھی میرے ساتھ جائیں گے، کیوں کہ اب وہ مجھے وہاں اکیلے بھیجنے کا رسک لینے پر تیار نہیں تھے۔ میرے پاس اُن کی بات مان لینے کے سوا کوئی چارہ بھی نہیں تھا۔ لیکن جب مما کو ہم دونوں باپ بیٹے کے ارادوں کا پتا چلا تو انہوں نے تو آسمان ہی سر پر اُٹھا لیا۔ وہ پپا پر بہت ناراض ہوئیں کہ انہوں نے ہی مجھے اس حال پر پہنچایا ہے۔ آخرکار بڑی مشکل سے جنگ بندی کا اعلان ہوا لیکن تب تک یہ طے پا چکا تھا کہ پپا کے ساتھ اب مما بھی درگاہ کے لیے ہماری ہم رکاب ہوں گی، کیوں کہ اب وہ کسی صورت بھی مجھے اپنی آنکھوں سے اوجھل نہیں کرنا چاہتی تھیں۔

اگلے دن مقررہ وقت پر ہم تینوں کو پپا کے ڈرائیور نے درگاہ کے دروازے پر پہنچا دیا۔ زائرین کی چہل پہل شروع ہو چکی تھی اور دُور بھیڑ سے پرے مجھے زہرا کی گاڑی بھی کھڑی نظر آ گئی۔ میں نے یہاں آنے کے لیے جمعرات کے دن تک کا یہ انتظار صرف اسی لیے کیا تھا، کیوں کہ میرا ارادہ زہرا کے سامنے عبداللہ سے بات کرنے کا تھا تاکہ اُسے مزید کوئی بہانہ بنانے کا موقع نہ مل سکے۔ درگاہ کے صحن میں داخل ہوتے ہی میری پہلی نظر زائرین کی بھیڑ میں گھرے سلطان بابا پر پڑی۔ میں نے مما اور پپا کو انہیں سلام کرنے کی غرض سے اُس طرف بھیج دیا اور خود عبداللہ کے حجرے کی جانب بڑھ گیا۔ مجھے یقین تھا کہ زہرا بھی حجرے کی پچھلی جانب لکڑی کی جالیوں والی چلمن کے برآمدے ہی میں موجود ہوگی۔ میرا دل ایک دم ہی بجھ سا گیا تھا۔ میں یہ ساری لاحاصل کوشش کیوں کر رہا تھا؟ جب وہ خود میرے نصیب ہی میں نہ تھی تو پھر وہ چاہے کسی کا بھی مقدر ہو۔ اس بات سے میری کالی قسمت کا لکھا ڈھل تو نہیں سکتا تھا۔ جیسے جیسے حجرے کا دروازہ قریب آتا گیا، میرے قدم بالکل ہی بے جان ہوتے گئے۔ آج اس جانب مرد حاجت مندوں کی بھیڑ بالکل ہی مفقود تھی۔ شاید میں بہت جلدی آ گیا تھا، یا پھر مجھے بہت دیر ہو گئی تھی۔ میں نے سر جھٹک کر خیالات کی یلغار روکی اور جیسے ہی حجرے کے دروازے کو ہلکا سا دھکا دیا، عبداللہ کی آواز نے میرے قدم جکڑ لیے۔ وہ دوسری جانب کھڑی

کے پار کسی سے مخاطب تھا۔ اُس کی آواز میں جھنجلاہٹ سی تھی۔ ''عورت...... عورت...... یہ کچھ الگ معاملہ ہے۔ آخر آپ سمجھنے کی کوشش کیوں نہیں کرتیں۔ یہ اختیار کا معاملہ ہے۔'' دوسری جانب سے وہ آواز اُبھری، جسے میں دنیا کی کروڑوں آوازوں کے درمیان بھی پہچان سکتا تھا۔ وہ زہرا ہی تھی۔ ''بات اگر اختیار کی ہے تو پھر میں بے اختیار ہوں۔ خود پر اختیار ہوتا تو میں بار بار یہاں کیوں آتی۔ اگر آپ میرے راستے پر نہیں چل سکتے تو نہ سہی، میں تو آپ کے راستے کی ڈھول بن سکتی ہوں نا......''

عبداللہ نے گہرا سانس لیا۔ ''میں شادی شدہ ہوں اور دوسری شادی کر کے میں انصاف نہیں کر پاؤں گا۔ میں اپنی بیوی اور بچے سے بہت محبت کرتا ہوں۔ کاش میں آپ کی کوئی مدد کر سکتا لیکن اپنی تقدیر میں یہ کانٹے آپ نے خود بوئے ہیں۔ اب بھی وقت ہے، آپ سنبھل جائیں۔'' زہرا سسکی۔ ''کاش یہ مشورہ آپ چار سال پہلے اُس وقت مجھے دیتے جب میں نے کلاس میں آپ کو پہلی بار دیکھا تھا تب تو آپ شادی شدہ بھی نہیں تھے، نہ ہی میں آپ کو ٹھیک طرح سے جانتی تھی۔ لیکن میرا تو سب کچھ تہس نہس کر دیا آپ کی اُس پہلی نظر نے۔ آپ ہی بتائیے اس میں میرا کیا قصور ہے۔ آپ نے اپنی پہلی نظر کو روکا کیوں نہیں؟'' عبداللہ نے لمبی سی سانس لی۔ ''ہر کسی کے مقدر میں کبھی نہ کبھی کہیں نہ کہیں وہ پہلی نظر ضرور لکھی ہوتی ہے۔ پھر یہ اگلے کا نصیب ہے کہ وہ نظر اُسے گل و گلزار کر دے، یا پھر جلا کر خاکستر۔ افسوس آپ کی قسمت میں اُس نظر کی شبنم کے بجائے یہ چنگاری لکھی تھی۔ لیکن اب بھی یہ آگ شبنم میں بدل سکتی ہے۔ اپنے مقدر پر قناعت کر لینا بھی بہت بڑی عبادت ہے۔ اپنی عبادت کو یوں برباد نہ کریں۔ میں آپ کا نصیب نہیں ہوں۔'' مجھے آہٹ سے یوں محسوس ہوا کہ جیسے عبداللہ نے کھڑکی سے ہٹ جانے کا ارادہ کیا ہو، تبھی زہرا کی ٹوٹی ہوئی آواز سنائی دی۔ ''میں آپ سے اپنا نصیب بدل دیئے جانے کی دعا کی اُمید تو کر سکتی ہوں، کیا آپ میرے لیے اتنی سی دعا بھی نہیں کریں گے......؟'' ''میری ہر دعا میں آپ ہمیشہ شامل رہیں گی۔ فی امان اللہ۔'' شاید زہرا کھڑکی سے ہٹ چکی تھی۔ میں پورا دروازہ کھول کر اندر آ گیا۔ عبداللہ نے چونک کر میری جانب دیکھا۔ ''آؤ ساحر میاں، اندر آ جاؤ، میں تمہارا ہی انتظار کر رہا تھا۔''

ہم دونوں کو اس حجرے میں خاموش بیٹھے کافی دیر بیت چکی تھی۔ آخر کار میں نے ہی

سکوت توڑا۔ ''سچ کہوں تو پہلے مجھے زہرا کی محبت کا راز جان کر بہت بُرا لگا تھا۔ مجھے ایسا لگا جیسے تم نے مجھے بہت بڑا دھوکا دیا ہو، میری پیٹھ میں خنجر گھونپا ہو۔'' عبداللہ ہلکے سے مسکرا دیا۔ ''اور اب...... اب تمہارے خیالات کیا ہیں، اس بارے میں۔'' ''اب مجھے ایسا لگتا ہے، جیسے تم بھی مجبور ہو، میری طرح، بے حد مجبور۔ میں زہرا کی محبت میں مبتلا ہوں، زہرا تمہارے عشق میں گرفتار ہے۔ تم کسی اور کی چاہت کے حصار میں ہو۔ شاید کبھی کسی کو مکمل جہاں نہیں ملتا۔ لیکن تم نے مجھ سے یہ بات کیوں چھپائی۔ اس میں کیا بعید ہے۔ یہ میں اب بھی نہیں سمجھ پایا۔'' عبداللہ نے ایک گہری سی سانس لی۔ ''سب سے پہلے طے ہوتا ہے ہماری مرضی کہاں چلتی ہے۔ تمہارا اس درگاہ میں آنا، زہرا سے ملنا، محبت کے اس کانٹوں بھرے جنگل سے گزرنا، یہ سب کچھ طے ہی تو تھا، رفتہ رفتہ تمہیں سب کچھ سمجھ میں آ جائے گا۔''

عبداللہ نے کچھ ہی دیر بعد مجھے اپنی اور زہرا کی پہلی ملاقات سے لے کر اب تک کی کہانی سنا دی تھی۔ عبداللہ جس یونیورسٹی سے اُردو ادب میں ایم اے کر رہا تھا، زہرا بھی اُسی یونیورسٹی کی طالبہ تھی۔ لیکن اُس کا داخلہ چونکہ کچھ دیر سے ہوا تھا لہٰذا اُس کے استاد نے اُس کی کلاس کے ایک لڑکے یعنی عبداللہ کو اُس کی مدد کے لیے مقرر کر دیا تھا۔ لیکن عبداللہ کے علم اور اُس کے شائستہ اطوار نے زہرا کے دل میں کسی اور ہی جذبے کو ہوا دے دی اور وہ تنہا ہی بہتی چلی گئی۔ پھر شاید زہرا نے روایتی حجاب، یا پھر اپنے حسن کے بھرم میں اقرار کرنے میں کچھ دیر لگا دی۔ عبداللہ کو اپنے والد کی موت کی اطلاع ملتے ہی جلدی میں اپنی ڈگری کے نتیجے کا انتظار چھوڑ کر آبائی گاؤں جانا پڑا، جہاں مقدر نے اُس کی راہ میں شادی کے رشتے کی بیڑیاں گاڑ رکھی تھیں۔ پھر ٹرین سے شہر واپس آتے ہوئے ایک اسٹیشن پر اُس کی سلطان بابا سے ملاقات ہو گئی اور عبداللہ کی زندگی کا دھارا ہی بدل گیا۔ عبداللہ گھر سے اپنی ایم اے کی ڈگری لے کر اپنی ہی یونیورسٹی میں لیکچرر شپ کی وہ نوکری قبول کرنے کے لیے نکلا تھا جس کا انٹرویو کئی ماہ پہلے بڑی تگ و دو کے بعد اُس نے پاس کیا تھا۔ لیکن قدرت نے اُس کے لیے درگاہ کی یہ نوکری شاید بہت پہلے ہی سے ڈھونڈ رکھی تھی۔ قسمت کا لکھا دیکھیے کہ زہرا کے خوابوں کی کمند بھی کسی درگاہ پر آ کر ٹوٹنی تھی۔ وہ پہلے ہی عبداللہ کے یوں بنا بتائے غائب ہو جانے سے بے حال تھی۔ کسی سہیلی نے مشورہ دیا کہ اس درگاہ کے بارے میں بہت سن رکھا ہے کہ یہاں مانگی

جانے والی منت کبھی رد نہیں ہوتی۔ لیکن زہرا کیا جانتی تھی کہ وہ جس منت کی تلاش میں درگا
کے تپتے صحن میں پہلی مرتبہ قدم رکھ رہی ہے وہ منت خود سر جھکائے کسی اور دعا کے لیے وہاں
سجدے میں پڑی ملے گی۔ عبداللہ اور زہرا کی نظریں ملیں اور زہرا کا سب کچھ ایک بار پھر ہمیشہ
کے لیے لٹ گیا۔ عبداللہ کا حلیہ بالکل بدل چکا تھا۔ چہرے پر کلین شیو کی جگہ گھنی ڈاڑھی ۔
لے لی تھی اور جدید تراش کے لباس کے بدلے اب وہ سادہ سے سفید کرتے، شلوار میں ملبوس
تھا۔ ابھی زہرا اپنی پہلی حیرت کے صدمے ہی سے باہر نہیں نکلی تھی کہ اُس کے سر پر دوسرا
قیامت بھی ٹوٹ پڑی۔ عبداللہ کی شادی کا سن کر تو وہ بالکل ہی ڈھے گئی اور بس، وہ دن او
آج کا دن، اُس نے پھر پلٹ کر زندگی کی طرف نہیں دیکھا۔ اُس کی حیات کا محور تب سے یہ
درگاہ اور یہی ایک منت رہ گئی تھی۔

میں حیرت سے عبداللہ کی طرف دیکھتا رہا۔ وہ کتنا خوش نصیب تھا کہ جس کے لیے ایک
پری خود زندگی بھر کے لیے اس کڑکتی اور جھلساتی دھوپ میں اپنا کومل وجود اور مومی پَر پگھلا۔
کو تیار بیٹھی تھی۔ میں عبداللہ کے فسانے میں اس قدر مگن ہوا کہ مجھے وقت گزرنے کا پتا ہی نہیں
چلا۔ میں یہ بھی بھول گیا کہ میرے والدین بھی آج میرے ساتھ آئے ہوئے ہیں۔ سلطان
نے کسی زائر کے ہاتھ پیغام بھیجا تو میں چونکا۔ ورنہ شاید خود میرے لیے اس لمحے وقت ا
رفتار کھو چکا تھا۔ ہم باہر نکلے تو یہ دیکھ کر مزید حیرت ہوئی کہ مما اور پپا سلطان بابا کے ساتھ ا
تک گفتگو میں مشغول تھے۔ جب کہ میرا خیال تھا کہ وہ دونوں میرے طویل انتظار سے اُ
چکے ہوں گے۔ خاص طور پر مما کو تو ایسی جگہوں سے شدید وحشت ہوتی تھی۔ آج بھی
صرف میری وجہ سے یہاں آئی تھیں۔ مجھے دیکھ کر سلطان بابا کے چہرے پر ہلکی سی مسکراہ
اُبھری...... ''تو تم نے اپنے والدین کو بھی خوب پریشان کیے رکھا۔ زندگی سے ضد کرنا چھوڑ
میاں...... کچھ صلے اس جہاں کے لیے نہیں ہوتے۔ سبھی خواہشیں اس دنیا میں پوری ہو۔
لگیں تو پھر اگلے جہاں کے لیے کیا باقی رہ جائے گا؟'' میں نے آج تک کبھی سلطان بابا
جواب نہیں دیا تھا، پر اُس وقت میری ذہنی حالت زہرا کے غم کی وجہ سے کچھ ایسی تھی کہ میں
کو روک نہیں پایا...... ''لیکن کچھ خواہشیں ایسی بھی تو ہوتی ہیں کہ جن کے بدلے دونوں جہا
گروی رکھے جا سکتے ہیں۔'' سلطان بابا چونکے ''نہیں...... ایسی کوئی خواہش نہیں، جو وہاں

بدل ہو...... انسان بڑا جلد باز ہے...... اسے صبر کی عادت نہیں ہے...... جو ملا وہی اس کے لیے
ٹھیک ہے...... جو نہیں ملا، اِسی میں اس کی بہتری ہے۔'' میں چڑ سا گیا۔ ''یہ سب دل بہلانے
کے بہانے ہیں۔ میں یہ دعا کیوں نہ مانگوں کہ جو مجھے نہیں ملا، مجھے اُس سے ملا دے اور اُسی
میں میری بھلائی کا سامان بھی پیدا کر دے...... اگر مجھے اس دنیا میں بھیجا گیا ہے تو مجھے زندگی
بھی تو میری اپنی مرضی کی ملنی چاہیے۔ میں نے خود تو اس دنیا میں آنے کی خواہش نہیں کی
تھی...... جب اُس نے بھیجا ہے تو اُسے میری چاہتوں کا خیال بھی رکھنا ہوگا، مجھے اگلے جہاں
کے صلوں سے کیا واسطہ۔ جو یہاں دے گا...... وہ وہاں بھی نوازے گا۔'' میں جوش جنوں میں
نہ جانے کیا کچھ کہہ گیا۔ مما نے گھبرا کر مجھے ٹوکا۔ ''ساحر...... ہوش کرو...... یہ تم سے بڑے
ہیں......'' سلطان بابا نے ہاتھ اُٹھا کر مما کو خاموش کرا دیا اور میری طرف پلٹے۔ ''اگر صرف دنیا
کو قابو کرنا ہے، تب بھی راستہ جنوں سے ہو کر ہی گزرتا ہے...... تم کیا سمجھتے ہو کہ دنیا کی چاہتیں
اتنی آسانی سے مل جاتی ہیں۔ بولو...... ہمت ہے خود کو جلا کر بھسم کرنے کی؟'' ''میں ہر امتحان
سے گزرنے کے لیے تیار ہوں۔'' ...... ''سوچ لو...... دنیا پانے کے لیے بھی کبھی کبھی سارے
عیش و آرام ترک کرنا پڑتے ہیں۔ کہیں راستے میں تھک کر پلٹ تو نہیں جاؤ گے؟'' میں نے
شاید زندگی میں پہلی مرتبہ سلطان بابا کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالیں۔ ''آزمائش شرط ہے۔''
سلطان بابا مسکرائے۔ ''ٹھیک ہے...... آزمائے لیتے ہیں...... ہم نے عبداللہ کا تبادلہ کسی اور
قصبے میں کر دیا ہے۔ تمہارے جنوں کی پہلی آزمائش یہی ہے کہ جلد از جلد اپنا گھربار اور یہ عیش و
عشرت چھوڑو اور اس درگاہ میں بسیرا کر لو۔ تمہیں یہاں لوگوں کی خدمت کے ساتھ ساتھ اپنے
گزر بسر کے لیے بھی کوئی مزدوری کرنا ہوگی۔ جیسے عبداللہ کرتا تھا۔ دو دن کے بعد میں اور
عبداللہ یہاں سے اپنے سفر پر کوچ کر جائیں گے، تب تک کوئی فیصلہ کر لو۔ لیکن یاد رہے......
تمہارے والدین ماشاءاللہ حیات ہیں...... لہٰذا جو بھی قدم اُٹھاؤ، اس میں اُن کی رضامندی
بہت ضروری ہے۔ اُن کی ناراضی کبھی مول نہ لینا......'' سلطان بابا میرا کاندھا تھپک کر آگے
بڑھنے لگے، پھر نہ جانے کیا سوچ کر دوبارہ پلٹے اور میری جانب دیکھ کر ہلکے سے مسکرائے۔
''اب بھی وقت ہے، گھر جا کر ٹھنڈے دل سے اپنے فیصلے پر غور کرو۔ دنیا خود ملے تو ملے ورنہ
اسے پانا چاہو تو یہ انسان سے بھاگتی ہے۔ اس کا حصول بھی بڑا جوکھم ہے۔ کیوں خود کو اس

جھمیلے میں ڈالتے ہو۔ تمہیں جو ملا ہے وہ بھی کچھ کم تو نہیں۔ ایک خواہش نہ سہی اور ہزاروں ارمان تو پورے ہو ہی رہے ہیں۔ یاد رکھو، یہ جنوں بھی ہر ایک کو راس نہیں آتا......" میرے منہ سے خود بخود نکل گیا۔ "جو اس جنوں میں پڑ جائیں پھر انہیں کسی راس، یا بے راسی کا دھیان ہی کب رہتا ہے..... جو ہوگا دیکھا جائے گا......" سلطان بابا کچھ دیر تک میری آنکھوں میں کچھ تلاش کرتے رہے۔ مجھے اُن کی آواز بہت دُور سے آتی ہوئی محسوس ہوئی۔ "پھر بھی میری یہی دعا ہے کہ تمہیں یہ جنوں راس آ جائے......" سلطان بابا آگے بڑھ گئے۔

میرے ماں باپ میرے قریب ہی کھڑے حیرت اور پریشانی سے میرے اور سلطان بابا کے درمیان مکالمہ سن رہے تھے۔ میری نظر عبداللہ کے چہرے پر پڑی جہاں تفکر کی نئی پرچھائیاں اپنی جگہ بنا رہی تھیں، مگر میرے دل نے بہت دھیرے سے مجھ سے کہا

جو نہ مل سکے، وہی بے وفا
یہ بڑی عجیب سی بات ہے
جو چلا گیا مجھے چھوڑ کر
وہی آج تک میرے ساتھ ہے

تعیناتی

سلطان بابا نے زہرا کو پانے کے لیے جس کڑے امتحان سے گزرنے کا چیلنج دیا تھا میں اُسے صدقِ دل سے قبول کر چکا تھا۔ لیکن انہوں نے اس امتحان میں بیٹھنے کے لیے میرے والدین کی رضامندی کی جو ذیلی شرط لگائی تھی وہ میرے لیے اس آزمائش سے بھی بڑا امتحان تھا۔ اُس روز درگاہ سے واپسی پر مما اور پاپا دونوں ہی بالکل خاموش، خیالوں میں گم صم سے تھے۔ شاید اُن دونوں کے ذہن میں بھی یہ سوال کہیں نہ کہیں گردش کر رہا ہوگا کہ اُن کا اس قدر نازوں پلا بیٹا اَن جانے میں سلطان بابا سے بہت بڑی شرط تو لگا آیا ہے لیکن جس کی ساری زندگی مخمل پر کٹی ہو، کیا وہ کبھی ٹاٹ برداشت کر سکتا ہے اور پھر میں تو اکلوتی اولاد کے علاوہ مزاجاً بھی کافی نازک مزاج تھا۔ میں نے زندگی میں کبھی کوئی تکلیف، یا مشقت جھیلنا تو دُور، اُس کا برائے نام سامنا بھی نہیں کیا تھا۔ میری ماں کے بقول "میرا تو رنگ بھی چند لمحوں کی دھوپ سے کملا سا جاتا تھا۔" تو پھر اس وقت اُن کے ذہن میں اُٹھتے سوال بھی تو بجا ہی تھے، لیکن میں حتمی فیصلہ کر چکا تھا کہ اب مجھے کیا کرنا ہے۔

گھر کے پورچ میں گاڑی رُکتے ہی میں بنا کسی سے کوئی بات کیے اپنے کمرے کی جانب بڑھ گیا۔ میری توقع کے عین مطابق ٹھیک آدھے گھنٹے کے بعد کاشف کا فون آ گیا۔

"ساحر تمہارا دماغ تو ٹھیک ہے...... میں یہ کیا سن رہا ہوں......" میں جانتا تھا کہ مما گھر میں داخل ہوتے ہی سب سے پہلی کال کاشف ہی کو کریں گی۔ میری ضد کے سامنے جب کبھی مما پاپا ہارنے لگتے تھے تو ایسے میں کاشف ہی اُن کا آخری سہارا ہوا کرتا تھا۔ "بولو نا...... چپ کیوں ہو......؟ ...... لیکن یاد رکھنا، ہم سب تمہیں اس پاگل پن کی اجازت ہرگز نہیں دیں گے۔ غضب خدا کا...... شہر کا سب سے بڑا کیسونووا (Casonova) ساحر رضا ایک درگاہ کا مجاور بننے چلا ہے...... خبردار! جو تم نے اس حماقت کے بارے میں مزید کچھ سوچا بھی تو......؟" کاشف اپنی رو میں نہ جانے کیا کچھ بولتا چلا گیا۔ میں چپ چاپ اُس کا لیکچر ختم ہونے کا

انتظار کرتا رہا۔ اُس کی قینچی کی طرح چلتی زبان رُکی تو میں نے اُسے چھیڑنے کے لیے ایک لمبی سی سرد آہ بھری۔ ''وحشی کو سکوں سے کیا مطلب...... جوگی کا نگر میں ٹھکانہ کیا......؟'' ''فار گاڈ سیک ساحر...... یہ ساری باتیں صرف کتابوں میں اچھی لگتی ہیں اور پھر تمہارا واحد مقصد تو صرف اور صرف زہرا کو پانا ہی ہے نا......؟ تو اُس کے حصول کے اور بھی بہت سے طریقے ہیں، تمہیں اس کے لیے یہ جوگ لینے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔'' مجھے کاشف کے ناصحانہ انداز پہ ہنسی آ گئی۔ ''اچھا...... بھلا وہ کون سے طریقے ہیں...... ذرا میں بھی تو سنوں۔'' ''میری بات مذاق میں مت اُڑاؤ ساحر...... تم نے اپنی چند دن کی بے ہوشی کے دوران ہزیان میں بہت سے راز افشا کر دیئے ہیں۔ میں جانتا ہوں کہ وہ لڑکی وہاں صرف اُس درگاہ کے متولی عبداللہ کے لیے آتی تھی۔ آج مجھے آنٹی سے یہ بھی پتا چلا ہے کہ سلطان بابا عبداللہ کو لے کر کسی لمبے سفر پر جا رہے ہیں۔ مطلب یہ کہ عبداللہ کی صورت میں تمہارا رقیب زہرا کی نظروں کے سامنے نہیں رہے گا۔ مجھے یقین ہے کہ تب تمہاری محبت کا وار ایک نہ ایک دن کارگر ضرور ثابت ہوگا۔ زہرا تمہارے پاگل پن کے سامنے زیادہ دن تک مزاحمت نہیں کر پائے گی۔ تم صرف انتظار کرو ساحر...... جلد بازی میں کوئی قدم نہ اُٹھانا میری جان...... ہم سب تم سے بے حد پیار کرتے ہیں......'' بولتے بولتے کاشف کی آواز کچھ بھرا سی گئی۔ وہ ایسا ہی تھا جذباتی سا۔ میں نے ماحول بدلنے کے لیے بات بدلی۔ ''خدا کے لیے یہ رونے دھونے کا فریضہ تم مما کے لیے ہی چھوڑ دو...... خبردار جو تم نے میری دوسری ماں بننے کی کوشش کی...... ارے یار تم لوگ سمجھنے کی کوشش کیوں نہیں کرتے...... مجھے سلطان بابا نے ایک چیلنج دیا ہے اور میں صرف اس کسوٹی پر پورا اُترنا چاہتا ہوں اور شاید تم بھول رہے ہو، ایسے چیلنج ہم روزانہ ایک دوسرے کو دیا کرتے تھے۔ یاد ہے تمہیں، پچھلے سال ہی ہم نے چولستان کے صحرا میں پندرہ دن بنا کسی گائیڈ کے رہنے کی شرط لگائی تھی اور آخر میں ہم دونوں ہی وہ شرط جیتے تھے۔ یہ بھی ایک ایسی ہی شرط ہے، جس کے تحت مجھے چند دن درگاہ میں رہنا ہوگا۔ تمہارا کیا خیال ہے کہ میں باقاعدہ مجاور بننے کے لیے درگاہ جا رہا ہوں......؟'' دوسری جانب سے کاشف کی مشکوک سی آواز سنائی دی۔ ''میں کیسے مان لوں کہ یہ سارا معاملہ صرف ایک شرط، یا چیلنج کی حد تک ہی رہے گا۔ مجھے تمہارے دیوانے پن سے ڈر لگتا ہے۔'' میرے منہ سے بے اختیار ایک دوسرا مصرعہ نکل گیا۔

''دیوانوں کی سی نہ بات کرے...... تو اور کرے دیوانہ کیا؟'' کاشف ہنس پڑا۔ ''تم کبھی نہیں سدھرو گے ساحر...... بہرحال میری تشویش کافی حد تک دُور ہوگئی ہے۔ لیکن فی الحال مجھے آنٹی کی تشویش دُور کرنی ہے، وہ اور انکل تمہارے اس نئے ایڈونچر کی وجہ سے بے حد پریشان ہیں۔'' میں نے کاشف کو جھاڑا۔ ''زیادہ چمچہ گیری کرنے کی بھی ضرورت نہیں ہے۔ ہو سکے تو مما پاپا کو بھی میرا نقطۂ نظر اسی طرح سمجھانے کی کوشش کرنا، جیسے میں نے ابھی تمہیں بتایا ہے اور خبردار، جو اپنی طرف سے ذرا سی بھی کوئی افلاطونی جھاڑنے کی کوشش کی تو!'' کاشف نے ہنستے ہوئے فون رکھ دیا۔ میں نے کاشف کو تو کسی نہ کسی طور سمجھا دیا تھا، لیکن میں یہ بھی اچھی طرح جانتا تھا کہ اپنے والدین کو سمجھانا کس قدر مشکل مرحلہ ہوگا۔

اُس رات نہ جانے کیوں مجھے عینی بہت ٹوٹ کر یاد آئی۔ وہ بھی تو میرے لیے اِسی آگ میں جلتی رہی تھی، جس میں آج میں زہرا کے جل رہا تھا۔ مجھے یاد آیا کہ کینیڈا کا اسکالر شپ لینے سے پہلے وہ درگاہ کی سیڑھیوں پر مجھ سے آخری بار ملی تھی تو کس قدر کرچی کرچی تھی وہ...... میں اُس وقت اُس کے جذبے کی کاٹ کو محسوس نہیں کر پایا تھا، لیکن آج جب خود میرے اُوپر یہ قیامت گزر رہی تھی تو مجھے اُس کی ہر بات یاد آ رہی تھی۔ میں جانتا تھا کہ وہ خود تو کبھی مجھے بددعا نہیں دے سکتی تھی، لیکن شاید کبھی کبھی خدا جذبوں کو بھی دعا، یا بددعا دینے کا اختیار دے دیتا ہے اور شاید آج میری اس حالت کے پیچھے بھی عینی کے کسی ایسے ہی جذبے کی بددعا کا عمل دخل تھا۔ کوئی ایسا جذبہ جس کے آبگینے کو میری لاپروائی سے ٹھیس لگی ہوگی۔ اگلی صبح بے حد بوجھل تھی۔ ناشتے کی میز پر مما کی آنکھیں صاف چغلی کھا رہی تھیں کہ وہ رات بھر نہیں سوئی۔ پاپا بھی چپ چپ سے تھے اور پھر بالآخر انہوں نے ہی یہ خاموشی توڑی۔ ''ساحر بیٹا، تمہاری مما تمہارے اس فیصلے سے بے حد ڈسٹرب ہیں۔ میں تو کہتا ہوں بیٹا اُس بزرگ کی بات کو اتنا سیریس لینے کی ضرورت نہیں ہے۔ میں نے ابھی ہمت نہیں ہاری ہے۔ ہم ایک بار پھر زہرا کا رشتہ لے کر جائیں گے اور مجھے اُمید ہے کہ جلد، یا بدیر ہم انہیں منا ہی لیں گے اور اس کے لیے تمہیں کسی بھی شرط وغیرہ کے چکر میں پڑنے کی قطعاً کوئی ضرورت نہیں ہے۔'' میری توقع کے مطابق کاشف نے بہت تفصیل سے مما پاپا سے بات کی تھی۔ ''کیوں پاپا...... کہیں آپ دونوں کو یہ ڈر تو نہیں کہ اس درگاہ میں رہتے رہتے کہیں میرا من بھی مذہب کی

طرف متوجہ نہ ہو جائے اور فرض کریں، اگر ایسا ہو بھی گیا تو اس میں بُرائی ہی کیا ہے؟ مجھے تو یہ سودا دونوں طرف سے فائدے کا ہی لگتا ہے۔ آخر ہم سب مذہب سے اس قدر خوف زدہ کیوں رہتے ہیں۔ یہ کیسا آسیب ہے جس کا ڈر ساری زندگی ہمارے اردگرد بھٹکتا رہتا ہے اور ہم تمام عمر اس سے بھاگتے ہی رہتے ہیں۔ کیوں ایک بار رُک کر، پلٹ کر اس چیز کا سامنا نہیں کر لیتے۔ آخر مذہب ہم سے ہمارا کیا چھین لے گا؟'' مما اور پپا نے آج تک کبھی میرے منہ سے اس قسم کی باتیں نہیں سنی تھیں۔ وہ دونوں ہی حیرت زدہ سے بیٹھے تھے۔ پپا نے ایک لمبی سی سانس لی۔ ''ہاں...... شاید ہم خوف زدہ ہیں، ہر اس چیز سے جو تمہیں ہم سے دُور لے جا سکتی ہو۔ پھر چاہے وہ مذہب ہی کیوں نہ ہو اور اکلوتی اولاد کے ماں باپ ہونے کے ناتے، یہ خوف ہمارا حق ہے اور یہ حق ہم سے ہمارا مذہب بھی نہیں چھینتا، شاید اسی لیے اُس بزرگ نے تمہیں بھی یہ حق یاد دلایا تھا۔'' مما بولیں تو اُن کی آواز کچھ بھرائی ہوئی تھی۔ ''اور پھر بیٹا...... یہ تو پاگل پن ہے کہ صرف ایک لڑکی کے حصول کے لیے تم دنیا کے باقی سبھی رشتوں کو بھلا دو...... کیا ہم تمہارے کچھ نہیں لگتے؟'' ''آپ دونوں میرے لیے دنیا کی ہر چیز سے بڑھ کر ہو، لیکن میری رُوح کے دھاگے قدرت نے اُس لڑکی سے باندھ دیئے ہیں مما...... میرا دم اُس کے بغیر گھٹتا ہے۔ اگر یہ ناانصافی ہے تو یقین کریں کہ میرا اس میں کوئی قصور نہیں ہے۔ سارا قصور اُس جذبے کا ہے، اُس جذبے کی شدت کا ہے، جس نے میری رُوح کو اُس کا قیدی بنا دیا ہے۔ آپ بتائیں میں کیا کروں؟ کہاں جاؤں؟''

وہ دونوں ہی چپ چاپ اور لاجواب سے بیٹھے رہے۔ اتنے میں ڈاکٹر یزدانی کا فون آ گیا۔ انہوں نے مجھ سے بات کر کے اپنے کلینک آنے کا کہا۔ شاید کچھ مزید ٹیسٹ وغیرہ کرنا چاہتے تھے۔ پہلے تو میں نے ٹالنا چاہا، پھر مما اور پاپا کا موڈ دیکھ کر ہامی بھر لی۔ پپا نے ڈرائیور کو گاڑی نکالنے کا کہا اور ہم سبھی ڈاکٹر کے کلینک چل پڑے، جہاں سے کافی دیر بعد ہماری واپسی ہوئی۔ واپسی پر سارے راستے مما پپا سے میری بحث جاری رہی۔ وہ دونوں کسی صورت مجھے اجازت دینے پر راضی نہیں تھے۔ مما تو باقاعدہ رو رہی تھیں۔ ''ساحر...... تم ہوش میں تو ہو...... اتنا پڑھ لکھ کر تم اس درگاہ کی نوکری پر لگ جاؤ گے...... لوگ کیا کہیں گے؟'' ''آپ کو لوگوں کی فکر ہے، یا اپنے بیٹے کی۔ اور پھر مجھے ویسے بھی تو ماسٹرز کے لیے انگلینڈ جانا ہی تھا۔

آپ یہی سمجھئے گا کہ میں اعلیٰ تعلیم کے لیے گھر سے باہر ہوں...... بلکہ وہاں سے تو ویک اینڈ اور عید وغیرہ پر گھر آنا بھی ناممکن تھا، جب کہ یہاں سے میں آسانی سے آپ سے ملنے آ سکتا ہوں۔ آپ کو میری دُوری محسوس بھی نہیں ہو گی۔'' ''کم آن ساحر'' اب پپا کی باری تھی۔ ''انگلینڈ سے ماسٹرز کرنے اور ایک درگاہ کا متولی بن کر رہنے میں بہت فرق ہے۔ ہم تمہیں مولوی نہیں، ایم بی اے بنانا چاہتے ہیں۔'' گھر میں بھی یہی بحث جاری رہی۔ ''دنیا کے سبھی والدین یہ کیوں چاہتے ہیں کہ اُن کا بیٹا پڑھ لکھ کر ڈاکٹر، انجینئر، یا پائلٹ ہی بنے؟ میں وہاں مولوی بننے نہیں جا رہا، کیونکہ شاید لغت میں یہ لفظ جن کے لیے موجود ہے، وہ بہت باعلم اور بڑے لوگ ہوتے ہیں۔ میں تو صرف اپنی غرض کے لیے یہ راستہ اختیار کر رہا ہوں۔ لیکن سوچنے کی بات یہ ہے کہ دنیا کے کوئی بھی والدین اپنی مرضی سے اپنے کسی ایک بچے کو بھی دین کی راہ پر کیوں نہیں ڈالتے۔ آپ کے ذہن میں مولوی کا جو تاثر ہے، وہ بھی کسی ایسے انسان ہی کا ہے، جو زندگی میں اور کچھ نہیں کر پاتا تو اس نے یہی کام بطور پیشہ اختیار کر لیا۔ پھر ہمیں گلہ کس بات کا ہے؟ جب ہم اپنی اولاد ہی کو اس راستے پر چلنے کی اجازت نہیں دیتے تو پھر جو اس خدمت میں مشغول ہیں، اُن کی کم علمی پر پتھر اُچھالنے کا بھی بھلا ہمیں کیا حق ہے؟'' پاپا زچ ہو گئے۔ ''لیکن ہماری سوسائٹی اسے قبول نہیں کر پائے گی۔'' ''سوسائٹی کے قانون ہم خود بناتے ہیں پپا...... آپ نے ساری عمر میں اتنا کما لیا ہے کہ اگر آپ کی اگلی سات نسلیں بھی بیٹھ کر کھاتی رہیں تو یہ دولت ختم نہیں ہو گی، لیکن مجھے اپنے آپ کو پانے کا موقع شاید یہ زندگی دوبارہ کبھی نہ دے...... مجھے اس راہ پر چلنے دیں...... اگر یہی میرا مقدر ہے تو مجھے اسے جھیلنے دیں...... آپ جانتے ہیں کہ اگر میں اس گھر میں قید رہا تو میری رُوح ہمیشہ کے لیے دو ٹکڑوں میں تقسیم ہو جائے گی۔ مجھے اپنے دل اور دماغ کی یہ جنگ لڑ لینے دیں۔ جیت دل کی ہو، یا پھر دماغ کی...... اصل فاتح آپ کا بیٹا ہی ہو گا۔''

میں مما پپا کو شش و پنج میں چھوڑ کر اپنے کمرے میں چلا آیا۔ ساری رات مما اور پپا کے زور زور سے بولنے کی آوازیں آتی رہیں۔ لیکن میں جانتا تھا کہ میری حالت کے پیشِ نظر پپا آخر کار مما کو منا ہی لیں گے اور پھر یہی ہوا، صبح جب میں ناشتے کی میز پر پہنچا تو مما کی آنکھیں سوجی ہوئی تھیں، شاید وہ رات بھر روتی رہی تھیں۔ میں نے اُن کا دل بہلانے کے لیے بات

شروع کی" آپ جانتی ہیں کہ اگر آپ یونہی روتی رہیں تو میں جا نہیں پاؤں گا...... سلطان بابا
کی لگائی ہوئی شرط کا فائدہ اُٹھا رہی ہیں کیا؟" اُن کے ہونٹوں پر دھیمی سی مسکراہٹ اُبھری۔
"بہت ضدی ہو ساحر...... لیکن ایک وعدہ کرنا ہوگا کہ ہر ہفتے گھر آؤ گے اور ہمارا بھی جب بھی
دل چاہے گا، ہم تم سے ملنے وہاں آ سکیں گے...... خدا کرے تمہارا یہ جنون جلدی ختم ہو......
مجھے تمہاری بہت فکر رہے گی۔" اور پھر مما پاپا کی ایسی بہت فکروں اور اُن دونوں کی بھیگی پلکوں
کے سائے میں، میں گھر سے رُخصت ہوگیا۔ وہ دونوں مجھے درگاہ تک چھوڑنے کے لیے آ
چاہتے تھے، لیکن میں نے بڑی مشکل سے اُنہیں گھر ہی میں روک دیا۔ میں جانتا تھا کہ مما کا
دل بہت نازک ہے اور وہ زیادہ دیر اپنے فیصلے پر قائم نہیں رہ پائیں گی۔ سلطان بابا کی شرط
کے مطابق میں گھر سے خالی ہاتھ ہی نکلا تھا۔ درگاہ کے صحن میں قدم رکھا تو سلطان بابا اور
عبداللہ کو سفر کے لیے تیار پایا۔ سلطان بابا نے غور سے مجھے دیکھا" ...... ہاں میاں...... اپنے
والدین کی اجازت سے آئے ہو نا......" "جی ہاں...... بڑی مشکل سے اجازت ملی ہے، لیکن
گیا ہوں......" عبداللہ مسکرایا۔ "میں جانتا تھا...... تم ضرور آؤ گے...... آؤ میں تمہیں کچھ ضرور
باتیں سمجھا دوں۔" عبداللہ نے کچھ ہی دیر میں مجھے تمام معمولات سے آگاہ کر دیا اور پھر اتنے
میں اُن کے جانے کا وقت بھی ہوگیا۔ سلطان بابا جاتے جاتے رُکے اور میرے کاندھے
ہاتھ رکھ کر بولے "پہلا پڑاؤ تو تم نے کامیابی سے طے کرلیا۔ ثابت قدم رہے تو اپنی مراد بھی
لو گے ایک دن...... جیتے رہو......" عبداللہ نے جاتے ہوئے مجھے زور سے گلے لگا لیا۔ میں
نے اُس کا ہاتھ تھام کر کہا "سچ تو یہ ہے کہ میں اندر سے اب تک دو حصوں میں بٹا ہوا ہوں
دعا کرنا کہ میں یہ ذمہ داری ٹھیک طرح سے سرانجام دوں، کہیں میرے قدم نہ لڑکھڑ
جائیں......" عبداللہ نے میرا ہاتھ زور سے تھام لیا اور مسکرا کر بولا "گرتے ہیں شہسوار ہی
میدان جنگ میں۔" پھر آگے بڑھتے بڑھتے اُسے جیسے کوئی ضروری بات یاد آگئی۔ اُس نے
جلدی سے اپنے کرتے کی جیب سے ایک پرچی نکالی اور میرے ہاتھ میں تھما دی۔ میں ایک
ضروری بات تو تمہیں بتانا بھول ہی گیا تھا۔ سلطان بابا نے تمہارا اپنا نام رکھ دیا ہے۔ ویسے
جیسے میرا رکھا گیا تھا، جب میں یہاں پر آیا تھا۔ اس پرچی پر لکھا ہے، ہمارے جانے کے بع
دیکھ لینا۔ لوگ اب تمہیں اِسی نام سے پکاریں گے یہاں......" یہ اک نئی حیرت تھی میرے

لیے۔ "کیا؟ یہ تم کیا کہہ رہے ہو؟ کیا یہاں آنے سے پہلے تمہارا کچھ اور نام تھا......؟ کیا نام تھا
تمہارا......" "عدنان...... عامر عدنان نام تھا، پہلے میرا...... اچھا اب چلوں...... سلطان بابا
بہت دیر سے دروازے پر کھڑے ہیں...... نئی جگہ پر پہنچ کر خط لکھوں گا...... اپنا خیال رکھنا......
فی امان اللہ۔"

عبداللہ مجھے گلے لگا کر آگے بڑھ گیا اور میں جانے کتنی دیر حیرت میں ڈوبا، گم صم وہاں
کھڑا رہا...... ڈھلتے سورج کی ڈوبتی کرنوں میں دُور نیچے ساحل کے آخری کنارے پر میں نے
عبداللہ اور سلطان بابا کے ہیولے کو آخری بار اوجھل ہوتے ہوئے دیکھا۔ تب ہی اچانک مجھے
اپنے ہاتھ میں پکڑی کاغذ کی اُس پرچی کا خیال آیا، جو جاتے وقت عبداللہ مجھے دے گیا تھا۔
کچھ عجب سی کیفیت میں لرزتے ہاتھوں سے وہ پرچی کھولی۔ پرچی پر لکھا ہوا نام میری ہتھیلی
کے پسینے سے بھیگ کر پھیلنے لگا تھا، میرے ذہن میں جیسے ایک ساتھ ہی کئی جھکڑ سے چلنے
لگے۔ پرچی پر اپنا نیا نام دیکھ کر میرے قدم لڑکھڑا سے گئے، میرا نیا نام تھا......"عبداللہ"

عبداللہ

میں جانے کتنی دیر سے اپنے نام کی پرچی ہاتھ میں لیے، آپنے آس پاس چلی غیر مرئی ی
آندھیوں کے شور میں وہیں درگاہ کے صحن میں کھڑا تھا۔ سلطان بابا اور عبداللہ کو گئے بہت دیر ہو
چکی تھی اور اب رات کا اندھیرا دھیرے دھیرے درگاہ کو اپنی لپیٹ میں لے رہا تھا۔ سلطان با
نے آج سے میری ایک نئی شناخت تجویز کر دی تھی۔ اب میں ساحر نہیں عبداللہ تھا۔ مجھ سے
پہلے یہاں کوئی اور عبداللہ تعینات تھا۔ گویا حاکم بابا اور سلطان بابا بھی اصل میں حاکم او
سلطان نہیں تھے، اُن کے اصل نام بھی کبھی کچھ اور ہوں گے اور پھر وہ بھی یونہی عبداللہ کے
عہدے سے ترقی کر کے پہلے حاکم اور پھر سلطان بنے ہوں گے......؟ عہدوں کا یہ سلسلہ کہاں
جا کر ختم ہوتا ہوگا......؟ میں جس قدر سوچتا رہا، اُسی قدر اُلجھتا چلا گیا۔ لیکن میں تو یہاں چند
دن کے لیے عارضی طور پر آیا تھا اور میرا مقصد صرف اور صرف زہرا کا حصول تھا۔ مجھے تو زہ
کو پاتے ہی اپنی اصل دنیا کی جانب لوٹ جانا تھا، تو پھر سلطان بابا نے اس عارضی مقصد ک
پانے کے لیے میری باقاعدہ "عبداللہ" کے عہدے پر تعیناتی کیوں کر دی تھی......؟ کیا ار
دکھاوے کا مقصد بھی کہیں اُس سنگ مرمر کی مورت کو پگھلانا تو نہیں تھا؟

رات اب باقاعدہ اور پوری طرح سے تمام ساحل پر اپنے پنجے گاڑھ چکی تھی۔ درگاہ میں
بجلی کا انتظام نہیں تھا۔ میں نے عبداللہ کی دی ہوئی ہدایات کے مطابق درگاہ میں رکھے ہوئے
چند مٹی کے چراغ روشن کر دیئے۔ انہی ہدایات میں یہ بات بھی کہیں درج تھی کہ مٹی کے ان
دیوں کے لیے تیل خریدنے کا اہتمام بھی مجھے اپنی مزدوری کے پیسوں ہی سے کرنا تھا۔ فی
الحال، کچھ تیل ان چراغوں میں باقی تھا۔ دفعتہً تنہائی اور اُداسی کی ایک بھرپور لہر نے میرے
پورے وجود کو جیسے لرز سا دیا۔ مجھے اپنے والدین، دوست، رنگین زندگی کی رومانی شامیں اور
مدہوش سی راتیں بُری طرح یاد آنے لگیں۔ مجھے یاد آیا کہ اس وقت اگر کبھی میں خوش قسمتی سے
گھر میں موجود ہوتا تھا تو مما کیسے بھاگ بھاگ کر کچن میں کک کو میرے لیے مختلف ڈشز تیا

کرنے کا حکم دیتی رہتی تھیں، پاپا جلدی سے شطرنج کی بازی جما لیتے تھے اور اُن کی ہمیشہ کوشش رہتی کہ وہ مجھ سے جیتنے کے بجائے ہارتے جائیں۔ نہ جانے انہیں مجھ سے ہارنے میں اتنا لطف کیوں آتا تھا؟ میں اپنی ساری دنیا تیاگ کر، اس اندھیری رات میں یہاں اس ویران درگاہ میں کیا کر رہا تھا......؟ یہ میں نے کیسا سودا کر لیا تھا؟ یہ سب کچھ سوچ کر دل جیسے کٹنے سا لگا۔ جتنی تنہائی اور اُداسی میں نے درگاہ کی اس پہلی رات میں اپنی رُوح کے اندر اُترتی محسوس کی، ویسی تو کبھی زندگی بھر نہیں جھیلی تھی۔ کہتے ہیں، رات کا فسوں ہر چیز کی حقیقت کو اُس کی اصل شدت سے کہیں زیادہ اُبھار کر پیش کرتا ہے۔ شاید میرے ساتھ بھی ڈھلتی رات کا جادو وہی کھیل، کھیل رہا تھا۔ میں بہت دیر تک درگاہ کی بیرونی دیوار کے ساتھ ٹیک لگا کر دُور شور مچاتے ساحل کو دیکھتا رہا۔ کنارے سے کچھ فاصلے پر ایک بحری جہاز میری طرح تنہا سمندر کی لہروں پر ڈول رہا تھا۔ دُور سے جب اس کی ٹمٹماتی بتیاں لحہ بھر کو چمکتیں تو مجھے ایسا لگتا کہ جیسے وہ بھی حیرت سے میری جانب دیکھ رہی ہیں کہ یہ "بنجارہ" اس ویرانے میں اکیلا بیٹھا کیا کر رہا ہے؟ ایسے ہی نہ جانے کتنے خیالات کی یلغار میں رات کے کسی پہر میری آنکھ لگ گئی اور پھر اچانک ہی مجھے یوں لگا، جیسے کسی نے دھیرے سے میرا کاندھا چھوا ہو۔ میں نے جھٹکے سے پلکیں کھولیں تو صبح ہونے کو تھی۔ کوئی شخص میرے قریب بیٹھا میرا کاندھا ہلا رہا تھا۔ "اُٹھ جاؤ بھائی......نماز کا وقت ہونے والا ہے۔" کچھ دیر تو مجھے سمجھ ہی نہیں آیا کہ میں کہاں ہوں۔ میں نے گھبرا کر سامنے بیٹھے شخص کو دیکھا جو اپنے حلیے سے مقامی مچھیرا لگتا تھا۔ وہ پھر گویا ہوا "نماز کھڑی ہونے والی ہے...... اُٹھ جاؤ......" میں نے اُس کے ہاتھ کے اشارے کے تعاقب میں نظر دوڑائی تو درگاہ کے بالکل سامنے والی چٹان پر پتھر کی ایک چھوٹی سی مسجد بنی ہوئی تھی۔ مجھے یاد آیا کہ سلطان بابا کے احکامات میں سے ایک حکم پانچوں وقت کی نماز پڑھنے کا بھی تھا، لیکن مجھے تو نماز پڑھے جانے کتنے سال گزر چکے تھے۔ سچ تو یہ ہے کہ مجھے اس وقت فجر کی نماز کی پوری رکعتیں بھی یاد نہیں تھیں۔ بہرحال میں نے جلدی سے اُٹھ کر منہ پہ پانی کے چند چھینٹے مارے۔ بھلا ہو ان چند نمازیوں کا جو مسجد کے باہر بنے چھوٹے سے حوض کے کنارے وضو کر رہے تھے، تو میں نے بھی اُنہی میں سے ایک کے قاعدے کو پوری طرح نقل کیا اور مسجد میں داخل ہو گیا۔ میرے ساتھ دو نمازی اور بھی مسجد میں داخل ہوئے تھے اور دونوں ہی نے

جلدی سے شاید سنتوں کی نیت باندھ لی۔ میں نے بھی اُنہی کی تقلید کی اور اُن کے ساتھ
سلام پھیر دیا۔ کچھ ہی دیر میں مولانا صاحب بھی تشریف لے آئے اور جماعت کھڑی ہو
انہوں نے جب پہلی رکعت شروع کی تو مجھے دھیرے دھیرے بچپن میں اپنے اسلامیات
ٹیچر کی حفظ کروائی ہوئی نماز اور سورتیں یاد آنے لگیں۔ کتنی عجیب بات تھی، ہم مذہب کو چا
کتنا بھی بھلا دیں...... مذہب نہیں بھلاتا۔ وہ کسی میٹھی یاد کی طرح ہمارے دل کے
خانوں میں کہیں نہ کہیں چھپا رہتا ہے اور جیسے ہی ہم کبھی کسی مجبوری میں اُسے آواز دیتے
وہ چھم سے کود کر ہمارے سامنے آ جاتا ہے۔ جب تک مولانا صاحب نے سلام پھیرا، میر
ذہن اور دل کے تمام دریچے وا ہو چکے تھے۔ مجھے بہت کچھ یاد آ چکا تھا۔

نماز کے بعد وہ نورانی چہرے والے امام ہماری طرف پلٹے اور کھنکار کر کہنے لگے۔ ''
بھئی ساتھیو...... تو کل ہم نے درس کہاں ختم کیا تھا۔'' مقتدیوں میں سے ایک نے جلدی
لقمہ دیا ''مولانا صاحب...... آپ حضرت سلیمان علیہ السلام کے قصے تک پہنچے تھے۔''
امام نے ایک لمبا سا ہنکارا بھرا اور غور سے ہم سب کی طرف دیکھا۔ ''ہاں تو میں کہہ رہا تھا
حضرت سلیمان علیہ السلام کا دربار لگا ہوا تھا، سبھی درباری مؤدب بیٹھے ہوئے تھے کہ ایک شخ
نہایت گھبرایا ہوا سا اُن کے دربار میں حاضر ہوا۔ اُس کے چہرے پر ہوائیاں سی اُڑ رہی تھی
وہ آتے ہی حضرت سلیمان علیہ السلام کے قدموں میں گر گیا کہ اُس نے ابھی ابھی حضر
عزرائیل علیہ السلام یعنی ملک الموت کو حضرت سلیمان علیہ السلام کے دربار کے باہر دیکھا
اور اُسے یقین ہے کہ وہ اُسی کی رُوح قبض کرنے کے لیے آج یہاں آئے ہیں، لہٰذا اُس
گزارش ہے کہ حضرت سلیمان علیہ السلام ہواؤں کو حکم دیں کہ فوراً اُسے اپنی طاقت سے اُڑا
دنیا کے دوسرے کونے میں پہنچا آئیں۔ ساتھیو، آپ تو جانتے ہیں کہ خدا نے حضرت سلیما
علیہ السلام کو بڑی طاقت عطا کی تھی۔ تمام جنات، ہوائیں، سب چرند پرند، حضرت سلیمان ع
السلام کے تابع تھے، تو حضرت سلیمان علیہ السلام نے فریادی کی فریاد قبول کر لی اور ہوا کو حکم
کہ اس شخص کو پل بھر میں دنیا کے آخری سرے تک پہنچا آئے۔ ہوا نے حکم کی تعمیل کی اور ا
دربار لگا ہی ہوا تھا کہ حضرت عزرائیل علیہ السلام بھی کسی بھیس میں اُس دربار میں آ پہنچ
حضرت سلیمان علیہ السلام نے بطور مزاح اُن سے پوچھا کہ ''کیوں حضرت...... آج تک ا

جانیں قبض کی ہیں، کبھی کچھ مشکل بھی پیش آئی......؟'' حضرت عزرائیل علیہ السلام نے جواب
دیا ''ہاں آج ایک عجیب واقعہ ہوا، جس نے کچھ دیر کے لیے تو مجھے بھی سوچ میں ڈال دیا۔ ہوا
یہ کہ آج مجھے دنیا کے دوسرے سرے پر ایک شخص کی رُوح قبض کرنے کا حکم ملا تھا، لیکن ابھی
چند لمحے پہلے میں نے جب اُسی شخص کو آپ کے دربار کے باہر دیکھا تو میں خود بھی متزلزل ہو
گیا کہ یہ شخص تو یہاں موجود ہے، جب کہ میری فہرست کے مطابق مجھے یہاں سے ہزاروں
میل دُور اُسے بے جان کرنا تھا۔ لیکن ایک لمحہ پہلے جب میں اُس مقام پہ پہنچا، جہاں اُس
شخص کا آخری سانس لکھا تھا تو وہ وہاں مجھ سے پہلے موجود تھا...... سچ ہے...... خدا کے کام......
خدا ہی جانے......'' مولانا صاحب نے قصہ ختم کر کے تمام نمازیوں کی طرف دیکھا، جو سبھی دم
سادھے مؤدب بیٹھے تھے۔ انہوں نے سب سے سوال کیا۔ ''ہاں تو ساتھیو...... اس واقعے سے
آپ کو کیا سبق ملا......؟ یہی نہ کہ موت سے کسی کو رُخصت نہیں۔ ہر ذی نفس کو اس کا ذائقہ
چکھنا ہوگا۔ چاہے انسان کتنی ہی تدبیر کیوں نہ کر لے، تقدیر پھر بھی اٹل ہے اور یہ بھی طے ہے
کہ جس کی موت جہاں آنی ہے، قدرت اُسے خود وہاں پہنچا دیتی ہے اور تب تک موت خود
زندگی کی حفاظت کرتی رہتی ہے......'' سبھی نمازیوں نے زور سے سر ہلا کر مولانا صاحب کی
باتوں کی تائید کی۔ یہ آس پاس کی بستیوں کے چند مچھیرے تھے جو روز صبح سویرے سمندر کی
طرف نکلنے سے پہلے نماز فجر کی ادائیگی کے لیے یہاں جمع ہوتے تھے۔ مولانا صاحب نے
درس ختم کرتے ہوئے اختتامی کلمات کہے ''اور اس سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ قدرت نے
جب جس سے، جہاں، جو کام لینا ہوتا ہے...... اُسے کسی نہ کسی بہانے وہاں کھینچ لے جایا جاتا
ہے۔ وہ کہتے ہیں نا...... جب جب، جو جو ہونا ہے، تب تب، سو سو ہوتا ہے......'' مجھے حیرت کا
ایک جھٹکا سا لگا...... بالکل ایسی ہی بات عبداللہ نے تب کہی تھی جب میں زہرا کی تلاش میں
دوسری مرتبہ درگاہ آیا تھا۔ سبھی نمازی ایک ایک کر کے پیش امام صاحب سے مصافحہ کرتے
ہوئے مسجد سے نکلتے گئے۔ میں نے بھی اِسی روایت کی تقلید میں انہیں سلام کیا اور واپسی کے
لیے قدم مسجد کے دروازے کی جانب بڑھائے ہی تھے کہ دفعتہً پیچھے سے پیش امام صاحب کی
آواز اُبھری ''عبداللہ بیٹا...... تم ذرا رُکو...... مجھے تم سے کچھ بات کرنی ہے......'' میں نے اُن
جانے میں فوراً پلٹ کر اُن کی نظروں کے تعاقب میں دیکھا کہ جیسے وہ ''عبداللہ'' ہی سے

مخاطب ہوں، لیکن میری حیرت اُس وقت دوچند ہوگئی جب مجھے یہ پتا چلا کہ اُن کا مخاطب ''میں'' ہوں۔ مجھے زندگی میں پہلی مرتبہ کسی نے سلطان بابا کے دیئے ہوئے نام سے پکارا تھا، لہٰذا میرا چونکنا تو فطری تھا، لیکن انہیں کیسے علم ہوا کہ میرا نام عبداللہ ہے۔ وہ میری حیرت کو بھانپ گئے اور مسکرا کر بولے۔ ''تمہاری حیرت بجا ہے۔ دراصل پچھلے عبداللہ نے جاتے ہوئے خود مجھے بتایا تھا کہ اُس کا کوئی دوست اُس کی جگہ لینے آرہا ہے اور سلطان بابا نے اُس کا نام بھی ''عبداللہ'' ہی تجویز کیا ہے...... آؤ...... یہاں بیٹھ جاؤ......''

میں ایک حیرت آمیز اُلجھن لیے، اُن کے سامنے بیٹھ گیا۔ عبداللہ نے مجھ سے تو کبھی اُن کا ذکر نہیں کیا تھا۔ پھر یہ صاحب میرے بارے میں اس قدر تفصیل سے کیسے جانتے تھے۔ میرے دل میں کئی سوال مچلے، لیکن میں احتراماً چپ رہا۔ پھر انہوں نے خود ہی باتوں کا سلسلہ جوڑا۔ ''میرا نام مولوی خضرالدین ہے۔ گزشتہ کئی برسوں سے اس مسجد کی امامت کر رہا ہوں۔ تم سناؤ...... کیسی گزر رہی ہے...... کوئی تکلیف تو نہیں ہے یہاں؟'' ''نہیں...... ایسی کوئی خاص تکلیف تو نہیں ہے...... ایک آدھ دن میں عادی ہو جاؤں گا، اس ماحول کا......'' ''ہاں میاں...... عادت پڑ ہی جاتی ہے...... بات بس خود کو ڈھالنے کی ہے...... تم نے اپنے گزر بسر کے بارے میں کیا سوچا ہے...... درگاہ میں کچھ کھانے پینے کو بھی موجود ہے کہ نہیں......؟'' مطلب یہ کہ عبداللہ نے انہیں کافی تفصیل سے میرے بارے میں بتا رکھا تھا۔ ''جی...... کچھ سامان عبداللہ چھوڑ گیا ہے...... ایک آدھ دن گزارہ ہو جائے گا...... پھر سوچوں گا کہ آگے کیا کرنا ہے۔'' ''نہیں میاں...... آج کا کام کل پر کیوں چھوڑتے ہو...... میری مانو تو آج ہی سے کام پر لگ جاؤ......'' مولانا صاحب مجھ سے باتیں کرتے ہوئے ایک آدھ بار اُٹھ کر مسجد کے اندر ہی بنے اپنے حجرے میں بھی گئے اور پھر کچھ ہی دیر میں مسجد کے چھوٹے سے کمرے میں چائے کی سوندھی خوشبو پھیلنے لگی۔ اُن کے حجرے کا ایک دروازہ مسجد کے اندرونی کمرے میں بھی کھلتا تھا اور کچھ ہی دیر میں وہ ایک چھوٹی سی ٹرے میں ایک چائے دانی، دو کپ اور شاید رات کی بچی ہوئی روٹی کے کچھ ٹکڑے لیے چلے آئے۔ میں اُن کے اس اچانک تکلف پر کچھ ایسا بوکھلایا کہ جلدی میں کچھ کہہ بھی نہیں سکا اور بس ''ارے...... ارے......'' ہی کرتا رہ گیا۔ مولوی خضر ہلکے سے مسکائے ''بھئی تمہیں تو شاید پسند نہ آئے...... پر ہمارا تو روز کا یہی

ناشتا ہے...... آج تم بھی گزارہ کر لو۔ کل سے اپنی پسند کا بنا لینا......'' میں نے حیرت سے اُن کی طرف دیکھا۔ ''آپ اپنا ناشتا خود ہی بناتے ہیں...... میرا مطلب ہے کہ......'' ''ہاں میاں...... چھڑا بندہ اپنا سامان خود تیار نہ کرے تو کیا کرے......'' وہ ہنس کر بولے ''اکیلا رہتا ہوں...... شادی وغیرہ کے جھمیلے میں نہیں پڑا۔ ماں باپ عرصہ ہوا، اللہ کو پیارے ہو چکے...... اب تو خود اپنا بھی چل چلاؤ ہے......'' ہم چائے پیتے ہوئے باتیں کرتے رہے۔ ''ہاں تو میں کہہ رہا تھا کہ تم چاہو تو آج ہی سے اپنا کام شروع کر سکتے ہو۔ ابھی کچھ دیر میں نیچے ساحل پر سیپیوں اور گھونگھوں کا بازار لگے گا، تم پچاس روپے کی چھوٹی ناکارہ سیپیاں خرید لینا اور پھر قریبی بستی کے اتوار بازار میں بیچ آنا۔ اس روز وہاں زائرین کا بھی خاصا ریلا ہوتا ہے۔ تمہیں ضرور بیس پچیس روپے کا فائدہ ہو جائے گا اور اتنے پیسے تمہاری روزانہ کی گزر بسر اور درگاہ کے چراغوں کے تیل کے لیے کافی ہیں۔''

میں غور سے مولوی صاحب کی بات سنتا رہا، لیکن بنیادی مسئلہ تو یہ تھا کہ اس وقت میرے پاس سیپیاں خریدنے کے لیے پچاس روپے بھی نہیں تھے، کیوں کہ مجھے سلطان بابا کی شرط کے مطابق گھر سے بالکل خالی ہاتھ درگاہ آنا تھا۔ غالباً مولوی خضر میرے اندر کی ہچکچاہٹ محسوس کر گئے۔ ''کیا ہوا......؟ لگتا ہے، تمہارے پاس پیسے نہیں ہیں۔ بھئی یہ تو کوئی بڑا مسئلہ نہیں ہے۔ ایسا کرو تم مجھ سے اُدھار لے لو...... پر یاد رہے...... جیسے ہی تمہاری پہلی کمائی ہو...... یہ اُدھار لوٹانا ہوگا...... بولو منظور ہے......'' میں کچھ ہچکچایا۔ ''لیکن اگر مجھے اس سودے میں نقصان ہو گیا تو...... میرا مطلب ہے، آپ رہنے دیں...... میں کچھ نہ کچھ بندوبست کر لوں گا......'' حالانکہ میں جانتا تھا کہ میرے پاس پیسوں کا بندوبست کرنے کا اور کوئی بھی ذریعہ موجود نہیں، لیکن نہ جانے کیوں مولوی خضر کی محنت کی کمائی کو داؤ پر لگاتے ہوئے مجھے کچھ ہچکچاہٹ سی محسوس ہو رہی تھی۔ لیکن انہوں نے زبردستی پچاس کا نوٹ میری قمیص کی جیب میں ڈال دیا اور مسکرا کر بولے ''ارے بھئی اُدھار کے نام سے تذبذب میں پڑنے کی ضرورت نہیں ہے...... اچھا چلو...... قرضِ حسنہ ہی سمجھ کر رکھ لو...... اگر نقصان ہو گیا تو قرضہ معاف...... ویسے ان پچاس روپوں میں بڑی برکت ہے...... دیکھ لینا تمہیں فائدہ ہی ہوگا۔ اچھا چلو، آج میں بھی تمہارے ساتھ ہی ساحل تک چلتا ہوں...... تمہارا پہلا دن ہے...... کہیں خراب مال ہی نہ اُٹھا

لو......'' مولوی خضر نے برتن سمیٹے اور میرے ساتھ چلنے کے لیے اُٹھ کھڑے ہوئے۔ میں نے ممنونیت سے اُن کی جانب دیکھا۔ ''آپ کیوں میرے لیے اتنی تکلیف اُٹھاتے ہیں...... میں خود ہی چلا جاؤں گا۔'' لیکن وہ بھی اپنی دُھن کے پکے نکلے۔ فٹافٹ تیار ہو کر سر پر امامہ باندھے، مجھے ساتھ لیے، نیچے ساحل پر بیٹھے مچھیروں کے ٹولے کے قریب پہنچ گئے، جو ذرا ذرا سے فاصلے پر اپنے سامنے تازہ سیپیوں اور گھونگھوں کا انبار سجائے بیٹھے تھے۔ مولوی خضر نے نہایت انہماک اور کافی بھاؤ تاؤ کے بعد سیپیاں خرید لیں۔ ساتھ ہی وہ مجھے اچھی سیپیوں کی خصوصیات اور پہچان بھی بتاتے رہے، تاکہ آئندہ ایسے کسی سودے میں مجھے کوئی نقصان نہ ہو۔ عجیب کمال شخص تھے مولوی خضر الدین...... کچھ ہی دیر میں مجھ سے یوں گھل مل گئے جیسے برسوں کی شناسائی ہو۔ میں نے یہ بات بھی محسوس کی کہ نہ صرف ساحل پر، بلکہ علاقے کے تقریباً سبھی لوگ اُن کا بے حد احترام کرتے تھے اور اگر وہ ذرا سا بھی اشارہ کر دیتے تو لوگ بنا کسی مول تول ہی کے، سارا کا سارا بازار اُن کے قدموں میں لا ڈالتے، لیکن انہوں نے پکے کاروباریوں کی طرح ایک ایک سیپی پر لمبی بحث کی اور مال خرید کر میرے حوالے کر دیا۔ واپسی پر انہوں نے تفصیل سے مجھے مالائیں بنانے کا ہنر بھی سکھا دیا کہ کس طرح سیپی کو ایک خاص زاویے سے دھاگے میں پرونا ہے۔ ہم دونوں جب اپنی ''خریداری'' کے بعد اُوپر درگاہ تک پہنچے، ظہر کی نماز کا وقت قریب آ چکا تھا، جب کہ مجھے ابھی اپنے دوپہر کے کھانے کا انتظام بھی کرنا تھا۔ عبداللہ نے اپنے حجرے کے چھوٹے سے باورچی خانے میں ضرورت کے چار برتن اور کچھ راشن میرے لیے چھوڑ دیا تھا، لیکن مسئلہ یہ تھا کہ مجھے تو ٹھیک سے انڈا اُبالنا بھی نہیں آتا تھا۔ یہاں بھی مولوی خضر ہی میرے کام آئے اور انہوں نے خود میرے کمرے میں آ کر تھوڑی سی دال کے ساتھ کچھ چاول اُبال کر میرے ''لنچ'' اور ''ڈنر'' کا انتظام کر دیا۔

ابھی چوبیس گھنٹے پہلے ہی کی بات تھی، جب میں دوپہر کے ٹھیک اِسی لمحے اپنے سارے دوستوں کے ساتھ پرل کانٹی نینٹل میں اُن کی طرف سے دیا گیا الوداعی ظہرانہ تناول کر رہا تھا۔ یہ لنچ دراصل کاشف کی طرف سے میرے اعزاز میں دیا گیا تھا۔ اور اُن سب نے مجھے گلے لگا کر اس دعا کے ساتھ رُخصت کیا تھا کہ میں ایک آدھ ہفتے میں سلطان بابا سے اپنی ''شرط'' جیت کر واپس انہیں جوائن کر لوں گا۔ ہم سب کے لیے یہ ''درگاہ یاترا'' صرف ایک شرط ہی تو

تھی اور میں اس سے پہلے بھی ایسی کئی شرطیں جیت چکا تھا، لیکن یہ میری زندگی کی شاید سب سے مشکل کسوٹی تھی۔ اگر میرے دوست، یا والدین مجھے اس روز وہ سادہ سے دال چاول کھاتے دیکھ لیتے تو شاید حیرت اور صدمے سے بے ہوش ہو جاتے، البتہ اپنی استقامت پر تو خود مجھے بھی حیرت ہو رہی تھی کہ میں کس آسانی سے اس ماحول میں ڈھلتا جا رہا تھا۔

دن ڈھلا اور پھر سے وہی تنہا اور اُداس شام درگاہ کی دیواروں پر اُتر آئی۔ ایک ہی دن میں میری زندگی کس قدر بدل چکی تھی۔ عام حالات میں، میں اس وقت سو کر اُٹھتا تھا اور نیم گرم پانی کا شاور لینے کے بعد تیار ہو کر کلب، ہوٹل، یا کسی دوست کی پارٹی میں محفل جمتی تھی، جس کا خاتمہ عموماً آدھی رات کے بعد ہی ہوتا تھا اور ہم اُس وقت اپنے گھروں کو سونے کے لیے لوٹتے تھے، جب باقی لوگ جاگ کر اپنے کام کاج پر نکل رہے ہوتے تھے۔ اچانک سمندر کی طرف سے چلنے والی ہوا میں کچھ شور اور ہلے گلے کی مدھم سی آوازیں بھی شامل ہو گئیں۔ میں نے چونک کر دُور نیچے ساحل پر نظر ڈالی، کچھ نوجوان لڑکے، لڑکیوں کا ایک گروپ ساحل پر رات گزارنے کے لیے کیمپ فائر کر رہا تھا۔ ساحل پر آگ جلا کر اور بڑے بڑے اسپیکرز پر موسیقی کی دُھن پر رقص جاری تھا۔ خوشی تھی، ہنسی تھی، قہقہے تھے اور مستی تھی۔ میں بہت دیر تک دُور نیچے ساحل پر اس گروپ کو دیکھتا رہا۔ مجھے یوں لگ رہا تھا جیسے وہ میرے ہی دوستوں کا گروپ ہو۔ ہم بھی تو ایسے ہی راتوں کو موج مستی کرنے نکل جاتے تھے۔ اچانک میوزک کی بیٹ بدل گئی اور ہوا میں نئے نغمے کی آواز گونجی۔ لڑکے، لڑکیاں خوشی سے چلائے ''پرانی جینز اور گٹار......'' لڑکیاں، لڑکے دیوانہ وار ناچ رہے تھے۔

لڑکپن کا...... وہ پہلا پیار......
وہ لکھنا ہاتھوں پہ...... اے پلس آر (A+R)
وہ دینا تحفے میں...... سونے کی بالیاں
وہ لینا دوستوں سے پیسے اُدھار......

دفعتاً مجھے اپنے گالوں پر کچھ نمی کا سا احساس ہوا۔ میں نے چونک کر ہاتھ پھیرا تو میری اُنگلیوں کی پوریں، خود میرے اپنے آنسوؤں سے بھیگ گئیں۔ میں نہ جانے کب سے رو رہا تھا۔ ٹھیک ہی تو ہے ''بس یادیں اور کچھ چھوٹی چھوٹی باتیں ہی تو رہ جاتی ہیں'' اور یادوں کے

اسی کڑوے دھویں نے میرے حلق میں کانٹوں کا وہ جنگل اُگا یا کہ پھر میرے آنسو روکے
رُکے۔ مجھے یاد آیا کہ یہ گانا عینی کو بھی بہت پسند تھا اور ہم کالج کینٹین میں گھنٹوں میزیں بجا
کر یہ گانا گایا کرتے تھے۔ میری آنکھوں سے آنسوؤں کی جھڑی یونہی رواں تھی کہ اچانک مجھے
اپنے کاندھے پر کسی نرم ہاتھ کا دباؤ محسوس ہوا۔

خضرِ راہ

میں چونک کر پلٹا تو مولوی خضر میرے پیچھے کھڑے تھے۔ میں نے جلدی سے آنکھیں
پونچھ ڈالیں، لیکن شاید وہ اس اندھیرے میں بھی میری بھیگی پلکوں کی تحریر پڑھ چکے تھے۔ ''لگتا
ہے کچھ یاد آ گیا تمہیں......؟'' میں نے جلدی سے بات بنائی ''نہیں...... وہ نیچے کچھ نوجوان
پارٹی کر رہے ہیں...... شاید اُن کے بار بی کیو کے دھویں سے آنکھیں جلنے لگی تھیں......''
مولوی خضر دھیرے سے مسکائے ''ہاں میاں...... دھواں لکڑی کا ہو، یا پھر یادوں کا...... دونوں
صورتوں میں آنکھ تو جلتی ہے۔'' میں نے چونک کر اُن کی جانب دیکھا۔ لیکن وہ جہاں دیدہ
شخص تھے، بات بدل کر بولے ''کل صبح ساحل کے بازار اکٹھے چلیں گے، مجھے بھی کچھ راشن
خریدنا ہے۔ ویسے تم نے آج کتنی سیپیاں پروئیں......'' ''جی سات مالائیں ہی پرو پایا ہوں اب
تک۔'' انہوں نے خوش ہو کر میرے سر پر ہاتھ پھیر کر دعا دی۔ ''شاباش...... تم واقعی ایک محنتی
اور اپنی دُھن کے پکے لڑکے ہو...... مجھے یقین ہے، تم زندگی کے ہر میدان میں سرخرو ہو گے۔''
میں زندگی میں کبھی کسی کے سامنے نہیں رویا، لیکن نہ جانے اُن کی اس دعا میں اور اس لمحے میں
کیسا اثر تھا کہ میرا پہلے ہی سے بھرا دل چھلک پڑا اور میری آنکھیں پھر سے بہہ نکلیں۔ مولوی
خضر الدین نے میرا کاندھا تھپتھپایا اور مجھے تسلی دے کر بولے۔ ''یہ آنسو بھی تمہارا سچ ظاہر
کرتے ہیں، کیوں کہ جن کے دل میں کھوٹ ہوتا ہے، اُن کی آنکھوں کے کنویں سدا خشک ہی
رہتے ہیں...... لیکن میری ایک بات ہمیشہ یاد رکھنا...... یہ آنسو کسی کی بھی زندگی کا رُخ بدل
سکتے ہیں، اس لیے انہیں ہمیشہ اپنی طاقت بنائے رکھنا، کبھی اپنی کمزوری نہ بنانا...... کیوں کہ میں
جانتا ہوں کہ تم کمزور نہیں ہو......'' مولوی خضر میری ہمت بڑھا کر واپس پلٹ گئے۔

درگاہ میں میری دوسری رات بھی اسی بے چینی، بے کسی اور درد کی تڑپ میں گزر گئی۔
اگلے دن پھر سے وہی سارا معمول جاری رہا اور مولوی خضر میری راہ کے خضر بنے، مجھے راستہ
دکھاتے اور سہارا دیتے رہے۔ سچ ہے کہ اگر ان ابتدائی دنوں میں مجھے اُن کا ساتھ حاصل نہ

ہوتا تو شاید میرے لیے درگاہ کی اس سادہ، مگر میرے لیے انتہائی سخت، زندگی کے معمول میں ڈھلنا اتنا آسان نہ ہوتا۔

اِسی طرح تین دن بیت گئے اور جمعرات کا دن بھی آ پہنچا۔ جمعرات کو تمام زائرین درگاہ کی زیارت کے لیے آتے تھے۔ نہ جانے کیوں صبح ہی سے میرا دل ہر آہٹ پر چونکنے اور ہر سرگوشی پر بُری طرح دھڑکنے لگا تھا۔ یہی تو وہ دن تھا، جب وہ نسیم سحر، اس درگاہ کے فرش پر اپنے گلاب قدموں کا بوسہ دیتی تھی۔ سہ پہر تک تو میری گھبراہٹ اس قدر بڑھ چکی تھی کہ مجھے یوں لگنے لگا کہ جیسے میرا دل ابھی میرے سینے کا پنجرہ توڑ کر باہر آ گرے گا اور پھر چار بجے کے قریب اچانک ہی وہ ٹھنڈی سی پروائی چلی، جو میری رُوح تک کو سرشار کر دیتی تھی۔ میں نے گھبرا کر نظریں اُٹھائیں تو وہ ماہ رُخ اسی شان سے چلتی ہوئی درگاہ کے صحن میں داخل ہو رہی تھی، ساتھ ہی حسب معمول اُس کی ماں اور دو قدم پیچھے اُس کی خادمہ بھی آہستہ آہستہ قدم اُٹھاتی آ رہی تھیں۔ اُس نے درگاہ کے دروازے کے قریب صفائی کرتے زائر سے کچھ پوچھا، شاید عبداللہ کے بارے میں استفسار کیا ہو۔ زائر نے جواب میں میری طرف اُنگلی اُٹھا کر اشارہ کر دیا۔ میں اس وقت درگاہ کے مرکزی صحن میں دروازے سے بہت دُور بیٹھا ہوا تھا۔ لیکن جب زہرا نے پلٹ کر میری طرف دیکھا تو اتنی دُور سے بھی اُس کی حیرت آمیز نگاہوں کی تپش سے مجھے اپنا پورا وجود پگھلتا ہوا محسوس ہوا۔ اُس کی مجھ پر نظر پڑی اور یہ میری تقدیر کی وہ پہلی نظر تھی، جس کا وقفہ شاید سب سے لمبا تھا۔ زہرا نے زندگی میں پہلی بار اتنی دیر تک میری جانب دیکھا تھا۔ شاید وہ حیرت اور صدمے کی وجہ سے اپنی نظر مجھ سے ہٹا نہیں پائی تھی۔ لیکن میں نے اپنی زندگی کے ان چند لمحوں کو کچھ اسی طرح جیا کہ پھر کسی اور سانس کی ضرورت ہی باقی نہیں رہ گئی۔ کسی کے لیے فنا ہو جانے کا اس سے بہتر موقع اور کیا ہو سکتا ہے کہ اُس کے دل بر کی نگاہ اُس پر ٹکی ہو اور وہ اپنی جان اُس جان آفرین کے سپرد کر دے۔ کچھ دیر تک زہرا مجھے اور میں اُسے دیکھتا رہا۔ پھر جیسے اُسے کچھ خیال آیا اور اُس نے اپنی نظریں جھکا لیں۔ مجھے یوں لگا جیسے بہت گھنی اور کالی گھٹا کے سائے کے بعد اچانک ہی بے حد تیز اور چبھن والی دھوپ نکل آئی ہو۔ زہرا کی ماں کی نظر بھی مجھ پر پڑی اور انہیں بھی اپنی بیٹی جیسا ہی شدید حیرت کا جھٹکا لگا۔ وہ تیز قدموں سے میری طرف کھنچی چلی آئیں۔ زہرا اور خادمہ اپنی جگہ پر کھڑے رہ گئے۔

انہوں نے آتے ہی میرے سلام کا جواب دیا اور جلدی سے میرے سر پر ہاتھ پھیر کر میرے چہرے کو یوں ٹٹولا، جیسے وہ میرے ہونے کا یقین کرنا چاہتی ہوں۔ پھر بہت دیر بعد اُن کے ہونٹوں سے کچھ ٹوٹے لفظ ادا ہوئے۔ ''ساحر بیٹا...... تم...... یہاں...... میرا مطلب ہے اپنا گھر بار چھوڑ کر اس طرح...... لیکن کیوں......'' شاید انہیں خود بھی سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیا کہنا چاہ رہی ہیں۔ میں نے انہیں اس صدمے سے نکالنے کے لیے خود ہی بات جوڑنے کی کوشش کی۔ ''جی...... میں نے سوچا کہ کچھ دن زندگی کا یہ رُخ بھی دیکھ لیا جائے تو کیا حرج ہے، اور ہاں...... لوگ مجھے یہاں 'عبداللہ' کے نام سے جانتے ہیں۔ ساحر اب میرا پرانا نام ہے......'' اَن جانے میں میرے منہ سے ایک ایسی بات نکل گئی جو نہیں کچھ دیر سے پتا چلتی تو بہتر ہوتا۔ میرے منہ سے میرا نام سن کر تو وہ جیسے بالکل ہی ڈھے سی گئیں اور وہیں درگاہ کے صحن کے فرش پر بیٹھ گئیں۔ میں نے جلدی سے انہیں قریبی گھڑے سے پانی کا ایک گلاس نکال کر پیش کیا اور تسلی دی ''آپ اپنے ذہن پر کوئی بوجھ نہ لیں۔ یہ راستہ میں نے خود اپنی مرضی سے اختیار کیا ہے، بنا کسی جبر کے...... بس آپ میرے لیے دعا کیجیے گا۔''

میں وہاں سے اُٹھ کر اپنے حجرے کی جانب چلا آیا، کیونکہ کچھ دیر ہی میں نذر و نیاز کا سلسلہ شروع ہونے والا تھا۔ میں نے درگاہ کے معمول کے مطابق پہلے مردانے والے برآمدے کی جانب بیٹھ کر نذرانے جمع کر کے اُن کی فہرست بنائی اور اُسی وقت جمعرات کے دن خصوصی طور پر آئے ہوئے درگاہ کے چند خدمت گاروں کے ذریعے اُن کی تقسیم کے احکامات بھی جاری کر دیئے۔ پھر میں حجرے میں بنی اُس کھڑکی میں آ بیٹھا، جو درگاہ کے پچھلے برآمدے میں کھلتی تھی اور جمعرات کے دن خصوصی طور پر زنانے کے لیے استعمال ہوتی تھی۔ کچھ ہی دیر میں خواتین کی آمد بھی شروع ہو گئی، جو اپنی نذر اور صدقہ وغیرہ اس چھوٹی سی کھڑکی سے اندر بڑھا کر اپنے مختلف النوع وقسم کے مسائل کے حل کے لیے دعا کی درخواست کرتیں اور دعا کے بعد اُٹھ کر یوں مطمئن ہو کر چلی جاتیں، جیسے اس دعا کے بعد واقعی اُن کے سب مسائل ایک دم حل ہی تو ہو جائیں گے؟ اور پھر کچھ ہی دیر بعد اُسی مترنم آواز نے دھیرے سے سلام کیا۔ وہی آواز جسے میں دنیا کی اربوں آوازوں میں بھی، بنا ایک پل ضائع کیے، شناخت کر سکتا تھا۔ میری آواز گلے میں اٹکنے سی لگی اور مجھ سے ٹھیک طرح سے جواب بھی نہیں دیا

گیا۔ کچھ دیر دوسری جانب بھی خاموشی چھائی رہی۔ پھر وہ دھیرے سے بولی "یہ آپ کیا
رہے ہیں...... خدا کے لیے اپنی ضد چھوڑ دیں...... ایسے بھلا کون، کسی کے لیے اپنی زندگی بر
کرتا ہے......؟" مجھے اپنی سماعت پر یقین نہیں آیا۔ وہ مجھ سے مخاطب تھی، جس کی صرف ای
جھلک دیکھنے کے لیے میں نے اپنی زندگی تیاگ دی تھی۔ لیکن یہ جوگ مجھے اتنا بڑا انعام د
گا، یہ تو میرے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا۔ میں تو صرف اُس کی آواز سننے کے لیے ایسے
جانے کتنے جنم، اس درگاہ پر تیاگنے کے لیے تیار تھا اور اُسے صرف میری اسی ایک حقیر زندگی
فکر لگی ہوئی تھی۔ میری طرف سے کوئی جواب نہ پا کر اُس نے پھر بے چین ہو کر اپنی با
دہرائی۔ "آپ چپ کیوں ہیں...... بولتے کیوں نہیں......؟" میں اپنے خیالات کی رو
چونکا۔ "شاید کچھ لوگوں کے مقدر ہی میں بربادی ہوتی ہے۔ کچھ زندگیاں ملتی ہی صرف تباہ
جانے کے لیے ہیں......" وہ بھڑک سی گئی۔ "آپ صرف پتھروں سے سر ٹکرا رہے ہیں۔
سوائے زخموں کے اور کچھ نہیں حاصل کر پائیں گے آپ......" "مجھے مرہم کی تمنا بھی نہیں
ہے...... پتھروں سے سر ٹکرانے کا شوق ہی مجھے یہاں تک لے کر آیا ہے۔ لیکن کچھ پتھر شاید
نہیں جانتے کہ جس جبیں کو وہ یوں لہولہان کر رہے ہیں، اُسی پیشانی سے چھلکتا خون، خود انہیں
بھی تو داغ دار کر دے گا۔" زہرا کو میری بات سن کر غصہ آ گیا۔ "بات اگر داغ دار ہونے
ہے تو اپنا دامن بھی کون سا اُجلا ہے...... ایک داغ اور سہی...... بہرحال...... میں پھر بھی آ
سے یہی درخواست کروں گی کہ یہ پاگل پن چھوڑ دیں...... یہ راہ پہلے ہی کئی زندگیاں برباد
چکی ہے...... میں نہیں چاہتی کہ ایک اور جیون اس کی بھینٹ چڑھے...... آگے آپ کی
مرضی......" وہ وہاں سے اُٹھ کر چلی گئی۔ مجھے یاد نہیں، میں نے کس طرح اُس کی خادمہ
اُس کا نذرانہ وصول کیا اور کس طرح باقی خواتین کے مسائل سنے۔ بس ایک خواب کی
کیفیت میں سارا وقت گزر گیا۔ ہوش تب آیا، جب مولوی خضر کے بھیجے ہوئے ایک شخص نے
کر اطلاع دی کہ مغرب کی اذان ہو رہی ہے اور مولوی صاحب مسجد میں میرا انتظار کر رہے
ہیں۔ میں نے سارا سامان اور نقد رقم وغیرہ درگاہ کے خصوصی زائر کے حوالے کی اور خود مسجد
آیا۔ نماز کے بعد جب مسجد خالی ہو گئی تو مولوی خضر مجھے اپنے ساتھ لیے چہل قدمی کرنے
ساحل کی جانب چلے آئے۔ ساحل اس وقت بالکل سنسان پڑا تھا۔ مغرب کی جانب سے چل

ٹھنڈی پروائی میں شامل نمی نے کچھ ہی دیر میں ہم دونوں کو بھگو دیا۔ انہوں نے شاید میری
خاموشی کو محسوس کر لیا تھا، تبھی ہلکے سے کھنکار کر بولے "کیوں میاں...... آج کچھ کھوئے کھوئے
سے لگتے ہو...... سب خیر تو ہے نا......" "جی...... کچھ خاص نہیں...... بس یوں ہی کچھ سوچ رہا
تھا......" "اچھی بات ہے...... انسان کو سوچتے رہنا چاہیے...... ہماری دنیا میں آمد کا اصل مقصد
بھی یہی سوچ اور یہی کھوج ہے...... اور اِسی کھوج اور اِسی جستجو کا ہمیں حکم بھی دیا گیا۔" "نہ
جانے آپ کس کھوج کا ذکر کر رہے ہیں، لیکن میری سوچ تو کافی خود غرض سی ہے...... میں
اپنے ہی ایک مسئلے کے بارے میں سوچ رہا تھا...... جس کا فائدہ، یا نقصان صرف میری ذات
تک محدود ہے......" مولوی خضر چلتے چلتے رُک گئے اور انہوں نے اپنی اُنگلی کے اشارے سے
میری توجہ دُور سمندر میں کھڑے ایک بحری جہاز کی جانب مبذول کروائی۔ "جانتے ہو......
سمندر کے بیچوں بیچ کھڑا یہ دیو ہیکل جہاز بھی کسی انسان کی ایسی ہی سوچ کا نتیجہ ہے، جو ہو سکتا
ہے کہ شروع میں اُسے بھی صرف اپنی ایک خود غرضانہ سوچ لگی ہو......" "میں سمجھا نہیں......
آپ کیا کہنا چاہتے ہیں......" مولوی صاحب نے غور سے میری جانب دیکھا "دنیا کی ہر ایجاد،
تبدیلی اور ترقی کسی سوچ ہی کا نتیجہ ہوتی ہے...... ہاں البتہ کوشش اور لگن کا جنون شرط آخر
ہے...... انسان سوچتا ہے پھر کوشش کرتا ہے اور پھر اُوپر والا چاہے تو اُس کی سوچ کو الہام بنا
دیتا ہے۔ انسان کے ذہن میں وہ کلیہ ڈال دیتا ہے، جو آگے چل کر اُس کی، اس بحری جہاز
جیسی ہی کسی کامیابی کا ذریعہ بن جاتا ہے...... لہٰذا سوچ کس قدر ضروری ہے...... اس کا اندازہ
اب تم خود ہی لگا لو......" اُن کی باتیں سن کر میں چونک سا گیا۔ "گویا آپ یہ کہنا چاہتے ہیں کہ
یہ بحری جہاز، یا پھر اس جیسی اور سبھی ایجادیں انسان کی اپنی کوشش کی نہیں...... بلکہ کسی الہام کی
مرہونِ منت ہیں......؟" وہ میری طرف دیکھ کر ہلکا سا مسکرائے۔ "کافی ذہین ہو...... میں
صرف اتنا کہنا چاہتا ہوں کہ بھرپور کوشش اور شدید محنت کے بعد ملنے والی کامیابی بھی کسی ایسے
اشارے کے تابع ہوتی ہے، جو قدرت انسان کے ذہن میں ڈال دیتی ہے۔ بات لمبی ہو جائے
گی...... چلو عشاء کا وقت ہو رہا ہے...... ہم نماز کے بعد اس موضوع پر بات کریں گے......"

ہم دونوں واپس درگاہ کی جانب پلٹ گئے۔ عشاء کی نماز کے بعد جب سب نمازی مسجد
سے نکل گئے تو مولوی خضر میری جانب متوجہ ہوئے۔ "ہاں تو میاں...... میرے کہنے کا مقصد

یہ تھا کہ قدرت نے انسان کو کھوج کے لیے ہی دنیا میں بھیجا ہے اور جو بھی اس سوچ و بچار
کھوج پر محنت کرتا ہے، قدرت اُسے کامیابی کا پھل دیتی ہے۔ پھر چاہے وہ ایمان والا ہو،
پھر کوئی کافر...... اس سوچ بچار اور تحقیق کے انعام میں قدرت نے کوئی تخصیص نہیں برتی...
اور اس کی مثال تمہارے سامنے ہی ہے کہ گزشتہ کئی صدیوں سے مسلمانوں کی کوئی قابل ذ
ایجاد سامنے نہیں آئی، جب کہ غیر مسلم اس تحقیق اور ایجاد کے میدان میں ہم مسلمانوں
کہیں زیادہ آگے نکل چکے ہیں۔ لیکن یہ بات طے ہے کہ چاہے مسلم ہو، یا غیر مسلم شدید محن
کے بعد کامیابی کا یہ فارمولا قدرت کسی الہام ہی سے اُن کے ذہنوں میں منتقل کرتی ہے،
ہم کمزور انسان اپنی محنت کا ثمر جان کر فخر سے اِتراتے پھرتے ہیں۔ اس کے لیے ایک چھو
سی مثال دیتا ہوں تمہیں۔ کیا نام تھا اُس سائنس دان کا...... ہاں...... نیوٹن...... کیا تم سمجھتے
کہ اُسے خاص اُس لمحے، جب وہ سیب گرنے والا تھا، اُس درخت کے نیچے از خود پہنچ
چاہیے تھا......؟ اور کیا اُس کے ذہن میں یہ خیال خود اپنے طور پر ہی آ گیا ہوگا کہ یہ سیب ز
کی طرف کیوں آیا......؟ ...... اور پھر یہی خیال اُس کے آس پاس کے لوگوں، یا پھر اُس
پہلے کسی اور کے ذہن میں کیوں نہیں آیا؟ اور اگر کبھی آیا بھی تھا تو اُس نے اس عمل کی ج
کیوں نہیں کی؟ کیا یہ سب باتیں اسے نیوٹن کا الہام ثابت نہیں کرتیں...... اور پھر صرف کش
ثقل ہی کی کیا بات ہے...... رائٹ برادران کے اُڑنے کے خواب سے لے کر نیل آ
اسٹرانگ کے چاند پر قدم رکھنے تک کا ہر خواب بھی تو ایک الہام ہی تھا، جو کسی نہ کسی خواب
سوچ کے ذریعے قدرت نے اُن کے دلوں میں ڈال دیا تھا۔'' مولوی خضر بولتے چلے گئے
میں حیرت کے عالم میں ساکت سا بیٹھا، اُن کی باتیں سنتا رہا۔ سائنس میں نے بھی پڑھی
لیکن سائنس کے بارے میں اس قدر تازہ نظریہ میں نے آج تک نہیں سنا تھا۔ وہ چپ ہو
تو میرے منہ سے بے ساختہ نکل گیا۔ ''آپ کا نام مولوی خضر الدین کے بجائے پروفیسر
ہونا چاہیے تھا......؟'' میرے اچانک ریمارکس سن کر وہ دھیرے سے ہنس پڑھے۔ ''ضرو
نہیں ہوتا کہ علم صرف کتابوں، یا یونیورسٹی ہی سے حاصل کیا جائے...... ایک سچے طالب
کے لیے ساری دنیا ہی ایک درس گاہ ہے...... ویسے کہنے کو میں نے بھی برائے نام کچھ ع
فزکس کی ڈگری لینے کے بعد پروفیسر شپ کی ہے، ایک بڑی یونیورسٹی میں...... لیکن

رائیگاں ہی گیا......'' میں اپنی جگہ سن سا بیٹھا رہ گیا۔ میں جب سے درگاہ کی اس نئی دنیا میں آیا
تھا، قدم قدم پر مجھے ایسی ایسی حیرتوں کا سامنا کرنا پڑ رہا تھا کہ اب تک تو مجھے ان جھٹکوں کا
عادی ہو جانا چاہیے تھا۔ لیکن مولوی خضر بھی ایک ایسے ہی صاحب کمال شخص نکلیں گے، یہ میں
نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا۔ آخر میرے ہونٹوں پر وہ سوال آ ہی گیا، جو نہ جانے کتنے دنوں سے
میرے دل و دماغ میں مچل رہا تھا۔ ''آج آپ مجھے بتا ہی دیں کہ آپ سب کس نگری سے
تعلق رکھتے ہیں۔ پہلے عبداللہ، پھر سلطان بابا اور اب آپ، ایسے اور کتنے لوگ موجود ہیں،
میرے آس پاس۔ ان طلسمات کی کوئی حد بھی ہے، یا نہیں...... آخر یہ کون سی دنیا ہے......؟''
''ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ ہم سب بھی اِسی نگری کے ہیں، جہاں تم بستے ہو۔ بس ہم نے راستہ
ذرا مختلف اختیار کیا ہے۔ منزل ہماری بھی وہی ہے، جو باقی سب کی ہے۔'' ''لیکن کوئی تو بات
ہو گی، جو آپ سب اتنا پڑھنے کے بعد اپنی اپنی فیلڈز چھوڑ کر اس راستے پر نکل پڑے
ہیں......؟ کوئی تو کشش ہو گی اس دنیا کی؟'' ''کشش صرف تحقیق اور جستجو کی ہے۔ آخر ہمیں
دنیا میں بھیجے جانے کا مقصد صرف روزگار کمانا اور بچے پیدا کرنا تو نہیں ہو سکتا نا۔ لیکن افسوس
کہ ہم انہی جھمیلوں میں پڑ کر اپنا سارا جیون ضائع کر دیتے ہیں۔ ہماری اس ظاہری دنیا کے
آس پاس اور بھی ایسے کئی جہاں ہیں، جنہیں کھوجنے کی ضرورت ہے۔ ہم غیروں پر تکیہ کیے ہی
کیوں بیٹھے ہیں، جب کہ یہ سارا علم تو مومن کی معراج ہے......؟''

مولوی خضر رات گئے تک مجھے تحقیق اور جستجو کی افادیت پر لیکچر دیتے رہے۔ مجھے اُن کی
سبھی باتیں سمجھ تو نہیں آئیں، لیکن ایک بات کا یقین پوری طرح ہو چکا تھا کہ ہمارے آس
پاس ایک نظر نہ آنے والا غیر مرئی نظام بھی پوری طرح متحرک اور کاربند ہے جس کا دائرہ کار
وہاں سے شروع ہوتا ہے جہاں ہمارا یہ ظاہری نظام ختم ہو جاتا ہے۔ لیکن اس ماورائی دنیا سے
میرا پورا تعارف ہونا ابھی باقی تھا۔ میں رات بہت دیر سے مولوی خضر کے حجرے سے نکل کر
''درگاہ'' لوٹا۔ ایک عجیب سی بے چینی محسوس کر رہا تھا، جیسے کچھ ہونے والا ہو۔ میرا اپنے
کمرے میں جا کر سونے کو من نہیں ہوا تو میں وہیں صحن میں ہاتھوں کا تکیہ بنا کر کچھ دیر کمر
ٹکانے کے لیے لیٹ گیا، اور پھر رات کے نہ جانے کس پہر میری آنکھ ذرا سی لگی ہی تھی کہ
اچانک مجھے اپنے آس پاس وہی ٹھنڈی سی پروائی چلتی ہوئی محسوس ہوئی۔ ہاں...... وہی سکون

آمیزسی ٹھنڈک کا احساس، جو ہر مرتبہ میرے سراپے کو اُس وقت گھیر لیتا تھا، جب کبھی میرا زہرا سے آمنا سامنا ہوتا تھا۔ مجھے جیسے ہی اس احساس نے چھوا...... میں نے گھبرا کر جھٹ سے آنکھیں کھول دیں اور اُٹھ بیٹھا۔ کچھ دیر تو مجھ سمجھ ہی نہ آیا کہ ہوا کیا ہے، پھر ایک ہلکی سی آہٹ ہوئی اور میں نے چونک کر درگاہ کے دروازے کی جانب دیکھا۔ دروازے کے بیچوں بیچ زہرہ کھڑی تھی۔

من کی لگن

ہاں...... وہ زہرا تھی۔ پہلے پہل تو مجھے بھی یہ لگا کہ میں دیوانگی کی اس سطح تک پہنچ گیا ہوں جہاں انسان جاگتی آنکھوں سے بھی سپنے دیکھنے لگتا ہے، لیکن جب میں نے زہرا کے پیچھے اُس کی ماں اور ڈرائیور کو بھی دروازے سے اندر داخل ہوتے دیکھا تو مجھے اپنی نظروں پہ یقین آ ہی گیا۔ لیکن وہ رات کے اس پہر، یہاں اس ویرانے میں کیا کر رہی تھی؟ اور رات بھی کہاں......اب تو سحر قریب تھی۔ زہرا کی حالت کافی ابتر تھی۔ میں نے آج تک اُسے پورے، یا آدھے نقاب کے بغیر گھر سے باہر نکلتے ہوئے نہیں دیکھا تھا، لیکن آج اُس کا مہتاب چہرہ بے نقاب تھا اور غزال آنکھوں تلے پڑے حلقے اس بات کی نشان دہی کر رہے تھے کہ وہ کئی دنوں سے نہیں سوئی۔ پر اس وقت وہ اس قدر پریشان نظر آ رہی تھی کہ میرے منہ سے گھبراہٹ میں صرف دو لفظ ہی نکل پائے۔ ''آپ...... یہاں......؟'' زہرا سے پہلے اُس کی والدہ بول اُٹھیں۔ ''معاف کرنا بیٹا...... ہمیں اس وقت اس طرح یہاں نہیں آنا چاہیے تھا، لیکن وہ کہتے ہیں نا......اولاد ضرور ہو...... پر اکلوتی نہ ہو......بس اِسی اکلوتی اولاد کے پیار کی وجہ سے ہم بھی یوں در در بھٹک رہے ہیں......'' مجھے اُن کی بات سمجھ میں نہیں آئی، لیکن میں نے اخلاقی فرض نبھایا۔ ''آپ حکم کریں...... میں کیا مدد کر سکتا ہوں......'' اس بار بولنے میں زہرا نے پہل کی۔ اُس کی نظریں جھکی جھکی اور پلکیں لرز رہی تھیں...... ''میں نے انہیں آس پاس کی تمام درگاہوں میں بہت تلاش کیا ہے...... لیکن اُن کا کچھ پتا نہیں چلا...... کیا آپ مجھے اُن کا پتا دے سکتے ہیں...... میں...... میں آپ کا یہ احسان زندگی بھر نہیں بھولوں گی......'' زہرا نے بات ختم کر کے نگاہ اُٹھائی۔ میں اُس کے کانپتے لب دیکھ رہا تھا۔ ہماری نظریں ملیں اور میرے دل کا بچا کھچا تنکوں کا آشیانہ بھی ایک ہی پل میں جل کر خاکستر ہو گیا۔ عموماً شعراء نظر سے نظر کے رشتے کو بہت موضوع گفتگو بناتے ہیں، لیکن ''نظر سے نظر کی التجا'' کو جس قدر تفصیل سے اس وقت میں بیان کر سکتا تھا، شاید کوئی اور نہیں۔ اسے تقدیر کا ستم نہ کہیں تو اور کیا کہ صدیوں کے بعد

محبوب در پر آیا بھی تو صرف رقیب کا پتا لینے...... سچ پوچھیں تو اُس وقت مجھے عبداللہ کی قسمت
پر بے حد رشک آیا۔ وہ نظروں سے اوجھل ہو کر بھی اس نازنین کے کتنے قریب تھا اور میں اُ
کی گھائل نگاہ کے سامنے ہوتے ہوئے بھی کس قدر اوجھل...... شاید وہ میری نظر کی شکایت
بھانپ گئی تھی، تبھی اُس نے پھر سے پلکوں کا پردہ گرا دیا تھا۔ ابھی ایک دن پہلے ہی اتفاق سے
مجھے عبداللہ کا پہلا خط ملا تھا، جو اُس نے اپنی نئی منزل پر پہنچ کر مجھے لکھا تھا۔ عبداللہ اس وقت
یہاں سے تقریباً تین سو کلومیٹر کی دُوری پر کسی اور درگاہ میں تعینات تھا۔ کاش اس پری رُخ
مجھ سے میری جان مانگی ہوتی، پر مانگا بھی تو کیا......؟ رقیب کا پتا...... بہرحال حکم کی تکمیل
بھی میرا فرض ہی ٹھہرا۔ ”آپ یہیں رُکیے......“ میں جلدی سے اپنے حجرے کی جانب بڑھ
گیا۔ عبداللہ کا خط نکال کر ایک طرف رکھا اور لفافہ لا کر زہرا کے ہاتھ میں تھما دیا۔ ”کل مجھ
اُس کا خط ملا...... لفافے کے پیچھے عبداللہ کا پتا موجود ہے......“ زہرا کی بے چین اُنگلیوں
کچھ ایسی تیزی سے لفافے کو ٹٹولا، جیسے شدید پیاس کے عالم میں مرتا ہوا کوئی شخص پانی کا آخر
بچا ہوا گھونٹ پینے کے لیے پیالہ پکڑنے کی سعی کرتا ہے۔ اُس کا بس چلتا تو شاید لفافے
لکھے حروف کو بھی نظر سے پی جاتی۔ اب کی بار اُس نے نظریں اُٹھائیں تو اُس کی نگاہ میں پہل
مرتبہ میرے لیے کچھ نرمی اور ممنونیت سی تھی۔ ”میرے پاس الفاظ نہیں ہیں...... پھر بھی آپ
بہت بہت شکریہ...... کاش میں اس قابل ہوتی کہ آپ کے احسان کا یہ قرض کسی بھی طور اُتا
پاتی......“ زہرا بات ختم کر کے چل دی اور...... میں اُس بھکاری کی طرح کھڑا رہ گیا، جس
اُس کی دن بھر کی بھیک بھی کوئی لٹیرا چھین لے جائے۔ زہرا کی ماں نے واپسی کے لیے قد
بڑھائے اور پھر نہ جانے کیا سوچ کر میری جانب پلٹ آئیں۔ اُن کی آنکھیں بھیگ رہ
تھیں۔ ”اگر زہرا کے ابا کسی کاروباری دورے پر ملک سے باہر نہ گئے ہوتے تو شاید ا
بدنصیب بیٹی کی چاہت بھی مجھے یوں آدھی رات کو اپنی دہلیز پھلانگنے پر مجبور نہیں کر سکتی تھی،
بیٹا، وہ تو سوالی ہے...... اپنے دیوانے پن میں یہاں تک چلی آئی، تم نے اُسے پتا کیوں د
دیا...... تم چھپا بھی تو سکتے تھے......“ وہ کہتے کہتے چپ سی ہو گئیں، لیکن میں اُن کا اشارہ سمجھ
تھا۔ ”ایک سوالی کسی دوسرے سوالی کی التجا بھلا کب ٹال سکتا ہے۔ ہم دونوں کی اذیت مشترک
ہے۔ ہاں! فرق بس اتنا ہے کہ انہیں کوئی پتا بتانے والا تو میسر ہے، جب کہ میری تقدیر

معاملے میں بھی کھوٹی ہے......“ وہ کچھ دیر تک میرے چہرے پر لکھی نہ جانے ضبط کی کون سی
تحریر پڑھتی رہیں، پھر بولیں ”میرا اپنی دعاؤں سے بھروسا اُٹھے عرصہ ہو گیا ہے...... لیکن پھر بھی
اگر کوئی ایک آخری دعا قدرت نے قبولیت کے لیے باقی رکھ چھوڑی ہے تو میں اُسے تمہارے
نام کرتی ہوں۔ کاش میرے نصیب میں تمہاری فرزندی لکھی ہو...... جیتے رہو۔“

اُن کی آنکھیں چھلک پڑیں اور پھر اُن سے رُکا نہیں گیا۔ میرے سر پر ہاتھ پھیر کر دعا
دیتے ہوئے تیزی سے آگے بڑھ گئیں۔ زہرا ڈرائیور کے ساتھ پہلے ہی درگاہ سے نکل چکی
تھی۔ میں اُسی طرح تنہا، بے کس اور لاچار سا درگاہ کے صحن میں کھڑا رہ گیا۔ مجھے اپنے آس
پاس ہزاروں آندھیوں کا شور محسوس ہو رہا تھا۔ نہ جانے لوگ دیوانوں پر ترس کیوں کھاتے
ہیں۔ پاگل پن تو ایک نعمت ہے۔ بدنصیب تو مجھ جیسے ہوش والے ہوتے ہیں، جو ان اذیت
ناک لمحوں کا عذاب جھیلنے کے لیے ہوش و حواس میں رہتے ہیں۔

جب فجر کی اذانیں ختم ہوئیں، تب بھی میں وہیں اُسی جگہ گم صم سا کھڑا تھا۔ اتنے میں
مولوی خضر کا پیغامبر بھی آ کر نماز کھڑی ہونے کی اطلاع دے کر جا چکا تھا۔ مولوی خضر نے
میری ”تازہ تازہ“ نماز کی وجہ سے اپنا یہ معمول بنا رکھا تھا کہ روز صبح احتیاطاً جگانے کے لیے
کسی نہ کسی نمازی کو درگاہ بھیج دیتے تھے۔ اس دن میرا دل نماز پڑھنے پر بھی مائل نہیں تھا، لیکن
جب تیسری مرتبہ مسجد سے میرا بلاوا آیا تو با دل نخواستہ مسجد کی جانب چل پڑا۔ مولوی صاحب
نے نماز ختم کی اور اپنا درس شروع کیا۔ ہاں تو بھئی کل میں بتا رہا تھا کہ حضرت نوح علیہ السلام
اپنے چند پیروکاروں کے ساتھ تشریف فرما تھے کہ ایک نہایت ہی عمر رسیدہ بڑھیا دہائی دیتی ہوئی
آ پہنچی۔ آپ علیہ السلام نے اُس سے ماجرا دریافت کیا تو بڑھیا نے فریاد کی کہ ”یا حضرت......
میرے بچوں کے حق میں دعا فرمائیے...... وہ ڈھائی، تین سو سال کی کچی عمر ہی میں ہوتے ہیں
کہ کسی نہ کسی بیماری کی وجہ سے انتقال کر جاتے ہیں...... آپ اُن کی جوانی اور درازیٔ عمر کے
لیے دعا کیجیے......“ حضرت نوح علیہ السلام بڑھیا کی فریاد سن کر مسکرا دیئے اور دعا کے لیے ہاتھ
بلند کر کے بڑھیا کے حق میں دعا فرما دی۔ بڑھیا کے جانے کے بعد محفل میں سے کسی نے عرض
کیا۔ ”یا حضرت نوح علیہ السلام...... جب اس بڑھیا نے آپ علیہ السلام سے دعا کی
درخواست کی تو آپ علیہ السلام مسکرائے کیوں......؟“ حضرت نوح علیہ السلام نے پھر تبسم

فرمایا اور ارشاد فرمایا۔ "یہ بڑھیا اپنے بچوں کی تین سو سال زندگی کو دراز کرنے کی دعا کی متمنی تھی اور میں یہ سوچ کر مسکرا دیا کہ اگر میں اُسے یہ بتا دیتا کہ ایک ایسا زمانہ بھی آئے گا کہ جب انسان پچاس، ساٹھ سال کی عمر میں پیدا ہو کر نہ صرف بچپن، لڑکپن، نوجوانی، جوانی اور پھر بڑھاپے کی منزلیں پار کر کے طبعی موت مر بھی جائے گا تو کیا یہ اپنے بچوں کی عمر پر خداوند کریم کے آگے سجدۂ شکر نہ بجا لاتی......؟"

ساری محفل انگشت بدنداں رہ گئی۔ کسی نے پوچھا۔ "یا حضرت، کیا واقعی کوئی ایسا زمانہ بھی آئے گا، جب انسان اتنی مختصر عمر میں پیدائش کے بعد بوڑھا ہو کر مر جائے گا۔" حضرت نوح علیہ السلام نے جواب دیا۔ "ہاں......قربِ قیامت کے آس پاس ایک ایسا وقت بھی آئے گا، جب انسان پچاس ساٹھ سال کے مختصر عرصے میں پیدائش سے لے کر بڑھاپے اور پھر موت کے تمام مراحل طے کر لے گا۔" ساری محفل بیک زبان ہو کر بولی۔ "بخدا اگر ایسا کبھی ہمارے زمانے میں ہوتا تو ہم تو چپّے باندھ کر ہی گزارہ کر لیتے اور سجدہ سے سر نہ اُٹھاتے کہ اتنے کم وقت میں گھر بار، کاروبار اور دیگر کام کاج کی طرف کسی کا دھیان ہی کب جاتا......؟"

حضرت نوح علیہ السلام پھر مسکرائے اور انہوں نے محفل کو تنبیہ کی۔ "ہاں......لیکن کتنی عبرت کی بات ہے کہ اُسی دور کے انسان اپنی رہائش کے لیے سب سے پکے محل تعمیر کریں گے......" سب نمازیوں نے اپنے اپنے کانوں کو جلدی سے یوں ہاتھ لگائے، جیسے وہ سب ابھی تک حضرت نوح علیہ السلام کے دور ہی میں بیٹھے ہوں۔ مولوی خضر نے اپنا درس ختم کیا۔ "تو ساتھیو...... ہمیشہ یاد رہے کہ یہ دنیا بڑی عارضی جگہ ہے۔ اس کے لیے بس اتنی ہی محنت کرو، جتنا یہاں رہنا ہے۔" سب نمازی درس کے خاتمے پر حسبِ معمول مولوی صاحب سے مصافحہ کرتے ہوئے رُخصت ہو گئے۔ مولوی خضر نے سب کے جانے کے بعد غور سے میری جانب دیکھا۔ میں ابھی تک سب سے الگ تھلگ مسجد کی دیوار سے ٹیک لگائے بیٹھا تھا۔ انہوں نے شاید میری بے زاری محسوس کر لی۔ "کیوں میاں......آج من کہیں اور لگا ہوا ہے کیا......رات میں تہجد کے لیے اُٹھا تو نیچے ساحل پر بڑی سی موٹر گاڑی کھڑی دیکھی تھی۔ لگتا ہے تمہارے مہمان آئے تھے۔" اُن کے ہونٹوں پر ہلکی سی مسکان اُبھر آئی۔ تو گویا انہیں زہرا کی آمد کا پتا تھا۔ "ہاں......وہ مجھ سے عبداللہ کا پتا مانگنے آئی تھی......" "ارے......تو کہہ دینا تھا کہ عبداللہ تو

اُس کے سامنے کھڑا ہے...... پھر وہ کسے کھوجتی پھر رہی ہے......؟" "وہ مجھے نہیں...... پرانے عبداللہ کی کھوج میں یوں آدھی رات کو ننگے سر چلی آئی تھی۔ میرے ایسے نصیب کہاں کہ وہ مجھے تلاش کرے۔" نہ چاہتے ہوئے بھی میرا لہجہ نہایت تلخ ہو گیا۔ مولوی خضر معنی خیز انداز میں بولے "لیکن آئی تو تمہارے پاس ہی نا......کل تک جو تمہارے سائے سے بھی کتراتی تھی آج اُسے مقدر نے اس قدر مجبور کر دیا کہ یوں آدھی رات کو تمہارے پاس دوڑی چلی آئی۔" میں نے چونک کر مولوی خضر کی جانب دیکھا۔ واقعی اگر دوسرے زاویے سے دیکھا جاتا تو بات تو اُن کی بھی ٹھیک ہی تھی۔ اُس کے ہونٹوں پہ خدا خدا کر کے میرا نام تو آیا، چاہے بر سرِ الزام ہی کیوں نہ آیا۔ گویا سلطان بابا کا وعدہ پورا ہو رہا تھا۔ رفتہ رفتہ اور دھیرے دھیرے...... ہاں البتہ اس ایفائے عہد کی رفتار بہت ہی آہستہ تھی۔ یا پھر میرا بے چین دل ہی نہایت بے صبرا تھا۔ پھر اچانک مجھے احساس ہوا کہ آج تک مولوی خضر نے یوں کھل کر تو کبھی مجھ سے زہرا کا ذکر نہیں کیا تھا، لیکن اُن کی معلومات سے لگتا تھا کہ انہیں سارے قصے کی بخوبی خبر ہے۔ مجھے اپنی چند لمحوں پہلے والی بے خودی پر ندامت سی محسوس ہوئی۔ "تو گویا آپ یہ بھی جانتے ہیں کہ میں صرف زہرا کے حصول کے لیے اس درگاہ تک آیا ہوں، لیکن آپ نے کبھی مجھ پر یہ جتایا کیوں نہیں......" میری سوچ کے دوران وہ حسبِ معمول اپنے ہاتھ کی مزے دار سی چائے بنا چکے تھے۔ میرے سوال پر دھیرے سے مسکرا دیئے۔ "میاں...... سب کچھ جتایا تو نہیں جاتا نا...... اور پھر ویسے بھی یہ تمہارا ذاتی معاملہ تھا۔ میں نے سوچا، تم سے کچھ پوچھوں گا تو تم بھی دل میں سوچو گے کہ بڑے میاں سٹھیا گئے ہیں۔" مجھے اُن کی بات پر ہنسی آ گئی۔ "آپ مجھے ایسا سمجھتے ہیں......؟......آپ سے ایک بات پوچھوں......آپ بُرا تو نہیں منائیں گے......؟" "نہیں نہیں......ضرور پوچھو......تم مجھے بہت عزیز ہو......" میں نے اُن کی آنکھوں میں دیکھا۔ "آپ نے کبھی کسی سے محبت کی ہے......؟"

میرا سوال سن کر اُن کے چہرے پر بچوں کی طرح حیا کا ایک گلابی رنگ آ کر گزر گیا اور وہ ہنس پڑے۔ "کیا میاں......؟......سبھی کچھ اُگلوا لو گے کیا......؟" "بتائیں نا......آپ نے کبھی کسی کو چاہا ہے......اور خدا کے لیے جواب میں یہ نہ کہیے گا کہ ہاں کی ہے، پھولوں سے، موسم سے، سمندر سے اور ان سب کو بنانے والے سے......آپ جانتے ہیں، میں کس سے محبت

کی بات کر رہا ہوں......'' میرے ضدی انداز پر وہ باقاعدہ زور سے ہنس دیئے۔ میں نے اس سے پہلے انہیں یوں ہنستے ہوئے کبھی نہیں دیکھا تھا، نہ جانے کیوں اس لمحے مولوی خضر مجھے بہت اچھے لگے۔ ''ہاں بھئی کی ہے...... اپنے زمانے میں ہم نے بھی کی ہے، محبت...... لیکن ہماری محبت میں اور آج کل کی اس طوفانی محبت میں بہت فرق ہے۔ مجھے جس سے محبت ہوئی، اُسے میں نے پوری زندگی میں صرف دو مرتبہ دیکھا۔ پہلی بار ایک کتابوں کی دُکان پر، جہاں وہ سائیکل رکشے میں اپنی والدہ کے ہمراہ تشریف لائی تھیں اور دوسری مرتبہ ایک لائبریری میں، جہاں ہم نے کسی طور بڑی ہی مشکل سے انہیں آنے کا کہا تھا۔ وہ بس دو منٹ کے لیے آئیں اور جتنی دیر میں لائبریرین کے ہاتھ سے کتاب اُن کے ہاتھ میں منتقل ہوئی، بس اتنی ہی دیر ٹھہریں۔ یہ اتنی سی ہی ہے، ہماری محبت کی کہانی۔'' میرا تجسس بڑھ گیا۔ ''تو پھر آپ نے اُن خاتون کے ہاں رشتہ کیوں نہیں بھیجا۔ میرا مطلب ہے، آپ نے بات آگے کیوں نہیں بڑھائی......؟'' ''بات بڑھتی تو بڑھاتے نا...... لمبی کہانی ہے، میاں۔ پھر کبھی سنائیں گے...... فی الحال تم بس اتنا جان لو کہ محبت کے ہزار سے بھی زیادہ روپ ہوتے ہیں، لیکن محبت ہمیشہ اس خوشبو کی طرح لاحاصل ہی رہتی ہے جو پرفیوم کرتے سے آس پاس فضا میں بکھر جاتی ہے۔ بس ایک کسک ہی اس عشقِ مجازی کا حاصل ہے......'' ''لیکن لوگ محبت میں ایک دوسرے کو پا بھی تو لیتے ہیں...... اس وصل محبت کے بارے میں آپ کیا کہیں گے...... کچھ لوگوں کو اُن کی محبت مل بھی تو جاتی ہے۔'' ''محبت کہاں مل پاتی ہے میاں...... بس جسم مل جاتے ہیں جانے کس بے وقوف نے اس وصل کو محبت کے وصل کا نام دے دیا ہے۔ محبت ہمیشہ سے ایک لاحاصل جذبہ ہے۔'' میں حیرت سے اس وجیہہ بزرگ کو دیکھتا رہا۔ ضرور اُن کا ماضی کسی شدید محبت کی داستان سے گندھا ہوا تھا۔ ورنہ محبت کے بارے میں اتنا منفرد اور انوکھا نظریہ کسی عام شخص کا تو نہیں ہو سکتا تھا۔

اس دن مولوی خضر سے مل کے درگاہ واپسی کے بعد بھی میں بہت دیر تک اُن کے فلسفہ محبت کے بارے میں سوچتا رہا۔ اگر وہ سچ کہہ رہے تھے تو پھر میری زہرا سے محبت کا مقام کیا تھا......؟ کیا حقیقت تھی میری محبت کی؟ کیا میری محبت بھی صرف جسم کے حصول کے لیے ہی تھی؟ لیکن میں نے تو آج تک کبھی زہرا کا جسم پانے کی خواہش تک نہیں کی تھی۔ میں نے

جب بھی اُسے دیکھا، بس اُس کے چہرے کے نور میں کھوتا چلا گیا اور پھر جسم، یا روح کا حصول تو بہت دُور کی بات تھی، وہ تو میرے بارے میں سوچتی تک نہ تھی۔ میں ایسے ہی نہ جانے کتنے خیالوں میں بھنور میں پھنسا غوطے کھا رہا تھا کہ اچانک ایک بار پھر میرے ساتھ وہی عجیب سا واقعہ ہوا جو پہلے بھی درگاہ میں عبداللہ کے حجرے میں پہلی مرتبہ داخل ہوتے ہوئے پیش آیا تھا۔ میں کافی دیر سے درگاہ کے صحن میں بیٹھا تسبیح کی مالائیں پرو رہا تھا اور اپنی محبت کی حقیقت کے بارے میں سوچ رہا تھا کہ اتنے میں باہر سے کسی مچھیرے کی آواز سنائی دی۔ ''عبداللہ بھائی...... تسبیحاں بن گئی ہوں تو دے دو...... میں نیچے بازار کی طرف جا رہا ہوں۔ دُکان پر چھوڑتا جاؤں گا۔'' یہ کریم بلوچ کی آواز تھی۔ مولوی خضر نے اُسے خاص طور پر تاکید کر رکھی تھی کہ جب بھی وہ ظہر کی نماز ادا کرنے کے بعد نیچے بازار جانے لگے تو مجھ سے بھی پوچھ لیا کرے، تاکہ میرا وقت بچ جائے۔ میں نے وہیں سے آواز لگائی۔ ''آیا کریم بھائی......'' اور اُسی لمحے ایک دم میرے ذہن میں پھر ایک جھماکا سا ہوا۔ مجھے یوں لگا کہ کریم پہلے بھی اِسی طرح مجھ سے تسبیح کی مالائیں لینے کے لیے یونہی درگاہ کے دروازے کے باہر کھڑے ہو کر آواز لگا چکا ہے اور میں نے ٹھیک اِسی جگہ بیٹھے، اُسے یہی جواب دیا ہے اور اب جب میں اُسے یہ مالائیں دینے کے لیے باہر نکلوں گا تو وہ مجھے داہنی جانب مسکراتا ہوا کھڑا ملے گا اور پھر ہوا بھی یہی۔ میں ابھی اسی روشنی کے جھماکے کے اثر میں تھا اور جیسے ہی میں بے اختیار ہو کر اُٹھا اور باہر نکلا تو کریم وہیں کھڑا مسکرا رہا تھا۔ ہمیشہ کی طرح یہ تمام احساس لمحے بھر کا تھا اور اگلے ہی لمحے میں پھر سے ''زمانۂ حال'' میں واپس پہنچ گیا، لیکن اس بار میرے سر میں درد کی ایک شدید لہر بھی اُٹھی تھی۔ میں نے کریم کو تو جیسے تیسے فارغ کر دیا، لیکن پھر خود مجھ سے بہت دیر تک وہاں سے اُٹھا نہیں گیا۔ عام طور پر ایسا ہم سب ہی کے ساتھ زندگی میں کبھی نہ کبھی ضرور ہوتا ہے کہ ہمیں کسی واقعے، بات، یا منظر کو دیکھ کر چند لمحوں کے لیے ایک وقتی سا احساس ہوتا ہے کہ ہم یہ بات پہلے بھی سن چکے ہیں، یا اس سوال کا جواب مخاطب کی زبان سے کیا نکلے گا، یا پھر پہلی مرتبہ کا دیکھا ہوا منظر بھی اپنی تمام تر جزئیات کے ساتھ کچھ ایسا دکھائی دیتا ہے، جیسے ہم پہلے بھی اس مقام سے گزر چکے ہوں۔ لیکن میرے ساتھ اس درگاہ میں آنے کے بعد سے لے کر اب تک صرف ایک مہینے میں تیسری، یا چوتھی مرتبہ یہ واقعہ اس تواتر کے ساتھ پیش آ رہا تھا

کہ خود میں بھی سوچنے پر مجبور ہو گیا کہ آخر یہ کیسا اسرار ہے۔ عصر کی نماز کے بعد جیسے ہی مس
نمازیوں سے خالی ہوئی، میں نے تمام واقعہ پوری تفصیل کے ساتھ مولوی خضر کے سامنے پیش
کر دیا۔ لیکن مجھے یہ دیکھ کر بے حد حیرت ہوئی کہ خلاف معمول مولوی خضر نے میرے تما
سوالات کے جواب میں بات ٹالنے کی کوشش کرتے ہوئے صرف اتنا کہا ''رہنے دو میاں......
بڑی تفصیل طلب باتیں ہیں...... وقت آنے پر تمہیں سب پتا چل جائے گا......'' میں نے
صرار کیا۔ ''آخر ایسا بھی کیا راز ہے...... پہلے میں نے عبداللہ سے بھی جب اس بات کا ذکر کیا
تھا، تب اُس نے بھی کچھ ایسا ہی گول مول سا جواب دیا تھا۔ میرا سر درد سے پھٹ جائے گا۔
میں آپ سے التجا کرتا ہوں کہ میری یہ اُلجھن دُور کر دیں...... چاہے اس راز کے افشا ہونے
سے میرا کتنا ہی نقصان کیوں نہ ہوتا ہو......'' انہوں نے ایک لمبا سا سانس لیا۔ ''بہت جلد با
ہو...... بہتر ہوتا کہ مناسب وقت کا انتظار کرتے......'' لیکن میں اپنی ضد پر اڑا رہا ''کل کرے
سو آج...... آج کرے سو ابھی......''

مولوی خضر نے مجھ پر ایک گہری نظر ڈالی۔ ''ٹھیک ہے...... یوں لگتا ہے جیسے تمہاری
تربیت کا وقت آ گیا۔''

تربیت

میں مولوی خضر کے منہ سے تربیت کا لفظ سن کر مزید اُلجھن میں پڑ گیا۔ وہ میری تربیت
کا ذکر کر رہے تھے؟ کیا زہرا کو پانے کے لیے اب مجھے باقاعدہ کسی تربیت سے بھی گزرنا
پڑے گا...... سوالوں کا ایک طوفان تھا، جو میرے اندر سب کچھ اُتھل پتھل کر رہا تھا لیکن میں بنا
کچھ کہے، دم سادھے اُن کے سامنے بیٹھا رہا۔ آخرکار انہوں نے ہی اپنی خاموشی کا قفل توڑا۔
''سب سے پہلے تم میرے ایک سوال کا جواب دو۔ تمہارے خیال میں اس دنیا کا سب سے
بڑا عہدہ 'مقام و مرتبہ' کون سا ہو سکتا ہے۔ یاد رہے، ماضی اور حال دونوں زمانوں کا پوچھ رہا
ہوں۔'' میں نے کچھ دیر سوچنے کے بعد جواب دیا۔ ''شاید کسی 'سپر پاور' کے سربراہ کا عہدہ۔''
''نہیں...... نبوت دنیا کا سب سے بڑا عہدہ 'مقام و مرتبہ' ہے۔ حالانکہ نبوت کا سلسلہ ختم ہو چکا
لیکن اب تک اور آنے والے تمام زمانوں کا سب سے بڑا عہدہ نبوت ہی ہے۔ ہمیشہ اس
بات کو یاد رکھنا۔'' ''جی بہتر...... لیکن میں اب بھی آپ کے اس سوال کا مقصد نہیں سمجھا؟''
انہوں نے ایک لمبا سا ہنکارا بھرا۔ ''دراصل جو میں اب کہنے جا رہا ہوں اس کا تعلق میرے
سوال سے ہے۔ میں نے تمہیں پہلے بھی بتایا تھا کہ ہماری دنیا اس کائنات کی لاتعداد دنیاؤں
کے مقابلے میں صرف ریت کے ایک ذرے جیسی حیثیت رکھتی ہے۔ ہمارے بالکل قریب،
ایک اور مخلوق جسے ہم جنات کے نام سے جانتے ہیں، اپنی دنیا بسائے ہوئے ہیں۔ پھر جانے
کتنی کہکشائیں، کتنے سیارے اپنے اپنے مدار میں گردش کر رہے ہیں۔ ہمارے پاس ہماری
اپنی دنیا کے اندرونی رابطے کے بہت سے ذرائع ایجاد ہو چکے ہیں مثلاً وائرلیس، ٹیلی فون،
موبائل وغیرہ جن سے ہم تمام دنیا میں پلک جھپکنے میں مطلوبہ شخص تک رسائی کر لیتے ہیں۔ لیکن
ہمارا ایک رابطہ ہمہ وقت اپنے خدا سے بھی تو رہتا ہے۔ وہ جو ہماری شہ رگ سے بھی زیادہ
قریب ہے۔ لیکن اس غیر مرئی رابطے کے لیے اب تک کوئی آلہ ایجاد ہوا ہے، نہ ہی کبھی ہوگا۔
اس رابطے کا نظام خود اللہ نے اپنے ہاتھ میں رکھا ہے۔ عموماً یہ رابطہ براہ راست نہیں ہوتا اور

بالواسطہ ہم سبھی ایک پوشیدہ نظام کے تحت اس رابطے سے جڑے رہتے ہیں۔لیکن خدا کے اپنے بندے سے براہ راست رابطے کے بھی کچھ ذرائع ہیں۔ میں صرف تین بڑے ذرائع کا ذکر کروں گا۔ وحی، کشف اور الہام۔'' مولوی خضر نے پانی پینے کے لیے ایک چھوٹا سا وقفہ لیا۔ میں نے بے چینی سے پہلو بدلا۔اُن کی اس لمبی تمہید نے میرے اندر ایک عجیب سی بے چینی بھر دی تھی۔ خدا خدا کر کے انھوں نے اپنی بات دوبارہ شروع کی۔ ''ہاں تو میں نے فی الحال صرف تین براہ راست رابطوں کا ذکر کیا ہے۔ان میں سے پہلا ذریعہ یعنی وحی شرعی کا سلسلہ آخری پیغمبر کے ساتھ ہی موقوف ہو گیا ہے۔ باقی رہ گئے دو ذرائع۔ ان میں سے پہلا ہے کشف، جس کا تعلق حسیات سے ہے۔جس میں کسی شخص کو باقاعدہ علم غیب، یا مستقبل میں پیش آنے والے واقعات کی جھلک نظر آتی ہے اور وہ اس واقعے کو اپنی آنکھوں کے سامنے ہوتا ہوا دیکھ سکتا ہے۔ ایسے انسان کو کاشف کہتے ہیں اور اس کا یہ کمال کشف کہلاتا ہے۔ جب کہ تیسرے ذریعے کو ''الہام'' کہا جاتا ہے۔الہام کا تعلق وجدانیات سے ہوتا ہے۔ وجدان یعنی انسان کو باقاعدہ کچھ نظر تو نہ آئے، پر خدا کی طرف سے اُس کے دل میں ایک خیال ڈال دیا جاتا ہے کہ فلاں واقعہ کچھ یوں ہوا ہو گا، یا فلاں شخص کس حال میں ہو گا، یا فلاں دو راستوں میں سے ایک راستہ اُسے اُس کی کامیابی کے راستے پر لے کر جائے گا۔لیکن یہ سب اللہ کی مرضی پر منحصر ہے کہ وہ اپنے کن خاص بندوں کو الہام، یا کشف کے مرتبے کے لیے چنتا ہے۔''

مولوی خضر نے کچھ دیر توقف کیا اور پھر مجھ سے پوچھا۔''میری بات سمجھ میں آ رہی ہے نا......'' میں نے اثبات میں سر ہلایا تو انھوں نے پھر سے سلسلہ جوڑا۔''لیکن ایک بات تو طے ہے کہ ایسا کمال ہر ایک کو تو عطا نہیں کیا جاتا، ضرور اُس بندے میں کوئی خاص بات تو ہوتی ہو گی۔ میرے نزدیک وہ خاص وصف خالص پن ہے جسے انگریزی میں Purity کہتے ہیں۔ ہم انسان عالم ارواح میں انتہائی معصوم ہوتے ہیں۔ پھر دنیا میں آنے کے بعد رفتہ رفتہ یہاں کے گناہوں کی آلودگی ہمیں داغ دار کر دیتی ہے۔ اس کی مثال بالکل ایسی ہے، جیسے کسی بچے کے شفاف پھیپھڑے کے مقابلے میں کسی لگاتار سگریٹ، یا تمباکو نوشی کرنے والے کے پھیپھڑے جو بہت زیادہ کاربن کی وجہ سے ایکسرے میں بھی باقاعدہ کالے نظر آتے ہیں۔ میرا ماننا یہ ہے کہ خدا نے کم از کم الہام کا تحفہ ہر انسان کے لیے طے کر رکھا ہے۔لیکن ہمارے اندر کی آلودگی

ہمارے قلب ونظر کے گرد اس طرح پہرہ بن کر پردے گرا دیتی ہے کہ ہم الہام تو دُور، سامنے کی چیز بھی نہیں دیکھ پاتے۔'' مولوی خضر نے پھر سے ایک وقفہ لیا۔شاید وہ مجھے اس بات کا موقع دینا چاہتے تھے کہ میں اُن کی ثقیل باتیں ہضم کر سکوں۔ وہ پھر گویا ہوئے ''اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کشف اور الہام کو ناپنے کا پیمانہ کیا ہے......؟ مطلب یہ کہ یہ نعمت بھی تو سبھی میں یکساں بٹی ہوئی نہیں ہوتی۔ اس کے بھی باقاعدہ درجے ہوتے ہیں۔ اس کے لیے تمھیں ایک مثال دیتا ہوں۔ آج کل سیٹلائٹ کا دور ہے۔ خلا میں بہتی لہروں کے ذریعے خلائی سگنل بھیجے جاتے ہیں اور ان لہروں کو پکڑنے کے لیے کسی انٹینا کا سہارا لیا جاتا ہے۔ جس انٹینا کی اُونچائی جتنی زیادہ ہوتی ہے اتنی ہی زیادہ لہریں وہ پکڑ پاتا ہے۔ بس یوں سمجھ لو کہ ہم سب انسانوں کے سر پر بھی ایک ایسا ہی اَن دیکھا انٹینا موجود ہے۔ جو جتنا بڑا کاشف، یا الہامی ہو گا، اُس کا انٹینا دوسروں سے اُتنا ہی اُونچا ہو گا اور اس غیر مرئی انٹینا کی لمبائی، یا اُونچائی کا براہ راست تعلق خود انسان کی اپنی محنت، عبادت، ریاضت اور پاکیزگی سے بھی ہے۔ جو جتنی کوشش اور ریاضت کرے گا اُس کی پہنچ عالم غیب میں اُتنی ہی زیادہ ہوتی جائے گی۔ یعنی اُس کا انٹینا سر سے اُتنا ہی بلند ہوتا جائے گا۔ آج کل ٹیلی پیتھی اور ریکی وغیرہ کا بڑا چرچا ہے۔ سائنس ان علوم تک بہت دیر میں پہنچی ہے جب کہ ''رُوحانیت'' نے تو عرصہ قبل یہ سنگ میل عبور کر لیے تھے۔ چین میں ابھی تک باقاعدہ ایسے لوگ پائے جاتے ہیں، جو ننگے پاؤں پانی کی سطح پر یوں چلتے پھرتے ہیں جیسے خشکی پر چل پھر رہے ہوں۔ کوئی ندی، دریا، یا سمندر انھیں ڈبو نہیں سکتا۔ یہ سب صرف اور صرف خود پر قابو پانے کی طاقت ہے، جو انھیں رُوحانیت سے عطا ہوتی ہے۔ ایک غیر مسلم جب اپنی توجہ اس قدر مرکوز کر سکتا ہے کہ وہ پانی کی سطح پر چلتے ہوئے پیر کے تلووں کے پٹھے کنٹرول کرتے ہوئے اُن کی ساخت عارضی طور پر پانی پر چلنے کے موافق کر لیتا ہے تو پھر سوچو کہ اگر مومن اپنی توجہ مرکوز کرنے پر قدرت حاصل کر لے تو کیا نہیں کر سکتا......؟؟؟ اب رہی بات تمھارے سوال کی کہ تمھیں بار بار چند لمحے آگے کی بات کیوں نظر آتی ہے تو میری ناقص اور ذاتی رائے یہی ہے کہ اس کا تعلق بھی اُسی کشف اور الہام سے ہے، جس کا میں نے ابھی اتنی تفصیل سے ذکر کیا ہے۔ تمھارا انٹینا کچھ پکڑنے کی کوشش کرتا رہتا ہے لیکن شاید ابھی ہم سب عام انسانوں کی طرح صرف سر کی سطح ہی پر ہے۔ میری دعا

ہے کہ خدا تمہیں مکمل وجدان عطا کرے۔" میں حیرت سے منہ کھولے ہوئے مولوی خضر کی
ساری تمہید سن رہا تھا۔ وہ کہاں کی بات کو کہاں لے جا کر جوڑ بیٹھے تھے۔ بھلا میں کہاں اور
رُوحانیت کہاں......؟ ابھی ایک ہفتہ پہلے تک تو مجھے ٹھیک سے نماز بھی پڑھنا نہیں آتی تھی
اب بھی جو کچے پکے سجدے کر رہا تھا۔ مجھے اگر زہرا کو پانے کی ذرا سی بھی نا اُمیدی ہوتی تو
میں ایک پل بھی مزید اس درگاہ میں نہ ٹھہرتا، جب کہ یہ حضرت تو نہ جانے کہاں کے قلابے
کہاں ملا رہے تھے۔ میں نے حیرت سے انہیں دیکھا۔ "یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں...... آپ
اچھی طرح جانتے ہیں کہ میرے یہاں آنے کا مقصد کیا ہے اور آپ میرے ماضی سے بھی
بخوبی واقف ہیں۔ پھر بھی......" انہوں نے میری بات پوری ہونے سے پہلے ہی کاٹ دی۔
"میں نے اِسی لیے شروع ہی میں یہ واضح کر دیا تھا کہ کچھ فیصلے قدرت اپنے پاس محفوظ رکھتی
ہے۔ کس کو اس کام کے لیے چنا ہے اور کسے نہیں...... یہ فیصلہ بھی تقدیر خود ہی کرتی ہے اور
اس فیصلے کے آگے ہم انسانوں کے سبھی جواز دھرے کے دھرے رہ جاتے ہیں۔"

مولوی خضر اپنی بات مکمل کر کے مغرب کی نماز کی تیاری کے لیے اُٹھ کھڑے ہوئے
لیکن میری ذات کو ادھورا بھٹکتے چھوڑ گئے۔ پتا نہیں اُن کی باتیں سننے کے بعد مجھے ایسا کیوں
محسوس ہونے لگا تھا جیسے کوئی اَن دیکھا شکنجہ میرے وجود کے گرد کستا جا رہا ہے۔ یہ سلطان بابا
مجھے کس گورکھ دھندے میں اُلجھا گئے تھے۔ میں تو اپنی پہلی اور ظاہری دنیا ہی سے بےزار تھا۔
یہ دوسری دنیا کے عذاب بھلا اب کون جھیلے گا......؟ میں نے وہیں مسجد میں بیٹھے بیٹھے اپنی
زندگی میں شاید پہلی مرتبہ گڑگڑا کر اپنے رب سے دعا کہ مجھے مزید کسی امتحان میں نہ ڈالے کہ
میں بہت ہی عام اور کمزور سا بندہ ہوں۔ مجھ میں اب مزید کوئی عذاب سہنے کی ہرگز سکت نہیں
ہے۔ مجھے پتا نہیں چلا کہ کب میں اپنی اس التجا میں اتنا غرق ہوا اور کب میرا چہرہ میرے
آنسوؤں سے دُھلنے لگا۔ لیکن اُس روز اُس سناٹے میں میری ہچکیاں سننے والا بھی کوئی نہیں تھا۔
دنیا میں مجھ جیسا کون ہوگا، جس نے اپنی محبت پانے کے لیے اپنی سانسیں تک گروی رکھ دی
ہوں۔ آخر قدرت کو مجھ پر رحم کیوں نہیں آتا تھا؟

عشاء کی نماز کے بعد میرا دل جب بہت گھبرانے لگا، تو میں نے ساحل کی چہل قدمی کا
ارادہ کر لیا۔ مولوی خضر نماز کے فوراً بعد ہی نیچے ساحلی بستی میں نہ جانے کس نمازی کی تیمارداری

کے لیے جا چکے تھے۔ میں تنہا ہی ساحل کی طرف چل پڑا۔ ٹھنڈی ہوا چہرے سے ٹکرائی تو کچھ
تھکن کا احساس کم ہوا۔ میں نہ جانے کتنی دیر یونہی اپنی دُھن میں ساحل کے کنارے کنارے
چلتا گیا۔ اچانک دُور ساحل پر چند روشنیاں تیزی سے مجھے اپنی جانب بڑھتی ہوئی نظر آئیں اور
پھر کچھ ہی دیر بعد سائلنسر کی آوازوں سے پتا چل گیا کہ چھ سات ہیوی بائیکس ساحل پر دوڑتی
ہوئی میری جانب آ رہی ہیں۔ کچھ ہی دیر میں اس چنگھاڑتے شور میں ان موٹر سائیکل سواروں
نے مجھے کراس کیا۔ یہ نوجوان لڑکے اور لڑکیوں کا ایک ٹولہ تھا جو شاید شہر سے دُور اس ویران
ساحل پر ریس لگانے کے لیے آیا ہوا تھا۔ ہر موٹر سائیکل پر ایک لڑکے لڑکی کا جوڑا بیٹھا ہوا
تھا۔ وہ سبھی چیخ چلا رہے تھے، نعرے لگا رہے تھے۔ میرے ہونٹوں پر خود بخود ایک دھیمی سی
مسکراہٹ اُبھر آئی۔ کچھ "میٹھی یادوں" نے میری رگوں میں بہتی کڑواہٹ کو کافی کم کر دیا۔
مجھے اپنے دوستوں کے ساتھ لگائی گئی ایسی کئی ریسوں اور ہنگاموں کا دور یاد آ گیا۔ ہمارے
گروپ میں کاشف سب سے اچھا بائیک رائڈ تھا لیکن میں اُسے بھی بہت دفعہ ریس میں ہرا
چکا تھا۔ میں اپنی یادوں کی جھونک میں بہت آگے چلا آیا تھا۔ ساحلی بستی کی روشنیاں تقریباً
غائب ہو چکی تھی۔ لہٰذا میں نے واپسی کا فیصلہ کیا۔ ابھی میں درگاہ سے کچھ فاصلے ہی پر تھا کہ
مجھے وہی موٹر سائیکل سوار گروپ ساحل کے کنارے کھڑا نظر آیا۔ وہ سب کے سب ایک
موٹر سائیکل کے گرد جمع تھے۔ شاید اُس بائیک میں کوئی خرابی ہو گئی تھی۔ میں اُن کے قریب پہنچا
تو وہ سب میری جانب متوجہ ہو گئے۔ اُن میں سے ایک شوخ سے لڑکے نے زور سے کہا۔
"سلام مولانا جی...... یہاں آس پاس کوئی گیراج ہے تو پلیز بتائیے۔" اُس کے مولانا کہنے پر
پہلے تو مجھے یہ گمان ہی نہیں ہوا کہ وہ مجھ سے مخاطب ہے لیکن جب اُس نے دوبارہ زور سے
کھنکار کر مجھے متوجہ کیا تو میں رُک گیا۔ میرے علاوہ وہاں اور تھا ہی کون جسے وہ پکارتا۔ پھر میرا
ہاتھ بے اختیار میری دو ہفتوں سے بھی زیادہ بڑھی ہوئی شیو کی جانب چلا گیا۔ میں اس وقت
کرتے پاجامے میں ملبوس، سر پر سفید ٹوپی اور بڑھی ہوئی ڈاڑھی لیے اُن کے سامنے کھڑا تھا۔
ایسے میں اُن کا مجھے "مولانا" سمجھنا اور پکارنا بالکل جائز تھا۔ مجھے یہ سوچ کر ہنسی آ گئی کہ نہ
جانے میں خود اس سے پہلے کتنے ایسے ظاہری حلیے والوں کو باقاعدہ مولوی سمجھتا رہا تھا۔ ہم
انسان بھی کس قدر ظاہر پرست ہوتے ہیں۔ لباس اور حلیے کی بنیاد ہی پر درجہ بندیاں کرتے

پھرتے ہیں۔ دل کے حال پر کبھی نہیں جاتے۔ میں نے جواب دیا۔ ''جی فرمائیے۔'' سارا
گروپ مجھے نہایت دل چسپی سے دیکھ رہا تھا۔ اُن میں سے شریر آنکھوں والی ایک لڑکی بولی
''جناب کسی قریبی ورکشاپ کا پتا بتا دیں۔ ہماری بائیک خراب ہوگئی ہے۔'' میں نے خراب
موٹر سائیکل پر دُور ہی سے نظر ڈالی۔ جرمنی کی 700 سی سی سپر ٹرانف (Super-tranf) تھی۔
کسی زمانے میں یہ میری بھی پسندیدہ سواری رہ چکی تھی۔ ''آپ کہیں تو میں دیکھ لوں......؟''
میں نے اُن سے اجازت طلب کی۔

میری بات سن کر وہ سب زور سے ہنس پڑے۔ ایک دوسری چیونگم چباتی لڑکی ہنس کر
بولی۔ ''مولوی جی...... یہ سپر ہیوی بائیک ہے۔ کوئی سائیکل نہیں، جو پنکچر ہوگئی اور آپ اسے
ٹھیک کر دیں گے۔'' لڑکی کی بات سن کر پورا گروپ قہقہہ لگا کر ہنس پڑا۔ میرے ہونٹوں پر بھی
مسکراہٹ آگئی۔ ''تو سائیکل ہی نا......بس ساتھ میں موٹر جڑ گئی ہے۔'' میں نے آگے بڑھ کر
سیلف چیک کیا۔ موٹر سائیکل کک سے نہیں، بلکہ سیلف سے اسٹارٹ ہوتی تھی۔ سیلف ٹھیک
تھا۔ میں نے ڈسک بریک دیکھی۔ اور ائیر لیور کو دو تین بار پکڑ کر چھوڑا۔ سارا گروپ حیرت
سے میری ''کارروائی'' دیکھ رہا تھا۔ میں نے حتمی نتیجے پر پہنچ کر سر اُٹھایا۔'' بریک کی ڈسکس
(Discs) ایک دوسرے میں پھنس گئی ہیں۔ شاید بریک لگاتے وقت کلچ کو ٹھیک طرح سے نہیں
دبایا گیا۔ آپ میں سے کسی کے پاس کٹ بیگ ہے؟'' سبھی گروپ کو جیسے سانپ سونگھ گیا تھا۔
اب کھنکارنے کی باری میری تھی۔ پھر جیسے میری کھنکار سن کر سبھی کو ہوش آ گیا اور ایک لڑ
جلدی سے کٹ بیگ لے کر میری طرف بھاگا۔ باقی سب بھی بیک وقت بولنے لگے۔ ''وا
(wow) یار...... کمال ہے...... اٹس امیزنگ...... آپ کو تو پوری بائیک کی انجینئرنگ کا
ہے...... کیا آپ مکینک ہیں......؟'' ''بس مکینک ہی سمجھ لیں......بس دس منٹ میں آپ ک
بائیک تیار ہو جائے گی۔'' میں پوری طرح موٹر سائیکل کی خرابی درست کرنے میں جت گیا۔
گروپ کی نظروں میں اب میرے لیے طنز کے بجائے ستائش تھی۔ وہ سب پھر سے اپنی اُ
پرانی بحث میں مصروف ہو گئے جو شاید میرے آنے سے پہلے اُن کے درمیان جاری تھی۔ جس
لڑکے نے مجھے مخاطب کیا تھا، وہ بولا ''تم لوگ مانو نہ مانو......مگر مجھے ایسا لگتا ہے کہ میں پ
بھی یہاں آ چکا ہوں اور تب بھی وہ شپ اِسی جگہ اینکرڈ تھا۔ شرارتی لڑکی بولی ''کم آ

نعمان...... اب یہ نا کہہ دینا کہ یہ تمہارا دوسرا جنم ہے۔'' میں نادانستہ طور پر اُن کی باتوں کی
جانب متوجہ ہو گیا۔ ایک دوسرا لڑکا بولا ''یار لوگ اس مرر امیج تھیوری (Mirror Image
Theory) پر یقین کیوں نہیں کر لیتے۔ نومی کا مسئلہ بھی بس اتنا ہی ہے۔'' اُن کی یہ ساری
گفتگو زیادہ انگریزی میں ہو رہی تھی۔ دوسری جانب سے جینز میں ملبوس ایک لڑکی چلائی ''خدا
کے لیے کوئی مجھے بھی اس شیشے کی عکس نما تھیوری کے بارے میں بتائے گا۔'' پہلا لڑکا تفصیل
سے بتانے لگا ''بھئی یونانی فلسفے کے مطابق ہماری یہ دنیا دراصل ہو بہو ایک ایسی ہی دنیا کا
عکس ہے جو بالکل ہمارے سامنے ہی بستی ہے۔ لیکن ہم اُسے دیکھ نہیں سکتے۔ یعنی جو کچھ وہاں
ہو رہا ہے ٹھیک وہ یہاں بھی ہو رہا ہے۔ مطلب یہ کہ ہم میں سے ہر ایک کا ڈپلی کیٹ اُس دنیا
میں موجود ہے۔ اور یہ جو گڑبڑ نومی کے ساتھ ہو رہی ہے ویسا تب ہوتا ہے، جب ہماری دنیا اور
اُس دنیا کے عکس کے چند فریم آگے پیچھے ہو جائیں۔ تب ہم لمحہ بھر کے لیے مستقبل میں جھانک
آتے ہیں۔ یار، وہ تم لوگوں نے ہم زاد کا ذکر نہیں سنا...... ہمارا ہم زاد وہی تو ہے۔ اسی جیسی
دنیا میں بستا ہمارا ڈپلی کیٹ۔ ہماری کاربن کاپی۔'' میرے ذہن میں اُن لوگوں کی باتیں سن کر
جھکڑ سے چلنے لگے تھے۔ یہ تو وہی بات کر رہے تھے جس کی ایک رُوحانی توجیہہ آج شام ہی کو
مولوی خضر نے میرے سامنے پیش کی تھی۔ جب کہ یہ تو بالکل ہی کسی نئی تھیوری کا ذکر کر رہے
تھے۔ قدرت میرے ساتھ یہ کیسا کھیل کھیل رہی تھی۔ مجھے کچھ سمجھ نہیں آ رہا تھا۔ اتنے میں
نعمان نے زور دے کر کہا۔ ''میں تو اب بھی کہتا ہوں کہ وقت اپنی جگہ قائم رہتا ہے۔ باہر کے
سائنس دانوں نے حال ہی میں کچھ ایسی آوازیں ریکارڈ کر لی ہیں جن کی زبان عبرانی ہے اور
جن کے متعلق یہ دعویٰ کیا جا رہا ہے کہ یہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے دور کی آوازیں ہیں۔ بلکہ
وہ تو اُس واقعے تک بھی پہنچ گئے ہیں کہ وہاں بات کسی گدھے کے مرنے کے قصے کے بارے
میں ہو رہی ہے۔'' تیز طرار لڑکی نے ناک سکیڑی ''تو اس بات سے کیا ثابت ہوتا ہے؟''
نعمان نے اصرار جاری رکھا ''یار جب آواز کے فریم خلا میں زندہ رہ سکتے ہیں اور صدیوں بعد
بھی پکڑے جا سکتے ہیں تو پھر ہماری تصویریں بھی فضا میں کہیں نہ کہیں کسی تہ میں ضرور باقی رہتی
ہوں گی۔ تم دیکھنا جلد ہی ایک ایسی مشین بھی وجود میں آ جائے گی جو ہمیں ہمارے مستقبل نہیں
تو کم از کم ماضی میں ضرور پہنچا دے گی، جہاں ہم خود اپنی آنکھوں سے اپنا بچپن، اپنے والدین

اور دیگر حالات دیکھ سکیں گے۔" شرارتی لڑکی خاموشی سے چلائی "واؤ...... دیٹس گریٹ...... یو
مین ٹائم مشین...... کاش اُس وقت ہم سب بھی زندہ ہوں اور اپنے ماضی میں جھانک سکیں......"

اتنے میں، میں بھی اپنا کام ختم کر چکا تھا۔ میں نے نعمان کو سیلف مارنے کا کہا۔ اُس نے سیلف مارا اور موٹر سائیکل ایک جھٹکے سے اسٹارٹ ہو گئی۔ سب نے خوشی کے مارے سیٹیاں بجائیں اور نعرے لگائے اور اپنی اپنی جوڑی کے ساتھ موٹر سائیکلوں پر بیٹھ گئے۔ نعمان نے مجھ سے ہاتھ ملایا اور اپنی جیب سے کچھ نوٹ نکال کر دینے چاہے۔ میں نے مسکرا کر نوٹ واپس اُس کی شرٹ کی جیب میں رکھ دیئے اور اُوپر درگاہ کی جانب اشارہ کر کے کہا "میں وہاں رہتا ہوں...... کبھی وقت ملے تو وہاں آیئے گا۔ میں آپ کو اس بائیک کے بارے میں کچھ ایک ہدایات دوں گا کہ پھر یہ آپ کو مہینوں تنگ نہیں کرے گی۔" نعمان نے گرم جوشی سے بائیک پر بیٹھے بیٹھے ہی آگے بڑھ کر مجھے گلے لگایا اور کہا "اوہ شیور...... Sure میں ضرور آؤں گا۔" شرارتی لڑکی نے بھی جاتے جاتے جلدی میں مجھ سے ہاتھ ملایا اور وہ سب ہی میرا شکریہ ادا کرتے اور شور مچاتے ہوئے وہاں سے روانہ ہو گئے۔ جانے میں ساحل پر چہل قدمی کے لیے کیوں اُترا......؟ جانے یہ گروپ وہاں کیوں آیا اور اُن تک میری رسائی کیوں ہو پائی......؟ شاید یہ سارا کھیل ہی مجھے اس نئی تھیوری تک پہنچانے کے لیے تھا......؟ میں نے دل میں ارادہ کیا کہ کل صبح موقع ملتے ہی سب سے پہلے مولوی خضر سے اس یونانی فلسفے کے بارے میں بات کروں گا۔ کیا واقعی ہمارا کوئی ہم زاد بھی ہوتا ہے۔ بالکل ہمارے جیسا؟ ہمارا نام، ہم پیشہ؟ لیکن اگلا دن جمعرات کا تھا اور حسبِ معمول فجر کے بعد ہی سے دھیرے دھیرے درگاہ پر حاضری دینے والوں کا ہجوم بڑھتا گیا۔ اُس روز ویسے بھی نہ جانے کیوں اس قدر بھیڑ تھی کہ مجھے سر اُٹھانے کی فرصت بھی نہیں مل سکی اور یونہی دیکھتے دیکھتے عصر کا وقت بھی ہو گیا۔

آج میرا دل بالکل ہی بجھا ہوا تھا۔ شاید اس لیے کہ میں جانتا تھا کہ زہرا کو اب یہاں آنے کی ضرورت نہیں پڑے گی۔ اُسے اپنے عبداللہ کا پتا مل چکا تھا اور شاید اب وہ ہر جمعرات کو سیکڑوں میل کا سفر کر کے اُس درگاہ کی زیارت کو جایا کرے گی، جہاں اُسے اُس کے من کی مراد مل سکتی تھی۔ اور پھر وہ درگاہ کی زیارت کو یہاں آتی ہی کب تھی......؟ وہ تو صرف عبداللہ کی زیارت کے لیے آتی تھی۔ میں انہی سوچوں میں گم تھا کہ اچانک میری نظر صحن کے پار

دروازے پر پڑی۔ کچھ دیر تو مجھے اپنی آنکھوں پر یقین ہی نہیں آیا۔ ہاں...... وہ وہی تو تھی...... تھکی تھکی...... نڈھال سی...... اپنے آپ اور اس سارے زمانے سے بے زار۔ میں نے لوگوں سے نظر بچا کر دوبارہ اپنی آنکھیں مل کر دیکھا لیکن وہ زہرا ہی تھی۔ آج صرف اُس کی خادمہ ہی اُس کے ساتھ تھی۔ وہ عورتوں والے حصے کی طرف بڑھ گئی اور لاتعلق سی ہو کر ایک دیوار کے ساتھ ٹیک لگا کر بیٹھ گئی۔ اُس کی نوکرانی جلدی جلدی اُسے پنکھا جھلنے لگی۔ زہرا کی حالت بہت ابتر تھی۔ شاید وہ کسی لمبے سفر کی تھکان کے زیرِ اثر تھی، یا پھر کسی اندرونی کش مکش نے اُس کو اتنا نڈھال کر رکھا تھا۔ میرے دل میں شدید یہ خواہش اُبھری کہ میں کسی طرح اُس سے معلوم کروں کہ اُس کی عبداللہ سے ملاقات ہوئی، یا نہیں۔ لیکن میری یہ حسرت دل میں ہی دبی رہ گئی۔ کچھ ہی دیر میں مجھے اپنے کمرے میں جانا پڑا اور نذر و نیاز اور مسائل کے حل کا مرحلہ شروع ہو گیا۔ مردانے سے فارغ ہو کر میں عورتوں والی کھڑکی کی جانب آیا تو حسبِ معمول میری سانس دھونکنی کی طرح چل رہی تھی۔ کچھ ہی دیر میں اُس کی رُوح میں اُتر جانے والی آواز میرے کانوں سے ٹکرائی۔ آج اُس کی آواز میں بھی تھکن کا غلبہ تھا۔ "اگر میں آپ سے کچھ مانگوں...... تو کیا آپ دیں گے......؟" میرا دل زور سے دھڑکا۔ شہنشاہ خود سوالی سے سوال کر رہا تھا۔ "میرے پاس میری اس لاحاصل زندگی کے علاوہ اور کچھ نہیں بچا۔ پھر بھی آپ کہیں......" کچھ دیر دوسری جانب خاموشی رہی جیسے وہ کسی شدید ذہنی کش مکش میں مبتلا ہو۔ پھر اُس کی آواز اُبھری "آپ...... میں چاہتی ہوں کہ آپ یہ درگاہ چھوڑ کر کہیں اور چلے جائیں......"

پہلی جیت

پہلے پہل تو میں سمجھ ہی نہیں پایا کہ وہ کہنا کیا چاہتی ہے۔ میں نے وضاحت چاہی
''میں آپ کا مطلب نہیں سمجھا...... آپ مجھے کہاں بھیجنا چاہتی ہیں۔'' ''کہیں بھی...... آ
کہیں بھی چلے جائیں...... بس یہ درگاہ چھوڑ دیں۔ آپ دھیرے دھیرے میرے راستے
رکاوٹ بنتے جا رہے ہیں۔ آپ کی وجہ سے عبداللہ کو یہاں سے کہیں اور جانا پڑا۔ اور جہ
میں وہاں اُن تک پہنچی تو انہوں نے مجھے اس درگاہ کی حاضری کا حکم دے دیا۔ میں اُن کا حکم
ٹال نہیں سکتی، لیکن آپ سے درخواست تو کر سکتی ہوں کہ آپ ہی میرے حال پر رحم کھایئے
براہ مہربانی آپ یہاں سے چلے جائیں۔ ہوسکتا ہے آپ کے جانے کے بعد وہ دوبارہ یہیں
جائیں۔'' وہ بولتی جا رہی تھی اور میرے دل پر نہ جانے کتنی چھریاں چل رہی تھیں۔ تو گویا اُ
کی آج کی حاضری کا مقصد بھی اُسی رقیب کی مدح سرائی تھا، جو پہلے ہی میری محبت پر ڈا
ڈال چکا تھا۔ مجھے زہرا کی سنگ دلی کا اس شدت سے احساس ہوا کہ رُوح کے نازک دھا
اُدھڑنے لگے۔ کیا اُسے میری حالت کی ذرا بھی پرواہ نہیں تھی۔ میں یہاں صرف اور صر
اُسی کے لیے تو بیٹھا ہوا تھا۔ کیا میری محبت اتنی ہی حقیر اور فضول تھی کہ آج تک اُس پتھر
ایک دراڑ بھی نہ ڈال پائی تھی۔ میری طرف سے گہری خاموشی پا کر اُس جلاد نے مجھے پھر میر
موت یاد دلائی۔ ''میں آپ کے جواب کی منتظر ہوں۔''

زندگی میں پہلی مرتبہ میرے اندر کی کڑواہٹ باہر نکل آئی۔ ''آپ جواب کہاں چا
ہیں۔ آپ کو تو بس حکم سنانا آتا ہے۔ سو، آپ نے سنا دیا۔ اب یوں کہیں کہ آپ تعمیل کی منت
ہیں۔'' اُسے شاید اپنے لہجے کی سختی کا کچھ احساس ہوا۔ ''اگر میری کسی بات سے آپ کو دُکھ
ہے تو میں معافی چاہتی ہوں۔ آپ میری ابتر حالت کا اندازہ نہیں لگا سکتے۔ میں اُس وقت
ڈوب رہی ہوں جب کنارہ بس سامنے نظر آ رہا ہے۔ مجھ پر رحم کریں، پلیز۔'' جلاد سر قلم کر
سے پہلے سزائے موت کے مجرم سے رحم اپیل کر رہا تھا۔ ''ٹھیک ہے اگر آپ میرے سر

کھڑے ہو کر ڈوبنے سے بچنا چاہتی ہیں تو مجھے یہ موت بھی منظور ہے۔ میری دعا پھر بھی یہی ہوگی کہ خدا آپ کی کشتی پار لگا دے۔ لیکن میں یہاں کچھ شرائط کے تحت اور کچھ معزز لوگوں کے وعدوں اور ضمانت پر آیا ہوں۔ مجھے کچھ مہلت دیجیے تاکہ میں یہاں سے جانے کا کوئی مناسب موقع اور بہانہ ڈھونڈ سکوں۔ مجھے یہاں سے جانے کے بعد اپنا سامنا بھی کرنا ہے۔ اُمید ہے آپ مجھے خود اپنے سامنے ذلیل ہونے پر مجبور نہیں کریں گی۔'' ''نہیں نہیں...... خدانخواستہ...... ساحر میں جانتی ہوں، میں آپ کو کتنی مشکل میں ڈال رہی ہوں...... لیکن آپ نہیں جانتے...... بس آپ نہیں جانتے۔''

جانے وہ کیا کہنا چاہتی تھی لیکن اُس کی آواز آنسوؤں میں رندھ گئی اور وہ تیزی سے وہاں سے اُٹھ کر چلی گئی۔ میں ویسے ہی اپنی جگہ پتھر بنا بیٹھا رہا۔ آج زندگی میں پہلی مرتبہ اُس نے میرا نام ''ساحر'' پکارا تھا۔ یہ چار حرف اُس کی زبان سے نکل کر کس قدر محترم، کتنے بلند ہو گئے تھے۔ مجھے یوں لگا کہ میرے بے معنی سے نام کو اُس کی زبان نے معنی دے دیئے تھے۔ ساحر...... پہلے تو کبھی مجھے میرا نام اتنا اچھا نہیں لگا تھا۔ لیکن وہ جاتے جاتے بھی مجھے ایک امتحان میں ڈال گئی تھی۔ جانے سلطان بابا اور عبداللہ کو میں یہ بات کیسے سمجھا پاؤں گا کہ جس کے لیے میں اس امتحان گاہ میں آ کر بیٹھا تھا، وہی نہیں چاہتی کہ میں سارے پرچے حل کر کے سرخرو ہو سکوں۔ جب ممتحن نے امتحان سے پہلے ہی نتیجہ سنا دیا تھا کہ کامیابی میرا مقدر نہیں تو پھر اس آزمائش کا تکلف بھی کیوں؟

شام کو مغرب کے بعد جب فراغت ملی تو میں نے سب سے پہلے مولوی خضر کو کل رات ساحل پر موٹر سائیکل گروپ سے ہونے والی ملاقات کے بارے میں بتایا اور اس کے ساتھ ہی انہیں اس ''عکسِ آئینہ'' تھیوری کے بارے میں بتایا کہ میں اُن کی بات سن کر کافی اُلجھ سا گیا ہوں۔ خاص طور پر ہم زاد والی بات سن کر تو خود مجھے بھی ایک لمحے کو ایسا لگا تھا کہ کہیں واقعی میرا ہم زاد ہی تو میرے ساتھ ساتھ نہیں چلتا۔ جو مجھ سے پہلے ہی ہر مقام پر پہنچ جاتا ہے۔ مولوی خضر نے غور سے میری بات سنی۔ ''وہ نوجوان ٹھیک کہہ رہا تھا میاں...... ایسا ایک نظریہ بھی موجود ہے، جو اس دنیا کو پہلے سے ہونے والے واقعات کا تسلسل بتاتا ہے۔ سائنس میں اس کے علاوہ بھی دنیا کے وجود میں آنے کی کئی توجیہات پیش کی گئی ہیں مثلاً بگ بینگ کا

نظریہ، ڈارون کی تھیوری وغیرہ وغیرہ۔ اس کے علاوہ بھی ایک اور دل چسپ نظریہ موجود ہے۔
یہ بھی کہا جاتا ہے کہ اس کائنات کی اور اس دنیا کی پوری فلم پہلے ہی سے بنا کر کیسٹ میں بند
کر دی گئی ہے۔ بنانے والے مالک نے پہلے ہی سے پوری فلم دیکھی ہوئی ہے۔ یعنی ازل سے
ابد تک سب کچھ فلمایا جا چکا ہے۔ آگے جو ہونا ہے، وہ بھی کیسٹ موجود ہے اور یہ الہام، یا
کشف، یا مستقبل بینی اُن کے حصے میں آتی ہے، جو فلم کے اگلے حصے کے چند مناظر اپنی کسی
خاص رُوحانی طاقت کی وجہ سے پہلے ہی دیکھ لیتے ہیں۔ اسی تصور پر کام کرتے ہوئے بیرونی
ملکوں کے سائنس دان ٹائم مشین کی تخلیق کی کوششوں میں جانے کب سے لگے ہوئے ہیں،
کیونکہ اُن کے خیال میں ابد تک فلم موجود ہے تو مستقبل میں بھی سفر کیا جا سکتا ہے۔ اور
باقاعدہ مستقبل، یا ماضی میں جا کر حالات و واقعات کا مشاہدہ بھی ممکن ہے۔ میں نے کہا نا
میاں، ہزاروں خواہشیں ایسی کہ ہر خواہش پہ دم نکلے، حضرت انسان کی کھوج کا یہ سفر اسے
ایسے نظریات اور مفروضوں تک لے جاتا رہے گا اور حقائق سامنے آتے رہیں گے۔ البتہ ایک
مسلمان کا عقیدہ اٹل ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام سے انسانی حیات کا سلسلہ شروع ہوا ہے
اور اب قیامت تک یہ سلسلہ جاری رہے گا۔ ہمارا دوسرا بنیادی عقیدہ یہ ہے کہ تقدیر اٹل ہے
اور صرف دعا تقدیر بدل سکتی ہے۔ ہمارا قسمت کا فلسفہ بھی تو کسی نہ کسی طرح سب پہلے سے
طے شدہ ہونے، یا پھر بقول مغربی محقق "سارے عمل کی مکمل فلم بندی، ہونے کو سہارا دیتا ہے
نا۔ بس بنیادی فرق عقیدے کا ہی رہ جاتا ہے ورنہ مغربی سائنس دان بہت سی باتوں میں خود
اسلام کی ترویج کر رہے ہوتے ہیں۔ چاہے انجانے میں ہی سہی......"

میں حیرت سے مولوی خضر کی باتیں سن کر رہا تھا۔ ہمارے اردگرد کتنے اسرار، راز
بکھرے پڑے ہیں اور ہم نہ جانے کن چیزوں میں اپنا دھیان کھپاتے رہتے ہیں۔ دوسروں کو تو
چھوڑیے، خود میں کہاں ان اسرار و رموز کی حقیقت جاننے کے لیے یہاں آیا تھا۔ میرا مقصد
بھی تو صرف اور صرف زہرا ہی تھی اور اب تو شاید اس کہانی کا خاتمہ بھی قریب آ چکا تھا۔ میں
نے سوچا کہ ایک آدھ دن میں کوئی مناسب سا موقع دیکھ کر خود مولوی خضر سے اپنی زہرا سے
ہونے والی اس آخری بات چیت کا احوال بیان کر کے درخواست کروں گا کہ کسی طور پر عبداللہ
یا سلطان بابا کو میرے واپسی کے ارادے سے مطلع کر دیں۔ میں درمیان میں صرف ایک

مرتبہ، ایک دن کے لیے گھر ہو کے آیا تھا۔ جب کہ مما، پپا سمیت تمام دوستوں کو سختی سے پہلے
مہینے میں درگاہ ملنے آنے سے منع کر رکھا تھا، کیوں کہ میں کسی بھی حوالے سے کمزور نہیں پڑنا
چاہتا تھا۔ البتہ حسب وعدہ والدین سے ملنے کے لیے ہر دو ہفتے میں ایک رات تو اپنے گھر پر
گزارنی تھی۔ میں جب گھر پہنچا تھا، تب مما اور پاپا دونوں ہی بے چینی سے میرا انتظار کر رہے
تھے اور شام ہونے سے پہلے میرے دوستوں کا بھی جم گھٹا سا لگ چکا تھا۔ وہ سب مجھ سے ایسا
برتاؤ کر رہے تھے جیسے میں جانے کتنی صدیوں بعد اُن سے ملا ہوں۔ باقاعدہ جشن کا سا سماں
تھا۔ میں درگاہ میں پندرہ دن گزار کر پہلی مرتبہ گھر گیا تھا اور اُن پچھلے پندرہ دنوں میں میری
ایک بھی نماز قضا نہیں ہوئی تھی۔ پہلی وجہ تو سلطان بابا کی شرط تھی اور دوسری مولوی خضر کا ہمہ
وقت ساتھ۔ وہ ہر نماز کے وقت سے پہلے ہی پیغامبر بھیج بھیج کر، مسجد پہنچنے پر مجبور کر دیتے
تھے۔ سچ ہے کہ اگر مولوی صاحب نہ ہوتے تو مذہب سے میرا یہ تعارف اتنا آسان نہیں ہوتا
اور پھر مجھے تو ویسے بھی نماز بہت مشکل اور پابند کر دینے والا عمل لگتا تھا۔ کچھ ہمارے گھر کا
ماحول بھی ایسا تھا کہ نماز وغیرہ کی پابندی شاذ و نادر ہی کی جاتی تھی۔ مما کو سال میں کبھی ایک
آدھ بار جوش چڑھتا تو کوئی محفل میلاد وغیرہ منعقد کروا لیتی تھیں۔ لیکن مجھے تو وہ بھی میلاد کی
محفل سے زیادہ "فیشن پریڈ" لگتی تھی۔ رہ گئے پاپا تو کبھی کبھار ہمارے ڈرائیور کی دیکھا دیکھی
جمعہ، یا عید کی نماز پڑھنے کے لیے اپنی مرسڈیز بینز میں قریبی جامع مسجد تک چلے تو جاتے تھے
لیکن زندگی میں کبھی بھی مجھے اپنے ساتھ نماز کے لیے جانے پر اصرار نہیں کیا تھا۔ مذہب
ہمارے گھر میں ایک فالتو بلکہ کسی حد تک ممنوعہ شے تھی۔ مجھے یاد ہے کہ بچپن میں جب میں
سکول میں اپنے دوستوں کو رمضان میں روزہ رکھتے ہوئے دیکھتا تھا تو گھر آ کر میں بھی مما پاپا
سے روزہ رکھنے کی ضد کرتا تھا، لیکن نہ تو انہوں نے خود کبھی رمضان کی پابندی کی تھی اور نہ کبھی
مجھے روزہ رکھنے دیا۔ مما کو ہمیشہ اپنے لاڈلے بیٹے کی صحت گرنے کا غم کھائے جاتا تھا۔ البتہ وہ
خود کبھی کبھار ستائیسویں، یا انتیسویں کا روزہ رکھ لیتی تھیں۔ رہ گئے پاپا تو اُن کا تو سارا سال ہی
بیرون ملک دوروں اور سفر کی نذر ہو جاتا تھا۔ لہٰذا ایسے میں روزہ رکھنے کی بھلا کسے
فرصت......؟ پتا نہیں میرے گھر والے مذہب سے اتنا خوف زدہ کیوں تھے؟ درگاہ میں پہلے
دن نماز پڑھتے ہوئے خود مجھے مذہب سے بے حد خوف محسوس ہوا تھا، لیکن پھر رفتہ رفتہ مولوی

خضر کی صحبت میں علم ہوا کہ مذہب تو بہت ہی آسان اور دوست نما کوئی چیز ہوتی ہے۔ جسے ٹھیک طرح سے اپنایا جائے تو اُلٹا وہ ہمارے اندر کے خوف اور وسوسوں کو ختم کر دیتی ہے۔ لیکن بہرحال میرے گھر میں مذہب ''شناختی کارڈ'' کے خانے میں لکھا جانے والا ایک لفظ ''مسلم'' تھا۔ ہاں البتہ ایک بہت عجیب بات یہ تھی کہ کوئی بھی موت چند دن کے لیے ہمارے گھر میں بھی مذہب کو یوں پھیلا دیتی تھی، جیسے ہم لوگوں سے زیادہ کٹر مذہبی اور کوئی نہ ہو۔ مجھے یاد ہے کہ میں بہت چھوٹا تھا جب یکے بعد دیگرے پہلے دادا ابو اور پھر دادی جان چند مہینوں کے وقفے سے اللہ کو پیارے ہو گئے۔ تب ہر موت کے اگلے چند دنوں تک ہمارے گھر میں صرف اور صرف مذہب کا راج تھا۔ جزدانوں میں برسوں سے پڑے قرآن اور سپارے اُتار کر اُن کی دھول جھاڑی گئی اور ہفتوں گھر میں قرآن خوانی ہوتی رہی۔ ایک مولوی صاحب روزانہ صبح سے شام تک گھر کے وسیع لان میں لگائے گئے شامیانے میں دعا کرنے کے لیے بیٹھے رہتے اور ہمارے گھر کے دالان میں ظہر، عصر اور مغرب کی تین نمازیں باقاعدہ جماعت کے ساتھ ہوا کرتی تھیں، جن میں پاپا سمیت وہ تمام ملاقاتی بھی شامل ہوتے، جو تعزیت کے لیے آتے تھے۔ مما بھی سر پر سفید چادر ڈالے اور ہاتھ میں تسبیح لیے عورتوں کے جم گھٹے میں ورد کرتی نظر آتیں۔ اور میں نے زندگی بھر میں صرف اُن ہی دنوں میں اُن کے ہاتھ میں قرآن دیکھا تھا۔ مطلب یہ ہے کہ صرف موت ہی ہمارا مذہب سے واحد ذریعہ ملاقات تھا اور چونکہ دادا اور دادی کے بعد گھر میں کسی خونی رشتے کی موت نہیں ہوئی تھی لہٰذا تب سے مذہب کے لیے بھی گھر کے دروازے ہمیشہ کی طرح بند تھے۔

جس دن میں درگاہ سے ایک رات گزارنے کے لیے گھر گیا تھا، اُس دن میں نے بھی کوئی نماز نہیں پڑھی تھی، حالانکہ اس شور اور ہنگامے میں بھی مجھے تمام نمازوں کے اوقات نہ صرف یاد رہے بلکہ ہر نماز کے وقت میرے اندر ایک عجیب سی بے چینی کی کیفیت بھی اُبھری۔ جیسے مجھ سے کوئی اہم چیز چھوٹ رہی ہو۔ مجھے کھو دینے کا عجیب سا احساس بھی ہوا لیکن پتا نہیں کیوں، میں اپنے گھر والوں اور دوستوں کے سامنے نماز پڑھنے کی ہمت نہیں کر پایا۔ ایک عجیب سی جھجک محسوس ہو رہی تھی۔ جیسے میں کوئی جرم کرنے چلا ہوں۔ مجھے یوں لگا کہ جیسے یہ لوگ کیا کہیں گے کہ ''ساحر تو پکا مولوی بن گیا ہے۔ درگاہ جا کر......'' پتا نہیں، ہمارے گھرانوں

میں مولوی جیسا محترم لفظ کیوں اور کب کیسے ایک الزام کی صورت اختیار کر گیا تھا۔ ہمارا مذہب سے تعلق صرف بچے کے کان میں اذان دلوانے سے لے کر نماز جنازہ پڑھوانے تک ہی رہ گیا تھا۔ درمیان کا مذہب نہ جانے کہاں کھو گیا۔ سو، میں بھی اپنے گھر میں، یا اپنے دوستوں کی محفل میں ایک نماز بھی ادا نہیں کر سکا۔ البتہ واپس آ کر میں نے مولوی خضر سے اپنی اس کمزوری کا ذکر کیا تو انہوں نے دھیرے سے مسکرا بس اتنا کہا۔ ''چلو جو ہوا سو ہوا، تم یوں کرو کہ ان سب نمازوں کی قضا پڑھ لو۔ مذہب کا کام راستہ دینا ہے، راستہ روکنا نہیں۔'' اب میں اُن سے کیا کہتا کہ مجھ سے تو میری پوری زندگی ہی ''قضا'' ہونے کو ہے۔ زہرا کے حصول کی لگن بھی ایک طرح کی اُمید ہی تھی۔ لیکن جب سے اُس نے مجھے اپنا یہ جنون ترک کرنے کی درخواست کی تھی، تب سے مجھے واقعی کچھ ایسا ہی محسوس ہو رہا تھا جیسے ''وہ ایک سجدہ'' جس میں اسے مانگنا تھا، وہی مجھ سے قضا ہو چکا ہے۔

میں نے آخرکار حتمی فیصلہ کر ہی لیا اور ایک طویل خط میں عبداللہ کو زہرا کی درخواست کے بارے میں ساری تفصیل لکھ ڈالی۔ عبداللہ کو یہ بھی بتا دیا کہ اب میرا اس درگاہ پر مزید ڈیرہ ڈالے رہنے کا کوئی مقصد ہے نہ فائدہ۔ لہٰذا وہ سلطان بابا کو بتا دے کہ میں شرط ہارنے کا اعلان کر رہا ہوں اور اس جمعرات کے بعد درگاہ چھوڑ جاؤں گا۔ ہو سکے تو وہ کسی اور خدمت گار کا بندوبست کر لیں، یا پھر عارضی طور پر عبداللہ ہی واپس یہاں آ جائے۔ خط لکھتے ہوئے بھی یہ بات میرے دل میں آئی تھی کہ زہرا بھی تو یہی چاہتی تھی کہ خود عبداللہ اس درگاہ کا انتظام پھر سے سنبھال لے۔ شاید اِسی طرح میں اُس محبوب کے کچھ کام آ جاؤں؟ ابھی میں خط لکھ کر فارغ ہوا تھا کہ باہر سے کریم کا نعرہ گونجا۔ ''عبداللہ بھائی...... کدھر ہو، آپ کے مہمان آئے ہیں۔'' میں حیرت کے عالم میں درگاہ کے دروازے سے باہر نکلا تو سامنے اُس رات والے موٹر سائیکل گروپ کے نعمان اور اُسی شریر سی چیونگم چباتی لڑکی کو کھڑے پایا، جو اُس رات بھی نعمان ہی کی بائیک پر بیٹھی ہوئی تھی۔ نہ جانے اُن دونوں کو دیکھ کر مجھے ایک انجانی سی خوشی کا احساس کیوں ہوا۔ میں نے گرم جوشی سے آگے بڑھ کر اُن کا استقبال کیا۔ لڑکی کا تعارف نعمان نے ٹینا کہہ کر کروایا۔ ٹینا درگاہ کے صحن میں داخل ہوتے ہوئے کچھ ہچکچا رہی تھی۔ میں نے نعمان کو اشارہ کیا تو وہ ٹینا کا ہاتھ پکڑے درگاہ میں داخل ہو گیا۔ ہم صحن ہی میں ایک جانب

درخت کی چھاؤں میں بیٹھ گئے۔ ٹینا نے آس پاس حیرت سے دیکھا۔ ''آپ یہاں رہ
ہیں......؟ بور نہیں ہو جاتے۔'' مجھے اُس کی بات سن کر ہنسی آ گئی۔ ''بہت بور ہوتا ہوں، کبھی کبھی
تو اتنا بور ہوتا ہوں کہ خود بوریت بھی مجھ سے بور ہو کر کہیں اور چلی جاتی ہے۔'' وہ دونوں میری
بات سن کر ہنس پڑے۔ نعمان نے بتایا کہ وہ حسب وعدہ مجھ سے اپنی بائیک کے بارے میں
معلومات لینے آیا ہے۔ میری طرح وہ بھی ہیوی بائیکس کا دیوانہ لگتا تھا۔ میں نے بہت تفصیل
سے اُسے تمام معلومات سے آگاہ کیا اور ہر پرزے کی الگ الگ خصوصیات بھی بتائیں۔ نعمان
اور ٹینا دونوں ہی بہت غور اور دل چسپی سے میری باتیں سنتے رہے۔ نعمان نے مجھے بتایا کہ
اُس نے حال ہی میں شپ کے ذریعے یہ بائیک جرمنی سے منگوائی ہے۔ اس لیے اُسے شروع
شروع میں اسے سنبھالنے میں بہت دشواری پیش آ رہی ہے۔ ہماری گفتگو کے دوران ایک
مولوی خضر بھی کسی کام سے درگاہ آئے اور انہوں نے نعمان اور ٹینا کو دعا بھی دی۔ شام ڈھلے
وہ دونوں رُخصت ہوئے تو بہت خوش تھے۔ ٹینا نے تو باقاعدہ درگاہ کی زندگی پر ایک انگریزی
اخبار میں فیچر لکھنے کا پروگرام بھی بنا لیا تھا اور نعمان نے مجھ سے وعدہ کیا کہ وہ جلد ہی مجھ سے
ملنے دوبارہ آئے گا۔ جانے کیوں میں اُسے یہ نہیں بتا سکا کہ اب جب وہ یہاں آئے گا تو شاید
مجھ سے اُس کی ملاقات نہ ہو۔ کیونکہ دو دن کے بعد ہی تو جمعرات تھی۔ میری اس درگاہ میں
آخری جمعرات۔

لیکن اگلے دو دن میرے لیے بہت ہی کٹھن ثابت ہوئے۔ اُس رات مولوی خضر
شدید بخار نے آ گھیرا اور اُن کی تیمارداری اور دیگر اُمور کو نمٹانے میں وقت کچھ یوں گزرا
کچھ پتا ہی نہیں چلا۔ کریم بھی اپنی کشتی لے کر چار دن کے لیے کھلے سمندر میں جال ڈالنے
لیے جا چکا تھا، لہٰذا مجھے اپنی مالاؤں کے ساتھ ساتھ مولوی خضر کی تنکوں کی بنی ہوئی ٹوپیاں
بیچنے کے لیے جمعرات کو خود بازار جانا پڑا۔ ہمارا طریقہ کار بھی وہی ہوتا تھا جو باقی پھیری
بازار سجانے کے لیے اختیار کرتے تھے۔ یعنی ساحل پر کسی چادر، یا لکڑی کے تختے وغیرہ پر
لگا کر گاہک کا انتظار کرنا، لیکن جانے اُس دن ایسی کیا بات تھی کہ کوئی خریدار میری طرف
ہی نہیں کر رہا تھا۔ اُوپر سے جمعرات کی وجہ سے درگاہ میں زائرین کا رش بڑھتا جا رہا تھا۔
سیڑھیوں سے کچھ فاصلے ہی پر اپنی مالائیں اور مولوی خضر کی ٹوپیاں سجائے بیٹھا درگا

سیڑھیوں سے اُوپر جاتے لوگوں کی بھیڑ کو دیکھ رہا تھا اور پریشان ہو رہا تھا کہ نہ جانے اُوپر صحن
میں موجود دو خدمت گار ٹھیک سے اپنا کام کر رہے ہوں گے، یا نہیں۔ مجھے زیادہ فکر یہ تھی کہ
عصر سے پہلے اگر میں اپنی چیزیں بیچ نہیں سکا تو نذر و نیاز کا معاملہ کون بھگتائے گا۔ عبداللہ نے
جاتے وقت سختی سے مجھے اس معاملے کو ذاتی طور پر نمٹانے کا کہا تھا، کیوں کہ یہ اچھی خاصی رقم
کا معاملہ تھا اور لوگوں کی بہت سی امانتیں ہمارے سپرد ہوتی تھیں، ایسے میں کسی اجنبی پر بھروسا
نہیں کیا جا سکتا تھا۔ میں اِسی شش و پنج میں بیٹھا جانے کیا سوچ رہا تھا کہ اچانک کسی راہ گیر کی
ٹھوکر لگی اور میری ساری مالائیں زمین پر بکھر گئیں۔ چند ایک کے دانے بھی لڑی سے علیحدہ ہو کر
ریت پر دُور تک بکھر گئے۔ نقصان بھی میرا ہوا تھا، لیکن اس پر بھی وہ صاحب جو غالباً اپنی بیگم کو
درگاہ کی زیارت کے لیے لے کر آئے تھے، مجھ ہی پر بگڑنے لگے۔ ''غضب خدا کا۔ سارا راستہ
ان لوگوں نے بند کر رکھا ہے۔ زیارتوں جیسی مقدس جگہوں کو بھی انہوں نے کاروبار کا اڈہ بنا
رکھا ہے۔ بیگم ہم تو کہتے ہیں کہ ان ہی لوگوں کے بھیس میں وہ چور اُچکے بھی چھپے ہوئے ہیں،
جن میں سے ایک نے پچھلے ہفتے آپ کا پرس چھین لیا تھا۔'' وہ جانے کیا اُول فول کہے جا
رہے تھے۔ میں نے اپنی مالائیں چنتے ہوئے اُن سے دھیرے سے بس یہ کہا ''آپ جائیں
یہاں سے، میں معافی چاہتا ہوں۔'' لیکن اُن کا غصہ بڑھتا ہی گیا۔ اب آس پاس کے لوگ
بھی تماشا دیکھنے کے لیے جمع ہونے لگے تھے۔ ''نہیں چلے کیسے جائیں۔ ہم تو یہاں کے
ایڈمنسٹریٹر سے مل کر ہی جائیں گے۔ یوں راستہ بند کرنے کا آخر مطلب کیا ہے۔ کیسی کھلی
بدمعاشی کا بازار گرم کر رکھا ہے تم لوگوں نے۔ آج میں اس کا بندوبست کر کے ہی جاؤں گا۔''
میں سر جھکائے اُن کی باتیں سنتا رہا۔ کیوں کہ میں اس وقت عبداللہ تھا۔ اگر عبداللہ کی جگہ ساحر
ہوتا تو نہ جانے اب تک کیا ہو چکا ہوتا۔ لیکن اگر ساحر ہوتا تو وہ بھلا یوں بازار میں عام
مزدوروں کی طرح مزدوری کرنے کیوں بیٹھا ہوتا؟ وہ صاحب یوں ہی گرجتے برستے رہے۔
اب اُن کی بیگم اور باقی بھیڑ نے انہیں ٹوکنا شروع کر دیا تھا کہ چلیں جو ہوا سو ہوا۔ اب جانے
دیں۔ بھیڑ نے یہ بھی محسوس کر لیا تھا کہ میں بنا کچھ کہے، سر جھکائے اُن صاحب کی تمام
صلوتیں سن رہا ہوں۔ اب ہجوم میں سے ایک آدھ شخص نے باقاعدہ اُن صاحب کو جھاڑ کر کہا
کہ لڑکا خاموش کھڑا کب سے آپ کی گالیاں سن رہا ہے۔ لہٰذا شرافت کا یہی تقاضا ہے کہ اب

آپ بھی یہاں سے آگے بڑھ جائیں۔ لہٰذا خدا خدا کر کے بادل نخواستہ اُن صاحب نے قدم آگے بڑھائے اور میں نے لمبا سا سانس لے کر اپنی نظریں اُٹھائیں اور پھر میری نظر کسی کی نظر سے ٹکرا کر جم سی گئی۔ جب وہ صاحب دل کھول کر میری بے عزتی کر رہے تھے اور میں سر جھکائے کھڑا تھا تب نہ جانے کس وقت زہرا اپنی ماں اور خادمہ کے ساتھ وہاں سے گزرتے ہوئے شاید بھیڑ کو دیکھ کر ٹھٹکی تھی۔ یہ سارا تماشا درگاہ کی سیڑھیوں کے قریب اُسی راستے پر ہو رہا تھا، جو اُس ماہ رُخ کی راہ گزر تھی۔ مطلب یہ کہ اُس نے میری رُسوائی کا یہ سارا منظر اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا تھا۔ زہرا کی والدہ تو زیادہ میری نظر کا سامنا نہیں کر پائیں اور منہ میں چادر کا پلّو دبائے سسکتی ہوئی وہاں سے خادمہ سمیت آگے بڑھ گئیں، لیکن سنگ مرمر کی وہ مورت وہیں جمی کھڑی مجھے دیکھتی رہی۔ چند گھڑیوں ہی میں جانے کتنے طوفان گزر گئے۔ پتا نہیں، یہ میرے اندر کی شدید بے بسی کا احساس تھا، اپنی رُسوائی کا غم تھا، یا پھر اُس بے رحم کی ناقدری کا شکوہ۔ لیکن جانے کیوں پل بھر میں ہی میری آنکھوں سے بیک وقت دو آنسو نکلے اور شاید نیچے ریتیلی زمین کے بجائے اُس نازنین کے دل پر ٹپکے۔ میری زبان نے تو آج تک کبھی اُس سے شکوہ نہیں کیا تھا، پر میری آنکھوں نے شاید اُس پل اپنی ساری کہانی کہہ ڈالی۔ پھر زہرا سے بھی وہاں رُکا نہیں گیا اور وہ اپنی پلکیں بھیگنے سے پہلے ہی تیزی سے آگے بڑھ گئی۔ میں بھی بوجھل دل کے ساتھ اُوپر درگاہ چلا آیا۔ میرے اندر چند لمحوں میں اتنی زیادہ ٹوٹ پھوٹ ہو چکی تھی کہ اب میرا دل کسی کام میں بھی نہیں لگ رہا تھا۔ لہٰذا میں نے تمام کام مولوی خضر کے اُس شاگرد کے حوالے کر دیئے جو جمعرات کے روز خصوصی طور پر میری مدد کے لیے درگاہ آتا تھا۔ حتیٰ کہ عصر کے بعد نذر اکٹھی کرنے کے لیے بھی اپنے کمرے میں نہیں گیا۔ شام ڈھل رہی تھی اور میں نڈھال سا آنکھیں موندے درگاہ کے صحن کے ایک پوشیدہ گوشے میں دیوار کے ساتھ ٹیک لگائے بیٹھا ہوا تھا۔ دفعتہً کسی کے قدموں کی ہلکی سی چاپ ہوئی۔ میں نے چونک کر آنکھیں کھولیں۔ وہ بالکل میرے سامنے کھڑی تھی۔ میرا جسم شل سا ہو گیا۔ اُس کی آواز میں لرزش تھی۔ ’’آپ مجھ سے جیت گئے......‘‘

الوداع

میں حیرت سے گنگ بیٹھا رہا، نہ جانے وہ کون سی جیت کی بات کر رہی تھی۔ میں تو اپنی آخری بازی بھی ہار چکا تھا۔ میں نے شکوہ کیا۔ ’’طعنہ دے رہی ہیں......؟‘‘ ’’نہیں نہیں‘‘ وہ جلدی سے بولی۔ ’’طعنہ نہیں ہے، اعتراف ہے، میں نے آج تک صرف اپنی لگن کو دنیا کی سب سے سچی لگن مانا ہے اور دنیا کا ہر جنوں، مجھے اپنے جذبے کے سامنے ہیچ اور کم تر لگتا تھا، لیکن آج میں یہ اعتراف کرتی ہوں کہ آپ کا جذبہ اور آپ کی لگن شاید اس دنیا ہی سے ماورا ہے......‘‘ میری حالت اس وقت اُس سپہ سالار سی تھی، جو زخموں سے چور ہو کر زمین پر گر چکا ہو، سانسیں دھیرے دھیرے ٹوٹ رہی ہوں، مگر سانسوں سے اُڑتی خاک کے پس منظر میں، مرنے سے کچھ لمحے پہلے اپنی فوج کو قلعے پر فتح کا جھنڈا لہراتے ہوئے بھی دیکھ رہا ہو۔ زہرا کی آنکھوں میں آنسو تھے اور آج وہ ستم گر بھی میرے جنون کی داد دے رہا تھا، جس نے مجھے دیوانگی کی اس حد تک پہنچایا تھا۔ اُسے روتے دیکھ کر میں گھبرا کر کھڑا ہو گیا، لیکن میرے لفظ جیسے کہیں کھو سے گئے۔ ’’آپ، یہ کیا...... دیکھیں، آپ کے آنسو...... پلیز......‘‘ میں اُسے کیا کہتا خود میری آنکھیں یوں بہہ رہی تھیں، جیسے سارے بند آج ہی ٹوٹے ہوں۔ کتنی عجیب بات تھی، ہم دونوں کا درد جُدا بھی تھا اور مشترک بھی...... اور ستم ظریفی یہ بھی تھی کہ ہم ایک دوسرے کو بے وفائی کا الزام بھی نہیں دے سکتے تھے۔ اتنے میں زہرا کی ماں اور ہڑبڑائی ہوئی سی خادمہ بھی اُسے ڈھونڈتے ہوئے وہاں چلی آئیں۔ انہوں نے شاید معاملہ کچھ بھانپ لیا کہ میری حالت زار نے اُن کی پتھر دل بیٹی کے سینے پر بھی ’’پہلی چوٹ‘‘ مار دی ہے۔ انہوں نے جب میرے سر پر ہاتھ پھیرا تو ہاتھوں کی لرزش صاف محسوس کی جا سکتی تھی۔ بولیں تو لہجہ کانپتا سا، بھرایا ہوا تھا۔ ’’محلوں کا ایک شہزادہ کیوں اپنی جوانی اس خاک میں رول رہا ہے، کچھ بھکاریوں کی قسمت میں بھیک بھی نہیں ہوتی بیٹا...... جاؤ اپنی سلطنت کو لوٹ جاؤ...... مجھے اُس ماں کی آہ سے ڈر لگنے لگا ہے، جس کی پھول سی اولاد کو ہم نے یوں دربدر کر دیا۔ ہمیں معاف

کر دو، ہماری خطا بخش دو......'' وہ جانے کیا کچھ کہتی اور میرے سر پر ہاتھ رکھ کر روتی رہیں۔ زہرا کی آنکھیں تو پہلے ہی برس رہی تھیں۔ ''اس میں آپ کی کوئی خطا نہیں ہے...... میرا مقدر مجھے یہاں کھینچ لایا ہے اور تقدیر کی مار مجھے تب تک جھیلنی ہی ہوگی، جب تک میرے نصیب میں لکھی ہے۔ بعض سلطنتیں خاک ہو جانے کے لیے ہی ملتی ہیں۔'' اس کے بعد وہ وہاں رُک نہیں پائیں اور زہرا کو لے کر درگاہ سے نکل گئیں۔

شام کو میں نے مولوی خضر کو بھی اپنی روانگی کے قصد سے آگاہ کر دیا۔ میری بات سن کر وہ بے حد اداس ہو گئے۔ ''کیا کہوں میاں، مجھے تو تمھیں روکنے کا اختیار بھی نہیں۔ پتا نہیں کیوں، چند ہی دنوں میں تم سے کیسا عجیب سا قلبی تعلق بن گیا ہے۔ بہر حال جہاں رہو، خوش رہو......'' میں نے انھیں بتایا کہ خود میرا دل بھی یہاں سے جاتے ہوئے بہت بوجھل ہو رہا ہے۔ کبھی کبھی کچھ انجان سے رشتے بھی کسی سرطان کی طرح تیزی سے خون میں شامل ہو کر رگوں میں اپنی جڑیں بچھا لیتے ہیں۔ کہیں بتائے ہوئے چند دن پچھلی پوری زندگی پر بھاری ہو جاتے ہیں۔ میں بھی یہاں سے ایسے ہی رشتے اور درگاہ سے کچھ ایسا ہی تعلق بنا کر واپس لوٹ رہا تھا۔ کتنے بندھن بندھ گئے تھے میرے اس درگاہ سے۔ کتنے انمول رشتوں کی ٹوکری بھر کر لے جا رہا تھا میں اپنے ساتھ۔ اور پھر وہ ناز آفرین...... کیا ہوا، جو وہ مجھے مل نہیں پائی۔ اُس کی محبت کا سدا رہنے والا احساس تو تھا میرے ساتھ، کیا آئندہ زندگی کاٹنے کے لیے یہ سب کافی نہیں تھا۔ میں نے اُس رات بیٹھ کر عبداللہ اور سلطان بابا کے نام الگ الگ لفافوں میں دو خط لکھ کر رکھ دیے۔ اُن سے بنا ملے چلے جانے پر معذرت کی اور یہ وعدہ بھی کیا کہ جب میں اپنے اندر کی شرمندگی پر قابو پا لوں گا تو اُن سب سے ملنے ضرور آؤں گا۔ فجر کی نماز کے بعد میں نے دونوں خط مولوی خضر کے حوالے کر دیے۔ وہ بہت دیر تک مجھے گلے لگا کر تھپکتے رہے۔

میں نے اُن سے آخری الوداع چاہا تو مسکرا کر بولے ''کیوں میاں، واپس اپنی دنیا میں جا کر ہمیں بھول تو نہیں جاؤ گے؟ اور کچھ یاد آئے نہ آئے، لیکن مولوی خضرالدین کے ہاتھ کی صبح کی چائے تو تمھیں ضرور یاد آئے گی، ہے نا......؟'' اُن کی بات سن کر پل بھر ہی میں میرے ضبط کے سارے بندھن ٹوٹنے لگے۔ جانے خدا نے ہم انسانوں کا دل اتنا کمزور کیوں بنایا ہے۔ ہم جا بجا خود کو اذیت دینے والے رشتے کیوں پال لیتے ہیں؟

مما اور پاپا نے یوں اچانک مجھے گھر میں دیکھا تو اُن پر شادیٔ مرگ کی کیفیت طاری ہو گئی۔ مما کو تو یقین ہی نہیں آ رہا تھا کہ میں مستقل گھر واپس آ گیا ہوں۔ پاپا بھی بہانے بہانے سے تصدیق کر رہے تھے۔ بڑی مشکل سے میں نے کسی طرح سمجھایا کہ اس وقت شدید تھکا ہوا ہوں اور سونے کے لیے اپنے کمرے میں جانا چاہتا ہوں۔ اگلی صبح میری آنکھ شور، ہنگامے سے کھلی۔ حسبِ توقع مما نے میرے سارے دوستوں کو خبر کر دی تھی اور وہ سب نیچے لاؤنج میں جمع ہو کر چلا چلا کے مجھے نیچے بلا رہے تھے۔ اُن کو میرے شرط ہار جانے کا یقین ہی نہیں تھا، کیوں کہ اس سے پہلے میں ایسی کئی شرطیں جیت کر اور سرخرو ہو کر واپس لوٹا تھا۔ بہر حال اُن کے لیے یہی کافی تھا کہ میں واپس لوٹ کر اُن کے درمیان پہنچ چکا تھا، لیکن کیا میں واقعی واپس آ گیا تھا......؟

دن گزر رہے تھے، لیکن مجھے یوں محسوس ہوتا کہ میں وہاں ہوتے ہوئے بھی وہاں موجود نہیں۔ گھر میں، دوستوں کی محفل، کلب، پارٹی میں، ہر جگہ جسمانی طور پر پہنچ تو جاتا لیکن گھنٹوں گم صم بیٹھا رہتا۔ یار دوست میری خاموشی سے تنگ آ کر لڑتے جھگڑتے اور میں یوں ہی اُن کی ہاں میں ہاں ملاتا رہتا، لیکن نہ جانے کیوں اُن لمحات میں مجھے ایسا محسوس ہوتا کہ میں اپنی رُوح کہیں دُور چھوڑ آیا ہوں۔ سب سے زیادہ مسئلہ مجھے نماز کے اوقات میں ہوتا۔ ایک عجب سی بے چینی اور کسک مجھے گھیر لیتی تھی۔ تب میرے لیے گھر، یا باہر کسی بھی محفل میں بیٹھے رہنا دوبھر ہو جاتا اور مسئلہ یہ تھا کہ کلب، یا گھر کا ماحول میری اس مشکل کو ختم کرنے کے بجائے مزید بڑھا دیتا۔ ایسے میں، میں گھر، یا محفل چھوڑ کر کہیں باہر نکل جاتا۔ کسی پُرسکون گوشے کی تلاش میں۔ ایک ایسی ہی سہ پہر جب میرے اندر کی بے چینی آخری حدوں کو چھو رہی تھی، میں گاڑی لے کر گھر سے نکلا اور پتا نہیں کب سینٹرل لائبریری کا بورڈ دیکھ کر شہر کی سب سے بڑی لائبریری کی پارکنگ میں گاڑی پارک کر دی۔ ہال میں مختلف شیلف ہر موضوع کی کتابوں سے بھرے ہوئے تھے۔ دفعتہً میری نظر ''تصوف'' والے سیکشن میں رکھی کتابوں پر پڑی اور میں یونہی ورق گردانی کے لیے ایک کتاب لے کر ایک گوشے میں بیٹھ گیا۔ کچھ صفحے پلٹے تو میری بے چین رُوح کو جیسے کچھ مرہم ملا۔ ہاں ٹھیک ہی تو تھا، جانے کب سے میری رُوح گھائل تھی، بیمار تھی۔ اور حیرت ہے کہ ہم اپنی جسمانی بیماری کے لیے تو ڈاکٹر کے پاس

درجنوں چکر لگا آتے ہیں لیکن رُوح کی بیماری ختم کرنے کے لیے کبھی کوئی کتاب تک اُٹھا نہیں
پاتے۔ پہلے چند صفحوں ہی میں مجھ پہ یہ حقیقت آشکار ہونے لگی کہ تصوف کی دنیا، ہماری ظاہ
دنیا سے کہیں زیادہ بڑی ہے۔ ہزاروں لاکھوں لوگ اس دنیا کے باسی ہیں۔ جو ہر غرض، لا
سے بے پروا ہو کر انسانیت کی خدمت میں مصروف ہیں۔ ان میں ہمارے آس پاس پھر
عام لوگوں سے لے کر اعلیٰ تعلیم یافتہ اور ہنرمند لوگ بھی شامل ہیں۔ تصوف دراصل رُوح
دنیا کا دوسرا نام تھا اور میں اس رُوحانی دنیا کو چھوڑ کر واپس آ گیا تھا۔ یہ ایسے لوگوں کی دنیا تھ
جو کسی عہدے، مرتبے کی فکر کیے بغیر ہم جیسے بھٹکے ہوئے انسانوں کو اُن کی اصل راہ پر لا
کے لیے شاید ابد تک مصروف رہنے والے تھے۔ جیسے جیسے میں کتاب کے صفحے پلٹتا گیا مجھے
صفحے پر اپنے ایک نئے سوال کا جواب ملتا چلا گیا۔ مجھے پتا چلا کہ مذہب صرف پانچ نمازیں پ
لینے، یا روزے رکھ لینے کا نام نہیں، یہ صرف بنیادی فرائض ہیں۔ جنہیں ادا کرنے کے ب
مذہب کا اصل سلیقہ اور اصل نظام شروع ہوتا ہے۔ مذہب تو بانٹنے کا نام ہے، چاہے وہ مذ
تعلیمات ہوں، یا کوئی دنیاوی شے...... مذہب ہر نعمت، علم اور سلیقے کو دوسروں تک پھیلا
نام ہے اور یہی کام عبداللہ، سلطان بابا اور مولوی خضر اس درگاہ کی چھوٹی سی دنیا کے ذریعے
رہے تھے اور یہ سلسلہ لامحدود تھا۔ گھروں میں، مسجدوں، درگاہوں، دفتروں میں، سمندروں
پہاڑوں، ساحلوں پر اور نہ جانے کہاں کہاں یہ لوگ پھیلے ہوئے تھے اور نہ جانے کس کس بھ
میں مذہب سے دُور اور مجھ جیسے بھٹکے ہوئے لوگوں کو تعلیم دے رہے تھے۔ ہمارے لا
دھتکارنے، مذاق اُڑانے اور شک کرنے کے باوجود، یہ دُھن کے پکے اپنا فرض سرانجام د
رہے تھے اور میں کس قدر بدنصیب تھا کہ اس نظام کا ایک حصہ بنتے بنتے رہ گیا۔ چند گھنٹ
کے بعد جب میں بوجھل دل لے کر لائبریری سے اُٹھا تو یوں محسوس ہو رہا تھا کہ جیسے کہیں مَ
یہ "لائبریری یاترا" بھی کسی کی دعاؤں کا اثر تھی؟ مولوی خضر سے جب میں بہت زیادہ ضد
کیا کرتا تو میری ساری تکرار کے بدلے میں اُن کا جواب صرف اتنا ہی ہوتا تھا۔ "ٹھیک و
کا انتظار کرو میاں...... وقت آنے پر قدرت تمہیں ہر سوال کے جواب تک خود پہنچا د
گی......" افسوس کہ قدرت نے میرے بہت سے سوالوں کے جواب تو دیے...... پر بہت
سے، یا پھر شاید میں خود ہی کچھ جلد باز نکلا......

لائبریری سے گھر پہنچتے پہنچتے شام ڈھل چکی تھی اور جیسے ہی میری گاڑی گھر کے قریب
پہنچی، میں نے گھر کے گیٹ سے زہرا کی سیاہ شورلیٹ نکلتے دیکھی۔ ہاں...... وہ اُسی کی گاڑی
تھی۔ لیکن ہمارے گھر، کیوں......؟ اگلے ہی لمحے مجھے اس گاڑی نے کراس کیا تو میں نے
آگے ڈرائیور اور پچھلی سیٹ پر صرف زہرا کی امی کو بیٹھے دیکھا۔ کوئی اور وقت ہوتا تو اُس ماہ
رُخ کی گاڑی اپنے گھر سے نکلتے دیکھ کر شاید خوشی کے مارے میرا دم ہی نکل جاتا، لیکن اس
وقت میں ایک اُلجھن آمیز سی حیرت لیے گھر میں داخل ہوا۔ مما اور پاپا پورچ ہی میں کھڑے
تھے شاید زہرا کی امی کو رُخصت کرنے کے لیے آئے ہوں...... مجھے گاڑی سے اُترتا دیکھ کر مما
والہانہ انداز میں میری جانب بڑھیں اور خوشی سے لرزتے ہوئے لہجے میں بولیں۔ "ساحر بیٹا،
ابھی زہرا کی امی آئی تھیں۔ زہرا نے رشتے کے لیے ہاں کر دی ہے۔" پل بھر کے لیے تو مجھے
لگا کہ ساری زمین گھوم رہی ہے اور یہ آسمان بھی کچھ ہی پل میں میرے سر پر گر جائے گا۔
میرے ماں باپ مجھے گلے لگا کر، چوم کر مبارک باد دے رہے تھے، لیکن مجھے سمجھ میں نہیں آ رہا
تھا کہ میں روؤں، یا ہنسوں...... خوشی سے چلاؤں، یا دُکھ اور اذیت سے چیخ چیخ کر آسمان کو
ریزہ ریزہ کر دوں۔ اپنے جذبات کے اظہار کا کوئی ذریعہ مجھے اس وقت نہیں سوجھ رہا تھا۔
مجھے تو یہ بات سنتے ہی سجدے میں گر جانا چاہیے تھا۔ صدیوں کا سفر طے کرنے کے بعد منزل
پانے والے کو بھلا اور کیا کرنا چاہیے؟ لیکن میں اپنی جگہ گنگ سا کھڑا رہ گیا۔ میں جانتا تھا کہ
میرے ذہن میں اس وقت سوالوں کا جو طوفان اُٹھ رہا تھا، اُس کا کنارا صرف عبداللہ کی ذات
تھی۔ اگلی صبح میری گاڑی ساحل کی جانب اُڑی جا رہی تھی۔ میں عبداللہ کی نئی درگاہ کی طرف
جانے سے پہلے احتیاطاً اُسے شہر والی ساحلی درگاہ پر دیکھتے ہوئے جانا چاہتا تھا اور پھر درگاہ کے
قریب کار پارک کرتے ہی میرا اندازہ درست ثابت ہوا۔ کریم مجھے سیڑھیوں کے قریب ہی مل
گیا۔ جس نے بتایا کہ سلطان بابا اور عبداللہ دونوں آئے ہوئے ہیں۔ میں تیزی سے سیڑھیاں
پھلانگتے ہوئے درگاہ کے احاطے تک پہنچا تو دُور ہی سے عبداللہ مجھے کسی شخص کو رُخصت کرتے
ہوئے دکھائی دیا۔ وہ شخص پلٹا تو حیرت کا ایک اور جھٹکا میرا منتظر تھا۔ یہ تو وہی صاحب تھے،
جنہوں نے اُس دن بازار میں بنا کسی غلطی کے مجھے سرعام اس قدر بے عزت کیا تھا کہ درد کے
مارے میرے آنسو نکل آئے تھے۔ عبداللہ اور وہ صاحب بیک وقت مجھے دیکھ کر ٹھٹکے اور پھر

عبداللہ کی ازلی ملائم سی مسکراہٹ اُس کے چہرے پر پھیل گئی۔ ''آؤ ساحر میاں...... خوش آمدید۔'' اچانک ہی وہ صاحب تیزی سے میری جانب لپکے۔ غصے سے میرا چہرہ تمتما سا گیا۔ لیکن یہ کیا؟ انہوں نے آتے ہی میرے ہاتھ پکڑ لیے اور نہایت لجاجت سے بولے۔ ''معاف کرنا بیٹا، اُس روز تمہارا بہت دل دُکھایا۔ سچ کہو تو گناہ عظیم کیا۔ پر کیا کرتا، بندے کو یہی حکم ملا تھا...... لیکن آفرین ہے تمہارے حوصلے اور صبر پر، میری ہر گالی، ہر چرکے کو دل پر سہا، لیکن اُف نہ کی۔ میں تم ہی سے معافی مانگنے یہاں آیا تھا۔ اُمید ہے دل میں کوئی میل نہیں رکھو گے۔'' وہ صاحب نہ جانے کیا کچھ کہتے جا رہے تھے اور میں حیرت سے عبداللہ کی طرف دیکھ رہا تھا۔ گویا یہ سارا ڈراما صرف میرے اور زہرا کے لیے رچایا گیا تھا۔ وہ صاحب رُخصت ہو گئے تو میں نے عبداللہ کی طرف شاکی نگاہوں سے دیکھا۔ ''میں جانتا تھا زہرا کی صورت میں تم مجھے بھیک ضرور دو گے۔ لیکن اگر مجھے بھکاری ہی بنانا تھا تو پھر اتنے کڑے امتحان میں کیوں ڈالا۔ پہلے ہی دن زہرا کو کیوں نہیں کہہ دیا کہ وہ میری طرف پلٹ جائے؟'' ''نہیں تم غلط سمجھ رہے ہو۔ سلطان بابا نے صرف تمہارا امتحان لینے کے لیے اُس شخص کو وہاں بھیجا تھا۔ وہ دیکھنا چاہتے تھے کہ پہلے دن آنے والے جلد باز اور غصیلے ساحر اور درگاہ پر چند ہفتے جینے والے عبداللہ میں کتنا فرق ہے۔ زہرا کا وہاں پہنچ جانا صرف ایک اتفاق اور تمہاری قسمت کی بدولت تھا۔'' اگر مجھے یہ پتا نہ ہوتا کہ عبداللہ جھوٹ نہیں بولتا تو شاید میں اس وقت اُس کی اس اتفاق والی بات پر کبھی یقین نہ کرتا۔ ''بہر حال، چاہے وہ اتفاق ہی سے وہاں آ پہنچی تھی، لیکن سچ یہی ہے کہ اُس کا دل نرم کرنے میں اتفاق نے بہت بڑا کردار ادا کیا ہے۔ میں یہ کیسے مان لوں کہ اُس کی ہاں کے پیچھے مزید کوئی اتفاق چھپا ہوا نہیں ہے۔'' عبداللہ مسکرا دیا۔ ''اگر تم اُس روز بھڑک کر اُس شخص کو پلٹ کر جواب دے دیتے تو یہ اتفاق تمہارے خلاف بھی جا سکتا تھا۔ تمہیں جو بھی ملا تمہارے صبر کے اجر میں ملا ہے اور بجائے خوش ہونے کے تم شکوک و شبہات میں پڑ کر اپنی جیت کا مزہ بھی کرکرا کر رہے ہو۔ میرا یقین کرو، میری اُس لڑکی سے ملاقات تو کیا، بات تک نہیں ہوتی۔'' میرا دل بیک وقت عبداللہ کی بات پر یقین کر بھی رہا تھا اور نہیں بھی۔ اتنے میں سلطان بابا کی آواز سنائی دی۔ ''کہاں چلے گئے تھے میاں ہمارا انتظار تو کیا ہوتا......'' چونک کر پلٹا تو وہ سامنے ہی ہاتھ میں تسبیح لیے کھڑے تھے۔ گرم جوشی سے مجھے اپنے سینے

لگایا اور گال تھپتھپائے۔ میں نے شرمندگی سے معذرت پیش کی۔ ''جب کھلاڑی ہار جائے تو اُسے میدان میں کھڑے رہ کر کسی اشارے کا انتظار نہیں کرنا چاہیے۔ خود ہی میدان چھوڑ دینا چاہیے۔ اِسی لیے آپ کا سامنا کیے بغیر ہی چلا گیا تھا۔ اُمید ہے آپ مجھے معاف کر دیں۔'' وہ خوش دلی سے ہنسے۔ ''ارے نہیں میاں، ناراضی کی تو کوئی بات ہی نہیں۔ یہ تو دل کا معاملہ ہے۔ تم نے وہی کیا جو تمہارے دل نے کہا۔ اور بھئی یہ تم سے کس نے کہہ دیا کہ تم ہار گئے ہو۔ تمہاری فتح کی خبر بھی ہم تک پہنچ چکی ہے۔ آخری جیت تو تمہاری ہی ہوئی نا۔ تم نے جو چاہا، آخر کار اُسے پا لیا۔ جیتے رہو۔'' سلطان بابا میرا کاندھا تھپتھپا کر آگے بڑھ گئے۔ میں جانتا تھا کہ وہ مجھے مزید شرمندگی سے بچانے کے لیے زیادہ دیر تک نہیں ٹھہرے۔ گویا زہرا کے اقرار کی انہیں بھی خبر ہو گئی تھی۔ میرے ذہن میں عبداللہ کا مخصوص جملہ گونجا۔ ''جب جب جو جو ہونا ہے، تب تب سو سو ہوتا ہے......'' لیکن میری رُوح کو قرار کیوں نہیں مل رہا تھا؟ میرے اندر کی بے چینی لحہ لحہ بڑھتی کیوں جا رہی تھی؟ اور پھر جب عبداللہ نے مجھے یہ بتایا کہ وہ اور سلطان بابا ایک اہم مشن پر بہت جلد کسی دُور دراز سفر پر نکل رہے ہیں، تو میرے منہ سے بے اختیار نکلا۔ ''تو پھر پیچھے درگاہ کا خیال کون رکھے گا؟'' ''مل ہی جائے گا کوئی نہ کوئی اللہ کا بندہ...... سنا ہے سلطان بابا نے کسی نئے عبداللہ کا انتخاب کر لیا ہے۔'' عبداللہ اپنی دُھن میں مگن مجھے بتاتا رہا۔ لیکن میرا دل تو یہ سن کر ہی ڈوب گیا کہ اب کوئی اور درگاہ کی رکھوالی کرے گا۔ نہ جانے اپنائیت کا یہ کیسا احساس تھا کہ میں درگاہ پر کسی نئے عبداللہ کی آمد کا سن کر کچھ ایسے ہی بے چین ہو گیا، جیسے میری کوئی ذاتی جاگیر لوٹ کر لے جا رہا ہو۔

میں ٹوٹے ہوئے دل سے عبداللہ سے پھر ملنے وعدہ کر کے وہاں سے چلا آیا۔ لیکن پھر میرا دل کسی بھی کام میں نہیں لگ پایا۔ گھر پہنچا تو ایک نئی خبر میری منتظر تھی۔ زہرا نے اپنی والدہ کے ذریعے پیغام بھجوایا تھا کہ وہ باقاعدہ رشتہ طے ہونے سے پہلے ایک بار مجھ سے ملنا چاہتی ہے۔ ملنا تو مجھے بھی اُس سے تھا، کیوں کہ ہمارے رشتے پر چھائی ہوئی دُھند چھٹنے کے بجائے بڑھنے لگی تھی۔ میں نے ملاقات کے لیے وہی جگہ تجویز کی جہاں سے یہ کہانی شروع ہوئی تھی اور اگلے دن شام ڈھلے ہم دونوں درگاہ کی سیڑھیوں سے کچھ فاصلے پر ایک دوسرے کے سامنے کھڑے تھے۔ زہرا کی امی ڈرائیور سمیت اُوپر درگاہ کی حاضری کو جا چکی تھی۔ آج وہ ناز آفرین

اپنی جبیں پر کوئی شکن لیے بغیر، نظریں جھکائے میرے سامنے کھڑی تھی۔ کیا اب مجھے اپنی تقدیر سے کوئی گلہ باقی رہ جانا چاہیے تھا؟ پل بھر ہی میں میری نظروں کے سامنے اُس پری کی ناراضی، دھتکار اور اُس سے ہوئی آدھی ادھوری ملاقاتوں کے تمام مناظر گھوم گئے، لیکن آج وہ میرے سامنے اُس بادشاہ کی طرح کھڑی تھی، جو میدان جنگ میں شکست کے بعد دوسرے شہنشاہ سے کہتا ہے کہ اُس سے وہی سلوک کیا جائے، جو بادشاہوں کا شیوہ ہے۔ میں نے اُس کی لرزتی پلکوں پر نظر ڈالی۔ ''میں آپ سے صرف یہ کہنا چاہتی ہوں کہ میرے اس فیصلے میں کسی ترحم آمیز جذبے کی ملاوٹ نہیں ہے۔ یہ میرا اپنا فیصلہ ہے۔ لیکن میرا ماضی بھی آپ کے سامنے پوری طرح عیاں ہے، لہٰذا اب فیصلہ آپ کا ہوگا۔ کیا آپ مجھے میرے ماضی سمیت قبول کر پائیں گے۔ میرا پچھلا جنوں کبھی طعنہ بن کر آپ کے لبوں پر تو نہیں آ جائے گا؟ اپنے ظرف کے پیمانے کی وسعت جانچ کر ہی کوئی فیصلہ کیجیے گا۔ مجھے دونوں صورتوں میں آپ کی رائے سے اتفاق ہوگا......'' اُس نے ایک ہی پل میں ساری باتیں کر ڈالیں۔ اب میں اُسے کیا بتاتا کہ میرے ظرف کا امتحان تو قدرت نے اُسی دن سے لینا شروع کر دیا تھا، جب میں نے پہلی مرتبہ اُسے دیکھا تھا۔ ''ظرف کا پیمانہ وسیع نہ ہوتا تو شاید ہم دونوں آج یوں ایک دوسرے کے سامنے کھڑے نہ ہوتے۔ لیکن میں آپ سے صرف ایک سوال کرنا چاہتا ہوں۔ یہ رشتہ صرف تن پر حکمرانی تک رہے گا، یا پھر مجھے رُوح کا غلبہ بھی حاصل ہوگا......؟'' میری بات سن کر وہ چونکی اور نظریں اُٹھا کر مجھے یوں دیکھا، جیسے پہلی مرتبہ دیکھ رہی ہو۔ اُس کی وہ پہلی نظر تھی، جو صرف میرے لیے تھی، صرف ساحر کے لیے۔ اُس کے لب ہلے۔ ''رُوح پر قبضہ پانے میں تو کبھی کبھی صدیاں بھی لگ جاتی ہیں ساحر......'' ''تو پھر میں مزید کئی صدیاں انتظار کرنے کے لیے تیار ہوں۔ کیا آپ میرے انتظار کی منزل تک میرا انتظار کر پائیں گی......؟'' میری بات سن کر اُس کا گلابی چہرہ کچھ اس طرح کھل گیا، جیسے سوچ اور تفکرات کے سبھی بادل ایک دم ہی چھٹ گئے ہوں۔ ''سوچ لیں، میرے پاس انتظار کے لیے زندگی پڑی ہے۔ لیکن کیا آپ رُوح سے رُوح کے رشتے کے لیے اتنا بڑا جوا کھیل پائیں گے۔ نتیجہ کچھ بھی ہو سکتا ہے؟'' ''نتیجہ جو بھی ہو، ہوگا تو آپ کی رُوح کا ہی......اور میں اس دربار میں اپنا سر تسلیم ازل ہی سے خم کر چکا ہوں۔'' اُس کے پنکھڑی سے لبوں پر میں نے زندگی میں پہلی مرتبہ ایک

مسکراہٹ اُبھرتی دیکھی، دنیا کی سب سے حسین مسکراہٹ۔ وہ کچھ دیر مجھے غور سے دیکھتی رہی۔ پھر دھیرے سے بولی۔ ''میری دعائیں سدا آپ کے ساتھ ہیں......'' میں نے چونک کر اُسے دیکھا، لیکن پھر وہ وہاں رُک نہیں پائی اور سلام کر کے چل دی۔ اپنی تقدیر پر جتنا پیار مجھے اس لمحے آیا، شاید زندگی میں اس سے پہلے کبھی نہیں آیا تھا۔

گھر واپسی پر جب میں نے مما اور پاپا کو اپنا اور زہرا کا فیصلہ سنایا تو کچھ دیر کے لیے تو وہ دونوں ہی جیسے دنگ رہ گئے۔ پھر پہلے پاپا نے آگے بڑھ کر مجھے گلے لگا لیا۔ ''ہمیں تم پر فخر ہے ساحر بیٹا اور ہم جانتے ہیں کہ تم ایک نہ ایک دن اُس کی رُوح کو بھی فتح کر لو گے۔ گاڈ بلیس یو۔'' ہاں......شاید میں کبھی زہرا کی رُوح کو بھی جیت ہی لوں گا۔ لیکن ان دنوں خود میری اپنی رُوح جس عذاب سے گزر رہی تھی، میں اس کا بھلا کیا درماں کرتا۔ مجھے لگتا تھا کہ میں اپنی آدھی رُوح کہیں اور چھوڑ آیا ہوں۔ آخر کار، اُس رات میرے ضبط کے سارے پیمانے چھلک پڑے اور میں آدھی رات کو کمرے ہی میں سجدے میں گر کر بلک اُٹھا۔ ''یا میرے رب مجھے اس اُلجھن سے نکال دے۔ اگر میرا مقدر دنیا ہے تو مجھے مکمل دنیا کا کر دے اور اگر میرا مقدر تیری نوکری ہے تو پھر مجھے پورا قبول کر لے......یوں میری رُوح کے کومل ریشوں کو تقسیم نہ کر۔ میں تیرا بہت نازک، بہت کمزور بندہ ہوں۔ مجھ پر اس دوراہے کا اتنا وزن نہ ڈال۔ میری مشکل آسان کر دے......'' نہ جانے کتنی دیر تک میں ہچکیاں لے لے کر روتا رہا اور پھر مجھے کب نیند آئی، مجھے خبر نہیں ہوئی۔ لیکن اُس رات میرے ماں باپ سو نہ سکے۔ جانے رات کے کس پہر، پاپا کی آنکھ کھلی اور میری ہچکیوں کی آواز نے انہیں اپنی جانب متوجہ کیا۔ پھر کب وہ مما کو بھی جگا کر میرے کمرے سے باہر آ کھڑے ہوئے۔ البتہ انہوں نے اُس وقت میرے اور میرے خدا کے رابطے کے درمیان مخل ہونا مناسب نہیں سمجھا۔ صبح جب میں ناشتے کی میز پر آیا تو اُن دونوں کے چہرے بھی آنسوؤں سے دُھلے ہوئے محسوس ہوئے۔ آخر کار، مما نے میرا ماتھا چوم کر میری ہر کشمکش کا فیصلہ کر دیا۔ مجھے رُخصت کرتے وقت انہوں نے صرف ایک جملہ کہا۔ ''ساحر! کاش میرے کئی بیٹے ہوتے اور سب تمہارے جیسے ہوتے۔ اب ہم بھی تمہارے اس حج کے سفر میں تمہارے ساتھ ہیں۔ جہاں کہیں مستقل ٹھکانہ بناؤ ہمیں بھی بتا دینا۔ ہم بھی وہیں آ بسیں گے......'' میری زبان سے بے اختیار نکلا ''ہاں، لیکن زہرا کو اپنے ساتھ لے کر

آیئے گا......'' وہ دونوں ہنس پڑے۔ اس بار مما اور پاپا خود اپنی گاڑی میں مجھے درگاہ چھوڑنے کے لیے آئے اور پھر بہت دیر تک مجھے اپنے سینے سے لگا کر کھڑے رہے۔

جب میں آخری سیڑھی چڑھ کر درگاہ کے صحن میں پہنچا تو وہاں کا منظر ہی کچھ اور تھا۔ سب کسی جلدی میں نظر آ رہے تھے۔ جیسے کسی لمبے سفر کی تیاری ہو۔ میں نے قریب سے گزرتے ایک زائر سے احوال پوچھا تو اُس کا جواب سن کر مجھے اپنی ڈولتی نیا ڈوبتی ہوئی محسوس ہوئی۔ ''سلطان بابا درگاہ کا انتظام کسی نئے خدمت گار کے سپرد کر کے خود کسی لمبے سفر پر جا رہے ہیں۔'' عبداللہ نے بتایا تھا کہ نئے عبداللہ کی تقرری کے بعد وہ لوگ نکل جائیں گے اور زائر کی اطلاع کے مطابق نئے عبداللہ کی تقرری ہو چکی تھی۔ میں نے مایوس ہو کر واپسی کے لیے قدم اُٹھائے ہی تھے کہ اچانک ایک آواز نے میرا راستہ روک لیا۔ ''کہاں چل دیے میاں، ابھی تو ٹھیک طرح سے آئے بھی نہیں۔'' میں پلٹا، وہ سلطان بابا ہی تھے۔ عبداللہ بھی اُن کے پیچھے کھڑا مسکرا رہا تھا۔ ''شاید مجھے دیر ہو گئی ہے۔ آپ کو آپ کا خادم مل گیا ہے۔'' سلطان بابا نے میرے کاندھے پر ہاتھ رکھا۔ ''میاں جن کی ترقی ہو گئی ہو، انہیں ہم دوبارہ درگاہ کی خدمت پر نہیں لگاتے۔ تم ہمارے ساتھ چل رہے ہو۔'' خوشی اور حیرت کے مارے میری تو آواز ہی گم ہو گئی۔ ''لیکن میں، میری ترقی، میرا مطلب ہے کہ یہ عبداللہ۔'' میری حالت پر سبھی مسکرا دیے۔ ''عبداللہ میاں اب ہمارے ساتھ نہیں جا رہے۔ انہیں ہم نے کسی اور جگہ کی خدمت کے لیے بھیجنا ہے۔ ساحر تم ہمارے ساتھ چل رہے ہو۔ بولو کیا ارادہ ہے۔'' ''زہے نصیب......لیکن درگاہ کی خدمت کے لیے بھی تو کسی کو یہاں رہنا تھا، وہ کہاں ہے؟'' دفعتاً عبداللہ کے پیچھے سے نعمان کا چہرہ اُبھرا۔ ہاں وہی کھلنڈرا سا موٹر سائیکل سوار نعمان۔ وہ تیزی سے بڑھ کر میرے گلے لگ گیا۔ ''میں یہاں رہوں گا، آپ بے فکر ہو کر جائیں۔'' سلطان بابا نے کاغذ کی ایک چٹ میرے ہاتھ میں تھمائی اور پلٹ کر جاتے ہوئے بولے۔ ''اس نوجوان کو اس کے نئے نام سے آگاہ کر کے چلے آؤ، ہمیں شام ڈھلنے سے پہلے بہت لمبا سفر طے کرنا ہے۔'' میں نے کانپتے ہوئے ہاتھوں سے کاغذ کھولا......کاغذ پر نیا نام جگمگا رہا تھا۔ ''عبداللہ۔'' میں نعمان سے مل کر اور اُسے ساری تفصیل سمجھا کر سلطان بابا کے پیچھے چل پڑا۔ میری زندگی کا نیا سفر شروع ہو چکا تھا اور ہماری منزل کہاں تھی، یہ صرف سلطان بابا ہی جانتے تھے۔ میں نے

ڈوبتے سورج کی سنہری روشنی میں دُور ساحل پر کھڑے ہو کر درگاہ کی جانب پلٹ کر دیکھا۔ ایک نیا ''عبداللہ'' درگاہ کی منڈیر پر کھڑا ہمیں الوداع کہہ رہا تھا۔ میں نے دھیرے سے ہاتھ ہلایا اور میرے دل نے کہا ''الوداع۔''

کالا پانی

ہمیں سفر کرتے تین دن ہو چکے تھے۔ جانے یہ کیسا سفر تھا، جس کے راہبر نے کچھ کہا نہ پیروکار ہی نے کچھ پوچھنے کی جسارت کی۔ میں سلطان بابا کے نقشِ قدم پر چلتا، اُن کے پیچھے پیچھے روانہ تھا۔ ساحلی پٹی ختم ہوئی تو سلطان بابا نے مرکزی شاہراہ سے پہلی بس لے لی۔ دوسرے دن بس نے ہمیں ایک ویران ریلوے سٹیشن پر پہنچا دیا۔ جہاں سے رات کی واحد پسنجر ٹرین پکڑ کر ہم پہاڑوں سے گھری ایک وادی کے چھوٹے سے اسٹیشن پر اگلی رات تک آ پہنچے تھے۔ رات سلطان بابا نے وہیں اسٹیشن ہی پر بسر کی اور پھر فجر کی نماز پڑھتے ہی ہم دوبارہ پیدل ہی قریبی قصبے کو جاتی مرکزی سڑک پر چل پڑے۔ اس وقت سورج ٹھیک ہمارے سروں پر تیز کونوں کی برچھیاں چبھو رہا تھا۔ میں نے پورے سفر میں سلطان بابا کو بلاضرورت بولتے نہیں دیکھا تھا۔ پورا رستہ وہ چپ ہی سادھے رہے، لیکن اُن کی خاموشی میں بھی ایک طرح کی گفتگو تھی۔ جب کبھی مجھے تھکن کا احساس ہوتا، یا میرے من میں کوئی سوال اُبھرتا، اُسی لمحے وہ پلٹ کر مسکراتی نظروں سے میری جانب دیکھ لیتے اور میرے ہر سوال کو جیسے ایک جواب مل جاتا اور تھکن جانے کہاں اُڑ جاتی۔ کتنی عجیب بات تھی۔ کچھ لوگوں کی خاموشی بھی بولتی ہے اور کچھ لوگ بول کر بھی گونگے رہتے ہیں۔

شام تک آسمان کو کالی گھٹاؤں نے پوری طرح ڈھک لیا اور پھر مغرب سے ذرا پہلے شدید اور موسلا دھار شروع ہو گئی۔ ان پہاڑی علاقوں کی بارش کے بارے میں سنا تو بہت تھا کہ پل بھر ہی میں سب جل تھل کر دیتی ہے، لیکن تجربہ آج پہلی بار ہو رہا تھا۔ کچھ ہی دیر میں ایک چھوٹی سی آبادی کے آثار دکھائی دینا شروع ہوئے اور قصبے کی پہلی سڑک پر مڑتے ہی ایک چھوٹے سے پہاڑی ٹیلے پر بنی ہوئی ایک خستہ حال مسجد کے گنبد نظر آنے لگے۔ میں اور سلطان بابا پوری طرح بھیگ چکے تھے اور جب ہم مسجد کے کچی اینٹوں سے بنے ہوئے صحن میں داخل ہوئے تو مؤذن مغرب کی اذان کے لیے کھڑا ہو چکا تھا۔ اذان ختم کرتے ہی وہ والہانہ انداز میں کچھ اس طرح سلطان بابا کی جانب بڑھا جیسے اُس کی، اُن سے برسوں سے جان پہچان ہو۔ سلطان بابا نے میرا تعارف ''عبداللہ'' کے نام سے کروایا۔ کچھ ہی دیر میں مسجد میں قریباً درجن بھر نمازی جمع ہو گئے اور سلطان بابا ہی کی معیت میں جماعت ادا کی گئی۔ نماز کے بعد مؤذن کے سوا تمام نمازی ایک ایک کر کے رُخصت ہو گئے۔ مؤذن کا نام رشید تھا۔ جس نے نمازیوں کے جانے کے بعد جلدی سے ہم دونوں کو گرم گرم قہوہ پیش کیا۔ میں نے ابھی قہوے کا پہلا گھونٹ ہی لیا تھا کہ سلطان بابا کا سوال سن کر میرے ہاتھ سے پیالہ قریباً چھوٹ ہی گیا ''پھانسی کب ہے؟'' وہ رشید سے مخاطب تھے۔ رشید نے اِسی طرح سر جھکائے جواب دیا۔ ''پرسوں صبح...... ساڑھے چار بجے۔'' سلطان بابا نے لمبا سے ہنکارا بھرا ''ہوں...... گویا ہمارے پاس اڑتالیس گھنٹے سے بھی کم ہیں...... چلو خیر، جو اللہ کو منظور۔'' میں حیرت سے سلطان بابا اور رشید کو دیکھ رہا تھا۔ یہ کس پھانسی کا ذکر ہو رہا تھا اور اڑتالیس گھنٹوں میں ایسا کیا ہونے والا تھا۔ بڑی مشکل سے میں نے خود کو کوئی سوال کرنے سے روکا۔ کچھ ہی دیر میں مسجد کے باہر ایک سرکاری جیپ آ کر رُکی اور پھر اندھیرے میں اس کی چمکتی لائٹس کی روشنی میں پانی سے شرابور، کیچڑ میں چھپ چھپ کرتے بڑی بڑی خاکی برساتیوں میں ملبوس چند سرکاری اہل کار اُترے۔ اُن میں سے ایک بارُعب اور عمر رسیدہ شخص، جو ان سب کا آفیسر تھا، چھتری کے سائے تلے تیزی سے چلتا ہوا مسجد کے احاطے میں داخل ہو گیا۔ اُس کے سر پر چھتری تانے ہوئے ایک اہل کار تقریباً دوڑتا ہوا، اپنے افسر کو پانی کے ریلوں سے بچانے کے لیے ساتھ ساتھ چلا آ رہا تھا۔ رشید نے جلدی سے اُٹھ کر افسر کا استقبال کیا۔ ''آئیے آئیے جیلر صاحب...... سلطان بابا آپ ہی کا انتظار کر رہے ہیں۔'' آنے والے کا نام اقبال تھا اور پتا یہ چلا کہ وہ اس قصبے کی مرکزی جیل کا سپرٹینڈنٹ ہے۔ وہ سلطان بابا سے پہلی مرتبہ مل رہا تھا، لیکن اُس کے انداز و اطوار میں بھی پرانے شناساؤں جیسا احترام تھا، البتہ اُس کے چہرے سے پریشانی کے آثار جھلک رہے تھے۔ ابتدائی علیک سلیک کے بعد جب رشید نے جیلر اقبال کو بھی قہوے کا پیالہ پیش کر دیا تو سلطان بابا نے حتمی سوال کر ڈالا۔ ''ہاں بھئی جیلر صاحب...... ہم تو حاضر ہو گئے آپ کے بلاوے پر...... اب فرمائیے کیا حکم ہے؟'' میں نے حیرت سے سلطان بابا کی طرف دیکھا، تو گویا تین دن کے اس لمبے سفر کا مقصد اس جیلر کا بلاوا تھا۔ اقبال نے

عاجزانہ انداز میں جواب دیا۔ "آپ اتنی دُور سے صرف میرے بلاوے پر یہاں تک آئے، یقین جانیئے، یہ میرے لیے بہت اعزاز کی بات ہے۔ دراصل پریشانی ہی کچھ ایسی تھی کہ آپ کو تکلیف دینی پڑی۔ آپ کو رشید نے بتا تو دیا ہوگا کہ پرسوں صبح میری جیل میں ایک پھانسی کی تیاری ہے۔ ایک ایسے جیلر کی حیثیت سے، جو تقریباً ۲۵ سال کی سروس مکمل کر چکا ہو، یہ پھانسی ایک معمول کی بات ہونی چاہیے، لیکن آپ کو یہ سن کر شاید حیرت ہو کہ میری کسی بھی بڑی سینٹرل جیل میں یہ دوسری تعیناتی ہے۔ اس سے پہلے تقریباً دو سال تک سندھ کی ایک بڑی جیل میں رہ چکا ہوں، لیکن آپ اسے قدرت کی مہربانی کہیں، یا مقدر کا ستم کہ میں نے اپنی پوری سروس میں کبھی کوئی پھانسی نہیں بھگتائی۔ اور پرسوں دی جانے والی پھانسی نہ صرف میری سروس، بلکہ میری زندگی کی بھی پہلی پھانسی ہے......"

ہم تینوں نے چونک کر جیلر کی جانب دیکھا، جو سر جھکائے اپنی زندگی کی شاید سب سے بڑی اُلجھن بیان کر رہا تھا۔ اقبال نے ہمیں بتایا کہ رحیم پور کے جس قصبے میں اس وقت ہم سب موجود تھے وہیں ملک کی سب سے بڑی اور شاید سب سے پرانی مرکزی جیل بھی واقع تھی، جس میں ملک بھر سے سنگین ترین جرائم کے قیدی بھیجے جاتے تھے، جن میں زیادہ تر سزائے موت ہی کے قیدی ہوتے۔ اس جیل کے پہاڑوں میں گھرے محل وقوع اور شدید سخت اور کڑے پہرے کی وجہ سے اُسے دوسرے "کالے پانی" کے نام سے بھی پکارا جاتا تھا۔ سنا تھا کہ انگریز کے زمانے سے لے کر اب تک یہاں سے صرف دو مرتبہ قیدیوں نے نقب لگا کر بھاگنے کی کوشش کی اور دونوں مرتبہ ہی تین اور پانچ کے دو قیدی گروہ، جیل کی فصیل تک پہنچنے سے پہلے ہی اُونچی بُرجی پر کھڑے جیل کے محافظوں کی گولیوں کا شکار ہو کر مارے گئے۔ اُس کے بعد آج تک کسی قیدی کو یہ جرأت نہیں ہوئی کہ وہ اس کالے پانی کی قید سے فرار کا سوچ بھی سکے۔ اقبال جیلر کی سروس کا یہ آخری سال تھا اور رحیم پور کی جیل میں اُس کی تعیناتی کو ابھی بمشکل ڈیڑھ ماہ کا عرصہ ہی ہوا تھا، لیکن حاضری کے فوراً بعد اُسے جس سرکاری حکم کا پہلا پروانہ موصول ہوا، وہ اُسی سکندر نامی قیدی کی پھانسی تھا۔ بقول جیلر، اُسی دن سے اُس کی نیندیں حرام ہو چکی تھیں۔ پہلے پہل تو اُس نے خود کو یہ کہہ کر تسلی دے دی تھی کہ ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ جیل بھی سینئر اور تجربہ کار افسر ہے، لہٰذا اُس کی موجودگی میں پھانسی کسی نہ کسی طرح

نپٹا ہی دی جائے گی۔ لیکن شومئی قسمت، ڈپٹی کے داماد اور بیٹی کا ساہیوال میں ایک خطرناک ایکسیڈنٹ ہو گیا اور ڈپٹی کو چار دن پہلے ہی انتہائی عجلت میں چھٹی لے کر جانا پڑ گیا اور فی الحال اگلے پندرہ دن تک اُس کی واپسی کا کوئی امکان نہیں تھا۔ جیلر کی دوسری اُمید جیل کا سرکاری ڈاکٹر تھا، جسے اس پھانسی کے تمام عمل میں اور تمام تیاریوں اور انتظامات میں جیلر کی معاونت بھی کرنی تھی۔ لیکن جیلر کے یہ سن کر تو ہوش اُڑ گئے کہ ڈاکٹر نے ابھی دو سال پہلے اپنا ہاؤس جاب مکمل کیا ہے اور کسی بھی جیل میں یہ اُس کی پہلی تعیناتی ہے۔ ڈاکٹر کے تو پہلے ہی یہ سوچ کر ہاتھ پاؤں پھولے ہوئے تھے کہ ایک زندہ انسان کو اُس کی نظروں کے سامنے چلا کر لایا جائے گا اور پھر اُس کی سانسیں سلب کر لی جائیں گی۔ بقول نوجوان ڈاکٹر "کسی مریض کو اپنے سامنے دم توڑتا دیکھنے میں اور ایک انسان کو پھانسی پر لٹکتا دیکھنے میں زمین و آسمان کا فرق ہوتا ہے۔" یہ سب کچھ بتاتے ہوئے بھی اقبال کے چہرے پر ہوائیاں سی اُڑ رہی تھیں۔ اُس کی پریشانی بھی اپنی جگہ بجا تھی، کیوں کہ ملک کی سب سے بڑی جیل کا سپرنٹنڈنٹ ہونے کے ناتے اُس پر بہت بھاری ذمہ داری عائد ہوتی تھی اور اگر اس سارے پھانسی کے عمل میں کوئی بھی قانونی، یا اخلاقی سقم باقی رہ جاتا تو اُس کی تمام تر جواب دہی اُسی کو کرنا تھی۔ سلطان بابا نے بہت غور سے جیلر کی بات سنی اور پھر ہلکے سے کھنکار کر گویا ہوئے "واقعی یہ تو بڑی پریشانی کی بات ہے۔ تو پھر آپ نے اس مشکل کا کیا حل نکالا۔ ویسے آپ تو خود کافی تجربہ کار ہیں۔ آپ یہ بھی جانتے ہوں گے کہ جیل کا جلاد ایسے موقعوں پر کافی کارآمد ثابت ہوتا ہے..... کیا آپ نے جلاد سے کوئی مدد نہیں لی...... کبھی کبھی اَن پڑھ ہوتے ہوئے بھی وہ بہت سی ایسی باریک تکنیکی تفصیلات جانتا ہے، جو کسی بھی بڑے افسر کے لیے انتہائی کارآمد ثابت ہو سکتی ہیں۔" اقبال نے بے چینی سے ہاتھ ملے "اب آپ کو کیا بتاؤں...... جلاد کی پوسٹ پچھلے آٹھ مہینے سے خالی ہے۔ پُرانا جلاد ریٹائر ہوا تو حسبِ معمول جلاد کی تعیناتی کے لیے حکام بالا سے اجازت لے کر اخبارات میں اشتہار دے دیا گیا کہ جیل میں جلاد کی جگہ خالی ہے، لیکن کسی نے بھرتی کے لیے درخواست ہی جمع نہیں کروائی۔ حتیٰ کہ پرانے جلاد کے بیٹے کو تو ہم نے پیش کش بھی کی تھی کہ اگر وہ اپنے باپ کی جگہ بھرتی ہونا چاہے تو ہم محکمے سے خصوصی اجازت لے کر بنا کسی ٹیسٹ، یا انٹرویو کے اُسے براہِ راست بھرتی کر لیں، لیکن وہ دس جماعت پڑھ چکا ہے اور

اُس کے صاف انکار کر دیا کہ وہ یہ کام نہیں کرنا چاہتا۔ ویسے اب غیر مسلم بھی اس کام سے کترانے لگے ہیں۔ پہلے تو زیادہ تر جیلوں کے جلاد غیر مسلم ہی ہوا کرتے تھے، لیکن اب اس بے روزگاری کے باوجود بھی کوئی اس پیشے سے منسلک ہونا پسند نہیں کرتا۔ دراصل موت کے تختے کا لیور کھینچنے کے لیے بڑا دل گردہ چاہیے ہوتا ہے جناب...... صبح ہونے سے پہلے کا رات کا سناٹا بڑا ہولناک ہوتا ہے۔ اور اس سناٹے میں لیور کی چرچراہٹ اور تختہ کھلنے کا کھڑاک بہت سے کمزور دل حضرات کا پتا پانی کر سکتا ہے...... اور پھر ان سب سے بڑھ کر قیدی کی گردن کا منکا علیحدہ ہو کر ٹوٹنے کی وہ بے رحم چٹختی ہوئی آواز......'' جیلر کی بات سن کر مؤذن رشید کو جھرجھری سی آگئی۔ اقبال بظاہر ہمیں پھانسی کی تفصیلات بتا رہا تھا، لیکن اُس کے چہرے سے صاف ظاہر تھا کہ وہ بار بار اُس لمحے کا ذکر کر کے دراصل اپنے لاشعور میں چھپے کسی خوف کو دُور کرنا چاہتا ہے، جو اندر ہی اندر جانے کب سے اُسے ڈسے جا رہا تھا۔

مجھے یاد تھا کہ کالج پاس کرنے کے بعد میرے بہت سے دوست، جو پری میڈیکل گروپ سے وابستہ تھے، انہوں نے میڈیکل کالج میں داخلہ لیا تو میں اور کاشف بہت عرصے تک اپنے پرانے کلاس فیلوز سے ملنے کے لیے اُن کے ہاسٹلز جاتے رہتے تھے۔ غالباً تیسرے سال میں طب کی پڑھائی میں ایک مضمون انہیں پڑھایا جاتا تھا، جس کا نام جیورسپروڈنس (Jurisprudence) تھا۔ میں نے ہاسٹل کی اُن ملاقاتوں کے فارغ لمحات میں اس کتاب کے بہت سے باب یونہی پڑھ ڈالے تھے۔ یہ مضمون طب کے مختلف کینسر سے متعلق تھا اور اس میں جرم اور سزا کے باب میں پھانسی کا بھی تفصیلاً ذکر موجود تھا۔ مجھے وہ کتاب پڑھتے ہوئے کئی مرتبہ ایک عجیب سا احساس بھی ہوا کرتا کہ پھانسی جیسا عمل، جس کے متعلق سوچ کر ہی رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں، سزا کی اصطلاح میں وہ بھی ایک بے حد میکانکی سا عمل ہے۔ حتیٰ کہ مجھے یہ بھی یاد تھا کہ میں نے اُن ہی طب کے رسالوں میں کہیں ''بہترین پھانسی'' کی اصطلاح بھی پڑھی تھی۔ طب کے میدان میں اور سزا کی دنیا میں بہترین پھانسی کا تصور یہ تھا کہ قیدی کی گردن کا منکا پہلے ہی جھٹکے میں یوں ٹوٹ جائے کہ اُسے زیادہ ''تکلیف'' کا سامنا نہ کرنا پڑے۔ حالانکہ اس ایک جھٹکے میں بھی سانس کی ڈور ٹوٹنے کے باوجود قیدی کم از کم آٹھ سے دس منٹ تک سولی پر لٹکتا ہوا چھوڑ دیا جاتا تھا، کیونکہ اس دوران بھی وہ دماغی طور پر (طب کی

اصطلاح میں) زندہ رہتا تھا اور اس کی مکمل ''دماغی موت'' کے لیے یہ آٹھ منٹ کا وقفہ ضروری سمجھا جاتا تھا۔ اس دوران قیدی کی تڑپ اور بے چینی جاری رہتی تھی اور اس کا کلیہ بھی اُسی کتاب میں درج تھا کہ جب تک پھانسی کا رسہ خفیف سی حرکت، یا جھول کھاتا رہے، تب تک یہ سمجھنا چاہیے کہ قیدی میں زندگی کی چٹکی بھر رمق باقی ہے۔ لیور کھینچنے، تختہ کھلنے اور قیدی کے جسم کے مکمل بوجھ کے رسے سے لٹک کر جھولنے کے اوّلین لمحے سے لے کر رسے کے مکمل سکوت میں آنے تک کے آخری لمحے کا درمیانی وقت آٹھ منٹ سے لے کر دس منٹ تک محیط ہو سکتا تھا اور اِسی درمیانی وقت کو قیدی کے لیے کم سے کم اذیت ناک بنانے کے لیے جیل حکام کا فرض بنتا تھا کہ وہ قیدی کے لیے ایک ''بہترین پھانسی'' کا انتظام کریں اور اس تیاری اور نظام کی جزئیات کچھ اس طرح تھیں کہ قیدی کے وزن کے حساب سے رسہ تیار کیا جائے۔ اس میں بنایا گیا پھندا، رسے کی لمبائی اور رسے کی ساخت کا تناسب بہترین ہونا چاہیے۔ رسہ ہمیشہ قیدی کے اُس وزن کے مطابق تیار کیا جاتا تھا، جو پھانسی سے ایک دن قبل آخری میڈیکل چیک اَپ کے وقت قیدی کا ہوتا ہے۔ اِسی طرح جلاد کی ڈیوٹی میں یہ بھی شامل تھا کہ وہ ایک دن پہلے تختہ دار کے قبضے وغیرہ جانچ لے کہ تختہ کھلنے میں کسی قسم کی دُشواری تو نہیں؟ لیور کا ہینڈل ٹھیک کام کر رہا ہے کہ نہیں؟ عین وقت پر لیور، یا تختہ کسی رکاوٹ کی وجہ سے جواب تو نہیں دے جائیں گے؟ تختے کے دونوں پٹ ایک جھٹکے سے اور ایک ساتھ کھل رہے ہیں، یا نہیں؟ تختے کے قبضوں کو گزشتہ ایک ہفتے کے دوران ٹھیک طرح سے تیل پلایا گیا ہے، یا نہیں۔ کہیں رسے کی رگڑ، یا لکڑی، لوہے کے ستون کی کوئی ناہموار سطح رسہ کاٹنے، یا ٹوٹنے کا باعث تو نہیں بن جائے گی؟ ایسے ہی نہ جانے کتنے درجنوں سوال تھے، جن کا جواب جلاد اور جیل کے عملے کو مل کر ڈھونڈنا ہوتا تھا، تب ہی کہیں جا کر کوئی پھانسی ''بہترین پھانسی'' کہلائی جاتی تھی۔ اور ان سب باتوں کی براہ راست نگرانی اور ذمہ داری جیل سپرنٹنڈنٹ کی ہوتی، اسی لیے اقبال ہمارے سامنے پریشان سی صورت لے کر بیٹھا ہوا تھا۔

اُس کے پاس بمشکل چالیس، یا بیالیس گھنٹے ہی بچے تھے اور شاید وہ ابھی تک پوری طرح پھانسی گھاٹ ہی تیار نہیں کروا پایا تھا۔ کبھی کبھی میں سوچتا ہوں کہ ہم انسان بیک وقت کتنے نرم خو اور کتنے سنگ دل ہو سکتے ہیں۔ معاشرے کو چلانے کے لیے ہمیں کیسے کیسے دُہرے

معیار اختیار کرنے پڑتے ہیں۔ گھر میں پالے ہوئے اپنے کسی پالتو جانور کی ذراسی تکلیف پر بے چین ہو جانے والے انسانوں کو بھی کبھی اس بات کے لیے سر جوڑ کر بیٹھنا پڑتا ہے کہ وہ اپنے جیسے جیتے جاگتے انسان کی جان لینے کا کون سا طریقہ اختیار کریں۔ بظاہر اقبال کی پریشانی بے جا ہی تو تھی۔ جب ایک انسان کی سانس کی ڈور کا کٹنا ہی مقدر ٹھہرا تو پھر اس میں اتنے تردد کی بھلا کیا ضرورت تھی۔ عملہ پورا تھا، یا نہیں، انتظامات میں کمی بیشی ہوئی بھی تو کیا؟ جان لینے کے لوازمات معیار کے مطابق تھے، یا غیر معیاری۔ بھلا ان باتوں سے اس سیاہ نصیب قیدی کی قسمت پر کیا فرق پڑنے والا تھا۔ مقصد تو اس کی جان لینا تھا، پھر بھلا وہ تلوار سے سر قلم کر کے لی جائے، یا گولی، یا پھانسی کے پھندے پر لٹکا کر...... کیا فرق پڑتا تھا۔ ایک لمحے کو تو مجھے اقبال کی ساری باتیں، وہ طوفانی بارش میں بھیگتا سیاہ سناٹا اور بوندوں سے بھیگتے ہمارے وجود...... سبھی کچھ ''ایک بہت بڑا جھوٹ'' لگنے لگا تھا۔ جیسے ہم سب اس نظام کی کمزوریوں پر پردہ ڈالنے کے لیے ڈھکوسلا کر رہے ہوں۔ اور کچھ ہی دیر بعد ہم سب اطمینان سے یہ کہتے ہوئے کپڑے جھاڑ کر اُٹھ کھڑے ہوں گے کہ ہم نے اپنے طور پر تو پوری کوشش کر دیکھی، لیکن کیا کریں پورا سسٹم ہی خراب ہے تو اس میں اب ہمارا کیا قصور؟ لیکن بے چارہ جیلر اپنے اندر کے اُس فرض شناس افسر کے ہاتھوں مجبور تھا، جو اُسے اس برستے موسم میں بھی اس بھاگ دوڑ پر مجبور کر رہا تھا کہ چاہے کچھ بھی ہو جائے قیدی کی جان لینے سے پہلے تمام قواعد و ضوابط تو پورے کرنے ہی ہوں گے۔ مجھے یقین ہے کہ اُس کے اندر سے بھی کبھی نہ کبھی یہ آواز اُٹھی ہوگی کہ ''کس جھنجھٹ میں پڑ رہے ہو میاں...... چڑھا دو سولی۔ یہاں اس ویرانے میں کس نے آ کر یہ قواعد و ضوابط دیکھنے ہیں۔ ختم کرو یہ ٹنٹا'' ''لیکن افسوس...... فطرت ہمیں اُس گناہ سے بھی پوری طرح لطف اندوز نہیں ہونے دیتی جو صرف ہمارے اندر ہی جنم لیتا ہے اور اندر ہی کہیں فنا ہو جاتا ہے۔ کبھی وفا، کبھی بھرم اور کبھی فرض شناسی جیسے ''درانداز جذبے'' ہمارے اس معصوم گناہ کا مزہ بھی کرکرا کرنے کے لیے جانے کہاں کہاں سے جنم لینے لگتے ہیں۔ جیلر بھی اس وقت ایسے ہی ایک معصوم گناہ اور ایک بے رحم ثواب کے بیچ چلتی جنگ کے درمیان پس رہا تھا اور وقت اُس کی بند مٹھی سے ریت کی طرح پھسلتا جا رہا تھا۔

سلطان بابا نے کچھ دیر تک ساری صورت حال پر غور کیا اور پھر جیلر سے مخاطب ہوئے

''واقعی صورت حال تو کافی گمبھیر ہے، لیکن جلاد کی عدم موجودگی میں یہ فریضہ اب کون سرانجام ے گا۔'' اقبال نے لمبی سی سانس بھری۔ ''ویسے تو میں نے دو ہفتے پہلے ہی حکام کو جلاد کی عدم ستیابی کا پروانہ لکھ دیا تھا اور انہوں نے ایک دوسرے قریبی ضلع کی سینٹرل جیل کے جلاد کو ذریعہ آرڈر پابند بھی کر دیا ہے کہ وہ میری جیل میں حاضر ہو کر مجھے ۴۸ گھنٹے پہلے رپورٹ کرے اور اس پھانسی کو تکمیل تک پہنچائے۔ لیکن ابھی تک تو وہ پہنچا نہیں، شاید صبح والی گاڑی سے پہنچ جائے۔ دراصل اس شدید طوفان اور موسلا دھار بارش نے چند گھنٹوں ہی میں بڑی باہی مچا دی ہے۔ ابھی جب ہم آپ کی طرف آ رہے تھے تو مجھے وائرلیس سیٹ پر اطلاع ملی کہ صبے کو بیرونی دنیا سے جوڑنے والی سڑک کا واحد پل بھی پانی سے بہہ گیا ہے اور ریلوے ٹریک ھی ایک آدھ گھنٹے کے بعد قابل استعمال نہیں رہے گا، کیوں کہ ابھی سے قریباً دو میل پٹڑی کا کڑا گھٹنوں گھٹنوں پانی میں ڈوب چکا ہے۔''

آسمان پر بادل زور سے گرجے اور دُور کسی ویرانے میں بجلی کا کوندا اس زور سے لپکا کہ کچھ دیر کے لیے ہم سبھی نیلی روشنی میں نہا سے گئے۔ میں نے اس لمحاتی روشنی میں جیلر کے تھے پر بارش کی بوندوں کے ساتھ پسینے کی چند بوندیں بھی ٹپکتی دیکھیں اور پھر اگلے ہی لمحے پھر سے وہی گھپ اندھیرا چھا گیا۔ سلطان بابا دھیرے سے مسکرائے ''جیلر صاحب لگتا ہے قدرت ی آپ کی اس زمینی عدالت کے فیصلے کو ماننے پر تیار نہیں ہے۔ ارے ہاں! آپ نے یہ تو بتایا نہیں کہ آخر ہمیں یہاں بلانے کا کیا مقصد تھا۔ کیوں کہ آپ کی تمام بیان کردہ مجبوریاں اپنی لہ، لیکن ظاہر ہے کہ یہ سارے سرکاری کام ہیں اور ان میں ہمارا کوئی عمل دخل نہیں ہو سکتا۔'' بال کسی گہری سوچ میں گم تھا۔ سلطان بابا کی بات سن کر چونک اُٹھا۔ ''جی بالکل...... آپ نے ا فرمایا۔ دراصل آپ کو زحمت دینے کی وجہ بھی وہی قیدی سکندر ہی ہے۔ اُس کی آخری اہش ہے کہ مرنے سے پہلے اُس کی آپ سے ملاقات کروا دی جائے۔'' میں نے اور طان بابا نے بیک وقت چونک کر ایک دوسرے کی جانب دیکھا۔

آخری انتظار

آسمان پر بجلی زور سے چمکی، تیز طوفانی ہوا نے کچھ پل کے لیے برسات کی بوچھاڑ کا رُخ ہماری جانب کر دیا اور ہم سب، جو پہلے ہی مسجد کے برآمدے میں تقریباً دیوار سے لگے بیٹھے تھے، ایک دفعہ پھر بھیگ کر مزید دیوار کے ساتھ چپک گئے۔ سلطان بابا نے حیرت سے جیلر کی جانب دیکھا۔ ''آپ کے قیدی کی آخری خواہش یہ ہے کہ اُس سے میری ملاقات کرا دی جائے...... لیکن ان آخری لمحات میں تو ہر قیدی اپنے خاندان، اپنے پیاروں سے ملاقات کا خواہش مند ہوتا ہے، پھر اُس نے ایک اجنبی سے ملنے کی خواہش کیوں ظاہر کی؟'' اقبال نے اپنی برساتی پر جمع ہوئی بوندوں کو جھاڑا ''قیدی کا اس دنیا میں اور کوئی رشتہ باقی نہیں رہا...... کم از کم اُس کا دعویٰ تو یہی ہے۔ لیکن اگر آپ اُس کے لیے اجنبی ہیں تو پھر یہ سوال البتہ اب بھی باقی ہے، ہوسکتا ہے آپ سے ملاقات کے بعد اس راز سے بھی پردہ اُٹھ جائے۔'' جیلر نے ہمیں یہ بھی بتایا کہ اُس نے اپنی پوری ملازمت میں موت کا ایسا عجیب قیدی نہیں دیکھا، جو اپنی زندگی بچانے کی اپیل کے حق میں بھی نہیں۔ نہ ہی اُس نے گزشتہ آٹھ مہینے میں، جب سے اُسے اس جیل میں لا کر موت کی کال کوٹھڑی میں ڈالا گیا ہے، کسی بھی قسم کی کوئی فرمائش، یا شکایت کی ہے۔ یوں لگتا ہے جیسے وہ خود ایک ایک دن گن گن کر اپنی موت کا انتظار کر رہا ہے۔ گویا موت نہ ہوئی، اُس کی ''محبوبہ'' ہوگئی۔ جیل کے گزشتہ ریکارڈ سے اقبال کو یہ بھی پتا چلا کہ سکندر نامی اس قیدی نے معمول کے لیے کی جانے والی رحم کی کسی اپیل پر بھی دستخط نہیں کیے تھے، ورنہ کم از کم صدر مملکت کو کی جانے والی اپیل کے فیصلے تک اُس کی سانسیں بڑھ سکتی تھیں اور اُس کی کم عمری کو دیکھتے ہوئے اس بات کا بھی قوی امکان تھا کہ شاید اُس کی سزائے موت رحم کھا کر ''عمر قید'' میں بدل دی جاتی۔ وہ سارا دن چپ چاپ رہتا تھا اور شام سے قبل، جب کال کوٹھڑیوں کے قیدیوں کو آدھے گھنٹے کے لیے زندان سے باہر ''ٹہلائی'' کے لیے نکالا جاتا تھا اس دوران بھی وہ خاموشی سے ایک جانب بیٹھا رہتا۔ شاید ہی کسی قیدی، یا جیل کے عملے

نے اُسے بلاضرورت کبھی بولتے دیکھا ہو۔ شروع شروع میں جب اُسے اس جیل میں لایا گیا تھا تب سی آئی ڈی (CID) والے روزانہ اُس سے تفتیش کے لیے جیل آتے تھے۔ سنا ہے اُس کا تعلق ایک بہت خطرناک ملک دشمن تنظیم سے تھا اور اس قیدی کے سینے میں بھی بہت سے ایسے راز دفن تھے جو اگر صحیح وقت پر افشا ہو جاتے تو بہت بڑی تباہی سے بچا جاسکتا تھا، لیکن سکندر کی زبان کھلنا تھی، نہ کھلی۔ اُس پر ملک کے ایک نوجوان اور اُبھرتے ہوئے سائنس دان کے قتل کا جرم ثابت ہو چکا تھا اور اِسی جرم کی پاداش میں وہ آنے والی موت کے انتظار میں اس کال کوٹھڑی میں پڑا، ایک ایک گھڑی گن رہا تھا۔ جیلر ابھی ہمیں یہ ساری تفصیلات بتا ہی رہا تھا کہ دُور جیل کے گھنٹہ گھر سے گیارہ مرتبہ ٹن، ٹن، ٹن...... کی سی آواز سنائی دی۔ جیل میں قیدیوں اور دیگر عملے کو وقت سے مطلع رہنے اور ہوشیار رکھنے کے لیے ایک بہت بڑی سی پیتل کی گھنٹی کو ہر گھنٹے کے بعد اتنی ہی مرتبہ لوہے کی ایک بہت بڑی راڈ کے ذریعے بجایا جاتا تھا۔ جتنی مرتبہ گھنٹی بجتی، وہی دن، یا رات کا وقت ہوتا۔ مطلب یہ کہ اس وقت رات کے گیارہ بج رہے تھے۔ اب ساڑھے گیارہ بجے یعنی آدھے گھنٹے کے بعد صرف ایک ''ٹن'' کی آواز یہ ظاہر کرے گی کہ رات کے ساڑھے گیارہ بج رہے ہیں۔ یہ ساری تفصیل بھی ہمیں جیلر کی زبانی ہی پتا چلی۔ جیلر نے اپنے پاس کھڑے جیل کے حوالدار سے کہا ''جا کر پتا کرو، دارالحکومت سے جس افسر نے آنا تھا، اُس کی کوئی خیر خبر پہنچی، یا نہیں...... میری جیپ کے وائرلیس ہی سے قصبے کے باہر والی چوکی کو بھی مطلع کرو کہ اگر وہ لوگ پل کی دوسری جانب پہنچ گئے ہیں تو محکمہ انہار والوں سے کہہ کر کشتی کا انتظام کروائیں اور ندی پار کروا کر جیل کے ریسٹ ہاؤس میں پہنچا دیں۔ میں کچھ دیر میں جیل پہنچتا ہوں......'' حوالدار کچھ ہچکچایا۔ ''لیکن جناب...... ریسٹ ہاؤس میں تو صرف ایک ہی کمرہ کچھ استعمال کے قابل تھا اور اس میں مقتول کی بیوہ، اپنے پانچ سالہ بیٹے کے ساتھ شام ہی سے آپ کے حکم کے مطابق ٹھہرائی گئی ہے...... پھر بھی اگر آپ کہیں تو......'' جیلر نے اپنے ماتھے پر ہاتھ پھیر کر یوں سر جھٹکا، جیسے اُسے خود اپنے بھلکڑ پن پر غصہ آ رہا ہو۔ ''اوہ ہاں...... یاد آیا...... اچھا ٹھیک ہے، اُن کے لیے میرے گھر کا مہمان خانہ تیار کروا دو...... بیوہ کو وہیں ریسٹ ہاؤس میں رہنے دو...... اب اس برستی رات میں وہ بے چاری کہاں کمرے تبدیل کرتی پھرے گی......'' حوالدار سر ہلا کر جلدی سے مسجد کے باہر کھڑی

جیپ کی جانب بڑھ گیا۔

ہمارے کسی سوال سے پہلے ہی اقبال نے خود ہمیں بتا دیا کہ حکامِ بالا کی خصوصی اجازت سے ایک تفتیشی افسر کو ایک آخری کوشش کے طور پر آج شام اس قصبے میں پہنچنا تھا، لیکن شاید خراب موسم کی وجہ سے اُسے کچھ دیر ہو گئی ہے۔ پولیس کے اعلیٰ تفتیشی حکام اب بھی ایک آخری اُمید رکھے ہوئے تھے کہ شاید اپنی موت سے ایک رات پہلے ہی سکندر کا دل پگھل جائے اور وہ جاتے جاتے کچھ ایسا بتا دے جو اُن کی تفتیش میں کارآمد ثابت ہو سکے اور سکندر کے اصل گروہ کی گرفتاری میں اُن کی مدد کر سکے۔ دوسری جانب چونکہ یہ قتل قصاص و دیت کی مد میں درج کیا گیا تھا، لہٰذا مقتول کی بیوہ کو اس کے پہلے وارث کے طور پر پھانسی دیکھنے کے لیے جیل بلایا گیا تھا۔ قصاص و دیت کے قتل کے کیسز میں مقتول کے سب سے قریبی ورثاء میں سے کسی کو قاتل کی پھانسی کا نظارہ دیکھنے کے لیے جیل مدعو کیا جاتا تھا اور قاتل کو مقتول کے وارث کے سامنے ہی پھانسی پر لٹکایا جاتا تھا۔ وارث کو پھانسی سے آخری لمحے قبل تک قاتل کی سانسیں بخش دینے کا اختیار بھی ہوتا تھا، چاہے وہ یہ سانسیں قصاص کی رقم کے عوض ہی کیوں نہ بخشے۔ لیکن اس سکندر نامی قاتل کی پھانسی دیکھنے کے لیے مقتول جاوید نامی شخص کی بیوہ نائلہ اپنے پانچ سالہ بیٹے کے ساتھ ہزاروں میل کا سفر طے کر کے بیرونِ ملک سے اس پس ماندہ قصبے تک پہنچی تھی، کیوں کہ اُس کے شوہر کے قتل کے بعد حفاظت کے نقطۂ نظر سے اُس کے والدین نے اُسے ملک سے باہر بھجوا دیا تھا۔ اقبال کے بقول، اُس کا خیال یہ تھا کہ اتنی دُور سے مقتول کی بیوہ، اپنے شوہر کے قاتل کی پھانسی دیکھنے کے لیے نہیں پہنچ پائے گی، لیکن اُس کی حیرت کی انتہا نہیں رہی، جب آج شام ہی بارش سے کچھ قبل نائلہ، اپنے اکلوتے بیٹے سمیت اس قصبے کے اسٹیشن پر صرف ایک سوٹ کیس کے ساتھ کھڑی جیل کی گاڑی کا انتظار کرتی ہوئی انہیں ملی۔ جیلر کے ایک سوال کے جواب میں کہ نائلہ نے ہزاروں میل کا یہ سفر کس لیے طے کیا، کیوں کہ پھانسی تو اُس کی غیر موجودگی میں بھی طے پا جاتی، نائلہ نے صرف اتنا ہی کہا کہ وہ اس پھانسی کا صدیوں سے انتظار کر رہی ہے اور اُسے تب تک سکون کی نیند نہیں آئے گی جب تک وہ اپنی آنکھوں کے سامنے اپنے شوہر کے قاتل کو پھانسی کے پھندے پر جھولتا ہوئے نہیں دیکھ لے گی۔ بقول اقبال، اُس نے آج تک اتنے آہنی اعصاب والی لڑکی نہیں

دیکھی تھی، کیوں کہ ابھی تک مقتول کی بیوہ کم عمر ہی تھی۔ نہ جانے، اُس بے چاری نے اس نوجوانی ہی میں یہ بیوگی کا داغ کیسے جھیلا ہو گا؟ کچھ ہی دیر میں حوالدار نے آ کر خبر دی کہ ’’بڑے شہر‘‘ سے افسر آ گیا ہے، لیکن اُس نے آتے ہی جیل میں قیدی سے ملاقات کی خواہش ظاہر کی ہے۔ وہ کہتا ہے کہ اُس کے پاس وقت بہت کم ہے، لہٰذا وہ مزید ایک لمحہ ضائع کیے بنا قیدی سے مل کر اپنی تفتیش کا آغاز کرنا چاہتا ہے۔ جیلر یہ سنتے ہی جلدی سے کھڑا ہو گیا ’’ٹھیک ہے...... ہم یہاں سے سیدھے جیل ہی جائیں گے اور ہاں...... اُس جلاد کا کیا بنا...... وہ پہنچا کہ نہیں؟‘‘ حوالدار نے اپنی ٹوپی سیدھی کی۔ ’’نہیں جناب...... جلاد کا فی الحال کچھ اتا پتا نہیں ہے۔ جیل کے دو سپاہی کشتی سمیت ٹوٹے ہوئے پُل کے قریب پوری رات جلاد کا انتظار کریں گے...... تا کہ رات کو کسی بھی پہر اگر وہ قصبے تک پہنچنے میں کامیاب ہو جائے تو ہمارا عملہ اُسے لے کر سیدھا جیل پہنچا دے......‘‘ ’’ہوں‘‘ جیلر نے لمبا سا ہنکارا بھرا اور سلطان بابا سے واپسی کے لیے اجازت چاہی۔ پتا نہیں، اس لمحے اچانک ہی میرے ذہن میں ایک عجیب سے سوال نے کہاں سے سر اُبھارا اور میں اپنی خواہش کو زبان پر آنے سے روک نہیں پایا۔ ’’جیلر صاحب...... کیا یہ ممکن ہے کہ آپ کے اس قیدی کو میں آج رات ہی دیکھ پاؤں...... کل تو اُس کی سانسوں کی میعاد بالکل ہی مختصر ہو گی...... جانے اُس وقت وہ اپنے حواس میں بھی ہو گا، یا نہیں......؟‘‘ میرا فرمائش نما سوال سن کر اقبال شش و پنج میں پڑ گیا۔ ’’مجھے تو کوئی اعتراض نہیں، لیکن جانے وہ تفتیشی افسر اس بات پر راضی ہو، یا نہیں...... کیوں کہ بہرحال سکندر ایک خطرناک قیدی ہے، جس کی آخری لمحے تک کڑی نگرانی کے احکامات ہمیں بہت پہلے موصول ہو چکے ہیں۔‘‘ میں نے اقبال کی طرف دیکھا ’’لیکن جیل میں اس قیدی کا ہر انتظام آپ کے ذمے ہے۔ اس سے کسے ملنے کی اجازت ہو سکتی ہے اور کسے نہیں، اس کا فیصلہ شاید صرف آپ ہی کر سکتے ہیں، یا پھر وہ قیدی خود...... آپ پر اعلیٰ حکام کا دباؤ تو ضرور ہو گا، لیکن فرض کریں کہ کسی بھی وجہ سے اگر آپ اس تفتیشی افسر کو بھی اس قیدی سے ملاقات کی اجازت دینے سے انکار کر دیں تو کوئی لاکھ سر پٹخے، لیکن قیدی کی کوٹھڑی تک نہیں پہنچ سکتا، لہٰذا آپ کا اختیار تو اپنی جگہ قائم ہے۔‘‘ جیلر کچھ دیر تک میری جانب غور سے دیکھتا رہا، پھر جانے کیا سوچ کر اُس نے ہتھیار ڈال دیئے۔ ’’ٹھیک ہے میں کوشش کرتا ہوں...... آپ بھی میرے ساتھ ہی چلیے......‘‘

میں نے سلطان بابا کی جانب اجازت آمیز نگاہوں سے دیکھا۔ وہ اپنی تسبیح پر ول رہے تھے۔
''جاؤ میاں......تم بھی اُس بدنصیب کو دیکھ آؤ......لیکن یاد رہے، جب جب جو جو ہونا ہے......
تب تب سو سو ہوتا ہے......'' میں نے چونک کر سلطان بابا کی آنکھوں میں کوئی تحریر پڑھنے کی
کوشش کی، لیکن وہ اپنی آنکھیں بند کر کے پھر سے تسبیح پڑھنے میں مصروف ہو چکے تھے۔

میں جیلر اقبال اور اُس کے حوالدار کے ساتھ بارش میں بھیگتا ہوا مسجد کے باہر کھڑی
جیپ کی جانب بڑھ گیا۔ جیپ کا ڈرائیور جو بارش کی خنکی سے بچنے کے لیے اپنی بیڑی سلگائے
سکڑا سمٹا سا جیپ میں بیٹھا تھا، ہمیں دیکھ کر فوراً چاق و چوبند ہو گیا اور ہمارے بیٹھتے ہی ایک
جھٹکے سے جیپ آگے بڑھا دی۔ قصبے کی واحد مرکزی سڑک اور آس پاس کی گلیاں سب جل
تھل تھیں۔ کچھ بھیگے اور سردی سے کپکپاتے آوارہ کتوں نے جیپ کی آواز سن کر چونک کر سر
اُٹھایا اور پھر بھونک کر پیچھا کرنے کی سکت نہ پا کر صرف غرا کر ہی چپ ہو گئے۔ کچھ ہی دیر بعد
جیپ نے قصبے کی آخری گلی کو بھی پیچھے چھوڑ دیا۔ گھپ اندھیرے میں دُور کہیں لپکتی نیلی بجلی کے
جھماکے میں مجھے ایک بہت بڑی قلعہ نما عمارت کی جھلک کسی نیلی روشنی میں نہائے ہیولے کی
طرح دکھائی دی۔ ٹھیک اُسی لمحے میرے ذہن میں بھی ایک جھماکا ہوا اور مجھے پھر وہی پرانا
احساس بُری طرح ڈسنے لگا کہ میں نے پہلے بھی کبھی کہیں نہ کہیں یہ عمارت دیکھی ہے۔ میرے
سر میں شدید درد کی ایک لہر سی اُٹھی اور پھر چند لمحوں ہی میں حسب معمول سب کچھ پہلے کی
طرح معمول پر آ گیا۔ جیپ جیل کی عمارت کے سامنے جا کر رُک گئی۔ پرانے قلعے کی طرز کی
وہ جیل اس وقت اندھیرے میں ڈوبی ہوئی تھی۔ شاید بجلی کا رابطہ منقطع تھا۔ برجیوں پر کھڑے
محافظوں نے برق رفتاری سے اپنی بڑی بڑی مشعل نما ٹارچیں روشن کر کے پہلے اُوپر ہی سے
اپنا اطمینان کیا اور پھر جلدی سے اندرونی دروازے کی دوسری جانب کسی کو بڑے جیلر کی آمد کی
اطلاع دی۔ اندرونی سنتری نے اپنے اطمینان کے لیے جیل کے مرکزی دروازے میں نصب
لوہے کی چھوٹی سی دراز نما کھڑکی سے ایک بار ہمارا جائزہ لیا اور پھر چھوٹا دروازہ کھول دیا۔

جیلر کا کمرہ مرکزی گیٹ کے ساتھ ہی واقع تھا جس کے بعد ایک اور بڑا سا آہنی گیٹ
تھا، جس کے بعد جیل کی اصل عمارت شروع ہوتی تھی۔ لیکن اقبال نے اپنے حوالدار کو مجھے
اِسی برآمدے میں واقع ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ کے کمرے میں بٹھانے کا کہا اور خود اپنے کمرے کی

جانب بڑھ گیا۔ شاید وہ تفتیشی افسر سے پہلے ملاقات کر کے اُسے میرے بارے میں بتانا چاہتا
ہو۔ کچھ ہی دیر بعد حوالدار نے آ کر مجھے بتایا کہ سکندر نامی قیدی کو تفتیش کے لیے بنے خصوصی
کمرے میں پہنچا دیا گیا ہے اور بڑے جیلر صاحب میرا وہیں انتظار کر رہے ہیں۔ میں حوالدار
کی سربراہی میں جیل کا اندرونی بڑا گیٹ پار کر کے جیل کی اندرونی دنیا میں داخل ہو گیا، جہاں
سب سے پہلے نہایت احتیاط سے تین مرتبہ میری تلاشی لی گئی اور پھر ہم جیل کی راہ داریوں
سے ہوتے ہوئے آگے بڑھنے لگے۔ جیل کی تمام عمارت ایک عجیب سے یاسیت زدہ
اندھیرے میں ڈوبی ہوئی تھی۔ لگتا تھا جیسے پوری عمارت پر کسی بھیانک آسیب کا سایہ ہو۔ دن
بھر کے تھکے ہارے قیدی اپنی کوٹھڑیوں اور بیرکوں میں ایک دوسرے سے اُلجھے، پڑے سو رہے
تھے۔ البتہ پھانسی گھاٹ کی جانب بنی کال کوٹھڑیوں سے زور زور سے قرآن اور تسبیح پر ''اللہ ہو''
کی آوازیں سناٹے کو چیرتی ہوئی آ رہی تھیں۔ مجھے ایک بار پھر سے موت اور مذہب کے اس
عجیب سے تعلق نے اُلجھا سا دیا۔ آخر صرف موت، یا موت کا تصور ہی ہمیں مذہب کے قریب
ہونے پر کیوں مجبور کرتا ہے؟ کیا صرف موت کے بعد ملنے والی سزا کا خوف ہی ہمیں مذہب کو
اپنانے پر مجبور کرتا ہے؟ ہم خوشی میں اور اپنی مرضی سے کسی سزا کے خوف، یا کسی جزا کی لالچ
کے بنا مذہب کو کیوں نہیں اپنا سکتے......؟ کیا ہمیں دنیا میں صرف اس خوف کا سامنا کرنے کے
لیے بھیجا گیا تھا، جو انسانی موت اور اُس کے بعد ملنے والی سزاؤں سے متعلق تھا؟ ہمیں اپنی
خوشی سے بندگی کا اختیار کیوں نہیں دیا گیا؟

میں اِسی سوچ میں مبتلا تھا کہ اچانک حوالدار نے ایک راہ داری کے آخر میں بنی ہوئی
لوہے کی سیڑھیوں کے قریب رُک کر مجھے اُوپر چڑھنے کا اشارہ کیا اور خود نیچے برآمدے ہی میں
کاندھے سے اپنی بندوق اُتار کر مستعدی سے پہرہ دینے کے لیے ٹھہر گیا۔ میں لوہے کی بنی
ہوئی سیڑھی چڑھ کر جب اُوپر پہنچا تو خود کو ایک گول کمرے میں پایا۔ سیڑھیاں بہت اُونچی تھیں
اور میرے اندازے کے مطابق مجھے اس وقت تیسری منزل کے برابر اُونچائی پر ہونا چاہیے تھا۔
یہ گول کمرہ دراصل نیچے سے آتی ہوئی دیوار ہی کا تسلسل تھا۔ بس یوں سمجھ لیجیے کہ میں ایک
بہت بڑے تنور کے دھانے پر موجود تھا۔ جیلر اقبال بھی اُوپر موجود تھا اور نیچے کی منزل میں،
جہاں اس تنور کا پیندا تھا، وہاں نچلے گول کمرے میں ایک شخص کمرے میں پڑی دو کرسیوں میں

سے ایک پر یوں بیٹھا ہوا تھا کہ اُس کے ہاتھ کرسی کے پیچھے موٹی رسی کے ذریعے بندھے ہوئے تھے۔ یہی نوجوان ''سکندر'' نامی وہ قیدی تھا جس کا ذکر میں شام سے سن رہا تھا۔ کمرے کی دیواریں بالکل چکنی تھیں، اتنی کہ کوئی لاکھ کوشش بھی کرتا، پر اُس کا ان دیواروں سے چڑھ کر اُوپر چڑھنا ناممکن تھا اور پھر اس پر مستزاد یہ کہ وہ گول کمرہ، جیسے جیسے بلند ہوتا جاتا تھا، ویسے ہی چاروں طرف سے مزید تنگ ہوتے ہوتے چھت تک صرف ایک گول دہانہ سا رہ جاتا تھا۔ شاید یہ سارا انتظام قیدیوں کے ذہن میں اُٹھنے والے فرار کے کسی بھی خیال کو پوری طرح کچلنے کے لیے کیا گیا تھا۔ میں جیلر اقبال کے ساتھ ہی پڑی کرسی پر بیٹھ گیا۔ ویسے بھی اُوپر کی گولائی میں بمشکل دو کرسیاں رکھنے کی ہی گنجائش تھی۔ کچھ ہی دیر میں پینٹ اور کوٹ میں ملبوس ایک ۴۰، ۴۵ سالہ شخص اندر داخل ہوا۔ جیلر نے آہستہ سے مجھے بتایا۔ ''یہ راحیل صاحب ہیں...... تفتیشی افسر...... ایس ایس پی راحیل......'' اس وقت نیچے گول کمرے میں بہت سی موم بتیاں روشن تھیں، جن کے ملگجے اُجالے میں، میں نے راحیل صاحب کو بغور دیکھا۔ چہرے پر نظر کا سنہرا فریم، ہونٹوں میں سگار، بال سلیقے سے بنے ہوئے، مجھے وہ روایتی پولیس والوں سے کافی مختلف دکھائی دیے۔ اتنے میں اچانک جیل کی بجلی واپس آ گئی اور نیچے گول کمرہ روشن ہو گیا، جب کہ اُوپر والے حصے کی بتیاں شاید جیلر نے پہلی ہی بجھا رکھی تھیں، اس لیے ہم دونوں مزید اندھیرے میں چلے گئے۔ اُوپر سے لوہے کی جالیوں میں سے نچلے گول کمرے میں جھانکتے ہوئے مجھے بالکل یوں محسوس ہوا جیسے ہم کسی اندھیرے سینما ہال میں بیٹھے روشن اسکرین پر کوئی فلم دیکھ رہے ہوں۔ فرق صرف اتنا تھا کہ سینما کی اسکرین سامنے ہوتی ہے اور یہاں اسکرین دیکھنے کے لیے ہمیں نیچے کی جانب جھانکنا پڑ رہا تھا اور ہمارے درمیان لوہے کی وہ موٹی سی جالی نما کھڑکی بھی حائل تھی جس نے اس تنور کے دہانے کو ڈھک رکھا تھا۔ تفتیشی کمرے میں روشنی کے لیے ہزار وولٹ کا بجلی کا صرف ایک بلب کمرے کے وسط میں کچھ ایسے زاویے سے لٹکایا گیا تھا کہ اُس کی براہ راست روشنی صرف قیدی کے چہرے ہی پر پڑ رہی تھی۔ اچانک روشنی سے قیدی کی آنکھیں چندھیا سی گئیں۔ پھر اُس نے دھیرے دھیرے اپنی بند ہوئی آنکھیں کھولیں اور راحیل صاحب کی طرف دیکھ کر ہلکے سے مسکرایا ''چلیں شکر ہے، آپ کے آنے سے کچھ لمحوں کے لیے ہی سہی...... لیکن اُن بجھے چراغوں میں روشنی تو آئی...... ورنہ

میں تو شاید اس ملک کو روشن دیکھنے کی حسرت ہی میں جان دے دیتا...... ویسے سنا ہے کہ ۲۰۰۹ء تک ملک سے لوڈشیڈنگ ختم ہو جائے گی...... آپ کو مبارک ہو راحیل صاحب۔'' راحیل صاحب سمیت میں اور جیلر بھی سکندر کا یہ جملہ سن کر چونک گئے۔ راحیل صاحب نے سگار کا لمبا سا کش لیا۔ ''گزشتہ پندرہ مہینوں سے جیل میں بند ہونے کے باوجود تمہاری معلومات کا ذخیرہ قابلِ ستائش ہے......'' سکندر نے طنز سے راحیل کی جانب دیکھا۔ ''جیل میں بند ہونے کا یہ مطلب تو نہیں ہوتا کہ انسان اپنی آنکھیں بھی بند کر لے۔ ویسے آپ کا بھی قصور نہیں ہے، پولیس والوں کو عام طور پر آنکھیں بند کر لینے کی عادت ہوتی ہے۔'' راحیل صاحب کرسی پر بیٹھ گئے۔ ''بہت تلخی ہے، تمہارے لہجے میں...... لیکن یاد رکھو، سب پولیس والے ایک جیسے نہیں ہوتے۔'' سکندر کے لبوں پر پھر سے مسکراہٹ آ گئی ''ٹھیک کہا آپ نے...... واقعی سب ایک سے نہیں ہوتے...... جو بھی ملا، پچھلے سے کچھ بدتر ہی نکلا۔ ویسے ہمیں تو آنکھیں کھلی رکھنی ہی پڑتی ہیں راحیل صاحب...... ہم آپ جیسے بڑے افسر تو ہیں نہیں، کہ جنہیں ہر ماہ کے آخر میں گھر بیٹھے کچھ نہ کرنے کی بھی تنخواہ مل جائے...... جنہیں اپنے حقوق کی جنگ لڑنی ہوتی ہے، انہیں آنکھیں اور کان کھلے رکھنے پڑتے ہیں......'' راحیل صاحب نے سگار منہ سے نکالا ''کن حقوق کی جنگ کی بات کر رہے ہو تم......؟ سچ تو یہ ہے کہ چند ملک دشمن عناصر کے ہاتھ میں کھیل رہے ہو تم لوگ...... جانے یہ کیسا برین واش ہے کہ خود اپنی موت کو گلے لگانے کو ترستے ہو...... یہ جانے بغیر کہ تمہاری اس قربانی کی کوئی وقعت نہیں ہے، تمہارے آقاؤں کی نظر میں......'' سکندر نے لمبی سی جمائی لی۔ ''اچھا بول لیتے ہیں آپ۔ ضرور کالج اور یونیورسٹی میں تقریری مقابلوں میں اوّل آتے رہے ہوں گے......'' راحیل صاحب نے سکندر کی آنکھوں میں جھانک کر جواب دیا ''اسکول اور کالج میں تو تم بھی انتہائی غیر معمولی طالب علم رہے ہو...... میٹرک میں ٹاپ کرنے پر تمہیں صدارتی وظیفہ بھی دیا گیا تھا...... کیا تم نے اُسی وقت یہ فیصلہ کر لیا تھا کہ بڑے ہو کر ایک دہشت گرد بنو گے......؟''

جانے اس ''دہشت گرد'' لفظ میں ایسا کیا تھا کہ سکندر تڑپ کر رہ گیا۔ غصے سے اُس کا چہرہ سرخ ہو گیا اور رسی سے بندھے ہاتھ کمر کے پیچھے بل کھا کر رہ گئے۔ اُس نے تقریباً غراتے ہوئے کہا ''اپنے اپنے نظریے کی بات ہے جناب...... آپ کی نظر میں ایک

دہشت گرد ہوں، جب کہ میری نظر میں آپ کا محکمہ راشی اور بے ایمان لوگوں کا گڑھ ہے۔
مجھے قدرت نے زیادہ موقع نہیں دیا، ورنہ آپ کے محکمے کی اچھی خاصی صفائی کر جاتا......" اِ
بار راحیل صاحب تلملا کر پلٹے۔ "چند غلط لوگوں کا الزام سارے محکمے کے سر دھرنا سراسر بے
وقوفی ہے...... اور پھر ٹھیک اور صحیح کا فیصلہ کرنے والے تم کون ہوتے ہو...... اس کے لیے پ
نظام موجود ہے۔" سکندر نے نفرت سے ہونٹ سکوڑے "ہونہہ...... کیا آپ کا محکمہ اور کیا اس
نظام...... مت بھولیے کہ اس وقت، جو آپ یہاں کھڑے میرا وقت برباد کر رہے ہیں، اس ک
اجازت بھی آپ کو صرف اِسی "دہشت گرد" کی مرضی سے ملی ہے...... ورنہ مجھے آپ ہی کے
نون نے یہ اجازت دی ہے کہ میں اپنا یہ آخری وقت جیسے بھی چاہوں، صرف کر سکتا ہوں......
میں نے سوچا کہ کوٹھڑی میں پڑے پڑے بور ہوتا رہوں گا...... چلو، کچھ تفریح ہی سہی...... ورنہ
میں نہ چاہوں تو آپ مزید ایک لمحہ بھی یہاں نہیں ٹھہر سکتے...... تو ایک دہشت گرد کی آخر
دین سمجھ کر اس قیمتی وقت کی قدر کیجیے...... مجھے آپ کے لیکچرز سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔"

میں اور اقبال جیلر دم سادھے سکندر اور راحیل صاحب کی لفظوں کی یہ جنگ سن رہے
تھے۔ راحیل صاحب اپنی کرسی سے اُٹھ کر سکندر کے قریب آ گئے اور پھر اُس کی کرسی پر جھک
کر اُس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بولے "ٹھیک کہا تم نے...... مجھے مزید وقت ضائع نہیں
کرنا چاہیے...... تم مجھے صرف اتنا بتا دو کہ تمہاری تنظیم نے تمہاری پھانسی کے وقت ملک کے کس
شہر میں اور کتنے بم دھماکے کرنے کا منصوبہ تیار کر رکھا ہے......؟"

آخری سجدہ

راحیل کا سوال سن کر سکندر نے ایک زوردار قہقہہ لگایا "اوہ تو آخر کار دل کی بات زبان پر آ ہی گئی۔ یہ آپ جیسے سی ایس پی افسر، جو چند کتابوں کا رٹا لگا کر مقابلے کا امتحان پاس کر لیتے ہیں، وہ آخر اپنے آپ کو عقل کل کیوں سمجھنے لگتے ہیں۔ آپ کیا سمجھتے ہیں کہ آپ میری موت سے ایک رات پہلے سگار کے کش لیتے ہوئے آئیں گے اور مجھ سے وہ سب جان لیں گے جس کی کھوج میں آپ کا پورا محکمہ جانے کتنے برسوں سے سرگرداں ہے۔ کاش آپ لوگوں کو سی ایس پی کے بعد عام فہم کی بھی کچھ ٹریننگ دے دی جاتی تو کتنا اچھا ہوتا۔" راحیل صاحب نے بہت سکون سے سکندر کی ساری طعنہ زنی برداشت کی۔ "تو گویا تمہیں ملک میں لیے جانے والے مقابلے کے امتحان کے طریقۂ کار سے متعلق بھی کچھ اعتراضات ہیں۔ جہاں تک میں نے تمہارا ریکارڈ دیکھا ہے مجھے یاد پڑتا ہے کہ خود تم نے بھی بی اے کے بعد سی ایس ایس کے لیے اپلائی کیا تھا، کہیں تمہاری اس تلخی کی وجہ تمہاری اپنی ناکامی تو نہیں۔" سکندر زور سے چلایا۔ "نہیں، میں ناکام نہیں ہوا تھا۔ تحریری امتحان میں میرے بہت اچھے نمبر تھے لیکن زبانی امتحان لینے والوں کو شاید میری صورت پسند نہیں آئی، یا پھر اُن میں سے کوئی ایک صبح اپنی بیوی سے لڑ کر وائیوا لینے آیا تھا۔ تب ہی انہوں نے مجھ سے کچھ ایسے غیر متعلق اور اوٹ پٹانگ سوال پوچھے جن کا نہ سر تھا نہ پیر، یا پھر شاید جس ایک سیٹ پر مجھ میں اور ایک وزیر کے بیٹے میں مقابلہ تھا، اُسے مجھ سے چھیننے کے لیے انہیں مجھ سے افریقا کے جنگلوں میں پائے جانے والے ایک خاص جھینگے کی نسل بتانے جیسے سوالات ہی کرنے چاہیے تھے، جن کا میرے تحریری امتحان کے مضامین سے قطعاً کوئی تعلق نہ تھا۔ باقی ڈیڑھ سو کے قریب اُمیدواروں میں سے بھی کسی کو اس سوال کا جواب معلوم نہیں تھا، لیکن صرف اُس وزیر کے بیٹے کو نہ صرف جھینگے کی نسل معلوم تھی بلکہ اُس نے تو جھینگے کا شجرۂ نسب بھی فرفر بیان کر دیا۔ نتیجتاً وہ اگلے مہینے اسسٹنٹ کمشنر تعینات ہو گیا اور میرا نام کامیاب اُمیدواروں کی فہرست سے خارج۔" راحیل صاحب نے

پھر سے سگار کا لمبا سا کش لیا۔ ''ہوسکتا ہے تمہارے ساتھ زیادتی ہوئی ہو، لیکن تم نے دوبار
کوشش بھی تو نہیں کی۔ یقین کرو، میں خود ایک غریب گھرانے سے تعلق رکھتا ہوں اور میں بھ
اِسی نظام کے تحت لیے جانے والے امتحان کے ذریعے پاس ہو کر پولیس میں بھرتی ہوا تھا
تمہاری شکایت اپنی جگہ۔'' سکندر نے اُن کی بات پوری ہونے سے پہلے ہی کاٹ دی۔ ''میر
شکایت اب بھی اپنی جگہ ہے۔ آپ خود ہی بتائیں کہ یہ کہاں کا انصاف ہے کہ برسوں محنت
کرنے والے اور پروفیشنل کالجوں سے برسوں کی پڑھائی کے بعد نکلنے والے ڈاکٹر اور انجینئر
اس معاشرے میں معمولی کلرکوں کا درجہ پاتے ہیں، جب کہ ایک سادہ بی اے پاس لڑکا چ
مہینوں میں دو چار کتابیں رٹ کر اعلیٰ افسر بن جاتا ہے اور اپنے رٹے کے بل پر کامیاب ہو ک
قوم کی قسمت کے فیصلے کرنے لگتا ہے۔ کبھی اُن افسر بن جانے والوں سے بعد میں کسی نے ا
مضامین کے بارے میں پوچھنے کی زحمت بھی کی؟ لیکن اگر کوئی پوچھے تو اُسے پتا چلے گا کہ ایک
لفظ بھی یاد نہیں ہوتا اُن ''افسرانِ بالا'' کو۔ پھر یہ مقابلے کا امتحان صرف یادداشت اور رٹے
مقابلہ ہی تو ہوا نا، اور پھر ہم غریبوں کا حافظہ تو پہلے ہی فاقوں اور پریشانیوں کی وجہ سے کمزو
اور خراب ہو چکا ہوتا ہے۔ سو غریب کا بچہ کلرک پیدا ہوتا ہے اور کلرک ہی مر جاتا ہے۔
''ٹھیک ہے، مقابلے کے امتحان کے طریقۂ کار میں کچھ خامیاں ہوسکتی ہیں اور ان خامیوں
دُور کرنے کے لیے بذریعہ قلم جدوجہد بھی کی جاسکتی ہے لیکن اس کا یہ مطلب تو نہیں کہ ہمار
نوجوان نسل بندوق اُٹھا کر سڑکوں پر آجائے، معصوم اور بے گناہ لوگوں کے خون سے ہاتھ
رنگنے لگے۔'' سکندر نے زور سے سر جھٹکا۔ ''ہونہہ، معصوم اور بے گناہ لوگ...... غلط فہمی ہے
آپ کی، میری تنظیم نے آج تک صرف کرپٹ، راشی اور بے ایمان لوگوں کے خلاف ہ
ایکشن لیا ہے۔ ہم صرف اس غلیظ معاشرے کی صفائی کر رہے ہیں اور کچھ نہیں۔ اور میرا ضم
آج پھانسی سے ایک رات قبل بھی بالکل مطمئن ہے کہ میں نے اپنا فرض نبھایا ہے اور بس.....
راحیل صاحب نے تاسف سے ہاتھ ملے۔ ''کاش میں اس آخری وقت ہی میں تمہار
آنکھوں پر پڑا یہ پردہ اُٹھا پاتا۔ بہرحال میں تمہیں آج رات کا وقت مزید دے رہا ہوں۔ ایک
بار پھر سوچ لو، کل کی رات تمہاری زندگی کی آخری رات ہوگی۔ جانے سے پہلے کفارہ ادا
جاؤ گے تو بہت سوں کا بھلا ہو جائے گا اور شاید تمہاری بخشش بھی۔'' راحیل صاحب واپسی

لیے پلٹے، سکندر نے اُن کے جاتے جاتے فقرہ کسا۔ ''اگر آپ کی نظر میں، میں اتنا بڑا گناہ گار
ہوں تو پھر یہ بھی جان لیجیے کہ ساری عمر کے گناہ کے داغوں کو یہ ایک آخری سجدہ بھی بھلا کیا دھو
پائے گا۔ کم از کم ایسے مشورے دے کر میرے گناہ تو بے لذت نہ کیجیے۔ آپ جس میڈل کی
تلاش میں مجھ تک پہنچے ہیں، کم از کم میں اپنے کاندھوں پر چڑھ کر آپ کو اس تمغے تک نہیں
پہنچنے دوں گا۔'' اتنے میں دو سنتری اندر آگئے۔ راحیل صاحب گول کمرے سے باہر نکل چکے
تھے۔ سنتریوں نے سکندر کو کرسی سے کھولنے سے پہلے بیڑیوں اور ہتھکڑیوں میں جکڑ لیا۔ اقبال
جیلر اور میں جب گول کمرے کی چھت سے سیڑھیاں اُتر کر نیچے آئے، تب تک فجر کی اذانیں
شروع ہو چکی تھیں۔ نماز کے بعد سلطان بابا چہل قدمی کے لیے باہر نکل گئے اور میں اپنی جلتی
آنکھیں لیے، کچھ دیر کے لیے کمر ٹکانے کے لیے لیٹ گیا۔ لیکن بند آنکھوں تلے بھی میں سکندر
ہی کا چہرہ دیکھتا رہا اور میرے کانوں میں اُس کے سلگتے جملے گونجتے رہے۔

ابھی سورج چڑھے کچھ ہی دیر گزری تھی کہ سنتری نے آکر مجھے جگا دیا کہ سلطان بابا
ناشتے پر میرا انتظار کر رہے ہیں۔ میں نے بمشکل چند گھونٹ چائے حلق سے نیچے اُتاری۔ نہ
جانے ایک عجیب سی بے چینی کیوں میری رگ و پے میں سرایت کرتی جا رہی تھی، جیسے کچھ
انہونی ہونے والی ہو۔ ناشتے کے فوراً بعد سلطان بابا اُٹھ کھڑے ہوئے۔ ''چلو عبداللہ میاں۔
ذرا بچی سے مل آئیں۔'' پہلے تو مجھے کچھ سمجھ میں نہیں آیا، لیکن اِسی لمحے جیلر اقبال کی گاڑی اُس
احاطے کے باہر آکر رُکی، جس میں مجھے اور سلطان بابا کو ٹھہرایا گیا تھا۔ جیلر کچھ عجلت میں
دکھائی دے رہا تھا۔ اُس نے آتے ہی کہا ''میں نے بیوہ سے بات کر لی ہے۔ اگر آپ لوگ
تیار ہیں تو ہم ابھی ریسٹ ہاؤس کے لیے نکل سکتے ہیں۔'' تب مجھے سمجھ میں آیا کہ سلطان بابا
کی مراد مقتول کی بیوہ سے تھی۔ کچھ ہی دیر بعد ہم ریسٹ ہاؤس کے برآمدے میں بیٹھے اُس کا
انتظار کر رہے تھے۔ صبح نماز کے وقت بارش کچھ تھم سی گئی تھی، لیکن اس وقت پھر سے ہلکی ہلکی
بوندا باندی شروع ہو چکی تھی۔ ریسٹ ہاؤس کے اینٹوں والے کچے صحن میں پانی کا ایک بہت
بڑا سا جوہڑ بن گیا تھا اور اس وقت برستی بوندوں کا ارتعاش اس ٹھہرے پانی میں کچھ ویسی ہی
ہل چل پیدا کر رہا تھا، جیسے اس وقت میرے دل و دماغ میں مچی ہوئی تھی۔ جیلر ہمیں یہاں
کیوں لے کر آیا تھا؟ ہمیں مقتول کی بیوہ سے ملوانے کا کیا مقصد تھا؟ میرا ذہن انھی سوالوں

میں اُلجھا ہوا تھا کہ اتنے میں اندر کمرے کی جانب سے کسی کے قدموں کی چاپ سنائی دی۔ میں آنے والی کے احترام میں کھڑا ہو گیا۔ وہ کالے لباس میں ملبوس چپ چاپ سلام کر کے ہمارے سامنے والی کرسی پر بیٹھ گئی۔ سیاہ لباس میں اُس کا سوگوار حسن کچھ اور نکھر گیا تھا۔ اِس وقت وہ خود بھی آسمان پر چھائی گھٹا ہی کی طرح لگ رہی تھی، کچھ رُکی، کچھ برسی سی برکھا جیسی۔ کچھ دیر تک ماحول پر عجیب سی گمبھیر خاموشی طاری رہی، پھر اُسی نازنین نے اپنے لب کھولے ''سپرنٹنڈنٹ بتا رہے تھے کہ آپ مجھ سے ملنا چاہتے ہیں۔'' سلطان بابا نے اُسے دعا دی ''جیتی رہو بیٹی۔ ہاں میرا ہی نام سلطان ہے اور میں نے ہی تم سے ملنے کی خواہش کا اظہار کیا تھا۔ تم ایک بہادر لڑکی ہو اور بہادروں کا ظرف بھی بڑا ہوتا ہے اور اِسی ظرف کی اُمید پر میں یہاں تک چل کر آیا ہوں۔'' اُس نے چونک کر سر اُٹھایا اور دھیرے سے بولی۔ ''آپ فرمائیے، میں سن رہی ہوں۔'' بابا نے اپنی بات کا سلسلہ جوڑا۔ ''مجھے جیلر صاحب نے بتایا ہے کہ تم قاتل کی پھانسی دیکھنے کے لیے ہزاروں میل دُور سے یہاں تک کا سفر طے کر کے آئی ہو لیکن اپنے دل کو ٹٹول کر پوچھو، کیا کل صبح صادق سے پہلے جب یہ پھانسی سرانجام پا چکی ہو گی تو کیا تمہارا سفر ختم ہو جائے گا؟'' اُس نے حیرت سے سلطان بابا کو دیکھا ''میں سمجھی نہیں، آپ کیا کہنا چاہتے ہیں۔'' ''میں صرف اتنا کہنا چاہتا ہوں کہ دو سال سے تم نے اپنے اس درد، اپنے اس رنج والم کے سفر کی منزل اس ''پھانسی'' کو بنا رکھا تھا۔ کل یہ منزل بھی سر ہو جائے گی پھر اس کے بعد کیا یہ درد، یہ کرب ختم ہو جائے گا۔ کہیں پہلے سے بھی سوا ہو گیا تو؟'' ''آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں۔ شاید کل کے بعد میرے درد کا اصل سفر شروع ہو گا۔ میرے دل کی واحد خواہش، واحد تسلی بھی ختم ہو جائے گی۔ رؤف کا قاتل بھی اپنے انجام کو پہنچ جائے گا لیکن میرے پاس اس کے سوا اور کوئی چارہ بھی نہیں ہے۔ مجھے تمام عمر اب اِسی کرب، اِسی درد کے ساتھ گزارنی ہے۔ یہی میرا مقدر ہے۔'' ''نہیں بیٹی، تمہارا مقدر ایک ازلی سکون بھی ہو سکتا ہے۔ اگر تم اس وقتی بدلے کی خواہش کو اپنے دل سے نکال کر اُس قاتل کو معاف کر دو۔'' مجھے حیرت کا ایک شدید جھٹکا لگا اور نائلہ تڑپ کر غصے میں اُٹھ کھڑی ہوئی۔ ''کیا...... کیا آپ یہ کہنا چاہتے ہیں کہ میں اپنے معصوم شوہر اور اپنے بچے کے باپ کے سفاک قاتل کو معاف کر دوں۔ کیا آپ بھی اُسی کے کوئی ساتھی ہیں جو بھیس بدل کر ایک بار پھر مجھے لوٹنے کے لیے

آئے ہیں۔ مجھے آپ سے مزید کوئی بات نہیں کرنی ہے۔'' نائلہ نے تیزی سے پلٹ کر واپسی کے لیے قدم بڑھا دیئے۔ خود مجھے بھی سلطان بابا سے ایسی کسی بات کی توقع نہیں تھی، لیکن اُن کے لہجے میں اب بھی وہی پرانا ٹھہراؤ تھا۔ ''میں بھی کسی ظرف کے بھرم ہی میں تم تک پہنچا ہوں بیٹی، درگزر سب سے بڑا انتقام ہے۔'' وہ چلتے چلتے رُک گئی اور پلٹ کر تیکھی نظروں سے ہمیں دیکھا۔ ''میری جگہ اگر آپ کی بیٹی کے ساتھ یہ حادثہ پیش آیا ہوتا تو کیا آپ اُسے بھی یہی مشورہ دیتے؟'' سلطان بابا اپنی جگہ سے اُٹھ کھڑے ہوئے اور چار قدم بڑھا کر نائلہ کے سر پر ہاتھ رکھ دیا۔ ''میں اپنے خدا کو حاضر و ناظر جان کر کہتا ہوں کہ آج اگر اس وقت تمہاری جگہ میری اپنی سگی بیٹی بھی کھڑی ہوتی تو میں اُس سے بھی یہی التجا کرتا، کیوں کہ تمہارا مجرم راہ سے بھٹکا ہوا ایک ایسا شخص ہے جو اپنی دانست میں کچھ غلط نہیں کر بیٹھا۔ وہ تم پر کیے گئے ظلم کو بھی کسی کے حق کی داد رسی سمجھتا ہے، ہو سکتا ہے تمہاری معافی اُسے راہ راست پر لے آئے۔'' نائلہ نے بہت ضبط کی کوشش کی لیکن اُس کی آنکھوں سے آنسو چھلک ہی پڑے۔ ''تو گویا آپ بھی اُس مکار شخص کی باتوں میں آ گئے۔ وہ آج تک پولیس اور باقی زمانے کو تو یہ جھانسا دیتا ہی رہا ہے کہ اُس کا ہر جرم ایک مقصد کو پانے اور کسی اور کو اُس کے گناہوں کی سزا دینے کی کوشش میں سرزد ہوا۔ اور شاید میں بھی اِسی فلسفے سے متاثر ہو کر اُسے بخشش دینے کا فیصلہ کر ہی لیتی، اگر اُس کی اصلیت نہ جانتی۔ آپ بھی جس لمحے اُس شخص کے اصل مکروہ چہرے کو قریب سے دیکھیں گے تو مجھ سے پہلے خود چلا اُٹھیں گے کہ اُس کا مقدر صرف اور صرف پھانسی کا پھندا ہی ہونا چاہیے۔'' نائلہ اب باقاعدہ بلک بلک کر رو رہی تھی، جب کہ ہم تینوں ابھی تک اسی حیرت اور شش و پنج کی سی کیفیت میں کھڑے تھے کہ آخر اس نازک سی لڑکی کو ایسا کون سا راز پتا ہے، جس نے اُس کے اندر انتقام اور نفرت کا ایک ایسا لاوا دہکا دیا ہے کہ جواب صرف سکندر کی موت ہی سے ٹھنڈا ہو سکتا ہے۔ سلطان بابا نائلہ کے سر پر ہاتھ رکھ کر اُسے کافی دیر تسلی دیتے رہے۔

کچھ دیر بعد جب اُس کی طبیعت ذرا سنبھلی تو وہ اندر کمرے سے ایک لفافہ اُٹھا لائی جسے اُس نے سلطان بابا کے حوالے کر دیا۔ ''اس میں میری زندگی کی وہ تحریر ہے جو آپ کو سارا سچ بتا دے گی، میں نے سوچا تھا کہ میں اُس ظالم کو یہ تب دکھاؤں گی جب اُسے مشکیں کس کر بے بسی کی حالت میں تختۂ دار پر لا کھڑا کیا جائے گا، لیکن آپ کی آنکھوں پر پڑا پردہ اُٹھانے کی

خاطر میں یہ ابھی سے آپ کے حوالے کر رہی ہوں۔ پڑھنے کے بعد آپ خود اس لفافے کو اس سفاک شخص تک پہنچا دیجیے گا۔" نائلہ اپنی بات ختم کر کے تیزی سے واپس اندر چلی گئی۔
سلطان بابا نے وہ لفافہ کھولا اور اس میں تہ کی ہوئی بند تحریر پر وہیں کھڑے کھڑے تیزی سے نظریں دوڑائیں، جیسے جیسے وہ خط پڑھتے گئے، ماتھے کی شکنوں میں اضافہ ہوتا گیا اور میں اور جیلر ویسے ہی اپنی جگہ کھڑے بے چینی سے پہلو بدلتے رہے۔ سلطان بابا نے تحریر ختم کرنے کے بعد خط کو دوبارہ تہ کر کے لفافے میں ڈال دیا اور گہری سانس لے کر بولے۔ "جیلر صاحب! قیدی کی آخری خواہش کب پوری کریں گے آپ؟ میرا مطلب ہے ہماری اُس سے آخری ملاقات کا وقت کیا طے کیا ہے آپ نے۔" جیلر نے سٹپٹائے ہوئے لہجے میں جواب دیا۔ "عام طور پر پھانسی کے قیدی کی آخری ملاقات کا وقت عصر کے بعد کا ہوتا ہے۔" سلطان بابا نے برستے آسمان کی جانب نگاہ ڈالی، جو اس وقت اندر پھوٹ پھوٹ کر رونے والی نائلہ ہی کی طرح بادلوں کا سارا پانی بہانے پر مصر لگتا تھا۔ "نہیں، عصر کے بعد تو بہت دیر ہو جائے گی۔ ہم ابھی کچھ دیر بعد ظہر کی نماز پڑھ کر قیدی سے ملنے چلیں گے۔ آپ سارے انتظامات کروالیں۔"

بارش پوری رفتار سے شروع ہو چکی تھی اور جس وقت ظہر کی نماز پڑھنے کے بعد میں اور سلطان بابا جیلر کی سربراہی میں سزائے موت کے قیدیوں کے مخصوص احاطے میں داخل ہو رہے تھے، تب تک سارا سینٹرل جیل ہی ایک بڑے تالاب کی سی صورت اختیار کر چکا تھا۔ قیدی اپنی اپنی کال کوٹھڑیوں کی سلاخوں سے چپکے ہوئے کھڑے تھے، کیوں کہ پانی پھانسی گھاٹ کی کوٹھڑیوں میں بھی داخل ہونے لگا تھا۔ قیدیوں کے چہرے کیا تھے، حسرت سے اٹے فریم تھے۔ اُن کی نظریں ہمیں یوں ٹٹول رہی تھیں جیسے ہم کسی اور ہی دنیا کی مخلوق ہوں۔ جیلر نے سکندر کی کوٹھڑی کے سامنے جا کر اپنی اسٹک سے سلاخیں کھٹ کھٹائیں۔ "سکندر، اُٹھو تم سے سلطان بابا ملنے کے لیے آئے ہیں۔" سکندر جو کسی گہری سوچ میں غرق، کوٹھڑی کی چھت سے ٹپکتے پانی سے بچنے کے لیے ایک کونے میں دیوار کے ساتھ سکڑ کر بیٹھا تھا، سلطان بابا کا نام سن کر جلدی سے اُٹھ کھڑا ہوا۔ کبوتر خانے کی مانند، چار بائی چھ کی یہ کوٹھی بس اتنی سی تھی کہ اگر کوئی لمبے قد کا قیدی، رات کو سوتے وقت ٹانگیں سیدھی کرنا چاہتا تو سلاخوں سے با

برآمدے میں نکل آتیں۔ سکندر لپک کر سلاخوں کے قریب آ گیا۔ "مجھے یقین تھا آپ انتہائی طویل فاصلے کے باوجود میری آخری خواہش پوری کرنے یہاں تک ضرور آئیں گے۔ میری زندگی تو اب صرف چند گھنٹوں کی مہمان ہے، لیکن آپ کا یہ احسان میری رُوح بھی تا ابد نہیں بھولے گی۔" سکندر کی آنکھیں نم ہو گئیں۔ جیل کی شدید مشقت اور تکلیفوں نے بھی اُس کے چہرے کی وجاہت پر کچھ زیادہ اثر نہیں ڈالا تھا۔ اُس کی گہری کالی آنکھوں میں اب بھی خاصی چمک باقی تھی۔ سلطان بابا نے اُس کے سر پر ہاتھ پھیرا "کہو نوجوان...... میں تمہارے لیے کیا کر سکتا ہوں۔ مجھے یاد نہیں پڑتا کہ ہم پہلے بھی کبھی کہیں ملے ہوں۔" سکندر نے اُن کا ہاتھ چوم کر تعظیم سے چھوڑ دیا۔ "نہیں! آپ مجھ سے نہیں ملے، لیکن میری آپ سے ملاقات بہت پرانی ہے۔ آپ کو شاید یاد ہو، آج سے تین سال قبل ساحل کی درگاہ کے سامنے لنگر انداز بحری جہاز میں ایک بلاسٹ ہوا تھا۔ وہ بم دھماکا میں نے ہی کیا تھا۔ حالانکہ بحری جہاز تقریباً خالی تھا، لیکن اس میں بھرے خام مال کی وجہ سے دن رات اُس کی نگرانی کی جاتی تھی۔ مجھے اُس بلاسٹ کی تیاری کے لیے تقریباً تین ہفتے تک ایک زائر کا بھیس بدل کر آپ کی درگاہ ہی میں چھپنا پڑا تھا۔ ان تین ہفتوں میں بارہا عصر کی نماز کے بعد مجھے آپ کا درس سننے کا اتفاق ہوا۔ یقین جانیں، اگر میں اپنی زندگی کی راہ پہلے ہی متعین نہ کر چکا ہوتا تو ضرور ہمیشہ کے لیے اُسی درگاہ ہی میں آپ کے قدموں کے پاس اپنا ڈیرہ ڈال دیتا، کیوں کہ آپ مجھے ایک سچے انسان دکھائی دیئے تھے۔ ایک ایسا شخص جو بنا کسی فائدے کے اپنا سب کچھ تیاگ کر مجھ جیسے بھٹکے ہوؤں کو راستہ دکھا رہا ہے۔ لیکن بلاسٹ کے فوراً بعد مجھے وہاں سے فرار ہونا پڑا، کیوں کہ پولیس نے سارے علاقے کو اپنے گھیرے میں لے لیا تھا۔ البتہ میں نے اُسی دن یہ فیصلہ کر لیا تھا کہ زندگی میں ایک بار آپ سے ضرور ملوں گا اور آپ سے اپنے گناہوں کی معافی کی دعا کی التجا کروں گا۔ اب اسے مقدر کا ستم کہوں، یا اپنی خوش نصیبی کہ آپ سے تب ملاقات ہو رہی ہے جب میری رُخصتی کا وقت قریب ہے اور مجھے واقعی آپ جیسے کسی بزرگ کی دعاؤں کی ضرورت ہے۔" اتنے میں بڑے حوالدار نے پانی میں شرابور دو سپاہیوں کے ساتھ آ کر جیلر اقبال کو مطلع کیا کہ جلاد پہنچ گیا ہے۔ جیلر نے اُن دو سپاہیوں کو وہیں نگرانی پر چھوڑا اور خود عجلت میں سلطان بابا سے اجازت لے کر پھانسی کے انتظامات کا جائزہ لینے چلا گیا۔ جلاد کی آمد کی خبر سن کر سکندر

کے چہرے پر ایک عجیب سی درد بھری مسکراہٹ اُبھر آئی۔ ''چلیں اچھا ہوا، جیلر صاحب کی یہ پریشانی بھی ختم ہوئی۔ بہت پریشان تھے وہ اس جلاد کی غیر حاضری کی وجہ سے۔ اور مجھے یوں محسوس ہونے لگا تھا کہ اپنی زندگی میں تو میں کسی کو کوئی سکھ دے نہیں پایا اور اب جاتے جاتے بھی زمانے کو ستا کر جا رہا ہوں۔''

سلطان بابا نے وہیں برآمدے ہی میں سکندر کی کوٹھڑی کے سامنے نشست ڈال لی تھی۔ انہوں نے دعا کے لیے ہاتھ اُٹھائے اور کچھ دیر میں دعا ختم کر کے سکندر پر پھونک کر بولے ''میں تمہیں تمہارے وہ اُصول توڑنے پر مجبور نہیں کروں گا، جنہیں نبھانے کی خاطر تم نے اپنی جان بھی داؤ پر لگا دی ہے، لیکن میری بات یاد رکھنا کہ سوائے شرک کے، ہر گناہ کا کوئی نہ کوئی کفارہ ضرور ہوتا ہے۔ اگر زندگی کے آخری پل میں بھی تمہیں یہ احساس ہو جائے کہ تم کسی گناہ کبیرہ کے مرتکب ہوئے ہو تو کفارہ ادا کرنے کی کوشش ضرور کرنا۔ شاید وہی کفارہ تمہاری بخشش کا سبب بن جائے۔'' سکندر نے چونک کر ہم دونوں کی جانب دیکھا، لیکن نہ جانے کیا سوچ کر چپ ہو گیا۔ اتنے میں جیل کا ایک وارڈن لمبی سی خاکی برساتی پہنے وہاں آ پہنچا اور سکندر سے مخاطب ہوا۔ ''ہاں بھئی قیدی نمبر ۳۱۸، تمہارا کوئی اپنا ہے، جو تمہاری خواہش کے مطابق کل تمہاری میت وصول کر سکے۔ اُس کا نام، پتا لکھواؤ، یا پھر ہم رفاہ عامہ کے محکمے کو لکھ دیں۔'' وارڈن کا میکانکی انداز اور اُس کا سوال سن کر سکندر ہنس پڑا۔ ''میرے تو سب سے قریبی اب تم ہی ہو کریم خان، کیوں نہ تمہارا ہی نام دے دوں؟'' کریم خان نے جلدی سے آسمان کی طرف دیکھ کر کانوں کو ہاتھ لگائے۔ ''نہ بابا نہ، میں تو پہلے ہی موسم کے تیور دیکھ کر ڈر رہا ہوں۔'' سکندر نے دوبارہ اُسے چھیڑا۔ ''فکر نہ کرو وارڈن صاحب، پھانسی بارش میں بھی دی جا سکتی ہے۔ ہاں، البتہ سنا ہے کہ لاش بھیگنے کے بعد بھاری بہت ہو جاتی ہے۔ اس لیے تم لوگوں کو میری بارات رُخصت کرنے میں کافی دُشواری پیش آئے گی۔'' سکندر کی بات سن کر وارڈن کریم مزید وہاں ٹک نہیں پایا، اُلٹے قدموں دوڑ گیا۔ سکندر کچھ دیر تک اُسے جاتا دیکھتا رہا، پھر اُس نے سلطان بابا کو جواب دیا ''آپ یقین کریں، میرا ضمیر بالکل مطمئن ہے۔ میں نے آج تک صرف معاشرے کے ناسوروں کے خلاف ہی ہتھیار اُٹھایا ہے، وہ جو اس ملک اور یہاں کے غریب عوام کا خون چوس رہے ہیں اور جنہیں جس قدر جلدی رُخصت کر دیا جاتا،

اُسی قدر بہتر تھا۔ میں مانتا ہوں کہ ملکی قانون کی نظر میں یہ ایک بھیانک جرم ہے اور اس کی جو سزا مقرر ہے وہ میں بھگت رہا ہوں، لیکن مجھے لگتا ہے کہ میں صرف اپنے حصے کا وہ کام کر کے جا رہا ہوں جو قدرت نے میرے ذمے لگایا تھا اور باقی کام میرے جانے کے بعد میرے ساتھی پورے کرتے رہیں گے۔'' اس موقع پر میں خاموش نہیں رہ سکا اور بول پڑا ''لیکن اس بات کا تعین کون کرتا ہے کہ معاشرے میں پلتا ہوا کون سا شخص کرپشن کی غلاظت میں رہتے رہتے ناسور بن چکا ہے اور اب اُسے سزا دے کر رُخصت کر دینے کا وقت آ چکا ہے؟'' سکندر نے پہلی بار غور سے میری جانب دیکھا۔ شاید اُسے سلطان بابا کی موجودگی میں اُن کے ساتھ آئے کسی خدمت گار سے ایسے کسی سوال کی توقع نہیں تھی۔ سلطان بابا سکندر کی نگاہوں کا مفہوم سمجھ کر بولے۔ ''یہ عبداللہ ہے، اسے میرا ہی ایک حصہ سمجھو اور جو بھی کہنا چاہتے ہو، کھل کر بتاؤ، ہم دونوں راز کی حفاظت کرنا خوب جانتے ہیں۔'' سکندر کے چہرے پر اطمینان کی لہر آ گئی۔ ہمارا پورا ایک نیٹ ورک ہے۔ یہ ایک منظم تنظیم ہے جو ہر کیس کی مہینوں چھان پھٹک کرتی ہے اور پھر سپریم کمانڈ سزا کا فیصلہ کرتی ہے۔ ہم بلاوجہ بے قصوروں پر گولیاں نہیں برساتے۔'' اب دوسرا سوال سلطان بابا نے کیا ''جس نوجوان سائنس دان رؤف کے قتل کے الزام میں تمہیں پھانسی کی سزا سنائی گئی ہے، اُس کا قصور کیا تھا؟'' سکندر نے نفرت سے ہونٹ سکوڑے۔ وہ بھی اسی کرپٹ اور چور معاشرے کا ایک حصہ تھا، جس کی جڑیں کاٹنے کے لیے میں اور میری تنظیم سرگرم تھی۔ وہ بظاہر اس ملک کا وفادار تھا اور لاکھوں روپے تنخواہ کی مد میں وصول کر رہا تھا۔ اُس کے بیرونی دوروں اور عالمی کانفرنسوں میں شرکت کا خرچہ بھی ہماری غریب سرکار ہی اُٹھاتی تھی، لیکن در پردہ وہ بھی ایک عیاش اور بے ایمان شخص تھا۔ میں نے خود آخری چار دن تک اس کی نگرانی تب کی تھی جب وہ ایک کانفرنس کے بہانے کسی عورت کے ہم راہ بھوربن کے ایک مہنگے سوئٹ میں مقیم تھا۔ اُس پر گولی چلانے سے قبل میں ہر طرح کا اطمینان کر چکا تھا۔ تب ہی میں نے اُسے ختم کرنے کا فیصلہ کیا تھا، حالانکہ میری تنظیم کے بڑوں نے دو مہینے قبل ہی اس کے بوجھ سے معاشرے کو پاک کرنے کا فیصلہ کر کے مجھے آرڈرز پہنچا دیے تھے۔'' سکندر کے لہجے کا یقین اور آنکھوں کی چمک بتا رہی تھی کہ اُسے اپنے عمل پر ذرا بھی پچھتاوا نہیں ہے۔ سلطان بابا نے چند لمحے توقف کیا اور بولے۔ ''نائلہ تمہاری کیا لگتی ہے؟'' جانے یہ سوال تھا، یا

کوئی بم، جسے سنتے ہی سکندر کچھ اس زور سے اُچھلا، جیسے اُسے کسی نے ہزار وولٹ کرنٹ کا جھٹکا دے دیا ہو۔ ''آپ...... آپ نائلہ کو کیسے جانتے ہیں؟'' سلطان بابا نے اصرار کیا۔ ''پہلے میرے سوال کا جواب دو۔ پھر میں بھی تمہیں تفصیل بتا دوں گا۔'' سکندر کچھ لمحے اپنے حواس مجتمع کرتا رہا، پھر کھوئی کھوئی آواز میں بولا ''نائلہ کبھی میری رُوح کا حصہ تھی، میرا سب کچھ تھی۔ لیکن اب وہ میرے لیے ایک نامحرم، ایک اجنبی ہے۔'' سلطان بابا کچھ دیر تک سکندر کو غور سے دیکھتے رہے، پھر اُن کی ڈوبتی ہوئی سی آواز سنائی دی ''تو گویا تم نہیں جانتے ہو کہ رؤف نامی جس نوجوان کو تم نے قتل کیا تھا، وہ اُسی نائلہ کا شوہر تھا اور نائلہ آج تمہاری وجہ سے بیوہ کہلاتی ہے۔''

عصا اور دیمک

تو خواب دگر ہے تیری تدفین کہاں ہو؟
دل میں تو کسی اور کو دفنایا ہوا ہے
سانپوں میں عصا پھینک کے اب محوِ دعا ہوں
معلوم ہے دیمک نے اُسے کھایا ہوا ہے

سلطان بابا کا انکشاف سن کر سکندر کا وہی حال ہوا، جو اپنے انتہائی عزیز کی موت کا سن کر کسی کا ہو سکتا ہے۔ وہ کچھ دیر تو سکتے میں جما بیٹھا رہا اور پھر یکایک چلا کر کہنے لگا ''نہیں...... ایسا ہرگز نہیں ہو سکتا، نائلہ کے شوہر کا نام تو عمران ہے اور نائلہ نے انتہائی اچھے گھرانے کا رشتہ قبول کیا تھا۔ اگر میں آپ کو اتنے قریب سے نہ جانتا ہوتا تو ضرور یہ سمجھ لیتا کہ یہ بھی پولیس ہی کی کوئی گھٹیا چال ہے، مجھ سے راز اُگلوانے کی۔'' سلطان بابا نے مزید کچھ کہے بنا اپنی جیب سے نائلہ کا دیا ہوا لفافہ نکالا اور سکندر کے حوالے کر دیا۔ ''ہو سکے تو اس تحریر کی سچائی کو جانچنے کی کوشش کرو۔ نائلہ کے شوہر کا پورا نام عمران رؤف تھا اور یہ وہی مقتول ہے، جس نے کیمیکل انجینئرنگ میں بیرون ملک سے ڈگری میں ٹاپ کر کے اپنے ملک کی خدمت کے جنون میں یہاں کے ایک تحقیقاتی ادارے میں بطور جونیئر سائنس دان نوکری قبول کی تھی۔ لیکن بدقسمتی سے اس ہونہار نوجوان کی قضا تمہارے ہاتھوں لکھی تھی۔'' سکندر نے جھپٹ کر وہ لفافہ سلطان بابا کے ہاتھ سے لے لیا اور جیسے جیسے اُس کی نظریں کاغذ پر لکھی تحریر پر پھیلتی گئیں، ویسے ویسے اُس کا جسم خشک ریت سے بنے گھروندے کی طرح بکھرتا چلا گیا اور کچھ ہی دیر میں جب اُس نے تحریر ختم کی تو تب تک وہ بالکل بے جان ہو چکا تھا۔ کہتے ہیں، موت زندگی سے رابطہ ٹوٹ جانے کے عمل کا نام ہے اور ضروری تو نہیں انسان کا زندگی سے رابطہ صرف سانس کی ڈور ٹوٹنے ہی سے منقطع ہو سکتا ہو، کچھ اموات ہم پر سانس لینے کے دوران بھی تو وارد ہو سکتی ہیں۔ ہم جیتے جی بھی تو کئی بار مرتے ہیں۔ سکندر پر بھی اُس وقت کچھ ایسی ہی موت طاری تھی اور اُس

کی اس سے بڑی بدقسمتی کیا ہوسکتی تھی کہ یہ موت اُس پر تب طاری ہوئی، جب اُس کی اصل موت میں صرف چند گھنٹے ہی باقی بچے تھے۔ اگر اُسے آج یہ پتا نہ چلتا کہ وہ اپنی محبوبہ کے شوہر کا قاتل ہے تو تقدیر کا کیا بگڑ جاتا۔ کچھ بھرم زندگی سے بھی بڑے ہوتے ہیں اور انسان اپنی ساری زندگی میں کماتا ہی کیا ہے۔ یہی چند بھرم...... تو پھر اُس شخص کی حالت کیا ہوگی، جس کی عمر بھر کی جمع پونجی، اُس کا سب سے بڑا بھرم موت سے چند لمحے پہلے لٹ جائے۔

اتنے میں عصر کی اذان شروع ہوگئی۔ بارش نے بھی نہ رُکنے کی قسم کھا رکھی تھی۔ جانے کیوں اس وقت مجھے حال ہی میں پڑھے گئے ناول ''خدا اور محبت'' کا ایک جملہ شدت سے یاد آیا کہ ''یہ بارشیں بھی کتنی عجیب ہوتی ہیں، کبھی کبھی تو ساری عمر بھی برستی رہیں تو کسی کا اندر بھگو نہیں پاتیں اور کبھی کسی کے من کو ہر لحہ جل تھل کیے رکھتی ہیں، لیکن باہر والوں کو اس کی خبر بھی نہیں ہو پاتی۔'' سلطان بابا نے مجھے اُٹھنے کا اشارہ کیا۔ سکندر ویسے ہی گم صم سا سلاخوں سے سر ٹکائے بیٹھا تھا۔ میں اور سلطان بابا عصر کی نماز پڑھنے کے بعد جیل کی جامع مسجد سے باہر نکلے تو گھنے کالے بادلوں کی وجہ سے اندھیرا سا چھایا ہوا تھا۔ میرا خیال تھا کہ سلطان بابا سکندر کی طرف چلنے کا کہیں گے، لیکن میری توقعات کے برعکس اُن کا فیصلہ کچھ اور تھا۔ ''اب دل جلے کو تم سنبھالو ساحر میاں۔ میں ایک بار مقتول کی بیوہ سے مل کر اُس کا دل موم کرنے کی کوشش کرتا ہوں۔ پتا نہیں کیوں، لیکن مجھے اب بھی سکندر اپنی راہ سے بھٹکا ہوا ایک نوجوان لگتا ہے، جسے استعمال کیا گیا ہے۔'' میں پلٹ کر ایک بار پھر رُک گیا اور میرے ہونٹوں پر کئی دن سے رُکا ہوا ایک سوال آ ہی گیا۔ ''بابا آپ مجھے سب کے سامنے عبداللہ، لیکن تنہائی میں ہمیشہ ساحر بلاتے ہیں...... ایسا کیوں؟'' وہ میرا سوال سن کر مسکرا دیے۔ ''اس لیے کہ عبداللہ کے اندر موجود ساحر بھی میرے لیے اتنا ہی اہم ہے، جتنا کہ عبداللہ...... اور ساحر کے اندر کا عبداللہ تو پہلے ہی سے ہمارے ساتھ ہے۔ یاد رہے، نام بھی ہماری آدھی شناخت ہوتی ہے...... اور میرا مقصد کبھی تمہاری اصل شناخت مٹانا نہیں رہا۔'' سلطان بابا میرا کاندھا تھپک کر آگے بڑھ گئے اور میں یونہی سوچ میں ڈوبا، بھیگتا ہوا دوبارہ سکندر کی کوٹھری کی جانب چلا آیا۔ سکندر کے ہاتھوں میں اب بھی نائلہ کا دیا ہوا خط ویسے ہی تھا۔ ایک بہت ہی مضبوط اور آہنی اعصاب کا انسان جب ٹوٹتا ہے تو پھر ٹوٹتا ہی چلا جاتا ہے۔ شاید ہم سب ہی بیک وقت اندر سے فولاد اور موم کے بنے

ہوتے ہیں۔ فولاد کا ملمع جب اُترتا ہے تو پھر موم کو پگھلتے زیادہ دیر نہیں لگتی۔ سکندر کا موم چہرہ بھی پگھل پگھل کر آنسوؤں کے جوہڑ میں ڈوب سا گیا تھا۔ میں نے سلاخوں کے قریب جا کر پکار کر اُسے اپنی جانب متوجہ کیا۔ اُس نے پگھلتی نظریں اُٹھائیں۔ ''کیا وہ یہیں ہے......؟''

''ہاں...... وہ جیل کے ریسٹ ہاؤس میں ٹھہری ہوئی ہے۔'' سکندر میری بات سن کر زخمی سی ہنسی ہنسا۔ ''اوہ...... تو میری پھانسی کا نظارہ دیکھنے کے لیے یہاں تک آئی ہے۔ یہ رشتے بھی پل پل میں کیسے کیسے بدلتے ہیں۔ کل تک جو مجھے آئی ایک کھرونچ کی تکلیف سے رو رو کر آسمان سر پر اٹھا لیتی تھی، آج وہ میرے بے جان وجود کو پھانسی کے پھندے پر جھولتے ہوئے دیکھنے کے لیے یہاں اس موت کی وادی میں بیٹھی میری سانسیں بند ہونے کا انتظار کر رہی ہے۔'' مجھے ایک بار پھر اس محبت نامی ازدھے کی سفاکی پر شدید غصہ آنے لگا۔ آخر اس عفریت کا پیٹ کب بھرے گا؟ کب تک یہ ہم معصوم انسانوں کی رُوح نگلتا رہے گا۔ کب تک ہمارے جذبوں کی شہ رگ میں اپنے قاتل دانت گاڑھے ہمارا خون پیتا رہے گا؟ اس کے جان لیوا زہر کا ایک تازہ شکار سکندر کی صورت میں اس وقت بھی میرے سامنے ادھ مرا موجود تھا۔

سکندر کی کہانی بھی اپنی محبت کی ہزاروں لاکھوں کہانیوں میں سے ایک تھی۔ اُس کی اور نائلہ کی ملاقات انٹر یونیورسٹی کے ایک تقریری مقابلے کے دوران ہوئی تھی۔ جب نائلہ کی زبردست تیاری اور تحقیق کے باوجود سکندر نے مقابلے کا پہلا انعام جیت لیا تھا۔ نائلہ مقابلے کے ساتھ ساتھ اپنا دل بھی ہار کر گھر واپس لوٹی تھی۔ لیکن وہ یہ نہیں جانتی تھی کہ محبت صرف دو دلوں کے ملاپ ہی کا نام ہوتا، ہمارے معاشرے میں جذبوں کے سوداگر اس معصوم جذبے کو بھی سونے چاندی کے انباروں سے تولنے کا فن جانتے ہیں اور سکندر کے پاس تو کبھی عام حالات میں بس کا پورا کرایہ بھی نہیں ہوتا تھا۔ اُس کی بیوہ ماں نے بچپن ہی سے دوسروں کے گھروں کے کپڑے اور برتن دھو کر اُس کے سرکاری اسکولوں کی فیس بھری۔ لیکن نائلہ کے کروڑ پتی باپ سیٹھ امجد کو اپنی لاڈلی بیٹی کا دل اُس کے پسندیدہ کھلونوں سے جوڑنا آتا تھا، تو وہ ان کھلونوں سے اُس کا من پھیرنا بھی خوب جانتا تھا اور اُسے اپنی حد سے زیادہ بگڑی ہوئی بیٹی کی تریاہٹ'' کا بھی بہت اچھی طرح سے اندازہ تھا۔ وہ جانتا تھا کہ اگر اُس نے غریب پھٹیچر جوان کو براہ راست دھکے مار کر اپنے محل سے نکالا تو اُس کی ضدی بیٹی بھی اُس کے ساتھ ہی

سب کچھ ٹھکرا کر در در کی ٹھوکریں کھانے کے لیے نکل جائے گی، اس لیے اُس نے بڑی مہارت
سے سارے معاملے کو سنبھال لیا۔ بیٹی کی پسند کو اُس نے ایک بہترین اداکار کی طرح آنکھوں
میں آنسو بھر کر قبول کیا اور سکندر کی انا پر پہلی ضرب اُس نے پہلے ہی روز اُس وقت لگائی، جب
اُس نے اپنے دفتر کی سیٹ اور سارا کاروبار سکندر کے حوالے کرنے کا عندیہ ظاہر کیا۔ اُس کی
توقع کے عین مطابق سکندر نے اپنی ہونے والی منگیتر نائلہ کے سامنے ہی سیٹھ امجد کی یہ پیش
کش ٹھکرا دی کہ وہ نائلہ کو اپنے ہاتھوں سے کما کر کھلائے گا۔ سیٹھ امجد یہ بات بہت اچھی طرح
جانتا تھا کہ سکندر جیسے غریب، لیکن آئیڈیلسٹ نوجوان جب تک اپنے خوابوں کی دنیا سے باہر
نکلتے ہیں، تب تک اُن کے پاس کسی آفس میں بڑا، یا چھوٹا بابو بن کر کلرکی کرنے، یا پھر کسی
ڈپارٹمنٹل سٹور پر شام کو پارٹ ٹائم سیلز مین شپ کرنے کے علاوہ کوئی چارہ نہیں رہ جاتا۔ لیکن
ہزار تجربوں کے بعد بھی ایسے احمق سدھرتے ہیں، نہ سدھر پائیں گے۔ دوسرا وار نائلہ کے
باپ نے نائلہ کے چائے لانے کے لیے اُٹھ جانے کے فوراً بعد کیا۔ جب اُس نے باتوں
باتوں میں سکندر کو نائلہ کے ایک دن کے خرچ کے بارے میں بتایا، جو سکندر کے مہینوں کے
خرچے کے برابر تھا۔ جب تک نائلہ چائے لے کر آئی تب تک سیٹھ امجد سکندر کو یہ بات بہت
اچھی طرح سمجھا چکا تھا کہ اُس کی ناز و نعم میں پلی نازک بیٹی کو پانے کے لیے سکندر کو صرف
اپنے خوب صورت الفاظ سے بے محل تراشنا چھوڑ کر کوئی عملی قدم بھی اُٹھانا ہوگا۔ اور پھر جب
سکندر نے خود امجد کو یہ بتایا کہ اُس کا ارادہ پہلے ہی سے اس سال کے آخر میں ہونے والے
مقابلے کے امتحان میں بیٹھنے کا ہے اور اُسے قوی اُمید ہے کہ وہ سی ایس ایس کا معرکہ سر کرنے
کے بعد سرخرو ہو کر نائلہ کو اُس کے معیار کے مطابق نہ سہی، لیکن ایک قابل عزت جیون کا سکھ
دینے کے قابل ضرور ہو جائے گا، تب ہی وہ نائلہ کی رُخصتی کی درخواست لے کر سیٹھ امجد کے
در پر دستک دے گا۔ یہ سن کر امجد نے گہری سکھ بھری سانس لی، کیوں کہ فی الحال مصیبت خود
اپنی مرضی سے سات آٹھ مہینے کے لیے ٹل رہی تھی اور یہ آٹھ مہینے اُس کے لیے بہت تھے۔
اُس نے دھیرے دھیرے اپنی بیٹی کو یہ احساس دلانا شروع کر دیا کہ زندگی صرف جذباتی
وعدوں، خوب صورت باتوں اور مستقبل کے سپنوں کا نام نہیں ہے، اس لیے اُسے سکندر کی "رہ
نمائی" کرتے رہنا چاہیے کہ زندگی میں ترقی کرنا کس قدر ضروری ہوتا ہے۔ سکندر نے مقابلے

کے امتحان میں کامیابی کے لیے دن رات ایک کر رکھے تھے، ایسے میں اچانک جب نائلہ اُسے
اپنے باپ کے بتائے ہوئے رستے پر چلنے کے مشورے دینے کے لیے چلی آئی تو کبھی کبھار
سکندر بے حد چڑ جاتا تھا اور یوں رفتہ رفتہ دونوں کے درمیان ہلکی پھلکی جھڑپوں کی صورت میں
"رنجش" نے ڈیرے ڈالنا شروع کر دیے۔ شومئی قسمت، سکندر مقابلے کے امتحان کے انٹرویو
میں فیل ہو گیا۔ سیٹھ امجد کو اپنا آخری اور سب سے کاری وار کرنے کا موقع مل گیا اور اُس نے
ہمدردی کی آڑ میں اپنی بیٹی کو خوب سمجھا کر سکندر کے پاس بھیجا کہ سکندر نے آج تک اپنی سی جو
کرنی تھی، وہ کر کے دیکھ لی، لہٰذا بہتر یہی ہے کہ اپنی ضد چھوڑ کر سیٹھ امجد کا کاروبار سنبھال
لے اور بیوہ ماں کو لے کر سیٹھ امجد کے بنگلے ہی میں شفٹ ہو جائے۔ امتحان میں ناکامی کا
صدمہ دل پر لیے بیٹھے سکندر کو اس لمحے گھر دامادی کا یہ طعنہ کسی گالی کی طرح لگا اور وہ بھڑک کر
نائلہ پر برس پڑا۔ نائلہ بھی خود کو ترکی بہ ترکی جواب دینے سے روک نہیں پائی اور باقی کام سیٹھ
امجد کی جلتی پر تیل چھڑکنے کی پالیسی نے کر دیا۔ تیسرے ہفتے کے ختم ہونے سے پہلے ہی سکندر
اور نائلہ اس نتیجے پر پہنچ چکے تھے کہ اب دونوں کا مزید ساتھ چلنا ممکن نہ ہوگا اور پھر آخر کار وہ
"آخری الوداع" بھی آ پہنچا، جو شاید ایسے ہر محبت کرنے والے جوڑے کا ازل سے مقدر ٹھہرتا
ہے۔ پھر سے وہی انا کی دیواریں، پھر سے وہی معصوم تحائف کی واپسی۔ آخر یہ محبت کرنے
والے جب بچھڑنے لگتے ہیں، تو ایسی آخری ملاقات کا اہتمام ہی کیوں کرتے ہیں، جس میں
وہ اپنی رہی سہی نازک اور خوب صورت یادوں کو بھی لوٹا آتے ہیں! اور جدا ہونے والوں کی
نشانیاں بھی کتنی ایک جیسی ہوتی ہیں۔ وہی خوشبو میں بسے گلابی خط، چند خشک پھول...... ٹوٹی
ہوئی چوڑیوں کے چند ٹکڑے، خزاں کی کسی سرد شام میں ایک ساتھ پی گئی کافی کا کوئی بل......
خالی سینما کے سب سے پچھلے سٹال میں اکٹھے بیٹھ کر دیکھی گئی انتہائی فلاپ فلم کے دو ٹکٹ......
پہلے ساون کی پہلی بارش میں بھیگ کر بچنے کے لیے جائے پناہ کی تلاش میں دوڑتے وقت
ٹوٹ جانے والے سینڈل کا ایک فیتہ...... نائلہ کے پاس بھی اس آخری ملاقات کے لیے چند
ایسی ہی سوغاتیں تھیں، جو وہ سکندر کو لوٹانے کے لیے لائی تھی۔ سنہرے رنگ کا ایک ٹوٹا کف
لنک، ایک پرانا پارکر پین، چند پرانے ٹشو پیپر، جو سکندر نے کپڑوں پر چائے گرنے کے بعد
استعمال کر کے پھینک دیے تھے۔ سکندر کے استعمال شدہ پرفیوم کی آدھی بوتل، خزاں رسیدہ چند

پتے اور سکندر کی اخبار میں چھپی چند نظمیں...... بس وہی کل اثاثہ تھا، اُن دونوں کی تین سالہ
محبت کا...... جنھیں لوٹاتے وقت ایک ایسا لمحہ بھی آیا، جب دونوں کی ہی پلکیں بھیگ چکی تھیں
اور قریب تھا کہ دونوں ہی جذبات کی رو میں بہہ کر اس کمزور لمحے کی گرفت میں آ جاتے...
سیٹھ امجد اچھی طرح یہ بات جانتا تھا کہ ایسی آخری ملاقاتیں کبھی کبھی تجدیدِ محبت کی بنیاد بھی بن
جاتی ہیں، لہٰذا اُس نے پورا انتظام کر رکھا تھا اور وہ خود بھی اس ریسٹورنٹ کی نچلی منزل پر
موجود تھا، جہاں اُوپر سکندر اور نائلہ آخری بار مل رہے تھے۔ اُس کے ہرکارے اُن دونوں کے
آس پاس ہی موجود تھے، لہٰذا جیسے ہی سیٹھ امجد کو خبر ملی کہ دونوں اب اس موڑ پر ہیں، جہاں
یادوں کا بہاؤ انہیں بہا کر لے جا سکتا ہے تو اُس نے فوراً نائلہ کے موبائل پر کال کر کے اُسے
واپس حقیقت کی دنیا میں پہنچا دیا۔ نائلہ ٹوٹے دل کے ساتھ وہاں سے اُٹھ آئی اور سکندر کے
اندر جلتی آگ نے ایک نیا رُخ اختیار کر لیا۔

محلے کی ایک تنظیم کے لیڈر نے اُسے بڑے لیڈر سے ملوا دیا، جس نے سکندر کو مشورہ دیا
کہ وہ اپنے اس لاوے کا رُخ اُن لوگوں کی جانب کر دے، جو معاشرے میں ایسی نا
انصافیوں کے مرتکب ہو رہے ہیں، جیسی سکندر کے ساتھ سی ایس ایس کے امتحان میں ہو چکی
ہے۔ خرچے کی وہ پروا نہ کرے، کیوں کہ آج سے اُس کی اور اُس کی ماں کی ذمہ داری تنظیم کی
ہے۔ یوں سکندر نے اپنی زندگی کا پہلا جرم اُس رات کیا، جب اُس نے پہلی مرتبہ تنظیم والوں
کے ساتھ مل کر اخبار والوں کا ایک دفتر جلایا۔ کہتے ہیں کہ ماچس سے چراغ بھی جلائے جاتے
ہیں اور آشیانے بھی، لیکن سکندر کے گھر پولیس کا پہلا چھاپہ پڑا اور اُس کی ماں کو پتا چلا کہ اُس
کے گھر کو خود اُسی کے گھر کے چراغ سے آگ لگ چکی ہے تو وہ پہلا صدمہ ہی برداشت نہیں کر
پائی اور دل کا ایک ہی دورہ اُس کے لیے جان لیوا ثابت ہوا۔ تب سے سکندر کا ہر بڑھتا قدم
اُسے جرائم کی دلدل میں دھکیلتا چلا گیا اور پولیس کی یہ حسرت ہی رہی کہ وہ کبھی رنگے ہاتھوں
سکندر کو گرفتار کر سکے۔ سکندر کی پہلی اور آخری گرفتاری میں بھی پولیس کی کوشش سے زیادہ
سکندر کی بدقسمتی کا عمل دخل تھا۔ نہ سکندر کی جیپ عین چوراہے پر دغا دیتی اور نہ ہی قریب سے
گزرتی موبائل پولیس کی نظر جام ٹریفک کے ہجوم میں پھنسے سکندر پر پڑتی۔ اس سے آگے
کہانی بہت مختصر تھی۔ سکندر کو گرفتاری کی رات ہی خصوصی تفتیش کے سیل میں منتقل کر دیا گیا۔

تین مہینے کی مختصر مقدمے بازی کے بعد اُسے پھانسی کی سزا سنا دی گئی۔ تب سے لے کر آج کی
اس برستی شام تک سکندر اس پھانسی کی کوٹھری میں بیٹھا، اپنے اجل کے فرشتے کا انتظار کر رہا
تھا۔ سکندر کی کہانی ختم ہوئی تو ہم دونوں بہت دیر تک خاموش بیٹھے رہے۔ پھر یکایک سکندر نے
سلاخوں سے اپنے ہاتھ بڑھا کر میرے ہاتھ تھام لیے۔ ''ایک مرتے ہوئے شخص کی ایک
آخری تمنا پوری کرو گے......؟ میں جانے سے پہلے ایک مرتبہ اُس سے ملنا چاہتا ہوں، صرف
اُسے یہ یقین دلانے کے لیے کہ مجھ سے جو کچھ بھی ہوا، انجانے میں ہوا۔ میں اُس پولیس
آفیسر کو اپنا آخری بیان بھی ریکارڈ کروانا چاہتا ہوں، کیوں کہ اب بھی بہت سے بھٹکے ہوئے
نوجوان اس تنظیم کے آلۂ کار ہیں...... شاید میرا بیان اُن میں سے ایک کی نجات کا باعث بن
جائے...... جلدی کرو...... میرے پاس وقت بہت کم ہے۔''

جس وقت راحیل صاحب کیچڑ میں لت پت اپنے جیل کے عملے سمیت بارش میں بھیگتے
ہوئے جیل کوٹھری کے احاطے میں داخل ہوئے، تب رات پوری طرح ڈھل چکی تھی۔ موم
بتیوں کی روشنی میں سکندر کا دو گھنٹے کا طویل بیان ریکارڈ کرنے میں جانے کتنے کورے صفحوں کا
مقدر سیاہ ہو گیا اور جب بیان مکمل ہونے کے بعد راحیل صاحب چلا چلا کر جیل کے وائرلیس
سیٹ سے مختلف چوکیوں کو دہشت گردوں کے ٹھکانوں پر چھاپے مارنے کے احکامات آگے
بڑھا رہے تھے، اُس وقت رات کے دو بج چکے تھے، سکندر کی پھانسی میں صرف دو گھنٹے ہی باقی
تھے، لیکن نائلہ نے سکندر سے ملاقات کرنے سے صاف انکار کر دیا تھا۔ اُس کا کہنا تھا کہ اب
سکندر سے اُس کی ملاقات پھانسی گھاٹ پر ہی ہوگی۔ راحیل صاحب نے اُسے سمجھانے کی بے
حد کوشش کی، حتیٰ کہ سکندر کے کفارے کے طور پر اُس کا دیا گیا آخری بیان بھی نائلہ کو دکھا دیا
کہ کس طرح اُس کی تنظیم نے دھوکے سے محبِ وطن عناصر کو سکندر کے ذریعے اپنے راستے
سے ہٹایا، جن میں نائلہ کا شوہر بھی شامل تھا، لیکن نائلہ کے پتھر دل کو پگھلنا تھا، نہ پگھلا۔ آخرکار
سلطان بابا کے اشارے پر مجھے اُس نازنین دل گرفتہ کے در پر آدھی رات کو دستک دینی پڑی،
اُس کی سوجی ہوئی سرخ آنکھیں اس بات کی غمازی کر رہی تھیں کہ وہ گزشتہ رات سے روتی
رہی ہے۔ اُس نے مجھے دیکھتے ہی تلخی سے کہا۔ ''تو اب آپ آئے ہیں، اُس قاتل کی صفائی
پیش کرنے کے لیے۔ مجھے حیرت ہے کہ پوری جیل ہی اُس کی جان بخشی کے لیے کیوں دوڑی

چلی آ رہی ہے۔ ویسے اُسے یہ فن تو ہمیشہ سے بہت کمال آتا ہے، اپنی باتوں سے اُس نے سب کو بھی زیر کر ہی لیا، یا پھر کوئی نئی بولی دے دی ہے۔ اُس کی نام نہاد تنظیم نے آپ کو بھی......'' میں نے خاموشی سے اُس کے طنز کا وار برداشت کیا۔ ''میں آپ کے پاس کوئی رحم کی اپیل لے کر نہیں آیا۔ دنیا میں مری ہوئی محبت سے زیادہ مردہ اور کوئی چیز نہیں ہوتی۔ اور اس سے بھی زیادہ مرے ہوئے وہ لوگ ہوتے ہیں، جو اس مردہ محبت کا جنازہ اپنے وجود کے اندر دفنائے زندہ لوگوں کے درمیان چلتے پھرتے، اُٹھتے بیٹھتے ہیں۔ میری نظر میں آپ اور سکندر بھی ایسے ہی دو مرے ہوئے جسم ہیں، جو دنیا کے دکھاوے کے لیے اب تک سانس لے رہے ہیں۔ سچ پوچھیں تو سکندر اس معاملے میں آپ سے زیادہ خوش نصیب دکھائی دیتا ہے۔ کیوں کہ کچھ لمحوں کے بعد کم از کم وہ اس سانس لینے کی منافقت سے تو چھوٹ جائے گا۔ آپ کو البتہ یہ جھوٹا بھرم شاید مزید کچھ سال تک جاری رکھنا پڑے گا۔'' نائلہ حیرت سے گنگ میری بات سن رہی تھی۔ میں جانے کے لیے پلٹا تو اُس کی ٹوٹی ہوئی سی آواز سنائی دی۔ ''ٹھہریں...... میں تیار ہوں......آپ جیلر صاحب کو مطلع کر دیں۔'' کچھ ہی دیر میں جیل کی فضا سیٹیوں کی آواز سے گونج اُٹھی۔ یہ اس بات کا اشارہ تھا کہ قیدی کی آخری ملاقات شروع ہو چکی ہے۔ جانے سکندر، نائلہ کی ملاقات کیا رنگ لائے گی۔ میں یہی سوچتا ہوا فجر کی نماز کے بعد مسجد سے نکل کر گھاٹ پہنچا تو سکندر کی کال کوٹھری کے سامنے میلہ سا لگا ہوا تھا۔ جیلر اقبال سمیت جیل کا ڈاکٹر اور مجسٹریٹ صاحب بھی آ چکے تھے۔ سکندر اپنا آخری غسل لے کر تیسویں سپارے کی تلاوت ختم کر چکا تھا۔ تمام پھانسی گھاٹ کی کوٹھریوں کے چراغ جل چکے تھے اور سکندر کے آس پاس کے سبھی قیدی اپنے ایک دیرینہ ساتھی کو آخری الوداع کرنے کے لیے اپنی اپنی کوٹھری کی سلاخوں سے سر ٹکائے، آنکھوں میں آنسو لیے کھڑے تھے۔ سکندر کی خواہش پر سلطان بابا بھی سکندر کے اس چند قدم کے آخری سفر میں اُس کے ساتھ قدم ملانے کے لیے موجود تھے۔ سکندر نے قرآن پاک واپس رحل پر رکھ دیا اور فجر کی نماز ادا کرنے کے بعد ہمارے ساتھ چلنے کے لیے تیار ہو گیا۔ ڈاکٹر نے اس دوران سکندر کا آخری طبی معائنہ کیا اور سکندر کو پیش کش کی کہ اگر وہ پھانسی گھاٹ تک چل کر جانے میں کچھ دقت محسوس کر رہا ہو تو اُس کے لیے اسٹریچر کا بندوبست کیا جا سکتا ہے۔ لیکن اُس نے ڈاکٹر کی یہ پیش کش ٹھکرا دی۔ جیسے

ہی سکندر نے کال کوٹھری سے باہر قدم رکھا، فضا میں آس پاس کے قیدیوں کے نعرے گونج اُٹھے...... ایک بولا، کلمہ شہادت...... سب بیک زبان بولے...... اشھد ان لا الٰہ الا اللہ...... سکندر کے قدم زمین پر تو پڑ رہے تھے، مگر وہ خود مجھے اس وقت کسی اور ہی دنیا کا باشندہ لگ رہا تھا۔ سلطان بابا کے سامنے پہنچ کر وہ اپنے آنسوؤں پر قابو نہیں رکھ پایا اور رو پڑا۔ ''بابا...... میرے اس آخری سجدے کی قبولیت کی دعا کیجیے گا...... میں نے اپنی ساری زندگی غیروں کے سامنے ماتھا ٹیکنے میں گنوا دی...... یہ آخری چند لمحے ہی میری کمائی ہیں......اور میری یہ چند ٹکوں کی کمائی بھی اب آپ کی نذر ہے۔'' سلطان بابا نے سکندر کو گلے لگایا تو وہ پھوٹ پھوٹ کر رو دیا۔ اگلے قدم پر میں کھڑا تھا۔ سکندر کی آنکھیں میری آنکھوں میں جیسے گڑ سی گئیں۔ میں جانتا تھا کہ وہ میری آنکھوں میں کس کی شبیہ تلاش کر رہا تھا۔ کاش میری آنکھوں کو چند لمحے کے لیے ہی سہی، پر قدرت اتنی صلاحیت تو دے دیتی کہ میں اس سیاہ نصیب کے لیے اُس گل رُخ کا چہرہ اپنی آنکھوں میں سجا لاتا۔ میں نے ہاتھ بڑھا کر سکندر کی آنکھیں پونچھ ڈالیں۔ وہاں جا کر کسی مقام پر رُک سکو تو میرا انتظار کرنا...... ابھی میں نے تمہیں اپنی کہانی نہیں سنائی...... میرا یہ قرض تم پر ابھی باقی ہے۔'' سکندر میری بات سن کر ہلکے سے مسکرایا اور گلے لگا کر آگے بڑھ گیا۔ سب قیدی سلاخوں سے ہاتھ نکال نکال کر سکندر کو چھو کر اُسے ''الوداع'' کہتے ہوئے رو رہے تھے۔ نیا جلاد گھاٹ کے باقی عملے کے ساتھ ہمارا انتظار کر رہا تھا۔ سکندر کو تختے پر چڑھا دیا گیا۔ جلاد نے کالے رنگ کا غلاف نما کپڑا سکندر کے چہرے پر چڑھانے کی کوشش کی، لیکن اُس نے ایک ہاتھ سے اُسے کچھ لمحے رُکنے کا اشارہ کیا۔ نائلہ ابھی تک گھاٹ پر نہیں لائی گئی تھی۔ کچھ ہی دیر بعد راحیل صاحب اُسے لیے ہوئے پھانسی گھاٹ کے احاطے میں داخل ہوئے۔ نائلہ کی نظر اُوپر اُٹھی اور سکندر کی اپنی جانب گڑی ہوئی نظر سے ملی۔ میں نے اس سرد اور بھیگے موسم میں بھی اس نظر کے ٹکراؤ سے چنگاریاں سی نکلتی ہوئی دیکھیں۔ سزائے موت کی کال کوٹھریاں، جن کی پشت پر یہ پھانسی گھاٹ موجود تھا، وہاں سے کسی قیدی نے زور کی تان لگائی......'' من عاصیم، من عاجزم، من بے کسم...... تاجدارِ حرم...... ہو نگاہ کرم......ہم غریبوں کے دن بھی سنور جائیں گے......'' بادل زور سے گرجا، بارش کی بوچھاڑ نے ہم سب کے جسم پوری طرح بھگو دیے۔ ہماری آنکھیں تو پہلے ہی بہہ رہی تھیں۔ جلاد نے کالا غلاف سکندر کے

چہرے پر چڑھا دیا اور سکندر کو کاندھے سے پکڑ کر بند تختے کے درمیان میں لا کھڑا کیا۔ اس کے ہاتھ پہلے ہی پیچھے باندھ دیے گئے تھے۔ کال کوٹھریوں کی جانب سے ''اللہ ہو، اللہ ہو'' کی صداؤں نے آسمان سر پر اُٹھا لیا۔ وہ پھانسی گھاٹ کی اُونچی دیواروں کی وجہ سے اپنے ساتھی کو سانسیں ہارتے دیکھ تو نہیں سکتے تھے۔ لیکن اُن میں سے کئی ایسے تھے، جنھوں نے اس سے پہلے بھی اپنے کسی ساتھی کو پیروں پر چل کر موت کی اس وادی میں جاتے اور پھر چار کاندھوں پر سوار واپس آتے ہوئے دیکھا تھا، لہٰذا انہیں ہر لمحے کی ترتیب کا خوب اندازہ تھا کہ ٹھیک کس لمحے جلاد کے ہاتھ لیور کی جانب بڑھیں گے اور کب لیور کے کھٹکے سے وہ موت کی چیخ بلند ہوگی۔ لہٰذا وہ اِسی ترتیب سے بآواز بلند دعائیں دہرا رہے تھے۔ پھر وہی موت...... اور پھر وہی مذہب...... جلاد نے مجسٹریٹ کی جانب دیکھا، جو اپنی کلائی پر بندھی گھڑی کی سوئیاں گن رہا تھا۔ مجسٹریٹ نے نائلہ سے دھیرے سے کچھ پوچھا، لیکن نائلہ نے انکار میں سر ہلا دیا۔ مجسٹریٹ نے جلاد کو اشارہ کیا۔ جلاد نے لیور پر ہاتھ رکھا اور اپنی قوت مجتمع کی۔ سلطان بابا نے اپنی آنکھیں بند کر لیں اور اُن کے ہاتھ میں پکڑی تسبیح تیزی سے گھومنے لگی۔ جلاد نے نائلہ کی جانب رحم طلب نظر ڈالی۔ مجسٹریٹ کا ہاتھ فضا میں بلند ہوا، نائلہ کا جسم تیزی سے لرزنے لگا۔ تیز ہوا نے بارش کی برچھی جیسی بوندوں کا رُخ ہماری جانب کر دیا۔ مجسٹریٹ نے پانچ اُنگلیاں اُٹھا کر جلاد کو پانچ سکینڈ گننے کا اشارہ دیا۔ جیلر اقبال کے ہونٹوں پر کلمے کا ورد مزید بلند ہو گیا۔ آنکھیں بند ہو گئیں۔ قیدیوں کے نعرے چیخوں میں بدلنے لگے...... اللہ ہو...... اللہ ہو...... اللہ ہو...... مجسٹریٹ کی پہلی اُنگلی بند ہوئی...... پانچ...... چار...... تین...... دو...... ایک...... جلاد نے زور سے لیور کھینچا...... فضا میں تختہ کھلنے کی چنگھاڑ گونجی...... کھڑاک...... سکندر کا جسم فضا میں پہلے اپنے بوجھ سے تیزی سے نیچے کی جانب گرا اور پھر سفاک پھندے کی بندش نے اُس کی گردن کو جکڑ لیا۔ ٹھک کی آواز آئی اور سکندر چند لمحے تڑپنے کے بعد ساکت ہو گیا۔ ٹھیک اُسی لمحے ایک اور کھٹکا ہوا اور نائلہ کا جسم بھد سے زمین پر کٹے ہوئے شہتیر کی طرح گر گیا۔ ڈاکٹر اور جیلر تیزی سے نائلہ کی جانب بھاگے۔ ڈاکٹر نے فوراً نبض دیکھی اور پھر جلدی سے نائلہ کی شہ رگ پر اپنے ہاتھ کی پشت رکھی، جو برف کی طرح سرد ہو چکی تھی۔ نائلہ کی رُوح بھی سکندر کے ساتھ ہی پرواز کر گئی تھی۔ سلطان بابا کی آنکھ سے آنسو ٹپکا اور نائلہ کی بند مٹھی پر گرا، جہاں کاغذ

کی ایک مڑی تڑی سی پرچی دبی بارش سے بھیگ رہی تھی۔ سلطان بابا نے کاغذ کی تہ کھول کر اُسے پڑھا اور پھر اُسے میری جانب بڑھا دیا۔ شاید یہ تمہارے لیے ہے......'' میں نے جلدی سے کاغذ کی تحریر پر نظر دوڑائی۔ ''آپ نے ٹھیک ہی کہا تھا...... ہم دونوں ہی بہت پہلے مر چکے تھے، اب صرف شرط اس منافقت سے پہلے جان چھڑانے کی ہے، جو ان سانسوں کی صورت میں ہمیں شرمندہ کر رہی ہیں۔ میں جان چکی ہوں کہ سکندر کو رؤف کے قتل میں استعمال کیا گیا ہے اور میں نے دل سے اُسے معاف بھی کر دیا، لیکن اُس کی تنظیم، اس بیان کے بعد اُسے کبھی معاف نہیں کرے گی۔ میرے لیے سکندر بہت پہلے مر چکا ہے اور میں ایک بار پھر اُسے اُن لوگوں کے ہاتھ سے مرتا ہوا نہیں دیکھ سکتی اور وہ خود بھی یہی چاہتا ہے کہ اُس کے پچھلے تمام گناہوں کا کفارہ آج یہیں ادا ہو جائے اور وہ سرخرو ہو کر آگے جا سکے۔ میرے لیے دعا کیجیے گا کہ میں بھی زندہ رہنے کی اس منافقت سے جلد از جلد چھٹکارا پا لوں۔'' میں نے نائلہ کی تحریر اپنی مٹھی میں جکڑ لی۔ اُسے ہماری کسی دعا کی ضرورت نہیں رہی تھی۔ وہ بھی سکندر کے ساتھ اپنے آخری سفر پر روانہ ہو چکی تھی۔

یاقوط

ٹرین کو رحیم پور کا اسٹیشن چھوڑے ہوئے تقریباً بارہ گھنٹے ہو چکے تھے۔ سکندر اور نائلہ کی موت نے میرے حواس چھین لیے تھے۔ کئی بار جی میں آیا کہ سلطان بابا سے کہہ کر پلٹ جاؤں۔ محبت کا یہ رنگ بھی ہو سکتا ہے، مجھے یہ اندازہ ہرگز نہیں تھا، لیکن پھر سلطان بابا کا گہرا سمندر جیسا سکوت اور صبر دیکھ کر میں خود ہی کو ملامت بھی کرتا کہ آخر جو کچھ مجھ پر بیتی ہے وہی سب کچھ اُن کے دل نے بھی جھیلا ہے، لہٰذا انہیں مزید پریشان کرنے سے کیا فائدہ؟ جانے یہ سب سوچتے سوچتے کب میری آنکھ لگ گئی اور پھر تب جاگا، جب سلطان بابا کی ہلکی سی آواز میرے کانوں سے ٹکرائی۔ ''ساحر میاں اُٹھ جاؤ...... ہماری منزل آگئی ہے۔'' انہوں نے شاید دھیرے سے میرا کاندھا بھی ہلایا تھا۔ میں نے ایک جھٹکے سے آنکھیں کھول دیں۔ صبح کے چار بج رہے تھے۔ اسٹیشن کافی بڑا تھا، لیکن اس وقت صبح سے پہلے کی شدید دُھند اور کہر میں ڈوبا ہوا تھا اور اِسی دُھند میں چلتے پھرتے قلی، ٹھیلے دار اور وینڈنگ کنٹریکٹر سب ہی ایک خواب ہی کا حصہ دکھائی دے رہے تھے۔ حسبِ معمول نہ میں نے سلطان بابا سے کوئی سوال کیا اور نہ ہی انہوں نے کچھ بتانے کی کوشش کی۔ ہم دونوں کے پاس سامان کے نام پر صرف ایک چھوٹا سا چمڑے کا بیگ تھا جس میں میرے اور سلطان بابا کے دو جوڑے کپڑے اور اُن کا مسواک وغیرہ رکھے ہوئے تھے۔ میں بیگ اُٹھائے پلیٹ فارم پر اُترا تو سفید وردی میں ملبوس ایک ڈرائیور پہلے ہی سے ہمارے انتظار میں وہاں کھڑا تھا اور اسٹیشن پر لگے بلب کی پیلی روشنی کے دائروں اور سفید دُھند کے ہیولوں میں ہمیں ڈھونڈنے کی کوشش کر رہا تھا۔ ہمیں دیکھتے ہی جلدی سے آگے بڑھا اور سلطان بابا سے مخاطب ہوا ''بابا جی...... کیا آپ حاجی رزاق صاحب کے مہمان ہیں۔ میں آپ ہی کو لینے کے لیے آیا ہوں۔'' کچھ دیر بعد ہم ڈرائیور کے ساتھ اَسّی کی دہائی کے ماڈل کی ایک کشادہ مرسڈیز گاڑی میں دُھند بھری سڑکوں سے ہوتے ہوئے ایک بہت بڑی حویلی کے بیرونی پھاٹک سے اندر داخل ہو رہے تھے۔

حویلی بھی کہر میں ڈوبی ہوئی تھی اور مرکزی عمارت کے سامنے اتنا بڑا وسیع اور کشادہ لان تھا، جس میں اس جیسی چار چھ مزید عمارتیں کھڑی کی جا سکتی تھیں۔ لان کے بیچوں بیچ ایک بہت پرانا پیپل کا درخت کچھ عجیب شان بے نیازی سے اکیلا ایستادہ تھا۔ درخت کے چاروں طرف سیمنٹ کا بڑا سا گول چبوترا تھا اور اس کی صدیوں پرانی شاخوں کے بیچوں بیچ ایک جھولا بھی لٹکا ہوا تھا۔ حویلی میں داخلے کی روش کو سرخ بجری سے پاٹا گیا تھا اور یہی روش پورچ سے آگے جا کر انگریزی کے حرف ''ڈی'' کی شکل میں حویلی کے بیرونی گیٹ پر ختم ہوتی تھی۔ داخلے اور بیرونی دونوں گیٹوں پر دربانوں کی موجودگی یہ بات ظاہر کرتی تھی کہ حویلی کے مکین آنے اور جانے کے دو مختلف گیٹ استعمال کرتے ہیں۔ پورچ میں پہلے ہی سے ایک پکی عمر کا شخص نفیس شیروانی اور سر پر قراقلی پہنے، چند نوکروں کے ساتھ ہمارا انتظار کر رہا تھا۔ ہمارے اُترنے پر جب اُس نے تعارف اور استقبال کیا تو پتا چلا کہ یہی موصوف حاجی رزاق صاحب ہیں۔ چائے ناشتے سے فارغ ہونے کے بعد وہ ہمیں حویلی کے عظیم الشان ڈرائنگ روم سے باہر لے آئے۔ اُن کی نظر بار بار مجھ پر پڑتی، لیکن پھر کچھ پوچھتے پوچھتے رُک سے جاتے۔ آخر کار اُن کے مہمان خانے کی خوب صورت انیکسی میں داخل ہوتے وقت سلطان بابا نے خود ہی اُن کی اُلجھن رفع کر دی۔ ''رزاق صاحب یہ عبداللہ میاں ہیں...... یہ بھی میرے ساتھ ہی رہیں گے...... اگر آپ کو کوئی اعتراض نہ ہو۔'' حاجی رزاق نے جلدی سے سلطان بابا کی بات کاٹ دی۔ ''نہیں نہیں جناب...... میری کیا مجال کہ میں کوئی اعتراض کروں...... میں بس یہی کنفرم کرنا چاہتا تھا کہ صاحب زادے بھی آپ کے ساتھ ہی رہیں گے، یا ان کے لیے کہیں اور بندوبست کرنا ہوگا۔ سو بسم اللہ...... آپ کے ساتھ رہیں...... ہمارے سر آنکھوں پر......'' یہ مہمان خانہ، یا انیکسی حویلی کی مرکزی عمارت کے داہنی طرف بیرونی گیٹ سے تقریباً متصل واقع تھا اور ہم اس وقت شیشے کی دیوار سے پرے جس برآمدے میں بیٹھے ہوئے تھے، وہاں سے بھی وہ پیپل کا پیڑ بالکل سامنے نظر آتا تھا۔ حاجی رزاق کی باتوں سے میں پہلے ہی اندازہ لگا چکا تھا کہ اُن کی سلطان بابا تک رسائی مولوی خضر کے توسط سے ہوئی ہے۔ لیکن ہماری یہاں آمد کا کیا مقصد تھا، یہ عقدہ بھی کچھ دیر میں حاجی رزاق ہی کی زبانی کھلا۔ انہوں نے بتایا کہ وہ اپنے خاندان سمیت ایک مہینہ تئیس دن قبل اس حویلی میں منتقل ہوئے تھے، لیکن ان

ترپین دنوں میں شاید ہی کوئی دن ایسا ہو جو انہوں نے سکون سے گزارا ہو۔ بقول حاجی رزاق، یہ حویلی اُن سے پہلے بھی بہت سے خریدار اور کرائے دار دیکھ چکے ہیں، لیکن جانے کیوں، یہاں کوئی بھی چند راتوں سے زیادہ ٹک نہیں پایا۔ حاجی رزاق ایسی باتوں پر زیادہ یقین نہیں رکھتے تھے اور پھر جب کروڑوں کی یہ جائیداد لاکھوں کے عوض بکنے لگی تو وہ خود کو اسے خریدنے سے باز نہیں رکھ پائے۔ انہوں نے قریباً چار ماہ قبل یہ حویلی خریدی تھی، تب یہ تقریباً کھنڈر ہو چکی تھی۔ انہوں نے دن رات مزدوروں کو لگوا کر اور چار پانچ ٹھیکے داروں کی نگرانی میں اس کھنڈر کو ایک بار پھر سے اس کی موجودہ چمکتی دمکتی حالت میں تبدیل کر دیا تھا۔ جس مہمان خانے میں اس وقت ہم بیٹھے ہوئے تھے، یہ نئی تعمیر تھی۔ اس سے پہلے یہاں انجیر کے درختوں کا ایک چھوٹا سا باغ تھا، جسے صاف کروا دیا گیا تھا۔ لاکھوں روپے اس حویلی کی تزئین پر خرچ کرنے کے بعد جس روز انہوں نے اپنے پورے خاندان سمیت پہلا قدم اس دالان میں رکھا، بس وہیں سے اُن کی مصیبتوں کی داستان شروع ہو گئی۔ حاجی رزاق کے خاندان میں اُن کی بیگم کے علاوہ اُن کی دو لاڈلی صاحب زادیاں شامل تھیں...... ۱۹ سالہ رُباب اور ۱۷ سالہ نایاب۔

رُباب بچپن ہی میں اپنے چچا زاد عامر سے منسوب کر دی گئی تھی، جو اس وقت اپنی طب کی تعلیم مکمل کرنے کے بعد ہاؤس جاب کے دوسرے سال میں تھا اور اگلے ساون سے پہلے اُن کا رُباب کی رُخصتی کا منصوبہ تھا۔ حاجی رزاق کے بقول، جس وقت وہ اس حویلی میں داخل ہوئے تھے، وہ عصر کا وقت تھا اور شام کی چائے انہوں نے نوکروں سے کہہ کر باہر والان ہی میں لگوائی تھی، کیوں کہ اندر کمروں میں ابھی جھاڑ پونچھ جاری تھی۔ لڑکیاں حویلی کے دالان میں چہل قدمی کرتی رہیں اور اِسی اثناء میں مغرب کا وقت بھی ہو گیا۔ انہیں خیال ہی نہیں رہا کہ چھوٹی نایاب تو ماں کے ساتھ اندر کی آرائش دیکھنے کے لیے جا چکی ہے اور وہ خود آخری سامان لانے والے ٹرک کے ڈرائیور اور منشی کے ساتھ بھاؤ تاؤ میں مصروف رہے مگر...... جب فراغت کے بعد پلٹ کر اندر جانے لگے تو نظر بڑی بیٹی رُباب پر پڑی، جو کچھ عجیب سے انداز میں دالان میں کھڑی ہو کر پیپل کے پیڑ کر دیکھ رہی تھی۔ باپ نے آواز دی تو وہ چونک کر پلٹی اور کھوئے کھوئے انداز میں اندر کی جانب بڑھ گئی، لیکن اس کے بعد سے آج تک کسی نے اُس لڑکی کو اپنے آپے میں نہیں دیکھا۔ رفتہ رفتہ اُس کی حالت بگڑتی گئی اور اب تو وہ باقاعدہ راتوں کو اُٹھ

کر اس درخت کے پاس آ جاتی ہے اور باقاعدہ اس سے باتیں کرتی رہتی ہے۔ مستقل بخار کی کیفیت نے اُسے اس قدر چڑچڑا کر دیا ہے کہ اب تو اُس نے اپنے منگیتر عامر سے بھی بات چیت بالکل بند کر دی ہے۔ حالانکہ ایک وہ وقت بھی تھا جب وہ پہروں بیٹھ کر عامر کا شام کی چائے پر انتظار کیا کرتی تھی۔ حاجی رزاق بیٹیوں کی ایک خاص حد تک آزادی کے قائل تھے اور عامر تو اُن کے اپنے بھائی کا بیٹا تھا۔ وہ خود بھی چاہتے تھے کہ رُخصتی سے پہلے لڑکا لڑکی ایک دوسرے کے مزاج سے آشنا ہو جائیں، لیکن اب تو رُباب عامر کا نام سن کر ہی غصے سے کانپنے لگتی تھی۔ اگر عامر، رُباب سے شدید محبت نہ کرتا ہوتا تو یہ رشتہ کب کا ٹوٹ چکا ہوتا۔ وہ خود بھی رُباب کی اس حالت سے بے حد پریشان تھا اور میڈیکل کی اصطلاح میں جو کچھ بھی علاج ممکن تھا، اپنے سینئر ڈاکٹروں کے مشورے سے آزما چکا تھا، لیکن سب بے سود ہی رہا۔ رُباب کی حالت روز بروز بگڑتی ہی گئی۔ حاجی صاحب کی بیگم دبے لفظوں میں کئی بار اُن سے کہہ چکی تھیں کہ انہیں یہ کوئی آسیب وغیرہ کا چکر لگتا ہے، لیکن عامر کو ان توہمات سے شدید چڑ تھی۔ پھر بھی رُباب کی ماں نے سب سے چھپ کر ایک بہت ''پہنچی ہوئی'' پیرنی کو اپنی کراماتی دھونی دینے کے لیے حویلی میں بلا بھیجا۔ لیکن جیسے ہی اُسے چند لمحے کے لیے خود اُسی کے کہنے پر رُباب کے ساتھ اکیلے کمرے میں چھوڑا گیا تو کچھ ہی دیر بعد وہ چیختی چلاتی ہوئی بدحواسی سے کچھ ایسی تیزی سے وہاں سے بھاگی کہ اپنی پیری فقیری کے سارے کراماتی لوازمات بھی اُٹھانا بھول گئی۔

عامر کو شام کو جب اس بات کا پتا چلا کہ اُس کی چچی نے رُباب کا ''آسیب'' اُتارنے کے لیے کسی عورت کو بلوایا تھا تو وہ بے حد ناراض ہوا اور اُس نے صاف لفظوں میں کہہ دیا کہ اب اگر کسی نے بھی ایسے کسی تجربے کو دہرانے کی کوشش کی تو اچھا نہیں ہوگا۔ عامر غصے کا بے حد تیز تھا اور حاجی رزاق تو دونوں طرف سے پس رہے تھے۔ ایک طرف بیٹی ہاتھ سے نکلی جا رہی تھی تو دوسری طرف داماد رُخصتی سے پہلے ہی پھسلا جا رہا تھا۔ لیکن جب میڈیکل نے پوری طرح جواب دے دیا تو انہوں نے بیٹی کی زندگی کے لیے داماد کی ناراضی کا خطرہ مول لینے کا فیصلہ کر ہی لیا اور مولوی خضر کے ہاتھ پیغام بھیج کر سلطان بابا کو اپنے ہاں بلوا لیا، البتہ عامر اس بات سے ابھی تک بے خبر تھا۔ ابھی حاجی رزاق کی بات ختم نہیں ہوئی تھی کہ اچانک بوندا باندی نے تیز بارش کا روپ دھار لیا اور ہم جس شیشے کے کمرے میں بیٹھے ہوئے تھے، اُس کی

دیواروں سے ٹکرا کر بارش کے موتی ایک عجیب سا جل ترنگ بجانے لگے۔ یہ بارشیں چاہے دنیا کے کسی خطے کی بھی ہوں...... ہوتی بالکل ایک جیسی ہیں۔ کچھ دیر کے لیے مبہوت کر دینے والی...... دلوں کے زنگ دھو دینے والی...... ابھی ہم شیشے کی دیوار سے ٹکرا کر فنا ہونے والی بوندوں کی سرگم سن ہی رہے تھے کہ اندر سے کالے لباس اور کالی چادر میں ملبوس ایک حسین لڑکی ہاتھ میں پانی کا فوارہ اُٹھائے نکلی اور اس برستی بارش میں بھی پیپل کے پیڑ کو پانی دینے لگی۔ اُسے اپنے بھیگنے کا کوئی ہوش نہیں تھا اور اُس کے چہرے کی پیلاہٹ اور زردی، میں یہاں اتنی دُور بیٹھے ہوئے بھی دیکھ سکتا تھا۔ حاجی رزاق نے ایک ٹھنڈی آہ بھری اور اُس کی جانب اشارہ کیا۔ ”یہی میری بیٹی رُباب ہے...... اس کی ابتر حالت کا اندازہ آپ خود کر سکتے ہیں۔“ دفعتاً رُباب کی نظر اُٹھی اور اُس نے شدید غصے اور بے چینی سے اِدھر اُدھر دیکھا اور پھر اُس کی نظر تیر کی طرح ایک سیدھ میں شیشے کی اس دیوار سے پرے بیٹھے ہم لوگوں پر گڑ گئی، حالانکہ پیڑ اور اس برآمدے کا فاصلہ اتنا زیادہ تھا کہ بارش میں ہمارے ہیولے تک باہر سے گزرتے کسی شخص کو واضح نظر نہیں آ سکتے تھے، لیکن رُباب نے سیکڑوں گز دُور سے ہماری جانب یوں دیکھا جیسے ہم اُس کے بالکل سامنے ہی بیٹھے ہوں۔ اُس نے ہاتھ میں پکڑے فوارے کو زور سے ایک جانب پٹخا اور غصے میں پھنکارتی ہوئی، تیز بارش کی لپٹوں سے اُلجھتی ہوئی ہماری جانب بڑھی۔ طوفانی ہوا نے اُس کے سر سے چادر ڈھلکا دی اور جس وقت اُس نے شیشے کے دروازے کو دھکا دینے والے انداز میں دھکا دیا، تب تک اُس کا کانچ سے بنا کومل وجود ایسے ڈھل چکا تھا جیسے ابھی ابھی کوئی موتی سمندر کی تہ سے باہر نکالا گیا ہو۔ اُس کا بھیگا گلابی حسن غصے سے سرخ ہو رہا تھا۔ گھنی لٹیں بھیگ کر چہرے سے یوں لپٹی جا رہی تھیں، جیسے بے نقاب فتنے پر حجاب کا پردہ ڈالنا چاہتی ہوں۔ رُباب کچھ دیر تک دروازے میں کھڑی غصے سے ہم سب کی جانب دیکھتی رہی اور پھر اُس کی نظریں سلطان بابا پر ٹک گئیں جیسے اُسے اُن کا وجود سخت ناگوار گزرا ہو۔ رزّاق صاحب بالکل ہی بوکھلا سے گئے۔ ”آؤ بیٹا آؤ...... یہ سلطان بابا ہیں...... بہت دُور سے تم سے ملنے آئے ہیں۔ اور یہ......“ رُباب نے باپ کی پوری بات سنے بغیر ہی درمیان سے کاٹ دی ”کیوں آئے ہو یہاں......؟“ وہ براہ راست سلطان بابا سے مخاطب تھی۔ اب تک اُس نے اپنے باپ، یا میری جانب دیکھنے کی زحمت بھی نہیں کی تھی۔ حاجی رزاق نے

ڈانٹا۔ ”رُباب...... یہ کون سا طریقہ ہے مہمانوں سے بات کرنے کا......“ رُباب نے پلٹ کر ایک نگاہ غلط پہلے حاجی رزاق اور پھر مجھ پر ڈالی اور پھر سلطان بابا کو اِسی طرح کھا جانے والی نظروں سے گھورتی ہوئی پلٹ کر وہاں سے چل دی۔ حاجی رزاق نے بے بسی سے ہماری جانب دیکھا۔ ”معافی چاہتا ہوں...... لیکن میں خود بھی بے بس ہوں۔“ سلطان بابا نے، جو رُباب کو دیکھنے کے بعد کسی گہری سوچ میں گم ہو چکے تھے، حاجی رزاق کو تسلی دی کہ اللہ بہتر کرے گا۔

بارش کا زور تو کسی طور کم ہونے میں نہیں آ رہا تھا، لہٰذا سلطان بابا کی فرمائش پر حاجی رزاق نے چند چھتریوں کی پناہ تلے ہی ہمیں پوری حویلی کا دورہ کروایا۔ سلطان بابا نے بطور خاص حاجی رزاق سے دریافت کیا کہ اس مکان کی بیرونی چار دیواری کے حساب سے حویلی کو کل کتنے کونوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے؟ گھر کی اندرونی ساخت کے مطابق حویلی کے کل سات کونے بنتے تھے۔ سلطان بابا نے اُسی وقت قریب کھڑے نوکروں میں سے ایک کو بازار بھیج کر پانچ انچ لمبی لوہے کی سات کیلیں لانے کا کہا۔ سب اپنی دُھن میں مگن تھے، لیکن نہ جانے مجھے کیوں مسلسل ایک عجیب سی بے چینی اور اُلجھن کا احساس ہو رہا تھا، جیسے کوئی اس سارے عمل کی نگرانی کر رہا ہو اور پھر جب ہم حویلی کے پچھلے حصے میں باغ کی جانب والے کونوں میں سلطان بابا کی پڑھی ہوئی کیلیں ایک ایک کونے میں گاڑھ رہے تھے تو اچانک ہی میری نظر رہائشی کمروں کی اُن کھڑکیوں کی جانب اُٹھ گئی، جو یہاں پچھلے باغ کی جانب کھلتی تھیں، تب میں نے اُن میں سے ایک کھڑکی میں رُباب کو اپنی آنکھوں میں خون لیے گھورتے ہوئے دیکھا۔ اس وقت وہ غصے میں چوٹ کھائی ہوئی کسی ناگن کی طرح بل کھا رہی تھی۔ چند لمحے کے لیے ہماری نظریں ٹکرائیں تو مجھے اپنی ریڑھ کی ہڈی میں ایک سرد سی لہر اُترتی ہوئی محسوس ہوئی۔ وہ نظر کچھ اور ہی تھی...... اپنے اندر ایک پیغام...... ایک دھمکی لیے ہوئے...... ایک جانی دشمن کی نظر...... ابھی میں اُس ماہ رُخ کی نظر کے پیچ ہی میں اُلجھا ہوا تھا کہ اچانک گیٹ کی جانب سے کسی کار کی اسکریچ کی آواز سنائی دی اور چند لمحوں بعد ہی ایک وجیہہ نوجوان غصے میں دندناتا ہوا ہماری جانب بڑھا چلا آیا۔ میں اُس کے پہلے جملے ہی سے سمجھ گیا کہ وہ رُباب کا منگیتر عامر ہے۔ اُس نے چھوٹتے ہی کہا ”رزاق چچا...... یہ میں کیا سن رہا ہوں...... آپ نے پھر کسی

ڈھونگی کو رُباب کے علاج کے لیے بلوا لیا ہے...... میرے لاکھ منع کرنے کے باوجود۔" حاجی رزاق گڑبڑا سے گئے۔ "آؤ عامر بیٹا...... ان سے ملو...... یہ سلطان بابا ہیں...... میں نے انہیں......" عامر غصے سے دھاڑا "آئی ڈیم کیئر کہ یہ کون سے بابا ہیں...... میں یہ پوچھ رہا ہوں کہ یہ یہاں کیا کر رہے ہیں......؟" حاجی رزاق کی صورت حال کچھ عجیب سی ہوگئی۔ اُن کے داماد نے آتے ہی اُن کے مہمانوں کو ڈھونگی قرار دے دیا تھا۔ ایسے میں سلطان بابا نے حاجی صاحب کی مشکل آسان کی اور بولے "کسی کے سچ، یا ڈھونگ کا فیصلہ کرنے کے لیے تم نے بہت کم وقت لیا نوجوان...... ہمیں حاجی صاحب نے نہیں بلایا...... ہم دو دن کے مسافر ہیں...... خود ہی آئے ہیں، کچھ دیر ستا کر آگے بڑھ جائیں گے...... ہمیں کسی سے کچھ لینا دینا نہیں ہے۔" عامر براہ راست سلطان بابا کی بات سن کر کچھ مخمصے میں پڑ گیا، لیکن تب تک حاجی رزاق سنبھل چکے تھے۔ انہوں نے ذرا سخت لہجے میں جواب دیا۔ "تم سے ہمیں یہ توقع نہیں تھی عامر میاں...... کچھ بھی ہو، مگر میں کسی کو بھی اپنے گھر میں تہذیب کا دامن ہاتھ سے چھوڑنے نہیں دوں گا۔" عامر غصے سے پلٹا اور زور زور سے پاؤں پٹختا ہوا وہاں سے چلا گیا۔

وہ پورا دن سلطان بابا نے حویلی کے محل وقوع اور اندرونی جائزے میں گزار دیا۔ شام کی چائے پر حاجی رزاق کی بیگم اور اُن کی چھوٹی بیٹی نایاب سے بھی ملاقات ہوئی۔ دونوں بیٹیاں شاید ماں ہی کا عکس تھیں۔ نایاب بھی اپنی بہن کی طرح لاکھوں میں ایک تھی، لیکن اس وقت بہن کی پریشانی کی وجہ سے خود بھی کملائی سی تھی، البتہ رُباب سے ہمارا دوبارہ سامنا نہیں ہوا۔ رات کو تنہائی میسر ہوئی تو میں نے سلطان بابا سے استفسار کیا۔ انہوں نے ایک گہری سی سانس لی۔ "بڑی آزمائش پڑنے والی ہے ساحر میاں...... دعا کرنا کہ خدا ہمیں ثابت قدم رکھے۔" میں نے اُلجھن آمیز لہجے میں پوچھا۔ "کیسی آزمائش...... اس لڑکی کے ساتھ آخر مسئلہ کیا ہے......؟" سلطان بابا نے اپنی تسبیح گھماتے ہوئے جواب دیا "شاید تمہیں مولوی خضر نے بتایا ہو کہ بظاہر ہماری آنکھوں کے سامنے موجود، اس دنیا کے علاوہ بھی اور بھی بہت سی دنیائیں موجود ہیں...... لیکن ہم اپنی آنکھوں اور اپنے ذہن اور عقل کو عطا کی جانے والی محدود بصارت کی وجہ سے اس متوازی اور بالکل ہماری دنیا کے ساتھ جیتی جاگتی اُس دنیا کو دیکھنے سے قاصر رہتے ہیں۔ بس، یوں سمجھ لو کہ یہ بھی ایک ایسی ہی متوازی دنیا کے کسی مکین کا ہماری دنیا میں

دخل دینے کا معاملہ ہے...... اور یاد رہے کہ اس پوری کائنات کا نظام، اس بنیاد اور اُصول پر قائم ہے کہ ہر ذی رُوح اپنے مقرر کردہ دائرے میں سفر کرے اور دوسری دنیا کے محور میں دخل اندازی نہ کرے۔ اسی اُصول کی بنیاد پر یہ لاکھوں کہکشائیں، چاند، ستارے اور سیارے گردش کر رہے ہیں اور اس گردش کی ذرا سی بھی غیر قدرتی تبدیلی، یا تغیر کو قیامت سے تشبیہ دی جاتی ہے، کیونکہ اس اُصول سے بال برابر انحراف بھی اس قدر تباہی و بربادی کا باعث بن سکتا ہے جو کسی قیامت سے کم نہیں ہوگا۔" مجھے پوری بات سمجھ میں نہیں آئی۔ "میں اب بھی آپ کا مطلب نہیں سمجھا...... یہاں اس گھر میں کون سی دوسری دنیا کے مکین مداخلت کر رہے ہیں......؟" سلطان بابا نے تسبیح ختم کر کے خود پر اور مجھ پر پھونکا۔ "جنات...... اس حویلی پر واقعی کسی آسیب کا سایہ ہے۔" میری حیرت سے وہ سمجھ گئے کہ میں اس ترقی یافتہ دور کی بھاگتی دوڑتی سیٹلائٹ ایج میں اس حقیقت کو ہضم نہیں کر پا رہا ہوں۔ انہوں نے مسکرا کر میری جانب دیکھا "جنات پر یقین تو رکھتے ہو نا...... قرآن میں باقاعدہ اُن کا کئی جگہ ذکر موجود ہے...... اور اُن کا مسکن بھی یہی ہماری دنیا ہے...... بس فرق صرف اتنا ہے کہ وہ ہم سے مخفی ہیں اور اُن کا دائرۂ حیات اور معاشرہ ہمارے محور کے بہت قریب ہوتے ہوئے بھی ہم سے یکسر جُدا ہے اور عام حالات میں وہ کبھی ہمارے معاملات میں دخل دینے کی کوشش نہیں کرتے، البتہ ہم انسانوں کی طرح اُن میں بھی نیک اور بد، شریف اور شریر مخلوق کا تصور موجود ہے۔ البتہ مجھے اس بات پر شدید حیرت ہے کہ اس گھر پر آسیب کا بھاری سایہ ہونے کے باوجود مجھے ابھی تک یہاں کسی شر کا شائبہ تک نہیں ہوا، کیونکہ معاملہ اگر بدی، یا شرارت کا ہوتا تو اب تک وہ مخلوق آسمان سر پر اُٹھا چکی ہوتی، حتیٰ کہ اُس نے اس وقت بھی کسی طرح کی دخل اندازی نہیں کی، جب میں نے اُس کی امکانی بندش کا بندوبست کرنے کا سامان کیا تھا۔ عام حالات میں وہ ایسے موقع پر پلٹ کر جوابی وار ضرور کرتی ہے۔ آگ کے خمیر سے اُٹھی اس مخلوق کا برتاؤ بھی کسی نار کی طرح ہی بھڑکیلا، گرم اور جلا دینے والا ہوتا ہے۔ لیکن خلاف توقع اس بار اُس کا رویہ بالکل مختلف ہے اور دھیان رہے، اس بار تمہاری تربیت کا یہ سب سے نازک اور مشکل مرحلہ ہے۔ ہر گزرتا دن تمہیں اس متوازی دنیا کی مزید جہتیں بتا کر جائے گا۔ شرط صرف خود کو سنبھالے رکھنے کی ہے۔ اب تک ہم جس متوازی دنیا کے اسراروں کا صرف

تذکرہ ہی کرتے آئے ہیں، اُن میں سے ایک متوازی دنیا اپنی مخلوق سمیت خود اس گھر میں موجود ہے......'' جانے سلطان بابا کی اس تنبیہ میں ایسا کیا تھا کہ مجھے خود اپنے رونگٹے کھڑے ہوتے ہوئے محسوس ہوئے۔ رات دیر تک بستر پر کروٹیں بدلنے کے باوجود نیند میری آنکھوں سے کوسوں دُور تھی۔ اب مجھے سمجھ آنے لگا تھا سکندر اور نائلہ سے ملاقات بھی دراصل میری تربیت ہی کا ایک حصہ تھی، لیکن کیسے؟ دفعتہً میرے ذہن میں ایک ساتھ بہت سے جھماکے ہوئے۔ مولوی خضر نے بہت تفصیل کے ساتھ مجھے زندگی اور موت کا فلسفہ سمجھایا تھا کہ ہم خواہ مخواہ اپنی جان کی حفاظت کے لیے ہلکان ہوئے جاتے ہیں کہ موت تو خود زندگی کی تب تک حفاظت کرتی ہے، جب تک اُس کے نزول کا وقت نہیں آ جاتا اور موت زندگی کو خود وہاں کھینچ لاتی ہے، جہاں پر انسان کی آخری سانس لکھی ہوتی ہے۔ مجھے مولوی خضر کا حضرت سلیمان علیہ السلام کے دور کا سنایا ہوا قصہ بھی یاد آیا کہ کیسے جنات خود مرنے والے کی فرمائش پر اُسے ہزاروں میل دُور وہاں چھوڑ آئے تھے، جہاں وہ اپنی دانست میں موت سے بھاگ کر جانا چاہتا تھا، لیکن ملک الموت کو اُسی مقام پر اُس کی سانسیں ضبط کرنے کا حکم ملا ہوا تھا۔ تبھی میرے ذہن میں ایک اور بجلی کوندی، تو گویا رحیم پور کی سینٹرل جیل کے اُس پھانسی گھاٹ پر کسی اور کی قضا طے تھی، جس کے لیے قدرت نے سکندر کا اتنا لمبا اسکرپٹ لکھ ڈالا تھا۔ سکندر کی سانسیں تو کب کی گنی جا چکی تھیں۔ اُس کی موت تو بڑی واضح اور طے شدہ تھی، لیکن نائلہ جو اُس پھانسی گھاٹ سے ہزاروں میل دُور ایک اجنبی دیس میں بیٹھی ہوئی تھی، اگر وہ واپس اپنے ملک کی فلائٹ لے کر وہاں نہ پہنچتی اور وقت پر پہلے رحیم پور اور پھر جیل تک نہ پہنچ پاتی تو بظاہر اُس کی موت کا کوئی امکان بھی نہیں تھا۔ سوچنے کی بات یہ ہے کہ نائلہ کی فلائٹ کیوں مس نہیں ہوئی، ٹرین لیٹ کیوں نہیں ہوئی اور وہ اُس برستے طوفان سے چند لمحے پہلے رحیم پور تک کیسے آن پہنچی تھی، جب کہ اُس کے آنے کے چند لمحے بعد ہی رحیم پور کا واحد پل بھی برساتی ریلے میں بہہ گیا تھا۔ وہ پل نائلہ کی ٹیکسی گزرنے سے پہلے کیوں نہیں بہا؟ گویا سب کچھ پہلے ہی سے طے شدہ تھا۔ نائلہ کو اپنے شوہر کے قاتل کی پھانسی دیکھنے کے بہانے اُس پھانسی گھاٹ تک پہنچنا ہی تھا، جہاں اُس کی آخری سانس لکھی ہوئی تھی۔ اور اُوپر والے کا اسکرپٹ تو دیکھیے کس غضب کا تھا، دنیا کو مرنے والی کی موت کا کوئی بہانہ بھی فراہم کرنا تھا قدرت کو۔ لہٰذا اس

بہانے کا بھی پورا اہتمام کر لیا گیا تھا۔ سکندر کے ہاتھوں خود اُسی کی محبت کے شوہر کو قتل کروا کر اُس کی پھانسی کا بندوبست کیا گیا اور پھر انتقام کی آگ میں جلتی نائلہ کو قاتل کے سامنے لا کھڑا کیا، تاکہ پہلے تو وہ اُسے پہچان کر معاف کر دے اور پھر خود بھی اُس کی موت کے جھٹکے کے ساتھ ہی اپنی سانسیں بھی جاں آفریں کے سپرد کر دے۔ اب پتا نہیں رُباب کی اس حویلی میں مجھ پر کون سا بھید اور اسرار کھلنے والا تھا۔ اس متوازی دنیا کی وہ کون سی پرت تھی، جس کا میرے اس کمزور وجود پر انکشاف ہونا تھا۔ میں تو سکندر اور نائلہ کے اس پہلے تجربے ہی سے رُوح کے آخری ریشے تک نڈھال ہو چکا تھا۔ اچانک ہی مجھے لاعلمی کے سکون پر رشک اور آگہی کے عذاب سے شدید خوف محسوس ہونے لگا۔ مجھے عام لوگوں کی زندگی ایک نعمت لگنے لگی، لیکن آگہی کا یہ راستہ اور دوسری دنیاؤں کے اسرار و رُموز کا یہ راستہ بھی تو میں نے خود ہی چنا تھا۔ کیا اس طرح بیچ راہ میں حوصلہ ہار دینا ٹھیک ہوگا؟ میں انہی سوچوں میں گم تھا کہ ایک کھٹکے نے چونکا دیا۔ رات کا تیسرا پہر شروع ہو چکا تھا اور بارش نہ جانے کس وقت تھم چکی تھی۔ پہلے تو میں اسے واہمہ ہی سمجھا، لیکن پھر دوبارہ ویسی ہی آواز پیدا ہوئی، شاید باہر دالان میں کوئی تھا۔ میرے اور سلطان بابا کے کمرے علیحدہ علیحدہ تھے۔ پہلے میں نے سوچا کہ انہیں بھی جگا دوں، لیکن پھر یہ سوچ کر کہ پچھلی کئی راتوں سے انہوں نے مکمل آرام نہیں کیا، تنہا ہی باہر جانے کا فیصلہ کر لیا۔ جیسے ہی میں نے انیکسی کے شیشے سے بند برآمدے کا دروازہ کھولا تو تیز اور سرد ہوا کے بھیگے جھونکے نے پورے وجود کو جھرجھرا سا دیا۔ اور تبھی وہ گھنگھروؤں کی جھنکار جیسی تیز سرگوشی پہلی مرتبہ واضح طور پر میرے کانوں سے ٹکرائی۔ مجھے یوں لگا جیسے کسی نے میرے کان کے بہت قریب اور دھیرے سے کہا ''یاقوط۔'' ہاں...... یہی لفظ تھا۔ سرگوشی کا لب و لہجہ عربی اور انتہائی نستعلیق نہ ہوتا تو شاید میں بھی اُردو والے یاقوت اور اس لفظ یاقوط میں فرق نہ کر پاتا۔ لیکن آخری حرف ''ط'' کی گردان اتنی صاف اور واضح تھی کہ میں نے گھبرا کر پلٹ کر دیکھا، لیکن وہاں دُور دُور تک میرے سوا کوئی نہیں تھا۔ البتہ سرگوشی اتنے قریب سے کی گئی تھی کہ مجھے ابھی تک اپنے کان کی لو کسی کی گرم سانس کی حدت سے پگھلتی ہوئی سی محسوس ہو رہی تھی۔ میں ابھی اس مخمصے کا شکار تھا کہ دفعتہً میری نظر دُور دالان میں چلتے ہوئے کسی سائے پر پڑی۔ ارے...... یہ تو رُباب تھی۔ لیکن اس اندھیری رات اور سناٹے میں وہ اس وقت ننگے سر،

بال کھولے کیا کر رہی تھی؟ وہ اس وقت بھی اُسی کالے جوڑے میں ملبوس تھی اور اُس کا مہتاب چہرہ اس وقت بھی کسی چاند کی طرح چمک رہا تھا۔ میں برآمدے کے سامنے راہ داری کے ستون کی اوٹ لے کر اُسے دیکھتا رہا۔ رُباب کسی معمول کی طرح چلتی ہوئی پیپل کے پیڑ کے سامنے سامنے آ کر کھڑی ہوگئی۔ اُس کے ہیولے کی غیر واضح حرکتیں یہ ظاہر کر رہی تھیں کہ وہ وہاں کسی سے محوِ گفتگو تھی۔ میں ستون کی اوٹ سے نکل کر دھیرے دھیرے چلتے ہوئے درخت کے بالکل قریب پہنچ گیا۔ مجھے یہاں سے دُھند اور کہر میں لپٹی رُباب کا چہرہ تو واضح نظر نہیں آ رہا تھا، لیکن اُس کی آواز بالکل واضح سنائی دے رہی تھی۔ وہ کسی سے مخاطب تھی۔ ''نہیں...... بہت انتظار کر لیا میں نے...... اب مجھ سے مزید صبر نہیں ہوتا۔ تم ہی بتاؤ کہ یہ کہاں کا انصاف ہے کہ تم تو مجھے دیکھ سکو...... جب بھی تمہارا دل چاہے، مجھے اپنی نظر سے نہار سکو...... لیکن میرا من تمہیں دیکھنے کے لیے یونہی ترستا رہے، تڑپتا رہے...... میں بھی تمہیں دیکھنا چاہتی ہو یاقوط...... میں بھی تمہاری ایک جھلک پانے کے لیے ترس رہی ہوں...... پل پل مر رہی ہوں...... میرے صبر کو اور مت آزماؤ...... ورنہ اب میں واقعی تم سے رُوٹھ جاؤں گی......'' یہ رُباب کس سے باتیں کر رہی تھی؟ جواب میں کسی نے کچھ کہا، یا نہیں، یہ میں سن نہیں پایا، کیوں کہ اچانک ہی مخالف سمت کی بہت تیز ہوا چل پڑی تھی اور جب ہوا کی لہر رُکی تو میں نے بے چینی سے پہلو بدل کر کچھ سننے کی کوشش کی، لیکن اب پھر رُباب بول رہی تھی ''نہیں...... اور کتنا چھپو گے مجھ سے...... بس، اب اور نہیں سہا جاتا مجھ سے یہ آنکھ مچولی کا کھیل...... دیکھو...... کیا حالت ہوگئی ہے میری...... میں اتنی سخت جاں نہیں ہوں یاقوط...... میں مر جاؤں گی...... رحم کرو مجھ پر......'' رُباب کی حالت بالکل بھکاریوں جیسی ہو رہی تھی۔ آخر یہ کون سی ہستی تھی، جس کی ایک جھلک دیکھنے کے لیے وہ پری زاد یوں گڑگڑا رہی تھی۔ اب تو میرے صبر کا پیمانہ بھی لبریز ہو چلا تھا۔ میں نے چند لمحے سوچا اور پھر ایک جھٹکے سے درخت کی آڑ سے نکل کر رُباب کے سامنے آ گیا۔ وہ کھٹکے سے گھبرا کر پلٹی اور مجھ پر نظر پڑتے ہی اُس کے چہرے کی تمام ملامت اور نرمی ایک پل میں غائب ہوگئی۔ وہ بُری طرح چلا کر بولی: ''تم......؟ تمہاری ہمت کیسے ہوئی اس وقت یہاں آنے کی......''

آسیب محبت

اُس ماہ رُخ کا چہرہ غصے سے سرخ ہو رہا تھا، لیکن میری ساری توجہ اُس ہستی کی جانب تھی، جس کی طرف دیکھ کر رُباب بات کر رہی تھی۔ لیکن یہ کیا، سامنے تو کوئی بھی نہیں تھا۔ صرف پیپل کا پیڑ اسی شان سے کھڑا تھا، جس کی اوٹ میں چھپ کر میں نے رُباب کی ساری باتیں سنی تھیں۔ وہ پھر زور سے چلائی۔ ''میں پوچھتی ہوں کس کی اجازت سے تم یہاں آئے ہو...... چلے جاؤ یہاں سے...... نکل جاؤ میرے گھر سے...... نکل جاؤ۔'' رُباب کی چیخیں بلند ہونے لگیں۔ اتنے میں اندر سے اُس کے ماں باپ، بہن اور کچھ نوکر دوڑتے ہوئے باہر نکل آئے۔ دوسری جانب مہمان خانے سے سلطان بابا بھی شور سن کر باہر نکل آئے۔ رُباب تب تک بالکل ہی نڈھال ہو کر زمین پر گر چکی تھی۔ اُسے فوراً اندر منتقل کر دیا گیا۔ سلطان بابا نے حاجی صاحب کے اصرار کے باوجود انہیں واپس حویلی بھیج دیا کہ وہ جا کر اپنی بیٹی کی خبر گیری کریں۔ میں نے سلطان بابا کو وہیں کھڑے کھڑے ساری بات بتا دی۔ وہ کچھ دیر گہری سوچ میں گم اُس پیڑ کی جانب دیکھتے رہے، پھر اچانک بلند آواز سے بولے ''میں جانتا ہوں، تمہارا بسیرا یہیں ہے...... اس سے پہلے کہ میں کوئی حتمی قدم اُٹھاؤں میں آخری بار تم سے درخواست کرتا ہوں کہ اس لڑکی کو اپنے اثر سے آزاد کر دو...... اگر ان لوگوں سے کوئی بھول چوک ہوئی ہے، یا انجانے میں ان سے تمہیں کوئی تکلیف پہنچی ہے تو انہیں معاف کر دو...... میں تمہیں تمہارا بسیرا چھوڑنے کو نہیں کہتا، تم چاہو تو خود اکیلے، یا پھر اگر دوسرے ساتھی بھی تمہارے ساتھ ہیں تو اُن سمیت ہمیشہ یہیں رہ سکتے ہو، لیکن شرط صرف یہی ہے کہ اب تم ان بھلے لوگوں کے ساتھ کوئی چھیڑ چھاڑ نہیں کرو گے...... میں تمہیں بارہ گھنٹے کی مہلت دیتا ہوں...... فیصلہ تمہارے ہاتھ میں ہے......'' سلطان بابا اپنی بات ختم کر کے پلٹے اور مہمان خانے کی جانب چل پڑے۔ میں وہیں حیرت کے سمندر میں گُنگ کھڑا، اُس بے جان درخت کو دیکھتا رہا کہ وہ اتنی دیر تک کس نادیدہ ہستی سے باتیں کرتے رہے۔ یہاں تو دُور دُور تک کسی ذی رُوح کا سایہ تک نظر

نہیں آ رہا تھا۔ جب میں واپس کمرے میں پہنچا تو وہ کسی گہری سوچ میں گم بیٹھے تھے۔ اچانک
مجھے کمرے میں ایک مانوس سی خوشبو کا احساس ہوا۔ شاید ایک سیکنڈ کے ہزارویں حصے میں مجھ
یاد آیا کہ ٹھیک یہی خوشبو مجھے تب بھی محسوس ہوئی تھی جب میں نے سلطان بابا کے ہمراہ پہلا
مرتبہ اس حویلی میں قدم رکھا تھا۔ میں نے سلطان بابا سے اس بات کا ذکر کیا تو انہوں
خشمگیں نگاہوں سے میری جانب دیکھا ”لڑکے...... اپنی آنکھیں اور کان کھلے رکھا کرو، بعض
مرتبہ ہلکی سی چوک کا بھی بہت بھاری خمیازہ بھگتنا پڑتا ہے۔ ہاں! یہ وہی خوشبو ہے اور تم
شاید غور نہیں کیا کہ یہ خوشبو اُس وقت پیپل کے اُس پیڑ سے بھی اُبھر رہی تھی، جب وہ لڑ
وہاں موجود تھی اور جب میں اُس سے باتیں کر رہا تھا، لیکن تمہارے حواس کو منظر نے منتشر کر
رکھا۔ تم جس راہ پر چل رہے ہو، وہاں سارا کھیل ہی حسیات کا ہے۔ حسیات پر عبور حاصل کر
گے تب ہی وجدان تک پہنچو گے......“ میری تربیت کے دوران یہ پہلی سرزنش تھی جو سلطان با
نے مجھے کی تھی لیکن میری سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ آخر اتنے بہت سے لوگوں نے مجھ سے ا
بڑی بڑی توقعات کیوں وابستہ کر لی تھیں؟ میں تو ایک بہت معمولی سا انسان تھا، جس کا چند د
پہلے تک مذہب سے دُور دُور تک کوئی واسطہ، رابطہ ہی نہ تھا۔ اور پھر ماضی کی کیا بات کروں م
تو حال کے ان دنوں میں بھی اکثر کھانے سے پہلے ”بسم اللہ“ تک کہنا بھول جاتا تھا۔ اگ
سلطان بابا میرے ساتھ کھانے میں شریک نہ ہوتے اور وہ زور سے بسم اللہ نہ پڑھتے تو م
سے ایسی روزمرہ کی نیکی بھی چھوٹ جاتی تھی۔ تو پھر جب میرے نسیان کی یہ حالت تھی تو ای
میں عبداللہ، مولوی خضر اور سلطان بابا جیسی بڑی ہستیاں مجھ سے کسی غیر معمولی برتاؤ کی ام
کیوں لگائے بیٹھے تھے؟ میں اپنی سوچوں میں گم، بستر پر پڑا کروٹیں بدلتا رہا۔ کہتے ہیں ن
سب سے بڑی چور ہوتی ہے۔ وہ انسان کی آدھی عمر چرا لیتی ہے۔ لیکن مجھے ایسا لگتا تھا کہ
سے یہ چورنی بھی رُوٹھی ہوئی تھی۔ میں یونہی کروٹیں بدلتا رہا اور نہ جانے کس وقت سلطان
نے فجر کی نماز کے لیے میرے کمرے کا دروازہ کھٹکھٹا دیا۔ سلطان بابا نے اُس نادیدہ ہستی
جس وقت بارہ گھنٹے کی مہلت دی تھی، اُس وقت رات کے تقریباً ساڑھے تین بجنے کو تھے
مطلب یہ کہ آج سہ پہر تک وہ مہلت ختم ہو جانی تھی لیکن دن تیزی سے ڈھلنے کے باوجود
تک کوئی غیر معمولی بات وقوع پذیر ہوتی دکھائی نہیں دے رہی تھی۔ رُباب ایک آدھ بار دالا

کی طرف آئی، لیکن اُس نے ہماری جانب نظر اُٹھا کر بھی نہیں دیکھا۔ بالآخر عصر کی نماز بھی ہو
گئی۔ سلطان بابا نے سلام پھیر کر میری جانب دیکھا۔ ”کیوں میاں...... کیا اب بھی وہ خوشبو
محسوس ہو رہی ہے؟“ میں نے حیرت سے اُن کے انداز کو ٹٹولا۔ آخر انہیں مجھ سے یہ تصدیق
کرنے کی ضرورت کیوں پیش آئی؟ خوشبو تو اسی طرح چارسو پھیلی ہوئی تھی۔ میں نے اثبات
میں سر ہلایا تو جائے نماز اُٹھاتے ہوئے بولے ”چلو تصدیق ہو گئی۔ یاد رکھو...... مشورہ کر لینا
بہتر ہوتا ہے۔ حواسِ خمسہ بھی کبھی کبھار دھوکا دے جاتے ہیں۔“ مطلب یہ کہ یہ خاص خوشبو، جو
ہمیں محسوس ہو رہی تھی، اُس کا تعلق اُس نادیدہ ہستی کی موجودگی سے تھا۔ گویا اُس ہستی نے
سلطان بابا کی مہلت کا نوٹس نہیں لیا تھا۔ سلطان بابا نے اپنے کمرے کی جانب جاتے ہوئے
مجھ سے کہا کہ وہ اپنے کمرے میں کسی خاص دعا میں مشغول رہیں گے اور میں اُن کے
دروازے کے باہر بیٹھ جاؤں، تب تک کسی کو اس کمرے کے اندر نہ آنے دوں، جب تک وہ
خود باہر نہ آ جائیں۔ انہوں نے مجھے سختی سے تلقین کی کہ میں نماز بھی وہیں برآمدے ہی میں
کمرے کے باہر ادا کروں اور کسی کو بھی انہیں پریشان کرنے سے روکوں۔ میں نے اُن کی
ہدایت کے مطابق دروازے ہی پر ڈیرا ڈال لیا اور پھر اس دوران پہلے مغرب اور پھر عشاء کی
نماز کا وقت بھی ہو کر گزر گیا اور پھر رات ڈھلنے لگی۔ میں گزشتہ رات بھی نہیں سو پایا تھا، اگرچہ
یہ جگ راتے اب میرے لیے معمول کی بات تھے، لیکن نہ جانے وہ اندھیری رات میری
پلکوں پر اس قدر بھاری کیوں ثابت ہو رہی تھی۔ بارہ بجے کے قریب تو مجھے ایسا لگنے لگا کہ اگر
میں نے مزید اپنی آنکھیں کھلی رکھنے کی کوشش کی تو میری رُوح آنکھوں کی پتلیوں سے ہو کر
باہر نکل جائے گی۔ جانے کتنی بار میرا سر ڈھلکا اور کتنی بار میں اپنی جھونک میں لڑکھڑا کر پھر سے
سنبھل کر بیٹھا۔ ایسی ہی جان لیوا غنودگی کا جانے وہ کون سا لمحہ تھا کہ اچانک کسی نے شیشے
والے برآمدے کا دروازہ کچھ اس زور سے دھڑ دھڑایا کہ کمزور سی چٹخنی علیحدہ ہو کر ایک جانب
ڈھلک گئی اور دروازے کے دونوں پٹ ایک دھماکے سے جا کھلے۔ میں بوکھلا کر کھڑا ہو گیا۔
دروازے کے بیچوں بیچ وہی حسن بے حجاب اپنی آنکھوں میں خون اُتارے کھڑا مجھے گھور رہا تھا۔
رُباب کا آنچل ڈھلکا ہوا تھا اور بال کھلے ہوئے۔ ہم دونوں کچھ دیر تک ایک دوسرے کی
آنکھوں میں آنکھیں ڈالے دیکھتے رہے، پھر اُس کی سرسراتی سی آواز اُبھری ”وہ کہاں

ہیں......؟'' غالباً اُس کا اشارہ سلطان بابا کی جانب تھا۔ میں نے کمرے کے بند دروازے کی جانب دیکھا ''وہ اس وقت کسی سے نہیں مل سکتے۔ مجھے یہی حکم ہے۔'' اس بار وہ باقاعدہ غرائی ''کیوں نہیں مل سکتے۔ بلایا ہے تو ملنا بھی پڑے گا۔'' اُس نے قدم آگے بڑھائے اور میں باقاعدہ دروازے کے سامنے کھڑا ہوگیا۔ مجھے اپنی راہ میں مزاحم کھڑا دیکھ کر اُس کا غصہ آسمان کو چھونے لگا۔ ''ہٹ جاؤ میرے راستے سے، ورنہ......'' ابھی اس کی بات آدھی منہ میں تھی کہ اندر کا دروازہ کھل گیا اور مجھے اپنی پشت سے سلطان بابا کی آواز سنائی دی۔ ''اِسے اندر آنے دو عبداللہ میاں......ہم اِسی کا انتظار کر رہے تھے۔'' میں اُلجھن آمیز حیرت لیے سامنے سے ہٹ گیا۔ وہ تنتناتی ہوئی اندر چلی گئی۔ میں نے بھی اُس کے پیچھے قدم بڑھا دیے۔ وہ سلطان بابا کے بالکل سامنے جا کر دوزانو ہو کر بیٹھ گئی اور اُن کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بولی۔ ''آپ ہمیں کیوں تنگ کر رہے ہیں؟'' میں نے حیرت سے اُسے دیکھا۔ اُس نے جمع کا صیغہ استعمال کیا تھا، جب کہ وہاں وہ فردِ واحد تھی۔ سلطان بابا نے غور سے اُس کی جانب دیکھا۔ ''میں نے پہلے ہی تمہیں خبردار کر دیا تھا کہ بارہ گھنٹے کی مہلت کے بعد مزید مہلت نہیں ملے گی۔ تم میرا سامنا کرنے سے کیوں کتراتے ہو۔ اس معصوم کا سہارا کیوں لے رہے ہو......؟'' مجھے کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اُن دونوں کے درمیان یہ کس قسم کی گفتگو جاری تھی۔ یہ سوال کس سے کیے جا رہے تھے اور جواب کون دے رہا تھا۔ رُباب نے بے بسی سے سر پٹخا اور اِدھر اُدھر نظر دوڑائی۔ کمرے کے وسط میں پڑی چھوٹی سی تپائی کے نچلے حصے میں ایک قلم اور کاپی رکھے ہوئے تھے۔ اُس نے ہاتھ بڑھا کر دونوں چیزیں اُٹھا لیں اور جلدی سے چند حرف گھسیٹ کر کاغذ پھاڑا اور سلطان بابا کے حوالے کر دیا۔ بابا نے غالباً مجھے سنانے کے لیے بلند آواز میں تحریر پڑھی۔ ''میں آپ سے اُلجھنا نہیں چاہتا، نہ ہی میں رُباب کے نازک اور کومل وجود پر طاری ہو کر اور اُسے اذیت دے کر آپ سے دوبدو بات کرنا چاہتا ہوں، آپ کو سلیمان علیہ السلام کا واسطہ...... آپ ہمیں ہمارے حال پر چھوڑ دیں۔'' سلطان بابا نے کاغذ ایک جانب رکھا۔ ''میں بھی تو یہی چاہتا ہوں کہ تم اس لڑکی کو اس کے حال پر چھوڑ دو......تم نے اب تک اسے، یا اس کے گھر والوں کو کوئی نقصان نہیں پہنچایا۔ یہی تمہاری شرافت کی دلیل ہے......لیکن تمہارا سحر بھی اس بنتِ آدم کے کومل وجود پر بے حد گراں ہے۔ دیکھتے نہیں، کیا حالت ہوگئی

ہے اس کی......؟ اس کے حال پر رحم کرو......بخش دو اِسے......'' رُباب نے جھلاہٹ میں جلدی سے مزید چند لائنیں صفحے پر گھسیٹیں اور پھر کاغذ سلطان بابا کو تھما دیا۔ لکھا تھا ''میں اس کا دشمن نہیں ہوں۔ ہم ایک دوسرے سے محبت کرتے ہیں......آپ ہمارے درمیان نہ آئیں...... میں آپ سے مقابلہ نہیں کرنا چاہتا......'' اس بار سلطان بابا کی آواز میں ایسی سختی تھی، جو میں نے پہلے کبھی محسوس نہیں کی تھی۔ ''یہ محبت نہیں سحر ہے......تم ناری ہو اور یہ خاکی ہے......اس کی رُوح پر قابض ہو کر اِسے اپنے بس میں کرنے کو تم محبت کہتے ہو......تمہیں تو اس کی زبان بولنے کے لیے بھی خود کو اس کے قلب پر طاری کرنا پڑتا ہے۔ دیکھو، میں نے اب تک حتیٰ الامکان سختی سے گریز کیا ہے۔ مجھے مجبور مت کرو کہ میں آخری حد تک بڑھ جاؤں۔'' تحریری جواب آیا۔ ''میں آپ کی حد جانتا ہوں، اس لیے ملتجی ہوں کہ مجھے میری حد تک نہ دھکیلیں...... ناری اور خاکی کا سوال تو تب اُٹھتا، جب بات جسم کے ملاپ کی ہوتی، یہ رُوح سے رُوح کے ملن کا مقدمہ ہے......آپ ٹھیک کہتے ہیں یہ بولی، یہ لفظ بھی میرے نہیں ہیں، لیکن لفظ تو بس رابطے کا ذریعہ ہوتے ہیں۔ مجھے اس کی دنیا سے رابطے کے لیے یہ ذریعہ بھی اپنانا پڑا تو میں اپنا لوں گا۔ آپ جو شرط بھی لگائیں گے مجھے قبول ہوگی، بس مجھے یہاں سے بے دخل نہ کریں۔ مجھے یہیں ایک کونے میں پڑا رہنے دیں۔ میری ذات سے کبھی کسی کو کوئی تکلیف نہیں ہو گی......'' اس مرتبہ سلطان بابا باقاعدہ گرجے۔ ''بس......بہت ہوگیا۔ یہ فطرت کے قانون کا معاملہ ہے۔ تمہیں اس لڑکی کی رُوح پر سے اپنا قبضہ اُٹھانا ہوگا، ورنہ......'' لیکن سلطان بابا کی بات ختم ہونے سے پہلے ہی رُباب وہاں سے اُٹھ کر واپس چل دی۔

میں نے سائنس کی اصطلاح میں ہپناٹزم کے بارے میں پڑھ ضرور رکھا تھا، لیکن اپنی زندگی میں پہلی مرتبہ کسی کو اس ہپناٹزم کے زیرِاثر دیکھا تھا۔ اگر یہ سارا عمل میری آنکھوں کے سامنے نہ ہوا ہوتا تو میں ضرور اسے کسی ایسے ہی ٹرانس کا کرشمہ سمجھتا، لیکن سائنس کی اب تک کی حد انسانی ذہن کی مقرر کردہ ہے، جب کہ عبداللہ کا لقب پانے کے بعد جس متوازی دنیا کا میں مسافر بننے جا رہا تھا، اس کی سرحد ہی شاید وہاں سے شروع ہوتی تھی، جہاں آ کر سائنس کی حدیں دم توڑ دیتی تھیں۔ یہ کیسا عجیب واقعہ تھا، جو میری آنکھوں کے سامنے وقوع پذیر تھا۔ آسیب کے قصے تو میں بھی بچپن ہی سے سنتا آیا تھا اور بچپن میں تو ہم باقاعدہ ایک دوسرے کو

"اُلٹے پیروں والی چڑیلوں" کے قصے سنا سنا کر ڈرایا بھی کرتے تھے۔ شاید رات اور اندھیرے کے خوف سے جو ایک براہِ راست تعلق ہوتا ہے ایسے قصوں کو جنم دینے میں اُس کا بھی بڑا ہاتھ ہوتا ہے، لیکن یہاں تو آسیب، ایک گل رُخ کی محبت میں نہ صرف خود گرفتار تھا، بلکہ اُسے اس دل رُبا کے محبوب ہونے کا دعویٰ بھی تھا۔ کیا واقعی جن و انس کے درمیان ایسی کسی محبت کا گمان بھی پایا جا سکتا ہے؟ مجھے ایک مرتبہ پھر سے "محبت" نامی اس عفریت کی بے پناہ قوت کا اندازہ ہوا۔ یاقوط نامی یہ نادیدہ ہستی، جو عام حالات میں شاید اپنی ایک پھونک سے اس پوری حویلی کو تہس نہس کر سکتی تھی، جو شر اور بگاڑ پیدا کرنے پر آ جاتی تو شاید اُسے روکنا بھی ہم کمزور انسانوں کے بس میں نہ ہوتا، لیکن ایک نازک سی لڑکی نے اُسے اس قدر مجبور و بے بس کر ڈالا تھا کہ وہ خود سوالی بن کر ہم انسانوں کے آگے ہاتھ باندھے کھڑی تھی۔ بظاہر یہی محسوس ہو رہا تھا کہ یاقوط نے سلطان بابا کی تنبیہ کا اثر نہیں لیا تھا۔ خود سلطان بابا کے ذہن میں بھی یہ بات کہیں نہ کہیں ضرور موجود ہو گی کہ زیادہ سختی لڑکی کے لیے کسی مصیبت کا باعث بھی بن سکتی ہے، کیوں کہ اس حویلی نے اب تک یاقوط کا ایک ہی رُخ دیکھا تھا۔ ہم میں سے ہر ایک اپنے اندر بیک وقت صحرا اور ساون ہوتا ہے۔ البتہ ہمارے اندر کا ساون ہمارے اردگرد موجود کسی ایک آدھ خوش نصیب کے اُوپر ہی برستا ہے، باقی اپنے تو ساری عمر ہمارے اندر کے صحرا کی تپش ہی جھیلتے رہتے ہیں۔ یاقوط کے اندر کا ساون بھی صرف رُباب کی حد تک ہی تھا اور ڈھلتی ہوئی وہ بھیگی رات مجھے ہر پل یہ کہتی ہوئی محسوس ہو رہی تھی کہ اگلے چند گھنٹوں میں اس کے صحرا کی پیاس ہمارے حلق میں کانٹے چبھو جائے گی۔

فجر کی نماز پڑھتے ہی سلطان بابا نے چند پڑھی ہوئی میخیں اُٹھائیں اور میرے ہاتھوں انہیں ٹھیک پیپل کی جڑوں کے قریب گاڑھ دیا۔ اور شاید ٹھیک اِسی وقت رُباب کی حالت بگڑنے لگی تھی۔ سورج نکلنے تک اُس کی وحشت اس قدر بڑھ چکی تھی کہ اُسے قابو میں رکھنے کے لیے اُس کی ماں اور بہن کو باقاعدہ جکڑنا پڑ رہا تھا۔ شاید گھر کے کسی نوکر نے عامر کو بھی خبر کر دی تھی اور صبح ساڑھے نو بجے کے قریب وہ اپنے سینئر ڈاکٹر اور نفسیات کے ایک پروفیسر کے ساتھ حویلی آ پہنچا۔ ہمیں اپنی منگیتر کے پاس دیکھ کر اُس کی تیوری چڑھ گئی۔ "آپ لوگ ابھی تک یہیں ہیں۔ پلیز آپ لوگوں کو جو چاہیے۔ وہ لے کر یہاں سے چلتے بنیے۔ میں اپنے

سینئر کولیگز کو لے کر آیا ہوں۔ یہ سیدھا سادہ ہسٹریا کا کیس ہے۔ آپ اس میں کچھ نہیں کر سکتے، لہٰذا دخل اندازی نہ کریں تو بہتر ہو گا۔" رُباب خشمگیں نگاہوں سے ہماری طرف دیکھ رہی تھی۔ نفسیات کے پروفیسر نے اپنی عینک درست کی۔ "جی جی...... بالکل...... دراصل بچی کے لاشعور میں بچپن کا کوئی خوف دوبارہ گیا ہے، جو اس گھر میں آ کر پھر سے اپنی پوری طاقت سے اس پر حملہ آور ہو گیا ہے۔ ہمیں اس کے دل سے یہ ڈر نکالنا ہو گا۔" سینئر ڈاکٹر نے بھی ہاں میں ہاں ملائی۔ "ہسٹریا کی بہت سی اقسام ہوتی ہیں، لیکن ان سب کا علاج ممکن ہے۔ بس ہمیں مریض کے آرام......" لیکن اس کی بات پوری ہونے سے پہلے ہی رُباب زور سے چلائی۔ "چلے جاؤ...... نکل جاؤ تم سب یہاں سے......" حاجی رزاق اور اُن کی بیگم لاچار سے کھڑے یہ سارا تماشا دیکھ رہے تھے۔ سلطان بابا نے سکون سے ڈاکٹروں کی ساری بات سنی اور پھر دھیرے سے بولے۔ "آپ کا مریض آپ کے سامنے ہے۔ آپ جیسے مناسب سمجھیں، اس کی دوا کر سکتے ہیں۔ مجھے بس اُن کے لیے دعا کرنے دیں...... کیا مجھے دعا کی اجازت بھی نہیں دیں گے آپ لوگ؟" سلطان بابا کی بات نے وقتی طور پر انہیں لاجواب کر دیا اور ڈاکٹر صاحبان نے اپنے بکس کھولے اور انجکشن وغیرہ تیار کرنے میں مشغول ہو گئے۔ سلطان بابا مجھے لیے کمرے سے باہر نکل آئے۔

میں بہت دیر اُسی پیپل کے پیڑ کے نیچے بیٹھا یہ سوچتا رہا کہ سائنس اور رُوحانیت کا یہ جھگڑا آخر کب تک چلے گا۔ اس بحث سے قطع نظر کہ دنیا میں سائنس پہلے وارد ہوئی تھی، یا رُوحانیت۔ حیرت کی بات یہ تھی کہ دونوں علم اپنے اندر ہر سوال کے جواب کی وسعت رکھتے تھے۔ اگر میں نے رُباب کو رات کو اس روپ میں نہ دیکھا ہوتا تو مجھے بھی ان ڈاکٹرز کی بات پر یقین کرنے میں کچھ تامل نہ ہوتا، لیکن سائنس تو صرف جسم کے زخموں کو مندمل کرنا جانتی ہے...... اور اگر کسی کی رُوح گھائل ہو تو وہ کہاں جائے......؟ ہماری زندگی میں دعا کی کیا اہمیت ہے؟ دعا کو عبادت کا مغز کیوں کہا گیا ہے؟ معجزہ کسے کہتے ہیں؟ معجزات اور دعاؤں کا آپس میں کیا رشتہ ہوتا ہے۔ دفعتہً مجھے یوں محسوس ہونے لگا کہ جس متوازی دنیا کے اسرار جاننے کے لیے میں گھر سے نکلا تھا، اس دنیا کے زخموں کی پہلی سائنس ہی "دعا" تھی۔ اور اس دنیا کی بیماری اور روگ سحر اور جادو تھا۔ میرے ذہن میں ایک اور عجیب بات بھی آئی کہ جب سائنس

نہیں تھی، تب ایسے روگوں کی دوا کیا ہوتی ہوگی؟ میرے خیالوں کا تسلسل اندر سے بلند ہوتی رُباب کی چیخوں نے توڑ دیا۔ میں گھبرا کر کھڑا ہو گیا۔ سلطان بابا جانے کب کے مہمان خانے کی طرف جا چکے تھے۔ رُباب کے کمرے کی کھلی کھڑکی سے میں نے اُسے ڈاکٹروں کے نرغے میں درد اور بے چینی سے تڑپتے ہوئے، زور لگا کر چھوٹنے کی کوشش کرتے ہوئے اور کرب سے چلاتے ہوئے دیکھا۔ سلطان بابا نے مجھے پہلے ہی خبردار کر دیا تھا کہ انہوں نے پیپل کے پیڑ کے گرد یاقوط کے لیے آخری بندش لگا دی ہے اور اب اگلے چند گھنٹے نہایت سخت گزریں گے، کیوں کہ اب وہ نادیدہ ہستی بے ٹھکانہ ہو چکی ہے۔ گویا دوسرے لفظوں میں اب کھلی جنگ کا طبل بج چکا تھا اور سلطان بابا کی پیش قدمی کے بعد اب ہمیں یاقوط کی جوابی کارروائی کا منتظر رہنا چاہیے تھا۔ لیکن رُباب اتنی بے چین کیوں تھی؟ کیا یہ کرب اور تکلیف واقعی ایک محبوب پر لگائی گئی پابندیوں کا نتیجہ تھا، یا پھر سینئر ڈاکٹر کے بقول، یہ اُسی ہسٹریا اور خوف کی کیفیت تھی جو رُباب کے لاشعور میں بہت پہلے سے کہیں چھپا بیٹھا تھا اور روپ بدل بدل کر اُس کے سامنے آ کھڑا ہوتا تھا۔ میں انہی سوچوں میں گم اُس نازک سی لڑکی کو بے قرار سا تڑپتے ہوئے دیکھ رہا تھا کہ اچانک اُس کی نظر مجھ پر پڑ گئی۔ میں کھڑکی سے باہر کافی فاصلے پر، لیکن بالکل سیدھ میں پیپل کے پیڑ کے نیچے کھڑا ہوا تھا۔ جانے اُس ایک نظر میں کیا کچھ تھا، بے بسی، لاچاری، غصہ، رحم کی فریاد، شکایت اور گلہ۔ مجھے یوں لگا کہ وہ نظر صرف نظر نہیں، کسی گھائل کی آخری آہ ہے۔ جو زہر میں بجھے ایک تیر کی طرح عین میرے دل کے وسط میں پیوست ہو کر رہ گئی ہے۔ میں گھبرا کر کھڑکی کے سامنے سے ہٹ گیا، لیکن اس کے بعد پورا دن ایک عجیب سی بے چینی میرے سارے رگ و پے میں دوڑتی رہی۔ کئی بار جی میں آیا کہ سلطان بابا سے اس بدنصیب کے لیے رحم کی اپیل کر دوں۔ آخر ہمیں کیا حق حاصل تھا، کسی کے خوابوں کی سلطنت کو یوں تخت و تاراج کرنے کا۔ اگر یاقوط نامی کوئی ہیولا رُباب کے خوابوں کا مرکز بن چکا تھا اور چاہے وہ صرف ایک سپنا ہی تھا اور رُباب کے انتہائی طاقت ور تخیل نے اس خواب کو اُس کے سامنے ایک حقیقت کے روپ میں لا کھڑا کیا تھا، تب بھی ہم کون ہوتے ہیں کسی کے خوابوں پر ڈاکا ڈالنے والے؟ اور پھر اُس کا منگیتر اور باقی ڈاکٹر اپنی سی کوشش تو کر ہی رہے تھے، کم از کم ہمیں اُس لڑکی کو اُس کے حال پر چھوڑ دینا چاہیے تھا۔ جانے اس لمحے مجھے ایک بات کا شدت سے

احساس کیوں ہوا کہ کبھی کبھی یہ دنیا بُروں کی وجہ سے اتنی بُری جگہ نہیں بنتی، جتنا بُرا اسے ہم جیسے ''اچھے'' بنا دیتے ہیں۔ رُباب کی اس بے کل نظر کے بعد میں خود بھی سارا دن بہت بے چین سا پھرتا رہا۔ سلطان بابا اپنے وظیفے میں مشغول تھے، لہٰذا اُن سے اپنی یہ بے کلی بانٹنے کا موقع بھی نہیں مل سکا۔

شام کو پھر وہی ڈاکٹروں کی ٹیم آئی اور پھر سے وہی سارا سلسلہ دوبارہ دہرایا گیا۔ جب وہ لوگ حویلی کے پورچ سے نکل رہے تھے، تب میں وہیں دالان ہی میں موجود تھا۔ سینئر ڈاکٹر، عامر سے کچھ بات کر رہا تھا کہ ''آج کل ڈائی پولر تھیوری آف گریوٹیشن (Dipolar Theory Gravitation) کا بہت چرچا ہے۔ عامر تم انٹرنیٹ پر ضرور اس صفحے کی تفصیلات پڑھنا۔ انسان کا لاشعور اس سے کیسے کیسے کھیل کھیلتا ہے۔ اس کا ہم اندازہ بھی نہیں کر سکتے اور بھئی مغرب تو یہ بات ثابت کرنے پر تلا ہوا ہے کہ ہم بذات خود ایک واہمہ ہیں، ایک حقیقی دنیا کا ساتواں عکس ہیں۔ ایسے میں اگر رُباب کسی متوازی دنیا کے خواب کو حقیقت سمجھ بیٹھی ہے تو یہ کوئی انہونی بات نہیں ہے۔ بس ایک ذرا سا سرا مل جائے اس گتھی کا، ہم یہ کیس ضرور حل کر لیں گے۔ یو جسٹ ڈونٹ وری ڈیئر، یہ صرف اور صرف خواب در خواب کی بیماری ہے۔ ہمیں سب سے پہلے رُباب کو اُس کے آخری خواب سے باہر لانا ہوگا۔ پھر آخر سے پہلا اور پھر دوسرا۔ دراصل وہ خواب میں بھی خواب دیکھ رہی ہے۔ کام مشکل ضرور ہے، لیکن ناممکن نہیں...... لیکن یاد رہے...... بہت احتیاط کی ضرورت ہے۔ اگر ہم سے ذرا سی بھی کوتاہی ہوئی اور ہم نے رُباب کے خواب در خواب کے تسلسل کو اسی طرح سے توڑا کہ ہم نے اُس کے آخری خواب سے پہلے کے کسی خواب کو راستے میں چھیڑ دیا تو پھر ہمارے ہاتھوں سے اس بھول بھلیاں کا یہ راستہ ہمیشہ کے لیے کھو جائے گا۔ اور رُباب یونہی ساری عمر کے لیے بھٹکتی رہ جائے گی......'' وہ سارے کافی دیر تک وہیں سر جوڑے رُباب کی بیماری پر بحث کرتے رہے۔ تو گویا نفسیات کی اصطلاح میں رُباب پیاز کی تہوں کی طرح تخیل کے جال میں پھنس گئی ہے اور اب اُسے اس خوابوں کی دنیا سے نکالنے کے لیے پیاز کی آخری تہ سب سے پہلے کھولنی ہوگی اور پھر ترتیب وار اُسے اس تخیل کے جالے سے نکالنا ہوگا۔ اور اس سارے عمل میں اگر کہیں غلطی سے بھی کوئی غلط تہ کھل گئی تو رُباب ہمیشہ کے لیے اپنے اُسی خواب کی تہ کی قیدی بن جائے گی۔

اچانک ہی مجھے یوں محسوس ہونے لگا کہ کہیں میں خود بھی تو کسی ایسے ہی خوابوں کے جالے میں پھنسا وقت کا شکار تو نہیں ہوں۔ خود مجھے بھی تو ایسے ہی منظر دکھائی دیتے رہتے ہیں۔ میرے ذہن میں بھی چند لمحوں کے بعد مستقبل کے جھماکے ہوتے رہتے ہیں، کہیں درگاہ میں داخلے کے وقت سے لے کر اب تک میں خود بھی کسی خواب در خواب سلسلے کا شکار تو نہیں ہوتا گیا تھا؟ یا خدا...... یہ کیسے بھید، کیسے راز تھے؟ میں اِسی اُلجھن کے تانے بانے بنتا اور اُدھیڑتا رہا۔ جانے کب رات ڈھلی اور کب حویلی میں سناٹے نے اپنا راج پھیلایا، مجھے اندازہ ہی نہیں ہوا۔ سلطان بابا تو ویسے بھی عشاء کی نماز کے بعد اپنے کمرے میں جا چکے تھے اور جاتے وقت وہ خاص طور پر مجھے تاکید کر کے گئے تھے کہ انہوں نے یاقوط کے غیر مرئی وجود کے لیے پوری حویلی ہی کو بندش لگا کر جائے ممنوعہ میں تبدیل تو کر دیا ہے، لیکن وہ اتنی آسانی سے ہتھیار ڈالنے والوں میں سے نہیں ہے، لہٰذا اُسے جہاں سے بھی ایک ذرا سی بھی درز، یا کوئی ایسی جھری ملی کہ جس سے وہ پھر سے خود کو اس ماحول میں تحلیل کر سکے تو وہ ایک لمحے کی تاخیر کے بنا، اپنی پوری طاقت سے اس موقعے کا فائدہ اُٹھانے کی کوشش کرے گا۔ اس لیے میں اگر ذرا سی بھی کوئی خلاف معمول حرکت، یا بات محسوس کروں تو فوراً انہیں مطلع کر دوں۔ میں اِسی فکر میں اپنے ذہن کے ریشے اُدھیڑتا رہا اور رات بھیگتی گئی۔ شاید ساڑھے تین کے آس پاس کا کوئی وقت ہو گا کہ اچانک ہی میرے سارے جسم کے رونگٹے کھڑے ہونا شروع ہو گئے۔ وہی مخصوص سی خوشبو مجھے اپنے اطراف تیرتی ہوئی محسوس ہوئی۔ میں نے کئی بار سر جھٹک کر خود کو یہ یقین دلانے کی کوشش کی کہ یہ میرا وہم ہے۔ سلطان بابا نے پوری حویلی کے گرد ایک غیر مرئی آہنی دیوار اُٹھا رکھی تھی، جس میں کوئی چھید، کوئی نقب لگانا ناممکن تھا تو پھر یہ خوشبو کیسی......؟

اچانک باہر دالان میں کوئی کھٹکا سا ہوا۔ میں بوکھلا کر کھڑا ہو گیا۔ آواز پیپل کے پیڑ کی جانب ہی سے آئی تھی۔ میں نے چند لمحے سلطان بابا کے کمرے کی جانب سے کسی حرکت کی توقع میں انتظار کیا، لیکن اِسی اثناء میں دوسرا کھٹکا ہوا اور میرے قدم میکانکی انداز میں باہر کی جانب اُٹھ گئے۔ میں نے برآمدے کا دروازہ کھولا تو سرد بھیگی ہوا کے ایک جھونکے نے میری سوئی ہوئی رُوح تک کو پہلی سلامی دے کر جگا دیا۔ باہر دالان میں بھی وہی خوشبو پھیلی ہوئی تھی اور اُس کی مہک کی شدت اندر برآمدے سے کہیں زیادہ تھی۔ میں جلدی سے ننگے پاؤں ہی باہر نکل آ

تھا۔ گھاس پر جمی شبنم کے قطرے کسی تیز برچھی کی نوک کی طرح میرے تلووں میں پیوست ہو کر میرے وجود کو چھیدتے ہوئے میری آنکھوں سے بہہ نکلے۔ مجھے لگا کہ جیسے وہ خوشبو مجھ سے کچھ کہہ رہی ہے۔

تیری ہر چاپ سے جلتے ہیں خیالوں میں چراغ
جب بھی تو آئے...... جگاتا ہوا جادو آئے
تجھ کو چھو لوں تو پھر اے جانِ تمنا
مجھ کو دیر تک اپنے بدن سے تیری خوشبو آئے

پیپل کے پیڑ کی جانب سے ایک آہٹ بلند ہوئی۔ میں چونک کر پلٹا، کسی کا نازک وجود فضا میں پھیلی دُھند اور کہرے پر تیرتا ہوا سا میری جانب بڑھ رہا تھا۔ میں نے اپنی پوری بصارت کو اپنی دو آنکھوں میں سمو کر کہرے کی اس سفید چادر کو چیرنے کی کوشش کی۔ سیاہ لباس میں ملبوس اس نازنین کا آنچل ڈھلکا اور میرے وجود میں روشنی کے کئی مینار پھوٹ پڑے۔ میرے سامنے زہرا بے نقاب کھڑی تھی۔ ہاں...... وہی...... میری اپنی...... زہرا۔

صلیب عشق

ہاں وہ زہرا ہی تھی اور وہی اُس کا رُوح کے اندر تک جذب ہو جانے والا حسن تھا لیکن وہ یہاں سیکڑوں میل دُور، رات کے اس سناٹے میں کیا کر رہی تھی۔ وہ مجھے یونہی ایک ٹک دیکھتی رہی۔ دفعتہً مجھے یوں محسوس ہوا کہ میرا وجود ایک پل میں ہی کئی من بھاری ہو گیا ہے۔ میرے کاندھوں میں اس اچانک بوجھ کی وجہ سے شدید درد اُٹھا لیکن شاید میں زہرا کو اپنے سامنے پا کر یہ سب بھول ہی گیا۔ میں لپک کر اُس کے پاس پہنچا۔ ''آپ یہاں......؟ اس وقت......لیکن کیسے......؟'' زہرا اپنی مخصوص سی دھیمی مسکراہٹ اپنے کومل ہونٹوں میں دبا کر بولی ''کیوں...... میں یہاں نہیں آ سکتی......؟ کیا سبھی کرامات صرف آپ کے لیے ہی مخصوص ہیں......؟'' میں لاجواب سا ہو گیا لیکن میری اُلجھن فزوں تر ہوتی گئی۔ ''لیکن پھر بھی...... میرا مطلب ہے......؟'' اُس نے اپنے ہونٹوں پر اُنگلی رکھ کر مجھے خاموش رہنے کا اشارہ کیا۔

''بس اور کچھ نہ کہو...... جانے کتنی صدیوں سے تمہاری ایک جھلک دیکھنے کے لیے میری یہ پیاسی آنکھیں، خشک اور بنجر پڑی ہیں۔ خاموش رہو اور میرے من پر اپنی شبیہ کا ساون برسنے دو......'' میں نے چونک کر زہرا کو دیکھا۔ اُس نے آج تک کبھی مجھے ''تم'' کہہ کر مخاطب نہیں کیا تھا لیکن اُس کی محویت اور بے خودی کا یہ عالم تھا کہ اس وقت وہ دنیا و مافیہا سے بے خبر دکھائی دے رہی تھی۔ اُس نے میرا ہاتھ تھاما اور ہم پیپل کے پیڑ کی اوٹ میں آمنے سامنے بیٹھ گئے۔ جو لوگ زندگی میں اس صلیب عشق پر اپنا وجود وار چکے ہیں وہ ضرور جانتے ہوں گے کہ خاموشی اور تنہائی کے ایسے چند لمحے جب ہونٹ خاموش ہوتے ہیں اور صرف سانسیں بولتی ہیں۔ یہ لمحے سات جنم میں بھی صرف ایک آدھ بار ہی کسی نصیب والے کا مقدر بنتے ہیں۔ لیکن کچھ منظر ایسے ہوتے ہیں کہ ہماری رُوح اُن سے کبھی سیراب نہیں ہوتی، جن سے ہماری آنکھیں کبھی نہیں تھکتیں۔ جن کو نہارنے کے دوران ہمیں اپنی پلکیں موندھنے کا وقفہ بھی صدیوں جیسا لمبا اور اذیت ناک لگتا ہے کہ جس مقام پر پہنچ کر ہمیں دنیا میں آنے کا مقصد حاصل ہو جاتا ہے اور جس کے بعد اپنی پہلے گزری اور بعد میں بسر ہونے والی ساری زندگی صرف اور صرف وقت کا ضیاع ہی لگتی ہے۔ وہ لمحہ بھی کچھ ایسا ہی تھا۔ نہ جانے ہم دونوں کتنی دیر تک یونہی چپ چاپ بیٹھے رہے۔ مجھے یوں لگ رہا تھا کہ کچھ دیر کے لیے میرا تمام حافظہ میرے ذہن کی سلیٹ سے مٹ سا گیا ہے۔ صبح کی سپیدی پھیلنے سے کچھ دیر قبل وہ کھڑی ہو گئی۔ ''اب میں چلتی ہوں......کل پھر اسی وقت یہیں ملاقات ہو گی لیکن دھیان رہے...... میرے یہاں آنے کی خبر کسی کو نہیں ہونی چاہیے...... ورنہ میرا یہاں آنا مشکل ہو جائے گا......'' میری زبان سلب ہی رہی اور وہ دھیرے دھیرے دُھند کی چادر میں بہتی ہوئی اندھیرے کا حصہ بن گئی۔ میرا جسم تپ رہا تھا۔ میں لڑکھڑاتے ہوئے قدموں سے آ کر اپنے بستر پر گر گیا۔ اور صبح جب میں فجر کی نماز قضا ہو جانے کے باوجود سلطان بابا کے کمرے میں نہیں گیا تو روشنی ہونے کے بعد وہ میرے کمرے میں آئے اور میرا جسم چھوتے ہی انہیں میرے شدید بخار کا پتا چل گیا۔ حاجی رزاق تو بالکل ہی بوکھلا گئے اور میں نیم بے ہوشی کی حالت میں بھی اپنے ماتھے پر ٹھنڈی پٹیوں کی سرد لہر محسوس کرتا رہا جو شاید حاجی رزاق کا نوکر وقفے وقفے سے میرے ماتھے پر رکھ رہا تھا۔ عصر تک میری جان میں کچھ جان آئی۔ آنکھیں کھولیں تو سلطان بابا کو اپنے سرہانے متفکر سا بیٹھا دیکھ کر میں نے جلدی سے اُٹھنے کی کوشش کی تو انہوں نے مجھے دوبارہ لٹا دیا۔ ''لیٹے رہو میاں...... یہ بخار اچانک کہاں سے پال لیا......؟'' میں نے انہیں رات کا واقعہ بتانے کی کوشش کی لیکن میرے لفظ کھو سے گئے تھے۔ شدید تھکن اور نقاہت کے مارے میرے منہ سے صرف ''ہوں، آں'' کے علاوہ کچھ نہیں نکل پایا۔ میں نے اشارے سے انہیں بتایا کہ میں کمرے میں گھٹن محسوس کر رہا ہوں، لہٰذا مجھے باہر کھلی فضا میں لے جائیں۔ باہر شام کی ٹھنڈی ہوا نے میرے حواس کافی حد تک بحال کر دیئے۔ باہر اس وقت سب کچھ معمول کے مطابق تھا۔ ہاں البتہ ایک بات ضرور خلاف معمول تھی۔ آج رُباب بالکل پُرسکون دکھائی دے رہی تھی۔ میری کرسی دالان میں جہاں ڈالی گئی تھی وہاں سے میں عامر اور اُس کے ڈاکٹروں کی ٹیم کو اپنی پہلی کامیابی پر خوشی مناتے ہوئے بخوبی دیکھ سکتا تھا۔ عامر اپنے سسر کو یقین دلا رہا تھا۔ ''میں نے آپ سے کہا تھا نا کہ یہ خاص نفسیات کا مسئلہ ہے۔ آپ نے دیکھا، ڈاکٹر ذاکر کے کل کے پہلے ہی ڈوز نے کتنا اثر ڈالا ہے اور آج رُباب کس قدر پُرسکون ہے......؟...... آپ خواہ مخواہ

ہی وسوسوں میں پڑے ہوئے تھے، دنیا کی ایسی کوئی بیماری نہیں ہے جس کا علاج سائنس کے پاس نہ ہو۔'' حاجی رزاق کے چہرے پر بھی اطمینان کے آثار دکھائی دے رہے تھے۔ کچھ لمحوں کے لیے رُباب دالان کی طرف نکلی تو میری نظر دُور سے اُس کے شانت وجود پر پڑی۔ اچانک وہ پلٹی اور اُس کی نظر میری نظر سے ملی۔ مجھے یوں محسوس ہوا جیسے کئی گز دُور ہونے کے باوجود اُس کی وہ دو بڑی بڑی کالی اور سلگتی ہوئی سی آنکھیں بالکل میری گھائل آنکھوں کی پلک سے پلک جوڑے مجھے گھور رہی ہیں۔ وہ چند لمحے مجھے یونہی دیکھتی رہی اور پھر پلٹ کر اندر چلی گئی۔ اور میرا جسم پھر سے اُسی بے پناہ بوجھ تلے دبتا گیا لیکن میں پھر چاہ کر بھی سلطان بابا کو کچھ نہیں بتا پایا۔ وہ میری بیماری کی وجہ سے پہلے ہی کافی پریشان تھے اور میں اُن کے چہرے پر مستقل ایک بے چینی اور تفکر کا سایہ دیکھ رہا تھا۔ جب بھی میری اُن سے نظر ملتی وہ مجھے میرے چہرے پر کچھ ڈھونڈتے سے ہوئے نظر آتے۔ سچ تو یہ ہے کہ میں کچھ ہی دیر بعد اُن کی کھوجتی نظر سے کچھ خوف سا محسوس کرنے لگا تھا۔ لہٰذا مغرب کے قریب میں سرد ہوا کا بہانہ کر کے وہاں سے اندر اپنے کمرے میں اُٹھ آیا۔ میرا رُواں رُواں اس وقت آدھی رات کا وقت جلد از جلد ہونے کے انتظار میں جلا جا رہا تھا لیکن یہ ستم گر وقت تھا کہ لمحوں کو صدیوں میں تبدیل کر کے کٹتا رہا۔ اوپر سے سلطان بابا کی وہ کڑکتی نظر، جو مجھے اپنے وجود کے اندر گڑھتی ہوئی محسوس ہو رہی تھی۔ خدا خدا کر کے عشاء کی نماز کے بعد وہ اپنے کمرے میں چلے گئے اور میں نے سکون کی سانس لی لیکن وقت ٹالنے کا جان لیوا مرحلہ اب بھی ویسے ہی درپیش تھا۔ میں دھیرے سے اُٹھ کر برآمدے میں آ کر بیٹھ گیا اور اپنی نظروں میں سات جنموں کا انتظار لے کر اُس جانب دیکھنے لگا جہاں سے کل رات زہرا آئی تھی اور پھر وہی گھڑی کی ٹک ٹک اور وہی میری پلکوں کی سوئیاں...... شاید میری قضا سے کچھ لمحے پہلے وہی آہٹ اُبھری اور میں یوں لپک کر باہر نکلا کہ جیسے شدید پیاس میں دم توڑنے والے کسی زخمی کے لب پانی کے آخری بچے ہوئے قطرے کے لیے کھلتے ہیں۔ باہر وہی خوشبو پھیلی ہوئی تھی۔ میں تیز قدموں سے پیپل کے پیڑ کے عقب میں پہنچ گیا۔ کچھ ہی لمحوں میں میری ساعتوں کو نئی زندگی بخشنے والی قدموں کی وہ چاپ اُبھری جو ہمیشہ ہی میرے دل کی دھڑکنوں کو اُتھل پتھل کر دیتی تھی۔ زہرا اُسی جانب سے چلتی ہوئی آئی اور آ کر میرے مقابل کھڑی ہوگئی اور گزشتہ رات ہی کی طرح میں پھر سے وہ سارے سوال

بھول کر مبہوت سا کھڑا اُسے دیکھتا رہا۔ جتنی مرتبہ زہرا میرے سامنے آئی تھی، چاہے درگاہ میں، یا چاہے کہیں اور...... ہر بار میری یہی حالت ہوئی تھی۔ اُس کے یاقوتی لب ہلے اور میرے کان میں جیسے پھر سے وہی انجان سرگوشی سی ہوئی۔ وہ دھیرے سے مسکرائی اور بولی "یاقوط...... تم آ گئے...... کتنا انتظار کرواتے ہو......'' میں چونکا لیکن اُس کی وہ جان فزا مسکراہٹ مجھے کب کچھ سوچنے دیتی تھی۔ وہ دو قدم بڑھا کر میرے اور قریب آ گئی اور اُس کی مہکتی ہوئی سانسیں میری شہ رگ کو چھو کر میری رگ جان میں ایک نئی زندگی بھر گئیں۔ جانے لوگوں نے زندگی کو صرف سانس لینے سے کیوں متصل کر رکھا ہے۔ زندگی تو کچھ اور شے ہے۔ سانس لینے اور جینے سے بہت بڑھ کر، بہت سوا ہے، جیسے زہرا کے میرے قریب آنے کا وہ لمحہ۔ لیکن اس سے پہلے کہ میں زندگی کی وہ لہر اپنی رُوح میں سینچتا، ایک چنگھاڑتی ہوئی دھاڑ سنائی دی ''عبداللہ......'' میں گھبرا کر پلٹا اور سلطان بابا کو اپنے پیچھے غصے میں تنتناتے ہوئے آتے دیکھا۔ زہرا نے ڈر کر میرا ہاتھ پکڑ لیا اور بولی۔ ''یہ شخص ہمیں جدا کرنے آ رہا ہے یاقوط...... مجھے اس سے بچا لو...... بچا لو مجھے۔'' میں نے بھی زہرا کو بچانے کی خاطر خود کو اُس کی ڈھال بنا لیا۔ سلطان بابا کی آنکھوں سے غصے کے مارے چنگاریاں سی نکل رہی تھیں۔ وہ میرے قریب آئے اور بنا کچھ کہے اُن کا ہاتھ اُٹھا اور پوری قوت سے گھوم کر میرے چہرے پر ایک زوردار چانٹے کا نشان چھوڑ گیا۔ تھپڑ تھا، یا کوئی بجلی کا جھٹکا، ایک ہی لمحے میں میرا سر کچھ اس طرح چکرایا کہ مجھے ساری دنیا ہی گھومتی ہوئی محسوس ہوئی۔ زمین پر گرنے سے پہلے میری بند ہوتی آنکھوں نے پلٹ کر زہرا کی طرف دیکھنے کی کوشش کی لیکن وہاں رُباب کو کھڑے دیکھ کر میرے رہے سہے حواس نے بھی میرا ساتھ چھوڑ دیا اور میرا ذہن مکمل تاریکی میں ڈوب گیا۔

جب مجھے ہوش آیا تو دن کا اُجالا پھیل چکا تھا۔ میں اپنے کمرے میں اپنے بستر پر ہی موجود تھا لیکن میرا سر درد سے پھٹا جا رہا تھا۔ آنکھوں میں جیسے بیک وقت کسی نے سیکڑوں سوئیاں پرو دی تھیں۔ سلطان بابا میرے سرہانے ہی آنکھیں موندھے بیٹھے ہوئے تھے۔ آہٹ ہونے پر انہوں نے بھی آنکھیں کھول دیں۔ ''اب کیسی طبیعت ہے میاں......؟'' میں کچھ بول نہیں پایا۔ مجھے صرف اتنا ہی یاد تھا کہ رات کو میں زہرا کے قریب کھڑا تھا اور پھر بے ہوش ہو گیا تھا۔ لیکن رُباب وہاں کہاں سے آ پہنچی تھی۔ سلطان بابا نے میری آنکھوں میں اُبھرتے

سوال پڑھ لیے اور گہری سی سانس لے کر بولے۔ ''شکست انسان کا مقدر تب بنتی ہے جب وہ اپنے قلعے کی ہر درز، ہر روشن دان، ہر دروازے پر پہرے بٹھا کر مطمئن ہو کر بیٹھ جائے، بنا یہ جانے کہ وہ جن پہرے داروں کو پہرے پر چھوڑ آیا ہے دشمن انہی میں سے اپنا راستہ تلاش کرنے کی دُھن میں ہے۔ اُس نے تمہی پر کمند ڈال کر میرے قلعے میں نقب لگائی ہے میاں...... بڑی بھول ہو گئی مجھ سے...... سبھی جگہوں پر بندش لگا دی لیکن تمہیں بھلا دیا۔ سچ ہے، انسان خطا اور نسیان کا پتلا ہے......'' میں نے حیرت سے اُن کی جانب دیکھا۔ اتنے میں باہر سے رُباب کی چیخیں بلند ہونے کی آوازیں آنے لگیں اور پتا چلا کہ اُس کی حالت پھر سے بُری طرح بگڑ چکی ہے۔ سلطان بابا کی باتیں سن کر میرے تو ہوش ہی اُڑ گئے۔ انہوں نے بتایا کہ شاید جس وقت میں رُباب کی کھڑکی کے سامنے کھڑا اُسے ڈاکٹروں کے نرغے میں تڑپتا ہوا دیکھ رہا تھا اور کچھ لمحوں کے لیے میرا دل رُباب اور یاقوط کی ماورائی سی محبت کے لیے نرم پڑ رہا تھا شاید اُسی وقت اُس نادیدہ ہستی نے یہ فیصلہ کر لیا تھا کہ اُسے سلطان بابا کے آہنی حصار میں کہاں سے نقب لگانی ہے اور اُسی رات اُس نے میرے وجود پر اپنا قبضہ مضبوط کر لیا تھا۔ ساتھ ہی ساتھ رُباب جو جانے کب سے یاقوط کو کسی سانچے، کسی روپ میں دیکھنے کی خواہش میں فنا ہوئی جا رہی تھی اُسے بھی اپنے محبوب کو کسی انسانی صورت میں اپنی آنکھوں سے نہارنے کا موقع مل گیا۔ میرے حواس کو اُس زور آور ہستی نے کچھ اس طرح سے جکڑا کہ خود مجھے بھی رُباب نہیں، زہرا ہی دکھائی دی۔ بقول سلطان بابا وہ مجھے وہی کچھ دکھا رہا تھا جو میں دیکھنا چاہتا تھا۔ میرے من میں بنے عکس کو ہی اُس نے رُباب کے وجود کے آئینے سے بدل کر رُباب کو زہرا کی صورت میں مجھے دکھایا۔ جس وقت سلطان بابا میرے ساتھ ہوئی اس ''واردات'' کی خبر مجھے سنا رہے تھے اس وقت بھی میرا پورا بدن بخار سے تپ رہا تھا۔ یہ جذبے کیا اتنے طاقت ور بھی ہو سکتے ہیں کہ وہ ہمارے جسم میں، ہماری رگوں میں داخل ہو کر اور ہماری نسوں میں خون بن کر اس طرح دوڑ سکتے ہیں کہ وہ ہمارے اندر کی ساری فزیالوجی بدل سکتے ہیں؟ بظاہر اس کے علاوہ مجھے اپنے بخار کی اور کوئی وجہ سمجھ نہیں آ رہی تھی۔ میں سلطان بابا سے بھی شرمندگی سی محسوس کر رہا تھا کیوں کہ اُن کی ساری محنت صرف میرے اس کمزور وجود کی وجہ سے مٹی میں مل گئی تھی۔ دوسری طرف باہر دالان میں عامر اور باقی سارے ڈاکٹروں کی ٹیم اس

بات کی کھوج میں اپنا سر پیٹ رہی تھی کہ آخر ۲۴ گھنٹے میں ہی ایسی کیا کایا پلٹ ہو گئی کہ سب کچھ اُلٹ پلٹ ہو کر رہ گیا تھا اور رُباب ایک بار پھر سے ہتھے سے اکھڑ گئی تھی۔ جیسے جیسے شام ڈھلتی گئی میرے اندر بے چینی کی سوئیاں پیوست ہوتی گئیں اور مکمل اندھیرا ہونے تک میں خود آگ سے بنا ایک آتش فشاں بن چکا تھا۔ میرے وجود کا قابض اپنے خونخوار پنجے میری رُوح میں دھیرے دھیرے گاڑھ رہا تھا اور کرب اور بے چینی سے میں اپنا سر اِدھر اُدھر پٹخ رہا تھا۔ وہاں رُباب کی بھی یہی حالت تھی۔ سلطان بابا دو قدم میرے دروازے میں رُکتے تو اگلے ہی لمحے حاجی صاحب کے بلاوے پر انہیں اندر زنانے کی طرف دوڑ لگانا پڑتی تھی۔ مجھے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے میرے وجود کے اندر قطرہ قطرہ کر کے کوئی سیاہ سیال مادہ ٹپکایا جا رہا ہے جو میرے سرخ خون میں شامل ہو کر میرے وجود کے اندر تاریکی بھر رہا ہے۔ میری سانسیں غراہٹ میں تبدیل ہوتی جا رہی تھیں اور میرا دل چاہ رہا تھا کہ میں سب کچھ تہس نہس کر دوں۔ میری حالت دیکھتے ہوئے سلطان بابا نے نوکروں کو میرے کمرے کا دروازہ باہر سے بند کرنے کی ہدایت کر دی۔ کیوں کہ انہیں خود رُباب کی حالت کے پیش نظر زنانے کی طرف کی توجہ دینا پڑ رہی تھی۔ آخر کار آدھی رات کے ٹھیک اُس لمحے جب میں گزشتہ رات رُباب سے ملنے کے لیے دالان کی طرف گیا تھا، میری آواز بھی میرے لیے اجنبی ہو چکی تھی۔ مجھے یوں لگا کہ خود میرے اندر سے اس غراہٹ بھری آواز میں کوئی اور بول رہا ہے۔ میں زور سے چلایا۔ ''سلطان بابا......'' کچھ ہی دیر میں بابا کمرے میں داخل ہوئے تو گھبرائے ہوئے سے حاجی رزاق بھی اُن کے ساتھ ہی تھے۔ میں نے تڑپ کر اُٹھنے کی کوشش کی لیکن تب مجھے پتا چلا کہ جانے میری غنودگی کے کس لمحے میں حاجی صاحب کے نوکر سلطان بابا ہی کی ہدایت پر میرے ہاتھ میری پشت پر پلنگ کی لوہے والی جالی کے ساتھ باندھ چکے ہیں۔ میں نے زور سے خود کو جھٹکا دیا اور بولا، لیکن وہ لفظ میرے تھے اور نہ ہی وہ لہجہ......'' آپ اپنی سی ہر کوشش کر کے دیکھ چکے ہیں۔ آپ کا کیا خیال ہے کہ چند لمحوں کی یہ عارضی قید مجھے میری راہ سے ہٹا دے گی......؟ میں ہر قید توڑ کر اپنی منزل تک پہنچوں گا۔ اب یہ میرا آپ سے وعدہ ہے۔ آپ مجھے روک سکیں تو روک لیں......''

سلطان بابا غصے سے گرجے۔ ''مجھے سختی پر مجبور نہ کرو۔ اب یہ کھیل زیادہ عرصہ نہیں چلنے

دوں گا میں......" میں زور سے ہنسا۔ "اچھا......؟ تو پھر کیا کریں گے...... اپنے اس پیارے
شاگرد کو مار ڈالیں گے کیا......؟ یاد رکھیے، اب میں اس کے جسم سے کہیں نہیں جانے والا......
مجھے اس کے جسم سے نکالنے کے لیے آپ کو اپنے اس عزیز کے جسم نازک کو اتنی اذیت دینا ہو
گی کہ اس کی سانسیں ہی بند ہو جائیں۔ صرف اس کا مردہ جسم ہی میرے اخراج کا باعث بن
سکتا ہے۔ تو پھر کہیں......؟ ہے ہمت اپنے شاگرد کو قربان کرنے کی......؟" سلطان بابا نے
غصے اور بے بسی سے اپنے ہونٹ کاٹنے اور میں دیوانہ وار قہقہے لگاتے لگاتے درد اور بے چینی
سے بے سدھ ہوتا چلا گیا۔ جانے یہ نیند بھی کیسی راحت لکھی ہے قدرت نے ہمارے نصیب
میں۔ درد چاہے کتنا ہی شدید اور مار دینے والا کیوں نہ ہو، یہ ایک مہربان ماں کی طرح اپنی گود
میں تھپک تھپک کر ہمیں سلا ہی دیتی ہے اور کچھ وقت کے لیے ہی سہی لیکن ہم اپنا ہر غم، ہر دکھ،
درد بھلا کر کسی معصوم بچے کی طرح اس بے رحم دنیا کی گھاتوں سے پیچھا چھڑانے میں کامیاب
ہو جاتے ہیں۔ کاش ہم ساری زندگی ہی یونہی سو کر گزار سکتے تو اپنے دامن پر لگے اُن گنت
داغوں کی کالک سے تو بچ جاتے۔ لیکن افسوس ہر اچھی چیز کی طرح یہ کم بخت نیند بھی ہم سے
دامن چھڑا ہی لیتی ہے۔ سو مجھ سے بھی وہ بے وفا اپنی آنکھیں چرا گئی اور میری آنکھ کھلی تو
کمزوری اور نقاہت سے میری پلکیں اُٹھنا بھی میرے لیے دوبھر ہو چکا تھا۔ میرے قریب ہی
وہ بزرگ پریشان، میرے ہمدم، سلطان بابا چپ چاپ سے بیٹھے ہوئے تھے۔ مجھے اپنی
کلائیوں میں جلن اور سوزش کا احساس ہوا۔ میں نے دیکھا تو کٹنے جیسے گہرے سرخ نشان
پڑے ہوئے تھے جن میں سے ہلکا ہلکا سا خون رس رہا تھا۔ سلطان بابا نے میرے ہاتھ تھام
لیے۔ "مجھے معاف کر دو ساحر میاں۔ کل رات تمہاری حالت کے پیش نظر میں نے ہی تمہیں
باندھنے کا حکم دیا تھا اُن لوگوں کو۔" میں نے تڑپ کر اُن کے مہربان ہاتھ سختی سے جکڑ لیے۔
"یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں۔ میرا یہ بوسیدہ جسم اگر آپ کی راہ کی رکاوٹ بن رہا ہے تو آپ کو
حق حاصل ہے کہ آپ اسے جلا کر ہمیشہ کے لیے فنا کر دیں...... لیکن پھر کبھی ایسی بات منہ سے
نہ نکالیے گا۔" اُن کی آنکھیں شاید زندگی میں پہلی مرتبہ میں نے بھیگی ہوئی دیکھیں۔ انہوں نے
مجھے بتایا کہ اندھیرا ہونے کے ساتھ ہی میرے وجود پر اُس عفریت کا سایہ قابض ہو جاتا ہے۔
مطلب یہ کہ فجر سے لے کر مغرب سے کچھ پہلے تک میں اپنے آپے میں رہتا تھا اور پھر میرا یہ
جسم میرے لیے پرایا ہو جاتا تھا۔ میرے ذہن میں سوال اُبھرا "تو پھر اس وقت میں خود کہاں

ہوتا ہوں؟ کیا خود اپنے ہی ذہن کے کسی پوشیدہ اور خوابیدہ گوشے میں میرا شعور جا چھپتا ہے
اور میں خود بھی خواب کی کیفیت میں چلا جاتا ہوں؟" مجھے خود سے زیادہ سلطان بابا کی فکر تھی۔
وہ تو رُباب کو اس سائے سے بچانے کے لیے آئے تھے اور یہاں خود اُن کا اپنا شاگرد بھی اُن
کے لیے عذاب بنتا جا رہا تھا۔ مجھے خود پر شدید غصہ آ رہا تھا اور میرا بس نہیں چل رہا تھا کہ میں
خود کو کس طرح سے اُن کی راہ کا پتھر بننے سے روکوں۔ میں جانتا تھا کہ وہ میرے اس وجود کی
وجہ سے ہی یاقوط سے شکست کھا رہے تھے کیونکہ میرا جسم اُن کی راہ میں حائل تھا۔ وہ مجھے
اذیت نہیں دینا چاہتے تھے ورنہ اب تک جانے وہ کیا کچھ کر گزرے ہوتے۔ اور یاقوط کو
میرے جسم سے نکالنے کا واحد ذریعہ اب شدید اذیت ہی رہ گیا تھا۔ لیکن میں انہیں اس طرح
ہارتے ہوئے نہیں دیکھ سکتا تھا۔ میں نے اُن کی ہتھیلیاں اپنی آنکھوں سے مس کیں۔ "میری
ایک بات مانیں گے بابا......" انہوں نے سوالیہ نظر سے میری جانب دیکھا۔ میں نے اُن کی
بھیگی پلکوں پر ٹھہرے موتیوں کو دیکھا۔ "آپ مجھے مار ڈالیں۔ ختم کر دیں مجھے...... اگر یہی
ایک ذریعہ ہے اُسے میری رُوح کے اندر سے نچوڑنے کا۔ تو آج میں اِسی وقت آپ کو اپنا
خون معاف کرتا ہوں لیکن دیر نہ کریں۔ آپ کا مقصد نیک ہے اور بلا جھجک اپنا فرض ادا
کریں۔" انہوں نے میرا سر اپنے کاندھے سے لگا لیا۔ "میں جانتا ہوں...... تم میرے لیے کسی
حد تک بھی جا سکتے ہو لیکن بات صرف فتح اور شکست کی نہیں ہے۔ کچھ جنگیں صرف فتح پانے
کی غرض سے نہیں لڑی جاتیں۔ اوروں کا بھی بہت کچھ لگا ہوا ہے اس داؤ پر۔ بس اتنا یاد رہے
کہ ابھی ہم دونوں کو بہت اذیت جھیلنی ہے لیکن ہم آخری سانس تک مقابلہ کریں گے......" وہ
میرا سر تھپکتے رہے اور میرے بے بس آنسو اُن کے شانے کو بھگوتے رہے۔ میں نے فیصلہ کر لیا
تھا کہ میں خود اپنے ہاتھوں اپنی سانسیں روکنے کا کوئی بندوبست کر لوں گا لیکن اب انہیں مزید
پریشان نہیں کروں گا۔ مجھے رُباب کا خیال آیا اور میرے من میں عجیب سی سوچ آئی۔

تم ہو اوروں کی محفل میں مصروف
یہاں میں ہوں اور عالم تنہائی
اب لوگ مجھے تیرے نام سے جانتے ہیں
جانے یہ میری شہرت ہے یا رُسوائی؟

وقت ڈھلتا رہا اور پھر سے وہی قاتل رات میرے سامنے اپنے خون آشام جبڑے کھولے آ کھڑی ہوئی۔ میری رگوں میں وہی بے رحم، سفاک اور جلا دینے والی آگ، انگارے بھرتی گئی۔ میری سانس بھرتی گئی اور کچھ ہی دیر میں میری نس نس سے چنگاریاں سی نکلنے لگیں۔ آج میرے جنون کا یہ عالم تھا کہ بان کی بنی ہوئی وہ موٹی رسی بھی میری راہ کی رکاوٹ بننے میں ناکام ہو رہی تھی لہٰذا ایک نوکر کہیں سے ایک موٹی سی فولادی زنجیر اُٹھا لایا اور آٹھ دس بندوں نے مجھے جکڑ کر میرے پیروں میں اُس زنجیر کی بیڑی ڈال دی۔ جنوں، قفس اور آہنی بیڑیاں...... یہ تو اس بے رحم قدرت کا پسندیدہ کھیل تھا جو وہ ازل سے ہم بے بس اور لاچار انسانوں کے ساتھ کھیلتی آ رہی تھی اور شاید ابد تک یہ بے رحم تماشا جاری رہنے والا تھا۔ میری حالت دیکھ کر خود حاجی رزاق بھی رو پڑے اور انہوں نے کسی کے ذریعے عامر کو خبر کروا دی کہ وہ بھی آ کر میری دیوانگی کا یہ نظارہ دیکھ لے اور اگر اُس کی سائنس میں اس جنوں کی بھی کوئی توضیح موجود تھی تو وہ بھی بیان کر جائے۔ لیکن ناصح بھلا کیا جانے کہ زخم کے بھرنے سے پہلے ہی ہم جیسے دیوانوں کے ناخن ہمیشہ بڑھ آتے ہیں۔ عامر نے میری حالت دیکھی تو اُسے بھی ایک چپ سی لگ گئی۔ سلطان بابا میرے قریب ہی بیٹھے بار بار کچھ پڑھ کر مجھ پر پھونک رہے تھے۔ اُن کی ہر پھونک سے چند لمحوں کے لیے میرے جلتے ہوئے وجود پر ایک ٹھنڈی پھوار سی تو ضرور پڑ جاتی تھی لیکن اگلے ہی لمحے وہ رُوح کے ریشے تک جلا دینے والی تپش پھر سے میرے جسم کو گھیر لیتی تھی۔ میرے اندر کی بے چینی مستقل مجھے رُباب کے کمرے کی جانب کھینچ رہی تھی۔ میرے اندر سے طاقت کا ایک لاوا سا اُبلنے کے لیے جیسے اپنا پورا زور لگا رہا تھا لیکن میرے اپنے جسم کی لاچاری، کمزوری اور بوسیدگی اس طاقت کا ٹھیک استعمال نہیں کر پا رہی تھی۔ ورنہ میں کب کا اس زنجیر کے ٹکڑے کر کے وہاں سے نکل چکا ہوتا۔ عامر حیرت کے عالم میں گنگ کھڑا یہ سب کچھ دیکھ رہا تھا۔ سلطان بابا کی بھیگی آنکھیں دیکھ کر وہ بھی بے چین سا ہو گیا۔ ”آپ اِسے کھول دیں ورنہ یہ خود کو کوئی نقصان پہنچا کر ہی دم لے گا۔“ سلطان بابا نے غور سے عامر کی جانب دیکھا۔ ”عبداللہ کا انسانی جسم یہ عذاب زیادہ دیر تک جھیل نہیں پائے گا۔ کیونکہ ہمارے اس فانی جسم کے برداشت کی اپنی کچھ حدیں ہیں۔ اور چونکہ اس وقت وہ عبداللہ کے جسم کی حدوں کا محتاج ہے اس لیے وہ کوشش کر رہا ہے کہ کسی طرح اِسی جسم کی آڑ

ں رُباب تک پہنچ سکے۔ لیکن اگر اس نے زیادہ زور لگایا تو لوہے کی یہ بیڑیاں عبداللہ کے جسم ے ریشوں میں سے گزر کر اس کی ہڈیوں کو چیر کر رکھ دیں گی۔ مگر تم فکر نہ کرو...... جب تک برے اس پیارے کے جسم میں زندگی کی ایک بھی رمق باقی ہے میں تمہاری منگیتر تک اسے ہیں پہنچنے دوں گا۔ تم بس اپنے رشتے کو کمزور نہ پڑنے دینا......“ عامر نے زور سے سر ہلایا۔ ”مجھے یقین نہیں آ رہا...... لیکن...... لیکن یہ بھی تو پاگل پن ہے...... نہیں...... میں ایسا نہیں نے دوں گا۔“ عامر کو یکایک نہ جانے کیا ہوا وہ بھاگتا ہوا مہمان خانے سے نکل گیا اور کچھ دیر عد ہی میری جلتی ہوئی رُوح پر کسی نے جیسے ٹھنڈے پانی کی آبشار بہا دی۔ عامر رُباب کا ہاتھ پڑے ہوئے مہمان خانے میں داخل ہوا۔ رُباب کے بال بکھرے ہوئے تھے اور وہ نہایت زد اور کمزور لگ رہی تھی۔ اُس نے رُباب کو ایک زور کا جھٹکا دیا اور وہ میرے قدموں کے ریب ہی ڈھے گئی۔ عامر زور سے چلایا۔ ”یہ لو...... میں نے تمہاری خواہش پوری کر دی ہے۔ ب خدا کے لیے ہمیں بخش دو۔ اگر اس معصوم لڑکی کی جان لینے سے ہی تمہاری تشفی ہو سکتی ہے آج یہ قصہ ہی ختم کر دو۔ مار ڈالو اسے اور یہ کھیل ہمیشہ کے لیے ختم کر دو۔“ رُباب کے پیچھے اُس کی ماں اور بہن بھی دوڑتی ہوئی چلی آئی تھیں اور اس وقت حاجی رزاق سمیت وہ سب سادھے یہ سب کچھ دیکھ رہے تھے۔ اُن کے سامنے سائنس کی طاقت کو حتمی علاج ماننے لے ایک انسان کے عقیدے نے اپنا کانچ کا بھرم توڑ ڈالا تھا۔ جیسے ہی میری رُباب پر نظر ی میری ساری بے چینی، ساری تپش، ساری آگ پل بھر میں سرد ہو گئی تھی۔ وہ بھی بنا پلک کائے میری جانب دیکھتی رہی۔ میرے لب ہلے۔ میں نے سلطان بابا کی جانب نظر ائی۔ ”انسانوں کی سنگ دلی کے قصے تو بہت سنے تھے۔ اُن کی بے رحمی اور مکاری کے انے بھی عام ہیں لیکن آج دیکھ بھی لیا۔ میں نے پہلے بھی کہا تھا کہ میری محبت جسم کی حدوں ، بہت آگے کی ہے۔ یہ رُوح سے رُوح کا مقدمہ ہے۔ لیکن آپ نے اپنے علم کی دھاک انے کے لیے خود اپنے عزیز شاگرد کو بھی داؤ پر لگانے سے گریز نہیں کیا۔ آپ جانتے ہیں کہ کا یہ نازک اور کمزور انسانی جسم زیادہ عرصے تک میرا وجود نہیں جھیل پائے گا لیکن پھر بھی پ اپنی ضد سے باز نہیں آئے۔ اب بھی وقت ہے مجھے آزاد کر دیں۔ میں آپ سے وعدہ تا ہوں کہ میں کسی کو کوئی نقصان نہیں پہنچاؤں گا۔ میری محبت میں خیر ہے...... اسے شر میں

بدلنے کی کوشش نہ کریں...... اب تو اس کا سب سے بڑا دعوئ دار بھی اس کے حق سے دستبردار ہو گیا ہے......"

سلطان بابا کچھ دیر تک چپ چاپ بیٹھے میری جانب دیکھتے رہے پھر جیسے کسی حتمی نتیجے پر پہنچ کر انہوں نے اپنا سر اُٹھایا۔

"ٹھیک ہے...... میں اس لڑکی کی رُوح پر ہمیشہ کے لیے تمہارا تسلط برداشت کرنے کے لیے تیار ہوں...... میں، یا کوئی بھی اور، کبھی بھی تمہارے راستے کی رکاوٹ نہیں بنے گا لیکن میری بھی ایک شرط ہے......"

ہم سب نے ہی چونک کر سلطان بابا کی جانب دیکھا۔ حاجی رزاق اور اُن کے پورے خاندان کا عامر سمیت پریشانی کے مارے رنگ ہی اُڑ گیا۔ حاجی صاحب ہکلائے۔

"یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں قبلہ...... اس طرح تو......"

سلطان بابا نے ہاتھ اُٹھا کر حاجی رزاق کو روک دیا اور میری جانب متوجہ ہوئے۔

"ہاں...... تو بولو...... منظور ہے یہ سودا......؟"

ابھی کچھ دیر باقی ھے

سلطان بابا نے ایک بار پھر اپنی بات دہرائی "بولو...... ہمت ہے ایک انسان کی کسوٹی پر پورا اُترنے کی۔ ابھی کچھ دیر پہلے تم نے ہم انسانوں کی مکاری اور ہمارے ظالم اور جابر ہونے کے بارے میں کہا تھا، لیکن اب ان میں سے ہی ایک انسان تم سے تمہارا وعدہ مانگ رہا ہے۔ شرط صرف اتنی سی ہے کہ تم جیتے تو رُباب تمہاری اور اگر میں جیتا تو تمہیں یہ بسیرا ہمیشہ کے لیے چھوڑ کر جانا ہوگا۔ اور یاد رہے، میرے اور تمہارے درمیان ضامن صرف وہی ہوگا جو ہم دونوں کا پروردگار ہے...... یعنی میرا اور تمہارا اللہ......"

کچھ دیر تک کمرے میں گھمبیر سی خاموشی طاری رہی۔ پھر میرے لب ہلے۔ "ٹھیک ہے مجھے آپ کی شرط منظور ہے...... بتائیے مجھے کیا کرنا ہوگا۔"

سلطان بابا نے ایک لمبی سی سانس لی۔ "تم اس لڑکی سے محبت کا دعوئ کرتے ہو اور تمہارے بقول یہ خود بھی تمہاری محبت میں شدید طور سے مبتلا ہے۔ تمہیں یہی بات ہم سب پر ثابت کرنا ہوگی۔ اگر میری بات سچ نکلی اور یہ تمہارے سحر کے زیرِ اثر ہوئی تو تمہارا دعوئ خود بخود غلط ثابت ہو جائے گا۔ تمہیں ایک بار اُسے مکمل آزاد کر کے کسی بھی روپ میں اُس کے سامنے آنا ہوگا۔ اگر رُباب یاقوط کے عشق میں مبتلا ہوئی تو اُسے تمہیں قبول کرنے میں کوئی ہچکچاہٹ نہیں ہونی چاہیے۔ لیکن یاد رہے، اُس وقت اُس کے ذہن اور دل پر تمہارا کوئی اثر نہیں ہونا چاہیے۔ بولو...... منظور ہے یہ کسوٹی......"

میں نے اُلجھن آمیز انداز میں سر پٹخا۔ "لیکن یہ کیسے ہو سکتا ہے؟ آپ جانتے ہیں میں اپنی ظاہری شکل وصورت میں اس کے سامنے نہیں آ سکتا۔ یہ ڈر جائے گی۔ اور پھر آپ لوگ میری بات کیوں نہیں سمجھ لیتے کہ یہ صرف رُوح سے رُوح کے تعلق کا معاملہ ہے۔ میری رُوح کے دھاگے اس کی رُوح کی ڈور سے اُلجھے ہوئے ہیں۔ آپ ہماری محبت کو جسم اور ظاہری شکل وصورت کی بندشوں میں قید کیوں کرنا چاہتے ہیں؟" سلطان بابا بولے "میں نے اِسی لیے پہلے

ہی کہہ دیا تھا کہ تم جس صورت میں بھی چاہو، اس کے سامنے آ سکتے ہو۔ مجھے اس سے کیا غرض نہیں ہے۔ تم حسین سے حسین تر روپ دھار سکتے ہو۔ تمہارا دعویٰ تو رُوح سے رُوح کے ملاپ اور رشتے کا ہی ہے نا...... تو پھر اِس کی رُوح تمہاری رُوح کو پہچاننے میں کوئی غلطی نہیں کرے گی۔ اور اگر تب بھی رُباب کے من نے تمہیں پہچان کر قبول کر لیا تو ہمیں بھی کوئی اعتراض نہیں ہوگا۔ بات اس بار یہاں بھی چہرے اور جسم کی شناخت کی نہیں ہے...... دل سے دل کے رشتے کی پہچان کی ہے...... اگر تمہاری محبت سچی ہے اور تمہارا دعویٰ اٹل ہے تو پھر اسے اپنے تسلط سے آزاد کرنے میں خوف کیسا......؟ ...... ایک بار تم نے اِسے اپنی جانب خود کھینچا تھا، اب ایک بار خود اِسے اپنی جانب بڑھنے دو...... ورنہ یہ مان لو کہ تم تسلط کے ذریعے اس کی محبت کو پانا چاہتے ہو......"

کمرے میں ایسی خاموشی چھائی ہوئی تھی کہ ہمیں اپنے مساموں سے پھوٹ کر جسم پر بہنے والے پسینے کی آہٹ بھی محسوس ہو رہی تھی۔ کچھ دیر تک میرے اندر چپ کا سناٹا رہا۔ پھر جیسے میں نے خود بھی اپنے اندر ہتھیار ڈالنے کی جھنکار سی سنی اور میرے لب ہلے۔ "ٹھیک ہے...... یہی آپ کی ضد ہے تو مجھے آپ کی یہ شرط بھی منظور ہے۔ میں یہیں اس گھر میں رُباب سے ملاقات کروں گا۔ مجھے اُمید ہے اس کے بعد آپ سب اپنے وعدوں کی پاسداری کریں گے...... بس مجھے دو دن کی مہلت دے دیں...... میں نہیں چاہتا کہ رُباب اس نڈھال اور مضمحل حالت میں مجھ سے ملے...... یہ اڑتالیس گھنٹے میں اِسی کی خاطر مانگ رہا ہوں۔ لیکن آپ کو بھی مجھ سے یہ وعدہ کرنا ہوگا کہ ان دو دنوں میں کوئی بھی رُبابؔ کے کسی بھی فیصلے یا طریقے پر کسی بھی طرح اثر انداز نہیں ہوگا۔ کوئی رشتہ بھی اس کی آزادی میں مخل نہیں ہوگا۔" غالباً یہ اشارہ عامر کی جانب تھا، یا پھر ایک ہاری ہوئی ماں سے کوئی خطرہ محسوس کر کے یہ ذیلی شرط لگائی گئی تھی؟ بہرحال سلطان بابا نے ایک لمبا سا ہنکارا بھرا "ہوں...... بے فکر رہو...... رُباب پر کسی بھی طرف سے اور کسی بھی رشتے کا کوئی دباؤ نہیں ہوگا۔ یہ سلطان کا تم سے وعدہ ہے۔" اس کے بعد کمرے میں خاموشی چھا گئی اور پھر میری آنکھ دوسرے روز دن چڑھے کھل پائی۔ میری زنجیر کھولی جا چکی تھی۔ لیکن سلطان بابا کے چہرے پر ابھی تک تفکر کی پرچھائیاں واضح تھیں۔ مجھے اُٹھتے دیکھ کر انہوں نے پوچھا "اب کیسی طبیعت ہے میاں......؟

دیر اور آرام کر لیتے تو بہتر ہوتا۔" میں نے انہیں بتایا کہ مجھے سوائے نقاہت کے اور کوئی تکلیف نہیں ہے۔ ایک عجیب بات یہ تھی کہ حالانکہ یاقوط کے لفظ میری زبان سے ادا ہوتے تھے اور اسی کی بولی میری باتوں کے ذریعے باقی سب تک پہنچتی تھی لیکن خود مجھے یوں محسوس ہوتا تھا کہ صبح اُٹھتے ہی میرے حافظے کی سلیٹ بالکل صاف ہو جاتی ہے اور مجھے کچھ یاد نہیں رہتا تھا کہ میں نے رات کو کیا پیغام پہنچایا تھا۔ لہٰذا مجھے ایک بار پھر سے سلطان بابا سے کرید کرید کر ہر بات پوچھنا پڑتی تھی۔ میں نے پوری بات سن کر حیرت سے سلطان بابا کی جانب دیکھا۔ "لیکن آپ اُس کی بات پر اس قدر اعتبار کیوں کر رہے ہیں؟ اگر یہ جنون ہے تو جنون کسی اُصول کو بھی نہیں مانتا۔ جنوں تو نام ہی اُصولوں سے ہٹ جانے کا ہے......" سلطان بابا نے چونک کر میری جانب دیکھا۔ "واہ میاں...... بڑی بات کہہ دی آج تم نے۔ واقعی...... جنوں کو کسی اُصول، کسی شرط، کسی وعدے کا پابند نہیں کیا جا سکتا...... لیکن ہمارے پاس اور کوئی چارہ بھی تو نہیں ہے...... مجھے اُس کی شرط مان کر اُس پر سے اپنا پہرہ آج شام سے پہلے اُٹھانا ہی ہوگا اور بدلے میں اُس کے وعدے پر اعتبار کرنا ہی ہوگا کہ وہ وقتی طور پر رُباب کو اپنے سحر سے آزاد کر دے گا۔ ہمیں یہ جوا کھیلنا ہی ہوگا۔" میں نے سلطان بابا کے چہرے پر کسی اَن جانے خطرے کے آثار اُن کے لاکھ چھپانے کے باوجود بھی محسوس کر لیے اور اُسی لمحے میں نے اپنے دل میں پکا عہد کر لیا تھا کہ اگر اس مرتبہ یاقوط نے میرے جسم کے ذریعے انہیں ہرانے کی کوشش کی تو میں خود اُسی لمحے اپنی جان لے لوں گا۔ لیکن کیسے......؟ ...... بس یہی طے کرنا باقی رہ گیا تھا۔

اُس روز نرم دھوپ تلے کرسی ڈالے میں بہت دیر تک اپنی درگاہ میں آنے کے بعد سے لے کر آج تک کی زندگی پر غور کرتا رہا۔ مجھے اس متوازی دنیا کے دروازے پر ہی بتا دیا گیا تھا کہ اس کے اسرار اور رُموز ہر ذی رُوح کا مقدر نہیں بنتے۔ آج مجھے اس رازداری کی وجہ بھی سمجھ میں آ گئی تھی۔ یہ اسرار کبھی کبھی اتنے ہی جان لیوا بھی ثابت ہو سکتے تھے اور انسان کو ایسی جاں کنی کی حالت تک بھی پہنچا سکتے تھے جس سے میں خود اس وقت دوچار تھا۔ کچھ دیر بعد عامر کے کینیڈین ڈاکٹروں کی وہی ٹیم بھی وارد ہو گئی جس میں ایک مشہور ماہر نفسیات بھی شامل تھا۔ وہ دالان میں بیٹھے عامر کو یہ بات سمجھانے کی کوشش کرنے لگے کہ یہ صرف میٹافزکس

(Metaphysics) کے کھیل ہیں۔ انہی میں سے پھر کسی نے اُسی ڈائی پولر تھیوری آف گریوی ٹیشن (Dipolar Theory of Gravitation) کا بھی ذکر کیا۔ عامر اُن سب کے سوالوں اور بحث کے جواب میں انہیں لے کر میری طرف آ گیا اور میری طرف اشارہ کر کے بولا۔ ''میں اب بھی میٹا فزکس کے کرشموں پر یقین رکھتا ہوں۔ اور سائنس کی ہر تھیوری آج بھی اُسی طرح مجھ پر واضح ہے۔ سائیکالوجی اور پیراسائیکالوجی کے تماشے بھی اپنی جگہ موجود ہیں اور اُن پر میرا اعتقاد بھی...... لیکن کل رات جو میری نظروں کے سامنے وقوع پذیر ہوا ہے میں اُسے کیسے جھٹلا دوں۔ رُباب کے چہرے پر آج صبح سے چھائی ہوئی سرخی اور اُس کی برسوں پرانی وہ مسکان بھی میرے سامنے سوالیہ نشان بنی کھڑی ہے...... آج اُس کے جسم میں پھر سے بہتے خون کی حرارت محسوس کی ہے میں نے...... اور یہ جو لڑکا آپ کے سامنے اس وقت خاموش بیٹھا ہے، کل رات میں نے اس کے اندر خود وہ عفریت بھرا ہوا دیکھا ہے جو سب کچھ ختم کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ اب آپ ہی بتائیں کہ میں سائنس پر یقین کروں، یا اپنی آنکھوں پر......؟ کیا اب آپ لوگ یہ کہیں گے کہ یہ پورا گھر ہی کسی خواب کا حصہ ہے......؟ کوئی تہ در تہ خوابی بھول بھلیاں اسے گھیرے ہوئے ہے؟ یا پھر اس وقت بھی ہم کسی خواب کی کیفیت میں ہیں؟ ڈاکٹر لاجواب ہو کر ایک دوسرے کی جانب دیکھنے لگے۔ پھر ماہر نفسیات نے میری جانب قدم بڑھائے۔ ''کیا میں تم سے کچھ پوچھ سکتا ہوں؟ کیا تم میری بات سمجھ رہے ہو۔ میرا مطلب ہے تم اپنی کل رات کی کیفیت کو بیان کر سکتے ہو؟ کیا تمہارے ساتھ ایسا پہلے بھی کبھی ہوا ہے؟ کیا تمہیں بچپن میں بہت سخت مذہبی سختیوں کا سامنا کرنا پڑا تھا......؟ کیا تمہیں رُباب میں کوئی ذاتی دل چسپی محسوس ہوئی ہے کبھی......'' تو گویا وہ حضرت اب بھی اسے انسانی ذہن کا کوئی شعبدہ سمجھ رہے تھے۔ میرے ظاہری حلیے کی وجہ سے وہ مجھے کوئی مذہب سے متاثرہ اَن پڑھ سمجھ بیٹھے تھے اور اُن کا گمان یہ تھا کہ میں رُباب کے ظاہری حسن سے متاثر ہو کر یہ سارا اسٹیج تیار کر رہا تھا تا کہ آخر کار اُسے پا سکوں۔ چند لمحے کے لیے تو میرا ذہن غصے سے اُبل سا ہی گیا۔ پھر مجھے اُن کے انداز پر ہنسی آ گئی۔ ''کیوں جناب! کیا آپ کی میٹا فزکس کی ابتدا ہی مذہب پر شک کرنے سے ہوتی ہے......؟ مذہب نے تو کبھی بھی آپ کی فزکس، میٹا فزکس، سائیکالوجی، پیراسائیکلوجی، یا کسی بھی قسم کی سائنس پر کوئی

اعتراض نہیں کیا...... تو پھر آپ کا یہ شکوہ کچھ بے جا معلوم ہوتا ہے۔'' میرا تفصیلی جواب سن کر ماہر سمیت اُن سب کے چہرے حیرت کا اشتہار بن گئے۔

پھر عامر کے منہ سے صرف اتنا نکلا ''کیا......؟...... کیا تم پڑھے لکھے ہو......؟'' مجھے یاد آیا کبھی یہی سوال میں نے عبداللہ سے بھی کیا تھا۔ میرا جواب بھی وہی تھا جو عبداللہ نے مجھے دیا تھا۔ ''ہاں...... یہاں آنے سے پہلے کچھ صفحے کالے کیے تھے، لیکن سب بے فائدہ ہی رہا......'' اب ان کی ساری توجہ میری جانب مبذول ہو چکی تھی۔ بڑے ڈاکٹر نے مجھ سے پوچھا ''ابھی کچھ دیر پہلے تم میٹا فزکس کے بارے میں بات کر رہے تھے۔ کیا تم نے سائنس پڑھی ہے؟'' ''پڑھی ہے لیکن اتنی ہی جتنا ایک طالب علم انٹر کے امتحان تک پڑھتا ہے۔ اس کے بعد تو بس کالج اور یونیورسٹی میں صرف وقت ہی ضائع کیا۔ لیکن یہاں معاملہ بہت سیدھا سادہ ہے۔ ہم نہ جانے ہمیشہ سائنس اور مذہب کو ایک دوسرے کے مدّ مقابل لا کر کیوں کھڑا کر دیتے ہیں؟ مذہب اس لیے تو وارد نہیں ہوا تھا کہ وہ سائنس کو رد کرے...... مذہب تو خود علم کے راستوں پر چلنے کی تلقین کرتا ہے اور سائنس بھی تو ایک علم ہے...... اور کیا ضروری ہے کہ سائنس مذہب کی ہر بات کی تصدیق کرے؟ یاد رکھیے مذہب سائنس سے بہت پہلے آیا تھا، لیکن مذہب نے کبھی سائنس کا راستہ روکنے کی کوشش نہیں کی تو پھر آپ سائنس کو کیوں مذہب کے راستے کی دیوار بنانا چاہتے ہیں؟ اور بھلا یہ کیا فارمولا ہوا کہ سائنس مذہب کی جس پیشین گوئی کو ثابت کر دے وہ تو سچ اور باقی سب غلط...... یہ کہاں کا انصاف ہے؟ کیا سائنس کی بھی اپنی کچھ حدیں نہیں ہیں؟ تو پھر ہر سوال کے جواب کی توقع صرف سائنس کے علم سے ہی کرنا سراسر نادانی نہیں ہے، کیونکہ سائنس بھی تو صرف ایک علم ہی ہے...... ان ہزاروں دیگر علوم کی طرح جو انسان ازل سے کھوج رہا ہے۔ تو پھر صرف سائنس کے علم کے فارمولے پر ساری کائنات کو پرکھنا کہاں کی عقل مندی ہے......؟'' میں شاید جذبات کی رو میں کچھ زیادہ ہی بول گیا اور میری آواز بھی معمول سے کچھ زیادہ بلند ہو گئی تھی لہٰذا مجھے معذرت کر کے اپنی بات ختم کرنا پڑی۔ لیکن عامر سے رہا نہ گیا۔ ''نہیں...... شاید تم ٹھیک کہہ رہے ہو لیکن ہم نے کبھی اس نظریے سے سوچا ہی نہیں...... اور پھر ذہن بھلا کہاں تسلیم کرتا ہے ایسی توجیہات...... جو چیز عقل میں نہ سمائے اور آنکھ اُسے دیکھ بھی نہ سکے اس پر یقین ذرا مشکل سے ہی آتا ہے اور پھر تم تو باقاعدہ

ایک پوری متوازی دنیا کی بات کر رہے ہو، اسے ہضم کرنا تو ہم جیسوں کے لیے واقعی بڑا مشکل ہے۔'' میں نے ان چاروں کی جانب غور سے دیکھا۔

''ٹھیک ہے تو پھر آپ سائنس سے کہیں کہ رُوح کی توجیہہ بیان کر دے...... ہمارے اندر ایسی کیا چیز پائی جاتی ہے جو نہ ہمیں نظر آتی ہے نہ ہی عقل کی حد اُسے چھو سکتی ہے لیکن اُس کے نکل جانے سے ایک پل میں ہم بے جان مٹی کے پتلے کی طرح ڈھے جاتے ہیں۔ وہ جب تک ہمارے جسم کے اندر رہتی ہے، رگوں میں خون کو رواں رکھتی ہے اور جسم چھوڑ جائے تو ہر عضو اپنے آپ مر جاتا ہے۔ کیوں......؟ کیا آپ نے اس رُوح کو کبھی دیکھا ہے......؟ سائنس سے کہیے کہ وہ رُوح کو ثابت کر دے، یا پھر اس کی نفی ہی کر دے...... اور رُوح کی حقیقت تو میں نے بہت بڑی مثال دے دی ہے...... آپ صرف سائنسی طور پر مجھے اس بات کی وضاحت ہی کہیں سے لا دیں کہ ہم مسلمان اگر مردے کو دفناتے وقت زمین سے یہ کہہ دیں کہ یہ جسم امانتاً دفن کیا جا رہا ہے تو سالوں بعد بھی اس میت کی منتقلی کے وقت جب زمین کھودی جاتی ہے تو وہ مرا ہوا جسم تازہ کیوں ہوتا ہے......؟ جب کہ سائنس کے اُصولوں کے مطابق تو اس جسم کو گل سڑ جانا چاہیے۔ وہ کون سی چیز ہے جو زمین کو اُسے کھانے سے روکتی ہے......؟ جواب دیں...... یہ تو بہت عام اور روزمرہ کی بات ہے۔'' وہ چاروں لاجواب ہو کر ایک دوسرے کو دیکھنے لگے۔ میں نے بات جاری رکھی۔ ''میرا مقصد آپ لوگوں کو لاجواب کرنا نہیں ہے، لیکن یہ سب باتیں یہ ظاہر کرتی ہیں کہ اس دنیا سے پرے بھی کچھ دنیائیں موجود ہیں۔ ہم ایلینز (Aliens) کے وجود کو تو اُڑن طشتریوں کے ذریعے ثابت کرتے اور مانتے ہیں لیکن جنات کی ہمارے آس پاس موجودگی سے انکاری رہتے ہیں۔ فون، یا ایس ایم ایس کے ذریعے ایک پل میں دنیا کے دوسرے کونے تک پیغام پہنچانے کے کمال کے تو معترف ہیں، لیکن ایک ماں کے دل سے نکلی ایک پکار پر ہزاروں میل دُور بیٹھے اُس کے بچے کے دل کی اچانک تیز دھڑکن کے جواز ڈھونڈتے رہتے ہیں۔ چھوٹی سی ٹی وی اسکرین پر لہروں کے ذریعے پہنچی زندہ تصویروں، یا لائیو ٹیلی کاسٹ پر تو یقین کرتے ہیں لیکن بند آنکھوں اور من کے اندر لگی اسکرین جو دل سے دل کے تار جڑنے پر روشن ہوتی ہے اُسے کبھی قابل بھروسا نہیں سمجھتے۔ ٹیلی پیتھی کے ذریعے دوسروں کے دل کا حال جاننے کو معتبر جانتے ہیں لیکن جب کوئی

ب کے ذریعے حالِ دل بیان کرنے لگے تو اُسے دھتکار دیتے ہیں۔ ہاتھ سے نکلتی لہروں
ری کے علاج کے لیے تو گھنٹوں قطار میں بیٹھ کر انتظار کر لیتے ہیں لیکن دوسری جانب اگر
ئی ہاتھ تھام کر اُس پر دم کر کے پھونک دے تو ہم شک میں پڑ جاتے ہیں۔ مریخ پر زندگی
ہم اس کی کھوج میں تو دن رات ایک کیے رکھتے ہیں، لیکن ہمارے آس پاس جو بے پناہ
م بکھری پڑی ہے اُس سے ہمیشہ غافل رہتے ہیں۔ یاد رکھیے، نیل آرمسٹرانگ کے چاند پر
نے سے پہلے بھی چاند موجود تھا لیکن تب تک سائنس ہمارے شق القمر کے عقیدہ کو شک کی
ہی سے دیکھتی رہی۔ یہ سب باتیں کیا ظاہر کرتی ہیں؟ صرف یہی کہ ہمارے متوازی ایک
حانی دنیا بھی ازل سے موجود ہے اور اُس دنیا کو جاننے کے لیے بھی ایک سائنس موجود ہے
ہم رُوحانیت کہتے ہیں۔ اِس دنیا کی سائنس میں جو کمال حاصل کر لے اُسے سائنس دان
ا جاتا ہے اور اُس دنیا کا سائنٹسٹ ''صوفی'' کہلاتا ہے۔ جیسے یہاں کی سائنس ظاہری جسم
درد کو دُور کرنے کے لیے ڈسپرین، یا دوسرا کوئی پین کلر (Painkiller) دیتی ہے ویسے ہی
ں کی سائنس رُوح کے درد کے لیے دعا، دم اور ورد کی شکل میں درد کو مارنے کی دوا تجویز
تی ہے۔ جس طرح ہماری اس ظاہری دنیا کی بیماریاں اور اُن کا علاج موجود ہے، اِسی طرح
رُوحانی دنیا میں بھی ہم بیمار پڑتے ہیں اور ٹھیک بھی ہوتے رہتے ہیں۔ رُباب بھی ایک
ہی رُوحانی بیماری کا شکار ہے اور اُس کی اس بیماری کا تعلق بھی ہماری متوازی دنیا کی ایک
ق کے اثر سے ہے۔ آپ لوگ بھی بس یہی دعا کریں کہ وہ ٹھیک ہو جائے اور اس دنیا کے
ری مرحلے کے کینسر کی طرح اُس کی رُوح کا ناسور لاعلاج نہ ہو چکا ہو...... سلطان بابا
ف اس ناسور کو بڑھنے سے روکنے کی کوشش میں مصروف ہیں۔ لیکن ایسے میں اگر آپ ہی
کا ساتھ نہیں دیں گے تو پھر اُن کے لیے مشکلات بہت بڑھ جائیں گی......'' بولتے بولتے
ی آواز بیٹھ سی گئی۔ مجھے پتا ہی نہیں چلا کہ سلطان بابا نہ جانے کب سے میرے عقب میں
ڑے میری یہ ساری تقریر سن رہے تھے۔ وہ آگے بڑھے اور پھر اچانک ہی مجھے گلے لگا لیا۔
ر اور اُس کی ٹیم کی آنکھوں سے بھی شک و شبے کی پرچھائیاں مٹ چکی تھیں اور اس بار جب
ں نے سلطان بابا سے ہاتھ ملایا تو اُن سب کی نگاہیں احترام سے جھکی ہوئی تھیں۔ چلتے
عامر دو لمحے کے لیے رُکا اور مجھ سے بولا ''آج تم نے ہمیں زندگی گزارنے کا ایک ایسا نیا

نظریہ دیا ہے جو ہمیشہ سے ہمارے آس پاس ہی کہیں موجود تو تھا لیکن ہماری نظروں سے
اوجھل رہا۔ آج کے بعد میں ہر مریض کو دوا کی پرچی دیتے وقت ایک مشورہ اور بھی دوں گا کہ
دوا کے ساتھ دعا بھی کرتے رہنا۔ دوا تو خون کے خلیوں میں جذب ہو کر اپنا کام کرے گی ہی
لیکن دعا تمہاری رُوح کے خلیوں میں جذب ہو کر تمہاری بیماری دُور کرے گی۔" اُن کے
جانے کے بعد سلطان بابا نے مسکرا کر میری جانب دیکھا۔ "ساحر میاں...... لگتا ہے مولوی خضر
نے پوری تربیت کے بعد ہی تمہیں میرے سپرد کیا ہے۔ جیتے رہو......" میں نے مسکرا کر بات
ٹال دی لیکن یہی سچ بھی تھا۔ یہ ساری باتیں جو میں نے آج عامر اور اُس کی ٹیم کو قائل کرنے
کے لیے کی تھیں ان سب پر میں خود مولوی خضر سے گھنٹوں بحث کر چکا تھا اور انہوں نے ہر
بات اس قرینے سے کی تھی کہ میرے سب تشنہ سوال جواب پاتے گئے۔ رفتہ رفتہ شام بھی ڈھل
گئی لیکن میری رگوں میں بھر جانے والی اس آگ کا آج دُور دُور تک پتا نہیں تھا۔ گویا یاقوط فی
الحال اپنے وعدے کی پاسداری کر رہا تھا۔ اندر زنانے سے آنے والی اطلاعات کے مطابق
رُباب بھی بہت حد تک نارمل ہو چکی تھی اور آج ہفتوں بعد اُس نے اپنے گھر والوں کے ساتھ
ایک دسترخوان پر بیٹھ کر کھانا بھی کھایا تھا۔ دھیرے دھیرے رات ڈھلنے لگی اور وہی اداسی حویلی
کی دیواروں اور درزوں سے جھانکنے لگی جو یہاں کا خاصہ تھی۔ سلطان بابا احتیاطاً کئی بار میرے
کمرے میں جھانک چکے تھے لیکن آج میں اپنے جسم پر کسی قسم کا بوجھ بھی محسوس نہیں کر رہا تھا۔
میری نظر رات بھر بار بار دالان میں اسی شان سے ایستادہ پیپل کے پیڑ کی جانب اُٹھ جاتی تھی
اور میرے من میں عجیب و غریب قسم کے سوال آتے رہے۔ وہ اس وقت کیا سوچ رہا ہو
گا......؟ اُس کی دنیا میں انتظار کیسا ہوتا ہو گا اور اُس کے انتظار کے لمحے کیسے کٹتے ہوں
گے؟ کیا وہ بھی ہم انسانوں کی طرح سجدے میں گر کر اپنے پروردگار سے اس نازنین کی ایک
جھلک، ایک لمحے کا ساتھ مانگتا ہو گا؟ اُس کی دعا کیسی ہوتی ہو گی۔ اُس کے جسم اور اُس کی
رُوح پر انتظار کے یہ کرب ناک لمحے کیسی کیفیت پیدا کرتے ہوں گے......؟ کیا وہ بھی محبوب
کی جُدائی میں روتا ہو گا......؟ کیا اُس کے آنسو بھی ہم بے بس انسانوں کی طرح صرف نمکین
پانی کہلاتے ہوں گے؟ کیا اُس کا دل بھی ہوتا ہو گا......؟ کیا وہ بھی آہیں بھرتا ہو گا......؟ انہی
سوالوں کے جھرمٹ میں صبح بھی ہو گئی۔ فجر کی نماز کے بعد میں خود سلطان بابا کے کمرے میں

ہا آیا۔ وہ بھی شاید رات بھر سو نہیں پائے تھے۔ آج شام ۴۸ گھنٹے پورے ہونے کے بعد
اب کی اور شاید ہماری بھی قسمت کا فیصلہ جو ہونے والا تھا۔ میں نے اُن سے یونہی پوچھ لیا۔
"بابا...... ہم مذہب سے اس طرح مطمئن کیوں نہیں ہو پاتے جس کاملیت سے سائنس، یا
نی اور علم ہمیں مطمئن کر جاتا ہے؟" وہ ہلکے سے مسکائے۔ شاید وہ خود بھی مجھ سے ایسے کسی
ال کی توقع کر رہے تھے۔ "وہ اس لیے کہ ہم نے صرف کلمے، نماز اور روزے کو مذہب کی
بل سمجھ لیا ہے۔ جب کہ یہ بنیادی رُکن تو صرف مذہب کی ابتدا ہیں...... اصل آغاز مذہب تو
ا کے بعد ہے...... اور پھر انتہا کی تو بات ہی کیا ہے۔ وہاں تک تو شاید کئی پیغمبر بھی نہیں پہنچ
ے۔ تو پھر ہم جیسے معمولی انسان بھلا مذہب کی انتہا کو کیا پائیں گے......؟ جس دن ہم یہ
ن سمجھ گئے کہ فی الحال ہم صرف اسلام لائے ہیں...... ایمان لانا ابھی باقی ہے اس روز
رے مسئلے حل ہو جائیں گے...... لیکن شاید ابھی وہ منزل کچھ دُور ہے...... بہرحال ہمارا سفر تو
ی ہے اور اسے جاری رہنا چاہیے۔"

اتنے میں حاجی رزاق صاحب نے آ کر بتایا کہ رُباب کئی مرتبہ عامر کا پوچھ چکی ہے اُسے
جواب دیا جائے۔ سلطان بابا نے انہیں سمجھایا کہ معاہدے کی رُو سے فی الحال عامر کا
ب کے سامنے آنا، یا اُس سے ملنا ممکن نہیں ہے۔ مبادا یاقوط اسے خلاف ورزی سمجھ کر بھپر
نہ جائے۔ بہتر یہی ہو گا کہ عامر کی غیر موجودگی کا کوئی مناسب بہانہ بنا دیا جائے، کیونکہ
تو بات صرف چند گھنٹوں کی ہی رہ گئی تھی۔ ایسے میں ہمیں کوئی بھی ایسی خلاف معمول
ت نہیں کرنی چاہیے جو سارے کیے کرائے پر پانی پھیر دے۔ حاجی صاحب نے یہ بھی بتایا
ان کی بیگم اور چھوٹی بیٹی نایاب بھی بے حد پریشان ہیں اور وہ کسی صورت رُباب کو کھونا نہیں
تے۔ سلطان بابا نے پھر وہی بات کی کہ وہ سب دعا کریں۔ خدا بہتر کرے گا۔ سچی بات تو
ہ کہ میں خود اندر سے بے حد خوف زدہ اور پریشان تھا اگر یاقوط نے سلطان بابا کی شرط مانی
اور اپنی محبت کو اس کڑی کسوٹی پر ثابت کرنے کی حامی بھری تھی تو اُس کا دعویٰ بھی کچھ وزن
نا ہو گا اور پھر میں تو خود اس محبت نامی اژدھے کا نگلا ہوا شکار تھا۔ میری رگوں میں بھی تو یہ
واز ہر اسی جذبے کی دین تھا۔ ہاں...... وہی محبت جو انسان پر ابتدا میں تو صبح کی نرم اور
دھوپ کی طرح اُترتی ہے لیکن دھیرے دھیرے وہ تپتے صحرا کی اس دوپہر کی شکل

اختیار کر لیتی ہے جہاں میلوں دُور تک مجھ جیسے بے بس انسانوں کے لیے کوئی نخلستان
سایہ میسر نہیں ہوتا۔ اس کی رُوح تک کو جھلسا دینے والی گرم کرنیں ہمارے نازک بدن
مسام چیر کر ہمارے اندر پیوست ہوتی رہتی ہیں۔ ہمارے حلق میں کانٹوں کا جنگل اُگ
ہے اور دھیرے دھیرے اور قطرہ قطرہ کر کے ہماری جان اسی محبت کے دہکتے سورج تلے
جاتی ہے۔ جذبوں اور خواہشوں کی گلابی تتلیاں بے بسی سے ہمیں تڑپتا اور دم توڑتا ہوا دیکھ
رہتی ہیں اور کچھ ہی دیر میں خود اُن کے سنہری پر بھی جل جاتے ہیں۔ ہاں...... ایسی ہی بے
اور ظالم ہوتی ہے یہ محبت......

آخر کار وہ پہر بھی آ ہی گیا جب شرط کے مطابق ہمیں رُباب کو اُس کے کمرے میں
چھوڑ آنا تھا۔ حاجی رزاق جب عامر اور بیگم و بیٹی کے ہمراہ کسی بہانے سے نکل کر مہمان خا
کی جانب آ رہے تھے تو اُن کی چال سے صاف ظاہر تھا کہ یہ اُس جواری کی چال ہے جو
زندگی کا سب سے بڑا جوا کھیل کر آ رہا ہو۔ ستم یہ تھا کہ بازی تو کھیلی جا چکی تھی لیکن جیت
مات کا فیصلہ ابھی باقی تھا۔ باقی گھر والوں کے رنگ بھی اُڑے ہوئے تھے۔ ہم سب
ساڑھے مہمان خانے کے شیشے کے برآمدے سے باہر حویلی کے اُس حصے کی جانب دیکھ ر
تھے جہاں رُباب کا کمرہ واقع تھا۔ رفتہ رفتہ ہماری تشویش بے چینی میں بدلنے لگی کیوں
پندرہ منٹ سے زیادہ کا وقت گزر چکا تھا۔ میں اِسی شش و پنج میں مبتلا تھا کہ جانے یاقوط کس
روپ میں رُباب کے سامنے آئے گا اور کس طرح سے اُسے اپنی محبت کا یقین دلائے گا؟ ا
اگر اُس کے دعویٰ کے مطابق رُباب بھی اُس کی محبت میں اُسی کی طرح مبتلا تھی تو کیا ہم رُباب
کو دوبارہ دیکھ بھی پائیں گے، یا نہیں...... اور اگر یاقوط اپنے وعدوں سے پھر گیا تو......؟ اور اگر
کہیں یہ اُس کی ہمیں رُباب سے چند لمحوں کے لیے دُور رکھنے کی سازش ہوئی تو......؟
ایسے نہ جانے کتنے سوال میرے ذہن میں سوئیاں چبھو رہے تھے کہ اچانک اندر سے رُباب کی
چیخ بلند ہوئی اور ساتھ ہی اُس نے چلا کر کہا...... "عامر......" ہم سب بُری طرح اُچھلے
میرے ذہن میں اچانک ہی جھماکا سا ہوا۔ اوہ میرے خدا...... یہ بات میرے، یا سلطان با
کے ذہن میں پہلے کیوں نہیں آئی۔ یاقوط کو ہم نے خود کوئی بھی روپ بدلنے کی اجازت دے
سے پہلے یہ کیوں نہیں سوچا کہ وہ عامر کا بہروپ بھی تو بھر سکتا ہے۔ اور اب اگر وہ ایسا کر گیا

پکا ہے تو اُس نے معاہدے کی کسی بھی طور خلاف ورزی نہیں کیونکہ ہم نے ایسی کوئی پابندی
اُس پر لگائی ہی نہیں تھی۔ ہم سب رُباب کی پہلی چیخ کے بعد جیسے سکتے کے عالم میں کھڑے تھے
اور پھر جب چند ہی لمحوں کے بعد رُباب کی چیخیں ایک تسلسل اور جنونی انداز میں شروع ہوئیں تو
ہم سب ہی اُس کے کمرے کی طرف دوڑ پڑے۔ ہمارے پہنچنے سے پہلے ہی رُباب بے ہوش
ہو کر فرش پر گر چکی تھی اور اُس کے کمرے میں دوسرا کوئی نہیں تھا۔ سلطان بابا نے فوراً رُباب
کے ماتھے پر ہاتھ رکھ کر چند آیتیں زیرِ لب پڑھیں اور پانی کے ایک گلاس پر کوئی سورۃ پڑھ کر دم
کیا اور رُباب کی ماں کو قطرہ قطرہ کر کے وہ پانی رُباب کے حلق میں ٹپکانے کا کہہ کر ہم سارے
مرد کمرے سے نکل آئے۔ وہ ساری رات ہم سب نے رُباب سمیت کانٹوں پر گزاری
کیوں کہ ہمیں اب بھی اس امتحان کے نتیجے کا پتا نہیں تھا۔ سب کچھ رُباب کے ہوش میں آنے
کے بعد ہی واضح ہونا تھا اور رُباب نے ہوش میں آنے کے لیے پورے چودہ گھنٹے لیے۔ ہوش
میں آنے کے بعد کچھ دیر تک وہ ہم سب کو اجنبی اور پھٹی پھٹی نظروں سے دیکھتی رہی اور پھر
روتے ہوئے اپنی ماں سے لپٹ گئی۔ سلطان بابا نے اُسے تسلی دی کہ اب ہم سب اُس کی
حفاظت کے لیے وہاں موجود ہیں لہٰذا وہ اطمینان رکھے اور ہمیں گزشتہ رات کا پورا واقعہ
سنائے۔ بڑی مشکل سے رُباب نے اپنے حواس یک جا کیے اور ٹوٹے پھوٹے لفظوں میں وہ
ہمیں صرف اتنا بتا پائی کہ کل رات کو وہ کافی دیر تک عامر کا موبائل نمبر ملانے کی کوشش کرتی
رہی لیکن فون بند پا کر اُس نے جھنجھلاہٹ میں عامر کو SMS کر دیا کہ اگر اُس نے فوراً ہی
رُباب سے رابطہ نہ کیا تو وہ عمر بھر اُس سے بات نہیں کرے گی۔ اِسی اثناء میں باہر آہٹ ہوئی تو
رُباب نے پکار کر پوچھا کہ کون ہے؟ تبھی اُسے عامر کی جھلک دکھائی دی۔ جو شاید اُسے ستانے
کی خاطر چھپنے کی کوشش کر رہا تھا۔ رُباب لپک کر اُس کے قریب پہنچی تو عامر نے اُسے اس
اندھیرے کونے کا بلب جلا کر روشنی کرنے سے منع کر دیا کہ گھر والے چونک جائیں گے اور خود
اُس نے رُباب کا ہاتھ تھام لیا۔ رُباب کے بقول اُس وقت عامر کا ہاتھ برف کی طرح سرد تھا
اور خلافِ معمول عامر نے اُسے ایک بار اقرارِ محبت کی تجدید پھر سے اپنے لفظوں میں کرنے کا
کہا۔ رُباب اُلجھ سی گئی کیوں کہ اُس نے آج تک عامر کا ایسا برتاؤ کبھی نہیں دیکھا تھا۔ وہ تو گھر
میں گھستے ہی آسمان سر پر اُٹھا لینے کا قائل تھا اور محبت کی تجدید تو دُور وہ تو رُباب کو اُس کے اس

''کتابی عشق'' پر اس قدر ٹوکتا اور تنگ کرتا تھا کہ کبھی کبھار تو رُباب تھک کر رو پڑتی تھی اور عامر کو اس طرح کے اظہارِ محبت سے تو سدا کی چڑ تھی۔ وہ نایاب کو اپنے ساتھ ملا کر رُباب کی ایسی نقلیں اُتارتا کہ رُباب پھر ہفتوں اُس سے بات نہیں کرتی تھی اور آج وہی عامر جب اس تاریک گوشے میں رُباب کے ہونٹوں سے محبت کے دو لفظ ادا ہو جانے کے انتظار میں اپنا سب کچھ لٹانے کا دعویٰ کر رہا تھا تو رُباب کا چونکنا لازمی تھا اور پھر عامر کے پرفیوم کی خوشبو بھی تو خلافِ معمول کچھ عجیب سی تھی اور اُس کی وہ گرم سانسیں جو رُباب کا رُواں جلانے کا باعث بن رہی تھیں۔ رُباب نے ہنس کر اُسے یقین دلایا کہ وہ تو سدا سے اُس کی محبت میں پاگل ہے۔ لیکن عامر نے جب رُباب سے تیسری مرتبہ یہ بات پوچھی کہ کیا اُسے واقعی عامر سے محبت ہے اور کہیں وہ دوسروں کے سامنے اس بات سے مکر تو نہیں جائے گی تب رُباب کا ماتھا ٹھنکا اور اُسے پہلی بار یہ ہڈیوں کے گودے کو جما دینے والا سرد احساس ہوا کہ اُس کے پاس کھڑا یہ شخص عامر نہیں کوئی اور ہے۔ اور جیسے ہی اُس کے حلق سے پہلی چیخ بلند ہوئی تب کسی نے جیسے اُس کے تمام حواس یک بار ہی بیدار کر دیئے۔ وہ جان چکی تھی کہ اجنبی ہاتھوں کا یہ لمس اور مہکتے وجود کی یہ خوشبو کسی نامحرم ہستی کی ہے۔ بس پھر کیا تھا رُباب کی چیخوں نے آسمان سر پر اُٹھا لیا اور کچھ ہی دیر بعد وہ ہوش کھو بیٹھی اور شاید یہ وہی لمحہ تھا جب ہم سب کمرے میں داخل ہوئے تھے۔ یاقوط شرط ہار چکا تھا۔ رُباب اُس کی انجان محبت کو شناخت نہیں کر پائی۔ اور شاید یہ پہلی محبت کی ہار تھی جس پر وہاں موجود ہر شخص خوش تھا۔ لیکن شاید وہاں کوئی اور بھی تھا جو اپنی محبت کے یوں سرِ بازار لٹ جانے پر ماتم کناں تھا۔ میں نے کھڑکی سے باہر کھڑے پیپل کے پیڑ پر نظر ڈالی۔ باہر ہلکی بارش شروع ہو چکی تھی اور پیڑ کے پتوں سے پانی کی بوندیں آنسو بن کر ٹپک رہی تھیں۔ قدرت نے جب ہم خود غرض انسانوں کو کسی کی محبت کی ہار کا جشن مناتے ہوئے دیکھا تو شاید اُس سے رہا نہ گیا اور اُس نے اس ہار کے غم میں خود آنسو بہانے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ تبھی یہ برستی بارش لمحہ بہ لمحہ تیز ہوتی جا رہی تھی۔ وہ ہمارے لیے اجنبی تھا۔ دوسری دنیا کا تھا لیکن قدرت کا تو اپنا تھا...... اتنا ہی اپنا، جتنا ہم خود کو سمجھتے ہیں۔ اُتنا ہی قریب، جتنی قربت کا دعویٰ ہماری یہ انسانی مخلوق کرتی ہے۔

اگلے دو روز حاجی رزاق اور گھر والے اِسی فکر میں گھلتے رہے کہ کہیں وہ واپس نہ آ جائے

لیکن سلطان بابا نے انہیں اطمینان دلایا کہ یہ ایک انسان کا وعدہ نہیں کہ کچے دھاگے کی طرح ٹوٹ جائے۔ اب وہ عمر بھر اپنے عہد کی پاسداری میں رُباب کے قریب بھی نہیں پھٹکے گا۔ اُسی لمحے نہ جانے مجھے ایک عجیب سا احساس کیوں ہوا۔ سلطان بابا نے بات کرتے وقت غیر ارادی طور پر دو مرتبہ پیپل کے پیڑ کی جانب نظر ڈالی اور مجھے یوں لگا جیسے سلطان بابا نے اُس سیاہ آسیب کو کم از کم اس پیڑ پر بسیرے کی اجازت دے دی ہے، لیکن گھر والوں کے اطمینان کے لیے وہ اس راز کو افشا نہیں کرنا چاہتے۔ آخر کار ہمارے رُخصت ہونے کا وقت بھی آ گیا۔ حاجی رزاق کے تمام گھر والوں کی آنکھیں اس پل نم تھیں۔ سلطان بابا نے خاص طور پر رُباب اور عامر کے سر پر ہاتھ رکھ کر انہیں دعا دی۔ ٹھیک اُسی لمحے میں پیپل کے پیڑ کی جانب دیکھ رہا تھا۔ انہوں نے مجھ سے پوچھا ''کیا ہوا؟'' میں خاموش رہا اور پھر دھیرے سے اُن کے کان میں کہہ ہی ڈالا۔ ''ایک دل جلے کو آخری سلامی پیش کر رہا تھا۔'' اُن کے ہونٹوں پر ہلکا سا تبسم ابھر کر غائب ہو گیا۔ پھر نہ جانے کیا سوچ کر اُن کی آنکھیں نم ہو گئیں۔ حاجی رزاق کے خاندان کو ہم آخری سلام کر کے باہر نکلنے لگے تو ایک لمحے کو وہ رُکے اور مجھے سامنے کھڑا کر کے بولے۔ ''ساحر میاں...... آج سے تمہارا ساحر سے عبداللہ تک کا سفر ختم ہوا۔ تم ہر امتحان پر پورے اُترے ہو اور مجھے یقین ہے کہ اب چاہے تم کہیں بھی رہو، تمہارا اس متوازی دنیا کا یہ سفر جاری رہے گا اور اب تم اپنی دنیا خود کھوج سکتے ہو...... جاؤ...... گھر لوٹ جاؤ۔ زہرا تمہارا انتظار کرتی ہو گی...... مجھے ابھی بہت سے کام کرنے ہیں...... بڑا لمبا سفر طے کرنا ہے...... میرے ساتھ کا حق تم پہلے ہی ادا کر چکے ہو...... اب میرا فرض ہے کہ میں تمہارا حق ادا کر دوں...... خوش رہو ہمیشہ۔'' انہوں نے میرے سر پر ہاتھ رکھ کر دعا دی۔ میں اُن کی بات سن کر چپ ہی تو گیا۔ ''کیا آپ مجھ سے اُکتا گئے ہیں......؟ کیوں دُور کرنا چاہتے ہیں مجھ کو خود سے؟ زہرا نے کہا تھا کہ وہ قیامت تک ہماری رُوحوں کے ملاپ کا انتظار کرے گی، لیکن آپ تو ابھی سے مجھ پر یہ قیامت کیوں ڈھانا چاہتے ہیں......؟ ہاں البتہ آپ کے اگلے سفر میں میں آپ پر بوجھ بن رہا ہوں، یا میری وجہ سے آپ کی راہ کھوٹی ہو رہی ہے تو پھر جیسے آپ کا حکم......'' انہوں نے جلدی سے میری بات کاٹ دی۔ ''تم ہرگز مجھ پر بوجھ نہیں ہو...... تم تو وہ ہم سفر ہو جس کی تمنا کوئی بھی راہی کر سکتا ہے......'' وہ کچھ دیر کے لیے کسی گہری سوچ میں گم ہو گئے پھر انہوں نے جیسے کوئی حتمی فیصلہ کر کے سر اُٹھایا۔ ''ٹھیک ہے...... تم یہ سفر جاری رکھنا

چاہتے ہو تو پھر یونہی سہی...... لیکن یہاں سے ہماری راہیں عارضی طور پر جُدا ہوتی ہیں۔ ہم دونوں یہاں سے ریلوے اسٹیشن سے مشرق اور مغرب کی طرف جانے والی الگ الگ گاڑیوں میں روانہ ہوں گے۔ تمہاری گاڑی جو مغرب کی طرف جائے گی وہ تمہیں جبل پور کے اسٹیشن تک پہنچائے گی اور میں مشرق کی راہ لوں گا۔ لیکن دھیان رہے جبل پور کی درگاہ بذاتِ خود ایک بہت بڑا امتحان ہے اور اب تمہیں تنہا ہی اس امتحان سے گزرنا ہوگا۔ تمہاری جان بھی جا سکتی ہے۔'' میں نے سر جھکا دیا۔ ''آپ مجھے ہمیشہ ثابت قدم پائیں گے۔'' انہوں نے میرا کاندھا تھپتھپایا اور آگے بڑھ گئے۔ حویلی کے بڑے پھاٹک سے نکلتے وقت نہ جانے میری نظر خود بخود پلٹ کر اُس پیپل کے پیڑ کی جانب کیوں اُٹھ گئی جو اپنے شاخیں کسی ماتم زدہ بیوہ کے انداز میں کھولے، کھڑا ہوا ہمیں جاتے دیکھ رہا تھا۔ مجھے یوں لگا جیسے وہ سوگوار پیڑ کسی سے یہ کہہ رہا ہو......

ابھی کچھ دیر باقی ہے
خزاں کے بیت جانے میں
گلوں کے مسکرانے میں
خوشی کے گیت گانے میں
بہاروں کے زمانے میں
ابھی کچھ دیر باقی ہے......
میں تم کو بھول جاؤں گا
نہ تم کو یاد آؤں گا
میں تم سے دُور رہ کر بھی
تمہیں جی کر دکھاؤں گا
تمہیں معلوم ہے لیکن
یہ سب میں کر نہ پاؤں گا
کہ تم کو بھول جانے میں
ابھی کچھ دیر باقی ہے......
ابھی...... کچھ دیر باقی ہے

دامن اور چنگاری

کہتے ہیں ''زندگی میں کتنے پل ملے......'' یہ سوچ کر جینے سے بہتر ہے کہ ''ہر پل میں کتنی زندگی ملی......'' اس بات کو جینے کا پیمانہ بنایا جائے۔ لیکن سلطان بابا سے جُدا ہونے کے بعد جانے کیوں مجھے کچھ ایسا محسوس ہونے لگا تھا کہ میرے حصے کے پل اپنی زندگی گنوا بیٹھے ہیں۔ ٹرین کو اسٹیشن چھوڑے اب گھنٹہ بھر سے زائد ہو چکا تھا لیکن میرا ذہن ابھی تک وہیں اسٹیشن پر سلطان بابا سے ہوئے الوداع میں اٹکا ہوا تھا۔ جانے میری منزل کہاں تھی؟ سلطان بابا نے تو صرف جبل پور اسٹیشن کا ٹکٹ میرے حوالے کر کے مجھے اس ٹرین پر چڑھا دیا تھا لیکن جبل پور نامی قصبے میں مجھے کہاں جانا تھا؟ کس سے ملنا تھا......؟ یہ سارے سوال میرے سامنے منہ کھولے کھڑے تھے۔ لیکن اب تک تو مجھے ان حالات کا عادی ہو جانا چاہیے تھا...... میں کیوں بار بار ان بے معنی سوالوں میں خود کو اُلجھا لیتا تھا۔ میرے گھر سے نکلنے اور درگاہ سے یہاں اس ٹرین کے اکانومی کلاس کے ڈبے تک کے سفر میں جانے ایسے کتنے اُلجھے سوال میری زندگی میں آ کر اپنا حل پا چکے تھے۔ ایک سوال اور سہی...... میں نے تھک کر اپنی آنکھیں موندھنے کی کوشش کی اور اپنا سر اُدھڑی ہوئی سخت نشست کے ٹیک پر ٹکانے کی کوشش کی لیکن ٹرین کے جھٹکے بھلا میرا توازن کہاں برقرار رہنے دیتے......؟ تنگ آ کر میں نے آنکھیں کھول دیں اور سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔ سامنے ایک ماں اپنے بچے کو یہ سمجھانے کی کوشش کر رہی تھی کہ ٹرین کی گڑگڑاہٹ سے ڈرنے کی ضرورت نہیں...... یہ تو سارے ڈبے مل کر اللہ ہو...... اللہ ہو کا ورد کر رہے ہیں۔ ماں نے بچے کے دل سے ڈر نکالنے کے لیے خود ہی ٹرین کے دوڑنے کی آواز اور ڈبوں کے آپس میں ٹکرانے اور ٹھکا ٹھک جیسی آواز کو ایک سُر میں ڈھال کر اُسے اللہ ہو کی شکل دے دی اور اپنے بچے کو تھپکنے لگی۔ کچھ ہی دیر میں اُس کا بچہ بھی اس گڑگڑاہٹ کی آواز کے ساتھ اللہ ہو کا ورد کرنے لگا۔ دوسری جانب کچھ تبلیغی حضرات بیٹھے اس بات پر بحث کر رہے تھے کہ عصر کی نماز ٹرین میں ہی ادا کر لی جائے، یا پھر کسی چھوٹے اسٹیشن پر دو چار

منٹ کا وقفہ لے کر باقاعدہ جماعت کروالی جائے۔ اُن سے ذرا پرے ایک ادھیڑ عمر کے مولانا اپنی بیوی کو بار بار اپنے برقعے کا نقاب ٹھیک طرح سے گرانے کی تلقین کیے جا رہے تھے۔ اُن کی بیگم کا شاید اتنے بھاری نقاب کے اندر دم گھٹ رہا تھا اور اِسی لیے وہ ہر پانچ سات منٹ کے وقفے کے بعد اپنا نقاب ذرا سا اُلٹ دیتی تھیں اور جلدی جلدی چار چھ لمبی سانسیں لے کر اپنا دم بحال کرنے کی کوشش کرتیں۔ لیکن تبھی مولانا صاحب کی خشمگیں نگاہیں اور اُن کا دھیرے مگر کڑے تیوروں کے ساتھ ''زلیخا'' بولنا ہی اُن کی بیگم کے لیے کافی ہوتا اور وہ بے چاری جلدی سے اپنا نقاب دوبارہ گرا دیتی تھیں۔ دراصل مولانا صاحب کا بھی قصور نہیں تھا۔ سامنے ہی بوگی میں دو نشستیں چھوڑ کر کالج کے تین لااُبالی سے لڑکوں کا ایک گروپ بیٹھا ہوا تھا جو ذرا ذرا سی دیر میں ریڈیو پر بجتے کسی گیت کی تال میں تال ملا کر اپنا اپنا راگ الاپنا شروع کر دیتے تھے اور ایسے میں اُن تینوں کی نظر زیادہ تر اگلے حصے میں بیٹھی اُن دو نازک سی لڑکیوں پر ہوتی تھی جو اپنے چھوٹے بھائی اور ماں باپ کے ساتھ شاید کسی تقریب میں شرکت کے لیے اپنے گھر سے نکلی تھیں۔ لڑکیاں شوخ تھیں اور ذرا ذرا سی بات پر کھل کر ہنس رہی تھیں اور اپنی ماں سے کسی بات پر بحث میں مصروف تھیں۔ جب کہ لڑکیوں کے ماں باپ شادی پر دی جانے والی سلامی اور خرچے کے رونے رو رہے تھے۔ کالج کے لڑکے گاہے بگاہے پاس سے گزرنے والے پھیری والوں سے کبھی گرم بھنے ہوئے نمکین چنے، کبھی گزک تو کبھی لمکا اور فالسے کی بوتلیں خرید خرید کر لڑکیوں کے بھائی کو بھی اس دعوت عام میں شریک کر لیتے تھے اور اُن کی زیادہ تر خواہش یہی ہوتی تھی کہ یہ نیمبو اور مرچ لگا بھٹا، گرم مونگ پھلیاں اور نرم ریوڑیاں بھائی سمیت اُس کی دونوں بہنوں تک بھی ترسیل ہوتی رہیں۔ مولانا صاحب دل پر پتھر رکھے یہ سارا ماجرا دیکھ رہے تھے اور بار بار زیرلب ''لاحول ولاقوۃ'' کا ورد بھی جاری رکھے ہوئے تھے۔ اُن سے دو نشست پیچھے دو صاحبان بڑی شد و مد سے ایک دوسرے کے پتے اور ٹیلی فون نمبروں کے تبادلے میں مصروف تھے، حالانکہ وہ دونوں ہی جانتے تھے کہ اگلے اسٹیشن پر اُترتے ہی وہ یوں اپنی اپنی راہ لیں گے کہ پھر کبھی پلٹ کر بھی ایک دوسرے کی جانب نہیں دیکھیں گے۔ لیکن بہرحال، وقت تو کسی طور کاٹنا ہی تھا۔ مجھ سے پچھلی نشستوں پر سگریٹ اور بیڑی کے دھوئیں کے بادل تیر رہے تھے اور اس نیلگوں ماحول میں چار حضرات بیٹھے تاش کھیلنے

میں یوں مگن تھے جیسے انہیں زندگی میں اس ٹرین سے اُترنے کے بعد دوبارہ کبھی تاش کھیلنے کا موقع نہیں ملے گا۔ وہ اب تک جانے کتنی بازیاں کھیل چکے تھے لیکن کسی پر بھی بازی جیتنے کی خوشی، یا داؤ ہار جانے کے دُکھ کے آثار نمایاں نظر نہیں آ رہے تھے۔ ہر بازی کے اختتام پر چند نعرے بلند ہوتے اور پھر سے وہ چاروں نئی بازی کے پھیرے میں اُلجھ جاتے، جانے یہ کیسی سعی لاحاصل تھی......؟

اچانک ٹرین کی رفتار کم پڑنے گی۔ اُوپر برتھ پر لیٹے ہوئے ایک حضرت نے جو اس سے پہلے بھی کئی مرتبہ اپنے چہرے پر ڈلی ہوئی چادر ہٹا کر درجنوں بار تفتیشی انداز میں دولت پور کے اسٹیشن کا پوچھ چکے تھے انہوں نے ایک بار پھر جلدی سے چادر ہٹائی اور وہیں سے آواز لگائی ''کیوں میاں...... دولت پور کا اسٹیشن تو نہیں آ گیا۔'' اور پھر حسب معمول کسی کا جواب نہ پا کر دوبارہ اپنے چہرے پر اپنا کھیس پھیلا کر خراٹے لینے لگ گئے۔ ٹرین نے چند زوردار جھٹکے لیے اور پھر ایک لمبی سی اسکریچ کی آواز کے ساتھ آخری ہچکی لے کر رُک گئی۔ کوئی چھوٹا سا اسٹیشن تھا جس کے پلیٹ فارم کے سروں پر جڑے تختوں پر لکھا نام تک ماہ و سال کی گردش کی تاب نہ لاتے ہوئے مٹ چکا تھا۔ تاش کی بازی والوں میں سے کوئی ایک چلایا۔ ''چل بے سلو...... اسٹیشن آ گیا۔ اب شرط کے مطابق بھاگ کر گرم گرم پکوڑے اور چٹنی پکڑ لا...... اور دیکھ پکوڑوں پر چاٹ مصالحہ ڈلوانا نہ بھول جائیو......'' سلو نے حکم کی تعمیل میں فوراً پلیٹ فارم پر جمپ لگائی اور پکوڑے والے کے ٹھیلے کی جانب دوڑ لگا دی۔ مولانا کی بیگم نے بھی شاید گرم پکوڑوں کے تذکرے کو سن کر اپنے میاں کے کان میں کچھ کھسر پھسر کی۔ مولانا بادل نخواستہ کراہتے ہوئے کھڑے ہو گئے اور ڈبے سے نکلنے سے پہلے انہوں نے ایک بار پھر اپنی بیگم کو قاب تانے رکھنے کی ہدایت کی۔ میرے قریب سے گزرتے ہوئے نہ جانے انہیں کیا ہوا کہ یرے سے کھنکار کر رُکے اور آہستہ سے بولے ''میاں...... میں ذرا نیچے سے کچھ سامان پکڑ اؤں۔ آپ زنانے کا دھیان رکھیے گا......'' میں نے چونک کر حیرت سے اُن کی جانب دیکھا یکن وہ آگے بڑھ چکے تھے۔ پورے ڈبے میں انہیں میں ہی قابل اعتبار کیوں دکھائی دیا......؟ ر خود ہی میری توجہ اپنے حلیے کی جانب چلی گئی۔ اوہ...... تو ایک بار پھر میرا یہ ظاہری حلیہ ہی برا تعارف ثابت ہوا تھا۔ جانے ہم انسانوں نے کسی کی ظاہری وضع قطع کو ہی شرافت و

نجابت کا معیار کیوں سمجھ رکھا ہے؟ یا پھر شاید ہم ظاہر پرستوں کے پاس اس وقتی پیمانے کے علاوہ اور کوئی چارہ ہو بھی نہیں سکتا تھا......؟ ...... تبھی تو وہ مولانا اپنی پوری ''زلیخا'' میرے حوالے کر کے اطمینان سے پلیٹ فارم پر اُتر چکے تھے۔ لیکن اُن کی سیدھی سادی بیگم نے شوہر کے اُٹھتے ہی اپنا نقاب کچھ اس طرح سے کس کر لپیٹا اور یوں سکڑ سمٹ کر بیٹھ گئیں کہ چاہ کر بھی کسی کی نظر اُن کی جانب اُٹھ نہیں سکتی تھی۔ جانے کیوں مجھے اُس وقت بہت شدت سے اس بات کا احساس ہوا کہ پردہ ہی عورت کی سب سے بڑی ڈھال ہے اور مرد کی غیر موجودگی میں یہ پردہ ہی عورت کا سب سے بڑا تعارف بھی بن جاتا ہے۔ مولانا کی بیگم کو جب تک میاں کی ڈھال میسر تھی وہ گاہے بگاہے خود کو بے نقاب بھی کر لیتی تھیں لیکن جیسے ہی اُن کی یہ آڑھ چند لمحوں کے لیے اُن سے کچھ دُور ہوئی تو فوراً انہوں نے اپنی ڈھال یعنی اپنے پردے کو اپنی حفاظت کا ذریعہ بنا لیا۔ مجھے اُس پل ایک اور انجانا اور بہت عجیب سا ادراک بھی ہوا کہ مرد کی نظر اور عورت کی حیا میں دامن اور چنگاری کا تعلق ہے۔ مرد کی نظر چنگاری ہے تو عورت کی حیا ایک نازک دامن ہے۔ کبھی چنگاری دامن کی طرف لپکتی ہے تو کبھی دامن اس چنگاری کو ہوا دے کر بڑھکا دیتا ہے۔ اور نتیجہ دونوں صورتوں میں صرف اور صرف آگ بن کر ہی وارد ہوتا ہے۔ یہ دامن اور چنگاری کا کھیل ازل سے جاری ہے اور ابد تک جاری رہے گا۔

ٹرین کو اس اسٹیشن پر رُکے ہوئے پانچ منٹ سے زیادہ ہوئے تو کچھ لوگ معلومات کے لیے پلیٹ فارم پر اُتر گئے۔ پتا چلا کہ چند لمحوں میں ہی کوئی کراسنگ ہونے والی ہے لہٰذا اسگنل ملنے تک انتظار کرنا ہوگا۔ تبلیغی جماعت کے حضرات کو بھی موقع مل گیا کہ تب تک جلدی سے جماعت ہی کروالی جائے۔ نیچے اُترتے اُترتے اُن میں سے کسی صاحب نے مجھے بھی دعوت دی اور میں بھی اُن کے ساتھ ہی نیچے پلیٹ فارم پر اُتر آیا لیکن جماعت کھڑی ہونے سے پہلے ایک عجیب سی صورت حال آن کھڑی ہوئی۔ جن صاحب نے امامت کروانی تھی وہ اچانک پلٹے اور اُن کی نظر مجھ پر پڑی اور مجھ سے بولے ''حضرت...... آیئے آپ جماعت کی امامت کیجیے......'' کچھ دیر تو مجھے سمجھ ہی نہیں آیا لیکن جب انہوں نے میرا ہاتھ تھام کر مجھے آگے کھڑا کرنا چاہا تب میں بالکل ہی بوکھلا گیا اور میں نے بڑی مشکل سے پوری جماعت کو یقین دلایا کہ میں اس اعزاز کے قابل نہیں سمجھتا خود کو...... لیکن سبھی نمازیوں نے امام صاحب کی ہاں میں

ں ملانا شروع کر دی تھی۔ اب میں انہیں کیا بتاتا کہ جناب ابھی تو میری زبان تکبیر تک دیتے ے لڑکھڑا سی جاتی ہے تو پھر بھلا میں کہاں اور امامت کہاں؟ درگاہ کی مسجد میں بھی مولوی ر کے شدید اصرار کے باوجود میں صف میں بالکل اُن کے پیچھے نہیں کھڑا ہوتا تھا تا کہ مجھے ہیں نہ کہنی پڑے۔ پتا نہیں میں خود کو اپنے اس داغ دار دامن کے ساتھ ان اعزازات اور ان ہوں کے قابل نہیں سمجھتا تھا۔ بڑی مشکل سے میں نے پلیٹ فارم پر صورت حال کو اُن سب ازیوں پر واضح کیا اور جماعت کے لیے اُنہی صاحب کو راضی کیا جو اصل پیش امام تھے۔ اعت ختم ہونے سے پہلے ٹرین دو بار سیٹی بجا چکی تھی، لہٰذا ہم سب سلام پھیر کر جلدی جلدی پنی اپنی نشستوں پر آ بیٹھے اور اگلے لمحے ہی ٹرین نے کسی بوڑھے کے غرارے کرنے جیسی آواز ے ساتھ دو چار جھٹکے لیے اور پھر دھیرے دھیرے اپنی منزل کی جانب روانہ ہوگئی۔ نوجوان الب علموں کا گروپ اب اپنی جگہ تبدیل کر کے میرے بالکل سامنے والی نشست اور میرے قابل اپنی جگہ سنبھال چکا تھا جس کی وجہ شاید وہ ہپی جوڑا تھا جو ابھی کچھ دیر پہلے ہی نہ جانے س دوسری بوگی سے ہمارے ڈبے میں آ کر بیٹھا تھا۔ مرد کی بھوری مونچھیں حد سے زیادہ پھیلی وئی تھیں اور چہرے پر ہفتے بھر سے زیادہ کی بڑھی شیو کے ساتھ تھکن کے آثار بھی نمایاں تھے ب کہ لڑکی کے بال سنہرے تھے جسے اُس نے دو چوٹیوں کی صورت میں اپنے ڈھول سے ے لیکن گلابی چہرے پر شانوں کی سمت جھلا رکھا تھا۔ لڑکوں کی ساری توجہ اسی میم کی جانب ی اور وہ سب ٹوٹی پھوٹی انگریزی میں اس ہپی جوڑے کا حدود اربعہ معلوم کرنے کی کوشش کر ہے تھے اور انہیں اپنے مکمل ''تعاون'' کا یقین دلا رہے تھے۔ جب کہ بوگی کے تمام بزرگ ہیں اس حرکت پر گھور گھور کر باز رہنے کی تلقین میں کوشاں تھے۔ لڑکوں نے مجھے دیکھا تو بوگی ے لوگوں کا دھیان بٹانے کے لیے اُن میں سے ایک نے بات جوڑی۔

''سلام مولانا جی...... میرا ایک سوال ہے آپ سے...... دراصل مجھے دعائے قنوت پوری د نہیں ہوتی...... تو کیا میں عشاء کی نماز کے وتروں میں دعائے قنوت کی جگہ تین بار قل ھو اللہ ڑھ لیا کروں......؟'' لڑکے کے سوال کے خاتمے تک اُس کے باقی ساتھیوں کے چہرے پر سکراہٹ نمودار ہو چکی تھی۔ میں جانتا تھا کہ وہ صرف وقت گزاری اور لوگوں کی نظر کی برچھیوں لوٹالنے کے لیے یہ موضوع چھیڑ رہے تھے تا کہ انہیں اس گوری میم کے قریب بیٹھنے کا مزید

کچھ وقت اور موقع مل سکے۔ میرے ہونٹوں پر بھی اُس کا سوال سن کر مسکان آ گئی۔

"میں کیا کہہ سکتا ہوں...... میں تو خود ابھی تک تین بار قل ہو اللہ سے ہی کام چلا رہا ہوں۔" میری بات سن کر آس پاس بیٹھے سبھی لوگوں کے چہرے پر مسکراہٹ اُبھر آئی۔ سارے لڑکے بھی کھل کھلا کر ہنس پڑے۔ اُن میں سے ایک نے میرے کاندھے پر ہاتھ رکھا۔ "ارے یار تم تو بالکل ہم جیسے ہو۔ پھر اتنی دیر سے یوں سنجیدہ سی صورت بنا کر کیوں بیٹھے ہوئے ہو......؟" چند لمحوں میں وہ تینوں مجھ سے یوں گھل مل چکے تھے کہ جیسے میں بھی اُن کا کالج فیلو یا ہم جماعت ہوں۔ حتیٰ کہ کچھ ہی دیر میں اُن میں سے ایک نے مجھ سے یہ سوال بھی کر ڈالا کہ "حافظ جی! آپ نے کبھی کسی سے محبت کی ہے......؟" اب میں انہیں کیا بتاتا کہ میں جو آج اُن کے ساتھ اس ٹرین میں بیٹھا ہوا یہ سفر کر رہا تھا، یہ راستے یہ منزلیں...... میرا سبھی کچھ اُس ایک محبت کی دین ہی تو تھا۔ پتا نہیں ہم محبت جیسے جذبے کو بھی حلیے کی بنیاد پر کیوں پرکھتے تھے۔ کیا شرعی لباس پہننے سے، یا چہرے پر چند ہفتوں کی ڈاڑھی بڑھ آنے سے انسان ان لازوال رُوحانی جذبوں کا حق رکھنے سے بھی محروم ہو جاتا ہے؟ میں نے اُسے جواب دیا کہ فی الحال تو میں محبت کی کھوج میں ہوں...... ہاں البتہ اگر کبھی اس کھوج میں مجھے کامیابی ہوئی تو اُسے ضرور مطلع کر دوں گا۔ سبھی لڑکے چلائے کہ "مولانا آپ ہمیں اپنی شادی میں ضرور مدعو کیجیے گا۔" سبھی بوگی والے ہنس پڑے۔ اچانک ہی مجھے بہت ٹوٹ کر زہرا کی یاد آئی۔ کیا ہم کبھی واقعی مل پائیں گے؟ کیا یہ دنیاوی ملن جسے لوگ یہاں شادی کے بندھن کا نام دیتے ہیں، کیا یہی بندھن ہی صرف اسی زمینی محبتوں کی معراج ہوتا ہے؟ کیا صرف ایک رسم کے ادا ہو جانے سے اور ایک بندھن میں بندھ جانے سے ہماری محبت کی تکمیل ہو جاتی ہے؟ پر مجھے تو جانے کیوں یہ جسمانی ملاپ ہمیشہ سے ہی اُس گلابی اور اَن چھوئے احساس کی فنا جیسا لگتا تھا جسے ہم صرف دل سے دل اور رُوح سے رُوح کا ملاپ، یا محبت کہتے ہیں۔ مجھے ہر بار یہی محسوس ہوا کہ جیسے ہم اس بندھن کے سودے میں کچھ نہ کچھ کھو ضرور دیتے ہیں۔ لاحاصل کی کسک اور دسترس سے دُوری کی تڑپ کا بھی تو اپنا ہی ایک نشہ ہوتا ہے جس کا خمار ملکیت مل جانے کا احساس مٹا دیتا ہے۔ تبھی کچھ لوگ جس لمحے اس بندھن کی گانٹھ باندھ رہے ہوتے ہیں ٹھیک اُسی پل وہ اپنے رُومان کے انمول سنہری جال کی گرہیں سدا کے لیے کھول بیٹھتے

ہیں۔ انہیں اپنی محبت کا جسم تو مل جاتا ہے لیکن وہ اپنے رُومان کی رُوح کو ہمیشہ کے لیے کھو دیتے ہیں۔

میں جانے کتنی دیر عشق اور رُومان کی یہ اُلجھی گتھیاں سلجھاتا رہا۔ گاڑی کافی دیر سے کمال آباد نامی شہر کے جنکشن پر کھڑی تھی۔ اچانک میری نظر باہر پلیٹ فارم پر پڑی اور کچھ دیر کے لیے تو مجھے یوں لگا کہ اب میں واقعی جاگتی آنکھوں سے بھی سپنے دیکھنے لگا ہوں۔ مجھے یوں لگا جیسے میں نے زہرا کو کسی درمیانی عمر کی عورت کے ساتھ پلیٹ فارم سے باہر نکلتے ہوئے دیکھا ہو۔ ہاں...... بالکل...... وہ زہرا ہی تو تھی لیکن نقاب کے بغیر اور عورت بھی میرے لیے انجانی تھی، لیکن زہرا......؟ یہاں......؟ کمال آباد کے اس ریلوے پلیٹ فارم پر؟ اگلے ہی لمحے میں لپک کر اُٹھا اور تقریباً دوڑتے ہوئے پلیٹ فارم پر اُتر آیا۔ اسٹیشن کافی بڑا تھا اور یہاں بھیڑ بھاڑ بھی کافی تھی لیکن ابھی تک میں دُور جاتی اُس عورت کی سفید بڑی سی چادر دیکھ سکتا تھا جسے میں نے زہرا کی اس شبیہ کے ساتھ جاتے ہوئے دیکھا تھا۔ لیکن جب تک میں پلیٹ فارم کے خارجی دروازے تک پہنچا تب تک وہ اسٹیشن سے نکلتی بھیڑ میں گم ہو چکی تھیں۔ میں نے لپک کر باہر دیکھا لیکن سڑک پر تانگوں، سائیکل رکشوں اور موٹر گاڑیوں کے اس ہجوم میں مجھے اُن دونوں کی کوئی جھلک دکھائی نہیں دی۔ اتنے میں گاڑی نے تیسری سیٹی بھی بجا دی اور جب تک میں بھاگتا ہوا اپنے ڈبے تک پہنچا، ٹرین تقریباً پلیٹ فارم چھوڑ ہی چکی تھی۔

اپنی نشست پر بیٹھ کر بھی میں کافی دیر تک اِسی اُدھیڑ بن میں ہی اُلجھا رہا۔ کیا یہ میری نظر کا دھوکا تو نہیں تھا۔ زہرا اتنی بھیڑ میں بنا نقاب کیسے گھوم سکتی ہے؟ اور پھر وہ اجنبی عورت اُس کے ساتھ کون تھی؟ لیکن روپ تو بالکل زہرا کا ہی تھا، وہی خیرہ کن اور مبہوت کر دینے والی شبیہ...... مگر وہ یہاں اس دُور دراز شہر میں کس غرض سے آ سکتی ہے؟ ایک بار تو جی میں آیا یہیں کمال آباد کے مضافات سے گزرتی ٹرین کی زنجیر کھینچ کر اُتر جاؤں اور واپس شہر جا کر اُسے تلاش کروں لیکن کہاں......؟ میرے لیے تو وہ شہر بھی اتنا ہی اجنبی تھا جتنا کہ خود میرا یہ وجود ٹھیک اُس لمحے میرے اپنے لیے ہو چکا تھا۔ کبھی کبھی ہم یک لخت اپنے آپ ہی سے بیگانے اور اجنبی بھی ہو جاتے ہیں۔ ہمیں اپنا وجود اور اپنی ہر کھوج اور کوشش بے معنی اور لاحاصل سی لگنے لگتی ہے۔

میں بھی نااُمیدی اور مایوسی کے ایسے ہی گردابوں میں پھنسا ہوا تھا کہ اُن لڑکوں کی منزل آ گئی اور مغرب سے پانچ منٹ پہلے ایک درمیانے درجے کے اسٹیشن پر وہ تینوں مجھ سے گلے مل کر اُتر گئے۔ اُترنے سے پہلے اُن میں سے ایک نے شاید اپنا پتا، یا ٹیلی فون نمبر لکھ کر اُن دو بہنوں میں سے ایک کی جانب اُچھالا لیکن چائے والے لڑکے کے درمیان میں آ جانے کی وجہ سے وہ درمیان میں ہی کہیں گر گیا۔ تب تک لڑکیوں کے باپ کی توجہ اُن کی جانب ہو چکی تھی لہٰذا وہ مایوسی کے عالم میں مجھ سے گلے ملتے ہوئے دھیرے سے میرے کان میں بولا ''اپنی قسمت خراب ہے حافظ جی...... ہوسکے تو اُترنے سے پہلے بڑی والی کو ارشد کا سلام کہیے گا۔ اُس کا نام ناہید بتایا ہے اُس کے بھائی نے......'' فوراً ہی ٹرین نے جھٹکا لیا اور اسٹیشن ہماری نظروں سے اوجھل ہونے لگا۔ تینوں میری جانب ہاتھ ہلاتے ہوئے مغرب کے وقت کے اندھیرے کا حصہ بنتے گئے۔ حسبِ معمول مغرب کے وقت کے عجیب سے اثر نے میرے اِردگرد اُداسی کے سائے لمبے کر دیئے۔ میں نہ جانے کیوں اس زوال کے وقت اس قدر نڈھال سا ہو جاتا تھا۔ سارے دن کی تنہائی ایک ہی لمحے میں میرے اندر بسیرا کر لیتی تھی۔ اچانک ہی میرے اِردگرد چنبیلی کے تیل جیسی عجیب سی خوشبو بکھر گئی۔ میں نے چونک کر سامنے والی برتھ پر نظر ڈالی تو ایک چھوٹے قد کا منحنی سا شخص جس کے بال شاید اسی تیل میں چپڑے ہوئے تھے اور پیچھے کی جانب چپکا کر بنائے گئے تھے، اپنی چھوٹی چھوٹی، لیکن نیزے کی نوک جیسی چبھتی نظروں سے مجھے گھورتا ہوا دکھائی دیا۔ مجھے حیرت ہوئی کیوں کہ مجھے اُس کی آمد اور برتھ پر چڑھنے کی بالکل بھی خبر نہیں ہوسکی تھی۔ شاید وہ اُس وقت برتھ پر آ چڑھا ہو جب میں چلتی ٹرین میں ہی بیٹھے بیٹھے مغرب کی نماز ادا کر رہا تھا۔ مجھے اُس کی چبھتی نظروں سے اُلجھن سی ہونے لگ گئی تھی۔ جانے یہ جبل پور کا اسٹیشن کب آئے گا۔ اُس نے شاید میرے اندر کی بے چینی بھانپ لی اور وہیں سے بولا ''کہاں جانا ہے......؟'' میں سٹ پٹا سا گیا۔ ''جی...... جبل پور......'' ''ہونہہ...... جبل پور میں کس کے پاس جاؤ گے......؟...... مجھے بھی وہیں اُترنا ہے......'' میں نے بات بنائی ''وہ مجھے لینے خود ہی اسٹیشن پر آ جائیں گے......'' اب میں اُسے کیا بتاتا کہ خود مجھے ابھی تک پتا نہیں تھا کہ مجھے جبل پور میں کس کے پاس جانا ہے؟ میں تو سلطان بابا کے حکم کی تعمیل میں اس ٹرین میں آ بیٹھا تھا اور مجھے اتنا ہی بتایا گیا تھا کہ مجھے

بل پور کے اسٹیشن پر اُتر جانا ہے۔ لیکن شاید اُس کی تشفی نہیں ہوئی۔ وہ اب بھی لگاتار اُسی رح مجھے گھورے جا رہا تھا۔ کچھ ہی دیر میں مجھے یوں لگنے لگا کہ اُس کی نظر کی یہ دھار میرے ود کے آر پار ہو جائے گی۔ وہ تو بھلا ہوا سامنے بیٹھے ہوئے دیہاتی نما ایک مسافر کا جس نے ے کھانے کا ڈبہ کھولا اور سبھی مسافروں کو کھانے کی پیش کش کرنے لگا۔ حالانکہ اُس کے ٹفن ں بمشکل اتنا کھانا تھا کہ صرف ایک انسان کا ہی پیٹ بھر پاتا لیکن شاید کسی نے سچ ہی کہا ہے رزق کی برکت اور فراوانی، نیت کی فراوانی سے متصل ہوتی ہے۔ اُس شخص کے کھانے کا ہ بھلے ہی خالی تھا لیکن اُس کی نیت بھری ہوئی تھی اور باقاعدہ چھلک رہی تھی...... اور اس کراہٹ کا نور اور اطمینان اُس کے چہرے سے بھی صاف عیاں تھا۔ اُس نے لجاجت سے سے بھی کہا ''بیٹا...... ایک لقمہ تو لے لو...... میری خوشی کی خاطر......'' میں نے مسکرا کر ایک لہ توڑا اور سالن میں بھگو کر منہ میں رکھ لیا۔ سچ ہے کہ خلوص اور محبت کا اپنا ہی ایک ذائقہ ہوتا ے جسے اگر زبان کے ذائقے کے غدود نہ بھی محسوس کر سکیں پر رُوح اس ذائقے سے بخوبی آشنا ی ہے۔ اس سارے ہنگامے میں کچھ پل کے لیے ہی سہی، پر کم از کم مجھے اس عجیب الخلقت ں کی گھورتی نگاہوں کے احساس سے نجات مل گئی۔ کچھ دیر بعد جب میں نے اُوپر برتھ کی ب نگاہ ڈالی تو وہ سر تک چادر تانے لیٹ چکا تھا۔ اگلے حصے میں بیٹھی بہنوں میں سے بڑی لی، جس کا نام ارشد نے ناہید بتاتا تھا، نے اپنے ریڈیو کی سوئی گھمائی اور چند سرسراہٹوں کے کسی نغمے کے بول فضا میں گونجے۔

''مالک نے بنایا...... انسان کو

انسان محبت کر بیٹھا......

وہ اُوپر بیٹھا...... کیا جانے......؟

انسانوں پہ کیا گزری ہے...... گزری ہے......

دیوانوں سے یہ مت پوچھو...... دیوانوں پہ کیا گزری ہے............

تبلیغی جماعت میں سے ایک بزرگ جو میرے قریب ہی بیٹھے تھے اُن کے چہرے پر اری کے آثار نمایاں ہو گئے اور وہ دھیرے سے بڑبڑائے ''لاحول ولا...... یہ شاعر حضرات ہ کیا کیا اُول فول بکتے رہتے ہیں۔ یہ تو نرا کفر ہے...... بھلا یہ بھی کوئی بات ہوئی کہ اُسے

اُوپر بیٹھے کچھ خبر ہی نہیں......نعوذ باللہ......''

ساری تبلیغی جماعت نے اُن کی بات سن کر اپنا سر دھنا۔ شاید بغاوت اور شکو
انسانوں کے خمیر کے ساتھ ہی گوندھا گیا ہوگا۔ تبھی ہم اپنے شعروں میں، اپنی دہائیوں میں
اپنی شکایتوں میں اُوپر والے سے اپنے حال سے بے خبر ہونے کی فریاد کرتے رہتے ہیں۔
شاید اسی لیے وہ شعر اور غزلیں بھی زیادہ مشہور ہوتی ہیں جن میں خدا سے شکوہ کیا گیا ہو۔
بزدل جو خود اپنے دل کی بات براہ راست خدا سے کہہ نہیں پاتے وہ ایسے شعر اور غزلیں پڑھ
ہی خوش ہو جاتے ہیں جس میں خدا کے سامنے اُس کی دی ہوئی تقدیر کی وجہ سے بربادی
فسانے بیان کیے گئے ہوں۔ شاید اسی لیے انسان کو ازل سے ''ناشکرے پن'' کے طعنے
سامنا بھی کرنا پڑا ہے۔ حیرت کی بات یہ تھی کہ جہاں شکوہ نہ کرنے والوں کا گروہ خود کو خدا
زیادہ قریب تر اور پسندیدہ ہونے کا حق دار سمجھتا تھا، وہیں یہ سارے شاعر، ادیب اور اُن جیسے
دوسرے شکوہ گر بھی خود کو خدا کا سب سے زیادہ لاڈلہ بتاتے تھے۔ اب یہ تو خدا ہی جانتا تھا
اُن میں سے زیادہ سچا کون تھا۔ ہجوم ''شکوہ کناں''، یا ''شکوہ گریزاں''......؟

اگلے اسٹیشن پر دونوں شوخ بہنیں بھی اپنے بھائی اور ماں باپ سمیت اُتر گئیں۔ جا
ہوئے بڑی بہن کی نظر میری نظر سے ٹکرائی۔ مجھے ارشد کی کہی ہوئی بات یاد آ گئی اور میر
ہونٹوں پہ خود بخود ایک دھیمی سی مسکان اُبھر آئی۔ ہمارے اِردگرد نہ جانے ایسی کتنی کہانیاں
سے پہلے ہی دم توڑ دیتی ہیں۔ بعض مرتبہ تو خود ہمیں بھی پتا نہیں چلتا کہ ہمارے مقدر کی کا
سی نظر ہم سے چوک گئی ہے۔ محبت کی جانے کتنی داستانیں بننے سے پہلے ہی ختم ہو جاتی ہیں
اگر ارشد کا پھینکا ہوا پرچہ ناہید کے قریب گرتا اور وہ اُسے پڑھ لیتی تو کیا ہوتا......؟
تقدیر صرف اُسی قدر لکھے کا نام ہے جو ہمارے ساتھ پیش آتا ہے؟ اور جو ہمارے ساتھ پیش
آتے آتے پیش نہیں آتا۔ اس کی حقیقت کیا ہے؟ اگر ارشد کے پھینکے ہوئے پرچے
درمیان میں اُس شخص کا کاندھا نہ آتا اور وہ رُقعہ ناہید کے پیروں میں جا گرتا تو کیا اُن کی اِ
مختصر سی محبت کی کہانی کا انجام کچھ اور نہ ہوتا......؟ کہیں ہماری بیک وقت دو تقدیریں تو نہیں
لکھی گئی ہوتیں......؟ کہیں ہم ہر بار انجانے میں اپنی اصل تقدیر سے چوک تو نہیں رہے
ہوتے......؟ کہیں خدا نے بندے کو یہ اختیار تو نہیں دے رکھا ہوتا کہ وہ اپنی ہمت اور محنت

اِسی جستجو سے اپنی تقدیر کو بدل سکے......؟ افسوس میرے پاس سوال تو بہت تھے لیکن
ایک بھی نہیں تھا............

میں نے ایسے ہی کچھ سوال ٹرین سے اُترتی ہوئی ناہید کی آنکھوں میں بھی دیکھے۔ شاید
اُترتے وقت مجھ سے یہی گلہ کر رہی تھی کہ میں نے ارشد سے اُس کا مکمل پتا خود ہی پوچھ
کیوں نہیں بتا دیا......؟ اب وہ کبھی زندگی بھر اُسے دیکھ نہیں پائے گی۔ کسی سے بیاہ
پہلے بیوی، پھر ماں، پھر نانی، دادی بن جائے گی لیکن جاڑے کی خنک رات کی طرح یہ
خلش تاعمر اُس کے دل میں کپکپی سی پیدا کرتی رہے گی۔ ایک چہرہ وقت کی دُھول میں
کر مٹنے کے باوجود اُس کے کورے دل کے آئینے میں اپنا ہیولہ چھوڑ جائے گا۔ نہ جانے
پل بھر میں مجھے ایسے لگا جیسے کسی نے میرا دل اپنی مٹھی میں لے کر مسل دیا ہو۔ مجھے یوں
ناہید اور ارشد کے انجان مقدر کی پرچی کسی اور سے نہیں، خود مجھ سے ہی کہیں گم ہو گئی
ناہید کے اُتر جانے کے بعد میں خود بھی نہ جانے کتنی دیر یونہی گم صم سا بیٹھا رہا، تاوقتیکہ کوئی
چلایا ''جبل پور آ گیا......جبل پور......''

میں نے چونک کر سر اُٹھایا تو ٹرین رُک چکی تھی۔ میں اپنا مختصر سا بیگ لے کر اندھیرے
ران سے پلیٹ فارم پر اُتر گیا۔ اسٹیشن سنسنان پڑا ہوا تھا۔ رات گہری ہو چکی تھی اور ٹرین
جانے کے بعد صرف میں ہی وہاں تنہا کھڑا رہ گیا۔ اچانک مجھے اس سناٹے میں پھر سے
دو آنکھوں کی چبھن کا احساس ہوا۔ میں چونک کر پلٹا تو دُور اندھیرے میں وہی عجیب
ت جسامت والا کمزور سا شخص ایک لیمپ پوسٹ کی مریل سی پیلی روشنی کے دائرے میں
مجھے گھور رہا تھا۔ نہ جانے کیوں پل بھر میں ہی مجھے اپنی ریڑھ کی ہڈی میں ایک عجیب سی
اہٹ کا احساس ہوا۔ آخر یہ شخص مجھ سے کیا چاہتا تھا......؟

سود و زیاں

ابھی میں یہ سوچ ہی رہا تھا کہ آگے بڑھ کر اُس شخص سے اس آنکھ مچولی کا مقصد پوچھوں کہ اچانک مجھے اپنے عقب میں ایک کرخت سی آواز سنائی دی۔ ''کیا آپ کا نام عبداللہ ہے؟'' میں اس قدر محو تھا کہ اُچھل ہی تو پڑا۔ میں نے پیچھے مڑ کر دیکھا۔ ایک دیہاتی سا شخص عام مزدوروں کے حلیے میں کھڑا نظر آیا۔ اُس نے اپنا صافہ سر پر خوب کس کر باندھ رکھا تھا اور پرانے بوسیدہ گرم کوٹ کو آخری بٹن تک خوب کس کر سینے پر باندھ رکھا تھا۔

''جی...... میں عبداللہ ہوں......'' اُس نے میرا جواب سنتے ہی لپک کر میرا بیگ اُٹھایا اور آگے بڑھتے ہوئے بولا۔ ''مجھے کریم خان صاحب نے بھیجا ہے۔ میرے پیچھے چلے آئیں......'' میں اُس سے یہ بھی نہیں پوچھ پایا کہ یہ کریم خان صاحب کون ہیں جنھوں نے آدھی رات کو اُسے مجھے اسٹیشن سے لانے کے لیے بھیجا ہے۔ شاید اُس کے انداز میں ہی اتنی بے ساختگی تھی کہ میں نے بھی اُس کے پیچھے قدم بڑھا دیئے۔ اچانک مجھے اس لیمپ پوسٹ کے نیچے کھڑے شخص کا خیال آیا اور میں پلٹ کر دیکھا اور پھر میرے قدم جم سے گئے۔ لیمپ پوسٹ خالی پڑی تھی۔ وہاں اب دُور دُور تک کوئی بھی نظر نہیں آ رہا تھا۔ میں حیرت سے آنکھیں پھاڑے اندھیرے کی چادر کو چیرنے کی کوشش میں مصروف تھا کہ پھر سے میرے رہبر کی آواز گونجی۔ ''بابو جی چلیں...... ہمیں بہت دُور جانا ہے......'' میں چونک کر پلٹا لیکن پلیٹ فارم سے نکلتے نکلتے بھی میں نے کئی بار مڑ کر دوبارہ اُسے تلاش کرنے کی کوشش کی لیکن اُسے تو نہ جانے زمین کھا گئی تھی، یا آسمان نگل چکا تھا۔ مجھے زیادہ حیرت اس لیے ہوئی کہ اسٹیشن سے باہر نکلنے کا واحد راستہ صرف وہی بڑا سا آہنی دروازہ تھا جس کے قریب ہم اس وقت کھڑے تھے، پھر وہ کہاں چلا گیا......؟

میں اسٹیشن سے باہر نکلا تو رات کے کہرے اور سفید بادلوں جیسی دُھند میں میں نے کریم خان کے بھیجے ہوئے بندے کو ایک تانگے میں کوچوان کی جگہ بیٹھے دیکھا۔ میں بنا کچھ کہے پچھلی نشست پر بیٹھ گیا اور اُس نے تانگے کو اینٹوں سے بنی سڑک پر ڈال دیا۔ کچھ دیر بعد کوچوان نے اپنی جیب سے ایک بیڑی نکال کر سلگائی اور مجھ سے پوچھا ''بابو جی...... بیڑی پئیں گے......؟'' ''نہیں...... میں بیڑی نہیں پیتا......'' وہ اتنی دیر میں پہلی بار مسکرایا۔ ''اچھی بات ہے...... یہاں کی بیڑی ویسے بھی کچھ خاص ذائقہ دار نہیں ہوتی۔ بیڑی تو اصلی جبل پور کی ہوتی ہے...... وہی بارڈر پار والا جبل پور...... سنا ہے کہ وہاں بیڑی کے بڑے بڑے کارخانے ہوتے تھے۔ جہاں سے ساری دنیا کو بیڑی بھیجی جاتی تھی...... پھر وہاں سے کچھ مزدور سرحد سے اس پار اس گاؤں میں آ کر بس گئے اور انہوں نے یہاں بھی بیڑیوں میں دیسی تمباکو بھرنا شروع کر دیا تو اس علاقے کا نام بھی سرحد پار والے جبل پور کے نام پر پڑ گیا۔ پر جناب، اصل جبل پور تو اُسی طرف والا ہے۔ ہمارا والا تو اُس کی نقل بھی نہیں...... کیا بات ہے اُس طرف کی بیڑیوں کی...... ایک کش میں ہی رُوح تازہ ہو جاتی ہے...... پر جی میری گھر والی کہتی ہے کہ بیڑی پینا بُری لت ہے...... بندے کو آخری عمر میں ٹی بی ہو جاتی ہے...... پر جناب بیڑی نہ پی کر لمبی عمر جینے سے تو یہی بہتر ہے کہ بندہ بیڑی پی کر جلدی مر جائے......'' وہ لگاتار اور بنا رُکے بولے جا رہا تھا۔ شاید اُسے بہت دنوں سے کوئی اچھا سامع میسر نہیں آیا تھا۔ اُس کا نام بشیر تھا جو اب بوڑھا ہو چکا تھا۔ یہ تانگا اُس کے باپ کے دور کی جاگیر تھا جو ترکے میں اُس کے حصے میں آیا تھا یہی وہ واحد تانگا تھا جو گاؤں بھر کی سواریوں کو اسٹیشن چھوڑنے اور وہاں سے گاؤں کے لیے لانے کے کام آتا تھا۔ سردی کی وجہ سے دُھند بڑھتی جا رہی تھی اور ہم اب ایک کچی سڑک پر آ چکے تھے۔ کوئی دُور سے ہمیں دیکھتا تو ہم اُسے شاید بادلوں میں تیرتے ہوئے ہی نظر آتے۔ گھوڑا اب تیزی سے ہانپ رہا تھا اور اس کے نتھنوں سے گرم بھاپ وقفے وقفے سے بھاری آواز کے ساتھ یوں چھوٹ رہی تھی جیسے کوئی پرانا اسٹیم انجن دوڑا جا رہا ہو۔ بشیرے نے تانگے کے بانسوں کے اگلے سرے پر لگے گیس کے دونوں ہنڈولے جلا رکھے تھے اور اُن سے پھیلتی مٹیالی سی روشنی میں ہم کہرے کی اس چادر کو چیر رہے تھے جس کی شدت کی وجہ سے ہم گز بھر دُور پڑی چیز کو بھی دیکھ نہیں پا رہے تھے۔ آخر خدا خدا کر کے کسی آبادی کے آثار شروع ہوئے حسبِ معمول پہلا استقبال گلیوں کے آوارہ کتوں نے کیا۔ کچھ چیزیں، کچھ باتیں شاید دنیا کے کسی خطے میں تبدیل نہیں ہوتیں۔ رات کا فسوں ہر جگہ اور ہمیشہ ایک سا ہی رہتا ہے۔ کچھ

ڈرانے والا، کچھ چھپانے والا...... اور بہت سے عیبوں پر پردہ ڈالنے والا۔

تانگا ایک بڑی سی کچی حویلی کے پھاٹک نما لکڑی کے دروازے کے قریب جا کر رُک گیا۔ بشیرے نے آواز لگائی ''اوئے کرمو اوئے...... مہمان آئے ہیں...... بوا کھول دے......'' اندر سے کسی بوڑھے کے کھنکارنے کی آواز سنائی دی۔ ''آیا......'' کچھ ہی دیر میں پھاٹک کھل گیا اور بشیرے نے تانگا اندر وسیع صحن میں ہی ہنکا دیا۔ صحن کچی اینٹوں سے چنا گیا تھا۔ لیکن مجھے یوں محسوس ہوا کہ جیسے یہ حویلی کا بیرونی صحن ہوگا۔ کیونکہ صحن کے چاروں طرف مہمان خانے کے طرز پر کمرے بنے ہوئے تھے اور سامنے ہی ایک اور ڈیوڑھی نظر آ رہی تھی جس کے اندر ایک دوسرا لکڑی کا دروازہ نظر آ رہا تھا جو اندر والے صحن کی جانب کھلتا تھا۔ بوڑھا کرمو اپنے ہاتھ میں ایک سال خوردہ سی لالٹین اُٹھائے ہماری جانب بڑھا اور اُس نے جلدی سے مجھے سلام کیا اور میرا بیگ تھام لیا۔ بشیرے نے اُسے ہدایات جاری کیں۔

''مہمان کو روٹی ٹکر کھلا کر نئے والے مہمان خانے میں سلا دینا۔ خان صاحب اب صبح ہی ملاقات کریں گے...... کیا سمجھا......؟'' کرمو نے سر ہلایا۔ بشیرا مجھ سے رُخصت ہو کر چلا گیا اور کرم دین نے مجھے پُرانے طرز کی ایک بیٹھک میں پہنچا دیا جو وہیں صحن کے دائیں طرف بنی ہوئی تھی۔ کمرہ کافی کشادہ تھا اور کھڑکی اس صحن کی جانب کھلتی تھی جہاں ابھی کچھ دیر پہلے بشیرے نے مجھے چھوڑا تھا۔ پلنگ کے ساتھ ایک ڈوری لگی ہوئی تھی جس کا دوسرا سرا چھت پر لگے ایک کنڈے سے ہوتا ہوا ایک بڑے سے کپڑے کے بنے ہوئے ہتھ پنکھے سے جڑا ہوا تھا۔ لیکن آج کل سردی کا موسم ہونے کی وجہ سے ڈوری کو لپیٹ کر پلنگ کی پائینتی سے باندھ دیا گیا تھا۔ بائیں طرف دیوار کے اندر ہی ایک بڑی سی انگیٹھی بنی ہوئی تھی جس میں کچھ ہی دیر میں کرم دین نے دھکتے ہوئے انگاروں کی پوری پرات اُلٹ دی اور کمرہ کچھ ہی دیر میں خنک سے خوشگوار حدت اختیار کر گیا۔ کرم دین عرف کرمو کے اصرار پر میں نے چند لقمے حلق سے نیچے اُتارے اور رات ڈھلنے کا انتظار کرنے لگ گیا۔ نیند کا تو کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ میری یہ سہیلی تو ویسے ہی عام حالات میں بھی مجھ سے رُوٹھی رہتی تھی تو اس انجان منزل پر بھلا کب میری پلکوں تلے ڈیرہ جمانے والی تھی۔ سو یونہی پلکیں جھپکاتے صبح کی اذانیں سنائی دینے لگیں۔ نماز پڑھنے کے بعد میں باہر صحن میں نکل آیا۔ یہ پُرانے طرز کی بڑی سی لیکن کچی

دیواروں اور کچے دالان والی حویلی تھی۔ کرم دین جو وہیں بیرونی ڈیوڑھی کے پاس ایک چھوٹی سی لوہے کی انگیٹھی سلگائے ہوئے بیٹھا تھا اُس نے جلدی سے ایک پیڑھا میرے بیٹھنے کے لیے اسی انگیٹھی کے پاس رکھ دیا اور خود جلدی سے اپنی کوٹھڑی سے سلور کی ایک بڑی سی چینک اُٹھا کر لے آیا اور مٹی کے پیالے میں گرما گرم چائے اُنڈیل کر اُس نے میرے ہاتھوں میں تھما دی۔ ہماری زندگیوں میں کچھ تعلق کس قدر مضبوط اور لازم و ملزوم بن جاتے ہیں جیسے صبح سویرے اور چائے کے کپ کا تعلق...... مگر جب چائے ایجاد نہیں ہوئی ہوگی تب لوگوں کی صبح کیسے ہوتی ہوگی؟ میں گرم پیالے کے کناروں سے نکلتی بھاپ کے عقب میں کرم دین کے جھریوں بھرے چہرے کو دیکھتے ہوئے نہ جانے کتنی دیر انہی سوچوں میں گم بیٹھا رہا۔ ہمارے شہروں میں صبح ہمیشہ ایک دم چھم سے کود کر اور ایک چیختے چنگھاڑتے شور کی صورت میں ظاہر ہوتی ہے جب کہ یہ دُور دراز کے گاؤں اور علاقے ہر روز صبح کو ایک مہربان اور نرم اُجالے کی طرح خود پر وارد ہوتا محسوس کرتے ہیں۔ جس کی ابتدا عموماً مرغ کی بانگ، چرخے کی کوک اور پن گھٹ پر لگے ہینڈ پمپ کی چوں چوں سے ہوتی ہے۔ مویشی اور ڈھور ڈنگر چونک کر سر اُٹھاتے ہیں اور بیل کے گلے میں بندھی گھنٹی ٹن ٹن بج اُٹھتی ہے۔ رات بھر جاگنے کے بعد کھیت کی رکھوالی کرنے والے راکھے لمبی لمبی جمائیاں لیتے ہوئے منہ اندھیرے گھر کو لوٹتے ہیں تو اُن کے قہقہے راہوں میں گونجنے لگتے ہیں۔ کچھ ہی دیر میں پن چکی کی سیٹی بھی بلند ہوتی ہے۔ گھروں کے آنگن میں دودھ اور لسی بلونے کی رڑک گونجنے لگتی ہے۔ بڑے بوڑھے اور بزرگ کھنکار کھنکار کر جوانوں کی مست نیند میں رخنہ ڈالنے لگتے ہیں۔ اور پھر کچھ ہی دیر میں مشرق کی جانب سے ایک گلابی آگ فلک کو دھکانے لگتی ہے جو دھیرے دھیرے سنہری آتشیں رنگت دھار لیتی ہے اور یوں نہ جانے کتنے مرحلوں کے بعد سورج اپنا دمکتا مکھڑا دھیرے دھیرے سرکاتا ہوا گاؤں کی ایک روشن صبح کو مکمل کرتا ہے۔ اتنی خوب صورت صبحوں کے چشم دید گواہ یہ گاؤں والے تبھی تو اتنے اُجلے چہروں اور پاک من کے مالک ہوتے ہیں۔ وہ صبح میری زندگی کی اُن چند صبحوں میں سے ایک تھی جسے میں نے گھونٹ گھونٹ جیا تھا۔ بالکل اس گرم بھاپ اُڑاتی چائے کے پیالے کی طرح...... جو اس وقت میرے ہاتھوں میں تھما تھا۔ میں نے آخری گھونٹ لیا ہی تھا کہ اندرونی پھاٹک کھلا اور اس میں لمبے قد کا ایک رُعب دار شخص اپنے

سراپے کو گرم کھیس میں لپیٹے اندر سے برآمد ہوا۔ دونوکر اُس کے دائیں بائیں اُس کا حقہ اور
تمبا کو وغیرہ اُٹھائے ہوئے تیزی سے چلے آرہے تھے۔ اُس نے آتے ہی مجھے زور سے بھینچ کر
گلے لگا لیا۔

''معاف کرنا جی...... رات کو مجھے ذرا تپ چڑھ گئی تھی۔ دوا پی تو اُونگھ آگئی اور میں آپ
کا استقبال نہیں کر سکا۔ میرا نام کریم خان ہے...... سلطان بابا نے آپ کے آنے کی خبر کر دی
تھی۔ پر آپ تو بالکل نوجوان ہو جی...... میں سمجھا تھا کہ سلطان بابا نے پہاڑی والی درگاہ کی
خدمت کے لیے کسی بزرگ کو بھیجا ہو گا......''

اوہ...... تو میری ڈیوٹی اس بار جبل پور میں لگائی گئی تھی۔ یہ تو مجھے اُسی وقت سمجھ جانا
چاہیے تھا جب سلطان بابا نے مجھے ٹکٹ دے کر جبل پور کے لیے روانہ ہونے کو کہا تھا۔ لیکن
اتنی دُور...... ملک کے اس دوسرے کونے میں بھیجنے کی کوئی خاص وجہ ہی ہو گی۔ صرف درگاہ کی
خدمت ہی کرنی ہوتی تو سلطان بابا یہیں جبل پور کے آس پاس سے کسی خدمت گار کو ہی بھجوا
دیتے۔ کریم خان نے مجھے بتایا کہ سلطان بابا سال چھ مہینے میں یہاں کا چکر ضرور لگاتے ہیں۔
گاؤں سے پرے پہاڑی کی چوٹی پر بنی درگاہ میں مدفون بزرگ بھی کریم خان کے آباؤ اجداد
سے ہی تعلق رکھتے تھے جن کے بارے میں مشہور تھا کہ وہ حضرت مجدد الف ثانی رحمتہ اللہ علیہ
کے سپاہیوں میں شامل تھے اور دین کی حفاظت کرتے ہوئے اُنھی سپاہیوں کے ساتھ شہید ہو
گئے تھے جنھوں نے اس عظیم مقصد کے لیے اپنی جانیں، جاں آفریں کے سپرد کی تھیں۔ تب
سے لے کر اب تک اس درگاہ پر جلتا دیا کبھی بجھنے نہیں دیا گیا تھا اور اسے ایک نور کے
استعارے کے طور پر لیا جاتا تھا جو اس دنیا میں ظلم اور کفر کے اندھیرے کو مٹانے کی نشانی کے
طور پر روشن رکھا گیا تھا۔ کبھی کبھی میں یہ سوچتا تھا کہ اللہ کے وہ سارے نیک بندے جو ایسی
درگاہوں اور مقبروں میں مدفون تھے جنھوں نے خدا کی وحدت اور اُس کے کلمے کی خاطر اپنی
جان دی، یا اپنی ساری زندگی لوگوں کو یہ سمجھانے میں بتا دی کہ اللہ ایک ہے اور کوئی اُس کا
شریک نہیں ہے، انہیں اپنے مزاروں پر شرک جیسی بدعات دیکھ کر کس قدر اذیت ہوتی ہو گی۔
جب وہ یہ دیکھتے ہوں گے کہ لوگ انہیں وسیلہ بنا کر خدا سے مانگنے کے بجائے خود اُنہی سے
آس لگائے بیٹھے ہیں تو اُن کی رُوح کو کس قدر تکلیف ہوتی ہو گی۔ کریم خان صاحب نے

بڑی محبت سے مجھے دوپہر کے کھانے تک حویلی میں ہی رُکنے کی درخواست کی اور پھر سہ پہر کو
جب بشیرا اپنا تانگا حویلی کے بیرونی صحن میں لگا چکا تو وہ کپڑے کی چند پوٹلیاں سنبھالے مجھے
تانگے پر سوار کرانے آپہنچے۔ ان پوٹلیوں میں گڑ، چنے، اخروٹ اور بادام اور ایسی ہی چند اور
چیزیں تھیں جو خان صاحب بطور خاص میرے لیے لے کر آئے تھے۔ میں نے اُن کے خلوص
کو تکلف کا زنگ لگا کر داغ دار کرنا مناسب نہیں سمجھا اور خوشی سے ساری پوٹلیاں تانگے کی
پچھلی نشست پر رکھوا دیں۔ انہوں نے مجھے یہ بھی بتایا کہ درگاہ کے گودام میں ابھی مہینے بھر سے
کچھ زیادہ کا ہی راشن پڑا ہو گا پھر بھی اگر کسی بھی چیز کی ضرورت ہوئی تو میں بلا جھجک اُن سے
کہلوا دوں۔ بشیرا ہر جمعرات کی شام کو دیے کا تیل بدلنے کے لیے درگاہ جاتا تھا۔ اُسی کو
میرے اور خان صاحب کے درمیان پیغامبر کے فرائض سرانجام دینا تھے۔ بشیرے نے تانگا
موڑا ہم حویلی کا پھاٹک کراس کر کے نکلے ہی تھے کہ اچانک خان صاحب کو جیسے کوئی ضروری
بات یاد آگئی۔ وہ جلدی سے میری جانب بڑھے ''ہاں عبداللہ بیٹا...... ایک بات تو میں تمہیں
بتانا بھول ہی گیا تھا۔ آج کل درگاہ میں کوئی سائل آکر ٹھہرا ہوا ہے۔ بڑا پریشان اور مجبور لگتا
ہے۔ اپنی کسی منت کے پورے ہونے کی آس میں اپنا گھر بار اور آرام تیاگ کر اس ویرانے
میں پڑا ہوا ہے۔ تمہیں کچھ دن تک اُسے بھی اپنے ساتھ ہی رکھنا ہو گا۔ بہت پریشان ہے بے
چارہ......'' ''آپ بے فکر رہیں...... میری جانب سے اُسے کوئی تکلیف نہیں پہنچے گی۔'' بشیرے
نے گھوڑے کی لگامیں ڈھیلی کر دیں اور کچھ ہی دیر میں تانگا گاؤں سے باہر جاتی اُسی سڑک پر
دوڑ رہا تھا جو بہت دُور جا کر محبوب کی کمر کی طرح اچانک ہی خم کھا گئی تھی۔ سڑک کے ساتھ
ساتھ ٹھنڈے اور صاف شفاف تازہ پانی کی ایک نالی بہہ رہی تھی جس میں بہتے پانی کی
گھنگھروؤں جیسی سرگم اور تانگے کی ٹپ ٹاپ ٹپ ٹاپ مل کر ایک مدھری موسیقی پیدا کر رہے
تھے۔ ہماری زندگی میں باتیں تو ہمیشہ ہی بولتی ہیں لیکن ایسا بہت کم ہوتا ہے کہ سناٹا ہم سے
بات کرے۔ گاؤں کی نارنجی خزاں رسیدہ پتوں سے ڈھکی اس سڑک کے سناٹے اور اس کے
کنارے دوڑتے پانی کے اس نالے کی ترنم نے بھی اس دن مجھ سے بہت سی باتیں کیں۔
بشیرے کو جب سے پتا چلا تھا کہ میں درگاہ کا نیا مجاور ہوں تب سے اُس کا انداز کافی عقیدت
مندانہ سا ہو گیا تھا۔ حویلی میں ہی وہ کئی بار مجھ سے یہ درخواست کر چکا تھا کہ میں اُس کے لیے

اولادِ نرینہ کی ''منت'' ضرور مانگوں۔ بدلے میں بیٹا ہونے پر وہ مجھے پورے ایک سو اکیاون روپے اور گڑ کی پوری ایک بوری نذر کرے گا۔ میں نے اُس سے کہا کہ ''ایک سو اکیاون روپے میں وہ پورا بیٹا مانگ رہے ہو، کم از کم پورے دو سو ایک روپے کی منت تو ہونی چاہیے۔'' بشیرے نے چونک کر پیچھے میری طرف پلٹ کر دیکھا اور پھر میری آنکھوں میں شرارت کی تحریر پڑھ کر وہ بھی زور سے ہنس پڑا۔ ''واہ جی...... جی خوش کر دیا آپ نے بشیرے کا...... اب مجھے پورا یقین ہے کہ بشیرے کی دعا بھی ضرور پوری ہوگی......'' میں نے اُس سے پوچھا کہ وہ اس یقین کے ساتھ خود خدا سے دعا کیوں نہیں کرتا کہ اللہ اُسے بیٹا عطا کرے۔ جواب میں اُس نے جلدی سے کانوں کو ہاتھ لگائے ''نا جی نا...... بھلا یہ گناہ گار بشیرا اس قابل کدھر کہ خود اللہ میاں سے کچھ مانگ سکے......اور پھر بشیرے کا مانگنا تو صرف مانگنا ہوگا نا جناب......لیکن آپ لوگ تو اللہ جی سے ضد بھی کر سکتے ہو...... یہ کام صرف مانگنے سے نہیں ہوتا جی...... یہ تو ضد والا معاملہ ہے......صرف دعا سے ہی بیٹا ملنا ہوتا تو میری گھر والی پچھلے سات سال سے سجدے میں نہ گری ہوتی......'' میں نے چونک کر بشیرے کی جانب دیکھا۔ اس سیدھے سادھے سے دیہاتی نے دعا کا کتنا بڑا کلیہ بتا دیا تھا مجھے۔ لیکن کیا واقعی ہم اللہ سے ضد بھی کر سکتے تھے؟ اور اپنی خواہشیں اور دعائیں ضد کر کے بھی اس سے منوا سکتے ہیں؟ جب بھی بہت لاڈلہ بچہ اپنی پسند کا کھلونا نہ ملنے پر گھر کے صحن میں پیر پٹخ پٹخ کر آسمان سر پر اُٹھا لیتا ہے تب یا تو اُسے اپنی ماں سے مار پڑتی ہے، یا پھر ممتا کی ماری ماں کسی بھی طرح مانگ تانگ کر اُسے وہ کھلونا دلوا ہی دیتی ہے۔ تو کیا یہی کلیہ اُس ستر ماؤں سے زیادہ پیار کرنے والے کے ہاں بھی چل جاتا ہوگا؟ وہاں تو مار پڑنے کا بھی امکان نہیں تھا تو پھر ہم انسان اپنے خدا سے ضد کیوں نہیں کرتے......؟ کہیں یہ ہمارے عقیدے کی کمزوری تو نہیں؟ کہیں ہم طلب اور دعا کے اصل اُصول سے ناواقف تو نہیں......؟

تانگا اب اس دو رویہ ایستادہ درختوں والی سڑک سے آگے بڑھ کر ایک کھلے میدان والی سڑک پر دوڑ رہا تھا اور دُور پہاڑی پر واقع ایک چھوٹی سی درگاہ کے آثار اب دھیرے دھیرے نمایاں ہونے لگے تھے۔ آخر ہم اُس مقام پر بھی پہنچ گئے جہاں سے آگے تانگے کے راستے کی حد ختم ہو جاتی تھی۔ بشیرے نے بہت اصرار کیا کہ وہ میرے ساتھ ہی میرا سامان اُٹھا کر اُوپر

پہاڑی تک جانا چاہتا ہے لیکن میں نے وہیں سے اُسے رُخصت کر دیا۔ جاتے جاتے میں نے اُسے ایک بار پھر چھیڑا ''یہ تو بتاتے جاؤ کہ اگر اس بار واقعی بیٹا ہوا تو اُس کا نام کیا رکھو گے...... کچھ سوچا ہوا ہے پہلے سے کہ نہیں......'' بشیرا جو تانگے پر بیٹھ کر اپنا چھانٹا پکڑ چکا تھا دھیرے سے مسکرایا اور اُس نے میری جانب غور سے دیکھا...... پہلے تو نہیں سوچا تھا جی...... پر اب سوچ لیا ہے...... میں اُس کا نام ''عبداللہ'' رکھوں گا......'' بشیرا زور سے ہنسا اور تانگا کچی سڑک پر ٹپ ٹاپ کی دُھن پر دوڑنے لگا۔ میں کچھ دیر تک اپنے اس نئے بنتے رشتے کو دیکھتا رہا۔ ہم انسان کس قدر بھولے اور نازک ہوتے ہیں۔ کتنی جلدی رشتوں کے کومل دھاگے اپنی رُوح کے ریشوں سے جوڑ لیتے ہیں۔ شاید اسی لیے ہم پل پل ٹوٹتے اور جڑتے رہتے ہیں۔ خدا نے ہمارے اندر احساس نام کا یہ جو جذبہ رکھا ہے یہ ہمیں کسی کروٹ چین نہیں لینے دیتا۔ ایک آس ٹوٹتی ہے تو دوسری جنم لے لیتی ہے۔ بشیرا بھی ایک نئی آس لیے واپس جا رہا تھا۔

جب میں اپنا سامان لیے اُوپر چوٹی پر بنی درگاہ کے کچے صحن میں پہنچا تو بُری طرح ہانپ رہا تھا۔ دسمبر کی کچی دھوپ میں بھی میرا ماتھا پسینے سے بھیگ چکا تھا اور اسی پسینے نے میرے ماتھے سے ٹپک کر درگاہ کی سرزمین کو اپنا پہلا سجدہ پیش کیا۔ میں کچھ وہیں صحن میں بیٹھ کر سستاتا رہا۔ میرے اِردگرد درجنوں کبوتر اور چڑیاں دانہ چگ رہی تھیں۔ شاید کوئی کچھ دیر پہلے ہی انہیں دانہ ڈال گیا تھا۔ درگاہ کے صحن کے وسط میں مضبوط ٹین کی چادروں والی چھپر کے نیچے ایک قبر بنی ہوئی تھی جس کے اُوپر سبز چادر اور کچھ پھول بکھرے ہوئے تھے۔ پھولوں کی خشک پتیاں تیز ہوا سے بکھر کر صحن میں پھیل رہی تھیں۔ اچانک میرے پیچھے آہٹ ہوئی۔ میں چونک کر پلٹا تو ایک پکی عمر کا مرد شانوں پر کمبل ڈالے اور ہاتھ میں جلانے والی لکڑی کے چند گٹھے لیے اپنی جانب آتا نظر آیا۔ میں نے کھڑے ہو کر اُس کا استقبال کیا۔ وہ قریب آ گیا اور میری جانب ہاتھ بڑھا کر بولا ''اوہ...... تو تم ہو عبداللہ...... مجھے خان صاحب نے تمہاری آمد کے بارے میں بتایا تھا۔ میرا نام اصغر ہے...... اصغر احمد...... میں اپنی ایک منت کے سلسلے میں کچھ دن کے لیے یہاں ٹھہرا ہوا ہوں...... اچھا ہوا تم آ گئے......کبھی کبھی بہت تنہائی کا احساس ہوتا تھا یہاں......؟''

میں چاہتے ہوئے بھی اُن سے یہ نہیں پوچھ سکا کہ وہ کون سی منت تھی جس کی خاطر وہ

اس ویرانے میں پڑے ہوئے تھے۔ کیوں کہ بظاہر اپنے حلیے سے وہ صاحب کافی متمول خاندان سے دکھائی دیتے تھے۔ ہاتھ میں انتہائی قیمتی گھڑی، گلے میں سونے کی چین، اُنگلیوں میں ہیرے کی تین تین انگوٹھیاں اور چہرے پر دولت کی وہ خاص چمک جو اس درگاہ کے غریبانہ سے ماحول میں بھی اپنی جلوہ دکھا رہی تھی۔ میں نے اُن کا بڑھا ہوا ہاتھ تھام لیا۔

''خوشی ہوئی آپ سے مل کر...... چلیں اگر تنہائی صرف ایک سے دو ہونے سے ختم ہو سکتی ہے تو پھر وہ نفری تو میری آمد نے پوری کر دی ہے...... اُمید ہے ہمارا وقت اچھا گزرے گا۔''

کچھ ہی دیر میں عصر کی نماز کا وقت ہو گیا۔ میں نے اصغر صاحب کو بھی نماز کی دعوت دی لیکن مجھے اُن کا جواب سن کر ذرا سی حیرت ہوئی۔

''نہیں عبداللہ میاں...... میں اپنی نمازیں تنہائی میں ہی ادا کرتا ہوں...... دراصل اس کا تعلق بھی میری منت سے ہی ہے۔ اُمید ہے تم بُرا نہیں مانو گے......''

''نہیں نہیں...... اس میں بُرا ماننے کی کیا بات ہے...... نماز آپ کا اور خدا کا ذاتی معاملہ ہے۔ آپ اپنی نماز ادا کریں، میں اپنی نماز پڑھ لوں......'' وہ اُٹھ کر درگاہ کے صحن میں بنے ہوئے کچے کمروں میں سے ایک کی جانب بڑھ گئے۔ میرے رہنے کا انتظام بھی انہی کمروں میں سے ایک میں کیا گیا تھا لیکن میں نے وہیں صحن میں بچھے جائے نماز پر عصر پڑھ لی۔ حسب معمول نماز کے لیے کھڑے ہوتے ہی مجھے اُسی ازلی بے چینی اور مختلف وسوسوں اور خیالات نے آگھیرا جو ہمیشہ سے میرے اور میری نماز کے درمیان حائل تھے۔ لشتم پشتم نماز پڑھ کر میں نے سلام پھیرا اور یوں ہانپنے لگا جیسے میلوں دُور سے دوڑ کر آ رہا ہوں۔ مولوی خضر نے مجھے بتایا تھا کہ ایسی نمازیں جو صرف زمین پر ماتھا ٹکانے کی حد تک ادا کی جاتی ہوں، وہ پلٹ کر واپس نمازی کے چہرے پر مار دی جاتی ہیں۔ شاید تبھی اپنی ہر نماز کے بعد مجھے اپنے چہرے پر ایک اَن دیکھے طمانچے کا احساس ہوتا تھا۔ اس دن بھی میں نے اپنی نماز کو فلک چھوئے بنا ہی واپس پلٹتے ہوئے محسوس کیا اور اسی بے چین دل کے ساتھ درگاہ کی کچی دیوار کے ساتھ ٹیک لگا کر بیٹھ گیا۔ سامنے چھت کی منڈیر سے سرکتی دھوپ مجھے یہ احساس دلا رہی تھی کہ میری زندگی کا ایک اور قیمتی دن ضائع ہو کر گزر گیا ہے...... آج بھی میں نے روز کی طرح صرف اپنا وقت ہی کھویا تھا...... بدلے میں کچھ پا نہیں سکا۔

درد اور مسیحا

اگلے روز صبح سویرے نیچے گھاٹی میں جبل پور کے ڈاکیے کی سائیکل کی مخصوص گھنٹی سنائی دی۔ اصغر صاحب بھی اپنے کمرے سے نکل آئے۔ میں درگاہ کے صحن میں نکلا تو ڈاکیا اپنا خاکی تھیلا لٹکائے سیڑھیاں چڑھ کر اُوپر آتا نظر آیا۔ مجھے پہلا خیال یہی آیا کہ شاید اصغر صاحب کے لیے کوئی خط آیا ہوگا۔ ڈاکیا مجھے عبداللہ کے نام سے جانتا تھا لیکن اُس کی بات سن کر میں زور سے چونک پڑا۔

''جناب یہاں کوئی ساحر صاحب بھی ٹھہرے ہوئے ہیں کیا......؟......''

اب میں اُسے کیا بتاتا کہ میں خود ساحر ہوں۔ ''کیوں؟...... خیر تو ہے......''

''جی سب خیر ہے...... اُس کے نام کا ایک خط آیا ہے۔ پتا اسی درگاہ کا ہے لیکن عجیب بات یہ ہے کہ ساحر کے نام کے سامنے چھوٹے حاشیے میں آپ کا نام لکھا ہوا ہے۔''

میں نے ڈاکیے سے خط لے لیا اور خط پر لکھی تحریر دیکھتے ہی میری سانسیں جیسے رُکنے لگیں۔ وہ زہرا کی تحریر تھی۔ ہاں...... اُسی کے کومل ہاتھوں کی اُنگلیوں کے شاہکار لفافے پر جگمگا ہے تھے۔

میں زہرا کی تحریر لاکھوں میں پہچان سکتا تھا۔ یہ حرف بھی تو ہم انسانوں جیسی ہی پہچان کھتے ہیں ان میں سے ہر حرف اپنا ایک چہرہ رکھتا ہے اور میں زہرا کے ہاتھ سے بنے ان سیاہ لوں کو خوب پہچانتا تھا۔ میں نے لرزتے ہاتھوں سے لفافہ کھولا اور میری نظر سفید کاغذ پر رے ان موتیوں پر پھیلنے لگی۔

''آداب......

مجھے ہر پل یہ احساس کیوں ستاتا ہے کہ آپ کو اس راہ پر دھکیلنے کے بعد میں خود ہی بار بار آپ کی راہ کا کانٹا بن جاتی ہوں۔ میں اور اماں اس وقت کمال آباد میں ہیں۔ زندگی کی وٹ کسی جانب سر ٹکانے نہیں دیتی۔ ابا کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔ آپ کا پتا پرانی درگاہ سے

ملا۔ اس تحریر میں پوری بات کا احاطہ ممکن نہیں۔ ہو سکے تو جلد از جلد کمال آباد میں نیچے دیئے گئے پتے پر پہنچ جائیں۔ میں آپ کو پریشان نہیں کرنا چاہتی تھی لیکن اماں کی ضد ہے کہ آپ کو ضرور خبر کر دی جائے۔ شاید وہ بھی میری طرح بالکل ٹوٹ گئی ہیں۔ یاد رہے کہ ہمارے پاس وقت بہت کم ہے۔

زہرا''......

خط کیا تھا، ایک معمہ تھا۔ اصغر صاحب غور سے میرے سامنے کھڑے میرے چہرے کے بدلتے تاثرات دیکھ رہے تھے۔ میں نے مختصر لفظوں میں انہیں بتایا کہ کوئی بہت خاص ہے جسے اس وقت میری ضرورت ہے۔ وہ خوش دلی سے مسکرا کر بولے کہ ''میاں! کچھ خاص لوگ ہی ہوتے ہیں جنہیں کسی ضرورت، یا مصیبت میں پکارا جاتا ہے۔ تم بے فکر ہو کر وہاں سے ہو آؤ۔ یہاں کا دھیان رکھنے کے لیے میں موجود ہوں۔''

کمال آباد جنکشن جبل پور سے تقریباً دو گھنٹے ٹرین کی مسافت پر تھا۔ میں شام کی گاڑی لے کر کمال آباد پہنچا تو اندھیرا ہو چکا تھا۔ سارے راستے میرے ذہن میں یہی بات گردش کرتی رہی کہ اس کا مطلب یہ ہے کہ کمال آباد کے اسٹیشن پر میں نے جس لڑکی کو دیکھا تھا وہ زہرا ہی تھی؟ لیکن زہرا تو پردے کا بے حد اہتمام کر کے گھر سے نکلتی ہے پھر یوں بے نقاب......؟؟ میں جتنا سوچتا گیا اُلجھن بڑھتی گئی۔ زہرا نے خط میں جس ''کاسنی حویلی'' کا پتا لکھا تھا وہاں تک پہنچنے میں مجھے کوئی دُشواری نہیں ہوئی۔ اور جب میں سائیکل رکشہ سے حویلی کے مرکزی لیکن بوسیدہ سے پھاٹک پر اُترا تو مجھے حویلی کے نام کی وجہ تسمیہ بھی پتا چل گئی۔ ساری حویلی کاسنی رنگ کے پھولوں سے ڈھکی ہوئی تھی۔ باہر کوئی دربان موجود نہیں تھا اور آدھا ٹوٹا، لٹکتا ہوا پھاٹک تیز ہوا میں جھول رہا تھا۔ باہر سے گزرتا کوئی بھی راہ گیر ایک ہی نظر میں در و دیوار کی شکستہ حالی سے اندر مکینوں کا حال جان سکتا تھا۔ سالہا سال سے بنا قلعی کے در و بام سے عجیب سی وحشت ٹپک رہی تھی۔ میں اِسی شش و پنج میں حویلی کے پھاٹک سے چند قدم اندر تو بڑھ آیا تھا لیکن اب کاسنی پھولوں کی کیاریوں سے متصل روش پر کھڑا یہ سوچ رہا تھا کہ اندر والوں کو اپنے آنے کی خبر کیسے کی جائے؟

اچانک اندر کی جانب سے ایک آہٹ ہوئی اور کسی عورت کے ہلکے سے کھنکارنے کی آواز سنائی دی۔ میں اُسے دیکھ کر زور سے چونکا۔ یہ وہی عورت تھی جو اُس دن ریلوے اسٹیشن

ے زہرا کے ساتھ دکھائی دی تھی۔ میرے سلام کا جواب دینے کے بعد اُس کا اگلا سوال
ے لیے ایک اور حیرت لے کر آیا۔ ''کیا تم عبداللہ ہو؟'' جواب میں میں صرف اثبات میں
ہلا سکا۔ وہ مجھے اپنے پیچھے اندر آنے کا اشارہ کر کے پلٹ گئی۔ میں نیم اندھیری سنسان
نہ سی راہ داریوں میں سے ہوتے ہوئے اُس کے پیچھے پیچھے چل پڑا۔ حویلی اگرچہ کھنڈر ہو
ی لیکن اُس کے آثار اب بھی اُس کے گزشتہ مکینوں کی شان و شوکت کا پتا دیتے تھے۔
ہی مجھے اس عورت کے پیچھے چلتے چلتے ان اندھیری غلام گردشوں سے ایک انجانے
ف کا احساس ہوا۔ جانے وہ کون تھی اور مجھے کہاں لے جا رہی تھی۔ آخرکار وہ ایک
لیکن شکستہ حال کمرے کا دروازہ کھول کر اندر داخل ہوگئی۔ اس وقت مجھے ادراک ہوا کہ
ی بجلی کٹی ہوئی تھی اور چند کمزور موم بتیوں اور دیوں کی نامکمل روشنی کی وجہ سے وہ ماحول
ا پُراسرار ہو گیا تھا۔ اندر کمرے میں حیرت کا دوسرا شدید جھٹکا میرا منتظر تھا۔ اندر داخل
ہی پہلی نظر میں اس ملگجے چراغوں کے اُجالے میں وہ مجھے زہرا ہی دکھائی دی اور میں
بلہ جم کر رہ گیا۔ قریب تھا کہ میں اُسے زہرا کے نام سے ہی پکار لیتا لیکن اُس نے
ئے ہوئے انداز میں جب مجھے سلام کیا تب میں ٹھٹک کر رُک گیا۔ وہ آواز زہرا کی نہیں
ہاں...... وہ زہرا نہیں تھی اور قریب سے دیکھنے پر اُس کی زہرا سے اچھی خاصی مشابہت
اوجود چند واضح فرق محسوس کیے جا سکتے تھے۔ اُس کا چہرہ ڈھکا ہوا نہیں تھا اور وہ قد میں
سے کچھ کم تھی اور اُس کی آنکھیں بھی گہری کالی کی بجائے نیلگوں سی تھیں اور شاید نیند، یا
ے کی کمی کی وجہ سے آنکھوں کے گرد ہلکے سے پڑے ہوئے تھے۔ میں نے بھی ہڑبڑا کر
جواب دیا ''وعلیکم السلام۔'' وہ لڑکی کمرے سے نکل گئی۔ عورت بولی ''یہ میری بیٹی ہے
ب...... یہ نام اُس کے والد کو بہت پسند تھا۔ انہوں نے بڑے چاؤ سے رکھا تھا۔'' میں نے
مجھتے ہوئے اُس عورت کی جانب دیکھا۔ دراصل مجھے زہرا مقبول نے یہاں آنے کے
......'' اُس نے میری بات درمیان میں ہی کاٹ دی۔ ''ہاں...... میں جانتی ہوں......
ب کا پورا نام زریاب مقبول ہے...... وہ زہرا کی سوتیلی بہن ہے......'' یہ تیسرا جھٹکا اس قدر
تھا کہ میں اپنی جگہ سے کھڑا ہو گیا۔ ''جی...... یہ آپ کیا کہہ رہی ہیں۔'' ''ہاں...... میں
مقبول حسین کی پہلی لیکن مطلقہ بیوی ہوں...... مجھے طلاق دینے کے بعد ہی انہوں نے

زہرا کی ماں سے شادی کی تھی۔ تمہاری آمد کی اطلاع مجھے زہرا نے ہی کی تھی۔'' میں نے
چینی سے اِدھر اُدھر نظر دوڑائی۔ ''لیکن زہرا کہاں ہیں......؟'' ''تم نے آنے میں کچھ دیر کر
دی۔ وہ لوگ ابھی آدھا گھنٹہ پہلے اپنے شہر کی گاڑی پکڑنے کے لیے نکل چکے ہیں۔ تمہارے
لیے زہرا نے یہ لفافہ دیا ہے۔ دراصل مقبول صاحب کی طبیعت کچھ ٹھیک نہیں ہے۔ انہیں دل کا
دورہ پڑا ہے۔ بس خدا اپنا رحم کرے۔'' میرے اندر جیسے بجلیاں سی بھر گئیں۔ ''اگر وہ لوگ
صرف آدھا گھنٹہ قبل یہاں سے نکلے ہیں تو شاید میں انہیں ریلوے اسٹیشن پر آخری لمحات میں
مل پاؤں......؟'' مجھ سے ایک پل بھی مزید وہاں نہیں ٹھہرا گیا۔ وہ مجھے روکتی ہی رہ گئیں کہ
میں کم از کم ایک پیالی چائے تو پیتا جاؤں لیکن میں اُن سے دوبارہ آنے کا کہہ کر تیزی سے باہر
کسی سواری کی تلاش میں لپکا۔

میں نے ٹرین کی پہلی سیٹی کی آواز اُس وقت سنی جب میں اپنی دھونکنی جیسی پھولتی سانس
کے ساتھ دوڑتے ہوئے پلیٹ فارم کے مرکزی دروازے سے اسٹیشن کے اندر داخل ہوا۔ میں
نہیں جانتا کہ انسانی نظر ایک پل میں کتنے مناظر اپنی بصارت میں سمیٹ سکتی ہے لیکن اس
ایک لمحے میں میری آنکھوں نے پوری گاڑی کا یوں جائزہ لیا جیسے میری بصارتیں ہزار گنا بڑھ
گئی ہوں لیکن وہ کہاں تھی جسے نہارے بنا میری دو آنکھوں کا یہ نور بس اس نعمت کا ایک زیاں
ہی تو تھا۔ گاڑی نے دوسری سیٹی بجائی اور میری حالت اُس وحشی کی طرح ہونے لگی جو اپنے
جنوں میں قفس کی سنگلاخ دیواروں سے سر ٹکرانے کے لیے اپنی زنجیریں تڑوانے کی کوشش کرتا
ہے۔ جانے پل بھر میں ہی کیوں مجھے وہ گاڑی ٹین اور لوہے کا جوڑ نہیں بلکہ ایک عفریت نظر
آنے لگی جو کچھ ہی پل میں میری آخری سانس بھی مجھ سے چھین کر لے جائے گا۔ میں نے
دیوانوں کی طرح ایک سمت قدم بڑھائے۔ ٹرین کو پہلا جھٹکا لگا۔ جب تک میں خود اپنی مرضی
سے زہرا سے دُور تھا تب تک میرے دل کو ایک انجانی سی ڈھارس تھی کہ وہ دُور سہی پر قریب
ہے، لیکن آج جب وہ میرے وجود کے اتنے نزدیک ہو کر بھی میری آنکھوں سے اوجھل تھی تو
مجھے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے کوئی کسی کند چھری سے میرا سینہ چیر کر اُسے میرے دل سمیت
پیوست کرنے کی کوشش کر رہا ہو۔ میرا سارا صبر، تمام چین و قرار ایک پل میں ہی لٹ گیا تھا۔
یہ جلاد دل بھی ہم معصوم انسانوں کے ساتھ کیسے کیسے کھیل کھیلتا ہے۔ مجھے یوں لگ رہا تھا کہ

میں چند گھڑیوں میں ہی وہی پرانا ساحر بن گیا ہوں جو ساحلی درگاہ پر ایک کار ریس جیتنے کے
بعد چند لمحوں بعد ہی زہرا کی پہلی نظر کا شکار ہو کر وہیں اپنا سب کچھ ہار گیا تھا۔ اچانک میرے
ذہن میں ایک کوندا سا لپکا۔ ایئر کنڈیشنڈ سلیپر، ہاں...... اس نازک اندام کو تو وہیں ہونا چاہیے۔
میں تیزی سے پلٹا۔ گاڑی نے دھیرے دھیرے سرکنا شروع کر دیا تھا۔ سامنے ہی اے سی والی
بوگی تھی۔ دفعتاً میری سماعتوں کو دھوکا سا ہوا۔ ''ساحر......'' یہ تو وہی رُوح میں اُتر جانے والی
آواز تھی۔ میں تڑپ کر پلٹا۔ ہاں...... وہ زہرا کی ہی آواز تھی۔ اے سی سلیپر بوگی کی ایک ادھ
کھلی کھڑکی سے میری سدا گردش میں رہنے والی تقدیر کا واحد روشن تارہ جھلک رہا تھا۔ میں اپنی
جگہ منجمد ہو گیا۔ اُس کا ڈبہ چیونٹی کی رفتار سے میری نظروں کے سامنے سے گزرا۔ وہ بے چینی
سے پھر بولی۔ ''ساحر...... گاڑی چھوٹ رہی ہے......'' مجھے ایک جھٹکا سا لگا۔ اُس کی بوگی مجھ
سے چند قدم آگے بڑھ چکی تھی۔ میں کھڑکی سے جھانکتی زہرا کی جانب لپکا۔ ٹرین کی رفتار تیز ہو
رہی تھی۔ میں نے کچھ بولنے کی کوشش کی لیکن میرے حلق سے آواز نہیں نکل پائی۔ میرے
شکستہ قدم لڑکھڑا رہے تھے۔ میری پلکیں بھیگنے لگیں۔ وہ تڑپ کر بولی ''خود کو سنبھالیں ساحر، میں
نے سب کچھ خط میں لکھ دیا ہے۔ پڑھ لیجیے گا...... اور اپنا خیال رکھیے گا......'' گاڑی نے مزید
رفتار پکڑ لی۔ میری نظر زہرا کی نگاہ میں گڑھ کر رہ گئی تھی۔ میری بصارت کے لیے دیگر ہر منظر
جیسے دُھندلا سا گیا تھا۔ وہ ٹرین، پلیٹ فارم، سیٹی بجاتا ٹی ٹی، وہاں پھرتے دیگر لوگ، وینڈنگ
کنٹریکٹر، سارے قلی، کہرے میں لپٹی شام، گیس کے ہنڈولوں کی ملگجی پیلی روشنی کے دائروں
میں ڈوبا وہ اسٹیشن، سب کچھ پل بھر کے لیے اوجھل سا ہو گیا۔ صرف میں اور وہ رہ گئے۔ میری
آنکھ سے ایک آنسو ٹپکا۔ میرے گھائل قدم کسی چیز میں اُلجھ کر لڑکھڑائے اور میں گرتے گرتے
بچا۔ زہرا نے بے قرار ہو کر بے اختیار اپنا ہاتھ یوں بڑھایا جیسے مجھے گرنے سے بچانا چاہتی
ہو۔ لیکن لوہے کی پٹڑی سے جڑے فاصلے تیزی سے اُسے مجھ سیاہ نصیب سے دُور لے جا رہے
تھے۔ اُس کا ہاتھ یونہی فضا میں اُٹھا رہ گیا۔ جانے کیوں مجھے احساس ہوا کہ اُس کی پلکیں بھی نم
ہو رہی تھیں۔ اُس کے لب ہلے، لیکن پہیوں کی گڑگڑاہٹ نے میرے نصیب کے لفظ بھی
میری سماعتوں سے چھین لیے۔ جانے اُس نے کیا کہا تھا؟ شاید ''الوداع''...... لب تو میرے
بھی ہلے تھے لیکن اپنے حرف تو میں خود بھی نہیں سن سکا تو بھلا اُس ناز خراماں کو کیا سنائی

دیتے......؟...... کچھ ہی پل میں ہمارے درمیان وہی زمینی فاصلے حائل ہو گئے جو ہمیشہ سے
اس نصیب جلی محبت کا مقدر ہوتے ہیں۔ ٹرین پلیٹ فارم سے باہر نکل کر کافی آگے بڑھ چکی
تھی اور اب دھیرے دھیرے اُس کہر آلود اندھیرے کا حصہ بنتی جا رہی تھی۔ تیزی سے دوڑتی
گاڑی کی جانب سے میری طرف بڑھتے سرد ہوا کے ایک آوارہ جھونکے نے میرے گالوں تک
پہنچے دو آنسوؤں کو مخالف سمت میں دھکیل کر اس فضا کا ایک حصہ بنا دیا۔ نہ جانے پانی کی وہ دو
نمکین بوندیں کس بدنصیب کے دل کی زمین پر جا کر گری ہوں گی۔ لیکن جہاں بھی گری ہوں
مجھے یقین تھا کہ سب کچھ جلا کر بھسم کر گئی ہوں گی۔

میں نے جیب سے زہرا کا خط نکال کر وہیں پلیٹ فارم کے ایک بنچ پر بیٹھے بیٹھے پڑھ
لیا۔ زہرا کی سوتیلی ماں کا نام نگار تھا اور انہیں اور زریاب کو میری جس مدد کی ضرورت تھی، وہ
فوری نوعیت کی نہ ہونے کے باوجود اہم تھی۔ میں نے وہیں اسٹیشن کے تار گھر سے ہی پاپا اور
اپنے دوست کاشف کو تار بھیجے اور خط کے بکسے میں خط بھی ڈال دیئے اور کاسنی حویلی کے نام بھی
ایک خط لکھ دیا کہ وہ مطمئن رہیں میں نے حکام بالا کو اطلاع کروا دی ہے اور جلد ہی دوبارہ اُن
سے آ کر ملوں گا۔

اس تمام مصروفیت سے فارغ ہو کر میں رات کی آخری گاڑی لے کر جب جبل پور
واپس پہنچا تو صبح کا سپیدہ نمودار ہو رہا تھا۔

میں درگاہ پہنچا تو اصغر صاحب کی طبیعت پہلے سے اب کافی بہتر لگ رہی تھی۔ انہیں سارا
احوال بتا کر میں درگاہ کے پچھلے ایک ہفتے کے ترک شدہ معمولات میں جٹ گیا۔ لیکن سارا وقت
میرے ذہن میں نگار اور زریاب سے متعلق زہرا کے لکھے ہوئے خط کے الفاظ ٹکراتے رہے۔

اگلی صبح میں گاڑی پکڑ کر کمال آباد بھی ہو آیا۔ میری توقع کے مطابق پاپا اور کاشف نے
تمام متعلقہ حکام کو کاسنی حویلی کے مسئلے کے بارے میں آگاہ کر دیا تھا۔ درگاہ میں میرے لیے
کاشف کا ایک خط بھی موجود تھا جس میں اُس نے بتایا تھا کہ کمال آباد میں حالیہ تعینات اے
ایس پی ہمارا ہی ہم جماعت خالد تھا جو سی ایس ایس کرنے کے بعد پولیس جوائن کر چکا تھا۔
خالد مجھ سے مل کر بے حد خوش ہوا اور اُس نے اپنے ہر ممکن تعاون کا یقین بھی دلایا۔

زہرا کے خط سے مجھے یہ تو پتا چل ہی چکا تھا کہ اُس کی بھی اپنی ماں سمیت زریاب اور

نگار سے یہ پہلی ملاقات تھی۔ لیکن کہانی آج سے نہیں بلکہ بائیس سال پہلے شروع ہوتی تھی
جب زہرا کے والد مقبول خان اپنی گریجوایشن کے بعد اعلیٰ تعلیم کے لیے دوسرے شہر پہنچے تھے۔
والدین کی اکلوتی اولاد اور بے پناہ دولت کی وجہ سے شاہانہ مزاج اور شہزادوں جیسی عادات تو
شروع سے ہی تھیں، رہی سہی کسر جوانی نے پوری کر دی تھی اور شاید انہی چیزوں کے امتزاج
کی بدولت اُنہی کی یونیورسٹی کی ایک جونیئر طالبہ نگار چند دنوں بعد ہی اپنا دل اُن کے قدموں
میں ہار بیٹھی۔ مقبول بھی زیادہ عرصہ مزاحمت نہ کر سکے اور دونوں یک جاں دو قالب کی تفسیر بن
گئے۔ مقبول کو اتنا اندازہ ضرور تھا کہ اُن کے والدین بیچ تعلیم انہیں کسی بندھن میں بندھنے کی
اجازت نہیں دیں گے۔ لہٰذا فیصلہ یہی طے ہوا کہ فی الحال گھر والوں سے چھپ کر نگار سے
شادی کر لی جائے اور کچھ عرصہ اس رشتے کو مخفی رکھا جائے۔ اُس وقت مقبول کا ارادہ یہی تھا کہ
کسی مناسب موقع پر یہ راز والدین کے سامنے کھول دیں گے لیکن وہ مناسب موقع کبھی نہ آیا۔
اگلے سال نتیجہ آنے سے پہلے اُن کے والد کی طبیعت کچھ یوں بگڑی کہ مقبول کو سب چھوڑ چھاڑ
کر گھر بھاگنا پڑا جہاں مقبول کے والد نے پہلے ہی سے اپنے بھائی کی بیٹی سے اُن کا رشتہ
جوڑنے کا انتظام مکمل کر رکھا تھا۔ مقبول کے والد کی حالت کے پیش نظر انکار کی کوئی گنجائش ہی
نہیں تھی اور شادی کے ٹھیک تیسرے دن والد اگلے جہاں سدھار گئے اور ٹھیک اُسی دن زریاب
تین ماہ کی ہوئی۔ چالیسویں کے بعد جب مقبول نے تنہائی میں اپنی ماں کو نگار اور اپنی بچی کے
بارے میں بتایا تو وہ بھی صدمے سے بے حال ہو کر بستر پر پڑ گئیں اور پھر انہوں نے قسم ہی کھا
لی کہ جب تک مقبول اس چھوٹے گھر کی لڑکی نگار سے ہر رشتہ توڑ نہیں لیتے تب تک وہ انہیں
اپنا حق نہیں بخشیں گی۔ اور یوں ایک عورت نے اپنے حق کی بخشش کی جنگ میں ہمیشہ کی طرح
ایک دوسری عورت کے حق پر ڈاکا ڈال دیا۔ نگار کو جب طلاق کا پروانہ ملا تو وہ نیم پاگل سی ہو
گئی۔ حالانکہ مقبول نے اپنی کمال آباد والی کوٹھی اور ماں اور بچی کی تربیت اور گزارے کے لیے
بہت معقول انتظامات کر دیئے تھے لیکن ہوش میں آنے کے بعد نگار نے اُس بے وفا کی دی
ہوئی ہر سہولت اور آسائش کو ٹھکرا دیا۔ کئی سال بیت گئے اور زریاب کے ساتھ اُس کی چھوٹی
بہن زہرا بھی جوان ہو گئی لیکن مقبول کی دوسری شادی اور طلاق کا راز راز ہی رہا۔ لیکن پچھلے
ہفتے جب حاجی مقبول کو تیسرا دل کا دورہ پڑا تو انہیں اپنی ماضی کی غلطیاں یاد آئیں اور انہوں

نے اس جان لیوا بیماری کے بستر پر ہی زہرا کی ماں کے سامنے اپنا دل کھول کر رکھ دیا۔ زہرا کی ماں تو کھل کر اپنے اندر ہوئی ٹوٹ پھوٹ اور کرچیوں کے شور کو بھی باہر نہیں نکال پائیں کیوں کہ اُن کے سہاگ کی حالت ہی اُس وقت کچھ ایسی تھی کہ انہیں اپنے پھٹتے ہوئے دل کی آخری سسکی کو بھی پی جانا پڑا۔ ہاں البتہ ماں نے تنہائی میں زہرا کے سامنے اپنے دل کے سارے سیلاب بہا دیئے۔ حاجی مقبول کی خواہش پر ہی زہرا اور اُس کی ماں کمال آباد آئے تھے تاکہ نگار سے مقبول کی خواہش کے پیش نظر اُس کی زیادتی کو درگزر کرنے کی درخواست کر سکیں۔ خود حاجی مقبول تو بستر سے کچھ ایسے لگے پھر دن بدن اُن کی حالت بگڑتی ہی گئی۔ نگار نے وہی کیا جو کوئی اعلیٰ ظرف کر سکتا ہے لیکن اُس نے زہرا کی ماں کے ساتھ شہر جانے سے انکار کر دیا۔ وہ پھر سے پرانے زخم ہرے نہیں کرنا چاہتی تھیں اور ویسے بھی وہ خود بہت سی اُلجھنوں میں گھری ہوئی تھیں۔ یہ کاسنی حویلی پہلے اُن کے دادا اور پھر باپ کی واحد اور آخری جاگیر تھی۔ لیکن دو سال پہلے زریاب کے نانا کے انتقال کے بعد اب زمانے کے گدھ اُن کی اس پشتینی جائداد اور بیٹی پر نظریں گاڑھے بیٹھے تھے اور وہ کسی بھی حال میں اپنے اس آخری خزانے کی حفاظت سے غافل نہیں رہ سکتی تھیں۔ اُن کی حالت کے پیش نظر ہی زہرا کی امی نے اُسے مجھے خط لکھنے پر مجبور کیا تھا۔ زریاب اور اُس کی ماں کی زندگی کا سب سے بڑا کانٹا شہر کا مشہور غنڈہ جگن تھا۔ جو بیک وقت کومل زریاب اور کمال آباد کے وسط میں کھڑی اُس کی جائداد کو ہتھیانے کے درپے تھا۔ اور جگن اس سلسلے میں ہر ہتھکنڈا پہلے ہی آزما چکا تھا۔ میں نے زریاب اور نگار کو اطمینان دلایا کہ مجھ سے جو ممکن ہوا، ضرور کروں گا۔ فی الحال اطمینان کی بات یہ تھی کہ جگن کو علاقہ پولیس نے نقصِ امن کے خدشے میں مہینہ بھر کے لیے شہر بدر کیا ہوا تھا اور فی الحال اُس کی طرف سے ماں بیٹی کو کوئی خطرہ نہیں تھا۔ اس رات میں نے پاپا اور کاشف کو جو تار اور خط بھیجے تھے وہ اسی مسئلے سے متعلق تھے کہ کمال آباد میں پولیس کی اعلیٰ قیادت کو کاسنی حویلی کی حفاظت کرنے کی درخواست کی جائے۔ میں جانتا تھا کہ کاشف تب تک ٹک کر نہیں بیٹھے گا جب تک سارا انتظام مکمل نہیں کر لے گا اور پاپا کا تو آئی جی پولیس کو ایک فون ہی کافی تھا۔ کہتے ہیں انسان ہی انسان کا سب سے بڑا درد اور انسان ہی اُس کا درماں ہے۔ لیکن فی الحال جگن کاسنی حویلی کا درد ثابت ہو رہا تھا۔ تیسرے دن ہی مجھے نگار کا پیغام ملا کہ جگن آباد واپس پہنچ گیا ہے۔ اے ایس پی خالد نے اُسے تھانے بلوا کر پہلے ہی سرزنش کر تو ہے کہ وہ دوبارہ کاسنی حویلی کی طرف آنکھ اُٹھا کر نہ دیکھے لیکن وہ اب بھی بے حد فکر مند تھیں زریاب کا تو اب جگن کا نام سنتے ہی رنگ پیلا پڑ جاتا تھا۔ میں دو دن پہلے ہی سلطان بابا لیے بذریعہ تار پیغام بھجوا چکا تھا کہ مجھے کمال آباد میں اُن کی اشد ضرورت ہے لہٰذا وہ کسی طرح کمال آباد پہنچیں۔ نہ جانے پرانی درگاہ پر بھیجے گئے تار کا پیغام اُن تک پہنچا تھا، یا نہیں اب میرے لیے مزید دیر کرنا ممکن نہیں تھا لہٰذا میں تمام ذمہ داریاں اصغر صاحب کے لے کر کے کمال آباد کی گاڑی پکڑنے نکل پڑا۔

"کاسنی حویلی" پر وہی سدا پرانی یاسیت طاری تھی۔ اس شام عصر کے وقت جب میں پہنچا تو مجھے پوری حویلی میں پھولوں سے بھری کیاریوں اور اُن کی نہایت سلیقے سے کی گئی خراش کے پیچھے چھپے ہنرمند ہاتھوں کا بھی پتا چل گیا۔ زریاب نہایت انہماک سے بڑا سا ہاتھ میں لیے پھاٹک سے متصل کیاری کی کاسنی پھولوں کی بیل سے بے جان ڈالیاں اور پتیاں اور ٹہنیاں تراش رہی تھی۔ شاید یہی اس پژمردہ سے ماحول میں اس نازنین کا واحد ادہ تھا۔ تبھی وہ اس کام میں اس قدر مگن تھی کہ اُسے میری آمد کی خبر تک نہیں ہوئی۔ کچھ لمحوں میں نے ہلکے سے کھنکار کر اُسے اپنی جانب متوجہ کیا۔ وہ گھبرا کر یوں پلٹی کہ اُس کے ے کا رنگ بھی انہی پھولوں کی طرح کاسنی سا ہو گیا۔ وہ جلدی سے مجھے سلام کر کے اندر گئی اور چند لمحوں بعد نگار اندر سے برآمد ہوئیں۔ وہ کافی گھبرائی ہوئی لگ رہی تھیں۔ پتا چلا جگن نے خود تو پہرے کی وجہ سے حویلی کا رُخ نہیں کیا لیکن اُس نے اپنے ہرکاروں کے لیے نگار کو یہ واضح پیغام بھیجا ہے کہ وہ کسی طور بھی زریاب سے دست بردار نہیں ہوگا اور یہ دروازہ پہرہ اُس کے راستے کی دیوار نہیں بن سکتا۔ زریاب جہاں بھی جائے گی وہ سائے کی طرح اُس کے ساتھ ہی لگا رہے گا۔ مجھے نگار کے چہرے سے ہی معاملے کی سنگینی کا احساس ہو رہا تھا۔ یہ معاملہ پولیس، یا پہرے داری سے کہیں بڑھ کر تھا اور پھر پولیس کے سادہ لباس والے اہلکار بھی کب تک یوں کاسنی حویلی کے پھاٹک پر ٹنگے رہتے، یا پھر نگار اور زریاب کے پیچھے پیچھے بازار اور دیگر روزمرہ کے آنے جانے کی جگہوں پر دُم چھلا بنے پھرتے رہتے......؟ معاملہ عورتوں کا تھا اور عورت کا پہرہ بذات خود ہمارے معاشرے میں ہزار سوالوں کو جنم دے

ڈالتا ہے۔ کیوں کہ ہم عورت کو پچاس فیصد قصور وار تو ازل سے ہی تسلیم کرتے چلے آر
ہیں۔ باقی کسر شک کا پانچ، یا دس فیصد پورا کر دیتا ہے۔ اور معاشرہ اُس کے خلاف اپنا فیصلہ
دیتا ہے۔ نگار اور زریاب اور پولیس کے پہرے کی یہ ہم راہی بھی تو ایک طرح سے جگن
کے اُس مقصد کی تکمیل تھی جو وہ زریاب کو بدنام کر کے حاصل کرنا چاہتا تھا۔ شرفا تو ویسے
اس در سے سو قدم دُور چلتے ہیں جہاں ان وردی والوں کا پہرہ ہو اور اس پہرے میں اگر
دونوں باہر بھی نکلتیں تو یہ مزید جگ ہنسائی اور لوگوں کو باتیں بنانے کا موقع دینے کے مترادف
ہوتا۔ اور پولیس جگن پر اُس وقت تک ہاتھ بھی نہیں ڈال سکتی تھی جب تک وہ کوئی باقاعدہ ج
نہ کرتا۔ وہ پہلے ہی علاقہ بدری کی سزا کاٹ کر آیا تھا اور اے ایس پی خالد اگر اُسے کسی بہا
سے دوبارہ جیل بھجواتا، یا پھر سے علاقہ چھوڑنے کا حکم دے بھی دیتا تو اس کی میعاد کیا ہوتی
اور پھر کسی بھی دوسرے درجے کے وکیل کے ذریعے مجسٹریٹ صاحب کی عدالت سے پولیس
کے اس حکم کے خلاف امتناعی پرچہ لیا جا سکتا تھا۔ کیوں کہ بہر حال عدالت کسی بھی شخص کو صر
اس وجہ سے سزا نہیں دے سکتی تھی کہ اُس کی ذات سے دو کمزور اور معصوم عورتیں خوف زد
ہیں۔ دھمکی ثابت کرنے کے لیے نگار کو عدالت کے پھیرے کاٹنے پڑتے اور زریاب کا دام
بھی اُلجھنے سے بچ نہ پاتا۔ جب کہ یہ سارا بکھیڑا ہی زریاب کے اُجلے دامن کو کسی بھی ایسے
داغ سے بچانے کے لیے ہی کھڑا کیا گیا تھا۔ بات اگر کسی عفت مآب دوشیزہ کی ہو تو یہ معاشر
ہر طرف سے ایک دلدل ہی تو ہے۔ چھری خربوزے پر گرے، یا خربوزہ چھری کی زد میں
آئے، نتیجہ تو ایک ہی تھا۔ دفعتہً مجھے محسوس ہونے لگا کہ جگن کے معاملے میں پولیس کو ڈال کر
ہم سے بہت بڑی بھول ہوگئی ہے۔ اب یہ معاملہ پسند، یا لالچ سے بڑھ کر ضد اور انا کی سو
بن چکا تھا جس پر جگن، یا زریاب میں سے کسی ایک کو لٹکنا ہی تھا۔ ایک بار جی میں آیا کہ نگار
سے کہوں کہ وہ اپنا اور زریاب کا چھوٹا موٹا سامان باندھیں اور میرے ساتھ اِسی وقت جبل پور
کے لیے نکل چلیں۔ ابھی روشنی باقی تھی اور ہم رات کا اندھیرا ہونے سے پہلے جبل پور پہنچ سکتے
تھے۔ اگر جگن نے ہمارے راستے میں آنے کی کوشش کی تو پھر دیکھا جائے گا۔ اور پھر جبل پور
میں خان صاحب کی پوری حویلی موجود تھی ان دو مظلوم عورتوں کے سر پر سایہ کرنے کے لیے۔
لیکن اگر کاسنی حویلی سے دست برداری ہی اس مسئلے کا حل ہوتا تو نگار خود بہت پہلے ایسا کر

قدم اُٹھا چکی ہوتیں۔ میں کافی دیر وہیں کھڑا اس معاملے کے پیچ و خم پر غور کرتا رہا۔ اچانک میں
نے نگار کے چہرے کا رنگ تبدیل ہو کر سفید ہوتے ہوئے دیکھا۔ میں نے چونک کر اُس کی
نظروں کے تعاقب میں پیچھے حویلی کے پھاٹک کی جانب دیکھا۔ ایک بھاری تن و توش اور
گہرے سانولے رنگ کا ایک شخص سر پر ترچھی قراقلی پہنے، ہونٹوں میں بیڑی اور کلوں میں پان
دبائے ہوئے تانگا حویلی کے پھاٹک پر رُکوائے ہمیں گھور رہا تھا۔ نگار کے منہ سے سرسراتی ہوئی
آواز میں صرف اتنا نکلا...... جگن......"

وہ شخص کچھ دیر تک ہمیں یونہی گھورتا رہا۔ پھر اُس نے تانگے والے کو اشارہ کیا اور تانگا
آگے بڑھ گیا اور پھر ایک دوسری لیکن انتہائی خوشگوار حیرت اُسی لمحے کے جلو میں میری
مایوسیوں اور نا اُمیدیوں پر پردہ ڈالنے کے لیے نمودار ہوگئی۔ تانگا بڑھتے ہی میں نے اُس کے
عقب میں ایک سائیکل رکشہ کو رُکتے اور اُس میں سے سلطان بابا کو اُترتے ہوئے دیکھا۔ چند
لمحے تو مجھے یقین ہی نہیں آیا کہ وہ کمال آباد اور پھر کاسنی حویلی پہنچ چکے ہیں اور اس وقت عین
میرے سامنے کھڑے میرے چہرے سے بے اختیار بہہ نکلنے والے آنسوؤں کو پونچھ رہے
ہیں۔ نگار اور زریاب سلطان بابا کے لیے چائے وغیرہ کے انتظامات میں لگ چکی تھیں۔ میں
نے سلطان بابا کو چند لمحوں میں ہی ساری کہانی "الف" سے لے کر "ی" تک سنا ڈالی، جسے
سن کر وہ کافی دیر کسی گہری سوچ میں ڈوبے رہے۔ پھر بہت دیر بعد سر اُٹھا کر بولے "کمال
آباد کے آئی جی صاحب سے پرانی یاد اللہ ہے مجھے اُن سے ملنا ہوگا......" میں نے چونک کر
انہیں دیکھا۔ میرا دل چاہا کہ میں انہیں اس بات سے منع کر دوں یہ پولیس، یا قانون کا معاملہ
نہیں تھا۔ مانا کہ آئی جی صاحب سارے ضلع کی کوتوالی جگن کے دروازے پر لا بٹھائیں گے
لیکن اس سے بھی کیا ہوگا۔ وہ بھی جگن کو عمر بھر کے لیے تو قید نہیں کر پائیں گے نا...... یہ تو اُس
کے دل میں پلتے کینے کو مزید بڑھاوا دینے کے مترادف ہوگا۔ لیکن چاہ کر بھی میں سلطان بابا کو
یہ سب نہیں کہہ پایا اور سلطان بابا کے ساتھ اگلی صبح آئی جی صاحب کے دفتر جا پہنچا۔ ملاقات کا
وقت صبح گیارہ سے بارہ بجے کا تھا اور ملاقاتیوں کی بھیڑ دیکھ کر مجھے کم از کم اگلے تین دن تک اپنا
نمبر آتا دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ بہر حال میں نے قاعدے کے مطابق کاغذ کی ایک چٹ پر
سلطان بابا کا نام لکھ کر استقبالیہ کلرک کو دے دیا جو دس پندرہ منٹ کے وقفے سے جمع شدہ

ناموں کی پرچیاں اندر آئی جی صاحب کے پی اے کو بھجوا رہا تھا۔ پھر اچانک ہی ایک عجیب بات رُونما ہوئی۔ اندر سے پکی عمر کے ایک صاحب جلد بازی میں برآمد ہوئے۔ اُن کی وردی پر لگے فیتوں سے زیادہ اُن کی شخصیت شاندار تھی۔ اُن کے پیچھے ہی باوردی اسٹاف، پولیس والے گارڈ اور چند اور عملے کے آدمی ہڑبڑاتے ہوئے تقریباً بھاگتے ہوئے کمرے سے نکل آئے۔ جس راہ داری میں ہم بیٹھے ہوئے تھے وہاں بھی کھلبلی سی مچ گئی۔ پتا چلا کہ یہی صاحب آئی جی نصیر احمد ہیں۔ وہ سبھی لوگوں سے لاتعلق تیر کی طرح ہماری جانب بڑھے اور گرم جوشی سے سلطان بابا کے گلے لگ گئے اور انہیں بڑی عزت اور محبت سے اندر اپنے کمرے میں لے گئے۔ میں حیرت سے اُن کی یہ ساری گرم جوشی دیکھتا رہا۔ دونوں نہ جانے کن کن زمانوں کی پرانی یادوں کو کافی دیر تک کریدتے رہے۔ نصیر صاحب کو بہت دیر بعد میرا خیال آیا اور انہوں نے مجھ سے معذرت کی کہ اُن کی سلطان بابا سے بہت مدت بعد ملاقات ہوئی ہے لہٰذا جذبات کی رو میں وہ میرا تعارف لینا بھول ہی گئے۔ ابتدائی تکلفات سے فارغ ہونے کے بعد اب مدعا کی باری آ چکی تھی لیکن میں سلطان بابا کی فرمائش سن کر کچھ حیران ہوا۔ انہوں نے آئی جی صاحب سے جگن کو اُن کے آفس طلب کرنے کی فرمائش کی۔ نصیر صاحب نے چونک کر سلطان بابا کو دیکھا۔ ''کوئی خاص شخصیت......؟...... جہاں تک میری معلومات ہیں، اس نام کا اس شہر میں ایک بدنام زمانہ اُچکا اور لفنگا رہتا ہے...... سب ٹھیک تو ہے نا......؟'' سلطان بابا مسکرائے ''سب ٹھیک ہے نصیر صاحب...... بس یہ دھیان رہے کہ آپ کے عملے میں سے جو بھی جائے، اُسے میرے مہمان کی حیثیت سے یہاں تک لے کر آئے......'' اس مرتبہ نصیر صاحب کے ساتھ ساتھ میری بھی چونکنے کی باری تھی۔ آئی جی صاحب نے سلطان بابا سے مزید کوئی سوال نہیں کیا اور فون پر کسی کو ہدایات جاری کر دیں کہ جگن کو عزت کے ساتھ اُن کے دفتر پہنچا دیا جائے۔ میں ایک بار پھر کچھ کہتے کہتے چپ ہو گیا۔ کچھ ہی دیر میں پی اے نے انٹرکام پر بتایا کہ جگن کو لایا جا چکا ہے۔ آئی جی صاحب نے اُسے وہیں آفس میں بھیجنے کی ہدایت کر دی۔ کچھ ہی دیر میں جگن کمرے میں داخل ہوا۔ جگن جیسے غنڈے کے لیے آئی جی آفس میں طلب کیا جانا بذاتِ خود اُس کے لیے ایک بہت بڑا دھچکا تھا۔ اُسے آج تک حوالدار سے لے کر سب انسپکٹر تک ہی بھگتتے آ رہے تھے، جو کہیں نہ کہیں خود بھی جگن سے مرعوب ہی

تھے۔ کوئی بڑا کیس ہو گیا تو انسپکٹر، یا ایس ایچ او آفس میں پیشی ہو جاتی تھی جہاں چھوٹے [illegible]ردں کی خوشامد اور بڑے اہلکاروں کی ڈانٹ ڈپٹ اور گالی گلوچ کا وہ عادی تھا اور وہاں [illegible]بلاوے اُس کے لیے اب صرف تفریح کا باعث ہوتے تھے۔ لیکن ایک دن اُسے یوں آئی [illegible]فس بھی طلب کیا جائے گا یہ اُس کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا۔ سچ تو یہ ہے کہ اس [illegible] کے لوگ اِسے اپنے لیے ایک اعزاز سے کم نہیں سمجھتے تھے اور آئندہ اُن کے ''دھندے'' [illegible] یہ بلاوہ اُن کی ساکھ بڑھانے میں کافی معاون ثابت ہو سکتا تھا۔ لیکن بہرحال آئی جی کا [illegible]اور پھر نصیر صاحب کی شخصیت اور اُن کے دفتر کا وہ رُعب دار ماحول...... یہ سب مل کر کسی [illegible]غلط انسان کے حواس کچھ دیر کے لیے معطل کرنے کا باعث بن سکتا تھا۔ اُس دن میں نے [illegible] محسوس کیا کہ بعض مرتبہ عہدے سے بڑھ کر انسان کا سراپا بولتا ہے۔ نصیر صاحب کی [illegible] بھرکم شخصیت اور اُن کی اندر تک اُتر جانے والی وہ گہری نظر کسی بھی چھوٹے موٹے مجرم [illegible] پانی کر سکتی تھی۔ لیکن جگن بہرحال علاقے کا دادا اور ایک گھاگ شخص تھا جسے کئی بار جیل [illegible] کے بعد قانون کی اتنی سمجھ تو آ ہی چکی تھی کہ فی الحال اُس نے ایسا کوئی جرم نہیں کیا جس کی [illegible] پر اُسے کوئی سزا دی جائے۔ اور اپنے بلاوے سے لے کر آئی جی آفس پہنچنے تک وہ اپنے [illegible]ں پر کافی حد تک قابو پا چکا تھا۔ لیکن پھر بھی اتنے سرد موسم کے باوجود دفتر میں داخل ہونے [illegible]لے کر اب تک کے مختصر عرصے میں وہ دو تین بار اپنے ماتھے سے پسینہ پونچھ چکا تھا۔ نصیر [illegible]ب نے سر سے پیر تک ایک بھرپور نگاہ اُس پر ڈالی ''ہوں...... تو تم ہو جگن......؟ ماں باپ [illegible] کیا نام رکھا تھا؟'' وہ کچھ ہڑبڑا سا گیا۔ ''جی...... وہ...... جہانگیر...... سے ہوتے ہوئے [illegible]ن پڑ گیا...... صاحب...... میرے کو یہاں......؟'' نصیر صاحب نے اُس کا سوال منقطع [illegible]تے ہوئے سلطان بابا کی جانب اشارہ کیا۔ ''یہ سلطان بابا ہیں...... میرے خاص [illegible]ان...... یہ تم سے ملنا چاہتے تھے......'' سلطان بابا نے آئی جی صاحب سے درخواست کی کہ [illegible]نہیں کوئی اعتراض نہ ہو تو ہم اُن کے کمرے کے ساتھ ملحقہ ملاقاتی کمرے میں جگن سے [illegible] کر لیں...... ویسے بھی ہماری وجہ سے اُن کے دفتر کے معمولات میں پہلے ہی کافی خلل پڑ [illegible] تھا۔ نصیر صاحب نے خوش دلی سے سر ہلایا اور چند لمحوں بعد ہم جگن کے سامنے ایک علیحدہ [illegible]رے میں بیٹھے ہوئے تھے۔ حالانکہ گزشتہ روز جگن کی مجھ پر کاسنی حویلی کے دالان میں

کھڑے ایک اُچٹتی سی نگاہ تو پڑ چکی تھی لیکن اُس کے تأثرات بتا رہے تھے کہ وہ مجھے پہچان نہیں پایا۔ اب اُس کا چہرہ باقاعدہ ایک سوالیہ نشان بن چکا تھا لیکن جانے یہ سلطان بابا کا ٹھہرا ہوا لہجہ تھا، یا پھر اس ماحول کا اثر کہ وہ چاہ کر بھی ہم سے کوئی سوال نہیں کر سکا۔ سلطان بابا نے شاید جان بوجھ کر کچھ زیادہ وقت لیا اور پھر دھیرے سے کھنکار کر بولے۔ ''معافی چاہتا ہوں جہانگیر میاں...... تمہیں اس طرح یہاں بلوا کر زحمت دی۔ اگرچہ پیاسے کو کنویں کے پاس جانا چاہیے، لیکن تمہارے پتے ٹھکانے سے آگاہ نہ ہونے کی وجہ سے کنویں کو پاس بلانا پڑا...... حالانکہ غرض ہماری ہی تھی......'' جگن جو پہلے ہی سلطان بابا کے منہ سے اپنا اصل نام سن کر ہڑبڑایا سا ہوا تھا، اُن کی بات سن کر بالکل ہی بوکھلا سا گیا۔ ''نہیں نہیں بابا جی...... آپ کام بولو......'' سلطان بابا کچھ دیر جیسے سوچ میں پڑ گئے پھر سر اُٹھا کر بولے ''نہیں...... یہاں کچھ مناسب معلوم نہیں ہوتا...... تم اپنا پتا دے دو...... میں اپنی درخواست لے کر وہیں حاضر ہو جاؤں گا......'' میں نے حیرت سے بابا کی طرف دیکھا، یہ کیا بات ہوئی......؟ بھلا اس شہر میں جگن جیسے بدنام زمانہ کا پتا ڈھونڈنا کون سی مشکل بات تھی......؟ ...... اور پھر اگر ہمیں اُس کے گھر جا کر ہی بات کرنی تھی تو پھر اُسے یہاں آئی جی آفس بلوانے کے لیے اس قدر اہتمام کی کیا ضرورت تھی......؟ ...... خود جگن کے لیے بھی سلطان بابا کی یہ بات کسی اچانک پھٹنے والے پٹاخے سے کم نہیں تھی۔ انتظار بھی تو ایک طرح سے اعصاب کا امتحان ہوتا ہے اور وہ دوبارہ اس پل صراط سے نہیں گزرنا چاہتا تھا۔ لہٰذا اُس نے سٹ پٹائے ہوئے انداز میں اپنی سی ہر ممکن کوشش کر دیکھی کہ سلطان بابا اپنی بات وہیں کہہ ڈالیں لیکن سلطان بابا بھی شاید اُس کے گھر کی زیارت کا تہیہ کر کے ہی یہاں تک آئے تھے۔ سو آخر کار جگن کو ہی ہار ماننا پڑی اور بے دلی سے اُس نے مجھے اپنے گھر کا پتا لکھوا دیا۔ نصیر صاحب کے دفتر سے نکلنے سے پہلے انہوں نے چلتے چلتے اُن سے کوئی بات کہی جسے میں آگے نکل جانے کی وجہ سے ٹھیک طرح سے نہیں سن پایا۔ راستے بھر سلطان بابا خاموش رہے اور کاسنی حویلی پہنچ کر بھی میں نے حسبِ معمول اُن سے کوئی سوال نہیں کیا۔ میں جانتا تھا کہ جو بھی بھید ہے وہ جلد ہی کھل جائے گا۔ شام چار بجے حویلی کے پھاٹک سے باہر کسی گاڑی کا ہارن بجا تو انہوں نے اپنے ہاتھ میں پھرتی لمبی سی تسبیح سمیٹی اور اُٹھ کھڑے ہوئے ''چلو میاں...... ذرا جہانگیر کے ہاں ہو آئیں۔'' انہوں نے

ے جگن کا اصلی نام سنا تھا وہ اُس کے تذکرے میں وہی نام لے رہے تھے۔ جب ہم ے باہر نکلے تو میں باہر آئی جی صاحب کی سرکاری موٹر کار کھڑی دیکھ کر زور سے چونکا۔ ی کے ساتھ ہی باوردی شوفر اور چاق و چوبند محافظ کو دیکھ کر میری حیرت دوچند ہو گئی۔ آخر کر وفر سے جگن جیسے غنڈے کے گھر جانے کی کیا ضرورت تھی؟ اور پھر سلطان بابا تو ایسے وں سے ہمیشہ ہی اجتناب برتتے تھے پھر آج یہ سب کچھ کیوں......؟ میں اِنہی سوچوں م تھا جب گاڑی نے ایک لمبا سا موڑ کاٹا اور ہم ایک پس ماندہ سے علاقے میں داخل ہو جہاں کچی گلیوں کی مٹی میں اٹے بچوں نے کچھ دیر تک ہماری گاڑی کا پیچھا کیا اور پھر تھک سرت بھری نگاہوں سے ڈھول اُڑاتی گرد کا حصہ بنتے گئے۔ مجھے یوں محسوس ہوا کہ ور کو ہماری منزل کا بخوبی اندازہ تھا کیوں کہ اُس نے راستے میں ایک بار بھی ہم سے کوئی یق نہیں چاہی اور گاڑی سیدھی جگن کے بتائے ہوئے پتے پر ہی جا کر رکی۔ تب تک گلی مام لوگ چونکنے ہو کر حیرت اور کچھ خوف سے آئی جی صاحب کے محافظ کو ہمارے لیے زے کھولتا دیکھ رہے تھے۔ اُن کے لیے بھی یہ جگن کی طرح ایک انہونی تھی کیونکہ آج تک ں نے زیادہ سے زیادہ کسی سب انسپکٹر، یا ایس ایچ او کو جگن کے دروازے مغلظات بکتے، ذ کے چند ٹکڑے مٹھی میں دبائے نظریں چرا کر جاتے ہوئے دیکھا تھا لیکن اس طرح لمبی ی سرکاری گاڑی میں سے ایک بزرگ درویش اُترتا وہ پہلی مرتبہ دیکھ رہے تھے جو جگن کے ہاتھ پھیر کر اُسے دعائیں بھی دے رہا تھا۔ خود جگن کی اپنی سیٹی گم لگ رہی تھی اور اُسے سمجھ آ رہا تھا کہ ہمارا استقبال کیسے کرے۔ آئی جی صاحب کا ہمارے ساتھ پُرتپاک سلوک وہ چکا تھا اور اب ہمیں اُن کی گاڑی سے اُترتا دیکھ کر تو جیسے اُس کے اوسان ہی خطا ہو گئے ۔ اُس نے آج تک لوگوں کو خود سے ڈر کر نفرت سے بھاگتے ہوئے ہی دیکھا تھا۔ یہ اُس لیے بھی ایک بالکل نیا تجربہ تھا کہ کوئی خود اُس کا مہمان بننے کے لیے اُس کے گھر کی دہلیز کے اُس کے کچے اور بوسیدہ صحن سے گزرا ہے۔ گھر میں دوسرا کوئی نہیں تھا۔ جگن کے چند ے کچھ ہی دیر میں لپک کر کسی قریبی بیکری سے چائے کے کچھ لوازمات پکڑ لائے اور اُن جھن اور حیرت آمیز نگاہوں کے درمیان ہمیں چائے بھی پیش کر دی گئی۔

خود میں بھی نہایت اچنبھے سے سلطان بابا کو یوں مزے سے چائے پیتا دیکھ رہا تھا جیسے

ہمارا واحد مقصد ہی یہاں آ کر جگن کی گلی کے نکڑ والے ہوٹل کی تیز چینی والی چائے پینا ہو۔ کچھ ہی دیر میں وہ جگن کے خاندان کی ساری تاریخ معلوم کر چکے تھے۔ جگن بچپن سے ہی یتیم خانے میں پلا بڑھا تھا اور پھر چودہ سال کی عمر میں اُس نے وہ سرکاری یتیم خانہ بھی چھوڑ دیا اور تب سے مہینے کا ایک آدھ ہفتہ وہ کسی نہ کسی جرم کی پاداش میں جیل میں گزارنے لگا۔ رفتہ رفتہ علاقے میں اُس کی دھاک بیٹھتی گئی اور چھوٹے موٹے چور اُچکے اُس کے گروہ میں شامل ہوتے گئے اور وہ علاقے کا سب سے بڑا دادا بنتا گیا۔ چائے ختم کرنے کے بعد سلطان بابا نے پیالہ میز پر رکھا اور براہ راست جگن کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بولے ”جہانگیر میاں...... تمہاری اتنی شہرت سنی تھی، تبھی اپنی ایک قیمتی چیز تمہارے پاس بطور امانت رکھنے چلا آیا ہوں اور یاد رہے...... یہ کام پولیس، یا کوتوالی کے بس سے باہر کا ہے۔ اُمید ہے مایوس نہیں کرو گے۔“ جگن گڑبڑا سا گیا۔ ”لیکن آپ تو خود...... میرا مطلب ہے...... اچھا آپ بولو تو سہی...... میرے بس میں ہوا تو ضرور...... کیوں نہیں......“

سلطان بابا کی نظریں اب بھی جگن پر ہی گڑی ہوئی تھیں۔ ”کاسنی حویلی کی ایک بٹیا ہے...... اپنی بٹیا جیسی ہی ہے...... زریاب...... اسے بطور امانت تمہاری تحویل میں سونپنا ہے...... بولو...... کرسکو گے اُس کی حفاظت......؟؟؟......“ مجھے یوں محسوس ہوا کہ گھمبیر سناٹے میں کسی نے کوئی کان پھاڑ دینے والا دھماکا کر دیا ہو۔ جگن تو بوکھلا کر کھڑا ہو ہی چکا تھا۔ خود میرے کان بھی سائیں سائیں کر رہے تھے۔ اب مجھے سمجھ آ رہا تھا کہ سلطان بابا نے جگن سے براہ راست بات کرنے کے بجائے اتنا لمبا راستہ کیوں اختیار کیا تھا۔ اگر یہ درخواست وہ سیدھے راستے سے آ کر جگن کے سامنے پیش کرتے تو یقیناً وہ ہماری التجا کو بھی اُسی طرح ہوا میں اُڑا دیتا جیسے ہر کمزور کی فریاد کا انجام ہوتا آیا ہے۔ سلطان بابا نے صبح ہی جگن کو یہ باور کرا دیا تھا کہ اُن کی ڈوری کہاں کہاں بندھی ہوئی ہے۔ پھر انہوں نے شام تک کا وقت لے کر جگن کو خود کو اور انہیں مزید تولنے کا موقع بھی فراہم کر دیا۔ اور پھر اب شام کو پولیس کے سب سے اعلیٰ عہدے دار کی گاڑی میں پوری شان و شوکت کے ساتھ جگن کے دروازے پر اُتر کر انہوں نے جگن کے حوصلوں پر آخری کاری ضرب بھی لگا دی تھی۔ اور اس ساری تمہید کا مقصد جگن کو صرف اتنا ہی احساس دلانا تھا کہ اُس کے مقابل اتنا وزن رکھتے ہیں کہ اگر چاہیں تو وقت

پڑنے پر ساری حکومتی مشینری اپنے حق میں استعمال کر سکتے ہیں لیکن اُن کی آخری بات اور عاجزانہ درخواست نے جگن پر یہ بھی ظاہر کر دیا تھا کہ آنے والوں کے ظرف کا پیمانہ اُس کے اندازوں سے کہیں زیادہ گہرا اور وسیع ہے اور وہ اُس کی دہلیز پار کرنے سے پہلے ہی اپنے ہتھیار باہر میدان میں پھینک آئے ہیں، حالانکہ وہ چاہتے تو ان ہتھیاروں کی بدولت وہ یہ جنگ جیت بھی سکتے تھے۔ لیکن سلطان بابا کا مقصد جنگ کبھی تھا ہی نہیں...... وہ تو بس عاجزی ہی جانتے تھے۔ لہٰذا انہوں نے جگن کو در پردہ یہ احساس بھی دلا دیا کہ اگر وہ اپنے شرانگیز ارادوں سے باز نہ آیا تو بدلے میں اُن کے پاس زریاب کو کاسنی حویلی سے کہیں دُور لے جانے کے سوا کوئی چارہ نہیں رہے گا کیوں کہ معاملہ ایک پردہ نشین کی حرمت کا ہے اور یہ وہ دودھاری تلوار تھی کہ جس کا شکار ہر حال میں وہ پری وش ہی تھی۔ سلطان بابا اپنی بات ختم کر کے چپ ہو چکے تھے اور جگن کے چہرے سے صاف پتا چل رہا تھا کہ اُس کے دل و دماغ میں اس وقت نہ جانے کتنے طوفان اور آندھیوں کے جھکڑ اپنی چیخوں سے اُتھل پتھل مچا رہے تھے۔ وہ اُسی طرح گم صم سا اپنی جگہ پر کھڑا رہ گیا تھا اور آس پاس منڈلاتے اُس کے ہرکارے بھی دم سادھے اپنی جگہ جمے ہوئے تھے۔ کچھ دیر تک ماحول پر وہ اعصاب شکن خاموشی طاری رہی۔ سلطان بابا نے اُٹھ کر جگن کے کاندھے پر ہاتھ رکھا ”اگر میری مانگ بہت بڑی ہے تو میں معافی چاہتا ہوں میاں......“ جگن کا جسم ذرا دیر کے لیے لرز سا گیا۔ میں بھی گھبرا کر اُٹھ کھڑا ہوا اور پھر وہ ہوا جو یہاں کے باسیوں کے لیے دیکھ پانا کبھی ممکن نہ تھا۔ جگن کو آج تک کسی نے زندگی بھر کبھی اتنی عزت اور پیار سے نہیں پکارا تھا۔ عزت تو دُور کی بات کسی صاحب اختیار نے اُس سے سیدھے منہ بات کرنا بھی گوارہ نہیں کیا تھا۔ سلطان بابا نے اُس کے لرزتے شانوں پر ہاتھ کیا رکھے کہ اُس کے اندر کا دس بارہ سالہ وہ یتیم بچہ کود کر باہر نکل آیا جسے آخری بار اِسی محلے کی مسجد کے پیش امام نے سر پر ہاتھ پھیر کر دعا دی تھی۔ جگن کے فولادی جسم نے دو چار ہچکیاں لیں اور پھر وہ جامد برف کا پہاڑ کچھ یوں ٹوٹ کر پگھلا کہ آس پاس سب ہی جل تھل ہوگیا۔ اُس کے کارندے اپنے اُستاد کو یوں بچوں کی طرح آنسو بہاتے دیکھ کر پہلے تو اُس کی جانب دوڑے اور چاہا کہ لپک کر اُسے سنبھال لیں لیکن اب اس بپھرے دریا کے آگے بند باندھنا اُن میں سے کسی کے بس کی بات نہیں رہ گئی تھی۔ نتیجتاً کچھ دیر بعد خود اُن میں سے بھی

چندا اپنی آنکھیں پونچھتے نظر آئے۔ سچ ہے کہ شاید ''آنسو ہی بہترین کفارہ ہے۔'' سلطان بابا کو مزید کچھ کہنے کی ضرورت نہیں پڑی اور جس وقت جگن ہمیں رُخصت کرنے کے لیے اپنی گلی میں آیا تب تک اُس کا اپنے آنسوؤں سے دُھلا ہوا چہرہ یہ صاف بتا رہا تھا کہ اب کمال آباد میں کاسنی حویلی کا اگر کوئی سب سے بڑا محافظ ہوگا تو وہ خود جگن ہی ہوگا۔ اب یہ ظرف سے ظرف کا سودا بن چکا تھا اور آج تک اس بُرے انسان کے اندر کے ظرف کو تولنے کے لیے کسی نے اپنا ترازو یوں پیش ہی نہیں کیا تھا اور آج جب کسی صاحب ذوق نے اُسے خود کو اس کانٹے پر پرکھنے کا موقع فراہم کیا تو اُس کے من کے اندر چھپی کان کا سارا سونا اس زنگ آلود آہن کے نیچے سے جھلک آیا تھا۔

اگلے روز جب ہم کاسنی حویلی سے رُخصت ہوئے تو نگار اور زریاب کی آنکھوں میں بھی آنسو تھے۔ میں اور سلطان بابا پھر سے کچھ نئے رشتے بنا کر اپنی اپنی راہ کے لیے نکل پڑے تھے۔ اسٹیشن پر جگن کا پورا ٹولا ہمیں رُخصت کرنے کے لیے موجود تھا۔ میں جبل پور کے اسٹیشن پر اُترنے سے پہلے سلطان بابا سے جلد وہاں کا پھیرا لگانے کا وعدہ لینا نہیں بھولا۔ میں نے جبل پور اسٹیشن پر ہی زہرا کو ساری صورت حال ایک خط میں لکھ کر بھیج دی اور درگاہ کی جانب چل پڑا۔

لاریب

یونہی رات ہوئی اور پھر دن نکل آیا۔ میں نے ایک عجیب سی بات محسوس کی کہ اصغر صاحب کے چہرے پر ایک عجیب سی اُلجھن اور تناؤ کے آثار ہمہ وقت موجود رہتے ہیں۔ خاص طور پر نماز کے اوقات میں وہ عجیب بے چین سے نظر آنے لگتے تھے۔ لیکن میں مذہب کو ہمیشہ سے ایک خاص حد کے اندر انسان کا بے حد ذاتی معاملہ سمجھتا ہوں۔ لہٰذا میں نے کبھی بھی اُن کے معاملات میں دخل دینے کی کوشش کی نہ ہی اس کی ضرورت محسوس کی۔ یونہی چار دن گزر گئے اور جمعرات کا دن آ پہنچا جب بشیرے نے دِیوں کا تیل بدلنے کے لیے آنا تھا۔ میں نے اُوپر چوٹی سے نیچے گھاٹی میں بشیرے کا تانگا آتے ہوئے دیکھا لیکن آج تانگے کی پچھلی نشست خلاف معمول ایک جالی دار پردے سے ڈھکی ہوئی تھی۔ پھر کچھ زنانہ سواریاں بھی تانگے سے اُتریں۔ کچھ دیر میں سب سے پہلے بشیرا درگاہ کے صحن میں وارد ہوا اور جلدی جلدی تیل کی کپی سے تازہ تیل ہر دیے کی کٹوری میں اُنڈیلنے لگا۔ ساتھ ساتھ اُس کی زبان بھی چلتی رہی۔ ''خان صاحب کی حویلی کی زنانیاں آئی ہیں دعا کرنے، کرم دین بھی ساتھ ہے۔ لاریب بی بی آتی ہیں ہر مہینے کی پہلی جمعرات کو یہاں...... اپنے خان صاحب کی چھوٹی بیٹی ہیں۔ بڑی والی امینہ تو دو سال پہلے ہی بیاہ کر رحمان گڑھ کے چودھری اجمل کے ہاں چلی گئی تھی......'' پھر جیسے بشیرے کو کچھ یاد آیا اور وہ میرے قریب آ کر رازدارانہ انداز میں بولا۔ ''امینہ اور چھوٹی بی بی کی سگی ماں کا بہت سال پہلے انتقال ہوگیا تھا۔ اب جو وہ بیگم صاحب لاریب بی بی کے ساتھ اُوپر آ رہی ہیں وہ اُن کی سوتیلی ماں ہے...... خان صاحب نے بیٹیوں کے لیے دوسری شادی رچا لی تھی......''

اتنے میں وہ دونوں درگاہ کے صحن تک آ پہنچیں اور بشیرے کے رواں تبصرے کو جیسے بریک سی لگ گئی۔ آنے والیوں میں سے ایک بُردبار اور سنجیدہ طبع تھی اور دوسری جو عمر میں چھوٹی تھی کافی شوخ و شنگ سی دکھائی دے رہی تھی۔ اگر بشیرے کی زبانی مجھے اس ماں بیٹی کے

رشتے کا پتا نہ چلتا تو میں انہیں کبھی ماں بیٹی نہ سمجھتا، کیونکہ دونوں کی عمر میں کچھ زیادہ فرق نہیں تھا۔شاید خان صاحب کی دوسری بیگم کی نوعمری میں ہی شادی ہوگئی تھی کیوں کہ وہ لاریب کی بڑی بہن ہی لگ رہی تھیں۔ دونوں نے احاطے میں داخل ہوتے ہی سب سے پہلے فاتحہ پڑھی اور قبر پر پھول چڑھائے۔ میں جب کبھی ان قبروں پر لوگوں کو ازراہ عقیدت پھول چڑھاتے، یا اگربتیاں جلاتے اور خوشبو بکھیرتے ہوئے دیکھتا تھا تو نہ جانے کیوں مجھے ایک عجیب سی بے چینی اور اُلجھن کا احساس ہوتا تھا جیسے ہم بیک وقت ان پھولوں کی نازک پنکھڑیوں اور اس قبر کی بے حرمتی سی کر رہے ہوں۔ اصغر صاحب نہ جانے صبح سویرے ہی کہاں نکل گئے تھے۔ میں احاطے کی کچی دیوار کے ساتھ ساتھ پھیلی ہوئی انگور کی بیلوں کی جانب بڑھ گیا جس کے پتے سردی کی وجہ سے زرد آتشیں رنگ کے ہوکر زمین پر یوں بکھرتے رہتے تھے جیسے کوئی مصور سبز، دھانی اور زرد رنگوں کے چھینٹے کینوس پر گراتا چلا گیا ہو۔انہی بیلوں کے نیچے شفاف پانی کی وہ کشادہ نالی بھی بہتی تھی جس کا منبع درگاہ سے باہر کسی اُونچی چوٹی سے نکلتا ہوا ٹھنڈے میٹھے پانی کا وہ چشمہ تھا جس کا دھارا اِسی درگاہ کے صحن سے اس نالے کی صورت ہو کر گزرتا تھا۔ اس بہتے جھرنے اور اس نالے کی رم جھم جیسی ٹھنڈی میٹھی آواز نے درگاہ کے اس سکوت کو اور بھی مقدس بنا رکھا تھا۔ دو تین دن سے رات کو چونکہ سردی کی شدت میں اضافہ ہو جاتا تھا لہٰذا اس بہتے پانی پر شفاف سی برف کی شیشے نما تہ سی بن جاتی تھی، جو دن نکلنے اور دھوپ چڑھنے پر دھیرے دھیرے پگھل کر پھر سے اُسی رواں پانی کا حصہ بن جاتی تھی۔ اس وقت بھی شیشے جیسی برف کی وہ پتلی سی تہ درمیان سے ٹوٹ کر پانی بن چکی تھی اور کناروں پر بچی اس کی باقیات قطرہ قطرہ پگھل رہی تھیں۔ میں نہ جانے کتنی دیر سے برف اور پانی کا یہ کھیل دیکھ رہا تھا کہ اچانک میرے قریب ہی بشیرے کے کھنکارنے کی آواز نے مجھے چونکا دیا۔ وہ اور اُس کی بڑی مالکن نہ جانے کب سے وہاں کھڑے تھے۔ شاید مالکن نے مجھ سے کوئی سوال بھی کیا تھا لیکن میں اپنی محویت کی وجہ سے اُسے سن نہیں پایا۔ میں نے جلدی سے معذرت پیش کی۔ وہ دھیرے سے مسکرائیں۔

"تو تم ہو اس درگاہ کے نئے مجاور...... لیکن تم تو ابھی کم عمر ہو...... کیا جدی پشتی مجاور ہو......؟ نام کیا ہے تمہارا......؟"

"عبداللہ......" میں نے اُن کے سوال کے پہلے حصے کا جواب دینے سے گریز کیا۔
ں نے بھی دوبارہ اصرار نہیں کیا اور بولیں "اچھا عبداللہ...... تمہیں کچھ خدمت سرانجام دینا
ی۔ ہمارا ہر جمعرات کو یہاں آنا ممکن نہیں، لہٰذا پچھلے خدمت گار کی طرح اب تمہی کو ہر
رات یہاں نیاز بانٹنے کا انتظام کرنا ہوگا۔ بشیر تمہیں ساری تفصیل بتا دے گا۔کوئی مشکل ہو
پوچھ لینا۔"

"جی بہتر......" وہ پلٹ کر جانے لگیں پھر انہیں جیسے کچھ یاد آیا۔ اتنے میں دُور کھڑی
بوتروں کو دانہ ڈالتی لاریب بھی ہاتھ جھاڑ کر ہماری جانب بڑھ آئی۔ بڑی مالکن نے مجھ
ے پوچھا۔

"تمہارے گھر والے کہاں ہیں...... شادی ہوئی ہے تمہاری......؟"

"نہیں...... میں یہاں اکیلا ہوں...... ماں باپ دُور کسی شہر میں رہتے ہیں۔ میں اکلوتا
ں۔" اب لاریب کی باری تھی۔ میرا جواب سن کر وہ چونکی اور کچھ تیز لہجے میں بولی۔

"ارے...... تو انہیں بھی ساتھ لے کر آنا چاہیے تھا نا...... وہ بے چارے اکیلے وہاں کیسے
زارہ کرتے ہوں گے...... اُن کے لیے کسی چیز کی ضرورت ہو تو بلا جھجک بتا دینا۔ بلکہ میں تو
تی ہوں اُن کو بھی یہیں بلوا لو...... پچھلے مجاور کا تو پورا خاندان اسی درگاہ میں رہتا تھا۔"

مجھے لاریب کی بات سن کر مما کا جملہ یاد آ گیا کہ جہاں کہیں بسیرا کرو ہمیں بھی وہیں بلوا
اور جانے کیوں یہ سوچتے ہی میرے ہونٹوں پر خود بخود ہلکی سی مسکراہٹ آ گئی کہ مما اور پاپا
ا میرے ساتھ ہی اس درگاہ کے کبوتروں کو دانہ ڈال رہے ہوں گے اور پتا نہیں کیسے میرے
سے نکل پڑا۔

"پہلے میں خود تو اس دنیا کے طور طریقے اور رہن سہن سیکھ لوں...... پھر انہیں بھی یہیں
الوں گا......"

لاریب اور بڑی مالکن نے چونک کر میری جانب دیکھا۔لیکن تیر کمان سے نکل چکا تھا۔
ب سے میں نے درگاہ کی زندگی اختیار کی تھی میری حتیٰ الامکان کوشش یہی ہوتی تھی کہ میں
بے الفاظ، برتاؤ، یا کسی بھی اور طور طریقے سے دوسروں پر کوئی ایسی بات ظاہر نہ ہونے دوں
ل سے انہیں میرے ماضی، یا میرے رشتوں کے بارے میں کوئی بھی اندازہ ہو سکے۔

دراصل میں جس راستے کا مسافر تھا اس کی منزل نمایاں ہونے سے نہیں بلکہ غیر نمایاں ہو کر نظر آ سکتی تھی۔ اِسی لیے میں ہمیشہ بھیڑ اور ہجوم میں کھوئے رہنے کو ترجیح دیتا تھا لیکن آج حد احتیاط کے باوجود شاید مجھ سے الفاظ کے چناؤ میں کوتاہی ہو ہی گئی تھی اور نتیجہ میں اِ سامنے کھڑی لاریب کی بڑی بڑی کالی آنکھوں سے جھانکتی ہوئی حیرت سے اخذ کر سکتا تھا۔ کچھ دیر تک غور سے میری جانب دیکھتی رہی۔ سورج کی ایک کرن اُس کی نازک سی ناک پر پڑے کوکے سے منعکس ہو کر اُس کے گلابی چہرے پر نور کا ایک سنہری ہالہ سا بنا رہی تھی۔ کچھ لوگوں کا حسن پہلی نگاہ میں ہماری نظر کو خیرہ نہیں کرتا، بلکہ دھیرے دھیرے کچھ الگ زاویوں سے ہم پر کھلتا ہے۔ لاریب کا چہرہ بھی کچھ ایسا ہی تھا۔ پرت در پرت کھلنے والا۔ اُس کی بڑی بڑی سی آنکھوں میں ہر وقت شرارت سی بھری رہتی تھی اور اُسے ہمہ وقت اپنے نچلے ہونٹ ک دانتوں میں دبانے کی عادت تھی جب کہ اُس کے چہرے پر بائیں گال پر ایک ہلکا سا گلابی گڑھا پڑ جاتا تھا۔ خاص طور پر جب وہ مسکراتی تھی، تب...... اور اس وقت یہ تمام کیفیات پوری طرح اُس کے چہرے پر واضح تھیں جب اُس نے میری بات کے جواب میں شرارتاً کہا۔

''انہیں بھی یہیں بلوا لو...... ویسے بھی کافی کمرے خالی پڑے ہیں...... کچھ رونق ہی رہے گی۔''

بڑی مالکن نے کڑی نظروں سے لاریب کو گھورا۔ جواباً وہ منہ میں اپنی کالی چادر کا پلو دبا کر زور سے ہنس پڑی۔ اُس کی ہنسی کی آواز بالکل اس جھرنے سے مشابہ تھی جو درگاہ سے اُوپر والی چوٹی سے نکل کر بہہ رہا تھا۔ بڑی مالکن نے جانے سے پہلے مجھے دعا دی۔ ''کسی اچھے گھر کے لگتے ہو...... جیتے رہو......'' وہ دونوں پلٹ کر چل دیں۔ بشیرے نے جاتے جاتے مجھے یاد دلانا ضروری سمجھا کہ مجھے اُس کی منت کے پورا ہونے کی دعا کرتے رہنا ہے۔ کرم دین ہانپتا کانپتا اپنی لکڑی کی بڑی سی ڈانگ سنبھالے حویلی کی بیبیوں کے آگے تیز تیز دوڑا چلا جا رہا تھا۔ نیچے اُتر کر وہ تانگے پر بیٹھیں اور تانگا آگے چل پڑا۔ اِسی اثنا میں اصغر صاحب بھی پسینے میں شرابور درگاہ کے احاطے میں داخل ہوئے۔ یوں لگتا تھا جیسے بہت دُور سے پیدل چل کر آ رہے ہوں۔ میں نے جلدی سے انگور کی بیلوں کے نیچے رکھے گھڑوں میں سے ایک گلاس پانی بھر کر انہیں پیش کیا جسے وہ ایک ہی سانس میں اُنڈیل گئے۔ ''خوش رہو میاں...... میں دراصل کسی

ام سے نیچے گاؤں کے بازار تک گیا تھا، کچھ لونگ اور لوبان وغیرہ چاہیے تھا۔ واپسی پر ہوڑے رستے کی لالچ میں زیادہ چڑھائی چڑھ گیا۔ کم بخت اب عمر بھی تو نہیں رہی نا......''
ر صاحب حسب معمول بات کرتے وقت اپنے گلے میں پڑے اس سرخ دھاگا نما تعویذ ے کھیلتے رہے جو میں پہلے دن سے اُن کے گلے میں مضبوطی سے کسا ہوا دیکھ رہا تھا۔ کبھی کبھی اُس دھاگے کی سختی اور اُن کے گلے میں پڑے سرخ نشانات دیکھ کر مجھے اُلجھن سی ہونے لگی ی کہ آخر اتنا کس کر دھاگا گلے میں باندھنے کی کیا ضرورت تھی؟ کہ خواہ مخواہ ہی انسان خود کو یت میں ڈالے رکھے، لیکن میں ایک بار پھر اُن سے کچھ پوچھتے پوچھتے رہ گیا۔ شاید یہ دھاگا ی اُن کی اُسی منت کا ہی کوئی تسلسل تھا۔ مجھے گہری سوچ میں پڑا دیکھ کر وہ ہلکے سے کرائے۔ ''میں جانتا ہوں تمہارے ذہن میں ہمہ وقت میرے متعلق بہت سارے سوالات چلتے رہتے ہیں لیکن تمہاری یہی عادت مجھے سب سے زیادہ اچھی لگتی ہے کہ تم کبھی چاہ کر بھی نے دائرے سے باہر نہیں نکلتے اور ہمیشہ غیر ضروری سوالات سے اجتناب کرتے ہو اور یہی ہارے گہرے اور اعلیٰ ظرف کی نشانی ہے۔''

میں نے غور سے اُن کی جانب دیکھا۔ ''پتا نہیں کیوں مجھے ایسا لگتا ہے کہ آپ کسی شدید رد کا شکار ہیں۔ جب کبھی آپ کو ایسا لگے کہ میں آپ کے کسی کام آ سکتا ہوں تو مجھے ضرور کہیے ا۔'' اصغر صاحب نے چونک کر میری جانب دیکھا اور پھر مسکراتے ہوئے میرا کاندھا تھپتھپا ر اپنے کمرے کی جانب بڑھ گئے۔

جبل پور ایک چھوٹا سا قصبہ نما گاؤں تھا جو چاروں جانب سے اُونچی پہاڑیوں سے گھرا وا تھا۔ جن کی چوٹیوں کو شام ڈھلے عموماً بادلوں کی دُھند ڈھک لیتی تھی اور پھر رات گئے، یا صبح ویرے کچھ دیر کے لیے ہلکی بارش ضرور ہوتی تھی۔ گاؤں کا واحد بازار قصبے کے وسط میں واقع ھا، جہاں ٹین کی چھتوں اور لکڑی کے بڑے بڑے پرانے دروازوں والی چند دکانیں بٹوارے ے پہلے سے ایستادہ تھیں جن میں گندم، جو، گڑ، تیل اور دیگر راشن لیے بیٹھے دُکان دار حیرت ری سی نگاہوں سے کسی اجنبی کو وہاں سے گزرتے ہوئے دیکھتے رہتے۔ بازار کے آخری رے پر ایک بڑا سا ٹال تھا جہاں سوختنی لکڑی کے انبار سے لگے رہتے تھے۔ بازار کا لین دین یادہ تر موسمی فصل کی بوائی اور کٹائی پر منحصر ہوتا تھا اور انہی دنوں میں لوگ اپنے پرانے اُدھار

اُتارتے اور ایک نیا قرض سر پر اناج کی بوریوں سمیت اُٹھائے چلے آتے۔ پھر بھی یہ سب لوگ خوش باش رہتے تھے اور اُن کی ہنسی میں ہنسی اور آنسوؤں میں آنسوؤں کا ذائقہ ابھی خالص تھا۔ سچ ہے کہ زندگی الگ چیز ہے۔ زندہ رہنا الگ بات ہے۔ میں نے جبل پور کے لوگوں کو زندہ محسوس کیا تھا۔ اُن کی نیند پُرسکون تھی اور صبح اُن کے لیے دھوپ کی صورت میں سورج کا خنجر لیے وارد نہیں ہوتی تھی۔ قصبے کا واحد مال دار اور متمول گھرانا کریم خان صاحب کا تھا جن کی حویلی پورے گاؤں کی واحد اور باعث تکریم نشانی تھی۔ خود کریم خان کا دل بھی اُن کے نام کی طرح بڑا تھا اور گاؤں کے نہ جانے کتنے گھرانے درپردہ اُن کی اعانت سے ہی چل رہے تھے۔ بیوی کی موت کے بعد اُن کی زندگی کا محور اُن کی دو بیٹیاں ہی رہ گئیں تھیں۔ وہ بچیوں کو دل کا چھالا بنا کر رکھتے تھے اور اُن پر سوتیلی ماں لانے کے بے حد خلاف تھے لیکن سال بھر میں ہی انہیں اندازہ ہوگیا کہ لڑکیوں کی تربیت میں ایک خاص عنصر اُن کی ماں کا بھی ہوتا ہے جو ایک عورت کی موجودگی سے ہی پورا ہوسکتا تھا۔ لیکن ایسی عورت کہاں سے ملتی جو اُن کی بیٹیوں کو ماں نہیں، ایک سہیلی بن کر پالتی۔ آخر کار بزرگوں کی نظر میں کریم خان کی مرحومہ بیوی کی چھوٹی بہن صائمہ پر پڑی جس نے ابھی تازہ تازہ بارھویں جماعت کا امتحان دیا تھا اور وہ درحقیقت کریم خان کی دونوں بیٹیوں کی پسندیدہ خالہ بھی تھی۔ تب کریم خان کی بڑی بیٹی امینہ ساتویں جماعت میں تھی اور سکینہ نے ابھی چوتھی جماعت میں قدم رکھا تھا۔ یوں صائمہ اگلے مہینے ہی دو کپڑوں میں بیاہ کر کریم خان کی حویلی میں چھوٹی مالکن سے بڑی مالکن کی گدی سنبھال چکی تھی۔ ایسے وقت میں کریم خان کے سسرال والوں کے ایثار اور سمجھ داری نے بھی بڑا کردار ادا کیا ورنہ صائمہ کی ماں کا دل تو اپنی پھولوں جیسی بیٹی کو یوں رُخصت کرتے وقت کٹا جارہا تھا۔ لیکن دوسری جانب بھی تو اُن کے اپنے جگر ہی کے دو ٹکڑے تھے جن کے لیے انہیں یہ قربانی دینا ہی تھی۔ صائمہ بیاہ کر کریم خان کے گھر آگئی اور پھر اُس نے ماں کے نام کے ساتھ لگا یہ ''سوتیلی'' کے لاحقے کو کچھ اس طرح سے مٹایا کہ لوگ سوتیلی لفظ کو ہی بھول گئے۔ صائمہ نے دونوں بیٹیوں کی تعلیم پر خصوصی توجہ دی اور بڑی کو تب تک رُخصت نہیں کیا جب تک وہ قریبی ضلع سے بی اے کی فرسٹ ڈویژن کی ڈگری لے کر گھر واپس نہیں آگئی۔ اِسی طرح وہ آج کل اُسی تن دہی سے لاریب کو اُس کی گریجویشن کی تیاری کروا رہی تھی۔ کریم

خان کو لگتا تھا کہ خدا نے اُس کے سبھی اچھے اعمال کا بدلہ اِسی دنیا میں صائمہ کی صورت میں اُسے دے دیا تھا۔ دونوں بیٹیوں نے بھی ماں کو ماں سے زیادہ اپنی سہیلی اور سہیلی سے بڑھ کر ماں سمجھا اور اُسے وہی مان دیا جو وہ اپنی سگی ماں کو دے سکتی تھیں۔ لاریب تو ویسے بھی صائمہ سے بہت قریب تھی اور دونوں ہی یک جان دو قالب کی تشریح بنی اس اُونچی حویلی میں اپنے جیون بیتا رہی تھیں۔ لاریب کو کتابوں سے بے حد شغف تھا اور کریم خان نے بیٹی کی سہولت کے لیے حویلی میں ہی ایک چھوٹی سی لائبریری بنا رکھی تھی جہاں ہر ہفتہ پندرہ دن کے وقفے کے بعد شہر سے چند نئی کتابیں ضرور شامل ذخیرۂ کتب ہو جاتی تھیں۔ لاریب کو اپنے بی اے کے رزلٹ کا انتظار تھا جس کے بعد وہ شہر کی بڑی یونیورسٹی میں داخلہ لے کر آگے پڑھنا چاہتی تھی لیکن فی الحال کریم خان اس کے حق میں نہیں تھے مگر لاریب کو یقین تھا کہ اپنی ہر ضد کی طرح وہ اس بات کو بھی اپنی لاڈلی ماں کے توسط سے منوالے گی۔ ویسے بھی وہ تھی ہی اتنی شوخ وشنگ کے اُس کے ناز کے سامنے اُس کے باپ کا غصہ کچھ کم ہی ٹھہر پاتا تھا۔ سارا دن حویلی میں اُس کی ہنسی اور قہقہوں کا جل ترنگ بجتا رہتا تھا اور وہ پورا دن کسی کو بھی ٹک کر نہیں بیٹھنے دیتی تھی۔ صبح سویرے دھوپ نکلتے ہی رضائیاں اور الگنیاں دھوپ میں ڈالی جا رہی ہیں تو گیارہ بجے گرم پکوڑے اور سموسے تلے جا رہے ہیں۔ ابھی اندر کا ہنگامہ ختم ہوا نہیں کہ سہ پہر سے پہلے آسمان پر بادلوں کی گھٹا دیکھتے ہی حویلی سے ملحقہ باغ میں جھولے ڈلوائے جا رہے ہیں۔ ابھی پہلی بوند گرتی نہیں کہ بارش کے پکوان باغ کے جھولوں تلے بننا شروع۔ ابھی نوکر باغ میں تیل کی کڑائیاں پہنچا کر اپنی کمر سیدھی بھی نہیں کر پائے ہوتے کہ شام کی چائے کا غلغلہ شروع، ساتھ ہی ساتھ دوپٹوں کی رنگائی اور ساون کے لیے نئے کپڑوں کی بنائی، درزی تو سال بھر جیسے حویلی کے دروازے سے ہی ٹنگا رہتا تھا۔ اور پھر مغرب ڈھلی نہیں کہ حویلی کے سب سے بڑے کمرے میں انگیٹھیاں جلوانے کی دوڑ دھوپ شروع، خشک میوے کی پراتیں فٹافٹ وہاں پہنچا دی جاتیں اور پھر رات کے کھانے کے فوراً بعد گرم قہوہ، سبز، یا کشمیری چائے بڑے بڑے فنجانوں میں وہاں کمرے میں پہنچا دی جاتی اور پھر جب کریم خان باہر کے بکھیڑوں سے فارغ ہو کر اپنی چہیتی بیٹی کے پاس آتے تو پھر رات گئے تک ماں باپ دونوں ہی بیٹی کی باتوں کی سرگم سے محظوظ ہوتے رہتے، وہ تھی بھی کچھ ایسی ہی، چند لمحوں میں ہی سب

کو اپنا بنا لینے والی۔ حویلی کے سبھی نوکر بھاگ بھاگ کر اُس کے کام یوں کرتے تھے جیسے اُن سے ذرا سی بھی تاخیر ہوگئی تو اُن کی لاڈلی مالکن کہیں اُن کے حصے کا کام کسی اور کے حوالے کر دے گی۔ اور وہ تو دن بھر اس آس میں اپنے کان اپنی چھوٹی مالکن کی پکار پر لگائے رکھتے تھے کہ کب اُس کے میٹھے لبوں سے اُن میں سے کسی کا نام نکلے اور وہ دوڑتا، یا دوڑتی ہوئی اپنی ہر دل عزیز مالکن کے پاس پہنچ جائیں۔ تبھی تو کریم خان کا دل نہیں مانتا تھا کہ اپنی اس بولتی مینا کو ایک بار پھر سے یونیورسٹی ہوسٹل کی بھول بھلیوں میں بھجوا دے۔ ابھی دو ماہ پہلے ہی تو وہ شہر کے کالج سے امتحان دے کر لوٹی تھی۔ اب وہ کسی طور بھی اپنی لاڈلی کو خود سے جدا نہیں کرنا چاہتے تھے۔ لیکن بابل جانے پیار پالتے ہوئے ہمیشہ یہ کیوں بھول جاتا ہے کہ بیٹیاں تو سدا سے پرایا دھن ہوتی ہیں۔ صائمہ بھی ہمیشہ شوہر کو یہی سمجھاتی رہتی تھی کہ بیٹی سے اتنا زیادہ پیار اور لگاؤ بعد میں بہت تڑپاتا ہے۔ لیکن ان جذبوں پر انسان کا قابو ہوتا تو پھر زندگی میں رونا ہی کس بات کا تھا اور پھر کچھ لوگوں میں کچھ ایسی ہی بات بھی تو ہوتی ہے، دل میں کھب جانے والی...... وہ بھی ایسی ہی تھی...... چند لمحوں میں ہی آنکھوں کے راستے دل میں اُتر کر خون سے تحلیل ہو جانے والی...... اور اُس کی یہ شوخ طبیعت اور قہقہے اب واقعی حویلی کے در و دیوار میں تحلیل ہی تو ہو چکے تھے۔

یہ ساری باتیں مجھے آتے جاتے بشیرے اور کسی حد تک کرم دین سے پتا چلتی رہیں۔ دن گزرتے جا رہے تھے۔ مما کی تاکید کے مطابق میں انہیں ہر ہفتے تاکید سے خط لکھ دیتا تھا اور ہر پندرھواڑے میسر آنے پر فون بھی کر لیتا تھا۔ اس دن بھی جب میں گاؤں کے واحد تار گھر سے مما سے فون پر بات کر کے واپس درگاہ آیا تو بے حد اداس تھا۔ مما کی طبیعت کچھ ٹھیک نہیں تھی۔ انہوں نے خود تو نہیں بتایا لیکن پاپا سے جب بات ہوئی تو انہوں نے دبے لفظوں میں اُن کی طبیعت کا ذکر کر دیا تھا۔ میں سوچ رہا تھا کہ سلطان بابا کا کہیں اتا پتا ملے تو میں اُن سے ایک ہفتے کی چھٹی لے کر گھر ہو آؤں۔ لیکن شام ڈھلنے سے پہلے ہی اصغر صاحب کو شدید بخار نے آ گھیرا۔ سردی کی شدت کافی بڑھ چکی تھی اور وہ نہ جانے دن بھر کہاں بھٹکتے رہتے تھے۔ شاید اِسی آوارہ گردی کے دوران انہیں سردی لگ گئی تھی۔ رات ہوتے ہوتے وہ بالکل ہی بے سدھ ہو گئے اور مجبوراً مجھے انہیں کمرے میں اُٹھا کر لانا پڑا۔ اُن کی بے ہوشی کے وقفے گہرے ہوتے

جا رہے تھے اور درمیان میں تھوڑا بہت ہوش آتا بھی تو بے سدھ سے پڑے رہتے۔ وہ ہذیان میں کچھ عجیب سی باتوں کی گردان بھی کر رہے تھے۔ ''توڑ دوں گا...... میں اس دھاگے کو توڑ دوں گا...... مجھے آزاد کر دو......'' مجھے سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ میں انہیں کیسے سنبھالوں کیونکہ مجھے ایسی کسی تیمارداری کا پہلے سے کوئی تجربہ نہیں تھا۔ اور میرے پاس یہاں درگاہ میں ایسی کوئی خاص دوا بھی نہیں تھی جو اس بیماری میں میں انہیں پلا سکتا۔ مجھے یہ بھی تشویش تھی کہ انہوں نے آج تک کبھی اپنے کسی اتے پتے سے بھی مجھے آگاہ نہیں کیا تھا، نہ ہی مجھے اُن کے کسی اور رشتے دار وغیرہ کا پتا تھا۔ آدھی رات تک مجھ سے جو بھی بن پڑا وہ میں نے کیا لیکن اُن کی حالت سدھرنے کے بجائے مزید بگڑتی ہی گئی اور آخر کار مجھے فیصلہ کرنا ہی پڑا کہ مجھے نیچے گاؤں جا کر کسی مدد کا انتظام کرنا ہی پڑے گا۔ لیکن یوں آدھی رات کو میں کس کے گھر کا دروازہ کھٹکھٹاتا۔ مجھے تو وہاں نیچے کسی حکیم، یا طبیب کا بھی پتا نہیں تھا۔ لہٰذا اس نیم شب میں جب سردی رگوں کو اندر سے کاٹ رہی تھی اور گاؤں بھر میں کسی بھی ذی رُوح کا نشان تک ڈھونڈے سے نہ ملتا تھا، میں نے بڑی حویلی کے پھاٹک پر دستک دی اور پھر جانے کتنی دیر بعد کسی دربان کے کھانسنے کی آواز سنائی دی۔ دروازہ کھولنے والا کرم دین نہیں تھا، کوئی دوسرا پکی عمر کا مرد تھا جو یوں آدھی رات کو اپنی نیند خراب کیے جانے پر کافی حد تک برہم بھی نظر آ رہا تھا۔ اُس نے پھاٹک کھلتے ہی درشت لہجے میں پوچھا۔

''کیا بات ہے......؟......''

میں نے اُس کے لہجے کو نظرانداز کر دیا۔

''میرا نام عبداللہ ہے...... میں پہاڑی والی درگاہ کا مجاور ہوں...... میں......'' اُس نے میری بات پوری ہونے سے قبل ہی کاٹ دی۔

''صبح آنا...... اس وقت سب سو رہے ہیں......'' اُس نے بڑبڑاتے ہوئے دروازہ بند کرنے کی ٹھانی اور زیرِ لب کہا ''نہ دن دیکھتے ہیں نہ رات...... یہ بھی کوئی وقت ہے مانگنے کا......'' وہ مجھے کوئی بھکاری سمجھ رہا تھا۔ ویسے ٹھیک بھی تھا، ہر طلب گار بھکاری ہی تو ہوتا ہے۔ میں نے جلدی سے اُسے روکا۔

''مجھے اپنے لیے کچھ نہیں چاہیے...... دراصل اُوپر درگاہ میں ایک مریض کی حالت بہت

بُری ہے...... مجھے اُس کے لیے کچھ دوائیں چاہئیں...... آپ اگر خان صاحب سے جا کر......''
اُس نے ایک بار پھر میری بات کاٹ دی۔ ''نہیں نہیں...... خان صاحب اس وقت کسی سے نہیں ملتے...... اور اب اس آدھی رات کو میں کہاں سے دوا دارو کا انتظام کروں......؟ تم اگر واپس نہیں جا سکتے تو یہیں حویلی کی ڈیوڑھی میں ایک طرف پڑے رہو، خان صاحب صبح کی نماز کے لیے اُٹھیں گے تو تمہاری بات کروا دوں گا...... اب جاؤ اور مجھے بھی سونے دو......''

اُس نے ایک بار پھر مجھے دھتکار کر پھاٹک بند کرنے کی ٹھانی۔ مجھے سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اُسے کس طرح سے صورت حال کی نزاکت سمجھاؤں۔ میں نے بھی مجبوراً واپسی کی ٹھانی۔ اتنے میں اندر والی ڈیوڑھی کے اندھیرے سے کسی عورت کی آواز اُبھری۔

''دروازے پر کون ہے جمالے......''

دوسرا مسیحا

حویلی کا دربان چونک کر پلٹا۔ ڈیوڑھی کے اندھیرے سے بڑی مالکن اور لاریب آگے بڑھ کر دیوار کے ساتھ لگی جلتی مشعل کی روشنی میں آ گئیں۔ وہ دونوں جانے کب دروازے پر بات چیت اور بحث کی آوازیں سن کر ڈیوڑھی میں چلی آئی تھیں۔ دربان گھبرا سا گیا۔

''پتا نہیں کون بھکاری ہے جی...... آدھی رات کو خان صاحب کو جگانے کا کہہ رہا تھا۔ میں نے کہہ دیا کہ ہم اس وقت اُن کی نیند خراب نہیں کر سکتے...... جو بھی چاہیے، صبح آ کر لے جائے، بڑی مالکن......'' انہوں نے جمالے کی بات پر دھیان نہیں دیا اور آواز دے کر بولیں۔

''کون ہے دروازے پر...... سامنے آؤ......''

میں نے پھاٹک سے اندر قدم رکھ کر انہیں سلام کیا۔ وہ مجھے دیکھ کر چونکیں۔ لاریب بھی حیران سی تھی۔ ''عبداللہ...... تم...... خیریت تو ہے......''

میں نے انہیں اصغر صاحب کی بیماری سے لے کر حویلی کا در کھٹکھٹانے تک کا تمام ماجرا سنا دیا۔ انہوں نے فوراً لاریب کو اندر سے میڈیکل بکس لانے کا کہا اور جمالے کو ٹھیک ٹھاک جھاڑ پلائی کہ اُسے کتنی بار منع کیا ہے کہ کسی بھی سائل کو یوں دروازے سے واپس نہ لوٹایا کرے۔ وہ تو اچھا ہوا کہ وہ کرم دین کی گھر والی، جو حویلی کے احاطے میں ہی اپنی کوٹھڑی میں بیمار پڑی تھی، کی دوا بنا کر اُسے دینے کے لیے جا رہی تھیں کیونکہ طبیب نے اُسے ہر چھ گھنٹے کے بعد ایک تازہ دوا کی خوراک دینے کی تاکید کی تھی۔ اور لاریب کی ضد تھی کہ وہ خود ہی انہیں دوا کھلائے گی کیونکہ کرم دین کو شک تھا کہ اُس کی گھر والی ان کڑوی کسیلی دواؤں سے تنگ آ کر اب انہیں آنکھ بچا کر بہا دیتی ہے۔ لہٰذا اب دوا کی تمام خوراکیں لاریب کی نگرانی میں پلائی جاتی تھیں۔ اور پھر جب لاریب جاگ رہی ہو تو بھلا وہ اپنی سہیلی اپنی پیاری ماں کو کہاں سونے دے سکتی تھی اور یہی جگ راتا انہیں رات کے اس پہر دروازے تک لے آیا۔ ورنہ شاید مجھے پوری رات وہیں حویلی کی ڈیوڑھی میں انتظار کرنا پڑتا۔ لاریب کچھ ہی دیر میں

میڈیکل بکس لے آئی جس میں بخار کی انگریزی دوائیں بھری پڑی تھیں۔ بڑی مالکن نے وہ بکس میرے حوالے کیا اور مجھے دوا پلانے کے بارے میں کچھ ہدایات جاری کر کے واپس درگاہ جانے کا کہا جب کہ جمالے کو حکم دیا گیا کہ وہ فوراً جا کر حکیم صاحب کو جگائے اور انہیں لے کر اُوپر درگاہ مریض کے پاس پہنچے۔ ویسے تو گاؤں میں ایک سرکاری ڈسپنسری بھی تھی لیکن اُس کا پچھلا سرکاری ڈاکٹر سفارش کروا کر کسی بڑے ضلع میں اپنا تبادلہ کروا چکا تھا اور پچھلے ڈیڑھ سال سے کسی نئے ڈاکٹر کی تعیناتی کھٹائی میں پڑی ہوئی تھی کیوں کہ جس کو بھی اس دُور دراز علاقے میں تعینات کیا جاتا وہ آنے سے پہلے دوڑ دھوپ کر کے اپنا تبادلہ رُکوا لیتا تھا۔

میں دواؤں کا بکس لے کر پلٹنے لگا تو بڑی مالکن نے مجھے آواز دی۔

''سنو عبداللہ......'' میں ٹھٹھک کر پلٹا تو وہ غور سے میری جانب دیکھ رہی تھیں۔

''جمالے کی باتوں کا بُرا نہ ماننا......تم کوئی مانگنے والے نہیں...... اس گاؤں بھر کے مہمان ہو......لیکن تمہارے ساتھ آج جو برتاؤ اس حویلی کے دروازے پر ہوا ہے اس کے لیے میں بہت شرمندہ ہوں...... خان صاحب کو پتا چلے گا تو وہ اس جمالے کی خوب خبر لیں گے......''

میں نے جلدی سے اُن کے غصے کو ٹھنڈا کرنے کی کوشش کی ''نہیں نہیں...... ایسی کوئی بات نہیں ہے...... میرا حلیہ ہی شاید ایسا ہے کہ جمالے کی جگہ کوئی اور بھی ہوتا تو دھوکا کھا جاتا۔ آپ خان صاحب کو اس ساری تفصیل سے آگاہ نہ کیجیے گا۔ یہ میری آپ سے گزارش ہے۔ معاف کرنے میں بڑائی ہے......آپ بھی جمالے کو معاف کر دیجیے......''

اُن کے منہ سے بے اختیار نکلا۔ ''جیتے رہو......'' لاریب نے کچھ کہنے کے لیے منہ کھولا لیکن تب تک میں وہاں سے پلٹ چکا تھا۔ میں اُوپر درگاہ میں پہنچا تو اصغر صاحب بالکل ہی بے سدھ پڑے تھے۔ بڑی مشکل سے اُن کے حلق میں دوا اُنڈیلی۔ کچھ ہی دیر میں جمالا بھی حکیم صاحب کو لے کر پہنچ گیا اور حکیم نے بڑی جانفشانی سے دن چڑھے تک اصغر صاحب کی کچھ ایسی دیکھ بھال کی کہ دوپہر تک وہ بمشکل آنکھیں کھولنے کے قابل ہو سکے۔ حکیم صاحب ابھی وہیں موجود تھے جب خان صاحب بھی تیمارداری کے لیے درگاہ آ پہنچے اور کافی دیر وہیں اصغر صاحب کے سرہانے بیٹھے رہے۔ انہوں نے بہت چاہا کہ اصغر صاحب کچھ دن کے لیے

نیچے اُن کی حویلی کے مہمان خانے میں منتقل ہو جائیں لیکن وہ نہیں مانے۔ پتا نہیں کیوں اصغر صاحب ایک رات بھی درگاہ سے باہر نہیں گزارنا چاہتے تھے۔ شاید یہ بھی اُن کی مانی ہوئی منت کی کوئی مجبوری تھی؟ خان صاحب نے جاتے وقت حکیم کو تاکید کی کہ وہ اصغر صاحب کے ٹھیک ہونے تک دن میں ایک مرتبہ درگاہ کا پھیرا ضرور ڈال جایا کریں کیوں کہ خان صاحب اصغر صاحب کو بھی اپنا مہمان سمجھتے تھے اور مہمان کی تیمارداری اور علاج میں وہ کوئی غفلت برداشت نہیں کر سکتے تھے۔ طبیب کے جانے کے بعد اصغر صاحب بہت دیر تک ممنونیت بھرے لہجے میں میرا شکریہ ادا کرتے رہے کہ میں نے اُن کے لیے بڑی زحمت برداشت کی۔ بڑی مشکل سے میں نے انہیں موضوع بدلنے پر آمادہ کیا اور اِدھر اُدھر کی باتیں کر کے اُن کا دھیان بٹایا۔ اس دن میں نے اُن سے احتیاطاً اُن کا پتا اور چند حوالے پوچھ کر ایک کاغذ پر لکھ لیے تاکہ آئندہ کسی ایسی ہنگامی صورت میں کام آ سکیں۔ انہوں نے بے دلی سے مجھے اپنا پتا نوٹ تو کروا دیا لیکن ساتھ ہی ساتھ خاص طور پر یہ تاکید بھی کی کہ میں حتیٰ الامکان کوشش کروں کہ یہ پتا راز ہی رہے اور صرف اور صرف اُن کی موت کی صورت میں ہی اُن کے گھر والوں سے کوئی رابطہ کیا جائے۔ میں نے جب چونک کر اُن کی جانب دیکھا تو وہ مجھے ایک بے حد ٹوٹے ہوئے انسان دکھائی دیئے۔ ''لمبی کہانی ہے میاں...... پر تمہیں سناؤں گا ضرور......تم نے میرا دل جیت لیا ہے۔ بس ذرا میری طبیعت سنبھل جانے دو......'' میں نے انہیں دماغ پر زیادہ زور ڈالنے سے منع کیا اور انہیں نیند کی گولی دے کر باہر صحن میں چلا آیا۔ سفید بادلوں کے چند آوارہ ٹکڑے نیلے آسمان پر آنکھ مچولی کھیل رہے تھے۔ اُن میں سے کوئی ایک کسی پہاڑی کی چوٹی کے پیچھے جا چھپتا اور پھر باقی سب اُسے ڈھونڈنے کے لیے ہوا کے دوش پر اُس کے پیچھے بھاگے جاتے۔ پھر اُن میں سے کوئی ایک اُسے جا پکڑتا اور اُن کے پیچھے باقی لگ جاتے۔ میں نہ جانے کتنی دیر تک ہوا، آسمان اور بادلوں کا یہ لافانی کھیل دیکھتا رہا۔ تبھی نرم چمکیلی دھوپ نے درگاہ کی منڈیروں کو چوم چوم کر انہیں الوداع کہنے کا سلسلہ شروع کر دیا۔ ساتھ ہی ساتھ وہ اُن سے یہ وعدہ بھی کرتی جاتی کہ کل صبح وہ پھر اُن سے ملنے آئے گی، لہٰذا وہ اداس نہ ہوں۔ لیکن شام ڈھلنے کے ساتھ ساتھ میری اداسی تو بڑھنی ہی تھی، مجھے یہاں اس دھوپ جیسا کوئی دوست میسر نہیں تھا جو اس شرط پر مجھ سے الوداع ہوتا کہ ''کل پھر ملیں گے......'' مغرب کی اذان کا

وقت ہو چلا تھا، میں منڈیر پر رکھے دیے جلانے کے لیے اُٹھا ہی تھا کہ مجھے نیچے گھاٹی میں بشیرے کے تانگے کی مخصوص گھنگھرؤں بھری ٹاپ اور اُس کے سال خوردہ بھونپو کی آواز سنائی دی۔ میں نے باہر نکل کر نیچے جانے والے رستے سے جھانکا تو وہ نیچے سے ہی چلایا۔ ''او عبداللہ باؤ جی...... آپ کو خان صاحب نے ابھی بلایا ہے۔ جلدی سے نیچے آ جاؤ۔'' خان صاحب کے بلاوے کا سن کر میں سوچ میں پڑ گیا۔ کہیں بڑی مالکن، یا لاریب نے انہیں رات والے واقعے کا تو نہیں بتا دیا؟ اگر ایسا ہوا تو خواہ مخواہ جمالے کی شامت آ جائے گی۔ میں اسی سوچ میں گھرا نیچے اُترا تو بشیرا تانگا موڑ کر بالکل تیار کھڑا ملا۔ میں نے اُس سے معاملہ پوچھا تو بولا ''پتا نہیں جی...... خان صاحب سے ملنے کچھ مہمان بڑی سی گاڑی میں آئے ہیں کہیں دُور شہر سے...... اس کے بعد خان صاحب نے مجھے یہاں بھیج دیا...... معاملہ تو اب آپ اُنہی سے پوچھنا۔'' میں اُلجھن میں پڑ گیا کہ خان صاحب نے اپنے مہمانوں کی آمد کے بعد بھی اگر مجھے بلاوا بھیجا ہے تو اس کا کیا مقصد ہو سکتا ہے۔ اس اُدھیڑ بن میں ہم حویلی پہنچ گئے۔ مجھے کوئی گاڑی حویلی کے باہر کھڑی دکھائی نہیں دی۔ شاید اُسے حویلی کے اندرونی احاطے کے پیچھے والے گیراج میں پارک کر دیا گیا تھا جہاں خان صاحب کی اپنی گاڑیاں پارک ہوتی تھیں۔ حالانکہ میں نے کبھی گاؤں میں آتے جاتے انہیں اپنی کوئی گاڑی استعمال کرتے نہیں دیکھا تھا۔ شاید وہ گاڑیاں صرف شہر آنے جانے کے لیے استعمال میں آتی تھیں۔ کرم دین میرے پہنچتے ہی جلدی سے اندرونی ڈیوڑھی سے برآمد ہوا اور مجھے حویلی کے اندر والے بڑے کمرے کی طرف چلنے کا کہہ کر حسبِ معمول بنا میرا جواب سنے آگے بڑھ گیا۔ میں نے جھجکتے ہوئے اندر کی جانب قدم بڑھا دیئے۔ میں اب تک جتنی بار بھی حویلی آیا تھا میرا تعلق صرف اس بیرونی مہمان خانے والے حصے تک ہی رہا تھا۔ آج پہلی بار مجھے اس اندرونی ڈیوڑھی سے گزر کر اصل حویلی میں قدم دھرنے کا اتفاق ہوا تو کچھ عجیب سی ہچکچاہٹ محسوس کر رہا تھا۔ جانے وہ کون سے خاص مہمان تھے جن سے ملوانے کے لیے خان صاحب نے مجھے اپنی حویلی کے زنان خانے کی سرحد بھی پار کروا دی تھی۔ بڑے کمرے سے زور زور سے باتیں کرنے کی آوازیں آ رہی تھیں اور جب میں نے بڑی سی چک اُٹھا کر اندر کمرے میں قدم رکھا تو میرے پاؤں جیسے زمین میں ہی گڑ کر رہ گئے۔ میرے بالکل سامنے والے صوفے پر مما بیٹھی ہوئی تھیں

ر اُن کے سامنے خان صاحب کے ساتھ پاپا بیٹھے سگار پی رہے تھے اور زور و شور سے کوئی بحث ہاری تھی۔ مما نے مجھے یوں جے دیکھا تو خود ہی لپک کر مجھ تک پہنچیں اور انہوں نے مجھے زور ے بھینچ کر گلے لگا لیا۔ پاپا بھی اُٹھ کر ہماری جانب چلے آئے۔ مما کی آنکھوں سے جیسے ہوں کا رُکا سیلاب بہہ نکلا۔ پاپا بھی ہم دونوں کو چپ کرواتے کرواتے اپنی آنکھیں بھگو بیٹھے ر ان دونوں کو دلاسا اور تسلی دیتے دیتے میرے اپنے آنسو میرے گالوں سے ٹپکتے ہوئے مما ے دامن کو بھگونے لگے۔ ابھی دو دن پہلے ہی تو میں نے پاپا سے فون پر بات کی تھی اور انہوں نے مجھے بتایا تھا کہ مما کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے اور وہ میرے لیے بے حد اداس ہیں۔ اگر کل نر صاحب بیمار نہ پڑتے تو میں خود اُن سے ملنے کا پروگرام بنا چکا تھا۔ لیکن میرے فون کے د مما سے رہا نہیں گیا اور وہ سیکڑوں میل کا سفر طے کر کے پپا سمیت یہاں آ پہنچی تھیں۔ مجھے ہاپا کی طرف سے یہ سختی سے تاکید تھی کہ میں جہاں بھی بسیرا کروں، اپنے مکمل پتے سے سب ے پہلے انہیں آگاہ کر دیا کروں۔ اس لیے مجھ تک پہنچنے میں انہیں کوئی دقت نہیں ہوئی۔ اور ل پور میں جب اتنی بڑی گاڑی داخل ہوئی تو سبھی نے یہی سمجھا کہ ہو نہ ہو یہ اُن کے خان احب کے ہی مہمان ہوں گے، لہٰذا جس پہلے راہ گیر سے راستہ پوچھا گیا وہ انہیں درگاہ کے ائے سیدھا خان صاحب کی حویلی تک لے آیا۔ نتیجتاً اس وقت مما پاپا دونوں میرے سامنے ٹھے ہوئے تھے۔ مما کی آنکھیں اب بھی بار بار چھلکی جاتی تھیں اور میں نے محسوس کیا کہ ہم ل کو یوں روتا دیکھ کر خود خان صاحب کی آنکھیں بھی نم ہو چلی تھیں۔ بڑی مشکل سے میں ،مما اور پپا کو سنبھالا۔ ماحول کی اداسی کچھ کم ہوئی تو خان صاحب نے شکوہ کر ہی ڈالا۔ ''تو اللہ میاں...... تم عبداللہ نہیں ساحر ہو...... لیکن میاں تم نے ہمارے ساتھ بڑی زیادتی کر ...... اب جبل پور والے اس زیادتی کا قرض کیسے اُتاریں گے......؟''

''یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں، میں اب عبداللہ ہی ہوں۔ ہاں اس سے پہلے ساحر تھا لیکن پ سے میرا تعارف عبداللہ ہی کی حیثیت سے ہوا تھا۔ براہ کرم ساحر کے تعارف کی دیوار کو ے رشتے میں حائل نہ کیجیے اور آپ نے ہمیشہ مجھ سے بے حد مہربانی کا سلوک روا رکھا ہے ا کے لیے میں ہمیشہ آپ کا احسان مند رہوں گا......''

خان صاحب ابھی تک حیرت کے عالم سے باہر نہیں نکل پائے تھے۔ ''مجھے ابھی تک

پوری طرح یقین نہیں آ رہا کہ کوئی اپنا محل اور شہزادوں جیسی زندگی چھوڑ کر، صرف ایک کھوج کے لیے یوں کٹیا کی زندگی اختیار کر سکتا ہے، اور وہ بھی اس دور میں جب ظاہری شان و شوکت اور بے انتہا دولت ہی لوگوں کی زندگی کا مقصد اور معیار بن چکی ہو...... یہ معجزہ نہیں تو اور کیا ہے......؟'' اتنے میں اندر زنان خانے سے مما کے لیے بڑی مالکن کا پیغام آ گیا کہ وہ کھانے میں اُن کی پسند کا پوچھ رہی ہیں اور اُن کی خواہش ہے کہ رات کے کھانے کی تیاری تک وہ اندر زنان خانے میں رہیں تو انہیں بہت خوشی ہوگی۔ میں جانتا تھا کہ مما کا دل میرے پاس سے اُٹھ کر جانے کو نہیں چاہ رہا ہوگا لیکن وہ دنیا کے بھرم اور تقاضے نبھانا بھی خوب جانتی تھیں لہٰذا فوراً اُٹھ کر اندر چلی گئیں۔ پپا میرا ہاتھ پکڑے وہیں صوفے پر بیٹھے خان صاحب کے ساتھ گپیں ہانکتے رہے مگر خان صاحب کی نظر بار بار پھسل کر مجھ پر پڑتی رہی۔ کبھی کبھی انسان کا رُتبہ اور دنیاوی مقام بھی اُسے ایک عجوبہ ہی بنا دیتا ہے۔ شاید اس وقت میری حیثیت بھی وہی تھی۔ مجھے اُوپر درگاہ میں پڑے اصغر صاحب کی فکر بھی ستا رہی تھی لیکن خان صاحب نے یہ بتا کر میری تسلی کر دی کہ انہوں نے کرم دین اور جمالے دونوں کو ہی اصغر صاحب کی تیمارداری کے لیے اُوپر بھجوا دیا ہے اور میری درگاہ واپسی تک وہ لوگ وہیں رہیں گے۔ رات کا کھانا بھی مما نے اندر زنان خانے میں ہی کھایا۔ پپا نے کھانے کے بعد خان صاحب سے واپسی کی اجازت چاہی کہ وہ مجھے دو چار دن کے لیے اپنے ساتھ لے کر گھر جانا چاہتے ہیں تو خان صاحب باقاعدہ ناراض ہو گئے کہ یوں رات گئے کیا وہ اپنے مہمانوں کو جانے دیں گے۔ میں نے بھی پپا کو اصغر صاحب کی بیماری اور اپنی مجبوری کے بارے میں بتایا کہ سلطان بابا نے خصوصی طور پر مجھے یہاں بھیجا ہے لہٰذا اُن کو بتائے بنا یوں درگاہ کو چھوڑ جانا میرے لیے بہت مشکل ہوگا۔ دوسری طرف خان صاحب مصر تھے کہ برسوں بعد انہیں کوئی اپنے مزاج کا آشنا ملا ہے لہٰذا شطرنج کی چند بازیاں کھیلے بنا اگر انہوں نے پپا کو واپس جانے دیا تو یہ ''گناہ عظیم'' ہو گا۔ آخر کار گھنٹوں کی بحث اور مباحثے کے بعد یہ طے پایا کہ جو دو چار دن مما اور پپا میرے ساتھ گھر میں گزارنا چاہتے تھے اب یہیں خان صاحب کی حویلی میں ہی گزاریں گے۔ مجھے البتہ اتنی چھوٹ دے دی گئی کہ میں روزانہ صبح و شام درگاہ کا چکر لگا آیا کروں۔ ہمارے رہنے کے لیے دو کمرے پہلے ہی کھلوا دیئے گئے تھے مگر وہ ساری رات مما اور پپا نے میرے کمرے

میں مجھ سے باتیں کرتے ہی گزار دی۔ مجھ سے ملنے کے بعد مما واقعی بہت خوش نظر آ رہی تھیں اور اُن کی بیماری بھی کہیں ''اُڑن چھو'' ہو گئی تھی۔ میرے کمرے کا دروازہ حویلی کے بائیں باغ کی طرف نکلتا تھا اور پپا نے بھی میرے ہی کمرے میں رات گزارنے کا فیصلہ کیا تھا کیوں کہ بہرحال خود انہیں حویلی کے پردے کا خیال رکھنا تھا حالانکہ خان صاحب نے اُن کا اور مما کا کمرہ اندر زنان خانے میں ہی لگوایا تھا۔ مما تو اگلے ہی دن بڑی مالکن کے قصے یوں سنانے لگ گئیں تھیں جیسے وہ اُن کی کوئی برسوں پرانی سہیلی ہوں۔ انہیں لاریب نے بھی بہت متاثر کیا تھا اور اس لڑکی کی زندہ دلی نے تو جیسے اُن کا دل ہی جیت لیا تھا۔ لیکن پتا نہیں کیوں جب سے مما اور پپا نے حویلی آ کر میرا ساحر ہونے کا راز کھولا تھا تب سے مجھے بڑی مالکن کے سامنے جانے کا سوچ کر ہی ایک عجیب سی جھجک گھیر لیتی تھی۔ لیکن میں زیادہ دیر تک اُن کا سامنا کرنے سے بچ نہیں پایا۔ اگلی شام جب میں اصغر صاحب کو دوا پلا کر درگاہ سے واپس حویلی لوٹا تو کرم دین نے بتایا کہ خان صاحب پپا کو اپنی زمینیں دکھانے کے لیے اپنے علاقے کی جانب نکل چکے ہیں اور میرے لیے مما کا یہ پیغام ہے کہ وہ چائے پر باغ میں میرا انتظار کر رہی ہیں۔ میں نے اپنے جھجکتے قدم حویلی کے باغ کی جانب بڑھا دیئے۔ باغ میں ایک جانب حویلی کے نوکر مالٹے کے درختوں کے نیچے چائے کے لوازمات وغیرہ بڑی سی ٹرالی پر سجانے میں مصروف تھے، لیکن مما مجھے کہیں آس پاس دکھائی نہیں دیں۔ میں پلٹا ہی تھا کہ میں نے اپنے بالکل سامنے لاریب کو کھڑے پایا۔ اُس کے ہاتھ میں بھی چائے کے ساتھ پروسے جانے والے ناشتے کی ایک ٹرے تھی۔ میں نے سلام کر کے جلدی سے وہاں سے آگے بڑھ جانا چاہا لیکن وہ تو جیسے میرے ہی انتظار میں تھی۔ اُس کی آواز نے میرے قدم جکڑ لیے۔ ''سنیں......'' میں نے اُس کی جانب دیکھا۔ ''وہ دراصل...... مجھے کچھ سمجھ نہیں آ رہا کہ میں آپ سے کیسے معذرت کروں......'' اُس کی پریشانی اُس کے ماتھے پر چمکتی پسینے کی چند ننھی بوندوں سے واضح تھی۔ میں نے اُسے دلاسا دیا۔ ''معذرت کیسی......؟ آپ نے تو ایسا کچھ بھی نہیں کہا جس کے لیے آپ معذرت خواہ ہوں......'' اُس نے غور سے میری جانب دیکھا ''یہ آپ کی اعلیٰ ظرفی ہے...... ورنہ اُس رات جمالے نے دروازے پر آپ کے ساتھ جو سلوک کیا وہ......'' میں نے اُس کی بات کاٹ دی۔ ''جمالے نے وہی کیا جو اُسے کرنا چاہیے تھا...... دربان کا کام اجنبیوں

کو روکنا ہی تو ہوتا ہے...... اور پھر اتنی رات گئے اگر جمالے کی جگہ میں بھی ہوتا تو وہی کرتا جو اُس نے کیا۔ آپ دل پر کوئی بوجھ نہ لیں......'' وہ جلدی سے بولی جیسے اُسے میرے آگے بڑھ جانے کا خدشہ ہو۔ ''بوجھ تو میرے دل پر اور بھی بہت سے ہیں، خود میرا رویہ بھی آپ سے کچھ نامناسب ہی رہا ہے...... میرے ذہن میں اَن گنت سوال ہیں لیکن فی الحال میں خود انہیں ترتیب نہیں دے پارہی...... میں بہت اُلجھن میں ہوں...... آپ...... یہ سب...... کیسے......؟''
واقعی شاید اُسے خود بھی سمجھ نہیں آرہی تھی کہ وہ اپنی بات کہاں سے شروع کرے۔ ایک دل چسپ بات یہ بھی تھی کہ لوگ ''آپ'' سے ''تم'' تک آتے ہیں۔ میرے معاملے میں وہ ''تم'' سے ''آپ'' تک آئی تھی۔ کیا ہم انسانوں کے یہ سبھی آداب و القابات صرف ہماری دنیاوی حیثیت اور رُتبے کا بدلہ ہوتے ہیں؟ کیا میں ''عبداللہ'' کی حیثیت میں ''آپ'' کہلائے جانے کا حق دار نہیں تھا۔ بہرحال میں نے اُس شیشے جیسی نازک لڑکی سے یہ سوالات کر کے اُسے مزید پریشان کرنا مناسب نہیں سمجھا۔ اِسی اثنا میں اندر سے مما اور بڑی مالکن بھی نکل آئیں۔ میں نے انہیں سلام کیا تو بڑی مالکن نے میرے سر پر ہاتھ رکھ کر دعا دے دی۔ ''جیتے رہو......'' پھر نہ جانے کیوں اُن کی آنکھیں بھر آئیں۔ ''خدا تمہیں تمہارے مقصد میں کامیاب کرے...... تمہاری امی نے بتایا ہے کہ تم کتنے اچھے بیٹے ہو......'' جس بات کا مجھے خدشہ تھا، وہی بار بار سامنے آرہی تھی۔ مجھے اب درگاہ کے مجاور کے طور پر نہیں بلکہ ملک کے ایک مشہور صنعت کار کے بیٹے کے طور پر برتا جا رہا تھا۔ جانے اس لمحے مجھے ایسا کیوں محسوس ہونے لگا تھا کہ میرے آنے والے دن اور درگاہ کی وہ سادہ سی زندگی بہت زیادہ تکلفات میں گھِرنے والی ہے۔ میں نے بڑی مشکل سے اپنی چائے ختم کی اور وہاں سے اُٹھنے کی ٹھانی تو بڑی مالکن، جو لاریب کے ساتھ ہی بیٹھیں، مما سے باتیں کر رہی تھیں، انہوں نے مجھے بیٹھے رہنے کا اشارہ کیا اور اندر سے ایک نیا سویٹر منگا کر میرے حوالے کیا۔

''انکار مت کرنا...... اس میں میری خوشی چھپی ہے......''

میں نے اُن کا شکریہ ادا کیا۔ مما شاید میری اندرونی جھجک کو جان گئیں تھیں۔ لہٰذا انہوں نے مجھے اندر کمرے میں جانے کی اجازت دے دی۔ اگلے دو دن میں نے حتیٰ الامکان کوشش کی کہ دوبارہ میرا سامنا بڑی مالکن، یا لاریب سے نہ ہونے پائے۔ شاید میں اُن دونوں کی

آنکھوں میں مچلتے سوالات کی یلغار سے بچنا چاہتا تھا۔ لیکن کچھ ایسے ہی سوالات کا سامنا مجھے خان صاحب کی نظروں سے بھی تھا۔ بہرحال وہ ایک وضع دار شخص تھے اور میری ہچکچاہٹ کی وجہ سے جان چکے تھے کہ میں اس موضوع سے کتراتا ہوں۔ لہٰذا انہوں نے دوبارہ مجھے کسی امتحان میں ڈالنے سے گریز ہی کیا۔ چوتھے دن پپا نے خان صاحب سے اجازت چاہی تو بات پھر گلوں شکوؤں سے ہوتی ہوئی مزید تین دن رُکنے تک چلی گئی اور یوں ساتویں دن بمشکل مما پپا کو خان صاحب اور بڑی مالکن سے واپسی کی اجازت ملی۔ وہ بھی اس شرط پر کہ اب وہ لوگ یہاں آتے جاتے رہیں گے۔ میں نے پہلے ہی مما پپا سے وعدہ لے لیا تھا کہ وہ لوگ وقت رُخصت اپنی آنکھیں نہیں بھگوئیں گے اور خوشی خوشی الوداع کہہ کر جائیں گے، لیکن یہ کم بخت الوداع ہمیشہ سے ہی خود میرا اپنا اندر کاٹ کر رکھ دیتا ہے۔ سو اس مرتبہ اگر مما اور پپا نے خود پر قابو پائے رکھا تو خود میری آنکھیں مما سے گلے ملتے ہی نم ہوگئیں۔ بس پھر کیا تھا مما تو پہلے ہی تیار بیٹھی تھیں، اور ماں کی آنکھ کا ساون تو سدا ہی جاری رہتا ہے، پھر چاہے وہ آنکھ کے سوتوں سے باہر کو برسے، یا پھر دل کے اندر کی زمین کو دھوتا رہے۔ مما کو سنبھالتے سنبھالتے پپا بھی نڈھال سے ہو گئے اور پھر بڑی مالکن، لاریب اور آخر میں خان صاحب بھی اپنی آنکھیں پونچھتے نظر آئے۔ ہم سب اس وقت حویلی کے بیرونی مہمان خانے والے حصے میں جمع تھے۔ جہاں پپا کا ڈرائیور پہلے ہی سے ہمارا انتظار کر رہا تھا۔ مما نے حسبِ معمول جُدا ہوتے وقت تب تک اپنی نصیحتوں کا سلسلہ جاری رکھا جب تک پپا نے مسکراتے ہوئے ڈرائیور کو گاڑی آگے بڑھانے کا اشارہ نہیں کر دیا۔ گاڑی چلنے کے دوران بھی مما کی سدا بہار ہدایات کا پروگرام جاری رہا اور میں تب تک ہاتھ ہلاتا رہا جب تک اُن کی گاڑی دُھول اُڑاتی ہوئی گاؤں کی واحد کچی سڑک پر اوجھل نہیں ہوگئی۔ میں نے پلٹ کر خان صاحب سے بھی اجازت چاہی۔ پچھلے چھ دن سے میں مما پپا کی وجہ سے اپنے فرائض پر مکمل دھیان نہیں دے پا رہا تھا اس لیے جلد از جلد درگاہ پہنچ کر اپنے معمولات کی طرف دھیان دینا چاہتا تھا۔ خان صاحب نے رات کے کھانے تک رُکنے کا کہا لیکن میں نے طریقے سے معذرت کر لی۔ بڑی مالکن اور لاریب بھی اُن کے پیچھے ہی کھڑی مجھے تک رہی تھیں۔ میری معذرت پر بڑی مالکن نے شرط لگا دی۔

’’ٹھیک ہے...... لیکن تمہیں اس شرط پر رخصت ملے گی کہ اب گاہے بگاہے یہاں آتے رہو گے...... یہ اب تمہارا بھی گھر ہے...... خبردار جو کبھی کوئی غیریت برتی......‘‘

میں نے مسکرا کر انہیں یقین دلایا کہ ’’میں یہاں آپ کی حویلی سے اپنے پن کی ایسی سوغات لے کر جا رہا ہوں جو اب غیریت کی ایسی کسی دیوار کو کبھی ہمارے رشتوں کے درمیان حائل نہیں ہونے دے گی۔‘‘ لاریب جو اُن کے ساتھ کھڑی غور سے مجھے دیکھ رہی تھی اُس کی آنکھوں میں شرارت کی اک چمک سی لہرائی اور وہ بے اختیار بول پڑی۔ ’’انسان کے پاس لفظوں کا اتنا خوب صورت ذخیرہ ہو تو اسے استعمال کرنے میں اتنی کنجوسی نہیں کرنی چاہیے۔‘‘ لاریب کی بات سن کر ہم سبھی ہنس پڑے اور میں نے ڈیوڑھی سے باہر قدم رکھتے وقت اُن دل رُبا چہروں کی طرف دیکھ کر ہاتھ ہلایا اور باہر کھڑے بشیرے کے تانگے کی جانب بڑھ گیا۔

جب میں درگاہ پہنچا تو مغرب کا وقت ہو ہی چلا تھا۔ اصغر صاحب کا کہیں اتا پتا نہیں تھا۔ میں پریشان ہو گیا کہ ابھی خدا خدا کر کے تو اُن کی ذرا طبیعت سنبھلی تھی پھر اچانک کہاں نکل گئے۔ میں اس شش و پنج میں مبتلا تھا کہ اچانک درگاہ کی بیرونی دیوار کی پرلی جانب کسی دو اشخاص کی سرگوشیوں کی آواز سنائی دی۔ میں چونکا کہ اس زوال کے وقت یہاں کون ہو سکتا ہے۔ میں نے دیوار کے اُوپر سے جھانکا اور اصغر صاحب کے ساتھ سرگوشیاں کرتے دوسرے شخص کو دیکھ کر میرے ذہن میں بیک وقت کئی جھماکے ہونے لگے۔ یہ وہی شخص تھا جو پلیٹ فارم پر مجھے دکھائی دینے کے بعد ایک دم غائب ہو گیا تھا۔

فاصلے ساتھ چلتے ہیں

وہ شخص پہلے مجھے ٹرین کی برتھ پر اور پھر پلیٹ فارم پر دکھائی دیا تھا۔ مجھے اُس کی وہ وح کو چیر دینے والی دو چھوٹی چھوٹی جگنوؤں کی طرح چمکتی ہوئی آنکھیں کیسے بھول سکتی تھیں ر پھر وہ اُس کا عجیب سا بے چین متحرک اور ہر لحہ کسی کرب جیسی کیفیت میں رہنے والا منحنی اور غر سا وجود...... لیکن وہ شخص اس وقت یہاں درگاہ کے باہر کیا کر رہا تھا؟ تو کیا وہ اصغر صاحب ے ملنے کے لیے جبل پور آ رہا تھا؟ لیکن اگر اُسے اصغر صاحب سے ملنا بھی تھا تو وہ درگاہ کے ہر یوں چوروں کی طرح کیوں اُن سے مل رہا تھا؟ کچھ ہی دیر میں اصغر صاحب بات ختم رکے جب واپس اندر آئے تب بھی میں وہیں درگاہ کے صحن میں بھی کھڑا تھا۔ وہ مجھے وہاں کھڑا دیکھ کر کچھ ٹھٹھک سے گئے۔ اُن کا ملاقاتی اندھیرے میں کہیں تحلیل ہو چکا تھا۔ وہ سر ھٹک کر آگے بڑھے ’’ارے عبداللہ میاں...... تم......؟ ...... تم کب واپس آئے۔ تمہارے امی با واپس چلے گئے کیا......؟‘‘ ’’جی وہ آج واپس لوٹ گئے ہیں...... لیکن آپ بستر سے کیوں اُٹھ آئے......؟ ...... اور یہ کون شخص تھا جس سے آپ وہاں اندھیرے میں کھڑے باتیں کر ہے تھے......؟‘‘

میرا سوال سن کر جانے مجھے کیوں لگا کہ جیسے وہ کچھ گھبرا سے گئے ہوں۔ ’’ہاں وہ...... کوئی نہیں بس یونہی کوئی سائل تھا...... کسی منت کی تفصیلات پوچھنے آیا تھا......‘‘ پھر جیسے وہ اچانک ہی چونک سے گئے۔ ’’تو کیا تمہیں وہ نظر آیا تھا......؟ میرا مطلب ہے کہ...... باہر تو بہت اندھیرا تھا۔‘‘ میں نے حیرت سے اُن کی جانب دیکھا کیوں کہ ابھی تو صرف شام کا جھٹپٹا ہی چھایا تھا اور ایسا اندھیرا ابھی نہیں تھا کہ چہرے بھی پہچانے نہ جا سکیں۔ ’’ہاں میں نے اُسے اس سے پہلے بھی دیکھا تھا...... جب میں جبل پور آ رہا تھا تب...... پہلے ٹرین میں اور پھر پلیٹ فارم پر...... لیکن پھر نہ جانے یہ شخص کہاں غائب ہو گیا تھا۔ اُس دن کے بعد آج دکھائی دیا ہے......‘‘ اصغر صاحب میری بات سن کر نہ جانے پریشان سے کیوں ہو گئے۔ ’’اوہ...... اس

کا مطلب ہے تم نے اُسے پہلے بھی دیکھا ہے......لیکن......؟ اچھا چلو خیر...... ہوگا کوئی......تم اپنی سناؤ...... ماں باپ سے مل کر اچھا تو لگا ہوگا......؟'' میں سمجھ گیا کہ وہ بات ٹالنا چاہتے ہیں۔ میں نے بھی اصرار نہیں کیا اور انہیں حویلی میں پیش آنے والے واقعات بتاتا رہا۔لیکن نہ جانے کیوں میرے ذہن میں اُن کے ملاقاتی کا چہرہ جیسے چپک کر ہی رہ گیا تھا۔ اصغر صاحب کی شخصیت روز بروز پُر اسرار سے پُر اسرار تر ہوتی جارہی تھی۔ وہ ساری رات میں نے کروٹیں بدلتے ہوئے گزاری۔ اس لیے صبح ہی سے میرا سر کچھ بھاری سا تھا۔ اگلے دن جمعرات تھی اور حسب معمول ہر جمعرات کی طرح زیارت پر صبح ہی سے زائرین کی چہل پہل شروع ہو چکی تھی۔کبھی کبھی میرے من میں یہ سوال بھی اُٹھتا تھا کہ جمعرات کے دن میں، یا شام میں ایسی کیا خاصیت ہے کہ ان درگاہوں پر خاص اِسی دن لوگوں کا تانتا بندھا رہتا ہے۔ مذہبی حوالے سے تو جمعہ کا دن اہم ہوتا ہے لیکن بعض جگہوں کے علاوہ جمعہ کے دن ان دُور دراز کی زیارتوں اور درگاہوں پر سناٹا ہی چھایا رہتا ہے۔تو کیا یہ روایت مذہب سے کچھ سوا تو نہیں......؟

شام تک تمام معمولات نبھاتے نبھاتے میں تھکن سے چور ہو چکا تھا اور پھر رات سے سر میں دھمکے کرتا وہ عجیب سا درد...... نتیجتاً مغرب کا وقت ہوتے ہوتے میرا جسم بخار میں پھنک رہا تھا۔ ایک عجیب سی بے چینی میرے رگ و رُوپ میں جیسے سرایت کرتی جارہی تھی۔ وہی ایک عجیب سا احساس...... جیسے کچھ ہونے والا ہو۔ مغرب سے ذرا پہلے بشیرا کرم دین کے ساتھ حویلی سے جمعرات کی شام کی مخصوص نیاز کی دیگیں لے کر اُوپر درگاہ پہنچا اور مختلف زائرین اور سائلوں کو کھانا کھلانے کے دوران اُس کا ہاتھ جب اتفاقاً میرے ہاتھ سے چھو گیا تو وہ اُچھل ہی پڑا۔''او جی یہ کیا...... آپ کو تو شدید تپ چڑھ رہا ہے عبداللہ باؤ...... اور آپ پھر بھی کام کر رہے ہیں۔'' اور پھر میرے لاکھ منع کرنے کے باوجود وہ زبردستی مجھے درگاہ کی بیرونی دیوار کے ساتھ بچھی دریوں کے قریب بٹھا کر جھٹ پٹ کرم دین کے ساتھ کھانا بانٹ کر نیچے گاؤں سے دوا لینے چلا گیا۔ میں نے اُسے سختی سے تاکید کی کہ اس بات کا حویلی والوں کو پتا نہیں چلنا چاہیے۔ اصغر صاحب حسب معمول پورا دن کہیں غائب رہے۔ میں نے محسوس کیا تھا کہ وہ جمعرات کے روز خاص طور پر کہیں ٹل جاتے ہیں اور درگاہ پر آیا ہوا نیاز کا کھانا، یا گوشت تو خاص طور پر چکھتے تک نہیں۔ اس روز بھی وہ آخری سائل کے جانے کے بعد ہی درگاہ واپس

لوٹے۔ لیکن میری حالت دیکھ کر وہ بھی پریشان ہو گئے اور فوراً ہی انہوں نے ٹھنڈے پانی میں بھیگی پٹیاں بنا کر میرے ماتھے پر رکھنا شروع کر دیں۔ کچھ دیر میں میں خاصا بہتر محسوس کرنے لگا۔ وہ ساتھ ساتھ مجھ سے باتیں بھی کرتے رہے۔''میں آج نیچے بازار گیا تو تمہارے گھر والوں کے بارے میں پتا چلا۔ بھئی تمہارے والد تو بہت بڑے صنعت کار ہیں۔ سچ پوچھو تو میں اب تک شدید حیرت کے جھٹکے میں ہوں کہ اتنے بڑے گھرانے کا لڑکا اور وہ بھی اس عمر میں اس راہ پر چل نکلا ہے......اور وہ بھی یوں بے سروسامان...... یہ کیسا جنون ہے......؟ یہ کیسی تلاش ہے......؟ میں اب تک سمجھ نہیں پایا......؟''

مجھ سے رہا نہیں گیا اور میں بول پڑا''آپ بھی تو کسی ایسے ہی جنوں کے اثر میں یہاں تک پہنچے ہیں...... ہو سکتا ہے ہماری کہانی مختلف ہو لیکن ہمارے حالات مختلف نہیں ہو سکتے......'' انہوں نے جلدی سے مجھے ٹوکا''خدا نہ کرے عبداللہ میاں...... کہ ہمارے حالات کبھی ایک جیسے ہوں۔ خدا تمہیں ایسی ہر آزمائش سے بچائے جس سے گزر کر میں یہاں تک پہنچا ہوں...... انگاروں بھری وہ راہ خدا کسی دشمن کے حصے میں بھی نہ بچھائے......'' میں نے چونک کر اُن کی جانب دیکھا لیکن اُن کو ٹوکنا مناسب نہیں سمجھا۔ وہ اپنی رو میں بولے جارہے تھے۔''میں اُسی دن سمجھ گیا تھا کہ تمہارا واسطہ ضرور خدا کے کچھ خاص بندوں کے ساتھ رہا ہے جس دن تم نے اس درگاہ میں قدم رکھا تھا اور پھر کل جب تمہیں مجھ سے باتیں کرتا وہ شخص بھی دکھائی دے گیا تو میرا یقین اور بھی پختہ ہو گیا۔ واقعی تم باقیوں سے مختلف ہو، کچھ خاص ہو......''

''آپ نے کل بھی اُس شخص کا ذکر کچھ عجیب سے الفاظ میں کیا تھا۔ ایسی کون سی بات ہے......؟ آخر کیا بھید ہے اُس شخص کی پہچان میں...... آپ بتا کیوں نہیں دیتے......؟''

اصغر صاحب نے ایک لمبا سا سانس لیا۔''سوچتا ہوں بتا ہی دوں۔ حالانکہ مجھے یقین ہے کہ میری کہانی سن کر تمہارے پاس میرے لیے سوائے نفرت اور حقارت کے اور کچھ نہیں بچے گا۔ لیکن شاید یہی نفرت، یہی بربادی اور یہی حقارت میرا مقدر ہے، سدا کے لیے...... اپنا ایمان بیچنے والا شخص کسی ایسے ہی، یا شاید اس سے بھی بدتر سلوک کا حق دار ہوتا ہے......''میں چپ رہا، کیوں کہ میں جانتا تھا کہ آخر کار وہ گرہ کھلنے ہی والی ہے جس نے اصغر صاحب کی شخصیت کو اتنا پُر اسرار بنا رکھا ہے۔ ہم دونوں درگاہ کے صحن میں نکل آئے جہاں سردی سے

بچنے کے لیے زائرین نے جنگل کی لکڑیوں کو جلا کر شام سے ایک بڑا سا الاؤ روشن کر رکھا تھا۔ اب صحن بالکل خالی ہو چکا تھا لیکن اصغر صاحب نے ایک شاخ کی مدد سے لکڑیوں کی راکھ کو کریدا اور چند مزید تختے اس انگاروں بھری راکھ میں پھینکے تو پھر سے آگ بھڑک اُٹھی اور ہم دونوں بھی اِسی الاؤ کے گرد بیٹھ گئے۔ اصغر صاحب نے اپنی یادوں کی راکھ کو بھی اپنی سوچ کی کسی لمبی چھڑی سے کریدا اور پھر دھیرے دھیرے اُن کے ماضی کی سلگتی آگ بھی اُن کی سوچ کی لکڑیوں کو چٹخانے لگی۔

"میری کہانی آج سے ٹھیک ایک سال پہلے، دسمبر کے اِسی مہینے سے شروع ہوتی ہے۔ اس سے پہلے میری زندگی میں کوئی فسانہ، کوئی کہانی نہیں تھی۔ میں ایک عام سینئر کلرک کی بوسیدہ اور پھٹیچر سی زندگی گزار رہا تھا۔ ایک بہت بڑے شہر کے ایک چھوٹے سے دو کمروں کے فلیٹ میں اپنی لڑاکا بیوی اور چار بدتمیز بچوں کے ساتھ رہائش پذیر تھا۔ میرے دو بیٹے اور دو بیٹیاں ہیں اور تم خود اندازہ کر سکتے ہو کہ بڑے شہروں کے ان ڈربہ نما فلیٹوں میں ہم چھ بندے کس طرح گزارہ کرتے ہوں گے۔ میرے دونوں بیٹے ماں کے لاڈ پیار کی وجہ سے کسی کام کے نہیں رہے تھے۔ بڑا کئی سال کی مسلسل کوشش کے بعد گریجوایشن تو پاس کر چکا تھا مگر کم نمبروں کی وجہ سے شہر بھر میں جوتے چٹخاتا پھرتا تھا اور چھوٹے نے تو بی اے میں ایک مرتبہ فیل ہونے کے بعد کتابوں سے ناتا ہی توڑ لیا تھا۔ دونوں بیٹیاں بھی دن بھر سوائے فیشن میگزین پڑھنے، یا کیبل پر فلمیں دیکھنے کے علاوہ اور کچھ خاص نہیں کرتی تھیں۔ بڑی بیٹی نے البتہ یونیورسٹی کے بعد کسی پرائیویٹ اسکول میں نوکری کر لی تھی جب کہ چھوٹی بارھویں کا امتحان پاس کرتے ہی کسی شہزادے کے انتظار میں دن بھر میک اپ کورسز پر اپنا دھیان لگائے رکھتی تھی۔ دراصل بچے ہمیشہ ماں میں اپنا آئیڈیل ڈھونڈنے کی کوشش کرتے ہیں اور ماں کو ہی فالو (Follow) کرتے ہیں اور میرے بچوں نے ہمیشہ اپنی ماں کو اپنے باپ کے ساتھ لڑتے جھگڑتے، طعنے دیتے اور گلے شکوے کرتے ہی دیکھا تھا۔ لہٰذا قدرتی طور پر اُن کے دل سے میری عزت جاتی رہی تھی۔ اور رفتہ رفتہ وہ دکھاوے کے لحاظ اور شرم و حیا سے بھی رہ چکے تھے اور اب ترکی بہ ترکی مجھے جواب دینے لگے تھے۔ شاید اس میں میری بیوی کا بھی اتنا قصور نہیں تھا۔ میں زندگی میں کبھی کوئی بھی آسائش انہیں مہیا نہیں کر پایا تھا۔ ایک سینئر کلرک کی تنخواہ ہوتی

ہی کتنی ہے اور پھر اُوپر سے مہنگائی کا یہ طوفان...... تنخواہ سے زیادہ تو بجلی اور گیس کے بل ہر ماہ منہ پر مونگ دلنے کے لیے آ پہنچتے تھے۔ ایسے میں ننگا نہائے کیا اور نچوڑے کیا؟ میں کبھی ضرورت کے مطابق بھی پیسے گھر نہیں لا پایا تھا تو پھر تفریح، پکنک، یا سینما کی تو بات کرنا ہی فضول تھا۔ میرے بچے اور بیوی ساری عمر پیٹ بھر کھانے کو ہی ترستے رہے۔ بیٹی نے نوکری کی تو بیوی کا ہاتھ کچھ کھلا لیکن یہ بھی میرے لیے مزید ایک طعنے کا سبب بن گیا کہ "ہاں بھئی...... اب تو بیٹی کی کمائی کا ہی آسرا ہے......" اپنی ساری نوکری میں مجھے کلرکی کے لیے شعبے بھی کچھ ایسے ہی دیئے جاتے رہے جہاں رشوت لینے کے مواقع بھی کبھی مجھے میسر نہیں رہے۔ سچ تو یہ ہے کہ مجھے ٹھیک طرح سے رشوت لینا بھی نہیں آتی تھی۔ ایک آدھ مرتبہ کسی سے کہلوا کر کسی کمائی والے سیکشن میں تبادلہ کروا بھی لیا تھا لیکن کسی نے ٹھیک ہی کہا ہے کہ رشوت لینا بھی ایک فن ہے اور میں اس فن سے قطعی نابلد تھا۔ میرے تو ہاتھ پاؤں ہی پھولنے لگتے تھے اور ذرا سی رقم پکڑتے وقت بھی پورا جسم لرزنا شروع کر دیتا تھا۔ لوگ نہ جانے کیسے اتنی بڑی بڑی رقموں کو بنا ڈکار لیے جیب میں ڈال کر ہضم بھی کر لیتے تھے۔ شاید میں شروع سے ہی بزدل تھا اور رشوت لینا، یا دینا مجھ جیسے بزدلوں کے بس کی بات نہیں تھی۔ اس لیے دو چار دنوں میں ہی اس کمائی والے محکمے کے راشی افسر میرے آگے ہاتھ پاؤں جوڑنا شروع کر دیتے تھے کہ "بس بہت ہو گیا میاں۔ اب یہاں سے چلتے بنو۔" دراصل میری وجہ سے اُوپر والوں کا لین دین بھی بگڑتا تھا کیوں کہ بہت سی جگہوں پر مجھ جیسے کلرک ہی ایسے کالے دھندوں کا پہلا دروازہ ہوتے ہیں۔ یوں میرے دن قرضوں کے بوجھ تلے دبے ہی گزر رہے تھے۔

میری صبح کا آغاز میرے سرہانے رکھے الارم کلاک کی چیخ سے ہوتا تھا جسے میری بیوی بدمزگی سے بند کروا کر دوسری کروٹ دوبارہ یہ بڑبڑاتے ہوئے سو جاتی کہ "نہ خود سوتے ہیں نہ دوسروں کو سونے دیتے ہیں۔" میں کچی اور بے آرام نیند سے تھکا ہارا جاگتا تو پورے گھر میں کوئی مجھے ایک پیالی چائے کا پوچھنے والا بھی نہ ہوتا۔ بیوی کو تو ویسے ہی اپنے آرام میں خلل منظور نہیں تھا۔ بڑی بیٹی کو اپنی نوکری پر جانے کی جلدی ہوتی، چھوٹی بیٹی کبھی خوش قسمتی سے جاگتی ہوئی مل بھی جاتی تو وہ خود اس انتظار میں ہوتی کہ کوئی باورچی خانے میں جائے تو اُس کے لیے بھی ایک کپ چائے بنا دے اور بیٹے تو ویسے ہی دن چڑھے جاگنے کے عادی تھے۔ مجھے

ہر صبح ساڑھے چھ بجے والی ٹرام پکڑنی ہوتی تھی کیونکہ اِسی صورت میں میں دو بسیں بدل
ساڑھے آٹھ بجے دفتر پہنچ سکتا تھا۔ یہ تو شکر ہے کہ سرکاری دفتروں میں کلرک بادشاہ ہو
ہیں اور انہیں ایک آدھ گھنٹہ لیٹ پہنچنے پر کوئی کچھ کہتا نہیں ورنہ دفتر کا اصل وقت تو صبح آ
بجے ہی تھا۔ دن بھر دفتر میں جھک مارنے کے بعد اور مانگے کی چائے پینے کے بعد شام
بجے جب میں وہاں سے فارغ ہوتا تو مجھے ایک اور پرائیویٹ دفتر میں چار سے سات
عارضی نوکری بھی بھگتانی ہوتی تھی جو میں نے اپنے قرضے اُتارنے کے لیے کر رکھی تھی۔
ڈسپیچ کا کام ہوتا تھا، یا پھر چند دفتری خط ٹائپ کرنا ہوتے تھے لیکن اس پرائیویٹ دفتر کا با
عظیم ایک نمبر کا ''کھڑوس'' شخص تھا۔ مجال ہے جو پل بھر کی دیر بھی برداشت کر جائے اور شوم
قسمت میں ہمیشہ دس پندرہ منٹ لیٹ ہو ہی جاتا تھا کیوں کہ اپنے سرکاری دفتر سے نکل کر
مجھے پیدل ہی دو بلاک چل کر اُس نجی آفس تک آنا ہوتا تھا اور یوں دیر سے آنے پر روز ہی عظیم
مجھے اپنی خوب صورت لیڈی سیکرٹری شبانہ کے سامنے جی بھر کر بے عزت کرتا تھا۔ مجھے اس بے
عزتی کی بھی خاص پرواہ نہیں تھی کیوں کہ یہ نوکری میری انتہائی مجبوری تھی لیکن اس بے عزتی
کے دوران مجھے شبانہ کی موجودگی بے حد کھلتی تھی۔ کیوں کہ وہ میری بے عزتی کے دوران مستقل
اپنا نچلا ہونٹ اپنے دانتوں تلے دابے ایک طنزیہ ہنسی ہنستی رہتی تھی اور مجھے یوں لگتا تھا کہ کوئی
مجھے سربازار ننگا کر رہا ہو۔ جانے عظیم کو اس طرح ایک عورت کے سامنے مجھے بے عزت کر کے
کیا ملتا تھا۔ شاید اس تحریک کے پیچھے بھی عظیم کا کوئی انتقام ہی چھپا ہوا تھا کیوں کہ میں نے
ایک دن غلطی سے کسی خط کی تصحیح کے لیے بنا دستک دیئے عظیم کے دفتر کا دروازہ کھول لیا تھا اور
ٹھیک اُسی وقت عظیم اپنی سیکرٹری کو اپنے بہت ہی قریب بٹھائے کوئی ڈکٹیشن (Dictation)
دے رہا تھا۔ دروازہ کھلنے پر شبانہ تو بوکھلا کر باس کی گود سے اُتر گئی لیکن عظیم کا چڑھا ہوا پارہ پھر
کبھی نہیں اُترا۔ اُس دن اُس نے مجھے جی بھر کے ذلیل کیا کہ دراصل میں اُس کی جاسوسی کرتا
پھرتا ہوں اور مجھے اتنے بڑے دفتر میں کام کرنے کے آداب بھی نہیں آتے اور یہ کہ اگر میں
نے باہر جا کر دفتر کے دوسرے لوگوں کے سامنے اس واقعے کا ذکر کرنے کی کوشش بھی کی تو وہ
مجھے دھکے مار کر یہاں سے باہر نکال دے گا۔ ویسے اُسے اس وقت بھی ایسا کرنے سے کوئی
نہیں روک سکتا تھا لیکن فی الحال اُس نے شاید یہ سوچ کر اپنے دل پر پتھر رکھ لیا تھا کہ میں یوں

فوراً دفتر سے بے دخل کر دیئے جانے پر اُس کے خلاف انتقامی کارروائی کے طور پر اس واقعے
کی دفتر میں اور باہر تشہیر ضرور کروں گا۔ حالانکہ سچ تو یہ ہے کہ میرے اندر اتنی سکت بھی نہیں
تھی۔ بہر حال اُس دن کے بعد سے عظیم کا غصہ کبھی کم نہیں ہوا اور مجھے روزانہ کسی نہ کسی بہانے
سے شبانہ کے سامنے بے عزت ضرور کیا جاتا رہا۔ میں جتنی بھی دیر سے اپنے دوسرے دفتر
پہنچتا، اتنے ہی وقت کے لیے مجھے دفتر کے اوقات کے بعد اور ٹائم لگا کر اپنا کام ختم کرنا پڑتا
تھا، کیوں کہ عظیم آج کا کام کل پر چھوڑنے کا بالکل قائل نہیں تھا۔ لہٰذا مجھ سے عام طور پر شام
ساڑھے سات بجے والی آخری بس بھی چھوٹ جاتی تھی جس کے بعد پیدل مارچ کر کے رات
گئے گھر پہنچنا میری مجبوری بن جاتی تھی اور رات دیر سے گھر پہنچنے کے بعد پھر سے وہی بیوی
کے طعنے اور بچوں کی کڑوی کسیلی باتیں کہ ''دن بھر گھر سے غائب رہتے ہو...... بیوی بچوں کا
بھی کچھ خیال ہے، یا نہیں...... یا بس تمہارا فرض جنم دینے کی حد تک ہی تھا۔ اب پڑے سڑتے
رہیں...... جانے کہاں دن بھر آوارہ گردی کرتے رہتے ہیں۔ بھئی ہم نے تو ایسا دفتر کبھی دیکھا
نہ سنا......'' کبھی کبھی تو میرا دل چاہتا تھا کہ کہیں سے زہر کی چار پڑیاں لا کر گھر والوں کے
کھانے میں ملا دوں تاکہ یہ روز روز کا جھگڑا ہی نمٹ جائے لیکن یہاں بھی میری وہی ازلی
بزدلی آڑے آ جاتی تھی اور میں چپ چاپ کان لپیٹ کر کسی کونے میں پڑ کر سو رہتا۔ ایک
اگلے اور نئے دن کے کانٹوں بھرے آغاز اور دوبارہ اِسی ذلت بھری زندگی کی گاڑی کھینچنے کے
لیے......''

اصغر صاحب بولتے بولتے چند لمحوں کے لیے خاموش ہوئے تو مجھے پتا چلا کہ میں اُن کی
کہانی میں اس قدر کھو سا گیا تھا کہ مجھے رات کے ڈھلنے کا احساس بھی نہیں ہوا۔ ابھی میں نے
عشاء کی نماز بھی ادا کرنی تھی اور اپنے اور اصغر صاحب کے لیے کچھ کھانے پینے کا انتظام بھی
کرنا تھا۔ وہ تو اچھا ہوا کہ شام کو کرم دین کی لائی ہوئی دیگوں میں سے کچھ بچ گیا تھا لہٰذا میں
نے جلدی سے وہی چاول گرم کر کے اصغر صاحب کے سامنے رکھے اور خود عشاء کی نماز ادا
کرنے کے لیے اپنے کمرے کی جانب بڑھ گیا۔

نماز پڑھ کر میں باہر نکلا تو اصغر صاحب ایک مرتبہ پھر سے لکڑیوں کے الاؤ کو دھکا چکے
تھے۔ اُن کے چہرے پر آگ کی لپٹوں سے پڑتی روشنی میں میں صاف دیکھ سکتا تھا کہ وہ اپنی

کہانی دہراتے وقت کس اذیت سے گزر رہے ہیں۔ میں چپ چاپ دوبارہ اُن کے سامنے جا کر بیٹھ گیا۔ انہوں نے بات وہیں سے جوڑی۔

''ہاں تو عبداللہ میاں...... میں تمہیں بتا رہا تھا کہ میں اس ذلت بھری زندگی کا عادی ہو چکا تھا اور اپنے دن کسی کولھو کے بیل کی طرح کاٹ رہا تھا۔ پھر ایک دن ایک اور غضب ہوا کہ میں نے بس پر چڑھتے ہوئے گھر واپسی کے وقت اپنی بڑی بیٹی لبنیٰ کو کسی پکی عمر کے مرد کے ساتھ گاڑی میں بیٹھے دیکھ لیا اور گھر آ کر میں نے باز پرس کی تو بس میرا بات کرنا ہی غضب ہو گیا۔ سارے گھر والے مجھ پر یوں برس پڑے جیسے خود مجھ سے کوئی گناہ عظیم سرزد ہو گیا ہو۔ پتا یہ چلا کہ وہ صاحب اُسی اسکول کے مالک ہیں جہاں لبنیٰ نوکری کرتی تھی اور اُن کا تو اب یہ معمول ہی بن چکا تھا کہ وہ چھٹی کے بعد واپسی پر لبنیٰ کو گھر ڈراپ کرنے آتے تھے۔ اُلٹا بیوی نے مجھے طعنہ دے دیا کہ تم کبھی سرِشام گھر واپس لوٹو تو تمہیں کچھ پتا بھی ہو......؟ بیٹوں نے سیدھی سادی دھمکی دے دی کہ وہ اپنی بہن کی زندگی کا فیصلہ خود کریں گے۔ لہٰذا مجھے اس میں دخل اندازی کی ضرورت نہیں۔ دراصل وہ شخص پورے گھرانے کو تحفے تحائف اور اپنے پیسے کے جال میں کچھ یوں پھانس چکا تھا کہ اب میرے گھر کا کوئی فرد بھی اُس کے خلاف ایک لفظ بھی سننے کو تیار نہیں تھا۔ مجبوراً ایک بار پھر مجھے ہی چپ سادھنا پڑی۔ لیکن اُس دن سے میرے وجود کے اندر خود اپنے لیے ہی ایک عجیب سی نفرت پلنا شروع ہو گئی کہ آخر میں کس مرض کی دوا ہوں......؟ میرا اس دنیا میں آنے کا مقصد کیا ہے......؟ کیا میں یونہی عمر بھر خود اپنوں اور غیروں کے ہاتھوں ذلیل ہوتا رہوں گا۔ اُس دن زندگی میں پہلی مرتبہ میں نے خودکشی کے بارے میں سوچنا شروع کر دیا کیوں کہ مجھ جیسے ناکارہ انسان اور نالی کے کیڑے جیسی زندگی گزارنے والے شخص کو مر ہی جانا چاہیے تھا۔ لیکن کیسے......؟ خودکشی بھی تو ہمت مانگتی ہے نا......لیکن میں نے یہ طے کر لیا تھا کہ اب اپنی اس بوسیدہ اور ذلت بھری زندگی کا خاتمہ کر کے ہی رہوں گا۔ کب اور کیسے......؟ بس یہ طے کرنا باقی رہ گیا تھا۔

کہاں قاتل بدلتے ہیں، فقط چہرے بدلتے ہیں
عجب اپنا سفر ہے، فاصلے بھی ساتھ چلتے ہیں

چھلاوہ

اصغر صاحب نے پانی کا ایک لمبا سا گھونٹ بھرا اور اپنی داستان جاری رکھی۔ رات خوب بھیگ چکی تھی اور سرد اور خنک ہوا ہمارے جسموں کو چیر کر گزر رہی تھی لیکن ہم دونوں ابھی تک اُسی الاؤ کے سامنے بیٹھے ہوئے تھے۔

''تو عبداللہ میاں...... میں نے وہ رات کس طرح کانٹوں پر گزاری یہ میں ہی جانتا ہوں۔ اگلی صبح پھر وہی بیوی کی چخ چخ۔ پہلے سرکاری دفتر دیر سے پہنچا اور پھر حسبِ معمول وہاں افسروں کی ڈانٹ سنتے ہوئے اور اپنا کام لیٹ ختم کر کے دوسرے دفتر بھاگم بھاگ پہنچا تو پورے پندرہ منٹ لیٹ تھا۔ دفتر میں میرے واحد دوست جاوید نے مجھے دفتر میں گھستے ہی بتا دیا تھا کہ باس عظیم تین مرتبہ میرا پوچھ چکا ہے۔ میں دل میں ہزار خدشے لیے اُس کے کمرے میں پہنچا تو حسبِ توقع شبانہ وہیں موجود تھی اور عظیم کے ساتھ خوش گپیوں میں مصروف تھی۔ مجھے دیکھتے ہی عظیم نے طنز کیا۔

''آ گئے نواب صاحب...... اس وقت آنے کی زحمت بھی کیوں کی جناب نے...... آپ حکم تو کرتے...... ہم فائلز آپ کے گھر ہی بھجوا دیتے......''

میں ہکلایا...... وہ سر...... میں وہ...... دراصل۔''

عظیم دھاڑا ''کیا میں میں کی رٹ لگا رکھی ہے...... یہ وقت ہے دفتر آنے کا...... آخر تم کب سدھرو گے...... تنخواہ لینے والوں کی قطار میں تم سب سے آگے کھڑے ہوتے ہو...... اور کام کے لیے آتے ہوئے موت آتی ہے تم کو......''

شاید اُس دن عظیم نے میری بے عزتی کرنے کی ہر حد کو پار کرنے کا سوچ رکھا تھا۔ شبانہ اُسی طرح لگاتار مجھے مسکراتے ہوئے دیکھ رہی تھی اور میرے تن من میں جیسے آگ سی بھرتی جا رہی تھی۔ اُس دن مجھے پتا چلا کہ قاتلوں سے قتل کس لمحے میں سرزد ہوتے ہوں گے۔ اُس وقت میرے جسم میں اتنی جان ہوتی، یا میرے پاس کوئی چاقو، یا پسٹل ہوتا تو میں ضرور

اُن دونوں کا وہیں خون کر دیتا۔ مجھے عظیم نے یہ حکم نامہ بھی صادر کیا کہ میں آج پچھلے پورے ہفتے کی فائلز اور خط نکال کر ہی گھر واپس جاؤں گا ورنہ اگلے دن مجھے دفتر آنے کی ضرورت نہیں اور ان پندرہ دنوں کی تنخواہ میرے گھر پہنچا دی جائے گی۔ میں بکتا جھکتا اس جلاد کے کمرے سے نکلا اور اپنی میز پر جا کر فائلوں کے انبار میں کھو گیا۔ جب تک میں نے کام ختم کیا، شام کے سوا سات بج چکے تھے۔ دسمبر کی شامیں ویسے بھی گہری راتوں میں بدلنے میں زیادہ دیر نہیں لگاتیں۔ میں دفتر سے نکل کر نیچے بس اسٹاپ پر پہنچا تو حسب توقع آخری بس بھی نکل چکی تھی۔ میں نے جیب میں ہاتھ ڈالا تو صرف ۲۵ روپے اور پانچ روپے کا ایک سکہ نکلا، مطلب رکشے، یا ٹیکسی کی عیاشی تو ناممکن تھی۔ لہٰذا میں نے عظیم کو دل ہی دل میں گندی گالیاں نکالتے ہوئے پیدل ہی گھر جانے کی ٹھانی۔ پیدل مختصر راستے اختیار کرنے کے باوجود میرے گھر کا فاصلہ دفتر سے دو گھنٹے کا تھا۔ میں تنگ اندھیری گلیوں اور ویران سڑکوں سے ہوتا ہوا گھر کی جانب روانہ تھا۔ میرے شہر کے حالات بھی کچھ ایسے تھے کہ ایسے راستوں پر دن میں بھی چلتے ہوئے لوگ خوف محسوس کرتے تھے۔ یہ تو پھر رات تھی۔ لہٰذا ذرا سی آہٹ پر میرے رونگٹے کھڑے ہو جاتے تھے۔ راستے میں ایک ویران سا پارک بھی پڑتا تھا جسے میں نے پہلے اپنی راہ گزر کے لیے منتخب نہ کرنے کا سوچا کیوں کہ اس پارک کے متعلق عجیب وغریب قسم کی باتیں مشہور تھیں لیکن پھر جب میں نے اس لمبے راستے کا سوچا جو پارک کے اندر سے نہ گزرنے کی صورت میں مجھے طے کرنا پڑتا تو خود بخود میرے تھکے ہوئے قدم اس پارک کی ٹوٹی ہوئی دیوار کی جانب بڑھ گئے جسے راہ گیروں نے اپنی سہولت کے لیے پارک کراس کرنے کے لیے توڑ رکھا تھا۔ پارک اُس وقت بالکل سنسان پڑا ہوا تھا۔ گھاس کے خشک میدان کے بیچوں بیچ ایک بوڑھا برگد کا پیڑ اپنی ہزاروں جڑیں زمین میں گاڑھے اور میدان کے اُوپر پَر پھیلائے یوں کھڑا تھا جیسے کوئی بزرگ اپنی ساری آل اولاد کو اپنے دامن میں سمیٹے کھڑا ہو۔ پیڑ کے نیچے ایک ٹوٹا ہوا پتھر کا بنچ پڑا ہوا تھا۔ جانے کیوں ایک دم ہی مجھے شدید تھکن کا احساس ہوا اور میں نے کچھ پل اُسی بنچ پر بیٹھ کر ستانے کا فیصلہ کر لیا۔ میں نے بنچ پر بیٹھ کر چند گہری سانسیں لیں تو کچھ سکون کا احساس ہوا۔ میں نے سر پیچھے ٹکا کر چند لمحوں کے لیے اپنی جلتی آنکھیں مونده لیں لیکن آنکھیں بند کرتے ہی ایک لمحے کے ہزارویں حصے میں مجھے یوں محسوس ہوا جیسے اس

برگد کے پیڑ کے اُوپر کوئی بیٹھا ہوا مجھے اپنی دو سرخ انگارہ آنکھوں سے گھور رہا ہو۔ میں نے گھبرا کر جلدی سے آنکھیں کھول دیں لیکن پیڑ کی شاخیں ویسے ہی سنسان پڑی تھیں۔ میں نے سر جھٹک کر دوبارہ آنکھیں موندھیں تو پھر وہی احساس چھم سے میری بند آنکھوں کے پردے پر اتر آیا، لیکن اس بار آنکھیں کھولنے سے پہلے ایک آواز بھی میرے ذہن کے پردے سے ٹکرائی۔ ''کیسے ہو اصغر......؟'' میری تو مانو جیسے جان ہی نکل گئی اور میں نے دوبارہ جلدی سے آنکھیں کھول دیں لیکن پیڑ اب بھی ویسے ہی تنہا کھڑا تھا۔ میرے مساموں سے اتنی سردی کے باوجود خوف کے مارے پسینہ نکل آیا اور میں نے وہاں سے بھاگ اُٹھنے کی ٹھان لی۔ لیکن ابھی میں نے اپنا بوجھ اپنے دوشل بازوؤں پر ڈالا ہی تھا اور میرا جسم ابھی پوری طرح اُٹھنے بھی نہیں پایا تھا کہ پھر سے وہی سرگوشی میرے کانوں سے ٹکرائی۔ ''ڈرو نہیں اصغر...... میں تمہیں کوئی نقصان نہیں پہنچاؤں گا۔ مجھے اپنا دوست ہی سمجھو......''

میں نے خوف کے مارے اِدھر اُدھر دیکھا ''لیکن تم ہو کون......اور مجھے کھلی آنکھوں سے نظر کیوں نہیں آ رہے......''

میرے کانوں میں پھر سے آواز گونجی ''میں بند آنکھوں سے بھی صرف اُنہی کو نظر آتا ہوں جنہیں میں آنا چاہتا ہوں......اگر تم زیادہ خوف زدہ نہیں ہو تو میں تمہیں کھلی آنکھوں سے نظر آ سکتا ہوں۔ تمہیں بس اپنے حواس قابو میں رکھنے ہوں گے......''

ایک بار تو میرے جی میں آیا کہ میں وہاں سے سرپٹ دوڑ لگا دوں لیکن پھر نہ جانے میرے اندر اتنی ہمت کہاں سے آ گئی اور میں نے ہکلاتے ہوئے اُسے اجازت دے دی۔

''ٹھیک...... ہے......لیکن مجھے زیادہ ڈرانا نہیں۔ میں دل کا کمزور واقع ہوا ہوں۔'' میں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر درخت کی شاخوں کو دیکھنے لگا کیوں کہ میرے خیال میں اُسے وہیں کہیں سے کودنا چاہیے تھا لیکن میں اپنے پیچھے سے اُس کی آواز سن کر بنچ سے گرتے گرتے بچا۔

''اب تم مجھے دیکھ سکتے ہو......''

میں نے ڈرتے ڈرتے لرزتے دل کے ساتھ پیچھے نظر ڈالی تو کچھ دیر کے لیے میرے اُوپر کا سانس اُوپر ہی رہ گیا۔ ایک نہایت کالا بھجنگ شخص جس کی آنکھیں دو دہکتے انگاروں کی چمک رہی تھیں اور جس کی جلد کا رنگ ایسا تھا جس کی رات کی سیاہی میں جانچ، یا دیکھ پانا

تقریباً ناممکن ہی تھا۔ میں نے فوراً خوف کے مارے اپنی آنکھیں بند کر لیں۔ اچانک کسی کی کرخت آواز فضا میں گونجی "او بابا...... تم اس اندھیرے میں کیا کرتا ہے......؟ میری تو چیخ نکلتے نکلتے رہ گئی۔ میں نے ڈر کر جھٹ سے آنکھیں کھولیں تو سامنے پارک کا پٹھان چوکیدار حیران سا کھڑا مجھے گھور رہا تھا۔ میں نے فوراً پلٹ کر اُس کی جانب دیکھا جہاں ایک لمحہ پہلے وہ شخص کھڑا تھا لیکن اب وہاں کوئی نہیں تھا۔ میں نے حیرت سے اپنی آنکھیں پھاڑ کر اندھیرے میں ٹٹولا لیکن وہ شخص غائب ہو چکا تھا۔ چوکیدار ابھی تک میرے سر پر کھڑا شاید مجھے کوئی مخبوط الحواس سمجھ رہا تھا۔ وہ پھر ڈانٹنے کے انداز میں بولا۔ "او بھائی تم کون ہے...... ایسے رات کو درختوں کے نیچے نہیں بیٹھنا چاہیے...... خو یہ اچھا نہیں ہوتا مڑاں......" اب میں اُس کو کیا بتاتا کہ میری آدھی رُوح تو پہلے ہی نکل چکی ہے۔ میں نے ڈرتے ڈرتے اُس سے پوچھا "کیا تم نے ابھی یہاں کسی اور شخص کو نہیں دیکھا...... وہ یہاں میرے قریب ہی کھڑا تھا۔" چوکیدار نے حیرت سے اِدھر اُدھر نظریں دوڑائیں۔ "کون...... اِدھر تو کوئی نہیں تھا۔ خو چہ ہم اِسی لیے بولتا ہے کہ ایسے رات کے وقت اِدھر اکیلا مت بیٹھو...... تم اِدھر اکیلا بیٹھا تھا اور جب ہم اِدھر آیا تو تم اپنے آپ کے ساتھ بولتا پڑا تھا......" گویا میں خود کلامی میں مشغول تھا۔ یہ مجھے کیا ہوتا جا رہا تھا۔ میں نے اپنا سر جھٹکا۔ شاید کام کے دباؤ نے میرے دل و دماغ پر بھی گہرا اثر چھوڑا تھا اور اب میں جاگتی آنکھوں سے بھی خواب دیکھنے لگا تھا۔ میں یہی سوچتا ہوا وہاں سے اُٹھا اور کسی طرح گرتے پڑتے رات گئے گھر تک پہنچ گیا۔ شکر ہے کہ سب لوگ سو چکے تھے۔ میں اس وقت اُن کے ساتھ کسی بحث میں نہیں پڑنا چاہتا تھا۔ میرے دماغ میں دھماکے ہو رہے تھے اور سر درد سے پھٹا جا رہا تھا۔ میں چپ چاپ جا کر اپنے بستر پر لیٹ گیا اور آج کے تمام واقعات پھر سے میرے ذہن میں چلنے لگے۔ کیا واقعی وہ سب صرف میرا واہمہ تھا، یا......؟...... انہی سوچوں میں جانے کب مجھے نیند نے آگھیرا لیکن ابھی شاید میری آنکھ لگے ہوئے چند لمحے ہی ہوئے تھے کہ اچانک مجھے محسوس ہوا کہ پھر سے وہی دو انگارہ آنکھیں مجھے گھور رہی ہیں، خود میرے ہی کمرے میں موجود دیوار میں لگی الماری جو چھت سے ذرا پہلے اپنی لمبائی ختم کرتی تھی، اُسی الماری پر وہ شخص بیٹھا مجھے گھور رہا ہے۔ ایک جھٹکے سے میری نیند ٹوٹی تو میں پسینے میں شرابور تھا لیکن الماری کے اُوپر کوئی بھی نہیں بیٹھا تھا۔ میرے خدا...... یہ میرے ساتھ کیا ہو رہا

ہے۔ یہ کون سی بلا میرے پیچھے پڑ گئی تھی اور پھر اس جدید دور میں میں اگر کسی کو یہ سب بتاتا بھی تو وہ میرا مذاق ہی اُڑاتا۔ میری بیوی ساتھ والے بستر پر پڑی خراٹے لے رہی تھی لیکن پھر میں دوبارہ سو نہیں پایا۔ ساری رات یہی آنکھ مچولی جاری رہی۔ میں جیسے ہی آنکھ بند کرتا، میری بند آنکھوں کے پردے پر وہ ہولناک شبیہ اُتر آتی۔ خدا خدا کر کے صبح ہوئی اور میں منہ اندھیرے ہی گھر والوں کو سوتا چھوڑ کر دفتر جا پہنچا۔ ابھی تک خاکروب نے پوری طرح دفتر کو جھاڑو بھی نہیں لگایا تھا اور چپڑاسی نے بھی اتنی صبح مجھے دفتر میں داخل ہوتے دیکھ کر حیرت سے اپنے کاندھے اُچکائے۔ لیکن اس وقت میری سمجھ میں اور کچھ نہیں آ رہا تھا۔ میں وہیں اپنی میز پر بیٹھا اپنے گھٹیا برانڈ کے سگریٹ پھونکتا رہا۔ دھیرے دھیرے لوگ دفتر آنا شروع ہو گئے اور جب میرا یار مرزا دفتر میں داخل ہوا تو مجھے اپنے سے پہلے دفتر میں پا کر وہ تو خوشی اور حیرت سے اُچھل ہی پڑا۔ "ابے یار اصغر...... تو...... آج سورج کس طرف سے نکلا تھا...... میں نے تو غور ہی نہیں کیا......" میں نے فوراً مرزا کا ہاتھ پکڑا اور اُس کو ایک جانب لے جا کر کل شام کی ساری رُوداد سنا دی۔ کچھ دیر تو وہ حیرت سے میری جانب دیکھتا رہا۔ پھر یکایک اُس پر جیسے ہنسی کا دورہ ہی پڑ گیا ہو۔ بڑی مشکل سے وہ چپ ہوا "میں نے تو سنا تھا کہ انسان ساٹھ کے بعد سٹھیاتا ہے...... تو تو چالیس کے بعد ہی......" وہ پھر ہنسنے لگا۔ میں ناراض ہو کر پلٹ کر واپس جانے لگا تو اُس نے میرا ہاتھ پکڑ لیا۔ "ابے یار...... ناراض کیوں ہوتا ہے...... دراصل لوگوں کا دماغ دو شادیاں کر کے خراب ہوتا ہے...... لیکن تجھے تیری دو نوکریوں نے پاگل کر دیا ہے...... یہ صرف ذہنی دباؤ اور ہر وقت کی سوچ کے کرشمے ہیں۔ میری جان...... میں تو کہتا ہوں لعنت بھیج اس دوسری نوکری پر...... جس دن سے تو نے اس خبیث عظیم کے دفتر میں نوکری کی ہے تیری پریشانیاں گھٹنے کے بجائے بڑھتی ہی جا رہی ہیں...... کیوں اپنی زندگی کو اتنے عذابوں میں ڈال رکھا ہے...... جس گھر اور اولاد کے لیے تو قرض پر قرض لیتا رہتا ہے انہوں نے تو کبھی آج تک تجھے گھاس بھی نہیں ڈالی۔ پھر اپنے اُوپر تو یہ ظلم کیوں کر رہا ہے۔" مرزا کہہ تو ٹھیک ہی رہا تھا۔ ان دو نوکریوں اور قرض کے چکر میں میں خود گھن چکر بنتا جا رہا تھا۔ لیکن کیا وہ سب جو میرے ساتھ بیتا، صرف ایک خواب ہی تھا؟ اور کیا کوئی خواب اتنے لمبے تسلسل سے بھی دیکھا جا سکتا ہے؟ میرا دل اُسے ایک خواب ماننے پر راضی نہیں ہو پا رہا تھا۔ اِسی ادھیڑ بن میں

سرکاری دفتر کا وقت ختم ہوا اور مجھے پھر سے اُسی اذیت گاہ کی جانب قدم بڑھانا پڑے جہاں روزانہ میری رُوح کا قتل ہوتا تھا۔ لیکن اُس دن اتفاق سے وہ جلادِ عظیم دفتر کچھ دیر سے پہنچا اور آتے ہی اُسے کسی ضروری کام کے سلسلے میں دوبارہ باہر جانا پڑ گیا۔ میں اپنے اندر سرِشام ہی ایک عجیب سی بے چینی محسوس کر رہا تھا، لہٰذا عظیم کے دفتر سے نکلنے کے بعد مجھ سے بھی دفتر میں نہیں بیٹھا گیا۔ میں دفتر سے نکلا اور میرے قدم خود بخود اُسی پارک کی جانب بڑھ گئے۔ مغرب کا وقت قریب ہی تھا اور بادلوں کی وجہ سے آج سرِشام ہی اندھیرا سا چھانے لگا تھا۔ پتا نہیں میں اُس پارک کی جانب کیوں بڑھا چلا جا رہا تھا۔ شاید میں اُس اُلجھن اور اُس اذیت کو ختم کرنا چاہتا تھا جو اس خواب اور حقیقت کا سچ جاننے کے لیے میرا اندر اس وقت جھیل رہا تھا۔ جب میں پارک پہنچا تو ابھی وہاں اکا دکا لوگ موجود تھے جو شام ڈھلنے سے پہلے گھر واپسی کی تیاری کر رہے تھے۔ میں چپ چاپ جا کر اُسی بنچ پر بیٹھ گیا۔ میں نے اِدھر اُدھر دیکھا اور پھر چوکیدار کو آس پاس نہ پا کر میں نے اپنی آنکھیں موندھ لیں۔ لیکن کچھ نہیں ہوا...... میں نے آنکھیں کھول کر پھر اطمینان کیا اور ایک بار پھر سر ٹکا کر آنکھیں بند کر لیں۔ لیکن اس بار بھی کوئی جھما کا نہیں ہوا۔ تو کیا واقعی وہ سب میرا واہمہ ہی تھا۔ میں نے تھک کر آنکھیں کھول دیں۔ پھر اچانک میرے ذہن میں ایک اور خیال آیا۔ کل جب میں یہاں آیا تو مغرب کے بعد کا اندھیرا چھا چکا تھا۔ جب کہ اس وقت اچھی خاصی روشنی باقی تھی۔ میں نے اُٹھتے اُٹھتے گھر واپسی کا ارادہ ترک کر دیا۔ جب یہاں تک آ ہی گیا ہوں تو آج اپنا شک پوری طرح دُور کر کے ہی واپس جاؤں گا۔ میں نے ٹہل کر پارک کا ایک چکر لگایا اور شاید وہ میرا تیسرا چکر تھا جب مغرب کی اذانیں شروع ہو چکی تھیں۔ میں چکر ختم کر کے واپس اپنے بنچ پر آ کر بیٹھ گیا۔ جانے میرا دل اتنے زور زور سے کیوں دھڑک رہا تھا۔ میں نے دل ہی دل میں ایک دو تین کہا اور آنکھیں بند کر لیں اور پوری طرح ذہنی طور پر تیار ہونے کے باوجود میں ایک بار پھر اُچھل پڑا۔ ہاں...... وہی دو سلگتی آنکھیں...... میرے ذہن میں آواز گونجی ''مجھے یقین تھا تم ضرور آؤ گے۔'' میں نے گھبرا کر آنکھیں کھول دیں اور پھر ڈرتے ڈرتے بند کیں اور زیرِ لب جیسے اپنے آپ سے ہی پوچھا ''تم کون ہو......؟ اور آخر میرے پیچھے ہی کیوں پڑے ہو...... اور تم کسی اور کو کیوں نظر نہیں آتے۔'' وہ آنکھیں ہنس دیں۔ ''میں صرف اُسی کو نظر آتا ہوں جس کو نظر آنا

...تا ہوں...... ورنہ تم انسانوں میں ایسے جنونی اور پاگل بھی موجود ہیں جو میری ایک جھلک ...ھنے کے لیے اور مجھے پانے کے لیے برسوں جانے کتنی تپسیا اور کتنے جاپ کرتے ہیں...... ...رات، صبح و شام اپنا جیون جلاتے ہیں، قبرستانوں میں، دریاؤں میں، صحراؤں میں ایک ...ں پر کھڑے ہو کر سالوں جنتر منتر پڑھتے ہیں۔ قبروں سے مردے نکال کر اُن کی ہڈیوں کا ...ہ بنا کر اپنی آنکھوں میں اس اُمید پر لگاتے ہیں کہ شاید وہ مجھے دیکھ پائیں گے لیکن جواب ...صرف اپنی بینائی ہی کھوتے ہیں عمر بھر کے لیے...... کئی تو ایسے بھی ہیں جو اپنے جیسے ...رے انسانوں کا خون کرنے سے بھی نہیں چوکتے صرف اس اُمید پر کہ شاید وہ کبھی میری ...ی جھلک ہی پا لیں گے لیکن میں اُن پر کبھی ظاہر نہیں ہوتا۔ میرا احسان مانو کہ میں کسی ...انی، یا امتحان کے بغیر تم سے آج محوِ کلام ہوں......''

مجھے اُس کی باتوں سے اُلجھن سی ہونے لگی تھی لہٰذا میں اپنی تلخی چھپا نہیں پایا۔ ''اچھا...... ...ب مجھ پر اس مہربانی کی وجہ بھی بتا ہی دو؟'' ''وجہ کچھ خاص نہیں ہے...... بس تم مجھے اچھے ...ے گئے ہو...... مجھ سے دوستی کرو گے......؟'' ''دوستی......؟ تم سے...... لیکن تم ہو کیا بلا...... ...امطلب ہے تم کون سی مخلوق ہو......؟'' وہ میری بات سن کر ہنس پڑا۔ ''میں جس سے بگڑ ...ں اُس کے لیے واقعی ایک بلا ہوں لیکن جس پر مہربان ہو جاؤں اُس کی دنیا بدل دیتا ...ں۔ تمہاری دنیا والے مجھے 'چھلاوہ' کہتے ہیں۔'' میں اُس کی بات سن کر اُچھل پڑا...... ...چھلاوہ...... تو کیا تم کوئی جن بھوت وغیرہ ہو۔'' وہ پھر ہنسا۔ ''تم چاہو تو بھوت ہی سمجھ لو۔ ...ن کیا تم نے آج تک کوئی بھوت دیکھا بھی ہے؟ جنات کا وجود تو پھر بھی ثابت ہے، ورنہ تم ...ان ہی خود سب سے بڑے بھوت ہو......'' میں ابھی تک اُلجھن میں تھا۔ ''کیا تم سامنے آ ...مجھ سے بات نہیں کر سکتے......؟ مجھے یوں بند آنکھوں سے بات کرنے سے اُلجھن ہونے ...ی ہے۔'' ''ٹھیک ہے لیکن یاد رہے کہ میں صرف تم پر ہی خود کو واضح کر رہا ہوں۔ دوسروں ...لیے میں اب بھی اوجھل ہوں۔ اب تم چاہو تو آنکھیں کھول سکتے ہو۔'' میں نے جھٹ سے ...ھیں کھول دیں۔ وہ بالکل میرے سامنے پنجوں کے بل بیٹھا ہوا تھا۔ میں نے جلدی سے ڈر ...اپنے پیر سکیڑ لیے۔ اُس کے بیٹھنے کا انداز بھی عجیب تھا جیسے کوئی بلی کوئی اُونچی چھلانگ ...نے سے پہلے اپنے پیروں پر اپنا پورا بوجھ ڈالتی ہے اور اگلے پنجوں کو زمین پر ٹکا کر اپنا جسم

تولتی ہے۔ وہ بھی یوں ہی زمین پر اپنا پورا وزن اپنے پیروں پر اور دونوں ہاتھ زمین پر ٹکا کر اور ہاتھوں کے پنجے کھولے ہوئے یوں بیٹھا تھا جیسے ابھی اگلے ہی پل کسی پھرتیلے چیتے کی طرح کوئی اُونچی زقند لگا کر درخت کی کسی اُونچی شاخ پر جا بیٹھے گا۔ اُس کے وجود میں جیسے کوئی پارا سا بھرا ہوا تھا، اور نس نس سے بے چینی ٹپک رہی تھی۔ اُس نے غور سے میری جانب دیکھا لیکن نہ جانے کیوں میں اُس کی جانب دیکھ بھی نہیں پا رہا تھا۔ ''تم نے میرے سوال کا جواب نہیں دیا کہ تم مجھ سے دوستی کرو گے، یا نہیں......؟ لیکن کوئی بھی جواب دینے سے پہلے میں تمہیں یہ بتانا ضروری سمجھتا ہوں کہ میری دوستی اتنی آسان نہیں ہے۔ کچھ شرائط پر پورا اُترنا پڑتا ہے۔ ہاں البتہ اس کے بعد جب تم میرے دوست بن جاؤ گے تو دنیا کی ہر آسائش وہ سب کچھ جس کا تصور تم شاید اپنے آخری خواب میں بھی نہیں کر سکتے، وہ سب تمہارے قدموں میں ہوگا۔ بس صرف تمہاری خواہش دل سے ہونٹوں پر آنے تک کی دیر ہوگی اور اس جہاں کی ہر نعمت تمہارے اختیار میں ہوگی......''

''اچھا......؟ ......تو اب لگے ہاتھوں وہ شرائط بھی بتا دو جو تم سے دوستی کرنے کے لیے مجھے پوری کرنا ہوگی۔''

''شرط کوئی خاص بڑی نہیں ہے......بس تمہیں اپنا 'ایمان' مجھے سونپنا ہوگا۔''

میں اُس کی بات سن کر اُچھل ہی تو پڑا۔ ''کیا مطلب......؟ ......تم کہنا کیا چاہتے ہو......؟'' اُس نے غور سے میری جانب دیکھا۔ ''تم سمجھے نہیں، یا پھر سمجھنا نہیں چاہتے...... میں نے کوئی اتنی مشکل بات تو نہیں کہی؟ بس تمہیں اپنا مذہب ترک کرنا ہوگا۔ تم مسلمان ہونے کے باوجود اپنے مذہب کا کوئی بھی فرض رُکن ادا نہیں کرو گے۔ کبھی مسجد میں قدم نہیں رکھو گے۔ کلمہ، نماز، روزہ یہ سب تمہارے لیے میری دوستی کے بعد اجنبی ہو جائیں گے۔ بس اتنی سی شرط ہے تمہیں کوئی اعتراض تو نہیں......''

غصے میں میرے تن بدن میں آگ لگ گئی۔ ''واہ...... کیا شرط ہے......؟ تم کیا سمجھتے ہو میں تمہاری باتوں میں آ کر اپنا مذہب ترک کر دوں گا......کبھی نہیں...... میں لعنت بھیجتا ہوں ایسی دوستی پر...... دوبارہ کبھی میرے راستے میں نہ آنا۔'' وہ زور سے ہنسا ''تم اتنا بھڑک کیوں رہے ہو...... میں نے جو عمل تمہیں ترک کرنے کے لیے کہا ہے تم خود نہ جانے کب کا وہ سب

چھوڑ چکے ہو...... ذرا غور تو کرو...... تم نے آخری نماز کب پڑھی تھی......؟ تمہیں روزہ ہوئے کتنے سال ہو چکے ہیں......؟ اور آخری بار تم نے کسی مسجد کا دروازہ کب پار کیا ......؟ تم اور تمہارا پورا گھرانا تو عید کے دن بھی سورج چڑھے نیند سے جاگتا ہے...... تمہاری کتاب پچھلے سات آٹھ سالوں سے تمہارے گھر کے طاق میں پڑی پڑی مٹی سے اَٹ چکی ...... میں نے ایسی کون سی انہونی کہہ دی ہے جو تم یوں مجھ سے اُلجھ رہے ہو......؟'' میں کی باتیں سن کر مزید غصے اور خجالت کا شکار ہو گیا۔ بہر حال اُس نے کہا سب سچ ہی تھا۔ ہیں یہ سب کس نے بتایا؟ اور کان کھول کر سن لو کہ نماز پڑھنا نا پڑھنا میرا ذاتی معاملہ ہے۔ اس کا یہ مطلب بھی نہیں کہ میں اپنا ایمان ہی تمہاری دوستی کے عوض بیچ ڈالوں۔''

وہ ایک لمحہ پہلے مجھے زمین پر دکھائی دیا لیکن اب اگلے ہی لمحے وہ درخت کی پہلی شاخ پر ہوا دکھائی دیا۔ وہ مسلسل بات چیت کے دوران ہر لمحہ اپنی جگہ بدلتا ہی رہتا تھا۔ جیسے اُسے کروٹ بھی چین نہ ہو۔ میری بات سن کر وہ غصے میں آ گیا۔ ''کسی نے سچ ہی کہا ہے...... نسان ہو ہی سدا کے ناشکرے۔ ٹھیک ہے جاؤ مرو اُسی ذلت کی زندگی میں۔ جہاں صبح سے تک تمہیں صرف بے عزتی ہی ملتی ہے...... جس سے کل تک تم اتنے بے زار آ چکے تھے کہ اس پیڑ کے نیچے بیٹھ کر مرنے کے طریقے سوچ رہے تھے۔ تم جیسوں کو مر ہی جانا یے۔ میں تمہیں آج جانے دے رہا ہوں، لیکن یاد رہے کہ اب اس طرف کا رُخ تبھی کرنا تم میری دوستی قبول کرنے کا فیصلہ کر لو، ورنہ اگر تمہیں میں نے دوبارہ تمہارے اس برائے ایمان کے ساتھ اپنے اس ٹھکانے کے آس پاس بھی بھٹکتے ہوئے دیکھا تو میں خود تمہاری لے لوں گا۔ تم نے ابھی تک میری دوستی دیکھی ہے...... میرا جان لیوا روپ نہیں دیکھا...... ب یہاں سے......'' وہ پل بھر میں جانے کہاں غائب ہو چکا تھا لیکن اُس کے لہجے نے مجھے ڈرا دیا تھا۔ میں نے چونک کر سامنے دیکھا تو چوکیدار دُور سے لمبے لمبے ڈگ بھرتا اپنی جانب آتا دکھائی دیا۔ میں اُس کے سوالات سے بچنے کے لیے جلدی سے وہاں سے اور مخالف سمت چلتا ہوا پارک سے باہر نکل گیا۔

ایمان فروش

اصغر صاحب کی داستان ابھی یہیں تک پہنچی تھی کہ صبح کی اذانیں شروع ہوگئیں۔ میں کچھ اس طرح سے اُن کی کہانی میں مگن ہوگیا تھا کہ وقت گزرنے کا ذرا بھی احساس نہیں ہوا۔ ہمیں وقفہ لینا پڑا۔ حالانکہ یہ خاصا مشکل کام تھا۔ میں نے اصغر صاحب کو کچھ آرام کرنے کا کہا لیکن خود میرا پورا دن اُن کی کہانی کے تانوں بانوں میں اُلجھا رہا۔ خدا خدا کر کے دن ڈھلا اور رات کو پھر ہمیں تنہائی میسر آئی تو اصغر صاحب نے پھر سے اپنی کہانی کا سرا وہیں سے جوڑا جہاں سے ٹوٹا تھا۔

''عبداللہ میاں...... انسان بڑا کمزور ہے۔ وہ ارادے باندھتا ہے اور پھر توڑ دیتا ہے۔ میرے ارادوں کے ساتھ بھی کچھ ایسا ہی ہوا...... میں اُس روز چھلاوے کو دھتکار تو آیا لیکن اگلے ہی روز صبح ہی سے میری پریشانیوں کا وہی پرانا نہ ختم ہونے والا سلسلہ پھر سے شروع ہو گیا۔ وہی سرکاری دفتر اور وہی افسروں کی چخ چخ۔ صبح سویرے ہی سب سے پہلے بیوی نے فلیٹ کے کرائے کا رونا شروع کر دیا کہ مالک کئی مہینوں سے کرایہ بڑھانا چاہتا ہے اور کل شام کو اُس نے فائنل نوٹس بھی دے دیا ہے کہ کرائے میں ساڑھے تین ہزار کا اضافہ کرو ورنہ فلیٹ چھوڑو...... اور ہمارے پاس وقت بھی صرف دو ہفتوں کا ہی بچا تھا۔ بیوی سے لڑ کر اور جان چھڑا کر دفتر پہنچا تو وہاں بھی افسر اُکھڑے ہوئے تھے کہ ہفتوں پرانی فائلز ابھی تک میری میز پر کیوں پڑی ہیں......؟ وہاں سے ڈانٹ کھا کر عظیم کے دفتر پہنچا تو وہ پہلے ہی گزشتہ دن میرے دفتر سے جلدی اُٹھ جانے کا پتا چل جانے پر غصے میں آگ بگولہ میرا انتظار کر رہا تھا۔ اُس نے مجھے کچھ بولنے کا موقع ہی نہیں دیا اور فائل اُٹھا کر میرے منہ پر دے ماری اور مجھے آفس سے نکل جانے کا حکم دے دیا۔ مطلب یہ نوکری بھی میرے ہاتھ سے جا چکی تھی۔ دفتر سے باہر نکلا تو گھر واپسی کا سوچ کر ہی میرا دل اُلٹنے لگا کہ جب میری بیوی کو پتا چلے گا کہ میں کرائے کا انتظام کرنے کے بجائے اُلٹا اپنی لگی بندھی نوکری بھی گنوا آیا ہوں تو وہ تو آسمان سر پر اُٹھا لے گی۔ میں نے پی سی او سے دو چار دوستوں کو فون کیا کہ شاید کچھ قرض کا انتظام ہو جائے مگر میں پہلے ہی سب سے اتنا قرض لے چکا تھا کہ اب تو کوئی دوست میری آواز سن کر ہی فون بند کر دیتے تھے۔ چھلاوے نے ٹھیک ہی کہا تھا مجھ جیسوں کو تو مر ہی جانا چاہیے تھا۔ میں نے کچھ سوچا اور قدم بڑھا دیئے اور جب میں اپنے خیالات کی یلغار سے چونکا تو میں پھر وہی اُسی پارک میں اُسی درخت کے نیچے کھڑا تھا اور شام کا ملگجا اندھیرا میری قسمت کی کالک کی طرح آس پاس پھیل چکا تھا۔ کچھ ہی دیر میں اُس نے درخت کے پیچھے سے جھانکا۔

''تم پھر آ گئے...... میں نے تمہیں خبردار بھی کیا تھا کہ......''

''ہاں...... میں چاہتا ہوں کہ تم مجھے مار ڈالو...... مجھ میں خود کو مارنے کی ہمت نہیں ہے۔'' وہ ہنسا۔ ''بڑے بزدل ہو...... خود مر بھی نہیں سکتے...... اور مر کے بھی چین نہ پایا تو کدھر جاؤ گے......؟''

میں نے بے بسی سے سر جھٹکا ''ٹھیک ہے...... تم بھی اُڑا لو مذاق...... میری اپنی دنیا والے بھی یہی کرتے ہیں......''

''میری پیش کش اب بھی قائم ہے...... جس مذہب سے تم پہلے ہی میلوں دُور ہو...... اُسے میری خاطر ترک کرنے میں آخر تمہیں اعتراض ہی کیا ہے؟ اچھا چلو...... میں تمہاری خاطر اپنی شرط میں کچھ نرمی پیدا کر دیتا ہوں لیکن صرف تمہارے لیے...... کیا سمجھے...... تم چاہو تو صرف ایک سال کے لیے آزمائشی طور پر اپنا ایمان میرے پاس گروی رکھوا سکتے ہو۔ اگر سال کے بعد تمہیں لگے کہ تمہاری پرانی زندگی ہی بہتر تھی تو تم واپس لوٹ جانا۔ لیکن خیال رہے کہ اس ایک سالہ معاہدے میں ہم دونوں کو ایک دوسرے کی ہر بات ماننا ہوگی۔ جو تم کہو گے وہ میں کروں گا اور جس چیز سے میں تمہیں منع کروں گا تمہیں اُس سے پلٹنا ہوگا۔ بولو منظور ہے۔''

میں ابھی تک اُسی ہچکچاہٹ کا شکار تھا۔ ''لیکن...... میرا مطلب ہے کہ اگر کسی غلطی، یا مجبوری کی وجہ سے میں نے مذہب کا کوئی ایسا رُکن اختیار کر لیا تو کیا ہوگا...... کیا اُس کے بعد......'' اُس نے میری بات کاٹ دی ''اس کی تم فکر نہ کرو...... جب تم ایک بار سچے دل سے اپنا ایمان میرے پاس گروی رکھوا دو گے تو پھر سال بھر تمہارے دل میں ایسی کوئی بات اوّل تو پیدا ہوگی نہیں...... اور پھر اگر تمہارا دل 'بھٹکا' بھی تو میرے پاس اس کا انتظام بھی موجود ہے۔ تم یہ سرخ

دھاگا اپنے گلے میں باندھ لو...... یہ پورے ایک سال تک تمہارے گلے میں موجود رہے گا اور تمہیں ہر اس بات سے بچائے گا جو مجھے پسند نہیں ہے، یا جس سے ہماری دوستی کی کسی بھی شرط پر کوئی بھی آنچ آسکتی ہو۔ یوں سمجھ لو کہ یہی سرخ دھاگا میرے اور تمہارے رابطے اور معاہدے کا ضامن ہوگا۔'' میں نے سر جھٹک کر دیکھا تو دھاگا اب اُس کے ہاتھ سے میرے ہاتھ میں منتقل ہو چکا تھا۔ میں شدید ہچکچاہٹ اور کش مکش کا شکار تھا۔ اُس نے مجھے اُکسایا۔ ''سوچو مت...... ایسے موقعے زندگی میں بار بار نہیں ملتے...... تمہیں کون سا دین، یا دنیا میں سے کوئی ایک بھی میسر ہے...... دین کی طرف تم گئے نہیں اور دنیا تم سے بھاگتی رہی...... اب ایک موقع ملا ہے تو کم از کم اس زندگی کو ہی جی جاؤ...... صرف ایک سال ہی کی تو بات ہے۔ پھر عمر پڑی ہے دین کو جینے کے لیے...... باندھ لو دھاگا...... لوگ ایسی زندگی کا ایک پل جینے کے لیے عمر بھر ایڑیاں رگڑتے ہیں...... اور میں تمہیں پورا ایک سال دے رہا ہوں...... باندھ لو یہ دھاگا...... دیر مت کرو......''

میرے ذہن میں جیسے ایک ساتھ کئی جھکڑ چل رہے تھے۔ میں نے ایک گہری سانس لی، آنکھیں بند کیں اور دھاگا گلے میں ڈال کر اس کی ڈور کس لی۔ دفعتہً ایک زوردار آندھی چلی۔ مجھے یوں لگا یہ ہوا اس درخت کی شاخیں مجھ پر گرا کر ہی دم لے گی۔ گرد کا ایک طوفان اُٹھا، مجھے ایک تیز چکر آیا اور میں لہرا کر وہیں زمین پر گر گیا۔

دوبارہ مجھے تب ہوش آیا جب کوئی دھیرے دھیرے پیار سے میرا کاندھا ہلا کر مجھے جگانے کی کوشش کر رہا تھا۔ ''اُٹھ جائیں نا...... دیکھیں کتنی دیر ہوگئی ہے...... آج دفتر نہیں جانا کیا......؟'' میں نے گھبرا کر آنکھیں کھول دیں۔ میری جھگڑالو اور لڑاکا بیوی نہایت تمیز اور پیار سے مجھے جگا رہی تھی اور اُس کے ہاتھ میں گرم چائے کا ایک کپ بھی تھا...... اوہ، بیڈ ٹی (Bed Tea)...... میں نے جلدی جلدی زور سے اپنی آنکھوں کو رگڑا...... میں نے پہلے کوئی خواب دیکھا تھا، یا ابھی اس وقت کوئی سپنا دیکھ رہا تھا۔ میں حیرت سے اُس کی طرف دیکھتا رہا۔ اُس نے پیار سے میرے بال سہلائے اور تکیہ سیدھا کر کے مجھے بٹھایا اور چائے کا کپ میرے ہونٹوں سے لگا دیا ''اُف کس سوچ میں پڑے ہیں...... جلدی کریں...... میں آپ کے کپڑے اِستری کر کے باتھ روم میں لٹکا دیتی ہوں۔ جلدی سے چائے پی کر نہا لیں۔ پانی گرم کروا دیا

ہے......'' میری بیوی کمرے سے مسکراتی ہوئی نکل گئی۔ اُس کی یہ مسکراہٹ میں نے آج سے ٹھیک ۲۵ سال پہلے دیکھی تھی جب ہماری تازہ تازہ شادی ہوئی تھی۔ تب سے لے کر آج تک میں اُس کی مسکراہٹ تو دُور، اُس کے دو میٹھے بولوں کو بھی ترس گیا تھا۔ بیوی کے نکلتے وقت میری نظر ڈریسنگ ٹیبل کے آئینے پر پڑی تو اس میں مجھے پیچھے اپنی الماری کے اُوپر وہ بیٹھا مسکراتا ہوا نظر آیا۔ میں نے جلدی سے پلٹ کر دیکھا تو کوئی نہیں تھا۔ میں نے ایک خواب کے سے عالم میں چائے ختم کی اور کمرے سے باہر نکلا تو میری بڑی بیٹی تولیہ اور صابن اور دوسری بیٹی ہاتھ میں میرے اِستری شدہ کپڑے پکڑی نظر آئی ''ابا آپ جلدی سے نہا لیں...... پھر ہم سب اکٹھے ناشتا کریں گے۔ آج عظمیٰ نے اپنے ہاتھوں سے آپ کے لیے پراٹھے بنائے ہیں۔'' عظمیٰ میری چھوٹی بیٹی کا نام تھا۔ میں حیرت سے وہیں گر پڑنے کے قریب تھا۔ اِسی کیفیت میں غسل کر کے باہر نکلا تو میرا بڑا بیٹا وقار میرے جوتے پالش کر چکنے کے بعد انہیں کپڑے سے چمکا رہا تھا۔ جب کہ چھوٹا میرے لیے خشک سلیپر لیے پہلے سے میرے انتظار میں غسل خانے کے باہر کھڑا تھا۔ میری تو جیسے زبان ہی گنگ ہو چلی تھی۔ میری بیوی اور بیٹیوں نے جس پیار سے مجھے ناشتا کروایا اور بیٹوں نے جس محبت سے لنچ بکس کا ٹفن کیریئر میرے حوالے کر کے مجھے دفتر کے لیے رُخصت کیا ویسا میں نے خواب میں بھی تصور نہیں کیا تھا۔ فلیٹ سے نکل کر بس اسٹاپ پر پہنچا تو جیسے بس میرے انتظار میں ہی کھڑی تھی اور میری پسندیدہ تین نمبر کی کھڑکی والی سیٹ بھی خالی تھی، جہاں بیٹھ کر میں ڈرائیور سے کہہ کر اپنی پسندیدہ کیسٹ بھی سن سکتا تھا۔ آج خلاف توقع کنڈیکٹر کا رویہ بھی میرے ساتھ بہت اچھا تھا اور جانے کیوں مجھے یہ بھی محسوس ہوا پل بھر کے لیے کہ میں نے ڈرائیور کے سامنے لگے ہوئے بیک ویو مرر میں اپنے اُسی مہربان کی ایک جھلک بھی دیکھی ہے لیکن جب میں نے پلٹ کر دیکھا تو پچھلی سیٹ پر کوئی اور بیٹھا ہوا تھا۔

دفتر پہنچا تو چپڑاسی نے نہایت ادب سے سلام کیا اور بتایا کہ توصیف صاحب دو تین بار میرا پوچھ چکے ہیں۔ توصیف صاحب ہمارے سیکشن آفیسر تھے اور اُصولوں اور وقت کے نہایت پابند۔ میں نے جھجکتے ہوئے اُن کے کمرے میں قدم رکھا تو مجھے دیکھتے ہی بولے ''آئیے آئیے اصغر صاحب...... بھئی مبارک ہو...... آپ کو سپرنٹنڈنٹ پروموٹ کر دیا گیا ہے اور وہ جو ہاؤس

لون (House Loan) کے لیے آپ نے درخواست دے رکھی تھی، وہ قرضہ بھی منظور ہو گیا
ہے۔ کیشیئر سے اپنا چیک لیتے جایئے گا......'' حیرت اور خوشی کے مارے میری آواز بند ہو گئی۔
میری پروموشن کا کیس پچھلے پانچ سالوں سے اٹکا ہوا تھا۔ کیوں کہ میری اے سی آرز
(ACRs) ٹھیک نہیں تھیں اور یہ گھر کے لیے اس قرضے کی درخواست تو میں نے بھرتی کے
دوسرے سال سے دے رکھی تھی اور اب تو میں اُسے بھول بھی چکا تھا۔ میں شادی مرگ کی
کیفیت میں توصیف صاحب کے کمرے سے نکلا تو وہ مجھے میری میز کے اُوپر اکڑوں بیٹھا نظر
آیا۔ ''کیوں...... اب تو خوش ہو......'' ......''خوش......؟ ہاں مگر یہ سب......؟ کیسے......؟''
''میں نے تم سے کہا تھا نا کہ جو تم سوچو گے وہ ہو جائے گا...... صبح سے اب تک صرف وہی ہو
رہا ہے جس کے بارے میں تم برسوں سے سوچتے آرہے ہو...... تم نے آج تک ہمیشہ یہی سوچا
تھا نا کہ تمہارے گھر میں تمہاری عزت ہو، آرام اور سکون ہو...... اور تمہاری وہ سب چھوٹی
چھوٹی سی خواہش پوری ہوں جن کے لیے تم برسوں سے ترس رہے ہو......؟ ...... تو بس میں
نے صرف تمہاری آج تک کی اُن خواہشوں کو ہی پایۂ تکمیل پہنچایا ہے...... ویسے تم انسان بھی
بڑے عجیب ہوتے ہو...... تم نے ان معمولی اور گھٹیا سی خواہشوں کے پیچھے بھاگتے بھاگتے اپنی
ساری عمر گنوا دی...... یہ معمولی سا ہاؤس لون اور اس سپرنٹنڈنٹ کی یہ بڑے کلرکوں والی
نوکری...... بس یہی پہنچ تھی تمہاری آج تک کی ہر سوچ، ہر جذبے کی...... سچ پوچھو تو مجھے افسوس
ہو رہا ہے تمہارے معیار پر......''

میں حیرت سے بیٹھا اُس کی باتیں سنتا رہا۔ اس وقت دفتر میں کچھ زیادہ چہل پہل نہیں
تھی کیوں کہ باقی سارے لوگ کانفرنس ہال میں تھے۔ میں نے اپنی آنکھیں پٹ پٹائیں۔
''مطلب یہ کہ میں جو بھی سوچوں گا، تم میرے لیے ویسا ہی کر دکھاؤ گے......؟ ...... کچھ بھی......
جو بھی میرے دل میں آئے؟'' وہ مسکرایا ''آزمائش شرط ہے......'' اور پھر میں نے آزمانے کا
فیصلہ کر لیا۔ شام کو جب میں عظیم کے دفتر پہنچا تو میرے دل نے کہا ''عظیم میرے لیے دروازہ
کھولے......'' اور پھر دروازہ کھلا تو عظیم میرے سامنے فائلیں لیے کھڑا تھا۔ اُس نے خوشامد
بھرے لہجے میں کہا ''آئیں سر پلیز...... ہم آپ کا ہی انتظار کر رہے تھے......'' شبانہ بھی اُس
کے پہلو میں کھڑی مسکرا رہی۔ میں شدید خواہش کے باوجود کچھ ڈگمگا سا گیا۔ اُس نے میرے

ذہن کو دھیرے سے کھٹکھٹایا۔ ''گھبرانے کی ضرورت نہیں...... اس وقت یہ تمہارا نہیں...... تم اس
کے باس ہو...... جو دل میں بھڑاس بھری ہے...... سب نکال دو......'' میں پھر سے خود اعتماد ہو
گیا اور عظیم کے کمرے میں داخل ہوتے ہوئے میں نے اُس سے کام کے بارے میں پوچھا۔
شبانہ میری کرسی کے پیچھے ہی کھڑی تھی، بالکل ویسے ہی جیسے وہ عظیم کے ساتھ کھڑی ہوتی تھی۔
عظیم نے جلدی سے فائل میرے سامنے پیش کی۔ میں نے دو صفحے پلٹے اور پھر فائل اُٹھا کر
پوری قوت سے عظیم کے منہ پر دے ماری۔ ''یہ کام کرتے ہو تم...... آج تک تمہیں ٹھیک طرح
سے ڈرافٹنگ کرنا بھی نہیں آئی۔ بوڑھے گدھے ہو گئے ہو اور ابھی تک غلطیاں کرتے رہتے
ہو۔'' عظیم کے ماتھے سے ویسے ہی پسینہ ٹپک رہا تھا جیسے روزانہ میرے ماتھے سے ٹپکتا تھا۔
شبانہ ویسی ہی مسکراہٹ لبوں پر سجائے ہوئے کھڑی طنز سے عظیم کی جانب دیکھ رہی تھی۔ میں
پھر عظیم پر دھاڑا ''چلو اُٹھاؤ یہ فائل اور اپنی منحوس صورت میری نظروں کے سامنے سے دُور لے
جاؤ۔ دوبارہ اس طرح کا ڈرافٹ میرے سامنے لے کر آئے تو میں فائل سمیت تم کو بھی اس
کھڑکی سے باہر پھینک دوں گا۔ دفع ہو جاؤ......'' عظیم خجالت اور شرمندگی سے کانپتا ہوا کمرے
سے نکل گیا۔ شبانہ مسکراتی ہوئی میری آغوش کی جانب بڑھی لیکن اب اُس کی باری تھی۔ میں
زور سے چیخا۔ ''اور یہ تم کیا ہر وقت اپنے ہونٹوں پر طوائفوں جیسی نمائشی مسکراہٹ سجائے
میرے آگے پیچھے پھرتی رہتی ہو۔ مجھے اپنے دفتر میں کام چاہیے...... بازار نہیں...... تم بھی دفع
ہو جاؤ یہاں سے ورنہ میں تمہیں بھی ابھی اِسی وقت دھکے مار کر دفتر سے نکلوا دوں گا۔ شبانہ کا
رنگ ہی جیسے اُڑ گیا اور وہ چند لمحے حیرت اور صدمے میں گنگ سی کھڑی رہ گئی اور پھر روتے
ہوئے دوڑ کر دروازہ کھول کر باہر بھاگ گئی۔ میرے اندر برسوں کے اُبلتے ہوئے لاوے پر
جیسے کسی نے پورا ٹھنڈا دریا اُنڈیل دیا ہو۔ اتنا سکون میں نے اپنی پوری زندگی میں کبھی محسوس
نہیں کیا تھا۔ میں عظیم کے کمرے سے باہر نکلا تو سارے دفتر کے لوگ حیرت میں شاک زدہ
سے کھڑے تھے اور یہ سارا ماجرا انہوں نے خود اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا۔ یہ وہی سب لوگ
تھے جن کے سامنے میں برسوں سے ذلیل ہو رہا تھا اور آج انہوں نے مجھے اپنے اندر کا لاوا
اُن لوگوں پر اُبلتے ہوئے دیکھ لیا تھا جن سے وہ اندر ہی اندر شاید خود بھی شدید نفرت کرتے تھے
لیکن خوف اور مجبوری کی وجہ سے کچھ بول نہیں سکتے تھے۔ میں نے ہال سے نکلتے ہوئے سب

کوالوداعی سلام کیا تو سب سے پہلے جاوید کے ہاتھ تالی بجانے کے لیے اُٹھے اور پھر دھیرے دھیرے اُن سب کی تالیوں سے ہال گونجنے لگا۔ میں مسکراتے ہوئے دفتر سے باہر نکلا تو میں نے دھیرے سے خود سے سرگوشی کی ''تم نے یہ سب کیسے کیا......؟ میرا مطلب ہے عظیم میرے سامنے یوں بھیگی بلی بنا کیسے کھڑا تھا؟ آخر وہ ہے تو میرا باس ہی......''

وہ مسکرایا ''تم ان باتوں میں اپنا ذہن مت اُلجھاؤ...... یہ میرے بائیں ہاتھ کا کھیل تھا۔ بہرحال فی الحال تم نئے نئے میرے دوست بنے ہو تو یوں سمجھ لو کہ یہ سب نظر بندی کا کھیل تھا۔ عظیم نے تمہیں اپنے ہی کسی بڑے افسر کے روپ میں دیکھا۔ تمہارے دفتر سے نکلنے کے بعد اُسے رفتہ رفتہ یہ احساس ہوگا کہ اُسے ذلیل کرنے والے خود تم تھے۔ بہرحال اب تم کچھ بڑا سوچو...... پورا دن گزر گیا یہ چوہے بلی کا کھیل کھیلتے ہوئے......'' میں نے حیرت سے اُس کی طرف دیکھا ''بڑا سوچوں......؟...... کیا مطلب......'' ''مطلب یہ کہ سب سے پہلے تمہیں اس پھٹیچر فلیٹ سے نکال کر تمہارے لیے اپنے دوست کے ہم منصب زندگی کا سوچنا ہوگا۔ آخر اب تم میرے دوست ہو، کوئی معمولی انسان نہیں......لیکن تم انسانوں کی مجبوریاں بھی دھیان میں رکھنا پڑتی ہیں۔ بہرحال یہ سب تم مجھ پر چھوڑ دو......''

اور پھر میں نے واقعی سب اُسی پر چھوڑ دیا۔ اگلے تین دن کے اندر نہ جانے میرے برسوں پرانے خریدے گئے چند پرائز بانڈز اور حال ہی میں خریدا گیا لاٹری کا ایک ٹکٹ یکے بعد دیگرے یوں نکلے کہ اگلے ایک مہینے کے اندر میں پہلے لکھ پتی اور پھر اگلے چند مہینوں میں کروڑ پتی ہو چکا تھا۔ دولت مجھ پر یوں برس رہی تھی جیسے میں نے کوئی پارس پا لیا ہو اور میں جس چیز کو بھی ہاتھ لگاتا وہ سونے کی بن جاتی۔ چھ مہینے کے اندر اندر میری زندگی یکسر بدل چکی تھی اور ان چھ مہینوں میں اس چھلاوے نے خود مجھ سے کوئی خاص کام بھی نہیں لیا تھا سوائے ایک آدھ بار کسی ویرانے سے چند جلے ہوئے بال اُٹھا کر کسی گھر کے آنگن میں ڈال آنے کے، یا پھر کسی جانور کا گوشت کسی ایک جگہ سے اُٹھا کر کسی دوسری جگہ پھینک آنا، وغیرہ وغیرہ۔ سچ پوچھو تو مجھے وہ سب کام انتہائی بچگانہ سے بھی لگتے تھے۔ لیکن میں نے سوچا کہ ہوگا کوئی جادو ٹونے کا چکر، لہٰذا میں نے کبھی پس و پیش نہیں کیا۔ ہاں البتہ اس تمام عرصے میں، میں دین سے بالکل دُور رہا اور خود دین رفتہ رفتہ میرے گھر سے دُور ہوتا گیا۔ اس کا انداز پہلی بار مجھے چھ مہینے

کے بعد اُس وقت ہوا جب ایک شام میں تھکا ہارا اپنے آفس سے گھر پہنچا۔ میرا کاروبار اتنا وسیع ہو چکا تھا کہ مجھے اپنے اور اپنے دو بیٹوں کے لیے الگ الگ تین عظیم الشان دفاتر قائم کرنا پڑے تھے۔ ہم نے اپنے کاروبار کے لیے ایک بڑی عمارت خرید لی تھی۔ اور میں، میرے بیٹے اور اُن کا سارا اسٹاف اِسی عمارت میں بیٹھتا تھا۔ ہمارا زمینوں کی خرید و فروخت کا کاروبار تھا اور ہم شہر کے سب سے بڑے بلڈر کہلاتے تھے۔ ہم تینوں اپنی اپنی بڑی گاڑیوں میں صبح گھر سے نکلتے اور شام تک ہم آدھا شہر فتح کر کے گھر واپس لوٹتے تو عام طور پر گھر سنسان ملتا تھا اور نوکروں سے پتا چلتا کہ بیگم صاحبہ کسی تقریب پر گئی ہوئی ہیں اور چھوٹی بیبیاں اپنی سہیلیوں کے ساتھ گھومنے کے لیے گئی ہوئی ہیں۔ البتہ اُس شام میں گھر پہنچا تو میں نے ایک عجیب ہی منظر دیکھا۔ میری بیوی کی کلب والی تمام نئی سہیلیاں میرے گھر کے ڈرائنگ روم میں موجود تھیں اور اُن کے سامنے میز پر تاش کے پتوں اور پیسوں کا ڈھیر لگا ہوا تھا۔ فلیش چل رہا تھا اور کمرہ سگریٹ کے دھویں سے بھرا ہوا تھا۔ مجھے اُس دن پتا چلا کہ میری بیوی نے سگریٹ پینا بھی شروع کر دیا ہے۔ ابھی میں حیرت کے اس پہلے جھٹکے سے سنبھل نہیں پایا تھا کہ میں نے کھڑکی سے باہر چھوٹی عظمیٰ کو شہر کے ایک مشہور لوفر امیر زادے کی گاڑی سے اُترتے ہوئے دیکھا اور جس انداز میں وہ اُس سے گلے مل کر رُخصت ہوئی وہ مجھے شرم سے پانی پانی کرنے کے لیے کافی تھا۔ میں نے اُس وقت تو کسی نہ کسی طرح خود پر قابو پائے رکھا لیکن رات کو جب میں نے بیوی سے گھر کو جوا خانہ بنانے اور بیٹی کی آزاد خیالی پر استفسار کیا تو اُس نے لاپرواہی سے اِٹھلا کر کہا ''اوہ کم آن اصغر...... کیا ہو گیا ہے آپ کو......آپ محلوں تک پہنچنے کے باوجود ابھی تک ذہنی طور پر اُسی دو کمرے کے فلیٹ میں زندگی گزار رہے ہیں۔ اس سوسائٹی میں موو (Move) کرنے کے لیے یہ سبھی طور طریقے اپنانے پڑتے ہیں۔ اور رہی بات عظمیٰ اور شہزادی کی تو اس کی آپ فکر نہ کریں۔ لڑکے کے گھر والے چند روز میں عظمیٰ کا رشتہ لینے آ رہے ہیں۔'' میں نے تلملا کر کہا ''بات رشتہ لینے دینے تک پہنچ چکی ہے اور مجھے خبر تک نہیں ہوئی۔ تم جانتی بھی ہو اس لڑکے کو...... ایک نمبر کا غنڈہ ہے......امیر زادہ ہوا تو کیا ہوا۔'' میری بیوی نے مجھے یوں دیکھا جیسے میں کسی اور دنیا کی مخلوق ہوں۔ ''کیا ہو گیا ہے آپ کو......اس معاشرے میں لڑکی کا رشتہ دیتے وقت صرف لڑکے کی حیثیت اور بینک بیلنس دیکھا جاتا ہے۔ چلیں اب سو جائیں۔ خواہ مخواہ پریشان نہ ہوں۔'' میری بیوی تو کروٹ بدل کر چند لمحوں میں خراٹے

بھرنے لگی لیکن میری نیندیں اُسی روز سے حرام ہو چکی تھیں۔ میں نے چھلاوے سے اس بارے میں شکایت کی تو وہ بھی طنزیہ سی ہنسی ہنس دیا۔ ''تمہاری بیوی ٹھیک ہی کہتی ہے۔تم کبھی بڑے آدمی نہیں بن سکتے۔ ہمیشہ چھوٹے چھوٹے مسئلوں میں اُلجھے رہتے ہوں۔ یہی جوا اگر تمہاری بیوی شہر کے کسی بڑے جم خانے، یا آفیسر کلب نما جگہ پر کھیلتی تو تم اسے نئی تہذیب میں شمار کرتے اور اگر وہی تاش کے پتے گھر میں کھل گئے تو وہ جوا ہو گیا؟ اور شکر کرو تمہاری بیٹی نے اُس لڑکے کو گھر رشتہ لانے کا کہا ہے۔ ورنہ جس ماحول میں وہ پل بڑھ رہی ہے وہاں لڑکیاں یا تو بھاگ کر شادی کرتی ہیں، یا پھر باہر شادی رچا کر گھر واپس آتی ہیں۔تم یہ کیوں بھول جاتے ہو کہ ایک دم اور آسانی سے بے تحاشا پیسہ مل جانے کے اپنے بھی کچھ اثرات ہوتے ہیں...... اور پھر تم انسان ایک اور پابندی بھی تو خود پر لگائے رکھتے ہو فضول سی۔ وہ کیا کہتے ہیں اُسے، ہاں...... حلال اور حرام...... تو اصغر صاحب تمہارے گھر میں پانی کی طرح بہتا پیسہ بھی تو تمہارے انسانی معیار کے مطابق حرام کا ہے۔ ہوسکتا ہے یہ سارے کمالات اِسی حرام کے پیسے سے کھائی ہوئی روٹی کے ہوں......؟'' میں نے چونک کر اُس کی جانب دیکھا۔ اُس کی باتیں تلخ اور کڑوی تو کونین سے بھی زیادہ ہوتی تھیں، لیکن سچ ہوتی تھیں۔ اگلے دن ایک اور بُری خبر میری منتظر تھی۔ میرا چھوٹا بیٹا کرکٹ پر کروڑوں کا سٹہ کھیلتے ہوئے پکڑا گیا۔ گوروں کی کوئی ٹیم آئی تھی خاص اُسے پکڑنے کے لیے۔ چھلاوے کی مدد نہ ہوتی تو عمر بھر باہر کی جیلوں میں سڑتا رہتا۔ ابھی اس پریشانی سے باہر نہیں نکل پایا تھا کہ بڑی بیٹی نے نشے میں دُھت تیز رفتاری سے گاڑی چلاتے ہوئے کسی راہ گیر کو کچل دیا۔ بیٹی کی ایف آئی آر میں میں نے جب یہ پڑھا کہ اُس کے میڈیکل ٹیسٹ میں شراب کا نتیجہ مثبت آیا ہے تو میں بالکل ہی ڈھے گیا۔ آسانی سے ملا ہوا بے تحاشا اور حرام کا پیسہ واقعی اپنا اثر دکھا رہا تھا۔ میں ایک شام اِسی غم میں اداس سا اپنے دفتر میں بیٹھا ساحل کی طرف کھلتی کھڑکی سے دُور لنگر انداز جہازوں کو دیکھ رہا تھا کہ اُس کی آواز میرے من میں گونجی...... ''کیا بات ہے...... بہت اداس ہو...... اب تو زندگی کی ہر نعمت تمہارے پاس ہے...... اب اس اداسی کی وجہ کیا ہے...... میرے ہوتے ہوئے بھی میرا کوئی دوست اداس اور پریشان ہو تو پھر میرا کیا فائدہ......'' میں نے ٹھنڈی سی آہ بھری ''پتا نہیں...... میرا دل اب ان سب چیزوں سے اُوب سا گیا ہے۔ اب مجھے احساس ہو رہا ہے کہ غربت کے اپنے مسائل اور امارت کی اپنی پریشانیاں ہوتی ہیں۔ لیکن دونوں صورتوں

میں انسان کا مقدر صرف بے چینی ہی ہے...... سکون کہیں بھی میسر نہیں آتا۔'' اُس نے میرا دل بہلانے کی کوشش کی۔ ''اچھا چھوڑو یہ مایوسی کی باتیں۔ یہ بتاؤ کبھی کوئی عشق وغیرہ کیا ہے زندگی میں......'' ''عشق......؟...... کیوں دل جلاتے ہو...... تمہارے آنے سے پہلے کھانے کے بھی لالے پڑے ہوئے تھے...... ایسے میں عشق کسے سوجھ سکتا ہے؟'' اُس نے اصرار کیا ''پھر بھی...... شادی سے پہلے کبھی تو کوئی اچھی لگی ہوگی......؟ کیا تمہارے پاس کوئی بھی سنہری یاد نہیں ہے......؟'' میں ماضی کے دریچوں میں کھو گیا۔ ''ہاں کبھی تھی کوئی...... لیکن پھر وہی امارت اور غربت کی دیوار...... ہم یونیورسٹی فیلو تھے...... وہ بہت چاہتی تھی مجھے۔ لیکن جب اُس کے سیٹھ باپ کو پتا چلا تو اُس نے اپنے کارندوں کے ذریعے میری وہ خبر لی کہ یاد رہے اور مجھے دھمکی بھی دی کہ اگر میں اُس کی بیٹی کے آس پاس بھی پھٹکا تو میری خیر نہیں۔ بعد میں سنا ہے اُس کی کسی بڑے صنعت کار کے ساتھ شادی ہوگئی تھی...... اب تو نہ جانے وہ کہاں ہوگی......''
اُس وقت تو چھلاوہ چپ رہا لیکن صبح میرے دفتر کے دروازے پر کسی نے ہلکی سی دستک دی۔ میرے اسٹاف میں سے کسی میں جرأت نہیں تھی کہ یوں ''ڈونٹ ڈسٹرب'' کا بورڈ لگا دیکھ کر بھی میرے آفس کا دروازہ کھٹکھٹا سکے...... میں نے چونک کر سر اُٹھایا تو دروازے میں وہی کھڑی تھی۔ ہاں...... وہ سعدیہ ہی تھی...... میری پہلی محبت...... وہ ذرا بھی تو نہیں بدلی تھی...... بلکہ اُس کا سوگوار سا حسن اور بھی کچھ نکھر گیا تھا۔ میرے ہاتھ سے پین چھوٹ گیا۔ ''سعدیہ......؟ تم......؟ یہاں......؟'' وہ جھجکتی ہوئی اندر آگئی اور پھر اُس نے جو بتایا وہ میرے ہوش اُڑانے کے لیے کافی تھا۔ اُس نے بتایا کہ وہ اپنے شوہر کے ساتھ چھ مہینے پہلے تک ایک خوش حال زندگی گزار رہی تھی کہ اچانک ایک دن اُس کا باپ ایک ایکسیڈنٹ میں مارا گیا۔ باپ کی دولت اور جائداد شوہر کے قبضے میں آئی تو اُس نے نہ جانے کن اللے تللوں میں اُڑا دی اور رفتہ رفتہ اُس کا رویہ سعدیہ سے بھی بد سے بدتر ہوتا گیا۔ باپ کی موت سے ٹھیک دو ماہ بعد اسے طلاق کا تحفہ دے کر گھر سے نکال دیا گیا اور پچھلے ہفتے ہی وہ اپنی عدت ختم کر کے نوکری کی تلاش میں نکلی تو اُسے میرا پتا چلا اور آج وہ میرے سامنے بیٹھی تھی۔ اُس نے اپنے باپ کے ایکسیڈنٹ کی جو تاریخ بتائی تھی وہ ٹھیک اُس سے اگلا دن تھا جب میں نے اپنے گلے میں یہ سرخ دھاگا باندھا تھا۔ میں نے مشکوک نظروں سے اُس کے پیچھے صوفے پر اکڑوں بیٹھے اُس شیطان کے چیلے کو دیکھا جس نے اپنے کاندھے اُچکائے اور میرے دل کی جانب اشارہ کیا۔

یہ سچ ہے کہ جب سے سعدیہ مجھ سے بچھڑی تھی تب سے لے کر آج تک میرے دل میں اُس کے ظالم اور امیر باپ کے لیے شدید نفرت بھری ہوئی تھی اور دن میں کئی مرتبہ خیال آنے پر میں اُس کا قتل بھی کرتا تھا لیکن اس کا یہ مطلب تو نہیں تھا کہ وہ اُس بے چاری کی زندگی ہی تباہ کر ڈالے۔ میں نے سعدیہ کو تو فوراً نوکری پر رکھ لیا اور اُس کی نظروں میں پڑا ایک پرانی چاہت کے پھر سے جاگ اُٹھنے کا پیغام بھی پڑھ لیا۔ لیکن اُس کے کمرے سے نکلتے ہی میں چھلاوے پر برس پڑا۔ وہ کچھ دیر اطمینان سے میری کڑوی کسیلی باتیں سنتا رہا، پھر اطمینان سے بولا ”بڑے ناشکرے ہو یار...... کیا یہ بھی تمہارے اپنے دل کی ایک چھپی ہوئی حسرت نہیں تھی کہ وہ ایک بار پھر سے کسی پکے ہوئے پھل کی طرح تمہاری آغوش میں آ گرے...... ساری زندگی اُس کے لیے آہیں بھرتے رہتے۔ وہ ٹھیک تھا، یا یہ بہتر ہے کہ اب وہ چوبیس گھنٹے تمہارے آس پاس رہے گی...... اب بننے کی کوشش مت کرو...... میں نے دیکھا تھا تم کس طرح بھوکی نظروں سے اُس کی طرف دیکھ رہے تھے۔ میں لاجواب سا ہو گیا۔ ”ہاں مگر...... اس طرح...... میرا مطلب ہے اُس کی زندگی برباد کر کے......“ وہ ہنسا ”ایک بات یاد رکھو...... اس دنیا میں تمہاری آبادی تبھی ممکن ہے جب تم دوسروں کی بربادی کی فکر چھوڑ دو...... جاؤ اب اُس کے ساتھ عیش کرو۔“ میں نے غصے سے اُس کی جانب دیکھا ”کیا مطلب ہے تمہارا...... وہ عیش کرنے کی چیز نہیں ہے۔ تم جانتے ہو میں اُس سے سچی محبت کرتا ہوں۔“ وہ پھر زور سے ہنسا ”اُف...... یہ تم انسانوں کے چونچلے، محبت سچی ہو جھوٹی...... تم لوگوں کی ہر محبت کا انجام آخر کار ہوس ہی ہوتا ہے...... تم چاہو تو سچی محبت کے نام پر اپنا مقصد حاصل کر لو...... مجھے کوئی اعتراض نہیں ہے...... ہونا آخر میں وہی ہے جو ہم دونوں ہی جانتے ہیں۔“ میں نے لاجواب ہو کر سر پٹخا۔ اُس کے شیطانی دماغ سے لڑنا میرے بس کی بات نہیں تھی۔ بہر حال کچھ دن کے لیے ہی سہی، لیکن میری زندگی میں ایک خوشگوار تبدیلی آنے لگی تھی...... سعدیہ نے آتے ہی میرے دفتر اور میرے دل کا سارا انظام یوں سنبھالا کہ کچھ پل کے لیے میری اس ویران زندگی میں بھی بہار آ ہی گئی۔ چھلاوے کے ساتھ میرے معاہدے کو چھ مہینے گزر چکے تھے اور ابھی چھ مہینے مزید باقی تھے۔

تیسری رات

اصغر صاحب کی داستان ابھی جاری تھی لیکن ہماری دوسری رات بھی اسی داستان گوئی میں صبح کے سپیدے میں تبدیل ہو رہی تھی۔ مجبوراً ایک بار پھر ہمیں باتوں کا سلسلہ روکنا پڑا۔ میں نماز پڑھنے کے لیے اُٹھ کھڑا ہوا اور اصغر صاحب اپنے کمرے کی جانب بڑھ گئے۔ میں چاہتے ہوئے بھی اُن سے یہ نہیں پوچھ سکا کہ آخر اب اس درگاہ پر اُن کی موجودگی کی وجہ کیا ہے؟ میں جانتا تھا کہ وقت آنے پر یہ راز بھی خود ہی کھل جائے گا اور ہو سکتا ہے کہ وہ وقت آج کی تیسری رات کا ہی ہو۔ کیوں کہ مجھے اصغر صاحب کی داستان اپنے منطقی انجام کی جانب بڑھتی ہوئی دکھائی دے رہی تھی۔ اگر میں خود آج سے چھ ماہ پہلے والا ساحر ہوتا تو میں کبھی بھی اُن کی اس ساری کہانی پر یقین نہ کرتا۔ کیوں کہ اس جدید سائنسی دور میں ایسی منفی غیبی قوتوں کا موجود ہونا از خود ایک بہت بڑا سوال ہے۔ لیکن پھر مجھے یاد آیا کہ سلطان بابا ہمیشہ کہا کرتے تھے کہ دنیا میں ازل سے لے کر ابد تک نیکی اور بدی کی جنگ جاری تھی اور جاری رہے گی۔ اور پھر خود ہمارا نفس بھی تو ایک چھلاوہ ہی ہے۔ ہم سے چھل کرنے والا، ہمیں فریب اور دھوکے میں رکھنے والا۔ کیا ایسا بھی ممکن ہو سکتا ہے کہ خود ہمارا نفس ہمارے سامنے کبھی اسی چھلاوے کی صورت آ کھڑا ہو جاتا ہو جیسے اصغر صاحب والا چھلاوہ اُن کے لیے ہزاروں نفسانی ترغیبات لے کر آ کھڑا ہوا تھا؟

پتا نہیں ایسے اور نہ جانے کتنے سوالات تھے جو میرے ذہن میں ایک عجیب سی اُتھل پتھل مچائے ہوئے تھے۔ اب مجھے دھیرے دھیرے اصغر صاحب کے پُراسرار رویے اور نماز کے وقت اُن کے غائب ہو جانے کی وجہ بھی سمجھ میں آ رہی تھی۔ انہوں نے بتایا تھا کہ چھلاوہ پچھلے سال دسمبر میں اُن پر واضح ہوا تھا اور یہ مہینہ بھی دسمبر کا ہی تھا۔ مطلب یہ کہ ابھی اُن کے معاہدے کے کچھ دن باقی تھے؟؟

اصغر صاحب رات بھر کے جگ راتے کے بعد سوئے ہوئے تھے۔ میں نے دن گیارہ

بجے کے قریب درگاہ کا پانی وغیرہ بھرا اور ابھی میں گھڑوں اور صراحیوں کو انگور کی بیلوں کے نیچے رکھ کر کھڑا ہوا ہی تھا کہ کرم دین اپنی لمبی سی ڈانگ لیے بڑے بڑے ڈگ بھرتا ہوا درگاہ میں داخل ہوا ''سلام عبداللہ باؤ...... بڑی اور چھوٹی مالکن آئی ہیں......'' میں چونکا...... ''بڑی مالکن اور لاریب، یوں اچانک......؟...... خیر تو ہے۔'' لیکن کرم دین کے جواب سے پہلے ہی وہ دونوں بھی درگاہ کے احاطے تک پہنچ چکی تھیں۔ میں نے انہیں سلام کیا اور اُن کے ساتھ ہی کھڑے ہو کر دعا پڑھ لی اور خود کچھ دُور جا کر کھڑا ہو گیا تا کہ وہ اپنے ساتھ لائی ہوئی چادر وغیرہ چڑھا سکیں۔ ان معمولات سے فارغ ہو کر بڑی مالکن میری جانب پلٹیں۔

''بھئی یہ تو بڑی وعدہ خلافی ہوئی۔ تم نے وعدہ کیا تھا کہ حویلی کا چکر ضرور لگاؤ گے۔ لیکن لگتا ہے تمہیں حویلی کے مکینوں سے کچھ خاص لگاؤ نہیں ہے......''

میں کچھ ہڑبڑا سا گیا۔ ''نہیں نہیں...... ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ آپ جانتی ہیں یہاں درگاہ میں میرے علاوہ ایک مریض بھی موجود ہے۔ اُس کی وجہ سے بھی پاؤں کچھ بندھے ہوئے ہیں۔ اور پھر سچ تو یہ ہے کہ مجھے یہاں تنہائی میں بڑا سکون ملتا ہے۔ البتہ مجھے اپنا وعدہ اچھی طرح یاد ہے اور بہت جلد وفا بھی ہو گا۔ بس آپ کسی خاص مدت کی شرط نہ لگائیں۔ یہ میری آپ سے التجا ہے......'' وہ میری لمبی تمہید سن کر مسکرا دیں۔ ''اپنا دفاع کرنا خوب جانتے ہو......'' اتنے میں کرم دین نے انہیں بتایا کہ وہ پرندوں کا دانہ اور چوری تانگے سے اُتروا لایا ہے۔ بڑی مالکن نے اُسے ساری چیزیں صحن میں لانے کا کہا اور میرے سر پر ہاتھ پھیر کر دعا دے کر آگے بڑھ گئیں۔ لاریب جو اُن سے دو قدم پیچھے کھڑی ہماری گفتگو سن رہی تھی، آگے بڑھ آئی۔ میں نے اُس سے پوچھا ''آپ کیسی ہیں......؟...... آگے تعلیم جاری رکھنے کی اجازت ملی، یا نہیں آپ کو......'' وہ مسکرائی ''ابھی مقدمہ جاری ہے، لیکن مجھے اُمید ہے کہ خان جی مان جائیں گے......'' وہ خان صاحب کو خان جی کہتی تھی۔ ''جی مجھے بھی یہی اُمید ہے...... اور سنا ہے کہ آپ کو اپنی بات منوانے کے بہت سے گر بھی آتے ہیں......'' میری بات سن کر وہ زور سے ہنس پڑی۔ وہی کچی زمین سے تازہ جھرنے کے پھوٹنے جیسی آواز...... ''سچ پوچھیں تو آپ سے مل کر ایک نئی تازگی کا احساس ہوا ہے مجھے۔ میں اس سے پہلے مذہب میں اتنی طاقت اور کشش کی قائل نہیں تھی۔ لیکن آپ کو دیکھ کر لگتا ہے کہ ابھی کھوج کرنے والے باقی

ہ'' پھر یکایک وہ سنجیدہ ہو گئی۔ ''مجھے آپ سے بہت سے سوال کرنے ہیں۔ ساحر سے
اللہ تک کے اس سفر کے بارے میں۔ آپ کی امی سے زہرا کے بارے میں بھی بہت کچھ
ہے اور میں اُس خوش نصیب کی ایک جھلک ضرور دیکھنا چاہوں گی جس کے رُخ سے منعکس
دھوپ نے پل بھر میں آپ کی کایا پلٹ دی۔ کیا دنیا میں اب بھی ایسے مقدر والے ہوتے
جو اپنے جلوے میں ایسے معجزے لیے پھرتے ہیں؟ لیکن میرے سارے سوال ہمیشہ تشنہ رہ
تے ہیں۔ کیا آپ کے اندر کا مذہب آپ کو ان سوالوں کے جواب دینے سے روکتا ہے، یا
آپ بھی مرد و عورت کی تقسیم میں پڑے رہتے ہیں......؟''

اُسے الفاظ برتنے کا ہنر خوب آتا تھا۔ تو گویا اُس شوخ ادا اور چنچل ہنسی کے پیچھے ایک
ت حساس ذہن اور گہری سوچ بھی موجود تھی۔ ''نہیں...... میرا مذہب مجھے کسی سوال کے
ب سے نہیں روکتا، نہ ہی میں عورت اور مرد کی کسی تقسیم میں ذہنی طور پر بٹا ہوا ہوں۔ سچ
ا اتنا ہے کہ میں تو ابھی تک خود سراپا سوال ہوں۔ جواب دینے کے لیے جس کاملیت کی
رت ہے میں اُسی سے کوسوں دُور ہوں ابھی۔ اور شاید یہ مختصر زندگی سوالوں میں ہی گزر
ے۔ پھر بھی اگر میرے پاس آپ کے لیے کوئی جواب ہوا تو میں اسے آپ کے ساتھ بانٹنے
خل سے کام نہیں لوں گا۔''

وہ میری بات سن کر کسی چھوٹے بچے کی طرح خوش ہو گئی ''تو پھر میں کب تک توقع
ں اپنے سوال پیش کرنے اور آپ کے جوابات ملنے کی...... یاد رہے کہ آپ نے ابھی خود
ا کے مختصر ہونے کی پابندی بھی بیان کر دی ہے......'' مجھے اُس کی بات سن کر ہنسی آ گئی۔
واقعی...... یہ کلہاڑی تو میں نے خود ہی چند لمحوں پہلے اپنے پیروں پر ماری ہے۔ لہٰذا اب
وقت کا تعین خود ہی کر دیں تو بہتر ہو گا۔ میں حاضر ہوں ہر طرح سے۔'' اُس نے اپنی فتح
لان کر دیا۔ ''تو پھر ٹھیک ہے کل رات کا کھانا آپ ہمارے ساتھ ہی کھائیں گے۔ میں
جی کو بھی آج ہی آپ کی آمد کا بتا دوں گی۔ وہ خود بھی کئی بار آپ کا پوچھ چکے ہیں۔'' میں
ور سے اُس کی جانب دیکھا۔ ''کیا آپ کے سوال اُن کی موجودگی میں اپنے اصل لفظ و
اختیار کر سکیں گے...... اور کیا خود میں اُن کی موجودگی میں آپ کو جواب دینے کے قابل
ـ'' وہ کچھ سوچ میں پڑ گئی۔ ''ہاں...... مجھے آپ کی مجبوری کا اندازہ ہے...... آپ خان جی

کے سامنے بندھے رہیں گے۔ چلیں یہ مسئلہ آپ مجھ پر چھوڑ دیں اور اس بات کا یقین لے
ہمارے گھر آیئے گا کہ میں آپ کو کسی امتحان میں نہیں ڈالوں گی......'' کچھ ہی دیر میں بڑ
مالکن بھی اپنی مصروفیت سے فارغ ہوگئیں اور رُخصت ہونے سے پہلے انہوں نے ایک بار
مجھے یاد دلایا کہ اب وہ اور اُن گھرانے والے مجھے غیروں میں شمار نہیں کرتے۔ لہٰذا میں
اپنے دل و دماغ میں کوئی گرہ باقی نہ رکھوں۔ وہ لاریب کو مجھ سے باتیں کرتا ہوا دیکھ چکی تھ
اس لیے اُس کی جانب دیکھ کر مسکرائیں اور مجھ سے بولیں ''تم نے میرے بلاوے کو تو بڑ
خوب صورتی سے ٹال دیا پر لاریب کی دعوت رد کرو تو جانوں...... اسے بھی تمہاری طر
لفظوں سے کھیلنے کا ہنر خوب آتا ہے۔'' وہ ہنستی ہوئی آگے بڑھ گئیں۔ مطلب انہیں پتا تھا
لاریب مجھے کل رات حویلی مدعو کرے گی؟؟ بہر حال اب تو میں ہاں کہہ چکا تھا، لہٰذا اس مد
پر زیادہ سوچ بچار سے کوئی نتیجہ حاصل نہیں ہوسکتا تھا۔ اِسی بھاگ دوڑ میں شام بھی ہوگئی ا
پھر اصغر صاحب نے بھی مغرب سے ذرا پہلے اپنے ''حجرے'' سے باہر جھانکا۔ مجھے عجیب ۔
چینی سی ہورہی تھی کہ کب میں ان روزمرہ کے معمولات سے فارغ ہوکر اُن کے سامنے جا
بیٹھوں گا اور کب وہ اپنی داستان مکمل کریں گے۔ حیرت ناک بات یہ تھی کہ یہ تیسری رات
رہی تھی جب میں پورے چوبیس گھنٹوں میں صرف دو تین گھنٹوں کی نیند لے پا رہا تھا لیکن پ
بھی تھکاوٹ اور نیند کے کچھ خاص آثار میرے دماغ اور جسم پر طاری نہیں ہو پائے تھے۔ خ
خدا کر کے رات ڈھلی اور عشاء کی نماز کے بعد میں اُن کے سامنے اس بچے کی طرح آ بی
جس کی کہانی پچھلی رات آدھی رہ گئی ہو اور اُس نے پورا دن اِسی رات کی آس میں گزار دیا
کہ آنے والی رات اُسے پھر سے خوابوں کے اُسی پرانے دیس میں لے جائے گی۔ اص
صاحب نے ایک گہری سانس لی اور سلسلۂ داستان پھر سے جوڑا۔

''ہاں تو عبداللہ میاں...... میں تمہیں بتا رہا تھا کہ سعدیہ کے آنے سے زندگی میں ایک
خوش گوار تبدیلی تو آئی لیکن ایک اور عجیب بات بھی میں نے محسوس کی۔ جس سعدیہ کو میں اُس کی
شادی سے پہلے جانتا تھا اور جس کی محبت میری زندگی کا پہلا عشق اور پہلا جنون تھا، جس کے
لیے کبھی میں ماہی بے آب کی طرح تڑپا کرتا تھا، جس کی ایک جھلک دیکھنے کے لیے میں
گھنٹوں کڑی دھوپ میں، برستی بارشوں میں صبح و شام اُس کی کلاس اور گھر کے چکر لگایا کرتا تھا

کے منہ سے باتیں نہیں موتی جھڑتے تھے اور جس کے چند بول سننے کے لیے میری
ں ترستی تھیں، آج بھی اُس کی دل کشی میں کوئی فرق نہیں آیا تھا۔ لیکن نہ جانے کیوں اب
ٹوں بولتی رہتی تھی تب بھی میرے اندر وہ حلاوت نہیں گھول پاتی تھی جو پہلے صرف اُس
منہ سے ''اصغر'' کا لفظ سنتے ہی میری سماعت سے میری رُوح کے آخری ریشے تک گھل
تھی۔ اب وہ زیادہ تر اپنے گزشتہ شوہر اور اُس کی بُری عادتوں کا ذکر کرتی رہتی تھی۔ وہ
کتنا ستاتا تھا۔ وہ اُس کا کتنا خیال رکھتی تھی۔ اُس نے اپنے شوہر کی خاطر کتنی قربانیاں دیں
وہ کس قدر بے وفا نکلا، وغیرہ وغیرہ۔ نہ جانے اُس کی ساری خوب صورت باتیں کہاں کھو
تھیں۔ وہ میر کی رباعی، وہ خیام کی غزل، وہ تصورِ جاناں کی باتیں...... وہ گرتی پھوار اور
جھم جیسی بوندوں والی باتیں۔ جانے یہ عورتوں کو گزرتی عمر کے ساتھ ساتھ کیسی کیسی نفسیاتی
ں گھیر لیتی تھیں کہ اُن کے اندر صرف ایک عورت ہی باقی رہ جاتی ہے...... محبوبہ نہ جانے
کھو جاتی ہے۔ سعدیہ کے اندر سے بھی میری وہ دل بر، وہ لیلیٰ نہ جانے کہاں چلی گئی تھی
رف سعدیہ کا جسم ہی باقی چھوڑ گئی تھی۔ تب مجھے ایک اور بھی عجیب سا ادراک ہوا کہ وقت
نے کے ساتھ ساتھ ہماری محبت کے تقاضے بھی بدلتے جاتے ہیں۔ اور یہ کہ انسان ایک
جس چاہت کو برسوں پہلے کھو چکا ہو، اگر قدرت خوش نصیبی سے اُسے زندگی میں دوبارہ
پانے کا موقع فراہم بھی کرے تو عقل مند وہی ہے جو اس محبت کو بس دُور ہی سے سلام
کے آگے بڑھ جائے، کیوں کہ ہوسکتا ہے وہ حال میں اپنی محبت پانے کے چکر میں اپنی
کی چاہت، اپنا جنوں بھی گنوا دے۔ وہ ایک احساس بھی کھو دے جس کے بھروسے اور
کے سہارے وہ آج تک جیتا آیا ہو۔ میرے ساتھ بھی شاید کچھ ایسا ہی ماجرا چل رہا تھا۔
بھی تو میں یہ بھی سوچنے لگتا کہ اگر سعدیہ اُس وقت مجھے مل بھی گئی ہوتی تو شاید آج ۲۵
بعد وہ ایسی ہی ہوتی۔ لیکن تب شاید میں اُس کے ساتھ زندگی اور وقت گزارنے کی وجہ
اُس کی ان جان لیوا تبدیلیوں کو محسوس نہ کر پاتا جو اس لمبی جُدائی کی وجہ سے میں اب
ں کر سکتا تھا۔ ہوسکتا ہے خود میرے اندر بھی کئی ایسی تبدیلیاں آگئی ہوں جیسی میں سعدیہ
اندر محسوس کر رہا تھا؟ گویا محبت وہی اچھی جو وقت پر حاصل ہو جائے۔ شاید محبت کے
ملے میں ''دیر آید درست آید'' والا مقولہ درست نہیں تھا۔ پتا نہیں مجھے ایسا کیوں لگنے لگا تھا

کہ آخری محبت وہی رہتی ہے جو لاحاصل ہو۔ جو حاصل ہو جائے وہ محبت تو ہو سکتی ہے، آخر محبت نہیں۔ میرے اندر سے رفتہ رفتہ وہ جنوں، وہ تڑپ اور کسک ختم ہوتی جا رہی تھی جو کسی بھی محبت نامی جذبے کا حاصل ہوتی ہے۔ کیا وہ سبھی جوڑے جنہیں اپنی محبت مل جاتی ہے وہ بھی اِسی تجربے سے گزرتے ہوں گے جس سے میں اِن دنوں گزر رہا تھا؟ کیا محبت دھیرے دھیرے یوں چیخ کر ٹوٹ بھی جاتی ہے جیسے خشک اور کمزور شاخیں......؟

لیکن وہ میری محبت کو یوں چٹختے اور تڑختے ہوئے دیکھ کر خوب قہقہے لگاتا اور مجھے طعنے دیتا کہ ’’کیوں...... میں نہ کہتا تھا کہ تم انسان کہیں ٹک کر نہیں بیٹھ سکتے...... نہ تمہارے جذبے لافانی ہیں اور نہ تمہارا پیار...... نہ تمہاری محبت سچی ہے نہ تم لوگوں کو آج تک نفرت کرنے کا صحیح ڈھنگ آیا...... تم انسان صرف اور صرف جذباتی پتلے ہو...... بس جس طرف کی ہوا دیکھی اُسی طرف کے ہو لیے...... تمہاری ہر محبت ہوس کا نتیجہ ہے اور تمہاری ہر نفرت تمہاری ذاتی انا کی شاخسانہ ہوتی ہے۔‘‘ ایک دن وہ میری آفس کی الماری پر بیٹھا مجھے اِسی طرح کے طنز کے تیروں سے چھلنی کر رہا تھا کہ میں بھی آخر کار بھڑک اُٹھا ’’تم ہمیشہ ہم انسانوں کی غلطیاں گنواتے رہتے ہو...... ہمیں اس کائنات کی ارزاں ترین مخلوق ثابت کرنے کی کوشش میں لگے رہتے ہو...... کبھی اپنے دامن میں بھی جھانک کر دیکھا ہے......؟ تمہارے جدامجد کی ایک غلطی نے آسمان سے زمین پر لا پھینکا تمہیں...... اور اب ابد تک تمہارا کام صرف مجھ جیسوں کو شکار بنانا ہے...... لیکن اگر میں نے تمہاری دوستی قبول کی ہے تو اس کا یہ مطلب نہیں کہ باقی سارے کے سارے ہی مجھ جتنے کمزور اور لاعقیدہ ہیں۔ ہم میں کچھ ایسے بھی ہیں جن پر تمہارا جادو ذرا سا بھی نہیں چل پاتا۔‘‘

میری بات سنتے ہی وہ غصے سے آگ بگولا ہو گیا۔

’’غلط فہمی ہے تمہاری...... تمہاری اس لاغر اور بے ایمان مخلوق میں کوئی بھی ایسا نہیں جس پر میرا سحر نہ چل پائے...... تم سب موم کی وہ ناک ہو جسے میں جب چاہوں موڑ کر رکھ دوں...... مجھے کبھی آزمانے کی بے وقوفی مت کرنا...... ہار جاؤ گے......‘‘

مجھے بھی غصہ آ گیا ’’نہیں...... غلط فہمی مجھے نہیں...... تمہیں ہے...... تم کیا سمجھتے ہو کہ دولت کے انبار لگا کر اور ہم جیسوں کو عیش و عشرت میں ڈال کر تم نے پوری بازی جیت لی

ہے...... نہیں...... کچھ لوگوں کی منزل یہ دولت، یہ عیش نہیں...... کچھ اور ہے......‘‘

اُس نے غصے میں میری میز پر پڑی سب ہی چیزیں اُلٹ دیں ’’دولت......؟...... عیش و عشرت......؟ تم کم ظرفوں کی تان ہمیشہ انہی دو چیزوں پر آ کر کیوں ٹوٹتی ہے؟ اور تم انسان جانتے کیا ہو دولت اور عیش کے بارے میں......؟...... کہاں آتا ہے تم لوگوں کو دولت کو برتنا اور عیش کرنا......؟...... تم لوگوں کو جب بھی ذرا مال میسر آیا تو کیا کیا؟...... دو چار جام لنڈھا کر اُلٹے پڑ گئے، یا پھر چار بازیاں کھیل لیں اور اپنی پسند کا کوئی ایک جسم منتخب کر کے رات بیتا دی۔ کیا ہے تم لوگوں کی عیاشی، شراب، جوا اور عورت...... بس......؟ یہی عیاشی ہے تم لوگوں کے نزدیک......‘‘

آج تک اُس نے مجھے خوب زخم لگائے تھے۔ اپنے طنز کے تیروں سے مجھے خوب چھلنی کیا تھا لیکن آج جب میں نے اُسے اپنی ایک ضرب سے یوں تڑپتے ہوئے دیکھا تو مجھے بہت مزہ آیا۔ وہ مسلسل چیخ رہا تھا۔ ’’تم لوگوں نے تو اپنی جنت کا تصور بھی انہی چند آسائشوں سے وابستہ کر رکھا ہے۔ شراب، عورت، ہیرے، موتی اور جواہر...... کم ظرف کہیں کے...... پھر بھی تم لوگ خود کو جنت کا حق دار سمجھتے ہو...... اور تم لوگوں میں سے کچھ دوغلے وہاں یہ سب کچھ پانے کے لیے چند دن یہاں کی زندگی میں ان چیزوں سے دُور بھاگتے رہتے ہیں۔ مجھے یہ بتاؤ کہ یہ چیزیں یہاں میسر ہوں، یا وہاں...... مقصد تو ایک ہی ہوا نا...... پھر یہ نیک اور زاہد بننے کا ڈرامہ کیسا......؟...... اور یہ جو تمہارے اندر کچھ لوگ برائے نام اپنے رب کی اطاعت کا ڈھکوسلا کرتے رہتے ہیں، انہوں نے اپنے رب کو جانا ہی کب ہے......؟...... تم سب کسی ایک کی رحمت کے صدقے جی رہے ہو...... دنیا بھی پا رہے ہو اور دین کے ٹھیکے دار بھی بنے پھرتے ہو...... پتا نہیں خدا نے کیا سوچ کر تم جیسے تھڑدلوں کو اس دنیا کی خلافت سونپ دی۔ جب کہ سچ تو یہ ہے کہ انسان جیسا کم ہمت، بزدل، احسان فراموش، جھوٹا، دھوکے باز، مکار اور فریبی اس پوری کائنات میں، اس روئے زمین پر اور کوئی نہیں ہے......‘‘

میں نے اُس کی چبھن سے لطف لیتے ہوئے کہا ’’بولتے رہو...... تمہیں یوں ’حقیر انسانوں‘ کی طرح تڑپتے اور گلے شکوے کرتے دیکھ کر مجھے بہت اچھا لگ رہا ہے......‘‘ اُس نے چونک کر میری جانب دیکھا اور پھر سمجھ گیا کہ آج میں اُس کے ساتھ کھیل رہا ہوں۔ وہ جھلا

سا گیا۔ ”لعنت ہو تم پر...... واقعی تم انسان بڑے چالباز ہوتے ہو، آج تم نے مجھے بھی اپنے رنگ میں رنگ لیا۔ چلو آج میں تمہیں اصل عیاشی کی ایک ہلکی سی جھلک دکھلاتا ہوں۔ کیا یاد کرو گے کبھی زندگی میں ایک اصل دوست سے بھی واسطہ پڑا تھا تمہارا......“

میں نے حیرت سے اُس کی جانب دیکھا۔ ”اصل عیاشی...... میں کچھ سمجھا نہیں......؟“

اُس نے طنز سے میری طرف دیکھا۔ ”ہاں...... ایسی عیاشی جو تم جیسوں کے خواب و خیال میں بھی نہ ہوگی۔ تم لوگ عورت کو ہی دنیا کی سب سے ناقابلِ حصول مخلوق سمجھتے ہو نا...... اور عمر بھر اُسی کے حصول کے لیے بے ایمانیاں کرتے اور ایک دوسرے کا گلا کاٹتے رہتے ہو...... اور بدلے میں پاتے کیا ہو...... صرف ایک آدھ جسم...... اور پھر اُس سے بھی دو چار سال کے اندر اُوب جاتے ہو...... ساری محبت، سارا عشق خشک مٹی کی طرح جھڑ جاتا ہے اور پھر باقی ساری عمر دوسری عورتوں کو دیکھ دیکھ کر ہونٹوں پر زبان پھیرتے رہتے ہو...... کبھی کسی فلم ایکٹریس پر فدا ہوتے ہو اور کبھی کسی ماڈل کے تصور میں ہی زندگی گزار دیتے ہو۔ آج میں تمہیں ایک موقع دے رہا ہوں۔ تمہیں آج تک زندگی میں ایسی جتنی عورتیں یاد ہیں جن کو تم کبھی بھی حاصل کرنا چاہتے تھے اُن سب کی اپنے ذہن میں ایک فہرست بنا لو۔ اگلے چند گھنٹوں میں تم اُن سب کے ساتھ کچھ وقت گزارو گے۔ چاہے وہ ملک، یا دنیا کے کسی بھی کونے میں رہتی ہو...... کہیں کی بھی فلم اسٹار ہو، ماڈل ہو، کتنی ہی مشہور اور ناقابلِ حصول کیوں نہ ہو...... یا پھر چاہے کتنے ہی ہزار پردوں میں کیوں نہ چھپی بیٹھی ہو۔ آج وہ تمہاری دسترس میں ہوگی......“ میں اُس کی بات سن کر کچھ جھینپ سا گیا۔ ”یہ تم کیا کہہ رہے ہو۔ میرا مطلب ہے میں شادی شدہ اور بیٹیوں کا باپ ہوں...... اب ایسی حرکتیں مجھے زیب نہیں دیتیں۔“ اُس نے میری بات سن کر اپنا سر پیٹ لیا۔ ”اُف یہ انسان...... چاہے دل میں لڈو ہی کیوں نہ پھوٹ رہے ہوں...... ہونٹوں پر تصنع اور بناوٹ کا انکار ہی رہتا ہے...... اچھا چلو تمہارے اطمینان کے لیے یہ بتا دوں کہ ہوگی اصل میں تمہاری بیوی ہی...... یعنی ذہنی طور پر تم کسی بھی عورت کو برتو...... جسمانی طور پر وہ ہوگی تمہاری اپنی ہی عورت...... لہٰذا اب خواہ مخواہ اپنے ضمیر نامی اس فضول احساس کو تکلیف دینے کی ضرورت نہیں، جو تمہیں گناہ سے روک تو نہیں پاتا، ہاں البتہ اس کا مزہ ضرور کرکرا کر دیتا ہے...... لہٰذا مزہ کرکرا کرنے کی ضرورت نہیں۔ اپنے ذہن کو آزاد چھوڑ دو تاکہ

میری گرفت اس پر مضبوط تر ہو سکے اور اپنے گھر چلو...... میں ایسے تماشے ہر کسی کو نہیں دکھاتا......“

میں اسی شش و پنج میں گاڑی میں بیٹھا اپنے گھر کی جانب روانہ تھا۔ میں نے ایسی عورتوں کی اپنے ذہن میں فہرست بنانے کی کوشش کی جو زندگی کے کسی بھی دور میں کسی بھی طرح میرے لیے باعثِ کشش رہی ہوں لیکن اس مقام پر بھی مجھے چھلاوے کے سامنے شرمندگی ہی اُٹھانی پڑی۔ اُس دن خود مجھ پر بھی انکشاف ہوا کہ میں نے آج تک کسی قدر بے رنگ زندگی گزاری تھی۔ سوائے ایک آدھ فلم ایکٹریس کے مجھے اور کوئی عورت یاد ہی نہ آئی اور اس شیطان کے چیلے نے میری ”بے ذوقی“ پر اپنا سر پیٹ لیا۔ اِسی خجالت میں میں نے گھر میں قدم رکھا تو استقبال کرنے والی پہلی وہی فلم ایکٹریس تھی۔ میں پوری طرح ہوشیار ہونے کے باوجود اُسے اتنے اپنے قریب پا کر حیرت کے جھٹکے سے گرتے گرتے بچا۔ پھر جب اُس نے میرا ہاتھ تھاما اور میری خواب گاہ کا دروازہ بند کر کے پلٹی تو وہ سعدیہ تھی اور پھر جس نے مجھے پہلا جام پیش کیا وہ میری سہاگ رات والی میری بیوی تھی۔ لیکن جس نے میری ٹائی کھولی اور کوٹ اُتار کر کھونٹی پر ٹانگا وہ شبانہ تھی۔ پھر جس نے پیار سے میرے بال سہلائے اور میرا سر اپنی گود میں رکھا وہ مشہور ماڈل تھی جس کے بل بورڈز میں ہمیشہ پہلے دفتر سے واپسی پر بس کی کھڑکی سے دیکھا کرتا تھا۔ پھر جس نے میرا لباس تبدیل کروایا وہ کوئی اور تھی اور جس نے خواب گاہ کی بتیاں مدھم کیں وہ کوئی اور...... یوں وہ رات میری زندگی کی ایسی رات تھی جب خود مجھے بھی زندگی میں پہلی مرتبہ اپنے دل میں دبی اور چھپی ہوئی بے شمار اور بے پناہ چاہتوں کے بارے میں پتا چلا...... کیسی رنگین اور کتنی سنگین رات تھی وہ......

اور پھر مجھے ایک اور حقیقت کا ادراک بھی انہی دنوں ہوا کہ عیاشی صرف ہمارے ذہن کی ایک اختراع ہے۔ ہمارے جسم کے اندر اُمڈتے مختلف ہارمون اور ان مادوں کی کارستانی ہے جنہیں ہمارا ذہن کنٹرول کرتا ہے۔ گویا ہم اپنے ذہن پر قابو پانا سیکھ لیں تو ہر عیاشی خود ہمارے در کی دربان بن سکتی ہے۔ شرابی کو جام کا نشہ، جواری کو اپنی بازی کی لت اور عورت کی تلاش میں بھٹکنے والوں کے لیے جسم کی لذت کا سرور...... یہ سارا کھیل ہی ذہن کا ہوتا ہے اور اگر ذہن یک سو نہ ہو تو ان سب کی عیاشیوں کی انتہا بھی اُسے ایک ذرہ برابر بھی لذت نہیں دے سکتی۔

لیکن عبداللہ میاں...... اس انسانی فطرت کا کیا کریں...... کہ ہر چیز کی زیادتی اور اس کا آسان حصول ہی ہمارے دل کو اس نعمت سے اُچاٹ کرنے کا باعث بن جاتی ہے۔ سو میں بھی اُوبنے لگا اور پھر انہی دنوں ایک اور مصیبت طوفان کی طرح میرے گھر میں داخل ہوئی اور اس کے در و دیوار کو لرزا گئی۔ میری چھوٹی بیٹی عظمٰی نے ضد کر کے اُسی لوفر سے شادی کر لی اور میرا داماد میرے بڑے بیٹے کے ساتھ اُن کے کاروبار میں شریک بن گیا۔ دونوں مل کر زمین کی خرید و فروخت کا دھندا کرنے لگے اور پھر اُن کی نظر شہر کے سب سے اہم مرکز میں ایک قیمتی پلاٹ پر پڑ گئی۔ انہوں نے اپنی ہر ممکن اور سر توڑ کوشش کر لی لیکن اس پلاٹ کا مالک اپنی زمین بیچنے پر راضی نہ ہوا۔ دراصل اُسے دولت کی کوئی کمی نہیں تھی اور وہ اُس زمین پر بچوں کے لیے پارک بنانا چاہتا تھا لیکن اِن دولت کے پجاریوں کو یہ کہاں قبول تھا کہ وہ سونے جیسی زمین کسی پارک کی تعمیر کے لیے چھوڑ کر ضائع کر دی جائے۔ سو میرے بیٹے اور داماد دونوں نے اس پلاٹ کے مالک سے آخری بار بات کرنے کا فیصلہ کیا اور اُس کے گھر پہنچ گئے۔ کافی بحث و تمحیص کے بعد بھی وہ شخص اپنی بات پر اڑا رہا۔ بحث گرما گرمی میں تبدیل ہو گئی اور میرے داماد نے مشتعل ہو کر اپنے کوٹ کی جیب سے پسٹل نکالا اور چھ کی چھ گولیاں اُس بے گناہ کے سینے میں داغ دیں۔ مالک زمین وہیں ٹھنڈا ہو گیا اور میرا داماد اور میرا بیٹا دونوں فرار ہو گئے لیکن کب تک چھپتے؟ مقتول کے ورثا بھی بہت اثر و رسوخ والے تھے اور انہوں نے عدالت سے میرے داماد اور بیٹے کو پھانسی پر لٹکانے کا فیصلہ لے کر ہی دم لیا۔ میری بیوی یہ سنتے ہی ایسی بستر پر گری کہ پھر فالج کے اثر سے نکل ہی نہیں پائی۔ میرا سارا گھر یوں بکھر گیا کہ پھر کبھی سمٹ نہ پایا۔ میں نے پھر اپنے اُسی دوست کی طرف مدد کے لیے دیکھا جو شاید کہیں نہ کہیں خود ہی میری اس ساری بربادی کا ذمہ دار تھا۔ تب اُس نے یہ کہہ کر میرے ہوش اُڑا دیئے کہ وہ اپنی سی ایک کوشش تو کر دیکھے گا لیکن اگر میرے بیٹے اور داماد کی سانسیں اس دنیا میں اتنی ہی لکھی ہیں تو پھر وہ بھی کچھ نہیں کر پائے گا کیوں کہ وہ کسی کی جان قبل از وقت لے تو سکتا ہے لیکن کسی کی سانسیں بڑھا نہیں سکتا۔ کیوں کہ کچھ چیزیں قدرت نے صرف اپنے اختیار میں ہی رکھی ہیں۔ میں اُس پر بہت برسا کہ اُس نے پہلے مجھے یہ سب کیوں نہیں بتایا، لیکن اب کیا ہو سکتا تھا۔ آخر کار وہ دن بھی آ پہنچا جب بیٹے اور داماد دونوں کی لاشیں وصول کرنے کے لیے

میں سنٹرل جیل کے باہر کھڑا تھا۔ میں نیم پاگل ہو چکا تھا اور میرے گھر میں موت کا وہ ماتم اور سناٹا چھایا کہ پھر ہم میں سے کوئی بھی مسکرا نہ سکا۔ بڑی بیٹی نے چند دن صبر کیا اور پھر وہ بھی اپنے کسی بوائے فرینڈ کے ساتھ نہ جانے کہاں نکل گئی۔ میری دولت میں جس تیزی سے اضافہ ہو رہا تھا اس سے کہیں تیزی سے میں اپنے سارے رشتے ایک ایک کر کے کھوتا گیا۔ مجھے اس دولت، اس عیش و عشرت کی زندگی اور خود اپنے وجود سے نفرت سی ہو گئی۔ مجھے چھلاوے کی شکل بھی اب ایک آنکھ بھی نہیں بھاتی تھی لیکن میں اس معاہدے کی وجہ سے معذور تھا اور پھر آخر کار اُس نے بھی اپنا رنگ دکھانا شروع کر دیا۔ اب وہ ہر وقت مجھ سے اُکھڑا اُکھڑا سا رہتا تھا کہ ہمارا معاہدہ ختم ہونے میں صرف دو ماہ ہی باقی رہ گئے ہیں لیکن میں نے اب تک ایک بھی ڈھنگ کا کام نہیں کیا اُس کے لیے۔ لہٰذا اب یا تو میں معاہدے میں ایک سال کی توسیع کر لوں، یا پھر اس کا کم از کم ایک بڑا کام ضرور سرانجام دوں۔ میں نے اُس کو صاف بتا دیا کہ میں اب اس معاہدے سے بیزار ہو چکا ہوں لہٰذا وہ اپنا کام بتائے تاکہ میں اُسے انجام دے کر اس دھاگے کو کاٹ دوں اور عمر بھر کے لیے اس عذاب سے اپنی گلو خلاصی کر لوں۔ اُس نے پھر مجھے احسان فراموش ہونے کا طعنہ دیا لیکن میں اپنی ضد پر اڑا رہا۔ آخر کار اُس نے وہ کام مجھے بتا دیا اور مجھے اس درگاہ پر وہ عمل سرانجام دینے کے لیے بھیج دیا جس کے بعد میں ہمیشہ کے لیے آزاد ہو جاؤں گا۔ تب سے لے کر میں اب تک یہیں اس درگاہ پر پڑا ہوں۔ دیکھو کہ اب کب مجھے اُس کی جانب سے آخری حکم ملتا ہے اور کب میری آزادی کا پروانہ میرے ہاتھ میں آتا ہے۔ ویسے بھی میری آزادی میں اب صرف ۲۹ دن ہی باقی رہ گئے ہیں۔"

اصغر صاحب نے اپنی داستان ختم کر کے اس طرح ایک لمبا سا سانس لیا جیسے اُن کے دل پر رکھا منوں بوجھ اُتر گیا ہو۔ صبح کی سپیدی کے آثار نظر آ رہے تھے اور دُور نیچے گاؤں کی مسجد سے صبح کی اذان کی گونج سنائی دے رہی تھی۔ میں نے بے چینی سے پہلو بدل کر اصغر صاحب سے پوچھا "لیکن وہ آخری حکم کیا ہے جس کے لیے آپ کو اس درگاہ میں بھیجا گیا ہے...... آپ کو کیا کرنا ہے یہاں......؟......"

"قتل......" اصغر صاحب نے دُور خلا میں گھورتے ہوئے کہا "مجھے یہاں ایک قتل کرنے کے لیے بھیجا گیا ہے......"

معصوم قاتل

اصغر صاحب کی بات سن کر میں اُچھل پڑا۔ ''قتل...... لیکن کس کا......؟'' انہوں نے لمبی سی سانس بھری ''یہ تو میں بھی نہیں جانتا۔ اُس نے کہا ہے کہ وقت آنے پر مجھے خود پتا چل جائے گا۔ تمہیں میں نے اپنی ساری کہانی من وعن اس لیے سنا دی ہے کہ اس دنیا میں صرف تم ہی وہ واحد شخص ہو جس نے میرے علاوہ اس چھلاوے کا کوئی روپ دیکھا ہے......'' یہ پے در پے حیرت کا دوسرا جان لیوا جھٹکا تھا میرے لیے...... ''میں نے چھلاوے کو دیکھا ہے؟...... کب......؟ کہاں......؟......'' میں نے انہیں جھنجھوڑ ہی تو ڈالا......

''جس شخص کو پہلے تم نے ٹرین میں اور پھر یہاں درگاہ کی چار دیواری کے باہر اندھیرے میں میرے ساتھ کھڑے دیکھا تھا وہی چھلاوہ ہے...... آج کل وہ مجھ سے اِسی روپ میں ملتا ہے...... اُسے اس قسم کی شعبدہ بازیاں کرنے میں بہت مزہ آتا ہے...... کچھ دن تک تو وہ خود میرے ہی دفتر میں چائے والا بن کر بھی آتا رہا، کبھی بس کنڈکٹر، کبھی میرا شوفر، کبھی کوئی دلال، کبھی کوئی سادھو...... جانے کس کس روپ میں وہ میری راہ کاٹتا رہا ہے۔''

اصغر صاحب کی بات سن کر میں سن سا رہ گیا۔ تبھی وہ پارے جیسی صفت رکھنے والا شخص مجھے اس قدر بے چین کر گیا تھا کہ میں کئی راتوں تک ٹھیک سے سو بھی نہیں پایا۔ یا خدا...... یہ کیسی دنیا تھی، کیسے اسرار تھے۔ ابھی یاقوط کا فسوں ختم بھی نہیں ہونے پایا تھا کہ یہ چھلاوہ میرے کالے نصیب کی تاریکی بڑھانے کے لیے چلا آیا تھا۔ اور پھر وہ آخر کس کے قتل کا حکم دے گا اصغر صاحب کو؟ اِسی اُدھیڑ بن میں سارا دن گزر گیا اور شام سر پر آ گئی۔ مغرب کے فوراً بعد نیچے گھاٹی میں بشیرے کے تانگے کا مخصوص بھونپو بجا۔ وہ ٹھیک وقت پر مجھے لینے کے لیے آ پہنچا تھا۔ میں حویلی پہنچا تو خان صاحب نے بیرونی ڈیوڑھی کے باہر ہی میرا استقبال کیا اور بڑی محبت سے مجھے اندر والے دیوان خانے میں لے گئے جہاں میں نے پہلی مرتبہ مما پپا کو بیٹھے دیکھا تھا۔ وہاں پہلے سے بڑی مالکن اور لاریب موجود تھیں۔ گویا خان صاحب نے

صرف زبانی طور پر ہی مجھے گھر کا فرد اور اپنا بیٹا نہیں کہا تھا بلکہ آج انہوں نے یوں مجھے اپنی حویلی کے زنانے میں بلوا کر اور یہ عزت دے کر عملی طور پر بھی یہ ثابت کر دیا تھا۔ بڑی مالکن اور لاریب نے ویسے تو پہلے بھی کبھی مجھ سے پردہ نہیں کیا تھا لیکن آج میں ایک مہمان کی حیثیت سے اُن کے گھر کی خواتین کے درمیان موجود تھا جو ان علاقوں میں بہت بڑی عزت اور بڑے مان کی بات سمجھی جاتی تھی۔ لیکن مجھے بہت جھجک محسوس ہو رہی تھی۔ یہ عزت اور یہ مان بھی تو انسان کو کہیں نہ کہیں باندھ کر رکھ دیتا ہے، اُسے بے بس کر دیتا ہے۔ کہتے ہیں سانپ کے زہر سے زیادہ اثر دار اور زہریلا نمک کا زہر ہوتا ہے۔ سانپ کا زہر تو پھر بھی کبھی نہ کبھی اپنا اثر کھو ہی بیٹھتا ہے لیکن کسی کے کھائے ہوئے نمک کے زہر کا اثر ظرف والوں کے خون سے کبھی بھی ختم نہیں ہوتا ہے۔ شاید خان صاحب کے اندر بھی کوئی ایسا ہی بھرم تھا میری ذات کے لیے...... میرے ظرف کے بارے میں...... تبھی انہوں نے آج مجھے یہ مان دیا تھا۔ کچھ دیر اِدھر اُدھر کی باتیں ہوتی رہیں اور پھر لاریب اور بڑی مالکن کھانے کا انتظام کرنے کے لیے اُٹھ گئیں۔ خان صاحب کی گفتگو جاری رہی۔ وہ مما اور پپا سے بہت متاثر ہوئے تھے۔ خاص طور پر مما جنہوں نے مجھے اس راستے پر چلنے کی اجازت دی تھی اور پپا کی سادگی نے تو اُن کا دل ہی موہ لیا تھا کہ اتنا بڑا صنعت کار ہونے کے باوجود اُن میں دکھاوا اور خود پسندی نام کو بھی نہیں تھی۔

اتنے میں لاریب نے آ کر بتایا کہ کھانا لگ گیا ہے اندر زنانے میں ایک آدھ خادمہ کے علاوہ اور کوئی لاریب اور بڑی مالکن کی مدد کے لیے موجود نہیں تھا، یا پھر بڑی مالکن نے خصوصی طور پر مجھے اپنا سمجھتے ہوئے کسی نوکر کو کھانے کی میز کے گرد نہیں آنے دیا اور خود اپنے ہاتھوں سے میرے لیے نہ صرف کھانا پروسا بلکہ ہر چیز ضد کر کے بلکہ حکم دے کر مجھے چکھائی بھی۔ سبھی کچھ بہت اچھا بنا ہوا تھا۔ آدھی سے زیادہ چیزیں لاریب کے ہاتھ کی بنی ہوئی تھیں اور پورے کھانے کے دوران اُسے یہی فکر کھائے رہی کہ کوئی چیز بدذائقہ، یا بُری تو نہیں بنی۔ جب بھی میں کوئی نیا خوان چکھتا وہ تب تک میرے چہرے کے تاثرات کا جائزہ لیتی رہتی جب تک میں وہ لقمہ نگل نہیں لیتا تھا۔ اُس کی اس ''پہرے داری'' پر مجھے ہنسی آ گئی اور آخرکار مجھے اُسے کہنا پڑا ''آپ یقین کریں آپ کے ہاتھ کی بنی ہوئی تمام چیزیں معیار سے کہیں بڑھ کر

اور نہایت لذیذ ہیں۔ لیکن اگر آپ اِسی طرح میرے چہرے پر ہرنئی ڈش کا ذائقہ تلاش کرتی رہیں تو مجھ سے بالکل نہیں کھایا جائے گا۔" میری بات سن کر سبھی ہنس پڑے۔ خان صاحب نے مسکراتے ہوئے کہا "یہ جب بھی کوئی نیا تجربہ کرتی ہے، اس کا انداز میرے ساتھ بھی کچھ ایسا ہی ہوتا ہے۔ بھئی میں تو اِسے کہہ دیتا ہوں کہ یہ تو زبردستی تعریف کروانے کا طریقہ ہے۔" یوں ہی ہنستے مسکراتے کھانا ختم ہوا اور پھر ہم نے بڑے کمرے میں بیٹھ کر کشمیری چائے بھی پی لی۔ میں نے خان صاحب سے اجازت چاہی تو لاریب نے جو بڑے کمرے میں ہی چائے کے برتن سمیٹ رہی تھی بڑے اعتماد سے مجھ سے جاتے جاتے کہا "ابھی رُکیے..... میرے سوال ابھی باقی ہیں....." میں نے چونک کر لاریب کی جانب دیکھا کیا خان صاحب اور بڑی مالکن سے اُس نے پہلے ہی اجازت لے رکھی ہے؟ خان صاحب میری اندرونی کش مکش کو شاید میرے چہرے سے بھانپ چکے تھے وہ اُٹھتے ہوئے بولے "لاریب تم سے کچھ پوچھنا چاہتی ہے عبداللہ میاں.....لیکن ضروری نہیں کہ تم اس کے ہر سوال کا جواب دینا چاہو....." مجھے اُس نے بتایا کہ تمہاری روایتی جھجک شاید تمہیں میرے سامنے کھل کر بات کرنے سے روکے.....تم اطمینان سے بات کرو۔ میں ذرا اپنا حقہ تازہ کروا آؤں اور زیادہ گھبرانے کی ضرورت نہیں..... اِس کے تابڑ توڑ سوالوں کی بوچھاڑ سے بچانے کے لیے اِس کی ماں تمہاری مدد کے لیے یہیں موجود ہے....." وہ مسکراتے ہوئے چلے گئے۔ اور میرے دل سے جیسے ایک بہت بڑا بوجھ سا ہٹ گیا۔ لاریب نے خان صاحب اور اپنی ماں کو اعتماد میں لے کر مجھے ایک بہت بڑے امتحان سے بچا لیا تھا۔ میں جانتا تھا اس شیشے کی بنی ہوئی لڑکی کا من کانچ سے بھی زیادہ صاف اور آئینے کی طرح شفاف تھا لیکن داغ ہمیشہ ایسے ہی کورے کانچ پر جلدی لگتا ہے۔ اور میں خان صاحب، یا بڑی مالکن کے کورے من پر اپنی جانب سے ذرا سی بھی کھرونچ برداشت نہیں کر سکتا تھا۔ یہ بہت مختلف اور بہت اعلیٰ انسانوں سے برتنے کا معاملہ تھا اور میں انہیں اُن کے معیار جیسا ہی برتنا چاہتا تھا۔

لاریب جلد ہی چائے کے برتن رکھوا کر خادمہ کے ہاتھ خشک میوے کی پراتیں اُٹھائے چلی آئی۔ تب تک بڑی مالکن مجھ سے میری تعلیم اور دیگر مشاغل کے بارے میں پوچھتی رہیں۔ انہوں نے اپنے بارے میں بھی مجھے بتایا کہ اُنہیں انٹر تک شاعری سے کافی لگاؤ پیدا ہو

ا تھا اور اب بھی کبھی کبھار وہ اپنی بیاض میں کچھ لکھ لیتی ہیں۔ لاریب نے خادمہ کو پراتیں ہ کر جائے کا کہا اور پھر وہ بھی بڑی مالکن کے ساتھ ہی سامنے والے صوفے پر براجمان ہو ئی۔ "ہاں تو اب سب سے پہلے یہ بتائیں کہ میں آپ کو ساحر کے نام سے پکاروں، یا عبداللہ ہہ کر..... ویسے کیا یہ نام بدلنے کی رسم ادا کرنا ضروری تھا...... مذہب کی، یا ایسی کسی اور راہ پر لنے کے لیے اپنی شناخت بدلنا ضروری ہے کیا؟" میرا امتحان شروع ہو چکا تھا۔ ممتحن نے پہلا ال پوچھ کر جواب کے انتظار میں اپنی آنکھیں مجھ پر گاڑھ دیں۔ "آپ مجھے ساحر کے نام ے بھی پکار سکتی ہیں۔ نام صرف شناخت کا ذریعہ ہی تو ہوتے ہیں۔ یہ اب پکارنے والے پر صر ہے کہ اُسے کس نام کی شناخت پسند ہے۔ اور رہی بات نام بدلنے کی رسم کی تو شاید جس ت میں اپنے کسی اور جنون میں اپنا گھر چھوڑ کر اس درگاہ پر بسیرا کرنے کے لیے آیا تھا تب ری گزشتہ شناخت مجھ پر شدید طاری اور زیادہ حاوی تھی ایسے میں مجھے اس نئے ماحول سے ڑنے کے لیے مجھے ایسی ہی کسی نئی شناخت کی ضرورت تھی اور ایسے میں عبداللہ نام کی اس لی ہوئی پہچان نے مجھے بڑا سہارا دیا اور شاید یہی میرا نام بدلنے والوں کا مقصد بھی تھا۔"

وہ مطمئن سی ہو گئی۔ "آپ نے میری اُلجھن تو ختم کر دی۔ اور سچ پوچھیں تو یہ بہت بڑی جھن تھی کیوں کہ بہر حال مجھ جیسوں کے لیے اپنا بچپن کا نام ہی بہت بڑی شناخت ہوتی ہے اپنا جنم نام یوں ایک جھٹکے سے بدل دینا بھی بڑی ہمت والوں کا ہی کام ہے..... پھر آپ ے دوسرا سوال یہ ہے کہ آپ نے اپنی دنیاوی چاہت کے لیے یہ بھیس بدلا تھا۔ پھر دھیرے رے آپ کی چاہت نے اس راستے کو پا ہی لیا جس پر چلنے کے لیے آپ کے قدم درگاہ کی ب پہلی بار بڑھے تھے۔ اس سفر میں زہرا نے بھی آپ کی محبت کی طاقت کے سامنے ہتھیار ل ہی دیئے۔ آپ وہ تمغہ بھی سینے پر سجائے اس راہ پر آگے بڑھتے گئے۔ آپ جسموں کو نہیں ح کو فتح کرنے کے لیے اس رُوحانی راہ گزر کے راہی بن گئے..... لیکن یہ سفر آخر ختم کہاں گا۔ کیا آپ کو نہیں لگتا کہ اِس طرح گھر بار چھوڑ کر اور زہرا کو اپنا منتظر چھوڑ کر آپ ایک فرض ادائیگی کے لیے نکل تو آئے لیکن آپ نے اپنے پیچھے بہت سے فرض اُدھورے چھوڑ دیئے ......؟"

بڑی مالکن نے سرزنش بھری نظر سے لاریب کی جانب دیکھا جیسے انہیں لاریب کے

سوالات کچھ چبھ رہے ہوں۔ لاریب نے جلدی سے وضاحت پیش کی۔ ’’اگر میں الفاظ کے چناؤ میں کچھ بے احتیاطی کر رہی ہوں تو پلیز آپ......‘‘ میں نے اُس کی بات پوری ہونے نہیں دی۔ ’’نہیں...... آپ کا پیرایہ اور الفاظ کا چناؤ بالکل درست ہے۔ نمک کو نمک اور تھوڑ کو تھوڑ ہی کہا جا سکتا ہے...... قند کہہ دینے سے اس کی تاثیر میں حلاوت شامل نہیں ہو جاتی۔ شاید یہ وہ سوالات ہیں جن کا سامنا مجھے عمر بھر کرنا ہے۔ لہجہ چاہے تلخ ہو، یا آپ جیسا شیریں...... سوالوں کا مدعا تو یہی رہے گا۔ اور میرے پاس بہرحال اپنے ہر عمل کا جواب موجود ہونا ہی چاہیے......‘‘

وہ دونوں دم بخود سی بیٹھیں میری بات مکمل ہونے کا انتظار کر رہی تھیں۔

’’آپ ٹھیک کہہ رہی ہیں۔ میں نے اپنی دنیاوی چاہت کے لیے ہی یہ بھیس بدلا تھا۔ اور سچ پوچھیں تو فی الحال میں صرف بھیس بدلنے کی حد تک ہی کامیاب ہو پایا ہوں۔ آپ کا یہ کہنا بھی درست ہے کہ خدا کو پانے کے لیے یوں بھیس بدل کر اپنا گھر بار چھوڑنے کی بھی قطعاً ضرورت نہیں...... اُسے تو اپنی شہ رگ سے بھی قریب کہیں آس پاس تلاش کرنا چاہیے۔ لیکن آپ کو ایسا نہیں لگتا کہ ہمیں ہمارا ضمیر ہمیشہ اس شعبے، یا اس راستے کی طرف بڑھنے پر مجبور کرتا ہے جس مٹی سے اُسے اُٹھایا گیا ہوتا ہے۔ مصور کو اگر آپ بڑھئی لگا دیں اور بڑھئی کو مصور کا کام سونپ دیں تو کیا ہوتا ہے؟ کسی موسیقار کو اینٹ گارا ڈھلائی کرنے والا مزدور بنوا دیں اور کسی مزدور کو کسی نازک پیانو پر لا بیٹھائیں تو کیا ہوگا؟...... بات کسی بھی راہ، یا حلیے کے اعلیٰ یا ادنیٰ ہونے کی اور اُسے کسی فرض کو ترک کر کے اختیار کرنے کی نہیں ہے۔ بات رُوح کے قرض کی ہے۔ مجھے ایسا لگا کہ میری رُوح کو اس کام کے لیے جنم دیا گیا ہے اور مجھے اِسی میں اپنا سکون، اپنی کاملیت دکھائی دی اور میں اس طرف چل پڑا۔ ٹھیک اُسی طرح جیسے اگر مجھے ڈاکٹر، انجینئر، یا پائلٹ وغیرہ بننے کا جنون ہوتا اور میں اپنے والدین کی مجھے بزنس مین بنانے کی خواہش کو رد کر کے ایسا کوئی شعبہ اختیار کر لیتا تو شاید دنیا کو اتنا عجیب نہ لگتا۔ تب شاید مجھے کچھ طرف سے داد و تحسین بھی ملتی کہ میں نے اپنا اتنا بڑا کاروبار چھوڑ کر اپنے دل کی مانتے ہوئے وہ شعبہ اختیار کیا جس میں میری خوشی تھی اور میری مثالیں دی جاتیں کہ اپنے فن اور شعبے کے لیے قربانی ہو تو ایسی ہو۔ تو کیا مذہب، یا رُوحانیت وہ شعبہ اور وہ فن نہیں ہو سکتا جس کی راہ کا

طالب علم بننا میری خوشی ہے......؟ بس تو میں نے اپنی خوشی سے ایک شعبہ ہی تو اختیار کیا ہے۔ اور کیا اگر میں ڈاکٹریٹ، یا بزنس مینجمنٹ کے لیے ملک سے باہر جاتا اور چار پانچ سال لگا کر واپس آتا تو کیا تب میں اتنا عرصہ ان رشتوں اور ان سے وابستہ فرائض سے دُور نہ رہتا؟ لیکن تب شاید یہ بھی میرے تمغوں میں مزید ایک تمغے کا اضافہ ثابت ہوتا کہ اپنے شعبے کی تکمیل کے فرض کی خاطر میں نے خونی رشتوں سے دُوری کی قربانی دینے سے بھی اجتناب نہ کیا۔ واپسی پر میرے گلے میں پھولوں کے ہار ڈالے جاتے اور میری سند کو جلی حروف میں میرے نام کی تختی پر کندہ کیا جاتا۔ تو پھر صرف اس راہ پر چلنے والوں پر فرائض سے بھاگنے کا الزام کیوں لگایا جاتا ہے۔ صرف اس لیے کہ شاید اس شعبے میں روپیہ پیسہ کمانے کا کوئی راستہ نہیں...... کیا صرف جس شعبے سے انسان کو لگی بندھی تنخواہ مل سکتی ہو صرف وہی انسان کی کامیابی کی دلیل ہوتا ہے۔ رہی بات حلیے کی تو ہر شعبے کا اپنا ایک یونیفارم بھی ہوتا ہے جس طرح ڈاکٹر سفید کوٹ پہنتے ہیں، انجینئر سائٹ پر جاتے وقت سر پر آہنی ہیلمٹ پہن لیتے ہیں، پائلٹ کاندھے پر پھول سجاتا ہے، اِسی طرح اس شعبے کا بھی اپنا ہی ایک یونیفارم پہلے سے طے ہے۔ آپ سوچیں کہ میں تھری پیس سوٹ میں مزار کا مجاور بنا کیسے لگوں گا......؟ بالکل اتنا ہی مضحکہ خیز جتنا اگر میں کسی بزنس ایمپائر کا مینجنگ ڈائریکٹر ہوتے ہوئے سفید کرتے پاجامے میں صبح اُٹھ کر اپنے دفتر جا پہنچوں......؟ یہ سادہ لباس ہی میرے شعبے کا تقاضا اور اس پر جچتا ہے۔ لیکن اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہے کہ صرف سادہ لباس ہی انسان کی رُوحانیت کی تکمیل کا باعث ہے۔ یہ تو ابتدا سے بھی پہلے کے چند لوازمات ہیں تبھی میں نے آپ کو شروع میں ہی بتا دیا تھا کہ فی الحال میں صرف لباس کی تبدیلی تک ہی پہنچ پایا ہوں۔ اب رہا آپ کا آخری سوال کہ رُوحانیت کے اس سفر میں زہرا کی رُوح کو فتح کرنے کا مرحلہ کب آئے گا تو یہ فیصلہ تو میں نے اُسی پر چھوڑ دیا تھا۔ میری رُوح تو پہلے روز ہی اُس کی اسیر ہو گئی تھی۔ یہ فیصلہ اب زہرا کے ہاتھ میں ہے کہ وہ اپنی رُوح کو کب میرے تصرف میں دینے پر خود کو آمادہ کرتی ہے۔ اور یہ زمینی فاصلے مجھے کبھی بھی اُس سے دُوری کا احساس نہیں دلا پائے۔ وہ ہر پل میرے ساتھ ہی تو ہوتی ہے۔ یہ طویل تنہائیاں اور یہ جگ راتے میں نے اُس سے باتیں کر کے ہی تو گزارے ہیں۔ ہمارا مسئلہ کبھی جسم کی قربت تو تھا نہیں...... مجھے یقین ہے کہ میری

رُوح کی کی ہوئی باتیں اُس تک بھی ضرور پہنچتی ہوں گی......''

میں اپنی بات ختم کر کے چپ ہو گیا۔ لاریب اور بڑی مالکن بھی بہت دیر تک اپنے لفظ جوڑنے کی کوشش کرتی رہیں اور پھر آخر کار میں نے ہی انہیں سہارا دیا۔ ''مجھے اُمید ہے کہ آپ کے سبھی سوالوں کے جواب میں نے دے دیئے ہیں۔ پھر بھی آپ کے دل میں اگر مزید کوئی خلش ہو تو آپ پوچھ سکتی ہیں۔'' لاریب کچھ کھوئی کھوئی سی تھی۔ ''نہیں...... مجھے اپنی زندگی میں اپنے کسی بھی سوال کے اتنے تسلی بخش جواب نہیں ملے...... آپ نے کوئی تشنگی چھوڑی ہی نہیں میرے واسطے......لیکن کبھی کبھی اتنی سیرابی بھی ہم جیسوں کے لیے باعث شادی مرگ بن جاتی ہے...... میں شاید اسی وجہ سے اپنے الفاظ کھو چکی ہوں......''

ایسے میں بڑی مالکن نے لاریب کو سہارا دیا۔ حالانکہ مجھے نہ جانے کیوں محسوس ہوا کہ وہ کچھ دیر مزید خاموش رہنا چاہتی تھیں۔ ''تم ایک مختلف نوجوان ہو عبداللہ...... تمہاری راہ بھی مختلف ہے لیکن آج تم نے اپنی راہ کی ہر سچائی کو جس طرح کھول کر بیان کیا ہے اس نے تمہاری قدر ہمارے دلوں میں فزوں تر کر دی ہے......تم ہمیشہ اپنے اندر اتنی حیرتیں بیک وقت کیسے چھپائے پھرتے ہو۔'' اتنے میں خان صاحب کی بروقت آمد نے مجھے اس مشکل سوال کے جواب سے بچا لیا۔ وہ مصر تھے کہ رات بہت ڈھل چکی ہے لہٰذا آج رات میں یہیں حویلی کے مہمان خانے میں قیام کر لوں لیکن میں نے انہیں اصغر صاحب کی طبیعت کی مجبوری بتائی تو بادل نخواستہ انہیں مجھے اجازت دینی ہی پڑی۔ بشیرا اپنے تانگے سمیت ڈیوڑھی میں ہی موجود تھا کیوں کہ شاید اُسے پہلے ہی وہاں ٹکے رہنے کا حکم دے دیا گیا تھا۔ میں اُن سب سے رُخصت ہو کر تانگے میں بیٹھا تو لاریب تب بھی کچھ کھوئی کھوئی سی تھی۔ مجھے الوداع کہتے وقت بھی اُس کی نظریں میرے چہرے پر جانے کیا ٹٹول رہی تھیں۔ جیسے اُس کے اندر کی کوئی بات اُدھوری رہ گئی ہے۔

تانگا پہاڑی کے پاس آ کر رُکا تو بشیرے نے مجھے پیش کش کی کہ وہ میرے ساتھ درگاہ تک جانا چاہتا ہے کیونکہ سناٹا اور اندھیرا بہت گہرا تھا۔ ''عبداللہ باؤ...... سنا ہے اس پہاڑی کے دوسری پار جنات رہتے ہیں۔ میں تو کہتا ہوں کہ میں آپ کے ساتھ اُوپر تک آتا ہوں۔ آخر آپ ہمارے خاص مہمان ہو......''

مجھے اس کی بات پر ہنسی آ گئی ''کیوں تم کیا جنات کے داماد لگتے ہو جو وہ تمہیں کچھ نہیں
ہے...... اور پھر اُوپر پہنچنے کے بعد تمہیں بھی تو تنہا ہی نیچے آنا پڑے گا نا...... تو پھر تمہیں
وڑنے کے لیے کون آئے گا؟...... اس طرح تو ہم ایک دوسرے کو ہی چھوڑنے کے لیے
اڑی اُترتے چڑھتے رہیں گے اور اسی بھاگ دوڑ میں صبح ہو جائے گی......''

بشیرا بھی میری بات سن کر ہنس پڑا۔ ''واقعی...... اکیلے اُترتے ہوئے تو مجھے بھی ڈر لگے
۔ چلو پھر اللہ بیلی......'' بشیرے نے تانگا موڑا اور میں اُس کی جلد بازی پر مسکراتا ہوا پہاڑی
ا اُوپر جاتی پگ ڈنڈی پر چڑھنے لگا۔ رات واقعی بہت سرد اور تاریک تھی۔ ان پہاڑی علاقوں
ں ایک پہاڑ پر اگر موسلادھار بارش برس رہی ہو تو اگلی پہاڑی پر دھوپ چمک رہی ہوتی
ہے۔ اسی طرح اِس رات کے وقت بھی دُور کسی پہاڑ پر بار بار بجلی چمک کر اُسے کیمرے کی
ش کی طرح نیلی روشنی کے جھماکوں سے منور کر رہی تھی جو اس بات کی غماری تھی کہ دوسرے
اڑ کے جانب بارش برس رہی ہے۔ کبھی کبھی ہوا کے دوش پر بادلوں کے گرجنے کی آواز بھی
ن میں پڑ جاتی تھی۔ میں لاریب کے سوالوں پر غور کرتا ہوا اُوپر چڑھا جا رہا تھا۔ کچھ ہی دیر
ں سردی کی شدت اور میرے تیز ہانپنے جیسے سانس کی وجہ سے میرے منہ سے بھاپ نکلنے لگی
ے میں ہر سانس کے ساتھ سگریٹ کا بہت سا نگلا ہوا دھواں اُگل رہا ہوں۔ جیسے جیسے درگاہ
یب آتی جا رہی تھی ویسے ویسے کہرا بڑھتا جا رہا تھا۔ اچانک عقب میں ایک آہٹ سی ہوئی۔
رے بڑھتے قدم رُک گئے اور میں نے پلٹ کر دیکھا لیکن پیچھے کوئی نہیں تھا۔ میں نے پھر
م اُٹھائے اور پھر وہی آہٹ ہوئی۔ میں پھر رُکا اور میں نے صاف محسوس کیا کہ کوئی میرے
اتھ ہی رُک گیا ہے۔ لیکن کون......؟ کیوں کہ وہاں تو دُور دُور تک صرف اندھیرے کا راج
ا۔ میں نے پھر سر جھٹک کر چلنا شروع کیا اور اس بار مجھے اپنی دھونکنی جیسی چلتی سانس کے
اتھ کسی اور کے سانس لینے کی آواز بھی سنائی دینے لگی۔ دفعتہً بجلی کا دُور کہیں ایک اور جھماکا
ا اور دائیں جانب والی چٹان کے اُوپر مجھے کسی اکڑوں بیٹھے ہوئے شخص کا ہیولہ سا دکھائی دیا
ں کی سرخ انگارہ آنکھیں دُور چمکتی بجلی کی منعکس روشنی میں پل بھر کو چمکیں اور پھر دوبارہ گھٹا
پ اندھیرا چھا گیا۔ میرے ماتھے سے پسینہ پھوٹا اور پل بھر میں میری کن پٹی سے ہوتا ہوا کان
ے پیچھے سے لو تک پہنچ گیا۔ میں نے اندھیرے میں آنکھیں پھاڑ کر دیکھا لیکن چٹان خالی پڑی

تھی۔ وہ میرا واہمہ تھا، یا وہ وہی تھا؟ میں نے کچھ دیر وہیں رُک کر سانس بحال کی اور پھر لمبے لمبے ڈگ بھرتا ہوا درگاہ کے احاطے تک پہنچ گیا۔ اصغر صاحب کے کمرے کی لالٹین جل رہی تھی اور روشنی ملگجے شیشوں سے باہر صحن میں جھلک رہی تھی۔ میں نے پہلے آگے بڑھ جانے کا ارادہ کیا لیکن پھر یہ سوچ کر کہ نہ جانے اتنی رات کو وہ کیوں بیدار ہیں، اُن کے کمرے کی جانب بڑھ گیا۔ میں نے دروازے پر ہلکی سی دستک دی۔ اُن کی آواز اُبھری ”آجاؤ عبداللہ میاں...... دروازہ کھلا ہے......“ میں اندر داخل ہو گیا۔

”آپ ابھی تک سوئے نہیں......؟......اور آپ کو کیسے پتا چلا کہ باہر دروازے پر میں ہی ہوں۔“ وہ ہلکے سے مسکرائے ”یہاں اور کون آئے گا بھلا اس آدھی رات کے وقت؟...... وہ شیطان کا چیلا تو اس احاطے میں آ نہیں سکتا کیونکہ بقول اُس کے یہاں مدفون نیک بزرگ کی وجہ سے اُس کی اس احاطے میں بندش ہے۔ لہٰذا میں نے سوچا تم ہی ہو سکتے ہو۔ کیسی رہی تمہاری دعوت؟ بھئی یہ کریم خان صاحب کی حویلی والے تو تم پر بہت مہربان لگتے ہیں۔ ذرا دھیان رکھنا، کہیں تمہارے لیے کوئی بیڑیاں نہ تیار کر رکھی ہوں......“

میں اُن کا اشارہ سمجھ کر ہنس دیا ”نہیں ایسی کوئی بات نہیں......وہ جانتے ہیں میں پہلے ہی اپنا آپ بندھوا کر یہاں تک پہنچا ہوں۔“ پھر میں نے انہیں راستے میں ہوئے ماجرے اور اُن جلتی انگارہ آنکھوں کا سارا حال بھی سنا ڈالا۔ اصغر صاحب میری بات سن کر بے حد متفکر ہو گئے۔

”یہ ضرور وہی ہوگا......لیکن وہ تمہارے پیچھے کیوں پڑ گیا ہے......؟ عبداللہ میاں تمہیں بہت احتیاط کی ضرورت ہے...... وہ بہت خطرناک مخلوق ہے......“ میں نے کچھ سوچ کر کہا ”لیکن آپ نے اپنی پوری داستان مجھے سنائی ہے......اس سے یہ کہیں ظاہر نہیں ہوتا کہ وہ خوا مخواہ کسی کو نقصان پہنچاتا ہو۔ آپ سے بھی دوستی کے لیے اُس نے پہلے آپ سے اجازت لی۔ خود کو آپ پر طاری کرنے کی کوشش نہیں کی......اور پھر اگر اُسے مجھے نقصان ہی پہنچانا ہوتا تو وہ میرے جبل پور کے سفر کے دوران ٹرین میں میری بے خبری میں بھی مجھ پر وار کر کے مجھے پہنچ سکتا تھا۔ پھر اُس کے لیے اس قدر انتظار کیوں......؟“

”ہاں......یہی بات تو سمجھ نہیں آ رہی۔ بہر حال مجھے نہ جانے کیوں ایک دم ہی بہت فکر ہونے لگی ہے تمہاری۔“ میں نے انہیں تسلی دی کہ میں محتاط رہوں گا لیکن نہ جانے کیوں میں

اندر سے بہت بے چین تھا۔ میرے لبوں پر وہ سوال آ ہی گیا جو میں اصغر صاحب سے جتے ہوئے بھی نہیں پوچھ پا رہا تھا۔ ”لیکن آپ نے کیا یہ سوچا ہے کہ وہ آپ کو کس آگ میں دھکیلنے جا رہا ہے۔ کسی انسان کا قتل معمولی بات تو نہیں...... پوری انسانیت کا قتل ہے...... کیا آپ یہ بھیانک جرم کر پائیں گے۔“ اصغر صاحب نے میری بات سن کر لمبا سا سانس لیا۔ ٹھیک کہتے ہو......لیکن جب انسان خود ہر پل مر رہا ہو، اذیت سے اپنا آپ قتل ہوتا ہوا محسوس کرتا ہو تو پھر ایسے میں ایسا ایک قتل اُسے بہت آسان لگنے لگتا ہے۔ میں یہ آخری جرم کرنے کے بعد جس عذاب سے نجات پا لوں گا اس کا اندازہ لگانا بھی محال ہے۔ مجھے اُس لامتناہی عذاب کے سلسلے کو ہمیشہ کے لیے ختم کرنے کے لیے اس آخری عذاب سے گزرنا ہی ہوگا۔ کیونکہ میرے پاس اور کوئی چارہ نہیں۔ یہی میرے معاہدے کی آخری شق اور آخری شرط ہے۔“

میں اصغر صاحب کو اُسی سوچ میں چھوڑ کر اپنے کمرے میں چلا آیا۔ رات ڈھلنے ہی والی تھی۔ لہٰذا میں نے سونے کا ارادہ ترک کر دیا۔ اور یونہی بستر پر لیٹ کر کروٹیں لینے لگا اور پھر تبھی میرے ذہن میں ایک جھماکا سا ہوا۔ ”کہیں ایسا تو نہیں کہ چھلاوے کے اختیارات اُس کی حد بھی مقرر ہو اور اُسے بھی اپنی کچھ خواہشات سرانجام دینے کے لیے کسی انسانی جسم کی ضرورت پڑتی ہو۔ تبھی وہ اصغر صاحب سے یہ قتل کروانا چاہتا ہے؟......لیکن کس کا قتل......“ اور پھر تبھی میرے ذہن میں اس جان لیوا خیال کا دوسرا جھماکا ہوا۔

”کہیں وہ مستقبل کا مجوزہ مقتول میں خود ہی تو نہیں......؟......اصغر صاحب کو کہیں وہ چھلاوہ میرے ہی قتل کا حکم تو نہیں دینے والا......؟......اور کیا پتا حکم دیا بھی جا چکا ہو اور اب صرف صحیح وقت پر عمل پیرا ہونا ہی باقی نہ رہ گیا ہو......؟“

پھر وہی محبت

جانے وہ کیسا خیال تھا کہ اُس نے میرے ذہن میں کچھ یوں جڑ پکڑی کہ میں پھر دن چڑھے تک اُسی سوچ کے تانے بانوں میں اُلجھا رہا۔ کئی بار جی میں آیا کہ اس قدر جی جلانے کی کیا ضرورت ہے۔ سیدھے جا کر اصغر صاحب سے ہی پوچھ لینا چاہیے کہ اگر میں ہی اُس چھلاوے کا مرکزِ نظر ہوں تو پھر دیر کیسی؟...... لیکن نہ جانے کیوں میں ہر بار پوچھتے پوچھتے رُک جاتا۔ دو دن اِسی اُدھیڑ بن میں ہی گزر گئے۔ تیسرے دن اصغر صاحب صبح کی کوسی دھوپ سینکنے کے لیے انگور کی بیلوں کے سامنے دریوں پر دیوار سے ٹیک لگا کر بیٹھے نہ جانے کس سوچوں میں گم تھے، میں دُور کھڑا پرندوں کو دانہ ڈالتے ہوئے کن اکھیوں سے انہیں دیکھ رہا تھا کہ انسان کو قسمت کیا کیا روپ بدلنے پر مجبور کر دیتی ہے۔ میں نے زندگی میں قاتل تو بہت دیکھے تھے لیکن ایسا شخص کبھی نہیں دیکھا تھا جو اگلے چند روز میں قاتل بننے جا رہا ہو۔ اتنے میں نیچے گھاٹی میں بشیرے کے تانگے کا مخصوص بھونپو بجا۔ میں چونکا کیوں کہ آج نہ تو جمعرات تھی اور نہ ہی حویلی میں سے کسی مکین کے آنے کا کوئی امکان تھا۔ میں نے درگاہ کی دیوار سے نیچے دیکھا تو لاریب اپنے وجود کو بڑی سی کالی چادر میں لپیٹے تانگے سے اُترتی دکھائی دی۔ کرم دین حسبِ معمول اپنی بڑی سی ڈانگ سنبھالے اپنی چھوٹی بی بی کے آگے آگے بھاگا چلا آ رہا تھا۔ لاریب......؟ آج......؟ یہاں......؟ اور اس طرح اچانک......؟...... مجھے کچھ سمجھ نہیں آیا۔ وہ کچھ ہی دیر میں درگاہ کے احاطے تک پہنچ گئی اور اُس نے صحن میں کھڑے کھڑے ہی دعا کر کے اپنے چہرے پر ہاتھ پھیرا اور میری جانب چلی آئی۔ دھوپ اور اُونچائی پر چڑھنے کی وجہ سے اُس کا گلابی چہرہ سرخ ہو رہا تھا اور اُس کے ناک کا لونگ کسی سرخ یاقوت میں جڑا کوئی نگ لگ رہا تھا۔ پسینے کی چند ننھی منھی سی بوندیں اُس کی روشن جبیں پر موتیوں کی طرح چمک رہی تھیں اور اُس کی سیاہ آنکھوں میں بیک وقت کچھ اُلجھن، کچھ بے چینی اور کچھ حیا کا عنصر دکھائی دے رہا تھا۔ مجھے یوں لگا کہ وہ یہاں تک آ تو گئی ہے لیکن اپنے سارے لفظ نیچے

گھاٹی میں چھوڑ آئی ہے۔ میں نے اُس کی مشکل آسان کر دی۔ ”کیوں لاریب بی بی...... کوئی سوال رہ گیا تھا کیا......“

وہ بھی مسکرا دی۔ ”نہیں...... یہ تو میں نے اُسی دن بتا دیا تھا کہ آپ نے میرے سوالوں کی سرزمین کو کچھ ایسا سیراب کیا ہے کہ ہر تشنگی مٹا دی ہے۔ لیکن نہ جانے کیوں اُس رات کے بعد میں خود ایک سوال بنتی جا رہی ہوں۔ ایک عجیب سی کسک، ایک اَن چاہی سی بے چینی ہے۔ میری رُوح مجھے کسی طرف ٹک کر بیٹھنے نہیں دی رہی۔ ایسے لگتا ہے جیسے میرے جسم کے پنجر میں پھڑ پھڑا رہی ہے۔ اس کی اُڑان جانے کس سمت کی ہے۔ آج بہت بے چین ہوئی تو یہاں درگاہ پر تنہا ہی دعا کے لیے چلی آئی۔ امی کو میں نے خود اپنے ساتھ آنے سے منع کر دیا۔ ویسے بھی رات سے اُن کی طبیعت کچھ بھاری سی تھی، لیکن نہ جانے کیوں میں تنہا ہی یہاں آنا چاہتی تھی۔ حالانکہ خان جی کو میرا یوں کہیں تنہا آنا جانا پسند نہیں ہے۔ لیکن میں نے اُن سے بھی کسی طور اجازت لے ہی لی۔ پر اب یہاں آ کر میں پھر اُسی شش و پنج میں ہوں کہ میں یہاں کھڑی کیا کر رہی ہوں......؟ آپ ہی بتائیں میں کیا کروں؟ میں نے غور سے اُس کی جانب دیکھا وہ اپنی بات پوری کرتے کرتے ہانپنے سی لگ گئی تھی۔ جیسے اپنے اندر چلتی کش مکش کو جلد از جلد مجھ پر عیاں کرنا چاہتی ہو۔

”ایسا ہم سب کے ساتھ اکثر ہوتا ہے۔ یہ کوئی انہونی تو نہیں ہے۔ آپ نے ابھی اپنی تعلیم مکمل کر کے اپنی آئندہ زندگی کے لیے کوئی راہ چننی ہے...... کبھی کبھی ہم سبھی اس درمیانی دور میں یہ خالی پن محسوس کرتے ہیں۔ منزل کا نشان ملنے تک ایسے دور زندگی میں آتے ہی رہتے ہیں۔ آپ کے اندر کی کھوج آپ کو بے چین رکھتی ہے اور بظاہر سامنے کوئی سنگِ میل تک نظر نہ آنے کی وجہ سے ہم اُکتانے لگتے ہیں۔ مجھے اُمید ہے باقی سب کی طرح آپ کا بھی یہ دور عارضی اور چند روزہ ہوگا۔“ وہ کچھ دیر میری جانب دیکھتی رہی۔ ”خدا کرے ایسا ہی ہو۔ آپ حویلی جلد چکر لگائیے گا۔ خان جی اور امی آپ کو بہت یاد کرتے ہیں۔“

وہ مجھ سے رُخصت ہو کر پلٹ کر چل دی۔ اُس کے جانے کے بعد اصغر صاحب اُٹھ کر میری جانب آ گئے۔ انہوں نے لاریب کو درگاہ کے احاطے سے نکلتے دیکھ کر کہا ”یہ کریم خان صاحب کی بیٹی تھی نا...... کیا کہہ رہی تھی۔“

"کچھ نہیں......بس دعا مانگنے کے لیے آئی تھی۔"

اصغر صاحب نے میری جانب غور سے دیکھا "کیا تم نے کچھ محسوس نہیں کیا، یا جان بوجھ کر انجان بننا چاہ رہے ہو۔"

میں نے حیرت سے اُن کی طرف دیکھا "میں کچھ سمجھا نہیں...... میں نے کیا محسوس نہیں کیا......؟" اصغر صاحب نے لاریب کی راہ گزر پر یوں نظر ڈالی جیسے وہ ابھی تک درگاہ میں ہی موجود ہو، حالانکہ اُسے نکلے دیر ہو چکی تھی۔ "یہ لڑکی تم سے محبت کرنے لگی ہے عبداللہ میاں...... حیرت ہے تمہیں اس بات کا اندازہ کیوں نہیں ہوا۔ حالانکہ کوئی اندھا بھی اس کی حالت دیکھ کر یہ سمجھ سکتا ہے کہ اُس کے دل میں تیر گڑھ چکا ہے......تمہاری محبت کا اندھا تیر......"

میں اصغر صاحب کی بات سن کر یوں ڈر کر ایک قدم پیچھے ہٹ گیا جیسے اُنہوں نے زبان سے بات نہیں، اپنی پٹاری سے کوئی سنپولیا نکال کر میری جانب اُچھال دیا ہو۔

"یہ آپ کیا کہہ رہے...... ایسا نہیں ہوسکتا...... وہ اچھی طرح جانتی ہے کہ میں کسی اور سے محبت کرتا ہوں۔"

اصغر صاحب میری بات سن کر یوں مسکرائے جیسے کوئی کسی بچے کے منہ سے کوئی معصومانہ سی بات سن کر مسکراتا ہے۔ "تو اس سے کیا فرق پڑتا ہے......؟ تم کسی اور سے محبت کرتے ہو، اس بات سے اُس کے دل میں جنم لینے والے کسی جذبے کا کیا تعلق ہے؟ یاد رکھو...... محبت ہم بے بس انسانوں کا کچھ اِسی طرح پیچھا کرتی رہتی ہے جیسے کسی گھنے اندھیرے جنگل میں چلایا ہوا کسی ظالم شکاری کا اندھا تیر اپنی زد میں آئے ہوئے کسی معصوم غزال کا پیچھا کرتا ہے۔ بدقسمتی سے ہم بھولے بھالے انسان بھی اُسی سیدھ میں بھاگنے کی کوشش کرتے جس طرح وہ بڑی بڑی حیرت زدہ آنکھوں والا غزال بنا دائیں بائیں مڑے بس سیدھا ہی بھاگ اُٹھتا ہے، لیکن تیر کی رفتار سے جیت نہیں پاتا اور آخر کار اپنی شہ رگ میں وہ تیز خنجر جیسا تیر پیوست کروا کر وہیں کسی گہری کھائی میں گر کر دم توڑ دیتا ہے۔ مرنے سے کچھ لمحے پہلے خون کا آخری تیز فوارہ اُس کی شہ رگ سے چھوٹتا ہے اور وہ غزال اپنی رُوح نکلنے کی تڑپ میں اپنے پیر پتھریلی چٹان پر بے تابی سے رگڑتا ہے۔ ٹھیک اُسی طرح آج یہ لڑکی بھی اپنی ایڑھیاں رگڑنے اس پتھریلی درگاہ پر آئی تھی۔ اُس کی شہ رگ سے گرم خون کا آخری فوارہ جاری ہو چکا ہے۔ اور اُس

کی رُوح دھیرے دھیرے نکل رہی ہے...... اب دیکھو کب......"

میں نے چلا کر اُن کی بات کاٹ دی۔ "یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں...... وہ بہت معصوم ہے...... میں ہرگز نہیں چاہوں گا کہ میری وجہ سے ایسی کوئی بھی اذیت کبھی بھی اُسے پہنچے...... آپ کو ضرور کوئی غلط فہمی ہوئی ہے...... وہ جان بوجھ کر اس آگ میں نہیں کود سکتی......"

لیکن اصغر صاحب کا سفاک لہجہ اُسی طرح میری سماعت میں برچھیاں گھونپتا رہا۔

"میں نے کہا نا، اس میں تمہارا، یا اُس معصوم لڑکی کا کوئی قصور نہیں...... خطاوار تو صرف محبت ہے...... ہاں...... وہی محبت کا اندھا تیر...... جس کو چلانے والے ہاتھ اور کمان سے شست باندھنے والی آنکھ اس بے رحم تقدیر کی ہوتی ہے جس پر ہمارا اختیار بھی نہیں چلتا......"

میں اب بھی اُلجھن میں تھا۔

"لیکن...... لیکن آپ یہ سب اتنے یقین سے کیسے کہہ سکتے ہیں......"

"کچھ باتیں جاننے کے لیے کسی خاص تجربے کی ضرورت نہیں ہوتی۔ لیکن میں اس لیے بھی پُر یقین ہوں کہ پچھلے ایک سال میں میں نے چہرے پڑھنا خوب اچھی طرح سیکھا ہے۔ اس لڑکی کا چہرہ تو ویسے بھی ایک کھلی کتاب کی طرح ہے۔ تم شاید اپنی آنکھوں پر اس خاندان کے احترام کی بندھی پٹی کی وجہ سے اُس کا چہرہ پڑھ نہیں سکے، یا پھر تم نے شاید یہ سمجھ لیا ہے کہ چونکہ وہ تمہاری کہانی سے آگاہ ہے لہٰذا اُس کا دل تمہاری جانب مائل نہیں ہوگا۔ عبداللہ میاں...... یہ لڑکیاں من کی بالکل کچی گریاں ہوتی ہیں۔ ذرا سے دباؤ سے چٹخ جانے والی اور پھر کبھی نہ جڑنے والی گریاں...... اس لڑکی کا کومل من بھی کہیں نہ کہیں سے چٹخ گیا ہے...... اب اس کے دل کی نازک اور کچی گری کو سوکھنے اور برباد ہونے سے کوئی نہیں روک سکتا...... وہ خود بھی نہیں......"

اصغر صاحب میرے اُوپر بجلیاں گرا کر واپس اندر اپنے کمرے کی جانب پلٹ گئے۔ لیکن مجھے نہ باہر کا چھوڑ گئے اور نہ ہی میں اپنے اندر چھپنے کی کوئی جگہ پا رہا تھا۔ کاش انہوں نے جو کچھ بھی کہا وہ صرف اور صرف اُن کا ایک اندازہ ہو اور ایسا کوئی بھی طوفان لاریب کے اندر نہ پنپ رہا ہو۔ اُس کی ہنسی سے تو اُس کی حویلی ہی کیا پورا جبل پور ہی سدا روشن رہتا تھا۔ وہ اور اُس کی معصوم شرارتیں تو اُس کے ماں باپ کی سانسیں بڑھانے کا باعث تھیں۔ اپنی اس چھوٹی

مالکن کی مسکراہٹ اور کلکاریاں ہی تو حویلی کے سبھی نوکروں کا خون بڑھاتی تھیں۔ ایسی زند
لڑکی کو محبت کا منحوس گہن لگ جائے...... نہیں نہیں...... اس سے پہلے خود مجھے اپنا وجود لے کر
یہاں سے کہیں دُور چلا جانا چاہیے...... لیکن...... میں جاؤں بھی تو کہاں...... یہ سلطان بابا بھی
مجھے یہاں بھیج کر جیسے بھول ہی گئے ہیں۔ میں نے اُسی شام ساحل والی درگاہ کے نئے عبداللہ
یعنی نعمان کو ایک تفصیلی خط لکھ ڈالا کہ جیسے بھی ہو وہ سلطان بابا تک میرا یہ پیغام پہنچا دے کہ
میں اُن کا بے حد بے چینی سے یہاں جبل پور والی درگاہ پر انتظار کر رہا ہوں۔ میں وہ خط شام
ہی کو پہنچے گاؤں میں پوسٹ ماسٹر صاحب کے حوالے کر آیا کہ اُسے کل کی ڈاک میں ضرور نکال
دیں۔ رات بھر اسی بے کلی میں بستر کی شکنیں بڑھاتا رہا لیکن اس سے کہیں زیادہ شکنیں میری
منہ زور سوچ میرے ماتھے پر ڈالتی رہی۔

کہتے ہیں خدشے اور وسوسے حد سے زیادہ بڑھ جائیں تو رفتہ رفتہ حقیقت کا روپ
دھارنے لگ جاتے ہیں۔ اگلے دن خان صاحب نے بشیرے کے ہاتھ پیغام بھجوا دیا کہ درگاہ
کی سالانہ زکوٰۃ بٹائی کا وقت ہو چلا ہے لہٰذا میں سہ پہر تک آ کر اُن سے سارے پیسے، مستحقین
کی فہرست اور پتے اور تقسیم کا طریقہ کار وغیرہ جمع کرتا جاؤں تاکہ اگلے دن سے یہ کام شروع
کیا جا سکے۔ میں سہ پہر کو وہاں پہنچا اور ہم شام پانچ بجے تک سارا طریقہ کار طے کر چکے تھے۔
خان صاحب کے کچھ مہمان بھی آ گئے تھے لہٰذا میں اُن سے اجازت لے کر واپسی کے لیے باہر
نکل آیا۔ بشیرے کو میں نے تانگا نکالنے کا کہا۔ آج میں مردانے میں خان صاحب کے ساتھ
بیرونی ڈیوڑھی کے مہمان خانے میں ہی بیٹھا رہا تھا۔ لہٰذا ایک بار جی میں آیا کہ کرم دین سے
کہلوا کر اندر بڑی مالکن کو سلام بھجوا دوں۔ لیکن پھر نہ جانے کیا سوچ کر میں نے خود کو روک لیا
اور پلٹ کر تانگے کی طرف چل دیا۔ لیکن ابھی میرا ایک پاؤں تانگے کی پچھلی سیٹ کے
پائیدان پر ہی تھا کہ لاریب نہایت عجلت میں اندر سے نکل کر ہماری جانب آتی ہوئی نظر آئی۔
وہ اتنی بدحواس سی تھی کہ ٹھیک طرح سے میرے سلام کا جواب بھی نہیں دے پائی۔ ”آپ جا
رہے ہیں......؟ امی سے نہیں ملیں گے......؟ میرا مطلب ہے یوں اچانک......؟ میں تو سمجھ رہی
تھی کہ آپ حویلی آئے ہیں تو سب سے مل کر جائیں گے......“

”جی خان صاحب نے کچھ کام دیئے ہیں سوچا پہلے اُن کو نپٹا لوں تو پھر بڑی مالکن کی

خدمت میں بھی سلام عرض کرنے آ جاؤں گا...... بہرحال آپ میری جانب سے اُنہیں آداب
ضرور کہہ دیجیے گا۔“

وہ کچھ بے چین سی تھی۔ ”آپ پھر کب آئیں گے......؟ میرا مطلب ہے مجھے آپ سے
بہت سی باتیں کرنی ہیں...... لیکن نہ جانے جب کبھی موقع ملتا ہے تو ذہن میں سب کچھ اُتھل
پتھل سا کیوں ہو جاتا ہے اور پھر آپ کے جانے کے بعد خود کو کوستی رہتی ہوں کہ آپ سے
ٹھیک طرح بات کیوں نہیں کر پائی۔ اُس روز اتنی دُور چل کر درگاہ بھی آئی لیکن وہاں بھی بات
اُدھوری ہی رہی......“

لاریب جب بے چین سی، بار بار اپنے سر پر دوپٹہ ٹھیک کرتی اور اپنی نازک سی کلائی
میں پڑا ہوا وہ سنہری کڑا بار بار گھما رہی تھی تو نہ جانے مجھے اس میں وہ پہلی ملاقات والی لاریب
کہیں بھی جھلکتی نظر نہیں آئی۔ یہ تو کوئی اور لاریب تھی جس کی ہنسی کی جڑوں میں محبت کا دیمک
اپنا اثر دکھانے لگا تھا۔ اُس کے گلابی رنگت میں محبت کا نیلا زہر دھیرے دھیرے شامل ہوتا جا
رہا تھا اور اُس کی نسوں میں بہتے سرخ خون میں عشق نامی زہریلے مادے کی سورج مکھی جیسی
زرد رنگت کی ملاوٹ اب اُس لڑکی کے چہرے سے جھلکنے لگی تھی۔ میرا دل چاہا کہ میں اُس کا
ہاتھ پکڑ کر اُسے اپنے ساتھ تانگے کی پچھلی نشست پر بیٹھا لوں اور اُسے شہ توت کے درختوں
والی اس جھرنا بہتی سڑک کے کسی پُرسکون کنارے لے جا کر اُس سے صرف اتنا کہوں کہ
”دیکھو...... یہ زندگی ہے...... یہ تم ہو...... اپنے اندر کی اس پُرشور بہتے جھرنے جیسی زندگی کو کسی
بھی ایسے جذبے کے نام گروی مت رکھ دینا کہ تمہارے اندر بہتی جیتی جاگتی زندگی کے سوتے
ہی خشک ہو جائیں۔“ لیکن میں اُسے یہ سب کہہ نہ سکا اور میری زبان سے صرف اتنا ہی نکل
سکا۔ ”آپ جب بھی چاہیں مجھے طلب کر سکتی ہیں۔ درگاہ اتنی دُور تو نہیں...... اور پھر میں کم از
کم آپ سے ہمیشہ یہی توقع رکھتا ہوں کہ آپ اپنی کسی بھی ذہنی اُلجھن کو دل میں دبائے نہیں
رکھیں گی...... اور جب بھی آپ کا من چاہے گا آپ اُسے بانٹ لیں گی...... یا ابھی تک آپ
نے مجھے صرف مہمانوں کی فہرست میں ہی سجا رکھا ہے......؟“

میری بات سن کر اُس کے چہرے پر چھائے فکر کے بادل کچھ حد تک چھٹ گئے اور وہ
ہلکے سے مسکرا دی۔ مجھے یوں لگا جیسے کچھ دیر کے لیے گھنی بدلیوں کی اوٹ سے سورج نے

جھلک دکھلائی ہو۔" "نہیں...... مہمانوں کی فہرست سے تو میں کب کا آپ کو نکال چکی۔ آپ سے کچھ پوچھنا تھا۔ کیا میری کبھی زہرا سے ملاقات ہو سکتی ہے؟ میں انہیں دیکھنا چاہتی ہوں۔ جانے وہ کیسی ہوں گی......؟ جن کی ایک جھلک نے ہی آپ کی زندگی بدل دی...... میں دیکھنا چاہتی ہوں کہ کیا کوئی اپنے اندر ایسا اثر بھی رکھتا ہے کہ پل بھر میں کایا پلٹ دے...... کیا آپ اُن سے مجھے کبھی ملوائیں گے......"

مجھے اُس کے بھولے پن پر ہنسی آ گئی۔ "ضرور ملواؤں گا...... اور ایک بات یاد رکھیے گا کہ ہم میں سے ہر ایک کے مقدر میں ایسی ایک نظر ضرور ہوتی ہے جو ہماری کایا پلٹ کر رکھ دے۔ اب یہ ہماری اپنی کوتاہ نظری ہے اگر ہم اپنے نصیب کی اس ایک نظر کو بھی برت نہ سکیں۔ اور یہ بھی سچ ہے کہ خود ہماری اپنی نظر بھی کسی نہ کسی اور کے لیے ویسی ہی تاثیر رکھتی ہے۔ کون جانے ہم خود کس لمحے کس کی زندگی بدل رہے ہوتے ہیں۔ لیکن ہمیں خود بھی اس کی خبر نہیں ہو پاتی...... شاید نظر کا یہ سارا کھیل ہی آنکھ مچولی کا ہے۔"

وہ غور سے میری بات سنتی رہی۔ جانے وہ میرے لفظوں کے درپردہ معنی تک پہنچ سکی، یا نہیں لیکن اتنے میں اندر سے بڑی مالکن کا لاریب کے لیے بلاوہ آ گیا۔ خود مجھے بھی اُس کا یوں اتنی دیر تک بیرونی ڈیوڑھی میں کھڑے رہنا کچھ بہتر نہیں لگ رہا تھا۔ وہ واپسی کے لیے پلٹنے سے قبل چند لمحوں کے لیے رُکی "آپ ٹھیک کہتے ہیں...... لیکن کیا یہ بھی ہماری بدنصیبی نہیں ہوتی کہ نظر کے اس پورے کھیل میں قدرت سارے کے سارے پتے اپنے پاس ہی رکھتی ہے...... اور خود ہم نظر کو سہنے، یا نظر ڈالنے والوں کی حیثیت صرف ایک تماشائی کی سی ہوتی ہے...... نہ تو اپنے مقدر کی نظر کو برتنا ہمارے اپنے اختیار میں ہوتا ہے اور نہ ہی کسی اور کے نصیب میں لکھی ہماری اپنی نظر کو ہم روک سکتے ہیں...... ہمیں ہوش تب آتا ہے جب ہم اپنا سب کچھ لٹا چکے ہوتے ہیں، یا پھر خود کسی کے مقدر کے قزاق بن کر اُسے لوٹ لیتے ہیں...... آپ کے پاس پھر کبھی وقت ہوا تو ہم اس موضوع پر دوبارہ بات ضرور کریں گے......" وہ خدا حافظ کہہ کر پلٹ کر چل دی۔ شیرے نے بھی تانگے کو ایڑھ لگا دی اور دُور ہوتی حویلی کے اُونچے بُرج بھی رفتہ رفتہ دُھندلے پڑنے لگے لیکن مجھے اصغر صاحب کی کہی باتیں یاد آنے لگیں۔ مجھے اِن جذبوں کی طاقت سے ڈر لگنے لگا تھا۔ کیا یہ جذبے اتنے منہ زور بھی ہو سکتے

ہیں کہ ہمارے خون میں شامل ہو کر ہمارے اندر کو بھی تہس نہس کر دیں؟ ہمارے اندر کی طبعی حالت کو ہی بدل کر رکھ دیں؟ ہماری شخصیت کے رُخ پلٹ دیں؟ کیا ان جذبوں کی اپنی بھی کوئی کیمیائی تاثیر ہوتی ہے جو پل بھر میں ہمیں بخار میں پھنکا دیتی ہے اور سخت گرمی میں ہم سرد ہو کر لرزنے لگتے ہیں؟

اگلے دو دن اِسی کش مکش میں گزر گئے۔ تیسرے دن صبح سویرے ڈاکیے کی سائیکل کی مخصوص گھنٹی نیچے بجتی سنائی دی۔ مجھے خوشگوار سی حیرت ہوئی کیوں کہ ابھی دو دن پہلے ہی میں نے عبداللہ میاں کو تفصیلی خط لکھا تھا لیکن اس کا جواب دو ہفتے سے پہلے ملنے کی اُمید نہیں تھی کیوں کہ اس دُور دراز علاقے میں ڈاک کا نظام اس قدر تیز رفتار نہیں تھا کہ کوریئر سروس کی طرح دوسرے ہی دن ڈاک ملک کے کسی بھی کونے میں پہنچا دے۔ تو پھر یہ خط کس کا آیا ہوگا۔ کچھ ہی دیر میں ڈاک بابو اُوپر آ پہنچا۔ خط میرا ہی تھا اور مجھ سے پہلے والے عبداللہ کی جانب سے تھا۔ اُس نے اپنی اور سلطان بابا کی خیریت سے آگاہ کیا تھا اور میرے لیے خوش خبری یہ تھی کہ سلطان بابا کا کچھ دنوں میں جبل پور آنے کا ارادہ تھا۔ مطلب یہ کہ میں نے نعمان کو خط لکھ کر جس خواہش کا اظہار کیا تھا قدرت نے ساحلی درگاہ پر میرا خط پہنچنے سے پہلے ہی وہ دعا قبول کر لی تھی۔ میں نے سوچ لیا تھا کہ سلطان بابا کے آتے ہی اُن سے اجازت لے کر جبل پور سے کہیں آگے نکل جاؤں گا۔ اس سے پہلے کہ لاریب کے اندر کی بے چینی کوئی واضح رُخ اختیار کرے۔ مجھے اُس کی نظروں سے اوجھل ہو جانا ہی بہتر لگ رہا تھا۔ جانے کیوں اس لمحے مجھے زہرا بہت ٹوٹ کر یاد آئی اور مجھے لمبے سفر میں شدید تھکن کا احساس ہونے لگا۔ دراصل مجھے اب ڈر لگنے لگا تھا۔ سنٹرل جیل میں سکندر کی پھانسی سے لے کر یاقوط کے ہتھیار ڈالنے تک میں نے اس محبت نامی جذبے کی تباہ کاریاں خود اپنی آنکھوں سے دیکھی تھیں اور پھر میں تو خود اس منہ زور جذبے کی اندھی طاقت کا ایک چلتا پھرتا ثبوت تھا۔ لیکن میں اب یہ ہرگز نہیں چاہتا تھا کہ کوئی اور معصوم اس آتشی جذبے کے تیزاب کی زد میں آ کر اپنا آپ جھلسا ڈالے۔ لیکن بات اگر صرف ہمارے چاہنے اور نہ چاہنے کی ہی ہوتی تو پھر بات ہی کیا تھی۔ یہاں تو ہر فیصلہ پہلے ہی سے طے شدہ اور ایک لفافے میں مہر بند ہمیں ملتا تھا۔

اصغر صاحب اس روز صبح سویرے ہی اُٹھ کر کہیں نکل چکے تھے۔ جب ڈاکیے نے مجھے

خط دیا تو اُس وقت میں درگاہ میں اکیلا ہی تھا۔لیکن آج میں نے طے کیا تھا کہ اصغر صاحب کی واپسی پر اُن سے اُن کی اس ''پُراسرار'' آوارہ گردی کا راز ضرور پوچھوں گا۔انہوں نے مجھے بتایا تھا کہ چھلاوہ اُن سے دن کی روشنی میں کم ہی ملتا ہے اور زیادہ تر وہ شام کے بعد ہی اُن پر واضح ہوتا ہے۔لہٰذا اُن کی اس یاترا کا مقصد کچھ اور ہی ہوسکتا ہے۔

لیکن اس روز وہ نہ جانے کہاں نکل گئے تھے کہ پہلے دوپہر اور پھر عصر کا وقت بھی گزر گیا لیکن اُن کی واپسی نہ ہوئی۔عصر کے بعد آسمان پر اُڑتے بادلوں نے گلے ملنا شروع کر دیا اور کچھ ہی پلوں میں سب ہی کے درمیان سازش ہونے لگی کہ کس غریب کی کچی چھت پر برس کر اُسے ستایا جائے۔بادلوں کے درمیان ہوتی سرگوشیاں آہستہ آہستہ بلند آواز بحث میں تبدیل ہونے لگیں اور اس گڑگڑاہٹ کی آواز نیچے ہم زمین والوں تک بھی پہنچنے لگی۔موسم کے تیور کچھ اچھے نہیں لگ رہے تھے اور فی الحال اصغر صاحب کا دُور دُور تک کچھ پتا نہیں تھا۔ذرا سی دیر میں ہلکی ہلکی بوندا باندی اور تیز ہوا کے جھکڑوں نے درگاہ کے صحن میں پڑے پتوں کی چادر کو اس طرح لہرانا شروع کیا جیسے کوئی کابلی پٹھان اپنی گٹھڑی میں سے رنگین کپڑوں کے تھان کھول کھول کر نمائش کے لیے ہوا میں لہرا رہا ہو۔میں نے درگاہ کی منڈیر سے نیچے گھاٹی میں جھانکا۔ گاؤں کی طرف سے آتی سڑک سنسان پڑی تھی۔لیکن پھر دُور ہی سے کسی تانگے کے گھنگروؤں کی جھنکار سنائی دینے لگی اور کچھ لمحوں میں ہی سواری کے آثار نمایاں ہونے لگے۔یہ بشیرے کا تانگا نہیں تھا۔میں نے سنا تھا کہ گاؤں سے ذرا پرے ایک اور بستی میں بھی چند تانگے سواریاں لاتے لے جاتے رہتے تھے یہ شاید اُن ہی میں سے کوئی ایک تانگا ہوگا۔میں نے یہ سوچ کر اطمینان کی ایک ٹھنڈی سانس بھری کہ ضرور اصغر صاحب اِسی تانگے میں آ رہے ہوں گے۔چلو اچھا ہے۔شام ڈھلنے سے پہلے اور اندھیرا ہونے سے پہلے وہ اپنے ٹھکانے پر لوٹ آئے تھے۔ نہ جانے چند ہی دنوں میں اُن کے ساتھ کیسا عجیب سا رشتہ بن گیا تھا۔حالانکہ وہ خود مجھے بتا چکے تھے کہ وہ کتنے خطرناک ارادے سے اس درگاہ پر قیام پذیر تھے لیکن پھر بھی پتا نہیں کیوں مجھے اُن سے کبھی بھی خوف محسوس نہیں ہوا حالانکہ اُن کے اس جان لیوا ارادے کا شکار میں خود بھی ہوسکتا تھا۔

لیکن میرا اطمینان عارضی ہی ثابت ہوا۔تانگے سے کوئی اور شخص اُترا اور پھر تانگے

الے سے راہ پوچھ کر اُوپر درگاہ کی پتھریلی ڈگر پر چڑھنے لگا۔میں شش و پنج میں وہیں منڈیر پر کھڑے ہو کر اُسے دیکھنے لگا۔سرد ہوا کے تھپیڑے اپنے ساتھ ٹھنڈی برچھیوں جیسی بوندوں کی وغات لیے اُس کا استقبال کرنے کے لیے لپکے چلے آ رہے تھے۔کچھ دیر میں وہ اُوپر پہنچ لیا۔اُس نے دُور ہی سے مجھے سلام کیا اور قریب آ کر بولا۔

''جناب میرا نام حوالدار اکرم ہے۔جبل پور پولیس تھانہ کا محرر بھی میں ہی ہوں۔''

''جی فرمائیے میں آپ کی کیا خدمت کرسکتا ہوں۔'' مجھے اُلجھن سی ہو رہی تھی۔پولیس کا ں درگاہ پر بھلا کیا کام؟ اُس نے اپنی بیلٹ کسی۔

''آپ کا نام ہی عبداللہ ہے۔''

''جی...... میں عبداللہ ہوں۔''

''آپ کو میرے ساتھ ذرا تھانے تک چلنا ہوگا، نیچے کوئی خون ہوگیا ہے۔''

خون......؟؟ اچانک ہی مجھے یوں لگنے لگا جیسے ساری درگاہ ہی گھوم رہی ہو۔اچانک ہی لھے اصغر صاحب کی لمبی غیر حاضری اور اُن کے آخری جرم کے ارتکاب کے خیال نے آ گھیرا۔

کہیں چھلاوے کا آخری حکم حقیقت کا روپ تو نہیں دھار چکا تھا۔

پہلی رہائی

میں نے گھبرا کر حوالدار سے پوچھا ''خون...... لیکن کس کا......؟ اور آپ کو میرے پاس کس نے بھیجا ہے۔'' ''پتا نہیں جناب...... تھانے دار صاحب نے بھیجا ہے۔ جبل پور سے پچھلے اسٹیشن پر ایک لاش ملی ہے کسی پکی عمر کے شخص کی۔ یہاں گاؤں میں تو کوئی شناخت نہیں کر پایا تو تھانے دار نے یہاں بھجوا دیا کہ آپ کو بھی بلا لاؤں ......شاید آپ کی شناخت کا ہو وہ بندہ......؟''

پکی عمر کے شخص کی لاش...... یا میرے خدا...... میں نے جلدی سے اپنے کمرے میں پڑی اپنی شال اپنے کاندھوں پر ڈالی اور حوالدار کے ساتھ چل پڑا۔ سارے راستے میرے ذہن و دل میں عجیب عجیب سے وسوسے جنم لیتے رہے اور میں خدا سے اپنے خدشات کو حقیقت میں نہ بدلنے کی التجا کرتا رہا۔ ہم جبل پور گاؤں کے باہر ہی سے آگے بڑھ گئے۔ جبل پور سے پہلے قادر پور کا ریلوے اسٹیشن آتا تھا جو جبل پور سے صرف چار کلومیٹر کے فاصلے پر تھا۔ آدھے راستے میں ہی موسلا دھار بارش نے ہمیں آگھیرا اور ہم نیم پختہ سڑک پر دوڑتے اور کیچڑ کے چھینٹے اُڑاتے تانگے کی پچھلی نشست پر بیٹھے بارش کی بوچھاڑ سہتے ہوئے جب اسٹیشن پہنچے تو مغرب کا اندھیرا چھا چکا تھا۔ پلیٹ فارم پر پیٹرومیکس کے بڑے بڑے لیمپ روشن کر دیئے گئے تھے جن کی پیلی روشنی میں برستی بارش کے قطرے یوں محسوس ہو رہے تھے جیسے آتش بازی والے کسی انار کو اندھیرے میں چلانے کے بعد اُس میں سے چنگاریاں پھوٹتی ہیں۔

ایک جانب کچھ پولیس والوں اور گاؤں کے چند بڑے بوڑھوں کا ہجوم سا لگا ہوا تھا۔ پولیس والے لمبے لمبے خاکی گرم اوورکوٹوں میں ملبوس تھے اور ایک سپاہی کسی افسر کے لیے چھتری تانے کھڑا تھا۔ شاید یہ ہی قادر پور کا تھانے دار تھا۔ ہم دونوں بھی اُسی کی جانب بڑھ گئے۔ ہمیں اپنی جانب آتے دیکھ کر بھیڑ یوں چھٹی جیسے چیونٹیوں کا کوئی جم گھٹا پانی کی تیز لہر اپنے درمیان سے گزرتے پا کر چاروں جانب چھٹ جاتا ہے۔ نیچے پلیٹ فارم کی زمین پر کسی

لاش پر کپڑا ڈال کر اُس کا بدن چھپا دیا گیا تھا۔ چہرہ بھی ڈھکا ہوا تھا۔ تھانے دار نے مجھ سے ہاتھ ملایا ''تو تم ہو جبل پور کی درگاہ کے نئے مجاور...... لیکن تم تو کافی کم عمر ہو......؟...... خان صاحب سے ایک بار تمہارا ذکر سنا تھا۔ اس برستے موسم میں تمہیں اس لیے زحمت دی ہے کہ آج صبح منہ اندھیرے یہاں ایک لاش ملی ہے۔ زخم گہرا ہے اور میرا تجربہ کہتا ہے کہ یہ کوئی ڈکیتی کی واردات ہے۔ ڈاکو اسے لوٹنے کی نیت سے آیا ہوگا اور مزاحمت پر چھرا گھونپ کر مال لوٹ کر لے گیا۔ لیکن اس شخص کی شناخت مشکل ہو گئی ہے۔ یہاں لوگ ایک دوسرے کو تین چار نسلوں سے جانتے ہیں لہٰذا یہ بات تو پکی ہے کہ مقتول اس علاقے کا نہیں ہے۔ ہم نے پنچ نامہ تو کر لیا ہے لیکن لاش اُٹھانے سے پہلے سوچا کہ ایک بار تم سے بھی شناخت کروا لیں کیونکہ بہت سے لوگ درگاہ کی زیارت کے لیے دُور دراز علاقوں سے بھی آتے ہیں جو سیدھے درگاہ جاتے ہیں منت مانگتے ہیں اور پھر دوسری گاڑی پکڑ کر واپس اپنے علاقے کو پلٹ جاتے ہیں۔ ہو سکتا ہے تم نے اسے پہلے درگاہ پر دیکھا ہو......اس کا باقی سامان تو لوٹ لیا گیا ہے صرف اس کے پاس یہ پھولوں کے چند ہار ملے ہیں۔ میں نے تھانے دار کے ہاتھ کے اشارے کی جانب نظر ڈالی تو چند کملائے باسی پھولوں کا ایک چھوٹا سا ڈھیر پلیٹ فارم پر لگی لکڑی کے بنچ کے پاس پڑا ہوا تھا۔ جانے کیوں میرے اندر ایک لمحے کے ہزارویں حصے میں کچھ چھن سے ٹوٹ سا گیا۔ جانے وہ بدقسمت پھول کس کی لحد پر بچھنے کی قسمت لے کر چلے تھے۔ کیا خریدنے والے کو یہ پتا تھا کہ یہ پھولوں کی چادر آخر کار اُسی کا نصیب ہوگی؟ لیکن پتا نہیں کیوں میں لاش کے چہرے پر سے چادر ہٹانے میں شدید ہچکچاہٹ محسوس کر رہا تھا۔ تھانے دار نے میری مشکل آسان کر دی اور حوالدار کو اشارہ کیا جس نے آگے بڑھ کر چادر کھینچ لی۔ میں نے پلکیں موندھ لیں اور پھر ایک گہری سانس لے کر آنکھیں کھول دیں۔ مرنے والا واقعی درگاہ کا ایک پرانا زائر ہی تھا اور میں نے بھی ایک آدھ جمعرات کو اُسے وہاں آتے دیکھا تھا۔ میں نے سر ہلا کر تھانے دار کو تصدیق کر دی اور اپنا بیان بھی ریکارڈ کروا دیا۔ اس شخص نے درگاہ پر چندہ بھی دیا تھا اور اس کا نام پتا درگاہ کے رجسٹر میں درج تھا۔ تھانے دار نے حوالدار کو دوبارہ میرے ساتھ درگاہ تک جانے کا کہا اور ہاتھ ملا کر میرا شکریہ ادا کیا اور مجھ سے درخواست کی کہ اگر مجھے مقتول کے بارے میں مزید کوئی بات پتا چلے تو نام اور پتے کے ساتھ وہ تفصیل بھی ایک کاغذ پر درج کر

کے حوالدار کے حوالے کر دوں۔ میں اور حوالدار جب دوبارہ درگاہ پہنچے تو رات پوری طرح شام کی گردن میں اپنے تاریک پنجے گاڑھ چکی تھی۔ اندھیرے میں پہاڑی پگ ڈنڈی پر چلتے ہوئے پھر سے وہی کسی نادیدہ ہستی کے اپنے قدموں کے ساتھ قدم ملا کر چلنے کا احساس ہوا۔ لیکن میں حوالدار کی وجہ سے سر جھٹک کر اُوپر چڑھتا گیا۔ درگاہ کے احاطے میں داخل ہوتے ہی سب سے پہلے میری نظر اصغر صاحب کے کمرے کی جانب اُٹھی۔ اُن کے کمرے کی لالٹین جل رہی تھی۔ میں نے حوالدار کو تمام تفصیلات ایک کاغذ پر لکھ کر دے دیں اور اُسے رُخصت کر کے فوراً اصغر صاحب کے کمرے کی جانب لپکا۔

اصغر صاحب کافی نڈھال سے لگ رہے تھے۔ جیسے دن بھر کافی مشقت کاٹی ہو انہوں نے۔ میں نے اُن سے شکایت کی ”کہاں چلے گئے تھے آپ یوں بنا بتائے......؟...... آپ جانتے ہیں میں کس قدر پریشان ہو گیا تھا......“

اصغر صاحب مسکرائے ”معاف کرنا عبداللہ...... بس اچانک کام ہی کچھ ایسا پڑ گیا تھا۔ اس لیے بنا بتائے صبح سویرے مجھے نکلنا پڑ گیا...... میں نے اتنی صبح تمہیں پریشان کرنا مناسب نہیں سمجھا۔“

”لیکن آپ گئے کہاں تھے۔“

اصغر صاحب نے بے دھیانی میں جواب دیا۔ ”کہیں نہیں...... جبل پور سے آگے ایک اور اسٹیشن ہے...... قادر پور...... بس وہیں تک گیا تھا کسی شخص سے ملنا تھا پر وہ ملا نہیں......“

میں قادر پور کا نام سن کر زور سے چونکا۔ میرے چہرے کے بدلتے تاثرات اصغر صاحب نے بھی محسوس کر لیے۔ ”کیوں کیا ہوا...... تم اتنے حیران اور ایک دم ہی پریشان کیوں ہو گئے ہو......؟ سب خیر تو ہے نا......“

میں نے مشکوک نظروں سے اُن کی جانب دیکھا۔ وہ صبح منہ اندھیرے قادر پور کے لیے نکلے تھے اور صبح سویرے ہی قادر پور کے ریلوے پلیٹ فارم پر ایک قتل ہو گیا...... کہیں یہ قتل......؟ اس سے آگے میں کچھ سوچ نہیں سکا۔ اصغر صاحب نے مجھے جھنجھوڑ دیا۔ ”کیا ہوا......؟ بولتے کیوں نہیں......؟“

میں نے انہیں شام کی ساری داستان، حوالدار کے آنے سے لے کر میرے قادر پور

جانے اور لاش کی شناخت تک کے تمام مراحل سنا دیئے۔ وہ بھی حیران سے رہ گئے۔

”اوہ...... یہ تو واقعی بڑے افسوس کی بات ہے...... جانے وہ بے چارہ کون تھا......“ وہ بولتے بولتے اچانک چپ سے ہو گئے۔ ”ٹھہرو...... کہیں تم یہ تو نہیں سمجھ رہے کہ یہ خون میں نے کیا ہے......؟...... یقین مانو اس جرم میں میرا کوئی عمل دخل نہیں...... میں تو اسٹیشن کی طرف گیا بھی نہیں......“

مجھے اُن کے لہجے میں سچائی کی جھلک محسوس ہوئی۔ ویسے بھی آج تک انہوں نے مجھ سے کوئی بات نہیں چھپائی تھی۔ پتا نہیں کیسے ٹھیک اُسی وقت میرے دل میں بہت دنوں کی چھپی بات میرے لبوں پر آ گئی۔ ”کیا آپ کو چھلاوے نے اُس شخص کا نام نہیں بتایا جس کو وہ آپ کے ہاتھوں کیفر کردار تک پہنچانا چاہتا ہے...... کہیں وہ میں تو نہیں......؟“

اب اُچھلنے کی باری اصغر صاحب کی تھی ”کیا......؟...... نہیں نہیں...... باخدا ایسا کچھ نہیں...... ویسے تو اُس نے مجھے اُس شخص کا نام نہیں بتایا۔ لیکن وہ جو کوئی بھی ہے اُس کا خاتمہ مجھے درگاہ سے باہر کسی مقام پر کرنا ہو گا۔ اُس کا ٹھکانہ یہ درگاہ نہیں ہو گی...... اور یقین کرو کہ اگر مجھے یہ پتا چلتا کہ مجھے اپنی آزادی کے لیے تمہاری جان لینی ہو گی تو میں اُسی پل خود اپنی جان لے لیتا۔ میں بہت بڑا گناہ گار صحیح...... لیکن کچھ گناہ......“

میں نے انہیں تسلی دی۔ ”آپ دل پر نہ لیں میرا مقصد آپ کا دل دُکھانا نہیں تھا، اگر کبھی میری اس لاحاصل زندگی سے آپ کی آزادی حاصل ہوتی نظر آئی تو آپ کو کہنے کی ضرورت بھی پیش نہیں آئے گی۔“

انہوں نے بڑھ کر مجھے گلے لگا لیا۔ ”میں جانتا ہوں...... لیکن تم فکر نہ کرو...... میری آزادی میں اب کم وقت رہ گیا ہے...... میں نے بہت عذاب ناک قید کاٹ لی...... اس بیڑیاں کھلنے کا وقت قریب ہے۔“

جانے اُس لمحے میں چاہ کر بھی اُن سے یہ کیوں نہیں کہہ سکا کہ کسی کے خون کے بدلے چھینی گئی آزادی بھلا انہیں کیا آزاد کر پائے گی؟ مجھے یوں لگا جیسے وہ ایک قید سے نکل کر کسی دوسرے اور بڑے زندان میں داخلے کی تیاری کر رہے ہوں۔

ساری رات ان ہی سوچوں میں گزر گئی۔ صبح میں نے اپنے کمرے سے نکل کر دیکھا تو

رات بھر مینہ چھاجوں برسا تھا اور اس وقت بھی موسلا دھار بارش جاری تھی۔ اُوپر والی پہاڑی کی چوٹی سے بارش کا پانی بہت سے پرنالوں کی صورت میں نشیب کی جانب بہہ رہا تھا اور فضا میں صرف اس بہتے پانی کا ہی شور نمایاں تھا۔ شاید دنیا کی بہترین موسیقی اِسی شفاف پانی کے بہنے کی آواز میں کہیں مضمر ہوتی ہے۔ میں کچھ دیر وہیں صحن میں کھڑا پانی کی باتیں سنتا رہا۔ جو مجھے یہ سمجھانے کی کوشش کر رہی تھیں کہ دنیا میں سب کچھ خراب ہونے کے باوجود اب بھی کچھ ایسی چیزیں ہیں جو قدرت نے ہمارے لیے بچا کر رکھی ہیں۔ یہ آسمان، یہ بادل، یہ راستے، یہ ہوا......اور یہ برستی بارش کی بوندیں...... بہت کچھ باقی ہے ابھی یہ بے زار جیون بتانے کے لیے......

درگاہ کے کچے صحن میں بارش کا پانی جمع ہونے لگا تھا۔ میں نے پاس رکھی ایک پرانی اخبار کی کشتی بنائی اور اس پانی میں چھوڑ دی۔ ایک پل میں ہی میں اپنے بچپن کے بارش کے پانی اور کاغذ کی کشتی کے کھیل کی یاد میں ایسا کھویا کہ تیز بارش کی بوندوں نے میرا وہ کاغذی سفینہ کب بھگو کر ڈبو دیا، مجھے اس کی بھی خبر نہ ہو سکی۔ باہر کسی آہٹ کی آواز نے جب تک مجھے چونکایا تب تک میری کشتی پوری طرح بھیگ کر کھل چکی تھی اور اب پانی میں صرف اخبار کا ہی وہ ٹکڑا بہہ رہا تھا جس سے میں نے وہ کشتی بنائی تھی۔ کچھ بھی تو نہیں بدلا تھا۔ سب کچھ ویسا ہی تو تھا، حتیٰ کہ میرے وہ آنسو بھی جو بچپن میں یوں اپنی کشتی کو ڈوبتے دیکھ کر میری آنکھوں سے بہہ نکلتے تھے۔ کسی کے قدموں کی چاپ سن کر میں نے جلدی سے اپنی آنکھیں پونچھ ڈالیں۔ آنے والا بشیرا تھا، جو اُوپر آتے آتے پوری طرح بھیگ کر اب باقاعدہ کانپ رہا تھا۔ میں جلدی سے کھڑا ہو گیا۔

''خیر تو ہے بشیرے......اتنی صبح......ایسے......؟''

اتنے میں اصغر صاحب بھی اپنے کمرے سے نکل آئے۔ بشیرے نے جلدی سے میرے بڑھائے ہوئے خشک تولیے سے اپنا سر خشک کرنے کی ناکام کوشش کی۔ ''خیر نہیں ہے جناب......کل شام سے لاریب بی بی کی طبیعت بہت خراب ہے۔ ساری رات شدید بخار میں تڑپتی رہی ہیں...... خان صاحب نے آج صدقے اور نیاز کی دیگیں چڑھانے کا فیصلہ کیا ہے اور آپ کو بھی دعا کے لیے بلوایا ہے۔ ظہر کی نماز کے بعد نیاز بانٹنی ہے۔ آپ اس سے پہلے ہی

ہنچ جانا...... دعا آپ نے ہی کرنی ہے۔ خان صاحب کی گاڑی آپ کو لینے آ جائے گی۔ میں ب تک لکڑیاں اور مٹی کا تیل وغیرہ حویلی پہنچا آؤں۔ بس آپ تیار رہیے گا۔'' بشیرا جیسے چھپ پھپ کرتا آیا تھا ویسے ہی سڑ سڑ کرتا اور بھیگتا ہوا واپس چلا گیا۔ میں نے اُسے بہت کہا کہ رگاہ کی چھتری لیتا جائے لیکن اُس نے یہ کہہ کر مجھے لاجواب کر دیا کہ ''اوباؤ...... ان بارش کے قطروں سے بچنا نہیں چاہیے...... یہ تو رب ہماری رُوح کو دھونے کے لیے آسمان سے رساتا ہے......''

اصغر صاحب چپ چاپ کھڑے ہماری ساری باتیں سنتے رہے۔ بشیرے کے جانے کے بعد انہوں نے مجھے کچھ ایسی نظروں سے دیکھا جیسے کہہ رہے ہوں کہ ''دیکھا...... میں نے کہا تھا نا......؟''

وہ نازک لڑکی محبت نامی اس زہریلے ناگ کا پہلا وار ہی برداشت نہیں کر پائی۔ زہر اس تیزی سے اُس کی کومل نسوں میں پھیل رہا تھا کہ وہ نڈھال ہو کر بستر سے لگ چکی تھی۔ اور کیسی ستم ظریفی تھی کہ اُس کے مندمل ہونے کی دعا کے لیے بھی اُسی کو طلب کیا جا رہا تھا جو خود اُن زخموں کا باعث تھا۔ گویا قاتل کو ہی مسیحائی کے لیے بلایا جا رہا تھا۔ ایک بار جی میں آیا کہ کوئی بھی بہانہ کر کے حویلی نہ جاؤں لیکن اصغر صاحب شاید میری سوچیں ہی پڑھ رہے تھے۔ وہ بول پڑے۔ ''تمہیں جانا چاہیے......تمہی اُس کا زخم اور تمہی مرہم ہو......نہیں جاؤ گے تو زخم اور گہرا ہو جائے گا۔ ہاں البتہ چلے جاؤ گے تو زخم تو لگے گا لیکن ساتھ ہی کچھ مرہم بھی دے آؤ گے...... سو میرا مشورہ یہی ہے کہ چلے جاؤ......اور کوشش کرنا کہ زخم کے مقابلے میں مرہم زیادہ بانٹ پاؤ......''

''لیکن کیسے......؟'' میں چلا اُٹھا...... اس معصوم لڑکی کے ساتھ ایسا کیوں ہو رہا ہے......؟......آخر اُس نے کسی کا کیا بگاڑا ہے؟ اُس کی ہنسی کیوں چھین لی گئی......؟ یہ زخم اُس کا مقدر کیوں بن گئے ہیں؟...... میں نے تو کبھی ایسا نہیں چاہا تھا......''

''جب تم پر تقدیر کا وار ہوا تھا تب تمہارا کیا قصور تھا؟ تم نے کسی کا کیا بگاڑا تھا؟ تمہارے مقدر میں ہی عشق کا وہ کاری وار کیوں لکھ دیا گیا تھا جس نے ایک پل میں ہی تمہاری دنیا بدل دی؟ ان سب سوالوں کے جواب میں تمہارے پاس......؟......نہیں...... کسی کا کوئی

قصور نہیں ہوتا، لیکن بعض سزائیں بنا کسی جرم کے بھی تو بھگتنا پڑتی ہیں۔ ہم تو اس دنیا میں آئے ہی بھگتنے کے لیے ہیں۔ سو جب تک ایک بھی سانس باقی ہے، بھگتتے ہی رہیں گے۔"

اصغر صاحب ٹھیک ہی کہہ رہے تھے۔ محبت کسی ناکردہ گناہ کی سزا ہی تو تھی۔ یہ سزا ملتی بھی دونوں کو تھی۔ جس نے محبت کی وہ تو خطاوار ٹھہرتا ہی ہے، یہاں تو اُسے بھی سولی پر لٹکنا پڑتا ہے جس سے دوسرے کو محبت ہو جاتی ہے...... محبت ہمیشہ دو ایسے لوگوں کے درمیان ہی کیوں وارد ہوتی ہے جن کا ملن دنیا کے ناممکنات میں سے ایک ہوتا ہے؟...... کیا صرف "لاحاصل" کا نام ہی عشق ہے؟ اور جو حاصل ہو جائے وہ محبت نہیں...... کیا "حاصل" کا درجہ عشق سے گر کر صرف ایک کامیابی کی طمانیت ہی رہ جاتا ہے......؟

میں ظہر سے پہلے ہی حویلی پہنچ گیا۔ بارش تھی کہ رُکنے کا نام ہی بھول چکی تھی۔ خان صاحب بیرونی ڈیوڑھی میں ہی چادر کی چھتوں والے سائبان کے نیچے اپنی نگرانی میں دس بارہ دیگیں پکوائی کے بعد انگاروں پر چڑھوا رہے تھے۔ مجھے گاڑی سے اُترتے دیکھ کر جلدی سے میری جانب لپکے۔ "اچھا ہوا تم جلدی آ گئے عبداللہ میاں...... میری تو پریشانی میں مت ہی ماری گئی ہے۔ شہر سے ڈاکٹرنی بھی بلوالی گئی ہے لیکن اُسے بھی بخار نہ اُترنے کی وجہ سمجھ نہیں آ رہی...... وہ میرے ہاتھ کا چھالا ہے...... میں اُسے اتنی اذیت میں نہیں دیکھ سکتا...... ساری رات وہ نیم بے ہوشی کی حالت میں بڑی ہذیان بولتی رہی ہے۔ کہیں یہ کوئی سائے وغیرہ کا چکر تو نہیں ہے......؟"

اب میں انہیں کیا بتاتا کہ محبت تو خود سب سے بڑا آسیب ہے۔ لیکن اس معصوم لڑکی کو تو شاید ابھی تک یہ بھی نہیں پتا تھا کہ اُس پر محبت نامی اس عفریت کا سایہ اپنے پنجے گاڑھ رہا ہے۔ اگر اصغر صاحب مجھے پہلے یہ خبردار نہ کر چکے ہوتے شاید مجھے خود بھی اس حقیقت کا ادراک بہت دیر میں ہوتا۔ حیرت ہے ان بڑے بڑے سائنس دانوں، حکیموں اور ڈاکٹروں نے صدیاں لگا کر ہر بیماری کا علاج دریافت کر لیا تھا۔ انسان ترقی کرتے کرتے اب چاند پر اپنی کالونیاں بنانے کا سوچ رہا ہے، لیکن محبت نامی اس بیماری کا کوئی علاج کیوں نہیں دریافت کر پائے تھے۔ کیوں ہمارے خون میں موجود ان زہریلے مادوں کا کوئی کھوج نہیں لگا پائے تھے جو ہماری اس پہلی نظر کے مرکب سے مل کر اس عشق نامی ناسور کا باعث بن جاتے تھے۔

ہاں...... یہ محبت ایک سرطان کی صورت میں تو ہمارے سارے جسم میں پھیل جاتی ہے۔ تو پھر جسم کے باقی سرطان کی طرح ہم ہسپتال جا کر اپنے جسم کے اس کینسر کو کیوں نہیں باہر نکلوا سکتے؟ کیوں باقی ناسوروں کی طرح کٹوا کر نہیں پھینک سکتے......؟

کچھ ہی دیر میں ساری دیگیں تیار ہو گئیں۔ حویلی کے بیرونی احاطے میں ہی شامیانے لگا کر اور ان کی چھتوں پر بڑی بڑی پلاسٹک کی شیٹس ڈال کر کھانے کا انتظام کیا گیا تھا۔ اور دُور دراز کے علاقوں میں بھی نیاز بانٹنے کا بندوبست کیا گیا تھا۔ گاؤں کی مسجد کے امام نے دیگوں کے کھلنے پر ہر دیگ میں سے کچھ چاول اور زردہ وغیرہ لے کر اس پر دعا پڑھ کر دم کیا۔ خان صاحب نے خصوصی طور پر مجھ سے بھی دعا کروائی اور پھر سب دیگیں گاؤں کے لوگوں اور دیگر غربا میں بانٹ دی گئیں۔ عصر کے وقت تک ہم اس فریضے سے مکمل طور پر فارغ ہو چکے تھے۔

اس اثناء میں اندر سے بڑی مالکن کا دو تین بار پیغام آ چکا تھا کہ میں ذرا فارغ ہو چکوں تو اُن سے اندر آ کر مل لوں۔ تیسری بار جب کرم دین اندر سے پیغام لے کر آیا تو خان صاحب نے میری جانب دیکھا اور ہلکے سے مسکائے۔

"عبداللہ میاں...... تم اندر مل آؤ اُن سے...... ورنہ یہ پیغام آتے ہی رہیں گے۔ میں بھی بس ان سب کو نپٹا کر آتا ہوں...... چائے ہم بڑے کمرے میں ہی پئیں گے۔ جلدی نکلنے کی نہ کرنا۔"

میری کوشش یہی تھی کہ میں اور خان صاحب اکٹھے ہی اندر جائیں لیکن آخر کار مجھے اکیلے ہی حویلی کی دوسری ڈیوڑھی پار کرنا پڑی۔ بڑی مالکن سامنے والے برآمدے میں ہی موتیے کی باڑھ کے پیچھے والے حصے میں بے چینی سے ٹہل رہی تھیں۔ مجھے دیکھا تو تیزی سے میری جانب لپکیں۔ اُن سے پتا چلا کہ لاریب کا بخار اب بھی ویسا ہی ہے۔ پھر اُن کی آنکھوں میں نمی سی تیر گئی۔

"عبداللہ...... تم لاریب سے ملو گے نہیں...... دیکھو گے نہیں کہ میرا وہ پھول کیسے کملا سا گیا ہے...... میری وہ مینا اپنی ساری باتیں، اپنی تمام چہکار کیسے بھول گئی ہے...... مجھے یقین ہے کہ تمہارے پاس اُس کی تسلی کے لیے وہ لفظ ضرور موجود ہوں گے جو اُس کے جلتے وجود کو جلا بخش سکتے ہیں۔ اُسے تم ہی سمجھا سکتے ہو کہ......"

بڑی مالکن بولتے بولتے خاموش ہو گئیں۔ شاید وہ اپنے الفاظ کھو بیٹھی تھیں۔ لیکن اُن کی اس خاموشی نے بھی سب کچھ کہہ ڈالا۔ میں نے چونک کر انہیں دیکھا گویا انہیں بھی کہیں نہ کہیں اور کسی نہ کسی طور پر اس فسانے کی خبر ہو چکی تھی، یا پھر یہ بھی ہو سکتا ہے کہ خود لاریب کے منہ سے ہذیانی کیفیت میں کچھ نکل گیا ہو۔ میں کچھ دیر تذبذب میں رہا۔ خود میرے لفظ بھی کہاں میرے اختیار میں تھے۔

''کیا آپ سمجھتی ہیں کہ میرا اُس سے ملنا ٹھیک ہوگا۔ میرا مطلب ہے میں...... آپ سمجھ رہی ہیں نا......''

''ہاں...... میں سمجھ رہی ہوں...... لیکن تمہارے علاوہ کوئی اور مسیحا بھی تو نہیں...... ابھی اُس کا گھاؤ بہت تازہ ہے اور اُسے شاید خود بھی اس جان لیوا جذبے کا پوری طرح ادراک نہیں ہے جو اُس کے اندر پل رہا ہے۔ خدا کے لیے اُسے روک دو۔ اُس کے معصوم اور چھوٹے جذبے کو بکھرنے سے پہلے ہی کسی طرح پلٹ دو...... یہ ہم سب پر تمہارا کتنا بڑا احسان ہوگا یہ تم نہیں جانتے......'' بولتے بولتے اُن کی آواز بھرا سی گئی اور وہ اپنے آنسوؤں پر قابو نہیں رکھ سکیں۔ میں سر جھکائے اُن کے سامنے کھڑا تھا۔ ''میں کوشش کروں گا کہ آپ کے اعتبار کے بھرم پر پورا اُتر سکوں۔ آپ کہیں تو میں آج ہی ہمیشہ کے لیے بنا کسی کو کچھ بتائے یہاں سے اتنی دُور چلا جاؤں گا جہاں کسی کو کبھی میری کوئی خبر نہیں مل پائے گی...... کاش میں کبھی جبل پور نہ آتا...... میں آپ سے بے حد شرمندہ ہوں......''

انہوں نے آگے بڑھ کر میرے سر پر ہاتھ پھیرا۔ ''ایسا کہہ کر ہمیں شرمندہ نہ کرو...... میں جانتی ہوں کہ تم اندر سے کتنے شفاف ہو...... اور پھر تمہارے دُور جانے سے لاریب کے اندر جنم لیتا جذبہ بھی تو دُور نہیں چلا جائے گا۔ آج مجھے یہ کہنے میں بھی ذرا سی عار محسوس نہیں ہوتی کہ اگر تمہارا من پہلے ہی سے زہرا سے نہ بندھا ہوتا تو میں کسی بھی طرح تمہیں تم سے لاریب کے لیے مانگ لیتی۔ کیوں کہ وہ صرف میری بیٹی ہی نہیں میری سب سے عزیز از جان سہیلی بھی ہے۔ اور میں اپنی سہیلی کو ذرا سی تکلیف میں دیکھ کر تڑپ اُٹھتی ہوں۔ پل پل مرتی رہتی ہوں۔ اور مجھے اپنی دوست کی ہر پسند پر ہمیشہ فخر رہا ہے...... اور آج بھی مجھے اُس کے انتخاب پر رشک آ رہا ہے...... کاش یہ انتخاب ہی اُس کا مقدر بھی ہوتا...... لیکن کیا کریں کہ ہمارا

زور نصیبوں کے لکھے پر چل نہیں پاتا......'' میں چپ رہا اور اُن کے نقش قدم پر چلتا ہوا لاریب کے کمرے میں داخل ہو گیا جہاں ایک خادمہ پہلے ہی اُس کے سرہانے بیٹھی اُس کا سر دبا رہی تھی۔ باہر بارش اور بادلوں کی وجہ سے کمرے میں ملگجا سا اندھیرا پھیلا ہوا تھا اور مجھے چاروں طرف کتابوں کے ریک اور شیلف بھرے پڑے نظر آئے۔ غالبؔ، میرؔ، دردؔ، اقبالؔ، فرازؔ...... اوہ...... تو گویا اُس نے اپنی رُوح کے قتل کا بندوبست پہلے ہی کر رکھا تھا۔ یہ شاعری ہی تو اپنے اثر سے ہمارے اندر کے بند دروازے کھولتی جاتی ہے۔ اور پھر ہم خود ہی اپنے دل کے اندر گھس آنے والے دَرانداز جذبوں کی دہائی دیتے پھرتے ہیں۔

لاریب آنکھیں موندھے لیٹی ہوئی تھی۔ ایک گرم لحاف نے اُسے ڈھک رکھا تھا اور اُس کے چہرے پر برسوں کی پیلاہٹ اور زردی نمایاں تھی۔ لیکن پھر بھی اُس کے چہرے کے نور سے جو ایک ہالہ سا بنتا تھا وہ غیر مرئی ہالہ آج بھی اپنا سفید نور بکھیر رہا تھا۔ بڑی مالکن نے لاریب کے سر پر ہاتھ پھیرا۔ خادمہ اُٹھ کر باہر نکل چکی تھی۔ ''لاریب...... دیکھو تم سے ملنے کون آیا ہے......''

آہٹ سن کر لاریب نے دھیرے دھیرے آنکھیں کھول دیں اور پھر مجھ پر نظر پڑتے ہی اُسے حیرت کا شدید جھٹکا سا لگا اور اُس نے جلدی سے اُٹھنے کی کوشش کی لیکن بڑی مالکن نے جلدی سے اُسے سہارا دے کر اُس کے لیے تکیے کا ٹیک بنا دیا۔ وہ اب بھی ہڑبڑائی ہوئی سی تھی۔ اُس نے جلدی سے اپنے بکھرے ہوئے بال باندھنے کی کوشش کی۔

''ارے آپ......؟...... یہاں؟...... کتنی خوشگوار حیرت ہو رہی ہے مجھے۔ میں بتا نہیں سکتی......'' وہ جو کچھ کہہ رہی تھی وہ اُس کے چہرے کی پیلاہٹ کے سرخی میں بدلنے سے بھی عیاں ہو رہا تھا۔ مجھے پھر ان جذبوں کی طاقت پر رشک آیا۔ سب سے بڑے حکیم اور سب سے بڑے طبیب تو خود ہمارے اندر ان جذبوں کی صورت میں پل رہے ہوتے ہیں، پھر نہ جانے کیوں ہم ان بیرونی ویدوں کے پیچھے دوڑے پھرتے ہیں؟

میں نے پاس پڑی کرسی کھینچ لی اور بیٹھتے ہوئے اُس سے پوچھا۔

''یہ کیا حال بنا رکھا ہے آپ نے...... اگر غالبؔ کو پڑھتی ہیں تو پھر یہ بھی ذہن میں رکھنا چاہیے کہ اُس نے بیمار ہونے کے لیے کسی تیماردار کے نہ ہونے کی شرط بھی لگا رکھی ہے۔

جب کہ آپ تو یہاں پورا ایک میلہ سجائے بیٹھی ہیں اپنے تیمارداروں کا...... حتیٰ کہ مجھے بھی یہاں تک آنے پر مجبور کر ہی ڈالا۔"

میری بات سن کر وہ اختیار کھلکھلا کر ہنس پڑی۔ وہ جھرنا پھر سے پُرشور آواز کے ساتھ بہہ کر نکلا اور پوری حویلی کے در و دیوار پر چھا گیا۔ بڑی مالکن غور سے اپنی سہیلی کو دیکھتی رہیں اور اُن کی آنکھیں غیر محسوس طور پر بھیگتی رہیں جنہیں وہ کسی نہ کسی بہانے سے اب تک پونچھتی ہی آتیں تھیں۔ وہ ہنس کر بولی۔

"بس یہیں میں غالب سے اتفاق نہیں کرتی۔ بھلا ایسے بیمار پڑنے کا فائدہ ہی کیا کہ کوئی آس پاس تیمارداری اور نخرے اُٹھانے کے لیے موجود ہی نہ ہو۔ جناب ہم تو اپنے ساتھ ہی سبھی کو بیمار کرنے کے قائل ہیں یعنی پڑیے گر بیمار...... تو سب ہوں آس پاس بیمار...... کیوں ٹھیک ہے نا......"

کچھ ہی دیر میں وہ اپنی بیماری بھول کر ہمارے ساتھ بحث کر رہی تھی۔ بڑی مالکن نے درمیان میں چائے کا انتظام کروانے کے لیے کچھ دیر کی مہلت مانگی اور میں اور لاریب کمرے میں تنہا رہ گئے۔ میں نے غور سے اُس پری کی جانب دیکھا۔

"آپ کے ماں باپ آپ سے بہت محبت کرتے ہیں۔ آپ کی ذرا سی تکلیف پر تڑپ اُٹھتے ہیں۔ آپ سے زیادہ بیمار پڑ جاتے ہیں۔ ایسے میں آپ کو بہت احتیاط کی ضرورت ہے۔ آپ کے اِردگرد کانچ کے لوگ رہتے ہیں...... جن کی خاطر آپ کو خود اپنے اندر کا شیشہ بہت سنبھال کر رکھنا ہوگا۔ ورنہ یقین جانیے آپ سے پہلے ان انمول رشتوں کو کچھ ہو جائے گا...... آپ کو اِس خزانے کی حفاظت بھی کرنی ہوگی......"

وہ میری بات سن کر چونک سی گئی۔

"آپ ٹھیک کہتے ہیں...... میں اپنی سی پوری کوشش بھی کرتی ہوں لیکن نہ جانے کچھ دن سے مجھے کیا ہوتا جا رہا ہے...... میرا خود اپنے اُوپر سے اختیار گھٹتا جا رہا ہے...... میں آپ سے چھپاؤں گی نہیں...... شاید آپ کو سن کر بُرا بھی لگے لیکن پتا نہیں کیوں جس دن سے آپ کی امی سے مجھے آپ کی کہانی کے بارے میں پتا چلا ہے میں تب سے نہ چاہتے ہوئے بھی ہر لمحہ آپ ہی کے بارے میں سوچتی رہتی ہوں۔ مجھے آپ کے جذبے کی طاقت اور سچائی پر رشک آتا ہے

اور میں خود اپنے آپ کو بھی ایسے ہی کسی جذبے کے تحت بہتے ہوئے محسوس کرتی ہوں۔ میں آپ کی بے حد عزت کرتی ہوں اور یہ عزت ہر پل مجھے اپنے اندر پلتی اور بڑھتی محسوس ہوتی ہے۔ کبھی کبھی تو میں خود اپنے اندر ہوتی ان تبدیلیوں کا سوچ کر ہی خوف زدہ ہو جاتی ہوں۔ میں جانتی ہوں کہ آپ اپنی رُوح کے آخری ریشے تک کسی اور کی محبت میں مبتلا ہیں۔ اور میں اس بات سے ڈرتی ہوں کہ کہیں آپ، یا باقی دنیا میرے اندر پلتے اس الوہی جذبے کو کچھ غلط نہ سمجھ لیں۔ کسی عام رشتے کا نام نہ دے دیں۔"

وہ سر جھکائے بولتی رہی۔ میں نے چونک کر اُس کی جانب دیکھا۔ آج پہلی بار اُس نے اتنا کھل کر اپنا مدعا بیان کیا تھا۔ کمرے میں مکمل خاموشی طاری تھی اور باہر کھڑکی سے تیز بارش کی گرتی بوندوں کا شور میری اور اُس کی رُوح کے درمیان رابطے کا کام کر رہا تھا۔

دوسری منت

پھر آخر کار میں نے ہی خاموشی توڑی۔

''آپ نے یہ کیسے سمجھ لیا کہ میں، یا آپ کے اِردگرد بسنے والا کوئی بھی ذی رُوح کبھی بھی آپ کے کسی بھی جذبے کو غلط ہونے کا الزام دینے کا سوچ بھی سکتا ہے۔ ہم سب آپ کے اندر کے شفاف اور کومل جذبوں کی اُتنی ہی قدر کرتے ہیں جس کے وہ حق دار ہیں۔ اور آپ کی سچائی تو آپ کے اندر چلتی اُس جنگ سے اور بھی واضح ہوتی ہے جس کی شدت نے آپ کو یوں بستر پر لا پھینکا ہے۔ یقین جانیئے ہم سب کے دلوں میں آپ کی عزت مزید بڑھ گئی ہے۔ بس میری آپ سے اتنی درخواست ہے کہ ایسے ہر جذبے کو اپنی طاقت بنا لیں۔ اُسے اپنے اندر خود پر حاوی ہو کر آپ کو کمزور نہ کرنے دیں حالانکہ میں جانتا ہوں کہ میں جو کہہ رہا ہوں وہ بہت مشکل کام ہے لیکن آپ جیسی سچی، شفاف اور کومل من کی لڑکی سے میں ہر معجزے کی اُمید رکھتا ہوں......''

وہ غور سے میری جانب دیکھتی رہی۔ ''میں نے کہا تھا نا...... آپ کو اپنے لفظوں پر خوب اختیار حاصل ہے...... خوب چن چن کر یہ خزانہ استعمال کرتے ہیں آپ۔'' پھر نہ جانے کیا سوچ کر اُس کے ہونٹوں پر ہلکی سی مسکراہٹ آ گئی۔ ''چلیں...... آج آپ سے یہ وعدہ بھی رہا کہ میں اپنے اندر کی اس جنگ پر قابو پانے کی کوشش ضرور کروں گی۔ لیکن آپ خود بھی جانتے ہیں کہ ایسی جنگیں جیتنے کے لیے ہم کمزور انسانوں کے پاس کوئی ہتھیار، کوئی آلہ نہیں ہوتا۔ تبھی عام طور پر ہماری شکست ہوتی ہے اور ان جذبوں کی جیت...... آپ خود بھی تو ابتدا میں ایک ایسی ہی جنگ ہار چکے ہیں...... دعا کیجیے گا کہ خدا مجھے بھی آپ جیسا ظرف عطا کرے...... میں بھی اتنی ہی ثابت قدم اور چٹان جیسی مضبوط بن سکوں کہ میرے اندر چلتے طوفان میری ظاہری ہیئت کو بگاڑ نہ سکیں اور آس پاس کے لوگوں کو اس کی خبر نہ ہو سکے...... بولیں...... دعا کریں گے نا میرے لیے......؟''

''میری ہر دعا میں آپ تا عمر شامل رہیں گی۔''

اتنے میں دروازے کی جانب سے آہٹ بلند ہوئی اور خان صاحب بڑی مالکن کے ساتھ کھنکارتے ہوئے کمرے میں داخل ہو گئے۔ کچھ ہی دیر میں خادمہ نے چائے بھی اُسی کمرے میں ٹرالی پر سجا دی۔ میں نے چائے ختم کر کے خان صاحب سے اجازت چاہی۔ بڑی مالکن نے میرے سر پر ہاتھ رکھ کر دعا دی۔ میں نے لاریب کو خدا حافظ کہا اور خان صاحب کے ساتھ کمرے سے باہر نکل آیا۔ مجھے رُخصت کرنے سے پہلے انہیں نہ جانے کیا ہوا کہ انہوں نے زور سے بھینچ کر مجھے اپنے گلے سے لگا لیا اور اُن کی آنکھیں بھیگ گئیں۔ ''آج نہ جانے کیوں تم جیسے ایک بیٹے کی کمی بہت شدت سے محسوس ہو رہی ہے......'' میں کچھ بوکھلا سا گیا۔

''آپ ایسے کیوں کہہ رہے ہیں؟...... کیا میں آپ کا بیٹا نہیں ہوں......؟'' انہوں نے اپنی نم پلکیں پونچھیں ''ہاں...... واقعی آج تم نے ایک بیٹے سے زیادہ بڑھ کر بیٹے کا حق ادا کیا ہے۔ ایک بیٹی کے باپ کو اس سے زیادہ بھلا اور کیا چاہیے ہوگا......'' میں نے حیرت سے اُن کی جانب دیکھا اور پھر وہ چھپا نہیں پائے کہ وہ میری اور لاریب کی ساری گفتگو سن چکے ہیں۔ دراصل باہر کھانا کھلانے سے فارغ ہو کر وہ واپس آئے تب انہوں نے لاریب کے کمرے کا رُخ کیا۔ ٹھیک اُسی وقت بڑی مالکن جو چائے کے لیے کمرے سے نکل چکی تھیں انہیں لاریب کے کمرے کی جانب بڑھتے دیکھ کر روک لیا۔ انہیں حیرت ہوئی کہ وہ کیا کہنا چاہتی ہیں لیکن پھر دروازے کے قریب ہونے کی وجہ سے خود اُن کے کان بھی ہماری باتوں کی جانب لگ گئے اور پھر ہر بات انہیں سمجھ میں آتی گئی۔ شاید بڑی مالکن اُس وقت کمرے سے جان بوجھ کر باہر نکلی تھیں تاکہ اُن کی دوست اُن کی سہیلی بنا کسی جھجک کے اپنے دل کی بات مجھ سے کر سکے۔ شاید یہ اُن کا مجھ پر حد سے گزرا ہوا مان بھی تھا اور اِسی مان کا بھرم خان صاحب نے بھی بڑی مالکن کی بات مان کر رکھ لیا تھا۔ میں جانتا تھا کہ مجھے یہ سب بتاتے ہوئے اُن کے اندر کے شفیق باپ کو کس وقت کا سامنا کرنا پڑا ہوگا۔ لہٰذا اب اِسی مان کے آبگینے کا بھرم رکھنا میرا بھی فرض ہو گیا تھا۔ میں نے اُن کے کاندھے پر ہاتھ رکھ کر انہیں تسلی دی۔

''آپ بے فکر رہیں لاریب بہت جلد ٹھیک ہو جائے گی...... آپ بہت خوش قسمت ہیں خان صاحب کہ آپ کو خدا نے لاریب جیسی بیٹی دی ہے...... اور ایسے انمول تحفوں کی حفاظت

دینے والا خود کرتا ہے...... اور ایک بات ہمیشہ یاد رکھیے گا کہ رشتے صرف خون ہی نہیں بناتا...... بلکہ کبھی کبھی تو خون سے بنے رشتے صرف ایک مجبوری بن کر ہمارے ساتھ چلتے رہتے ہیں۔ اصل رشتے وہ ہوتے ہیں جو ہم خود اپنی مرضی سے بناتے اور چنتے ہیں...... جیسا کہ میرا آپ سے، بڑی مالکن سے اور لاریب سے رشتہ ہے...... جو ہم سب نے خود چنا ہے اور ہم سب ہی اس رشتے کی بے حد عزت کرتے ہیں......اسے جان سے عزیز جانتے ہیں۔''

میں انہیں گلے لگا کر درگاہ کے لیے پلٹ گیا۔ وہ دیر تک وہیں ڈیوڑھی میں کھڑے گاڑی کو دُور جاتا دیکھتے رہے۔ میرا دل اُس وقت شدت سے بس یہی ایک دعا کر رہا تھا کہ ''اے میرے خدا اس مجبور باپ کے سامنے میری لاج رہ جائے اور وہ خود اپنی ذات کے سامنے سرخرو ہو جائیں۔ اُن کے اندر کا باپ کبھی کسی کے سامنے شرمندہ نہ ہو......''

قدرت نے دنیا میں جتنے بھی رشتے بنائے ہیں اُن میں سب سے مجبور رشتہ شاید باپ کا ہی بنایا گیا ہے، خاص طور پر اگر یہ رشتہ ایک بیٹی سے شدید محبت کرنے والے ایک وضع دار باپ کا ہو، تب اس مجبوری اور بے کسی کی حدیں لامحدود ہوتی ہیں۔

میں جب درگاہ پہنچا تو اصغر صاحب بے چینی سے میرا انتظار کر رہے تھے۔ مجھے دیکھتے ہی لپک کر میری جانب بڑھے۔

''کہاں رہ گئے تھے۔ بڑی دیر لگا دی۔''

میں نے حیرت سے اُن کی جانب دیکھا ''خیریت......؟''

''ہاں...... مجھے میرے مقتول کی اطلاع مل گئی ہے۔ اگلی جمعرات کو پچھلی پہاڑی کی طرف سے آتی ہوئی گاؤں کی کچی سڑک پر مجھے اُس کا ایک خاص مقام پر انتظار کرنا ہوگا اور اُسے وہیں ختم کر کے اپنی آزادی کا پروانہ حاصل کرنا ہوگا۔''

اصغر صاحب کی بات سن کر میرا دل جیسے ایک لمحے میں ہی ڈوب سا گیا۔ لیکن وہ اپنی دُھن میں ہی پُرجوش سے ساری تفصیلات بتاتے رہے کہ کیسے آج چھلاوے نے انہیں درگاہ کے باہر بلوا کر وہ ساری تفصیلات اُن کے حوالے کی تھیں۔ وہ بہت خوش تھے کہ آخرکار اُن کی آزادی کا دن بھی آ ہی گیا تھا۔ بس چند دن ہی تو رہ گئے تھے۔ لیکن تبھی میں نے بھی فیصلہ کر لیا کہ میں اُن کے ہاتھوں سے یہ گناہ کبیرہ سرزد ہونے نہیں دوں گا، چاہے مجھے اس کے لیے کچھ

بھی کرنا پڑے۔ چاہے میری اپنی جان ہی کیوں نہ چلی جائے۔ لیکن انہیں اس آخری جرم سے روکنا میری آخری خواہش بنتی جا رہی تھی۔

کاش اس وقت سلطان بابا وہاں ہوتے تو میں خود کو اس قدر تنہا محسوس نہ کرتا۔ اس رات میں نے دو خط لکھے...... پہلا زہرا اور دوسرا عبداللہ کے نام اور صبح ہوتے ہی دونوں خط نیچے گاؤں کے پوسٹ ماسٹر کو مزید پیسوں اور اس درخواست اور تاکید کے ساتھ پکڑا آیا کہ اسے کسی بھی طرح شام سے پہلے کسی بڑے اسٹیشن سے فوری ڈاک، یا کوریئر کے حوالے کروا دیں کیوں کہ اگلی شام تک ان خطوط کا اپنی منزل تک پہنچنا بہت ضروری ہے۔ پوسٹ ماسٹر نے مجھے اطمینان دلایا کہ وہ اسی وقت صبح نو بجے والی گاڑی سے یہ دونوں خط شہر بھیج دیں گے جہاں سے انہیں اُن کا کوئی ماتحت، یا دوست کوریئر کر دے گا۔ میں نے پوسٹ آفس سے ہی زہرا کے گھر فون کرنے کی کوشش بھی کی لیکن دو دن سے برستی بارش نے ٹیلی فون کی سبھی لائنیں تہس نہس کر رکھی تھیں۔ میں اب صرف یہ دعا ہی کر سکتا تھا کہ میرے دونوں خطوط وقت پر اپنی منزل تک پہنچ جائیں۔ اُس دن بھی بارش نے رُکنے کا نام نہیں لیا اور شام تک بادل اپنا رونا روتے رہے۔ عصر کے بعد کرم دین اور بشیرا آئے۔ بڑی مالکن نے اُن کے ہاتھ خاص اپنے ہاتھ کی بنی ہوئی ماش کی دال کی مٹھائی اور چنے کی دال کا حلوہ ناریل کی قاشوں میں بھر کر بھیجا تھا۔ اصغر صاحب اپنی مسکراتی اور معنی خیز نظروں سے میری جانب دیکھتے رہے۔ میں نے نظر بچا کر کرم دین کا ہاتھ پکڑا اور اُسے ذرا دُور لے جا کر اُس سے اُس کی چھوٹی مالکن کی طبیعت کے بارے میں پوچھا۔ کرم دین فوراً ہی اُداس ہو گیا۔ ''اُن کی حالت کچھ ٹھیک نہیں ہے جی...... شام تک طبیعت کچھ سنبھلی تھی پھر رات کو دوبارہ بخار چڑھ گیا۔ آپ دعا کریں جی کہ وہ جلد بھلی چنگی ہو جائیں...... ہم سب تو اُن کی ہنسی اور اُن کی ڈانٹ پر ہی زندہ ہیں......'' میں نے کرم دین کے کاندھے پر ہاتھ رکھ کر اُسے تسلی دی ''فکر مت کرو...... جو لڑکی اتنے بہت سے لوگوں کی زندگی کا باعث ہو اُسے کچھ نہیں ہو سکتا۔'' بشیرا اور کرم دین زیادہ دیر ٹھہرے نہیں اور چل دیئے۔ اُن کے جانے کے بعد اصغر صاحب نے شرارتی نظروں سے میری جانب دیکھا۔

''کیا بات ہے میاں......؟ بڑی آؤ بھگت ہو رہی ہے...... خوش نصیب ہو......'' میں بھی اُن کی اس شرارت پر مسکرا پڑا۔ ویسے بھی انہیں جب سے اپنی آزادی کی خبر ملی تھی تب سے وہ

بہت خوش رہنے لگے تھے۔ سارا دن کچھ نہ کچھ گنگناتے رہتے تھے۔ اُنہوں نے غور سے میری جانب دیکھا۔

’’کیسی ہے وہ......؟‘‘

گویا انہیں خبر ہوگئی تھی کہ میں کرم دین سے کیا بات کر رہا تھا۔ ’’وہ ٹھیک نہیں ہے...... ایک منت مانگی ہے میں نے بھی آپ کی طرح...... دعا کریں کہ اُس کے لیے مانگی گئی میری وہ منت بھی قبول ہو جائے......‘‘

اور پھر خط بھیجنے کے تیسرے دن یعنی بدھ کی سہ پہر میری منت قبول ہو ہی گئی۔ اُس روز آسمان صبح سے صاف ہو چکا تھا اور چمکتی دھوپ میں ہر دُھلا منظر جگمگا رہا تھا۔ اِسی خیرہ کرتی دھوپ کی نرم کرنوں کے درمیان درگاہ کے احاطے میں میری قسمت کا سورج تب جگمگایا جب میں تھک کر مایوس ہونے کو تھا۔ اصغر صاحب بھی درگاہ کے صحن میں انگوروں کی بیل کی جانب چگتے پرندوں کو دانہ ڈال رہے تھے۔ پہلے اُنہی کی نظر درگاہ کے دوازے کی جانب اُٹھی اور پھر میں نے اُن کی حیران نظروں کے تعاقب میں دیکھا تو خود بھی سب کچھ بھول کر وہیں کھڑے کا کھڑا رہ گیا۔ ہاں...... وہ وہی تھی...... اپنی اُسی آب و تاب کے ساتھ، اُسی شاہانہ جلال کے ساتھ، اُسی کالے نقاب میں، اُسی طرح پانیوں پر تیرتی راج ہنسی کی طرح چل کر آتے ہوئے...... ہاں وہ زہرا ہی تھی۔ مجھے دیکھ کر اُس کی آنکھوں میں چمک اور ہونٹوں پر ہلکی سی مسکراہٹ اُبھر آئی...... میں نے خط لکھ کر اُسے بلا تو لیا تھا اور مجھے یقین بھی تھا کہ وہ میری پکار پر وہاں ہزاروں میل کا فاصلہ طے کر کے پہنچے گی بھی ضرور...... لیکن اس کے باوجود بھی میں اُسے یوں اپنے سامنے پا کر اس طرح گم صم کھڑا تھا جیسے اب بھی وہ کوئی خواب ہی ہو...... میرا سب سے حسین خواب...... وہ میرے سامنے آ کر کھڑی ہوگئی۔ ’’ایسے کیوں دیکھ رہے ہیں...... آپ نے ہی تو بلایا تھا......‘‘

’’ہاں...... لیکن آپ یہاں تک پہنچ بھی گئی ہیں...... مجھے اس کا یقین تو ہو جانے دیں......‘‘

میری بات سن کر اُس کی آنکھوں میں شرارت کی لہر تیر گئی۔

’’آپ کہیں اور ہم نہ آئیں...... ایسے تو حالات نہیں......‘‘

پھر اچانک ہی جیسے مجھے ہوش سا آ گیا۔ ’’لیکن آپ یہاں تک اکیلے...... میرا مطلب ہے......‘‘ ’’نہیں میں اکیلی بھلا یہاں تک کیسے پہنچتی، امی اور ڈرائیور نیچے گاڑی میں ہیں۔ امی کے گھٹنے اتنی چڑھائی کے متحمل نہیں ہو سکتے......‘‘ میں جلدی سے اصغر صاحب سے اجازت لینے کے لیے اُن کی جانب بڑھا۔ وہ پہلے ہی سے حیران کھڑے تھے۔

’’یہ پری کون ہے عبداللہ میاں۔‘‘

’’یہی ہے میری منت...... میری دعا...... اس کو مانگا تھا میں نے خدا سے لاریب کا درد کم کرنے کے لیے۔ زہرا کی اماں نیچے میرا انتظار کر رہی ہیں...... میں انہیں حویلی چھوڑ کر جلد واپس آ جاؤں گا۔‘‘ وہ یوں ہی حیرت زدہ کھڑے رہ گئے۔ میں زہرا کو لیے نیچا پہنچا تو اُس کی امی میرا انتظار کر رہی تھیں۔ جانے اس لمحے مجھے اُن پر اتنا پیار کیوں آ گیا کہ میں سلام کرتے ہی اُن کے گلے لگ گیا۔ وہ بھی بالکل میری امی جیسی ہی تو تھیں۔ اپنی اولاد کے لیے ہر وقت ہر مشکل میں ساتھ دینے کے لیے تیار، ہر خوشی ہر غم میں اُس کے ساتھ اور شریک سفر...... آج بھی وہ میری ایک پکار پر زہرا کے ساتھ یہاں اتنی دُور آ پہنچیں تھیں۔ میں نے اُن کا شکریہ ادا کرنے کی کوشش کی تو انہوں نے ہلکے سے میرا سر تھپتھپا کر مجھے خاموش کروا دیا۔ انہوں نے مجھے بتایا کہ اس بار باقاعدہ زہرا کے ابا سے اجازت لے کر اُسے یہاں تک لائی ہیں۔ وہ خود بھی مجھ سے ملنے کے لیے یہاں آنا چاہتے تھے۔ لیکن ڈاکٹر نے اُن کی بیماری کی وجہ سے انہیں کار کے اتنے لمبے سفر سے منع کر رکھا تھا۔ البتہ انہوں نے اپنی دعاؤں کے ساتھ اپنے خصوصی محافظ اور ڈرائیور کے ساتھ زہرا اور امی کو بھجوایا تھا۔

میں جب زہرا کی گاڑی میں حویلی پہنچا تو خان صاحب اور بڑی مالکن اتنی دُور سے آئے خاص مہمانوں کو اپنے درمیان پا کر نہال ہی تو ہو گئے۔ وہ سب غائبانہ طور پر زہرا کو پہلے ہی سے جانتے تھے اور اُسے یوں اچانک اپنے درمیان پا کر اُن کی خوشی کا کوئی ٹھکانہ نہیں تھا۔ میں نے خط لکھ کر زہرا کو لاریب کے بارے میں بھی کچھ بتا دیا تھا اور یہ بھی کہ اس معصوم لڑکی کی مسیحائی کے لیے مجھے اُس کی شدید ضرورت ہے۔ میری اپنی ایک غرض بھی اس درخواست میں پنہاں تھی۔ میں جمعرات سے پہلے ایک بار زہرا سے ملنا چاہتا تھا کیوں کہ جمعرات کے دن میں نے اصغر صاحب کو اس بھیانک جرم سے روکنے کے لیے خود اس شکار گاہ میں پہنچنے کا فیصلہ کر

لیا تھا جہاں انہیں اپنا آخری جرم سرانجام دینا تھا۔ میں نے اس متوقع مقتول کی جگہ خود لینے کا ارادہ کیا تھا۔ میری کوشش یہی تھی کہ میں کسی بھی طرح اُن کو اس آخری گناہ سے روک سکوں۔ لیکن میں جانتا تھا کہ بات صرف اصغر صاحب کی نہیں ہے۔ میرا واسطہ وہاں اس انجانی مخلوق سے بھی پڑ سکتا تھا اور ضروری نہیں تھا کہ میں زندہ وہاں سے واپس آ پاتا۔ لیکن یہ جوا تو مجھے کھیلنا ہی تھا اور اس آخری بازی سے پہلے میں اپنی زندگی کے سرمائے سے آخری بار مل لینا چاہتا تھا۔ مما اور پپا کو میں نے اس لیے خبر نہیں کی تھی کہ میں آخری لمحوں میں کمزور نہیں پڑنا چاہتا تھا۔

البتہ زہرا کو میں نے اصغر صاحب، یا چھلاوے کی اس داستان کے بارے میں فی الحال کچھ نہیں بتایا تھا۔ اُسے بس لاریب کی بیماری کا ہی پتا تھا اور یہ کہ میں نے اُسے محبت کے گھاؤ کے آخری مرہم کے طور پر جبل پور بلوایا ہے۔ ساری عورتیں ذرا سی دیر میں ہی آپس میں یوں گھل مل چکی تھیں جیسے وہ برسوں سے ایک دوسرے کو جانتی ہوں۔ اندر زنانے کی جانب سے اُن سب کے ہنسنے اور بولنے کی آوازیں یہاں مردانے میں مجھ اور خان صاحب تک بھی آ رہی تھی۔ خان صاحب کو بھی شاید کچھ سمجھ آ رہا تھا کہ میں نے زہرا کو وہاں کیوں بلوایا ہے۔ انہوں نے میرا ہاتھ تھام لیا۔

''عبداللہ میاں...... اور کتنے احسان کرو گے مجھ پر......؟ اُس دن تم نے مجھ سے کہا تھا نا کہ میں بہت خوش نصیب ہوں کہ لاریب جیسا ہیرا میرے پاس ہے۔ تو آج میں تمہیں بتاتا ہوں کہ اس روئے زمین پر تم سے زیادہ خوش نصیب اور کوئی نہیں، جس کے پاس بیک وقت اتنے انمول رشتے موجود ہیں اور اُن میں زہرا جیسا نگینہ بھی شامل ہے۔

میں نے درگاہ واپسی سے پہلے زہرا کو کچھ دیر کے لیے اندرونی ڈیوڑھی میں بلوایا تھا تاکہ اُسے یہ بتا سکوں کہ شاید میں شام کو حویلی نہ آ سکوں کیوں کہ مجھے درگاہ کے چند ضروری کام نپٹانے ہیں۔ وہ کچھ ہی دیر میں وہاں آ گئی...... وہ ابھی تک شرارت کے موڈ میں تھی۔

''کیوں بھئی ساحر صاحب...... اور کہاں کہاں اپنا سحر بکھیرا ہے آپ نے۔ میں تو یہ سمجھی تھی کہ آپ سلطان بابا کا ہاتھ بٹاتے ہوں گے لیکن یہاں تو ماجرا ہی کچھ اور ہے۔''

میں مسکرا دیا۔ ''یہ میرا سحر نہیں...... بس آپ سے ہوئی ایک ملاقات کا اثر ہے۔'' میں نے جلدی جلدی اُسے ساری بات سمجھا دی۔ زہرا غور سے میری بات سنتی رہی۔

''آپ بے فکر رہیں...... میں اپنی پوری کوشش کروں گی کہ آپ کے مجھ پر کیے ہوئے اعتماد کا بھرم رکھ سکوں......''

میں مسکرا کر جانے کے لیے پلٹا تو اُس نے مجھے پیچھے سے آواز دی۔

''ساحر......''

میں نے رُک کر اُس کی جانب دیکھا۔ وہ بھیگی پلکیں لیے کھڑی تھی۔

''مجھے آپ پر فخر ہے...... آپ میرا مان ہیں......''

میں کچھ بھی تو نہیں بول پایا۔ بس اگلے ہی لمحے خود میری آنکھیں بھیگ چکی تھیں۔ مجھے پتا بھی نہیں چلا کہ کب دو آنسو میری آنکھوں سے نکلے اور پھسل کر میرے گالوں تک آ پہنچے۔ پل بھر میں ہی اس دل بر نے میرے سات جنموں کی ریاضت، میری ساری مشقت، ساری محنت کا معاوضہ اپنے پنکھڑی لبوں سے دو لفظ بول کر ادا کر دیا تھا۔ کیا اس حقیر زندگی کو کسی دیوی کے چرنوں کی بھینٹ چڑھانے کے لیے اس سے بہتر کوئی اور پل ہو سکتا تھا۔ کیا اس لمحے کے بعد بھی جینے کی کوئی اور وجہ باقی رہ جاتی تھی......؟ ...... ہم دونوں بھی کتنے عجیب تھے، زمانے میں بچھڑنے والے ایک دوسرے کو رو کر وداع کرتے ہیں...... جب کہ ہم دونوں کی آنکھوں میں اس لیے آنسو تھے کہ ہم ایک دوسرے کو رفتہ رفتہ پا رہے تھے۔ میری آنکھوں میں آنسو دیکھ کر وہ مزید ایک پل بھی وہاں رُک نہیں پائی اور جلدی سے اپنی پلکوں کی شبنم اپنی ہتھیلیوں میں سمیٹتی ہوئی وہاں سے اندر کی جانب بڑھ گئی۔

میں درگاہ پہنچا تو اصغر صاحب کو وہاں موجود نہ پا کر میرا دل دھک سے رہ گیا۔ کہیں اُن کا منصوبہ بدل تو نہیں گیا۔ انہوں نے تو جمعرات کا بتایا تھا مجھے۔ پر کہیں انہوں نے ایک دن پہلے ہی اپنا جرم سرانجام دینے کا فیصلہ تو نہیں کر لیا۔ خدا نے زہرا کو یہاں تک پہنچا کر میری ایک دعا تو پوری کر دی تھی لیکن میری دوسری دعا۔ میرا دوسرا خط میں نے عبداللہ کے نام لکھا تھا کہ کسی بھی طرح سلطان بابا کو جمعرات سے پہلے جبل پور والی درگاہ پہنچنے کا پیغام دے، پتا نہیں اس خط کا کیا بنا؟

میں کچھ دیر وہیں درگاہ میں اصغر صاحب کا انتظار کرتا رہا لیکن پھر بے چین ہو کر درگاہ سے باہر نکل آیا۔ مجھے اصغر صاحب نے پچھلے پہاڑ کی اس پگ ڈنڈی کا بتایا تھا جہاں بنی ہوئی

ایک ٹوٹی پھوٹی متروکہ سی ایک عمارت کے کھنڈر اب بھی موجود تھے۔ جو شاید کسی زمانے میں
کوئی مسافر خانہ، یا ستانے کے لیے کوئی قیام گاہ رہی ہوگی۔ اصغر صاحب نے اِسی کھنڈر میں
وہ خون کرنا تھا۔ میں بے قراری میں اُس مسافر خانے کے کھنڈر کی جانب ہی چل پڑا۔ حالانکہ
میں جانتا تھا کہ وہ کھنڈر یہاں سے تقریباً تین گھنٹے کی مسافت پر ہے اور شام کا اندھیرا اتنی
تیزی سے پھیل رہا تھا کہ رات ہونے سے پہلے میرا وہاں پہنچنا ناممکن تھا۔ لیکن میرے اندر کی
بے قراری میرے قدم بڑھائے جا رہی تھی۔ پھر اچانک دو کوس کے فاصلے پر پہنچتے ہی ایک موڑ
پر مجھے اصغر صاحب کا دُور گھاٹی میں ہیولہ سا دکھائی دیا۔ وہ لمبے لمبے ڈگ بھرتے ہوئے درگاہ
کی جانب ہی چلے آ رہے تھے۔ میں نے شکر ادا کر کے سکون کی ایک لمبی سی سانس لی۔ لیکن
پل بھر میں ہی میری وہی سانس میرے حلق میں اٹک گئی۔ اصغر صاحب کے ہاتھ میں ایک بڑا
سا چاقو تھا جسے وہ آس پاس کی چٹانوں پر تیز کرنے کے سے انداز میں رگڑتے چلے آ رہے
تھے۔ تو کیا انہوں نے خون کر دیا تھا......

اتنے میں اصغر صاحب کی نظر بھی مجھ پر پڑ چکی تھی، وہ کچھ ٹھٹھک کر رُک گئے۔ میں
بھاگتا ہوا اُن کے پاس پہنچ گیا۔ میرا سانس دھونکنی کی طرح چل رہا تھا۔ ”کہاں چلے گئے تھے
آپ؟ میں تو پریشان ہی ہو گیا تھا۔“ وہ حیران سے تھے۔ ”بتایا تو تھا تمہیں کل جمعرات ہے نا۔
میں ذرا کھنڈر تک گیا تھا۔ کچھ ابتدائی انتظامات کرنا تھے...... لیکن تم اس ڈھلتی شام میں کہاں
چل دیئے۔“

میں نے اطمینان کا گہرا سانس لیا۔ گویا میرا شک غلط تھا۔ میں نے انہیں ٹال دیا۔
”کہیں نہیں...... بس آپ درگاہ میں نہیں تھے تو پریشان ہو کر باہر نکل آیا۔ چلیں واپس چلتے
ہیں......“ میں انہیں ساتھ لیے واپس درگاہ آ گیا۔ انہیں اگلی شام سے پہلے کھنڈر پہنچنا تھا اور
کھنڈر میں اُس شخص کا انتظار کرنا تھا۔ اس لحاظ سے مجھے اُن سے بھی پہلے درگاہ سے نکل کر اس
کھنڈر والے راستے پر کسی ایسی جگہ مورچہ لگانا تھا جہاں سے اُس آنے والے شخص پر بھی نگاہ
رکھ سکتا اور اُسے وہاں سے پلٹا کر مجھے خود کھنڈر بھی پہنچنا تھا۔ ساری رات اِسی اُدھیڑ بن میں
گزر گئی۔ صبح کرم دین خان صاحب کا پیغام لے کر آیا کہ انہوں نے دوپہر کے کھانے پر مجھے
حویلی بلوایا ہے۔ اس کے ہاتھ میں زہرا کا لکھا ہوا ایک رُقعہ بھی تھا، جس پر اُس کی جاں فزا تحریر
میں صرف دو سطریں تحریر تھیں کہ

”دل پر لگے وار کافی گہرے اور کاری ہوتے ہیں...... لیکن مطمئن رہیے آپ کا بھیجا ہوا
مسیحا بھی کچھ کم مشاق نہیں...... وہ اپنا زخم آزمائیں ہم اپنا مرہم آزمائیں گے......“

میرے ہونٹوں پر مسکراہٹ آ گئی اور میں نے اُسی رُقعے پر یہ شعر لکھ دیا۔

اُٹھتی رہتی ہے ایک گرد مجھ میں
کون پھرتا ہے دربدر مجھ میں
مجھ کو مجھ میں جگہ نہیں ملتی
وہ ہے موجود اس قدر مجھ میں

میں نے رُقعہ کرم دین کے حوالے کیا اور اُس سے کہا کہ آج میری جانب سے خان صاحب اور مہمانوں سے معذرت کر لے کیونکہ مجھے ایک بہت ضروری کام سے درگاہ سے باہر جانا ہے لہٰذا آج دیر ہو جائے گی۔ زندگی رہی تو فارغ ہوتے ہی خود حویلی حاضر ہو جاؤں گا۔ پتا نہیں سب کو فرداً فرداً سلام دیتے ہوئے میری آواز کیوں بھرا سی گئی۔ کرم دین پلٹ کر چل دیا۔ اصغر صاحب اپنے کمرے میں جانے کن تیاریوں میں لگے ہوئے تھے۔ اُس روز قدرت نے بھی میرے ساتھ کھیلنے کا منصوبہ بنا رکھا تھا۔ شاید دوپہر سے پہلے ہی گھنے بادلوں نے آسمان کو ڈھانپنا شروع کر دیا اور ظہر سے پہلے وہی موسلا دھار جھڑی شروع ہو گئی جو پچھلے ایک ہفتے سے جبل پور کے پہاڑوں کو نہلا رہی تھی۔ میں نے اصغر صاحب سے بہانہ کیا کہ حویلی سے میرے لیے بلاوا آیا ہے لہٰذا میرا جانا ضروری ہے۔ البتہ میں شام ہونے سے پہلے واپس آنے کی کوشش کروں گا۔ وہ خوش دلی سے مسکرائے ”جاؤ میاں جاؤ...... حویلی میں ایک نہیں دو دو پریاں جس شہزادے کا انتظار کر رہی ہوں اُس کا دل بھلا ہم بوڑھوں کے ساتھ کہاں لگے گا۔ جاؤ مل آؤ...... آج جب تم لوٹو گے تب تک میں بھی آزاد ہو چکا ہوں گا......“ بس دعا کرنا کہ آخری لمحے میرے قدم لڑکھڑا نہ جائیں...... بڑی ہمت کی ضرورت ہے۔ میں کتنا بڑا گناہ گار ہی کیوں نہ سہی...... لیکن قتل پھر بھی مجھ سے آج تک سرزد نہیں ہوا......“

میں نے انہیں خدا حافظ کہتے ہوئے دل میں سوچا کہ اگر اللہ نے چاہا تو آج بھی میں انہیں قاتل نہیں بننے دوں گا۔ میں جب درگاہ سے باہر نکلا تو اس خیال سے کہ کہیں وہ مجھے جاتے ہوئے دیکھنے کے لیے باہر نہ نکل آئیں میں نے پہلے پہاڑی سے نیچے سیدھے سڑک کا ہی رُخ کیا۔ جب کہ کھنڈر تک پہنچنے کے لیے مجھے اُوپر کی جانب جانا چاہیے تھا کیونکہ کھنڈر سڑک سے بالکل مخالف سمت میں درگاہ کی پچھلی چوٹی کے پیچھے والی پگ ڈنڈی کی راہ اختیار کرنے سے آتا تھا۔ میرا ارادہ یہ تھا کہ میں کچھ دُور سڑک پر جا کر پہاڑی پر چڑھنے کے لیے ایسا راستہ اختیار کروں گا کہ اصغر صاحب کی نظر میں آئے بنا کھنڈر کی ڈگر تک پہنچ جاؤں لیکن بُرا ہو اس طوفانی بارش اور گھٹا ٹوپ اندھیرے کا جس نے دن کے وقت بھی گہری شام سی کر رکھی تھی۔ مجھ سے اندازے میں کچھ چوک ہو گئی اور جس وقت میں گرتے پڑتے دوبارہ پہاڑ کی چوٹی تک پہنچا اُس وقت عصر کا وقت گزر چکا تھا۔ میرے ہاتھ پاؤں پھولنے لگے تھے۔ سرد ہوا

نے میرا وجود برف کر دیا تھا اور بارش کی بوندیں میرے جسم میں ہزاروں سوئیوں کی طرح چبھ رہی تھیں۔ دُور سے کھنڈر کے آثار نظر آئے تو میرے قدم مزید تیز ہو گئے۔ جانے وہ مسافر کہیں بارش سے چھپتے ہوئے مجھ سے پہلے ہی کھنڈر میں پناہ نہ لے چکا ہو......؟...... ایسے میں اُسے میں کس طرح سمجھا پاؤں گا کہ اُس کا وہاں کھنڈر میں بیٹھ کر بارش رُکنے کا انتظار اُس کے لیے کس قدر خطرناک اور جان لیوا ثابت ہو سکتا ہے...... یا خدا...... مجھے اُس سے پہلے کھنڈر پہنچا دے۔ میں جب کھنڈر میں داخل ہوا تب بھی یہی دعا میرے لبوں پر جاری تھی۔ لیکن شاید وہ دن میری دعائیں رد ہونے کا دن تھا۔ میں جب کھنڈر میں داخل ہوا تبھی مجھے گیلی لکڑیوں کے جلنے سے پیدا ہونے والے دُھویں نے کسی ذی رُوح کی موجودگی کا پتا دے دیا تھا۔ دُھویں کی چادر کے پار کوئی شخص گیلی لکڑیاں جمع کیے انہیں جلانے کی کوشش کر رہا تھا۔ کچھ لکڑیاں سلگ کر آگ پکڑ چکی تھیں لیکن گیلی اور نم ہونے کی وجہ سے بے حد دُھواں پھینک رہی تھیں۔ اس دُھویں کے نیلے مرغولوں کے جھنڈ میں سے اُس شخص نے سر اُٹھایا۔ میرے قدم وہیں جمے کے جمے رہ گئے۔ آسمان پر بجلی زور سے کڑکی اور مجھے یوں لگا کہ یہ بجلی قدرت نے براہ راست مجھ پر ہی گرائی ہے۔ میرے سامنے سلطان بابا بیٹھے ہوئے تھے۔ اُن کو وہاں بیٹھے دیکھ کر میری اُوپر کی سانس اُوپر ہی رہ گئی۔ وہ مجھے اپنے سامنے دیکھ کر خوشی سے نہال ہو گئے۔ ”واللہ ساحر میاں...... یہ تم ہی ہو نا...... میں ابھی تمہارے بارے میں ہی سوچ رہا تھا...... جیسے ہی تمہارا پیغام ملا میں چل پڑا تھا۔ لیکن راستے میں بس خراب ہو گئی۔ میں نے سوچا کہ رات بھر سے پہلے تو اب یہ بس ٹھیک ہو گی نہیں تو کیوں نہ پیدل ہی چلا جائے۔ لیکن بھلا قدرت اپنا زور دکھانے سے کب چوکتی ہے...... سو دیکھو...... راستے میں اس بوچھاڑ نے آ گھیرا اور یہاں اس کھنڈر میں پناہ لینی پڑی......“ پھر جیسے انہیں کچھ یاد آیا ”لیکن تم یہاں کیسے ساحر میاں...... بھئی مان گئے تمہارے الہام کو......“

سلطان بابا مسکرائے۔ مجھے پل بھر کے لیے یوں لگا جیسے سلطان بابا سب کچھ جانتے ہوئے بھی انجان بن رہے ہیں۔ یہ قدرت میرے ساتھ کیسا کھیل کھیل رہی تھی۔ اصغر صاحب کو اس کھنڈر میں کسی ایک شخص کا قتل کرنا تھا اور ستم ظریفی دیکھیے کہ اس ممکنہ مقتول کو اپنا پیغام بھیج کر اس کھنڈر تک بلوانے والا کوئی اور نہیں، میں خود تھا...... اور میں نے بلایا بھی کس کو

تھا......؟ ...... اپنے محسن، اپنے رہبر...... اپنے پیر کامل کو...... یہ مقدر کا میرے ساتھ ایک بھیانک مذاق نہیں تو اور کیا تھا......؟ ...... مجھے سمجھ نہیں آیا کہ میں سلطان بابا سے کیا کہوں۔ میرے منہ سے صرف اتنا نکلا۔ ''آپ یہاں سے چلے جائیں...... یہاں آپ کی جان کو شدید خطرہ ہے......کوئی شخص آپ کی جان کے درپے ہے......''

''کیا کہہ رہے ہو میاں...... بھلا ہم درویشوں کی جان لے کر کسی کو کیا ملے گا......''

میں زچ سا ہو گیا۔ ''آپ میری بات سمجھنے کی کوشش کریں۔ میں یہاں آپ کے استقبال کے لیے نہیں آیا۔ مجھے تو یہ بھی پتا نہیں تھا کہ میرا پیغام آپ تک پہنچا بھی ہے کہ نہیں...... میں تو یہاں اس اجنبی شخص کو بچانے کے لیے آیا تھا جسے یہاں قتل کرنے کا منصوبہ بنایا جا رہا ہے۔'' میں نے جلدی جلدی انہیں اپنے جبل پور آنے سے لے کر آج تک کی ہر بات بتا دی کہ کس طرح چھلاوہ اصغر صاحب کی آزادی کے بدلے اُن سے یہاں کسی کے قتل کا وعدہ لے بیٹھا ہے اور اصغر صاحب اب یہاں پہنچنے ہی والے ہوں گے۔ سلطان بابا نے اطمینان سے میری ساری بات سنی اور سکون سے بولے۔ ''ٹھیک ہے ساحر میاں...... اگر میری آخری سانس یہیں لکھی ہے تو پھر اس سے بھاگنے کا کوئی فائدہ نہیں۔ آنے دو تم اپنے اس چھلاوے کو...... میں بھی تو دیکھوں کہ......''

ابھی سلطان بابا کی بات اُن کے منہ میں ہی تھی کہ اچانک پیچھے سے کوئی زور سے چلایا

''عبداللہ......''

میں گھبرا کر پلٹا تو ڈھلتی شام کے سائے میں میں نے اصغر صاحب کو وحشت بھرے انداز میں ہاتھ میں وہی چاقو لیے کھڑے دیکھا۔ یہ اصغر صاحب اُس درگاہ والے نرم خو اصغر صاحب سے قطعی مختلف تھے اور اُن کی آنکھوں سے میں نے غصے کی چنگاریاں نکلتے ہوئے دیکھیں۔ وہ پھر سے گرجے۔

''تم یہاں کیا کر رہے ہو۔ کیا میں نے تمہیں بتایا نہیں تھا کہ یہ جگہ آج کسی کا مقتل بننے والی ہے۔ پھر بھی تم یہاں چلے آئے...... بڑی حماقت کی تم نے...... اب بھی وقت ہے، جاؤ چلے جاؤ یہاں سے......''

میں اُن کی جانب سے پلٹا۔ ''نہیں نہیں...... آپ غلط سمجھ رہے ہیں۔ یہ میرے سلطان

بابا ہیں۔ انہیں میں نے ہی درگاہ آنے کی دعوت دی تھی۔ یہ وہ نہیں جس کا آپ کو انتظار ہے......'' اصغر صاحب کو جواب دینے کی مہلت نہیں ملی۔ اندھیرے میں بجلی زور سے چمکی اور کھنڈر کی منڈیر پر میں نے ملگجے اندھیرے میں وہی دو آنکھیں چمکتی ہوئی دیکھیں۔ وہی شخص منڈیر پر اکڑوں بیٹھا ہوا تھا جسے میں اس سے پہلے ٹرین اور پھر درگاہ کے باہر دیکھ چکا تھا۔ وہ زور سے چلایا۔

''نہیں...... یہ وہی ہے جس کا آج خاتمہ ہونا اٹل ہے۔ دیر مت کرو اصغر...... تمہارا شکار تمہارے سامنے ہے۔ اس لڑکے کی پروا نہ کرو...... یہ تمہارا کچھ نہیں بگاڑ سکتا...... آگے بڑھ کر وار کرو...... تمہاری آزادی تم سے صرف چند قدم کے فاصلے پر ہے......'' میں جلدی سے آگے بڑھ کر سلطان بابا کے سامنے کھڑا ہو گیا۔

''خبردار...... ان کی جانب بڑھتی ہر چیز کو پہلے مجھے پار کرنا ہوگا۔''

وہ زور سے چلایا ''دیر مت کرو اصغر...... اس لڑکے کو بھی راستے سے صاف کر دو...... خس کم جہاں پاک......''

سلطان بابا سکون سے اپنی جگہ پر کھڑے اپنی مخصوص تسبیح گھما رہے تھے، وہ مجھے ہٹا کر میرے سامنے آ گئے اور ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولے۔

''جس کی جان کا سودا طے کیا جا رہا ہے کوئی اُسے بھی تو بتائے کہ مول کیا لگا ہے؟ مجھے کیوں ختم کرنا چاہتے ہو۔ میں نے تمہارا کیا بگاڑا ہے؟''

چھلاوہ جو اَب کود کر دوسری منڈیر پر بیٹھا غصے سے ہمیں گھور رہا تھا، چلا کر نفرت سے بولا۔ ''زیادہ بھولے نہ بنو...... تم خوب جانتے ہو کہ تمہاری اور میری دشمنی تو ازل سے ہے...... صدیوں سے تم میرا راستہ کاٹتے آئے ہو۔ کبھی مذہب کی صورت میں، کبھی نیکی کی صورت میں، کبھی اچھائی کی صورت میں۔ آغاز سے ہی تم نے میرا ناطقہ بند کرنے کی کوشش کی ہے...... لیکن آج میں تمہاری سانسیں بند کر کے یہ کھیل ہمیشہ کے لیے ختم کر دوں گا۔ آج میری وہ پہلی جیت ہوگی جس کا مجھے صدیوں سے انتظار تھا۔''

سلطان بابا کے لہجے میں اب بھی ٹھہراؤ تھا۔ ''تم صدیوں کی بات کر رہے ہو...... جب کہ میں تو ایک عام انسان ہوں جس کی عمر فقط چند سال ہے، پھر تم کس سے اب تک لڑتے آ

ہے ہو۔ضرور تمہارا دشمن کوئی اور ہوگا......''

چھلاوہ اب صحن میں کھڑے ایک جلے ہوئے درخت کی شاخ پر اٹکا ہوا تھا، اُس نے فرت سے ہونٹ سکوڑے۔

''نہیں تم وہی ہو......بس تمہارے جسم بدلتے رہتے ہیں۔لیکن مجھے تمہارے اس بوسیدہ سم سے کیا لینا دینا...... میں تو تمہاری اس رُوح کو ختم کرنا چاہتا...... ہمیشہ کے لیے...... اصغر تم ہاں کھڑے کیا تماشا دیکھ رہے ہو، آگے بڑھو ورنہ ہمیشہ کے لیے میرے غلام ہو کر رہ جاؤ گے۔کیا تمہیں آزادی نہیں چاہیے...... جلدی کرو میرے پاس زیادہ وقت نہیں ہے...... یاد کھو...... اگر آج تم نے معاہدے کی خلاف ورزی کی تو جرمانے کے طور پر میں ساری زندگی تم مسلط رہوں گا...... اور تم اچھی طرح جانتے ہو کہ میری دشمنی کتنی بُری چیز ہے...... ساری ندگی تڑپتے اور سسکتے ہوئے گزر جائے گی۔تم موت مانگو گے لیکن تمہیں موت بھی نہیں ملے لی......''

اصغر صاحب شدید کش مکش میں ہاتھ میں چاقو لیے کھڑے تھے۔وہ ہچکچا کر آگے بڑھنے لگے، میں زور سے چلایا۔''یہ آپ کیا کر رہے ہیں...... رُک جائیں۔'' چھلاوے نے غصے اور رت بھری نگاہ مجھ پر ڈالی اور اگلے ہی لمحے مجھے یوں محسوس ہوا جیسے مجھے اُن آنکھوں کے سحر نے جکڑ لیا ہو۔میں نے اصغر صاحب کے راستے کی رکاوٹ بننے کی کوشش کی لیکن میرے قدم یسے زمین میں ہی جکڑے رہ گئے۔سلطان بابا ویسے ہی استقامت سے اپنی جگہ کھڑے تھے۔ س بار وہ اصغر صاحب سے مخاطب ہوئے۔

''کیا تمہیں پورا یقین ہے کہ میرا خاتمہ کرنے کے بعد یہ عفریت تمہارا پیچھا چھوڑ دے ا؟ اور پھر اگر یہ اِسی قدر طاقت ور ہے کہ ساری زندگی تمہیں اپنا غلام بنا کر رکھ سکے تو پھر یہ د آگے بڑھ کر میرا خاتمہ کیوں نہیں کر دیتا۔اس قتل کے لیے اِسے تمہارے کمزور انسانی زوؤں کی ضرورت کیوں پیش آ رہی ہے...... کہیں ایسا تو نہیں کہ یہ آخری گناہ کروانے کے انے ہی پوری عمر کے لیے تمہاری رُوح پر قبضہ کرنا چاہتا ہے...... دو گھڑی رُک کر ذرا غور کر ......تھوڑا سوچ لو...... مجھے قتل کرنے کے لیے تو پوری رات پڑی ہے...... میں کہیں بھاگا نہیں رہا...... یہیں تمہارے سامنے ہی کھڑا ہوں۔''

اصغر صاحب ٹھٹھک کر اپنی جگہ کھڑے ہو گئے۔چھلاوہ انہیں رُکتے دیکھ کر زور سے چیخا۔

''پاگل مت بنو اصغر...... اس شخص کی چکنی چپڑی باتوں میں مت آنا...... یہ جادوگر ہے...... تمہاری تباہی کے درپے ہے...... تم جانتے ہو اس پوری دنیا میں میں ہی تمہارا واحد دوست ہوں۔میں نے آج تک تمہارے لیے کیا نہیں کیا؟...... جب کہ تمہارے سامنے کھڑا یہ شخص جو تمہیں نصیحتیں کرنے کی کوشش کر رہا ہے اس سے ملے تمہیں ابھی پورا ایک گھنٹہ بھی نہیں ہوا۔ اس پر اعتبار کر کے اپنے آپ کو ہمیشہ کے لیے خاک میں نہ ملاؤ...... جاؤ اس کے سینے میں یہ چاقو گھونپ دو...... اور ہمیشہ کے لیے نجات پا لو...... ورنہ تمہارے گلے میں پڑا یہ سرخ دھاگا ہمیشہ کے لیے تمہاری غلامی کا طوق بن جائے گا...... چلو شاباش اب دیر نہ کرو۔''

سرخ دھاگے کا ذکر آتے ہی اصغر صاحب کا دھیان اپنے گلے کی جانب چلا گیا اور انہوں نے شاید اپنے ماضی کے گزرے اذیت ناک دن یاد کر کے ایک جھرجھری سی لی۔مجھے لگا کہ چھلاوے کا یہ وار کام کر گیا ہے۔اصغر صاحب نے یہ کہتے ہوئے سلطان بابا کی جانب قدم بڑھا دیئے کہ ''میری تم سے کوئی دشمنی نہیں ہے لیکن مجھے تمہیں ختم کرنا ہی ہوگا۔اِسی میں میری نجات ہے۔'' چھلاوے کی آنکھوں میں اطمینان کی ایک لہر سی اُٹھی۔اصغر صاحب سلطان بابا کے قریب پہنچ چکا تھا۔میری آواز تک سلب ہو چکی تھی اور میں دم سادھے یہ سب کچھ اپنی آنکھوں کے سامنے ہوتے ہوئے دیکھ رہا تھا سلطان بابا نے کلمہ پڑھ لیا اور آخری بار بولے۔

''ٹھیک ہے...... میرے خاتمے سے تم نجات پا سکتے ہو تو یہ نجات تمہیں مبارک ہو...... لیکن اس عارضی دنیا کی نجات کیا معنی رکھتی ہے...... کیا اگلے جہاں میں تمہارا ابھی اس عفریت کے ساتھ عمر بھر آگ میں جلنے کا ارادہ ہے...... یہی تو اس کا وہ ارادہ ہے جو اِسے تم جیسے معصوم انسانوں سے ایسے کبیرہ گناہ کروانے پر اُکساتا ہے۔'' اصغر صاحب معصوم کا لفظ سن کر تلخی سے ہنسے ''معصوم......؟ اور میں......؟...... تم شاید میرے ماضی سے واقف نہیں ورنہ اس لفظ کی حرمت خراب نہ کرتے...... دنیا کا کون سا گناہ ہے جو آج تک مجھ سے سرزد نہیں ہوا۔اگلے جہاں کا تو میں نے سوچنا ہی چھوڑ دیا ہے۔تمہاری جان لے کر شاید یہاں کی چند سالہ مزید زندگی ہی آرام سے کٹ جائے......''

سلطان بابا گرجے ''کتنا جی لو گے مزید تم...... اور کیا ضمانت ہے کہ وہ زندگی بھی سکون

رہے ہو۔ضرور تمہارا دشمن کوئی اور ہوگا......''

چھلاوہ اب صحن میں کھڑے ایک جلے ہوئے درخت کی شاخ پر اٹکا ہوا تھا، اُس نے نفرت سے ہونٹ سکوڑے۔

''نہیں تم وہی ہو......بس تمہارے جسم بدلتے رہتے ہیں۔لیکن مجھے تمہارے اس بوسیدہ جسم سے کیا لینا دینا...... میں تو تمہاری اس رُوح کو ختم کرنا چاہتا...... ہمیشہ کے لیے...... اصغر تم وہاں کھڑے کیا تماشا دیکھ رہے ہو، آگے بڑھو ورنہ ہمیشہ کے لیے میرے غلام ہو کر رہ جاؤ گے۔ کیا تمہیں آزادی نہیں چاہیے...... جلدی کرو میرے پاس زیادہ وقت نہیں ہے...... یاد رکھو...... اگر آج تم نے معاہدے کی خلاف ورزی کی تو جرمانے کے طور پر میں ساری زندگی تم پر مسلط رہوں گا...... اور تم اچھی طرح جانتے ہو کہ میری دشمنی کتنی بُری چیز ہے...... ساری زندگی تڑپتے اور سسکتے ہوئے گزر جائے گی۔تم موت مانگو گے لیکن تمہیں موت بھی نہیں ملے گی......''

اصغر صاحب شدید کش مکش میں ہاتھ میں چاقو لیے کھڑے تھے۔ وہ ہچکچا کر آگے بڑھنے لگے، میں زور سے چلایا۔''یہ آپ کیا کر رہے ہیں...... رُک جائیں۔'' چھلاوے نے غصے اور نفرت بھری نگاہ مجھ پر ڈالی اور اگلے ہی لمحے مجھے یوں محسوس ہوا جیسے مجھے اُن آنکھوں کے سحر نے جکڑ لیا ہو۔ میں نے اصغر صاحب کے راستے کی رکاوٹ بننے کی کوشش کی لیکن میرے قدم جیسے زمین میں ہی جکڑے رہ گئے۔ سلطان بابا ویسے ہی استقامت سے اپنی جگہ کھڑے تھے۔ اس بار وہ اصغر صاحب سے مخاطب ہوئے۔

''کیا تمہیں پورا یقین ہے کہ میرا خاتمہ کرنے کے بعد یہ عفریت تمہارا پیچھا چھوڑ دے گا؟ اور پھر اگر یہ اِسی قدر طاقت ور ہے کہ ساری زندگی تمہیں اپنا غلام بنا کر رکھ سکے تو پھر یہ خود آگے بڑھ کر میرا خاتمہ کیوں نہیں کر دیتا۔ اس قتل کے لیے اِسے تمہارے کمزور انسانی بازوؤں کی ضرورت کیوں پیش آ رہی ہے...... کہیں ایسا تو نہیں کہ یہ آخری گناہ کروانے کے بہانے ہی پوری عمر کے لیے تمہاری رُوح پر قبضہ کرنا چاہتا ہے...... دو گھڑی رُک کر ذرا غور کر لو...... تھوڑا سوچ لو...... مجھے قتل کرنے کے لیے تو پوری رات پڑی ہے...... میں کہیں بھاگا نہیں جا رہا...... یہیں تمہارے سامنے ہی کھڑا ہوں۔''

اصغر صاحب ٹھٹھک کر اپنی جگہ کھڑے ہو گئے۔ چھلاوہ انہیں رُکتے دیکھ کر زور سے چیخا۔ ''پاگل مت بنو اصغر...... اس شخص کی چکنی چپڑی باتوں میں مت آنا...... یہ جادوگر ہے...... تمہاری تباہی کے درپے ہے...... تم جانتے ہو اس پوری دنیا میں میں ہی تمہارا واحد دوست ہوں۔ میں نے آج تک تمہارے لیے کیا نہیں کیا؟...... جب کہ تمہارے سامنے کھڑا یہ شخص جو تمہیں نصیحتیں کرنے کی کوشش کر رہا ہے اس سے ملے تمہیں ابھی پورا ایک گھنٹہ بھی نہیں ہوا۔ اس پر اعتبار کر کے اپنے آپ کو ہمیشہ کے لیے خاک میں نہ ملاؤ...... جاؤ اس کے سینے میں یہ چاقو گھونپ دو...... اور ہمیشہ کے لیے نجات پا لو...... ورنہ تمہارے گلے میں پڑا یہ سرخ دھاگا ہمیشہ کے لیے تمہاری غلامی کا طوق بن جائے گا...... چلو شاباش اب دیر نہ کرو۔''

سرخ دھاگے کا ذکر آتے ہی اصغر صاحب کا دھیان اپنے گلے کی جانب چلا گیا اور انہوں نے شاید اپنے ماضی کے گزرے اذیت ناک دن یاد کر کے ایک جھرجھری سی لی۔ مجھے لگا کہ چھلاوے کا یہ وار کام کر گیا ہے۔ اصغر صاحب نے یہ کہتے ہوئے سلطان بابا کی جانب قدم بڑھا دیئے کہ ''میری تم سے کوئی دشمنی نہیں ہے لیکن مجھے تمہیں ختم کرنا ہی ہوگا۔ اِسی میں میری نجات ہے۔'' چھلاوے کی آنکھوں میں اطمینان کی ایک لہر سی اُٹھی۔ اصغر صاحب سلطان بابا کے قریب پہنچ چکا تھا۔ میری آواز تک سلب ہو چکی تھی اور میں دم سادھے یہ سب کچھ اپنی آنکھوں کے سامنے ہوتے ہوئے دیکھ رہا تھا سلطان بابا نے کلمہ پڑھ لیا اور آخری بار بولے۔

''ٹھیک ہے...... میرے خاتمے سے تم نجات پا سکتے ہو تو یہ نجات تمہیں مبارک ہو...... لیکن اس عارضی دنیا کی نجات کیا معنی رکھتی ہے...... کیا اگلے جہاں میں تمہارا بھی اس عفریت کے ساتھ عمر بھر آگ میں جلنے کا ارادہ ہے...... یہی تو اس کا وہ ارادہ ہے جو اِسے تم جیسے معصوم انسانوں سے ایسے کبیرہ گناہ کروانے پر اُکساتا ہے۔'' اصغر صاحب معصوم کا لفظ سن کر تلخی سے ہنسے ''معصوم......؟ اور میں......؟...... تم شاید میرے ماضی سے واقف نہیں ورنہ اس لفظ کی حرمت خراب نہ کرتے...... دنیا کا کون سا گناہ ہے جو آج تک مجھ سے سرزد نہیں ہوا۔ اگلے جہاں کا تو میں نے سوچنا ہی چھوڑ دیا ہے۔ تمہاری جان لے کر شاید یہاں کی چند سالہ مزید زندگی ہی آرام سے کٹ جائے......''

سلطان بابا گرجے ''کتنا جی لو گے مزید تم...... اور کیا ضمانت ہے کہ وہ زندگی بھی سکون

سے ہی کٹے گی؟...... اور ہاں...... ایک گناہ اب بھی ایسا ہے جو تم نے اب تک نہیں کیا......
قتل...... کیا کسی معصوم انسان کے قتل کا بوجھ اپنے سر پر لے کر تم واقعی سکون کی زندگی جی پاؤ
گے؟...... کیا ضروری ہے کہ تم یہ آخری گناہ بھی اپنے کھاتے میں لکھوا کر ہی اُوپر جاؤ...... توبہ
اور معافی کا در کبھی بند نہیں ہوتا۔ تمہارے گناہوں کا کوئی شمار کوئی حد ہو سکتی ہے لیکن اُس کی
رحمت بے شمار اور لامحدود ہے...... اب بھی وقت ہے...... تمہاری سانسیں ابھی باقی ہیں...... ان
کے ختم ہونے سے پہلے اُس کے دربار میں ہاتھ جوڑ کر اُس سے معافی مانگ لو...... مجھے یقین
ہے وہ تمہیں معاف کر دے گا...... اور تمہارے پاس تو کفارہ ادا کرنے کا بھی موقع ہے......
سچے دل سے توبہ کر کے اس بدی کے ہرکارے کی بات ماننے سے انکار کر دو...... شاید تمہیں
قدرت نے آج اِس مقام پر اِسی لیے پہنچایا ہے کہ تم اپنی گناہوں بھری زندگی کا خود خاتمہ
کر لو۔''

بارش کی بوچھاڑ تیز ہو چکی تھی اور بجلی اب یوں کڑک کڑک کر اِردگرد گر رہی تھی جیسے آج
اُسے بھی اپنے کسی شکار کی تلاش ہو۔ اصغر صاحب کا اُٹھتا ہوا ہاتھ اُٹھتے اُٹھتے پھر درمیان میں
رُک گیا۔ چھلاوہ زچ ہو کر غصے میں پاگل ہو چکا تھا اور سلطان بابا کی گفتگو کے دوران وہ درجنوں
بار اپنی جگہ بدل چکا تھا۔ اب اُس کے صبر کا پیمانہ بالکل ہی لبریز ہو گیا تھا وہ چلا کر بولا۔
''بس بہت ہو چکا یہ کھیل...... اصغر تم اس کا خاتمہ کرتے ہو، یا میں اپنے اِسی سرخ
دھاگے کو تمہارے گلے کا پھندا بنا ڈالوں ہمیشہ کے لیے...... میں اب پل بھر بھی انتظار نہیں
کروں گا واپس پلٹنے میں...... مار ڈالو اسے...... گھونپ ڈالو اس کے سینے میں یہ چاقو......
ابھی...... میں کہتا ہوں ابھی......'' اصغر صاحب جو شاید اس قتل کے لیے خود کو ذہنی طور پر تیار کر
چکے تھے۔ اُن کی آنکھوں میں تاسف تھا۔ اُنہوں نے چھلاوے کی دھاڑ سے ڈر کر چاقو والا
ہاتھ یوں فضا میں بلند کیا جیسے وہ اس بحث کے دوران ہزار بار ٹوٹ کر بکھر چکے ہوں۔ سلطان
بابا نے اپنی آنکھیں بند کر لیں اور اصغر صاحب کے ہاتھ میں پکڑے چاقو کا پھل دُور کہیں گرتی
بجلی کی روشنی سے پل بھر کے لیے جگمگایا اور پھر فضا میں سلطان بابا کی آواز گونجی ''لَآ اِلٰہَ اِلَّا
اللّٰہُ......'' اصغر صاحب کا ہاتھ تیزی سے نیچے آیا میرے منہ سے ''نہیں'' کی چیخ نکل گئی۔ اصغر
صاحب کے تیزی سے نیچے آتے چاقو کے تیز پھل نے اُن کی گردن میں پڑے دھاگے کو اس

طرح کاٹا کہ خود اُن کی گردن سے بھی خون کا ایک تیز فوارہ سا نکلا جس نے سامنے کھڑے
سلطان بابا کو رنگ ڈالا۔ اصغر صاحب نے سلطان بابا کے سینے میں چاقو گھونپنے کے بجائے
اپنے ہی گلے میں پڑے سرخ دھاگے کو کاٹ ڈالا تھا۔ اُن کا وار چھلتا ہوا پڑا اور چونکہ دھاگا
گلے میں مضبوطی سے کسا ہوا تھا لہٰذا چاقو نے دھاگے کی کسی ہوئی ڈور تک پہنچنے سے پہلے اُن
کے گلے کی جلد کو کاٹ ڈالا۔ دفعتہً بجلی زور سے کڑکی اور پھر فضا میں گھپ اندھیرا چھا گیا۔ اور
میں نے اس گھپ اندھیرے میں برستی بوچھاڑ کے پس منظر میں اُن دو سرخ جلتی آنکھوں کو رفتہ
رفتہ معدوم ہوتے ہوا دیکھا۔ ایسے جیسے کوئی دو جلتے ہوئے شدید تیز انگاروں پر پانی کی ہلکی ہلکی
بوندیں گرا کر انہیں دھیرے دھیرے بجھا دے۔ میں ابھی تک انہی آنکھوں کے سحر میں تھا کہ
سلطان بابا کی زوردار آواز نے جیسے مجھے جھنجھوڑ ڈالا ''ساحر میاں...... جلدی کرو...... ابھی جان
باقی ہے...... اسے کسی ہسپتال تک پہنچانا ہوگا......'' میں ایک دم سے جیسے ہوش میں آ گیا۔ اصغر
صاحب زمین پر اوندھے پڑے ہوئے تھے اور اُن کے گلے سے بھل بھل خون نکل کر پانی کے
قطروں کے ساتھ مل کر نیچے کیچڑ میں مل رہا تھا۔ سلطان بابا نے جلدی سے اپنے کاندھے پر
پڑی چادر کو پھاڑا اور ایک پٹی سی بنا کر اصغر صاحب کے زخم پر خوب کس کر مضبوطی سے باندھ
دی۔ قریب ہی کیچڑ میں لت پت پڑے اُس سرخ دھاگے کو انہوں نے اس بجھتی ہوئی آگ
میں پھینک دیا جو انہوں نے میرے پہنچنے سے پہلے کھنڈر میں روشن کر رکھی تھی۔ دھاگا جل کر
یوں تڑخا جیسے کوئی جڑی بوٹی آگ میں جلی ہو۔ میں نے اصغر صاحب کو کاندھے پر ڈالا اور ہم
دونوں تیزی سے کھنڈر سے نکل کر گاؤں کی طرف جاتی کچی سڑک کی جانب دوڑ پڑے۔ مجھے
یوں لگا جیسے اصغر صاحب کے گلے سے ٹپکتے ہوئے خون کے قطرے مجھ سے کہہ رہے ہوں کہ

ہم خوابوں کے بیوپاری تھے
پر اس میں ہوا نقصان بڑا
کچھ بخت میں ڈھیروں کالک تھی
کچھ اب کے غضب کا کال پڑا
راکھ لیے جھولی میں
اور سر پہ ساہوکار کھڑا

جب بستی صحرا صحرا تھی
ہم دریا دریا روئے تھے
جب ہاتھ کی ریکھائیں چپ تھیں
اور سُر سنگیت میں کھوئے تھے
تب ہم نے جیون کھیتی میں
کچھ خواب انوکھے بوئے تھے
جب فصل کٹی تو کیا دیکھا
کچھ زخمی خواب تھے آنکھوں میں
کچھ درد کے ٹوٹے گجرے تھے
ہم خوابوں کے بیوپاری تھے
پر اس میں ہوا نقصان بڑا

خواب مرتے نہیں

آخرکار تیسرے دن اصغر صاحب کو ہوش آ ہی گیا۔ ہم اُس طوفانی رات میں انہیں کس طرح لے کر پہلے گاؤں کے ہسپتال اور پھر خان صاحب کی گاڑی میں قریبی ضلع کے بڑے ہسپتال تک پہنچے یہ ایک الگ اور لمبی داستان تھی۔ پہلے تو ڈاکٹروں نے بالکل ہی جواب دے دیا، لیکن پھر نہ جانے یہ اُن کے اندر کے جینے کی لگن تھی، یا پھر واقعی اُن کا کفارہ ساتویں آسمان پر قبولیت کا شرف پا گیا تھا۔ ہماری دعائیں رنگ لے آئیں اور اصغر صاحب نے آنکھیں کھول دیں۔ پہلے چند گھنٹے تو ہوش و حواس سے بالکل ہی عاری تھے۔ انہیں کچھ یاد ہی نہیں آ رہا تھا کہ وہ کون ہیں اور اس ہسپتال تک کیسے پہنچے۔ پھر دھیرے دھیرے انہیں اپنی پچھلی زندگی یاد آنے لگی۔ سلطان بابا نے اُن کی اس کیفیت کی ایک بہت حیرت انگیز سی وجہ بھی بیان کی کہ اگر ہوش میں آنے کے بعد اصغر صاحب کو چھلاوے کے ساتھ گزرا ایک سال صرف چند لمحوں کا خواب لگا، یا انہیں کچھ بھی یاد نہ آیا تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ وہ ہمارے زمینی وقت کے محور سے باہر نکل چکے تھے۔ میں نے حیرت سے اُن کی طرف دیکھا ''زمینی وقت سے کیا مراد ہے آپ کی......؟ کیا مختلف زمانوں کے لیے وقت کے پیمانے بھی مختلف ہوتے ہیں؟'' سلطان بابا نے گہری سی سانس لی۔ ''فی الحال تو یہ صرف ایک پہیلی ہی ہے...... اور سائنس بھی کہیں نہ کہیں اس پہیلی کی کھوج میں ہے۔ لیکن نوری سال (Light Year) اور وقت میں سفر کا تصور اس نظریے کو تقویت دیتا ہے کہ ہم زمین پر جس وقت کے پیمانے میں زندہ ہیں اس کے علاوہ وقت کے مزید پیمانے بھی ضرور موجود ہیں۔ اور یہ ضروری نہیں کہ ہماری گھڑی، پل، منٹ، گھنٹے اور سیکنڈز بھی ان زمانوں کے وقت کے پیمانوں سے مطابقت رکھتے ہوں۔ مثلاً ایسا بھی ہوسکتا ہے کہ اصغر صاحب نے اُس مخلوق کے زیر اثر جو پورا ایک سال گزارا وہ ہماری دنیا کا صرف ایک منٹ، یا چند سیکنڈ ہی ہوں۔ مثلاً ہم خواب میں اپنے بچپن سے لے کر بڑھاپے تک کی زندگی کے تمام مناظر دیکھ کر بھی جب اُٹھتے ہیں، تو ہماری پوری نیند میں اس دیکھے گئے

خواب کا اصل دورانیہ چند منٹ سے زیادہ کا نہیں ہوتا۔ مطلب خواب میں وقت بہت تیزی سے گزرتا ہے اور سالوں کا سفر لمحوں میں طے کر لیتا ہے۔ گویا خواب کے وقت کا پیمانہ جاگتی حالت کے پیمانے سے یکسر مختلف ہے...... اِسی طرح کسی زمانے کے وقت کا پیمانہ ہمارے زمانے کے بالکل اُلٹ بھی ہو سکتا ہے...... یعنی ہم یہاں زمین پر جس وقت کو سالوں میں پورا کر پاتے ہیں، ہوسکتا ہے کہ وہ کسی زمانے کا ایک پل ہی ہو...... یہ سب کہیں نہ کہیں میٹافزکس سے بھی تعلق رکھتا ہے۔ یہی سارے وہ اسرار ہیں جن کی کھوج کا ہمیں حکم دیا گیا ہے۔"

میری اُلجھن ابھی تک قائم تھی۔ "لیکن اصغر صاحب کے معاملے میں صرف وہی تو اس وقت کے پیمانے میں شامل نہیں تھے، اُن کے ساتھ اُن کی بیوی، بچے، دوست، دشمن، باہر کی دنیا اور دفتر والے سیکڑوں لوگ شامل تھے، جن سے پورا سال اصغر صاحب کا تعلق اور واسطہ رہا ہے۔ ہم اگر یہ فرض کر بھی لیں کہ اصغر صاحب ایک خواب کی حالت میں اس چھلاوے کی دنیا کے وقت کے پیمانے کے زیرِ اثر اپنا پورا سال گزار کر یہاں تک پہنچے ہیں تو پھر باقی لوگوں کی کیفیت کے بارے میں آپ کیا کہیں گے۔ اور پھر اُن کے آخری تیس دن تو خود میرے ساتھ درگاہ پر ہی گزرے ہیں اور آخری دن کے چند گھنٹے تو آپ بھی ہمارے ساتھ اس وقت کے پیمانے میں شامل تھے...... اس کے متعلق آپ کا کیا خیال ہے؟" سلطان بابا ابھی تک اُسی گہری سوچ میں تھے۔ "اِسی لیے میں نے کہا نا کہ ابھی تک یہ ایک پہیلی ہی ہے اور پھر تم بھول رہے ہو کہ انسان جب نیند میں چلتا ہے تو اُس کے اِردگرد کا زمانہ جاگ ہی رہا ہوتا ہے اور پوری طرح اپنے حواس میں ہوتا ہے۔ اگر اصغر صاحب نیند میں تھے تو ہم بھی اُن کے خواب کے چند کردار بن کر اُن کے ساتھ چلتے رہے۔ اِس سے اُن کی خوابیدہ حالت کا کیا تعلق......؟" "چلیں مان لیا کہ اصغر صاحب خواب کی کیفیت میں ہی تھے، لیکن پھر اس چھلاوے کی وہ شبیہ......؟ اُس کی وہ دو جلتی ہوئی آنکھیں......؟...... جو میں نے اور پھر آپ نے بھی خود دیکھیں ہیں...... اُس کی آپ کیا توجیہہ پیش کریں گے......؟"

سلطان بابا میری تکرار سن کر مسکرا دیئے۔ انہوں نے توصیفی نظر سے میری جانب دیکھا "ہاں...... یہ البتہ مکمل سوال ہے۔ جس کی توجیہہ کی ضرورت ہے...... تمہیں یاد ہے کہ یاقوط نے رُباب کو تمہیں زہرا کے روپ میں دکھایا تھا؟...... یہ بھی ہوسکتا ہے کہ اس بار ہم دونوں ہی

اُسی طرح کے کسی خواب کے زیرِ اثر رہے ہوں لیکن بہرحال یہ بات طے ہے کہ اصغر صاحب کا واسطہ واقعی ایک شیطانی مخلوق سے قائم تھا...... اس مخلوق کے اثرات اور اس کے وقت اور دیگر پیمانوں کا تو اب تب ہی پتا چلے گا جب اصغر صاحب کو مکمل ہوش آئے گا......"

اور پھر دھیرے دھیرے اصغر صاحب کو مکمل ہوش آ ہی گیا اور ساتھ ہی انہیں پچھلی ساری باتیں بھی یاد آ گئیں۔ انہیں واقعی اپنا پچھلا گزرا پورا سال ایک خواب ہی لگ رہا تھا لیکن وہ سب خواب نہیں تھا۔ انہوں نے جب ہسپتال کے نمبر سے اپنے نئے گھر کا نمبر ملایا تو وہاں سے واقعی اُن کے نوکر نے ہی فون اُٹھایا لیکن اُس نے یہ بتا کر حیران کر دیا کہ اصغر صاحب جانے سے پہلے اس قدر دیوالیہ ہو چکے تھے کہ اُن کے تمام کاروبار، گھر اور روپیہ پیسہ گروی ہو چکا تھا اور تین دن پہلے اس رہن کی میعاد ختم ہونے کے بعد بینک اور باقی سود خور جن سے قرضہ لیا گیا تھا، وہ ساری چیزیں اپنے قبضے میں لے چکے ہیں۔ حیرت کی بات یہ تھی کہ یہ ٹھیک وہی وقت تھا جب اصغر صاحب نے اپنے گلے میں پڑا دھاگا کاٹ ڈالا تھا۔ گویا عین اُس لمحے جب اصغر صاحب اپنا گروی رکھا ہوا ایمان واپس پا رہے تھے، ٹھیک اُسی وقت اُس رہن رکھے ایمان کے بدلے پائی ہوئی سلطنت کو وہ کھو رہے تھے۔ چھلاوہ اپنی دی ہوئی دنیاوی آسائشوں کو تخت و تاراج کر رہا تھا اور آج ٹھیک ایک سال بعد مالی طور پر اصغر صاحب وہیں کھڑے تھے جہاں سے انہوں نے یہ سفر شروع کیا تھا۔ البتہ رشتوں کے معاملے میں انہوں نے صرف اور صرف کھویا ہی تھا۔ اُن کا سارا خاندان برباد ہو چکا تھا اور اُس ایمان فروشی کی قیمت اپنے کھوئے ہوئے رشتوں کے بدلے انہیں ساری عمر چکانا تھی۔ اور کمال کی بات یہ تھی کہ بظاہر اُن کے اس عروج و زوال کی کہانی کا اسکرپٹ پوری طرح مکمل کر رکھا تھا اُس چھلاوے نے۔ عام لوگوں کے لیے یہ معاملہ بہت سیدھا سادھا تھا۔ ایک عام جونیئر کلرک جو اپنے دو کمروں کے چھوٹے فلیٹ میں عسرت زدہ زندگی گزار رہا تھا، ایک دن اُس کا پانچ کروڑ کا پرائز بانڈ نکل آتا ہے اور وہ راتوں رات کروڑ پتی بن جاتا ہے۔ پھر وہ اس پیسے کو اسٹیٹ اور پراپرٹی کے کاروبار میں لگاتا ہے۔ قسمت یہاں بھی اُس کا ساتھ دیتی ہے اور اُس کا زمین کے لین دین کا کاروبار دن دونی اور رات چوگنی ترقی کرتا ہے اور وہ ایک بہت بڑی بزنس ایمپائر کا مالک بن جاتا ہے۔ لیکن پھر ایک دن اُس کا بیٹا اور داماد قتل کے جرم میں گرفتار ہو کر پھانسی تک جا پہنچتے ہیں اور

یہاں سے اُس کا زوال شروع ہو جاتا ہے۔ بیوی، بیٹے کی موت کی خبر سن کر ہوش و حواس کھو بیٹھی ہے۔ بیٹی بیوہ ہو جاتی ہے۔ دوسری بیٹی کسی غنڈے کے ساتھ بھاگ جاتی ہے اور وہ کروڑ پتی بیٹے اور داماد کو پھانسی سے بچانے کے چکر میں اپنا سب کچھ لٹانے کے بعد اپنی ساری جائداد گروی رکھ کر سود پر بازار سے قرضہ اُٹھاتا ہے۔ لیکن یہاں بھی مقدر اُس کا ساتھ نہیں دیتا۔ بیٹا پھانسی چڑھ جاتا ہے اور وہ شخص دیوالیہ ہو کر ایک دن دنیا کی نظروں میں گھر سے بھاگ کر کہیں چھپ جاتا ہے اور اِسی اثناء میں بینک اور سود پر پیسہ دینے والے مدت ختم ہونے کے بعد اُس کے گھر، جائداد اور کاروبار پر قبضہ کر لیتے ہیں اور یوں وہ شخص پھر سے غربت کے اُسی گڑھے میں جا گرتا ہے۔ عام لوگوں کے لیے یہ بس اتنی ہی اور سیدھی سادھی سی کہانی تھی۔ آس پاس کے لوگ اصغر صاحب کی بدقسمتی پر کچھ دیر کے لیے بحث کر کے پھر سے اپنے روزمرہ کے کاموں میں مشغول ہو جائیں گے اور رفتہ رفتہ چند ہفتوں کے بعد یہ کہانی بھی اُن کے ذہنوں سے مٹ جائے گی۔ کوئی اس بات پر یقین نہیں کرے گا کہ اصغر صاحب کے اس عروج اور زوال کی داستان کے پیچھے ''چھلاوے'' نامی کسی مخلوق کا ہاتھ بھی ہو سکتا ہے۔ اس ماڈرن سائنسی دور میں کس کے پاس فرصت ہے ایسی طلسماتی داستانوں پر یقین کرنے کی؟...... میرے ذہن میں اچانک ہی ایک اور عجیب سا خیال آیا، ہمارے آس پاس جانے کتنے لکھ پتی کنگلے اور جانے کتنے کنگلے راتوں رات لکھ پتی بن جاتے ہیں...... کون جانے ان کامیابیوں اور بربادیوں کے پیچھے بھی کسی اَن دیکھے ''چھلاوے'' کا ہاتھ ہی نہ ہوتا ہو؟؟ ہم اپنی کامیابیوں کی راہ پر اپنی بے ایمانی اور ایمان فروشی کے ایسے ہی گھوڑے پر سرپٹ دوڑتے جاتے ہیں اور اپنی ہر فتح کو اپنی حکمت اور اپنی منصوبہ بندی کا مرہون منت مان کر جیت کے نشے میں ہر سہرا اپنے سر باندھتے ہوئے یہ بالکل ہی بھول جاتے ہیں کہ کہیں یہ ''بے ایمان'' کامیابیاں، قدرت کی کسی ڈھیل کا نتیجہ تو نہیں......؟ کہیں کوئی ''چھلاوہ'' ہمارے اِرد گرد اپنا جال تو نہیں بن رہا؟ ایک ایسا جال جس کی ڈوریاں خود ہماری ایمان فروشی کے دھاگوں سے بنی ہوئی ہیں اور جب بھی ذرا ہمارے اندر ایمان جاگا وہ چھلاوہ ہمارے قدموں تلے سے زمین کھینچ کر پھر سے ہمیں بے دست و پا کر دے گا......

ٹھیک اُسی طرح جیسے اُس نے آج پل بھر میں اصغر صاحب کو آسمان سے اُٹھا کر پھر سے

اُسی زمین پر پٹخ دیا تھا جہاں سے وہ ترقی اور دولت کی خواہش لے کر اُٹھے تھے۔ پوری طرح حالت سنبھلنے کے بعد انہوں نے مجھے اور سلطان بابا کو بتایا کہ جس وقت انہوں نے چاقو والا ہاتھ بلند کیا تھا اُس وقت تک اُن کا صرف اور واحد ارادہ وہ چاقو سلطان بابا کے عین سینے میں اُن کے دل کے اندر گاڑھ دینے کا ہی تھا، لیکن جیسے ہی اُن کا ہاتھ بلند ہوا اور سلطان بابا کے ہونٹوں سے غیر ارادی طور پر لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ کا کرشماتی کلمہ ادا ہوا تو پل بھر میں ہی جانے اُن کے اندر سب کچھ تلپٹ کیسے ہو گیا اور انہوں نے خود اپنی شہ رگ پر ہی وار کر دیا۔ بقول اُن کے اگر خنجر اُٹھانے سے پہلے ہی اُن کا ارادہ دھاگا کاٹ دینے کا ہوتا تو وہ ہاتھ کو سر سے بلند ہی نہ کرتے اور سیدھے اپنی گردن کی جانب لے جا کر دھاگا کاٹ ڈالتے۔ اور اس صورت میں شاید اُن کی گردن بھی اس قدر نہ کٹتی جتنی اس طرح اُوپر سے وار کرنے کی صورت میں کٹی۔ اپنی جانب سے تو وہ اپنا خاتمہ کر ہی چکے تھے، لیکن قدرت کو ابھی اُن کی زندگی، یا یوں کہہ لیں کہ اُن کا امتحان مزید مقصود تھا لہٰذا تین دن زندگی اور موت کی بازی کھیلنے کے بعد وہ پھر سے زندگی کی جانب پلٹ آئے۔ سلطان بابا نے اُن کی پوری بات سن کر سر اُٹھا کر خدا کا شکر ادا کیا اور دھیرے سے بولے ''بے شک! اللہ کے کلمے میں بڑی طاقت ہے۔ کاش ہم سب اس کلمے کی اصل طاقت اور اثر سے پوری طرح واقف ہوتے تو کسی اور 'اسم اعظم' کی تلاش میں یوں در بدر نہ بھٹکتے۔ جو کچھ بھی ہے اسی کلمے میں پنہاں ہے......''

میں اصغر صاحب کی بے ہوشی کے وقفے میں تین دن تک سلطان بابا کے ساتھ ہی بنا پلک جھپکائے ہسپتال میں اصغر صاحب کے سرہانے بیٹھا رہا تھا۔ اُن کی طبیعت کچھ سنبھلی تو سلطان بابا نے اصرار کر کے مجھے حویلی کی خبر لینے کے لیے گاؤں بھیجا کہ زہرا اور اُس کی ماں صرف میرے بلاوے پر اتنی دُور آئے ہوئے تھے لہٰذا مجھے اُن کی دل جوئی کے لیے ہی سہی، پر حویلی کا ایک چکر ضرور لگا آنا چاہیے۔ حالانکہ جب ہم اصغر صاحب کو کریم خان صاحب کی موٹر میں ضلع کے بڑے ہسپتال کے لیے لے کر نکل رہے تھے تب میں نے بڑی مالکن کے ذریعے زہرا کو یہ پیغام بھجوا دیا تھا کہ ''پریشانی کچھ ایسی ہے کہ مجھے دیر ہو سکتی ہے۔'' اور مجھے یہ بھی یقین تھا کہ میں جن اعلیٰ ظرف لوگوں کے درمیان زہرا اور اُس کی ماں کو چھوڑے جا رہا تھا وہ اپنا سب کچھ لٹا دیں گے لیکن کبھی اپنے مہمانوں کے شیشہ دل پر کوئی بھی خراش نہیں آنے دیں

گے۔لیکن خود اُن کے اپنے گھر میں اُن کے اپنے دل کا ایک ٹکڑا بھی تو مضمحل تھا، زخمی تھا، بے کل تھا...... جانے وہ اُس موم کے پروں والی پری کی اس آنچ سے حفاظت کیسے کر پائے ہوں گے؟ وہ تو اتنی نازک تھی کہ بادلوں سے چھنی ایک ہلکی سی کرن بھی اُس کا اندر پگھلا سکتی تھی۔ پھر جانے یہ تین دن کا سورج اُس پر کیسے برسا ہوگا؟ ہاں البتہ اتنا اطمینان مجھے ضرور تھا کہ میں زہرا نام کا جو اَبر اُس نازنین کے پہرے کے لیے چھوڑ کر گیا تھا وہ خود اپنے وجود پر لاریب کے حصے کی ہر تپش برداشت کر لے گا لیکن اُس کا کومل من کبھی پگھلنے نہیں دے گا۔انھی سوچوں میں گم جب میں ضلع سے صبح کی پہلی ٹرین لے کر دو گھنٹے کی مسافت طے کر کے جبل پور اسٹیشن پر اُترا اور حویلی پہنچا تو سارے گھر پر ایک عجیب سی خاموشی طاری تھی۔ بیرونی ڈیوڑھی میں کرم دین نے مجھے آتے دیکھا تو اندر اطلاع کرنے کے لیے دوڑ گیا۔ اور کچھ ہی پل میں اُلٹے قدموں لوٹا کہ مجھے اندر بلایا گیا ہے۔ حالانکہ میں درجنوں بار یہ ڈیوڑھی پار کر کے حویلی کے اندر جا چکا تھا لیکن آج بھی میرے قدموں میں وہی جھجک اور وہی ہچکچاہٹ تھی جو پہلی بار یہ دہلیز پار کرتے ہوئے موجود تھی۔

اندر زنانے والے حصے کے برآمدے کو بڑی بڑی چقوں سے ڈھانک دیا گیا تھا۔ شاید یہ اہتمام سخت گرمیوں کے موسم کے لیے کیا گیا ہو تاکہ دوپہر کی تپتی دھوپ کی تپش کو روکا جا سکے۔لیکن اس سرما کی نرم دھوپ والی سہ پہر میں بھی ان لکڑی کی کھلے تنکوں والی چقوں کا یوں ڈھلکا رہنا ضرور کسی خاص وجہ سے ہی ہو سکتا تھا۔ پھر اچانک مجھے خیال آیا کہ ضرور یہ اہتمام زہرا اور اُس کی امی کی وجہ سے کیا گیا ہوگا۔ کیوں کہ بہر حال وہ دونوں حویلی کے آبائی نوکروں کے سامنے بھی یوں آزادانہ پھرنے میں کچھ جھجک ضرور محسوس کرتی ہوں گی۔

باہر سے چھن کر آنے والی دھوپ چق کے تنکوں کے درمیان سے کچھ ایسے زاویے سے برآمدے کے چمکیلے سنگ مرمر کے فرش پر پڑ رہی تھی کہ نیچے فرش پر بھی دھوپ کے تنکوں کی ایک ''چق'' سی بچھ گئی تھی۔ ایک عجیب سا مٹیالا اُجالا پھیلا ہوا تھا اس طویل برآمدے میں۔ لہٰذا میری آنکھوں کو کچھ پل لگے اس ملگجی روشنی سے نظریں ملانے میں۔ برآمدے کے آخر میں موتیے کی لمبی لمبی بیلوں کے سامنے کوئی پیٹھ کیے کھڑا تھا۔ آہٹ سن کر وہ وجود پلٹا۔ میری آنکھیں تب تک اس مدہم روشنی سے مانوس ہو چکی تھی۔ وہ لاریب تھی، سفید کرتے پاجامے

میں ملبوس اور سر پر دھانی رنگ کی اوڑھنی لیے ہوئے۔ وہ نور کا ایک ایسا ہالہ لگ رہی تھی جس کے اندر ذرا سی ہلدی کی آمیزش کر دی گئی ہو۔ شاید یہ اس شدید بخار اور بیماری کا اثر تھا جو اُس کے ملیح چہرے پر پچھلے چند دنوں کے دوران اپنا رنگ چھوڑ گیا تھا۔ مجھے دیکھ کر اُس کی ستارہ آنکھوں میں ایک چمک سی لہرائی۔ میں نے سلام کے بعد اُس سے باقی گھر والوں کے بارے میں پوچھنے سے پہلے اُس کی طبیعت کا پوچھا، وہ دھیرے سے مسکائی ''آپ نے طبیب ہی ایسا بھیجا تھا کہ بیماری کو نہ کہتے ہی بنی...... اتنے اچھے لوگ بیک وقت اپنے آس پاس کیسے جمع کیے رکھتے ہیں آپ......؟ ...... میں تو ہر بار کھو دیتی ہوں۔'' میں نے چونک کر اُس کی جانب دیکھا، جانے یہ بات اُس نے کسی رو میں کہی تھی، یا واقعی وہ کچھ اور کہنا چاہتی تھی۔ لیکن یہ لڑکیاں اپنے چہرے کے تاثرات چھپانا بھی خوب جانتی ہیں۔ ہتھیلی پر نام لکھ لکھ کر پلکوں سے مٹاتی رہتی ہیں۔ لیکن آنکھ کے پردے تک وہ تحریر آنے نہیں دیتیں۔ میں نے باقی گھر والوں کے بارے میں پوچھا تو لاریب نے بتایا کہ ساتھ والے گاؤں میں کسی منگنی کی تقریب میں بڑی مالکن کو بطور لڑکی کی سرپرست دعوت تھی۔ لہٰذا وہ جاتے ہوئے اپنے ساتھ زہرا اور اُس کی ماں کو بھی تبدیلی کی غرض سے لے گئی تھیں۔ کچھ دیر کے لیے میں اور لاریب بالکل ہی خاموش کھڑے رہے۔ جیسے ہمارے پاس کرنے کو کوئی بات ہی نہ رہی ہو، یا ہم دونوں ہی جیسے اُس مقام پر پہنچ چکے ہوں جہاں خاموشی خود ہر بات کہہ دیتی ہے۔ اور زبان، لفظ اور باتیں سب بے معنی سے ہو جاتے ہیں۔ میں نے واپسی کا ارادہ ظاہر کیا تو وہ کچھ مضطرب سی ہو گئی۔ ''مجھے آپ سے معذرت کرنا تھی......'' میں چونک کر پلٹا ''معذرت...... لیکن کس بات کی......'' اُس نے اپنی پلکوں کی جھالر گرا لی۔ ''میں انجانے میں آپ کو اپنے زخموں میں اُلجھا بیٹھی...... آپ تو خود شدید گھائل ہیں...... آپ کے تو اپنے زخموں سے ابھی خون رِسنا بند نہیں ہوا...... آپ کی امی نے آپ کی اور زہرا کی کہانی اتنی تفصیل سے نہیں سنائی تھی۔ اگر میری زہرا سے ملاقات نہ ہوتی تو شاید آپ کے داغوں پر پڑا یہ پردہ میرے سامنے کبھی اُٹھ نہ پاتا۔ آپ تو ہر حد سے گزر کر یہاں تک پہنچے ہیں۔ میں نے آج تک محبت کو جیتنے اور لوگوں کو محبت میں ہارتے ہوئے ہی دیکھا تھا...... لیکن آپ نے محبت کو جیت کر دکھا دیا...... زمانے کی ہر رسم، محبت کی ہر شرط، مجبوری کا ہر دعویٰ آپ کے سامنے فقط ریت کی ایک دیوار ہی تو ثابت ہوا۔ آپ نے دنیا کو بتا

دیا کہ جو عشق میں جی نہیں سکتے وہ پہلے ہی سے مرے ہوتے ہیں۔'' وہ بولتے بولتے اچانک چپ ہوگئی، جیسے اُس کے پاس کہنے کے لیے اتنی زیادہ باتیں ہوں کہ وہ ذہن میں اُن کی ترتیب جوڑتے جوڑتے اپنے لفظ ہی بھلا بیٹھی ہو۔ لاریب نے اپنے دھونکنی جیسے چلتے سانس پر قابو پانے کی کوشش کی۔ جانے یہ جذبوں کی بھول بھلیاں ہم کمزور انسانوں کے ساتھ ایسے گھناؤنے کھیل کیوں کھیلتی ہیں کہ ہم کچھ کہتے ہیں تو رُسوا ہوتے ہیں اور خاموش رہتے ہیں تو لفظوں کے یہ ڈنک ہمیں اندر ہی اندر ڈستے رہتے ہیں۔ اور آخر کار چپ کا یہ ناسور ہماری جان لے کر ہی رہتا ہے۔ کچھ ایسی ہی صورت حال سے اس وقت وہ کانچ کا پیکر بھی دوچار تھی۔ میں نے کھنکار کر اُسے حوصلہ دینے کی کوشش کی۔ ''اپنی اپنی تقدیر کی بات ہے...... میری ہمیشہ یہی دعا رہے گی کہ قدرت آپ کی راہ میں کانٹوں کی بچھی ہر راہ کو گلوں سے بھر دے......''

اُس نے اپنی پلکیں اُٹھائیں ''پھولوں کی خواہش تو میں نے بھی کبھی نہیں کی...... اور پھر ان راہوں کے چناؤ کا انتخاب خود ہمارے بس میں ہوتا ہی کب ہے کہ ہم کلیوں، یا کانٹوں کے فرق کو دھیان میں رکھتے ہوئے کسی راستے کو چن کر اپنا پہلا قدم وہاں رکھیں...... ہمیں تو پتا ہی تب چلتا ہے جب ہمارے پاؤں چھل چکے ہوتے ہیں......''

میں نے چونک کر اُسے دیکھا۔ وہ بھی پاؤں کے چھالوں کی دُہائی دے رہی تھی۔ میں اب اُس گل اندام کو یہ کیسے سمجھاتا کہ یہ تو وہ راہ ہے جہاں پیر کے چھالے گننے کی مہلت بھی نہیں ملتی۔ میرے مقدر میں تو یہ خار ازل سے لکھ دیئے گئے تھے مگر وہ اپنی گلابوں جیسی کومل جلد لیے اس خارزار کی طرف کیوں بڑھی چلی آ رہی تھی؟ اُس کے جگر ناتواں کے لیے تو یہاں کا صرف ایک زہریلا کانٹا ہی کافی تھا۔ میں سر جھکائے جانے ایسی کتنی سوچوں سے لڑتا رہا۔ پر شاید وہ بھی سوچ پڑھنے کا ہنر جانتی تھی۔ جس کا ثبوت اُس کے اگلے جملے نے دے دیا۔

''لیکن آپ اپنے دل پر کوئی بوجھ نہ رکھیئے گا۔ میں نے آپ ہی سے سیکھا ہے کہ یہ وہ بازی ہے جو ہار کر ہی جیتی جا سکتی ہے۔ یہ وہ ملن ہے جو جُدائی کے بنا مکمل نہیں۔ یہ وہ رشتہ ہے جو کھو کر ہی پایا جا سکتا ہے۔ یہ وہ بستی ہے جو اُجڑ کر ہی بستی ہے۔ یہ وہ جیون ہے جو خود کو ہار کر ہی جیا جاتا ہے۔ اور یہ وہ سرد سکون ہے جس کی ٹھنڈک انگاروں پر چل کر ہی حاصل کی جا سکتی ہے...... تو میں نے بھی ان چند دنوں میں اُس عجائب خانے کو برتنے کا کچھ نہ کچھ ڈھنگ

سیکھ لیا ہے جسے لوگ محبت کہتے ہیں۔ میں یہ دعویٰ تو نہیں کر سکتی کہ میں نے ہر درد پر عبور حاصل کر لیا ہے لیکن اتنا وعدہ آپ سے ضرور کرتی ہوں کہ میرے اندر اس جذبے سے جو بھی تبدیلی آئے گی، وہ اس اعزاز کی حرمت کی تحقیر کا باعث کبھی نہیں بنے گی۔ میں ہمیشہ سر اُٹھا کر جیوں گی تاکہ میری وجہ سے کبھی محبت کا سر جھکنے نہ پائے...... بس مجھے ہر قدم پر آپ کی دعاؤں کی ضرورت رہے گی کہ میں ابھی بہت کمزور ہوں اور میرے ظرف کا پیالہ بھی ابھی اتنا گہرا نہیں ہے۔ ابھی تو مجھے ٹھیک طرح سے ٹوٹنا بھی نہیں آتا جب کہ مجھ سے خود ہی اپنے ریزے سمیٹنے کی اُمید بھی باندھی جا چکی ہے۔ دعا کریں کہ میں ثابت قدم رہ سکوں......'' وہ چپ ہوئی تو مجھے یوں لگا جیسے میرے سارے لفظ بھی اُسی کے پاس رہ گئے ہیں۔ گویا قدرت نے ایک بار پھر کوہ کن کے ہاتھ ایک چھوٹا سا تیشہ تھما کر اُسے زندگی کے پتھریلے پہاڑ سے دودھ کی نہر نکالنے کی ذمہ داری سونپ دی تھی۔ میں اُس نازک سی لڑکی کے الفاظ اور اُن سے پیدا شدہ مدوجزر پر غور کرتا رہا۔ یہ محبت بھی کتنی بڑی اُستاد ہوتی ہے۔ نہ جانے چند دنوں میں ہی یہ ہم معصوم انسانوں کو اتنے سبق کیسے دے جاتی ہے؟ ہم خود بخود اتنی مشکل بولی کیسے بولنے لگ جاتے ہیں؟ کل تک ہر بات ہنسی مذاق میں اُڑا دینے والی اور ہر پل زندگی کا رس نچوڑنے والی لاریب کو بھی تو یہ بولی اُسی ''عشق'' نامی اتالیق کی ہی سکھائی ہوئی تھی۔ سچ کہ محبت صدیوں کا سفر لمحوں میں طے کرانے کی طاقت رکھتی ہے۔ یہ ایک پل میں جواں، رعنا اور حسین دلوں کی رگوں سے زندگی اور نسوں سے خون نچوڑ کر انہیں ضعیف تر کر دیتی ہے۔

میرے منہ سے بس اتنا ہی نکل سکا کہ ''میری دعائیں سدا آپ کے ساتھ ہیں۔'' پھر مجھ سے وہاں رُکا نہیں گیا۔ باہر جاتے وقت کرم دین سے یہ بھی پتا چلا کہ بڑی مالکن لوگ تو اب رات دیر سے ہی لوٹیں گے۔ میں درگاہ پہنچا تو ہماری چار روزہ غیر حاضری کے دوران درگاہ کا صحن خزاں رسیدہ پیلے اور زرد پتوں کی چادر سے ڈھک چکا تھا۔ انگور کی خشک بیلیں اُداس ہو کر میری راہ دیکھتے دیکھتے منڈیر تک بڑھ آئی تھیں اور چشمے کے یخ اور تازہ پانی کا جھرنا یونہی بہتے بہتے انہیں اپنی جھنکار سے تسلیاں دے رہا تھا۔ میں کچھ دیر کے لیے اس خاموشی اور سکوت سے مبہوت سا ہو گیا۔ کیا جنت کا سکوں اس ماحول سے کچھ سوا ہوگا؟

شام ڈھلے ایک اور خوش گوار حیرت سلطان بابا اور اصغر صاحب کے روپ میں درگاہ کی

ویرانی کم کرنے کا سبب بن گئی۔ سلطان بابا نے بتایا کہ ڈاکٹر نے اصغر صاحب کے بے حد اصرار پر کہ وہ دوائیں اور آرام کا سلسلہ درگاہ پر بھی جاری رکھ سکتے ہیں انہیں جانے کی اجازت دے دی ہے لیکن صرف اس شرط اور وعدے پر کہ وہ اگلا ایک ہفتہ مسلسل آرام کریں گے اور زخم بھر جانے کے بعد ہی روزمرہ کے کاموں میں حصہ لے سکیں گے۔ اصغر صاحب کی نیت یہی تھی کہ اب وہ باقی ماندہ زندگی یہیں اِسی درگاہ میں لوگوں کی خدمت کرتے ہوئے کاٹ دیں لیکن سلطان بابا نے انہیں پھر سے اپنے گھر لوٹ جانے کی تلقین کر رکھی تھی۔ وہ اصغر صاحب کو پہلے ہی چھ کلمے اور ایمان مفصل اور ایمان مجمل پڑھوا کر اُن کے ایمان کی تجدید کروا چکے تھے۔ سلطان بابا کے بقول اصغر صاحب کا اصل امتحان اور کفارہ جبل پور سے نکلنے کے بعد ہی شروع ہوگا۔ انہوں نے اصغر صاحب کو یہ بھی بتایا کہ شروع کے چند مہینے اُن پر بے حد سخت گزریں گے کیوں کہ منفی قوتیں اب انہیں چین سے جینے نہیں دیں گی۔ لیکن انہیں ہر حال میں ثابت قدم رہ کر سختی اور ہر مشکل کا سامنا کرنا ہوگا۔ اِسی میں اُن کی نجات ہے کہ وہ اب آخری سانس تک مذہب کا دامن سختی سے تھامے رہیں۔ اصغر صاحب نے انہیں یقین دلایا کہ اب ایسا ہی ہوگا۔

اگلی صبح چمکیلی اور خوشگوار تھی۔ ہفتے بھر کی جھڑی کے بعد سورج نکلا تو جیسے ہر چیز پر لگے گہن کو پھر سے چمکا گیا۔ روشن اور چمکیلی صبحیں بھی تو زندگی بڑھانے کا سبب ہوتی ہیں۔ میں بھی اس صبح کی چمکیلی کرنوں کو انگور کی بیلوں کے چھت سے چھن کر آتے اور نیچے بہتے نالے کے پانی سے آنکھ مچولی کھیلتے ہوئے دیکھ رہا تھا کہ نیچے گھاٹی میں بشیرے کے تانگے کو بھونپو بجا۔ اصغر صاحب اور سلطان بابا ابھی اندر اپنے کمرے میں ہی تھے۔ پھر چند لمحوں بعد ہی وہ نسیم سحر کی طرح بہتی اور جیسے پانیوں پر چلتی ہوئی درگاہ کے احاطے میں داخل ہوئی۔ زہرا آج اکیلے ہی آئی تھی۔ ضرور اُسے لاریب نے میری درگاہ پر واپسی کی اطلاع دے دی ہوگی۔ وہ مجھے دیکھ کر ہلکے سے مسکرائی۔

''آپ کے گھائل کے زخم بھرنے تلک میں خود ہی نڈھال ہو کر نہ گر پڑوں...... بہت بڑے امتحان میں ڈال گئے تھے آپ مجھے۔''

میں بھی مسکرا دیا۔ ''وار کاری تھا...... تو مسیحا بھی اُتنا ہی اعلیٰ ظرف چاہیے تھا جتنی زخم کی گہرائی تھی...... کہ اس بیماری کا مرہم بھی تو صرف ظرف کا پیمانہ ہی ہوتا ہے...... اور آپ نے

خوب مسیحائی کی ہے...... جس کا اندازہ مجھے کل ہی اُس سے ملاقات میں ہو گیا تھا۔''

زہرا نے غور سے میری جانب دیکھا۔ ''میں نے تو کچھ بھی نہیں کیا۔ صرف اُسے اتنا ہی بتایا تھا کہ ہم تو خود ابھی تک ایک دوسرے کی کھوج میں ہی تھے۔ اور یہی سچ بھی ہے ساحر...... میں نے آپ کو ریزہ ریزہ چن کر اور پل پل میں پایا ہے...... اور ابھی تو میں صرف آپ کے وجود کی پرچھائی تک ہی پہنچی ہوں...... اور ابھی تک ہر نیا دن مجھے آپ کی رُوح کے ایک نئے رُخ، ایک نئے زاویے سے متعارف کروا رہا ہے۔ ہر روز میری رُوح ایک نئے ساحر سے ملتی ہے۔ اتنا عرصہ دُور رہنے کے باوجود بھی یہ ملاقات ہر لمحہ، ہر پل جاری رہتی تھی...... میں نے تو لاریب سے صرف اتنا ہی کہا کہ اگر وہ بھی میری اس کھوج میں میرے ساتھ شامل ہونا چاہے تو اِسے اپنی خوش نصیبی سمجھوں گی...... کہ یہ تلاش ہی کچھ ایسی ہے کہ شاید تنہا میرا اس پر نہ تو حق ہے اور نہ ہی اختیار......''

میں نے چونک کر اُس کی جانب دیکھا۔ میں جانتا تھا کہ صرف زہرا ہی اعلیٰ ظرفی کا یہ جوا کھیلنے کی جرأت کر سکتی ہے۔

میں نے زہرا سے پوچھا ''تو پھر لاریب نے کیا جواب دیا......؟''

''وہی جو ایک بادشاہ دوسرے بادشاہ کو دے سکتا ہے۔ اُس نے کہا کہ وہ جذبوں پر اختیار کی ماہر تو نہیں، لیکن وہ اس کھوج پر صرف اور صرف میرا حق اور اختیار مانتی ہے۔ اُسے اس بات پر بھی بے حد شرمندگی تھی کہ اُس کے منہ زور جذبے کی بے پناہ طاقت نے اُس کی ظاہری حالت پر اس قدر اثر ڈالا کہ آپ تک اُس کی خبر پہنچ گئی اور آپ کو پریشانی میں مجھے یہاں بلوانا پڑا...... لیکن بقول لاریب کہ یہ اُس کی درپردہ شدید خواہش کی تکمیل بھی تھی کہ میری اور اُس کی کبھی ملاقات ہو سکے......'' میں چپ چاپ اور دم سادھے اُس شہزادی کی کہانی سنتا رہا۔ ہاں زہرا اک شہزادی ہی تو تھی جس کا راج پاٹ میرے دل کی سلطنت پر چلتا تھا۔ یہ دل بھی تو ایک بادشاہ کی طرح ہی اپنی سلطنت کا قبضہ کسی ایک کو ہی دیتا ہے۔ خود ہی اپنا سویمبر رچاتا ہے اور پھر جس کسی کے گلے میں یہ اپنے پیار کی مالا ڈال دیتا ہے اُسی کے ساتھ جنموں کے بندھن باندھ لیتا ہے۔ میری مالا بھی اُسی دن زہرا کے گلے میں ڈل گئی تھی جس دن میں نے پہلی بار اُسے درگاہ پر دیکھا تھا۔ لیکن اُس پہلے دن والی زہرا اور آج میرے سامنے کھڑی

ں راج کماری کے دل میں کتنا فرق تھا۔ تب وہ سراپا سنگ تھی اور آج موم کی ایک گڑیا......
ج پہلی بار اُس نے یوں کھل کر خود اپنی رُوح پر میری سپردگی قبول کی تھی۔ کتنا لمبا سفر طے
کر کے میں یہاں تک پہنچا تھا۔ کتنی بار میری رُوح نکلتے نکلتے رہ گئی۔ کتنی بار میرے قدموں
نے لہولہان ہو کر راستے میں ہی سپر ڈالنے کی دہائی دے ڈالی۔ کتنے ہی خار میری کومل رُوح
ں یوں چبھے کہ پھر اندر ہی ٹوٹ کر عمر بھر کا ناسور بن گئے...... کتنی بار اس شدید تپتے صحرا میں
ں یوں جاں بلب ہو کر گھٹنوں کے بل گرا کہ سورج کی تپش اور چبھن سے میری جان میری
ی آنکھوں کے راستے بہتے بہتے خشک ہو کر بے جان ہو گئی۔ لیکن میں چلتا ہی رہا...... ایک
اب کو اپنا نشانِ منزل بنائے...... اور آخر کار آج میں نے یہ صحرا پار کر ہی لیا تھا۔ میرے
منے اب ایک وسیع سمندر تھا اور میری جان میرے کٹے پھٹے بوسیدہ جسم کے ساتھ میرے
ں گھائل ہونٹوں پر آن اٹکی تھی۔ لیکن کیا اپنی جان اس جان آفریں کے سپرد کرنے کے لیے
ں سے بہتر کوئی گھڑی ہو سکتی تھی......؟...... میں نے آخر کار محبت کا وہ قلعہ فتح کر ہی لیا تھا
ں کی فصیل تک پہنچنے کی آرزو میں ہی لاکھوں دم توڑ دیتے ہیں...... اور صدیوں کی ریاضت
۔ بعد کوئی ایک آدھ بھولا بھٹکا اگر اس قلعے کے آس پاس پہنچ بھی جائے تو عشق کا وہ
یت، وہ دیو جو اس قلعے کی حفاظت پر معمور ہے، جس کی ہزار آنکھیں اور ہزاروں ہاتھ
ں ہیں، وہ پل بھر میں ہی اُس زخموں سے چور عاشق کو آگے بڑھ کر اپنے ایک ہی ڈنک
دو حصوں میں تقسیم کر کے اُس کی روح قبض کر لیتا ہے۔ لیکن ساحر نے آج عبداللہ کے
پ میں اُس محبت کے قلعے پر اپنا جھنڈا لہرا ہی دیا تھا اور اس قلعے میں قید پری آج میرے
منے خود کو سپرد کرنے کے لیے نظریں جھکائے کھڑی تھی۔ اس شہزادی کے لبوں پر ایک دھیمی
ن تھی اور اس کی ستارہ پلکیں لرز رہی تھیں۔

میری آنکھوں میں بے اختیار آنسو آ گئے۔ ایک سپہ سالار خود اپنی فتح پر آج رو پڑا تھا۔ یہ
۔ ہزاروں زخموں سے چور اُس کے بدن سے اُٹھتی درد کی ٹیسوں کی وجہ سے نہیں نکلے تھے،
اُسے ان اَن گنت کاٹ کے داغوں اور کٹی پھٹی جلد کا کوئی غم تھا جو اب تا عمر اس معرکے
ملے تمغوں کی صورت میں اُس کے چہرے اور جسم کی نشانی بنے رہیں گے۔ یہ آنسو تو کچھ
ں کہانی بیان کر رہے تھے کہ ہم بہت زیادہ ہنستے ہنستے بھی تو رو پڑتے ہیں۔

زہرا نے مجھے خاموش پا کر اپنی نظریں اُٹھائیں اور میری آنکھوں میں آنسو دیکھتے ہی وہ تڑپ کر آگے بڑھی۔ ”یہ کیا......؟ آپ رو رہے ہیں ساحر...... اب تو منزل سامنے ہے...... بہت قریب...... خدا کے لیے خود کو یوں آزردہ نہ کریں...... میری رُوح کا آخری ریشہ تک آپ کا مقروض ہے...... کبھی میں نے آپ کو رُوح کا قبضہ ملنے تک کے انتظار کا کہا تھا...... آج میں آپ سے کہتی ہوں کہ میری رُوح خود آپ کی منتظر ہے...... آ کر اپنی ملکیت کا قبضہ لے لیں...... جب آپ کا جی چاہے...... میری روح پلکیں بچھائے آپ کو آپ کا انتظار کرتی ملے گی......“

اب میں اُسے کیا بتاتا کہ یہ آنسو خود میری منزل کو سامنے دیکھ کر اُس کے استقبال کے لیے ہی تو بہہ نکلے تھے۔

اتنے میں سلطان بابا بھی اندر سے نکل آئے۔ انہوں نے زہرا کے سر پر ہاتھ رکھ کر اُسے بہت سی دعائیں دیں۔ پھر مسکراتے ہوئے زہرا کو دیکھ کر کہنے لگے ”تمہارا یہ قیدی اب جلد تمہارے حوالے کر دیا جائے گا کہ اس کا جنوں تو دن بدن بڑھتا ہی جاتا ہے۔ لیکن دھیان سے بیڑیاں ڈالنا اس کے اندر کی کھوج کسی کروٹ چین نہیں پاتی......“

زہرا جو مسکراتے ہوئے سر جھکائے سلطان بابا کی بات سن رہی تھی، اُس کے چہرے پر حیا کے کئی گلابی سائے پل بھر میں ہی گزر گئے۔ پھر وہ زیادہ دیر وہاں رُک نہیں پائی اور ہم سے رُخصت ہو کر پلٹ کر چل دی۔ درگاہ کی منڈیر کے پاس رُک کر اُس نے پیچھے مڑ کر مجھ پر ایک نظر ڈالی۔ کیا کچھ نہیں تھا صرف اُس ایک نظر میں، جانے کتنی صدیوں کا ٹھہراؤ، جانے کتنے جنم کی ایک طمانیت......

زہرا کے جانے کے بعد وقت کا کچھ پتا ہی نہیں چلا۔ ایسا میرے ساتھ ہمیشہ ہوا تھا۔ وہ جب جب میرے سامنے آئی تھی، میرے لیے جیسے وقت تھم سا گیا تھا اور جیسے ہی وہ منظر سے اوجھل ہوئی، وقت جیسے پھر اپنی رفتار چل پڑتا تھا۔ تیسرے دن سلطان بابا نے جبل پور سے کوچ کا اعلان کر دیا کیوں کہ یہاں ہمارا کام ختم ہو چکا تھا۔ کل شام جو اس سال کی آخری شام بھی تھی، ہمیں جبل پور سے رُخصت ہو جانا تھا۔ لیکن کہاں؟ ہمیشہ کی طرح نہ میں نے سلطان بابا سے کچھ پوچھا نہ انہوں نے کوئی وضاحت کی۔ البتہ یہ احساس مجھے ضرور ہو چلا تھا کہ شاید اس

مرتبہ یہ میرا اور سلطان بابا کا آخری مشترکہ سفر ہوگا۔ اُدھر ہماری روانگی کا سن کر زہرا کی امی نے بھی رخت سفر باندھنے کا ارادہ کر لیا کیوں کہ انہیں بھی ہفتہ بھر سے زائد ہو چکا تھا اور وہاں شہر میں زہرا کے ابا کی طبیعت بھی ٹھیک نہیں تھی۔

آخر کار ہماری روانگی کا دن بھی آن پہنچا۔ جاتی خزاں کی شامیں ویسے بھی بہت اُداس ہوتی ہیں لیکن دسمبر کی وہ آخری شام اُداسی کے ساتھ ساتھ ایک عجیب سا درد اور کسک بھی اپنے اندر پنہاں لے کر اُتری تھی۔ ہمیں پہلے درگاہ سے خان صاحب کی حویلی اور پھر وہاں سے ریلوے اسٹیشن جانا تھا کیونکہ طے یہ ہوا تھا کہ زہرا کی گاڑی بھی خان صاحب کی گاڑی سمیت ہمیں اسٹیشن چھوڑنے جائے گی کیوں کہ وہاں تک جبل پور سے نکلنے کا راستہ سانجھا تھا۔ درگاہ سے نکلنے سے پہلے میں اصغر صاحب کو وداع کہنے لگا تو وہ مجھے گلے لگا کر بھرا سے گئے۔ اور پھر اچانک ہی پھوٹ پھوٹ کر رو پڑے۔ انہیں تھکتے پھکتے خود میری آنکھیں بھی نم ہو گئیں۔ سلطان بابا نے ہم دونوں کو دلاسا دیا اور اصغر صاحب سے بولے "یہ آنسو بہتے رہنے چاہئیں، من ہلکا اور زرخیز رہتا ہے...... یہ خشک ہو جائیں تو دل کی زمین بھی بنجر ہو جاتی ہے، یہ آنسو ہی ہماری آنکھ کا وضو ہوتے ہیں...... سو آنکھوں کو پاک کرتے رہنا ہوگا، کفارہ ادا ہوتے رہنا چاہیے۔" اصغر صاحب نے آخری بار مجھے گلے لگایا "عبداللہ میاں...... میں تمہیں اپنا دوست کہوں، بیٹا کہوں، محسن کہوں، یار رہبر...... ایک ساتھ کتنے رشتوں کا خزانہ دیئے جا رہے ہو تم مجھے...... کیسے لوٹا پاؤں گا میں یہ سب۔" میں نے اُن کے کاندھے پر ہاتھ رکھا "اپنا بھی کہتے ہیں اور واپس لوٹانے کی بات بھی کرتے ہیں...... اپنوں میں سودے بازی نہیں ہوتی...... آپ جب اپنی منزل پر پہنچ جائیں تو مجھے اطلاع ضرور کیجیے گا اور اپنا خیال رکھیئے گا...... نصیب میں ہوا تو میں بہت جلد آپ سے آ کر ملوں گا۔"

ہم نیچے گاؤں میں پہنچے تو حویلی کے سبھی ملازمین اُداس سے گیٹ کے باہر ہی سفر کی تیاریوں میں مصروف نظر آئے۔ بشیرے، کرم دین اور جمالے نے خاص طور پر مجھے گلے لگایا اور سلطان بابا سے دعا لی۔

وہاں حویلی کے اندر بیرونی ڈیوڑھی کے پاس بڑی مالکن اور لاریب افسردہ سی زہرا کی گاڑی کے پاس کھڑی تھیں۔ لاریب تو زہرا کو گلے لگا کو وداع کرتے وقت اپنی آنکھیں چھلکا

ہی بیٹھی۔ زہرا کی امی نے بڑی مشکل سے بڑی مالکن اور لاریب کو باہر تک آنے سے روکے رکھا کہ خواہ مخواہ سب کا من الوداعی سے مزید اُداس اور بوجھل ہوگا۔ البتہ یہ وعدہ وہ بڑی مالکن سے لینا نہیں بھولیں کہ وہ جلد ہی لاریب کو لے کر شہر اُن کے ہاں چند دن ٹھہرنے آئیں گی۔

آخر کار حویلی سے وداع ہونے کا وہ جاں گسل لمحہ بھی آ ہی گیا۔ سلطان بابا نے فرداً فرداً سبھی کو دعا دی۔ زہرا اور اُس کی امی نم پلکوں کے ساتھ خان صاحب کے خاندان سے مل کر اپنی گاڑی میں جا بیٹھیں۔ میں نے بشیرے کو گلے لگاتے ہوئے دھیرے سے اُس کے کان میں کہا۔ "عبداللہ کی آمد کی خبر مجھے ضرور دینا۔" بشیرے نے ہتھیلی کی پشت سے اپنی آنکھیں پونچھ ڈالیں۔ کرم دین اور جمالے وغیرہ سے ملتا ہوا میں بڑی مالکن تک پہنچا تو انہوں نے میرے سر پر ہاتھ رکھا۔ اُن کی آواز لرز رہی تھی۔ "ہمیں بھول تو نہیں جاؤ گے؟" میں نے اُن کا اپنے سر پر رکھا ہاتھ اپنی آنکھوں سے لگا لیا "میں اپنی آنکھیں یہیں آپ کے پاس چھوڑے جا رہا ہوں۔ جب دل چاہے اِن میں جھانک کر مجھے بلا لیجیے گا۔" میں مزید اُن کی لرزتی پلکوں سے نظر نہیں ملا پایا اور سب سے آخر میں گم صم سی کھڑی لاریب کی طرف بڑھ گیا۔ "مجھے رُخصت نہیں کریں گی؟" وہ جیسے پل بھر میں ہی کسی اور دنیا سے واپس آ گئی۔ "پہلے میں آپ کے ہونے کا کامل یقین تو خود کو ہو جانے دوں...... رُخصت تو بہت بعد کا مرحلہ ہے...... آپ کے لفظوں کا مرہم سدا میرے ساتھ رہے گا...... اللہ آپ کا نگہبان ہو۔" میں پلٹ کر خان صاحب کی گاڑی کی طرف چل دیا جہاں سلطان بابا پہلے سے میرا انتظار کر رہے تھے۔ گاڑیاں حویلی سے باہر نکلیں تو میں نے بڑی مالکن اور لاریب کی جانب ہاتھ ہلاتے ہوئے جبل پور کو ایک عجیب سی اُداسی میں گھرتے ہوئے محسوس کیا۔ ہم اسٹیشن پہنچے تو گاڑی پہلے ہی لگ چکی تھی۔ خان صاحب نے لپکتے جھپکتے نوکروں کی مدد سے ہمارا برائے نام سامان بوگی میں منتقل کروا دیا۔ زہرا اور اُس کی امی بھی ہمیں وداع کرنے کے لیے پلیٹ فارم پر آ گئیں۔ یہاں سے ایک بار پھر میرے اور زہرا کے راستے عارضی طور پر جدا ہو رہے تھے۔ پھر وہی الوداع...... پھر وہی کسک اور تڑپ...... مجھے ہر بار یہ الوداع اُس زنگ زدہ گلوٹین کی طرح لگتا تھا جس کے نیچے کٹنے کے لیے سجائے گئے عاشق کا سر کٹ تو جائے، پر دھڑ سے پوری طرح علیحدہ نہ ہونے پائے اور اس بے کس اور مجبور عاشق کی جان تڑپ تڑپ کر اور نکلتے نکلتے یوں نکلے کہ اُس کے پیٹھ پیچھے

بندھے ہاتھوں اور پیروں کی سخت مشکیں جان کنی کے عالم میں اُس کے جسم کے ریشوں میں گھستی جائیں لیکن ہاتھوں کی بندش کی وجہ سے وہ ٹھیک طرح سے تڑپ بھی نہ سکے اور بندھے پیر اُسے ٹھیک طرح سے ایڑیاں رگڑنے کا موقع بھی نہ دیں۔ کچھ ایسا ہی حال اُس وقت میرا بھی تھا۔ خان صاحب نے رُخصت کرنے سے پہلے زور سے بھینچ کر مجھے گلے لگایا اور دوبارہ جبل پور آنے کا وعدہ لیا۔ زہرا کی امی نے میرے سر پر ہاتھ رکھ کر مجھے دعا دی ''ہم سب تمہارے منتظر رہیں گے...... اس بار دیر نہ کرنا بیٹا......'' آخر میں وہ پری زاد ایک بڑی سی کالی چادر میں اپنے گلاب رُخ چہرے اور جھکی پلکوں کے ساتھ میرے وداع کے انتظار میں کھڑی تھی۔ اُس کی جھکی نظر اُٹھی ''میں آپ کا انتظار کروں گی۔'' میں نے خود کو مجتمع کیا۔ ''میں آپ کو آپ کے ہر انتظار کی حد سے پہلے آ کر ملوں گا...... اب مجھے وداع کر دیں......'' اُس نے پھر اپنی نظر جھکا لی...... سب مدھم پڑ گیا۔ ''کچھ الوداع رُخصت کرنے کے لیے نہیں...... اگلی ملاقات کی پیشگی خوش آمدید کہنے کے لیے ہوتے ہیں، سو میں صرف اتنا ہی کہوں گی کہ خوش آمدید......'' میرے منہ سے بھی بے اختیار نکلا ''خوش آمدید۔'' ٹرین کی آخری سیٹی بھی بج چکی تھی۔ سلطان بابا نے زہرا کے سر پر ہاتھ رکھا اور ہم دونوں گاڑی میں سوار ہو گئے۔ ٹرین نے ایک ہچکولا لیا اور دھیرے دھیرے پلیٹ فارم سے نکلنے لگی۔ پلیٹ فارم پر کھڑے سبھی لوگوں نے ہاتھ ہلا کر الوداع کہا لیکن زہرا کا ہاتھ یونہی ہوا میں جیسے معلق ہی رہ گیا۔ ٹرین کے سامنے سے ہٹتے ہی دُور پہاڑوں کے پیچھے غروب ہوتے سورج کی ایک آخری کرن تیزی سے زہرا کی جانب لپکی اور میں نے بہت دُور سے بھی اُس کی آنکھ میں نمی کی چمک لہراتے دیکھی۔ شاید یہ جبل پور کے سورج کا مجھے اور زہرا کو آخری سلام تھا۔ پلیٹ فارم سے دھوپ اور اسٹیشن سے گاڑی دُور ہوتی جا رہی تھی۔ سورج میرے دل سے بولا

سنو دسمبر
اُسے پکارو
اُسے بلا دو
اُسے ملا دو
اب اِس سے پہلے کہ سال گزرے

اب اِس سے پہلے کہ سانس نکلے
وہی لکیریں، وہی ستارے
میری ہتھیلی میں قید کر دو
یہ آخری شب کے آخری پل
کوئی بڑا اختتام کر دو
یہ زندگی بھی تمام کر دو
سنو دسمبر......
اُسے پکارو......
اُسے ملا دو......

ہاشم ندیم

عبداللہ II
ہاشم ند

فہرست

عبداللہ

عبداللہ کے پہلے حصے، 29 اقساط کا خلاصہ

شہر کے اعلیٰ طبقے سے تعلق رکھنے والا ایک نوجوان، ساحر ایک کار ریس کے اختتام پر خود کو ایک ساحلی درگاہ کے قریب پاتا ہے۔ قریب کھڑی ایک بڑی گاڑی کو دیکھنے کا شوق اسے درگاہ تک دھکیل لاتا ہے اور وہاں ایک پری وش زہرا کی ایک ہی جھلک اسے اپنی دنیا سے بیگانہ کر دیتی ہے۔ لیکن زہرا کا من جیتنا ساحر کے لیے ناممکن ہو جاتا ہے کیوں کہ وہ واضح الفاظ میں اس کا بھیجا گیا رشتہ ٹھکرا دیتی ہے۔ ساحر کا جنوں اُسے درگاہ کے متولی عبداللہ تک کھینچ لاتا ہے، جہاں اُس کی سلطان بابا سے بھی ملاقات ہو جاتی ہے جو عبداللہ کے اُستاد ہیں۔ ساحر سلطان بابا سے بحث میں اُلجھ کر اپنی تقدیر کا شکوہ کرتا ہے اور سلطان بابا جواباً اُسے اُکساتے ہیں کہ عشق کا حصول کچھ آسان کام نہیں۔ پہلے ساحر خود کو اس جنوں کا اہل ثابت کرے اور اپنی دنیا چھوڑ کر درگاہ پر عارضی بسیرا کر لے تو کوئی اس دعوے کی سچائی کو تسلیم بھی کرے۔ ساحر یہ چیلنج قبول کر لیتا ہے۔ لیکن تب اس پر یہ راز آشکار ہوتا ہے کہ زہرا کسی اور کی نہیں خود درگاہ کے متولی عبداللہ کی نظر سے گھائل ہے۔ لیکن عبداللہ اُسے بتاتا ہے کہ وہ اب شادی شدہ ہے اور زہرا کبھی بھی اس کی منزل نہیں رہی۔ ساحر گھر والوں کی اجازت سے درگاہ پر آ بیٹھتا ہے اور یہاں اسے اپنے نئے نام ''عبداللہ'' کی شناخت ملتی ہے۔

سلطان بابا پرانے عبداللہ کے ساتھ کسی سفر پر نکل جاتے ہیں اور ساحر مولوی خضر کی تربیت میں درگاہ پر اپنے شب و روز گزارنے لگتا ہے۔ مولوی خضر کی معیت میں اس پر کئی نئے اسرار کھلتے ہیں اور خود زہرا بھی ساحر کے جنوں کے آگے رکھی اپنی ڈھال کو زنگ زدہ پاتی ہے۔ لہٰذا ساحر سے درخواست کرتی ہے کہ وہ گھر واپس لوٹ جائے کیوں کہ ساحر کا جنوں اس کے راستے کی دیوار ہے۔ ساحر گھر تو لوٹتا ہے لیکن اپنا سب

کچھ درگاہ ہی میں چھوڑ آتا ہے۔ آخرکار ساحر کے والدین اس کی بٹی ہوئی زندگی اور تقسیم شدہ رُوح کے ہاتھوں مجبور ہو کر اُسے دوبارہ درگاہ جانے کی اجازت دیتے ہیں۔ لیکن اس بار اُس کی منزل درگاہ نہیں بلکہ سلطان بابا کا ساتھ ہے اور ان دونوں کا پہلا پڑاؤ دُور دراز کی سینٹرل جیل ہے جہاں سکندر نامی قیدی کی پھانسی اگلی صبح طے ہے۔ مقتول کی بیوہ نائلہ خود کبھی سکندر کی زندگی کی ڈور تھی لیکن اب وہ سکندر کو پھانسی پر جھولتا دیکھنا چاہتی ہے۔ عبداللہ (ساحر) کی کوشش تو رنگ لے آتی ہے۔ نائلہ آخری وقت میں سکندر کو معاف تو کر دیتی ہے لیکن خود بھی سکندر کی سانسوں کے ساتھ اپنی زندگی کی بازی ہار جاتی ہے۔ سلطان بابا کا اگلا پڑاؤ رُباب کی حویلی بنتی ہے جہاں یاقوط نامی ایک جن زادہ رُباب کی زلفوں کا اسیر ہے۔ وہ سلطان بابا کو شکست دینے کے لیے عبداللہ کے جسم پر اپنا تسلط قائم کر لیتا ہے لیکن جیت آخر انسان ہی کی ہوتی ہے اور رُباب یاقوط کے چنگل سے آزاد ہو جاتی ہے۔ سلطان بابا عبداللہ کو جبل پور روانہ کر دیتے ہیں جہاں راستے میں زہرا کی سوتیلی بہن زریاب کو دیکھ کر عبداللہ دنگ رہ جاتا ہے اور پھر اُسے جگن نامی غنڈے کے عذاب سے بچانے کے لیے عبداللہ کو ایک بار پھر سلطان بابا کو پکارنا پڑتا ہے۔ زریاب تو جگن کی دست برد سے نکل آتی ہے لیکن خود جبل پور کے خان کریم کی آنکھوں کا تارا، لاریب عبداللہ کے ماں باپ کی زبانی ساحر اور زہرا کی لازوال داستان سن کر نادانستہ عبداللہ کو دل میں بسا لیتی ہے اور شدید بیمار پڑ جاتی ہے۔ عبداللہ کو ایک بار پھر زہرا کے مرہم کی ضرورت پڑ جاتی ہے اور وہ زہرا کو جبل پور طلب کر لیتا ہے۔ لیکن خود زہرا اس مرتبہ عبداللہ کی مستقل مزاجی اور محبت کے سامنے گھٹنے ٹیک دیتی ہے۔ لاریب کو زہرا کی سچائی اور اس جذبے کی طاقت دوبارہ زندگی کی طرف لوٹنے پر مجبور کر دیتی ہے اور زہرا عبداللہ سے کہتی ہے کہ اب اس کی رُوح عبداللہ کے بلاوے کی منتظر رہے گی۔ سلطان بابا اور عبداللہ جبل پور سے اپنے نئے سفر پر نکل پڑتے ہیں۔

جبروت

میری آوارگی میں کچھ دخل ہے تمہارا بھی مُحسن
تمہاری یاد آتی ہے تو گھر اچھا نہیں لگتا

ہمیں جبل پور سے نکلے آج تیسرا دن تھا اور اب تک ہم دو ٹرینیں بدل چکے تھے۔ رفتہ رفتہ ہمارے آس پاس کے مناظر سے سبزہ اور پہاڑ اُوجھل ہوتے جا رہے تھے اور تیسرے دن دوپہر تک باہر کا موسم یکسر بدل چکا تھا۔ ریت اور گرد کے بگولے گاڑی کی ادھ کھلی کھڑکیوں اور سالوں سے زنگ خوردہ، جامد دروازوں سے ہمارے استقبال کو یوں اندر لپک رہے تھے جیسے کوئی صدیوں کا بچھڑا اپنے گم شدہ محبوب کی طرف بڑھتا ہے۔ گرم لُو کے تھپیڑے چہروں کو جھلسانے لگے تھے اور باہر دوڑتی زمین کے آثار بتا رہے تھے کہ ہم کسی صحرا میں داخل ہو رہے ہیں۔ آس پاس کے مسافروں نے جلدی جلدی سامان سے تولیہ یا کوئی اور کپڑا نکال کر پانی میں بھگویا اور سر اور چہرے چھپانے لگے۔ سلطان بابا نے مجھے بھی یہ احتیاطی تدبیر اختیار کرنے کا مشورہ دیا لیکن میں مسکرا کر ٹال گیا۔ اب میں انہیں کیا بتاتا کہ اس سے کہیں زیادہ شدید "لُو" تو شاید ازل ہی سے میرے اندر چل رہی ہے۔ باہر چلتی ہوا کے یہ چند گرم جھونکے بھلا مجھ سے کرم جلے کا کیا بگاڑ پائیں گے۔ اور پھر بات باہر کے موسم کی تھی ہی کب، جن کے اندر ہی سدا کے لیے خزاں ٹھہر گئی ہو انہیں بیرونی تبدیلیوں سے کیا واسطہ۔

گاڑی اب باقاعدہ ایک وسیع صحرا سے گزر رہی تھی، جہاں اُڑتی ریت کی زیادتی سے گرم دھوپ میں چمکتی لوہے کی پٹڑی بھی جگہ جگہ ریت میں دھنس کر غائب ہو جاتی تھی۔ شاید اسی لیے ٹرین کی رفتار اب کافی مدھم پڑ چکی تھی۔ دو اہل کار ایک بڑی سی قنات نما کپڑے کی رسی لیے گاڑی کے آگے آگے بھاگ رہے تھے، جنہوں نے زمین پر یوں ڈھلکا رکھا تھا کہ اس کے پونچھے کی رگڑ سے پٹریوں پر پڑی ریت پونچھی جا رہی تھی۔ شاید اسی مقصد کے لیے رسی کو اچھی طرح پانی میں بھگویا گیا تھا۔ ایک تیسرا اہل کار ایک بڑے سے کین میں پانی لیے ان کے ساتھ ساتھ دوڑ رہا تھا۔ جیسے ہی لُو کے گرم تھپیڑوں سے پونچھا خشک ہونے لگتا وہ جلدی سے دوبارہ اس پر پانی کا چھڑکاؤ کر کے اُسے بھگو دیتا۔ بعض جگہ ریت کے ٹیلے باقاعدہ لوہے کی پٹڑی کے اُوپر سرک آئے تھے، جنہیں ہٹانے کے لیے متعین عملے کو خاص بیلچوں کی مدد سے ٹرین رُکوا کر ریت ہٹانا پڑتی تھی۔ کہیں پڑھا تھا کہ ریت بھی ہم انسانوں کی طرح سفر کرتی ہے اور صحرا کی منزل بھی وقت کے ساتھ بدلتی رہتی ہے، تو بہت دیر تک اس سرکتی ریت اور بدلتے صحرا کے کھیل کو خاموشی سے دیکھتا رہا۔

رفتہ رفتہ شام ڈھلنے لگی۔ اُفق کے پار سورج ڈوبنے کے باوجود آتشی گلابی رنگت کی ایک واضح لکیر یوں گاڑی کے ساتھ بہت دیر تک دوڑتی رہی، جیسے کسی دیا سلائی کا مختصر سا شعلہ رگڑ کھانے کے بعد لکڑی کی تیلی پر اپنے اختتام کی جانب دوڑتا ہے۔ صحرا کے آسمان کی حد پر قدرت نے بھی کوئی دیا سلائی سی جلا دی تھی۔ جواب تیزی سے اُفق کے دوسرے پار تک اپنی گلابی آنچ پہنچا کر سارے فلک کو جلا دینا چاہتی تھی۔ مغرب کی نماز ہم نے ہچکولے کھاتی گاڑی ہی میں پڑھی اور مکمل اندھیرا ہونے تک ہمیں کسی انسانی بستی یا اسٹیشن کے آثار نظر نہیں آئے۔ جانے وہ رات کا کون سا پہر تھا، جب ٹرین نے ایک آخری ہچکی لی اور دھیرے دھیرے ایک ویران سے اسٹیشن پر رُک گئی۔ سلطان بابا نے مجھے اشارہ کیا "چلو میاں...... ہماری منزل آ گئی ہے"۔

میں اپنے خیالات کی رد ٹوٹنے پر ہڑ بڑا کر اُٹھ بیٹھا۔ باہر گھٹا ٹوپ اندھیرا تھا اور ہم نے جس زمین پر قدم رکھے، اسے پلیٹ فارم سے زیادہ ریت کا کوئی ٹیلا کہنا زیادہ مناسب تھا۔ چند قدم کے فاصلے پر ایک برآمدے کے پیچھے تین چار کچے کمرے ایستادہ تھے، جن میں سے ایک کے اندر میل خوردہ لالٹین کی کمزور سی روشنی کھڑکی کے ملگجے شیشوں سے چھن کر باہر آ رہی تھی۔ پلیٹ فارم کی ہر چیز کو گرد اور ریت کی موٹی تہ نے ڈھانپ رکھا تھا۔ جب تک سلطان بابا اندر اسٹیشن ماسٹر کے کمرے سے کچھ معلومات حاصل کر کے آئے تب تک میں نے پلیٹ فارم پر بچھے ایک لکڑی کے تختے نما بنچ کو دوبارا اپنے ہاتھ سے جھاڑ کر اس کی سطح صاف کرنے کی کوشش کی۔ لیکن چند لمحوں ہی میں پھر سے تیز ہوا کے ساتھ اُڑتی ہوئی ریت نے اُسے ڈھک لیا۔ ہم انسان ساری زندگی اس گرد سے خود کو بچانے کی کوشش کرتے رہتے ہیں لیکن بالآخر ایک دن یہی مٹی ہمیں اپنی پناہ میں لیتی ہے۔ سچ ہے "آخر کار سب مٹی ہو جاتا ہے"۔

دفعتاً مجھے ایک عجیب سا احساس ہوا، جیسے کوئی اور بھی پلیٹ فارم پر رات کے اس سناٹے میں موجود ہو اور مجھے دیکھ رہا ہو۔ میں نے چونک کر نظر اُٹھائی تو دُور پٹریوں کے دوسری پار، جہاں اسٹیشن کی حد ختم ہو رہی تھی اور جہاں لوہے کی ایک بڑی سی راڈ کو بطور گھنٹی لٹکایا گیا تھا، ایک نوجوان لڑکی کا ہیولا سا دکھائی دیا۔ لیکن ٹرین تو کب کی جا چکی تھی، پھر اس ویرانے میں اتنی رات گئے ایک تنہا لڑکی کیا کر رہی تھی۔ اس نے ایک کالی چادر اوڑھ رکھی تھی، جس پر سفید پھول کڑھے ہوئے تھے۔ لیکن فاصلہ زیادہ اور اسٹیشن کی دم توڑتی روشنی اتنی کم تھی کہ میں اس کے چہرے کے خدوخال کو ٹھیک طرح سے دیکھ نہیں پایا تھا اور تبھی اچانک اپنے عقب میں مجھے سلطان بابا کے کھانسنے کی آواز سنائی دی۔

"کن سوچوں میں گم ہو...... ہمیں ابھی بہت سفر پیدل بھی طے کرنا ہے۔ اگر تھکن زیادہ ہے تو ہم رات بھر اِسی اسٹیشن پر قیام کر سکتے ہیں لیکن پھر بہت سویرے نکلنا ہوگا، کیوں کہ صحرا میں سورج نکلتے ہی موسم بہت شدید ہو جاتا ہے۔" سلطان بابا کو ہمیشہ میرے ہی آرام کی فکر کھائے جاتی تھی۔ میں مسکرایا۔ "نہیں...... ابھی سفر کریں گے...... میں بالکل تازہ دم ہوں۔" سلطان بابا نے میرا کاندھا تھپتھپایا اور آگے بڑھ گئے۔ میں

نے پلیٹ فارم سے نکلنے سے پہلے پلٹ کر دیکھا۔ وہ لڑکی اب وہاں نہیں تھی۔ ایک لمحے کو مجھے یوں محسوس ہوا کہ جیسے یہ کوئی واہمہ ہو۔ لیکن وہم اس قدر جزئیات کے ساتھ تو نہیں اُترتے۔ بہر حال میں سر جھٹک کر صحرا میں آگے بڑھتے سلطان بابا کے نقش قدم پر چل پڑا۔ جن لوگوں نے صحرا کی ڈھلتی رات کو جیا ہے، وہ اس کے سحر سے ضرور واقف ہوں گے۔ مجھے یوں محسوس ہو رہا تھا کہ جیسے پوری کائنات ایک آسمان بن گئی ہو اور اس پر چمکتے اَن گنت تارے مجھ سے سرگوشیاں کر رہے ہوں کہ "ہمیں چھوڑ کر کہاں چل دیئے؟" رات کے وقت صحرا خود ایک لامتناہی سمندر کی طرح نظر آتا ہے۔ بس ہر موڑ پر ایک نیا سراب چھل دینے کے انتظار میں کھڑا ملتا ہے۔ جانے یہ تارے صحرا میں اتنے روشن اور چمک دار کیسے ہو جاتے ہیں، میرے مقدر کا ستارہ تو سدا کا دھندلا تھا۔

صبح ہونے سے کچھ پہلے ہم ایک صحرائی بستی میں داخل ہو چکے تھے۔ بستی کیا تھی، بس ویرانہ ہی تھا۔ کچے گھروں کی طویل قطاریں دُور دُور تک صحرا میں پھیلی ہوئی تھیں جنہیں کیکر نما ایک جھاڑی کی باڑھ سے ڈھکا گیا تھا۔ بستی کی زبوں حالی اور غربت ان کچے جھونپڑوں ہی سے ظاہر تھی۔ البتہ کچھ آگے بڑھنے پر چند پکی عمارتیں اور پھر خاکی رنگ کی ایک بہت بڑی سی قلعہ نما عمارت بھی نظر آئی۔ شاید پوری بستی میں یہی ایک واحد عمارت تھی جہاں بجلی کی روشنی نظر آ رہی تھی۔ فضا میں ایک عجیب سی گھرررر...... کی سی آواز سے یہ بھی ظاہر ہو رہا تھا کہ یہ اُجالا کسی بہت بڑے جنریٹر کا مرہون منت ہے۔ میں نے بستی کی ٹیڑھی میڑھی، اینٹوں سے چُنی سڑکوں اور کچی گلیوں سے گزرتے ہوئے ایک اور عجیب سی بات بھی محسوس کی کہ کسی ایک آوارہ کتے نے بھی ہمارا راستہ روکنے کی کوشش نہیں کی۔ شاید پوری بستی میں کوئی کتا تھا ہی نہیں۔ بس ایک لرزا دینے والا سناٹا طاری تھا۔ اب بستی کا باقاعدہ بازار ختم ہو رہا تھا اور دُور چند گلیوں سے پرے صحرا میں ایک ٹیلے پر ایک چھوٹا سا چراغ ٹمٹماتا ہوا دکھائی دے رہا تھا۔ البتہ بستی ختم ہو جانے کے بعد میں جس روشنی کو بہت قریب سمجھ بیٹھا تھا، صحرا میں وہ عمارت اور وہ چراغ بھی بہت دُور نکلے۔ چراغ نے دھیرے دھیرے ایک بڑی سی گیس بتی کی شکل اختیار کر لی اور ریت کا ٹیلا دھیرے دھیرے صحرا میں کھڑے ایک بوسیدہ مزار کی عمارت کی شکل اختیار کرتا گیا۔ یہی زرد اینٹوں سے چُنا گیا صدیوں پرانا مزار ہماری منزل تھا، جو صحرا میں ریت کے ایک بہت بلند ٹیلے پر واقع تھا۔ میں نے پلٹ کر دیکھا دُور بستی کے کچے گھر اور وہ قلعہ بچوں کے بنائے گھروندوں سے معلوم ہو رہے تھے۔

مزار کا بوسیدہ لکڑی کا گیٹ تیز ہوا سے جھول کر اس سناٹے میں ایک عجیب سی آواز پیدا کر رہا تھا۔ جیسے نئے آنے والے مہمانوں سے اپنی بے کسی کی فریاد کر رہا ہو۔ مزار کا صحن بھی انہی کچی اور پیلے رنگ کی اینٹوں سے جڑا گیا تھا جس کا استعمال قصبے کی سڑک میں نظر آیا تھا۔ صحن سے کافی پرے چند بوسیدہ کمرے اور وسط میں ایک گنبد تھا، جس کے اُوپر کی گئی پتھریلی اور منقش مینا کاری مہ و سال کی گردش کے سبب جگہ جگہ سے اکھڑ گئی تھی اور مزار کی چھت پر کھڑا یہ عظیم گنبد اس وقت خود کسی سجدے کی سی حالت میں نظر آ رہا تھا۔ دفعتاً میرے دل میں وہی پرانا سوال پھر سے جاگ اُٹھا "لوگ ان مزاروں پر کیوں آتے ہیں۔ ان برستی ویرانیوں کا ہمارے دل کی

ویرانی سے کیا رشتہ ہے؟'' آہٹ سن کر اندر سے ایک بوڑھا نکل آیا اور اس نے بڑے تپاک سے ہم دونوں کا استقبال کیا۔ سلطان بابا اسے اکرام اللہ کے نام سے مخاطب کر رہے تھے اور جب انہوں نے عبداللہ کے نام سے میرا تعارف کروایا تو اس نے پہلے تو چونک کر ایک بار پھر سے میرا بغور جائزہ لیا اور پھر نہایت شفقت سے میرے سر پر ہاتھ رکھ کر دعا دی ''خدا تمہیں تمہارے مقصد میں کامیاب کرے۔'' میں نے چونک کر اُس کی جانب دیکھا۔ وہ کس مقصد کی بات کر رہا تھا؟ اگر زہرا ہی میرا مقصد تھی تو شاید اُسے تو میں حاصل کر چکا تھا۔ تو پھر زہرا کے بعد وہ کون سا مقصد تھا جو مجھے ان ویرانوں میں در بدر بھٹکا رہا تھا۔ یہ کیسی تلاش تھی، جو ختم ہونے کے بعد ہی شروع ہوتی تھی؟ کچھ ہی دیر میں فجر کا وقت بھی ہو گیا۔ اکرام اللہ صاحب نے اذان دی اور سلطان بابا کی معیت میں ہم دونوں نے با جماعت نماز پڑھ لی۔ کچھ ہی دیر میں پھر شفق سے قدرت کی وہ اَن دیکھی دیا سلائی سُلگی اور مدھم شعلے جیسی اک گلابی روشنی افق کے ایک کونے سے دوسرے کونے کی جانب لپکی۔ میں پل بھر کے لیے مبہوت سا رہ گیا۔ فلک پر ایسا چراغاں میں نے پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ کچھ ہی دیر میں اکرام صاحب پیتل کی چھوٹی سی کیتلی میں چائے اور ایک چنگیر میں روٹی کے چند ٹکڑے لیے اندر سے برآمد ہوئے۔ چائے کا پہلا گھونٹ لیتے ہی میرے منہ میں ریت کا ذائقہ اور ذرے بھر سے گئے۔ مجھے سمجھ ہی نہیں آیا کہ میں اس ریت بھری چائے کو نگلوں یا اُگلوں...... یہی حال گندم کے آٹے سے بنی اس روٹی کا بھی تھا۔ اکرام صاحب غور سے میری حالت دیکھ رہے تھے۔ دھیرے سے مسکائے ''بھئی یہاں کی ہر چیز میں تمہیں اس ریت کا ازلی ذائقہ ملے گا۔ آٹا اور چینی کتنے بھی ڈھانک کر رکھو، ریت کہیں نہ کہیں سے اندر چھن ہی آتی ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ ہم 'کال گڑھ' والے اب اس ریتلے ذائقے کے اس قدر عادی ہو چکے ہیں کہ اب تو سالن میں نمک، مرچ اور دیگر مسالوں کے ساتھ ریت کا بھی با قاعدہ حساب رکھنا پڑتا ہے۔ مجھے افسوس ہے کہ میں یہاں تمہیں گھر جیسا ناشتا نہیں پیش کر سکتا۔'' ان کا آخری جملہ سن کر میرے ہونٹوں پر بھی مسکراہٹ آ گئی۔ اب میں انہیں کیا بتاتا کہ ایک وقت تھا کہ ساحر صاحب صبح کا ناشتا صرف اس لیے چھوڑ کر اُٹھ جاتے تھے کہ فرانس کا مارملیڈ اور مصر کا شہد میز پر موجود کیوں نہیں۔ ہالینڈ کے بنے ہوئے دلیے کے علاوہ اگر کوئی دیسی یا بدیسی کارن فلیکس ہوتا تو سارا دن مزاج بگڑا رہتا۔ ہم انسانوں کی زندگی بھی کیسے کیسے انجان موڑوں اور غلام گردش جیسی اجنبی گولائیوں سے بھرپور ہوتی ہے۔ کون، کب کیا ہو جائے...... کس کو خبر......؟

کچھ ہی دیر میں سورج کا گولا مشرق سے بلند ہوا اور آناً فاناً جیسے ہر چیز کو آگ سی لگ گئی۔ میں نے صحرا کی گرمی اس سے پہلے کبھی نہیں جھیلی تھی۔ کبھی پاپا یا کاشف کے ساتھ شکار یا کیمپ فائر کے لیے جانا ہوا بھی تو ہمارے ساتھ بڑے بڑے جنریٹر ہوتے تھے اور ہمارے خیموں کو ٹھنڈا کرنے کا پورا اہتمام ہمارے ساتھ ہی سفر کرتا تھا۔ لیکن یہ تپش...... دو گھنٹوں میں ہی مجھے یوں لگنے لگا تھا جیسے میرے وجود کے ساتھ ساتھ میری رُوح بھی پگھل کر بہہ جائے گی۔ یہ نیلا آسمان ایسے قہر بھی برساتا ہوگا، مجھے اندازہ نہیں تھا۔ کال گڑھ ایک صحرائی بستی

تھی، جس کے نام کی وجہ تسمیہ بھی سدا کا کال اور قحط ہی تھا۔ یہاں برسوں سے بارش نہیں برسی تھی اور پانی یہاں آبِ حیات سے بھی بڑی عیاشی تھا۔ قصبے میں نوے فیصد آبادی غربت کی لکیر سے نیچے کی زندگی گزارتی تھی اور پوری بستی پر قلعے کے باسیوں کا قبضہ تھا۔ یہ ساری باتیں مجھے اکرام اللہ صاحب سے پتا چلیں۔ جو خود کال گڑھ کے واحد اور برائے نام مڈل اسکول کے ریٹائرڈ ہیڈ ماسٹر تھے اور اب ریٹائرمنٹ کے بعد بستی کے بچوں کو درسِ قرآن دیتے تھے۔ ان کے خاندان میں ان کا اکلوتا بیٹا ہی بچا تھا، جو اپنے بیوی بچوں کے ساتھ بڑے شہر میں رہتا تھا۔ اُسے کال گڑھ میں قلعہ داروں کی غلامی پسند نہیں تھی۔ لہٰذا وہ میٹرک کے بعد ہی با قاعدہ شہر منتقل ہو گیا تھا۔ میں نے محسوس کیا کہ قلعے کے ذکر پر اکرام صاحب کچھ بے چین اور با قاعدہ خوف زدہ سے ہو جاتے تھے۔ آخر مجھ سے نہیں رہا گیا ''آپ نے ہر چیز کے بارے میں بڑی تفصیل سے بتا دیا ہے لیکن یہ قلعے اور اس میں بسنے والے قلعے داروں کا اسرار مجھے سمجھ نہیں آیا۔'' میرا سوال سنتے ہی اکرام صاحب کے چہرے پر ایک رنگ سا آ کر گزر گیا۔ انہوں نے جلدی سے اِدھر اُدھر نظر دوڑائی۔ ہم دونوں مزار کے برآمدے میں ستون کے گرم سائے میں چھپنے کی ناکام کوشش کر رہے تھے۔ سلطان بابا اندر کمرے میں آرام کرنے جا چکے تھے۔ اکرام صاحب نے سرگوشی کی ''عبداللہ میاں...... ان قلعہ داروں کے سائے سے بھی بچ کر رہنا۔ بہت سفاک اور اذیت پسند ہے۔ وہاں کا بڑا قلعے دار۔ سارا علاقہ کانپتا ہے جبروت کے نام سے......'' ''جبروت......؟؟ یہ کیسا نام ہے......؟'' ''نام تو ماں باپ نے شاید جابر رکھا تھا، جو پیار سے جبرو ہوا اور پھر اس کے ظلم کی دہشت نے اسے جبروت بنا ڈالا۔ اور اب وہ اسی نام سے حکمرانی کرتا ہے۔'' جبروت جو کوئی بھی تھا، اس کی دہشت میں اپنے سامنے بیٹھے اکرام اللہ کے چہرے ہی سے محسوس کر سکتا تھا۔ انہوں نے مزید جو کچھ بتایا وہ اس جدید دنیا میں مجھے ایک ماورائی داستان سے کچھ کم محسوس نہیں ہوا۔ کال گڑھ جبروت کی کسی ذاتی جاگیر کی مثال بن چکا تھا۔ علاقے میں کوتوالی یا پولیس نام کی کوئی چیز نہیں تھی۔ ایک سب انسپکٹر ایک برائے نام سی تھانہ نما عمارت میں چار چھ کانسٹیبلوں کی نفری کے ساتھ بیٹھتا تو تھا لیکن اس کی حیثیت بھی جبروت کے ذاتی غلاموں جیسی ہی تھی۔ کال گڑھ کا قانون، عدالت اور انصاف سب کچھ جبروت تھا۔ علاقے کے سارے مقدمے اُسی کے سامنے پیش ہوتے تھے اور وہی اُن کا فیصلہ کرتا تھا۔ اُس کی حکم عدولی کی سزا فوری اور انتہائی اذیت ناک تھی۔ قلعے کے اندر اس نے ذاتی جیل بھی بنا رکھی تھی، جس کی کال کوٹھڑیوں میں اس کے مجرم پڑے پڑے سڑتے رہتے تھے۔ ان سے دن بھر انہی زنجیروں اور بیڑیوں سمیت مشقت لی جاتی تھی اور پھر شام ڈھلے، ان ہی بندھے بھاری پتھروں سمیت پھر سے تہ خانوں کے زندان میں دھکیل دیا جاتا تھا۔ ان میں سے تو کئی ایسے تھے جنہیں قلعے سے باہر کا آسمان دیکھے بھی برسوں بیت چکے تھے۔ سارا قصبہ جبروت کے دیئے ہوئے قرض کے بوجھ تلے دبا ہوا تھا اور ان کی دوسری نسل بھی اس قرض کو چکاتے چکاتے اپنی جوانی بڑھاپے میں بدل رہی تھی۔ برسوں کے قحط نے کال گڑھ کے باسیوں کی کمر پہلے ہی توڑ رکھی تھی اور اب تو انہوں نے قرض کی اس غلامی سے باہر نکلنے کا

خواب دیکھنا بھی چھوڑ دیا تھا۔ قلعے میں جبروت کے پہرے داروں اور محافظوں کی فوج کے علاوہ اس کی تم
بیویاں اور کتوں کی ایک فوج بھی رہتی تھی۔ جبروت کو اگر دنیا میں کسی چیز سے پیار تھا، تو وہ اس کے پالے ہو
خوں خوار کتے تھے، جنہیں وہ اولاد سے زیادہ عزیز رکھتا تھا۔ ویسے بھی جبروت کی تمام اولاد بچپن ہی میں ماں ک
گود ہی میں خدا کو پیاری ہو جاتی تھی۔ اسی اولاد کی خواہش میں اس نے یکے بعد دیگرے چار شادیاں کیں او
چوتھی بیوی کا انتقال بھی زچگی کے دوران ہی ہوا تھا۔ لیکن کچھ افسانے یہ بھی دہراتے تھے کہ جبروت نے خود
کسی بات پر ناراض ہو کر اُسے زہر دے دیا تھا۔ وجہ کچھ بھی رہی ہو آج کل پھر جبروت کی چوتھی بیوی کا کمرہ او
نشست خالی تھی۔ ایسا پہلے بھی کئی مرتبہ ہو چکا تھا اور ہر بار پوری بستی کی اُس وقت تک جان پر بنی رہتی تھی جب
تک جبروت کہیں نہ کہیں سے کوئی نئی نویلی چوتھی بیوی بیاہ کر نہیں لے آتا تھا۔ چار کی اس گنتی کو تین کرنے م
جبروت کی کسی نہ کسی بیوی کو کبھی ہیضے، کبھی سانپ کے کاٹے، کبھی بخار اور کبھی کسی دوسری ''انہونی'' کے ہاتھو
موت کے گھاٹ اُترنا ہی پڑتا تھا۔ سچ ہے ''قدرت کے لکھے'' کو بھلا کون ٹال سکتا تھا۔ لیکن چار کی گنتی پور
کرنے کے چند دن بعد ہی جبروت پھر سے ان کھلونوں سے اُوب جاتا اور پھر سے قدرت کے لکھے کا انتظا
کرنے لگتا۔ ہاں البتہ اس کی دل چسپی اگر سدا کسی مشغلے میں برقرار رہی تو وہ تھی، خون خوار بھیڑیا نما کتوں ک
دیکھ بھال اور نشو و نما۔ سُنا تھا کہ ان کے راتب اور خوراک وغیرہ میں غفلت کرنے والے نوکروں کو وہ ان
بھوکے کتوں کے سامنے ڈال دیتا تھا۔ دن میں تین مرتبہ ان کتوں کو خوراک، ورزش اور غسل کے بعد ٹہلا
کے لیے جب بستی میں نکالا جاتا تھا تو جبروت خود ان کے ساتھ ہوتا اور انہیں دیکھ کر ہی بستی والوں کا پتا پا
ہو جاتا۔ ان کتوں کے بارے میں ایک اور لرزہ خیز فسانہ بھی کال گڑھ میں زبان زدِ عام تھا۔ کہنے والے ک
تھے جبروت اپنے مخالفوں اور دشمنوں کے ساتھ ایک عجیب کھیل کھیلتا تھا۔ اُسے خود کو انصاف پسند کہلانے کا بہ
شوق تھا اور وہ چاہتا تھا کہ اس کی رعایا اُسے کبھی بے انصاف کا لقب نہ دے، لہٰذا اپنے دشمنوں کو مروانے
پہلے وہ انہیں ایک پیش کش کرتا تھا کہ اگر اس کا دشمن چاہے تو اب بھی اس کی جان بخشی ہو سکتی ہے، بس ا
جبروت کے ان لاڈلوں کو ہرانا ہو گا۔ کھیل یہ طے پاتا تھا کہ ملزم کو کال گڑھ کا تپتا صحرا بھاگ کر پار کرتے ہو
سات کوس کے فاصلے پر موجود ریلوے اسٹیشن تک پہنچنا ہوتا تھا۔ شکار کے سرپٹ صحرا میں دوڑنے کے ٹھی
پندرہ منٹ بعد جبروت کے خون خوار درندے بھی اس دشمن کے تعاقب میں چھوڑ دیئے جاتے تھے۔ کہتے
کہ آج تک ایک بھی ایسا خوش نصیب ثابت نہیں ہو سکا تھا جس کی لرزہ خیز چیخوں سے کال گڑھ کا صحرا نہ گو
ہو۔ بستی میں داخل ہونے والے ہر ذی رُوح کو پہلی سلامی کے لیے جبروت کے حضور پیش ہونا پڑتا تھا، ورنہ
شخص پہلے دن ہی سے باغی قرار پاتا تھا۔ اکرام صاحب کے بقول میں اور سلطان بابا اس لحاظ سے خوش نص
تھے کہ جبروت دو دن سے کسی کام سے شہر گیا ہوا تھا۔ لہٰذا اُسے فی الحال ہماری کال گڑھ میں موجودگی کا پتا نہ
چل پایا تھا، لیکن، ساتھ ہی وہ اس بات سے بھی پریشان تھے کہ جب جبروت کی واپسی ہو گی تو وہ ضرور ہم دون

سے ملنا چاہے گا۔ اکرام صاحب نے پریشانی سے سر ہلایا۔ دفعتاً تب ہی ہمارے عقب میں آواز اُبھری ''جب جب جو جو ہونا ہے...... تب تب سو سو ہوتا ہے۔'' میں اُچھل ہی تو پڑا۔ سلطان بابا جانے کب سے ہمارے عقب میں کھڑے جبروت نامی اس عجیب الخلقت کردار کے فسانے سن رہے تھے۔ میں نے گھبرا کر اُن کے چہرے کی جانب دیکھا، جہاں حسب معمول ملامت آمیز سکوت پھیلا ہوا تھا۔

اکرام صاحب ہمارے دوپہر کے کھانے کا بندوبست کرنے چلے گئے۔ اِسی سوچ و بچار میں شام بھی ڈھل گئی اور پھر سے وہی خواب ناک صحرا کی رات تاروں بھرا آنچل لیے ہمارے سروں پر آ کر ٹھہر گئی۔ اکرام صاحب مغرب سے کچھ پہلے ہی واپس لوٹ چکے تھے۔ عشاء کے بعد سلطان بابا نے مجھ سے کہا ''اب تم بھی ذرا کمر ٹکا لو عبداللہ میاں...... میں بھی کمرے میں اپنی تسبیح پوری کروں گا۔'' لیکن میری بنجر آنکھوں میں بھلا نیند نے کب آبیاری کی تھی۔ سو کچھ دیر کروٹیں بدلنے کے بعد گرمی اور حبس سے پریشان ہو کر میں مزار کے صحن میں نکل آیا۔ آسمان پر چمکیلے ستاروں کا کارواں مجھے دیکھ کر مُسکایا۔ میں ان تاروں میں اپنا اور زہرا کا تارا تلاش کرنے کے لیے ایک ستون سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا۔ اچانک مجھے محسوس ہوا جیسے مزار کے صحن کے باہر میں نے کسی کے پھولوں بھرے آنچل کی ایک جھلک لہراتے دیکھی ہے۔ ہاں...... وہ وہی تو تھی، جسے میں نے کل رات ریلوے پلیٹ فارم پر دیکھا تھا لیکن وہ میرے پیچھے یہاں اس ویرانے میں آدھی رات کو اس مزار تک بھی آ پہنچی، کیوں......؟؟؟ مجھے لگا، جیسے وہ مجھ سے کچھ کہنا چاہتی ہے۔ لیکن کل کی طرح آج بھی ہمارے درمیان کافی فاصلہ تھا اور پھر اس کا وہ لمبا سا صحرائی گھونگھٹ کل کی طرح پردہ بن کر اس کے خدوخال مجھ سے چھپا رہا تھا۔ آخر وہ چاہتی کیا تھی۔ حلیہ تو اِسی ریگستانی بستی ہی کا تھا۔ میں اپنی جگہ سے کھڑا ہو گیا۔ فضا میں دو تین جیپ نما گاڑیوں کا شور گونجا۔ میری توجہ لمحے بھر کو صحرا کی جانب ہٹی، جہاں دُور تین گاڑیوں کی ہیڈ لائٹس جگمگاتی ہوئی مزار کی جانب بڑھ رہی تھیں۔ اگلے ہی پل میں نے دوبارہ وہاں نظر ڈالی، جہاں وہ کچھ دیر پہلے گھونگھٹ نکالے کھڑی تھی تو اب وہ جگہ سنسان تھی۔ شاید کسی کو آتا دیکھ کر وہاں سے بڑھ گئی ہو۔ تینوں گاڑیاں پرانے ماڈلز کی ولیز جیپیں ہی تھیں جو اَب بالکل مزار کے قریب پہنچ کر رُک گئی تھیں۔ دفعتاً میرے کانوں میں بہت سے کتوں کے غرّانے کی آواز گونجی۔ جیپ سے کوئی کود کر نیچے اُترا اور اُس نے بھاگ کر پچھلی جیپ کا دروازہ کھولا۔ ایک دراز قد ہیولا اندھیرے میں نیچے اُتر آیا۔ میری آنکھیں ابھی تک جیپ کی جلتی لائٹس کی وجہ سے چندھیائی ہوئی تھیں لہٰذا روشنی کے پیچھے چھپے سائے بصارت کی پکڑ میں نہیں آ رہے تھے۔ باقی اشخاص پیچھے کھڑے رہے۔ دراز قد شخص روشنی میں آ گیا۔ میری رگوں میں خون کی گردش تیز ہو گئی۔ اکرام اللہ کے بتائے ہوئے حلیے کے مطابق میرے سامنے کھڑا وہ شخص جبروت کے علاوہ اور کوئی نہیں ہو سکتا تھا۔ ہم دونوں کچھ دیر کے لیے ایک دوسرے کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھتے رہے۔ اچانک جبروت کے عقب سے ایک خوں خوار کتا میری جانب لپکا۔

دوسرا سورج

اس خوں خوار کتے کی لپک اتنی اچانک اور شدید تھی کہ میں نے اس کی غراہٹ سے گھبرا کر دونوں ہاتھ ہوا میں یوں بلند کیے کہ جیسے اس کے حملے کو روک ہی تو لوں گا، لیکن اچانک فضا میں جبروت کی گرج دار آواز گونجی "ناں...... کالے!!" اور اس آواز میں جانے کیا جادو تھا کہ زقند بھرنے کے لیے تیار اور اپنے خوں خوار جبڑے کھولے اور اپنی اگلی ٹانگوں پر اپنے وزن کو تولتے ہوئے کتے کو سکتہ سا ہو گیا اور وہ وہیں زمین پر بنا آواز کے یوں بیٹھ گیا، جیسے اگر ذرا سی بھی جنبش ہوئی تو پتھر کا ہو جائے گا۔ جبروت نے ایک نگاہِ غلط مجھ پر ڈالی۔ "کون ہو تم...... اور میرے علاقے میں کیا کر رہے ہو؟" "عبداللہ...... مزار کی خدمت کے لیے آئے ہیں۔" جبروت کو جیسے کچھ یاد آیا۔ "او ہاں! ہیڈ ماسٹر نے بتایا تھا، تمہارا دوسرا ساتھی کہاں ہے؟" "وہ آرام کر رہے ہیں...... لمبے سفر کی تھکن ہے۔" جبروت نے لمبا سا ہنکارا بھرا "ہوں...... اور جانے کے لیے پلٹا۔ پھر اُسے جیسے کچھ یاد آیا اور وہ چلتے چلتے رُک گیا" ہیڈ ماسٹر سے کہنا کل تم لوگوں کو قلعے سے ضرورت کا سامان دلوا دے۔ یہاں تم لوگوں کو کسی چیز کی کمی نہیں ہوگی۔" جبروت لمبے لمبے ڈگ بھرتا ہوا اپنی جیپ کی جانب بڑھ گیا اور پھر اس کے بعد مجھے بھی رات بھر نیند نہیں آئی۔ صبح سویرے اکرام صاحب پریشانی میں بڑبڑاتے ہوئے سے تیز تیز چلتے مزار کے احاطے میں داخل ہوئے۔ "کیا رات کو جبروت یہاں آیا تھا، اس نے کیا کہا؟" سلطان بابا اس کی پریشانی دیکھ کر مسکرا دیئے۔ "بھئی میں تو کمرے میں تھا۔ اس کی ملاقات صرف عبداللہ سے ہوئی تھی۔" "وہ در پردہ ہمیں قلعے میں حاضری لگانے کا حکم دے گیا ہے۔" میں نے اکرام اللہ کو ساری تفصیل بتا دی جسے سن کر اُن کے ماتھے پر پڑی سلوٹیں مزید گہری ہو گئیں۔ میری مانیں تو آپ دونوں دو گھڑی کے لیے آج وہاں سے ہو ہی آئیں۔ دریا میں رہ کر مگر مچھ سے بیر اچھا نہیں ہوتا۔ جو چند دن آپ لوگوں نے یہاں گزارنے ہیں کم از کم وہ تو سکون سے گزر جائیں گے۔" سلطان بابا پہلے ہی سے کسی گہری سوچ میں گم تھے، انہوں نے تسبیح کا آخری دانہ پڑھ کر سر اُٹھایا۔ "آپ ٹھیک کہتے ہیں، جتنا ممکن ہو شر اور فساد سے پہلو تہی کرنی چاہیے۔ عبداللہ میاں! آج سہ پہر تم اکرام صاحب کے ساتھ قلعے سے ہو آنا۔" میں نے چونک کر اُن کی جانب دیکھا۔ اکرام صاحب بڑبڑائے۔ "اور آپ...... آپ نہیں چلیں گے کیا؟"

"نہیں۔ ابھی میرے جانے کا وقت نہیں آیا۔ اگر میرا پوچھیں تو کہیے گا کہ میں بھی جلد ہی اس کے در دولت پر حاضری دوں گا۔ فی الحال میرا نمائندہ ہی سہی۔" اکرام صاحب کے چہرے کے تاثرات بتا رہے تھے

کہ ان کے اندر کی بے چینی کم ہونے کے بجائے مزید بڑھ گئی ہے لیکن وہ سلطان بابا کے احترام کی وجہ سے چپ ہی رہے اور میرے ساتھ سہ پہر کا وقت طے کر کے اُلٹے قدم لوٹ گئے۔

رفتہ رفتہ سورج کا گولا پھر سے وہی آگ برسانے لگا۔ جانے کیوں اس صحرا کا یہ آفتاب میرے لیے بالکل اجنبی تھا۔ یہ تو کوئی دوسرا سورج تھا، میری دنیا کے سورج سے بالکل جدا۔ اچانک میرے ذہن میں ایک عجیب سا خیال آیا، کہیں یہ اس سورج کا دوسرا رُخ تو نہیں تھا۔ کہیں میں چلتے چلتے اپنے سورج کی دوسری جانب تو نہیں آ پہنچا؟ ہاں شاید یہ ایسا ہی تھا۔ ورنہ یہ فلک مجھ سے کبھی اتنا اَن جان تو نہ تھا۔ سلطان بابا آنکھیں بند کیے۔ تسبیح پھیر رہے تھے۔ میرے آنے کی آہٹ ہوئی تو انہوں نے آنکھیں کھولیں۔ "کیوں میاں...... کبھی اپنی سوچ کے گھوڑے کو لگام بھی دیتے ہو یا نہیں، کبھی تو ان اعصابی ریشوں کو آزاد بھی چھوڑ دیا کرو۔"

جانے انہیں ہر مرتبہ میری سوچ کی خبر کیسے ہو جاتی تھی۔ ہم دونوں اس وقت مزار کے برآمدے میں بنے بوسیدہ سے ایک کمرے میں موجود تھے، جہاں براہ راست لو سے بچنے کے لیے دروازے اور پچھلی جانب کھلتی لکڑی کی جھولتی ہوئی کھڑکی کے اُوپر ایک ٹوٹی پھوٹی چق اور چند کپڑے کی کترنیں لگا کر ڈھانپنے کی ناکام سی کوشش کی گئی تھی۔ کمرے میں فرش کی جگہ ریت کا بستر تھا اور ایک صراحی کمرے کے کونے میں ادھ بھری رکھی تھی۔ میں سلطان بابا کے قریب ہی بیٹھ گیا اور پھر من میں بہت دنوں سے مچلتا سوال میرے ہونٹوں پر آ ہی گیا۔ "ایک بات بتائیں، ہم ان درگاہوں اور مزاروں کے اردگرد ہی خدا کو کیوں کھوجتے پھرتے ہیں......؟ میں آپ کی طرح اسے اپنی شہ رگ کے قریب کیوں محسوس نہیں کر سکتا۔ اور ہر بار ہمارا بسیرا ایسی ہی کسی ویران درگاہ یا مزار سے متصل کیوں ہوتا ہے......؟" انہوں نے تسبیح ختم کر کے اپنے اور میرے چہرے پہ پھونکا۔ "اسے کسی مزار یا درگاہ میں ڈھونڈنے کی ضرورت نہیں ہے۔ نہ ہی اسے اپنی شہ رگ سے بھی قریب ڈھونڈنے کے لیے کسی خاص وجدان کی ضرورت ہوتی ہے۔ وہ اس کائنات کے ہر گوشے میں یکساں موجود ہے۔ تمہاری یہ فکر کہ تم اسے محسوس کیوں نہیں کر سکتے۔ یہ بھی تمہاری اس سے قربت ہی کی ہی ایک نشانی ہے۔ بس اتنا ضرور یاد رہے...... یہ فکر کبھی ختم نہیں ہونی چاہیے۔ رہی بات کہ ہم ہمیشہ ایسی ہی درگاہوں، مسجدوں یا مزاروں ہی میں کیوں قیام کرتے ہیں تو ہمارے دروازے اب مذہب کے نام پر کچھ کم ہی کھلتے ہیں۔ ایسے میں ان بستیوں میں موجود یہی درگاہیں اور خانقاہیں اپنی بانہیں پھیلائے ہر گھڑی ہمارے استقبال کو تیار ملتی ہیں۔ ہمارے سونے کو اطلس و کمخواب کے بستر نہ سہی، پر مسجد کا فرش ہمیشہ موجود رہتا ہے۔ یہی خاک ازل سے ہمارا مقصد اور ہمارا مقدر ہے اور ہمیں سب کو یاد دلاتے رہنا ہے کہ ہم سب نے آخر خاک ہی ہو جانا ہے۔" میرے سوال ابھی ختم نہیں ہوئے تھے۔ "لیکن! اس بار آپ نے اس قدر دُور دراز علاقے کا انتخاب کیوں کیا۔ ہم راستے میں نہ جانے ایسی کتنی درگاہیں پیچھے چھوڑ آئے ہیں۔" سلطان بابا نے گہرا سا سانس لیا۔ "اس بار معاملہ بے اختیاری کا ہے۔ اب تک تم نے جو بھی جھیلا اس میں کہیں نہ کہیں ہمیں کچھ اختیار ضرور حاصل تھا، لیکن اس مرتبہ

ہم دونوں کسی اور کے اختیار میں ہیں میاں۔'' میں نے چونک کر اُن کی آنکھوں میں دیکھا۔ نہ جانے کیوں مجھے سلطان بابا کی آواز میں دُور کہیں کسی شدید پریشانی اور آنے والی پریشانیوں کا احساس ملا اور پھر دوسرے ہی لمحے میرے ذہن کے دریچے وا ہوتے چلے گئے۔ ہاں! سچ ہی تو تھا۔ اس سارے علاقے پر ایک ظالم اور انتہائی سفاک شخص کی حکومت تھی۔ ایک طرف سرحد تھی اور دوسری طرف ایک وسیع و عریض تپتا صحرا۔ درمیان میں سات کوس کے فاصلے پر وہ بستی واقع تھی جس سے گزر کر ہی ہم کال گڑھ سے نجات کے واحد ذریعے، یعنی دن میں ایک بار گزرنے والی ٹرین کے اسٹیشن تک پہنچ سکتے تھے۔ جو کم از کم پیدل چار گھنٹے کی مسافت پر موجود تھا۔ ایک دم ہی میرے رونگھٹے، یہ سوچ کر ہی کھڑے ہونے لگے کہ اگر کبھی ہمیں اس بستی سے ہجرت کرنا بھی پڑی تو اس کی اجازت اور اختیار بھی صرف اس جلاد کو حاصل تھا، جو اس پھانسی گھاٹ کا پہرے دار بھی تھا۔ میں نے اُلجھن آمیز نگاہوں سے سلطان بابا کو دیکھا۔ ''لیکن کیوں...... اس بے اختیاری کی منزل سے گزرنا اس قدر ضروری کیوں، اس امتحان اور اس کسوٹی سے کیا حاصل......؟'' ''سارا کھیل ہی تو اس اختیار و بے اختیاری میں توازن قائم کرنے کا ہے۔ یاد رکھو، ہمارے اختیار کی حد وہیں ختم ہو جاتی ہے، جہاں سے ہمیں اپنے خود مختار ہونے کا زعم ہونے لگتا ہے۔ دھیرے دھیرے سب سمجھ آ جائے گا۔ جاؤ تم تیاری کرو۔ ابھی ظہر کے بعد تمہیں قلعے بھی جانا ہے۔'' جانے کیوں، ایک دم ہی میرے ذہن میں نہ جانے کتنے سوالوں کے بچھو ڈنک مارنے لگے تھے۔ اختیار و بے اختیاری کے دھاگوں میں میرا من کچھ یوں اُلجھا کہ مجھے اکرام اللہ صاحب کے ساتھ بستی پہنچنے تک بھی کچھ ہوش نہ تھا۔ میں تب چونکا جب بستی کے کچی اینٹوں والے بازار میں اُونٹوں کی ایک لمبی قطار نے مجھے تقریباً مس کرتے ہوئے کراس کیا۔ کال گڑھ کے اس مختصر سے بازار میں سہ پہر کی اس شدید دھوپ کے باوجود اچھی خاصی چہل پہل نظر آ رہی تھی۔ بازار کے بیچوں بیچ بکریوں کے ایک ریوڑ کی خرید فروخت جاری تھی۔ جس کے ساتھ ہی ایک پرانی سی دکان میں جلیبیاں تلی جا رہی تھیں۔ دکان دار پرانے اخبارات کے بنڈل پھاڑ پھاڑ کر گاہکوں کو شیرے سے بھری نارنجی جلیبیاں پکڑا رہا تھا اور بالکل سامنے خشک گھاس اور بھوسے کے گٹھے بیل گاڑی سے اُتروائے جا رہے تھے۔ سنہری بھوسا نارنجی شیرے میں ضم ہو رہا تھا اور پچھلی جانب پرانی سائیکلوں کے انبار کے بیچ ایک کاریگر سامنے ٹب میں پانی بھرے، پرانی ٹیوبوں کو پنکچر لگا رہا تھا۔ بازار کے سرے پر ایک دھنکیا پرانی رضائیوں اور لحافوں کی روئی دُھن رہا تھا اور فضا میں اُڑتے اُون اور روئی کے ننھے بگولے گرد اور ریت کے ساتھ ہمارے حلق میں پھنس رہے تھے۔ اگلے نکڑ پر ایک ماشکی پرانی سی مشک میں انتہائی گدلا پانی بیچ رہا تھا۔ اُون دھننے والے کے اوزار کی دُھن دُھن، اُونٹوں کی جرس، بھیڑ بکریوں کا شور، گرم شیرے کے نیچے جلتے الاؤ کی دھونکنی اور ماشکی کے آوازے...... سب مل کر چند لمحوں کے لیے اس مردہ کال گڑھ کو کس قدر زندہ کر گئے تھے۔ موڑ مڑتے ہی قلعے کی آسمان سے باتیں کرتی خاکی چار دیواری شروع ہو گئی۔ جیسے جیسے ہم قلعے کے مرکزی دیوہیکل دروازے کی جانب بڑھتے گئے، ویسے ویسے قلعے کے اندر سے ایک عجیب سے وحشت ناک شور کی آوازیں بلند ہوتی گئیں۔ اور پھر جیسے ہی میں نے اکرام

صاحب کے پیچھے بڑھتے ہوئے قلعے کی چار دیواری میں اپنا پہلا قدم رکھا تو ان کرب ناک چیخوں کا راز بھی کھل گیا۔ وحشت اور بربریت کا ایک خوف ناک کھیل عین قلعے کی بیرونی چار دیواری کے وسط میں کھیلا جا رہا تھا۔ میرے قدم جیسے زمین میں گڑ گئے۔ جبروت اپنے حواریوں کے جھرمٹ میں ایک اُونچے سے تخت پر براجمان وحشیانہ انداز میں چیخ رہا تھا، قہقہے لگا رہا تھا اور غصے میں گالیاں بک رہا تھا۔ اُس کے سامنے کھلے میدان میں ایک لمبی اور موٹی سی فولادی زنجیر گلے میں ڈالے ایک عظیم الجثہ سیاہ ریچھ اپنا خون خون بدن لیے کھڑا جھول رہا تھا اور جبروت کے آٹھ خوں خوار کتے چاروں طرف سے اُس بیڑیوں میں جکڑے قیدی ریچھ پر حملے کر رہے تھے۔ ریچھ کے جسم سے لپٹے کتے اُسے بھنبھوڑ رہے تھے اور گھائل ریچھ کا زخم زخم بدن خون کا فوارہ بنا ہوا تھا، لیکن ریچھ نے ابھی ہار نہیں مانی تھی۔ اب بھی وہ پوری قوت سے ان وحشی کتوں کا مقابلہ کر رہا تھا۔ اس کے نرخرے سے عجیب سی خرخراہٹ کی آوازیں نکل رہی تھیں اور اس کی نکیل کا کڑا زور لگانے کی وجہ سے اس کی ناک کی نازک جلد کو چھیدتا ہوا ہڈی کے اندر تک دھنس چکا تھا، جس کی ناقابل برداشت اذیت نے ریچھ کو انتہائی حد تک خطرناک کر دیا تھا۔ اور وہ کرب اور تکلیف سے بے حال، غصے میں پاگل ہو کر چنگھاڑ رہا تھا۔ اس کی پوری کوشش تھی کہ وہ آٹھ طرفہ حملے کو کسی طور روک پائے۔ یہ سارا وحشیانہ کھیل ایک بہت بڑے ہجوم کے دائرے میں ہو رہا تھا۔ تماشائی جبروت کے خوف کے سبب صرف کتوں ہی کو داد دے رہے تھے۔ خود جبروت کا وحشی پن بھی عروج پر تھا۔ وہ کتوں کی ہمت بڑھانے کے لیے انہیں چلا چلا کر ہشکار رہا تھا اور کتوں کے منہ سے بہتے کف کی طرح اس کی رال بھی فرط جوش سے بار بار ٹپک رہی تھی۔ جب کوئی کتا ریچھ کو گہرا زخم لگانے میں کامیاب ہو جاتا تو جبروت کی حالت مزید ہیجانی ہو جاتی اور اگر ریچھ کو گہرا زخم لگانے میں کامیاب ہو جاتا تو جبروت کی حالت مزید ہیجانی ہو جاتی اور اگر ریچھ کی خوش قسمتی سے کوئی کتا اس کے پنجے کے تھپیڑے یا گرفت میں آ جاتا تو جبروت بے قابو ہو کر اپنے کتوں اور اُن کے سدھارنے والے خدمت گاروں کو گندی گندی گالیاں دینے لگتا۔ اُن پر غراتا، چلاتا اور بالکل ہتھے سے اُکھڑ جاتا۔ مقابلہ اب اپنی انتہا کو پہنچ چکا تھا اور تھکن اور پیاس کے مارے کتوں کی زبانیں باہر لٹک آئی تھیں، لیکن شاید ایسے مقابلوں میں کتوں کو پانی کے قریب نہیں پھٹکنے دیا جاتا۔ تب ہی کتوں کے رکھوالے انہیں بار بار پانی سے دُور ہانک دیتے تھے۔ ان میں وہ کتا بھی شامل تھا جسے جبروت نے رات ''کالے'' کہہ کر مخاطب کیا تھا۔ دفعتاً ریچھ کو ایک موقع ملا اور ایک چتکبرے کتے کی غلط چھلانگ نے اُسے ریچھ کے بازوؤں کی لپیٹ میں دے دیا۔ ریچھ نے ایک لمحہ ضائع کیے بنا اپنی گرفت شدید تر کر دی اور میں نے اتنی دُور کھڑے ہونے کے باوجود اس کان پھاڑ دینے والے شور میں بھی اس کتے کی ریڑھ کی ہڈی کے چٹخنے اور پھر ٹوٹ کر تڑخنے کی آواز سنی۔ کتے کے منہ سے ایک دل خراش چیخ نکلی اور زمین پر گرتے ہی چند لمحے تڑپنے کے بعد وہ ٹھنڈا ہو گیا۔ اِسی اثناء میں ریچھ کا پنجہ پوری قوت سے لہرایا اور ''کالا'' ہوا میں لہراتے ہوئے ہجوم کے دائرے سے باہر جا گرا اور گرتے ہی بے سُدھ ہو گیا۔ جبروت کا پارہ آسمان کو چھونے لگا اور وہ زور سے چلایا ''مرنے دے اس مردار کو۔ کوئی ہاتھ نہ لگائے اس حرام خور کو......'' آٹھ میں سے دو

کتوں کو ریچھ نے مکمل پچھاڑ دیا تھا لیکن اسے اب بھی چھ طرفہ حملے کا سامنا تھا اور ریچھ کے جسم سے تیزی سے بہتا خون اب اسے دھیرے دھیرے نڈھال کر رہا تھا۔ جبروت نے جھولتے اور ڈگمگاتے ریچھ کو دیکھا تو اس کی آنکھوں میں چمک سی لہرائی۔ اس نے پاس کھڑے ڈھولکیے کو ڈھول پیٹنے کا اشارہ کیا۔ ڈھول کی پہلی تھاپ سنتے ہی ادھ مرے کتوں میں جیسے بجلی کی لہر سی کوند گئی اور ان سب نے اپنے گھائل جسم سمیٹے اور ایک ساتھ ہی ریچھ کے شکستہ جسم پر حملہ آور ہوگئے۔ جانے کیوں اس لمحے مجھے وہ اذیت وکرب سے لہراتا ریچھ رومن دور کے ان جنگجوؤں کی یاد دلا گیا، جنہیں گلیڈی ایٹر (Gladiater) کہا جاتا تھا اور جنہیں رومن بادشاہ سزا کے طور پر اسی قسم کے اکھاڑوں میں بھوکے شیروں کا مقابلہ کرنے کے لیے صرف ایک ڈھال اور نیزے کے بل پر اُتار دیتے تھے۔ لیکن یہاں تو ڈھال اور نیزے کا تکلف بھی نہیں تھا۔ بالآخر ایک کتا ریچھ کے نرخرے میں اپنے خونی جبڑے گاڑنے میں کامیاب ہو ہی گیا۔ ریچھ کے نرخرے سے خون کا ایک فوارہ سا نکلا اور آس پاس کئی تماشائیوں کے کپڑے سرخ چھینٹوں سے داغ دار ہوگئے۔ دوسرے کتے موقع پا کر ریچھ کی تھوتھنی اور نکیل والے حصے کو بھنبھوڑ رہے تھے۔ گلیڈی ایٹر ہار چکا تھا۔ زمین پر گرنے سے پہلے اس نے ایک بے کسی کی نگاہ اکھاڑے کے بے حس تماشائیوں پر ڈالی اور اس کا عظیم جُثہ بے دم ہو کر زمین چھونے کے لیے آخر بار جھول کر ڈھلکا، لیکن اس سے پہلے ریچھ کے مالک کی آنکھ سے ٹپکے دو آنسو زمین کو اپنی آخری سلامی پیش کر چکے تھے۔

ایک زوردار دھپ کی آواز کے ساتھ ریچھ زمین پر گرا اور گرد کا ایک طوفان اُٹھا۔ چھ کتوں میں سے دو مزید شدید زخمی حالت میں ایک جانب پڑے تڑپ رہے تھے اور باقی چار کی حالت سے بھی ایسا لگتا تھا کہ انہیں پھر سے اپنے معمول کی حالت تک پہنچنے کے لیے ہفتوں درکار ہوں گے۔ جبروت نے فتح کا نعرہ لگایا اور ڈھولکیے نے ڈھول کی تان تیز کر دی۔ تماشائی آگے بڑھ بڑھ کر جبروت کو مبارک باد پیش کر رہے تھے۔ ان ہی میں سے ایک نے مٹھائی کے ٹوکرے کا منہ کھولا اور ایک شان دار حریف کی موت کے جشن میں مٹھائی تقسیم کرنے لگا۔ اکرام صاحب نے رش میں سے راستہ بنایا اور مجھے کھینچتے ہوئے جبروت کے قریب لے گئے۔ نہ جانے اس شور میں جبروت کو ان کی بات سمجھ میں آئی یا نہیں لیکن اس وقت وہ خوشی سے اس قدر سرشار تھا کہ اس نے میرے وجود کی طرف نظر بھی نہیں ڈالی اور اپنے کسی کارندے کو چلا کر راشن دینے کا کہا۔ کچھ ہی دیر میں جب ہم قلعے سے باہر نکل رہے تھے تو اکرام صاحب کے ہاتھ میں آٹے، چاول اور گڑ کے چند تھیلے موجود تھے۔ جبروت اس ہنگامے کی وجہ میرے دوسرے ساتھی یعنی سلطان بابا کی کمی محسوس نہیں کر سکا تھا۔ اور اس بات پر اکرام صاحب سارا راستہ اللہ کا شکر ادا کرتے آئے کہ چلو بلا ٹلی تو سہی۔

میرا من اس وحشیانہ کھیل کو دیکھنے کے بعد اس قدر پژمردہ ہوا کہ میں شام تک ایک گھونٹ پانی بھی اپنے حلق سے نیچے نہیں اُتار سکا۔ بار بار میری نظروں کے سامنے اس بے بس اور لاچار ریچھ کی وہ پُرنم آنکھیں اور اس کا ہار کر زمین پر گرنے کا منظر آجاتا۔ سلطان بابا بہت دیر تک مجھے یوں گم صم بیٹھا دیکھتے رہے۔ انہیں اکرام صاحب نے واپس جانے سے پہلے ساری کہانی سنا دی تھی کہ میں کیوں اتنا گم صم سا واپس لوٹا ہوں۔

مغرب کے بعد سلطان بابا تسبیح ختم کر کے میرے پاس ہی آکر بیٹھ گئے۔ اس وقت ہوا بالکل بند تھی اور دن کا سورج ڈھلنے کے بعد چاند ایک دوسرے تپتے سورج کے روپ میں طلوع ہونے کی تیاری میں تھا۔ انہوں نے غور سے میری آنکھوں میں جھانکا۔ ”کیوں میاں...... کچھ سمجھ میں آیا یہ اختیار اور بے اختیاری کا کھیل۔ آج دوپہر کو جو کچھ تم نے دیکھا، وہ بھی اسی معمے کی ایک کڑی ہی تو تھی۔“ میں نے چونک کر اُن کی جانب دیکھا۔ ”وہ کیسے؟“ ”بھئی ذرا غور کرو تو وہ بے بس جانور بھی ہماری زندگی کا ایک استعارہ ہی تو تھا۔ اور آٹھ جانب سے لپکتے وہ حملہ آور وہ مجبوریاں، جرم گناہ اور فریب کے وہ حملے تھے جو ہم ساری عمر جھیلتے ہیں اور ریچھ کی آخر کار وہ موت اختیار سے بے اختیاری کی جانب سے اس کا آخری سفر تھا۔ اس کے پیروں سے بندھی وہ زنجیر اور اس کے ناک میں ڈلی نکیل ہمارے معاشرے کی پابندیاں اور قانون سمجھ لو۔ کبھی کبھی یہ بیڑیاں رشتوں کی صورت میں بھی ہمیں جکڑے رکھتی ہیں۔ زندگی خود اختیاری کی ایک قسم ہے اور موت بے اختیاری ہے۔ ہاں البتہ اس جانور اور انسان میں ایک واضح فرق ضرور ہے کہ انسان اشرف المخلوقات ہے اور اس کے اختیار کی حدیں کسی بھی مخلوق سے بہت زیادہ ہیں۔“ مجھے سلطان بابا کی بات پوری طرح سمجھ میں نہیں آئی۔ لیکن میں جانتا تھا کہ وقت آنے پر یہ معمہ بھی از خود مجھ پر کھل ہی جائے گا۔ اچانک مجھے وہ لڑکی یاد آئی جس کا ہیولا میں دو مرتبہ کال گڑھ آنے کے بعد دیکھ چکا تھا۔ میں نے سلطان بابا سے ذکر کیا تو وہ کسی گہری سوچ میں پڑ گئے۔ ”بعض مرتبہ یہ صحرا ہم انسانوں سے عجیب خواب وسراب کے کھیل کھیلتا ہے۔ لیکن سراب کا واسطہ تسلسل سے نہیں ہے۔ خاص طور پر اگر یہ کسی انسانی ہیولے کا معاملہ ہے۔ اگر تیسری مرتبہ پھر وہ شبیہ تمہیں دکھائی دے تو اس کے قریب جانے کی کوشش کرنا، لیکن یاد رہے، صحرا کا فسوں بڑا گہرا ہوتا ہے۔“

عشاء کے بعد سلطان بابا اپنے کمرے میں چلے گئے اور میں پھر سے اپنے نصیب کے چند ستاروں کے ساتھ اس کالی رات میں مزار کے صحن میں تنہا بیٹھا رہ گیا۔ ہماری زندگی کی زیادہ تر انہونیوں کا تعلق رات ہی سے کیوں ہوتا ہے؟ کیا دن کا اُجالا بہت سے حقائق کو ڈھانپ لیتا ہے۔ حالانکہ عموماً ہم یہی خیال کرتے ہیں کہ ڈھانپنے اور پردہ ڈالنے کا واسطہ اندھیرے سے ہوتا ہے۔ لیکن مجھ پر تو زیادہ تر رات ہی کھلتی تھی اور دن ہمیشہ سے ہی میرے لیے ایک دبیز پردے کا کام سرانجام دیتا رہا تھا۔ میں انہی سوچوں میں گم تھا کہ اچانک ہوا کے دوش پر مجھے دُور سے کسی بانسری کی لے کی آواز سنائی دی۔ چند لمحوں تک تو میں اس آواز کو بھی اپنا واہمہ ہی سمجھتا رہا لیکن پھر سلطان بابا کی کہی ہوئی بات نے مجھے جھنجھوڑ دیا۔ ”ہاں...... واہموں اور سراب کا واسطہ تسلسل سے نہیں ہوتا۔“ لیکن یہ مدھر لے تو لگاتار اور مسلسل سنائی دے رہی تھی۔ میں نے مزار سے نکل کر اس ٹیلے کی جانب قدم بڑھائے جہاں سے آواز آرہی تھی۔ قریب پہنچتے پر آہٹ کی آواز سنتے ہی بانسری تھم گئی اور کوئی دھیمی سے آواز میں بولا ”نوری...... تم ہو......؟“ میں ٹیلا پار کر کے دوسری جانب آگیا۔ اندھیرے میں کچھ دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ میں نے اندازے سے آواز لگائی...... ”میرا نام عبداللہ ہے۔ میں صحرا کے مزار کا

نیا خدمت گار ہوں تم کون ہو......؟'' چند لمحے دوسری جانب خاموشی رہی اور پھر ایک نوجوان لڑکا بانسری ہاتھوں میں تھامے ٹیلے کی اوٹ سے باہر نکل آیا۔ اس کی آواز میں مایوسی تھی۔ ''اوہ...... میں کچھ اور سمجھا تھا۔ نیچے آجاؤ۔ میرا نام سانول ہے۔ میں بھی کال گڑھ کا رہنے والا ہوں۔ مجید مستری کا بیٹا۔'' لڑکے نے صحرا کی روایت کے مطابق اپنا مکمل تعارف کروادیا تھا اور اب میری جانب سوالیہ نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ میں نے اپنا نام اور مزار سے تعلق دوبارہ دہرانے کے بعد کہا'' تم بانسری اچھی بجالیتے ہو۔ لیکن اتنی دُور ویرانے میں اور یوں آدھی رات کو......'' اُس نے میری بات کاٹ دی۔ ''میرے باپ کو میرا بانسری بجانا پسند نہیں۔ وہ چاہتا ہے کہ میں بھی اس کی طرح قلعہ داروں کے ہاں مہینے بھر کی گندم اور گڑ کے بدلے نوکری کرلوں۔ پر مجھے وہ غلامی پسند نہیں۔ اس سے تو بہتر ہے کہ میں بھی تمہاری طرح کسی مزار کا مجاور بن جاؤں۔ ویسے بھی میرا یہاں دل نہیں لگتا۔'' مجھے اس کی بات سن کر ہنسی آگئی۔ ''مجاور بن کر کیا کروگے؟ مجاور تو بانسری بھی نہیں بجاسکتے۔'' وہ بھی میری بات سن کر ہنس پڑا۔ ''ہاں واقعی۔ یہ تو ہے۔ پر تم مجھے کچھ دوسری قسم کے مجاور لگتے ہو۔ میں تمہیں بانسری سناؤں۔ تم نے کبھی موسیقی سنی ہے۔'' اب میں اُسے کیا بتاتا کہ ابھی کچھ عرصے پہلے تک دنیا کا کوئی چارٹ ٹاپر (Chart topper) ایسا نہیں تھا جو میرے ذاتی کلیکشن میں شامل نہ ہو۔ بیک اسٹریٹ بوائز اور وٹنی ہیوسٹن کی ایل ڈیز سے میرے کمرے کے شیلف بھرے رہتے تھے اور دنیا کے ہر کونے سے میرے دوست میرے لیے نئی تخلیقات بھیج کر میرا خزانہ بڑھاتے رہتے تھے۔ گھر، گاڑی، یونیورسٹی، پارٹی، کلب ڈسکو ہر جگہ ہر لمحہ یہ تانیں میرے ساتھ ہوتی تھی۔ سانول مجھے سوچ میں گم دیکھ کر ہچکچایا۔ ''اگر تمہیں پسند نہیں تو میں نہیں بجاتا۔'' ''نہیں نہیں۔ تم بجاؤ۔ مجھے بانسری کی اتنی سمجھ تو نہیں لیکن پھر بھی تمہاری لے تک پہنچنے کی کوشش کروں گا۔'' سانول کا چہرہ خوشی سے چمک سا گیا۔ اُس نے جلدی سے بانسری اپنے ہونٹوں سے لگائی اور ایک پرانے گیت کی تان چھیڑ دی۔ اُس کی نظریں بانسری بجاتے ہوئے بھی مستقل مجھی پر جمی ہوئی تھیں، جیسے وہ اپنی دُھن کا اثر میری آنکھوں میں تلاش کرنے کی کوشش کر رہا ہو۔ دنیا کا ہر ہنر، ہر فن اک ستائش ہی سے تو متصل ہوتا ہے۔ ایسے دیوانوں کی ہر کوشش خود کو منوانے اور ہجوم میں الگ وممتاز رہنے کی ایک پروانہ وار کوشش ہی تو ہوتی ہے۔ انسان ہمیشہ سے اپنے ہنر کی تعریف کا بھوکا رہا ہے۔ میرے ذہن میں ''خدا اور محبت'' کا ایک جملہ گونجا۔ ''اپنے ہنر کی تعریف کی یہی بھوک انسان کو کچھ انوکھا، کچھ الگ کر دکھانے پر مجبور کرتی ہے۔ تب ہی انسان سے تاج محل جیسے شاہ کار سرزد ہو جاتے ہیں۔ یہ تعریف اور سراہے جانے کا جذبہ ہم میں نہ ہوتا تو شاید ہم اب تک پتھر کے دور ہی میں زندہ ہوتے۔'' انہیں سوچوں میں گم میں سانول کی بانسری کی مدھر تان سن رہا تھا کہ اچانک مجھے سانول کے عقب میں کچھ دُور اُسی لڑکی کا سراپا لہراتے ہوئے نظر آیا۔ ہاں...... وہی تھی...... بڑا سا پلو لیے۔ میں ایک دم جھٹکے سے کھڑا ہو گیا۔ سانول کے ہاتھ سے بوکھلاہٹ میں بانسری چھوٹ گئی اور وہ گھبرا کر بولا۔ ''یا اللہ خیر...... کیا ہو گیا......؟''

خواب اور سراب

میرے منہ سے بس اتنا ہی نکل پایا۔ ''وہ......لڑکی......'' سانول نے بھی جلدی سے پلٹ کر دیکھا یہی وہ چند لمحے تھے جب میری توجہ اُس کی جانب مبذول ہوئی ہوگی۔ لیکن اب جب ہم دونوں نے سانول کے عقب میں دیکھا تو وہاں صرف سناٹا ہی تھا۔ سانول کچھ دیر تک حیران نظروں سے کبھی مجھے اور کبھی اپنے پیچھے مڑ مڑ کر اَن دیکھے وجود کو ڈھونڈنے کی کوشش کرتا رہا اور پھر زور سے کھلکھلا کر ہنس پڑا۔ ''تم بھی اس صحرا کے چکر میں آگئے نا۔ معاف کرنا مزار کے پچھلے خدمت گار کو میں حافظ جی کہتا تھا لیکن تم تو میرے ہی ہم عمر ہو۔ بُرا نہ مانو تو میں تمہیں عبداللہ کہہ کر ہی پکارا کروں......؟''

''تم جو چاہو مجھے پکار سکتے ہو۔ لیکن میں کسی وہم کا شکار نہیں ہو رہا۔ میں پہلے بھی دو مرتبہ اس لڑکی کو دیکھ چکا ہوں۔'' اب سانول کے چونکنے کی باری تھی۔ ''اچھا......؟؟ ذرا مجھے اس کا حلیہ تو بتاؤ'' میں نے جلدی جلدی جو کچھ میرے حافظے میں محفوظ تھا، اس کے سامنے دہرا دیا۔ سانول میری بات سن کر ایک بار پھر زور سے ہنس پڑا۔ ''بڑا سا پلو، پھولوں والی چادر، ہاتھ میں کہنیوں تک سفید چوڑیاں، سانولا سا رنگ، ماتھے پر بندیا...... تم کہو تو ایسی دو درجن لڑکیاں میں کال گڑھ کے بڑے میدان میں آج صبح ہی بلوا لوں۔ ارے بھئی، یہ تو اس علاقے کی ہر دوسری لڑکی کا حلیہ بتا دیا ہے تم نے۔ یہاں سب ہی ایسی ہی ہوتی ہیں۔ کوئی خاص نشانی یاد ہو تو بتاؤ؟'' میں سانول کی بات سن کر مخمصے میں پڑ گیا۔ ''خاص نشانی......؟ ارے ہاں، ابھی تھوڑی دیر پہلے تم نے کسی نوری کو پکارا تھا، کہیں یہ وہی تو نہیں تھی؟'' سانول نوری کا نام سنتے ہی کچھ ٹپٹا سا گیا۔ اس کے چہرے پر کئی رنگ آکر گزر گئے۔ پھر وہ شرما کر بولا۔ ''نہیں جی...... وہ نوری نہیں ہو سکتی...... میں تو یونہی ہر آہٹ پر اُس کا نام پکار بیٹھتا ہوں۔ وہ بھلا اس ویرانے میں آدھی رات کو کہاں سے آئے گی۔ اس پر تو دن میں بھی ہزار پہرے لگے رہتے ہیں۔'' میں نے شرم سے لجاتے سانول کو چھیڑا۔ ''اوہ...... تو یہ بات ہے۔ پر یہ نوری ہے کون؟'' ''نوری میری منگ ہے جی! یہیں کال گڑھ میں رہتی ہے۔ آپ مزار پر ہیڈ ماسٹر اکرام اللہ سے تو ضرور ملے ہوں گے، نوری اُن ہی کے بھائی کی بیٹی ہے۔ پوری آٹھویں جماعت تک پڑھا ہے اُس نے۔ پھر اُس کے باپ نے گھر بٹھا لیا۔ ویسے بھی آگے پڑھنے کے لیے کال گڑھ سے بیس کوس دُور، دوسری بستی کے ہائی اسکول تک جانا پڑتا ہے۔'' سانول شرما شرما کر اپنے اور نوری کے رشتے کی بابت بتا رہا تھا کہ کیسے، اُس کے گھر والوں نے سانول کی نشانی تو رکھ لی، لیکن ساتھ ہی یہ شرط بھی لگا دی کہ جب تک سانول برسرِ روزگار نہیں ہو جاتا

وہ بیٹی کو رُخصت نہیں کریں گے۔ لیکن کال گڑھ میں روزگار کے نام پر صرف قلعے داروں کی غلامی ہی تھی، جو سانول کو کسی صورت منظور نہیں تھی۔ کیوں کہ قلعے کے قرضے کے چنگل میں ان لوگوں کی تیسری نسل پس رہی تھی اور سود در سود کا یہ جال کال گڑھ والوں کو کسی اَن دیکھے خون آشام عفریت کی طرح جکڑے ہوئے تھا۔ سانول کا باپ بھی اس سے بچ نہیں پایا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ وہ نوری کو اب تک بیاہ کر گھر نہیں لا سکا تھا، کیوں کہ بستی کے تمام رشتوں کا فیصلہ ہر سال قرض ادا کرنے کے موقعے پر جبروت کی پنچایت ہی کرتی تھی۔ لوگ اپنا پرانا قرضہ چکاتے اور اپنے پیاروں کے رشتے کے لیے نئے قرض کی گٹھڑی اپنے شانوں پر ڈالے قلعے سے نکل آتے۔ اسی لیے سانول کا باپ چاہتا تھا کہ سانول بھی قلعے داروں کی نوکری کر لے تا کہ باپ بیٹا دن رات محنت کر کے قلعے کا سارا قرض اسی سال چکتا کر دیں اور سانول کا رشتہ پکا ہو سکے۔ لیکن خود سانول کو یوں رشتے کے بہانے بار بار نوری اور اُس کے گھر والوں کا قلعے بلایا جانا ایک آنکھ بھی نہیں بھاتا تھا۔ اُس کا بس چلتا تو وہ نوری کو سات پردوں میں زمانے کی نظر اور ہر دید کی آنچ سے بچا کر چھپا رکھتا۔ لیکن وہ اس وقت بے بس تھا کیوں کہ نوری پر اُس کا پورا حق تسلیم نہیں کیا گیا تھا اور یہی بات سانول کو ہر دم پریشان رکھتی تھی۔ اُس نے نوری کو بھی سختی سے منع کر رکھا تھا کہ وہ اپنے باپ یا چچا کے بغیر کبھی اپنے گھر کے آنگن سے قدم بھی باہر نہیں دھرے گی کیوں کہ جبروت کے حواری اور گرگے آوارہ کتوں کی طرح سارا دن کال گڑھ کی گلیوں میں منڈلاتے رہتے تھے۔ سانول کے بقول، جب سے نوری کے ساتھ اُس کی منگنی طے ہوئی تھی وہ ویسے بھی دہرے عذاب کا شکار تھا۔ پہلے تو پھر بھی کبھی کبھار اُسے نوری کی ایک آدھ جھلک نصیب ہو جاتی تھی، لیکن اب تو وہ اس کی صورت دیکھنے کو بھی ترس جاتا تھا۔ میرا دل چاہا کہ میں سانول کو بتاؤں کہ کوئی بھی منگنی یا دوسرا بندھن اُس کا قصوروار نہیں۔ یہ سارا قصور تو اُس محبت کا ہے جو اپنے جلو میں ہر بار جانے ایسی کتنی بے چینیاں، درد اور لاحاصل پن کی چبھن لے کر آتی ہے۔ جب تک ہمیں کسی سے محبت نہیں ہو جاتی، وہ شخص ہمارے لیے کس قدر عام ہوتا ہے۔ ہزاروں کی بھیڑ میں سے کوئی ایک، ہمارے آس پاس باقی لوگوں کی طرح چلتا پھرتا اور ہماری دسترس میں۔ لیکن جیسے ہی ہمیں اُس سے محبت ہو جاتی ہے، پل بھر میں وہ ہمارے لیے کس قدر ناممکن، کتنا لاحاصل ہو جاتا ہے۔ وہ جو پہلے پہروں ہماری محفل میں سامع بنا بیٹھا رہتا تھا، اب اُس کی قربت کی دو گھڑی کے لیے بھی ہم ترس جاتے ہیں۔ یہ محبت آخر ہے کیا بلا...... کیا اپنے ساتھ ہی یہ مجبوریوں، پریشانیوں، دوریوں اور کرب کا ایک دریا لیے وارد ہوتی ہے؟ پہلے میں سمجھتا تھا کہ محبت کا نزول ہی ہمیشہ دو ایسے افراد کے درمیان ہوتا ہے، جن کا ملن ناممکنات کا دوسرا نام ہو۔ لیکن اب مجھ پر یہ راز دھیرے دھیرے آشکار ہونے لگا کہ اصل میں محبت خود اپنے ساتھ ایک ایسا سحر لیے نمودار ہوتی ہے کہ جو ہمارے محبوب کو ہمارے لیے پری زاد بنا دیتا ہے۔ جانے کوہ قاف کے بلند و بالا پہاڑ خود بخود ہمارے درمیان کہاں سے آ کھڑے ہوتے ہیں۔ زمانے کی نظر بدل کر برچھی کیوں بن جاتی ہے۔ اپنے بھی پرائے ہو کر طعنے مارنے لگتے ہیں، ہمدردی طنز میں بدل جاتی ہے۔ کل تک

پلکوں پر بٹھانے والے سیخ پا ہو کر سرزنش کرنے لگتے ہیں۔ نہ جانے یہ محبت ہمیشہ ہمارے اردگرد کا ہر موسم، رویہ ہمارے خلاف کیوں کر دیتی ہے۔ ہر بہار کو خزاں میں بدل دیتی ہے۔ یہاں تک کہ ہمیں اپنے آپ تک سے جُدا کر دیتی ہے۔ یہی سب کچھ سانول کے ساتھ بھی ہو رہا تھا۔ وہ رات گئے تک مجھ سے اپنا درد بانٹتا رہا۔ جانے اس نے پہلی ہی ملاقات میں مجھ پر اتنا بھروسا کیوں اور کیسے کر لیا تھا۔ رُخصت ہوتے وقت بھی اُس نے مجھ سے کئی بار وعدہ لیا کہ میں روز رات کو کچھ دیر کے لیے صحرا میں اُس سے ملنے ضرور آیا کروں گا۔

میں جب سانول کو الوداع کہہ کر مزار کے صحن میں داخل ہوا تو صبح کی اذان کا وقت قریب ہی تھا۔ سو وہیں کچی اینٹ کے صحن کو بستر بنا کر اور ہاتھوں کے تکیے پر سر رکھ کر کچھ دیر کمر ٹکانے کے لیے لیٹ گیا اور پتا نہیں، کس گھڑی میری آنکھ لگ گئی۔ نیند میں مجھے عجیب سے سائے ڈراتے رہے۔ میں نے اچانک خود کو اُسی وسیع و عریض اور لق و دق صحرا کے بیچوں بیچ کھڑا پایا۔ سوا نیزے پر آیا سورج میرے سر پر اپنی تپتی کرنوں کی برچھیاں لیے کھڑا ہے اور پھر اچانک ہی مجھے بہت سے کتوں کے بھونکنے کی آوازیں سنائی دیتی ہیں۔ میں گھبرا کر ایک طرف دوڑتا ہوں تو آٹھوں کتوں کو اپنے تعاقب میں دیوانہ وار بھاگتے پاتا ہوں اور پھر اُن میں ایک کتا اُچھل کر میرے نرخرے میں اپنے دانت گاڑ دیتا ہے اور میں گھبرا کر آنکھیں کھول دیتا ہوں...... یا اللہ...... یہ خواب تھا یا کوئی عذاب......؟ سلطان بابا صحن ہی میں ایک برتن سے پانی لے کر وضو کر رہے تھے۔ انہوں نے منہ پر پانی کا چھینٹا مارا۔ اُن کے انداز سے صاف ظاہر تھا کہ وہ بہت احتیاط سے پانی کا استعمال کر رہے تھے۔

فجر کی نماز کے بعد میں نے انہیں اپنے خواب کے بارے میں بتایا۔ میں نے سنا تھا کہ صبح کے قریبی خواب سچے ہوتے ہیں۔ سلطان بابا میرا خواب سن کر کچھ خاموش سے ہو گئے۔ میں نے اصرار کیا تو دھیرے سے بولے، ''خواب تقدیر نہیں ہوتے۔ کبھی کبھی مستقبل کی ایک جھلک ضرور ثابت ہو جاتے ہیں اور اگر یہ جھلک سچی ہے تو آنے والے دنوں میں یہ صحرا تمہاری بہت بڑی امتحان گاہ ثابت ہوگا۔ نہ صرف تمہارے لیے بلکہ خود میرے لیے بھی ...... لیکن ہمیں ہر حال میں ثابت قدم رہنا ہوگا۔ یاد رہے کہ یہ جسم صرف اس دنیاوی زندگی کا ایک استعارہ ہے۔ اصل حیات تو موت کے بعد شروع ہوتی ہے۔''

نہ جانے سلطان بابا کے لہجے میں ایسی کیا بات تھی کہ میں سر سے پیر تک پسینے میں شرابور ہو گیا۔ رفتہ رفتہ صحرا کی بے رحم دھوپ نے مزار کی روشوں پر ڈیرے ڈالنے شروع کر دیئے۔ میں ابھی تک رات کے خواب کے اثر سے باہر نہیں نکل پایا تھا۔ اچانک مجھے یوں لگا کہ کوئی کتا درد سے بے چین ہو کر رو رہا ہے۔ چند لمحے تو میں یہی سمجھتا رہا کہ یہ بھی رات والے خواب ہی کا کوئی تسلسل ہے۔ لیکن جب ایک ہی آواز وقفے وقفے سے مزار کی عقبی دیوار سے اُبھرنے لگی تو مجھے خود کو مجتمع کر کے اُٹھنا ہی پڑا اور پھر میں تپتی ریت میں پیر دھنسائے ہوئے عقبی سمت تک پہنچا تو اپنی جگہ جم کر ہی رہ گیا۔ دیوار کے نامکمل سائے میں ادھ مرا ''کالا'' پڑا ہوا تھا۔ ہاں، جبروت کا وہی لاڈلا کتا جس نے پہلی رات مجھ پر حملہ کرنے کی کوشش کی تھی اور گزشتہ روز جسے ریچھ نے

پوری قوت سے اپنے پنجے کے ایک ہی تھپیڑے سے ہوا میں اُچھال کر ہجوم کے دائرے سے پرے پھینک دیا تھا۔ مجھے اکرام اللہ صاحب نے بتایا تھا کہ جبروت اپنے ہار جانے والے یا شدید زخمی کتوں کو مرنے کے لیے صحرا میں پھنکوا دیتا ہے۔ شاید کالے کو بھی ادھ مرا سمجھ کر وہ لوگ صحرا میں پھینک گئے تھے، لیکن وہ اس حالت میں یہاں تک کیسے آ پہنچا۔ کتے کا جسم بُری طرح زخمی تھا اور ریچھ کے خوں خوار پنجوں نے کالے کا پیٹ بُری طرح سے اُدھیڑ دیا تھا۔ وہ گرم ریت پر کچھ اس طرح پڑا ہوا تھا کہ اس کی دھونکنی جیسی چلتی سانس اور منہ سے لٹکتی زبان ریت چاٹ رہی تھی اور اس کی آنکھوں سے آنسو بہہ بہہ کر ریت میں جذب ہو رہے تھے۔ مجھے دیکھ کر کتے نے اپنی جگہ سے حرکت کرنے کی کوشش کی، لیکن وہ صرف ایک کراہ کے بعد نڈھال ہو کر پھر وہیں پڑ کر رہ گیا۔ مجھے اور تو کچھ سمجھ میں آیا نہیں میں جلدی سے بھاگ کر مزار کے احاطے میں پڑی پرانی مشک اُٹھا لایا جس کی تہ میں ابھی کافی پانی موجود تھا۔ میں نے چند قطرے جانور کے چہرے پر ٹپکائے تو اُس نے جلدی سے زبان باہر نکال دی اور پانی کی گرتی بوندوں کو بے تابی سے اپنے حلق سے نیچے اُتارنے لگا۔ قریب سے دیکھنے پر مجھے زخم کی اصل گہرائی کا اندازہ ہوا۔ لیکن افسوس میرے پاس اس وقت وہاں کوئی ایسا مرہم نہیں تھا، جسے میں زخم پر لگاتا۔ اچانک مجھے کچھ خیال آیا اور میں دوبارہ اندر کی طرف دوڑا۔ ایک پرانا ٹاٹ کا ٹکڑا صحن کی دیوار کے پاس پڑا نظر آیا۔ میں نے دیوار کے بنے طاق کے اندر سے ماچس اُٹھائی اور ٹاٹ کو آگ لگا دی۔ بچپن میں ایک بار کاشف کی بلی کا پاؤں زخمی ہو گیا تھا، تب میں نے اپنے لنگوٹیے یار کو یہی نسخہ آزماتے دیکھا تھا۔ ٹاٹ کی راکھ میں نے کالے کے زخم کے اُوپر بکھیر دی۔ پتا نہیں اُسے اس سے سکون ملا یا نہیں۔ میں رات کی بچی ہوئی روٹی کے چند خشک ٹکڑے بھی اپنے ساتھ لایا تھا۔ روٹی نگلنے اور پانی پینے کے بعد وہ مجھے کچھ سکون میں دکھائی دیا۔ لیکن مسئلہ اب بھی وہی تھا۔ بے زبانی ...... اچانک ہی مجھے اس زبان اور ان لفظوں کی شدید اہمیت کا احساس ہوا۔ ہمارے پاس یہی ایک لفظ ہی تو ہوتے ہیں، سب سے خاص، سب سے ممتاز کر دینے والے...... اور اگر ہماری زندگی سے یہ لفظ نکال دیئے جائیں تو ہم کس قدر نامکمل، کس قدر کھوکھلے ہو جائیں۔ بے زبانی کا کرب جس شدت سے اس لمحے میں نے محسوس کیا، شاید ہی کبھی کیا ہو۔ کالے نے اپنے جسم کو تولا اور تقریباً گھسٹتے ہوئے ایک طرف کو روانہ ہو گیا۔ میرا دل چاہا کہ میں اس سے کہوں کہ جب تک وہ ٹھیک نہیں ہو جاتا، یہیں پڑا رہے۔ لیکن میں تو اشاروں کی زبان بھی نہیں جانتا تھا اور پھر بات اشاروں کی زبان تک ہی کہاں مخصوص تھی میں بول کر بھی بعض مرتبہ اپنے لفظوں کو گونگا ہی پاتا تھا۔ کالے نے اُونچے ٹیلے سے پلٹ کر ایک بار تشکر بھری نظروں سے میری جانب دیکھا اور پھر ریت کے اُڑتے گرم بگولوں میں غائب ہو گیا۔ اتنے میں اندر مزار کے صحن سے کسی کے باتوں کی آواز سنائی دینے لگی۔ میں پلٹ کر واپس صحن میں داخل ہوا تو اکرام صاحب ایک بوڑھے جوڑے کے ساتھ سلطان بابا کے قریب بیٹھے دکھائی دیئے۔ بوڑھے کی نظر شاید بالکل ہی جواب دے چکی تھی، لہٰذا وہ بڑھیا کے سہارے ٹٹول ٹٹول کر سلطان بابا سے مخاطب تھا۔ میں بھی سلام کر کے خاموشی سے ان

لوگوں کے قریب ہی بیٹھ گیا۔ بڑھیا گزارے لائق بھی اُردو نہیں بول سکتی تھی۔ سو بوڑھے ہی کو اُس کے حصے کے الفاظ بھی ادا کرنا پڑ رہے تھے۔ خود بوڑھا بھی اپنا مدعا ٹوٹی پھوٹی اُردو اور صحرائی زبان کی آمیزش میں بیان کر رہا تھا۔ اکرام صاحب بھی درمیان میں لقمے دیتے رہے۔ ماجرا کچھ یوں تھا کہ بوڑھے اور بوڑھی کی نواسی چھ ماہ پہلے بیاہ کر اپنے گاؤں سے میاں سمیت کال گڑھ سے دو گاؤں آگے رحمان گڑھ کے لیے روانہ ہوئی تھی لیکن وہ اور اُس کا شوہر کبھی رحمان گڑھ نہیں پہنچ پائے۔ لڑکی کے گاؤں اور رحمان گڑھ کے بیچ صرف کال گڑھ ریلوے سٹیشن ہی پڑتا تھا اور تلاش کے دوران چند ریلوے ملازمین نے اتنی گواہی تو ضرور تھی کہ انہوں نے اُس رات ایک نوجوان شادی شدہ جوڑے کو کال گڑھ کے ریلوے سٹیشن پر اُترتے ہوئے دیکھا تھا، لیکن اس کے بعد وہ دوبارہ ٹرین پر سوار ہوئے یا کہیں اور نکل گئے، اس کی خبر کسی کو نہیں تھی۔ لڑکی کے ماں باپ تو چند سال پہلے ہی خالق حقیقی سے جا ملے تھے۔ لڑکی کے نانا نانی نے ہی پال پوس کر اُسے بڑا کیا اور بیاہا تھا۔ لڑکا رحمان گڑھ میں کوئلے کی کان میں مزدور تھا اور ہفتے بھر کی چھٹی لے کر صرف بیاہ کے لیے اپنی دلہن کے گاؤں آیا تھا۔ بوڑھا اور بوڑھی اپنی نواسی کی جُدائی میں بے حد نڈھال تھے۔ خاص طور پر بڑھیا کے تو آنسو ہی نہیں رُکتے تھے۔ بقول اُس کے اُسے کال گڑھ کی مٹی میں سے اُس کی سکینہ کی خوشبو آتی تھی اور گزشتہ چھ ماہ ہی سے وہ دونوں در در کی ٹھوکریں کھا رہے تھے لیکن ابھی تک اُن کی نواسی کا کوئی سراغ نہیں مل سکا تھا، نہ ہی اُس کے شوہر کا کوئی پتا تھا۔ کال گڑھ کی ناکارہ پولیس بھی چند دن کی دکھاوے کی دوڑ دھوپ کے بعد ہاتھ پر ہاتھ دھر کر بیٹھ گئی تھی اور اب تو حوالدار نے باقاعدہ ان دونوں کا داخلہ بھی تھانے میں بند کروا دیا تھا کہ کون روزانہ ان دو خبطی بوڑھوں کی تکرار سنتا پھرے۔ اکرام صاحب نے سلطان بابا کو یہ بھی بتایا کہ شروع میں سب سے پہلے سکینہ کے نانا نانی نے علاقے کی روایت کے مطابق جبروت سے بھی رابطہ کیا تھا اور جبروت نے چند دن اپنے ہرکارے آس پاس کے علاقوں میں دوڑائے بھی کہ شاید کہیں لڑکا لڑکی کا کچھ پتا چل سکے، لیکن چند دن بعد کارندے بھی تھک ہار گئے۔ اب تو جبروت نے بوڑھے اور بڑھیا سے ملنے سے بھی انکار کر دیا ہے۔ ظاہر ہے کہ اس کے پاس کتے لڑانے جیسے اور بھی بہت سے اہم کام ہوتے تھے، وہ کب تک اپنے وفاداروں کو ہلکان کرتا۔ لیکن سکینہ کی نانی یہ علاقہ چھوڑ کر نہیں جانا چاہتی تھی۔ اُسے اب بھی اُمید تھی کہ اُس کی لاڈلی کی اگر کوئی خبر ملے گی تو وہ یہیں کال گڑھ سے ملے گی۔ بڑھیا نے بوڑھے کے کان میں کچھ کہا اور بوڑھے نے اُسے ڈانٹا۔ بڑھیا نے پھر منت کی۔ بوڑھا بادل ناخواستہ گڑگڑایا۔ ''میری لگائی سٹھیا گئی ہے پیر صاحب۔ آپ سرکار لوگ ہو، بُرا نہیں ماننا۔ پر یہ کہتی ہے کہ اُسے روزانہ کئی مہینوں سے ہر رات ایک ہی عجیب سا خواب آتا ہے کہ ہماری سکینہ اس صحرا میں دوڑ رہی ہے اور اس کے پیچھے بہت سے کتے لگے ہوئے ہیں۔ سکینہ زور زور سے رو رہی ہے اور ہمیں پکار رہی ہے......'' میں زور سے چونکا۔ کچھ ایسا ہی خواب تو میں نے بھی رات کو دیکھا تھا۔ یہ صحرا کیا اپنے سبھی باسیوں کو ایک جیسے ہی خواب دکھاتا تھا۔ بوڑھا گڑگڑا رہا تھا۔ ''آپ ہمارے لیے دعا کرو پیر جی...... ہم بہت

مجبور اور بے کس ہیں۔ بڑی دُور سے چل کر آئے ہیں۔ یہاں کوئی ہماری فریاد سننے والا نہیں ہے۔" بوڑھ
بولتے بولتے بھرا سا گیا اور اس کی آنکھوں سے دو آنسو ٹپک کر مزار کی بنجر زمین میں جذب ہوگئے۔ بڑھیا
اپنے مرد کو روتے دیکھا تو جلدی سے اپنا دکھڑا بھول کر پلو سے اُس کی آنکھیں پونچھنے لگ گئی۔ عجیب نظارہ تھا
دو مجبور اور بے بس انسان ایک دوسرے کو دلاسا دے رہے تھے، حالانکہ دونوں اس بات سے باخبر تھے کہ ان
دلاسا جھوٹا ہے۔ پتا نہیں کیوں ایک دم ہی میرا دل بھر آیا اور میں نے وہاں سے اُٹھ جانے کی ٹھان لی۔ ا
میں مزار کے دروازے سے زوردار آواز کے ساتھ سلام کی آواز سنائی دی۔ آنے والا سانول تھا، جو و
دروازے کے قریب کھڑے ہو کر مجھے پاس آنے کے اشارے کر رہا تھا۔ مجھے تو ویسے بھی وہاں سے ٹلنے
بہانہ چاہیے تھا۔ سانول کے قریب پہنچ کر میں نے اُس سے پوچھا۔ "خیر تو ہے...... کہیں نوری کے لیے ک
منت مانگنے تو نہیں آئے۔" وہ مسکرایا۔ "منتوں سے اگر پیار ملتے تو کال گڑھ کا یہ مزار اتنا ویران نہ ہوتا جنا
"واہ...... بڑی بات کہہ دی تم نے۔ کہو کیسے آئے؟" سانول نے کچھ رازدارانہ انداز میں میرے قری
ہو کر بتایا کہ نوری کی کسی سہیلی نے اُسے پیغام بھجوایا ہے کہ نوری عصر کے بعد اپنے والدین کے ساتھ مزار پر
کرنے آئے گی۔ شاید چچا اکرام بھی ساتھ ہوں۔ سانول بھی اُس وقت کسی بہانے مزار پر آنا چاہتا تھا۔ وہ مجھے
یہی بتانے کے لیے اس جھلسا دینے والی دھوپ میں دوڑتا ہوا یہاں تک آیا تھا کہ میں اس کی مدد کروں اور ا
کے ذمے کوئی ایسا کام لگا دوں کہ وہ جب مزار پر آئے تو نوری کے گھر والوں کو شک نہ ہو اور وہ بُرا نہ مانیں
بقول سانول نوری کے گھر والے اس معاملے میں بہت سخت تھے، خاص طور پر اپنے پرانے اُستاد ہیڈ ما
اکرام صاحب سے تو اس کی جان جاتی تھی۔ میں نے اُس کی رام کہانی سننے کے بعد مسکرا کر اُس سے پوچھا
"جہاں اُس نے اتنی محنت کی ہے، وہیں ضرور کوئی اچھا سا بہانہ بھی خود ہی سوچ لیا ہوگا۔" سانول بھی ہنس دیا
"اُس کا انتظام بھی میں نے کر دیا ہے۔ آج جمعرات ہے۔ میں یوں ظاہر کروں گا کہ جیسے تمہارے کہنے
مغرب کے بعد پڑھ کر بانٹنے کے لیے چنے اور گڑ وغیرہ لے کر آیا ہوں۔ پچھلے حافظ جی بھی ہر جمعرات کو
نیاز بانٹا کرتے تھے۔" یہ محبت کرنے والوں کو ہمیشہ ایسے بہانوں کی ضرورت کیوں پڑتی ہے؟ میں نے سانو
کو تسلی دی کہ وہ بے فکر ہو کر واپس جائے۔ میں اس "معاونت عشق" کے جرم میں اُس کا پورا ساتھ دوں گ
سانول کو پریشان دیکھ کر میں یہی سوچتا رہا کہ یہ پیار اپنے ساتھ اتنی کڑی پابندیوں کے کانٹے کیوں لے کر آ
ہے۔ ہفتوں صحرا میں سر پٹخنے اور پاؤں میں چھالے پڑنے کے بعد آج جب محبوب کا دیدار نصیب ہو بھی رہا
تو وہ بھی صرف چند گھڑیوں کے لیے۔ اور اس کے لیے بھی سو بہانے اور تاویلیں گھڑنا پڑ رہی تھیں۔ یہ پیار ا
محبت کا جذبہ ہماری رگوں سے سارا خون نچوڑنے کے بعد ہی خوشی کی دو بوندیں ہماری رُوح کے کشکول م
کیوں ڈالتا ہے۔ جاتے جاتے سانول کی نظر سلطان بابا کے قریب بیٹھے بوڑھے اور بڑھیا پر پڑی۔ "اوہ
یہ بے چارے یہاں بھی آ پہنچے......؟" "تم جانتے ہو انہیں......؟" کال گڑھ میں کون ہے جو انہیں نہیں جا

پچھلے چھ ماہ سے علاقے کے ہر گھر کی چوکھٹ پر دستک دے چکے ہیں یہ دونوں۔ بڑا ظلم کیا ہے قدرت نے ان
کے ساتھ۔ جانے ان کی نواسی کہاں کھو گئی ہے۔ علاقے کے سب ہی جوانوں نے چپہ چپہ چھان مارا لیکن ان
نوں کا آج تک کہیں پتا نہیں چلا۔ اب تو باقی سب کی طرح میں بھی یہی سمجھتا ہوں کہ ضرور وہ لوگ کال گڑھ
سے کہیں آگے بڑھ گئے ہوں گے۔ یہاں ہوتے تو اُن کا کچھ نشان تو ملتا؟" جاتے جاتے سانول ایک بار پھر
نا پورا منصوبہ دہرا کر اور مجھ سے تصدیق کروا کر واپس پلٹ گیا۔ سلطان بابا نے دعا کے لیے ہاتھ اُٹھا دیئے
تھے۔ میں بھی آ کر دعا میں شامل ہوگیا۔ دعا ختم کر کے سلطان بابا نے سکینہ کے نانا نانی کو تسلی دی کہ انشاء اللہ جلد
ا اُن کی لاڈلی کا کوئی نہ کوئی سراغ مل جائے گا۔ اکرام صاحب نے دعا کے بعد واپسی کا ارادہ ظاہر کیا۔ بڑھیا
نے بوڑھے کو سہارا دے کر کھڑا کیا اور سلطان بابا سے رُخصت ہو کر جانے کے لیے پلٹے۔ بڑھیا کی گود سے
کپڑوں کی ایک چھوٹی سی پوٹلی پھسل کر نیچے گر گئی لیکن اُسے شاید اس کی خبر نہیں ہوئی۔ میں بھی انہیں جاتا دیکھنے
ں اس قدر محو تھا کہ پہلے میری نظر بھی وہاں نہیں گئی۔ پھر جب احساس ہوا، تب تک وہ مزار کے دروازے تک
پہنچ چکے تھے۔ میں نے اکرام صاحب کو آواز دے کر روکا اور جلدی سے پوٹلی اُٹھا کر انہیں تھمانے کے لیے
دروازے کی جانب دوڑا۔ پوٹلی کی گرہ شاید نرمی سے لگائی گئی تھی، تب ہی وہ بیچ راستے ہی میں کھل گئی اور دو چار
کپڑے نکل کر صحن میں بکھر گئے۔ ریت کا تیز بگولا مزار کے صحن میں داخل ہوگیا اور میں نے جلدی جلدی
کپڑے سمیٹنا شروع کر دیئے۔ ریت میری آنکھوں میں گھسی جا رہی تھی۔ کپڑے کیا تھے، چند کترنیں ہی تھیں۔
تیز ہوا نے ایک زنانہ دوپٹے کو دُور پھینک دیا۔ میں باقی کپڑے سمیٹنے کے بعد اُس جانب بڑھا، جہاں مزار کے
صحن میں اُگے کیکر کے ایک جھاڑ میں وہ دوپٹا اٹکا ہوا تھا۔ ریت کے اُڑتے ذرّوں نے آس پاس سب ہی کچھ
دھندلا کر رکھ دیا تھا۔ تب ہی میری نظر دوپٹے پر پڑی اور میرے ذہن میں ایک ساتھ بہت سے جھماکے
ہوئے۔ یہ...... یہ تو وہی پھولوں والی چادر کا ایک حصہ تھا، جو میں نے اُس انجان لڑکی کو اوڑھے دیکھا تھا۔
ہاں وہی تو تھا...... لیکن یہ دوپٹا...... یہاں کیسے......؟ میں نے جلدی سے کیکر سے کپڑا علیحدہ کیا اور اُسے
لے کر تقریباً دوڑتا ہوا دروازے کے قریب کھڑے جوڑے تک پہنچا۔ اکرام صاحب بھی میری ہڑبڑاہٹ دیکھ
کر گھبرا سے گئے۔ میں نے جلدی سے پوچھا۔ "یہ کپڑے کس کے ہیں؟" اکرام صاحب نے جواب دینے کے
بجائے بوڑھے کی جانب دیکھا۔ بوڑھے نے ٹھنڈی آہ بھری۔ "یہ ہماری سکینہ کی چادر کا آدھا حصہ ہے۔ شادی
کے بعد آتے ہوئے اُس نے اپنی بدنصیب نانی کو اپنی نشانی کے طور پر دیا تھا۔ اب یہ اسے اپنے سینے سے
لگائے پھرتی ہے جی۔ کہتی ہے اس میں سے اُسے اپنی لاڈلی کی خوشبو آتی ہے۔" میرے ذہن میں بیک وقت
نے کتنی آندھیوں کے جھکڑ چلنے لگے۔ اس کا مطلب تھا کہ اب تک جو انجانی لڑکی رات کے اندھیرے میں
مجھے اس صحرا میں دکھائی دیتی رہی، وہ سکینہ ہی تھی۔

لاحاصل کی کھوج

میرا دل چاہ رہا تھا کہ میں چیخ چیخ کر اُن دونوں کو بتاؤں کہ میں نے سکینہ کو دیکھا ہے لیکن نہ جانے وہ کو
سا احساس تھا جس نے مجھے اس اعلان سے باز رکھا۔ بوڑھا اور بڑھیا اکرام صاحب سمیت اپنی نواسی
کپڑوں کی پوٹلی لیے پلٹ کر چل دیئے اور میں وہیں ریت کے شدید طوفان میں مزار کے دروازے کے قریب
گم صم سا کھڑا رہ گیا۔ مجھے احساس بھی نہیں ہوا کہ کب ریت کی چادر نے میرے سارے وجود کو اپنی جلتی چا
سے ڈھک دیا۔ یہ کیسا اسرار تھا؟ اگر وہ لڑکی سکینہ ہی تھی، جو مجھے ایک آدھ نہیں، پورے تین بار دکھائی دی تھی
پھر وہ گزشتہ اتنے عرصے میں کال گڑھ کے دوسرے باسیوں کو کیوں نظر نہیں آئی تھی؟ لیکن کیا صرف ایک
پھولوں والی چادر کی مشابہت کی بنا پر مجھے اتنا بڑا دعویٰ کرنا بھی چاہیے یا پھر مزید کسی ثبوت کا انتظار کرنا چاہیے
میں انہی سوچوں میں گم رہا اور مجھے پتا بھی نہیں چلا کہ کب عصر کا وقت گزر گیا۔ سلطان بابا نے ٹوکا تو میں
جلدی سے سورج ڈھلنے سے کچھ قبل نماز ادا کی۔ آج مزار پر ہلکی پھلکی چہل پہل بھی تھی۔ شاید جمعرات کی و
سے۔ کچھ ہی دیر میں اکرام اللہ صاحب ایک پکی عمر کے مرد اور عورت کے ساتھ مزار کے احاطے میں داخل
ہوئے۔ ان کے پیچھے پیچھے جھجکتی سی، چھوٹے چھوٹے قدم اُٹھاتی ایک سانولی سلونی سی نوجوان لڑ
علاقے کی ریت کے مطابق بڑا سا پلو نکالے اندر چلی آئی۔ اچھا تو یہ تھی، سانول کی نوری...... واقعی سانول
تڑپ اور بے چینی بلاوجہ نہیں تھی۔ نوری کے نور سے مزار چند لمحوں کے لیے جگمگا سا گیا تھا۔ کچھ لوگوں کی سادگ
میں کس قدر کشش ہوتی ہے۔ کچھ سراپے خود سرتاپا ایک گہنا ہی ہوتے ہیں۔ انہیں مزید کسی زیور کی ضرورت
نہیں ہوتی۔ نوری نے بھی سادہ سفید چوڑیاں کہنی تک ڈال رکھی تھیں۔ وہ اپنے ماں باپ اور اکرام چچا
ساتھ دعا میں مشغول تھی اور میں بار بار باہر صحرا کی طرف نظریں دوڑا رہا تھا۔ نہ جانے سانول کہاں رہ گیا تھا
اُس نے مجھے یہی بتایا تھا کہ نوری کی خاص سہیلی نے نوری سے بھی چھپ کر اس کے مزار آنے کی یہ خبر سانول
تک پہنچائی تھی۔ نوری کی سب سہیلیاں سانول کی اس بے قراری سے واقف تھیں اور سب ہی کی دلی خواہش
تھی کہ نوری جلد از جلد سانول کی ہو کر اُس کے گھر چلی جائے۔ اس لیے وہ نوری کی ناراضی کا خطرہ مول لے
بھی ایسی حرکت کر گزرتی تھیں۔ جس سے ان دونوں کو دو گھڑی ایک دوسرے کو دیکھنے کا موقع مل سکے
نوری کا سکون بھی یہی ظاہر کر رہا تھا کہ اسے سانول کی آمد کی خبر نہیں، ورنہ ایسے شفاف آئینے کہاں کچھ چ
پاتے ہیں۔ نوری نے دعا کے لیے ہاتھ اُٹھا رکھے تھے اور میں نے دُور صحرا میں نوری کی ہتھیلیوں کے حلقے

پرے سانول کو لمبے لمبے ڈگ بھرتے مزار کی جانب آتے ہوئے دیکھا۔ اُس نے دروازے تک پہنچنے سے
پہلے ہی زوردار انداز میں ہم سب کو سلام کیا اور ایک بڑا سا کپڑے کا تھیلا ایک جانب رکھتے ہوئے
بولا ''چھوٹے پیر جی...... آپ نے دعا کے لیے جو سامان منگوایا تھا، سب لے آیا ہوں۔'' اُس کی اس ''چھوٹے
پیر جی'' کی اصطلاح نے مجھے بے ساختہ مُسکرانے پر مجبور کر دیا۔ نوری نے چونک کے پلٹ کر دیکھا اور اُس
کے چہرے پر ایک وقت حیا، شرم اور کچھ کچھ غصّے کی لالی بکھر گئی۔ وہ سمجھ گئی تھی کہ سانول کی اس ''سعادت
مندی'' کے پیچھے کیا راز ہے۔ سانول نے باقی سب لوگوں سے بھی علیک سلیک کی اور میرے پاس آ کر کھڑا ہو
گیا۔ اُس کی نظر بار بار پھسل کر نوری کے چہرے کا طواف کر رہی تھی اور چند لمحوں پہلے کسی گہری جھیل کی طرح پُر
سکون نظر آنے والی نوری کسی سمندر کے بے چین مدوجزر کی طرح بل کھانے لگی تھی۔ دعا ختم کرنے کے بعد
نوری کے والدین نے سلطان بابا سے چند لمحوں کی ملاقات کی۔ اکرام صاحب نے ان سب کا تعارف کروایا۔
اس تمام عرصے میں نوری مستقل سر جھکائے کھڑی رہی۔ سانول کا دیا ہوا لقب نوری کے ماں باپ کی زبان پر
بھی چڑھ گیا تھا اور وہ رُخصت ہوتے وقت تک مجھے ''چھوٹے پیر'' کے نام ہی سے پکارتے رہے۔ گویا سلطان
بابا کال گڑھ کے بڑے پیر تھے اور میں اُن کا معتمد، چھوٹا پیر۔ سانول کی بے چینی ظاہر کر رہی تھی کہ اُس کی
جنت صرف نوری کی اک نظر ہے۔ لیکن اس پیکرِ حیا نے بھی جیسے صرف مزار کی زمین پر بچھی ریت ہی کو نہار
نے کا فیصلہ کر رکھا تھا۔ نوری نے آخری وقت تک اپنی نظر جھکائے رکھی، حتیٰ کہ اُس کے ماں باپ اور چچا مزار
کے دروازے تک پہنچ گئے۔ سانول بالکل ہی پژمردہ سا ہونے لگا۔ میرے دل سے بے اختیار ایک صدا نکلی کہ
اس کے حصے کی نظر اسے نصیب کر دے اور ٹھیک اُسی لمحے نوری نے مزار سے نکلتے نکلتے ایک پل کے لیے پلٹ
کر سانول کی جانب دیکھا۔ کیا، کچھ نہیں تھا۔ اُس ایک نظر میں۔ حجاب، ستائش، سرزنش اور ایک
الوداع...... تب تک کے لیے جب قدرت ایک بار پھر ان دونوں کا سامنا کرا دے۔ سانول اپنی جگہ بُت سا
کھڑا رہ گیا اور نوری پلٹ کر چل دی۔ میں جانتا تھا کہ یہ ایک نظر سانول کو کیا کچھ دے گئی۔ لیکن مجھے یہ بھی پتا
تھا کہ اب اگلی ملاقات تک سانول کے جگر میں نوری کی یہ آخری نظر، زہر میں بجھے ہوئے ایک تیر کی طرح
پیوست رہے گی۔ نہ جانے کتنے جگ راتے اور دھوپ کے کتنے پہر اسی ایک نظر کی کسک اور تڑپ کے اثر میں
گزر جائیں گے۔ صورت چاہے کوئی بھی ہو، یہ محبت ہر حال میں ایک دودھاری تلوار ہی تو ثابت ہوتی ہے۔ نہ
ہو تو جُدائی کاٹتی ہے اور ملاقات ہو جائے تو محبوب کا جلوہ جلا کر راکھ کر دیتا ہے۔ سانول بھی اب صرف اپنی
راکھ کی صورت ہی میں اس مزار کے احاطے میں موجود رہ گیا تھا اور گرم ہوا کے تیز بگولے اور ریت کا طوفان
اس راکھ کو پورے مزار کی چار دیواری میں اُڑا رہا تھا۔ یہ جذبے بھی کتنے منہ زور ہوتے ہیں۔ ایک لمحے ہی
میں کیسے کیسے زندہ دلوں کو خاک کر دیتے ہیں۔ سانول بھی کچھ دیر بعد اپنے اس ریزہ ریزہ اور خاکستر وجود کو
لیے واپس پلٹ گیا۔ مغرب کے بعد جب سلطان بابا نے اپنی تسبیح ختم کی تو میں نے انہیں سکینہ کے دوپٹے والی

ساری بات بتائی کہ اِسی چادر کا دوسرا حصہ پہنے ہوئے میں نے صحرا میں اس لڑکی کو دیکھا تھا۔ سلطان بابا میر
بات سن کر کسی گہری سوچ میں ڈوب گئے۔ پھر بولے تو لہجہ تب بھی کچھ کھویا کھویا سا تھا۔ ''گویا وہ صرف ایک
سراب ہی نہ تھی۔ قدرت تم سے کوئی بڑا کام لینے والی ہے ساحر میاں! خیال رہے کہ اب قدم ڈگمگانے
پائیں۔ ویسے میرا قیاس ہے کہ اب وہ لڑکی تمہیں دوبارہ دکھائی نہیں دے گی۔ اس نے تمہیں جو اشارہ دینا تھا
دے چکی۔ اب آگے کی کھوج تمہاری اپنی ذمہ داری ہے۔''

ہمیشہ کی طرح میں سلطان بابا کی پوری بات سمجھ نہیں پایا اور ہمیشہ کی طرح چپ ہی رہا کیوں کہ مجھ
اندازہ تھا کہ سلطان بابا مجھے اتنا ہی بتاتے ہیں جتنا میرے لیے جاننا ضروری ہوتا ہے۔ رات ڈھلنے لگی تھی ا
میری ازلی وحشت اور بے چینی کا دور بھی شروع ہونے ہی کو تھا کہ مجھے باہر سے وہی مخصوص غراہٹ سنائی د
مجھے اندازہ تھا کہ ''کالا'' بھوک لگنے پر اب ہمیشہ مزار پر چار دیواری ہی کا رُخ کیا کرے گا کیوں کہ اس ک
پرانے مالک نے تو اسے اس کی زندگی بھر کی وفاداری کا صلہ ایک ''دیس نکالے'' کی صورت ہی دیا تھا۔ وہ د
اپنی مخصوص جگہ پر پاؤں پسارے بیٹھا تھا۔ میں نے ایک پرانے برتن میں پانی کا مستقل انتظام کر دیا تھا۔ رو
کے چند ٹکڑے نگلنے کے بعد کالا وہیں پیر پسار کر بیٹھ گیا۔ جانے اسے اتنی سمجھ کیسے آ گئی تھی کہ وہ مزار کی چ
دیواری کے اندر پھٹکتا بھی نہیں تھا۔ اتنے میں صحرا کی طرف سے سانول کی پُرسوز بانسری کی لے ہوا کے دوش
بکھری۔ اُس کی تان میں جو درد آج تھا۔ اُسے شاید صرف میں ہی محسوس کر سکتا تھا۔ شاید شیلے نے کہا تھا
''ہمارے سب سے میٹھے نغمے وہی ہوتے ہیں جو ہمارے اندر کے شدید غم کو بیان کرتے ہیں۔'' آج سانول
بانسری بھی شیلے کے اس قول کو سچ ثابت کر رہی تھی۔ مجھے اپنی طرف آتا دیکھ کر اُس نے ہونٹوں سے بانسری
لی۔ میں نے قریب جا کر اُسے چھیڑا۔ ''مجھے نہیں پتا تھا کہ نوری کی ایک جھلک تمہاری دھن کو اتنی زندگی بخ
دے گی۔ ورنہ اُس کے ماں باپ سے کچھ دیر مزار پر ٹھہرنے کی التجا ضرور کرتا۔'' سانول پھیکی سی مسکراہٹ
ساتھ بولا ''میں ہر لمحہ اُسے دیکھنے کے لیے تڑپتا ہوں، لیکن جب کبھی بھی اُس کی ایک آدھ جھلک پا لیتا ہوں
پھر ہفتوں یونہی اداس اور بے چین رہتا ہوں۔ ایسا کیوں ہوتا ہے عبداللہ......'' ''پہلے تو تم یہ فیصلہ کر لو کہ
عبداللہ ہوں یا چھوٹا پیر۔ پھر اس کے بعد ہم مل کر اس درد کا مرہم بھی ڈھونڈ لیں گے۔'' اس مرتبہ سانول خ
کھلکھلا کر ہنسنے سے روک نہیں پایا اور یہی میرا مقصد بھی تھا۔ میں اُسے یاسیت کے اس دور سے باہر نکالنا چا
تھا۔ اب میں اُسے کیسے سمجھاتا کہ اس محبت نے آج تک خوشی کم ہی بانٹی ہے۔ کیکر کا مقدر صرف کانٹے ہو
ہیں، گلاب نہیں۔

میں ابھی تک سکینہ کے بھید میں اُلجھا ہوا تھا۔ میں نے سانول سے دوبارہ اُس کا تذکرہ کیا کہ مجھے
لگتا ہے کہ جس لڑکی کی جھلک میں نے صحرا میں تین مرتبہ دیکھی ہے، وہ سکینہ ہی تھی۔ لیکن اس بار سانول کا
عمل بہت چونکا دینے والا تھا۔ اُس نے جلدی سے میرے ہونٹوں پر اپنی اُنگلی کی مہر لگا دی اور گھبرا کر اِدھر

دیکھنے لگا۔ پھر کسی کے نہ ہونے کا اطمینان کر کے سرگوشیانہ انداز میں بولا ''میری ایک بات مانو گے اس بات کو
یہیں ختم کر دو۔ یہ کھوج تمہارے لیے ٹھیک نہیں ہے۔'' مجھے اس کے رویے پر شدید حیرت ہوئی۔
''کیوں......؟ ایسا کیا ہے اس کھوج کے انجام میں۔ دیکھو اگر تمہیں اس لڑکی کے بارے میں کچھ بھی پتا ہے تو
مجھے ضرور بتاؤ۔ کیوں کہ اب تو دھیرے دھیرے مجھے بھی یہ یقین ہونے لگا ہے کہ میری کال گڑھ آمد کا مقصد ہی
صرف یہ کھوج ہے۔'' سانول نے بات ٹالنے کی بہتیری کوشش کی، لیکن میرے مصمم ارادے کے آگے اُسے ہار
ماننا پڑی۔ ''میں اس کے بارے میں کچھ زیادہ تو نہیں جانتا لیکن شاید دوسروں سے کچھ بڑھ کر معلومات رکھتا
ہوں۔ سکینہ اپنے شوہر کے ساتھ کال گڑھ کے اسٹیشن پر کیوں اُتری، اس کا تو مجھے پتا نہیں، لیکن وہ ایک رات
بستی کے کس مکان میں ٹھہری تھی، مجھے اس جگہ کا پتا ہے۔ میں اور میرا دوست پیرل وہاں گئے بھی تھے۔''
سانول بولتے بولتے چپ ہو گیا۔ میں نے اُسے ٹوکا ''تم لوگ وہاں کیوں گئے تھے اور اب تمہارا دوست کہاں
ہے؟'' سانول نے گہری سانس لی ''پیرل کو اُس کے باپ نے اگلے ہفتے ہی شہر بھجوا دیا تھا، کیوں کہ اُسے ڈر تھا
کہ یہاں اُس کی جان کو خطرہ ہو سکتا ہے۔'' اب میری بے چینی عروج پر پہنچ چکی تھی۔ ''خدا کے لیے یہ پہیلیاں
بجھوانا بند کرو اور مجھے پوری بات بتاؤ۔'' سانول نے غور سے میری جانب دیکھا۔ ''کبھی کبھی مجھے تم وہ نہیں لگتے
جو تم ہو...... لیکن پتا نہیں پھر بھی جانے کیوں تم پر اعتبار کرنے کو دل کرتا ہے۔ ٹھیک ہے، میں تمہیں پوری بات
بتاتا ہوں۔''

سانول نے ایک بار پھر اچھی طرح اطمینان کیا کہ ٹیلے کے آس پاس صحرا میں کوئی دوسرا ہماری گفتگو سننے
کے لیے موجود نہ ہو۔ پھر اُس نے دھیمے انداز میں بھید کھولنا شروع کیا۔ میں دم بخود سا بیٹھا سنتا رہا۔ سانول
کے مطابق وہ اور پیرل اُس رات گھر والوں سے چھپ کر قریبی قصبے میں نوٹنکی دیکھنے کے لیے گئے ہوئے تھے۔
واپسی پر انہیں دیر ہو گئی اور آدھی رات کے وقت جب وہ بستی کی طرف لوٹ رہے تھے تو بستی کی مشرقی سمت
جہاں صحرا میں کچے گھر دُور دُور فاصلے پر بنے ہوئے ہیں اور جن میں سے ہر گھر کے آگے کچا آنگن اور پھر آدھی
کچی چار دیواری کی آڑ بنائی گئی ہے، وہاں ایک گھر کے قریب انہیں چند سائے لپکتے نظر آئے۔ سانول اور اُس کا
دوست ڈر کر وہیں دبک کر بیٹھ گئے اور پھر چند لمحوں بعد یہ ہلچل ختم ہوئی تو وہ جلدی جلدی اپنے گھروں کو
ٹے۔ دو دن بعد یہی بوڑھا بڑھیا کال گڑھ پہنچے اور انہوں نے اپنی سکینہ کی تلاش کی دہائی میں ہر دروازے پر
ستک دینا شروع کر دی۔ اِسی تلاش میں وہ سانول کے دوست پیرل کے در تک بھی گئے۔ پیرل کا باپ ایک
کھوجی ہے، لہٰذا انہوں نے اپنی نواسی کے کھوج کی التجا بھی کی۔ میں نے کھوجی لفظ پر سانول کو ٹوکا۔ ''یہ کھوجی
لیا ہوتا ہے......؟'' سانول نے حیرت سے میری جانب دیکھا ''کیا تمہیں کھوجی کا نہیں پتا۔ یہ تو بڑے گنی لوگ
وتے ہیں۔ ان کے باپ دادا سے یہ فن اُن کے اندر نسل در نسل چلتا ہے۔'' سانول نے مجھے بتایا کہ کھوجی وہ
وتا ہے جو زمین پر پڑے نشانات کے ذریعے گاؤں میں ہوئی کسی بھی واردات کا سراغ لگانے میں مدد کرتا

ہے۔ان میں سے کچھ لوگوں کی حسیات تو اتنی تیز ہوتی ہے کہ وہ صرف عورت یا مرد کے جسم یا کپڑوں کی بُو پر کھوج کر سراغ نکال سکتے ہیں۔کھوجی اگر اعلیٰ نسل کا ہو تو وہ زمین پر پڑے نشان دیکھ کر یہ بھی بتا سکتا ہے کہ یہ پاؤں کا نشان کسی عورت کا ہے یا مرد کا، بچے کا ہے یا کسی بوڑھے کا۔عورت کا ہے تو کیا وہ جوان تھی یا بوڑھی۔حتیٰ کہ عورت کے حاملہ یا غیر حاملہ ہونے کا سراغ بھی، وہ مٹی پر پڑے انہی بے جان نشانوں سے ڈھونڈ نکالتے تھے۔اس ساری جمع تفریق اور نشان پہچاننے کا ایک گہرا تعلق عورت یا مرد کے وزن سے بھی ہوتا تھا اور کھوجیوں کی تربیت میں کچھ ایسے خاص کلیے شامل ہوتے تھے، جو انہیں مرد و عورت کی چال ڈھال اور رہن سہن تک کے بارے میں سراغ دے جاتے تھے۔بہر حال یہ ایک خداداد صلاحیت تھی، جو آج بھی چند مخصوص لوگوں کو حاصل ہے۔میں سانول کی بتائی ہوئی کھوجیوں کی تفصیلات میں کچھ ایسا کھویا کہ چند لمحے کے لیے سکینہ کو بھی بھلا بیٹھا۔
پھر سانول نے اپنی بات کا سلسلہ وہیں سے جوڑا کہ سکینہ کے نانا نانی پیرل کے کھوجی باپ کے سامنے بھی اپنی فریاد لیے آن پہنچے۔اُن کی گریہ وزاری سے کھوجی کا دل پسیج گیا اور اُس نے حامی بھر لی۔اگلے دن طے یہ پایا کہ کال گڑھ کے ریلوے اسٹیشن سے سکینہ اور اُس کے شوہر کے پیر کے نشان اُٹھانے کا سلسلہ شروع کیا جائے گا، کیوں کہ پہلا سراغ وہیں سے مل سکتا تھا۔لیکن کھوج اور نشان اُٹھانے کے لیے ایک بہت اہم نکتہ زمین کی ساخت بھی تھا۔کال گڑھ کا ریلوے اسٹیشن چوں کہ صحرا کے بیچوں بیچ تھا اور شدید تیز ہوا اور رات بھر چلتی آندھی تو پل بھر پہلے کے بنے نشان بھی زمین پر جمنے نہیں دیتی تھی اُوپر سے وہ ہر لحظہ سرکتی ریت۔نتیجتاً کھوجی کو ریلوے اسٹیشن کے پلیٹ فارم سے مایوس لوٹنا پڑا۔سانول نے مجھے بتایا کہ وہ، اُس کا دوست پیرل اور سکینہ کے نانا نانی بھی کھوجی کے ہمراہ ہی تھے، جب وہ ریلوے اسٹیشن سے تھکے ہارے بستی میں داخل ہو رہے تھے۔سکینہ کی نانی بار بار سکینہ کی چادر کو چومتی، اپنی آنکھوں سے لگاتی اور روتی ہوئی اُن کے پیچھے چلی آ رہی تھی کہ اچانک کھوجی کے پاؤں جیسے زمین میں گڑ کر رہ گئے۔وہ پہلے بھی سکینہ کی چادر کا اچھی طرح جائزہ لے چکا تھا لیکن اس بار اُس نے خصوصی طور پر بڑھیا سے چادر جھپٹ کر اُسے خوب اچھی طرح سونگھا اور ایک کچے مکان کے سامنے جا کر رُک گیا۔سانول اور پیرل کی رگوں میں خون کی گردش تیز ہونے لگی۔یہ تو وہی مکان تھا، جہاں تین دن پہلے رات کو انہوں نے کچھ لپکتے سائے اور کچھ گھٹی گھٹی سی آوازیں سنی تھیں۔مکان کا دروازہ بھڑا ہوا تھا لیکن آدھی کچی چار دیواری کے پار آنگن کی ویرانی اور سناٹا دیکھ کر صاف پتا چلتا تھا کہ گھر میں کوئی نہیں ہے۔صحن سے پرے لکڑی کی بلیوں والے چھت کے برآمدے میں کھلنے والے اندر کے کمروں کے دروازے بھی ادھ کھلے پڑے تھے۔شام ڈھل چکی تھی اور مغرب کے بعد کا جھٹپٹا چھا رہا تھا۔آخر سانول ہی نے سب سے پہلے ہمت کی اور دروازہ کھول کر اندر صحن میں داخل ہو گیا۔لیکن کھوجی کی تیز آواز نے اُسے اپنی جگہ کھڑے رہنے پر مجبور کر دیا۔کھوجی چلایا ''اپنی جگہ پر کھڑے رہنا سانول۔صحن کی طرف نہ جانا۔ہو سکتا ہے وہاں کوئی نشان باقی ہو۔'' سانول کے پیچھے کھوجی اور پیرل بھی دبے پاؤں اندر داخل ہو گئے۔بوڑھے جوڑے کو انہوں

نے باہر ہی روک دیا۔سانول اور پیرل دروازے کے ساتھ ہی دیوار سے چپکے کھڑے رہے۔کھوجی نے اپنے کرتے کی جیب سے لکڑی کی دو عجیب سی لمبی اور پتلی ڈنڈیاں نکالیں اور اُن سے صحن کی کچی زمین کو پھونکیں مار مار کر صاف کرنے لگا۔صحن میں اُترنے سے پہلے اُس نے ایک کام اور بھی کیا کہ اپنے جوتے اُتار دیئے اور اپنے پیروں میں مخصوص ساخت کے بنا نشان والے اُونی موزے پہن لیے۔شاید اس کا مقصد صحن کی ریتلی زمین پر اپنے پاؤں کے نشانات سے بچنا ہوگا۔میں حیرت زدہ سا سانول سے فنگر پرنٹس اُٹھانے کا یہ انوکھا واقعہ سن رہا تھا۔سانول نے بتایا کہ کھوجی نے بڑی احتیاط سے تمام صحن اور پھر دونوں کچے کمروں کی زمین پر پڑی ریت کو صاف کیا اور اس تمام عرصے میں سکینہ کی چادر کی خوشبو سے بھی مدد لیتا رہا۔پھر ایک خاص جگہ پہنچ کر کھوجی نے اپنی کلائی پر بندھی ایک خاص سفید ڈوری کھولی اور اس کی مدد سے زمین پر پڑی مٹی کو مخصوص طریقے سے یوں کھرچا کہ ڈوری کے دونوں سرے کھوجی نے اپنے ہاتھوں کے دو انگوٹھوں سے باندھ رکھے تھے اور اپنی ہتھیلیوں کو اس طرح کھول رکھا تھا کہ جب وہ اپنے ہاتھ زمین پر پھیرتا تو دھاگے کی ڈوری زمین پر رگڑ کھاتی، چند مخصوص نشان مٹی میں اُبھار دیتی۔کھوجی نے اپنا کام ختم کر کے ایک لمبی سی سانس لی اور صحن سے باہر نکل کر بوڑھے سے پوچھا ''کیا تمہاری نواسی بائیس سے چوبیس سال کی درمیانی عمر کی تھی اور کیا اس کے دائیں پاؤں میں کوئی چوٹ یا زخم تھا۔'' بوڑھے سے پہلے بڑھیا چلا اُٹھی ''ہاں ہاں! مہندی کی رات پلنگ سے اُترتے وقت اُس کے پاؤں میں موچ آ گئی تھی، اس لیے وہ کچھ تکلیف میں تھی۔لیکن تمہیں کیسا پتا؟'' کھوجی نے ایک نظر آس پاس ڈالی اور پھر آہستہ سے بولا ''اس صحن میں اور کمروں کے اندر پڑے چند نشانات سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہاں ایک بائیس تیئس سالہ نوجوان لڑکی جو اپنے داہنے پاؤں پر پورا بوجھ نہیں ڈال سکتی، موجود تھی۔ لیکن اس لڑکی کے علاوہ بھی یہاں کم از کم چار مردوں کے چلنے پھرنے کے نشانات موجود ہیں۔ہو سکتا ان میں سے ایک اس کا شوہر بھی ہو۔بہر حال ابھی تمہاری نواسی کی خوشبو اس گھر میں موجود ہے۔اب رات سر پر ہے۔ لہٰذا ہم اب کل صبح گھر کے باہر سے نشان اُٹھانا شروع کریں گے تا کہ یہ پتا چل سکے کہ یہاں سے سکینہ کس طرف گئی ہے۔'' سانول نے مجھے بتایا کہ کھوجی کے منہ سے اتنا ہی سن کر وہ بوڑھا بوڑھی اس قدر خوش ہوئے کہ اگر ان کا بس چلتا تو وہ ساری رات اِسی ویران مکان کی چوکھٹ ہی پر گزار دیتے۔بڑی مشکل سے سانول نے انہیں اس بات پر آمادہ کیا کہ ابھی صبح ہونے میں صرف چند ہی گھنٹے بچے ہیں، لہٰذا کچھ دیر مزید انتظار میں کوئی حرج نہیں۔کیوں کہ رات میں ویسے بھی کھوجی نشان نہیں اُٹھا پائے گا۔

اُن کے جانے کے بعد راستے میں کھوجی نے دبے لفظوں میں اپنے بیٹے پیرل اور سانول کو اس بات کا اشارہ دیا کہ اُسے شک ہے کہ لڑکی کو اُس کی مرضی کے بغیر اس گھر سے کہیں اور لے جایا گیا ہے کیوں کہ کھوجی نے صحن میں واضح طور پر گھسیٹے جانے کے چند نشان دیکھے تھے۔سانول نے کھوجی کو کریدا کہ اُسے اس بات کا یقین کیسے ہوا کہ جس ذی رُوح کو گھسیٹا گیا تھا وہ سکینہ ہی تھی۔کھوجی نے بتایا کہ چونکہ گھسٹتے وقت بھی لڑکی اپنے

داہنے پاؤں کا پورا وزن زمین پر نہیں ڈال پا رہی تھی اور پھر ایک مقام پر آ کر جب وہ صحن میں گر پڑی تھی تو اُس کے وزن اور مردوں کے پیروں کے نشانات اور کش مکش کے آثار اس بات کی طرف واضح اشارہ کرتے ہیں کہ اس صحن میں کوئی اَن ہونی ضرور ہوئی ہے۔ کھوجی کو وہاں زمین پر لڑکی کی ایک بالوں والی پن اور ایک ٹوٹا ہوا ناخن بھی ملا تھا۔ جو اس نے نانا نانی کو دکھائے بغیر ہی اپنے پاس محفوظ کر لیا تھا۔ بہر حال راز جیسا بھی تھا، اُسے اگلی صبح کھل ہی جانا تھا۔

سانول اتنی کہانی سنا کر چپ ہو گیا۔ میں نے بے چینی سے کروٹ بدلی۔ ''پھر اس کے بعد...... آگے کیا ہوا...... وہ بھی تو بتاؤ نا......'' لیکن سانول خاموش ہی رہا۔ میں نے اُسے جھنجھوڑا تو وہ جیسے ہوش میں آیا۔ ''اس کے بعد کی کہانی بے حد مختصر ہے۔ میں اگلی صبح پیرل کے گھر پہنچا تو وہ دونوں بوڑھا بوڑھی پہلے ہی سے کھوجی کے دروازے پر نظریں جمائے بیٹھے تھے، لیکن دروازے پر پڑا موٹا سا تالا ہم تینوں کا منہ چڑا رہا تھا۔ تین دن تک سکینہ کے بدنصیب نانا نانی کھوجی کے بند در ہی پر پڑے رہے اور جب چوتھے دن وہ لوٹا تو پیرل اُس کے ساتھ نہیں تھا۔ ہمارے پوچھنے پر اُس نے گول مول سا جواب دے کر ہمارے منہ بند کروا دیے کہ بڑے شہر میں اُس کی خالہ نے کسی بنگلے میں چوکیدار کی نوکری ڈھونڈ نکالی تھی، لہٰذا اُسے جلدی میں پیرل کو لے کر جانا پڑا۔ سکینہ کی تلاش کے سلسلے میں بھی وہ بالکل ہی سرد رویے کا اظہار کرتا رہا کہ اب اتنے دن بعد کہاں کوئی نشان بچا ہوگا۔ البتہ بڑھیا کی حد سے زیادہ آہ و زاری سے تنگ آ کر وہ دو گھڑی کے لیے ہمارے ساتھ اُس ویران مکان تک چلا گیا، لیکن کچھ دیر باہر میدان کی خاک چھاننے کے بعد حتمی اعلان کر دیا کہ روزانہ کی چلتی آندھی اور تیز ہوا سے آس پاس کا ہر نشان مٹ چکا ہے لہٰذا اب یہاں سکینہ کی تلاش لاحاصل ہوگی۔ بہتر ہوگا کہ اس کے چاہنے والے کوئی دوسرا ذریعہ اختیار کریں۔'' سانول نے بات ختم کر کے کچھ اس طرح میری جانب دیکھا، جیسے اُسے خود بھی اس نامکمل داستان کے انجام سے شدید کوفت ہوئی ہو۔

''لیکن کھوجی نے ایسا کیوں کیا۔ تم نے اُس سے کچھ تو پوچھا ہوتا۔'' سانول نے مایوسی سے سر ہلایا۔ ''کھوجی نے اُس دن کے بعد سے اپنے لب کچھ اس طرح سے سی لیے ہیں کہ اب وہ شاذ و نادر ہی کسی سے کوئی بات کرنے کے لیے منہ کھولتا ہے۔ نہ جانے پیرل کو بھی اس نے کہاں بھیج دیا ہے۔ میں تو گزشتہ چھ مہینوں سے اپنے جگری یار کی شکل دیکھنے کے لیے بھی ترس گیا ہوں۔'' ہم نے ساری رات باتوں میں گزار دی تھی۔ بستی کی جانب سے اذان کی آوازیں بلند ہونے لگیں تو میرے ذہن میں اچانک ہی ایک خیال کسی کوندے کی طرح لپکا۔ ''کیا ہم اس وقت اُس کھوجی کے گھر جا سکتے ہیں؟'' سانول میری بات سن کر اُچھل ہی تو پڑا۔ ''اس وقت...... کھوجی کے گھر، کیوں خیر تو ہے۔ وہ کبھی زبان نہیں کھولے گا۔ اپنا وقت ضائع مت کرو، عبداللہ۔''

''میرا وقت اتنا قیمتی نہیں ہے۔ چلو دیر نہ کرو، مجھے روشنی ہونے سے پہلے واپس مزار بھی پہنچنا ہے، ورنہ سلطان بابا پریشان ہوں گے۔''

کچھ دیر بعد ہی ہم بستی کی ٹیڑھی میڑھی گلیوں سے ہوتے ہوئے ایک پرانے سے بوسیدہ مکان کے دروازے تک پہنچ چکے تھے۔ سانول کی تیسری دستک پر اندر سے کسی بوڑھے کے کھانسنے کی آواز سنائی دی اور پھر کوئی چپل گھسیٹتے ہوئے دروازے کی جانب بڑھا۔ دروازہ کھلا اور ایک بوڑھا ہاتھ میں لالٹین تھامے سر باہر نکال کر کچھ گھبرائے ہوئے لہجے میں بولا، ''اس وقت کون ہے بھئی......'' دفعتاً اُس کی نظر پہلے سانول اور پھر مجھ پر پڑی اور وہ ہڑبڑا کر بولا ''تم......؟؟''

رُوح کا عکس

مجھے اس بوڑھے کھوجی کی بڑبڑاہٹ پر مزید حیرت ہوئی۔ ''آپ مجھے جانتے ہیں......؟'' ''ہاں......اُس دن تمھیں ہیڈ ماسٹر کے ساتھ بستی کے بازار میں دیکھا تھا تم مزار کے نئے مجاور ہونا......لیکن اس طرح منہ اندھیرے میرے دروازے پر......سب ٹھیک تو ہے نا؟'' اب سانول نے بات سنبھالی۔ ''ہاں چاچا! سب ٹھیک ہے۔ اس کا نام عبداللہ ہے۔ میری اس سے بہت اچھی دوستی ہو گئی ہے۔ یہ تم سے ملنا چاہتا تھا۔ سو میں اسے یہاں لے آیا۔'' کھوجی کے تاثرات سے صاف ظاہر تھا کہ اسے سانول کی یہ ''خدائی خدمت گاری'' ایک آنکھ نہیں بھائی۔ لیکن وہ چپ رہا اور بادل نخواستہ اس نے ہمیں اندر آنے کا اشارہ کیا اور سانول صحن میں پڑی جھلنگا سی چارپائی کی پائنتی پر ٹک گیا۔ باہر گلی میں اکا دُکا نمازیوں کے کھنکھارنے اور چلنے کی آوازیں آنے لگی تھیں۔ میں نے مزید وقت ضائع کیے بغیر براہ راست سوال داغ دیا۔ ''آپ سکینہ کے بارے میں کیا جانتے ہیں؟'' میرا سوال سن کر کھوجی بوڑھے کے ہاتھ سے لالٹین گرتے گرتے بچی اور وہ سانول کی طرف دانت پیس کر بولا۔ ''اچھا...تو یہ تمھاری شرارت ہے، بدمعاش لڑکے۔ اِسی لیے میں نے پیرل کو بھی تمہارے سائے سے دُور بھجوا دیا تھا، لیکن تم اب بھی اپنی حرکتوں سے باز نہیں آتے۔ نکل جاؤ تم دونوں یہاں سے......میں پہلے بھی ہزار مرتبہ کہہ چکا ہوں کہ مجھے اس لڑکی کے بارے میں مزید کچھ نہیں پتا۔'' میں اپنی جگہ بیٹھا رہا۔ ''سانول نے مجھے ایسا کچھ نہیں بتایا جس سے آپ کسی مصیبت میں پڑ جائیں۔ میں نے خود سکینہ کو صحرا میں دیکھا ہے۔''

یہ دوسرا دھماکا تھا جو عین کھوجی کے سر پر کسی بم کی طرح پھٹا۔ ''کیا......؟ تم نے اُس لڑکی کو دیکھا ہے۔ مگر کیسے۔ میرا مطلب ہے کہ پھر تم مجھ سے اس کا پتا کیوں پوچھ رہے ہو۔ جا کر اُسی سے پوچھ لو نا۔'' میں کھوجی کے سامنے جا کھڑا ہوا۔ ''وہ مجھے صرف چند لمحوں کے لیے ایک جھلک کی طرح نظر آئی اور پھر غائب ہو گئی لیکن آپ اس کے بارے میں ضرور کچھ ایسا جانتے ہیں جس سے مجھے اُس کی کھوج میں کچھ مدد مل سکے۔ لیکن شاید آپ کچھ بتانا نہیں چاہتے۔'' کھوجی غصے سے بپھر گیا۔ ''کتنی دفعہ کہوں کہ مجھے اُس کے بارے میں کچھ نہیں پتا۔ اب تم دونوں یہاں سے چلتے بنو۔ اپنی جوانی پر نہیں تو میرے بڑھاپے پر کچھ رحم کھاؤ۔'' کھوجی کے حتمی انداز سے صاف ظاہر تھا کہ اب وہ اس مدعا پر مزید کوئی بات نہیں کرے گا۔ وہ صحن کا دروازہ کھولے کھڑا ہماری روانگی کا انتظار کر رہا تھا۔ سانول نے مجھے چلنے کا اشارہ کیا۔ میں نے دروازے کی طرف قدم بڑھائے تو کھوجی

دروازے سے ہٹ کر ایک طرف ہو گیا۔ میں نے پلٹ کر اُس کی جانب دیکھا۔ ''ٹھیک ہے......آپ کہتے ہیں تو میں چلا جاتا ہوں۔ لیکن ایک بات یاد رکھیے گا کہ آپ کے پاس یہ فن اور یہ خداداد صلاحیت قدرت کی ایک امانت ہے اور آپ نے امانت میں خیانت کی ہے۔ اُوپر والے نے آپ کا اندر اس لیے روشن کیا کہ آپ دوسروں کو اندھیرے میں راستہ دکھائیں اور اُن کی مدد کریں لیکن آج آپ نے اپنے فرض اور کام سے انصاف نہیں کیا۔ مجھے ڈر ہے کہ یہ بے ایمانی آپ کی آنے والی نسلوں کے اندر سے یہ وجدان و صلاحیت ختم نہ کر دے۔'' میں بات ختم کر کے واپسی کے لیے پلٹا تو کھوجی ہیجانی انداز میں چلایا۔ ''نہیں میں نے اپنے فن کے ساتھ کبھی بے ایمانی نہیں کی......لیکن بعض دفعہ مصلحت بھی آجاتی ہے۔ میں ایک غریب انسان ہوں اور میری ساری پونجی میرا جوان بیٹا پیرل ہے۔ مجھے اپنی کوئی فکر نہیں۔ پر اُسے اگر کچھ ہو گیا تو میں جیتے جی مر جاؤں گا......'' سانول نے حیرت سے پہلے میری طرف دیکھا۔ میں نے یہ آخری کوشش اِسی اُمید پر کی تھی کہ شاید کھوجی کے دل و دماغ پر جمی کچھ برف پگھلے۔ ہر فرض شناس کاریگر کی طرح وہ اپنے فن اور ہنر پر آیا الزام برداشت نہیں کر سکا اور تلملا کر بول اُٹھا۔ میں نے اُسے تسلی دی۔ ''زندگی اور موت خدا کے ہاتھ میں ہے۔ میں آپ سے کہیں زیادہ کمزور اور اس علاقے میں صرف ایک اجنبی ہوں لیکن پھر بھی اس لڑکی کی کھوج میں آپ تک چلا آیا۔ کیا آپ کو ان بدنصیب اور لاچار بوڑھوں پر ترس نہیں آتا جو اپنی زندگی کے آخری دن یوں اس تپتے صحرا کی جلتی ریت چھانتے ہوئے گزار رہے ہیں۔ ان دنوں میں تو انہیں اپنے گھر کے آنگن میں آرام اور سکون کی زندگی گزارنی چاہیے تھی۔ جیسے میں اور آپ گزار رہے ہیں۔ کیا آپ چاہتے ہیں کہ وہ دونوں اِسی صحرا میں سسک سسک کر اپنی جان دے دیں۔'' کھوجی نے بے بسی سے سر پٹخا۔ ''تم سمجھنے کی کوشش کیوں نہیں کرتے۔ میرے باپ دادا نے بھی انگریزی پولیس میں کھوجی کی ڈیوٹی دی ہے۔ انگریز سرکار نے میرے باپ کو اس کی خدمت کے صلے میں بڑی عزت، بڑا مان دیا۔ خود میں نے بائیس سال کھوجی کی نوکری کی ہے لیکن کبھی خود کو اتنا بے بس نہیں پایا۔ میں اپنے پیشے کی بہت عزت کرتا ہوں لیکن......'' کھوجی کچھ بولتے بولتے چپ ہو گیا۔ پھر لمبی سی سانس لے کر بولا، ''اچھا غور سے سنو......میں اگلی صبح اُس مکان کے باہر نشان اُٹھانے پہنچ گیا تھا۔ نشان اُٹھانے کا بہترین وقت صبح شبنم اور کہرے کے خشک ہونے سے پہلے ہی کا ہوتا ہے تب تک وہ بوڑھی اور بوڑھا نہیں پہنچے تھے۔ لڑکی کو گھر سے نکالنے کے بعد قریباً 30 فٹ تک گھسیٹا گیا تھا اور پھر اُسے کسی اُونٹ پر لاد دیا گیا تھا۔ بس اس جگہ سے آگے لڑکی کے جسم کے نشان ختم ہو گئے تھے۔ اب تو تم بھی سمجھ ہی گئے ہو گے کہ لڑکی کو اغوا کر کے لے جایا گیا تھا۔ میں یہ بات اگر لڑکی کے نانا نانی کو بتا بھی دیتا تو وہ بے چارے اس پردیس میں کیا کر لیتے۔ اِسی لیے میں چپ رہا اور بس......'' میں نے غور سے کھوجی کی جانب دیکھا۔ ''لیکن اُس اُونٹ کے پیروں کے نشان بھی تو کسی جانب گئے ہوں۔ آپ نے اس کا کھوج نہیں لگایا؟'' کھوجی نے خود کو جیسے ہمارے حوالے کر دیا۔ وہ بالکل ہی ہار کر بولا۔ ''وہ ایک نہیں تین اُونٹوں پر سوار ہو کر آئے تھے اور

تمام نشانات دوبارہ صحرا کی طرف ہی پلٹ گئے تھے۔'' مجھے ایک جھٹکا سا لگا۔'' تو پھر آپ نے یہ بات سکینہ ک گھر والوں کو کیوں نہیں بتائی۔'' کھوجی نے بے بسی سے سر پٹخا۔'' کیسے بتاتا، اغوا کنندگان کو پچھلی شام ہی ہمار ساری سرگرمی کی اطلاع مل چکی تھی اور صبح جب میں اُس مکان کے سامنے سکینہ کے نشان اُٹھا رہا تھا، تب ہی دو اندھیرے دو تین نقاب پوش میری بے خبری میں، میرے سر پر آ پہنچے۔ اُن کے ہاتھ میں لڑکی کے شوہر کے خو آلود کپڑے تھے جو انہوں نے میرے سامنے پھینک کر دھمکی دی کہ اگر میں نے اس معاملے میں زیادہ پھر دکھانے کی کوشش کی تو اسی رات اپنے اکلوتے بیٹے کا سر بھی اپنی چوکھٹ پر لٹکا ہوا دیکھوں گا۔ اب تم ہی بتاؤ م میں کیا کرتا؟ میں اُسی لمحے گھر پلٹا اور سب سے پہلے پیرل کو شہر چھوڑ آیا۔ بس اتنی سی کہانی ہے کہ میرے اند کھوجی ایک مجبور باپ کے سامنے آ گیا۔''

کھوجی اپنی بات ختم کر کے لمبے لمبے سانس لینے لگا، جیسے برسوں کا بھرا غبار اندر سے نکل گیا ہو۔ م سانول کو اس کے گھر چھوڑتے ہوئے مزار لوٹا تو سلطان بابا فجر کی نماز ختم کر کے سلام پھیر رہے تھے۔ انہو نے غور سے میری جانب دیکھا۔'' کیوں میاں! کہاں تک پہنچی تمہاری کھوج۔ کچھ کامیابی ہوئی یا پھر مز اُلجھنیں سمیٹ لائے ہو۔'' ہمیشہ کی طرح سلطان بابا مجھ سے پہلے میری تہہ تک پہنچ چکے تھے۔ میں نے رات تک کی تمام روداد انہیں سنا دی۔ کھوجی کی باتوں سے کچھ ایسا ظاہر ہوتا تھا کہ جیسے سکینہ کا معاملہ کسی قبائلی رشت داری کی خلش کا شاخسانہ بھی ہو سکتا ہے، کیوں کہ ان علاقوں میں لڑکی کا رشتہ نہ ملنے پر یا ٹھکرائے جانے پر ا ان ہونیاں عام تھیں۔ لیکن اُسی دن جب میں نے اکرام صاحب کے ذریعے بہانے سے سکینہ کے نانی نا کریدا تو یہ بھی محض میری خام خیالی ہی ثابت ہوئی۔ اُن کے بقول سکینہ بہت پہلے ہی اپنے شوہر رحیم بخش منسوب تھی اور بنا کسی اُلجھن کے اُن کا رشتہ ہنسی خوشی طے پایا تھا۔ دھاگے مزید اُلجھتے جا رہے تھے اور ہر جان سے میرا راستہ ایک بند گلی میں آ کر ختم ہو جاتا تھا۔ سارا دن اسی ادھیڑ بن میں گزر گیا۔ شام کو عصر کے بعد م انہی سوچوں میں گم مزار کے صحن میں بیٹھا، سورج کے جلتے گولے کو دھیرے دھیرے ریت کے ٹیلوں کے پیچ چھپتے ہوئے دیکھ رہا تھا کہ سانول ہڑبڑایا ہوا سا مزار کے احاطے میں داخل ہوا۔ میں بھی اُسے دیکھ کر چونک گیا۔'' خیریت تو ہے۔ تمھارے چہرے کا رنگ کیوں اُڑا ہوا ہے......؟'' سانول نے سر پٹخا۔ یہ لوگ مجھے سکو سے کہاں رہنے دیتے ہیں۔ نوری کے باپ نے آج میرے ابا کو اپنے گھر بلایا تھا۔ انہوں نے رشتہ کے ۔ شرط لگا دی کہ اگر لڑکا کال گڑھ میں کوئی کام نہیں کرنا چاہتا تو اُسے شہر جا کر محنت مزدوری کرنی ہوگی تا کہ سال بھر میں اپنی بیٹی رُخصت کر دیں۔ اب تم ہی بتاؤ میں یہ صحرا چھوڑ کر کہیں اور کیسے جا سکتا ہوں۔ میر بانسری کا ہر ساز تو اسی ریت سے زندہ ہے اور میری ہر دُھن اسی 'ایک' کے لیے۔ میں تو مر جاؤں گا اُس سے دُ جا کر...... مجھے تو یہاں کی ہوا میں بھی اُس کی خوشبو محسوس ہوتی ہے۔ کسی دوسری فضا میں تو میری سانس ہی گھ جائے گی۔'' میں چپ چاپ سانول کو اپنے زخم اُدھیڑتے دیکھتا رہا۔ ال کیمسٹ میں پاؤلو نے غلط لکھا ہے؟

'' جب تم کسی کو چاہتے ہو تو کائنات کی ہر چیز تمہیں ملانے میں جٹ جاتی ہے۔'' اگر آج وہ میرے سامنے موجود ہوتا تو میں اُسے بتاتا کہ جب ہم کسی کو چاہنے لگتے ہیں تو پوری کائنات ہمیں جُدا کرنے کی سازش میں جٹ جاتی ہے۔ ہمارے خلاف منصوبے بنانے لگتی ہے، ہمیں برباد کر دیتی ہے۔ سانول اور نوری کے خلاف بھی سازشیں شروع ہو چکی تھیں۔ محبت بھلا ہمیں کب چین کے دو سانس لینے دیتی ہے۔ جلد ہی ہماری سانسیں گھونٹنے کے لیے آس پاس کی فضا میں جُدائی کا زہریلا دُھواں بھر دیتی ہے۔ ہماری آنکھیں جلنے لگتی ہیں۔ اس عشق کو شاید خشک آنکھیں پسند ہی نہیں۔ وہ انہیں ہر لمحہ بہتا ہوا دیکھنا چاہتا ہے۔ آج سانول کی آنکھیں بھی عشق کی اس سدا سے پیاسی زمین کو سیراب کر رہی تھیں۔ میں نے اُس سے آگے کے منصوبے کے بارے میں پوچھا تو وہ ہٹ دھرمی سے بولا۔'' میں کہیں نہیں جاؤں گا۔ صحرا میں کسی کا ریوڑ چرا کر گزارا کر لوں گا۔ کاش کال گڑھ میں قلعہ داروں کی غلامی کے علاوہ بھی کوئی دوسرا روزگار ہوتا تو آج میں اتنا بے بس نہ ہوتا۔'' مغرب سے کچھ پہلے سانول واپس لوٹ گیا۔

اندھیرا ہونے سے کچھ دیر قبل '' کالا'' بھی مزار کے باہر آ کر مخصوص غراہٹ سے مجھے بلانے لگا۔ اُس کا زخم دھیرے دھیرے بھرنے لگا تھا۔ چال میں بھی کچھ توازن آ گیا تھا۔ وہ انتہائی حد تک سدھایا ہوا کتا تھا۔ اُس نے پہلے دن ہی محسوس کر لیا تھا کہ میں اُس سے اپنے کپڑے مس کرنے میں احتیاط سے کام لیتا ہوں۔ تب ہی شروع دن سے وہ اپنی شکر گزاری کا اظہار بھی کچھ فاصلے سے کرتا تھا۔ کالے کے جانے کے بعد میں پھر اس ویران مزار کی منڈیر کے قریب آ بیٹھا۔ جانے وہ کس کا مزار تھا۔ اندر کمروں میں بنی ایک گمنام قبر کے اُوپر کسی نے پھولوں کی جو آخری چادر چڑھائی تھی، اب اس کے پھول بھی خشک ہو کر ہوا کے ساتھ اِدھر اُدھر بکھرے جاتے تھے۔ سلطان بابا اندر سے نکلے اور مجھے یوں گم صم بیٹھا دیکھ کر میری طرف آ گئے۔'' کیا سوچ رہے ہو میاں! کبھی اپنے اندر کی اس وحشت کو لگام بھی دے دیا کرو۔ جنوں حد سے بڑھ جائے تو دیوانگی میں تبدیل ہو جاتا ہے۔'' میں نے اُن کی جانب براہِ راست دیکھنے سے گریز کیا۔'' آپ میرے لیے دعا کیوں نہیں کرتے۔ نصف جنوں سے مکمل دیوانگی کہیں بہتر ہے۔ میں خود اپنے اندر کی اس پل پل بڑھتی بے چینی سے بہت تنگ آ گیا ہوں۔'' سلطان بابا مسکرا دیئے۔'' اپنے اپنے مقدر کی بات ہے۔ کسی کو خرد راس آئے تو کسی کو جنوں۔ اب دیکھو عبداللہ کے مقدر میں دیوانگی ہے یا فرزانگی؟ انہوں نے میری نظروں کے تعاقب میں مزار کے گنبد پر نگاہ ڈالی اور پھر کچھ دیر بعد بولے۔'' بہادر شاہ ظفر کو پڑھا ہے؟'' میں نے چونک کر انہیں دیکھا۔'' کون؟ وہ آخری مغل شہنشاہ...... نہیں۔ بس اُس کی شاعری کے بارے میں یونیورسٹی میں تھوڑا بہت سن رکھا تھا۔'' سلطان بابا نے مزار کے گنبد کی طرف اشارہ کیا۔'' شاید اُس کا یہ قطعہ بھی ایسے ہی کسی مزار کے لیے ہوگا۔ سنو اور اسے اپنی زندگی سے جوڑ کر دیکھو۔ یہ ہم سب پر یکساں لاگو ہوتا ہے۔

نہ کسی کی آنکھ کا نور ہوں
نہ کسی کے دل کا قرار ہوں
جو کسی کے کام نہ آ سکا
وہ ایک مشت غبار ہوں
پڑھے فاتحہ کوئی آئے کیوں
کوئی چار پھول چڑھائے کیوں
کوئی آ کے شمع جلائے کیوں
میں وہ بے کسی کا مزار ہوں

جانے اس قطعے میں کیا بات تھی۔ مجھے یوں لگا جیسے میرا دل بہت دیر کے لیے ڈوب سا گیا ہے۔ مجھے یوں لگا جیسے بہادر شاہ ظفر نے خاص میرے لیے یہ سطریں کہی ہوں گی۔ خود میری حالت بھی تو دن بدن کسی ایسے مزار جیسے ہی ہوتی جا رہی تھی۔ رات ڈھلتے ہی صحرا کی طرف سے سانول کی بانسری کی آواز فضا کے دوش پر بکھرنے لگی۔ لیکن آج اُس کی تان میں کچھ عجیب ہی کسک اور کرب تھا۔ یہ محبت کس قدر قابض اور زور آور ہوتی ہے کہ ہمارے ساز اور ہماری تانیں بھی اُسی کے تابع ہو جاتی ہیں۔ آج میں سانول کو اس کی اپنی آگ میں جلنے کے لیے تنہا چھوڑنا چاہتا تھا۔ ویسے بھی جانے مجھے ایسا کیوں لگ رہا تھا کہ یہ گرم حبس زدہ رات مجھ پر کسی نئے روپ میں کھلنے والی ہے۔ شاید میرے اندر کہیں یہ خواہش شدید طور پر انگڑائیاں لے رہی تھیں کہ میں کسی بھی طرح ایک بار پھر سکینہ کی ایک جھلک دیکھ سکوں۔ اس بار میں نے پہلے ہی سے خود کو ذہنی طور پر تیار کر رکھا تھا کہ میں اُسے نظروں سے اُوجھل نہیں ہونے دوں گا۔ میں اندھیرے میں باہر صحرا پر یوں نظریں گاڑے بیٹھا تھا جیسے ابھی یہ سیاہ پردہ پھاڑ کر کوئی معجزہ رُونما ہونے والا ہو۔ جانے کتنی دیر یونہی گزر گئی۔ کئی بار میری آنکھیں نیند سے بوجھل ہو کر بند ہوئیں اور ایک آدھ بار مجھے جھونک بھی آئی، لیکن رات کا کالا پردہ میرے مقدر کی طرح بند ہی رہا۔ صبح سے کچھ پہلے میں تھک کر اندر کمرے میں جانے کے لیے اُٹھ کھڑا ہوا اور تب ہی ایک عجیب سی آواز میرے کانوں سے ٹکرائی۔ شاید اُونٹوں کا کوئی قافلہ صحرا سے گزر رہا تھا۔ ہاں...... یہ قافلے کی بجتی جرس کی آواز ہی تھی۔ لگتا تھا کہ بہت سے اُونٹوں کے گلے میں بندھی گھنٹیاں بج رہی ہوں۔ رفتہ رفتہ آواز قریب آنے لگی۔ میں دم بخود سا کھڑا انتظار کرتا رہا۔ میں نے سن رکھا تھا کہ صحرا میں قافلے صبح منہ اندھیرے سے بھی پہلے روانہ ہوتے تھے، کیوں کہ مسافر شب کو اُٹھتے ہیں...... جو جانا دُور ہوتا ہے......" لیکن یہ کیا...... قافلے کی آواز اب بالکل قریب آ چکی تھی اور مجھے اب بھی کچھ نظر نہیں آ رہا تھا۔ میں بھاگ کر مزار سے باہر کھلے صحرا میں ایک اُونچے ٹیلے پر چڑھ گیا۔ دُور دُور تک وہی ازلی ویرانی اور سناٹا چھایا ہوا تھا۔ لیکن

میں اپنی سماعتوں کا کیا کرتا......؟ میرے کانوں میں اب تک قافلے کا شور گونج رہا تھا اور ان آوازوں کی ہر ہر ایک تفصیل مجھے کسی ریڈیو پر پیش کیے جانے والے کھیل کی طرح سنائی دے رہی تھی۔ دُور کوئی بچہ رو رہا تھا۔ اُونٹوں کے کوہانوں پر رکھا سامان حرکت کی وجہ سے کھڑک رہا تھا۔ کوئی دُور سے ہانکا لگا رہا تھا۔ کچھ لوگ سرگوشیاں کرتے ہوئے آگے بڑھ رہے تھے، اُونٹ خرخرا رہے تھے۔ حتیٰ کہ اُن کے ریت پر پڑنے والے پاؤں کی دھمک بھی مجھے علیحدہ سنائی دے رہی تھی۔ کچھ پازیبوں کی جھنکار، کچھ شریر بچوں کے ہنسنے اور دوڑنے کی آوازیں اور قافلے کے پہرے داروں کی وقفے وقفے سے سب کو ہوشیار کرنے کے لیے نقارے پر چوٹ کی آواز تیز ہوگئی۔ ریت کا ایک طوفان سا اُٹھا اور میں اُسی ٹیلے پر کھڑا ریت کا حصہ بنتا گیا۔ میری آنکھیں ریت کی چبھن سے جلنے لگیں اور مجھے یوں محسوس ہونے لگا کہ وہ قافلہ اس وقت میرے آس پاس، بلکہ میرے اندر سے ہو کر گزر رہا ہے۔ سرگوشیاں تیز ہوگئیں۔ جیسے لوگ مجھ سے بچ کر دائیں بائیں سے گزر رہے ہوں لیکن میری جلتی ہوئی آنکھوں کے پردے پر اب بھی صرف میلوں دُور پھیلتا ہوا ویران صحرا ہی اپنا عکس بکھیر رہا تھا۔ دور دُور تک کسی ذی رُوح کا نام و نشان تک نہیں تھا۔ یا خدا...... یہ کیا ماجرا تھا؟ یا تو میری سماعتیں ناکارہ ہو کر خود آوازیں تخلیق کرنے لگی تھیں یا پھر میری بصارت نے ہمیشہ کے لیے میرا ساتھ چھوڑ دیا تھا۔ کیا میری دیوانگی کا آخری دور شروع ہو چکا تھا۔ قافلہ جانے کب کا گزر چکا تھا۔ ریت کا طوفان تھم گیا تھا۔ لیکن میرے اندر اُٹھا طوفان کسی ریت کے جلتے بگولے کی طرح تیز سے تیز تر ہوتا جا رہا تھا۔ میں کون تھا، یہاں کیا کر رہا تھا......؟ میرے ساتھ ہی یہ ساری ان ہونیاں کیوں ہوتی تھیں۔ کیا واقعی میرا خرد سے جنوں کا سفر مکمل ہونے کو تھا۔ آخر کیا حد تھی میرے اس سفر کی۔ میری وحشت کا اختتام کہاں تھا۔ میں دوسرے عام لوگوں کی طرح اپنی محبت کو پانے کے بعد اس کے ساتھ اپنی باقی زندگی آرام اور سکون سے کسی گھر کے آنگن میں کیوں نہیں گزار سکتا تھا۔ میری رُوح نے تو کب سے اپنی سپردگی کا اختیار مجھے دے دیا تھا، پھر بھی میں ان ویرانیوں کی خاک کیوں چھان رہا تھا۔ میں جانے کتنی دیر اس ٹیلے پر کھڑا ریت میں گھلتا رہا اور مجھے اس بات کی خبر بھی نہیں ہوئی کہ جانے کب سے تہجد کے لیے جاگے سلطان بابا مزار کے صحن میں نکلے اور مجھے یوں گم صم کھڑا دیکھتے رہے۔ میں تب چونکا، جب انہوں نے میرے کاندھے پر ہاتھ رکھا۔ انہیں دیکھتے ہی میرے اندر کا آتش فشاں پھٹ پڑا۔ میں نے وہ سارے سوال، جو کچھ دیر پہلے میرا اندر کاٹ رہے تھے، اُن کے سامنے اُگل دیئے اور قافلے کا سارا احوال بھی بیان کر دیا۔ میرے سوال سن کر سلطان بابا بہت دیر تک خاموش رہے۔ لیکن انہیں اس بات کا احساس ہو گیا تھا کہ اب کچھ جواب ناگزیر ہو چکے ہیں۔ بہت دیر بعد وہ بولے تو اُن کا لہجہ تھما ہوا سا تھا۔ "میں جانتا ہوں تم کس دور سے گزر رہے ہو۔ ایک بات ہمیشہ یاد رکھنا کہ کچھ رستے اور منزلیں صرف کچھ خاص لوگوں کے لیے ہوتی ہیں۔ قدرت نے تمہارے لیے عام ڈگر سے ہٹ کر کوئی راہ چنی ہے، تو ضرور تم میں کچھ خاص ہو گا۔ لیکن قصر سلطانی کے گنبد کو چھوڑ کر ہمالے کی چوٹی پر بسیرا کرنے کے لیے اپنی اُڑان بھی اُونچی رکھنی پڑتی

ہے۔ جان جوکھم میں ڈالنی ہی پڑتی ہے۔ یادرہے ابھی تمہیں ایسے مزید عذاب جھیلنے ہوں گے۔'' میں دہ
چلا اُٹھا۔ ''لیکن میں ہی کیوں......؟'' وہ مسکرائے۔ ''میں نے کہا نا...... کچھ چناؤ قدرت صرف اپنے
میں رکھتی ہے۔ اس نے تمہیں کیوں چنا۔ اس کا جواب تو میرے پاس بھی نہیں ہے۔ لیکن فیصلہ تو اب
تمہارے اپنے ہاتھ ہے۔ تم چاہو تو ابھی اِسی لمحے یہ سب ترک کر کے واپس پلٹ سکتے ہو۔ تم پر کوئی جبر
تم سے پہلے بھی جانے کتنے پلٹے ہوں گے۔ تم تو پھر بھی اس سفر میں بہت دُور تک چلے آئے ہو۔ کئی ا
ہیں جو قدرت کی طرف سے واضح اشارہ ملنے اور چنے جانے کے باوجود پہلا قدم تک نہیں اُٹھا سکے اور ر
کی بھیڑ میں گم ہو کر رہ گئے۔ یہ تمہاری ہی ہمت تھی کہ تم اس راہ کا ہر کانٹا چنتے ہوئے آج اس مقام تک
ہو۔ اتنا زادِراہ بھی ایک زندگی کے لیے کافی ہے۔ جانا چاہو تو سلطان تمہیں خوشی سے رُخصت کرے گا۔
نے بے بسی سے سر پٹخا۔ ''آپ جانتے ہیں۔ واپسی میرے بس میں نہیں ہے۔ نہ ہی میری ایسی کوئی خو
ہے۔ لیکن میں خود کو اس بوجھ سے ٹوٹتا ہوا محسوس کرتا ہوں۔ اتنا ظرف نہیں ہے مجھ میں، جس کی توقع ق
کیے بیٹھی ہے۔'' انہوں نے میرا کاندھا دبایا۔ ''اپنے ظرف کے پیمانے کا حساب خود نہیں کیا جاتا۔
آزمانے والے پر چھوڑ دو۔'' میں نے تھک کر ہتھیار ڈال دیئے۔ ''لیکن یہ بھرے پرے قافلے کی صدائیں
کیا ماجرا تھا......؟'' سلطان بابا نے گہرا سانس لیا۔ ''صحرا کا اپنا فسوں اور اپنا ہی جادو ہوتا ہے، البتہ ہو سکا
کہ ابھی کچھ دیر پہلے یہاں سے واقعی کوئی قافلہ گزرا ہو۔ جب سے انسانی بستیاں بے تحاشا بڑھنے لگی
ایسے صحرا اور ویرانے ہی جنات اور دوسری مخلوقات کی آماج گاہ بنتی گئیں۔ ہماری بصارت کا پردہ کسی
سے روشنی کی لہر ٹکرانے کا محتاج ہے، لیکن اگر دوسری مخلوق کثیف نہ ہو، بلکہ لطیف ہو یعنی ایسے مادے سے
کہ جس کے اندر سے روشنی بنا ٹکرائے گزر جائے تو ہماری آنکھ کے پردے پر اس شے کی تصویر نہیں بن
گی۔ ابھی کچھ دیر پہلے تمہارا واسطہ بھی کسی ایسی مخلوق کے قافلے سے پڑا تھا۔ عام حالات میں ہم انسانو
سماعت بھی ان کی آواز کی لہروں کو پکڑ نہیں سکتی، لیکن تم نے اگر اُن کی دنیا کی آوازیں سنی ہیں تو اس کا م
ہے خاص اس لمحے میں قدرت نے تمہاری سماعت کا پردہ اتنا حساس کر دیا تھا کہ تم نے اُن غیر مرئی صدا
بھی سن لیا۔ دھیان رہے کہ یہ سارا معاملہ فریکوئنسی کا ہے۔ ہماری بصارت اور سماعت کی فریکوئنسی اُن کی د
فریکوئنسی سے جُدا ہے۔ لہٰذا ہم انہیں عام حالات میں دیکھ یا سن نہیں سکتے۔ ہاں البتہ کچھ خاص لوگ
ارتعاش تک بھی پہنچ جاتے ہیں جہاں ان کے لیے وہ خاص فریکوئنسی پکڑنا بھی ممکن ہو جاتا ہے۔ میری د
کہ دو جہانوں کا مالک تمہیں اپنے خاص بندوں میں ہمیشہ کے لیے شامل کر دے۔''

میں حیرت سے سلطان بابا کی بات سنتا رہا اور اچانک ہی میرے ذہن میں بجلی سی لپکی۔ ''اگر تصویر ک
ہماری بصارت کے پردے پر روشنی کی لہر کے کسی کثیف مادے سے ٹکرانے ہی سے ہے تو پھر اس کا مطلب
کہ سکینہ کا وجود بھی اسی صحرا میں کہیں موجود ہے۔ کیوں کہ میں نے اُس کی واضح تصویر دیکھی ہے۔ دھندلی

ضع انسانی خدوخال کے ساتھ۔ مطلب یہ ہے کہ سکینہ ہمارے آس پاس ہی کہیں موجود ہے......؟''

''ہاں......ہو بھی سکتا ہے کہ یہ وہی سکینہ ہو۔ لیکن تم ایک بات بھول رہے ہو کہ ٹھیک اسی وقت تمہارے
اتھ سانول بھی تھا، جسے وہ دکھائی نہیں دی۔ خود میں ریلوے اسٹیشن پر اُس کی جھلک سے چوک گیا تھا۔ اگر
ں سارے معاملے سے پھولوں والی وہ خاص چادر نکال دی جاتی تو یہ بھی ہو سکتا تھا کہ وہ کسی عام صحرائی لڑکی کا
لا ہو، جو صحرا میں بھٹک رہی ہے۔ لیکن اطمینان رکھو جلد یا بدیر تم اس ہیولے کی حقیقت تک بھی پہنچ جاؤ گے۔
رہے، ایک بار تم نے خود ہی ایک مفروضے کا ذکر کیا تھا۔ اگر خلا میں ماضی کی لہر زندہ رہ سکتی ہے تو پھر ماضی کی
ویر کی جھلک کیوں نہیں؟ ہو سکتا ہے جو تمہیں نظر آ رہا ہو، وہ بھی اس حال کی نہیں بلکہ ماضی کی کسی تصویر کی
ک ہو۔ اور قدرت نے ہی تمہاری سماعت کی طرح تمہاری بصارت کے پردے کو بھی چند لمحوں کے لیے یہ
ت عطا کی ہو کہ تم نے اس صحرا کے ماضی کی کوئی جھلک اس لڑکی کی تصویر کی صورت دیکھ لی ہو۔ یہاں کچھ بھی
ن نہیں کہ اس قدرت کے کارخانے میں ''جب جو ہونا ہے......تب تب سو ہوتا ہے......'' سلطان بابا
بات ختم کر کے اندر پلٹ گئے اور میں اپنی مخصوص جگہ گم صم سا کھڑا رہ گیا۔ میرا سارا وجود ایک ارتعاش سے
پ رہا تھا اور کان سائیں سائیں کر رہے تھے۔ سوال تھے کہ بڑھتے ہی جا رہے تھے اور جواب تھے کہ مستقل
ن بچائے جاتے تھے۔

اچانک صحرا کی جانب سے ایک تیز نسوانی چیخ نے میرے سارے خیالات بکھیر دیئے۔ میں گھبرا کر
۔ چیخ دوسری مرتبہ بلند ہوئی۔ سامنے مزار کے صحن میں نماز پڑھتے سلطان بابا بھی سلام پھیر کر چونکے تو مجھے
اسا لگا۔ مطلب یہ صرف میرا واہمہ نہیں تھا۔ آواز سلطان بابا نے بھی سنی تھی۔ تیسری چیخ نے مجھے جگہ کا تعین
نے کے بارے میں ہر شک سے آزاد کر دیا۔ آواز اُسی جانب سے بلند ہو رہی تھی، جہاں سانول رات بھر
ربانسری بجایا کرتا تھا۔ میں بے تحاشا اُس جانب دوڑ پڑا۔ صحرا کی ریت میں میرے پاؤں دھنسے جا رہے
۔ دُور سے میں نے اس اُونچے ٹیلے پر فجر کے جھٹپٹے میں کسی عورت کا ہیولا دیکھا، جو مسلسل نیچے کی طرف
ر چیخ رہی تھی، اور اپنی مخصوص زبان میں کسی مدد کے لیے چلا رہی تھی۔ ٹیلے کو دیکھتے ہی میری سانس رُکنے
۔ یہ وہی ٹیلا تھا جہاں سانول گزشتہ رات بانسری بجا رہا تھا۔

دشمن زندہ رہے

کچھ لمحے کے لیے تو جیسے میرے ہاتھ پاؤں ہی پھول گئے۔ جب تک میں دوڑ کر ٹیلے تک پہنچا، اُر عمر کی چرواھن کے ہاتھوں کے اشارے مجھے سمجھ آچکے تھے۔ ٹیلے کی پرلی جانب سانول بے سدھ پڑا تھ اس کے سر سے بہتا ہوا خون نہ جانے کب سے جم کر ریت کو سیراب کر رہا تھا۔ سلطان بابا بھی شاید میرے ہی صحرا کی جانب لپکے تھے۔ جس وقت میں سانول کی سانسیں ٹٹول رہا تھا، تب تک وہ بھی وہاں پہنچ چکے۔ زندگی اگر صرف سانس لینے کا نام ہے تو سانول ابھی زندہ تھا، لیکن اس کی سانسیں اُکھڑ رہی تھیں۔ جب اور سلطان بابا اُسے لے کر بستی پہنچے تو سب سے پہلے بستی کے مضافات میں بکریوں کا دودھ دوہتے، اُس گوالے کی نظر ہم پر پڑی، جسے میں پہلے بھی ریچھ کے مقابلے کے دوران جبروت کے قلعے میں دیکھ چکا تھ پھر چند لمحوں ہی میں پورا کال گڑھ سانول کے کچے آنگن میں جمع ہو چکا تھا۔ بستی کے واحد طبیب نے فو سانول کا زخم دھو کر مرہم پٹی تو کر دی اور کچھ دوائیں بھی اس کے حلق سے نیچے اُنڈیل دیں، لیکن فی ا سانول بے ہوش ہی تھا۔ بڑی مشکل سے سانول کے باپ، مجید مستری اور طبیب کی درخواست پر لوگو چھٹا۔ سانول کو ہم نے آنگن سے اندر کمرے میں پہنچایا ہی تھا کہ اکرام اللہ صاحب اور اُن کے پیچھے کا باپ ہڑبڑاتے ہوئے سے سانول کے گھر داخل ہوئے۔ وہی چند روایتی سوال "کیا ہوا؟...... کیسے ہوا کس نے کیا......؟" اور وہی ایک جواب کہ "اللہ جانے......؟" کچھ ہی دیر میں نوری بھی چند دوسری عو اور اپنی ماں سمیت صحن میں داخل ہوئی اور تیزی سے عورتوں والے کمرے کی جانب بڑھ گئی۔ پریشانی م سانول کے باپ کو سلام کرنا بھی بھول گئی تھی اور پھر برآمدے کے قریب ماں کے کہنی مارنے پر چونکی تو سے صحن میں بیٹھے مجید کو سلام کر کے اندر پلٹ گئی۔ سچ ہے کہ محبت آداب بھلا دیتی ہے۔ طبیب اپنا کام کر جا چکا تھا اور اُس کے بقول اب سانول کو دوا کے ساتھ دعا کی بھی اُتنی ہی ضرورت تھی۔ سانول کی دعا تو نور اور نوری خود سراپا دعا بنی اُسی کے گھر کے آنگن میں ماتھا ٹیکے سجدے میں پڑی تھی۔ پھر بھی قدرت کو رحم آتے تین راتیں بیت گئیں۔ سانول کی طویل بے ہوشی تیسری فجر سے کچھ پہلے ٹوٹی۔ اس اثناء میں، مِ سلطان بابا باری باری مزار سے ہو کر آتے رہے۔ اس وقت اتفاق سے میں ہی سانول کے سرہانے موج جب اُس نے دھیرے دھیرے کراہتے ہوئے آنکھیں کھول دیں۔ نوری کی دعا آخر کار فلک میں چھپ ہوئی مقام قبولیت سے جا ٹکرائی تھی۔ سانول کو صرف اتنا یاد تھا کہ وہ اُس رات بھی حسب معمول اپنی مخصو

پر بیٹھا بانسری کی تانوں سے کھیل رہا تھا کہ اچانک ہی اندھیرے سے چار نقاب پوش سائے اُس کی جانب لپکے اور پھر کھینچا تانی کے دوران کوئی کند فولادی چیز اُس کے سر سے ٹکرائی جس کے بعد سانول اپنے ہوش کھو بیٹھا۔ ان نقاب پوشوں کی تکرار سے صرف اتنا ظاہر ہو رہا تھا کہ وہ سانول کو کال گڑھ میں مزید ایک لمحہ بھی برداشت کرنے کے لیے تیار نہیں۔ لیکن کیوں؟ اس کا جواب ہم میں سے کسی کے پاس نہیں تھا۔ بہر حال اس وقت تو سانول کا ہوش میں آجانا ہی اُس کے پیاروں کے لیے غنیمت تھا۔ سانول کی دگرگوں حالت اس بات کا اشارہ تھی کہ اُسے فی الحال بستر سے اُٹھنے میں چند دن مزید لگیں گے۔ لیکن میں جانتا تھا کہ سانول زیادہ دن تک خود کو پابند نہیں رکھ پائے گا۔ شام کو جب میں مزار واپسی کے لیے اُٹھنے لگا تو اُس نے میرا ہاتھ دبا کر مجھے کچھ دیر مزید رُکنے کا اشارہ کیا۔ عیادت کے لیے آئے ہوئے چند دیہاتی جب کمرے سے باہر نکل گئے تو اُس نے دھیرے سے پوچھا "وہ آئی تھی......؟" مجھے اُس کی حالت سے زیادہ اُس کے سوال پر ہنسی آگئی۔ "کہیں اُسے بلانے کے لیے خود ہی تو اپنا سر نہیں پھوڑ ڈالا؟" میری بات سن کر وہ بھی ہنس پڑا۔ "اُسے بلوانے کے لیے تو یہ سر کاندھوں سے اُتار کر نیچے بھی رکھ سکتا ہوں۔" پھر اُس نے صحرائی زبان میں ایک مصرعہ پڑھا۔ میں نے سوالیہ نظروں سے سانول کی طرف دیکھا تو اس نے لمبی سی آہ بھرتے ہوئے مجھے ترجمہ سنایا کہ "عاشق چاہے جیسا بھی درد اُٹھالے۔ کتنی ہی گہری چوٹ کیوں نہ کھالے، دنیا والے اُس کے زخموں کو ایک ڈھونگ ہی سمجھتے ہیں۔ لیکن پھر بھی عاشق جسم پر زخموں کے داغ سجاتا ہی رہتا ہے۔ تاکہ جب کبھی محبوب سے ملاقات ہو تو اس سے داد پا سکے۔" میں حیرت سے سانول کی زبانی اس صحرائی قطعے کا ترجمہ سنتا رہا۔ کچھ چیزیں اس پوری کائنات میں کس قدر یکساں ہوتی ہیں۔ ہوا، پانی، دھوپ، بارش اور یہ محبت کا جذبہ...... صرف لفظ اور لہجہ ہی بدلتا ہے۔ باقی ہر کسک ایک سی ہی رہتی ہے۔ کائنات کے ہر ذرے کی طرح محبت بھی شاید وحدت ہی کی قائل ہوتی ہے۔ درد، تڑپ، چبھن اور کسک کی وحدت۔ رُوح کو آری سے دو حصوں میں چیر دینے کی یکسانیت، قطرہ قطرہ کر کے جان نکلنے کی مماثلت۔ جانے ہم نے دنیا کی ہر اذیت اور درد دینے والی چیزوں کے اتنے مختلف ناموں کیوں رکھ ڈالے ہیں۔ ہم ایسی سب ہی اذیتوں کا ایک ہی نام "محبت" کیوں نہیں رکھ دیتے؟

سانول بھی اس وقت اپنے سر کے زخم اور گھائل وجود کے درد سے زیادہ عشق کے زہریلے ڈنک کے اثر سے تڑپ رہا تھا۔ میں نے اُسے بتایا کہ اس کے زندگی کی طرف لوٹنے میں نوری کی منت ہی کا سب سے زیادہ دخل ہے۔ گزشتہ تین دنوں سے وہ اپنی ماں سمیت کسی نہ کسی بہانے سے سانول کے کمرے کے آس پاس ہی بھٹک رہی ہے۔ اگر چہ مردوں کی موجودگی کے سبب وہ سانول کے اتنے قریب نہ آسکی، لیکن میں نے ہر لمحہ اُس کی بے چین آنکھوں اور بے تاب رُوح کو سانول کے سرہانے ہی موجود پایا۔ شاید اب بھی یہیں قریب کسی دیوار سے پرے اپنے من کے ہاتھ اپنے مالک کے سامنے پھیلائے بیٹھی ہو۔ سانول دم بخود سا میری بات سنتا رہا۔ اس کا محبوب اس قدر قریب موجود تھا، یہ سن کر اُس کی حالت مزید ہیجانی سی ہوگئی۔ دیواروں سے پار

جھانکنے کی اتنی شدید خواہش اس سے پہلے میں نے کبھی کسی کی آنکھوں سے جھلکتی نہیں دیکھی تھی۔ لیکن دیوار کا دوسرا نام ہی رُکاوٹ، پابندی ہے اور ہم انسان خود ہی تو ایسی کئی دیواریں کھڑی کرتے ہیں۔ اپنے لیے، اپنے جذبوں کے لیے......

سانول کے گھر سے مزار کی جانب لوٹتے ہوئے جانے کیوں مجھے سکینہ کو اُٹھا لے جانے والے چار نقاب پوش یاد آتے رہے۔ ان میں اور سانول پر حملہ کرنے والے نقاب پوشوں میں کوئی ایسی مماثلت تھی جو میرے ذہن کی کنڈی ہلاتی رہی۔ کہیں وہ سانول کو بھی سکینہ کے معاملے میں میری رہنمائی کرنے کی سزا دینے تو نہیں آئے تھے۔ یہ کیسا معمہ تھا، جو سلجھنے ہی میں نہ آتا تھا۔ مزار کے صحن میں سلطان بابا تسبیح پڑھ رہے تھے۔ چند لمحوں بعد فراغت پائی تو کہنے لگے'' تمہارا دوست آیا تھا۔ میں نے اُسے روٹی ڈال دی تھی، لیکن شاید اُسے تمہاری عادت پڑ گئی ہے۔ ناراض ہو کر پلٹ گیا۔'' وہ شاید کالے کی بات کر رہے تھے۔ میں نے انہیں سانول پر حملہ کرنے والوں کے بارے میں اپنے خدشے سے آگاہ کیا تو بولے'' ہاں...... ایسا ممکن ہے...... سانول کو بھی اب احتیاط کرنی چاہیے۔ تقدیر شاید پھر بھی ایک موقع اور دے دیتی ہے، لیکن سچا دشمن کبھی نہیں۔'' میں نے اس عجیب اصطلاح پر انہیں حیرت سے دیکھا۔'' کیا دشمنی بھی خالص اور نا خالص کے پیمانے پر تولی جاتی ہے۔ کیا دشمن بھی کبھی سچا یا جھوٹا ہوتا ہے......؟'' انہوں نے دوسری تسبیح ختم کر کے مجھ پر پھونک ماری۔'' سچائی اور خالص پن کی جتنی ضرورت دشمنی کے جذبے میں ہوتی ہے اتنی تو شاید یہ دوستی میں بھی نہ ہوتی ہو۔ دشمن خالص اور معیاری نہ ہو تو اعلیٰ ظرف حریف کے لیے مقابلہ بہت مشکل ہو جاتا ہے۔ قدیم منگول نسل کے کچھ لوگ شاید آج بھی ہمارے درمیان زندہ ہیں، جو دشمنی اور انتقام کو ایک اعلیٰ جذبہ سمجھتے ہیں اور دشمن ان کے لیے جینے اور آگے بڑھنے کی تحریک کا باعث ہوتا ہے۔ اسی لیے ان کا ایک قول ان میں نسل در نسل منتقل ہوتا رہتا ہے۔'' سلطان بابا کسی آہٹ کی آواز سن کر اپنی بات ادھوری چھوڑ کر چپ ہو کر باہر صحرا کی جانب متوجہ ہو گئے۔ میں نے بے چینی سے کروٹ بدلی'' کون سا قول......؟'' سلطان بابا نے غور سے میری جانب دیکھا اور قول دہرایا'' دشمن زندہ رہے۔'' وہ اپنی بات ختم کر کے اُٹھ کھڑے ہوئے۔ میں یونہی ساکت سا بیٹھا رہ گیا۔ برآمدے کے قریب رُک کر وہ میری جانب پلٹے۔'' لیکن یاد رہے...... یہاں اس بستی میں ہمارا واسطہ شاید اعلیٰ ظرف دشمن سے نہ پڑے، لہٰذا اپنی آنکھیں کھلی رکھنا۔'' سلطان بابا اپنے کمرے کی جانب بڑھ گئے اور میں ہمیشہ کی طرح اُن کے الفاظ کی بھول بھلیوں میں کھو کر رہ گیا۔ میں آج تک محبت ہی کو طاقت ور ترین انسانی جذبوں میں شمار کرتا تھا لیکن آج میرے اندر کئی دروازے مزید کھل گئے تھے۔ واقعی، کتنی بڑی بات کہہ گئے تھے، سلطان بابا۔'' دشمن زندہ رہے۔'' جانے یہ قول دعا تھا یا بددعا۔ حسرت تھی یا نفرت کی انتہا۔ میں ساری رات کالے کا انتظار کرتا رہا لیکن وہ واپس نہیں پلٹا۔ صبح کچھ دیر کے لیے آنکھ لگی تو بھی نیند میں بے چینی تھی۔ ہمیشہ کی طرح کسی اَن ہونی کا خوف مجھ پر طاری ہونے لگا تھا۔ صبح نہ جانے سلطان بابا کو کیا سوجھی کہ خود

بول پڑے۔'' چلو میاں! تمہارے دوست کی عیادت کو ہو آئیں۔ اسی بہانے وہاں اکرام صاحب سے بھی ملاقات ہو جائے گی۔'' زیادہ تر سلطان بابا کی یہی کوشش ہوتی تھی کہ ہم دونوں میں سے کوئی ایک ہمہ وقت مزار پر موجود رہے اور ویسے بھی وہ زیادہ تر بستی کی جانب جانے سے گریز ہی کیا کرتے تھے۔ لیکن آج نہ جانے ایسی کیا خاص بات تھی کہ انہوں نے خود ہی سانول کے گھر چلنے کی فرمائش کر دی۔

ہم سانول کے گھر کے صحن میں داخل ہوئے تو کافی بھیڑ تھی۔ پتا چلا کہ سانول کے باپ نے اُس کے ہوش میں آنے کی خوشی میں شکرانے کے طور پر نیاز بانٹنے کا ارادہ کیا ہے اور اسی لیے بستی کے سب ہی مرد وہاں چلے آ رہے تھے۔ انہوں نے'' بڑے اور چھوٹے پیر صاحب'' کو بیک وقت اپنے درمیان پایا تو سب ہی خوش ہو گئے۔ کال گڑھ کی واحد جامع مسجد کے مولوی صاحب بھی کچھ دیر میں آ پہنچے۔ نیاز کے چاول ابھی دم پر تھے اور بٹنے میں کچھ دیر باقی تھی کہ بستی کے چند بزرگوں میں کال گڑھ کے سدا کے کال اور سوکھے کی بات چل پڑی۔ کسی جانب سے ایک بوڑھے نے تشویش زدہ انداز میں سب کی توجہ اس جانب دلائی کہ بستی کے آس پاس قریبی جوہڑ اور تالاب تو تین سال پہلے ہی خشک ہو چکے تھے، لیکن اب دُور دراز کے پانی کے ذخیرے بھی دھیرے دھیرے خالی ہوتے جا رہے ہیں اور اگر چند ایک دن میں علاقے میں بارش نہ ہوئی تو کال گڑھ میں پینے کے پانی کا شدید بحران پیدا ہو جائے گا۔ بوڑھے کی بات سن کر محفل میں کچھ دیر کے لیے سناٹا سا چھا گیا اور پھر سب ہی اپنی اپنی بولیاں بولنے لگے۔ کچھ لوگوں کا خیال تھا کہ قلعہ دار کی منت کر کے ان سے مزید کچھ قرض لیا جائے اور ایک آخری کوشش کے طور پر مشرقی سمت جہاں پانی ملنے کی کچھ اُمید ہے، وہاں پھر سے کنواں کھود کر پانی تلاش کیا جائے۔ لیکن اکثریت نے اس مشورے کو یک سر رد کر دیا۔ ایسی بارہا کوششیں پہلے ناکام ہو چکی ہیں اور قرض کا بوجھ پہلے ہی اتنا بڑھ چکا ہے کہ مزید ایسی کوئی سعیٔ لا حاصل، صرف وقت کے زیاں ہی کا باعث ہو گی۔ اچانک کوئی کسی کونے سے بولا'' تو پھر بڑے پیر صاحب سے درخواست کرتے ہیں کہ وہ بارش کی دعا کریں۔ اب اور کوئی چارہ نہیں۔'' اس آواز کا بلند ہونا تھا کہ سب ہی جانب سے سلطان بابا کے سامنے فریاد پیش کی جانے لگی۔ ایک شور سا مچ گیا۔ مولوی صاحب نے بھی بارش کے لیے دعا کی درخواست دائر کر دی۔ سلطان بابا نے ہاتھ اُٹھا کر سب کو خاموش کروایا اور دھیمے لہجے میں بولے'' اگر آپ سب کا یہی مشورہ ہے تو پھر دعا بھی ہم سب اجتماعی طور پر ہی کریں گے۔ آج عصر کی نماز کے بعد بڑے میدان میں ساری بستی کے مرد نمازِ استسقاء کے لیے جمع ہو جائیں۔ ہم سب پیش امام صاحب کی معیت میں باجماعت نماز ادا کر کے اللہ کے حضور اپنی درخواست پیش کریں گے۔'' سلطان بابا کی بات سن کر نوجوان طبقے نے تو زور و شور سے اُن کی ہاں میں ہاں ملائی، لیکن بزرگ کچھ خاموش ہی رہے۔ میں نے پاس بیٹھے اکرام صاحب سے آہستہ سے اس خاموشی کی وجہ پوچھی تو انہوں نے جواباً میرے کان میں جو سرگوشی کی۔ اس سے میں صرف اتنا ہی مطلب اخذ کر سکا کہ جبروت کے علم میں لائے بنا بستی کے باہر ایسا کوئی بھی عوامی جمگھٹا اس کی ناراضی کا سبب

بن سکتا ہے، لہٰذا بزرگ یہی چاہتے ہوں گے کہ قلعے داروں کو بھی باقاعدہ دعا میں شرکت کی دعوت دی جا
تب تک سلطان بابا مجھے وہاں سے اُٹھنے کا اشارہ کر چکے تھے اور یہ طے پایا تھا کہ بستی کے تمام مرد عصر کے وق
باہر والے بڑے میدان میں جمع ہو جائیں گے۔ ہم محفل کو مکھیوں کی طرح بھنبھناتے اور آپس میں سرگوشیا
کرتے چھوڑ کر وہاں سے نکل آئے۔ جانے ان میں سے کوئی بعد میں جبروت سے باقاعدہ اجازت لینے یا
میں شرکت کرنے کی درخواست لے کر قلعے کی جانب گیا یا نہیں۔ ہم بہرحال عصر سے کچھ پہلے بستی
مضافاتی میدان میں پہنچے تو دعا کے لیے اچھے خاصے لوگ موجود تھے۔ مجھے اُسی دن راستے میں سلطان بابا
بارش کے لیے خصوصی طور پر مانگی جانے والی دعا اور نمازِ استسقاء کے بارے میں بتایا اور یہ بھی کہ شاید یہ
واحد اور منفرد التجا ہے، جو سیدھی ہتھیلیوں کے بجائے ہاتھ کی پشت آسمان کی جانب بلند کر کے دعا کی صور
میں کی جاتی ہے۔ میرے لیے یہ ایک بالکل نئی بات تھی۔ بستی کے لوگوں، بشمول امام مسجد نے سلطان بابا سے
بار درخواست کی کہ وہ جماعت کی امامت کریں لیکن انہوں نے یہ کہہ کر معذرت کر لی کہ یہ بستی کی جامع م
کے امام کا حق ہے۔ بالآخر امام صاحب ہی امامت کے لیے کھڑے ہو گئے۔ سلام کے بعد سب نے ہاتھوں
پشت آسمان کی طرف کر کے دعا مانگی اور مولوی صاحب نے اپنی چادر پلٹ دی۔ دعا کے بعد نمازی رُخصت
ہونے لگے، تب اچانک میری نظر بے ساختہ دھوپ کا قہر برساتے آسمان کی جانب اُٹھ گئی۔ سورج اب
اپنی اُسی آب و تاب کے ساتھ چمک رہا تھا۔ دُور دُور تک کسی بدلی تو کیا کسی مٹی یا ریت کے بگولے کے آ
بھی نمایاں دکھائی نہیں دے رہے تھے۔ میں نے سلطان بابا کے چہرے پر کوئی تحریر پڑھنے کی کوشش کی لیـ
وہاں حسبِ معمول صرف سکون کا ڈیرہ تھا۔ وہ تو دعا مانگنے کے بعد اس طرح بے فکر اور لاپروا ہو گئے تھے، ج
خدا ان کی ہر دعا سن ہی تو لے گا۔ اچانک میرے ذہن میں ایک کوندا سا لپکا۔ کہیں یہ اٹل یقین ہی تو کسی دعا
قبولیت کا اصل کلیہ نہیں۔ کہیں ہماری دعائیں اسی لیے تو رد نہیں ہو جاتیں کہ ہم اندر سے بے یقین اور بدا
ہوتے ہیں۔ ہم جس سے مانگ رہے ہوتے ہیں، خود اُسی کی سخاوت اور خزانے پر ہمارا اعتماد متزلزل ہوتا ہے
پھر دعا قبول نہ ہونے کا شکوہ کیسا۔ یہ تو اعتبار اور توکل کا سودا ہے اور سچ ہی تو ہے کہ انسان ہی سدا کا خسار
میں ہے۔

رات کو بھی کئی بار میں نے اُٹھ کر آسمان کو دیکھا۔ میرے اندر کا تول مول کرنے والا سوداگر آج
یقین اور بے یقینی کے پلڑے دلیل اور جواز کے پتھروں سے برابر کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ آدھی رات
قریب جب مجھے پہلی جھپکی آئی تب تک آسمان بالکل صاف تھا۔ ایمان اور بے یقینی کی جنگ میں سوداگر
شک کی جیت ہوئی اور میں تھک کر سو گیا۔ لیکن صبح بہت سے بچوں کے شور سے میری آنکھ اچانک کھلی تو
نظر سیدھی آسمان پر پڑی۔ سارا آسمان بادلوں سے ڈھکا ہوا تھا۔ بستی کے سارے بچے کاغذ اور پلاسٹک
پتنگیں، لمبی لمبی ڈوروں سے باندھے صحرا میں چلتی تیز ہوا کے دوش پر اُڑائے پھر رہے تھے۔ میں ایک

سے اُٹھ بیٹھا۔ صحرا میں بادل، کتنا عجیب تضاد آمیز لیکن خوش گوار تجربہ تھا۔ سلطان بابا بھی صحن میں نکل آئے۔
میں نے اُن سے پوچھ ہی لیا۔ ”آپ کو اس قدر یقین کیسے تھا۔ مجھے تو جو نعمت میری دسترس میں، میرے سامنے
موجود ہوتی ہے، اُس کے پانے کا بھی کامل یقین نہیں ہوتا اور آپ ایک اَن ہونی پر بھی اس قدر اعتبار کیسے جمع
کیے رکھتے ہیں۔“ انہوں نے غور سے میری جانب دیکھا ”سارا کھیل ہی یقین اور بے یقینی کا ہے میاں......اور
یقین جانو کہ تم اس کامل یقین کے بہت آس پاس ہو۔ بس ثابت قدمی ہی آخری شرط ہے۔“ سلطان بابا کی
بات ختم ہوتے ہی پہلی بوند نے میری پیشانی چوم کر سلامی دی اور پھر چند ہی لمحوں میں وہ جل تھل ہوئی کہ کال
گڑھ کی برسوں سے پیاسی اور سوکھی زمین کے ساتھ ساتھ میرا اندر بھی پوری طرح ڈھل گیا۔ کچھ بارشیں
ہمارے اندر بھی برستی ہیں۔ کال گڑھ کے لوگوں کو خوشی سے چلاتے اور اُچھلتے کودتے دیکھ کر میرے من میں بھی
بوندوں کا جلترنگ بجنے لگا۔ کال گڑھ کی بارش صرف بیس منٹ کے لیے تھی، لیکن میرے اندر کا ساون بہت دیر
تک برستا رہا۔ کچھ ہی دیر میں بستی کے تمام لوگ مزار کے باہر جمع ہو چکے تھے۔ وہ سلطان بابا کا شکریہ ادا کرنے
کے لیے آئے تھے کہ اُن کی دعا سے کال گڑھ کے نصیب کی بدلی آج کھل کر برسی تھی، لیکن سلطان بابا نے
مسکراتے ہوئے بات انہیں پر اُلٹ دی کہ ”میں نے اللہ سے صرف اتنی دعا کی تھی کہ کال گڑھ میں جو بھی تجھے
سب سے زیادہ عزیز ہے، اُس کے صدقے بارش بھیج دے۔ اب تو یہ تم ہی سب مل کر کھوج کرو کہ تم میں سے اللہ کا
وہ سب سے پیارا کون ہے؟“ یہاں بستی میں سب ہی کے من کی کلی کھل رہی تھی، مگر کوئی ایسا بھی تھا جو قدرت کو
اپنی سلطنت میں دخل اندازی کرتے دیکھ کر تلملا رہا تھا۔ جانے کیوں مجھے اُسی روز احساس ہو گیا تھا کہ جبروت
کبھی سلطان بابا کے لیے لوگوں کی آنکھوں کی یہ محبت اور عقیدت برداشت نہیں کر پائے گا اور اسی خدشے کا
اظہار اسی شام سانول نے بھی کر دیا جب میں اُس سے ملنے اُس کے گھر پہنچا تو مغرب کا وقت ڈھل چکا تھا، گھر
میں چہل پہل بھی کم تھی۔ سانول نے جلدی سے میرا ہاتھ پکڑ کر مجھے اپنے سرہانے بٹھا لیا۔ اُس کی حالت پہلے
سے کافی بہتر تھی اور زخم بھی بھر رہا تھا، لیکن اُس کے باپ نے اُسے اپنی قسم دے رکھی تھی کہ اب وہ تنہا صحرا میں
بانسری بجانے کبھی نہیں جائے گا۔ سانول اس بات پر بھی کافی جھنجھلایا ہوا تھا لیکن فی الحال اُس کی پریشانی کی
وجہ کچھ اور تھی۔ اُس نے مجھے بتایا کہ جس دن سے اُس پر حملہ ہوا ہے بستی کا بوڑھا کھوجی بھی اپنے گھر سے غائب
ہے۔ اُس کے گھر کو بھی تالا لگا ہوا ہے اور بستی میں کوئی نہیں جانتا کہ کھوجی کہاں چلا گیا ہے۔ میں بھی چونکا تب
ہی وہ بوڑھا اتنے دنوں سے مجھے بھی دکھائی نہیں دیا تھا نہ ہی وہ سانول کی مزاج پرسی کے لیے اُس کے گھر آیا
تھا۔ مطلب میرا شک ٹھیک تھا کہ اُن نقاب پوشوں کا تعلق ضرور سکینہ کے اغوا سے بھی رہا ہوگا۔ سانول نے
میرے خدشات دوچند کر دیئے تھے۔ لیکن میں اُسے اپنی پریشانی بتا کر مزید اُلجھانا نہیں چاہتا تھا۔ میں گھنٹہ بھر
اُس کے پاس بیٹھنے کے بعد اُٹھنے لگا تو سانول نے اصرار کیا کہ کھانا کھا کر جاؤں۔ آج نوری کے گھر سے اُس
کے لیے خاص طور پر گڑ کے چاول بن کر آنے تھے۔ میں نے مسکرا کر اُسے چھیڑا کہ تب ہی آج وہ باتیں بھی گڑ

کے شیرے جیسی میٹھی کر رہا ہے۔ ہائے یہ جذبے.......... پل میں ہمیں کتنا کڑوا اور دوسرے پل میں ک
شیریں کر دیتے ہیں۔ کچھ ایسی اُلٹ پلٹ مچاتے ہیں ہمارے اندر کے ہم خود اپنا اصل بھی بھول جاتے ہیں
میں بھی سانول کی آنکھوں سے پھوٹتی محبت کی وہ میٹھی آنچ پورے کمرے میں پھیلتی چھوڑ کر وہاں سے نکل آیا
سانول کو میں نے بڑی مشکل سے سمجھایا کہ سلطان بابا مزار پر میرا انتظار کرتے ہوں گے۔ لہٰذا میں کل پھر آؤ
گا اور نوری کے گھر سے آئے گڑ کے چاول بھی ضرور کھاؤں گا۔ میں سانول کے کمرے سے باہر نکلا تو چ
عورتیں لمبے لمبے گھونگھٹ نکالے گھر میں داخل ہو رہی تھیں۔ اُن کے ساتھ ساتھ سانول کی ماں بھی تھی۔ میں
جھکا کر سلام کر کے آگے بڑھنے لگا تو سانول کی ماں نے میرے سر پر ہاتھ رکھ کر دعا دی۔ ''شالا چھوٹا
جیوے......'' کائنات کی ساری مائیں شاید ایک ہی مٹی سے گندھی ہوئی ہوتی ہیں۔ آنسوؤں، دعاؤں ا
خدمت کی مٹی۔ مجھے مما یاد آ گئیں اور میری آنکھیں بھیگ گئیں۔ میں دروازے سے نکل ہی رہا تھا کہ میر
عقب سے ایک سہمی اور ڈری ہوئی سی نازک سی آواز اُبھری۔ ''چھوٹے پیر جی...........!!'' میں ٹھٹھک کر ر
اور حیرت زدہ برآمدے کے ستون کی آڑ میں نوری کو اپنا سراپا سمیٹتے ہوئے دیکھا۔ اُس نے بھی علاقے
ریت کے مطابق لمبا سا گھونگھٹ نکالا ہوا تھا اور میں اُس کے وجود کی لرزش اتنی دُور سے بھی محسوس کر سکتا تھا
باقی عورتیں اندر کی جانب بڑھ چکی تھیں اور اُس وقت صرف ہم دونوں ہی صحن میں موجود تھے۔ اُس نے مجھ
روک تو لیا تھا، پر خود اُس کا بس چلتا تو اگلے لمحے ہی وہاں سے ہوا ہو جاتی۔ میں نے ہلکے سے کھنکار کر اُ
متوجہ کیا۔ وہ ہڑبڑا سی گئی۔ ''وہ جی.......... چھوٹے پیر جی.......... آپ اس سے کہیں نا کہ وہ شہر چلا جائ
یہاں اس کی جان کو بہت خطرہ ہے۔ آپ کہو گے تو نہ نہیں کرے گا۔ بہت سنتا ہے آپ کی۔'' مجھے نوری
تشویش کا اندازہ تھا۔ ''آپ اطمینان رکھیں۔ میں سانول سے بات کروں گا۔'' میں بات ختم کر کے درواز
سے باہر نکل آیا۔ عورت کا دامن کچھ یوں بھی سدا ہی سے کورا ہوتا ہے، لیکن ان علاقوں میں تو زور سے چلتی
بھی اسے داغ دار کر دیتی ہے۔ وہ معصوم لڑکی سانول کی محبت میں شاید چند لمحوں کے لیے یہ بھول گئی تھی، لیک
مجھے ریت اور رواج کی حدیں یاد تھیں۔ ساری بستی ہی کو چند دن میں اندازہ ہو گیا تھا کہ سانول کی مجھ
گاڑھی چھنتی ہے اور وہ ضدی لڑکا میری بات کا بہت مان رکھتا ہے۔ یہ اسی مان کا بھروسا تھا، جس نے نوری
آج مجھ سے بات کرنے کا حوصلہ بخشا تھا۔ میں خود بھی سوچ رہا تھا کہ سانول سے کہوں کہ کچھ عرصے کے
یہاں سے دُور چلا جائے۔ دشمن اگر اَن جانا ہو تو وہ دہرا خطرناک ہو جاتا ہے اور ہمیں اس وقت ایسے ہی ک
چھپے ہوئے دشمن کا سامنا تھا۔ میں اپنی سوچوں میں گم صحرا کے اُونچے ٹیلے پار کرتا ہوا مزار کی جانب بڑھ رہا تھا
اچانک مجھے داہنی طرف کے ٹیلے کے پیچھے سے چند غراہٹیں سنائی دیں۔ میں ٹھٹھک کر رُک گیا۔ غراہٹ
رُک گئی۔ میں نے کالے کو آواز لگائی۔ لیکن کالا ہوتا تو ایسے چھپتا ہی کیوں۔ میں نے پھر قدم بڑھائے ہی
کہ ٹیلے کے پیچھے سے دو خوف ناک قسم کے کتے ایک دم ہی میرے سامنے آ گئے۔ یہ جبروت کے کتوں

ٹولے میں سے تو نہیں تھے لیکن ان کے تیور بھی اس وقت کچھ ویسے ہی تھے۔ مجھے احساس ہوا کہ بچپن سے
میرے اندر چھپا کتوں کا خوف ایک دم ہی میرے سارے وجود پر طاری ہو گیا ہے اور میں ٹھیک اُسی طرح اپنی
جگہ منجمد ہو گیا، جیسے بچپن میں کسی کتے کے غرانے پر اپنے پیروں سے جان نکل جانے پر ہو جاتا تھا۔ کتوں نے
زقند بھرنے کے لیے اپنے جسم کو تولا، میری رگوں میں بہتے گرم خون نے پل بھر میں ہی میرے سر سے لے کر
میرے پاؤں کے تلوؤں تک کا دورانیہ طے کر لیا اور تب اچانک ہی کسی طرف سے کالا دوڑتا ہوا آیا اور میرے
پاؤں کے قریب آ کر لوٹنے لگا۔ میں ابھی تک ساکت ہی کھڑا تھا۔ کالے کو یوں میرے پاس قلابازیاں کھاتے
دیکھ کر دوسرے دو کتوں کے تنے جبڑے بھی کچھ ڈھیلے ہو گئے۔ شاید کالے نے صحرا میں بھی اپنا گروہ بنا لیا تھا
اور باقی دو بھی اُسی کے ساتھی تھے۔ میں نے ایک گہری سی سانس لی اور آگے بڑھ گیا۔ جانے یہ جانور آپس
میں کون سی بولی بولتے ہوں گے، کیسے ایک دوسرے کو اپنی بات سمجھاتے ہوں گے۔ ان کے لفظ کیسے ہوتے
ہوں گے۔ ابھی ابھی کالے نے میری جان کے دشمن بنے ان خوف ناک کتوں کو یہ کیسے سمجھایا ہو گا کہ یہ تو میرا
دوست ہے...... تم بھی اسے کچھ نہ کہنا اور کتنی جلدی وہ کالے کی بات مان بھی گئے۔ ہم انسانوں کی طرح کسی کج
بحثی یا تکرار میں پڑے بنا، انہوں نے کیسے اپنے دوست کی بات مان لی۔ شاید اس دور کے انسانوں کو بہت سی
باتیں ان جانوروں سے سیکھنے کی ضرورت تھی۔ اچانک میرے ذہن میں ایک کوندا سا لپکا۔ کہیں یہ لفظ صرف ہم
انسانوں ہی کی مجبوری تو نہیں ہوتے۔ رابطے کے کئی اور ذرائع بھی تو ہوتے ہوں گے۔ جیسے ان جانوروں کا
آپس میں رابطہ، اور پھر وہ رابطہ، وہ جذبہ اور وہ پیام ہی کیا جسے لفظوں کی یا زبان کی ضرورت محسوس ہوتی ہو؟
ت تو تب ہے جب بنا کچھ کہے ہی وہ ہمدم سب جان لے۔ جیسے ابھی کچھ دیر پہلے ہی کالے کا اپنے ساتھیوں
کو بھیجا گیا وہ خاموش پیام تھا۔ شاید یہ لفظ ہم کم ظرفوں ہی کی پہچان ہوتے ہیں۔ انہی خیالوں میں گم میں مزار
کے سامنے والا بڑا ٹیلا طے کر کے جیسے ہی نیچے اُترا تو میرے پاؤں جیسے ریت پر گڑ کر رہ گئے۔ مزار کے باہر
روت کی جیپ کھڑی تھی۔ اتنی رات گئے جبروت یہاں کیا لینے آیا تھا......؟؟

دل سے دھواں اُٹھتا ہے

مجھے جبروت کی جیپ مزار کے باہر کھڑی دیکھ کر جو پہلا جھٹکا لگا تھا میں اُسی کے زیرِ اثر تقریباً دوڑ۔ ہوئے مزار کے بیرونی دروازے تک پہنچا ہی تھا کہ اندر سے جبروت کا خاص کارندہ، اکرم لمبے لمبے قد اُٹھاتے ہوئے باہر نکلا اور مجھ پر ایک نگاہ غلط ڈالتا ہوا جیپ میں سوار ہوگیا جہاں ڈرائیور سمیت ایک دو محافظ پہلے ہی بیٹھے ہوئے تھے۔ جیپ آگے بڑھ گئی۔ سلطان بابا صحن ہی میں اپنی مخصوص جگہ پر بیٹھے تسبیح گ رہے تھے۔ میں پھولی ہوئی سانسیں لیے اُن کی جانب بڑھا۔ ''یہ لوگ یہاں کیا کرنے آئے تھے ''دھمکانے آئے تھے......لیکن ڈھکے چھپے لفظوں میں......'' میں مزید اُلجھ گیا۔ ''پوری بات بتائیں...... سلطان بابا اُٹھ کھڑے ہوئے ''جبروت کا پیغام لائے تھے کہ یہاں اُس کا سکہ چلتا ہے، لہٰذا آئندہ کوئی ب اجتماع کرنے سے پہلے اُس سے اجازت ضرور لے لی جائے۔'' میں نے تشویش بھری نظروں سے سلطان کی جانب دیکھا، گویا میرے خدشات ایک ایک کر کے سچ ثابت ہو رہے تھے۔ ''تو آپ نے کیا جواب دیا وہی جو مجھے کہنا چاہیے تھا کہ ہم فقیر لوگ ہیں۔ ہمارا تو گزارا ہی مانگ کر ہوتا ہے۔'' گویا انہیں سانول کا سے ملنا جلنا بھی پسند نہیں تھا۔ سلطان بابا کے لہجے سے ظاہر ہو رہا تھا کہ طبلِ جنگ بج چکا ہے اور اب جلد یا ب ہماری جبروت سے حتمی ملاقات ہونے والی ہے۔

عشاء کی نماز پڑھنے کے بعد سلطان بابا کمرے میں آرام کے لیے چلے گئے۔ لیکن میری قسمت میں آر کہاں...... پھر وہی رات، وہی بے خوابی، وہی میری جگ راتوں کی محفل اور وہی میرے ساتھی تارے۔ کہ ہیں پرانے زمانوں میں کاہن اور جادوگران تاروں کی چال سے حال اور مستقبل کی کروٹ کا اندازہ لگایا کر۔ تھے۔ میں بھی بہت دیر تک ان شرارتی تاروں میں اپنے مقدر کا تارا کھوجتا رہا۔ لیکن وہ مجھے کیسے دکھائی دیتا۔ گردش میں سدا رہتے ہوں انہیں تو فلک بھی اپنے دامن میں جگہ نہیں دیتا۔ ایسے ستاروں کا آسمان بھی شاید کو دوسرا ہی ہوتا ہوگا۔

اگلے روز میں مزار سے باہر سانول کی زور زور سے باتوں کی آواز سے چونکا۔ جلدی سے اُٹھ کر مزار منڈیر سے باہر جھانکا تو سانول اپنے باپ کے ساتھ لڑتا جھگڑتا اور بحث کرتا مزار کی جانب بڑھا چلا آ رہا تھ اُس کے باپ نے صحن میں داخل ہوتے ہی سلطان بابا کو سلام کے بعد اپنا دکھڑا سنانا شروع کر دیا کہ وہ ا۔ لڑکے کے ہاتھوں بے حد پریشان ہے۔ ابھی کل ہی اس کی حالت کچھ سنبھلی ہے اور آج ہی سے اس نے دو

گھر سے نکلنے کی ضد شروع کر دی ہے۔ اب بڑے پیر جی ہی اسے کچھ سمجھائیں کہ اپنے بوڑھے باپ کو اس عمر میں یوں اوازار نہ کرے اور اس کی بات مان کر شہر چلا جائے۔ سانول نے اپنے باپ کو سلطان بابا کے سامنے فریاد سناتے چھوڑ کر میرا ہاتھ پکڑا اور مزار کی منڈیر کی طرف چلا آیا۔ میں نے سب سے پہلے اُسے جبروت کے رات والے پیغام کی رُوداد سنائی جسے سن کر وہ مزید پریشان ہوگیا۔ ''اوہ...... یہ تو بہت فکر کی بات ہے۔ پھر بڑے پیر صاحب نے انہیں کیا جواب دیا۔'' ''وہی جو انہیں دینا چاہیے تھا۔ سلطان بابا جس مقصد سے کال گڑھ آئے ہیں اُسے پورا کیے بنا وہ یہاں سے کوچ نہیں کریں گے۔'' سانول نے مجھ سے پھر وہی سوال کیا۔ ''لیکن ایسا کیا مقصد ہے اُن کا۔ اس ویران بستی میں ان درندوں سے دشمنی مول لے کر کیا ملے گا انہیں؟'' میں نے لمبی سی سانس لی۔ ''یہ تو وہی جانیں۔ ویسے بھی میں اُن سے زیادہ سوال نہیں کرتا۔ سوچنے اور فیصلہ کرنے کا اختیار صرف اُن ہی کو دے رکھا ہے میں نے۔ لیکن تم اپنے گھر والوں کی بات کیوں نہیں مان لیتے۔ وہ سب تمہاری بھلائی کے لیے ہی تو کہتے ہیں۔ کچھ عرصے کے لیے منظر سے ہٹ جاؤ۔ اِسی میں تمہارے اپنوں کی خوشی ہے۔'' سانول نے تنک کر سر پٹخا۔ ''جانتے ہو میں ایک پل کے لیے بھی اُس سے دُور نہیں جا سکتا۔ اس کے بنا تو میری بانسری سے بھی سر نہیں نکلتا۔'' ''اور اگر تمہاری دُھن اور تمہارے من کی تان بھی تم سے یہی التجا کرے تب......؟'' سانول نے چونک کر میری جانب دیکھا ''کیا مطلب؟'' میں نے گزشتہ شام نوری سے ہوئی ساری بات بتا دی۔ سانول مضطرب ہونے کے ساتھ ساتھ کچھ دل گیر بھی ہوگیا۔ ''وہ بھی یہی چاہتی ہے کہ میں بستی چھوڑ کر چلا جاؤں۔ وہ جس کے لیے میں سارے زمانے سے لڑتا پھرتا ہوں وہ بھی زمانے کے ساتھ مل گئی ہے۔'' میں نے سانول کو ڈانٹا۔ ''بے وقوفی کی باتیں نہ کرو۔ وہ تم سے شدید محبت کرتی ہے۔ تب ی تمہاری فکر میں گھلتی رہتی ہے۔ اب اور ضد نہ کرو اور پھر تم خود بھی تو یہاں قلعہ داروں کی غلامی سے چڑتے ہو۔ تو پھر اپنی نوری کو پانے کے لیے یہ عارضی جُدائی تو برداشت کرنی ہی پڑے گی۔'' ''سوچو وہ بھی تمہاری جُدائی بں اتنی ہی پریشان ہوگی جتنا تم، لیکن وہ بے چاری تو لڑکی ہونے کی وجہ سے کسی سے اپنا درد بھی نہیں کہہ سکتی۔ تم ا کچھ احساس کرو۔'' سانول نے بے بسی سے میری جانب دیکھا۔ آخر کار گھنٹہ بھر کی بحث کے بعد اُس نے تھیار ڈال دیئے اور میں اُس کا ہاتھ پکڑے اُس کے باپ کے پاس چلا آیا۔ ''آپ کو مبارک ہو۔ سانول نے ہر جانے کی ہامی بھر لی ہے۔'' سانول کے باپ کو پہلے تو یقین ہی نہیں آیا کہ یہ پہاڑ اتنی آسانی سے سر ہو گیا ہے۔ اُس نے حیرت سے سلطان بابا کی طرف دیکھا۔ سلطان بابا مسکرائے ''حیران ہونے کی ضرورت نہیں۔ مارے عبداللہ میاں ایسے کرشمے دکھاتے رہتے ہیں۔ بھئی میں تو کہتا ہوں کہ اس کا نام عبداللہ کی جگہ ساحر ہونا ہیے تھا۔ لگتا تمہارے بیٹے پر بھی اس کا جادو چل گیا ہے۔'' سلطان بابا کی اس شرارت پر مجھ سمیت سانول ر اُس کا باپ بھی مسکرا دیئے۔ مزار سے نکلتے ہوئے سانول نے دھیرے سے میرے کان میں کہا۔ ''لیکن ری بھی ایک شرط ہے۔ میں نوری سے ملاقات کیے بنا یہاں سے نہیں جاؤں گا اور یہ ملاقات کل شام ہی ہو

گی۔تمہیں صرف اتنا کرنا ہے کہ کل کسی طرح مجھے گھر سے تنہا نکلنے کی اجازت دلوادو۔ باقی انتظام میں خود کرلوں
گا۔" میں نے مسکرا کراس کی پیٹھ تھپتھپائی تو تم نے بھی سودے بازی سیکھ لی ہے۔ٹھیک ہے کل عصر کے بعد تیار
رہنا، میں تمہیں لینے آؤں گا۔

سانول کے جانے کے کچھ دیر بعد ہی مزار کی بیرونی دیوار سے پرے کالے کی مخصوص غراہٹ گونجی۔ میں
روٹی اور پانی لے کر باہر آیا تو دُور کالے کی پشت پر، میں نے اُس کے دونوں دوستوں کو بھی ٹیلے کے اوپر
کھڑے دیکھا۔ میں نے اُس کے لیے روٹی ڈالی اور انہیں بھی اشارہ کیا کہ وہ بھی آکر اپنے دوست کے ساتھ
شریک ہو جائیں، لیکن شاید فی الحال وہ دونوں کچھ شرمیلے تھے۔ میں اندر سے اور روٹی لے آیا اور پانی میں بھگو کر خو
دُور مزار کی دیوار کے پاس چلا گیا۔ مجھے مزار کی طرف بڑھتے دیکھ کر کالے کے دوست بھی ٹیلے سے اُتر آئے۔

اگلے روز عصر کے بعد میں سانول کے گھر پہنچا تو وہ پہلے ہی سے تیار بیٹھا تھا۔ سانول کو میرے ساتھ گھر
سے باہر نکلتے دیکھ کر اُس کے ماں باپ کے دل میں جو تھوڑا بہت تذبذب تھا، وہ بھی ختم ہو گیا۔ میں نے بستی
سے باہر نکلتے ہوئے اُس سے پوچھا "اب کیا ارادہ ہے۔ کیا سیدھے نوری کے دروازے پر جا بیٹھو گے؟"
سانول زور سے ہنس پڑا "نہیں! جو سودا میں نے تمہارے ساتھ کیا تھا، وہی نوری کے سامنے بھی اُس کی سہیلی
کے ذریعے پیغام کی صورت بھیج دیا تھا کہ اگر وہ چاہتی ہے کہ میں شہر جا کر محنت مزدوری کروں جو آج شام اُسے
مجھ سے ملنے کے لیے مزار کے پچھلے بڑے ٹیلے پر آنا ہی ہوگا۔" میں نے حیرت سے سانول کو دیکھا۔ "تو کیا
مان گئی۔ اُس نے تمہیں کوئی جواب بھی دیا کہ نہیں......؟" سانول مسکرایا "نہیں...... جواب تو کوئی نہیں آیا اُدھر
کی طرف سے۔ لیکن میں جانتا ہوں کہ وہ ضرور آئے گی۔" میں نے غور سے سانول کی جانب دیکھا۔ "تمہیں
اتنا یقین کیسے ہے۔" سانول اپنی ہی دُھن میں مگن تھا۔ "ساری بات ہی یقین کی ہے چھوٹے پیر جی......" میں
زور سے چونکا...... میرے ذہن میں سلطان بابا کا جملہ گونجا "سارا کھیل ہی یقین اور بے یقینی کا ہے میاں......
کیا ہمارے یقین میں واقعی اتنی طاقت ہوتی ہے کہ وہ ہمارے مجبور اور معاشرے کے قیدی محبوب کو بھی گھر سے
نکال کر اس ویران تپتے صحرا میں ہمارے سامنے کھڑا کر سکتا ہے......؟ اگر زمین والوں پر اس یقین کا اتنا گہرا اثر
ہے تو پھر عرش بریں والے کی آمد کا کیا حال ہوگا، جو ہمارے ایک قدم کے بدلے ستر قدم ہماری جانب بڑھا
چلا آتا ہے......؟ اور پھر میں نے دُور ہی سے مزار سے پرے ٹیلے پر نوری کی سرخ اوڑھنی کو سانول کے کامل
یقین کی صورت میں لہراتے ہوئے دیکھ لیا۔ وہ شاید اپنی کسی سہیلی کے ساتھ آئی تھی، جو بظاہر ٹیلے پر اُگی ایک
خاص جنگلی بوٹی چننے میں مشغول تھی، جسے جوڑوں کے درد کی دوا میں استعمال کیا جاتا تھا۔ یہ محبت بھی ہمیں
بہانے سکھا دیتی ہے۔ شاید محبت خود دنیا کی سب سے بڑی "بہانے باز" ہوتی ہے۔ میں مزار کی منڈیر کے
قریب ہی رُک گیا۔ سانول کو نوری کی جانب آتے دیکھ کر اُس کی سہیلی نے نوری کے کان میں کوئی سرگوشی کی
اور ہنستی ہوئی کچھ فاصلے پر چلی گئی۔ ٹیلے اور مزار کی منڈیر میں کافی فاصلہ تھا۔ اچانک تیز ہوا نے ریت کے

شریر بگولوں کو چھیڑ دیا اور وہ نیند سے جاگ کر صحرا میں ایک دوسرے کے پیچھے لپک کر "کوکلا چھپا کی" کھیلنے
لگے۔ سانول ریت میں پیر دھنساتا نوری کے قریب پہنچ چکا تھا۔ نوری سر جھکائے کھڑی تھی۔ مجھ سے ریت
کے ایک شریر بگولے نے کہا "جانتے ہو وہ آپس میں کیا بات کر رہے ہیں......؟" "ہاں...... میں جانتا ہوں۔
سب ہی بچھڑنے والوں کی بولی ایک جیسی ہوتی ہے۔ کچھ گلے، کچھ شکوے۔ کچھ دعوے اور کچھ وعدے۔ کبھی نہ
پورے ہونے والے وعدے......" سانول بھی نوری سے کچھ ایسے ہی وعدے کر رہا تھا۔ جانے مجھے اتنی دُور
سے بھی ایسا کیوں محسوس ہوا کہ جیسے نوری رو رہی ہو۔ سانول اُسے تسلیاں دے رہا تھا۔ یہ لڑکیاں بھی کتنی عجیب
ہوتی ہیں۔ پہلے تو خود ہی اپنے سے دُور بھیجنے کی جتن کرتی ہیں اور پھر خود ہی جُدائی کا سوچ کر رو پڑتی ہیں۔
اچانک ہی زہرا کی یاد نے میرے وجود کے ہر روئیں پر اپنا قبضہ جما لیا۔ وہ پورا صحرا جیسے زہرا کی یاد کا اک دریا
بن گیا۔ کیا اُسے بھی میری یاد آتی ہوگی۔ کیا وہ بھی نوری کی طرح آنسو بہاتی ہوگی۔ زمانہ چاہے صدیوں ہی پر
محیط کیوں نہ ہو۔ محبوب سے ہوئی ملاقات ہمیں ہمیشہ پل بھر کی ہی لگتی ہے۔ سو، نوری اور سانول کی ملاقات کے
وہ چند پل بھی پلک جھپکتے ہی بیت گئے۔ نوری اپنی سہیلی کے ساتھ ٹیلے سے اُتر کر بستی کی جانب چل پڑی اور
جاتے جاتے پلٹ کر ٹیلے پر کھڑے گم صم سے سانول کو دیکھتی رہی، جس کی آنکھ سے ٹپکتے اس آنسو کی چمک،
میں ڈوبتے سورج کی کرنوں میں یہاں اتنی دُور سے بھی دیکھ سکتا تھا۔ خود نوری بھی بار بار پلو سے اپنی بھیگی پلکیں
پونچھ رہی تھی۔ ایک اور الوداع...... ایک اور عذاب جو سانول اور نوری کی جُدائی کی صورت میں میری رُوح کو
جھیلنا پڑ رہا تھا۔

نوری کے جانے کے بعد بھی سانول وہیں ٹیلے پر کھڑا اُس جانب دیکھتا رہا، جہاں ریت پر نوری کے
قدموں کے نشان گئے تھے۔ میں نے اُس کی تنہائی میں دخل دینا مناسب نہیں سمجھا۔ میں جانتا تھا کہ اس وقت
صرف اُس کا جسم ہی اس ٹیلے پر موجود ہے۔ اُس کی رُوح تو نوری کی آنکھوں سے ٹپکتے آنسوؤں کو چننے، ان
سے وضو کرنے کے لیے نوری کے ساتھ ہی صحرا پار کر گئی تھی۔ سورج ڈھلنے کے بعد سانول بھی اپنی محبت کے
غروب ہوتے آفتاب کی طرح ٹیلے سے نیچے اُتر آیا۔ وہ بہت مضمحل لگ رہا تھا۔ میں نے اُسے تسلی دی کہ دائمی
ملن کے لیے کبھی کبھی یہ عارضی جُدائی ضروری ہوتی ہے۔ سانول کو اگلی صبح روانہ ہونا تھا۔ وہ رات دیر تک
میرے ساتھ بیٹھا رہا اور پھر اُس کے لاکھ منع کرنے کے باوجود میں اُسے گھر تک چھوڑ آیا۔ لیکن اگلی صبح میرے
بے حد اصرار کے باوجود اُس نے مجھے ریلوے اسٹیشن تک ساتھ چل کر اُسے وداع کرنے سے منع کر دیا۔ بقول
اُس کے وہ پہلے ہی بہت اداس تھا اور اگر میں اسٹیشن تک ساتھ آیا تو کہیں وہ اپنا ارادہ ہی نہ بدل دے۔ وہ صبح
سویرے ہی مزار پہنچ گیا تھا۔ اُس کی گاڑی دوپہر کی تھی۔ میں خود اُسے رخصت کرتے ہوئے بہت اداس تھا۔
اُس کے ساتھ کال گڑھ میں اتنے دن کیسے کٹ گئے، کچھ پتا ہی نہیں چلا۔ جاتے ہوئے مجھ سے گلے مل کر وہ رو
پڑا۔ میں نے جلدی سے اُس کے آنسو پونچھے "ارے...... یہ کیا......؟" "تم مجھے بہت یاد آؤ گے عبداللہ۔ میں

روز تمہیں ایک خط لکھا کروں گا اور تم جواب میں مجھے اس بستی، اس صحرا اور نوری کی خبر لکھنا۔'' میں نے ماحول
بدلنے کے لیے اُسے چھیڑا۔ ''اچھا تو گویا خط میں بھی اُسی کی باتیں...... میں تو یہ سمجھ بیٹھا تھا کہ تم میرے لیے
خط لکھا کرو گے، پر اپنے ایسے نصیب کہاں؟'' سانول میری بات سن کر مسکرا دیا۔ ''اگر میرا خط اُس تک پہنچ پا
تو یقین کرو میں اُسے ہر خط میں عبداللہ کی باتیں لکھا کرتا۔ میں نے نوری کو پیغام کروا دیا ہے کہ تم سے اُسے
میری خیر خیریت پتا چلتی رہے گی اور اگر اُسے کوئی ضروری پیغام دینا ہو تو وہ بھی تمہارے ذریعے مجھے دے سکتی
ہے۔ میں ڈاک بابو سے بھی خاص التجا کر کے آیا ہوں کہ مزار والی ڈاک کا خاص خیال رکھے۔'' میں نے
سانول کو اطمینان دلایا کہ وہ فکر نہ کرے۔ میں اُس کے ساتھ رابطے میں رہوں گا۔ جانے سے پہلے وہ خصوصی
طور پر سلطان بابا کے کمرے میں جا کر اُن کی دعا بھی وصول کر آیا تھا۔

سانول کے جانے کے بعد ایک دم ہی جیسے ساری فضا اداس اور میری تنہائی اور وحشت دو چندسی ہو گئی
تھی۔ دل پھر سے ہوکنے لگا تھا۔

گاہے دل سے دھواں اُٹھتا ہے
ابھی رہتا ہے اس مکاں میں کوئی

اگلے روز سکینہ کے بوڑھے نانا نانی سلطان بابا سے ملنے چلے آئے۔ جانے کیوں انہیں دیکھ کر اب میرا
کہیں چھپ جانے کو دل کرتا تھا۔ مجھ سے اب اُن کی فریاد برداشت نہیں ہوتی تھی۔ بڑھیا کا آج یہ اصرار تھا
کہ اگر سلطان بابا سکینہ کی اوڑھنی پر تین بار دم کر کے اور دعا کر کے پھونکیں گے تو وہ ضرور واپس لوٹ آئے گی۔
سلطان بابا نے شاید اُسی کے اطمینان کی خاطر اُس سے کہا کہ وہ سکینہ کی پھولوں والی چادر یہیں چھوڑ جائے۔ وہ
ضرور سکینہ کی بازیابی کی دعا کریں گے۔ وہ دونوں یوں خوش ہو گئے، جیسے واقعی انہیں سکینہ مل گئی ہو۔ مزار سے
نکلتے ہوئے بڑھیا کی نظر مجھ پر پڑ گئی تو اُس نے میرے سر پر ہاتھ پھیر کر مجھے دعا دی کہ خدا میری ہر مراد پوری
کرے اور ٹھیک اُسی لمحے میرے من کی صرف ایک ہی مراد تھی ''یا خدا اس لاچار بڑھیا کو اس کی نواسی سے ملا
دے......''

کچھ دیر میں سورج ڈوب گیا۔ آج میں کالے اور اُس کے دوستوں کے لیے پہلے ہی پانی اور روٹی باہر رکھ
آیا تھا تا کہ اُس کے دوست میری وجہ سے کوئی جھجھک محسوس نہ کریں۔ تھوڑی دیر بعد ہی اُن کی غراہٹوں کی آواز
بھی باہر سے بلند ہونے لگیں۔ لیکن خلاف معمول ''کالا'' مزار کے سامنے آ کر بھونکنے لگا۔ اُس نے پہلے کبھی
ایسا نہیں کیا تھا، جانے کیا بات تھی۔ جب تو اُتر سے آتی آواز نہ رُکی تو مجبوراً مجھے اُٹھ کر مزار سے باہر جانا پڑا۔
وہ مزار کے مرکزی دروازے سے کچھ ہٹ کر کھڑا تھا۔ پہلے تو مجھے کچھ سمجھ ہی نہیں آیا کہ مسئلہ کیا ہے؟ پھر
اندھیرے میں اُس کے سامنے ریت پر پڑے سفید کپڑے پر میری نظر پڑی تو میں چونک کر آگے بڑھا۔ وہ

شاید کہیں سے یہ کپڑا اُٹھا لایا تھا اور مجھے یہی دکھانے کے لیے بار بار بھونک کر باہر بلا رہا تھا۔ ارے یہ تو میرا ہی
کرتا تھا، جو دو دن پہلے ریت کے شدید طوفان کی وجہ سے مزار کی الگنی سے اُڑ کر نہ جانے صحرا میں کہاں کھو گیا
تھا، لیکن یہ کالے کو کہاں سے ملا۔ مجھے سانول نے بتایا تھا کہ جبروت کے سب ہی پالتو کتے انتہائی حد تک
سدھائے ہوئے اور اپنی حسیات میں کمال حد تک ہوشیار ہوتے ہیں۔ اوہ...... تو پھر ضرور کالے نے کُرتے
میں میرے جسم کی باس پائی ہوگی، تب ہی وہ یہ کُرتا یہاں اُٹھا لایا۔ کہتے ہیں کہ کتے کی سونگھنے کی حس اس قدر
تیز ہوتی ہے کہ وہ سینکڑوں لوگوں میں سے اپنے مالک کے جسم کی بو شناخت کر لیتا ہے۔ آج میں نے اس کا عملی
مظاہرہ بھی دیکھ لیا تھا اور پھر اچانک ہی میرے ذہن میں ایک ساتھ بہت سے جھماکے ہوئے اور میں اندر کی
جانب دوڑا۔ ایک مبہم سی اُمید نے میرے اندر جیسے بجلیاں سی بھر دی تھیں۔ میرے کمرے میں ابھی تک سکینہ کی
اوڑھنی پڑی تھی، جو آج اُس کی نانی سلطان بابا کے پاس چھوڑ گئی تھی۔ اگر سکینہ اُسی صحرا میں کہیں بھٹک رہی
ہے تو شاید کالا اُس کے دوپٹے میں بسی خوشبو کو پا کر اُس کا بھی کوئی کھوج نکال لائے۔ میں اوڑھنی لے کر اسی
رفتار سے دوبارہ بھاگتا ہوا باہر آیا اور کالے کے سامنے اس پھٹی ہوئی چادر کو ڈال دیا۔ وہ کچھ دیر چاروں طرف
گھوم کر اس کو سونگھتا رہا۔ مجھے کچھ سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ اسے کیسے سمجھاؤں کہ ہمیں اس اوڑھنی والی کی تلاش ہے۔
کالا اوڑھنی سونگھنے کر پھر سے میرے اردگرد چکر لگانے لگا۔ شاید اُسے میری بات سمجھ نہیں آئی تھی۔ میں نے
چادر زمین سے اُٹھا کر اُس کا ایک گولا سا بنایا اور اُسے دُور صحرا میں اُچھال دیا۔ کالا فوراً بھاگا اور چادر کے قریب
پہنچ کر بھاگنے لگا۔ اس بار شاید وہ میرا مدعا جان گیا تھا۔ اب وہ زور زور سے بھونک کر چادر کے گرد چکر کاٹ کر
صحرا کی جانب دوڑ جاتا اور پھر واپس اپنی جگہ آ کر بھونکنے لگتا۔ میری رگوں میں خون کا دورانیہ بڑھنے لگا، گردش
تیز ہو کر میری نسوں میں انگارے سے بھر گئی۔ میں صحرا میں کالے کے پیچھے لپکا۔ وہ جس طرح خاص سدھائے
ہوئے کتوں کی طرح کچھ قدموں کے بعد رک کر میرا انتظار کرتا اور پھر بھاگنے لگتا اس سے صاف ظاہر تھا کہ وہ
اس اوڑھنی والی کے بارے میں کچھ جانتا ہے۔ میں اُس کے نقش قدم پر دوڑتا ہوا صحرا پار کر رہا تھا۔ کالے کا رُخ
بستی کی جانب تھا اور کچھ ہی دیر میں ہم نصف شب کے وقت خواب خرگوش کے مزے لیتے ہوئے کال گڑھ کی
سنسان گلیوں میں دھول اُڑا رہے تھے۔ کالا بنا رُکے آگے بڑھتا گیا۔ میرا سانس پھول چکا تھا اور قدم جواب
دے رہے تھے۔ پھر بھی میں ایک اَن جانی قوت کے زیر اثر کالے کے پیچھے دوڑتا رہا اور پھر بستی کے آخر میں
کالے کے قدم ایک جگہ جم سے گئے اور اُس نے بھونک بھونک کر آسمان سر پر اُٹھا لیا۔ میں بھی اپنی جگہ ساکت
ہو گیا۔ کالا اپنے پنجوں سے جس دیوار کو بار بار کھرچ تھا، وہ جبروت کے قلعے کی چار دیواری تھی۔ مطلب
سکینہ دیوار کے اس پار موجود تھی۔ اس وقت میرا بھی دل شدت سے یہ آرزو کرنے لگا کہ کاش میرے ناخن بھی
کالے جیسے ہو جائیں اور میں کالے کے ساتھ مل کر اس پتھر کی دیوار کو کھرچ کھرچ کر ڈھا دوں یا اس میں نقب لگا کر اس
پرانی قلعے کے اندر گھس کر سکینہ کو کہیں سے بھی ڈھونڈ نکالوں، لیکن اس وقت ہم دونوں ہی شدید بے بس تھے۔

بلکہ شاید ٹھیک اُس لمحے اس جانور کے اختیار کی حدیں مجھ سے کہیں بڑھ کر ہی تھیں۔ تھکے قدموں سے ہم دو
صحرا کی طرف لوٹ گئے۔ میں جب مزار کے احاطے میں داخل ہو رہا تھا، تب سلطان بابا تہجد کی نماز ادا کر
اُٹھ ہی رہے تھے۔ میرے ہاتھ میں سکینہ کی چادر دیکھ کر کچھ چونکے "کیوں میاں؟ کس کھوج میں رہے ر
بھر؟" میں نے انہیں ساری رُوداد سنا دی۔ پوری بات سن کر انہوں نے گہری سانس لی "لگتا ہے کوئی بڑا ا
سر پر ہے...... یا اللہ ہمیں ثابت قدمی عطا کر۔" انہوں نے دعا کے لیے ہاتھ اُٹھا دیئے اور میں یہی سوچ
کر پریشان ہوتا رہا کہ اگر سکینہ واقعی جبروت کے قلعے میں کہیں قید ہے تو اُسے نکالنے کے لیے پوری فوج د
ہوگی، کیوں کہ اس علاقے میں پتا ہلانے کے لیے بھی جبروت کی اجازت درکار ہوتی تھی۔ اس سوچ میں خ
نہیں ہوئی کہ جانے کب سورج نکلا اور میرے وجود میں دھوپ کے نیزے گڑنے لگے۔ میں تب چونکا،
میرے ماتھے سے بہتا پسینہ ٹپ ٹپ مزار کے صحن میں بچھی ریت پر گر کر جذب ہونے سے پہلے ہی فضا
تحلیل ہونے لگا۔ سلطان بابا کے ٹوکنے پر میں تپتی دھوپ سے ہٹ کر گرم سائے میں جا بیٹھا لیکن ابھی
میرے مقدر میں بہت کڑی دھوپ باقی تھی۔

کچھ ہی دیر میں مزار کے باہر کچھ آوازیں بلند ہوئیں اور اکرام صاحب نوری کے والد اور کسی دو
بزرگ کے ساتھ مزار کے اِحاطے میں داخل ہوئے۔ اُن سب کے چہرے سُتے ہوئے تھے اور ماتھے پر
شکنیں اندر کا حال بتا رہی تھیں۔ سچ ہے کہ چہرے کا آئینہ شیشہ ہوتا ہے اور دل کا آئینہ چہرہ۔ لیکن آج اُن
کا آئینہ دھندلایا ہوا تھا۔ نوری کا باپ بے حد مضطرب دکھائی دے رہا تھا۔ سلطان بابا کے استفسار پر بمشکل
کے منہ سے صرف ایک جملہ نکلا "جبروت نے نوری کا رشتہ مانگ لیا ہے۔" میرے ہاتھ میں اکرام صاح
دینے کے لیے پکڑا پانی کا گلاس چھوٹتے چھوٹتے بچا۔ جملہ کیا تھا، ایک ایسا شدید دھماکا تھا، جو پل بھر
پورے صحرا کو تہس نہس کر گیا۔ میں بے ساختہ چلا اُٹھا۔ "لیکن...... یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ ساری بستی جانتی
نوری سانول کی منگیتر ہے اور سانول صرف اسی رشتے کی تکمیل کی خاطر ابھی کل ہی محنت مزدوری کے لیے
گیا ہے، پھر یہ سب کچھ......" میرے لفظ میرے اندر ہی گھٹ کر رہ گئے۔ نوری کا باپ تو اس قدر روہانسا
تھا کہ اُس سے جواب میں کچھ کہا ہی نہیں گیا۔ البتہ کچھ لمحوں بعد اکرام صاحب ایک لمبا سا سانس
بولے۔ "کاش ہم سانول کے ساتھ ہی نوری کو بھی دو بول پڑھا کر شہر رُخصت کر دیتے۔ یہ ٹھیک ہے کہ نور
سانول کے گھر والوں نے اُس کے لیے مانگ رکھا تھا، لیکن ابھی تک باقاعدہ کوئی رسم تو ادا نہیں کی گئی تھی۔
کی تو منگنی بھی نہیں ہوئی اور ایسی صورت میں کسی بھی طرف سے لڑکی کے لیے رشتہ آ سکتا ہے۔ ہاں بستی وا
اس زبانی رشتے کا بھی سدا احترام کرتے لیکن کسی کی نیت ہی اگر بُری ہو تو پھر اس کا کیا علاج......؟"

میں نے چونک کر اکرام صاحب کی طرف دیکھا، انہوں نے سلطان بابا کو جو تفصیل بتائی، اس کے مط
جبروت شاید بہت پہلے سے اس رشتے کی تاک میں تھا اور اُس نے مناسب موقع پر یہ تیر چلایا تھا۔

بھی وہ یہ تکلف صرف نوری کے ماں باپ کے اطمینان کے لیے کر رہا تھا، ورنہ بستی میں جس کسی گھر میں جب
کبھی قلعے کی طرف سے کوئی رشتہ آیا تھا، تب اُس کے بعد نہ تو کسی کو انکار کی جرأت ہوئی اور نہ ہی کبھی بستی میں
سے کسی دوسرے گھر نے جبروت کے مانگے ہوئے رشتے پر کمند ڈالنے کی ہمت کی تھی۔ اس لیے اگر کبھی جبروت
کی طرف سے بستی میں کسی گھر کی بیری کی طرف پتھر آتا تو وہاں ماتم اپنے ڈیرے ڈال دیتا تھا اور پھر ہمیشہ کے
لیے اس گھر میں موت کا سناٹا چھا جاتا تھا۔ میں نے جلدی سے اکرام صاحب سے پوچھا "سانول کے باپ کا
کیا کہنا ہے؟" وہ بے چارا کیا کہے گا۔" اُس کے تو ہاتھ پاؤں ہی پھول گئے یہ سنتے ہی۔ غریب کا احتجاج کیا
ہوتا ہے، صرف بددعا اور کڑھ کر اپنے اندر ہی کو مار دینا، وہ چاہ کر بھی کچھ نہیں کر سکتا۔ ساتھ ہی اُسے اپنے بیٹے
کی فکر بھی کھائے جا رہی ہے۔ وہ جانتا ہے کہ سانول یہ سنتے ہی اُلٹے پاؤں بستی دوڑا چلا آئے گا اور سانول کا
باپ یہ کبھی نہیں چاہے گا کہ وہ اپنے جوان بیٹے سے ہاتھ دھو لے۔ لہٰذا اس کی پوری کوشش ہوگی کہ یہ خبر سانول
تک کبھی نہ پہنچے۔ کیوں کہ یہاں جس نے بھی قلعے داروں سے جھگڑا مول لیا اس کے کاندھے ہمیشہ کے لیے
سر کے بوجھ سے آزاد ہو گئے۔ اکرام صاحب کی بات ختم ہوتے ہی مزار میں سناٹا سا چھا گیا۔ صرف آس پاس
چلتی لُو کی سائیں سائیں اور ریت کے بگولوں کے رقص کا شور فضا میں باقی رہ گیا۔ کچھ باتوں کی سنگینی کا احساس
ہمیں یک دم نہیں ہوتا، لیکن پھر جیسے جیسے وقت گزرتا ہے، اعصاب کی گرہیں کھلنے لگتی ہیں اور ہمیں دھیرے
دھیرے اپنی بے بسی اور اس حادثے کے مضمرات کا پتا چلتا ہے۔ ٹھیک یہی حال اس وقت میرا بھی تھا۔ میرے
پاس سانول کا پتا نہیں تھا اور اُس کے گھر والے اب کسی حال میں مجھے اس کی کوئی خبر نہ دیتے۔ شاید نوری کو شہر
میں سانول کے رہنے کی جگہ کی کچھ خبر ہو، لیکن میں نوری سے اس کا پتا کیسے لے سکتا تھا۔ وہ تو سات پردوں میں
چھپی ہوئی تھی۔ میں تو صرف سانول کے پہلے خط ہی کا انتظار کر سکتا تھا، جس کا اُس نے مجھ سے وعدہ کیا تھا۔
یکن تب تک تو بہت دیر ہو چکی ہوگی۔ جانے نوری کا کیا حال ہوگا۔ وہ بھی تو کسی بے بس چڑیا کی طرح
پھڑ پھڑا رہی ہوگی۔ میں اپنی ہی سوچوں میں گم تھا کہ سلطان بابا کی آواز نے مجھے ڈرا ہی دیا۔ "آپ لوگوں نے
ب کیا سوچا ہے۔ کیا پوری بستی میں کوئی بھی ایسا نہیں جو اس ظلم اور زیادتی کے خلاف آواز بلند کر سکے؟" ان
نیوں بزرگوں کے سر ندامت سے جھک گئے۔ "کاش کسی میں اتنی جرأت ہوتی۔ ہم تو بس آپ سے دعا کی التجا
کرنے آئے ہیں۔ آپ دعا کیجیے کہ اللہ ہمیں اس طرح ظالم شخص کے قہر سے بچا لے۔" سلطان بابا کی آواز
لند ہو گئی۔ میں نے انہیں اتنی تیز آواز میں بات کرتے پہلے کبھی نہیں سنا تھا۔ "یہ دعا کا نہیں، عمل کا وقت ہے۔
ندا بھی اُن کی حالت کبھی نہیں بدلتا جو خود کو بدلنے کی کوشش نہ کرتے ہوں۔" تیسرے بزرگ نے پہلی مرتبہ
گفتگو میں دخل دیا۔ "آپ بجا فرماتے ہیں، لیکن اس بستی کی تیسری نسل تک قرضوں میں جکڑی ہوئی ہے۔ ان
کی رُوحیں تک جبروت کی غلام ہیں۔ ان بوسیدہ جسموں سے آپ ایسی کوئی توقع نہ رکھیں۔ شاید ہم سے زیادہ
بے بس کوئی اور نہ ہو۔" سلطان بابا نے تسبیح رکھ دی اور گرج کر بولے "ٹھیک ہے...... اگر ساری بستی کی رُوح

غلام اور جسم بوسیدہ ہو چکے ہیں تو پھر یہ فریضہ بھی اب مجھے ہی سرانجام دینا ہوگا۔ چلو عبداللہ...... مجھے جبر
کے قلعے لے چلو۔ وقت آ گیا ہے کہ اس سے دو بدو بات کر لی جائے۔'' سلطان بابا نے پاؤں اپنی کھڑ
میں ڈالے اور جانے کے لیے اُٹھ کھڑے ہوئے۔ تینوں بزرگ حواس باختہ سے ہو گئے۔ ''یہ آپ کہ
رہے ہیں؟''

قفس اور جبر

اکرام صاحب نے جواب تک سلطان بابا کے اس اچانک فیصلے سے بوکھلائے ہوئے تھے، مدد مانگنے کے انداز میں یوں میری جانب دیکھا جیسے میں واقعی سلطان بابا کو روک ہی تو لوں گا لیکن میں خود اپنے حواس میں کب تھا اور پھر میرا کام تو صرف تعمیل تھا لہٰذا میں سلطان بابا کے حکم کی تعمیل میں اُن کے پیچھے پیچھے مزار سے نکل پڑا۔ راستے میں نوری کے والد نے ایک بار پھر سلطان بابا سے درخواست کی کہ اس طرح براہ راست جبروت کی مخالفت میں کھڑے ہو جانا شاید ٹھیک نہ ہو لیکن سلطان بابا کا کہنا بھی ٹھیک ہی تھا کہ آج نہیں تو کل اس سے کسی نہ کسی کو تو بات کرنی ہی ہوگی تو پھر آج ہی کیوں نہیں۔ بستی قریب آئی تو سلطان بابا نے رُک کر ان تینوں بزرگوں کو مخاطب کیا۔ ''میں آپ لوگوں کی مجبوری سمجھتا ہوں لہٰذا بستی کی اس سرحد سے آگے بڑھنے سے پہلے میں آپ تینوں کو یہ اختیار دیتا ہوں کہ آپ لوگ اپنے اپنے گھر چلے جائیں۔ نوری میرے لیے بھی بیٹی ہی کی طرح ہے لہٰذا آپ سب یہ اطمینان رکھیں کہ میرا کوئی بھی فیصلہ میری اپنی ذات کے لیے ہوگا اور نہ ہی آپ کو مزید کسی مشکل میں ڈالے گا البتہ جو مشکل پہلے سے سر پر آن پڑی ہے اس کا تدارک اب ضروری ہو چکا ہے۔ یاد رہے کہ ظلم کو چپ چاپ سہنے والا ظالم سے بھی بدتر ہے۔'' کچھ دیر کے لیے ماحول پر سناٹا سا چھا گیا، صرف فضا میں اُڑتی چیلوں اور کال گڑھ کے نارنجی آسمان میں بھٹکتے گدھوں کا شور باقی رہ گیا۔ کچھ دیر بعد اکرام صاحب ہی نے اس خاموشی کو توڑا۔ ''آپ ٹھیک کہتے ہیں۔ آخر کسی کو تو پہل کرنی ہی ہوگی۔ آپ بستی کے سگے نہیں لیکن پھر بھی آپ صرف ہم سب کی خاطر یہ زبان بندی توڑنے کے لیے یہاں تک چلے آئے۔ میں اور لڑکی کا باپ بھی آپ کے ساتھ چلیں گے۔'' تیسرے بزرگ کو انہوں نے بڑی مشکل سے بستی کے باہر ہی سے رُخصت کر دیا اور کچھ دیر بعد ہم سب کال گڑھ کے بازار میں جبروت کے قلعے کے سامنے کھڑے تھے۔ بازار میں لوگوں نے نوری کے باپ کو ہمارے ساتھ جاتے دیکھا تو وہ تجسس کے مارے ہمارے ساتھ ہی چل پڑے۔ کال گڑھ کی آبادی مختصر سی تھی اور ظاہر ہے کہ جبروت کے نوری کے لیے بھیجے گئے رشتے کی ان سب ہی کو خبر ہوگی۔ لیکن جب انہوں نے سلطان بابا کو قلعے کے سامنے رُکتے دیکھا تو اُن سب کے قدم وہیں اپنی اپنی جگہ جمتے چلے گئے اور کچھ ہی دیر میں، میں اور سلطان بابا، اکرام صاحب اور نوری کے باپ سمیت ایک ایسے گول مجمعے کے درمیان گھرے ہوئے تھے جو ہم چاروں سے کچھ فاصلے پر یوں کھڑا تھا جیسے ان سب کو کوئی سانپ سونگھ گیا ہو۔ اندر سے قلعے کے دیوہیکل چوبی دروازے کے دربان نے بھی باہر کوئی غیر معمولی بات

محسوس کر کے دروازے کے ایک پٹ میں بنی چھوٹی سی کھڑکی کی درز سے باہر جھانکا اور پھر ہمیں یوں راہ
میں کھڑا دیکھ کر جلدی سے دروازہ کھول کر باہر نکل آیا۔ ”کیا بات ہے، یہ بھیڑ کیوں لگا رکھی ہے یہاں.....“
دربان کی جھاڑ سن کر مجمع میں مکھیوں کی بھنبھناہٹ جیسا ایک شور گونجا اور سب ہی لوگ چند قدم مزید پیچھے ہٹ
گئے۔ سلطان بابا ٹھہری ہوئی آواز میں بولے ”مجھے تمہارے مالک سے بات کرنی ہے۔ جا کر اُسے اطلاع
کہ باہر کچھ ملاقاتی آئے ہیں۔“ دربان کے چہرے پر حیرت کا تاثر اُبھرا۔ اُسے شاید اس لہجے اور اس بے با
کی عادت نہیں تھی۔ ”مالک سے ہر کوئی یوں نہیں مل سکتا۔ مالک اُسی سے ملتا ہے جس سے اُس کی مرضی ہو
ویسے بھی وہ اس وقت یہاں نہیں ہے، شکار کے لیے صحرا کی طرف گیا ہوا ہے۔ شاید کل تک واپسی ہوگی۔
لوگوں کو اگر ملنا بھی ہے تو پہلے مالک سے وقت طے کرنا ہوگا پھر آنا.....“ دربان اپنی بات ختم کر کے نخوت سے
منہ بناتا ہوا واپس اندر پلٹ گیا۔ بھیڑ کے لیے اب مزید کوئی دلچسپی یہاں باقی نہیں رہ گئی تھی لہٰذا لوگ بھی ا
اُدھر چھٹنے لگے۔ بہرحال ہماری آمد کا نصف مقصد تو حل ہو ہی گیا تھا۔ دربان جبروت کی واپسی پر اُسے
اطلاع ضرور دے گا کہ مزار کا بزرگ متولی اُس سے ملنے کے لیے قلعے کے دروازے پر دستک دے چکا ہے
اب ہمارے پاس انتظار کے سوا کوئی اور چارا نہیں تھا۔ لہٰذا میں اور سلطان بابا، اکرام صاحب اور نوری کے اہ
سے رُخصت لے کر واپس مزار کی جانب پلٹ آئے۔ راستے میں میرے ذہن میں ایک عجیب سا خیال آیا
اگر میں کسی طرح نوری کے گھر والوں کو اس بات پر قائل کرنا چاہوں کہ وہ لوگ معاملہ نمٹنے تک نوری کو لے
کہیں روپوش ہو جائیں تو کیا یہ عارضی حل انہیں قابل قبول ہوگا۔ لیکن پھر خود میرے ہی دماغ نے اس خیال
رد کر دیا۔ پہلے تو نوری کے گھر والے میری ایسی کوئی بات سنیں گے ہی کیوں؟ اور پھر اگر میں کسی طر
انہیں قائل کر بھی لوں تو کیا جبروت نے ایسے کسی متوقع اقدام کے لیے پیش بندی نہیں کر رکھی ہوگی۔ میں ج
قدر سوچ رہا تھا اُتنا ہی اُلجھتا جا رہا تھا۔ چاروں طرف سے پھندا نوری کے گرد تنگ ہوتا نظر آ رہا تھا اور شاید
اِسی پھندے کی گھٹن ہی تھی کہ جس نے نوری جیسی سہمی ہوئی چڑیا کو بھی اپنے پنجرے میں پھڑ پھڑانے پر مجبور
کر دیا۔

عصر سے کچھ دیر بعد میں نے جب اُسے اپنے شکستہ قدم باپ کے ساتھ صحرا عبور کر کے مزار کی جانب
آتے دیکھا تو پہلے تو کچھ دیر تک میں اُسے بھی سراب ہی سمجھتا رہا لیکن پھر جب وہ ایک حقیقت کی طرح مزار
دہلیز عبور کر کے میرے سامنے آ کھڑی ہوئی تو مجھے اپنی آنکھوں پر یقین کرنا ہی پڑا۔ میں بے یقینی کے عالم
ان دونوں کے استقبال کے لیے کھڑا ہو گیا۔ سلطان بابا عصر کے بعد اپنے کمرے میں جا چکے تھے اور اس و
مزار کے صحن میں صرف میں تھا یا آس پاس چلتی گرم لو کی سرگوشیاں۔ نوری کے باپ نے سلام کے بعد ٹو
ہوئے لہجے میں کہا، یہ بدنصیب آپ سے کوئی بات کرنا چاہتی ہے، میں اسے لے کر یہاں کبھی نہ آتا کہ ا
اس کے گھر سے باہر نکلے قدموں سے بھی ڈر لگتا ہے۔ لیکن بالآخر ایک مجبور، لاچار باپ اپنی لاڈلی کی آ

ہائش پوری کرنے چلا آیا ہے۔ نوری کی حالت میری سوچ سے بھی زیادہ ابتر تھی۔ اُس کی سوجی ہوئی آنکھیں
ت بھر کے اشکوں کی کہانی سنا رہی تھیں۔ وہ بمشکل اتنا ہی کہہ سکی ”چھوٹے پیر جی..... آپ کسی طرح سانول کو
ماغ کروا دیں ورنہ میں جیتے جی مر جاؤں گی۔“ گویا اُس نے مجھ سے وہی مانگ لیا جس کی توقع میں اُس
ے کر رہا تھا۔ میں نے جلدی سے نوری سے سانول کے شہر کا پتا پوچھا تو اُس نے ہاتھ میں پکڑا ایک مڑا تڑا سا
غذ میرے حوالے کر دیا۔ اس پر سانول ہی کی کچی تحریر میں قریبی شہر کے ریلوے اسٹیشن کے نزدیک کسی مسافر
نے کا پتا درج تھا۔ لیکن یہ قریب ترین شہر بھی کال گڑھ سے پورے ایک دن کی مسافت پر ریل کے راستے
ے منسلک تھا۔ میرے جی میں آیا کہ نوری کے باپ سے کہوں کہ ابھی اپنی بیٹی کا ہاتھ تھامے اور میرے ساتھ
ل گڑھ سے نکل پڑے۔ جبروت کی واپسی سے پہلے ہم ٹرین کے ذریعے سانول تک پہنچ سکتے تھے لیکن
لطان بابا کو یہاں اکیلا چھوڑ کر بھی تو میں کہیں نہیں جا سکتا تھا۔ میرا سر چکرانے لگا۔ میں نے نوری کے باپ کی
ف دیکھا۔ وہ نہ جانے کن خیالوں میں گم مزار کی دیوار سے پرے خلا میں گھور رہا تھا۔ میں نے اُسے پکارا تو
ٹ پٹا سا گیا۔ ”یہاں سے اگلی گاڑی کتنے بجے چھوٹے گی.....؟“ میرا سوال سنتے ہی اُس کے چہرے کا
اُڑ گیا۔ وہ سمجھ گیا تھا کہ میرے ذہن میں کون سا منصوبہ کلبلا رہا ہے۔ ”نہ چھوٹے پیر جی۔ کال گڑھ سے
ر پیر نکالنے کا مطلب ہمیشہ کے لیے یہاں سے علاقہ بدر ہونا ہے۔ پھر میری سات نسلیں بھی یہاں دوبارہ
ا جائیں تو یہ ظالم ہمیں نہیں چھوڑیں گے۔“ ”سوچ لو! تمہیں اپنی اگلی سات نسلیں بچانی ہیں یا اپنی اکلوتی بیٹی
ا زندگی..... فیصلہ تمہارے اپنے ہاتھ میں ہے۔ لیکن کوئی بھی فیصلہ کرنے سے پہلے اتنا ضرور سوچ لینا کہ بیٹی
ہ رہے گی تو.....“ میں نے بات ادھوری چھوڑ دی۔ نوری کے باپ نے بے بسی سے سر پٹخا اور پھر آدھے
ھنٹے کے طویل وقفے کے بعد اُس نے نظر اُٹھائی تو وہ ایک ایسے ہارے ہوئے جواری کی نظر تھی، جس نے اپنا
ب کچھ آخری داؤ پر لگانے کا فیصلہ کر لیا ہو۔ طے یہ پایا کہ رات ساڑھے گیارہ بجے والی گاڑی کو پکڑا جائے
۔ نوری کی ماں کو اس سے پہلے ہی اکرام صاحب کے ساتھ اُونٹوں کے قافلے کی ہمراہی میں آج شام اُس کی
نا کے پاس کسی دوسرے بستی کے لیے روانہ کر دیا جائے گا اور نوری صرف اپنے باپ کے ہمراہ رات دس بجے
ے پہلے مجھے بستی کے باہر ریلوے اسٹیشن کی راہ پر ملے گی۔ میں انہیں گاڑی پر سوار کروا کر واپس کال گڑھ لوٹ
ل گا۔ میں نے سوچ رکھا تھا کہ جبل پور والے خان صاحب کے نام ایک خط بھی نوری کے باپ کے حوالے
ردوں گا اور انہیں مکمل تفصیل اور پتا لکھ کر سمجھا دوں گا کہ وہ شہر پہنچتے ہی سانول کو لے کر آگے جبل پور کے لیے
انہ ہو جائیں۔ مجھے یقین تھا کہ خان صاحب کو ان مظلوم لوگوں کو پناہ دینے میں کوئی تامل نہ ہوگا۔ ساتھ ہی
ہانے یہ بھی سوچ رکھا تھا کہ نوری کے باپ کو اپنے دوست کاشف اور پاپا کے تمام ٹیلی فون نمبرز بھی احتیاط
ے الگ کاغذ پر لکھ کر دوں گا تا کہ کسی ہنگامی صورت میں وہ پہلا ٹیلی فون میسر آتے ہی اُن سے بات کر سکے۔
ہانے نوری کے باپ کا کاندھا تھپک کر اُسے ہمت دلائی اور انہیں رُخصت کیا تا کہ وہ گھر جا کر اس ”ہجرت“

کی تیاری کرسکیں۔ نوری اس تمام گفتگو کے دوران سر جھکائے خاموش کھڑی رہی لیکن واپس پلٹنے سے پہلے شکر گزاری کے بول بولنے کی کوشش میں روہانسی ہوگئی۔ اُس کی آنکھیں چھلک اُٹھیں۔ کبھی کبھی یہ لفظ ہمارے احساس کو منتقل کرنے کے لیے کس قدر کم یاب ہوجاتے ہیں۔ یا شاید بعض جذبے اور احساسات ہوتے ایسے ہیں کہ دنیا کی بہترین لغت بھی ان کے احاطے کے لیے ناکافی ہوجاتی ہے۔

ان کے جاتے ہی میں نے کمرے میں جاکر عبادت میں گم، سلطان بابا کو ساری صورت حال سے آگاہ کیا۔ وہ میری بات سن کر کچھ سوچ میں پڑگئے پھر صرف اتنا ہی بولے۔ ''ٹھیک ہے، اگر ان سب پر یہ زمین ہی تنگ ہوگئی ہے تو پھر ان کا یہاں سے ٹل جانا ہی بہتر ہے۔ تم سے جو مدد ممکن ہو ضرور کرو۔''

رات نو بجے تک میں اپنی تمام تیاریاں مکمل کر چکا تھا۔ خطوط کو علیحدہ علیحدہ لفافوں میں بند کرنے کے بعد میں سلطان بابا سے اجازت لے کر بستی کی جانب چل پڑا۔ اچانک ہی مجھے شدت سے اس بات کا احساس ہوا کہ اپنا گھر بار چھوڑنا، اپنی جائے جنم ترک کرنا کس قدر مشکل اور اذیت ناک عمل ہوتا ہے۔ شاید اسی لیے مذہب میں ہجرت کا اس قدر اعلیٰ درجہ بیان کیا گیا ہے۔ یہ تو گویا ایک بار پھر سے جنم لینے کے مترادف ہی ہے۔ میں بستی کے باہر اسٹیشن کی راہ کو جانے والی صحرائی پگ ڈنڈی پر پہنچا تو مجھے مزار سے نکلے ٹھیک آدھا گھنٹہ بیت چکا تھا۔ چاند پوری طرح کھل کر آسمان سے نور برسا رہا تھا، لیکن نہ جانے کیوں آج یہ چاندنی مجھے کھَل رہی تھی۔ اُجالے کا واسطہ شناخت سے ہوتا ہے اور جب مقصد ہی اپنی شناخت کو دوسروں سے اُوجھل رکھنا ہو تو اُجالا کبھی کبھی کس انسان کا سب سے بڑا دشمن بن جاتا ہے۔ ہم انسان بھی کس قدر مطلبی ہوتے ہیں۔ کبھی اِسی چاند کی چاندنی کے لیے مہینہ بھر انتظار کرنے کے کرب میں مبتلا رہتا تھا اور ٹھیک ہر چاند کی چودھویں رات کو اپنے تمام دوستوں سمیت ساحل پر، یا کھلے سمندر میں کسی بحری جہاز کے عرشے پر حلقہ گلا کرنے اور سجانے کے لیے پہنچ جاتا تھا۔ تب یہ چاندنی مجھے کس قدر رُومان پرور محسوس ہوتی تھی اور آج میرا دل چاہا کہ پورے صحرا کے آسمان پر ایک سیاہ چادر ڈال دوں یا کال گڑھ پر ہی کوئی چھتری تان دوں تاکہ چھوڑنے والوں پر کسی کی نظر نہ پڑ سکے۔ لیکن ایسی چھتریاں اگر کہیں میسر ہوتیں تو جانے کتنے سیاہ نصیب مقدر کے سورج پر تاننے کے لیے بازار سے خرید نہ لاتے۔ کچھ ہی دیر میں ٹیلے سے پرے کچھ آہٹ سی محسوس ہوئی۔ میں نے ٹیلے پر چڑھ کر دیکھا تو دُور ٹیلے سے پرے نوری اور اُس کا باپ تیز قدموں سے ریت کا سینہ عبور کرتے نظر آئے۔ نوری کے ہاتھ میں شاید اُس کے کپڑوں کی ایک گٹھڑی تھی، جسے اپنے سینے سے لگائے اور لمبا گھونگھٹ نکالے وہ اپنے باپ کی تیز رفتار کا ساتھ دینے کی کوشش کر رہی تھی، جو ہر چند قدم بعد رُک کر اپنی بیٹی کو جھڑک کر تیز چلنے کی ہدایت کر رہا تھا۔ کچھ دیر بعد جب وہ ٹیلے تک پہنچے تو نوری کا سانس بُری طرح پھول چکا تھا لیکن اپنے باپ کے خوف سے اپنی اُلجھی سانسوں پر قابو پانے کی کوشش کر رہی تھی۔ میں نے جلدی جلدی تمام تفصیل نوری کے باپ کو سمجھائی اور خط اُس کے حوالے کر دیا۔ ہمارے پاس وقت بہت کم تھا۔ رات

کے دس بج چکے تھے اور ابھی ہمیں گھنٹہ بھر کی مسافت طے کر کے ریلوے اسٹیشن بھی پہنچنا تھا۔ اس لیے ان دونوں کو آگے بڑھنے کا اشارہ کر کے چل دیا۔ اب وہاں صرف صحرا تھا، چاندنی تھی اور ہمارے ریت میں دھنستے قدموں کی چاپ......

میری کوشش تھی کہ ہم صحرا کے مرکز کی بجائے آس پاس ٹیلوں کی آڑ لیتے ہوئے آگے بڑھتے رہیں۔ ہر آہٹ پر ہم تینوں بُری طرح چونک جاتے اور ریت کی غیر معمولی سرسراہٹ سے بھی ہمارا دم اٹکنے لگتا۔ اسٹیشن اب تھوڑی دُور رہ گیا تھا، لیکن منزلوں کا تعلق بھلا فاصلوں کے گھٹنے یا بڑھنے سے کب ہوا ہے اور پھر میری کمند تو ہر بار تب ہی ٹوٹی تھی، جب دو چار ہاتھ باقی تھے بام کو۔ اچانک ہی صحرا میں جیپ کے زوردار انجن کی فراٹے بھرتی آوازیوں گونجی کہ ہم تینوں ہی اُچھل کر رہ گئے۔ جیپ کسی قریبی ٹیلے کے پیچھے ہی چھپا کر کھڑی کر رکھی تھی اور پھر اگلے ہی لمحے تیز ہیڈ لائٹس کی روشنی کے دائرے میں ہمارے پاؤں جم کر رہ گئے۔ نوری کے منہ سے بے اختیار چیخ نکل گئی۔ میں نے چندھیائی ہوئی آنکھوں سے روشنی کے دائرے سے پرے جھانکنے کی کوشش کی۔ فضا میں چند بھدے قہقہے اُبھرے اور جیپ میں بیٹھے چار ہیولوں میں سے ایک ترنگ میں بولا۔ ''کہاں جا رہے ہو چھوٹے پیر جی...... کہو تو ہم چھوڑ آئیں۔'' وہ سب لوگ پھر سے ہنسے اور ایک ہیولا جیپ سے نکل کر روشنی کے سامنے آگیا۔ وہ اکرم تھا۔ جبروت کا خاص کارندہ۔ میرے سینے میں جیسے ایک تیر سا گڑھ کر رہ گیا۔ میں جسے غافل سمجھ رہا تھا، مجھ سے زیادہ ہوش وحواس میں ثابت ہوا۔ جبروت نے پہلے ہی نوری کے گرد پہرا بٹھا رکھا تھا اور اُسے شاید مزار سے شروع ہوئی اس کہانی کی ہر تفصیل کی خبر تھی۔ وہ صرف ہم سے کھیل رہا تھا اور کسی مناسب موقع کے انتظار میں تھا کہ جب ہمیں رنگے ہاتھ پکڑ سکے اور میں نے یہ موقع اُسے پلیٹ میں رکھ کر فراہم کر دیا تھا۔ جیپ کے ڈرائیور نے نوری پر ایک بھرپور نظر ڈالی اور زور سے ہنسا ''کیوں پیر جی، تم اسے بھگا رہے تھے یا یہ تمہیں لے کر بھاگ رہی تھی۔ ویسے معاملہ چاہے کچھ بھی ہو، اس میں تمہارا کوئی قصور نہیں۔ یہ جوانی چیز ہی ایسی ہے کہ انسان خود پر قابو نہیں رکھ پاتا۔'' وہ چاروں پھر سے زوردار قہقہہ لگا کر ہنسے۔ کچھ ہی دیر میں وہ ہم تینوں کو ہانک کر جیپ میں بٹھا کر واپس کال گڑھ کی جانب روانہ ہو چکے تھے۔ نوری اور اُس کے باپ کے چہرے پیلے پڑ چکے تھے، خاص طور پر نوری کی حالت بہت بُری تھی۔ مجھے لگا کہ وہ دھیرے دھیرے کانپ رہی تھی۔ وہ ان چاروں کے سردار کی منظورِ نظر نہ ہوتی تو شاید وہ اُس سے مزید بدتمیزی کرتے ہیں لیکن شاید انہیں اتنا ہی حکم دیا گیا تھا کہ ہمیں قابو کر کے قلعے تک پہنچا دیا جائے۔ نوری کے باپ اور میری مشکیں البتہ وہ پہلے ہی کس چکے تھے۔

جیپ قلعے میں داخل ہوئی تو جس احاطے میں ریچھ کی لڑائی ہو رہی تھی، اس کے بائیں جانب ایک تنگ کی راہ داری سے ہوتے ہوئے گاڑی قلعے کی پچھلی جانب ایک صحن میں جا کھڑی ہوئی۔ چاروں طرف بلند شہتیروں کے ستونوں والے برآمدے تھے اور چاروں جانب کمروں کی قطاریں۔ پھر اُوپری منزل میں روشنی

ہوئی اور ایک کرخت چہرے والا بوڑھا ہاتھ میں بڑا سا گیس لیمپ لیے برآمدے میں نکل آیا۔ وہ اُوپر ہی سے چلا کر بولا۔ ”لے آئے ہو انہیں۔ بند کر دو، الگ الگ کمروں میں۔ صبح سردار لوٹ کر ان کا فیصلہ کرے گا۔“ اکرم کے ساتھ کھڑے کارندے نے مجھے ایک جانب دھکیلا اور دوسرے نے نوری کے باپ کو دوسری جانب دھکا دیا۔ اُوپر سے بوڑھا چلایا۔ ”لڑکی کو چھوٹی سرکار کے پاس لے جاؤ اور بوڑھے کو بند کر دو۔“ نوری چلائی۔ ”میں کہیں نہیں جاؤں گی۔“ لیکن اتنی دیر میں نہ جانے اندھیرے میں کہاں سے دو عورتیں برآمد ہوئیں اور نوری کو کھینچتے ہوئے ایک جانب لے گئیں۔ قلعہ نوری کی چیخوں سے کچھ دیر کے لیے گونجا اور پھر نوری کی آواز اندھیرے میں ڈوبتی چلی گئی۔ مجھے اور نوری کے باپ کو پہلے ہی چاروں کارندے قابو کر چکے تھے۔ نوری کے باپ نے بہت دہائی دی، فریاد کی لیکن ان لوگوں پر بھلا ایسی فریادوں کا کیا اثر ہونے والا تھا۔ چند لمحوں بعد ہی وہ ہم دونوں کو کال کوٹھڑی نما چھوٹے علیحدہ کمروں میں دھکیل کر باہر سے تالا ڈال کر واپس جا چکے تھے۔ بوڑھے کی باتوں سے تو یہی اندازہ لگایا جا سکتا تھا کہ جبروت فی الحال کال گڑھ میں موجود نہیں تھا اور کل اس کی واپسی متوقع تھی۔ لیکن وہ اس قدر شاطر تھا کہ اپنی غیر موجودگی میں بھی نوری کے پہرے کا تمام بندوبست کر کے گیا تھا۔ نوری اور اُس کے بوڑھے باپ پر کیا گزر رہی ہوگی اور پھر وہاں سلطان بابا بھی تو میرا انتظار کر رہے ہوں گے۔ اور جب میں رات بھر مزار نہیں پہنچوں گا، تو وہ بھی تو پریشان ہو جائیں گے۔ سچ ہے کہ تقدیر ہماری تدبیروں سے ایک چال ہمیشہ آگے ہی رہتی ہے۔ رات دھیرے دھیرے سرک رہی تھی۔ اس چھوٹے سے تہ خانے نما کمرے میں صرف ایک مختصر سا روشن دان موجود تھا، جس میں لگی لوہے کی سلاخوں سے باہر آسمان پر چمکتا چاند مجھے یوں دکھائی دے رہا تھا جیسے کسی گول روٹی کو چھری سے چار حصوں میں اُفقی رُخ پر تقسیم کر دیا گیا ہو۔ ابھی کچھ گھنٹوں پہلے مجھے اِسی چاند کی روشنی سے شکایت تھی اور اب اس اندھیری کوٹھڑی میں پھر اِسی کی چاندنی اپنا نور بکھیر کر میری وحشت کم کرنے کی کوشش کر رہی تھی۔ چلو اچھا ہے کہ قدرت کی نعمتیں بھی انسانوں کی طرح ہماری ناشکری پر ہم سے رُوٹھ نہیں جاتیں، ورنہ آج تک ہم میں سے نہ جانے کتنے بارش، ہوا، بادل، دھوپ، خزاں، بہار اور اس جیسی نہ جانے کتنی سوغاتوں سے محروم ہو چکے ہوتے، کہ انسان کی تو فطرت ہی شکوہ ہے۔ میرے ہاتھ اس مضبوطی سے پیٹھ پر بندھے ہوئے تھے کہ رسی کے سخت ریشے کلائیوں کی جلد میں پیوست ہوئے جا رہے تھے۔ میں اِسی طرح بندھے ہاتھوں کے ساتھ اندھیرے میں دیوار ٹٹول کر ٹیک لگا کے بیٹھ گیا۔ دفعتاً سامنے والی دیوار کی جانب ہلکی سی سرسراہٹ ہوئی اور اندھیرے میں دو دیا سلائیاں سی جلتی ہوئی نظر آئیں۔ میرے جسم کو پاؤں کے ناخن سے سر کے بال تک ایک سرد سی لہر جھنجھوڑ گئی۔ یہ کسی جہازی سائز کے چوہے کی دو آنکھیں تھیں جو اندھیرے میں جگمگا رہی تھیں۔ وہ بالکل میرے پیروں کے قریب بیٹھا مجھے گھور رہا تھا۔ مجھے بچپن ہی سے جن چیزوں سے شدید کراہت محسوس ہوتی تھی، چھپکلی اور چوہا اُن میں سرفہرست تھے۔ کہاں تو ان جان داروں کی صرف کمرے میں موجودگی کے احساس ہی سے میری رگیں تن جاتی تھیں اور میں ایک لمحہ بھی

وہاں نہیں گزار سکتا تھا اور کہاں آج میرے قدموں سے صرف چند انچ کے فاصلے پر ایک ایسی ہی مخلوق میری آنکھوں میں آنکھیں گاڑے بیٹھی تھی۔ شاید میں نے جس جگہ دیوار سے ٹیک لگائی تھی وہیں اس چوہے کا گھریا راستہ تھا، لیکن اب میرے مجبوری یہ تھی کہ اپنے بند ہاتھوں کی وجہ سے میں گھٹنے ٹیکے بغیر دوبارہ کھڑا نہیں ہو سکتا تھا اور اگر میں گھٹنے ٹیکنے کی کوشش کرتا تو ڈر تھا کہ کہیں وہ کچلا نہ جائے۔ لہٰذا میں یونہی ساکت بیٹھا رہا اور ہم دونوں اس طرح ایک دوسرے کو گھورتے رہے۔ شاید وہی لمحہ تھا جب ”جبر“ کی صحیح تعریف مجھے سمجھ میں آئی۔ جبر صرف قید و بند کا نام نہیں۔ نہ صرف جسم کا پابند سلاسل ہونا جبر کہلاتا ہے۔ اصل جبر تو روح کی اسیری ہے۔ ہماری رُوح اور ہمارے اندر کو کسی ایسے کام کے لیے پابند کرنا، جو ہماری سرشت اور فطرت کے خلاف ہو، پھر چاہے، رُوح کی وہ بندش کسی عالیشان محل میں کمخواب کے بستر پر ہو یا پھر کسی ایسی کال کوٹھڑی میں، جہاں آج میں بند تھا۔ قدرت نے آج مجھے ایک ایسے جان دار کے ساتھ اس زندان میں لا ڈالا تھا جس کی موجودگی کے احساس ہی سے میری آنتیں اُلٹنے لگی تھیں۔ اور آج وہ میرے اس قدر قریب تھا کہ اس کی تیز دھونکنی جیسی سانس کی آواز بھی میں سن سکتا تھا۔ اس سے بڑا جبر میرے لیے اور کیا ہو سکتا تھا۔ چند لمحوں ہی میں یہ خوف ناک قلعہ، جبروت کی قید، اس رات کی تنہائی اور یہ کال کوٹھڑی سب ہی کچھ میرے لیے بے معنی ہو کر رہ گئے تھے۔ اب اصل امتحان اس چوہے کی جسم کو مس کرتی ہوئی موجودگی میں ساری رات بتانا تھا۔ شاید کچھ اِسی طرح کے جبر کا شکار وہ چوہا بھی تھا۔ ہم دونوں اِسی خیال سے گھنٹوں اپنی جگہ ساکت جمے رہے کہ اگر پہلے نے حرکت کی تو دوسرا بھی ردعمل ظاہر کرے گا اور اسی جبر میں وہ ساری رات گزر گئی۔ روسو نے ٹھیک ہی کہا تھا کہ انسان بظاہر آزاد پیدا ہوتا ہے، لیکن تمام عمر اَن دیکھی زنجیروں میں بندھے گزار دیتا ہے۔ آج مجھے اُن اَن دیکھی زنجیروں کا بخوبی احساس ہو رہا تھا۔ جانے کب چاند ڈوبا اور کب کال گڑھ کے اس ناراض سورج نے اپنی بھٹی سلگائی، باہر قدموں کی چاپ سن کر میری بیتی رات کا وہ ساتھی، شب گرد جلدی سے دوڑ کر قید خانے کی ایک اُبھری ہوئی اینٹ کی اُوٹ میں جا کر چھپ گیا۔ آنے والے جبروت کے دو غلام تھے۔ انہوں گھسیٹ کر مجھے کھڑا کیا اور کوٹھڑی سے باہر دھکیلا۔ زندان سے نکلنے سے پہلے میری نظر چوہے کی نظر سے ٹکرائی۔ میرے دل نے کہا ”شکریہ دوست تم نے مجھے زندگی کا ایک نیا سبق دیا۔ اگر قسمت میں کچھ سانسیں مزید لکھی ہیں تو اب بڑے سے بڑے جبر کا سامنا بڑی آسانی سے کر سکوں گا......“ وہ دونوں غلام مجھے دھکیلتے ہوئے اُسی احاطے کی طرف بڑھنے لگے، جہاں میں نے جبروت کا پہلا تماشا دیکھا تھا۔ جیسے جیسے ہم تنگ راہ داریوں سے گزرتے ہوئے قلعے کے بیرونی احاطے سے نزدیک ہوتے گئے، ویسے ویسے کسی ہجوم کی مکھیوں جیسی بھنبھناہٹ کا شور بڑھتا گیا۔ ایسے لگتا تھا جیسے لوگوں کا ایک بہت بڑا ہجوم دیواروں کی پرلی جانب جمع ہو رہا ہے۔ میں فی الحال برآمدوں کے اندر سایوں سے گزر رہا تھا اور پھر جیسے ہی میں نے آخری غلام گردش کے ختم ہونے پر، کھلے احاطے میں آگ برساتے سورج کی روشنی میں، پہلا قدم رکھا تو میری آنکھیں چندھیا سی گئیں۔ احاطہ لوگوں

سے کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔ اور سب ہی لوگ اُسی طرح ایک گول دائرے میں کھڑے تھے جیسے ریچھ کے تماشے والے دن وہ سب یہاں جمع تھے۔ ایک جانب نوری کا باپ بھی میری طرح پشت پر بندھے ہاتھ لیے سر جھکائے کھڑا تھا۔ ان میں سے چند چہروں کی آنکھوں میں، جنہیں میں بستی میں سانول کی بیماری اور نماز استسقاء کے موقع پر دیکھ چکا تھا، تاسف اور بے بسی کی ایک لہر سی تھی۔ البتہ جبروت کے کارندے ہماری حالت پر خوش تھے اور آپس میں ہنسی مذاق کر رہے تھے۔ اسی اثناء میں ایک جانب سے شور سا اُٹھا اور لوگوں کے بیچ ایک رستہ سا بنتا گیا۔ مجمعے میں کچھ بے چینی کے آثار پیدا ہوئے اور میرا دل الٹنے لگا۔ اکرم اور دو نئے کارندے سلطان بابا کو لیے قلعے میں داخل ہو رہے تھے۔ سلطان بابا کے چہرے پر وہی ازلی سکون طاری تھا، لیکن نہ جانے کیوں مجھے اُن کی حالت کچھ ٹھیک نہیں دکھائی دی۔ سلطان بابا نے اندر آتے ہی رُعب دار آواز میں سارے ہجوم کو سلام کیا اور اطمینان سے تسبیح گھماتے ہوئے ٹھیک میرے سامنے دوسرے جانب آ کر کھڑے ہو گئے۔ وہ میرے بندھے ہاتھ اور حالت دیکھ چکے تھے۔ ہم دونوں کی نظریں آپس میں ٹکرائیں اور مجھے لگا کہ جیسے انہوں نے مجھ سے پوچھا ہو...... "کیسے ہو عبداللہ میاں؟" میں نے بھی اسی غیر مرئی رابطے سے سر ہلا کر انہیں اپنے اچھے ہونے کا اطمینان دلایا۔ انہوں نے ہاتھ اُٹھا کر زیرِ لب دعا دی، لیکن جانے کیوں مجھے اُن کی پلکوں کے گوشے بھیگتے ہوئے محسوس ہوئے۔ میں نے جلدی سے نظر جھکا لی کہ یہ لوگ کہیں میری بھیگی پلکوں کو اس قید اور تکلیف کا شاخسانہ نہ سمجھ لیں۔ کاش دل کی کاٹ سے نکلے آنسوؤں کا رنگ عام درد کے آنسوؤں سے کچھ مختلف ہوتا تو کتنا اچھا ہوتا......

اچانک بھیڑ پر جیسے سکتہ سا طاری ہو گیا۔ پہرے داروں نے جلدی جلدی اپنی جگہ سنبھالی اور پھر احاطے میں بچھے تخت کے پیچھے سے دھیرے دھیرے چلتا ہوا جبروت نمودار ہوا اور اپنی جگہ پر آ کر بیٹھ گیا۔ اُس نے پہلے مجمع پر ایک نظر ڈالی اور پھر اس کی وہ سرد، سفاک اور قہر بھری نظر میرے چہرے پر آ کر ٹھہر گئی۔ میری نظر اُس کی نظر سے ٹکرائی اور کچھ دیر ہم دونوں یونہی ایک دوسرے کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے دیکھتے رہے۔ مجھے اُس کی نظر میں چھپی چنگاریاں فضا میں بکھرتی سی محسوس ہوئیں۔

کبھی ہم بھی خوبصورت تھے

اچانک وہ زور سے دھاڑا "تو تم ہو عبداللہ...... جسے سولی چڑھنے کا شوق اس بستی تک کھینچ لایا ہے۔ ویسے ایک بات ہے تمہاری ہمت کی داد نہ دینا بھی زیادتی ہوگی۔ جبروت کی پسند کو بھگا لے جانے کی کوشش کرنے والا یا کوئی دیوانہ ہو سکتا ہے یا پھر وہ جسے خودکشی کرنے کا کوئی اور طریقہ نہ سوجھا ہو۔ کب سے چل رہا ہے یہ چکر...... لڑکی کی رضا مندی بھی شامل تھی، تمہارے ساتھ بھاگنے میں یا تم ہی نے اُسے ورغلایا تھا......؟" مجمعے میں سناٹا چھایا ہوا تھا۔ میں اتنی دُور سے بھی سلطان بابا کی تسبیح کے دانے گرنے کی آواز سن سکتا تھا۔ میں نے جبروت کی طرف دیکھا "میں اسے بھگا کر نہیں لے جا رہا تھا۔ لڑکی کا باپ بھی میرے ساتھ تھا اور وہ شہر جانا چاہتے تھے، کیوں کہ لڑکی کو تمہارا رشتہ منظور نہیں۔ ساری بستی یہ بات جانتی ہے۔" میری بات سنتے ہی جبروت کے منہ سے غصے کے مارے کف بہنے لگا۔ اُسے شاید اتنے براہ راست جواب کی توقع نہیں تھی۔ وہ زور سے چلایا "سب بکواس ہے۔ مزار کے متولی اور مجاور کے بھیس میں تم لوگ یہ دھندے کرتے ہو۔ بردہ فروشی کے لیے یہی جگہ ملی تھی تم لوگوں کو...... میں جانتا ہوں ہماری بستی کی عورتیں بہت معصوم ہیں۔ ضرور اس کا باپ بھی تمہارے بہکاوے میں آ گیا ہوگا۔ بہر حال لڑکی بھی تمہارے ساتھ جرم میں برابر کی شریک ہے اور میری عدالت تم دونوں کو......" اس کی بات ابھی ادھوری ہی تھی کہ سلطان بابا کی آواز گونجی "کوئی بھی عدالت فیصلہ دینے سے پہلے ملزم کو صفائی کا پورا موقع دیتی ہے۔ تو پھر یہ تمہاری کیسی عدالت ہے، جو خود ہی وکیل ہے اور خود ہی منصف......" جبروت چونک کو پلٹا۔ یہ آج کی دوسری انہونی تھی کیوں کہ آج تک جبروت کے دربار میں کسی کی اتنی ہمت نہیں ہوئی تھی کہ وہ اس کی بات کاٹ سکے۔ وہ پھنکارتی ہوئی آواز میں بولا "اوہ...... چھوٹے میاں تو چھوٹے میاں، بڑے میاں سبحان اللہ...... میں بھول گیا تھا کہ گروہ کا سرغنہ بھی یہیں موجود ہے۔ اتفاقاً ایک بارش کیا برس گئی تم نے تو خود کو اس بستی کا مسیحا ہی سمجھ لیا۔ چلو کیا یاد کرو گے، جبروت کی عدالت تمہیں تمہارے ساتھی کی وکالت کا موقع بھی دیتی ہے۔ پھر نہ کہنا کالی گڑھ میں تمہارے ساتھ انصاف نہیں ہوا۔"

جبروت نے داد طلب نظروں سے مجمع کی طرف دیکھا جہاں کچھ بزرگ ندامت کی وجہ سے سر جھکائے کھڑے تھے۔ جبروت ہجوم کی خاموشی سے چڑ سا گیا۔ اُسے شاید احساس ہو گیا تھا کہ بستی کے بہت سے لوگ دل ہی دل میں اس تماشے سے خوش نہیں ہیں۔ اب یہ خود اس کی اپنی انا کا مسئلہ بھی بنتا جا رہا تھا۔ وہ اب بھی اگر ہمیں عبرت کی مثال نہ بناتا تو اس کی سلطنت کے قلعے میں یہ پہلی نقب ہوتی، جو ایک کمزور اور بے بس بوڑھے کے

ہاتھوں لگتی۔ لہٰذا اُسے اپنے تیور کڑے کرنے پڑے۔ وہ زور سے چلایا ''لیکن یاد رہے کہ اگر تم دونو
صفائی میں کچھ ثابت نہیں کر سکے تو پھر میں تم دونوں کا وہ حال کروں گا کہ تمہاری اگلی سات نسلیں یاد رکھیں
بولو، کیا ثابت کرنا چاہتے ہو......'' سارے مجمع کی توجہ سلطان بابا کی جانب ہوگئی۔ یہ اُن سب کے لیے بھی
انتہائی حیرت انگیز تجربہ تھا کہ انہوں نے آج تک لوگوں کو جبروت کے قدموں میں گرتے اور گڑگڑا کر زند
بھیک مانگتے ہوئے ہی دیکھا تھا۔ سلطان بابا کی تسبیح لگاتار گھوم رہی تھی، وہ ٹھہرے ہوئے لہ
بولے ''عبداللہ کی صفائی کے لیے لڑکی اور اُس کے باپ کا بیان ہی کافی ہے۔ لڑکی تم سے رشتہ نہیں کرنا
اور اپنے باپ کے ساتھ شہر جا کر اپنے منگیتر سے نکاح کرنا چاہتی ہے۔ تم اُسے نہیں روک سکتے۔ یہ لڑکی
ہے۔ اسے شہر جانے دو۔'' جبروت نے زور کا قہقہہ لگایا...... بہت خوب! اسے کہتے ہیں مدعی ست ا
چست۔ جس لڑکی کے حق کے لیے تم مجھے نصیحتیں کر رہے ہو، اُس کا باپ تو وہاں کونے میں سر جھکا
ہے۔ چلو کوئی تو ہے جو جبروت کو بھی نصیحت کر سکے۔ مرنے سے پہلے کوئی اور حسرت ہو تو وہ بھی بیان ک
کوشش کروں گا تمہارے ہر حکم کی تعمیل ہو۔'' کارندوں نے اپنے آقا کی حس مزاح پر مسکرا کر اُسے داد
سلطان بابا نے جبروت کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال دیں۔ ''ہاں...... ایک خواہش اور ہے میری، اگر پو
سکو تو۔ مجھے اس بزرگ جوڑے کی نواسی سکینہ کا پتا بتا دو۔ انہیں اس عمر میں مزید در بدر اور خوار نہ کرو۔'' جب
ہنستے ہنستے ایک دم ہی چپ ہو گیا اور اُس نے اپنی قہر بھری نگاہ سلطان بابا کی اُٹھی ہوئی انگلی کے تعاقب میں
کی طرف دوڑائی۔ بھیڑ جبروت کی اُٹھتی نگاہ سے گھبرا کر ایک دم درمیان سے یوں چھٹی، جیسے کوئی تیر کمان
نکل کر اُن کی جانب لپکا ہو۔ لوگ دونوں اطراف اس طرح ہٹے جیسے کوئی ساکت پانی میں لکیر کھینچ د
لوگوں کی آخری قطار میں سکینہ کے نانا، نانی کھڑے تھے۔ پتا نہیں، وہ پہلے ہی سے اس بھیڑ کا حصہ تھے
جب سلطان بابا کو لایا جا رہا تھا تو وہ بھی اُسی وقت اُن کے ساتھ آ گئے۔ جبروت کی ساری زندہ دلی پل
میں ہوا ہو گئی اور وہ شدید طیش کے عالم میں چلایا۔ ''بس! بہت سن لی تمہاری بکواس، تم کیا سمجھتے ہو کہ تمہا
وعظ سن کر یہاں کے لوگ میرے خلاف اُٹھ کھڑے ہوں گے۔ یہ اچھی طرح جانتے ہیں کہ ان کا اَن
کون ہے۔''

''نہیں یہ تمہاری سب سے بڑی بھول ہے۔ اس ساری کائنات کا اَن داتا صرف ایک ہی ہے۔'' سلط
بابا نے آسمان کی جانب اُنگلی اُٹھائی۔ ''اب بھی وقت ہے، اپنے گناہوں سے تائب ہو کر معافی مانگ لو۔
توبہ کر لو۔ اُس کی رحمت تمہارے گناہوں سے کہیں زیادہ وسیع ہے اور ابھی تمہاری سانس چل رہی ہے لہٰذا تو
وقت بھی باقی ہے۔ اس مہلت سے فائدہ اُٹھا لو۔'' جبروت کے صبر کا پیمانہ اب بالکل ہی لبریز ہو چکا تھا۔
تک کسی نے اُس کے سامنے یوں سر اُٹھانے کی جرأت نہیں کی تھی لیکن آج اُسے ہماری آنکھوں سے اپنا خ
مفقود دکھائی دے رہا تھا جب کہ اس کی حکومت کی تو اصل بنیاد ہی یہ ''خوف'' تھا۔ اس لمحے مجھ پر ایک اور عج

سا انکشاف ہوا۔ ''خوف'' کا واسطہ دراصل ''پوشیدگی'' سے ہوتا ہے۔ جو چیز ظاہر اور واضح ہو جائے، وہ اپنا
اصل خوف اور ڈر کھو دیتی ہے۔ اور شاید ٹھیک اُسی وقت یہی کلیہ جبروت کے ذہن کے کسی کونے میں بھی سر اُٹھا
رہا تھا۔ اُسے سمجھ آ گیا تھا کہ مجھ سے اور سلطان بابا سے کسی قسم کی مزید بحث اُس کا خوف، اُس کی رعایا کے دلوں
سے مزید کم کرنے کا باعث بن سکتی ہے۔ لہٰذا اُس نے دربار ختم کر کے اپنا فیصلہ سنا دیا۔ ''تمہاری تبلیغ کا وقت
ختم ہوا۔'' افسوس تم اپنے ملزم کا دفاع نہیں کر سکے۔ لہٰذا میری عدالت اس لڑکے کو کال گڑھ کی لڑکی کو ورغلا کر
بھگا لے جانے کا مجرم سمجھتی ہے۔ لیکن اسے اپنی بے گناہی ثابت کرنے کا آخری موقع ضرور دوں گا۔ کل صبح
سورج نکلتے ہی عبداللہ کو صحرا میں چھوڑ دیا جائے گا۔ ٹھیک پندرہ منٹ بعد میرے چھ پالتو کتے بھی اس کے پیچھے
چھوڑے جائیں گے۔ اگر ملزم میرے شیروں کی گرفت میں آئے بغیر یہ صحرا پار کر کے اسٹیشن تک پہنچ گیا تو بے
قصور سمجھا جائے گا اور باعزت بری ہوگا۔ دوسری صورت میں یہاں موجود یہ بوڑھا بھی اپنی جان سے جائے
گا۔ اگر کسی کو اس فیصلے پر اعتراض ہے تو بولے......'' مجمع پر سکوت طاری ہو گیا۔ پیش امام نے کچھ ہمت کی اور
حلق تر کر کے بولا ''میری آپ سے درخواست ہے کہ ان دونوں پر رحم کیجیے۔ یہ اس علاقے کے نہیں ہیں۔
انہیں علاقہ بدر کر دیجیے، پر اتنی کڑی سزا نہ دیں۔ ہم سب کی یہی التجا ہے آپ سے......'' جبروت کے ماتھے پر
شکنیں بڑھ گئیں۔ پیش امام کی دیکھا دیکھی چند اور بزرگوں نے بھی جبروت کو دہائی دی، اور اُس کے والد اور
دیگر بزرگوں سے اپنے تعلق کے واسطے دیئے۔ اُس نے ہاتھ اُٹھا کر سب کو یک لخت خاموش کروا دیا۔ ''ٹھیک
ہے۔ کل کو کوئی یہ نہ کہے کہ جبروت بے انصاف ہے۔ اگر عبداللہ اپنے جرم کا اقرار کر لے اور مجھ سے رحم کی اپیل
کرے تو میں اس کی سزا میں کمی کا سوچوں گا۔'' سارے ہجوم کی نگاہیں میری جانب اُٹھ گئیں۔ بھیڑ کی پچھلی
قطاروں میں سے چند ایک نے اشاروں سے اپنے ہاتھ جوڑ کر آنکھوں آنکھوں میں التجا بھی کی کہ میں جبروت
سے معافی مانگ کر یہ قصہ ختم کر دوں۔ میں نے جبروت کی طرف دیکھا ''اگر میری بے گناہی کی سند یہ صحرا دے
سکتا ہے تو میں تمہارے پاؤں پڑنے سے یہی بہتر سمجھوں گا کہ میری قسمت کا فیصلہ یہ صحرا ہی کرے۔'' بزرگوں
نے سر پیٹ لیے۔ جبروت کے اشارے پر مجھے اور سلطان بابا کو وہاں سے دھکیلتے ہوئے پھر سے ان ہی غلام
گردشوں کی جانب روانہ کر دیا گیا۔ البتہ دوسری راہداری مڑتے ہی سلطان بابا کو مجھ سے علیحدہ کر کے وہ کسی
اور جانب لے گئے اور مجھے دائیں جانب بنی کوٹھڑیوں میں سے ساتویں قید خانے میں بند کر دیا گیا۔

یہ کمرا بھی گزشتہ رات والے زندان کی طرح مختصر اور تنگ تھا۔ اس میں باہر کی جانب کھلنے والا کوئی روشن
دان بھی نہیں تھا۔ البتہ اُوپر کی جانب دیوار میں ایک آدھ اینٹ کی جگہ خالی رکھی گئی تھی، جو شاید ساتھ والی کوٹھڑی
کی جانب کھلتی تھی۔ غالباً ہوا کے گزرنے کے لیے یہ انتظام رکھا گیا ہو، کیوں کہ اس کمرے کا دروازہ بھی
سلاخوں والا نہیں تھا لہٰذا سخت لکڑی کا بھدا سا بڑا دروازہ بند ہونے کے بعد دن میں بھی اس کوٹھڑی میں آدھی
رات جیسا گھٹا ٹوپ اندھیرا چھا گیا تھا۔ میں ٹٹول ٹٹول کر دیوار کے ساتھ ٹیک لگا کر بیٹھ گیا۔ میرے کانوں میں

بار بار کال گڑھ پہنچنے کے بعد سلطان بابا کا کہا ایک جملہ گونج رہا تھا۔ ''یاد رکھنا، موت صرف جسم کے فنا ہو جانے کا نام ہے۔ موت کے بعد ہی اصل زندگی کی ابتداء ہوتی ہے۔'' تو کیا میری اس فانی جسم سے رُخصتی کا وقت بھی قریب آ چکا ہے۔ لیکن کیا میرے ذمے اس دنیا کے جتنے فرائض تھے، میں نے وہ سب پورے کر دیے ہیں۔ کیا میری ہر تلاش کی آخری حد یہی موت تھی۔ میں اپنی سوچوں میں گم بیٹھا ہوا تھا اچانک دیوار کے اُوپر والے حصے میں جہاں ایک اینٹ کی درز خالی تھی، آہٹ سی بلند ہوئی اور ایک سرگوشی سی سنائی دی۔ پہلے تو میں اسے اپنا وہم سمجھا۔ لیکن پھر جب دوسری مرتبہ کسی نے دھیرے سے پوچھا۔ ''کوئی ہے؟'' تو میں چونک کر کھڑا ہو گیا ''میں عبداللہ ہوں، تم کون ہو......؟'' دوسری جانب سے آواز آئی ''شش...... آہستہ بولو۔ جبروت کے ک[...] کتے نے اگر تمہاری آواز سن لی تو غضب ہو جائے گا۔ میں پانچ مہینوں سے اس قید تنہائی میں پڑا ہوں۔ میں نہیں چاہتا کہ ہماری باتوں کی آواز سن کر کوئی تمہاری کوٹھڑی بدل دے۔ ترس گیا ہوں میں کسی کی آواز سننے کسی سے بات کرنے کے لیے۔'' مجھے حیرت ہوئی ''لیکن تم کون ہو اور تمہیں کس جرم میں اتنی لمبی قید دی گئی ہے......؟'' ''میرا نام خانو ہے۔ پانچ ماہ پہلے میں بھی جبروت کے وفادار کتوں میں شامل تھا۔ ایک ذرا سی چوک ہوئی اور اس ظالم نے مجھے یہاں لا پھینکوایا۔ سب میرے گناہوں کی سزا ہے۔ اب ساری زندگی مجھے اسی کوٹھڑی میں ایڑیاں رگڑ رگڑ کر مرنا ہے۔ ہم سے پہلے یہاں نہ جانے کتنے اپنی سانسیں ہار چکے ہیں۔'' اچانک دُور کہیں آہٹ سنائی دی۔ وہ جلدی سے بولا ''کوئی آ رہا ہے، اندھیرا ہونے کے بعد بات کروں گا۔'' وہ جو بھی تھا، دیوار سے دُور ہٹ گیا۔ چند لمحوں بعد کسی نے خشک روٹی کے چند ٹکڑے اور عجیب سے رنگ کا شوربہ ایک ٹرے میں رکھ کر دروازے کے نیچے، درز سے اندر کھسکا دیا۔ اور زور سے ہنسا ''کھانا کھا لو جوان! کل تمہیں صحرا ابھی پار کرنا ہے اور خالی ٹرے واپس کھسکا دینا۔'' پھر دوسری ٹرے سرکانے کی آواز آئی ''لے بھائی خانو بھی عیش کر۔ پھر نہ کہنا یاور یاروں کا خیال نہیں رکھتا۔'' جواب میں خانو نے شاید یاور نامی بندے کو کوئی گالی دی۔ آواز مبہم تھی، لیکن یاور کے قہقہے مجھے راہ داری کے آخر تک سنائی دیتے رہے۔ میں نے کھانے کی ٹرے واپس باہر کھسکا دی اور آنکھیں بند کر کے دیوار کے ساتھ کمر ٹکا کر بیٹھ گیا۔ آنکھیں بند ہونے کے بعد بھی تو اُجالے ہمارے اندر اُتر آتے ہیں۔ خاص طور پر جب آس پاس ایسا گھٹا ٹوپ اندھیرا ہو۔ سو میں بھی باہر تاریکی سے منہ پھیر کر بند آنکھوں تلے اپنے اندر کے اُجالوں سے باتیں کرنے لگا۔ جانے کتنے گھنٹے یوں گزر گئے۔ پھر دوبارہ دیوار کی درز سے آواز اُبھری۔ ''عبداللہ تم جاگ رہے ہو......؟'' مجھے اُس کا سوال سن کر ہنسی آ گئی۔ ''تو تمہارا کیا خیال ہے میں اس آرام وہ کمرے کی مسہری پر ٹیک لگائے اپنے غلاموں کا انتظار کرتے کرتے سو گیا ہوں؟'' دوسری جانب شاید خانو کے ہونٹوں پر بھی صدیوں بعد کوئی مسکراہٹ اُبھری ہو گی۔ [...] ہی وہ بولا ''زندہ دل لگتے ہو۔ یہاں کیسے آ پھنسے؟'' میں نے مختصراً اپنا جرم بتا دیا۔ خانو دوسری جانب سے خند لہجے میں بولا ''تم ٹھیک سمجھے ہو۔ وہ اس سے کہیں زیادہ گرا ہوا، خطرناک اور کمینہ صفت انسان ہے۔ وہ [...]

اب کبھی بھی اُس کے چنگل سے نہیں نکل پائے گی اور اسی قلعے میں سسک سسک کر دم توڑ دے گی۔ اس سے پہلے بھی نہ جانے کتنی معصوم لڑکیاں اس درندے کی ہوس کا شکار ہو چکی ہیں۔ آج زندگی میں پہلی بار تمہارے سامنے یہ اقرار کرتے ہوئے میں خود کو بھی انتہائی گرا ہوا انسان محسوس کر رہا ہوں کہ کل تک میں خود بھی اس کے کسی پالتو کی طرح اس کے ہر حکم کی تعمیل کرتا آیا ہوں۔ جانے کتنے بے گناہوں کے خون سے جانے انجانے میں صرف اس کی خوشنودی پانے کی خاطر ہاتھ رنگ چکا ہوں میں۔ اور آج شاید انہی مظلوموں میں سے کسی کی آہ نے مجھے اس حال تک پہنچا دیا ہے۔'' خانو نہ جانے ماضی کی کن بھول بھلیوں میں کھو گیا تھا۔ اچانک میرے ذہن میں ایک کوندا لپکا اور میں نے بڑی مشکل سے اپنی آواز بلند ہونے سے روکی۔ ''سنو خانو! کیا تم سکینہ نامی کسی لڑکی کو جانتے ہو۔ اُسے بھی اسے قلعے کی طرف ہی لایا گیا تھا......؟'' میری بات سنتے ہی دوسری جانب کچھ دیر کے لیے سناٹا سا چھا گیا اور پھر خانو کی ہیجانی سی آواز سنائی دی۔ ''تم سکینہ کو کیسے جانتے ہو...... خدا کے لیے بتاؤ۔ پچھلے پانچ مہینوں سے مجھے اُس لڑکی نے سونے نہیں دیا۔ جب بھی ذرا دیر کے لیے آنکھ لگتی ہے وہ میرے خواب میں چلی آتی ہے۔ مجھے اُس کی آنکھوں سے بہت ڈر لگتا ہے۔ خدا کے لیے مجھے بتاؤ تمہارا اُس لڑکی سے کیا تعلق ہے۔ میں اپنے گناہوں کا تمہارے سامنے اعتراف کرنا چاہتا ہوں۔ میں اس درد اور خوف کے عذاب سے باہر نکلنا چاہتا ہوں۔ میری مدد کرو۔ میں تمہاری منت کرتا ہوں۔'' خانو کا ہیجان اس قدر بڑھنے لگا تھا کہ خطرہ محسوس ہوا کہ اس کی بلند ہوتی آواز آس پاس کے پہرے داروں ہی کو ہوشیار نہ کر دے۔ بڑی مشکل سے میں نے اُسے یہ احساس دلایا کہ ہم دونوں کہاں ہیں۔ کچھ دیر بعد خانو کا جنون کچھ کم ہوا تو اُس نے دھیرے دھیرے سکینہ کی کہانی میرے گوش گزار کرنی شروع کی، جسے سن کر خود میرے اپنے ہاتھ پاؤں بے جان سے ہوتے گئے۔

خانو نے بتایا کہ آج سے تقریباً چھ ماہ پہلے رات کی گاڑی کال گڑھ کے ریلوے اسٹیشن پر معمول سے کچھ زیادہ دیر کے لیے ٹھہری تھی۔ شاید انجن فیل ہو گیا تھا۔ گرمی اور حبس سے گھبرا کر لوگ پلیٹ فارم پر اُتر آئے۔ انہی میں وہ نوجوان جوڑا بھی تھا، جسے رحمان گڑھ جانا تھا۔ لڑکی شرمائی اور گھبرائی ہوئی سی تھی۔ صاف ظاہر ہو رہا تھا کہ ان کی شادی کو ابھی پورا ہفتہ بھی نہیں گزرا ہو گا۔ کیوں کہ لڑکی کے ہاتھوں کی مہندی تک تازہ تھی اور سہاگ کا سرخ جوڑا بھی تن پر موجود تھا۔ جبروت کا خاص کارندہ، اکرم اپنے دو مزید ساتھیوں کے ساتھ اس وقت پلیٹ فارم پر موجود تھا۔ اُس کی عادت تھی کہ وہ رات کی گاڑی دیکھنے کے لیے اسٹیشن ضرور آتا تھا۔ کبھی کبھار کوئی اچھا ''شکار'' ہاتھ لگ جاتا تھا اور آقا کو خوش کرنے کا ایک بہانہ ہاتھ آ جاتا تھا۔ اُس دن خانو بھی اُن کے ساتھ آیا تھا۔ اِسی اثناء میں پلیٹ فارم پر ٹہلتے ہوئے اُن کی نظر اس جوڑے پر پڑی۔ لڑکی کو شاید پیاس ستا رہی تھی اور لڑکا پانی کی تلاش میں اِدھر اُدھر بھاگ دوڑ کر رہا تھا لیکن اس صحرائی اسٹیشن پر بھلا پانی کہاں میسر تھا۔ ٹرین کے مسافروں کے پاس جو تھوڑا بہت پانی تھا، وہ صحرا کے سفر اور پھر اس ویران پلیٹ فارم پر گاڑی کے

تین گھنٹے کے اس غیر متوقع سٹاپ نے ختم کر دیا تھا۔ اور اُس وقت سب ہی مسافر پانی کی تلاش میں سرگرا
تھے۔ رہی سہی کسر اس غضب کی گرمی اور حبس نے پوری کر دی تھی۔ ایسے میں اکرم کی لڑکی پر نظر پڑی اور
کر ہی رہ گئی۔ اُس نے خانو اور دوسرے ساتھی کو اشارہ کیا اور وہ تینوں اُس لڑکی کی جانب بڑھ گئے۔ ٹرین
عملے نے اعلان کر دیا کہ انجن فیل ہونے کی وجہ سے قریب ترین جنکشن سے دوسرا انجن منگوایا گیا ہے لیکن کال
پہنچتے پہنچتے وہ انجن بھی پانچ چھ گھنٹے لے گا۔ یعنی صبح تک انتظار کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا۔ اتنے میں لڑکی کا شو
ناکام و نامراد بنا پانی کے واپس آ پہنچا۔ یہی وہ موقع تھا جس کا انتظار وہاں کھڑا اکرم کر رہا تھا۔ اُس نے فورا
اور مودٔبانہ لہجے میں لڑکے سے درخواست کی کہ اگر وہ مناسب سمجھے تو اُن کے ساتھ بستی تک چل کر پانی
کھانے پینے کی کچھ چیزیں لے آئے۔ لڑکا جس کا نام رحیم بخش معلوم ہوا، کچھ تذبذب کا شکار تھا کہ وہ
نو بیاہتا بیوی کو اکیلے چھوڑ کر کیسے جا سکتا ہے۔ اکرم نے فوراً پانسہ پھینکا کہ رحیم بخش چاہے تو اپنی بیوی کو
ساتھ لے لے۔ اس کے دونوں ساتھی یہیں اسٹیشن پر ٹھہر کر ان کے سامان کی حفاظت کریں گے اور رحیم
اپنی بیوی سمیت جیپ میں اکرم کے ساتھ جا کر ٹرین کے سب ہی مسافروں کے لیے پانی اور کچھ پھل
لے کر واپس آ جائے گا۔ آخر کچھ پس و پیش کے بعد رحیم بخش اس بات کے لیے راضی ہو ہی گیا اور اپنی
کو لے کر اکرم کے ساتھ چل پڑا۔ لڑکی کو وہ سکینہ کہہ کر مخاطب کر رہا تھا، جو کافی پریشان سی دکھائی دیتی تھی۔
نے آنکھوں آنکھوں میں رحیم بخش کو منع کرنے کی کوشش کی لیکن اکرم اس دوران رحیم بخش سے اس قدر
تکلف ہو چکا تھا کہ رحیم بخش جیسے سیدھے سادے انسان کو وہ اس وقت دنیا کا سب سے بھلا آدمی دکھائی
ویسے بھی اکرم جیسے گھاگ شخص کے لیے اس دیہاتی لڑکے کو اپنے جال میں پھانسنا قطعی مشکل ثابت نہیں
خانو اور دوسرا ساتھی دکھاوے کے لیے اسٹیشن ہی پر رُک گئے اور پھر اکرم اور جوڑے کے پلیٹ فارم سے
ہی دوسرے راستے سے کال گڑھ کے لیے نکل پڑے۔ اکرم جیپ میں رحیم بخش اور سکینہ کو لیے سیدھا کال
کے قلعے پہنچ گیا اور انہیں بیرونی احاطے کے ایک مہمان خانے میں چھوڑ کر جبروت کو اپنے ''کارنامے
اطلاع دینے چلا گیا۔ سکینہ اور رحیم بخش کے لیے کچھ ہی دیر میں ایک خادمہ کھانا لیے پہنچ گئی۔ رحیم کو کچھ
تھی۔ اُس نے خادمہ سے کہا کہ انہیں واپس پلیٹ فارم پہنچنا ہے لہٰذا یہ کھانے وغیرہ کا تکلف نہ کیا جائے
خادمہ نے اُسے بتایا کہ اکرم ٹرین کے باقی مسافروں کے لیے پانی اور کھانے وغیرہ کا انتظام کر کے جب
آئے گا، تب تک اُسے یہی حکم ہے کہ جوڑے کو کھانا کھلا دیا جائے۔ خادمہ نے کھانے کے دوران سکی
پھولوں والی اوڑھنی کی بہت تعریف کی۔ سکینہ نے اُسے بتایا کہ یہ چادر اُس کی بوڑھی نانی نے اس بڑھاپے
بھی خاص اپنے ہاتھوں سے سکینہ کی شادی کے لیے کاڑھی ہے۔ خادمہ نے درخواست کی کہ سکینہ جب
یہاں سے دوبارہ گزرے اُس کے لیے بھی ایسی چادر ضرور بنواتی لائے۔ سکینہ نے بھی وعدہ کر لیا۔ اُن کا
گپیوں میں رحیم بخش اور سکینہ نے کھانا کھا لیا اور خادمہ برتن لے کر واپس چلی گئی۔ اس کے بعد رحیم بخش کی

ملی تو سورج سر پر چڑھ آیا تھا۔ وہ گھبرا کر جھٹکے سے کھڑا ہوا تو بستر سے گرتے گرتے بچا۔ ایک دوسرا جھٹکا اُس
منتظر تھا۔ وہ اُسی خادمہ کے کمرے میں موجود تھا۔ جو رات اُسے کھانا دینے آئی تھی۔ رحیم نے چلا کر اُس سے
پوچھا کہ وہ یہاں تک کیسے پہنچا اور سکینہ کہاں ہے......؟'' خادمہ کے کوئی جواب دینے سے پہلے ہی باہر کا دروازہ
زور سے پیٹا جانے لگا۔ رحیم بخش نے دروازہ کھولا تو تین چار مرد غصے میں تن تناتے ہوئے اندر داخل
ہو گئے اور آتے ہی رحیم بخش پر چڑھ دوڑے کہ وہ قلعے کی خادمہ کے کمرے میں کیا کر رہا ہے۔ رحیم چلاتا ہی رہ
گیا کہ وہ تو خود اپنی سکینہ کو تلاش کر رہا ہے لیکن انہوں نے ایک نہ سنی اور بات اتنی بڑھی کہ قلعہ دار کی عدالت کا
دروازہ کھٹکھٹایا گیا۔ وہاں اکرم اور خانو کو جبروت کے دائیں بائیں کھڑے دیکھ کر رحیم کو سارا ماجرا سمجھ آ گیا کہ
اس کے ساتھ کیا کھیل کھیلا جا رہا ہے۔ لیکن اُس کے ہزار چیخنے چلانے کے باوجود اُس پر خادمہ کے کمرے میں
زبردستی نشے کے عالم میں داخل ہونے کا الزام لگا کر صحرا پار کرنے کی سزا سنا دی گئی۔ البتہ اُس وقت جبروت کا
دربار عام نہیں تھا۔ قلعے کے اندر صرف اُس کے چند خاص کارندے ہی موجود تھے۔ سکینہ کو اُس رات بستی کی
مغربی سمت ایک کچے مکان میں قید رکھا گیا تھا اور جبروت کے حکم ہی پر اگلی رات اُسے خانو اور اکرم اُٹھا لائے
تھے۔ آگے کی کہانی بہت مختصر تھی۔ رحیم کبھی وہ صحرا پار نہیں کر سکا۔ سکینہ اُس رات جبروت کی خواب گاہ پہنچا دی
گئی، لیکن تب بھی وہ ایک زندہ لاش ہی تھی اور جب صبح اُسے باہر نکالا گیا، تب وہ اس سانس لینے کے تکلف
سے بھی آزاد ہو چکی تھی۔ کچھ نے کہا کہ وہ خود ہی پھندا لے کر اس ذلت بھری زندگی سے منہ موڑ گئی اور کچھ نے
اسے بھی جبروت کے قاتل پنجوں کے دباؤ کا شاخسانہ قرار دیا۔ بہر حال سکینہ مر گئی......خانو چُپ ہو کر ہانپنے لگ
اور میرے زمین و آسمان ایک ہونے لگے۔ مجھے یوں لگ رہا تھا، جیسے صرف سکینہ ہی نہیں مری، کال گڑھ
کے ہر گھر میں موت نے ڈیرے ڈال دیئے ہیں۔ تب ہی اس بستی میں مجھے ہر پل ماتم کی سی کیفیت محسوس
ہوتی تھی۔ کہتے ہیں، کچھ خون ایسے ہوتے ہیں جنہیں زمین کا دامن بھی خود میں سمیٹنے کی ہمت نہیں کر پاتا۔ خانو
زور سے رو رہا تھا۔ ''جس دن سے سکینہ مری ہے، میں ایک لمحہ بھی چین سے جی نہیں پایا۔ مجھے یوں لگتا ہے
وہ ہر پل میرے آس پاس پھرتی ہے اور مجھ سے پوچھتی ہے کہ مجھے کیوں مار دیا۔ ابھی تو میں نے جینا بھی نہیں
سیکھا تھا۔ ابھی تو شادی کا پرندہ بھی میرے بالوں سے نہیں کھلا تھا۔ ابھی تو مجھے تتلیاں پکڑنی تھیں۔ جگنوؤں
کے پیچھے بھاگنا تھا۔ ابھی تو مجھے اپنے رحیم بخش کے ساتھ رنگوں کی پہچان کرنی تھی۔ ابھی تو میری کئی خواہشیں
تھیں۔ پھر تم نے ان کا گلا کیوں گھونٹ دیا۔'' خانو نہ جانے کیا کیا بولتا رہا اور میرا چہرہ نمکین پانی سے جلنے
نہ جانے وہ میری کون تھی۔ مجھے ہی اُس کی شبیہہ اُس کی موت کے بعد کیوں دکھائی دی؟ کیا واقعی آواز کی
لہروں کی طرح ہماری تصویریں بھی خلا کی کسی تہہ میں ہمیشہ کے لیے باقی رہ جاتی ہیں۔ جس طرح لوگ اپنی
موت کے بعد بھی خوابوں میں زندہ نظر آتے ہیں، کیا میں بھی کسی ایسے ہی خواب کا شکار ہوا تھا؟ کیا یہ صحرا مجھے
کوئی سچا خواب دکھا رہا تھا۔ میرا سر درد کے مارے پھٹنے لگا۔ میں روتے ہوئے خانو کو دو بول تسلی کے بھی نہ

کہہ سکا۔ پھر اچانک جیسے وہ خود ہی ہوش میں آ گیا۔ ''سنو عبداللہ...... مجھے تم سے کچھ بہت ضروری با
ہیں ۔ میں نے ساری زندگی کوئی نیک کام نہیں کیا اور شاید میرا آخری وقت بھی اب کچھ زیادہ دُور نہ
جاتے جاتے میں ایک اچھا کام کرنا چاہتا ہوں۔ کل صبح جس صحرا سے تمہارا مقابلہ ہوگا وہ اس سے پہلے
کتنے معصوموں کا لہو پی چکا ہے، لیکن اگر تم میری چند باتیں دھیان سے ذہن نشین کر لو تو تم اس صحرا او
کے درندہ نما کتوں کو شکست دے سکتے ہو۔ تمہیں صحرا میں جس سمت دوڑنے کو کہا جائے گا، بظاہر اس
تاثر ملے گا کہ اگر تم سیدھ میں دوڑتے رہے تو ریلوے اسٹیشن تک پہنچ جاؤ گے اور تمہاری جاں بخشی
گی ۔ یہ درست نہیں۔ اوّل تو یہ خوں خوار صحرا ایک گھنٹے کی مسافت پر واقع اسٹیشن تک پہنچنا ہی ناکا
ہے۔ لیکن بالفرض کوئی خوش قسمت اسٹیشن تک پہنچ بھی جائے تو وہاں اُسے اکرم اپنا انتظار کرتا ہوا م
پندرہ منٹ تک لگا تار بھاگنے کے بعد ساتویں بڑے ٹیلے سے دائیں جانب کو مُڑ جانا۔ کتے تمہاری
جانب پلٹیں گے، لیکن تب مقابلہ برابر کا ہوگا، کیوں کہ اُن کے لیے بھی تمہاری طرح یہ علاقہ بالک
گا۔ وہاں سے ٹھیک سات میل کے فاصلے پر سرحد کی جانب سے آتی ایک نیم پختہ سڑک گزرتی ہے
سڑک تک پہنچ گئے تو سمجھو کہ آدھی جنگ تم جیت گئے۔ کیوں کہ سڑک پر مشرق کی طرف دوڑتے رہنے
تمہیں فوج کی کوئی چوکی مل جائے گی یا پھر کیکڑا......'' میں نے حیرت سے دہرایا ''کیکڑا......؟'' ''ہاں
مال برداری اور مسافروں کے لیے سرحد کی طرف سے جو کھلے ٹرک نما عجیب ہیئت کی گاڑی چلتی ہے، ا
یہاں کیکڑا کہتے ہیں۔ یہ سواری تمہیں کسی بھی سرحدی بستی تک پہنچا دے گی، جہاں سے تم اپنی مرضی
پناہ تک پہنچ سکتے ہو۔ لیکن یاد رکھنا...... تمہیں مستقل بھاگتے رہنا ہوگا۔ پچھلے دنوں یہاں بارش ہوئی
قسمت نے تمہارا ساتھ دیا تو شاید راستے میں تمہیں کوئی برساتی جوہڑ مل جائے لیکن ہوشیار رہنا دو گھو
زیادہ پانی پینے کی کوشش کی تو وہیں گر جاؤ گے۔ صرف ہونٹ تر کر کے آگے بڑھ جانا۔ اس شدید پیاس
بھی تمہارے لیے زہر ثابت ہوگا۔ اور تمہارا دل بند کر دے گا۔ ایک اور ضروری بات، کوشش کرنا ک
دوڑتے وقت سانس منہ کی بجائے ناک سے لو اور سورج کو براہ راست دیکھنے سے مکمل گریز کرنا۔ جو
کر نیفے میں اُڑس لینا، پھینکنا نہیں۔ پاؤں شروع میں گرم ریت میں جھلسیں گے لیکن تلوؤں کی جلد پو
جل جانے کے بعد احساس ختم ہو جائے گا۔ پانی میسر آتے ہی کوئی رومال وغیرہ اچھی طرح بھگو کر س
لینا۔ اور میں پھر کہہ رہا ہوں کہ بھاگتے رہنا۔ یہ تین ساڑھے تین گھنٹے تمہیں اپنی زندگی کی دوڑ دوڑ
ہی جیتنی ہے۔ اگر گناہ گاروں کی دعائیں بھی قبول ہوتی ہیں تو میں آج زندگی میں پہلی اور آخری دعا
کہ خدا تمہیں اس امتحان میں کامیاب کرے......'' خانو کی آواز آنسوؤں میں رندھ گئی۔

صبح ہونے میں کچھ دیر باقی تھی۔ مجھے رہ رہ کر سکینہ کے بوڑھے نانا نانی کا دھیان ستا رہا تھا۔ ا
کہ میں دوبارہ اُن کا سامنا کرنے سے پہلے ہی صحرا کی ریت میں خاک ہو جاؤں ورنہ میں انہیں کیسے

اُن کی لاڈلی سکینہ بھی اب مٹی کا حصہ بن چکی ہے۔ میں نے خانو سے آخری سوال پوچھا ''کیا تمہیں سکینہ کی قبر کا
کچھ اتا پتا معلوم ہے۔ اُس کے ورثاء کو اور کچھ نہیں تو اُس کی لحد کا نظارہ ہی نصیب ہو جائے تو شاید اُن بدنصیبوں
کو کچھ قرار مل سکے......'' خانو کچھ سوچ میں پڑ گیا ''یہاں کم ہی خوش نصیب ایسے ہوتے ہیں جنہیں باقاعدہ کوئی
قبر نصیب ہوتی ہے۔ ٹھہرو مجھے سوچنے دو۔ سکینہ کو تو شاید اسی احاطے میں دفنایا گیا تھا۔'' ''کیا......؟'' لفظ تھے
کہ انگارے...... میری سانسیں رُکنے لگیں۔ ''اسی احاطے میں دفنایا تھا۔ ٹھیک سے یاد کرو، کہاں۔ یہ بہت
ضروری ہے خانو......'' خانو نے اپنا سر پیٹا ''ارے ہاں...... یہی تو جگہ تھی۔ اِسی برآمدے میں دائیں جانب
سے ساتویں کوٹھڑی تھی۔ ہاں ہاں، ساتویں کوٹھڑی ہی میں اُسے دفنایا تھا ہم نے۔'' خانو کی بات سنتے ہی میں
چکرا کر اپنی جگہ ڈھے سا گیا۔ زمین کی گردش رُک گئی۔ آسمان پلٹ گیا اور زمین اوندھی ہو گئی۔ مجھے جس کوٹھڑی
میں قید کیا گیا تھا، اس کا نمبر داہنی طرف سے ساتواں ہی تھا۔ سکینہ اِسی زمین کے نیچے دفن تھی، جہاں میں اس
وقت اپنا شکستہ وجود لیے بیٹھا تھا۔

اک نئی جنگ

سورج نکلنے تک میں وہیں اپنی جگہ ساکت بیٹھا رہا اور دیوار کے ساتھ ٹیک لگا کر اپنے پاؤں آخری
حد تک سکیڑ کر گھٹنے اپنے سینے کے ساتھ اُس وقت تک جوڑے رکھے، جب تک مجھے لینے والے وہاں پہنچ
گئے۔ میں اُس مظلوم لڑکی کے لیے اور تو کچھ نہ کر پایا لیکن اتنا تو کر ہی سکتا تھا کہ اُس کے مدفن پر اپنے پا
پھیلا کر نہ بیٹھوں۔ باہر آہٹیں بلند ہوئیں تو میں نے خانو کو الوداع کہا۔ ''میں جا رہا ہوں دوست۔ اگر تم ی
سے زندہ نکلنے میں کامیاب ہو گئے تو اتنا ضرور یاد رکھنا کہ کفارے کی آس تو آخری سانس تک رہتی ہے۔'' م
بات پوری ہونے سے قبل ہی پہرے دار آ پہنچے۔ خانو کی آخری آواز، جو میرے کانوں تک پہنچی وہ ''رب را
تھی۔ کچھ ہی دیر میں مجھے جیپ میں بٹھا کر بستی کی حد تک پہنچا دیا گیا۔ پوری بستی کے مرد وہاں م
تھے۔ جبروت کے کارندے اور محافظ بھی اسلحہ سنبھالے اِدھر اُدھر گھوم رہے تھے۔ کچھ دیر میں وہ سلطان بابا ا
وہاں لے آئے۔ اب شاید صرف جبروت اور اُس کے کتوں کا انتظار باقی تھا۔ سلطان بابا میری جانب بڑ
پہرے داروں نے کوئی اعتراض نہ کیا۔ انہوں نے تسبیح ختم کی اور مجھ پر پھونک دیا۔ ''جب تک ہماری ایک
سانس باقی ہے، موت زندگی کی خود سب سے بڑی محافظ ہوتی ہے۔ یہ دنیا صرف ابتدا ہے۔ انتہا کا سفر اِ
سے پرے شروع ہوتا ہے۔ مجھے تم پر فخر ہے۔'' میرے ہاتھ بندھے ہوئے تھے، ورنہ میں انہیں آگے بڑ
گلے لگا لیتا۔ مجھے اپنے اس آخری سفر سے پہلے اس زادِ راہ کی اشد ضرورت تھی۔ انہوں نے شاید میری آ
کی تحریر پڑھ لی اور خود ہی بڑھ کر مجھے گلے لگا لیا۔ ''جیتے رہو۔'' اُن کے منہ سے بے ساختہ نکلنے والی اس د
اہمیت آج مجھ سے زیادہ بھلا اور کسے محسوس ہوئی ہوگی۔ کچھ ہی دیر میں جبروت اپنی مخصوص جیپ میں
لاڈلے کتوں سمیت دُور صحرا سے نمودار ہوتا نظر آیا۔ ریت سے اُٹھتی گرم لہروں کے پس منظر میں اُس کی
شفاف پانی میں تیرتی نظر آ رہی تھی۔ اچانک میرے ذہن میں ایک عجیب سا خیال آیا کہ جبروت ایک بہ
شعبدہ باز ہے۔ وہ ایسے کھیل صرف اپنی تفریحِ طبع کے لیے کھیلتا ہے۔ پھر چاہے وہ رحیم اور سکینہ کا معا
نوری اور عبداللہ کا قصہ۔ دونوں جگہ وہ پوری طرح مختار تھا کہ بنا کسی حجت کے بھی۔ مجھے اور رحیم کو د
میں ختم کروا سکتا تھا۔ بغیر کسی عدالت اور فیصلے کے ڈھونگ کے بھی وہ ہماری جان لے سکتا تھا۔ یہاں اُ
پوچھنے والا بھی نہیں تھا۔ اگر آس پاس کے علاقے کی پولیس اور قانون خاموش تھا تو ضرور اس کے پیچھے بھ
کا اثر و رسوخ شامل ہوگا۔ کال گڑھ تو ایک جنگل تھا اور اس جنگل میں صرف جبروت نامی بادشاہ کا قانو

ا۔ جانے ان نسلوں سے غلام چلے آتے لوگوں کو اس بات کا احساس بھی تھا کہ وہ ایک آزاد ملک کے شہری ہیں
نہیں۔ غلامی زنجیروں میں بندھے رہنے ہی کا نام نہیں ہوتا۔ غلامی تو ایک خاص رویے کا نام ہے، جو ذہنوں کو
سخر کر لینے سے وابستہ ہے اور جبروت کو پتا تھا کہ ذہنوں کو مسخر کیسے کیا جاتا ہے۔ رُوحوں کا تو پتا نہیں، پر
سموں کو تسخیر کرنے کے لیے وہ خوف کے ہتھیار کا استعمال کرتا تھا۔ اُسے لوگوں کو حیران اور خوف زدہ کر کے مزا
تا تھا۔ یہ سارا تماشا اُس نے اپنے جنون کی سیرابی کے لیے ہی لگا رکھا تھا۔ دو تین سال پہلے میں اور میرا
وست، کاشف لندن گرمیوں کی چھٹیاں گزارنے کے لیے گئے تھے تو ہمیں پکاڈلی کے علاقے میں ایک عجیب
لب کے بارے میں پتا چلا تھا۔ وہاں ہم نے خود اپنی آنکھوں سے لوگوں کو خود کو سانپوں سے ڈسواتے ہوئے
یکھا۔ وہاں لوگ اسے ایڈرنالین رَش (Adernaline Rush) کا کھیل کہتے تھے۔ ہمارے جسم میں موجود
ب مادّے (ہارمون) کے بہنے کا تعلق شدید خوف سے ہوتا ہے۔ مغرب میں جہاں لوگ ہر قسم کے تعیش
رتجربے سے گزر چکے ہوتے ہیں، اُن کے لیے زندگی ایک بے کیف سا معمول بن کر رہ جاتی ہے۔ ایسے میں
بھ من چلے اپنے جسم میں خون کی روانی بحال رکھنے کے لیے عجیب و غریب قسم کے مشاغل اختیار کر لیتے ہیں۔
ئی بہت بلندی سے چھلانگ لگا لیتا ہے، کچھ سانس بند کرنے کی کوشش میں جان سے جاتے ہیں، کچھ ریوالور
ے ایک چیمبر میں گولی رکھ کر ٹریگر دبانے کا کھیل کھیلتے ہیں اور کچھ وائٹ گولڈ (ہیروئن کی ایک نئی قسم) کے
وف کو اپنے نتھنوں کے ذریعے اس طرح دماغ کے خلیوں تک پہنچاتے ہیں کہ پھر وہ سدا کے لیے کسی اور
اں کے باسی بن جاتے ہیں۔ لیکن اس ایڈرنالین رَش (Adernaline Rush) کا یہ جان لیوا نشہ باقی
م نشوں کا سرتاج بن جاتا ہے۔ وہ خود کو موت کے منہ میں دھکیل کر اس قضا کو پل پل اپنی رگوں میں اُترتا ہوا
سوس کرنے میں ایسی سدا بہار لذت پاتے ہیں، جو انہیں اپنی جان سے بھی زیادہ عزیز ہو جاتی ہے۔ جبروت
ا ایسے ہی کسی نشے کا شکار اور رسیا تھا۔ یہ بات مجھے اُسی دن محسوس کر لینی چاہیے تھی، جب میں نے اُسے
ھ سے اپنے کتے لڑاتے اور خون کے چھینٹے اُڑتے دیکھ کر ہیجانی انداز میں خوشی مناتے ہوئے دیکھا
۔ ٹھیک ایسی ہی خوشی وہ اُس وقت بھی محسوس کرتا ہوگا، جب اُس کے پالتو شکاری صحرا میں اپنے شکار کی
بوٹی کر کے اُس کے خون آلود کپڑے اپنے جبڑوں میں دبائے واپس اپنے آقا کے پاس دوڑے چلے آتے
۔ مغرب ایسے جنونیوں کی داستانوں سے بھرا پڑا ہے، جو صرف ہیجان کی خاطر قاتل بنے اور پھر کبھی جیک
ا رپر (Jack The Ripper)۔ کبھی فرینکنسٹائن (Frankinstine) اور کبھی فریڈی کے نام سے مشہور
ئے۔ ٹھیک اُسی طرح اس وقت میرے سامنے جیپ سے اُتر کر اپنے کتوں کو والہانہ پیار کرنے والا یہ جنونی
ں بھی کسی ایسی ہی نفسیاتی بیماری کا شکار تھا۔ جسے خود کو جابر سے جبروت بنانے میں جانے کتنے سال لگے
ں گے۔ کہتے ہیں، نام بھی ہماری شخصیت پر گہرا اثر ڈالتے ہیں۔ اس کا ایک مظاہرہ تو میں اپنے سامنے ہی
ر رہا تھا۔ جبروت اپنے کتوں کو پیار کر کے میری طرف بڑھا۔ ''ہاں تو تم تیار ہو، مقابلے کے لیے۔ اب بھی

وقت ہے اگر تم اپنے جرم کا اقرار کر لو اور مجھ سے معافی مانگ لو تو تمہاری سزا میں کمی کی جا سکتی ہے،
جی......" جبروت کی آنکھوں میں صرف اور صرف تضحیک تھی۔ میں نے چند لمحے اُس کی جانب غور سے
"اگر میں نے تم سے معافی مانگ لی تو تمہارا یہ کھیل ادھورا رہ جائے گا۔ پھر شاید میں نہیں تو کوئی اور اس ج
بھینٹ چڑھ جائے کیوں کہ تمہیں تو بہر حال یہ خونی تماشا کرنا ہی ہے کیوں کہ صرف اِسی صورت تمہار۔
بھڑکتی یہ لہو کی پیاس شاید کچھ دنوں کے لیے بجھ جائے گی۔ ہو سکے تو آج یہاں سے فراغت پانے کے
کے کسی بڑے ماہر نفسیات سے مل لینا۔ شاید وہ تمہاری کچھ مدد کر سکے۔" وہ کچھ دیر میری جانب عجیب
میں دیکھتا رہا، پھر سرسراتی ہوئی آواز میں بولا "یا تو تم واقعی بہادر ہو یا پھر موت کو اتنے قریب پا کر ہر خو
تمہارے ذہن سے مٹ گیا ہے۔ مجھے بھی روتے گڑگڑاتے اور پیروں میں پڑتے دشمن اچھے نہیں لگتے
میں انہیں بھی مارتا تو ضرور ہوں لیکن عزت کی موت نہیں۔ تم نے البتہ آج اپنے لیے ایک باوقار مو
ہے۔ اطمینان رکھو، تمہاری موت کے بعد بھی کال گڑھ میں تمہارا نام غیرت مند دشمنوں کی فہرست
جائے گا۔" جبروت اپنی بات ختم کر کے آگے بڑھ گیا۔ میں نے ہجوم اور سلطان بابا پر الوداعی نظر ڈالی ا
میں دوڑ شروع کرنے کے نشان کی طرف بڑھ گیا۔ وہاں مجھے غرّاتے، گھورتے اور اپنے خوں خوار جبڑو
رال ٹپکاتے قد آور کتوں کے بے حد قریب سے گزارا گیا تا کہ وہ میرے جسم کی بُو کو اپنے دماغ کے خلیو
اچھی طرح ذہن نشین کر لیں۔ جس وقت میں ان چھ کتوں کے قریب سے، اپنا جسم اُن کے جبڑوں
کرتے ہوئے گزر رہا تھا، میری رگوں میں ایک عجیب سی جھنجھناہٹ پیدا ہو رہی تھی۔ شاید میرے اندر بھ
ایڈرنالین نامی ہارمون کا بہاؤ شروع ہو چکا تھا، جس کی لذت پانے کے لیے جبروت تپتی دھوپ میں
تماشا دیکھ رہا تھا۔ میری اور اُس کی کیفیت میں فرق صرف اتنا تھا کہ میری کیفیت میرے متوقع خون بہنے
سے تھی جب کہ جبروت کا ایڈرنالین دوسروں کا خون بہتے دیکھ کر اُس کے اندر دوڑتا تھا۔ اُس نے اپنی کا
بندھی گھڑی کی طرف دیکھ کر مجھ سے کہا "اب سے ٹھیک پندرہ منٹ کے بعد ان کتوں کے پٹے کھول
جائیں گے۔ تم یہاں سے ٹھیک اپنی سیدھ میں دوڑو گے تو ایک گھنٹے بعد ریلوے اسٹیشن تک پہنچ جاؤ گے
شرط صرف اتنی سی ہے کہ میرے یہ پالتو شیر اس سے پہلے تم تک نہ پہنچ جائیں اور ہاں بے فکر رہو یہ سد
ہوئے ہیں لہٰذا یہ اسٹیشن کی عمارت دیکھتے ہی دُور سے پلٹ جائیں گے۔ تو کہو، تم تیار ہو؟" میں نے
"ہاں" کہا اور جبروت کا اشارہ پاتے ہی صحرا میں دوڑ لگا دی۔ پہلے دو تین منٹ تو مجھے کچھ احساس ہی نہ
لیکن جیسے ہی میں نے پہلا ٹیلا پار کر کے خانو کی ہدایت کے مطابق اپنے جوتے اُتارے، ایک لمحے
یوں محسوس ہوا، جیسے ہزاروں ننھے مُنے انگارے میرے تلووں سے ہوتے ہوئے، خون کے اندر سرایت
ہیں۔ کچھ دیر کے لیے تو مجھے دن ہی میں تارے نظر آ گئے اور میں نے بے اختیار اپنی ہتھیلیوں سے اپنے تلو
یکے بعد دیگرے اس آگ کی تپش سے بچانے کی کوشش کی، لیکن میرے پاس اتنا وقت ہی کہاں تھا کہ

سب کچھ کر پاتا۔ میرے ذہن میں بار بار خانو کا ایک جملہ گونج رہا تھا "یاد رکھنا، تمہیں ہر حال میں بس دوڑتے
ہی رہنا ہے۔" میں نے شدید تکلیف سے کراہتے ہوئے مجبوراً اس آگ کے سمندر میں دوبارہ پاؤں ڈال
دیئے۔ صحرا کے پہلے پانچ منٹ ہی نے میرا وہ حال کر دیا تھا، جو کسی ایسے خستہ حال شخص کا ہو سکتا تھا، جو اس
تپتے ریگ زار میں برسوں سے بھٹک رہا ہو۔ میرے ہونٹ خشک ہو کر چٹخنے لگے۔ سانس دُھونکنی کی طرح چلنے،
حلق میں ہزاروں کانٹے چبھنے لگے۔ بے اختیار میں نے منہ سے سانس لینے کی کوشش کی تا کہ حلق میں لگی آگ
کو کچھ ٹھنڈک ملے لیکن پہلے ہی سانس میں اُڑتی ریت کے بگولے سے ہزاروں ذرّے کسی خاردار تار کی طرح
میرے گلے سے ہوتے ہوئے سانس کی نالی میں اٹک گئے اور مجھے زور دار کھانسی کا پھندا لگا۔ میں گرتے
گرتے بچا۔ خانو کی آواز پھر ذہن کے کسی گوشے سے ٹکرائی "منہ سے سانس لینے کی کوشش کبھی نہ کرنا۔" میں
نے اپنے ہونٹ سختی سے بھینچ لیے۔ پانچواں ٹیلا پار کرتے ہی میری آنکھوں تلے اندھیرا سا چھانے لگا۔ پاؤں
کے تلووں میں پہلے منٹ میں جوتے اُتارتے ہی جو چھالے بنے تھے، وہ ایک ایک کر کے پھٹنے لگے اور مجھے
ہر چھالا پھٹنے پر ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے میرے پیروں پر ہزاروں نشتر لگا کر مجھے ان کھلے زخموں کے ساتھ نمک
کے سمندر پر چلنے کے لیے مجبور کر دیا گیا ہو اور وہ نمک میرے کھلے منہ والوں زخموں سے، خون میں مل کر اسے
جلا رہا ہو، کھولا رہا ہو۔ اس تُرش نمک کی کڑواہٹ مجھے اپنے حلق میں، سارے جسم میں دوڑتی محسوس ہو رہی
تھی۔ دسویں منٹ کے ختم ہوتے ہی وہ تپتے جہنم جیسا صحرا میرے ساتھ کھیل کھیلنے لگا۔ مجھے اپنے سامنے
تھوڑے ہی فاصلے پر ٹھاٹھیں مارتا ایک وسیع سمندر دکھائی دیا۔ ارے اتنا بہت سا پانی۔ میں اپنی سمت بھول کر
اس جانب لپکا۔ میرے اندر بیٹھا خانو چلایا "براہ راست سورج کو نہ دیکھنا......" لیکن کچھ لمحے پہلے ہی میری
نظر اس قہر برساتے گولے پر غیر اختیاری طور پر پڑ چکی تھی۔ یہ سامنے بہتا سمندر اور شفاف لہریں اسی سورج کی
جلتی کرنوں سے ملی میری نظر کا شاخسانہ تھیں۔ مجھے زور کا ایک چکر آیا اور میں اپنی ہی جھونک میں لڑھکتے
ہوئے ٹیلے سے نیچے جا گرا۔ میری آنکھوں میں ریت پڑ گئی اور کچھ دیر کے لیے میں اندھا سا ہو گیا۔ اچانک
دور کہیں سے ڈھول بجنے کی آواز سنائی دی۔ میری ساری حسیں جیسے ایک ساتھ ہی بیدار ہو گئیں۔ یہ اس بات
کی نشانی تھی کہ جبروت نے اپنے کتے میرے تعاقب میں کھول دیئے ہیں۔ اگر مجھے یہاں یہ آواز سنائی دے
رہی تھی تو اس کا صاف مطلب یہ تھا کہ میں اتنی دیر تک دوڑنے کے باوجود ابھی آغاز کے مقام سے زیادہ دُور
نہیں تھا۔ سامنے ہی میری جلتی آنکھوں نے ساتویں ٹیلے کے آثار دیکھے اور میرے شدید تھکے، ٹوٹے اور شکستہ
جسم نے ایک اور کوشش کی۔ اچانک میرے ذہن نے کام کرنا چھوڑ دیا۔ خانو نے کیا کہا تھا۔ ساتویں ٹیلے سے
دائیں یا بائیں......؟ شاید دائیں......؟ نہیں نہیں بائیں جانب، لیکن......شاید دائیں......؟ میں سرپٹ دوڑ تو
رہا تھا لیکن میرا ذہن جیسے سُن سا ہو کر رہ گیا تھا۔ ساتواں ٹیلا ریت کی ایک ڈھیری سے بڑا ہوتے ہوئے ایک
چھوٹی پہاڑی میں تبدیل ہوتا گیا اور پھر جیسے ہی میں دوڑتے ہوئے اس کے اُوپر چڑھا تو میرے ذہن نے

میکانیکی انداز میں فیصلہ دے دیا۔ دائیں جانب...... اور میں مشینی انداز میں داہنی طرف مُڑ گیا۔ شدید سے میرا بُرا حال ہو رہا تھا۔ بس ایک بوند پانی اس وقت میری زندگی کی سب سے بڑی خواہش تھی۔ پھر مجھے موت ہی کیوں نہ آجائے۔ اچانک میری نظر دُور صحرا میں چمکتے ایک سکّے پر پڑی جو دھوپ کی کرنوں جگمگا رہا تھا لیکن یہ طلائی سکہ یہاں......؟ اور پھر وہ جگمگاتا سکہ بڑا ہوتا گیا۔ ارے...... یہ تو لوہے کی ایک سی پرات تھی۔ نہیں۔ اوہ میرے خدا، یہ تو چھوٹا سا جوہڑ تھا۔ بارش کے پانی سے بنا ایک چھوٹا سا جوہڑ، جو بڑے ٹیلے کی آڑ میں عمودی رُخ پر اس طرح بنا تھا کہ دھوپ براہِ راست وہاں نہیں پہنچ پا رہی تھی۔ کیا د اتنی جلدی بھی قبول ہو جاتی ہیں۔ کیا اس صحرا سے عرشِ بریں کچھ زیادہ ہی قریب تھا یا پھر میرا آخری وقت ق آ رہا تھا کہ فرشتوں نے میرے حساب کتاب کے بستے سمیٹتے سمیٹتے میری آخری دعائیں بھی سمیٹنا شروع تھیں۔ میں کسی دیوانے کی طرح دوڑتے ہوئے جوہڑ کے قریب پہنچا اور میرا شدید جی چاہا کہ اپنا م گدلے پانی میں ڈال کر وہیں پڑ جاؤں۔ اس وقت وہ چھوٹا سا جوہڑ کیا، میں پورا دریا بھی ایک ہی گھونٹ پی جانا چاہتا تھا۔ ''خبردار...... گھونٹ بھر پینے کی کوشش نہ کرنا، ورنہ دل بند ہو جائے گا۔'' میں نے ''نہیں، اب اور کوئی نصیحت نہیں۔ اس شدید پیاس کے عالم میں مرنے سے تو بہتر ہے کہ میں دو گھونٹ پی مر جاؤں۔'' اُس وقت مجھے ادراک ہوا کہ لوگ مرنے سے پہلے پانی کیوں مانگتے ہیں۔ میری نسوں میں خون گاڑھا ہو کر میرے اندر موجود پانی کا آخری قطرہ تک چوس چکا تھا۔ مجھے یوں لگا، جیسے کنپٹی پر پھڑکتی نس اس زور سے پھٹے گی کہ سارے صحرا کو لال کر جائے گی۔ میں نے جلدی سے ہتھیلیوں میں پانی بھرا او پھر چھم سے کود کر میرے سامنے کسی کے بندھے ہاتھوں کی صورت آن کھڑا ہوا۔ ''نہیں عبداللہ، نہیں۔ یہ نہیں موت ہے۔'' دفعتاً میری ہتھیلی میں کوئی موٹی سوئی زور سے گڑ گئی۔ تکلیف سے میری چیخ نکلتے نکلتے اور میری آنکھوں سے آنسو بہہ نکلے۔ میں نے جلدی سے اپنے ہاتھوں کی جانب دیکھا، جن کے کٹورے ابھی تک جوہڑ سے نکالا گیا پانی ٹپک ٹپک کر گر رہا تھا۔ ایک لمبی اور موٹی سی کالی جونک میری ہتھیلی کی جلد ماس تک اپنے نوکیلے دانت گاڑ چکی تھی اور ایک دوسری جونک چلتی ہوئی میری کلائی کے قریب خون چوسنے لیے کوئی مناسب جگہ تلاش کر رہی تھی۔ میں نے جلدی سے گھبرا کر پانی پھینک دیا۔ کلائی والی جونک تو پانی بہاؤ کے ساتھ ہی گر گئی لیکن ہتھیلی والی سرمئی جونک، میرے سیاہ مقدر کی طرح میرے گوشت سے چپکی ہی درد، جلن اور چبھن کی ایک کٹیلی لہر میری اُنگلیوں کی پوروں سے ہوتی ہوئی، پورے بازو میں پھیل گئی۔ میرا نیلا پڑنے لگا اور میں نے بے اختیار شدید تکلیف کے عالم میں اپنا ہاتھ گرم جلتی ریت میں گھونپ دیا۔ جونک نازک اور لجلجی سی چپکیلی جلد سے شدید تپتی ریت ٹکرائی تو ہلکی سی ایسی آواز بلند ہوئی، جیسے جلتے ہوئے انگا پر کوئی پانی کا چھینٹا مار دے۔ جونک تڑپ کر اُچھلی اور اس کا نوکیلا ڈنک میری ہتھیلی سے نکل گیا۔ میں کانپتے ہاتھوں سے اپنی جیب سے رُومال نکال کر پانی میں بھگویا اور اسے اپنے خشک چٹختے ہونٹوں سے لگا

رے ہونٹوں کی جلی ہوئی جلد کو ذرا سی نمی میسر آئی تو اِن کی حالت مزید خراب ہو گئی اور خون کی پتلی سی چند ریں رُومال کی سطح پر اُبھر آئیں۔ دوسری مرتبہ بھیگا رُومال میں نے چہرے پر پھیرا اور تیسری مرتبہ اُسے بھگو اپنے سر پر باندھ ہی رہا تھا کہ مجھے میری قضا کی آوازیں سنائی دینے لگیں۔ ہاں...... یہ وہی بھونکتے کتوں دوڑنے اور غرّانے کی آواز تھی۔ مطلب وہ قریب تر ہو رہے تھے۔ میں اُٹھ کر بھاگا۔ فی الحال وہ مجھے نظر ں آ رہے تھے اور مجھے ایک گمان یہ بھی تھا کہ ساتویں ٹیلے کے بعد اگر وہ اپنی جھونک میں مزید کچھ آگے بڑھ تو انہیں پلٹنے میں دو چار منٹ مزید لگیں گے کیوں کہ اس وقت صحرا میں چلتی گرم لُو کا رُخ بھی اُسی سمت تھا، طرف میں دوڑ رہا تھا۔ لہٰذا اُن تک میرے جسم کی بُو پہنچتے پہنچتے بھی کچھ وقت ضرور لگے گا۔ لیکن اب خود ی اپنی رُوح دھیرے دھیرے میرے اندر سے سرکنا شروع ہو چکی تھی۔ اگر میں پچھلے چھ مہینوں سے سلطان کے ساتھ اتنا پیدل نہ چلا ہوتا اور میں نے جبل پور کے بسیرے کے دوران پہاڑی والی درگاہ کے دشوار راستے انہ کئی بار طے نہ کیے ہوتے تو میں یقیناً بہت پہلے ہی گر چکا ہوتا۔ کیوں کہ کالج اور یونیورسٹی میں اسپورٹس بعد صرف ایک گھنٹہ روزانہ اسکواش کا کھیل ہی میری واحد ورزش رہ گیا تھا اور آج اس صحرا نے مجھے ''دوڑ'' ل مطلب سمجھا دیا تھا۔ کچھ ہی دیر میں میں نے ریت کے بگولوں کے عقب سے اُس پہلے عفریت کو نمودار تے دیکھا۔ میرا شک صحیح تھا۔ ساتویں ٹیلے کے بعد وہ ٹکڑیوں میں بٹ گئے تھے اور یہ پہلا تھا، جس نے پا لیا تھا۔ میرے قدم تیز ہو گئے لیکن اس کی غرّاہٹیں بتدریج قریب آنے لگیں۔ میرے پاس پیچھے مڑ کر نے کا وقت نہیں تھا۔ میری اُلجھی سانسیں خود ایک غرّاہٹ میں تبدیل ہونے لگیں۔ ہم میں سے ہر ایک کے بھی تو ایک درندہ چھپا بیٹھا ہوتا ہے۔ اُن آخری لمحات میں میرے اندر کا درندہ بھی بیدار ہو گیا۔ اب میں للہ یا ساحر نہیں...... صرف ایک انسان باقی رہ گیا تھا، جسے اپنی جان بچانے کے لیے ایک خونی عفریت کا نا تھا۔ پتھر کے دور کے انسان کی تمام جبلتیں ایک دم ہی میرے اندر انگڑائی لے کر جاگ چکی تھیں اور اب تے ہوئے میری نظر چاروں جانب کچھ ایسا تلاش کر رہی تھیں، جسے میں اپنے دفاع کے لیے ہتھیار کے طور تعمال کر سکتا۔ غرّاہٹیں اب بالکل میرے قریب پہنچ گئی تھیں۔ ساتھ ہی ریت پر دوڑنے کی دھمک اور دھپ کی آوازیں میرے حواس معطل کیے دے رہی تھیں۔ میرا دشمن بہترین سدھائے ہوئے شکاری کی بنا بھونکے اور حتی الامکان آواز نکالے بغیر میرے تعاقب میں تھا۔ اچانک ریت میں دبی ایک خشک ٹہنی ی پر میری نظر پڑی اور میں اُسے اُٹھانے کے لیے جھکا اور یہی میری غلطی تھی۔ لکڑی اندر تک ریت میں ا ہوئی تھی۔ میرے ہاتھ چھلنے کے باوجود وہ پوری طرح باہر نہیں نکلی لیکن اس اثنا میں پہلا دشمن میرے سر چکا تھا۔ میری نظریں اُسی پر جمی ہوئی تھیں۔ اُس نے دوڑتے ہوئے بنا رُکے مجھ پر زقند بھری اور ٹھیک لمحے وہ لکڑی ریت سے نکل آئی، جسے میں وحشیانہ انداز میں طاقت لگا کر باہر کھینچنے کی کوشش کر رہا تھا۔ میں اختیاری طور پر وہ خشک لکڑی پوری قوت سے فضا میں لہرائی اور پتا نہیں کتے کو وہ چھڑی کتنی زور سے لگی

کہ اُس کے مُنہ سے ایک سسکی کی آواز نکلی۔ میں ایک جانب اور وہ دوسری جانب جا گرا۔ لیکن اُس نے پلٹ
جھپٹنے میں ایک لمحہ بھی ضائع نہیں کیا۔ لکڑی میرے ہاتھ سے چھوٹ کر دُور جا گری تھی لہٰذا اب مجھے اپنے شک
بازوؤں ہی پر بھروسا کرنا تھا۔ لیکن وہ بھاری بھرکم وجود اپنے پورے بوجھ کے ساتھ میرے سینے پر گرا تو میر
ہاتھ جیسے ٹوٹ ہی تو گئے۔ اُس کے خونی پنجے میرے شانوں میں یوں پیوست ہوئے کہ کئی خراشوں میں مرچ
بھر گئیں۔ اس کی غرّاہٹیں اور گرم سانس میرے گالوں کو چھو رہی تھیں اور تھوتھنی سے بہتی رال کا دھارا
میری بائیں آنکھ کے اُوپر لٹک رہا تھا۔ اُس کے کھلے جبڑوں کے چاروں کونوں سے جھانکتے وہ چار لمبے نوکی
دانت عین میری شہ رگ میں گڑ جانے کے لیے بے تاب تھے۔ ایک لمحے کے لیے میری اور اُس کی نظر ملی
جھنجھلایا ہوا تھا، اُسے میری مزاحمت بُری لگ رہی تھی۔ اُس کی نظر نے میری نظر سے کہا "زیادہ مت تڑپو
اپنی جان مجھے سونپ دو، میرا مالک انتظار کرتا ہوگا......" میرے اندر کا درندہ غرّایا۔ "نہیں، اتنی آسانی
نہیں......" اچانک ہی مجھے اس بے بس ریچھ کے پینترے یاد آ گئے۔ وہ ریچھ اس طرح کے کئی عفریتوں
ایک موٹی زنجیر سے بندھے ہونے کے باوجود آخری وقت تک لڑتا رہا تھا۔ مجھے یاد آیا کہ وہ پوری لڑائی
دوران مستقل اپنا سر ہلا ہلا کر اپنے نرخرے کو ان کتوں کے جبڑوں سے بچانے کی کوشش کر رہا تھا۔ مطلب
سدھائے ہوئے کتوں کا پہلا نشانہ مقابل کی شہ رگ ہی ہوتی ہے۔ اِسی لیے وہ اس وقت میرے سینے پر
میری رگِ جان میں اپنے دانت گاڑنے کی دیوانہ وار کوشش میں مصروف تھا۔ میرے حواس یکے بعد دیگر
پھر سے جامد ہونے لگے تھے۔ اصل میں مجھے اس وقت، اس کتے کے وجود سے اتنی تکلیف نہیں پہنچ رہی تھی بلک
اس کی مستقل غرّاہٹ اور سانس کی خرخراہٹ میرے حواس معطل کیے جا رہی تھی۔ مجھے ایک عجیب سا احسا
ہوا کہ اگر کتے کی آواز سے یہ وحشیانہ صفت نکال دی جائے تو شاید اس کے پاس کچھ بھی نہ بچے۔ ہمار
ہاتھوں پیروں میں سے آدھی جان نکالنے کے لیے وہ سب سے پہلے اِسی ہتھیار کا استعمال کرتا ہے۔ شاید
اثر سانپ کی پھنکار اور کسی بھی درندے کی دھاڑ میں بھی ہوتا ہے۔ میں اپنے دونوں ہاتھوں سے اب تک
کے چہرے کو اس کا گلا دبا کر اپنے چہرے سے دُور رکھنے میں کامیاب تھا لیکن میں یہ بھی جانتا تھا کہ یہ کامیا
عارضی ہے کیوں کہ میرے بازو شل ہو رہے تھے اور اس کے پنجے میرے سارے جسم پر جلتی خراشیں چھوڑ
جا رہے تھے۔ اچانک میری مٹھی میں کچھ ریت بھر گئی اور بے اختیار میں نے ساری کی ساری ریت اُس
قاتل آنکھوں میں جھونک دی۔ وہ زور سے چیخا اور ایک لمحے کے لیے اُس کی گرفت کمزور پڑ گئی۔ میں
پوری قوت لگا کر اُسے اپنے اُوپر سے اُچھال کر دُور پھینک دیا۔ میرا کُرتا چیتھڑوں میں تبدیل ہو چکا تھا
نے فوراً اُسے جسم سے علیحدہ کیا اور بچے کھچے کپڑے کو بھاگتے ہوئے اپنے گلے کے گرد اچھی طرح کس
باندھ لیا۔ اس کا شکار میری شہ رگ تھی تو مجھے سب سے پہلے اُسے ہی بچانے کی فکر کرنی چاہیے تھی۔ تب تک
دشمن اپنا جسم جھٹک کر اپنی آنکھوں سے ریت جھاڑ چکا تھا اور پھر سے میرے پیچھے لپکنے کی تیاری میں تھا۔ اِسی

ہی پچھلے ٹیلے کی جانب سے اس کے گروہ کے دو اور ساتھی نمودار ہوئے اور مجھے دیکھ کر انہوں نے خوشی سے
وحشیانہ آوازیں بلند کیں۔ میرے آخری لمحے شروع ہو چکے تھے۔ میری پوری کوشش کے باوجود میری رفتار مدھم
پڑ چکی تھی اور قدم ریت میں دھنسنا شروع ہو گئے تھے۔ میرے تین اطراف سے وہ تین کتے میرے جسم کو تین
حصوں میں تقسیم کرنے کے لیے اُڑے چلے آ رہے تھے۔ میں نے دوڑتے دوڑتے آنکھیں بند کر لیں۔ مجھے
سلطان بابا نظر آئے "موت صرف جسم کا مقدر اور رُوح کی زندگی کی ابتدا ہے۔" موت کے بارے میں ہم
سب ہی ساری زندگی سوچتے ہیں، سُنتے ہیں اور بات کرتے ہیں لیکن ٹھیک اس لمحے میں میں نے خود پر موت کو
وارد ہوتے محسوس کیا۔ "اچھا تو یہ ہے وہ فسانہ، جس کا سارے شہر میں چرچا تھا۔" اچانک مجھے سانول کی
بانسری سنائی دی۔ وہ دُور سے ہاتھ ہلا ہلا کر مسکراتے ہوئے مجھے بُلا رہا تھا۔ نہیں...... سانول کی بانسری
نہیں...... یہ تو اُس پیانو کی آواز تھی، جو پاپا ہمیں بچپن میں روزانہ ڈنر کے بعد میری اور مما کی فرمائش پر سُناتے
تھے۔ مما اور پاپا سفید ملبوسات میں اُسی بڑے سے کالے پیانو کے پاس کھڑے مجھ سے کہہ رہے تھے، "بس
کرو ساحر، اب گھر واپس آ بھی جاؤ۔ کتنا انتظار کرواتے ہو تم۔" کچھ ہی دیر میں اُسی پیانو کے سامنے زہرا سیاہ
لباس میں بیٹھی تھی۔ اُس کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ "ساحر کیا میری ہر محبت ہمیشہ یونہی تشنہ رہے گی؟" میں نے
گھبرا کر دوسری جانب دیکھا تو کاشف اور میرے باقی سارے دوست کالج میوزک شو کی تیاری کے لیے ڈرم
اور گٹار بجا رہے تھے۔ کاشف چلایا "اوئے ساحر کے بچے! آج پھر پریکٹس پر نہیں آئے تم۔" نہیں یہ کالج کا
ڈرم تو نہیں تھا، یہ تو وہی ڈھول تھا، جو جبروت کے ہرکارے ریچھ اور کتوں کی لڑائی کے دوران پیٹ رہے تھے۔
کتے...... ہاں...... میں نے گھبرا کر آنکھیں کھول دیں...... میں ریت پر اوندھے منہ گرا ہوا تھا۔ تینوں
کتے میرے سر پر پہنچ چکے تھے۔ میں نے کراہ کر کروٹ بدلی۔ سورج کی آگ برساتی کرنوں کا زوردار چانٹا
میرے گالوں کو جھلسا گیا۔ ڈوبتی آنکھوں سے میں نے تین اطراف سے بڑھتی موت کو گلے لگانے کے لیے
سورج کو آخری الوداع کہا لیکن یہ کیا......؟ کتے میرے قریب آ کر رُک سے گئے۔ کیا وہ مجھ سے میری آخری
خواہش پوچھ رہے تھے۔ پھر مجھے یوں محسوس ہوا کہ میرے سر کی پچھلی جانب بھی کچھ غرّاہٹیں بلند ہوئی ہیں۔
مطلب یہ کہ باقی تین کتے بھی آن پہنچے تھے لیکن اس وقت میرے اندر اتنی سکت بھی نہیں تھی کہ میں گردن موڑ
کر پیچھے دیکھ لیتا۔ سامنے والے تین دشمنوں میں سے ایک نے غرّا کر اپنا جسم تولا۔ اُس کی ہڈیاں زقند لگانے
سے پہلے جسم کے اندر چٹخیں۔ اُس نے اپنا سارا بوجھ اپنے پچھلے پیروں پر ڈالا اور ہوا میں میری جانب اُچھلا۔
میں نے آسمان پر پگھلتے سورج کو اس کے وجود کے پیچھے چھپتے دیکھا۔ مجھ پر دشمن کے قہر کا سایا ہوا اور پھر اس
سے پہلے کہ وہ مجھ پر گرتا ایک عجیب بات ہوئی۔ ابھی دشمن کا جسم ہوا ہی میں معلق تھا کہ ایک اور جسم زوردار
دھاڑ کے ساتھ غرّاتے ہوئے دشمن کے جسم سے لپٹا، ٹکرایا اور اُسے اپنی لپیٹ میں لیتے ہوئے مجھ سے دُور
لے جا کر ریت پر گر گیا۔ چند لمحوں کے لیے چھپا سورج پھر سے میری پلکوں میں برچھیاں گھونپ گیا اور میری

آنکھیں پھر سے چندھیا گئیں۔ غرّاہٹیں اب باقاعدہ چیخوں میں تبدیل ہو رہی تھیں۔ میں نے بمشکل پلٹ
کروٹ لی اور حتی الامکان سر اُٹھا کر اپنے اس محسن جسم کو دیکھنے کی کوشش کی، جس نے ہوا ہی سے میری جا
اُڑ کر آتی قضا کو اُچک لیا تھا اور پھر میں نے ایک عجیب منظر دیکھا، دشمن کو ہوا ہی میں دبوچ لینے والا ''کالا'' تو
وہ اور اُس کے گروہ کے باقی دو ساتھی سینہ تانے میرے اور میرے تین دشمنوں کے درمیان صحرا میں کھڑ
تھے۔ اس وقت دونوں گروہ ایک دوسرے کو نظروں نظروں میں تول رہے تھے، غرّا رہے تھے، دھمکا رہے تھ
میں کراہ کر اُٹھ بیٹھا۔ مجھے لگا اس وقت میں کالے اور دشمنوں کے گروہ کے درمیان ہوتی گفتگو سمجھ سکتا ہو
دشمنوں کا سرغنہ بولا ''تم ہمارے پرانے ساتھی رہے ہو۔ اس لیے ہم تمہارا لحاظ کر رہے ہیں۔ ہٹ جا
ہمارے راستے سے......ہمیں اس کی شہ رگ چیر کر اپنے آقا کے پاس لے جانی ہے۔ وہی آقا، جو کل تک تم
بھی مالک تھا۔'' کالا جواباً غرّایا ''نہیں...... وہ کبھی میرا مالک تھا لیکن اب یہ بھی میرا دوست ہے۔ میں تم کو
کی جان نہیں لینے دوں گا۔ تم لوگ واپس پلٹ جاؤ......'' سرغنہ بھونکا ''بس............ بہت ہو چکا............
ہی دیر میں میرے تین مزید ساتھی یہاں پہنچ جائیں گے۔ میں نہیں چاہتا کہ اس پرائے انسان کے چکر میں ہ
اپنا پرانا ساتھی اپنی جان سے جائے۔ ہم نے بہت سے مقابلے ساتھ جیتے ہیں۔ نہ جانے کتنی جنگیں ایک سا
لڑی ہیں۔ اپنی یہ آخری جنگ ہمارے خلاف نہ لڑو۔ یہ انسان بڑے کم ظرف اور احسان فراموش ہوتے ہی
ان کے لیے اپنے ساتھ اپنے اِن دو بے وقوف ساتھیوں کی جان خطرے میں نہ ڈالو۔ یہ تو ہماری طر
سدھائے ہوئے ہیں، نہ ہی لڑنا جانتے ہیں...... ہٹ جاؤ......''

کالے نے جسم تولا......''اگر یہ آخری جنگ ہے تو میں اپنی یہ آخری لڑائی ایک غدار اور احسان فرام
بن کر نہیں...... بلکہ ایک دوست بن کر لڑوں گا۔'' اتنے میں دُور سے باقی تین کتوں کے بھونکنے کی آواز
سنائی دینے لگیں۔ سرغنہ نے فاتحانہ انداز میں کالے کی جانب دیکھا ''اچھا تو پھر ٹھیک ہے............ مرنے
لیے تیار ہو جاؤ......''

معصوم سے معصومیت تک

اس جنگ میں اپنے ساتھ مزید تین ساتھیوں کو پا کر میرے اندر زندگی کی نئی رمق جاگی۔ باقی تین دشمن
بھی کچھ فاصلے پر تھے لیکن صحرا میں ان کے وحشیانہ انداز میں بھونکنے کی آوازیں بتدریج قریب آ رہی تھیں۔
سامنے والے تین دشمنوں نے پینترا بدل کر مجھ پر جھپٹنے کی کوشش کی لیکن کالا اور اُس کے گروہ کے باقی دو جانباز
ب میرے اور ان دشمنوں کے درمیان حائل تھے۔ میں جانتا تھا کہ جیسے ہی دشمن تین سے چھ ہوئے، تب شاید
برے یہ تین وفادار بھی کچھ نہ کر پائیں کیوں کہ ان میں سے صرف کالا ہی باقاعدہ سدھایا ہوا تھا اور وہی اس
رنی لڑائی کے گر جانتا تھا۔ بہتر یہی تھا کہ ان تین دشمنوں کو اپنے پیچھے لگا کر میدان جنگ تبدیل کیا جاتا رہے
ر پھر مجھے تو ہر حال میں آگے ہی بڑھتے رہنا تھا۔ سو، میں ایک بار پھر ہمت مجتمع کر کے اُٹھا اور دشمنوں سے پہلو
باتے ہوئے صحرا میں سڑک کی سمت دوڑنے لگا اور پھر میرے منہ سے ایک طویل کراہ نما چیخ نکل گئی۔ میرے
ننگے پیر میں ہاتھ کی اُنگلی جتنا ایک کانٹا اس طرح گھسا کہ تلوے کو چیرتا ہوا اُوپر سے نکل گیا۔ میں اُسی قدم لڑکھڑا
کر گرا اور پاؤں جیسے شل ہو گئے۔ میں نے زور سے آنکھیں بند کیں اور کانٹے کو ایک جھٹکے سے کھینچ کر پاؤں
سے علیحدہ کر دیا۔ اچانک میرا دھیان نیفے میں اٹکے اپنے جوتوں کی جانب گیا، جو میں نے شروع ہی میں خانو
کی ہدایت کے مطابق اپنے جسم کے ساتھ کس کر باندھ لیے تھے۔ میں نے جلدی سے جوتے پہنے۔ زمین سخت
ہو رہی تھی۔ جس کا مطلب تھا کہ اب سڑک کہیں قریب ہی تھی۔ کتوں کی آوازیں بھی پچھلے ٹیلے تک آ پہنچی تھیں
ر پھر پہلے تین کا دشمن گروہ میرے سر پر آن پہنچا۔ اس بار سرغنہ نے پیچھے سے میری گردن میں جبڑے سے
وار کیا لیکن میرے گلے میں بندھی قمیض کے چیتھڑوں کی وجہ سے اُس کے دانت ماس میں ٹھیک طرح سے کھب
نہیں پائے۔ لیکن میں اس کے دھکے سے اپنی جھونک میں سامنے جا گرا۔ تب تک میرے ساتھی بھی پہنچ چکے
تھے۔ کالے کا ایک ساتھی جو میری پہرے داری کے لیے میرے سر کی جانب کھڑا ہو گیا تھا، اُسے سرغنہ نے
ایک زوردار پنجہ مارا اور خون کے چھینٹے میرے چہرے کو بھگو گئے۔ کالا بھی نہایت بے جگری سے لڑ رہا تھا لیکن
اب دشمنوں کی تعداد چھ ہو چکی تھی۔ میں جب دوڑتے ہوئے آخری ٹیلے پر پہنچا تو بہت دُور کالی تارکول کی
سڑک کسی باریک دھاگے کی طرح نظر آ رہی تھی۔ میں نے ٹیلے کے دوسری جانب اُترتے ہوئے آخری مرتبہ
پیچھے نظر ڈالی تو کالے سے میری نظر ٹکرائی۔ مجھے یوں لگا جیسے وہ مجھ سے کہہ رہا ہوں ''ہم نے اپنا نمک حلال کر
دیا دوست! اب آگے تم جانو اور تمہاری قسمت......'' اچانک میرے پیروں کو نیچے کسی نرم اور لچکیلی سطح کا احساس

ہوا اور میرے جوتے چپکنے سے لگے۔ ارے یہ تو وہی سڑک تھی، جسے میں اب بھی بہت دُور دیکھ رہا تھا
سڑک صحرا کے اندر سے ہوتی گزر رہی تھی اور اس کے جس ٹکڑے کی طرف میں بھاگ رہا تھا، وہ اُسی سڑ
تسلسل تھی لیکن یہ ٹکڑا ریت کے طوفان کی وجہ سے شاید نیچے دب کر رہ گیا تھا۔ خانو کی آواز پھر سے میر
کانوں میں گونجی۔ ''اگر تم اس سڑک تک پہنچنے میں کامیاب ہو گئے تو سمجھو کہ تم نے آدھی جنگ جیت لی۔''
نے پیچھے مڑ کر دیکھا، دونوں دشمن کف بہاتے، رال ٹپکاتے اور اپنے مضبوط پنجوں سے بھاگتے اُسی رفتار
میرے تعاقب میں آ رہے تھے بلکہ یہ فاصلہ بتدریج کم ہو رہا تھا۔ میرے پھیپھڑوں کی بچی کھچی سانسیں
تیزی سے ختم ہو رہی تھیں۔ ویسے بھی اس ایک زندگی کے لیے ان پھیپھڑوں کے تمام خلیوں کو جس قدر مشا
سرانجام دینی تھی، پچھلے دو گھنٹوں میں وہ اس سے زیادہ محنت کر چکے تھے۔ اچانک بے خیالی میں میری نظر آ
کی جانب اُٹھ گئی۔ شاید وہ میری آخری دعا کا وقت تھا۔ پتا نہیں ہم ہمیشہ دعا کرتے وقت ہر بار اپنی نظر آ
کی جانب کیوں اُٹھاتے ہیں، اپنے دل کی جانب کیوں نہیں دیکھتے۔ کیا یہ بھی ہمارے کمزور ایمان کی نشانی ن
ہے۔ کیا وہ صرف آسمان پر ہی بسیرا کرتا ہے۔ میری اس آخری اُٹھی نظر نے بھی اُسی لمحے مجھے میری ''
ایمانی'' کی سزا دے دی۔ میرا سر سورج کی تیز روشنی دیکھ کر زور سے چکرایا اور میں کسی مدہوش مے نوش کی ط
لڑکھڑایا اور اگلے ہی لمحے نرم، تپتی سڑک پر چاروں شانے چت پڑا تھا۔ میری کہنیاں اور گھٹنے چھل کر سیاہ ہو
تھے۔ میں نے تھک کر آنکھیں موند لیں۔ جسم کا ایک ایک ریشہ اس قدر شدید تھکن سے چور تھا کہ اب
دوڑتی، غرّاتی، رال ٹپکاتی اور اپنی طرف بڑھتی ہوئی وہ موت بھی ایک لمبے اور آرام دہ سکون کا ایک وقفہ ہی
رہی تھی۔ ہم زندگی بھر اس بے وفا زندگی کے لیے کتنی بھاگ دوڑ کرتے ہیں، جھوٹ بولتے ہیں، دھوکے د
ہیں، ایذا دیتے ہیں لیکن ہمارا آخری حاصل یہی موت ہوتی ہے۔ صحرا میں آج اس دو گھنٹے کی دوڑ اور اس
میری طرف بڑھتی موت نے زندگی کا سارا فلسفہ خوب اچھی طرح مجھے سکھا دیا تھا۔ میرا جی چاہا کہ اپنی طرح
ان سب انسانوں کو جو اس زندگی کی دوڑ میں خود اپنے آپ کو، اپنے رشتوں کو اور جیو اور جینے دو کے اُصولو
بھول چکے ہیں، ایک بار صحرا کی اِس دوڑ میں لا کھڑا کروں اور جب وہ بھی میری طرح نڈھال ہو کر گر پڑ
موت اپنے خونی جبڑے اُن کی شہ رگ میں پیوست کرنے لگے تو اُن سے بس ایک ہی سوال پوچھوں ''کیا
بے وفا زندگی واقعی اس قابل تھی، جس قدر تم نے اسے پیار دیا؟'' میرے دشمن بس اب چند گز ہی دُور تھے
میں نے ڈوبتی آنکھوں اور بند ہوتی پلکوں سے اُن میں سے اگلے والے کو مجھے یوں زمین پر بے بس گرا دیکھ
خوشی سے ہوکتے ہوئے سنا۔ انہیں بھی تو عرصے بعد کوئی ایسا دشمن میسر آیا تھا، جس نے آج اُن کے مسامو
سے بھی پسینہ چھلکا دیا تھا۔ آخری لمحے میں، میں نے اُس کے خونی جبڑے کو ایک خاص زاویے پر کھلتے اور ا
کے چار لمبے نوکیلے دانتوں کو خاص میکانزم کے تحت آگے نکلتے ہوئے دیکھا۔ ظاہر ہے کہ اس قاتل جبلت
خاص نشانہ میری شہ رگ ہی تھی۔ میرے دل نے کہا ''خوش آمدید'' اور ٹھیک اُسی لمحے فضا میں فائر کی ایک آ

گونجی۔ دشمن کی اپنی شہ رگ سے خون کا ایک فوارہ چھوٹا اور مجھ سمیت سڑک کے اُبلتے تارکول کو رنگ گیا۔ زمین
پر خون گرنے سے ایسی آواز اُبھری جیسے شدید گرم اور تپتے ہوئے توے پر کوئی ٹھنڈا پانی چھڑک دے۔ فضا میں
ایک نعرہ گونجا ''اللہ اکبر'' اور دوسرے فائر کی آواز آئی۔ مجھ پر چھلانگ لگانے والا پہلا دشمن، بالکل میرے
مقابل گرا ہوا تھا اور دشمن کی نبض بھی ڈوب رہی تھی اور آنکھیں میری طرف پلکوں کے بوجھ سے بوجھل ہو کر بند
ہو رہی تھیں۔ ایک لمحے کے لیے ہم دونوں کی نظر آپس میں ٹکرائی۔ مجھے لگا جیسے اُس نے مجھ سے کہا ہو ''الوداع
ے دشمن! تم نے بھی خوب دشمنی نبھائی۔'' لیکن ہم دونوں ہی اپنے اپنے فرض کے ہاتھوں مجبور تھے اور پھر دشمن
کی آنکھیں بھی میری آنکھوں کے ساتھ ہی بند ہو گئیں۔ آخری چند لمحوں میں مجھے اس کی آنکھوں میں وہی
معصومیت دکھائی دی، جو کسی بچے کی آنکھ میں ہوتی ہے۔ واقعی خدا ہمیں اس دنیا میں شفاف اور معصوم ہی بھیجتا
ہے مگر ہم رفتہ رفتہ خود کو میلا اور داغ دار کرتے جاتے ہیں۔ ہم میں سے کچھ تو پھر بھی جسم کے گناہ روزانہ وضو کر
کے اور رُوح کے گناہ رات کو سوتے وقت توبہ کر کے دھونے کی کامیاب یا ناکام سعی کر ہی لیتے ہیں لیکن ان میں
سے وہ، جو میری طرح ان تمام داغوں سمیت ہی دنیا سے رُخصت ہونے کو ہوں، انہیں ان آخری لمحوں میں کیسا
سوس ہوتا ہوگا؟ کیا ہمیں دنیا میں صرف یہی داغ سمیٹنے کے لیے بھیجا جاتا ہے۔ مجھے اس سڑک پر پڑے ان
خری لمحوں میں ایک عجیب سا ادراک ہوا کہ ہم میں سے زمین پر بسنے والے ہر ذی رُوح کا سفر بس ''معصوم
ے معصومیت'' تک واپسی کی ایک کہانی ہی ہے۔ میں یونیورسٹی میں اپنی انگریزی کی پروفیسر مارتھا سے ایک
صطلاح ہمیشہ سنتا تھا ''Back to the Innocence'' لیکن ''معصومیت کی طرف واپسی'' کی اس
صطلاح کا مطلب مجھے اس روز سمجھ میں آیا۔ ہم کامل معصوم پیدا ہوتے ہیں، لیکن گناہ ہمیں غیر معصوم اور عاصی
ا دیتے ہیں۔ دراصل مذہب ہم پر وارد ہی اس لیے ہوا ہے کہ وہ ہمیں پھر سے معصوم بنا دے اور تمام عمر مذہب
ا یہی کوشش رہتی ہے کہ وہ ہماری اس ''معصومیت سے معصومیت تک'' کی واپسی کی راہ کو ہموار کر دے۔ اور
اید ٹھیک موت کی گھڑی میں چند لمحوں کے لیے ہم سب پھر سے معصوم ہو جاتے ہیں۔ تب ہی ہماری کومل رُوح
تحلیل ہونے کا موقع ملتا ہے، ورنہ گناہوں سے لتھڑے اس کثیف جسم کے پنجرے سے اس نورانی ہیولے کا نکلنا
مکن ہو جاتا۔ کیا میری رُوح بھی میرا ساتھ چھوڑ گئی تھی۔ میرا جسم تو ابھی گناہوں کے بوجھ سے آزاد نہیں ہوا
ا۔ آنکھیں کھلنے میں اتنی دیر لگی۔ میرے سر پر سبز آسمان تھا، کیا وہاں فلک کا رنگ بدل جاتا ہے؟ اچانک
رے کانوں میں آواز گونجی ''اُٹھ گیا بھئی جوانا! شاباشے۔'' میں نے چونک کر داہنی طرف آواز کی جانب
یکھا، رینجرز کا ایک سپاہی اپنی بندوق صاف کر رہا تھا۔ اوہ...... تو میں زندہ تھا اور جسے میں سبز آسمان سمجھ رہا تھا
پیراشوٹ کے کپڑے سے بنے ہرے خیمے کی چھت تھی۔ میرے ذہن میں خانو کا آخری جملہ گونجا ''اگر یہ
ک تمہیں سرحد پر بنی کسی فوجی چوکی تک پہنچا دے تو سمجھ لینا کہ یہی تمہاری جیت ہے......'' میں ایک جھٹکے سے
ٹھ کر بیٹھ گیا۔ میرے سارے جسم میں شدید درد کی ایک ٹیس اُٹھی۔ سپاہی جلدی سے اُٹھ کر میرے قریب

آ گیا۔ "اوئے آرام سے جوان آرام سے۔ پورے چھ گھنٹے بعد تم ہوش میں آئے ہو۔ میرا نام حوالدار
ہے۔ ہم چھ سپاہی ہیں اس چوکی کی دن کی ڈیوٹی پر...... میں ہی شفٹ انچارج ہوں اور اس وقت میں ہ
سے باہر کھڑا علاقے کا جائزہ لے رہا تھا، جب میں نے دُور سے پہلے تمہیں اور پھر تمہارے پیچھے ان ک
دوڑتے دیکھا۔ واہ بھئی...... عجب دوڑ تھی وہ بھی...... اور جب تک میں بھاگ کر اندر خیمے سے اپنی بندوق
کر آیا، تم زمین پر گر چکے تھے۔ ٹھیک لمحے پر اپنی بندوق اور اپنا نشانہ آزمانے کو ملا۔ خدا نے سرخرو کیا، ور
بندوق پر لگے دُوربینی نشانے پر کبھی بھروسا نہیں رہا۔ مجھے تمہارے اور اس کتے کے تیزی سے قریب
سروں میں سے کتے کے سر کو علیحدہ رکھ کر گولی چلانی تھی اور یقین کرو کہ ایک لمحے کے لیے بھی اگر میری
کانپ جاتی تو مجھے وزیرے کی ماں سے بہت صلواتیں سُننا پڑتیں۔" حوالدار زور سے ہنسا "وزیرا، وزیر
پانچ سال کا بیٹا ہے......" میں نے بستر سے اُترنے کی کوشش کی۔ "مجھے کہیں بہت جلدی پہنچنا ہے......"
تمہاری دیوانہ وار دوڑ سے ہی پتا چل رہا تھا۔ ویسے تو میں نے قریبی یونٹ سے ڈاکٹر کو بلوالیا تھا۔ وہ و
پہلے آکر تمہیں ضروری انجکشن وغیرہ لگا چکا ہے اور تمہارے زخموں کی مرہم پٹی بھی کر گیا ہے لیکن اس نے
جاتے یہ بھی کہا ہے کہ تم ایک ہفتے تک بستر سے اُٹھنے کی کوشش بھی نہ کرنا۔ ویسے یہ ماجرا کیا تھا......؟ میں
جلدی جلدی شیر محمد کو ضروری تفصیل بتائی کہ میرے لیے ایک ایک لمحہ کس قدر قیمتی ہے۔ شیر محمد حیرت سے
کھولے میری بات سنتا رہا اور اچانک میرے ذہن میں آئی جی نصیر صاحب کا خیال آیا۔ کمال آباد اگرچہ
سے تین دن ٹرین کے فاصلے پر تھا لیکن ان کے حکم پر کسی قریبی ضلع کی پولیس میری مدد کو کال گڑھ آسکتی
میں نے جلدی سے شیر محمد سے پوچھا "کیا میں یہاں سے کمال آباد ایک فون کر سکتا ہوں۔" "ہاں جی!
نہیں، ایک کیا دس فون کرو۔" اُس نے خیمے میں رکھے ایک پرانی وضع کے لوہے کے ڈبے کو اُٹھا کر دو تین
اس کی چرخی گھمائی۔ دوسری جانب سے شاید کسی آپریٹر نے اُٹھایا۔ شیر محمد نے مجھ سے کمال آباد کا نمبر پو
میں نے اُسے بتایا کہ مجھے نمبر تو زبانی یاد نہیں ہے لیکن کمال آباد میں آئی جی نصیر کا کوئی بھی نمبر ملا دیں۔ آ
پانچویں کوشش پر دوسری جانب سے گھر کے نمبر پر پہلے کسی آپریٹر نے فون اُٹھایا۔ میں نے اُسے بتایا کہ
سلطان بابا کے حوالے سے عبداللہ بات کر رہا ہوں اور مجھے نصیر صاحب سے بہت ضروری بات کرنی ہے۔
دیر بعد دوسری جانب سے نصیر صاحب کی تھکی ہوئی آواز سنائی دی۔ وہ شاید آرام کر رہے تھے۔ وہ تعا
کروانے سے پہلے ہی مجھے پہچان چکے تھے اور جب میں نے انہیں ساری صورت حال بتائی تو اُن کے لہجے
فکر مندی کے ساتھ ساتھ روایتی پولیس والوں کی تیزی بھی در آئی۔ انہوں نے مجھے تسلی دی کہ اگلے آدھے
کے اندر قریب ترین ضلع کے ایس پی اپنی تمام تر مہیا کمک کے ساتھ کال گڑھ کے لیے نکل چکے ہوں گے
جب تک میں کال گڑھ کی سرحد تک پہنچوں گا تب تک وہ بھی مجھے وہیں میرا انتظار کرتے ملیں گے۔ انہوں
سختی سے مجھے منع کیا کہ میں تنہا دوبارہ کال گڑھ میں داخل ہونے کی کوشش نہ کروں۔ جب میں نصیر صا

ے بات کر کے خیمے سے باہر نکلا تو شام کے پانچ بج رہے تھے۔ باہر کچھ فاصلے پر میرے دونوں دشمنوں کی
لاشوں کو دو سپاہی ایک گہرا گڑھا کھود کر دفنانے کی تیاریوں میں مصروف تھے۔ حوالدار نے اپنے انچارج کپتان
صاحب سے شفٹ ختم ہونے کے بعد مجھے اپنی جیپ میں کال گڑھ کی سرحد تک پہنچانے کی اجازت لے لی
تھی۔ جیپ روانہ ہونے سے پہلے دو سپاہی کود کر پچھلی سیٹوں پر بیٹھ چکے تھے۔ شیر محمد خود ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھ
گیا اور ہم اُسی تارکول کی سڑک سے ہوتے ہوئے واپس صحرا کی جانب روانہ ہو گئے۔ کچھ گھنٹے قبل یہی قاتل
صحرا میری سانسیں گھونٹنے کے لیے کسی اور انداز میں مجھ پر کھلا تھا اور ابھی اس وقت اس جیپ میں گزرتے
ہوئے سب کچھ کتنا مختلف اور کتنا مہربان دکھائی دے رہا تھا۔ مجھے حیرت ہو رہی تھی کہ میں نے دوڑتے
دوڑتے کتنا فاصلہ طے کر لیا تھا۔ جیپ ریت کے ٹیلوں سے اُترتی چڑھتی کال گڑھ کی جانب بڑھ رہی تھی اور پھر
ایک ٹیلا اُترتے ہی میری زبان سے بے اختیار نکلا "روکو...... جیپ روکو......" حوالدار نے چونک کر جلدی سے
ریک پر پاؤں رکھ دیا۔ میں تیزی سے کود کر ٹیلے کی پچھلی جانب دوڑا، اور پھر میرے قدم ریت ہی میں دھنس کر
ہ گئے۔ شیر محمد اور سپاہی بھی میرے پیچھے ہی بھاگے چلے آئے اور پھر اُن کی نگاہوں نے بھی میری نظروں کے
عاقب میں وہ نظارہ دیکھ لیا۔ سامنے ہی کالا اپنے دو ساتھیوں سمیت بے جان پڑا تھا اور چند قدموں کے فاصلے
پر ادھر اُدھر تین دشمنوں کے لاشے پڑے ہوئے تھے۔ میں دوڑتا ہوا کالے کے پاس پہنچا۔ میرے دوست نے
ندگی کی بازی ہارنے سے پہلے شدید جدوجہد کی تھی۔ میں وہیں گھٹنوں کے بل بیٹھے بیٹھے رو پڑا۔ حوالدار
یرت سے یہ سارا ماجرا دیکھ رہا تھا۔ اُس نے میرے کاندھے پر ہاتھ رکھا "کیا یہ تین تمہارے محافظ تھے۔"
یری آواز بمشکل نکلی "نہیں۔ یہ تین میرے دوست تھے۔ انہوں نے اپنے ایک دوست کے لیے اپنی جان دی
ہے۔" میرا دل چاہ رہا تھا کہ میں چیخ چیخ کر رو دوں۔ حوالدار میری حالت سمجھ چکا تھا۔ اُس نے اپنے ساتھیوں کو
شارہ کیا اور خود بھی جیپ کے پیچھے سے ترپال کے نیچے رکھے بیلچوں میں سے ایک اُٹھا لایا اور کچھ ہی دیر میں وہ
یک گہرا گڑھا کھود چکے تھے۔ میں نے کالے کو الوداعی سلامی پیش کی اور انہوں نے میرے تینوں دوستوں کو
ُس ریت تلے دبا دیا۔ میں نے شیر محمد کی جانب دیکھا اُس نے مجھے گلے لگا لیا۔ "میں جانتا ہوں جوان! تم
پنے دشمنوں کو بھی یوں پڑا رہنے نہیں دو گے۔ یہی بڑے دشمن کی نشانی ہوتی ہے۔" کچھ ہی دیر میں اتنے ہی
ہرے گڑھے میں میرے تینوں دشمن بھی ریت نشین ہو چکے تھے۔ وہ میرے دشمن تھے، لیکن وفادار تھے۔ جب
م کال گڑھ کی سرحد سے کچھ فاصلے پر تھے تو میں نے ایک جیپ کے ہیولے کو تیزی سے واپس پلٹتے
یکھا لیکن شام کے جھٹپٹے اور فاصلے کی وجہ سے میں ٹھیک طرح سے گاڑی پہچان نہیں سکا۔ حوالدار کا خدشہ صحیح
۔ کتوں کے واپس نہ پہنچنے پر جبروت کے ہرکارے صحرا میں اُن کی تلاش میں نکل آئے تھے۔ جب ہم کال
ڑھ کی بیرونی حد تک پہنچے تب تک اندھیرا چھا چکا تھا اور دُور سے پولیس کی جیپوں اور ایک بڑے ٹرک کی جلتی
تی بتیاں قریب آتی نظر آ رہی تھیں۔ چند لمحوں بعد پولیس کے جوانوں کا ایک جم غفیر ایک ایس پی اور ڈی

ایس پی کی قیادت میں وہاں آ پہنچا۔ افسروں نے اپنا تعارف کروایا اور بتایا کہ وہ آئی جی صاحب کی خا
ہدایت پر یہاں پہنچے ہیں۔ شیر محمد نے مجھ سے رُخصت ہونے سے پہلے مجھے زور سے گلے لگا لیا اور او
''مجھے یہاں سے آگے جانے کی اجازت نہیں ہے جوان، ورنہ میں بھی تمہارے اُستاد سے ملنے ضرور
تمہارے ساتھ۔'' میں نے اُسے رُخصت کرتے ہوئے دھیرے سے اُس سے کہا ''جب تم وزیرے کی
سے فون پر بات کرو تو اُسے بتانا کہ تمہارا نشانہ واقعی بہت اچھا ہے......'' جیپ میں بیٹھتا ہوا شیر محمد زور سے
پڑا۔ گاڑی آگے بڑھ گئی۔ ایس پی نے وہیں ریت پر لکڑی کی ایک چھڑی کی مدد سے میرے معلومات
مطابق کال گڑھ کا ایک چھوٹا سا نقشہ بنا لیا اور قلعے کا جغرافیہ اور آنے جانے کے تمام ممکنہ راستے اپنی فور
اچھی طرح ذہن نشین کروا دیئے۔ آدھے سپاہی ڈی ایس پی کی قیادت میں دوسری جانب سے صحرا کی طر
نکلتے راستوں پر پہرے کی چوکیاں بناتے ہوئے کال گڑھ کا محاصرہ کرتے ہوئے بڑھتے گئے جب کہ ایس
صاحب میرے ساتھ آدھے سپاہی لیے کال گڑھ داخل ہو گئے۔ کبھی کبھی نصیب ہماری ساری گنتی اُلٹی کر
ہے۔ ہر توقع برعکس ثابت ہو جاتی ہے۔ شاید آج یہی جبروت کے ساتھ ہونے والا تھا۔ اس کے وہم و گمان
بھی نہیں ہوگا کہ اس قید خانے میں خانو مجھے صحرا کے دوزخ سے نکلنے کے راستے اور گُر بتا دے گا اور میں
کے جانبازوں کو کالے اور اُس کے دو ساتھیوں کی مدد سے پچھاڑ کر صحرا پار کر جاؤں گا اور ایک سرحدی چوکی
بھی پہنچ جاؤں گا۔ چوکی والے بھی اپنے فرائض کی حد بندی کی وجہ سے اتنی جلدی میری مدد نہ کر پاتے کیوں
یہ پولیس کا کیس تھا۔ ایسے میں جبروت نے یہ بھی کہاں سوچا ہوگا کہ مزار پر رہنے والے یہ دو فقیر اتنی پہنچ
رکھتے ہوں گے کہ ایک ٹیلی فون پر ضلع کے ایس پی کو تمام لوازمات کے ساتھ کال گڑھ آنے پر رضا مند کر
گے، کیوں کہ عام حالات میں اس سارے انتظام کے لیے کم از کم مہینہ درکار ہوتا لیکن اس کی تمام توقعات
برعکس میں اس وقت ایس پی سمیت قلعے کے دروازے پر کھڑا تھا۔ دربان کو دروازہ کھولتے ہی گرفتار کر لیا گ
اندر سے کچھ مزاحمت ہوئی اور چند کارندوں نے پولیس پر فائر کھولنے کی کوشش کی لیکن آدھے گھنٹے کے اند
قلعے کے اندر موجود دس بارہ محافظ گرفتار ہو چکے تھے۔ میں تیزی سے راہ داریوں میں دوڑتا ہوا قید خانوں
طرف بڑھ گیا۔ نوری اور اُس کے باپ سمیت گیارہ مزید قیدی اس زنداں سے برآمد ہوئے لیکن میری نظر
سلطان بابا کی تلاش میں بھٹک رہی تھیں۔ میں نے ایک ایک کال کوٹھڑی میں خود جھانک کر دیکھا لیکن اُ
کہیں کچھ پتا نہیں تھا۔ قیدی آزاد ہونے کے بعد قلعے کے صحن میں جمع تھے اور خوشی سے نعرے لگا رہے
قلعے سے باہر کال گڑھ کی ساری بستی، رات ہونے کے باوجود جمع ہو چکی تھی۔ لوگ اپنے بچھڑوں کے لیے
رہے تھے، چلا رہے تھے۔ جبروت کے ظلم کا سورج آج ہمیشہ کے لیے غروب ہو چکا تھا لیکن خود جبروت
جانے کہاں غائب تھا۔ اکرم اور اُس کے دو مزید خاص ہرکاروں کا بھی کچھ پتا نہیں تھا۔ میری سانسیں
لگیں۔ کہیں اُس نے سلطان بابا کو کوئی نقصان نہ پہنچا دیا ہو۔

نوری بھی اپنے باپ سمیت صحن ہی میں کھڑی رو رہی تھی۔ میں واپس دوڑتا ہوا ایس پی کے پاس پہنچا
اور اُسے بتایا کہ سلطان بابا کا کہیں کچھ پتا نہیں چل رہا۔ ایس پی وائرلیس پر اپنی فورس کو ہدایات دینے میں
مشغول ہو گیا۔ اتنے میں قیدیوں کے ہجوم سے ایک قیدی باہر نکلا اور اُس نے مجھے گلے لگا لیا۔ ''میں جانتا
تھا...... تم کامیاب واپس لوٹو گے......'' آواز سنتے ہی میں نے چونک کر اُسے دیکھا، وہ خانو تھا۔ میں بھی روہانسا
سا ہو گیا۔ ''یہ سب تمہاری مدد کی وجہ سے ممکن ہوا ہے خانو...... لیکن میرے سلطان بابا نہ جانے کہاں ہیں۔ سارا
قلعہ چھان مارا ہے لیکن......'' خانو چلایا ''ٹھہرو! وہ ضرور بابا کو قلعے کی اُس خفیہ سُرنگ کے ذریعے لے جانے
کی کوشش میں ہوں گے، جو سیدھی صحرا کو جا نکلتی ہے......'' ایس پی نے خانو کی بات سنتے ہی مزید ایک لمحہ
ضائع کیے بنا کچھ سپاہیوں کو خانو کے ساتھ اُس سرنگ کا پتا لگانے کے لیے دوڑا دیا۔ میں نے بڑھنے کی
کوشش کی تو مجھے روک دیا گیا۔ ''آپ رُک جائیں...... وہاں خطرہ ہو سکتا ہے......'' میرے بس میں ہوتا تو
سب سے آنکھ بچا کر وہاں سے بھاگ جاتا۔ کچھ ہی دیر میں ایک سپاہی ہانپتا ہوا دوڑ کر واپس آیا اور اُس کی
بات سُن کر میری آنکھوں تلے اندھیرا چھا گیا۔ وہ زور سے چیخا ''سرنگ مل گئی ہے صاحب۔ وہاں ایک
بوڑھا اوندھے منہ پڑا ہے......''

پہلا کفارہ

اُس سپاہی کی بات سن کر مجھے یوں لگا، جیسے ابھی آسمان پھٹ کر ہمارے سروں پر آ گرے گا۔ میں تی کر آگے بڑھا تو کسی دوسرے سپاہی نے میرا راستہ روکنے کی کوشش کی۔ لیکن میں اُسے دھکیل کر قلعے کی غلام گردش کی طرف بھاگا، جہاں خانو سُرنگ دکھانے کے لیے باقی سپاہیوں کو لے گیا تھا۔ وہاں تھوڑے فاصلے پر مجھے اندر جاتی سیڑھیاں نظر آ گئیں، جو بظاہر کسی تہ خانے کا راستہ دکھائی دے رہی تھیں۔ جانے جبر جیسے ہر قلعے دار کو اپنے قلعے میں ایسی خفیہ سرنگیں بنانے کی ضرورت کیوں پیش آتی ہے۔ میں نے تاریخ میں ایسے بہت سے بادشاہوں کا تذکرہ پڑھا تھا جو اپنے محل سے فرار کا ایسا کوئی پوشیدہ راستہ ضرور بنا کر رکھتے تھ کیا جبر اور اقتدار ہمیشہ ہی سے چور راستوں کا محتاج رہا ہے۔ سرنگ کے اندر سپاہیوں کا جمگھٹا سا تھا۔ انتہ تنگ ہونے کے باوجود نہ جانے اس سرنگ میں ہوا کہاں سے آ رہی تھی۔ میں ٹارچ کی روشنی میں بنے دائر سے ہوتا ہوا وہاں تک پہنچا، جس جگہ کی سپاہی نے نشان دہی کی تھی۔ ہاں، وہ سلطان بابا ہی تھے۔ ہوش و حوا سے بیگانہ، نہایت زرد رنگت اور اُکھڑی سانسوں کے ساتھ بے سدھ پڑے ہوئے۔ کچھ سپاہی اُن کے ہا پاؤں مسل کر انہیں ہوش میں لانے کی کوشش کر رہے تھے۔ میرا دل ڈوبنے لگا۔ کچھ ہی دیر میں سلطان بابا کو کر باہر کھلی فضا میں پہنچا دیا گیا۔ بظاہر انہیں کوئی چوٹ لگی نظر نہیں آ رہی تھی۔ ایس پی صاحب نے جب سپاہی کو اپنی گاڑی سے میڈیکل بکس لانے کا حکم دیا تو عقدہ کھلا کہ وہ ڈاکٹر پہلے ہیں اور سی ایس ایس آفیسر میں۔ انہوں نے سلطان بابا کا تفصیلی معائنہ کیا اور ایک انجیکشن بھی لگا دیا۔ انہیں بھی بظاہر گھٹن اور تھکن علاوہ کوئی خاص علامت دکھائی نہیں دی، لیکن انہوں نے مجھے تلقین ضرور کر دی کہ پہلی فرصت میں انہیں بڑے اسپتال میں مکمل طبی معائنے کے لیے ضرور لے جاؤں۔ قلعے میں ابھی تک افراتفری پھیلی ہوئی تھ سپاہیوں کے ساتھ زنانہ پولیس بھی تھی، جس نے قلعے کی تمام خواتین کو اندرونی احاطے میں جمع کر کے انہیں دی کہ فی الوقت اُن میں سے کسی کو پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ وہ اپنے اپنے کمروں میں آرام کری البتہ واضح رہے کہ اُن میں سے کسی کو بھی قلعہ چھوڑنے کی اجازت نہیں ہے۔ رات تیزی سے ڈھل رہی تھی میں وہیں سلطان بابا کے سرہانے پریشان بیٹھا بار بار اُن کا ماتھا چھو کر دیکھ رہا تھا۔ مجھے کچھ حدت سی مح ہوئی تو میں جلدی سے ایس پی صاحب کو بلا لایا۔ انہوں نے تصدیق کر دی۔ ''ہاں...... کچھ بخار سا تو ہے۔ اتنی تھکن کے بعد یہ کوئی تشویش کی بات نہیں۔'' میں نے اُن سے جبروت کے بارے میں پوچھا تو انہوں

ایا کہ سارے علاقے کا محاصرہ کر لیا گیا ہے، لیکن فی الحال اُس کی حراست کی اطلاع نہیں آئی۔ میں نے بھیڑ سکینہ کے نانا نانی کو دیکھا تو میرا جی چاہا کہ دوڑ کر کہیں چھپ جاؤں، لیکن وہ تو خود مجھے ہی تلاش کر رہے ھے۔ ظاہر ہے اُن کے پاس وہی ایک تھا۔ جس کے بارے میں سوچ کر ہی میری سانسیں گھٹنے لگتی تھیں۔ انک ہجوم میں خانو مجھے ایک جانب کھڑا نظر آیا۔ میں نے اشارے سے اُسے اپنے پاس بلایا۔ وہ جلدی سے ری جانب بڑھا ''تم اپنے گناہوں کا کفارہ ادا کرنا چاہتے تھے نا......؟'' ہاں۔ اور اِسی لیے میں نے خود لیس کو اپنے بارے میں سب بتا دیا ہے۔ ایس پی صاحب نے مجھے جبروت کے خلاف ''سلطانی گواہ'' بنانے کا دہ بھی کیا ہے۔ مجھے جبروت کے ہر گناہ کا اقرار بیان کی صورت میں بھری عدالت میں کرنا ہوگا اور میں اس لیے تیار ہوں۔ بلکہ پولیس اگر مجھے سلطانی گواہ نہ بھی بنائے تب بھی عدالت میں بیان ضرور دوں گا۔'' میں غور سے خانو کی طرف دیکھا۔ ''نہیں تم ضرور سلطانی گواہ ہی بنو گے، لیکن یہ تمہارا کفارہ نہیں ہوگا۔ تمہارا ل کفارہ تمہاری رہائی کے بعد شروع ہوگا۔ بولو، منظور ہے؟'' خانو نے میرے ہاتھ پکڑ کر اپنی آنکھوں سے لگا یے۔ ''تمہارے لیے خانو کی جان بھی حاضر ہے۔ تم صرف کفارے کی بات کرتے؟'' میں نے اُسے دُور ڑے بوڑھے جوڑے کی طرف اشارہ کر کے بتایا ''یہ بوڑھا اور بڑھیا اُسی سکینہ کے نانا اور نانی ہیں، جو اِسی ے کی کھولی نمبر سات میں دفن ہے۔ تمہارا پہلا کفارہ یہی ہے کہ تم انہیں لے جا کر سکینہ کی قبر دکھاؤ اور اس بڑھیا شانوں پر پڑی وہ آدھی پھٹی ہوئی پھولوں والی چادر اُس بدنصیب کی قبر پر ڈال دو۔'' خانو کے چہرے کا گ پیلا پڑ گیا اور وہ یوں ڈر کر دو قدم پیچھے ہٹ گیا، جیسے اُس کے قدموں تلے کوئی بچھو نکل آیا ہو۔ ''نہیں نہیں! ہ نہیں ہوگا۔ تم چاہو تو میرا سر کاٹ کر اُن کے قدموں میں ڈال دو، لیکن......'' ''لیکن کیا؟ ابھی تو تم دعویٰ ر رہے تھے کہ کفارے کے لیے ہر حد سے گزر جاؤ گے۔ پھر اس پہلی حد کو پار کرنے سے پہلے ہی تمہارے ؤں کیوں جلنے لگے......؟'' وہ بے بسی سے تلملایا ''نہیں یہ بات نہیں ہے۔ لیکن میں اُن کا سامنا کیسے کروں ؟'' میں نے اُس کا چہرہ اپنی جانب موڑا ''تمہیں صرف آج نہیں، ساری عمر اُن کا سامنا کرنا ہے۔ کیوں کہ ارا اصل کفارہ اب ان لاچاروں کی کفالت ہی ہے۔ اب تم ہی کو عمر بھر ان کی دیکھ بھال کرنی ہے۔ زندگی بھر گناہ دھونے کا اس سے بہترین موقع بھلا اور کیا ہوگا؟'' خانو نے شدید کش مکش کے عالم میں سکینہ کے رگوں کی جانب دیکھا۔ میں نے دھیرے سے اُسے اُن کی جانب دھکیل دیا۔ بڑھیا اپنے آس پاس سے زرنے والے ہر شخص سے یہی پوچھ رہی تھی کہ کیا قلعے کے سارے قیدی رہا ہو چکے ہیں اور کیا ان میں سے کسی اُن کی سکینہ کو کہیں دیکھا؟ خانو دھیرے دھیرے چلتا ہوا اُن کے قریب پہنچ گیا تھا۔ بوڑھی آنکھوں نے اُس ے بھی سوال پوچھا۔ خانو نے بنا کچھ کہے اُن دونوں کا ہاتھ پکڑا اور اندرونی راہ داری کی طرف بڑھ گیا۔ نو کے قدموں میں واضح لرزش مجھے اتنی دُور سے بھی نظر آ رہی تھی، لیکن یہ لڑکھڑاہٹ اُن قدموں کی تھی، جو ج زندگی میں پہلی مرتبہ کفارے کی راہ پر آگے بڑھ رہے تھے۔ جانے ہمارے قدم تب اس طرح کیوں نہیں

لڑکھڑاتے اور ڈگمگاتے جب ہم گناہ کے راستے پر بڑھ رہے ہوتے ہیں۔ نہ جانے قدرت ہم کمزور و
انسانوں کو اس قدر ثابت قدم اور مضبوط کیوں سمجھتی ہے؟ سچ ہے کہ انسان کا مقدر یہ عمر بھر کی پھسلن ہی
ہی ایسے خوش نصیب ہوتے ہیں، جو اس ازلی ڈھلان سے پھسلے بنا ہی سیدھے نیچے اُتر جاتے ہیں۔
کوٹھڑیوں کی جانب گئے تھوڑی ہی دیر ہوئی تھی کہ اچانک بڑھیا کی چیخوں نے آسمان سر پر اُٹھا لیا۔
بوڑھے کے رونے کی آواز بھی سنائی دی، تو ساری بستی والے اُس جانب دوڑے۔ میں وہیں گم صم
بابا کے سرہانے بیٹھا رہا کہ میں جانتا تھا کہ ان بدنصیبوں پر کیا قیامت گزر چکی ہے۔ ایک لمحے کو مجھے یو
میں نے سکینہ کے نانا نانی کی آس سدا کے لیے توڑ کر کچھ اچھا نہیں کیا۔ کیا بُرا تھا اگر میں اُنہیں اُن کی
آخری چند سالوں میں اسی بھرم ہی میں جینے دیتا کہ اُن کی لاڈلی نواسی گم شدہ، لیکن زندہ ہے۔ ہم میں
بہت سے انسان اپنی ساری زندگی ایسے ہی کسی جھوٹے بھرم میں گزار دیتے ہیں کہ "وہ مجھے چھوڑ گئی،
وفا نہ تھی۔ وہ واپس لوٹا ہے تو پھر میرا ہی ہوگا۔" "یہ دنیا ہماری نہیں تو کیا، آخرت تو ہماری ہی ہے۔" "یا
زندگی کس نے دیکھی ہے، جتنا بھی جینا ہے، یہی جی لیں۔" تو اگر ایک بھرم اور بڑھ جاتا تو ایسا کیا گناہ
لیکن میں اس عمر بھر کی اذیت سے بھی واقف تھا، جو کسی کے نہ ختم ہونے والے انتظار کی صورت میں جھ
ہے۔ انتظار تو خود پل پل وارد ہوتی موت کا نام ہے اور میں اُن دونوں کی بوڑھی آنکھوں کو انتظار کی
صلیب پر مزید نہیں لٹکانا چاہتا تھا، ورنہ شاید اُن کی پلکیں موت کے بعد بھی کھلی رہ جاتیں۔

کچھ دیر میں سلطان بابا نے کراہتے ہوئے آنکھیں کھول دیں۔ میں جلدی سے اُن پر جھکا "اب
آپ...... آپ نے تو میری جان ہی نکال دی تھی۔ ہوا کیا تھا؟" میں نے ایک ہی سانس میں کئی
ڈالے۔ سلطان بابا دھیرے سے مسکرائے۔ "ابھی تک بہت جلد باز ہو۔" پھر انہوں نے آہستہ آہستہ
کہ جبروت کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ میں صرف بارہ گھنٹے کے قلیل وقفے میں ضلع بھر کی پو
لے کر قلعے کے دروازے پر آ پہنچوں گا۔ جیسے ہی اُسے پولیس کی آمد کی اطلاع ملی اور صحرا سے آئی جیپ
نے اُسے بتایا کہ صحرا میں صرف اور صرف پولیس ہی کی گاڑیاں نظر آ رہی ہیں، تو اُس نے سب
حکومت میں موجود اپنے اُن اعلیٰ عہدے داروں سے رابطہ کرنے کی کوشش کی، جو اُس کے در پردہ ہم
لیکن حسبِ معمول اس موقع پر سب ہی نے کسی نہ کسی بہانے سے معذرت کر لی۔ ایک آدھ نے پو
دربار کی گھنٹی ہلانے کی کوشش کی بھی، تو وہاں نصیر صاحب کی ہدایات کا قفل پڑا پایا۔ جبروت کے پا
تیزی سے ختم ہو رہا تھا اور فورس کال گڑھ میں داخل ہو چکی تھی۔ تب ہی اُس نے سلطان بابا کو طلب کیا
کر اُن سے پوچھا کہ آخر وہ ہیں کون؟ لیکن اس سے پہلے کہ سلطان بابا کوئی جواب دے پاتے،
گاڑیوں کی آوازیں قریب آنے لگیں اور مجبوراً جبروت کو افراتفری میں وہاں سے بھاگنا پڑا۔ جاتے جا
نے اپنے ہرکاروں کو سلطان بابا کو بھی ساتھ لے جانے کا حکم بھی دے دیا، لیکن اس بھاگ دوڑ میں سلط

دو چار دھکے سینے پر اس زور سے لگے کہ وہ بھاگنے والوں کے تیز قدموں کے لیے زحمت بن گئے۔ جبروت
آگے نکل چکا تھا، پیچھے والوں میں سے کسی نے اُن کے سر پر وار کیا اور وہ لوگ انہیں بے سدھ پڑا چھوڑ کر خود
آگے بڑھ گئے۔ شاید اُن کے ذہن میں کہیں یہ اطمینان بھی ضرور ہوگا کہ اس خفیہ سُرنگ میں یہ ضعیف شخص
ایڑیاں رگڑ رگڑ کر ہی جان دے دے گا، کیوں کہ عام حالات میں اُس تہ خانے کی دیواروں میں چھپے، اس
سرنگ کے دروازے کو ڈھونڈنے میں ہمیں شاید ہفتوں لگ جاتے ہیں، لیکن ایک بار پھر یہاں خانو کا کفارہ
جبروت کی تمام چالوں اور گناہوں پر بازی لے گیا اور چند لمحوں بعد ہی ہم نے انہیں کھوج لیا۔ میں نے انہیں
مختصراً سکینہ کے بارے میں بتایا تب تک اندر سے سکینہ کے نڈھال نانا نانی کو کچھ لوگ سہارا دیئے ہوئے باہر
نکال لائے۔ خانو بھی اُن کے ساتھ ہی تھا۔ ایس پی صاحب کو سلطان بابا کے ہوش میں آنے کی خبر ملی، تو انہوں
نے فوراً آئی جی صاحب کو کنٹرول لائن کے ذریعے اطلاع کروا دی۔ رات ڈھلنے ہی والی تھی۔ میرے شدید
اصرار کے باوجود سلطان بابا نے مزید آرام کرنے سے منع کر دیا اور مؤذن کو وہیں قلعے کی فصیل پر چڑھ کر اذان
دینے کی ہدایت کی۔ وہ بہت نڈھال سے لگ رہے تھے، لیکن انہوں نے وہیں قلعے کے پکے صحن کو دھلوا کر
چادریں بچھوائیں اور امام صاحب سے درخواست کی کہ وہ آج یہیں قلعے میں فجر کی جماعت کروائیں۔ قلعے کی
دیواروں نے صدیوں بعد یہ نظارا بھی دیکھا۔ امام کی قرأت کی آواز اس چار دیواری میں گونجی، تو بستی کے سب
ہی مکین نم دیدہ ہو گئے۔ طے یہ پایا کہ ظہر کی نماز کے بعد سکینہ کی آخری رُسومات یہیں قلعے میں ادا کی جائیں
گی۔ بوڑھا جوڑا بھی اسی حق میں تھا کہ اب اسی کوٹھڑی کو سکینہ کی قبر کے طور پر رہنے دیا جائے۔ البتہ وہاں
باقاعدہ مٹی کی ڈھیری اور قرآن و دعا وغیرہ کا انتظام کروا دیا گیا۔ میرا ذہن پھر سے جسم اور رُوح کے اُن دیکھے
تعلق کے اُلجھے دھاگوں کو سلجھانے کی کوشش میں خود اپنے بخیے ادھیڑنے لگا۔ رُوح کا عکس کیسا ہوتا ہوگا؟ کیا
ہمارے ظاہری جسم کی شباہت کا بھی اس عکس پر کچھ اثر پڑتا ہوگا یا پھر وہ ہوا کے کسی جھونکے کی طرح بے رنگ،
بے شکل ہوتی ہوگی اور مجھے سکینہ کا جو عکس صحرا میں نظر آیا تھا، وہ تو اُس کی موت کے بعد دکھائی دیا تھا۔ گویا وہ
عکس رُوح کے بغیر کی تصویر تھی۔ ہم خواب میں جو چلتی پھرتی تصویریں دیکھتے ہیں، وہ بھی تو بے جان ہی ہوتی
ہیں۔ جس شخص کو میں اپنے خواب میں چلتا پھرتا، دوڑتا بھاگتا دیکھتا ہوں، وہ اُس وقت اپنی رُوح سمیت کہیں
اور جیتا جاگتا موجود ہوتا ہے۔ گویا ہمارے ذہن کے پردے پر بنا رُوح جو فلم چل رہی ہوتی ہے، ضروری نہیں
کہ کبھی ہمارا اس شخص کے جسم اور رُوح سے کوئی خونی رشتہ بھی رہا ہو۔ ہم بالکل انجان اور نئے چہرے بھی اپنے
خواب میں دیکھتے ہیں۔ ہمارا ذہن ان کا خاکہ کیسے تراش لیتا ہے؟ اُن میں سے کئی چہرے ایسے بھی ہوتے ہیں،
جنہیں ہم باقی ساری زندگی کبھی دوبارہ نہیں دیکھ پاتے۔ لیکن کبھی کبھار ایسا ہوتا ہے کہ ہمیں کوئی خواب کا شناسا سا
چہرہ مل بھی جاتا ہے۔ تو کیا ہم عالم ارواح میں پہلے اُس چہرے کی رُوح سے مل چکے ہوتے ہیں؟ سلطان بابا
کی حالت اُس وقت ایسی نہیں تھی کہ میں انہیں مزید سوال پوچھ پوچھ کر پریشان کرتا، لیکن خود میں اُلجھتا ہی چلا

گیا۔ میں نے کہیں پڑھا تھا کہ آج بھی ہمارے درمیان ایسے لوگ موجود ہیں، جو مستقبل کی جھلکیاں اپنے خواب میں دیکھ لیتے ہیں۔ اُن میں سے بعض تو جاگتی آنکھوں چند لمحوں میں آنے والے کسی واقعے کی کچھ تفصیل، کبھی کچھ اشاروں میں اور کبھی باقاعدہ چہرے، نام اور جگہ کی تفصیل کے ساتھ دیکھنے کی صلاحیت بھی رکھتے ہیں۔ لیکن انہیں وہ اجنبی چہرے اور انجان جگہیں کس طرح خواب میں دکھائی دی جاتی ہیں۔ ضرور میرا اور سکینہ کی تصویر کا بھی کچھ ایسا ہی معاملہ تھا۔ وہ میرے لیے بظاہر انجان ہونے کے باوجود انجان نہیں تھی۔ میرا سارا دن اِسی سوچ بچار میں گزر گیا۔ میری پوری کوشش تھی کہ سلطان بابا جس قدر ہو سکے، آرام کریں، لیکن بستی والوں نے ہمیں مزار واپس لوٹنے ہی نہیں دیا اور نوری کا باپ ضد کر کے ہمیں اپنے گھر لے آیا۔ میں نے بستی کے ڈاکیے کے ذریعے شیر محمد کو بھی ایک رقعہ بھجوا دیا تھا کہ اگر ہو سکے تو اپنی یونٹ کا ڈاکٹر لے کر کچھ دیر کے لیے کال گڑھ آ جائے۔ میں چاہتا تھا کہ ایک مرتبہ سلطان بابا کا تفصیلی معائنہ کروا کے اپنا پورا اطمینان کر لوں اور پھر وہ "شاباشے جوانا شاباشے" کرتا ہوا عصر کے بعد اپنی جیپ میں ڈاکٹر کو لے کر پہنچ بھی گیا۔ ڈاکٹر نے نہایت تفصیل سے سلطان بابا کا معائنہ کیا۔ وہ اُن کی سر کی چوٹ کے بارے میں کچھ فکرمند نظر آ رہا تھا۔ اُس نے چند تفصیلی ٹیسٹ لکھ کر دے دیئے کہ دو دن آرام کے بعد جب سلطان بابا سفر کے قابل ہو جائیں، تو فوراً شہر کی کسی بڑی لیبارٹری سے یہ ٹیسٹ کروا لیے جائیں۔ تب تک اُس نے سلطان بابا کو سختی سے آرام کرنے کا مشورہ دیا۔

مغرب کے بعد شیر محمد اور ڈاکٹر کو رُخصت ہوئے تھوڑی ہی دیر ہوئی تھی کہ مکمل اندھیرا چھاتے ہی سرحد کی جانب سے شدید فائرنگ کی آواز نے ہم سب کو چونکا دیا۔ پولیس کی نفری بھی ابھی تک کال گڑھ ہی میں موجود تھی اور پھر کچھ دیر بعد ہی ایس پی صاحب نے آ کر ہمیں وہ خبر سنائی، جو ایک خدشے کی طرح میرے دل و دماغ کے کسی کونے میں صبح سے کھٹک رہی تھی۔ جبروت اور اُس کے چار ساتھی سرحد پار کرنے کی کوشش میں سرحدی رینجرز سے بھڑ گئے اور میری توقع کے عین مطابق جبروت نے ہتھیار ڈالنے سے انکار کر دیا تھا۔ مجھے ایک بار سلطان بابا نے بتایا تھا کہ معافی اور توبہ کی توفیق بھی مقدر والوں ہی کو نصیب ہوتی ہے، ورنہ آنکھوں پر لوہے کے پردے اور کانوں میں سیسہ پگھلا دیا جاتا ہے۔ انسان کے سوچنے سمجھنے کی ہر صلاحیت سلب کر لی جاتی ہے۔ شاید یہی سب کچھ جبروت کے ساتھ بھی ہو رہا تھا۔ اُس کی انا اُسے کفارے کے راستے پر بڑھنے سے روک رہی تھی۔ موت دونوں جانب ہی اُس کا مقدر تھی۔ وہ گرفتاری دے دیتا، تب بھی صرف سکینہ کا قتل ہی اُسے پھانسی پر چڑھانے کے لیے کافی تھا اور شاید خود کو اپنی مرضی سے دار کے حوالے کر دینے سے قدرت اُس کے چند گناہ دھو بھی ڈالتی، لیکن اُس نے گناہوں کی کالک ماتھے پر لیے ہی اس جہاں سے جانے کی ٹھان لی تھی۔ پولیس کنٹرول کے ذریعے ہمیں پل پل کی خبر مل رہی تھی کہ اب جبروت کے گرد گھیرا تنگ کر دیا گیا ہے۔ اب اُس کے ساتھی بھاگ رہے ہیں اور پھر اُس کا پہلا محافظ گرا پھر دوسرا اور اب جبروت کو آخری تنبیہ کی جا رہی ہے کہ ہتھیار ڈال کر سامنے آ جائے اور پھر مکمل خاموشی...... ایک آخری فائر کی آواز گونجی اور پھر پولیس

کے وائرلیس سیٹ چیخ پڑے، ہر جانب ایک شور سا مچ گیا۔ جبروت نے خود کو کنپٹی پر گولی مار کر اپنا خاتمہ کر لیا تھا۔ بستی کی ساری آبادی، جو پولیس کے عارضی صحرا میں قائم کردہ کنٹرول روم کے گرد جمع تھی، گنگ سی رہ گئی۔ چاروں طرف ایک سناٹا چھا گیا۔ ظلم کا ایک باب ہمیشہ کے لیے بند ہو گیا۔ ابھی چوبیس گھنٹے پہلے تک، جو ان سب لوگوں کی قسمت کا فیصلہ گر تھا، آج ایک بے جان لاشے کی صورت ریت پر بے بس پڑا تھا۔ سرخ رنگ اور خون کی دھار تو اُس کا پسندیدہ کھیل تھا اور آج جاتے جاتے بھی وہ یہ کھیل کھیل ہی گیا۔ سلطان بابا کو خبر پہنچی تو اُن کی زبان سے ایک ہی جملہ نکلا "انا للّٰہ و انا الیہ راجعون......" وہ ابھی نوری کے گھر ہی میں آرام کر رہے تھے اور پھر اگلی صبح سورج نکلتے ہی پہلے سانول اور پھر اُس کا باپ یکے بعد دیگرے نمودار ہوئے۔ سانول مجھے دیکھتے ہی بھاگ کر میرے گلے لگ گیا اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔ اُس کا باپ بھی شرمندہ سا پیچھے کھڑا تھا۔ بڑی مشکل سے میں نے اُسے چپ کروایا۔ سانول کے باپ نے ساری بستی کے سامنے ہاتھ جوڑ دیئے کہ وہ جبروت کے ڈر کی وجہ سے کھل کر بستی والوں کا ساتھ نہیں دے سکا۔ نہ ہی اُس نے اپنے بیٹے کو جبروت کے نوری کے لیے بھیجے گئے رشتے اور اس سارے معاملے کی خبر ہونے دی، کیوں کہ اُسے خدشہ تھا کہ وہ اپنے جوان بیٹے سے ہاتھ دھو بیٹھے گا۔ میں نے آگے بڑھ کر اُس کے جڑے ہوئے ہاتھ کھول دیئے۔ وہ خوف زدہ تھا اور زمانے میں خوف سے بڑی کوئی دلیل نہیں ہوتی۔ کال گڑھ والوں کے سر سے جبروت کے خوف کے بادل چھٹے، تو اُن کی زرد رنگت میں بھی دھیرے دھیرے سرخی شامل ہونے لگی۔ چوبیس گھنٹے کے اندر ہی وہ صرف سانس لینے کی مجبوری سے نکل کر جینے کے سپنے دیکھنے لگے تھے۔ میرا ارادہ یہی تھا کہ میں اگلے دن بستی والوں سے رُخصت لے کر سلطان بابا کو شہر کے کسی بڑے اسپتال میں داخل کروا دوں تا کہ اُن کے تمام ٹیسٹ ہو سکیں۔ ویسے بھی کال گڑھ میں ہمارا کام ختم ہو چکا تھا، لیکن جیسے ہی میں نے اپنی اس خواہش کا بستی والوں کے سامنے اظہار کیا، سب ہی بگڑ گئے۔ سانول تو باقاعدہ لڑنے کے لیے آ پہنچا کہ اگر سلطان بابا کا طبی معائنہ ہی کروانا ہے تو وہ خود میرے ساتھ شہر جا کر دو چار دن میں سارے کام مکمل ہونے کے بعد میرے ساتھ ہی واپس آ جائے گا۔ اب میں انہیں کیسے سمجھاتا کہ ہمارے پاؤں میں چکر تھا، جانے قدرت نے ہمارا اگلا پڑاؤ کہاں لکھا تھا اور اب مزید کون سا امتحان درپیش ہوگا۔ اُسی شام سانول کے باپ کی درخواست پر نوری کو باقاعدہ نشانی پہنانے کی رسم بھی رکھی گئی تھی۔ شام ہی سے بستی کے سب ہی گھروں کی دیواروں کی منڈیر پر دیئے جلا دیئے گئے۔ یہ اس صحرا کا پہلا چراغاں تھا، جو قلعے کی دیواروں کے باہر خود بستی والوں کی مرضی سے ہو رہا تھا۔ مردوں نے برسوں سے صندوقوں میں پڑی اپنی سفید لٹھے کی گھیردار شلواریں نکلوا کر انہیں مائع لگا کر تیاری کی۔ بوسکی کی دو گھوڑوں کے نشان والی قمیصیں اور سر پر نیا صافہ یا سرخ پگڑی، عورتوں نے بھی اپنے بازو کہنیوں سے اُوپر تک چوڑیوں سے بھر لیے۔ سرخ، نیلے، پیلے، اودے اور سفید بڑے گھیر والے پلو اور ناک میں چمکیلے کوکے۔ جانے ایسی رسموں کا مہندی سے ایک خاص تعلق کیوں جُڑا ہوتا ہے۔ شاید رنگ اور خوشی کا آپس میں کوئی گہرا ناتہ ہوگا۔

اِسی لیے تو جہاں خوشی بکھرتی ہے، وہیں بہت سے رنگ بھی دَر آتے ہیں۔ میں خود تو ابھی تک اس ''خوشی'' نامی جذبے یا احساس کی گتھی ہی نہیں سلجھا پایا تھا۔ خوشی کیا ہوتی ہے۔ مجھے تو ہمیشہ سے ہی زیادہ خوشی مزید افسردہ کر دیتی ہے۔ شاید میرے اندر خوشی جھیلنے کا ظرف ہی نہیں تھا اور کسی ایسے احساس کا جشن کیا منانا، جو چند گھڑیوں سے لے کر بس چند گھنٹوں تک ہی آپ کا ساتھی ہو۔ شاید خوشی کا واسطہ ہی اس کی اس کم یابی کی صفت سے جڑا ہے۔ بڑی سے بڑی خوشی ہمیں بس کچھ دیر کے لیے ہی تو مکمل مسرور رکھ پاتی ہے اور پھر دھیرے دھیرے یہ سرور ایک اطمینان میں ڈھلنے لگتا ہے اور چند گھنٹوں بعد ہی کسی احساس کی تکمیل کی طمانیت میں تبدیل ہو کر ذہن کے کسی گوشے میں کروٹ لے کر سو جاتا ہے۔ پھر جب تک ہم خود اس لطیف احساس کو نہ ٹٹولیں، یہ اپنے آپ نہیں جاگتا۔ لیکن اس کے برعکس ''غم'' ہر لمحہ بوند بوند ہو کر ہمارے دل کی زمین پر ٹپکتا رہتا ہے۔ ہمیں خوشی کو کچھ دن کے بعد یاد کرنے کی ضرورت پڑتی ہے، جب کہ غم ہمیں کبھی بھولتا نہیں۔ کسی وفادار دوست کی طرح ہر پل ہمارے وجود کے اندر رہتا ہے۔ خوشی اپنے ساتھ ہمیشہ رُخصت ہونے کا تصور لاتی ہے، جب کہ غم کا کانٹا ایک دائمی چبھن، کاٹ اور جلن لیے دل کے اندر ہی پیوست ہو جاتا ہے۔ تو پھر نہ جانے ہم ہمیشہ خوشی کی تلاش میں کیوں بھٹکتے رہتے ہیں۔ اس بے وفا کو ہر لمحہ خوش آمدید کہنے کے لیے کیوں تیار رہتے ہیں، جو ہمیشہ اپنے ماتھے پر ''الوداع'' لکھوا کر آتی ہے۔ اُسے کیوں اُٹھا کر سدا کے لیے اپنے سینے سے نہیں لگا لیتے، جو عمر بھر ہمارے چوکھٹ پر پڑا ہمارا انتظار کرتا رہتا ہے۔

سانول بھی آج اس بے وفا خوشی کے وار کا شکار تھا۔ جب میں مزار کی دہلیز پر پڑے غم کی چوکھٹ پار کر کے بستی کے لیے نکلا، تو شام ڈھل چکی تھی۔ غم مجھے جاتے دیکھ کر بولا ''جاؤ مل آؤ، اس دو گھڑی کی ساتھی سے میں یہیں پڑا رہ کر تمہارا انتظار کروں گا۔ پر دیکھو، کہیں دیر نہ کر دینا کہ میرا تمہارا تو سدا کا ساتھ ہے۔'' سلطان بابا کی دیکھ بھال کے لیے پیش امام صاحب نے مسجد سے دو طلبا کو مزار بھیج دیا تھا، کیوں کہ سلطان بابا اس شور شرابے سے گھبرا کر آج شام ہی واپس مزار لوٹ آئے تھے۔ میں جب سانول کے گھر کے قریب پہنچا تو دُور سے مجھے عورتوں کی گنگناہٹ سنائی دی۔ صحرائی گیت کے بول سانول کو مبارک باد دے رہے تھے ''کہ آج سے زیادہ خوش قسمت کون ہوگا۔ تمہاری محبوب سولہ سنگھار کیے اور اپنے ماتھے پر تمہارے نام کی بندیا لگائے کب سے تمہارا انتظار کر رہی ہے...... لیکن خدا مارے ان چوڑیوں والیوں کو...... یہ ہمیشہ دیر کر دیتی ہیں...... شاید تمہاری محبوب سے جلتی ہیں۔'' عورتیں زور سے ہنسیں اور کسی دوسری جانب سے کوئی اور ٹولی گنگنائی، یہ چوڑی والیوں کا جواب تھا ''ہاں ہاں...... ہم کیوں جلدی کریں؟ ہمارے تو دل جل رہے ہیں...... بستی میں ایک ہی چھیل چھبیلا تھا، جس کی بانسری سننے کے لیے ہم ساری صحرا میں جمع ہوتی تھیں...... خدا کرئے آج اس زور آندھی چلے کہ صحرا کا شہزادہ اپنا راستہ بھول کر چوڑی والیوں کی بستی میں آ جائے......'' سب عورتیں ہنس پڑیں۔ جانے یہ صحرائی گیت اور ٹپے کون لکھتا ہوگا۔ جانے ایسے کتنے گم نام شاعر ہوں گے، جنہیں دنیا کبھی جان نہیں پائی، لیکن ان کے الاپ اور گیت سدا کے لیے امر ہو کر ان صحراؤں، بستیوں اور گاؤں گلیوں میں سینہ بہ سینہ منتقل ہوتے رہتے ہیں۔

سانول کی منگنی کی تقریب کا ہنگامہ اپنے عروج پر پہنچ چکا تھا۔ لڑکے والیاں ترکی بہ ترکی لڑکی والیوں کے سوالوں کا جواب دے رہی تھیں۔ مرد قہقہے لگا رہے تھے۔ صحرا کے بنے ہوئے خاص سونف اور شکر کے مشروب سے ساری تقریب کی خاطر مدارات کی جا رہی تھی۔ بچے اِدھر اُدھر بھاگے پھر رہے تھے۔ ہر طرف نور، رنگ، نور اور قہقہے تھے۔ سانول کو عورتوں کے جھرمٹ میں باہر لایا گیا، تو سب ہی اُس جانب دوڑے۔ کچھ ایسا ہی منظر نوری کے صحن کا بھی تھا۔ اس وقت نوری کے چہرے پر شام کی لالی اور صبح کے نور جیسے دو موسم بیک وقت جھلملا رہے تھے۔ یہ لڑکیاں ایسے موقعوں پر اتنے بہت سے رنگ بیک وقت کیسے سمیٹ لیتی ہیں۔ اب عورتوں کے تیروں کا رُخ میری جانب ہو گیا تھا۔ ایک نے لے لگائی ''جانے لوگ کس کے غم میں جوگی بن بیٹھے ہیں۔ کاش آسمان پر اُڑتی یہ نیلی پتنگ مزار کے مجاور تک میرا پیغام بھی پہنچا دے......'' سب زور سے ہنسے۔ دوسری ولی نے تان چھیڑی۔ ''مزار کے مجاور کی آنکھوں کا سرمہ جانے کس کان سے آتا ہے...... اگر وہ چاہے تو ہم سب اپنی اپنی سرمے دانیاں مزار کی چوکھٹ پر چھوڑ آئیں......'' سانول میرے قریب ہی بیٹھا ہنس ہنس کر اس صحرائی بولی کا ترجمہ مجھے سنا رہا تھا۔ لفظ چاہے کسی بھی زبان کے ہوں...... ان گیتوں کا مطلب سدا ایک سا ہی ہوتا ہے۔

ابھی یہ ہنگامہ جاری تھا کہ صحن کا دروازہ کھلا اور ایک طالب علم، جسے میں مزار چھوڑ آیا تھا، گھبرایا ہوا سا اندر داخل ہوا اور مجھے دیکھتے ہی تیر کی طرح میری طرف بڑھا۔ اس کی کچی پکی اُردو سے میں صرف اتنا ہی سمجھ پایا کہ سلطان بابا کو خون کی قے ہوئی ہے اور اُن کی حالت ٹھیک نہیں ہے۔ میرے جسم میں سے جیسے کسی نے پل بھر ہی میں ساری جان نکال دی۔ میں نے سانول سے کہا کہ وہ یہیں رہے، لیکن مجھے ابھی مزار لوٹنا ہوگا۔ لیکن سانول بھی میرے پیچھے ہی لپکا۔ کچھ ہی دیر میں ہم دیگر بہت سے لوگوں سمیت مزار کی جانب دوڑے چلے جا رہے تھے۔

دھانی

سلطان بابا کی حالت واقعی بہت خراب تھی۔ چند لمحوں ہی میں وہ برسوں کے بیمار نظر آنے لگے رات کی گاڑی چھوٹنے میں ابھی سوا گھنٹہ باقی تھا لیکن اس وقت سب سے بڑا مسئلہ سواری کا تھا۔ گھنٹہ یہاں سے ریلوے اسٹیشن کی مسافت تھی۔ لیکن کسی مریض کو بنا کسی سواری، یہ صحرا پار کرانے میں ہو جاتی ہے۔ لہٰذا طے یہ ہوا کہ ہم دو دو کی ٹولیوں میں اُونٹوں پر سفر کریں گے۔ بستی میں سواری کے اُونٹ موجود تھے۔ عام حالات میں ان کے پیچھے دو پہیوں والی ٹھیلا گاڑی بھی لگا دی جاتی تھی۔ لیکن اَب وہ پہیے ریت میں دھنس کر چلنے کی وجہ سے تاخیر کا باعث بن سکتے ہیں لہٰذا ہمیں اُونٹوں کے مضبوط قدموں انحصار کرنا تھا۔ کچھ ہی دیر میں ہم دس آدمی پانچ اُونٹوں پر سوار، صحرا میں دوڑے جا رہے تھے۔ سلطا میرے ساتھ تھے۔ سانول اور اُس کا باپ ایک اُونٹ پر اور نوری کا باپ اور پیش امام صاحب ایک سا تھے۔ خانو، اکرام صاحب اور بزرگ بقیہ اُونٹوں پر تواتر سے ہمارے پیچھے چلے آ رہے تھے۔ کچھ دیر پہلے ہم بستی کی سرحد سے گزر رہے تھے تو سب ہی مرد اور عورتیں مجھے اور سلطان بابا کو الوداع کہنے کے لیے آئے۔ میں نے صحرا میں پلٹ کر دیکھا اور مجھے یوں لگا جیسے ہوا دھیرے سے میرے کان میں سکینہ کے پیغام کی سرگوشی کر کے ہولے سے گنگنائی ہو...... ''الوداع......''

ہم تیزی سے صحرا عبور کر کے اسٹیشن تک پہنچ تو آئے۔ مگر جس وقت میں نے دُور صحرا میں ریلوے کی اُجاڑ عمارت اور پلیٹ فارم کے آخری سرے پر جلتی ٹمیالی سی گیس بتی دیکھی، تب تک ہمیں گھنٹہ بھر سے زیادہ وقت ہو چکا تھا۔ پلیٹ فارم پر پہنچے تو کانٹا بدلنے والے نے خوش خبری سنائی کہ آج گاڑی دو گھنٹے لیٹ ہے، اس لیے ابھی کال گڑھ نہیں پہنچی۔ میں نے سلطان بابا کو وہیں پلیٹ فارم پر بچھے، لکڑی کے تختے پر لٹا دیا۔ نہ جانے کن فکروں میں وقت گزر گیا اور گاڑی پلیٹ فارم پر آ کر لگ گئی۔ سب ہی کی آنکھیں نم، افسردہ تھے۔ سانول میرے ساتھ شہر جانے پر مُصر تھا۔ میں نے بڑی مشکل سے اُسے واپس جانے پر آمادہ سیکنڈ کلاس کے ڈبے میں بھیڑ کے باوجود مجھے سلطان بابا کو لٹانے کی جگہ مل ہی گئی۔ یہاں سے قریب ترین رحیم پور بھی کم از کم بارہ گھنٹے کی مسافت پر تھا۔ اور میں سارا راستہ یہی دعا کرتا رہا کہ ہمارے وہاں پہنچنے مزید کوئی اَن ہونی نہ ہو جائے۔ بارہ گھنٹے بعد ساڑھے نو بجے کے قریب جب ٹرین نے رحیم پور کے پلیٹ فارم کو چھوا تو میں نے سب سے پہلے گھر فون کر کے مما پپا سے بات کی اور انہیں کچھ پیسے بھیجنے شہر کے سب سے بڑے اسپتال کا پتا میں پہلے ہی اسٹیشن ماسٹر سے پوچھ چکا تھا۔ دوسرا فون میں نے آئی جی نصیر کو کیا کیوں کہ انہوں نے ایس پی کے ذریعے سلطان بابا کی پل پل کی خبر دینے کی ہدایت کی تھی۔ جب انہیں پتا چلا کہ میں رحیم پور میں ہوں تو فوراً اپنے ایک ریٹائرڈ دوست کا نام، پتا اور ٹیلی فون نمبر لکھوا کر تاکید کی کہ اسپتال پہنچ کر انہیں بھی ضرور مطلع کر دوں۔ یہ صاحب پولیس کے اعلیٰ عہدے سے ریٹائر ہونے کے بعد اب رحیم پور ہی میں اپنا فارم ہاؤس اور مالٹے، کینو کے باغات کا کام سنبھالتے تھے۔ میں نے بے دھیانی میں ساری تفصیل کاغذ کی ایک چٹ پر لکھ کر جیب میں ڈال لی۔ اُس وقت میری ساری توجہ اس جانب تھی کہ کسی طرح جلد از جلد سلطان بابا کو اسپتال پہنچا دوں۔ اسٹیشن کے باہر ٹیکسی اسٹینڈ سے گاڑی لے کر میں لشتم پشتم اس بڑے نجی اسپتال تک پہنچا اور یہاں ایک بار پھر میرا حلیہ میرے آڑے آ گیا۔ باہر کھڑے دربان کو اس بات کا یقین ہی نہیں تھا کہ میں اتنے بڑے اسپتال کی فیس بھر سکوں گا۔ تب قریب سے گزرتے ایک معمر ڈاکٹر کو روک کر میں نے اُس سے درخواست کی کہ وہ ہمیں اندر جانے کی اجازت دلوائے۔ پپا رقم پہلے ہی اسپتال کے اکاؤنٹ میں منتقل کروا چکے تھے۔ وہ کوئی بھلا انسان تھا۔ اُس نے ہمدردی سے میری بات سنی اور گارڈ کو ڈانٹا کہ ''کتنی بار منع کیا، یوں مریضوں کو گیٹ پر روک کر بحث نہ کیا کرو۔''

میں سلطان بابا کو انہی ڈاکٹر صاحب کی معیت میں انتہائی نگہداشت کے شعبے کی طرف بھجوا کر خود استقبالیہ کی طرف دوڑا۔ کاؤنٹر پر بیٹھی لڑکی کو میں نے پاپا کا اور اپنا نام بتایا کہ وہ چیک کرے کہ کیا اس مد میں کوئی رقم اسپتال کے اکاؤنٹ میں جمع ہوئی ہے۔ اُس نے مستعدی سے جانچ پڑتال کے بعد مسکراتے ہوئے اطلاع دی کہ رقم جمع ہو چکی ہے۔ پاپا نے اتنے پیسے بھیج دیئے تھے کہ اگر ہمیں مہینہ بھر سے زیادہ بھی یہاں رہنا پڑتا تو کوئی فکر کی بات نہیں تھی۔ تب میرے ذہن میں ایک عجیب سا خیال آیا۔ کہ ''اب تو مسیحا بھی گراں ہو گئے۔'' اگر انسان کی جیب میں مناسب رقم نہ ہو تو یہ مسیحائی بھی اس کا مقدر نہیں۔ سلطان بابا کے سر کے بہت سے ایکسریز اور سی ٹی اسکین وغیرہ کے بعد انہیں ایک کشادہ کمرے میں داخل کر لیا گیا۔ اس وقت وہ اپنے ہوش وحواس میں تھے۔ اور انہیں مستقل یہی فکر کھائے جا رہی تھی کہ میں خواہ مخواہ انہیں اتنے مہنگے اسپتال میں کیوں لے آیا ہوں۔ بقول اُن کے وہ بھلے چنگے تھے اور اب ہمیں وہاں سے چل پڑنا چاہیے تھا۔ لیکن ڈاکٹروں کی رائے اس کے بالکل برعکس تھی۔ انہوں نے سر کی اندرونی چوٹ کا خدشہ ظاہر کیا تھا اور اُن کے کلیے کے مطابق اب تک سلطان بابا کا چلنا پھرنا بھی کسی معجزے سے کم نہیں تھا۔ بہر حال طے یہ ہوا کہ صبح بڑے ڈاکٹروں کا ایک پینل بابا کی تمام رپورٹس کی جانچ کرے گا اور پھر کوئی حتمی بات کی جائے گی۔

اس سارے ہنگامے میں شام ہو چکی تھی اور جب مجھے سلطان بابا کی نگرانی پر مامور نرس نے یہ اطلاع دی کہ یہاں رات بھر ٹھہرنے کی اجازت نہیں دی جاتی تو مجھے ایک دوسری تشویش نے آ گھیرا۔ میں سلطان بابا کو اکیلا چھوڑ کر کہیں جانا نہیں چاہتا تھا لیکن اسپتال کے اُصول بھی اٹل تھے۔ ابھی میں اسی کش مکش میں مبتلا تھا کہ

ایک بزرگ جو نفیس سے سفاری سوٹ میں ملبوس تھے، ہونٹوں میں پائپ دبائے بوکھلائے ہوئے سے د
دے کر اندر داخل ہوئے۔ سلام کے بعد دھیرے سے نرس سے پوچھنے لگے۔ ''کیا عبداللہ صاحب کا یہی
ہے۔ میرا نام شیخ امتیاز ہے۔'' اچانک میرے ذہن میں بھی نام گونجا۔ اوہ! یہ تو وہی حضرت تھے، جن کا ن
نصیر صاحب نے بطور خاص لکھوایا تھا۔ میں جلدی سے درمیانی حصے کا پردہ ہٹا کر کمرے کے دوسرے حصے
آ گیا اور انہیں سلام کیا۔ ''جی...... میرا نام عبداللہ ہے۔'' وہ مجھے دیکھ کر کچھ ٹھٹکے اور پھر جلدی سے آگے بڑ
گرم جوشی سے ملنے لگے۔ ''اوہ! معذرت چاہتا ہوں۔ دراصل میرے ذہن میں کسی بزرگ کا خاکہ تھا۔
نصیر نے کچھ دیر پہلے ہی فون کر کے ساری تفصیل بتائی ہے۔ وہ بزرگ کیسے ہیں، جن کی طبیعت نا
تھی۔'' میں انہیں اندر سلطان بابا کے پاس لے گیا۔ وہاں انہوں نے اپنا تفصیلی تعارف کروایا کہ وہ اور
صاحب ملازمت میں ایک دوسرے سے سنیارٹی میں کافی فاصلے پر ہونے کے باوجود بہت قریب تھے ا
تعلق شیخ صاحب کی ملازمت سے فراغت کے بعد بھی بڑھتا ہی گیا۔ انہوں نے بڑی عاجزی سے سلطا
سے درخواست کی کہ اُن کے لائق کوئی بھی خدمت ہو تو ضرور حکم کریں۔ سلطان بابا نے اُن کا شکریہ ادا کیا
یہاں تک آ گئے، یہی اُن کے لیے باعث تسلی ہے۔ شیخ صاحب نے جھجکتے ہوئے اسپتال کی فیس کا پوچھا تو
نے انہیں بتایا کہ مہینے بھر کی پیشگی ادائیگی ہو چکی ہے۔ وہ ذرا سے حیران ہوئے لیکن چہرے کے تاثرات
گئے۔ ہمارے ظاہری حلیوں کو دیکھتے ہوئے اُن کی حیرت بجا تھی کہ کاغذ کے ان مخصوص ٹکڑوں کی اہمیت
جگہ مسلم ہے۔ اتنے میں نرس نے ایک بار پھر یاد دلایا کہ مریض کے پاس رہنے کے اوقات ختم ہو چکے ہ
سلطان بابا کو اب بھی میری ہی فکر کھائے جا رہی تھی کہ میں رات کہاں بسر کروں گا۔ میں نے انہیں تسلی دی
میں قریب ہی کوئی جگہ تلاش کر لوں گا۔ وہ اپنے ذہن پر بوجھ نہ ڈالیں اور ڈاکٹر کی ہدایت کے مطابق دوا
رہیں۔ شیخ صاحب جو دروازے کے قریب ہی کھڑے ساری بحث سن رہے تھے، جلدی سے بولے'' آپ
نوجوان کی فکر نہ کریں۔ میرا اتنا بڑا گھر کس دن کام آئے گا۔ عبداللہ میاں کو میں اپنے ساتھ ہی لے جاؤں گ
صبح ٹھیک وقت پر دوبارہ یہاں پہنچا بھی دوں گا۔'' سلطان بابا میرے چہرے پر پس و پیش کے آثار دیکھ کر
گئے کہ میں ان تکلفات میں پڑنے سے کترا رہا ہوں۔ انسان جب تک اکیلا اور اپنے بس میں ہو تو آزاد
ہے۔ کسی اور کے کرم پر ہو تو جکڑ جاتا ہے۔ میں جب تک اپنے گھر میں بھی تھا تب بھی مجھے گھر کی پابندیاں
مما پاپا کی نصیحتیں کبھی مخصوص اوقات کا پابند نہیں کر سکی تھیں۔ بیرونی گیٹ کی ایک چابی ہمیشہ میری گاڑی
چابی کے چھلے میں موجود رہتی تھی تا کہ جب کبھی میں آدھی رات کو اپنی مٹر گشت کے بعد گھر پہنچوں تو مجھے ا
بجا کر دروازہ نہ کھلوانا پڑے۔ مجھے بند دروازوں، لگے بندھے نظام الاوقات اور ایسی ہر پابندی سے خدا وا
کا بیر تھا، جو میرے اندر کی آزاد دنیا کو قید کرنے کی کوشش کرتی۔ اور شاید وہ آوارہ گرد ساحراب بھی مجھ سے
چھپا بیٹھا تھا۔ سلطان بابا میرے ساتھ ہوتے تو بات اور ہوتی، کیوں کہ اُن کی موجودگی میں کہیں بھی آز

وس کرتا تھا، لیکن یوں تنہا شیخ صاحب کے ساتھ جانے میں مجھے بہت ہچکچاہٹ ہو رہی تھی۔ امتیاز صاحب بھی
ہچکچاہٹ جان گئے مسکرا کر بولے'' بھئی اگر تم یہ چاہتے ہو کہ نصیر آج کے بعد مجھ سے کبھی بات نہ کرے
ردر کہیں اور ٹھہر جانا۔ کیوں کہ وہ پکا پولیس والا ہے، ایک بار رُوٹھ جائے تو منانا مشکل ہے۔ جب اُسے پتہ
گا کہ میرے شہر میں اُس کے مہمان کہیں اور قیام کر رہے ہیں تو تم خود سمجھ سکتے ہو کہ وہ کیا سوچے گا......؟''
ان بابا نے بھی میرا ہاتھ دبا کر مصلحت سمجھانے کی کوشش کی۔

ہم اسپتال کی پارکنگ میں آئے تو اُن کی بی ایم ڈبلیو کے ڈرائیور نے جلدی سے آگے بڑھ کر دروازہ
لا اور کچھ ہی دیر میں ہم اُن کے گھر کی طرف روانہ ہو چکے تھے۔ راستے میں انہوں نے اپنے خاندان کا
انہ تعارف بھی کروایا۔ اُن کی اہلیہ چار سال پہلے داغ مفارقت دے چکی تھیں۔ گھر میں دو بیٹے اور دو بیٹیاں
ں۔ بڑا لڑکا کاروبار کے سلسلے میں گزشتہ ایک ہفتے سے بیرون ملک تھا۔ اُس کی آمد دو ہفتے میں متوقع تھی۔
سے چھوٹی دونوں بیٹیاں اپنی تعلیم مکمل کر چکی تھیں۔ اور سب سے چھوٹا بیٹا ابھی بی اے کا طالب علم تھا۔ میں
چاپ اُن کی گفتگو سنتا رہا۔ وہ کافی زندہ دل انسان معلوم ہوتے تھے۔ جو اپنی اولاد کی ہر چھوٹی بڑی دلچسپی
پوری طرح شامل ہو اور اپنے گھر ہی کو اپنی کل کائنات سمجھتا ہو۔ میں نے اپنے بارے میں مکمل تفصیلات
نے سے اجتناب کیا اور اتنا ہی بتایا کہ ماں باپ کے بعد اب سلطان بابا ہی میرے اپنے اور بزرگ ہیں۔ اسی
میں اُن کا گھر بھی آ گیا۔ کافی بڑا بنگلہ تھا۔ جدید طرز تعمیر کا ایک شاہکار۔ اتنے دن صحرا میں گزارنے کے
تنا زیادہ سبزہ اور ہرے بھرے درخت دیکھ کر جانے کیوں مجھے ایسا لگ رہا تھا جیسے اچانک ہی دنیا بلیک اینڈ
ٹ سے تبدیل ہو کر رنگین ہو گئی ہو۔ جلتی ہوئی لو کی جگہ گاڑی سے اُترتے ہی بھیگی ہوئی نرم ہوا کے جھونکے
میرا چہرہ چوم لیا۔ دو نوکر اندر سے دوڑے چلے آئے۔ آگے بڑھ کر ہاتھ سے میرے کپڑوں کا تھیلا تھام لیا۔
صاحب نے انہیں ہدایت کی کہ مجھے انیکسی میں لے جائیں۔ اب میرا قیام وہیں ہو گا۔ انہوں نے رات
کھانے کے لیے میرے پسند پوچھی تو میں ٹال گیا کہ جو بھی بنا ہو وہی میری پسند ہو گا۔ میں نوکروں کے پیچھے
ں کی طرف بڑھنے لگا تو انہیں کچھ یاد آیا'' ارے ہاں، عبداللہ میاں! انیکسی کے دوسرے کمرے میں اپنے
یار میاں بھی ٹھہرے ہوئے ہیں۔ ایک ماہ پہلے ہی دارالحکومت سے تشریف لائے ہیں۔ میرے بہت
ے دوست کے صاحب زادے ہیں۔ تمہارے ہی ہم عمر ہیں۔ اُمید ہے کہ تم دونوں کا وقت اچھا گزرے
تم نہا دھو کر فریش ہو جاؤ...... ہم کھانا انیکسی ہی میں کھائیں گے۔'' میں انیکسی پہنچا تو بنگلے کا ایک پورا حصہ
ان خانے کے طور پر پچھلے حصے میں موجود تھا۔ جس کا اپنا پورچ اور باغیچہ بھی اِسی حصے میں واقع تھے۔ انیکسی
چار کمرے تھے، ڈرائنگ روم اور کھانے کا کمرہ اس کے علاوہ تھا۔ میرے لیے جو کمرہ کھولا گیا، اس کے
ڈ والے کمرے میں پہلے سے روشنی تھی اور تیز موسیقی کی آواز بند دروازے سے باہر آ رہی تھی۔ گھر کافی
ادہ اور ہر طرح کے آسائشی لوازمات سے مزین تھا۔ لیکن نہ جانے کیوں مجھے وہاں ایک عجیب سی گھٹن کا

احساس ستانے لگا۔ شاید اتنے بہت دنوں تک تنگ و تاریک اور ویران جگہوں پر رہتے رہتے، میر
ماحول کا عادی ہوتا جارہا تھا۔ مجھے یوں محسوس ہوا کہ جیسے ہم اپنی آسائش اور آرام کے پیمانے خود ا
بناتے ہیں۔ کبھی یہ آرام دہ بستر میرے آرام کا پیمانہ تھا اور اب ایک رات پہلے تک صحرائی جلتی ریت
سکون سے سو جاتا تھا۔ بات تو بس ذرا اس پگلے من کو بہلانے کی ہوتی ہے۔ اور ہم سے جو کوئی
بہلاوے کا گُر جان لے، دراصل وہی کامیاب کہلاتا ہے۔

کچھ دیر بعد شیخ صاحب بھی کپڑے تبدیل کر کے انیکسی پہنچ گئے۔ مجھے نوکر نے بتایا کہ وہ
صاحب کھانے کی میز پر میرا انتظار کر رہے ہیں۔ میں وہاں پہنچا تو ایک کلین شیو نوجوان نے اُٹھ کر می
کیا۔ "ہیلو! مجھے شہریار کہتے ہیں۔" میں نے اُس کا بڑھا ہوا ہاتھ تھاما۔ "میں عبداللہ ہوں۔
مسکرایا...... "عبداللہ تو ہم سب ہی ہیں۔ یعنی اللہ کے بندے۔" شیخ صاحب زور سے ہنسے "ارے؟
بات کا بُرا نہ ماننا، دراصل لفظوں سے کھیلنا ہی شہریار میاں کا پیشہ ہے۔ قلم کار جو ٹھہرے۔ آج کل
اپنے کسی منصوبے کے لیے کہانی کی تلاش میں آئے ہوئے ہیں۔" میں بھی دھیرے سے مسکرایا "پھر
ڈرنا چاہیے، کہیں ہماری ہی کہانی نہ بنا ڈالیں۔" اُن دونوں ہی کو شاید مجھ سے ایسے کسی جواب کی توقع
ایک لمحے کے لیے دونوں چونکے اور پھر دونوں ہی زور سے ہنس پڑے۔ کھانے کے دوران پتا چلا
ایک لکھاری ہے۔ ماں باپ کا اکلوتا بیٹا، سونے کا چمچ منہ میں لے کر پیدا ہوا، لیکن عملی زندگی میں باپ
میں ہاتھ بٹانے کی خواہش کو رد کر کے قلم سے رشتہ جوڑ لیا۔ موضوعات کی یکسانیت سے گھبرا کر وہ ایک
لکھنے کی بجائے کہانی کی تلاش میں گھوم گھوم کر لکھنے کو ترجیح دیتا تھا۔ شہریار کو مختصراً سلطان بابا کے بار
دیا۔ کھانے کے بعد کافی کا ایک دور چلا اور پھر شیخ صاحب ہم دونوں سے رُخصت ہو کر آرام کے
گئے۔ میں اور شہریار بھی شب بخیر کہہ کر اپنے اپنے کمروں کی جانب بڑھ گئے۔ میں عشاء کی نماز ادا ک
بعد بھی بہت دیر تک شیشے کی اس دیوار نما بڑی سی کھڑکی کے قریب ہی بیٹھا رہا، جہاں سے انیکسی ک
موجود باغیچے کا نظارہ کیا جا سکتا تھا۔ باغ میں ہر تین چار گز کے فاصلے پر بجلی کے سفید دودھیا قمقمے لگ
تھے۔ لہٰذا اس وقت بھی وہاں دن جیسا ہی سماں تھا۔ میری توجہ ابھی اسی لان کی انتہائی نفاست سے
باڑھ اور بیلوں کی جانب ہی تھی کہ اچانک سامنے پڑی چھوٹی سی شیشے کی تپائی پر پڑا فون بج اُٹھا۔ میر
چونکا، رات کے ساڑھے بارہ بجنے کو تھے۔ اس وقت کس کا فون ہو سکتا ہے؟ اچانک میرا ذہن اسپتال
گیا اور کسی اَن جانے وسوسے کی پھنکار سے ڈر کر میں نے جلدی سے ریسیور اُٹھا لیا۔ "جی......" دوسر
خاموشی تھی۔ میں نے قدرے زور سے کہا "جی فرمایئے" دوسرے جانب سے ایک نازک سے نس
اُبھری۔ جی آپ کون؟" "میں عبداللہ ہوں۔" دوسرے جانب سے کھٹ سے فون بند ہو گیا۔ شاید کوئی
تھا۔ میں گہرے سانس لے کر اُٹھنے ہی کو تھا کہ گھنٹی دوبارہ بجی۔ جی میں آیا کہ ریسیور اُٹھا کر نیچے رکھ د

بانے اس فون کی دوسرے لائن کہاں تھی۔ اس طرح مصروف کر دینے سے کوئی ضروری فون بھی تو چوک سکتا
میں نے دوبارہ ریسیور اُٹھایا۔ دوسرے جانب وہی آواز تھی "جی...... شہریار......؟" اوہ تو یہ شہریار کے لیے
تھا۔ میں نے جواب دیا "نہیں...... شہریار صاحب تو اپنے کمرے میں ہیں۔ میں یہاں مہمان ہوں۔"
رے جانب پھر وہی جلترنگ بجا۔ "اوہ ...... معاف کیجیے گا۔ آپ کو اتنی رات گئے زحمت دی۔ آپ فون
دیں اور اس بار گھنٹی بجے تو آپ نہ اُٹھایئے گا۔" شہریار خود اُٹھالیں گے۔ دراصل اس نمبر کی دو ایکس ٹینشنز
" میں نے ریسیور واپس رکھ دیا۔ دس منٹ کے بعد گھنٹی بجی تو تین گھنٹیوں کے بعد خاموشی چھا گئی۔ شاید
ری جانب سے شہریار نے فون اُٹھا لیا تھا۔ کمرے میں کچھ دیر گزارنے کے بعد ہی مجھے پھر سے وہی گھٹن
نے لگی، حالانکہ اے سی کی وجہ سے کمرے میں خوش گوار خنکی چھائی ہوئی تھی۔ میں ابھی باہر نکلنے کا سوچ رہا تھا
دروازے پر ہلکی سی دستک ہوئی اور شہریار نے اندر جھانکا "ویسے تو آدھی رات کے وقت یہ سوال کرنا خود
ہی کے زمرے میں آتا ہے۔ لیکن اجازت ہو تو اندر آ جاؤں۔ مجھے بھی نیند نہیں آ رہی اور تمہاری نیند شاید
اس فون کی بجتی گھنٹی نے اُڑا دی ہے۔" میں خوش دلی سے مسکرایا "نہیں! میری نیند ازل سے اُڑی ہوئی
۔ شاید میرے اندر ہی کوئی گھنٹی لگی ہوئی ہے۔ اندر آ جاؤ۔" شہریار نے میری کرسی کے سامنے والا صوفہ
ال لیا "واہ، خوب کہی۔ ویسے تمہاری تعلیم کتنی ہے؟ سچ کہوں تو مجھے تو تم بھی کوئی رائٹر ہی دکھتے ہو۔" "میں
کر ٹال گیا اُلٹا شہریار سے سوال کر دیا "تم کہانی کی تلاش میں یہاں آئے ہو، تو پھر کچھ کامیابی ہوئی کہ
۔" شہریار نے ایک لمبی سی سانس لی "اب کیا بتاؤں۔ پچھلے چند دنوں سے میں خود ایک کہانی بنا ہوا
۔" "کیوں...... خیریت......؟" "ہاں فی الحال تو خیریت ہی ہے۔ دراصل ڈیڈی نے مجھے یہاں کسی اور
مد کے لیے بھیجا ہے۔ کہانی تو بس ایک بہانہ ہی ہے۔ مجھے شیخ انکل کی دو بیٹیوں میں سے کسی ایک کا بطور ہم
نتخاب کرنا ہے۔ یہ ڈیڈی کی خواہش ہے۔ مجھ پر کوئی پابندی نہیں ہے۔ لیکن انہوں نے مجھے یہ اختیار دیا
لہ چونکہ ابھی تک کوئی مہ جبیں میری نظروں میں سمائی نہیں، لہٰذا اس چناؤ کے لیے اپنی پہلی تلاش اسی گھر
شروع کروں۔ اور یہیں سے میری اُلجھن کا آغاز ہوتا ہے۔" میں نے حیرت سے اُس کی جانب
"اس میں اُلجھن کیسی۔ شیخ صاحب کی دونوں صاحب زادیوں سے مل کر دیکھ لو۔ اور پھر دونوں میں سے
دل کو بھائے اُس کے لیے ہاں کہہ دو اور پھر تمہیں تو نہ کرنے کی آزادی بھی حاصل ہے۔ دل نہ مانے تو
ڈیڈی کو اطلاع کر دینا۔" شہریار نے پھر ایک آہ بھری "یہی تو مشکل ہے۔ مجھے ان میں سے بڑی والی
ہے...... کیا کہوں کہ وہ میر کی غزل ہے یا خیام کی رُباعی، درد کا کوئی قطعہ ہے یا غالب کے خطوط کی نثر
......" میں مسکرادیا۔ "تو پھر اُلجھن کیا ہے۔ پہلی فرصت میں گھر والوں کو اطلاع کر دو کہ وہ آ کر تمہارے
اُس کا ہاتھ مانگ لیں۔" شہریار جلدی سے بولا "وہ ہے ہی ایسی۔ ابھی کچھ دیر پہلے تم نے فون پر اُسی کی
کی تھی۔ میں تمہیں کیا بتاؤں کہ اُس کا مطالعہ کتنا وسیع ہے، لٹریچر تو جیسے وہ سارے کا سارا گھول کر پی چکی

ہے، دنیا کا کون سا موضوع ہے جس پر وہ بات نہیں کر سکتی ...... لیکن صرف فون پر...... جیسے ہی وہ سا
ہے، سمجھو زبان کھو جاتی ہے اُس کی۔'' تو کیا اُسے پہلے پتا تھا کہ تمہارے اُن کے ہاں ٹھہرنے کی اطا
ہے......؟ شہر یار مسکرا دیا'' ہاں میرا خیال ہے کہ ڈیڈی نے انکل کو کچھ اشارہ ضرور دیا ہوگا اور خود انکل
اولاد سے بالکل دوستوں جیسا برتاؤ رکھتے ہیں۔ انہوں نے ضرور اپنی دونوں بیٹیوں کو میری آمد کا مقا
ہوگا۔ ان کے آپس میں شرارت آمیز اشارے تو یہی بتاتے ہیں۔ لیکن میرا مسئلہ کچھ اور ہے۔ میں اُ
تنہائی میں ایک بار مل کر بات کرنا چاہتا ہوں۔ ایک آدھ بار ایسا موقع ملا بھی تو میرے کان وہ سب کچھ
لیے ترستے ہی رہے جو میں فون پر اُس کی میٹھی زبان سے سنتا رہا ہوں۔ دوسرا مسئلہ یہ ہے کہ فون پر دونو
بیک وقت موجود ہوتی ہیں۔ کبھی کبھی تو دونوں ہی زور سے ہنس بھی دیتی ہیں۔ مطلب انہوں نے
چھپانے کی کوشش نہیں کی کہ مجھ سے بات کرتے وقت وہ دونوں ہی دوسری جانب لائن پر موجود ہوتی
مجھے شہر یار کی حالت دیکھ کر ہنسی آ گئی۔ اُس نے شکوہ کیا'' ہاں تم! بھی ہنس لو۔ اپنی صورت حال ہی کچھ
ہے کہ آتے جاتے سب ہی ہماری کھلی اڑاتے ہیں۔'' میں نے اُسے چھیڑا'' تم خواہ مخواہ کہانی کی تلا
یہاں وہاں بھٹکتے پھرتے ہو۔ ایک سنسنی خیز تجسس سے بھرپور کہانی تو خود تمہارے آس پاس چل رہی ہے
یار نے قریب پڑا کشن اپنے سر کے پیچھے رکھا'' ٹھیک کہتے ہو۔ یہ تو خواتین کے کسی رسالے کے لیے
ایک ناول کا پلاٹ ہے۔ لیکن مسئلہ یہ ہے کہ مجھے یہاں آئے مہینے بھر سے کچھ زیادہ ہونے کو آ گیا ہے
مجھے اس سے ایک تو تفصیلی ملاقات میں بہت سے سوالوں کا جواب لینا ہے اور میرے پاس اس کے لیے
وقت بھی نہیں ہے۔ میں نے غور سے شہر یار کی جانب دیکھا'' ویسے کیا تم نہیں سمجھتے کہ تم نے مجھے اپنی ا
کی کہانی میں شامل کرنے میں کچھ جلدی کی ہے۔ میں ابھی تک تمہارے لیے ایک اجنبی ہی تو ہوں۔''
مسکرایا'' ہم بھی لکھاری ہیں۔ میاں چلتے پھرتے بہت کرداروں کے اندر تک جھانک لیتے ہیں۔ مانا
ملے ابھی چند گھنٹے ہی ہوئے ہیں، لیکن تم میرے لیے پہلے لمحے کے بعد ہی اجنبی نہیں رہے تھے۔ تم وہ
جس کا بھیس تم نے بھر رکھا ہے۔'' میں نے چونک کر اُسے دیکھا'' اچھا......؟ اتنی جلدی یہ نتیجہ کیسے اخذ
نے۔'' شہر یار میرے جانب ہی دیکھ رہا تھا۔ کھانے کی میز پر زیادہ تر اٹالین اور چائنیز ڈشز موجود تھیں۔
تم نے چھری کانٹے کا استعمال حتی الامکان کم سے کم کیا لیکن تمہیں ان لوازمات کا استعمال کرتے دیکھ
بھی بآسانی بتا سکتا تھا ہے کہ تم وہ نہیں جو دکھائی دیتے ہو۔'' میں نے حیرت سے شہر یار کی طرف دیکھا
کمال کا مشاہدہ تھا اُس کا۔ اتنی چھوٹی سی بات کا بھی اُس نے کس قدر غور سے جائزہ لیا۔ میں نے اُ
دی۔'' واہ بھئی...... مجھے نہیں پتا تھا کہ آج کل کے نئے لکھاری بھی اس قدر گہرا مشاہدہ رکھتے ہیں۔ تم
متاثر کرنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی۔'' شہر یار زور سے ہنسا۔'' تو پھر ہو جاؤ نا متاثر۔ کوئی تو ہمارا بھی فی
'' میں بھی ہنس پڑا۔'' چلو تو پھر آج سے میں تمہارا پہلا پرستار ہوں۔ لیکن یہ بتاؤ کہ اب اس معمے کا کیا کر

جس نے تمہارے راتوں کی نیند اُڑا دی ہے۔'' شہر یار نے سر کھجایا۔ معما تو حل کرنا ہی پڑے گا۔ انکل کی عادت ہے کہ وہ شام کی چائے سب کے ساتھ ہی کبھی لان میں تو کبھی سن روم میں پیتے ہیں۔ ہو سکتا ہے کل تمہارا سامنا بھی ان دونوں سے ہو جائے، پھر تم ہی بتانا کہ فون پر اتنا اچھا بولنے والی، سامنے آتے ہی اس قدر خاموش کیوں ہو جاتی ہے۔ شہر یار بہت دیر تک میرے کمرے میں بیٹھا باتیں کرتا رہا۔ لہٰذا اگلی صبح مجھ سے فجر قضا ہو گئی۔ آنکھ کھلی تو سر بھی بہت بھاری ہو رہا تھا۔ نوکر نے مجھے کمرے سے نکلتے دیکھ کر جلدی سے ناشتا میز پر لگا دیا۔

کچھ ہی دیر میں شیخ صاحب کا ڈرائیور مجھے اسپتال چھوڑ آیا۔ شیخ صاحب دوسری گاڑی میں صبح سویرے ہی کسی ضروری کام سے نکل چکے تھے۔ البتہ ڈرائیور کو ہدایت کر گئے تھے کہ مجھے شام چار بجے کے قریب گھر واپس لیتا آئے۔ میرے ذہن میں شہر یار کی رات والی بات گونجی۔ سلطان بابا کی حالت آج کچھ بہتر لگ رہی تھی۔ دوپہر بارہ بجے تک اُن کے تمام ضروری معائنے بھی ہو گئے۔ جن کی رپورٹ کل ملنا تھی۔ میں نے ڈرائیور کو گھر واپس بھیجنے کی بات کی تو انہوں نے منع کر دیا کہ اگر شیخ صاحب نے کہا ہے تو پھر میں شام کو گھر سے ہو آؤں، پھر چاہے تو رات گئے تک اسپتال میں اُن کے ساتھ ٹھہر سکتا ہوں۔ میں ساڑھے چار بجے ڈرائیور سمیت گھر واپس پہنچا تو دربان نے بتایا کہ شیخ صاحب لان میں میرا انتظار کر رہے ہیں۔ شام کی چائے پر شہر یار اور اُن کا چھوٹا بیٹا وقار بھی موجود تھے۔ کچھ ہی دیر میں چائے لگا دی گئی۔ اتنے میں اندر سے جدید وضع قطع کے لباس میں ایک شوخ سی لڑکی نکلی۔ شیخ صاحب نے تعارف کروایا۔'' عبداللہ میاں! یہ ہماری بڑی صاحبزادی ہیں، شاہانہ۔ ہماری شانی۔'' میں نے اُٹھ کر سلام کیا۔ شانی کے پیچھے پیچھے ایک اور سیدھی سادھی، بیچ میں مانگ نکالے سانولی سلونی لڑکی بھی چھوٹے چھوٹے قدم اُٹھاتی ہماری جانب آ گئی۔ وہ شاہانہ کی بالکل الٹ دکھائی دیتی تھی۔ سادہ سا کرتا پاجامہ پہنے لمبی سی چٹیا بنائے۔ وہ اس ماحول سے یکسر مختلف نظر آئی۔ شیخ صاحب نے پھر تعارف کروایا۔'' اور بھئی...... یہ ہیں ہماری چھوٹی صاحبزادی...... دھانی......''

لفظ گر

اگر ان دونوں کا تعارف خود شیخ صاحب نہ کرواتے تو شاید میں کبھی انہیں سگی بہنیں نہیں مانتا۔ ان کے برتاؤ، چال ڈھال اور رکھ رکھاؤ میں مشرق و مغرب جتنا فاصلہ اور دن اور رات جیسا فرق تھا۔ خود اعتمادی دونوں میں یکساں اور بلا کی تھی۔ چائے کے دوران دونوں بہنوں نے مجھ سے سلطان بابا کی ط کا پوچھا اور اپنی اور شیخ صاحب کی جانب سے خواہش ظاہر کی کہ جب وہ بہتر ہو جائیں تو کچھ دن ان س ساتھ یہیں ان کے گھر پر قیام کریں۔ میں صرف اتنا ہی کہہ سکا کہ میں ان کی فرمائش ضرور سلطان بابا تک دوں گا۔ شہریار کی ساری توجہ شاہانہ پر تھی۔ مگر نہ جانے کیوں وہ چائے پینے کے دوران بھی کھویا کھویا سا تھا۔ میں چائے ختم کر کے شیخ صاحب کی اجازت سے دوبارہ اسپتال کے لیے نکل پڑا۔ باقی سب بھی اُٹھ تھے۔ شہریار نے مجھ سے کہا کہ وہ رات کے کھانے پر میرا انتظار کرے گا۔ میں اسپتال پہنچا تو سلطان کمرے میں تین چار سینیئر ڈاکٹروں کا جمگھٹا دیکھ کر پریشان ہو گیا۔ نرس نے مجھ سے درخواست کی کہ جب ڈاکٹر کمرے سے نکل نہ جائیں میں بیرونی کمرے میں انتظار کروں۔ دس منٹ کا وہ مختصر عرصہ مجھ صدیوں جیسا بھاری گزرا۔ پھر جیسے ہی پہلے ڈاکٹر نے باہر قدم رکھا میں تیزی سے اس کی جانب لپکا۔ "ٹھیک تو ہے نا ڈاکٹر صاحب۔" ڈاکٹر مسکرایا۔ "اوہ ہاں...... ڈونٹ وری۔ بس معمول کا چیک اپ تھا۔ اب لوگوں سے اسپتال والوں نے اتنی فیس لی ہے تو ہمیں بھی کچھ سرگرمی تو دکھانا پڑے گی نا۔" اُن کی بات میں بھی مسکرا دیا۔ طبیب کے پاس مریض کے لیے دوا اور اُس کے تیمارداروں کے لیے مسکراہٹ سے اور بھلا کیا سوغات ہو گی۔ خوش دلی اور اخلاص سے بھری ایک مسکان کی خود اپنی ایک مسیحا گری ہوتی بہت سے گھائل تو ایسے بھی ہوتے ہیں جن کا فقط علاج ہی بس ایک مسکراہٹ ہوتی ہے۔ اور اس لمحے یہ احساس ہوا کہ طب کے شعبے میں شاید دوا سے بھی زیادہ اور پہلی ضرورت خوش اخلاقی ہے۔

سلطان بابا اپنے بستر پر تکیے سے ٹیک لگائے بیٹھے تھے۔ مجھے دیکھ کر جلدی سے بولے۔ "میں نے کہ اسپتال میں بندہ داخل تو اپنی مرضی سے ہوتا ہے، لیکن پھر اس کی رہائی اُن ڈاکٹروں کی مرضی ہو پاتی ہے۔ اب یہ روز بروز نئی محبتیں تراشیں گے مجھے یہاں روکنے کے لیے......" مجھے اُن کی "رہائی" اصطلاح پر ہنسی آ گئی۔ "ہاں...... ابھی باہر جو ڈاکٹر صاحب ملے تھے، وہ بھی یہی کہہ رہے تھے کہ پیسے لے انہیں حلال بھی تو کرنا ہے۔" میری بات سن کر بابا بھی مسکرا دیئے۔ "ٹھیک ہے میاں! کر لو اپنی ضد پوری

لیکن یاد رہے...... جب جب جو ہونا ہے...... تب تب سو سو ہوتا ہے۔" میں نے چونک کر اُن کی جانب دیکھا۔ ہر بار کی طرح ان کا یہ مخصوص جملہ ایک بار پھر میرے اندر سب کچھ تلپٹ کر گیا۔ اب تو مجھے اس جملے سے باقاعدہ خوف سا محسوس ہونے لگا تھا، کیوں کہ سلطان بابا نے جب بھی اسے ادا کیا کوئی نہ کوئی انہونی ضرور پیش آئی۔ میرے لبوں سے آخر بہت دیر سے اٹکا سوال پھسل ہی پڑا۔ "آپ ہمیشہ کہتے ہیں کہ دعا سے تقدیر بدل سکتی ہے، پھر آپ اپنے لیے شفایابی کی دعا کیوں نہیں کرتے۔ کال گڑھ میں آپ کو جو شدید چوٹ لگی، آپ نے اس سے بچاؤ کی دعا پہلے سے کیوں نہ کی؟" وہ میرا سوال سن کر کچھ سوچ میں پڑ گئے، جیسے میں نے قبل از وقت کوئی بات پوچھ لی ہو۔ کچھ دیر بعد خاموشی توڑی اور کہا۔ "میں ہمیشہ اپنے لیے، تمہارے لیے بلکہ سب کے لیے یکساں دعا مانگتا ہوں۔ سب کے لیے اللہ سے اُس کا فضل، کرم طلب کرتا ہوں۔ اور ہر اس خواہش کا اظہار کرتا ہوں جس کی تکمیل میں ہم سب کی بہتری ہو...... لیکن یاد رہے، بہتری کس بات میں پوشیدہ ہے، اس کی خبر تو بس اُسی کو ہے۔ جانے اس سر کی چوٹ اور پھر یہاں اسپتال تک پہنچنے میں اُس کی کون سی مصلحت پوشیدہ ہے۔ ہم انسان بہت کوتاہ نظر، بہت قریبی نتائج پر نظر رکھنے والے پیدا کیے گئے ہیں لہٰذا نتائج کی پرواہ ہمیشہ اُسی پر رکھ چھوڑنی چاہیے...... رہی بات خود اپنے جسم کو گھائل ہونے سے بچانے کے لیے دعا کرنے کی تو یاد رکھو، اس جسم کی اپنی کچھ حدیں ہیں اور موت ان جسمانی حدوں کو پار کر جانے کا نام ہے۔ یہ جسم دنیا کی سب سے فانی شے ہے۔ اس دور میں اس بدن کے عروج اور پھر زوال کا دورانیہ اوسطاً ساٹھ سے ستر سال کے درمیان ہوتا ہے۔ اس کلیے سے میرا جسم اپنی عمومی مدت پوری کر چکا ہے۔ میں ستر کے عدد کو چھونے والا ہوں اور اس دوران میرے جسم میں موجود خون کے خلیے، میری رگیں، پٹھے اور جسم کے بنیادی اعضا اپنی عمومی مشقت پوری کر چکے ہیں۔ اب ان اعضا کے ساتھ جسم کا جو بھی برتاؤ ہے، وہ خصوصی ہو گا۔ یہاں ایک بات اور دھیان میں رکھنے کی بہت ضرورت ہے کہ موت کا تعلق کبھی براہ راست جسم کے زوال سے نہیں ہوتا۔ موت جسم میں موجود رُوح کے نکلنے کا نام ہے جو نکلتے نکلتے سو سال سے بھی زیادہ کا عرصہ لے سکتی ہے۔ اور بہت سے ایسے انسان ہمارے آس پاس موجود ہیں، جو اپنے جسم کے اس خصوصی رویئے کی وجہ سے بآسانی اتنی عمر کا سفر بھی طے کر لیتے ہیں، جب کہ بعض حادثاتی صورتوں میں بیس بائیس سال کے جوان جسم سے بھی رُوح پل بھر میں نکل جاتی ہے۔ تو ثابت یہ ہوا کہ جسم کی اپنی بھی ایک خاص میعاد اور مدت ہے۔ وہ کیا کہتے ہیں انگریزی میں...... ایکس پائیری ڈیٹ، جو کسی حادثے کی صورت میں فوراً اور طبعی مدت پوری کرنے کی صورت میں ساٹھ سے ستر سال کے اندر ہمارے جسم کو اس حال تک پہنچا دیتی ہے کہ جہاں ہماری رُوح کا اس بدن میں مزید قیام مشکل ہو جاتا ہے۔" میں غور سے سلطان بابا کی بات سن رہا تھا۔ مجھے لگا کہ ایک بہت بڑا اسرار میرے ذہن کے دریچوں سے اندر آتے آتے واپس پلٹ گیا۔ جیسے کچھ سمجھ میں آنے سے پہلے ہی سب کچھ آپس میں اُلجھ گیا ہو۔ سلطان بابا نے کچھ وقفے کے بعد بات جاری رکھی۔ "اِسی لیے ہمارے معاشرے میں

عام طور پر لوگ اپنے جسم کے اس عمومی رویئے کو ذہن میں رکھتے ہوئے اپنی دینی اور دنیاوی معمولات کا بھی ترتیب دیتے ہیں۔ ایک عام رویئے کا انسان چالیس پینتالیس سال کی عمر کے بعد مذہب کو زیادہ دینے لگتا ہے، کیوں کہ اس کے لاشعور میں کہیں یہ بات دبی ہوتی ہے کہ عمر کی آخری دہائیاں شروع ہو چکی، بہتر ہے کہ اب اُوپر والے کو بھی راضی کر لیا جائے۔ واضح رہے کہ بچپن، لڑکپن، جوانی اور پھر بڑھاپا۔ یہ، کیفیات بھی صرف ہمارے جسم ہی پر وارد ہوتی ہیں۔ ان کا ہماری رُوح سے کوئی تعلق نہیں، البتہ رُوح کا ہماری ان جسمانی تبدیلیوں پر منحصر ہے۔ تقدیر وہ وقت طے کرتی ہے، جب ہماری روح کو ہمارا یہ جسم چھوڑ ہے اور پھر کوئی نہ کوئی بہانہ، بیماری، چوٹ، حادثہ یا سادہ طبعی موت اس رُوح اور جسم کی دائمی جُدائی کا باعث جاتا ہے۔ یہی ہمارا ایمان ہے کہ ہر ذی نفس کو موت کا ذائقہ چکھنا ہے اور پھر موت کے بعد اُسے روزِ حشر سے دوبارہ زندہ کر کے اُٹھایا جائے گا اور تب ہماری زندگی کا دوسرا اور اصل دور شروع ہوگا۔ اِسی لیے ہمیں دنیا کے لیے اُسی قدر محنت کی تاکید کی گئی ہے، جتنا ہمیں یہاں رہنا ہے۔'' سلطان بابا اپنی بات ختم کر چکے لیکن میرا ذہن حسب معمول کچھ نئے سوالوں میں اُلجھتا چلا گیا۔ تو کیا ہماری معصوم رُوح صرف ہمارے گئے گناہوں کی سزا بھگتتی ہے؟ کیا گناہ اور ثواب کا اختیار صرف ہمارے ایک بنیادی عضو ''ذہن'' کارستانیوں کا شاخسانہ ہے......؟

رات آٹھ بجے نرس نے دوبارہ آ کر مجھے کل والی بات کی یاد دہانی کروائی کہ تیمارداروں کو رات گزار کی اجازت نہیں ہے۔ کچھ ہی دیر میں شیخ صاحب خود بھی آ پہنچے اور پندرہ منٹ سلطان بابا کے ساتھ بیٹھنے بعد ٹھیک ساڑھے آٹھ بجے ہم نے اسپتال کے اُصولوں کے مطابق روانگی اختیار کر لی۔ شیخ صاحب نے را میں بتایا کہ آج نصیر صاحب نے انہیں فون کر کے سلطان بابا کی تفصیلی خیریت معلوم کی تھی اور مجھے نہ جا کیوں اُن کی باتوں سے کچھ ایسا محسوس ہوا، جیسے آئی جی صاحب نے انہیں کچھ میرے بارے میں بھی بتایا۔ اور شاید وہ یہ بات بھی جان چکے ہیں کہ اسپتال کی ادائیگی بھی میرے گھر والوں کی طرف سے کی گئی ہے بہرحال انہوں نے مصلحتاً اس موضوع کو چھیڑنے سے گریز ہی کیا اور مجھے ایک بڑی مشکل سے بچا لیا کیوں اب میں کسی بھی طور اپنے روایتی حسب نسب اور ماضی کے کسی بھی حوالے کو اپنی ذات کا تعارف نہیں چاہتا تھا۔ ہم گھر میں داخل ہوئے تو اُن کا چھوٹا بیٹا وقار کار پورچ سے ذرا پرے اپنی ڈی ٹی ایس ہیوی بائیک کی ریس چیک کرنے کے لیے اس کے پچھلے پہیے کو اسٹینڈ کے ذریعے اُونچا کر کے ہائیڈرولک جیک لگا رہا تھا سارے گھر میں موٹر سائیکل کی تیز آواز نے ہنگامہ سا برپا کر رکھا تھا۔ میں ایک لمحے ہی میں ماضی کی بھول بھلیوں میں کھو کر خود اپنے گھر کے احاطے میں پہنچ گیا اور چند پل ہی میں وقار کی جگہ پرانے ساحر نے لے لی۔ ہر اتوار کو میں اور کاشف میرے ہی گھر میں، اپنی اپنی بائیکس کھول کر اِسی طرح ان کی صفائی کیا کرتے تھے اور گھر سر پر اُٹھائے رکھتے۔ وہ دن گھر کے تمام نوکروں کی شامت کا دن ہوتا کیوں کہ ہمیں ہر دوسرے پل کسی

کسی چیز کی ضرورت ہوتی۔ اور نہ ملنے پر یا دیر سے لانے پر کوئی نہ کوئی نوکر ہمارے عتاب کا شکار بن کر ہی رہتا۔ پھر شام کو جب پاپا گھر واپس آتے تو اُن کی عدالت میں ہماری شکایتیں لگتیں اور کبھی مجھے اور کبھی کاشف کو جرمانہ بھرنا پڑتا۔ یہ وقت بھی کیسی کیسی کروٹیں بدل جاتا ہے۔ کاش ہمارا حافظہ بھی گزرتے وقت کی کروٹ کے ساتھ ساتھ کسی سلیٹ کی طرح صاف ہوتا رہتا، تو کتنا اچھا ہوتا۔ مجھے اپنی جگہ رُکا دیکھ کر شیخ صاحب آگے جاتے جاتے واپس پلٹ آئے۔ ''کیوں عبداللہ سب ٹھیک تو ہے نا......'' میں جلدی سے سر جھٹک کر اپنی دنیا میں واپس آیا اور آگے بڑھ گیا۔ شیخ صاحب نے نوکروں سے کہا کہ وہ تازہ دم ہو کر انیکسی ہی میں ہمارے ساتھ کھانا کھائیں گے۔ میں نہ چاہتے ہوئے بھی اپنے قدم وقار کی جانب بڑھنے سے نہیں روک پایا۔ اُس نے ہائیڈرولک تیل کی لمبی گلاس نما کپی اپنے ہاتھ میں پکڑ رکھی تھی اور پچھلے پہیے کی ڈسکس میں بنے چھوٹے چھوٹے سوراخوں میں تیل ڈالنا چاہتا تھا۔ مجھے اپنی جانب آتا دیکھ کر اس نے ایکسیلیٹر چھوڑ دیا لیکن پہیہ اب بھی تیزی سے گھوم رہا تھا۔ میں نے تیل کی کپی اُس کے ہاتھ سے لے لی۔ ''جب تک پہیہ مکمل طور پر رُک نہ جائے اور بائیک کا انجن ٹھنڈا نہ ہو جائے، تیل نہ دینا۔ ورنہ یہ آئل صرف پہیے کی ڈسک تک محدود نہیں رہے گا، پورے انجن میں پھیل جائے گا۔ پھر کئی دن تک بائیک بار بار چوک ہوتی رہے گی......'' وقار کھلے منہ کے ساتھ حیرت سے میری بات سنتا رہا۔ پھر اُس نے زور سے اپنے سر پر ہاتھ مارا۔ ''اوہ! تو یہی وجہ تھی کہ بائیک پوری ریس نہیں اُٹھا رہی تھی اور میں پچھلے تین دنوں سے سر کھپا رہا ہوں اور ڈسک کو جام سمجھ کر تیل دیئے جا رہا ہوں۔'' میں نے مسکرا کر آئل کی بوتل اُسے واپس کر دی۔ وقار بھی جلدی سے ہاتھ پونچھ کر میرے ساتھ ہی انیکسی کی طرف چلنے لگا اور اپنی بائیک کے بارے میں بتانے لگا کہ ابھی دو ماہ پہلے ہی اُس کے ڈیڈ نے اُسے یہ بائیک لے کر دی ہے۔ لیکن اس کے ساتھ ہدایتی کتابچہ (Manual Guide) نہیں ملا۔ کیوں کہ بائیک سمندر کے ذریعے کھلے بحری جہاز پر پہلے پورٹ اور پھر یہاں تک پہنچی تھی، لہٰذا بہت سے ضروری لوازمات بھی غائب تھے۔ انہی باتوں کے دوران شیخ صاحب بھی پہنچ گئے۔ لیکن آج شہریار نہ جانے کہاں غائب تھا۔ نوکر نے بتایا کہ وہ شام کو کسی دوست کے ہمراہ کہیں باہر نکل گیا تھا لیکن کھانے لگنے تک شہریار بھی پہنچ گیا۔ وقار بھی ہمارے ساتھ کھانے میں شریک ہو گیا۔ اب تک وہ مجھ سے کافی بے تکلف ہو چکا تھا۔ پھر کھانا کھاتے کھاتے اچانک ہی وہ پوچھ بیٹھا...... ''عبداللہ بھائی کیا آپ مولوی ہیں؟'' شیخ صاحب نے اُسے گھور کر دیکھا اور میری ہنسی چھوٹ گئی۔ ''ہاں۔ لیکن جیسے نیم حکیم ہوتے ہیں، ویسے ہی میں فی الحال آدھا مولوی ہوں۔'' وقار اور شہریار بھی مسکرا دیئے۔ وقار کی کچھ ہمت بندھی۔ ''آپ کے گھر والے کہاں رہتے ہیں۔ آپ کو اُن کی یاد نہیں آتی؟'' شیخ صاحب نے اُسے ڈانٹا۔ ''وقار! یہ کیا بدتہذیبی ہے؟'' میں نے شیخ صاحب کو روک دیا۔ ''کوئی بات نہیں اسے پوچھنے دیں۔ ہاں تو بھئی میرے گھر والے تو یہاں سے بہت دُور رہتے ہیں اور مجھے اُن کی یاد بھی بہت آتی ہے۔'' ''تو پھر آپ کیا کرتے ہیں۔ میرا مطلب ہے جب اُن کی بہت یاد آتی ہے کیوں کہ میں تو اپنے گھر سے

ایک رات بھی دُور نہیں رہ سکتا۔" "رہ تو میں بھی نہیں سکتا، پر کیا کروں میرا کام ہی ایسا ہے نا۔ البتہ جب گھر
والے بہت یاد آتے ہیں تو تھوڑا سا رو لیتا ہوں۔ اس طرح دل کچھ بہل جاتا ہے۔" وقار زور سے ہنس پڑا
"ارے، آپ روتے بھی ہیں۔ لیکن آپ تو مجھ سے بھی بڑے ہیں۔" "تو کیا ہوا۔ بڑے روتے نہیں کیا؟ میں
تو سمجھتا ہوں بڑوں کو چاہئے چھپ کر ہی سہی، چھوٹوں سے زیادہ رونا چاہیے۔ اس طرح اُن کا دل کبھی سخت
نہیں ہوگا۔ میری مانو تو تم بھی ابھی سے پریکٹس شروع کر دو۔ ہر غم کا ڈر دل سے نکل جائے گا۔" اب شیخ
صاحب اور شہر یار بھی ہماری اس "معصوم" بحث سے لطف اندوز ہونے لگے۔ وقار نے جھجکتے ہوئے اپنے دل
ایک اور شک زبان سے اُگل دیا۔ "آپ تو ہم جیسے ہی ہیں، لیکن شام کو شاہانہ باجی کہہ رہی تھیں کہ جو لوگ یوں
اپنا گھر بار چھوڑ کر اس راستے پر نکل آتے ہیں، وہ رفتہ رفتہ انتہا پسند بن جاتے ہیں۔" شیخ صاحب کے ہاتھ سے
کانٹا چھوٹ گیا۔ شہر یار نے بھی چونک کر اُوپر دیکھا۔ شیخ صاحب غصے سے بولے۔ "وقار یور مائنڈ یور اون
بزنس۔" میں نے ہاتھ اُٹھا کر شیخ صاحب کو روکا۔ "تم انتہا پسندی کسے کہتے ہو......" وقار کچھ ہچکچایا۔ "وہی جو
لوگ زبردستی اپنی منوانے کی کوشش کرتے ہیں۔" میں نے ہاتھ میں پکڑا پانی کا گلاس میز پر رکھ دیا۔ "دیکھو! یہ
پانی کا گلاس تقریباً بھرا ہوا ہے۔ اس کے سانچے میں جتنی گنجائش تھی، اتنا پانی اس میں موجود ہے۔ اگر میں اس
گلاس میں مزید پانی ڈالوں گا تو وہ چھلک کر میز پر گر جائے گا اور اس سے تمہیں، تمہارے ابو اور شہر یار کو پریشانی
ہوگی۔ بالکل اُسی طرح، جیسے تمہارے ڈی ٹی ایس بائیک کی رفتار کی حد ایک سو اسی کی ہے؟ لیکن اگر شہر کی عام
سڑکوں پر تم اسے ساٹھ، ستر کی رفتار سے زیادہ چلاؤ گے تو لوگ ڈر کر اِدھر اُدھر بھاگیں گے۔ ہوسکتا ہے تم کسی کو
زخمی بھی کر بیٹھو۔ بس یہی انتہا پسندی ہے۔ ہر وہ حد جس سے گزر کر تم دوسرے انسانوں کے لیے کسی بھی طرح
کی پریشانی کا باعث بن جاؤ، وہ انتہا پسندی ہے۔ ہم نے آج کل اس صفت کو نہ جانے کیوں صرف مذہب کے
سے وابستہ کر دیا ہے۔ انتہا پسندی ایک رویئے کا نام ہے۔ تم اپنی حد سے بڑھ کر بائیک دوڑا کر بھی انتہا پسند بن
سکتے ہو۔ شہر یار تیز ہارن بجا کر بھی اس فہرست میں شامل ہوسکتا ہے۔ شیخ صاحب دن میں آٹھ گھنٹے کے بجائے
بیس گھنٹے اپنے کاروبار پر صرف کر کے بھی انتہا پسند کہلا سکتے ہیں۔ لیکن میرا راستہ تو میری اپنی کھوج کا ہے۔ میں
کچھ سیکھنے کے لیے گھر سے نکلا ہوں۔ میرا مقصد اپنے نظریات کسی پر مسلط کر کے اُسے پریشان کرنا نہیں ہے
بلکہ سچ تو یہ ہے کہ میں ابھی تک صرف مختلف نظریات کو جانچنے اور پرکھنے کی حد تک ہی محدود ہوں۔ جانے اس
مختصر زندگی میں، مذہب کی بنیادی باتوں سے کچھ آگے بھی بڑھ پاؤں گا یا نہیں۔ کسی انتہا تک جانا تو بہت دُور کی
بات ہے۔ ویسے بھی مذہب ہمیں ہر چیز میں اعتدال کی راہ اختیار کرنے کی ہدایت کرتا ہے۔ حتیٰ کہ خود عبادت
میں بھی اِسی اعتدال کو مدنظر رکھنے کا حکم ہے۔ تو پھر بھلا مذہب ہمیں کسی بھی انتہا پسندی کی طرف کیسے لے جاسکتا
ہے......؟"

میری بات ختم ہونے کے بعد بھی کمرے میں کافی دیر تک خاموشی طاری رہی۔ پھر میں نے خود ہی وقار

سے پوچھا کہ کوئی اور سوال تو اُس کے ذہن کو پریشان نہیں کر رہا؟ وہ خوش دلی سے مسکرایا...... "نہیں عبداللہ
بھائی...... میں آپ کی باتیں سننے سے پہلے واقعی ایسے لوگوں سے بہت کتراتا تھا، لیکن آج آپ نے مجھے
احساس دلایا کہ شاید ہم خود ہی مذہب کو انتہا پسندی کی طرف لے جاتے ہیں۔ مذہب ہمیں کبھی اس طرف نہیں
دھکیلتا۔ ہمیں خود اپنے رویوں پر قابو پانا ہوگا۔" شیخ صاحب کے تنے ہوئے اعصاب ڈھیلے پڑ گئے اور انہوں
نے خوش ہو کر بیٹے کی پیٹھ تھپکی۔ شہر یار بھی مسکرا دیا۔ شیخ صاحب کھانے کے بعد بھی بہت دیر تک ہمارے ساتھ
بیٹھے رہے۔ اُن کے جانے کے بعد میں نے شہر یار سے عشاء کی نماز کے لیے مہلت طلب کی۔ "ٹھیک ہے
جناب، لیکن نماز پڑھتے ہی میرے کمرے میں چلے آنا۔ تم سے بہت ضروری باتیں کرنی ہیں۔" میں نے ہنس کر
اسے دیکھا۔ "میں جانتا ہوں تمہارے ضروری باتوں کا دائرہ کہاں تک محدود ہوگا۔ تم چلو میں آدھے گھنٹے میں
آتا ہوں۔" نماز کے بعد میں شہر یار کے کمرے میں داخل ہوا تو کمرہ نیلگوں دھوئیں سے بھرا ہوا تھا۔ بہت سے
اَدھ جلے سگریٹ راکھ دان میں اب بھی سلگ رہے تھے۔ کچھ لمحوں کے لیے تو میرا دم ہی گھٹ سا گیا۔ "مجھے
اندازہ نہیں تھا کہ تم اتنے لگاتار سگریٹ نوش ہو گے۔" شہر یار نے جلدی سے اُٹھ کر کمرے کی کھڑکیاں کھول
دیں۔ "نہیں...... ہر وقت اتنی سگریٹ نہیں پھونکتا۔ بس کبھی کبھی ذہن کسی پلاٹ یا نکتے پر اُلجھ جائے تو پھر یہ
نکوٹین ہی میرے سوچوں کی رُکی ہوئی گاڑی کو آگے دھکیلتی ہے۔" "مجھے آج تک یہ بات سمجھ نہیں آئی کہ یہ
کڑوا دھواں تم جیسے لکھاریوں کے اندر جا کر ایسا کیا جادو کرتا ہے کہ لفظ اور خیال آنسوؤں کی طرح باہر ٹپکنے لگتے
ہیں؟" شہر یار زور سے ہنسا۔ "پتا نہیں، وہ ہوسکتا ہے اندر جا کر یہ دھواں اُن کا بھی دم گھونٹتا ہو تو خیال باہر کو لپکتے
ہوں۔ کیا تم بالکل بھی سگریٹ نہیں پیتے......؟" مجھے اپنے ماضی کی شامیں، کلب اور ان میں بھرا دھواں یاد
آ گیا...... "کبھی پیتا تھا، دن میں ایک آدھ پیکٹ بھی پھونک جاتا تھا۔ اب نہیں پیتا۔ تم یہ بتاؤ کہ ایسا کون سا
خیال اٹک گیا ہے، تمہارے اندر جسے اس دھوائیں سے باہر نکالنے کی کوشش کر رہے ہو؟" شہر یار نے گہری سی
سانس لی، لیکن جواب دینے کے لیے اُس کے لب کھلنے سے پہلے ہی فون کی گھنٹی بج اُٹھی۔ شہر یار نے جلدی
سے فون اُٹھا لیا۔ دوسرے جانب سے شاید کسی نے سلام کیا۔ شہر یار نے جواب کے بعد کہا "زہے
نصیب...... کہیے آج کون سا امتحان لیں گی ہمارا......؟" میں نے اُٹھنے کا ارادہ کیا لیکن شہر یار نے میرا ہاتھ پکڑ
کر مجھے دوبارہ بٹھا لیا۔ مجھے اُن کی گفتگو کے دوران وہاں بیٹھنا کچھ معیوب سا لگ رہا تھا، لیکن شہر یار نے میر
ادوسرا اشارہ بھی نظر انداز کر دیا اور دوسری جانب کی بات سن کر کہا۔ "اگر آپ کو اعتراض نہ ہو تو ہم کچھ دیر بعد
بات کریں۔ دراصل میرے کمرے میں ایک مہمان دوست ہے۔" دوسری جانب کی بات سن کر شہر یار نے فون
رکھنے سے پہلے کہا۔ "چلیں ٹھیک ہے، کل بات کریں گے اور ہاں آپ کے سوال کا جواب ادھار رہا تھا۔" فون
رکھ کر وہ میری جانب پلٹا۔ "کافی چلے گی......؟" "نہیں! میری کفین سے کچھ زیادہ بنتی نہیں۔ تم نے خواہ مخواہ
فون بند کر دیا۔ ہوسکتا ہے وہ کوئی ضروری بات کرنا چاہتی ہوں۔ میں تو ویسے بھی جانے ہی والا تھا۔" شہر یار کسی

گہری اُلجھن کا شکار نظر آ رہا تھا۔ ”پتا نہیں کیوں تم سے ہر اُلجھن بانٹنے کو جی چاہتا ہے۔ ہم رائٹرز ویسے بہت کھلے دل کے مالک ہوتے ہیں۔ جو بھا جائے، وہی اپنا بن جاتا ہے۔“ میں نے غور سے اُس کی طر دیکھا۔ ”تم کچھ اُلجھے ہوئے سے لگتے ہو؟“ ”ہاں...... ایک عجیب سی بات ہے شاید میرا وہم ہی ہو لیکن نے محسوس کیا ہے کہ شانی جس طرح کھل کر ہر موضوع پر مجھ سے فون پر بات کرتی ہے۔ سامنے آنے پر وہ کے بالکل برعکس چپ سی نظر آتی ہے۔ پہلے پہل تو میں اسے روایتی شرم وحیا کے زمرے میں تولتا رہا، لیکن اُ آدھ مرتبہ ہمیں تنہائی میں ملنے کا موقع بھی ملا تو وہ بس ہوں ہاں ہی کرتی رہی۔“

میں غور سے اُس کی بات سنتا رہا۔ ”تم ایک لکھاری ہو۔ لفظ تمہارے آس پاس عقیدت سے دوز ہوئے بیٹھے رہتے ہیں لیکن ضروری تو نہیں کہ ہر کوئی تمہاری طرح گفتگو کے فن میں طاق ہو۔ ہوسکتا ہے اُ خاموشی کی زبان زیادہ بہتر لگتی ہو۔ ویسے بھی یہ لڑکیاں چپ رہ کر زیادہ بولتی ہیں۔ وہ کیا کہا ہے شاعر نے ”تخلیے کی باتوں میں گفتگو اضافی ہے۔ تو ہوسکتا ہے۔ اُسے بھی یہ لفظ غیر ضروری اور اضافی محسوس ہو ہوں۔“ شہریار اب بھی بے چین تھا۔ ”ہاں! ایسا بھی ہوسکتا ہے، لیکن وہ یہ بات بھی اچھی طرح جانتی ہے کہ لفظ ہی تھے، جو ہمیں اتنا قریب لانے کا باعث بنے۔ اُسے یہ بھی پتا ہے کہ اچھے لفظ اور اُن سے بنے اُ چھوٹے خیالات ہی میری کمزوری ہیں۔ پھر بھی وہ بولنے میں اس قدر احتیاط، بلکہ کنجوسی کا مظاہرہ کیوں کر ہے......؟“ ”یہ سوال تم نے شانی سے کیوں نہیں پوچھا؟“ ”پوچھا تھا۔ اُس نے بھی کم وبیش وہی تمہارا جوا دہرا دیا کہ تخلیے کی باتوں میں گفتگو اضافی ہے۔“

اس رات شہریار نے مجھے تفصیل سے شیخ صاحب کے خاندان کے بارے میں بتایا کہ اُن کا بڑا بیٹا ام اور چھوٹی بیٹی دھانی نقش ونگار کے معاملے میں اپنے باپ پر گئے ہیں، جب کہ بڑی بیٹی شاہانہ اور چھوٹا بیٹا وقا اپنی مرحومہ ماں کے حسن اور رنگ وروپ سے جڑے ہوئے تھے۔ اِسی لیے شانی اور دھانی کے نقش اس قد مختلف تھے۔ لیکن اس چہرے اور دھوپ چھاؤں جیسے رنگ کے فرق سے قطع نظر شیخ صاحب کی تمام اولاد م بے حد ایکا اور محبت تھی۔ خاص طور پر دونوں بہنیں تو جیسے ایک جان دو قالب تھیں۔ البتہ شانی کے مقابلے م دھانی اپنے باپ سے زیادہ جڑی ہوئی تھی۔ اُس کا نام بھی شیخ صاحب نے دھان کی فصل کی کٹائی کے وقت اُس کی پیدائش پر رکھا تھا۔ سنا ہے اُس سال شیخ صاحب کی گاؤں والی زمینوں پر چاول کی فصل نے برسوں کے ریکارڈ توڑ دیئے تھے، اور پھر دھانی جیسے جیسے بڑی ہوتی گئی دھانی رنگ بھی اس کی شخصیت کا ایک حصہ بن گیا۔ اسکول میں دھانی رنگ کے واٹر کلر، پنسلیں، پھر کالج بیگ اور پھر یونیورسٹی میں لباس میں دوپٹے، ہاتھ کی چوڑیاں، ہیر بینڈ یا پھر پرس...... کوئی ایک چیز دھانی ضرور ہوتی تھی۔ یہی حال گھر بھر کی کٹلری، پردوں او صوفوں کی کلر اسکیم حتیٰ کہ اس کے اپنے کمرے کے رنگ اور اس کی اپنی شخصیت پر بھی حاوی تھا۔ وہ خود بھی اس رنگ جیسی پُرسکون، ٹھہری ہوئی اور ساکت تھی۔ البتہ شانی اس کے برعکس تیز گلابی رنگ جیسی تھی۔ شوخ، چلبلی

اور تھرکتی ہوئی۔ سارا گھر اُسی کی وجہ سے حرکت میں رہتا تھا۔ نہ وہ خود چین سے بیٹھتی تھی نہ ہی کسی کو زیادہ دیر بیٹھے رہنے دیتی تھی۔ دونوں بہنوں کے اس مزاجوں کے فرق ہی نے دراصل شیخ صاحب کے گھر کے توازن کو ایک خوبصورت انداز میں برقرار رکھا ہوا تھا۔ بیٹے بھی باپ کے فرمان بردار تھے البتہ۔ گھر کا سارا انتظام بہنوں نے سنبھال رکھا تھا۔ شہریار آیا تو کسی کہانی کی تلاش میں تھا، لیکن شیخ صاحب کے ہاں مہمان ہوتے ہی وہ خود ایک کہانی کا حصہ بنتا گیا۔ اُس کا استقبال کرنے والی دھانی تھی، جس نے اپنے گھر کے گیٹ پر اُسے خوش آمدید کہا۔ لیکن...... جس نے شہریار کے دل کے گیٹ پر پہلی دستک دی، وہ شانی تھی۔ لیکن یہ سب کچھ ایک دم ہی نہیں ہوگیا۔ پہلے تعارف میں تو کوئی بھی شاہانہ کے ملکوتی حسن سے متاثر ہوسکتا تھا، لیکن شہریار کو شانی کی دستک سننے میں دو ہفتے سے بھی زیادہ لگ گئے۔ انیکسی میں وہ اُس کی دوسری رات تھی، جب فون کی گھنٹی پہلی بار بجی۔ دوسری طرف جو بھی تھی، اُس نے اپنا نام نہیں بتایا بلکہ یہ کسوٹی بھی اُس نے شہریار ہی پر چھوڑ دی کہ وہ ہی سے پہچانے کہ وہ کون ہے، کیوں کہ یہ دعویٰ بھی تو شہریار ہی کا تھا کہ لکھاری لوگوں کی آنکھوں سے اُن کے دل کا حال جاننے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ اور شہریار کو اگلے روز ہی شانی کی آنکھوں میں چھپا وہ گلابی پیغام دکھائی دے گیا، جو شاید پہلے ہی دن سے اُس کی گھنیری پلکوں کے پیچھے چھپا ہوا تھا۔ لیکن شہریار نے مزید کئی دن لیے ات والی اُس آواز کو اُس کی پہچان بتانے میں۔ شاہانہ کو خوشی ہوئی کہ اُس کی نظروں کا پیغام شہریار کے دل تک پہنچنے میں کامیاب ہوگیا۔ پھر راتوں کے فون کی یہ شہزادی کچھ ایسی ہی شروع ہوئی کہ لفظوں کی دنیا میں رہنے والا شہریار جیسا لفظ گر بھی ان ملائم لفظوں اور کومل جذبوں کا شکار ہوتا چلا گیا، جو دیر رات گئے تک وہ فون پر اُس کی سماعتوں میں انڈیلتی تھی۔ وہ دونوں دنیا کے ہر موضوع پر گفتگو کرتے تھے۔ شہریار اُسے اپنے افسانوں کے موضوعات پر بحث کی دعوت دیتا اور اُس سے ایک قاری کے طور پر پہلی رائے بھی لیتا۔ لیکن مسئلہ وہاں سے جڑنے لگا، جب ایک آدھ مرتبہ شہریار کو شانی سے تنہائی میں بات کرنے کا موقع ملا۔ وہ فون پر شاہانہ کی منفرد طرز اور گفتگو میں الفاظ کے نئے زاویوں کی عکاسی سن سن کر خود بھی ایسے کسی موقع کا بے تابی سے انتظار کر رہا تھا۔ پہلی مرتبہ اُس وقت یہ ملاقات ہوئی، جب سارے گھر والے کسی تقریب میں گئے ہوئے تھے اور شام کی چائے پر باغ میں وہ اور شاہانہ تنہا تھے اور دوسری مرتبہ تب جب شیخ صاحب کو کسی ضروری کام کے سلسلے میں اچانک ڈرائیور سمیت شہر سے باہر جانا پڑا اور شہریار گھر کی دوسری گاڑی میں شاہانہ کو اس مقام سے گھر واپس لے کر آیا، جہاں سے مقررہ وقت پر ڈرائیور نے اُسے لانا تھا۔ لیکن شہریار کے تشنہ کان شانی کے لبوں سے کچھ سننے کی آرزو ہی کرتے رہے اور وہ بس چھوٹے چھوٹے جملوں میں ”ہوں ہاں“ کر کے شہریار کی باتوں کا جواب دیتی رہی۔ اِسی بات نے شہریار کو اُلجھا رکھا تھا۔ حالانکہ وہ در پردہ اپنے خاندان کو شاہانہ کے لیے اپنے پسندیدگی سے بھی آگاہ کر چکا تھا، لیکن وہ ایک مرتبہ شانی سے کھل کر بات کرنے کے لیے کسی موقع کی تلاش میں تھا۔ کیوں کہ اگلے ماہ اُس کے گھر والے باقاعدہ اس پری رُخ کو شہریار کے لیے مانگنے آ رہے تھے اور شاید

شہریار کے والد اس سلسلے میں شیخ صاحب کو بھی شہریار کی مرضی سے آگاہ کر چکے تھے۔ شہریار نے غالباً
پانچویں پیکٹ کے آخری سگریٹ کو راکھ میں تبدیل کیا ہی تھا کہ باہر سے صبح کی اذانیں سنائی دینے لگیں۔

میں شہریار کو تسلی دے کر جب اپنے کمرے میں آیا تو میرے ذہن میں ایک عجیب سا خیال دھیرے
دھیرے گھر کرنے لگا تھا۔ شہریار کی نظر شاہانہ ہی پر کیوں ٹکی؟ دھانی بھی تو اُسی گھر میں ہی رہتی تھی۔ ہماری
نظر ہمیشہ روشن اور اُجلے چہروں ہی میں کیوں اُلجھتی ہے۔ یہ خوبصورتی کیا بلا ہے؟ اگر یہ دیکھنے والی نظر ہی
منحصر ہوتی ہے تو پھر ہماری نظر عام چہروں پر کیوں نہیں رُکتی؟ ہمارا دل کسی سادہ چہرے کے لیے بھی پہلی
جھلک میں اس طرح کیوں نہیں دھڑکتا، جیسے وہ کسی ماہ وش کی پوری پلکیں گرنے سے پہلے ہی اُس کے لیے
زانو ہو چکا ہوتا ہے۔ تو پھر کہیں یہ قدرت کی بے انصافی تو نہیں کہ اس نے کچھ آئینے تو اتنے شفاف اور
ہلکے دھندلے بنا ڈالے۔ اور اگر چہروں اور رنگ و روپ میں یہ تفریق پیدا کرنی اتنی ہی ضروری تھی تو
ہماری نظر اور ہمارے دلوں میں یہ فرق نہ ڈالا ہوتا۔ کیوں ہمارے سدا کے سودائی اور پاگل دل کو ان شفاف
آئینوں میں جھانکنے کی لت ڈال دی۔

میں انہی سوچوں میں گم تھا کہ ٹیلی فون کی گھنٹی نے مجھے جھنجھوڑ کر رکھ دیا۔ باہر سورج نکل چکا تھا۔ میں
یہ سوچ کر فون بجنے دیا کہ شہریار خود اُٹھا لے گا۔ گھنٹی لگاتار بجتی رہی، پھر بہت دیر بعد بند ہو گئی۔ شاید شہریار
اُٹھا لیا تھا پھر اچانک ہی دروازہ کھلا اور شہریار آنکھوں میں نیند کا خمار لیے بیچوں بیچ جمائیاں لیتا کھڑا
آیا۔ ''عبداللہ فون اُٹھاؤ...... تمہارے لیے کال ہے۔'' میں چونک گیا۔ ''میرا فون...... اس وقت......'' شہریار
پلٹ گیا میں نے دھڑکتے دل سے فون اُٹھایا ''جی کون ہے......؟'' دوسری جانب کچھ خاموشی کے بعد
آواز اُبھری۔ ''جی...... میں دھانی بول رہی ہوں......''

کچھ دیر تو مجھے کچھ سمجھ نہیں آیا۔ ''جی......؟'' وہ کچھ دیر بعد ہلکے سے کھنکار کر دوبارہ بولی ''میں شیخ صاحب
کی چھوٹی بیٹی دھانی بول رہی ہوں۔'' میں سنبھل چکا تھا ''جی فرمایئے......'' وہ کچھ اُلجھی ہوئی سی لگ رہی تھی۔
''وہ دراصل مجھے کچھ وضاحت کرنا تھی۔ بعض باتیں سفر کرتے ہوئے اپنا اصل زاویہ کھو بیٹھتی ہیں اور مطلب کچھ
کا کچھ ہو جاتا ہے۔'' مجھے حیرت ہوئی ''جی، میں سمجھ سکتا ہوں، لیکن مجھے اس تمہید کی وجہ سمجھ نہیں آئی۔'' وہ کچھ
ہچکچائی ''تمہید تو میں نے باندھ دی ہے۔ اب باقی بات آپ کو شانی بتائے گی۔ یہ لیں، اُن سے بات کریں''۔
چند لمحوں بعد کم و بیش بالکل ویسی ہی آواز فون پر اُبھری ''آداب! دراصل کل وقار نے رات کے کھانے پر مجھ
سے منسوب کر کے آپ سے کچھ ایسی بات کہی، جو میں نے اس مفہوم میں ہرگز نہیں کہی تھی۔ نہ ہی میرا مقصد
آپ کو ہدف تنقید بنانا تھا۔ میں نے لوگوں کے عمومی رویوں کی بات کی تھی۔ ڈیڈی بھی ہم سے بہت خفا ہوئے۔
آپ کو جو ذہنی تکلیف ہوئی، میں اس کے لیے معذرت خواہ ہوں۔'' میں نے جلدی سے کہا ''یقین کریں وہ
بات تو بس یونہی ہنسی مذاق میں بحث کا حصہ بن گئی اور میں تو بھول بھی چکا تھا۔ آپ ذہن پر کوئی بوجھ نہ
رکھیں۔'' ''شکریہ۔ آپ کے بزرگ اب کیسے ہیں۔ آپ اجازت دیں تو میں اور دھانی بھی ڈیڈی کے ساتھ جا
کر اُن کو دیکھ آئیں۔'' ''جی ضرور۔ کیوں نہیں۔ انہیں بہت خوشی ہوگی۔'' پیچھے سے کسی سرگوشی کی آواز آئی۔
شانی جھجکتے ہوئے بولی ''دھانی کہہ رہی ہے کہ آپ ڈیڈی کا دل ضرور صاف کر دیجیے گا، ہماری جانب سے۔ ہم
اُن کی ذرہ برابر خفگی بھی برداشت نہیں کر سکتے۔'' مجھے ہنسی آ گئی۔ تو گویا یہ ساری گفتگو شیخ صاحب کی ناراضگی
دُور کرنے کے لیے تھی۔ میں نے انہیں مطمئن کیا۔ ''آپ بے فکر رہیں۔ انہیں آپ سے کوئی شکایت نہ رہے
گی۔'' میں نے بات ختم کر کے فون واپس رکھ دیا اور یہی سوچتا رہا کہ نہ جانے یہ لڑکیاں ایسے کانچ کے من کے
ساتھ اس پتھریلی دنیا میں کیسے گزارہ کر پاتی ہیں۔

اسپتال پہنچا تو سلطان بابا کچھ مضمحل سے لگ رہے تھے۔ لگتا تھا رات بھر ٹھیک سے سو نہیں پائے۔ میں
بے چین ہو کر جلدی سے ڈیوٹی پر موجود ڈاکٹر کے پاس پہنچا اور بابا کی اس حالت کی وجہ پوچھی۔ اُس نے مسکرا
کر تسلی دی۔ ''ایسا ہو جاتا ہے۔ انہیں ہائی ڈوز اینٹی بائیوٹکس دی جا رہی ہیں۔ ایسے میں طبیعت کا بوجھل ہو جانا
قدرتی عمل ہے اور پھر اُن کی خوراک بہت کم ہے۔'' میری پریشانی دُور ہونے کے بجائے مزید بڑھ گئی۔ ''لیکن
انہیں ہوا کیا ہے۔ اب تو اُن کے تمام معائنے بھی ہو چکے ہیں۔'' ڈاکٹر نے اُن کی فائل کھولی اور آسان لفظوں

میں مجھے سمجھانے کی کوشش کی۔ ''ہمیں دو محاذوں پر بیک وقت لڑنا پڑ رہا ہے۔ اُن کے داہنی جانب آخر
پسلیوں کو اندر کی جانب کسی زوردار دھکے کی وجہ سے شدید دباؤ کا سامنا کرنا پڑا، جس کا اثر اندر جگر کی بیرو
تک ہوا ہے۔ ہمیں ان خراشوں کو بھرنا ہے اور دوسری اہم بات ان کی سر کی چوٹ ہے۔ ہمارے دما
شریانوں میں خون کی روانی میں ایک لمحے کی رُکاوٹ بھی شدید نقصان کا باعث بن سکتی ہے اور خون کا
دباؤ عارضی یا مستقل فالج کا سبب بھی بن سکتا ہے۔ خون کے بہاؤ میں یہ رُکاوٹ خون سے بنے ریت کے
ذرے سے بھی باریک لوتھڑے سے پیدا ہو سکتی ہے۔ یہ لوتھڑا اگر شریانوں سے چپک جائے تو اسے تھر
اور اگر خون کے بہاؤ کے ساتھ بہتا رہے تو اسے طب کی زبان میں ایمبولس کہتے ہیں۔ بس یوں سمجھ لو
فی الحال تو کسی ایسے چپکے یا بہنے والے لوتھڑے سے بچے ہوئے ہیں لیکن کبھی کبھی وقت گزرنے کے
ساتھ ایسی پیچیدگیاں ظاہر بھی ہونے لگتی ہیں۔ تو بس فی الحال ہماری اتنی سی جنگ ہے، ان کی بیماری کے
اور یہی کوشش ہے کہ مزید کوئی پیچیدگی پیدا نہ ہو۔ آپ اطمینان رکھیں۔ وہ ماہر ہاتھوں میں ہیں۔'' ڈاکٹر
مستند تجربے کار کی طرح مجھے تسلی دی۔ لیکن اُس کی باتیں سننے کے بعد میرا رہا سہا اطمینان بھی جاتا رہا۔
واپس کمرے میں پلٹا تو سلطان بابا نے میرے چہرے کی تختی پر بکھری سیاہی کو غور سے پڑھا ''تم بھی آگئے
ڈاکٹروں کی باتوں میں۔ مطمئن رہو، جب تک سانسیں باقی ہیں، یہ بیماری میرا کچھ بگاڑ نہیں سکتی اور
سانس پوری ہوئی تو ان ڈاکٹروں کی ساری دنیا کی مکمل سائنس مل کر بھی مجھے ایک زائد سانس نہیں دے
گی۔ پھر اس جھمیلے میں کیوں پڑتے ہو؟'' میں نے انہیں غور سے دیکھا ''میرا بھی ٹھیک یہی یقین ہے، لیکن
کے باوجود ہم آخری لمحے تک ہر ممکن دوا کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اس لیے کہ دوا کرنا بھی تو ایک طر
دعا ہے۔ یہ بھی تو اُمید اور آخری لمحے تک اس کا کرم یا فضل ہو جانے کا ایک استعارہ ہوتی ہے۔ لہٰذا آپ
دوا کی دعا کرنے سے نہ روکیں۔ میرے ہونٹوں سے ادا ہوتی دعا آسمان کی وسعتوں تک جاتی ہے تو میر
کی یہ دعا آپ کی نسوں میں بہتے خون کے خلیوں میں گھل کر اپنی فریاد اس زندگی کے مالک کو پیش کرتی
تیرا ایک بندہ تیرے آسرے پر اس دوا کی کرامات پر یقین کیے بیٹھا ہے۔ اس کو مایوس نہ کرنا۔'' میں نہ
کتنی دیر تک بولتا رہا۔ سلطان بابا خاموشی سے میری بات سنتے رہے۔ پھر انہوں نے سر اُٹھایا تو اُن کی
بھیگی ہوئی تھیں۔ میں گھبرا کر جلدی سے اُن کی جانب بڑھا ''ارے...... یہ کیا، میری کوئی بات ناگوار گ
کیا؟'' انہوں نے میرا ہاتھ مضبوطی سے تھام لیا۔ ''نہیں۔ یہ آنسو بھی اُس کی شکر گزاری کے ہیں۔ آج پہلا
عبداللہ نے سلطان کو سبق دیا ہے۔ آج شاگرد اس مقام پر ہے، جہاں اُستاد تھک کر بیٹھ گیا ہے۔ جیتے
خوش رہو۔'' میں نے ان کا ہاتھ اپنی آنکھوں سے لگا لیا۔ ''یہ میں نہیں، میرے اندر خود آپ بول رہے
میرے پاس تو خود اپنا کچھ بھی نہیں۔ یہ نام بھی آپ ہی کا دیا ہوا ہے۔'' میں بہت دیر اُن کے سرہانے بیٹھا
رفتہ رفتہ انہیں غنودگی سی ہونے لگی اور وہ گہری نیند سو گئے۔

ظہر کے وقت میں نے دھیرے سے اُن کا کاندھا ہلا کر نماز کے لیے جگا دیا۔ شام چار بجے کمرے کے
کچھ آہٹیں اُبھریں اور پھر شیخ صاحب اپنی دونوں بیٹیوں اور شہر یار کے ہمراہ کمرے میں داخل ہوئے۔
ان بابا اُن سب سے مل کر کافی ہشاش بشاش ہو گئے۔ انسان سے انسان کا یہ رشتہ بھی کس قدر انوکھا ہے،
ی زہر تو کبھی تریاق۔ جبروت کے زہر نے بابا کو اسپتال کے اس بستر تک پہنچا دیا تھا اور شیخ صاحب اور اُن
خاندان کے ذرا سے تریاق نے پل بھر میں اُن کے زرد چہرے پر کتنے رنگ کھلا دیئے تھے۔ جب شیخ
حب نے شہر یار کا اُن سے یہ کہہ کر تعارف کرایا کہ وہ بہت جلد اُن کی فرزندی میں آنے والا ہے تو سلطان بابا
مسکرا کر اُس کی جانب دیکھا ''کیوں میاں، نماز وغیرہ بھی پڑھتے ہو یا صرف صفحے ہی سیاہ کرتے رہتے
؟'' شہر یار جو نہ جانے کس خیال میں کھویا کھڑا تھا اس اچانک حملے سے بالکل ہی گھبرا گیا ''جی...... وہ......
مطلب ہے......'' ہم سب شہر یار کی یہ حالت دیکھ کر ہنس پڑے۔ سلطان بابا نے اُسے دعا دی ''جیتے رہو
ہاں، نماز پڑھا کرو۔ لکھنے والا تو ویسے بھی خدا کے زیادہ قریب ہوتا ہے۔ تب ہی اس کا زیادہ واسطہ الہام
ہوتا ہے۔ اپنی تحریر میں جذب کی کیفیت پیدا کرنا چاہو تو پانچ وقت اُس کے دربار میں حاضری دینے کا پابند
لو خود کو۔'' شہر یار نے جلدی سے یوں سعادت مندی سے سر ہلایا، جیسے آج ہی سے اُن کی نصیحت پر عمل
ع کر دے گا۔ سلطان بابا نے خاص طور پر دھانی اور شانی سے بھی اُن کی مصروفیات کا پوچھا اور انہیں بھی
دی۔ وہ سب بہت دیر تک وہاں بیٹھے رہے۔ سلطان بابا کا کمرہ اُن کے لائے ہوئے سامان سے بھر چکا تھا،
ن ڈاکٹر نے پرہیز کی پابندی بتا کر اُن سب کی اُمیدوں پر پانی پھیر دیا۔ آٹھ بجے سے کچھ پہلے شیخ صاحب
گھر کا دوسرا ڈرائیو جو روز مجھے لینے آتا تھا، وہ بھی آ پہنچا۔ میرا دل آج سلطان بابا کو چھوڑ کر جانے کو بالکل بھی
ں چاہ رہا تھا، لیکن رات کی ڈیوٹی والی نرس بھی پہنچ گئی تھی۔ لہٰذا مجبوراً مجھے سب کے ساتھ اُٹھنا پڑا۔ شہر یار
ے ساتھ گاڑی میں بیٹھ گیا اور شیخ صاحب ہماری گاڑی کے ڈرائیور کو اپنی گاڑی کے پیچھے آنے کا کہہ کر
ی اور شاہانہ کے ساتھ بڑی گاڑی کی جانب بڑھ گئے۔ دونوں گاڑیاں آگے پیچھے اسپتال سے نکلیں تو خلاف
دل شیخ صاحب والی گاڑی نے گھر کی مخالف سمت موڑ کاٹ لیا۔ شاید وہ گھر جانے سے پہلے کہیں اور جانا
ہتے تھے۔ میں نے اپنی سوچوں میں گم شہر یار کو چھیڑا۔ ''عموماً دیکھا گیا ہے کہ ایسے مواقع پر چاہنے والوں
چہرے کھلے رہتے ہیں، لیکن تمہاری حالت اس کے برعکس کیوں ہے؟'' شہر یار نے لمبی سی ٹھنڈی آہ بھری
لا ہے جسم جہاں، دل بھی جل گیا ہو گا۔ کریدتے ہو راکھ، آخر یہ جستجو کیا ہے...... کبھی کبھی مجھے یوں لگتا ہے
غالب میرے دل کا ہر معاملہ پہلے ہی ساری دنیا پر کھول گیا ہے۔ اب راکھ کریدنے سے تمہیں بھی کچھ
ل نہ ہو گا اے دوست۔'' میں مسکرا دیا۔ شیخ صاحب کی گاڑی نے شہر کے ایک مشہور پانچ ستارا ہوٹل کی ذیلی
راہ کی جانب موڑ کاٹا اور کچھ دیر بعد ہم سب ریسٹورنٹ میں کھانے کے میز کے گرد جمع تھے۔ شیخ صاحب
لے ''بھئی لڑکیوں کی ضد تھی کہ آج رات کا کھانا ہم کہیں باہر کھائیں، لہٰذا اب آپ سب بلا تکلف اپنی پسند

بتادیں۔'' کچھ ہی دیر میں مستعد بیروں نے میز پر کھانا سجا دیا۔ ہم سے ذرا فاصلے پر لابی میں ایک کہ
موسیقار پیانو پر مختلف فرمائشی دُھنیں چھیڑ رہا تھا۔ آس پاس بیٹھے لوگ کاغذ کی چٹ پر اپنی پسند کی دُھن
اردگرد پھرتے بیرے کی ٹرے میں ڈال دیتے جو فوراً اُسے پیانسٹ کے سامنے لے جا کر رکھ دیتا۔ پیا
مسکرا کر اپنا سر ہلاتا اور پھر باری آنے پر جب وہ دُھن بجاتے ہوئے اُس کی اُنگلیاں پیانوں کی لمبی سفید
تھرک رہی ہوتیں تو اُس کی نظریں بار بار فرمائش کرنے والے جوڑے کی جانب اُٹھتی رہتیں۔ سچ ہے کہ
ہر ہنر مند داد کا خواست گار ہوتا ہے۔ مجھے بچپن میں پیانو سیکھنے کا جنون تھا۔ ہمارے گھر کے بڑے ہال
سیلون کی لکڑی سے بنا ایک بھورے رنگ کا بہت بڑا پیانو رکھا ہوا تھا، جسے پاپا کبھی کبھار کسی محفل کے دوران
کبھی تنہائی میں بجاتے تھے۔ اور میں گھنٹوں محویت سے بیٹھا انہیں دیکھتا رہتا۔ جانے کیوں تب ہی سے
پیانسٹ بہت ہنر مند اور سلجھے ہوئے لوگ لگتے تھے۔ ہمارے دائمیں جانب شیشے کی دیوار پر پانی کا جھر
اس طرح سے بہہ رہا تھا، جیسے باہر موسلا دھار بارش ہو رہی ہو۔ کھانے کی میزوں کے اردگرد روشنی کا انتظ
اس انداز میں کیا گیا تھا کہ ہر شخص ایک مدہم روشنی کے دائرے میں خود کو اس طرح محسوس کرتا جیسے وہ سب
درمیان ہوتے ہوئے بھی تخلیے میں ہے، اور شاید تخلیے و تنہائی کا احساس ہی اس ماحول کو آرام دہ اور پُر
بنائے ہوئے تھا۔ صاحب حیثیت لوگ ایسی جگہوں پر شاید اسی احساس کی قیمت ادا کرتے ہیں، ورنہ کم
یہی ذائقہ ہر دسترخوان پر ان کے گھروں میں بھی موجود ہوتا ہے۔ وہ یقیناً یہاں پیش کیے جانے والے کھ
کی نہیں، یہاں گزارے جانے والے وقت کی قیمت ادا کرتے ہیں۔ دھانی اور شاہانہ نے بھی مختلف دُھنو
فرمائش شروع کر دی۔ پیانسٹ شاید شیخ صاحب کی ذاتی حیثیت سے واقف تھا، لہٰذا اب اُس کی پوری
ہماری میز کی جانب تھی۔ مجھے یاد آیا کہ میرے بچپن میں پپا اسٹیو ونڈر کے اِسی نغمے کی دُھن بہت شوق
بجاتے تھے ''ہیلو...... کیا میں وہی ہوں، جس کا تمہیں انتظار ہے؟ کیوں کہ میں تمہاری مخمور آنکھوں اور
گھائل مسکراہٹ میں دیکھ سکتا ہوں۔ مجھے بتاؤ تمہیں کیسے جیتوں اے دلربا...... کہ میں انجان ہوں......
میں ابھی ان ہی لفظوں کے طلسم سے شروع کروں...... کہ مجھے تم سے محبت ہے۔'' پیانسٹ نے دُھن خ
سارے ہال نے اُسے داد دی۔ اب دھانی کی باری تھی، اُس نے چٹ بھیجی، ''لاپرواہ سرگوشیاں less
(whispers...... میری بہترین دوست ہیں ...... لیکن اب میں کبھی رقص نہیں کر پاؤں گا، کیوں کہ
بوجھ قدم بنا تال کے ہیں......'' بہت دیر تک شانی اور دھانی میں جارج مائیکل، ویم اور ماڈرن ٹاکنگ
پرانے نغموں اور پھر شیر (Cherr) بیک سٹریٹ بوائز اور برٹنی سپیئرز کے نئے نغموں کی دُھنوں پر پیا
آزمانے کا سلسلہ جاری رہا۔ شیخ صاحب بھی کچھ اس طرح مطمئن بیٹھے مسکراتے رہے، جیسے اُن کا یہا
اُٹھنے کا کوئی ارادہ ہی نہ ہو۔ دھیرے دھیرے ڈھلتی رات کا فسوں اب پوری طرح چھا چکا تھا۔ کھانے
ہال میں اب بھی بہت سی میزیں بھری ہوئی تھیں اور دیر رات کو نکلنے والے آوارہ گرد بھی جمع ہو رہے ت

ایک عجیب سے بات محسوس کی کہ ہمارے دن اور رات کے رویوں میں بہت زیادہ فرق ہوتا ہے۔ رات
ا بہت حد تک بدل دیتی ہے۔ ہماری اندر چھپے بہت سے خوابیدہ جذبوں کا براہ راست تعلق رات سے ہوتا
، اور اگر خوش قسمتی سے ایسا خواب ناک ماحول میسر ہو تو یہ جذبے اپنے پوری قوت سے ہماری شخصیت پر
ی ہو جاتے ہیں۔ ہمارے باتیں نشیلی ہو جاتی ہیں اور ہمارے لہجے ملائم ...... بعض اوقات ہمیں خود سے ہی
ہونے لگتا ہے اور ہم اپنے اندر چھپے کسی معصوم بچے کی ہر ضد مانتے چلے جاتے ہیں۔ اپنی روایتی وضع داری
ہولا اُتار کر بے باک ہو جاتے ہیں اور ہمارے اندر کی رُومان پسند شخصیت چھم سے باہر نکل آتی ہے۔ کہتے
نشے میں بھی یہی تمام خصوصیات ہوتی ہیں۔ گویا ایسے ماحول میں یہ رات بھی ایک نشے کی طرح ہی ہمارے
ں میں تحلیل ہو کر ہمیں دنیا و مافیہا سے بے گانہ کر سکتی ہے۔ شاید رات خود ایک بہت بڑا نشہ ہے۔ پیانسٹ
تار چھیڑے ''صرف لفظ...... اور بس یہی لفظ ہی تو ہیں میرے پاس...... تمہیں دینے کے لیے......'' اچانک
دھانی نے کھوئے کھوئے سے شہریار سے پوچھا۔ ''آج کل آپ کیا لکھ رہے ہیں۔ کچھ ہمیں بھی تو بتایئے
آنے والی تحریر کے بارے میں۔'' شہریار کچھ چونک سا گیا۔ ''آج کل میں ایک ایسے قلم کار کی کہانی لکھ رہا
، جس کی تحریر اور لفظوں نے ساری دنیا میں دھوم مچا رکھی ہے۔ اس کی ہر نئی آنے والی کتاب مقبولیت کے
ریکارڈ قائم کر رہی ہے۔ لوگ بے چینی سے اس کے قلم سے بکھرے لفظوں کی مالا چننے کے لیے اس کی تحریر کا
ظار کرتے ہیں، لیکن عجیب بات یہ ہے کہ خود اس لکھاری کے پاس اپنے گھر میں بولنے کے لیے صرف
وشی ہے۔ اس لکھاری کی شریک حیات کے حصے میں قلم کار کا کوئی لفظ نہیں آتا۔ وہ دونوں بس خاموشی میں
ت کرتے ہیں۔'' شاہانہ کی ساری توجہ اب شہریار کی جانب تھی۔ دھانی نے دلچسپی سے پوچھا ''لیکن ایسا
وں......؟ کیا لکھاری کی شریک حیات کو لفظوں کی ضرورت نہیں پڑتی۔ یا پھر قلم کار اپنی کسی گزشتہ محبت کے اثر
کھویا رہتا ہے؟'' شہریار نے غور سے شانی کو دیکھا۔ ''نہیں۔ لکھاری کی زندگی کی ساتھی تو اُس کے لفظوں
لیے بے تاب رہتی ہے اور خود لکھاری کی پہلی اور آخری محبت بھی اُس کی شریک حیات ہی ہے۔ لیکن اُسے
یں ایسا لگتا ہے، کہ وہ جو کچھ لکھتا ہے، وہ سب اُس کی محبت کے لیے ہی تو ہوتا ہے۔ تو پھر اپنی زبان سے بھی
ں لفظ ادا کرنا، جو اس کے نقش کردار ایک دوسرے کے لیے ہمہ وقت اُس کی کہانیوں میں بولتے نظر آتے
اُسے یہ ادائیگی کچھ معیوب سی نظر آتی ہے اور کہیں اُس کے دل میں یہ خدشہ بھی موجود ہے کہ ان ہی لفظوں
جذبوں کی بے ساختہ زبانی ادائیگی کو دکھاوا نہ سمجھ لیا جائے، لہٰذا اپنی شریک حیات اور محبت کے سامنے وہ عموماً
موش ہی رہتا ہے اور یہیں سے لکھاری کی شریک حیات کی اُلجھن شروع ہوتی ہے۔ کیوں کہ بظاہر آس پاس
ں اور اُس لڑکی کی سہیلیاں اُس پر رشک کرتی ہیں کہ لکھاری کی شریک حیات کس قدر خوش قسمت ہے کہ
ے ان خوب صورت لفظوں کا ہمہ وقت ساتھ میسر ہے، جنہیں کتاب کی صورت میں پڑھنے کے لیے لکھاری
کے پرستار مہینوں انتظار کرتے ہیں اور لمبی قطاروں میں کھڑے ہو کر اُس کی کتابیں خریدتے ہیں۔ اسی کش مکش

اور ذہنی الجھنوں کی یلغار میں ایک دن لکھاری کی محبت اس کا گھر چھوڑ جاتی ہے کہ اب وہ مزید اس خامو
متحمل نہیں ہوسکتی۔'' شانی اور دھانی بہت غور سے شہریار کی بات سن رہی تھیں۔ شیخ صاحب بھی پوری
متوجہ تھے۔ اُن سے شہریار کی خاموشی کا لمبا وقفہ برداشت نہیں ہوسکا اور وہ جلدی سے پوچھ بیٹھے ''تمہاری
کہانی کا عنوان کیا ہے؟'' شہریار نے ہم سب کی جانب نگاہ دوڑائی...... ''میرا ہر لفظ تمہارا ہے، لیکن میری
کا انجام ابھی باقی ہے۔ آپ سب بھی اپنی رائے دیجئے کہ انجام کیسا ہونا چاہیے۔'' کچھ دیر کے لیے ما
خاموشی طاری رہی۔ پھر دھانی ہی نے سکوت توڑا۔ ''انجام تو بہت واضح ہے، لکھاری کو اپنی محبت کی جُدا
بعد یہ احساس ہوجانا چاہیے کہ رشتے لفظ مانگتے ہیں۔ جذبے اظہار چاہتے ہیں اور محبت ادائیگی کے لیے
شدہ ہے۔ لہٰذا اُسے بھی دل سے یہ دہرائی ہوئی بات کا خوف نکال کر اپنے لفظ اپنی محبت کے نام کر
گے۔ کیوں کہ محبت کبھی پرانی اور باسی نہیں ہوتی۔ لفظ کبھی میلے نہیں ہوتے اور اپنی محبت کے لیے ان کی
سدا بہار رہتی ہے۔ لہٰذا لکھاری کو اپنی محبت کا اظہار کھل کر کر دینا چاہیے اور اپنی شریک حیات کو اپنی زندگی
واپس لے آنا چاہیے۔'' شہریار نے مجھ پر نظر ڈالی ''اور تم کیا کہتے ہو عبداللہ۔'' میں شہریار سے ایسے کی
کی توقع بالکل نہیں کر رہا تھا۔ لیکن اب سب کی توجہ میری جانب مبذول ہوچکی تھی اور خلاصی ناممکن تھی۔
لگتا ہے دھانی ٹھیک کہہ رہی ہیں۔ کیوں کہ ہماری زندگی میں بعض رشتے ایسے بھی ہوتے ہیں جو اپنی طبعی
کے ساتھ دنیا میں وارد ہوتے ہیں۔ اور ہمیں اسی مدت کے اندر ہی ان رشتوں کو برتنا پڑتا ہے۔ ورنہ مد
ہوجانے کے بعد وہ جذبے بھی سرد پڑ جاتے ہیں، جو ان رشتوں کی بنیاد اور ان کی رُوح کا باعث
ہیں۔ بلکہ کبھی کبھی تو مجھے ایسا لگتا ہے کہ خون کے رشتوں کے علاوہ سب ہی رشتوں پر اس ایکس
ڈیٹ کی مہر پہلے ہی سے لگی ہوتی ہے۔''

کہانی کا انجام طے ہوچکا تھا۔ ہم سب گھر واپس پہنچے تو شب نصف سے زیادہ بیت چکی تھی۔ را
بھی شہریار خاموش رہا۔ ہم دونوں انیکسی میں اپنے کمروں کی جانب بڑھنے لگے وہ اچانک ہی کسی خیال
سے باہر آیا۔ ''آج تم نے ایک عجیب بات محسوس کی، یا پھر یہ میرا ہی واہمہ ہے......؟'' میں سمجھ گیا کہ
اشارہ کس جانب ہے۔ ''نہیں...... میں پہلے ہی یہ بات محسوس کر چکا ہوں۔ جس وقت تم اپنی کہانی کا پلا
چکے تھے، تب ہی میں نے تمہاری آنکھوں میں سوال پڑھ لیا تھا۔ شانی سوچتی ہے اور دھانی اس کی
لفظوں کا روپ دیتی ہے۔ شاہانہ کے پاس لفظ نہیں ہیں اور دھانی ہی اُس کی لغت ہے۔'' شہریار نے
نظروں سے میری جانب دیکھا ''اور پھر بھی تم کہتے ہو کہ تم کچھ اور ہو۔ اتنی باریک بات جسے جاننے
مہینہ بھر سے زیادہ لگ گیا، تم نے دو ملاقاتوں ہی میں کیسے پرکھ لی؟'' ''نہیں...... اس میں ایسی کوئی خا
نہیں۔ تمہاری جگہ اگر میں محبت کے اس سنہری جال میں جکڑا ہوتا تو شاید مجھے اس سے بھی زیادہ وقت
بات محسوس کرنے میں۔ دراصل کچھ جذبے ہمارے حواس پر آہنی پردے ڈال دیتے ہیں۔ اور پھر یہ کوئی

بھی تو نہیں...... ہم میں سے بہت سے لوگ کسی ایک میدان ہی میں یکتا ہوتے ہیں۔ کچھ لفظوں کو کاغذ پر
ارنے کا ہنر جانتے ہیں تو کچھ اُن کی ادائیگی میں کمال رکھتے ہیں۔ اور لکھاریوں کے ساتھ تو یہ مسئلہ بہت عام
ہے کہ بعض بہت بڑے لفظ گر ہونے کے باوجود گفتگو کے معاملے میں خاص ماہر نہیں ہوتے۔ اِسی طرح کچھ جو
سکتے ہیں، وہ بول نہیں سکتے۔ شاید شانی کا بھی یہی مسئلہ ہے۔'' شہریار کہیں اور کھویا ہوا تھا ''تو پھر وہ مجھ سے
فون پر گھنٹوں کیسے بات کر لیتی ہے۔ کیا یہ مسئلہ صرف تخلیے اور جلوت کا ہے؟'' میں نے غور سے شہریار کو
ھا۔ اُس کی زبان پر وہی بات آ کر رُک گئی تھی، جو خود کہیں دُور میرے ذہن کے کسی گوشے میں اٹکی ہوئی
۔ میں نے اپنا سوال دہرانے سے پہلے لفظ اپنے ذہن میں ترتیب دیئے۔ ''ٹھیک سے یاد کر کے بتاؤ، تم
طویل گفتگو کی نشستوں کا ذکر کر رہے ہو، وہ تمہاری یہاں آمد کے بعد سے لے کر کب تک اسی طرح جاری
جیسے تم انہیں محسوس کرنا چاہتے تھے۔'' اور کیا ان میں کبھی کوئی بدلاؤ بھی آیا تھا؟'' شہریار کو جیسے ایک جھٹکا سا
۔ غالباً وہ میرے سوال کی تہ تک پہنچ چکا تھا۔ ''اُس کی گفتگو اُس وقت تک مکمل تھی، جب تک میں نے شانی
آواز کی شناخت کا اعلان نہیں کیا۔ اور اس بات میں قریباً دو ہفتے کا عرصہ حائل تھا۔'' میں اور شہریار ایک ہی
ے پر پہنچ رہے تھے۔ شہریار کی شیخ صاحب کی کوٹھی میں آمد کا مقصد سب کے لیے ایک کھلا راز تھا اور دوسری
ب ہی سے شہریار کو وہ ٹیلی فون آنا شروع ہوا تھا۔ پھر شہریار اس آواز کے زیر و بم میں کھوتا چلا گیا۔ اس ملائم
از کے جادو، لفظوں کے خوب صورت چناؤ اور خیالات کے حسین زاویوں نے اُسے کچھ ایسا مدہوش کیا کہ وہ
آپ ہی بھول گیا۔ روز شام کو جب چائے پر شیخ صاحب کے گھرانے سے اُس کی ملاقات ہوتی تو وہ شانی
ر دھانی دونوں کے چہروں پر رات والی آواز کی تحریر پڑھنے کی کوشش کرتا۔ شہریار کی اُلجھن بھی اپنی جگہ بجا تھی
بول کہ دونوں بہنوں کی آواز بالکل ایک جیسی تھی۔ خود میں نے بھی جب شاہانہ اور دھانی سے اُس روز فون پر
ت کی تھی، دونوں آوازوں میں فرق تلاش نہیں کر پایا تھا۔ اور پھر شہریار کو شانی کی آنکھوں میں وہ گلابی معطر
ام دکھائی دے ہی گیا، لہٰذا یہ بات بھی واضح ہوگئی کہ شہریار کو فون کرنے والی شاہانہ ہی تھی۔ شہریار نے اُسی
ت وہ کسوٹی حل کر دی، جو پچھلے دو ہفتوں سے اُس کے دل میں اتھل پتھل مچا رہی تھی اور اُس نے فون کرنے
لی آواز کو شاہانہ کی آواز کے طور پر شناخت کر لیا۔ شانی نے بھی اپنی ہار تسلیم کر لی اور اس کے بعد شہریار کا شوق
قات بڑھتا ہی چلا گیا۔ ایک آدھ ملاقات کا موقع میسر بھی آیا، لیکن سماعتیں تشنہ ہی رہیں۔ ایک لفظ گر ایک
رے لفظ تراش سے کچھ لفظوں کی بھیک نہ پاسکا۔ پھر دھیرے دھیرے شہریار کو یہ بھی محسوس ہونے لگا کہ اب
ت کو زیادہ تر وہی بولتا ہے اور دوسری جانب سے شاہانہ صرف اس کے لفظ جوڑتی ہے۔ اب وہ پہلے کی طرح
ل کر شہریار سے نہ تو بحث کرتی تھی اور نہ ہی شہریار کے نئے افسانوں کے پلاٹ پر کوئی تبصرہ۔ لیکن شہریار
نے شروع میں اس تبدیلی پر کوئی خاص توجہ نہیں دی تاوقتیکہ اُس کی شاہانہ سے تنہائی میں دو ملاقاتیں نہیں
گئیں۔ پھر میں شیخ صاحب کے مہمان کے طور پر انیکسی میں شہریار کا ہم سایہ بن گیا اور اس کا زیادہ تر رات کا

وقت میرے ساتھ اپنی کہانیاں سناتے گزرنے لگا اور آج وہ لمحہ بھی آ ہی گیا، جب شہریار نے وہ بات محس
لی، جو شاید عام حالات میں اُسے بہت پہلے سمجھ آ جاتی۔ ہم دونوں کافی دیر خاموش کھڑے رہے۔ اچانک
فون کی گھنٹی نے ہم دونوں کے خیالات کی رَو توڑ دی۔ شہریار نے ہچکچا کر میری جانب دیکھا۔ میں نے اُ
دی ''سچ ہمیشہ اپنی جگہ قائم رہتا ہے اور ہم سے بہت نزدیک ہوتا ہے۔ یہ ہماری سوچ اور ہمارے اختیا
گئے راستے کا قصور ہوتا ہے کہ ہم اس سچ تک پہنچنے میں اتنی دیر لگا دیتے ہیں۔ شاید ہم جان بوجھ کر
کتراتے ہیں اور وہ راستہ اختیار کرتے ہیں، جو ہمیں سچ تک پہنچانے میں بہت دیر لگاتا ہے۔ لیکن میں
یہ اُمید رکھتا ہوں کہ تم اس سچ کا سامنا بہادری سے کروگے۔ جاؤ جا کر فون اُٹھاؤ۔ اب تم سے صبح
ہوگی۔'' میں شہریار کا شانہ تھپتھپاتے ہوئے آگے بڑھ گیا۔ صبح ہونے میں کم ہی وقت باقی رہ گیا تھا۔
بعد میں کچھ دیر تک بستر پر کروٹیں بدلتا رہا اور پھر صبح کے نہ جانے کس پہر میری آنکھ لگ گئی۔

پھر میری آنکھ فون کی گھنٹی سے ہی کھلی۔ دوسری جانب کوٹھی کا خانساماں تھا۔ اُس نے مجھے بتایا
مرتبہ پہلے بھی میز پر ناشتا لگا چکا ہے، لیکن جب خلافِ معمول میں اپنے وقت پر باہر نہیں نکلا تو اُسے
ہوئی۔ لہٰذا اُس نے میری طبیعت کا پوچھنے اور ناشتا لگانے کی اجازت طلب کرنے کے لیے فون کیا ہے
باہر نکلا تو شہریار پہلے ہی سے باہر کھلتی کھڑکیوں کے قریب کھڑا نہ جانے خلا میں کیا گھور رہا تھا۔ میرے
کی آہٹ سن کر وہ میری جانب پلٹا۔ ''تم نے ٹھیک کہا تھا عبداللہ۔ سچ ہمیشہ ہمارے آس پاس موجود
...... ہم خود ہی نہ جانے کہاں بھٹکتے رہتے ہیں۔ میرا سچ بھی میرے سامنے آ گیا ہے۔ مجھ سے شروع
کرنے والی شانی نہیں تھی۔ میں جن سنہرے خوابوں اور کومل جذبوں کے دھارے میں بہہ رہا تھا۔ انہیں
کی صورت دینے والی خواب گر کوئی اور نہیں، دھانی ہی تھی۔''

لفظ رُوٹھ جاتے ہیں

ہماری زندگی میں پیش آنے والے بعض حقائق ایسے بھی ہوتے ہیں، جن کا مکمل ادراک ہونے کے
باوجود ہم ان کے پیش آنے پر کچھ اس جھٹکے سے چونکتے ہیں، جیسے وہ حقیقت نہیں، کوئی انہونی ہو۔ ٹھیک اس
وقت میرا حال بھی کچھ ایسا ہی تھا۔ حالانکہ میرے ذہن کے کسی گوشے میں یہ بات گزشتہ شام ہی سے گردش کر
رہی تھی کہ شانی کی اس پہلوتہی اور خاموشی کے پیچھے کوئی ایسی ہی کہانی ہوگی، لیکن شہریار کی زبانی یہ بات سن کر
چند لمحے کے لیے میں گنگ سا رہ گیا۔ شہریار کی آنکھیں بتا رہی تھیں کہ وہ ساری رات سو نہیں پایا۔ میں تیزی
سے اُس کی جانب بڑھا ''تو کیا تم نے براہ راست شانی سے سوال کر ڈالا؟'' ''نہیں۔'' اس کی نوبت ہی نہیں
آئی۔ کل رات میری کہانی کا پلاٹ سن کر شاید شانی کو بھی اس حقیقت کا احساس ہو گیا تھا کہ میں رویوں کے
اس فرق کو پہچان گیا ہوں۔ وہ بہت شرمندہ تھی کہ یہ بات بتانے میں سے اتنی دیر لگی۔ حالانکہ اس کی اپنی نیت
بھی یہی تھی کہ وہ کسی مناسب موقع پر یہ راز کھول دے گی کہ شہریار کو شروع میں فون کرنے والی شانی نہیں دھانی
تھی۔ اور پھر جب شہریار کی پسند ان دونوں بہنوں پر کھلی تو شانی نے از خود فون پر دھانی کی جگہ لے لی۔ کیونکہ
دھانی کے بقول اُس کے شہریار کے لیے صرف بطور ایک اچھے لکھاری، پسندیدگی کے جذبات تھے۔ جب کہ
شانی پہلی نظر ہی میں شہریار کی شخصیت سے متاثر ہو چکی تھی۔ لیکن وہ دونوں ہی شاید یہ جان نہیں پائیں کہ شہریار
لفظوں کا اسیر ہے۔ اُس کی رگوں میں لفظ زندگی بن کر دوڑتے ہیں اور اس کی نسوں میں خون نہیں، لفظ رواں
ہے۔ اُس کے دل کو فتح کرنے والی وہ پہلی آواز، جس نے حسین لفظوں سے خیال کی سنہری وادیوں تک کا سفر
شہریار کی اُنگلی پکڑ کر طے کیا تھا، وہ صرف چند میٹھے بول نہیں تھے، وہ ایک فریکوئنسی تھی، جس نے اُن دونوں کو
لا کر ایک ایسے نکتے پر پہنچا دیا، جہاں سے ان کا وہ سفر شروع ہوتا تھا، جس کے راستے اور منزلیں سب ایک
تھے۔ لیکن دھانی کے جانے کے بعد شانی وہ فریکوئنسی برقرار نہیں رکھ سکی۔ وہ دو انسان، جن کے درمیان محبت
کے تار جڑتے ہیں، ان کے جذبوں کی لہریں ہوا کے دوش پر ضرور کسی ایک اور خاص مقام پر ملتی ہوں گی، جیسے
ریڈیو کی شارٹ ویو، میڈیم لہر کی فریکوئنسی نہیں پکڑ سکتی اور اسی طرح لانگ ویو، شارٹ ویو کی لہروں پر جڑے
سگنل نہیں پکڑ پاتی، حالانکہ یہ تینوں لہریں اسی فضا میں ہمہ وقت موجود رہتی ہیں لیکن ان کے دائرہ کار مختلف
ہیں۔ محبت کے جگنو بھی ہر لمحہ ہوا میں تیرتے اور جگمگاتے رہتے ہیں، لیکن کس جگنو کی چمک کس اندھیرے دل کا
چراغ بن کر اُس انسان کی زندگی میں اُجالے بھر دے گی، اس کا فیصلہ وہ فریکوئنسی کرتی ہے، جس کے ملنے بنا دنیا

کا ہر ملن ادھورا رہ جاتا ہے۔ ہاں البتہ شاید محبت کے یہ جگنو فضا میں تیرتے ہوئے اپنی جگہیں بعض مرتبہ
بھی دیتے ہیں۔ ایک لہر کی تہ سے نکل کر سفر کرتے ہوئے، دوسری لہر میں بھی جا ملتے ہیں۔ تب ہی ہمیں بعض
اوقات ایسے انسانوں سے بھی محبت ہو جاتی ہے، جو بظاہر پہلے ہمارے لیے بہت عام ہوتے ہیں اور ہمارے
آس پاس ہی برسوں سے موجود ہوتے ہیں، جی رہے ہوتے ہیں۔ مجھے ایک اور عجیب سی حقیقت کا ادراک
ہوا۔ ہمارا معاشرہ جہاں شادی کا بندھن ہی ملن کا باعث ہوتا ہے۔ جہاں اب بھی نوے فیصد رشتے بزرگوں
مرضی اور دو خاندانوں کے جوڑ کا سبب ہوتے ہیں۔ ایسی طے شدہ شادیوں میں جہاں دو ہم سفر زندگی میں
مرتبہ ایک دوسرے کو دیکھتے ہی کسی بندھن میں بندھ جانے کے بعد ہیں، وہاں محبت کے جگنوؤں کا سفر تیز
جاتا ہے۔ شاید دعاؤں کا ایندھن اس رفتار کو مہمیز دیتا ہے، لیکن شہریار کا ستا ہوا چہرہ اور اُس کی سرخ آنکھیں
رہی تھیں کہ اُس کے جذبوں کے جگنو اب بھی وہیں، اُسی لہر میں منجمد تھے، جہاں کبھی پہلی رات دھانی سے
کے تار جڑے تھے۔ میں نے غور سے شہریار کی آنکھوں میں بجھتے ہوئے چراغوں کو دیکھا ''پھر تم نے شانی
کیا کہا؟'' ''میں پھٹ پڑا کہ ان دو بہنوں نے میری زندگی کے ساتھ اتنا بڑا مذاق کیوں کیا۔ آخر میں نے
کا کیا بگاڑا تھا۔ وہ رو پڑی اور مجھ سے معافی ہی مانگتی رہی کہ اس کا مقصد مجھے دھوکا دینا کبھی نہیں تھا۔ اُسے
بھی گزشتہ رات ہوٹل میں کھانے کے دوران یہ احساس ہوا کہ میں دھانی کے خیالات اور باتوں سے پہلے
ہوا تھا اور شانی کے حسن سے بعد میں۔ جب کہ وہ اب تک یہی سمجھتی آ رہی تھی کہ میں پہلے ہی دن سے اُس
متاثر ہوں۔'' مجھے شہریار کی بات سن کر نہ جانے کیوں بہت دکھ ہوا۔ ''تمہیں اُسے ڈانٹنا نہیں چاہیے تھا۔ اُس
اندر بہت نازک ہے۔ تمہارے دیئے ہوئے لفظوں کے گھاؤ بھرتے بھرتے بھر بھی گئے تو اُن کے داغ
جگمگاتے رہیں گے۔'' شہریار اُلجھا ہوا تھا۔ ''میں بہت دباؤ میں تھا۔ خود پر قابو نہیں رکھ سکا اور بہت کچھ
گیا۔'' ''دباؤ ہی میں تو خود پر قابو رکھنے کی ضرورت ہوتی ہے۔ جانتے ہو اصل فاتح کون ہوتا ہے۔ وہ جو شدید
دباؤ میں بھی متانت کا دامن تھامے رکھے۔ انسان کی پہچان اُس کے غصے کے دوران ہی ہوتی ہے۔
حالات میں تو سبھی میٹھے ہوتے ہیں، ہمارے اندر کے زہر کو پرکھنے کا پیمانہ یہ دباؤ اور طیش ہی تو ہے۔ اور
چند لمحوں میں کچھ بت ایسے ٹوٹتے ہیں کہ پھر کبھی جڑ نہیں پاتے۔ اپنا بت سنبھالو شہریار۔'' وہ چڑ سا گیا ''تو تم
چاہتے ہو، میں ابھی جا کر اس سے معافی مانگ لوں۔'' ''نہیں۔ یہ دوسری غلطی ہوگی تمہاری۔ تم پہلے ہی
اشتعال میں آ کر پہلی غلطی کر چکے ہو۔ زندگی میں بعض غلط فہمیاں ایسی ہوتی ہیں، جو مناسب وقت کا تقاضا کر
ہیں، حالانکہ اس لمحے آپ کے دل و دماغ پر اپنی بھڑاس نکالنے کا جنون طاری ہوتا ہے اور بظاہر آپ کو ایسا
رہا ہوتا ہے کہ گنتی برابر کرنے کا یہ موقع اگر آپ کے ہاتھ سے نکل گیا تو شاید ہمیشہ کے لیے دیر ہو جائے گی
ہمارا جوابی حملہ خطا ہو جانے کے بعد انہی اَن کہے لفظوں کی صورت میں کانٹا بن کر خود ہمارے دل ہی میں
رہے گا۔ لہٰذا ہم اپنے دل کے بولی اپنی زبان سے زہر میں بجھے تیر بنا کر دوسرے کے دل میں پیوست کر د

ہیں۔ اور ایسا کرنے سے وقتی طور پر ہمیں کچھ سکون بھی ضرور مل جاتا ہے۔ لیکن کبھی تم نے سوچا ہے کہ ہم اس
سارے عمل میں حاصل کیا کرتے ہیں؟ صرف ایک خلش، کبھی نہ مٹنے والی کسک اور بدقسمتی سے غلط ثابت ہو
جانے کی صورت میں عمر بھر کے پچھتاوے، کیوں کہ دل کے شیشے میں آیا بال پھر کبھی نہیں نکلتا۔ اسے نکالنے کے
لیے وہ شیشہ چکنا چور کرنا پڑتا ہے یا پھر عمر بھر اسی بال کے ساتھ گزارا کرنا پڑتا ہے، کیوں کہ میں سمجھتا ہوں کہ
لفظ بھی واپس نہیں پلٹتے۔ اور ہم کچھ نہ کچھ ایسا ضرور کھو دیتے ہیں، جو پھر کبھی نہیں ملتا۔ اس لیے رویوں میں حد
درجہ احتیاط ہی زندگی کے ہر بندھن کی کامیابی کی ضمانت ہے۔'' شہریار خاموشی سے میری بات سنتا رہا۔ ''تم
ٹھیک کہتے ہو۔ ہمارے پاس کسی اجنبی کے ساتھ بھی کوئی دوسرا رشتہ نہ ہونے کے باوجود بردباری، احترام اور
اس کی اور اپنی عزت کا رشتہ تو ہر حال میں قائم رہتا ہے۔ اور دوستی محبت یا خون کے کسی رشتے کی صورت میں تو
یہ ذمہ داری دگنی ہو جاتی ہے۔ میں رات کو اپنے ذمہ داری نبھا نہیں پایا۔ میں اب تک اپنی ہر کہانی اور افسانے کو
ایک خوب صورت موڑ پر ختم کرنے کا عادی رہا ہوں لیکن خود میری اپنی کہانی کا اتنا بدصورت انجام ہوگا، یہ میں
نے کبھی سوچا تک نہ تھا۔'' ''تو پھر اب تم نے کیا سوچا ہے۔ کہانی ختم کرنے کا ایک اُصول یہ بھی ہوتا ہے کہ
لکھاری کو ہر کردار کے ساتھ انصاف کرنے کے بعد اُسے انجام تک پہنچانا ہوتا ہے۔'' شہریار نے لمبی سی آہ
بھری۔ ''لیکن میری کہانی کا انجام کچھ مختلف ہے۔ میں نے واپس جانے کا فیصلہ کر لیا ہے۔ اس افسانے کے ہر
کردار کو اپنا انجام خود طے کرنا ہوگا۔'' ہماری باتوں کے دوران ناشتا بالکل ٹھنڈا ہو چکا تھا۔ مستعد نوکر تھوڑی دیر
بعد چائے گرم کر کے میز پر سجاتے رہے تھے۔ میں دو گھونٹ بھر کے اسپتال کے لیے نکل پڑا۔

سلطان بابا کی حالت آج خلاف معمول کچھ بہتر نظر آ رہی تھی۔ مجھے دیکھ کر بولے ''آج اپنی کنڈی کہاں
لگا آئے ہو میاں۔ کبھی اس ذہن کو دو گھڑی آرام بھی کر لینے دیا کرو۔'' میں مسکرا کر بات ٹال گیا۔ جانے وہ
اتنی آسانی سے چہرے کی سلیٹ کیسے پڑھ لیتے تھے یا پھر میری جبیں کی شکنیں ہی کچھ ایسی تھیں کہ میرے اندر
برستی ہر بارش لفظوں کی صورت قطروں کی طرح ٹپکتی اور پھسلتی رہتی تھی۔ چہرہ آئینہ ہوتا ہے اور آئینے بوندوں کا
بوجھ زیادہ دیر سہار نہیں پاتے۔ انہیں بہنے کے لیے راستہ دینا ہی پڑتا ہے کہ بہاؤ کا واسطہ ہمیشہ سے شفافیت
سے ہے۔ سلطان بابا کو اب اسپتال سے خارج ہونے کی فکر ستا رہی تھی۔ میں نے وجہ پوچھی تو کہنے لگے کہ
یہاں سے بہت دُور ملک کے مغربی ساحل پر کوئی درگاہ ہے، جہاں ہمارا پہنچنا ضروری ہے۔ میں چونک سا گیا۔
ساحل اور درگاہ کا نام سن کر مجھے اچانک ہی اپنا شہر اور زہرا سے ساحل پر ہوئی پہلی ملاقات یاد آ گئی۔ میرا شہر
مشرقی ساحل پر تھا اور سلطان بابا مغربی ساحل کی جانب بسے ہوئے شہر کی طرف کوچ کرنے کا ارادہ رکھتے
تھے۔ انہی لہروں کے دوسری پار وہ بھی تو رہتی تھی۔ اس سمندر کے دو کناروں کی لہریں بھی تو آخر کبھی نہ کبھی ایک
دوسرے سے مل جاتی ہوں گی۔ جانے ہمارے مقدر کی لہریں کب آپس میں جڑ پائیں گی۔ میں نہ جانے کن
خیالات میں کھویا ہوا تھا کہ مجھے سلطان بابا کی آنکھ لگنے کی خبر بھی نہ ہو سکی۔ سہ پہر کو شیخ صاحب کا ڈرائیور مجھے

لینے آیا تو میں چاہتے ہوئے بھی اُسے واپس نہیں بھیج پایا۔ یہ سلاخیں اور قید خانے ہمیں کیا قید کر پاتے
گے، اصل قید تو مروت اور وضع داری کی ہوتی ہے۔ میں گھر پہنچا تو ہلکی بوندا باندی شروع ہو چکی تھی اور
موسم کے انہی تیوروں کے باعث آج بڑے والے شیشے کے کمرے میں چائے کا اہتمام کیا گیا تھا۔
سمیت شیخ صاحب کا سارا خاندان موجود تھا۔ برستے موسم کی مناسبت سے ہلکے پھلکے پکوان میز پر
جا رہے تھے۔ ہمارے اندر موجود ذائقوں کا تعلق باہر کے موسموں سے کیسے جڑ جاتا ہے، یہ میں کبھی سمجھ
پایا۔ دونوں بہنوں اور شہریار کے رویے میں تناؤ اُن کے بے حد چھپانے کے باوجود محسوس کیا جا سکتا تھ
صاحب نے بھی غور سے ان تینوں کی طرف دیکھا۔ ''کیوں بھئی، کوئی سرد جنگ چل رہی ہے کیا۔ تم تینو
آج بے حد خاموش ہو۔'' وہ تینوں ہی کچھ گڑبڑا سے گئے۔ شہریار جلدی سے بولا۔ ''ایسی تو کوئی بات نہیں
کبھی کبھی موسم کچھ بولنے کی اجازت ہی نہیں دیتا۔ لفظ خود بوندیں بن کر بہہ جاتے ہیں۔'' شیخ صاحب
زبان سے بے ساختہ داد نکلی۔ ''بھئی واہ، کیا بات کہی ہے۔ خاموشی کا حق ادا کر دیا۔ کبھی ہم بھی ان برستی بون
کے لیے کچھ ایسے ہی خیالات رکھتے تھے۔ عبداللہ میاں! تم ہی کچھ کہو، ان تینوں نے تو بارش سے شرط باندھ
ہے۔'' دھانی نے چونک کر باپ کو دیکھا۔ شیخ صاحب تناؤ محسوس کرنے کے باوجود بڑی خوب صورتی سے
ٹال گئے تھے۔ میں نے بات جوڑی ''مجھے ایسا لگتا ہے کہ کچھ موسم ایسے ہوتے ہیں جو ہم سے تمام گلے شکو
بھلا کر بس اس موسم میں ڈوب جانے کا تقاضا کرتے ہیں کہ موسم بھی تو ایک نعمت کی طرح ہوتا ہے۔ کفر
نعمت ہو تو موسم ہم سے رُوٹھ جاتے ہیں اور پھر بہت دنوں تک وہ ہمارے کمرے کی کھڑکی پر دستک نہیں د
بس دبے پاؤں خاموشی سے باہر ہی سے گزر جاتے ہیں۔'' اب چونکنے کی باری شاہانہ کی تھی، جب کہ
مخاطب شہریار تھا، جس نے ہلکے سے نظر اُٹھا کر میری جانب دیکھا اور پھر چائے کی پیالی سے اُٹھتی بھاپ
عقب میں گم ہو گیا۔ باہر گرتی بوندوں نے اب باقاعدہ جل تھل کی شکل اختیار کر لی تھی۔ باہر باغیچے میں ایک
جگہ پر پانی کا جوہڑ سا بنتا دیکھ کر میرا بہت شدت سے جی چاہا کہ میں کاغذ کی ایک چھوٹی سی کشتی بنا کر اس
میں چھوڑ آؤں اور پھر اپنے بچپن کی طرح ہاتھ کی چھتری بنا بنا کر، گھنٹوں خود بھیگ کر اس کشتی کو بھیگنے سے
رہوں، حتیٰ کہ شام ڈھل جائے اور سرمئی بادلوں کی چھپئی اندھیرے میں مما کہیں سے مجھے ڈھونڈتے ہ
وہاں نکل آئیں اور میں اُن کی اُنگلی تھامے ہوئے گھر کی جانب جاتے ہوئے بھی مڑ مڑ کر اپنا سفینہ ڈوبتے
کر، آنکھوں سے موٹے موٹے آنسو ٹپکاتا رہوں۔ اتنے برس گزر جانے کے بعد بھی میں آج تک یہ سمجھ
پایا تھا کہ ''کاغذی سفینوں'' کو تو ڈوب ہی جانا ہوتا ہے۔ پھر چاہے وہ سفینہ کسی نازک رشتے ہی کا کیوں نہ
جیسے اس وقت شانی اور شہریار کے رشتے کی کشتی ڈوب رہی تھی۔ ہم کسی کے کتنے بھی قریب کیوں نہ
جائیں، کسی کو کتنا ہی اپنا کیوں نہ مان لیں، اگر وہ رشتہ کاغذی ہو تو سفینے ڈوب ہی جاتے ہیں۔ لفظ رُوٹھ جا
ہیں۔ ایک لمحہ پہلے وہی انسان جس پر ہمارا کامل یقین، مان اور بھرم ہوتا ہے کہ بس وہی تو ہے جو ہمیں اس

نیا میں سب سے زیادہ جانتا اور سمجھتا ہے، اگلے لمحے ہی ہمارے لیے دنیا کا سب سے انجان شخص بن جاتا
ہے۔ میں آج تک یہ معمہ حل نہیں کر پایا تھا کہ بے انتہا اپنائیت کا وہ بھرم جھوٹا ہوتا ہے یا پھر اچانک ہی بیچ میں
راندازہو جانے والی اس بیگانگی اور اجنبیت کا یہ احساس سچا۔ ہم پل بھر ہی میں اتنے اپنے اور پھر ایک دم
پانک اتنے بیگانے کیسے ہو جاتے ہیں؟

چائے ختم کر کے میں اسپتال واپس جانے کے لیے اُٹھا تو شیخ صاحب بھی سلطان بابا کو دیکھنے میرے
تھی ہی چل پڑے۔ سلطان بابا ہمیں ساتھ آتا دیکھ کر مسکرائے۔ ''لگتا ہے میرے جوگی کا دل آپ کے ہاں
گیا ہے؟'' شیخ صاحب بھی ہنس پڑے۔ ''پتا نہیں، لیکن عبداللہ میاں کو دیکھ کر تو خود ہمارا بھی جوگ لینے کو جی
ہتا ہے۔'' وہ دونوں زمانے بھر کی باتیں کرتے رہے اور میں کمرے کی کھڑکی کے قریب پڑی کرسی پر بیٹھ کر
رستی بوندوں کا کھیل دیکھتا رہا۔ بارش میں سب ہی منظر یکساں ہو جاتے ہیں۔ رِم جھم گرتی وہ پھوار باہر
ساتھ ساتھ ہمارے اندر سے بھی بہت کچھ دھو ڈالتی ہے۔ گھر واپس پہنچنے پر مجھے شہریار انیکسی میں دکھائی
ں دیا۔ نوکر نے بتایا کہ ہمارے جانے کے کچھ دیر بعد وہ بھی دوسری گاڑی لے کر کہیں نکل گیا تھا۔ بارش
نے کا نام نہیں لے رہی تھی۔ نوکر نے کھانے کا پوچھا تو میں نے انکار کر دیا۔ عشاء کے بعد بھی میں بہت دیر
شہریار کا انتظار کرتا رہا، پر وہ نہ جانے کہاں رہ گیا تھا؟ انہی سوچوں میں گم میں باہر لان میں جلتی سفید گول
ں پر جگنوؤں کی یلغار جیسی بارش کی بوندیں گرتی دیکھ رہا تھا کہ اچانک فون کی گھنٹی نے مجھے جھنجھوڑ کر رکھ دیا۔
ور یہ فون شہریار کے لیے ہو گا، لیکن وہ تو ابھی واپس ہی نہیں پلٹا۔ گھنٹی بہت دیر تک بج کر چند لمحے کے لیے
ہو گئی اور پھر کچھ دیر بعد ہی پھر سے لگاتار بجنے لگی۔ میں نے شش و پنج کے عالم میں فون اُٹھا ہی لیا۔ دوسری
ب اُن دونوں سے کوئی ایک بولی۔ ''ہیلو......جی میں عبداللہ بول رہا ہوں۔ شہریار ابھی گھر واپس نہیں لوٹا۔''
ری جانب کچھ لمحے خاموشی چھائی رہی، پھر وہ بولی۔ ''میں دھانی بول رہی ہوں۔ مجھے دراصل آپ ہی سے
کرنی ہے۔'' میں نے اپنی حیرت کو ظاہر ہونے سے روکا۔ ''جی فرمائیے......'' وہ کچھ دیر تک اپنے لفظ
تی رہی۔ ''غالباً شہریار نے آپ کو پوری تفصیل سے آگاہ کر دیا ہو گا۔ مجھے اِسی سلسلے میں آپ کی کچھ مدد
یے......'' ''میں حاضر ہوں۔ اگر کسی بھی مدد کے قابل ہوں۔'' ''شکریہ......شانی نے مجھے بتایا تھا کہ آپ کچھ
نوں میں شہریار کے بہت اچھے دوست بن گئے ہیں۔ آپ انہیں سمجھاتے کیوں نہیں کہ وہ ہماری شروع میں
ئی نادانی کو بس ایک شرارت سمجھ کر معاف کر دیں۔ ہم دونوں میں سے کسی کا بھی مقصد انہیں دھوکا دینا نہیں
شانی کل رات سے بے حد پریشان ہے اور یقین جانیے اس سارے معاملے میں اگر کوئی قصوروار ہے بھی،
مں ہوں، لیکن سزا شاہانہ کو مل رہی ہے۔ مجھ سے مزید اُس کے آنسو نہیں دیکھے جاتے۔ آپ شہریار سے
ہ اگر سزا دینا اتنا ہی ضروری ہے تو میں حاضر ہوں۔ وہ چاہیں تو ساری عمر مجھ سے کوئی رابطہ بھی نہیں رکھیں،
شانی کو معاف کر دیں۔ وہ بہت معصوم ہے۔'' مجھے لگا کہ دھانی بولتے بولتے کچھ بھرا سی گئی ہے۔ میں نے

اُسے تسلی دی۔آپ مطمئن رہیں۔ میں ضرور اُسے سمجھانے کی کوشش کروں گا۔حالانکہ بات کچھ نازک جذ
کی ہے۔آپ نے شہریار سے خود بات کی ہے؟''''جی کل رات جب وہ شانی کو ڈانٹ رہے تھے۔ میں
بھی اُن سے بات کرنے کی کوشش کی تھی اور آج شام بھی چائے کے بعد میں نے انہیں فون کیا، لیکن شا
میری کوئی بات سننا ہی نہیں چاہتے۔ وہ میری اس خطا کو شرارت ماننے پر تیار ہی نہیں۔'' میں بے ساختہ کہ
''کیا وہ صرف ایک شرارت ہی تھی؟'' دوسری جانب گہری خاموشی چھا گئی۔ مجھے تاسف ہوا لیکن تیر کمان
چھوٹ چکا تھا اور اندھے تیر کی سب سے بڑی خطا یہی ہوتی ہے کہ اس کا نشانہ نامعلوم رہتا ہے۔ پھر بھی
نے تلافی کی کوشش کی ''معاف کیجیے گا، بعض مفہوم بات سے پہلے اور بہت سے نامناسب انداز میں مخاطب
پہنچ جاتے ہیں۔'' دوسری طرف سے اضطرابی کیفیت اور اُلجھی سانسوں پر قابو پانے کی آہٹ محسوس ہوئی۔
دھانی نے خود کو سنبھالا۔ ''خدا کرئے آپ جس نتیجے پر پہنچے ہیں، شہریار وہاں کبھی نہ پہنچیں۔ سچ یہی ہے
بات شرارت ہی سے شروع ہوئی تھی۔ میری بہن مجھے اپنی جان سے بھی زیادہ عزیز ہے اور وہ شہریار کی پسند
ہے۔اس حقیقت کے بعد باقی تمام باتیں بے معنی ہو جاتی ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ آپ کے پاس دلیل کی
طاقت ہے، جو شہریار کی تمام اُلجھنیں مٹا سکتی ہے۔ مجھے آپ کی جانب سے کسی پیش رفت کا انتظار رہے گا
بات ختم کر کے دھانی نے فون رکھ دیا۔ گویا میرے ذہن کے کسی گوشے میں پلنے والا خیال صرف میرا واہمہ
نہیں تھا۔ شاہانہ سے بہت پہلے دھانی شہریار کو اپنے من مندر میں بیٹھا چکی تھی، شاید اُسی وقت جب شہریا
اُس نے گیٹ پر خوش آمدید کہا ہوگا۔ لیکن شہریار نے جب اُس کی آواز کو شانی کی آواز کے طور پر شناخت کی
دھانی اپنے اندر چھناکے سے ٹوٹ کر کرچی کرچی ہونے والے جذبے کی آخری چیخ کو بھی کچھ اس خوبصو
سے چھپا گئی کہ اس کی ہم نفس اس کی واحد راز دار بہن، جو خود دھانی کا آئینہ تھی، اُسے بھی اس طوفان کے آ
اور پھر خاموشی سے گزر جانے کی خبر تک نہیں ہوئی۔ ایک بار پھر روپ کا ڈاکا پڑ گیا۔ یہ من موہنی صورتوں وا
ہی تو سب سے بڑے ڈاکو ہوتے ہیں، لیکن حیرت ہے دنیا کی کسی بھی تعزیرات میں اس ڈاکے کی کوئی سزا
نہیں۔ زیادہ نہ سہی پر کم از کم ان روپ والوں اور بے روپوں کے لیے علیحدہ علیحدہ جزیرے ہی مقرر کر
چاہیے تھے۔ تاکہ کبھی کسی بے روپ کا رستہ نہ کٹتا۔ انہی سوچوں میں ساری رات کٹ گئی۔ شہریار واپس
لوٹا۔ صبح ناشتے کی میز پر میں نے نوکر سے پوچھا تو پتا چلا کہ وہ پہلے ہی کہہ گیا تھا کہ اگر رات کو اُسے زیادہ د
گئی تو وہ اُسی دوست کے یہاں ٹھہر جائے گا، جہاں وہ جا رہا تھا۔ میں شہریار کی آمد سے مایوس ہو کر اسپتال
لیے نکلنے کا سوچ کر ابھی انیکسی کا باغیچہ پار کر رہی رہا تھا کہ سامنے سے آتی دھانی کو دیکھ کر میرے قدم جم
گئے۔ وہ اس وقت برسوں کی بیمار لگ رہی تھی۔ قریب آنے پر میں نے اُسے سلام کیا اور جواب دینے کے
وہ اچانک ہی اس اُلجھن کا شکار ہو گئی، جو کسی بھی فیصلے کے آخری لمحات میں کچھ پل کے لیے ہمارے قدم
سے دیتی ہے۔ آخر میں نے بات شروع کی۔ ''شہریار رات کو واپس نہیں لوٹا، لیکن آپ مطمئن رہیں۔ میں

ی ضرور اُس سے بات کروں گا۔'' ''جی میں جانتی ہوں۔ دراصل میں کچھ اور کہنا چاہ رہی تھی...... دراصل......
وہ...... '' اپنے لفظوں سے زیادہ وہ خود اُلجھی ہوئی لگ رہی تھی۔ اُس کی پلکیں جھک گئیں۔ ''کیا شہریار نے آپ
سے کوئی بات کی تھی؟ میرا مطلب ہے کیا وہ مجھ سے بہت زیادہ ناراض ہیں؟'' ''میں ناراضی سے زیادہ اسے
ایک بے نام اُلجھن کہوں گا۔ شہریار اُن لوگوں میں سے ہے، جن کے دل کی کنجی لفظ ہوتے ہیں۔ ان کے من
کے دروازے الفاظ کی چاہتوں سے کھلتے ہیں۔ آپ نے وہ سارے دروازے کھول ڈالے لیکن کسی اور کو اس
کے من میں دھکیل کر خود دل کے دروازے سے ہی واپس پلٹ گئیں۔ شہریار اس وقت دستک دینے والے اور
اندر آنے والے مہمان کے فرق کی اُلجھن کا شکار ہے۔ اُسے کچھ وقت دیں۔ وہ اس کش مکش سے ضرور باہر نکل
آئے گا۔'' دھانی کی جھکی پلکیں میری بات سن کر بہت دیر تک اُٹھ نہیں پائیں۔ پھر جب وہ بولی تو مجھے یوں لگا
کہ ساری کائنات اس کے اندر کے درد میں ڈوب ہی تو جائے گی۔ ''کوئی بھی مہمان دروازے پر دستک دے
کر خود واپس پلٹنا نہیں چاہتا۔ اور پھر یہ دستک تو زندگی میں شاید پہلی اور آخری بار ہی دی جاتی ہے۔ لیکن اگر
اندر سے میزبان کون؟'' پوچھنے کے بجائے کسی اور مہمان کا نام لے کر با آواز بلند صرف اُسی کو خوش آمدید کہے
تو کسی بھی وضع دار مہمان کو پلٹ ہی جانا چاہیے۔'' میں نے چونک کر اپنے سامنے سر جھکائے اس دھان پان سی
سانولی سلونی کو دیکھا۔ سچ ہے، ظرف کسی روپ کا محتاج نہیں ہوتا۔ میں نے اُسے مزید کھوجا۔ ''اندر بلانے
والے میزبان کو اپنی پہچان بھی تو کروائی جا سکتی تھی۔ کبھی کبھی اچانک نئے آ جانے والے مہمان بھی تو اُسی تحیر اور
خوشی کے ساتھ لبیک کہے جاتے ہیں۔'' اُس نے اپنی بھیگی نظر اُٹھائی۔ درد، شکوہ، قسمت سے گلہ اور اپنی بے بسی
کا افسوس۔ کیا کچھ نہیں تھا اُس ایک نظر میں...... ''نہیں...... کم از کم میرے معاملے میں یہ انہونی ناممکن تھی۔
میں بچپن سے ان سب چیزوں کی عادی ہو چکی ہوں۔ آپ نے ٹھیک کہا کہ شہریار کے من کی کنجی لفظ ہیں۔ لیکن
اُن کے دل کا راستہ بھی اُن کی نظر سے ہو کر ہی گزرتا ہے۔ تب ہی میرے لفظوں کی دستک کے باوجود انہیں باہر
وہی نظر آیا، جسے اُن کی نظر نے سراہا تھا۔ رنگ، روپ اور حسن کی طاقت سے کسے انکار ہے اور یقین جانیں
شانی کے لیے ایسی ایک دستک تو کیا، میری ہزار زندگیاں بھی قربان ہو جائیں تو یہ میرے لیے کسی اعزاز سے کم
نہیں۔ کیوں کہ ایسی بہن نصیب والوں ہی کو ملتی ہے۔ وہ بہت نازک ہے، بہت معصوم ہے۔ اور چاہے انجانے
ہی میں سہی، پر اب وہی شہریار کے دل کی مکیں ہے اور یہی اس کی خوشی ہے۔ اور میں اپنی بہن کی خوشی کے لیے
اپنی آخری سانس بھی گروی رکھ سکتی ہوں۔'' میں نے غور سے اُسے اپنے لرزتے وجود کو سنبھالنے کی کوشش
کرتے ہوئے دیکھا۔ ''یقیناً شاہانہ بھی آپ سے اتنی ہی محبت کرتی ہوں گی۔ کیوں کہ میں نے آپ دونوں کو
یک جان دو قالب پایا ہے۔ پھر آپ کو نہیں لگتا کہ آپ نے اپنی پہلی دستک اُن سے چھپا کر کوئی بے ایمانی کی
ہے؟'' ''نہیں میں نے ہی اُسے یہ سمجھایا تھا کہ اگر شہریار کا دل اُس کی جانب مائل ہے تو شانی کو بھی اپنے دل
سے رائے لینی چاہیے۔ اُس کا دل اگر شہریار کو محرم مانتا ہے تو پھر اُسے بھی قدم بڑھانے میں دیر نہیں کرنی

چاہیے اور شاہانہ نے یہی کیا۔ کیوں کہ وہ خود کہیں اندر سے شہریار کو اپنا مان چکی تھی۔'' دھانی کے کانپتے وجود
لرزش بڑھنے لگی۔ گویا معاملہ قربانی دینے کا ہے؟'' اُس نے شکوہ بھری نگاہ ڈالی۔ ''اگر یہ قربانی ہی ہے تو
قربانی میں اپنے جنم ہی سے دیتی چلی آ رہی ہوں۔ معاملہ اگر خوب صورت لفظوں ہی تک محدود ہوتا تو شہریار
پہلی نظر مجھ ہی پر پڑتی، لیکن مجھ جیسوں کو شاید خود کو مکمل کرنے کے لیے خوب صورت خیالات اور دانش
بیساکھی کی ضرورت پڑتی ہے۔ خوب صورت لوگوں کی زبان سے نکلا ہر لفظ خود حسین اور ہر خیال حسین تر ہو جا
ہے۔ میں کتابی دنیا میں رہنے والی لڑکی نہیں ہوں۔ نہ ہی میں نے کبھی کسی خصوصی سلوک کی توقع ہی کی ہے
ہاں، میرے اندر میرے اپنے تخیل کی دنیا ضرور آباد ہے۔ جانے اس بار میرا دل کیسے بھٹک گیا اور شہریار کے
دل کا دروازہ کھٹکھٹا بیٹھا۔ لیکن کیا کریں، دل پر زور بھی تو نہیں...... اور اس دل کو بھٹکانے میں بھی شہریار جیسے
ادیبوں اور شاعروں کا بہت بڑا ہاتھ ہوتا ہے۔ یہی ہمارے دل کی بجھی راکھ کو اپنے جادو بھرے لفظوں سے کرید
کر اس میں دبی چنگاریاں بھڑکاتے ہیں اور پھر ہمارا دل باغی ہو کر ہم سے بس ایک ہی سوال کرتا ہے کہ کیا
بدصورت لوگوں کو محبت کرنے کا حق نہیں ہوتا۔ کیا کم روپ والوں کا دل کچھ کم دھڑکتا ہے یا سادہ چہرے والوں
کے اندر کے جذبے بھی بے رنگ اور سادہ ہوتے ہیں۔ قدرت نے یہ کیسا نظام بنا رکھا ہے کہ روپ بانٹتے
وقت تو ترازو اُوپر نیچے ہو جاتا ہے لیکن جذبے، کسک اور خلش بانٹتے وقت پیمانہ یکساں رکھا جاتا ہے۔ کیوں
ہمارے اندر چاہنے اور چاہے جانے کی اس لازوال خواہش کا پیمانہ ہمارے رنگ و روپ کے مطابق کم یا
زیادہ نہیں رکھا گیا۔ اگر چاند اور ستارے توڑ کر لانے کے دعوے صرف روپ والوں کے لیے مخصوص ہیں تو
پھر ہم جیسوں کے لیے ایک اور فلک کیوں نہیں تخلیق کیا گیا، جہاں جگمگاتے تارے اور چاند نہ سہی چند اُدھ
جلے انگارے کچھ مدھم جگنو ہی ٹانک دیئے ہوتے، کیوں ہمارے فلک کے مقدر میں بھی ہمارے نصیب کی
طرح صرف سیاہی لکھ دی گئی......؟''

دھانی بولتے بولتے ہانپنے لگ گئی۔ شاید عمر بھر کا لاوا تھا، جو آج میرے سامنے بہہ نکلا۔ ایک آنسو دھانی
کی آنکھ سے ٹپکا اور اُس کی قدم بوسی کر گیا۔ پیچھے سے آہٹ بلند ہوئی شانی کسی ستون کی آڑ میں جانے کب
سے کھڑی ہماری ساری باتیں سن رہی تھی۔ دھانی کا رنگ اُسے دیکھ کر مزید پیلا پڑ گیا۔ شانی اپنی بہن کی جانب
لپکی اور پھر اگلے ہی لمحے دونوں بہنیں ایک دوسرے کو گلے لگا کر بلک بلک کر رو رہی تھیں۔ میری پلکیں بھی نم ہو
گئیں۔ مجھے یوں لگا جیسے آج پوری خدائی رو رہی ہے۔

تم بھول جاؤ گے

ان دو بہنوں کے لگاتار بہتے آنسو مجھ سے مزید برداشت نہیں ہو سکے۔ میں تو انہیں کوئی تسلی دینے کی
ت میں بھی نہیں تھا۔ بعض دھاگے کچھ اس طرح اُلجھ جاتے ہیں کہ انہیں سلجھانے کی ہر کوشش انہیں مزید
ھانے کا باعث بنتی چلی جاتی ہے۔ ایسا ہی کچھ جذبوں اور رشتوں کے معاملے میں بھی ہوتا ہے۔ ایسے میں
ں ان جذبوں، رشتوں اور گتھیوں کو اُسی طرح اُلجھے چھوڑ کر آگے بڑھ جانا پڑتا ہے۔ سو، میں بھی ان دونوں
یونہی اُلجھا چھوڑ کر آگے بڑھ گیا۔ زندگی میں کبھی کچھ سیدھا نہیں ہوتا۔ یہ ہم سب کے ساتھ مکمل بھید بھاؤ
ی ہے۔ شہریار، دھانی اور شاہانہ کی زندگی نے بھی اپنا خراج وصول کرنا شروع کر دیا تھا۔ کتنی حیرت کی بات
کہ دونوں بہنیں شہریار کا دل جیت کر بھی رو رہی تھیں۔ ایک اپنے لفظوں سے جیتی اور روپ سے ہاری تھی
دوسری روپ سے جیت کر بھی لفظوں سے شکست کھا گئی تھی۔ وہ دونوں ہی فاتح بھی تھیں اور شکست خوردہ
...... کچھ ایسا ہی حال محبت کی اس تکون کے تیسرے کردار شہریار کا بھی تھا۔ یہ محبت ہم لاچار انسانوں کے
تھ کیسے کیسے کھیل کھیلتی ہے۔ آج دھانی کی فریاد نے مجھے اندر تک لرزا کے رکھ دیا تھا۔ دنیا کا ہر انسان مرد
ت کی تخصیص کے بنا خود کو اپنے من کے آئینے میں حسین تر ہی دیکھتا ہے۔ شاید ہمارے ہمیشہ سے دو چہرے
تے ہیں۔ ایک وہ جو ظاہری دنیا کو نظر آتا ہے اور دوسرا وہ جو ہم ہر لمحہ خود اپنے من کے آئینے میں دیکھتے ہیں۔
میں سے بعض اپنے اندر لگے شیشے سے جھلکتے دوسرے چہرے کے اس قدر عادی ہو جاتے ہیں کہ پھر انہیں
ری دنیا کے آئینوں کی عادت ہی نہیں رہتی اور تب تک وہ خود کئی بار چونک جاتے ہیں، جب کبھی ان کا واسطہ
لگے کسی شیشے سے پڑتا ہے۔ کیوں کہ سامنے نظر آتے آئینے میں کھڑا شخص انہیں بالکل اجنبی نظر آتا ہے۔
ی ہم چونک کر کہتے ہیں ''ارے میری تصویر تو بالکل اچھی نہیں آتی......'' یا ''بھئی میں تو بالکل ہی 'فوٹو جینک'
ں ہوں، بعض زندہ تصویر کشی سے کترانے لگتے ہیں۔ تنہائی میں بار بار خود کو مختلف زاویوں سے شیشے میں دیکھ
اپنے آپ کو یقین دلانے کی کوشش کرتے ہیں کہ چاہے ہماری تصویر اچھی نہیں آتی، چاہے ہم ویڈیو میں
ے ہی بھدے کیوں نہ دکھائی دیتے ہوں، اصل میں تو ہم بہت دل کش ہیں۔ ہمیں ہمیشہ صرف وہی جملے یاد
جاتے ہیں جو کبھی کسی نے ہمارے سراپے کی تعریف میں کہے ہوتے ہیں۔ ہم وہی رنگ پہننا شروع کر دیتے
جو کسی کی رائے کے مطابق ہم پر جچتے ہیں۔ کچھ ایسا ہی برتاؤ ہماری تمام شخصیت کے بناؤ سنگھار کے ساتھ
ا ہو جاتا ہے۔ دراصل ہمیں پہلا دھوکا دینے والا کوئی اور نہیں خود ہمارے کمرے کا آئینہ ہوتا ہے جو ہماری

دائیں جانب نکلی مانگ کو سر کے بائیں جانب دکھاتا ہے۔ اور پھر کبھی کبھی دائیں بائیں کا یہ معمولی سا فرق ہمارے سر کی مانگ کی طرح ہمارے اندر لگے اور باہر کمرے کے آئینے کے درمیان ہمیشہ کے لیے ایک دراڑ ڈال دیتی ہے۔ مجھے اُس دن نہ جانے اپنے بچپن میں سنی اس معمولی شکل وصورت والی شہزادی کی کہانی بھی یاد آ رہی تھی جس نے اپنی سلطنت کے سبھی آئینے توڑ ڈالنے کا حکم دے دیا تھا۔ کاش ہماری دنیا کے سبھی بڑے آئینے بھی ٹوٹ جاتے اور ہم میں سے ہر ایک کے من کا آئینہ باہر کمرے میں لگ جاتا تو یہ دنیا کتنی خوبصورت ہو جاتی۔ کون جانے ہمارے بیچ کتنے ایسے دل جلے بھی ہوں جو آئینے توڑنے کی بجائے آنکھیں پھوڑنے کی آس دل میں رکھتے ہوں گے۔ اگر انسانی خوبصورتی کو ماپنے کا پیمانہ صرف یہ بے وفا نگاہیں ہی ہیں تو کاش ہم بے بصارت ہی ہوتے۔ میرا ذہن نہ جانے کن بھول بھلیوں میں اٹکا ہوا تھا۔ اندر ڈاکٹر سلطان بابا کے چند معائنے کر رہے تھے۔ اچانک میں شہریار کو سوجی ہوئی آنکھیں لیے اندر داخل ہوتے دیکھ کر حیرت زدہ سا رہ گیا کیوں کہ میرے لیے اس کی یہاں اسپتال میں آمد بالکل غیر متوقع تھی۔ وہ بہت تھکا ہوا لگ رہا تھا۔ میں جلدی سے اُس کی جانب بڑھا۔ ''تم کہاں چلے گئے تھے، سب ٹھیک تو ہے نا......؟'' ''ہاں بس ایک دوست کی طرف رُک گیا تھا رات کو۔ اب بھی وہیں سے آ رہا ہوں۔ پتا نہیں کیوں گھر جانے کو جی نہیں چاہ رہا۔ سوچا کچھ دیر تمہارے پاس ہی بیٹھ جاؤں۔ سلطان بابا اب کیسے ہیں؟'' ''وہ بہتر ہیں۔ لیکن تم یہ سب کیوں کر رہے ہو؟ وہ دونوں تمہارے اس رویے کی وجہ سے بہت پریشان ہیں۔ کس کو سزا دے رہے ہو۔ خود کو یا اُن دونوں کو......؟'' شہریار نے ایک لمبی سانس لے کر اپنا سر کرسی کی ٹیک سے ٹکا دیا۔ ''بہت اُلجھ گیا ہوں میں...... سمجھ نہیں آ رہا۔'' ''کیا سمجھ میں نہیں آ رہا۔ دل دروازے پر دستک دینے والی کو تم پہلے ہی واپس لوٹا چکے ہو۔ جو دل کے اندر براجمان ہے، اُس کی تو قدر کرو۔'' شہریار نے چونک کر مجھے دیکھا۔ میرا جی چاہا کہ میں دو کے ساتھ ہوئی ساری بات اُسے بتا دوں لیکن کسی کا بھرم رکھنا مقصود تھا۔ لہٰذا اختصار کے ساتھ ان دونوں بہنوں کی پریشانی بیان کر دی۔ لیکن میں یہ بھی جانتا تھا کہ شہریار کی اُلجھن کم ہونے کے بجائے مزید بڑھ جائے گی اور پھر میں اس سے کس رویے کی اُمید کر رہا تھا۔ خود میں بھی تو کسی مہ رُخ کی ایک اُچٹتی نظر کا شکار ہو کر سب کچھ بھلا بیٹھا تھا۔ کہیں میں بھی صرف زہرا کے روپ ہی کا تو گھائل نہیں تھا؟ اگر زہرا بھی عام شکل صورت کی کوئی سیدھی سادی سی لڑکی ہوتی تو کیا تب بھی میں اسی طرح اپنا چین وقرار لٹا بیٹھتا، خود میں بھی کسی کی گہری، کالی جھیل جیسی آنکھوں، گلابی عارض اور گالوں میں پڑنے والے گڑھوں کے قریب جا کر ڈوبا۔ خود میری منزل بھی تو کسی کے پنکھڑی لبوں کے قریب کا تل تھا اور خود میرا راستہ بھی تو کسی کی صراحی دار گردن کے خم سے ہو کر ہی گزرتا تھا۔ خود میرے خوابوں کی نیند بھی تو کسی کی آنکھوں پر گرتی زُلف نے اُڑا رکھی تھی۔ میں بھی تو کسی کی گھنیری پلکوں کے تپتے سائے تلے ہر دم جل رہا تھا۔ پھر مجھے شہریار سے کسی بھی گلے شکوے کا کیا حق تھا۔ شاید ہر گھائل، روپ کا گھائل ہوتا ہے۔ ہر جنوں کسی حسن کا اسیر ہے۔ ہر چاند کسی کی کلائی کا

اور سب تارے کسی کی اوڑھنی کا آنچل تھے۔ اگر ملزمان کی فہرست بنائی جاتی تو سب سے بڑا مجرم تو میں خود تھا۔

شہریار بہت دیر تک میرے ساتھ بیٹھا رہا۔ ڈاکٹر معائنے سے فارغ ہوئے تو سلطان بابا نے فوراً اُن کے سامنے دوبارہ اپنی ''رہائی'' کی درخواست پیش کر دی۔ ڈاکٹروں میں سے ایک ہنس کر بولا۔ ''کیوں بابا! کیا آپ کا یہاں ہمارے ساتھ دل نہیں لگتا؟'' سلطان بابا مسکرائے۔ ''جس نے یہاں دل لگا لیا، سمجھو وہ یہیں کا ہو گیا میاں...... آپ مجھے یہاں سے جانے دیں تو یہ وعدہ رہا کہ ہر ہفتے ہم خود یہاں حاضری دینے آ جایا کریں گے۔'' سبھی ڈاکٹر ہنستے ہوئے کمرے سے باہر نکل گئے۔ شہریار، سلطان بابا کے پاس جا بیٹھا۔ میری نظر سامنے دیوار پر لگے کیلنڈر پر پڑی۔ ہمیں کال گڑھ سے نکلے آج ٹھیک پندرہواں دن تھا۔ اچانک نہ جانے کیوں پل بھر ہی میں مجھے ایسا لگا کہ کیلنڈر میں بھرے رنگ غائب ہو گئے ہوں۔ تصویر رنگین سے صرف کالی اور سفید ہو کر رہ گئی۔ پھر میں نے ذرا غور کیا۔ نہیں کالا نہیں یہ تو نیلا اور شاید کچھ پیلا رنگ بھی تصویر میں باقی تھا۔ مطلب یہ کہ صرف سرخ اور سبز رنگ تصویر سے اُڑے تھے۔ میں نے گھبرا کر زور سے پلکیں جھپکیں جیسے کوئی پرانے کلر ٹی وی کے چلتے چلتے رنگ اُڑ جانے پر اُسے زور سے آس پاس سے تھپک کر، ہلا کر جھٹکے سے اُس کے رنگ واپس لانے کی کوشش کرتا ہے۔ یہ ایک لمحاتی اثر تھا اور دوسرے ہی لمحے میری بصارت کے رنگ واپس لوٹ چکے تھے۔ لیکن ٹھیک اُسی لمحے مجھے اپنی نسوں میں تیز مرچوں جیسی جلن اور چبھن دوڑتی ہوئی محسوس ہونے لگی۔ بے چینی اور جلن کا احساس اس قدر شدید اور اچانک تھا کہ میری آنکھوں سے پانی بہہ نکلا۔ میں نے جلدی سے قریب پڑے پانی کے جگ سے تین چار گلاس پانی بنا کسی وقفے کے حلق سے نیچے اُنڈیلے۔ شہریار دوسرے کمرے میں سلطان بابا سے باتیں کر رہا تھا۔ دونوں میری اس بگڑتی حالت سے ناواقف تھے۔ شاید یہ میرا وہم ہی ہو۔ لیکن نہ جانے کیوں مجھے ایک لمحے کے لیے ایسا محسوس ہوا جیسے میرے لبوں کے کنارے پر ہلکا سا کف جمع ہو کر تحلیل ہو گیا ہو۔ پتا نہیں یہ سب کیا تھا۔ لیکن چند لمحوں ہی میں اس احساس نے میری رُوح نچوڑ کر رکھ دی تھی۔ شکر ہے کہ جس وقت سلطان بابا نے مجھے آواز دی، تب تک میرا ہانپنا ختم ہو چکا تھا۔ ورنہ وہ خواہ مخواہ پریشان ہو جاتے۔ پھر بھی جب میں درمیانی راستے کا پردہ اُٹھا کر اُن کے بستر والے حصے تک پہنچا، تب تک وہ میرے چہرے پر کچھ پڑھ چکے تھے۔ ''کیا ہوا میاں! یہ ہلدی کہاں سے مل لائے ہو چہرے پر۔ رنگ کیوں زرد پڑ رہا ہے؟'' میں نے بات ٹالی۔ ''کچھ نہیں۔ شاید نیند نہ آنے کی وجہ سے کچھ بے چینی سی ہو رہی تھی۔ اب ٹھیک ہوں بابا۔'' وہ کچھ دیر تک غور سے میری جانب دیکھتے رہے۔ ''کبھی دو گھڑی آرام بھی کر لیا کرو۔ جنوں حد سے گزر جائے تو وحشت بن جاتا ہے۔'' میں چپ رہا۔ سہ پہر کو شیخ صاحب کا ڈرائیور آ گیا۔ میں نے شہریار سے کہا کہ وہ گھر چلا جائے۔ شیخ صاحب جانے کیا سوچتے ہوں گے۔ لیکن اُس نے ضد پکڑ لی کہ میں بھی کچھ دیر کے لیے اس کے ساتھ ہی چلوں۔ میں نے پردہ اُٹھا کر دیکھا سلطان بابا کی آنکھ لگ چکی تھی۔ ہم خاموشی سے دبے پاؤں کمرے سے نکل آئے۔

گھر میں داخل ہوتے ہی حسب توقع شیخ صاحب نے شہر یار پر سوالوں کی بوچھاڑ کر دی کہ وہ ٹھیک
ہے۔ کہیں اُن کی خدمت میں کوئی کمی تو نہیں آ گئی جو شہر یار یوں اُکتا کر دوست کے گھر چلا گیا تھا۔ شہر یار
بڑی مشکل سے انہیں یقین دلایا کہ اُسے تو بس اپنی کہانی کے ایک اہم موڑ کے لیے ماحول کی کچھ تبدیلی چا
تھی اور بس...... چائے کے دوران شانی اور دھانی نے بھی ہر ممکن کوشش کی کہ ماحول خوشگوار ہے۔ آج گز
روز جیسی پھوار تو نہیں پڑ رہی تھی لیکن آسمان پر آج سفید بادلوں کے بہت سے آوارہ ٹکڑے ''کوکلا چھپا
کھیل رہے تھے۔ آج دن بھی جمعرات کا تھا۔ مجھے یاد آیا کہ بچپن میں جب چھوٹی ماں (میری خالہ)
بادلوں کی کہانی سنایا کرتی تھی کہ یہ سارے بادل اللہ میاں کی بھیڑیں اور دنبے ہوتے ہیں جنہیں اللہ میاں
کے وقت نیلے آسمان پر کھیلنے کے لیے چھوڑ دیتے ہیں تو میرے ذہن میں اللہ میاں کا بہت ہی خوبصورت
تصور ابھرتا تھا۔ شہر یار آج بھی چپ سا تھا۔ دھانی نے غالباً شیخ صاحب کا دھیان بٹانے کے لیے اِدھر اُ
کی باتوں کا سلسلہ جوڑ رکھا تھا۔ شانی بھی بیچ میں ایک آدھ لقمہ دے رہی تھی۔ اچانک ہی دھانی مجھ سے پو
بیٹھی۔ ''عبداللہ! آپ بتائیں کہ آپ ایسے موسم کو کیسے انجوائے کرتے ہیں؟'' میرے ہونٹوں پر مسکراہٹ اُ
آئی۔ ان دو لڑکیوں کو شیخ صاحب کی کتنی فکر تھی۔ کیا سبھی بیٹیاں اپنے بابل کے لیے اِسی طرح گھلتی ہوں
''میرے ذہن میں تو ایسے موسم کے لیے بہت خصوصی اہتمام کے کئی طریقے آتے ہیں...... مثلاً ایسا شیشہ
بہت بڑا کمرہ ہو جس کی شفاف دیواروں سے پرے ہم بوندوں کا کھیل دیکھیں۔ برستے آسمان سے بھیگتی ز
تک کا ہر نظارہ ایک ہی فریم میں ہماری آنکھوں کے سامنے ہو۔ شیشے کے ہال میں ایک بہت بڑا سا پیانو
اور......'' شانی اچانک بولی اُٹھی۔ ''اور اس پیانو پر زیبا بیگم بیٹھیں گنگنا رہی ہوں 'کسی مہرباں نے آ کے میر
زندگی سجا دی'......'' شانی کی مثال اس قدر بے ساختہ اور عمدہ تھی کہ ہم سبھی زور سے ہنس پڑے۔ شیخ صاحب
بہت دیر تک اس بات کا لطف لیتے رہے۔ ماحول پل بھر میں ہی خوشگوار ہو گیا اور شانی اور دھانی کی کوشش
رائیگاں نہیں گئی۔ وہ رشتے کتنے خوش قسمت ہوتے ہیں جن کی پروا کرنے کے لیے لوگ موجود ہوتے ہیں
شاید رشتوں کا واسطہ ہی دل جوئی اور دل داری سے ہوتا ہے، ورنہ سارا جہاں اجنبی ٹھہرا۔ چائے کے بعد
صاحب سے اجازت لے کر واپس اسپتال جانے کے لیے پورچ تک پہنچا ہی تھا کہ شانی تیز تیز قدم اُٹھ
میرے پیچھے چلی آئی۔ ''عبداللہ......! میں اور دھانی دونوں ہی اپنے صبح کے برتاؤ پر بے حد شرمندہ ہیں
دراصل ہم دونوں ہی ایک دوسرے کے معاملے میں بہت جذباتی ہیں۔ اور میں اُس کی آنکھوں میں آنسو تو
ذرا سی نمی بھی برداشت نہیں کر سکتی۔ حالانکہ آپ کو یہ سن کر ہنسی آئے گی کہ جب تک امی ہمارے درمیان مو
تھیں، ہم ایک دوسرے سے دن میں تین چار بار ضرور لڑا کرتی تھیں لیکن ہمیشہ ان جھگڑوں کا خاتمہ بھی
ایک کے آنسوؤں پر ہی ہوتا تھا۔'' ''جی میں سمجھ سکتا ہوں۔ آپ دل پر کوئی بوجھ نہ لیں۔ جانے ان آنسوؤں
صفت کو عورتوں کے ساتھ ہی کیوں مخصوص کر دیا گیا ہے۔ میں تو یہ سمجھتا ہوں کہ ہم میں سے ہر ایک کو ضرور

پڑنے پر یہ خزانہ بہا دینا چاہیے کیوں کہ روتا ہوا انسان اُس لمحے بہت معصوم ہو جاتا ہے۔'' شانی کے چہرے پر
چھایا تکدر صاف ہو گیا۔ ''آپ ہر بات کا ایک نیا زاویہ اپنے اندر رکھتے ہیں۔ ویسے آپ کے کلیے کے مطابق تو
میں اور دھانی اس دنیا کے سب سے زیادہ معصوم فرد ہوں گے، کیوں کہ ہم دونوں تو بہت روتے ہیں۔ کبھی امی کو
یاد کر کے، کبھی پرانی باتوں پر، کبھی ڈیڈی کی کسی پریشانی پر اور کچھ نہ ملے تو اپنی چوڑیوں کے ٹوٹ جانے یا چھلوں
کے کھو جانے پر بھی...... کبھی اپنی پسند کے ایک جیسے دو جوڑوں میں سے کسی ایک کے کپڑے کا رنگ اُتر جانے پر
تو کبھی دل پسند سینڈل کی ہیل ٹوٹ جانے پر......! دھانی اور میرے پاس رونے کے بہانے کبھی بھی کم نہیں
رہے۔'' میں نے ہنس کر غور سے اُس زندہ دل لڑکی کو دیکھا۔ کہاں اُلجھا بیٹھی تھی محبت کی رنگین لیکن تیز دھار ڈور
میں خود کو۔ کیا وہ نہیں جانتی تھی کہ محبت کی یہ ڈور ہمارے جذبوں کی پتنگ کو اُونچا اور زیادہ اُونچا لے جانے کی
خواہش جگا کر ہمیں اس قدر غافل کر دیتی ہے کہ پھر ہمیں اس بات کی خبر ہی نہیں ہوتی کہ کب اور کس طرح یہ
قاتل ڈور ہمارے شہ رگ پر پھر جاتی ہے۔ ہم جب تک سنبھلتے ہیں، خون کا تیز فوارہ ہمیں پورے وجود تک بھگو
چکا ہوتا ہے۔ شانی دراصل مجھ سے یہ پوچھنے آئی تھی کہ کیا میں نے شہر یار تک اُن کی معذرت پہنچا دی تھی اور یہ
کہ ان دونوں نے شیخ صاحب کو پوری بات بتانے کا فیصلہ کر لیا تھا لیکن وہ دونوں چاہتی تھیں کہ میں شیخ صاحب
سے بات کروں۔ میں کچھ اُلجھ گیا۔ ''میں......؟ میرا مطلب ہے مجھے کوئی اعتراض نہیں ہے لیکن کیا آپ نہیں
سمجھتیں کہ یہ بہت ذاتی بات ہے، کہیں شیخ صاحب میری زبانی یہ سن کر......'' ''میں آپ کی بات سمجھ سکتی ہوں
لیکن یقین کریں کہ ڈیڈی آپ کے خیالات کی بے حد قدر کرتے ہیں۔ مجھے اور دھانی کو یقین ہے کہ وہ آپ کی
بات کو غلط نہیں لیں گے۔ ہم اپنی غلطی پر نادم ہیں۔ لیکن ڈیڈی سے چھپا کر ہم مزید ایک اور غلطی کے مرتکب ہو
رہے ہیں۔ آپ بھی سوچتے ہوں گے کہ آپ کو یہ کس امتحان میں ڈال دیا ہم نے۔'' شاہانہ کی سنہری جبیں پر اپنا
مدعا بیان کرتے کرتے پسینے کے چند ننھے قطرے اُبھر آئے تھے۔ کیا سبھی لڑکیاں ایک سی ہی ہوتی ہیں؟ میں
نے اُسے تسلی دی۔ ''آپ اطمینان رکھیے۔ میں اسے امتحان سے زیادہ سعادت سمجھتا ہوں۔ لیکن کیا آپ
دونوں کو نہیں لگتا کہ شیخ صاحب سے بات کرنے سے پہلے آپ دونوں کو شہر یار سے ایک بار کھل کر بات کر لینی
چاہیے......؟ دل کی گرہیں بہت مضبوطی سے بھی لگی ہوں تو اُن کا ملائم دھاگا آسانی سے کھل جاتا ہے۔ بعض
گرہیں وقت کے متقاضی ہوتے ہیں۔ پوری آنچ مانگتے ہیں۔ کبھی کبھی ذرا سی جلدی اور ہلکی آنچ ہی سے اُتار
لینے پر کچے رہ جاتے ہیں۔ اور یاد رہے کہ رشتوں کی یہ آنچ بس ایک بار ہی سلگائی جا سکتی ہے۔ دوسری مرتبہ
سب جلا کر رکھ دیتی ہے۔'' شاہانہ چپ چاپ سر جھکائے میری بات سنتی رہی۔ جذبوں اور رشتوں کی آنچ کی
بالکل ٹھیک اُس لمحے میں اس کے چمپئی سے کندن ہوتے گلابی چہرے پر بھی محسوس کر سکتا تھا۔
میں اسپتال پہنچا تو سلطان بابا کا چہرہ کسی تازہ پھول کی طرح کھل رہا تھا۔ پتا چلا کہ ڈاکٹروں نے اُن سے
کہہ دیا ہے کہ اگر اگلے اڑتالیس گھنٹوں میں کوئی پیچیدگی نظر نہ آئی تو انہیں جانے کی اجازت دے دی جائے

گی۔ مجھے اس لمحے وہ بالکل ایک چھوٹے بچے کی طرح معصوم دکھائی دیئے۔ انہوں نے رات کا کھانا بھی
رغبت سے کھایا۔ انسان کا من اندر سے شانت ہو تو پھر سبھی ہارمون شاید مکمل کام کرنے لگتے ہیں۔ انسان
اپنے اندر بھی بیک وقت نہ جانے کتنے جادو منتر چلتے رہتے ہیں۔ رات گئے میں گھر واپس پہنچا تو ایک عجیب
خاموشی نے مجھے مضطرب کر دیا۔ میں نے انیکسی میں جا کر شہریار کے کمرے کا دروازہ کھٹکھٹایا۔ شہریار اند
سے بولا۔ ''کم ان!'' دروازہ کھولتے ہی میری پہلی نظر شہریار کے سوٹ کیس پر پڑی جس میں وہ اپنا سامان
رکھ رہا تھا۔ ''تو تم نے واپسی کا فیصلہ کر لیا ہے......؟'' ''ہاں......! اور کوئی فیصلہ حتمی نہیں ہو پا رہا تھا۔'' ''تمہا
اس فیصلے کا شیخ صاحب کو پتا ہے؟'' ''نہیں فی الحال صرف اتنا ہی پتا ہے کہ میں اپنی کہانی پوری ہو جا
واپس گھر جا رہا ہوں۔ لیکن کون جانے کہ یہ کہانی اب کبھی پوری ہو گی بھی یا نہیں......؟'' میں نے چونک کر
کی جانب دیکھا۔ ''کیا تمہاری ان دونوں سے کوئی بات ہوئی؟'' ''ہاں......! دونوں ہی سے فرداً فرداً
ہوئی، آج شام کو۔'' اتنے میں نوکر نے دستک دے کر بتایا کی شیخ صاحب لاؤنج میں کافی پر میرا انتظار کر
ہیں۔ شہریار کے چہرے کے تاثرات بتا رہے تھے کہ شانی نے اُسے بھی یہ بتا دیا ہے کہ وہ مجھے شیخ صاحب
بات کرنے پر آمادہ کر چکی ہیں۔ میں نے جانے سے پہلے آخری مرتبہ شہریار سے پوچھا۔ ''تم کسی نتیجے
چکے ہو تو مجھے بھی بتا دو کہ شاید میں تمہارا مقدمہ ٹھیک طرح سے شیخ صاحب کے سامنے پیش کر پاؤں۔'' شہ
کے لبوں پر ایک اداس سی مسکراہٹ اُبھری۔ ''نتیجہ چاہے کچھ بھی ہو...... مجھے یقین ہے کہ تم ایک بہترین
کی طرح میرا مقدمہ لڑو گے۔ فی الحال میں دل اور دماغ کی اس جنگ میں پس رہا ہوں۔ تم جاؤ، انکل
انتظار کر رہے ہوں گے۔'' میں نوکر کے ساتھ لاؤنج پہنچا تو کافی کے مگ سجائے جا چکے تھے۔ ماحول پر
طاری تھی۔ دھانی نے کافی کپس میں اُنڈیل کر ہمارے حوالے کی اور خود کمرے سے باہر نکل گئی۔ شیخ صا
بھی شاید خود کو ذہنی طور پر کسی اہم بات کے لیے تیار کر چکے تھے۔ میں نے آسان لفظوں میں انہیں شہر
یہاں آنے سے لے کر دھانی کے فون اور پھر شانی کی پسند تک کا سارا ماجرا بیان کر دیا۔ وہ چپ چاپ
بات سنتے رہے اور جب میں بات ختم کر چکا تب بھی بہت دیر تک کمرے میں خاموشی طاری رہی۔ آنس
کی سرسراہٹیں بتا رہی تھیں کہ دونوں بہنیں پاس ہی کسی ملحقہ کمرے میں موجود ہیں۔ شیخ صاحب اپنا پائپ
چکے تھے۔ اور ان کے ماتھے پر بنتی شکنیں بھی دھوئیں کے اُن مرغولوں جیسی تھیں جو اس وقت اُن کے پائپ
نکل رہے تھے۔ بہت دیر بعد اُن کے لب کھلے۔ ''تو کیا شہریار اِسی لیے یہاں سے جا رہا ہے؟'' ''یہ بھی
وجہ ہے۔ اور میں سمجھتا ہوں کہ چند دن کا یہ وقفہ ان تینوں کو کسی ٹھیک فیصلے پر پہنچنے میں مدد دے گا۔'' شیخ صا
نے ایک لمبا سا ہنکارا ابھرا۔ میں جانتا تھا وہ اس وقت کسی شدید کشمکش کا شکار تھے۔ یہ ایک ایسی جنگ تھی
میں جیت اُن کی دو بیٹیوں میں کسی کی ہوتی، خود اُن کی اپنی ہار یقینی تھی۔ کیوں کہ یہ راز اب اُن پر بھی عیا
چکا تھا کہ شانی سے پہلے دھانی، شہریار کی کنڈی ہلا چکی تھی اور انجانے ہی میں سہی پر وہ بھی اس در کے

نظار میں شہریار کے دل کے باہر کھڑی رہی ہے۔ شیخ صاحب اُٹھ کر ٹہلنے لگے۔ ''شہریار کی اُلجھن اپنی جگہ بجا
ہے......لیکن میں یہ بھی جانتا ہوں کہ میری دونوں بیٹیاں ایک دوسرے کے لیے کسی بھی قربانی سے دریغ نہیں
کریں گی۔ شہریار اچھا لڑکا ہے اور میں اُس کی صاف گوئی سے بھی مزید متاثر ہوا ہوں۔ اُس سے بس اتنا کہنا
ہے کہ اس گھر کے دروازے اُس کے لیے ہمیشہ کھلے رہیں گے۔'' گویا شیخ صاحب نے فیصلے کا اختیار شہریار کو
سونپ دیا تھا۔ میں اُن سے اجازت لے کر واپس انیکسی پہنچا تو شہریار برآمدے ہی میں شیشے کی دیوار کے
قریب پڑی آرام کرسی پر بیٹھا نہ جانے کن سوچوں میں گم تھا۔ مجھے آتے دیکھ کر سنبھل گیا۔ ''آ گئے وکیل
صاحب! کہو کیا فیصلہ لے کر آئے ہو......؟'' ''تمہاری عدالت نے فیصلے کا اختیار بھی تم ہی پر چھوڑ دیا
ہے......شانی یا دھانی نام کی جو بھی بیڑی تمہیں پسند ہے، تمہیں اُسی کے ساتھ عمر قید سنا دی جائے گی۔'' شہریار
کے ہونٹوں پر عجیب سی مسکراہٹ اُبھر آئی۔ ''منصف کسی کو عمر قید کی سزا سنانے سے پہلے کبھی ان ہتھکڑیوں یا
بیڑیوں سے کیوں نہیں پوچھتا کہ کیا انہیں اس ملزم کا زیور بننا قبول بھی ہے یا نہیں؟'' میں نے چونک کر اُس کی
جانب دیکھا۔ اُس نے اپنی بات جاری رکھی۔ ''شام کو پہلے دھانی آئی تھی خود انیکسی میں، مجھے صرف یہ بتانے
کہ شانی کی خوشی اس کے لیے کیا اہمیت رکھتی ہے اور یہ درخواست کرنے کے لیے کہ میں اس ابتدائی ایک ہفتے
کی ظاہری بات بھلا کر اگر شانی کو خود اُس کی شخصیت کے تناظر میں دیکھوں تو شانی سے بہتر جیون ساتھی مجھے پوری
دنیا میں چراغ لے کر ڈھونڈنے سے بھی نہیں ملے گا۔ وہ اپنی بہن کی خوشی مانگنے آئی تھی۔'' ''تو تم نے کیا جواب
دیا؟'' ''مجھے جواب دینے کی مہلت ہی کہاں ملی۔ ابھی دھانی کو انیکسی سے نکلے دو لمحے بھی نہیں گزرے تھے کہ
شانی کا فون آ گیا اور کیسا ستم ہے کہ دوسری بہن نے بھی مجھ سے وہی مانگا جو اُس کے لیے پہلی بہن مانگ کر گئی
تھی۔'' ''کیا مطلب......! کیا شانی نے بھی......؟'' ''ہاں اُس نے بھی صرف یہی کہنے کے لیے فون کیا تھا کہ
دھانی کے لیے اپنی بہن کے آنسوؤں سے بڑھ کر اور کوئی شے نہیں۔ اور اب چونکہ وہ اپنی بہن کے دل میں چھپے
ارمان کو جان چکی ہے لہٰذا اُس کے لیے یہ ناممکن ہے کہ وہ اپنی بہن کے سپنوں کی راکھ پر اپنا محل قائم کر لے۔
اُس نے اپنے آپ کو میرے لئے سدا نامحرم رکھنے کا فیصلہ کر لیا ہے۔ وہ بھی مجھ سے اپنی آخری خواہش کے
طور پر دھانی کو اپنانے کا کہہ گئی ہے۔''

اچانک فون کی گھنٹی بجنے لگی۔ شہریار اسی طرح شیشے کے پار دیکھتا رہا۔ ''یہ تمہارے لیے ہوگا۔ دھانی نے
مجھے کہا تھا کہ وہ تم سے رات کو بات کرے گی۔'' میں نے اپنے کمرے میں جا کر فون اُٹھایا، دوسری جانب
دھانی ہی تھی۔ ''یہ آپ نے کیا کیا......کیا آپ یہ نہیں جانتی تھیں کہ آپ کی بہن کا خمیر بھی اُسی مٹی سے اُٹھا ہے
جس سے آپ کا جنم ہوا تھا۔ پھر بھی یہ جانتے ہوئے کہ شانی کبھی شہریار کو آپ کی شرط کے مطابق قبول نہیں
کرے گی، آپ نے کیوں یہ جوگ لے لیا؟'' دھانی کی آواز سے صاف لگ رہا تھا کہ وہ بہت دیر تک روتی
رہی ہے۔ ''بعض جوگ ازل سے ہماری قسمت میں لکھے ہوتے ہیں۔ میں شہریار کو پا بھی لیتی تو یہ اُن کے لیے

ادھوری خوشی ہوتی، کیوں کہ اُن کی آدھی خوشی شانی کی شخصیت میں پوشیدہ ہے اور کبھی کبھی ادھوری خوشی کم
سے زیادہ اذیت ناک ہوتی ہے۔ محبت اگر دو نقطوں کی صورت میں ہو تو کبھی نہ کبھی دائرہ بن کر مکمل ہو
ہے۔ لیکن اگر یہی محبت تکون کی صورت اختیار کر لے تو اس کے تین زاویے کبھی جڑ نہیں پاتے۔ شاید م
شانی کو منا ہی لوں۔ آپ نے ہمارے لیے جتنا کچھ کیا، میں شکریہ ادا کر کے اس کی اہمیت کم نہیں کرنا
آپ کو اگر وقت ملے تو شانی سے بات کیجیے گا، اُسے آپ کی باتیں جلد سمجھ آتی ہیں۔'' فون رکھ دینے ک
بھی میں بہت دیر تک گم صم بیٹھا رہا۔ جانے اس محبت کے اور کتنے روپ دیکھنا باقی تھے۔

اگلی صبح میں کمرے سے باہر نکلا تو شہریار کے جانے کی تمام تیاریاں مکمل تھیں۔ شہریار بہت بکھرا ہو
رہا تھا۔ کتنی عجیب بات تھی کہ دو انمول انسان اُسے ٹوٹ کر چاہتے تھے لیکن پھر بھی وہ خالی ہاتھ اس گھ
واپس جا رہا تھا۔ شیخ صاحب جیسا بڑے دل کا اور وضع دار انسان بھی میں نے کم ہی دیکھا تھا۔ اُن کے ما
ایک شکن بھی نہیں تھی کہ جس سے کوئی اُن کی آزردہ دلی کا اندازہ لگا سکے۔ انہوں نے حسبِ معمول ہنستے ہ
شہریار کا سامان اپنی گاڑی میں رکھوایا۔ شانی اور دھانی بھی بظاہر بڑھ چڑھ کر ہر کام میں حصہ لے رہی تھیں
اُن دونوں کی آنکھوں میں لکھی تحریر صاف بتا رہی تھی کہ ایک اور محبت کی کہانی بنا کسی انجام کے ختم ہو رہی
اس کہانی کے آخر میں بنا سوالیہ نشان ہمیشہ کے لیے اس کہانی کے ساتھ جڑا رہے گا۔ شہریار گاڑی میں بیٹھنے
پہلے آخری مرتبہ ہماری جانب مڑا۔ وقار نے اُس سے پوچھا۔ ''شہریار بھائی......! آپ پھر کب آئیں گے
ہم سب آپ کو بہت مس کریں گے۔'' وہ مسکرایا۔ ''میں جلد آؤں گا۔'' شانی کی آنکھیں بھیگنے لگیں۔ م
دھانی کو خود کو سمیٹتے ہوئے دیکھ کر لقمہ دیا۔ ''اِسے جلد آنا ہی پڑے گا، ورنہ پیانو پر بیٹھی گنگناتی زیبا بیگم کر
کہیں گی کہ 'کسی مہرباں نے آ کے میری زندگی سجا دی'۔'' سب ہنس پڑے۔ شہریار نے شانی اور دھانی پر
نظر ڈالی اور گاڑی میں بیٹھ گیا۔ گاڑی چل پڑی۔ جانے اس لمحے مجھے سانول کی زبانی سنا ایک صحرائی گیت
شدت سے کیوں یاد آیا جس میں محبوبہ اپنے بچھڑے ہوئے محبوب کو دہائی دیتی ہے کہ وہ جانتی ہے کہ ا
محبوب اُسے بھول جائے گا، چاہے وہ لاکھ قرآن پر ہاتھ رکھ کر اُسے یقین دلائے۔ پر وہ جانتی ہے کہ یہ
وقتی جواز ہے اور محبوبہ کی قسمت میں تو ازل سے جُدائی کی موت ہے کیوں کہ اُس کا محبوب اُسے بھول جا

تے کوں یاد ہوسی میں آکھیا سی
دل دار مٹھا توں بھل ویسیں
وَل وَل قرآن تے ہتھ نہ رکھ
نہ قسماں چا...... توں بھل ویسیں
کچھ سوچ سمجھ تے فیصلہ کر

نہ جوش دکھا توں بھل ویسیں
تیرے باجوں میں نئی جی سکدی
نہ ظلم کما...... توں بھل ویسیں
دلدار مٹھا...... توں بھل ویسیں

شالیمار

کبھی کبھی پیار کھو دینے کے بعد ہمارے لیے کسی انمول ہیرے کی شکل اختیار کر لیتا ہے۔ کھوئی ہوئی م
''کوہ نور'' بن جاتی ہے۔ کھویا ہوا پیار ''شالی مار'' بن جاتا ہے۔ دھانی اور شاہانہ کی چاہت بھی شالی مار بن
تھی۔ شہریار کے جانے کے بعد اگلے روز سلطان بابا بھی اسپتال سے فارغ ہو کر شیخ صاحب کے ہاں
آئے۔ اُن کا ارادہ جلد کوچ کرنے کا تھا لیکن ڈاکٹروں کی ہدایت اور شیخ صاحب کے اصرار پر نہ کر
ہوئے بھی ایک ہفتہ مزید بیت ہی گیا۔ اُب بظاہر اُن کی طبیعت پہلے سے بہت بہتر تھی لیکن میرے اندر کی
چینی اب رفتہ رفتہ کسی لاوے کی شکل اختیار کرنے لگی تھی۔ اور اب تو رنگوں کا میری بصارت سے کچھ لمحوں
لیے رُوٹھنا، ہر چوبیس گھنٹے میں ایک معمول کی شکل اختیار کرنے لگا تھا۔ لیکن سبھی رنگ نہیں رُوٹھتے تھے، بس
تھے جو کسی پرانی تصویر کی طرح درمیان سے غائب ہو جاتے تھے۔ اور یہ چند لمحے مجھ پر کس عذاب کی صور
بیتتے تھے، یہ بس میرا دل ہی جانتا تھا۔ کچھ دیر کے لیے تو مجھے لگتا تھا جیسے میری نسوں میں خون نہیں، گرم کو
سیال مادہ دوڑ رہا ہو۔ میری سانسیں کسی گرم بھٹی کی دھونکنی بن جاتی تھیں اور میں یوں ہانپنے لگتا تھا جیسے میلو
دُور سے دوڑتے ہوئے آیا ہوں۔ لیکن میں نے حتی الامکان کوشش کی کہ میری یہ حالت کسی پر ظاہر نہ ہو
کہ میں نہیں چاہتا تھا کہ میری وجہ سے سلطان بابا کو مزید دیر ہو۔ وہ پہلے ہی مشرقی ساحل پر بنی کسی مسجد کی
تک پہنچنے کے لیے کئی مرتبہ بے چینی کا اظہار کر چکے تھے۔ اب اگر ایسے میں، میں اپنی بگڑتی طبیعت کا رونا
کر بیٹھ جاتا تو وہ ضرور علاج کے مخمصے میں پڑ جاتے اور ہمیں نہ جانے مزید کتنے دن یہاں رُکنا پڑتا اور پھر
کیا تھا، میرے اندر تو جانے ایسے کتنے لاوے میری رُوح کو جھلسانے کے لیے ہر دم بہتے رہتے تھے۔ اور
خود ہی تھک کر سرد بھی ہو جاتے تھے۔ سوچا یہ تپش بھی دل کے سرد خانے کی دیواروں سے ٹکرا کر خود ہی برف
جائے گی۔

جس دن ہمیں شیخ صاحب کی کوٹھی سے رُخصت ہونا تھا، اُس روز بہت سے کالے بادل ہمیں الو
کہنے کے لیے آسمان پر جمع ہو چکے تھے۔ میں نے سلطان بابا سے سن رکھا تھا کہ ہم جس مشرقی ساحل کی جا
جا رہے تھے، وہاں بارشیں بہت برستی ہیں۔ شاید یہ گھنیرے بادل بھی اُسی دیس سے آئے ہوں۔ مہمان
راستوں سے ناآشنا ہوں تو میزبانوں کو انہیں لینے اُن کی بستی جانا ہی پڑتا ہے۔ ہمیں رُخصت کرنے کے
دھانی، شانی، وقار اور شیخ صاحب گیٹ تک آئے۔ پھر وہی الوداع، پھر وہی رگوں کے سرے تک پھیل جا
والی اُداسی۔ جب ہمیں اچھی طرح پتا ہوتا ہے کہ ہمیں ایک دن ہر رشتے، ہر جگہ، اس جہاں ہی سے رُخصت ہو
جانا ہے تو ہم اپنے دل کے دھاگوں کی گرہیں یہاں وہاں کیوں باندھتے پھرتے ہیں۔ سلطان بابا نے تینوں
بچوں کو فرداً فرداً سر پر ہاتھ رکھ کر دعا دی۔ سبھی کی آنکھیں نم تھیں۔ دھانی اُن سے نظر نہیں ملا پائی۔ وہ کچھ دیر
اُس کے پاس ٹھہر کر بولے۔ ''جن کے من کے آئینے اتنے اُجلے ہوں، اُن کے مقدر کبھی دھندلے نہیں
ہوتے۔ ہم جو کھو دیتے ہیں، قدرت اُس سے بہتر ہمارے لیے پہلے سے چن رکھتی ہے۔ بس اتنا یقین رکھنا۔''
دھانی رو پڑی۔ پھر شانی اور پھر شیخ صاحب بھی اپنی پلکیں پونچھتے نظر آئے۔ مجھے اسی لیے یہ الوداع سدا سے
کاٹ جاتے ہیں۔ شیخ صاحب بضد تھے کہ ہم اُن کی گاڑی مع ڈرائیور اپنے سفر کے پہلے حصے کے لیے استعمال
کریں لیکن سلطان بابا نے بس کے سفر کو ترجیح دی۔

بس نے ہمیں تقریباً چھتیس گھنٹے کے سفر کے بعد ایک دریا سے منسلک قصبے تک پہنچا دیا، جہاں سے اگلے
روز صبح ہوتے ہی ایک چھوٹے سے اسٹیمر نے ہمیں پہلے سمندر کی ایک بڑی شاخ اور پھر کھلے سمندر میں پہنچا
دیا۔ میرا شہر اسی سمندر کے مغربی ساحل پر واقع تھا۔ میں اسٹیمر کے عرشے سے ٹکرانے والی لہروں کو دیکھ کر سوچتا
رہا کہ جانے ان میں وہ کون سی لہر ہوگی جو اس ساحل کو چھو کر آئی ہوگی جس سے ذرا پرے میرے دل کے
ساحلوں کی حق دار رہتی ہے۔ پھر اچانک میرے من میں خیال آیا کہ ہو سکتا ہے ان میں کوئی ایسی لہر بھی جو اس
ماہ رُخ کے نازک پاؤں چھو کر آئی ہو۔ زہرا کو بھی تو ساحل کی گیلی ریت پر ننگے پاؤں چلنا بہت پسند تھا۔ ضرور
یہ جھاگ اُڑاتی، مسکراتی اور شریری ہنسی ہنستی ہوئی بے باک لہریں اس لالہ رُخ کی قدم بوسی کر کے ہی مجھ تک
پہنچی ہوں گی۔ میں نے کہیں پڑھا تھا کہ دل کے دریا، سمندر سے بھی گہرے ہوتے ہیں۔ ''دل دریا، سمندروں
ڈونگے۔'' لیکن زہرا کی یاد نے پل بھر میں میری آنکھوں میں نمکین پانی بھر دیا تھا۔ وہ مجھے اس بات کا احساس
دلا رہا تھا کہ میرے دل کا دریا کب سے سمندر میں تبدیل ہو چکا ہے ورنہ اتنا نمکین پانی میری آنکھوں کو ہر لمحہ
جلانے کے لیے کہاں سے آتا۔ میری پتلیوں کا یہ وضو تو شاید ازل سے جاری و ساری تھا۔ تقریباً ڈیڑھ دن کے
سفر کے بعد اسٹیمر نے ہمیں ایک کٹے پھٹے ساحل پر اُتار دیا جہاں کھڑی مخصوص اُونٹ گاڑیوں پر ہمارے سفر کا
آخری حصہ طے ہونا تھا۔ شام ڈھلے جب ڈوبتے سورج کی کرنوں کا سونا پورے سمندر کو ایک سنہری قالین میں
تبدیل کر رہا تھا۔ میں اور سلطان بابا اپنی منزل پر پہنچ ہی گئے۔ ایک چھوٹی سی مسجد جو سمندر کی لہروں سے ٹکراتی
پہاڑی کی چوٹی پر بنی ہوئی تھی۔ پیش امام کا نام مرتضیٰ تھا، جو ہمارے استقبال کے لیے مسجد کے دروازے کے باہر
ہی کھڑے تھے۔ اُن کا گھر پہاڑی کے عقب میں واقع چھوٹی سی بستی میں تھا اور اُن کا چھوٹا بیٹا جس کی عمر قریباً
نو دس برس ہوگی، ہمیں پہاڑی ٹیلے کی جانب بڑھتا دیکھ کر پہلے ہی دوڑتا ہوا اپنے بابا کے پاس جا کر ہمارے
آنے کی منادی کر چکا تھا۔ جب مرتضیٰ صاحب ہم سے مل رہے تھے تو وہ اُن کے عقب میں کھڑا اپنی حیران
آنکھوں سے ہمیں دیکھ رہا تھا۔ سلطان بابا نے اُسے پکارا تو وہ جلدی سے اپنے بابا کی اوٹ میں چھپ گیا۔

اُس کا نام اشرف المرتضیٰ تھا۔ جانے دنیا کے سبھی بچوں کی رُوحیں ایک سی کیوں ہوتی ہیں۔ صاف، شفاف، ملائم، شرمیلی اور لجیلی سی............ ہم تمام عمر اپنے بچپن والی رُوح کی شفافیت کو اپنے اندر قائم کیوں نہیں پاتے؟

مرتضیٰ صاحب نے سلطان بابا کو حجرے میں چلنے کی دعوت دی اور میں نے بھی کچی اینٹوں والے صحن میں اُن کے پیچھے قدم بڑھائے ہی تھے کہ ایک بار پھر وہی بصارت سے رنگ نچوڑ لینے والا دورہ میری نسوں میں آگ بھر گیا۔ ایک چنگاری سی میرے لہو میں دوڑی اور میں ایک لمحے کے لیے ڈگمگا سا گیا۔ مرتضیٰ صاحب جلدی سے میری جانب بڑھے۔ ''کیوں نوجوان! سب ٹھیک تو ہے نا............'' میں نے بڑی مشکل سے سلگتی سانسوں پر قابو پایا۔ ''جی.........! میں ٹھیک ہوں۔ بس شاید لمبے سفر کی تھکن ہے۔ کچھ دیر آرام کروں گا تو سنبھل جاؤں گا۔'' سلطان بابا نے غور سے میری جانب دیکھا لیکن چپ رہے۔ کچھ ہی دیر میں مرتضیٰ صاحب نے خود ہی عشاء کی اذان بھی دے دی اور ساحلی بستی سے دس بارہ مکین نماز کے لیے جمع ہوتے گئے۔ سبھی اپنے حلیے سے مچھیرے لگ رہے تھے۔ مرتضیٰ صاحب کے بے حد اصرار کے باوجود سلطان بابا نے جماعت پڑھوانے کی ذمہ داری مرتضیٰ صاحب ہی کو سونپ دی اور ہم نے اس ساحلی مسجد میں عشاء کی باجماعت نماز ادا کی۔ نماز کے بعد سبھی نمازیوں نے فرداً فرداً سلطان بابا اور مجھے خوش آمدید کہا۔ رات کا کھانا مرتضیٰ صاحب کے گھر سے ہی آچکا تھا اور اشرف المرتضیٰ جواب دھیرے دھیرے ہم سے مانوس ہوتا جا رہا تھا، ایک جانب شرمایا سا بیٹھا، اپنے بابا کو دستر خوان پر چاول اور خشک مچھلی کے نمکین قتلے لکڑی کی پلیٹوں میں سجاتے ہوئے دیکھ رہا تھا۔ مرتضیٰ صاحب نے ہمیں کھانے کے دوران بتایا کہ یہاں کی آب و ہوا میں شدید سلین نمک کے مخصوص ذرات کی موجودگی کی وجہ سے لوہے، تانبے یا سلور کا کوئی بھی برتن استعمال نہیں کیا جاتا کیوں کہ وہ ہفتوں ہی میں زنگ آلود ہو کر گل جاتا ہے۔ لہٰذا یہاں کی تعمیر میں بھی زیادہ تر اسی مخصوص لکڑی کا استعمال کیا جاتا ہے جس سے بنے برتنوں میں ہم کھانا کھا رہے تھے۔ سمندر کی تیز ہوا حجرے کی بناش کھڑکیوں اور روشن دانوں سے پار ہوتے ہوئے ایک عجیب سا ساز بجا رہی تھی جیسے کوئی ماؤتھ آرگن ہونٹوں سے لگائے ہوئے ہو۔ کچھ دیر بعد مرتضیٰ صاحب اپنے بیٹے سمیت رُخصت ہو گئے۔ سلطان بابا کچھ دیر ستانے کی غرض سے لیٹ گئے اور میں خاموشی سے حجرے سے باہر نکل آیا۔ باہر میرے سبھی دوست تارے گہرے نیلے آسمان پر اپنی محفل سجا چکے تھے۔ وہ مجھے دیکھ کر مسکائے۔ میں نے اُن میں سے سب سے روشن اور چمکتے تارے سے زہرا کا پوچھا۔ ''کیسی ہے وہ..........؟'' تارے نے سمندر کی مغربی سمت جھانکا اور ہنس کر بولا۔ ''وہ بھی تمہاری طرح اداس ہے اور اپنے گھر کی وسیع چھت پر ایک آرام کرسی ڈالے ہم سے تمہاری باتیں کر رہی ہے۔ تمہارا پتا پوچھ رہی ہے۔'' جانے کیوں اس لمحے مجھے ان ستاروں کی قسمت پر رشک آیا۔ وہ آسمان کے چھت پر لٹکے پوری دنیا میں جب چاہیں، جسے چاہیں دیکھ سکتے تھے۔ کاش میں بھی

آسمان کا ایک تارا ہوتا، بہت چمک دار نہ سہی میلا اور مدھم ہی سہی، ایک آوارہ تارا.............. نصف رات بیت چکی تھی۔ میں نے پہاڑی ٹیلے سے اُٹھنے کا ارادہ کیا اور ٹھیک اُسی لمحے مجھے یوں محسوس ہوا کہ جیسے میں نے کسی بڑی گاڑی کے انجن کی آواز سنی ہے۔ میں نے اندھیرے میں آنکھیں پھاڑ کر دیکھنے کی کوشش کی۔ ہاں یہی جس ٹیلے کی چوٹی پر میں بیٹھا ہوا تھا، اُس سے کچھ فاصلے پر درمیان کی ایک تنگ گھاٹی سے متصل ایک اور ٹیلے کی چوٹی بھی تھی اور کسی گاڑی کی بیک لائٹس روشن ہو کر دھیرے دھیرے اندھیرے میں غائب ہو گئیں۔ مطلب یہ کہ گاڑی پہلے ہی سے وہاں پارک تھی اور اب واپس جا رہی تھی۔ اس ویرانے میں اتنی رات گئے یہ کون تھا۔ میں نے اپنا سر جھٹکا۔ ''ہوگا کوئی میری طرح رات، تنہائی، سمندر اور تاروں سے بات کرنے والا.....''

فجر کے بعد اگلی صبح میری آنکھ لگی تو پھر اُٹھتے اُٹھتے بہت دیر ہو گئی۔ سلطان بابا نے بھی جانے کیوں سورج نکلنے سے پہلے حسبِ معمول مجھے نہیں جگایا اور پھر جب میری آنکھ کھلی تو اپنے اردگرد سلطان بابا، مرتضیٰ صاحب، اشرف اور ایک انجان شخص کو پریشان سا بیٹھا دیکھ کر میں جلدی سے اُٹھ بیٹھا۔ میرے سر میں درد کی ایک شدید ٹیس اُٹھی۔ سلطان بابا نے جلدی سے مجھ سے پوچھا۔ ''اب کیسی طبیعت ہے میاں..........؟'' میں نے حیرت سے انہیں دیکھا۔ ''مجھے کیا ہوا۔ میں تو ٹھیک ٹھاک ہوں۔ بس ذرا سر میں درد ہے۔ شاید رات کو نیند نہ آنے کی وجہ سے۔'' ان سب لوگوں نے ایک دوسرے کو عجیب سی نظروں سے دیکھا۔ انجان شخص نے میری نبض تھامی۔ ''ایسے دورے کب سے پڑ رہے ہیں آپ کو.........؟'' میں نے چونک کر سلطان بابا کی طرف دیکھا۔ انہوں نے گہری سی سانس لی۔ ''فجر کی نماز پڑھ کر جب تم کمرے میں لوٹ رہے تھے تو اچانک چکرا کر کمرے کی چوکھٹ ہی پر گر گئے تھے، تمہاری سانس بے قابو ہونے لگی تھی اور شاید ہونٹوں کے کناروں سے کف بھی بہنے لگا تھا۔ مرتضیٰ صاحب نے فوراً اپنی بستی کے حکیم ریاض السلام صاحب کو بلوا لیا اور تب سے ہم سب تمہارے سرہانے ہی بیٹھے ہیں۔ حکیم صاحب کی تمہارے حلق میں اُنڈیلی گئی دوا کا اثر ہوا تو سہی، پر بہت دیر سے۔'' میں حیرت سے منہ کھولے سلطان بابا کی زبانی یہ ساری رُوداد سن رہا تھا۔ مجھے بالکل بھی یاد نہیں تھا کہ میں صبح دروازے کی چوکھٹ پر ہی گر گیا تھا۔ یہاں کمرے میں آنے تک کی تمام جزئیات میرے ذہن کی سلیٹ پر بالکل واضح تھیں لیکن اس کے بعد سب کورا تھا۔ میں نے بادل نخواستہ حکیم صاحب کو گزشتہ چند روز سے اپنے اندر ہونے والی آتشی جنگ کے بارے میں بتایا اور یہ بھی کہ دن میں دو چار مرتبہ چند لمحوں کے لیے میری بصارت بے رنگ بھی ہونے لگی تھی۔ حکیم صاحب پریشانی سے میری بات سنتے رہے اور پھر انہوں نے غور سے میری جانب دیکھا۔ ''ایک بات بتائیے.......... ماضی قریب میں آپ کے ساتھ کسی جانور کے کاٹنے یا پنجے گوشت تک پیوست ہو جانے کا واقعہ تو پیش نہیں آیا؟ خاص طور پر کسی کتے سے کوئی مڈبھیڑ تو نہیں ہوئی آپ کی؟'' میں حکیم صاحب کی بات سن کر اُچھل ہی تو پڑا۔ میں نے انہیں مناسب الفاظ میں بتایا کہ کچھ عرصہ قبل ایسا واقعہ

ضرور پیش آیا تھا کہ میں کتوں کے جبڑے کی کاٹ سے تو کسی طور بچتا ہی رہا لیکن اُن کے پنجے میری جلد میں
بار پیوست ہوئے تھے۔ شاید دانت بھی اس دھینگا مشتی میں میرا ماس چھو گئے ہوں۔ پر میں نے انہیں یہ بھی
کہ اسی روز چند گھنٹوں کے اندر اندر مجھے مطلوبہ دوا ویکسین کی صورت میں انجیکٹ بھی کر دی گئی تھی کیون
میں فوجی چوکی کے مستند ڈاکٹر تک خوش قسمتی سے پہنچ گیا تھا۔ حکیم صاحب کچھ دیر سوچتے رہے اور پھر انہوں
مجھ سے پوچھا۔ ''کیا آپ پر جن کتوں نے حملہ کیا تھا، انہیں اگلے 72 گھنٹے یا پھر چند دن زیرِ معائنہ رکھا
تھا۔ اُن میں سے کسی کی موت تو واقع نہیں ہوئی تھی؟'' میں ایک بار پھر اُلجھ گیا۔ اب میں انہیں اپنی اس عجیب
غریب جنگ کے بارے میں کیا بتاتا جس میں میری اور مجھ پر حملہ آور فوج کے سبھی رُکن کتے ہی تھے اور بد قسم
سے سبھی کتوں نے اُسی میدان میں جان دے دی تھی۔ میں نے اپنا گلا صاف کیا اور دھیرے سے بو
''دراصل وہ تین چار کتے تھے اور مجھ پر حملے کے دوران ہی انہیں مار دیا گیا تھا۔ لہٰذا معائنے کی نوبت ہی نہ
آئی۔'' حکیم صاحب نے تشویش بھرا لمبا سا ہنکارا ابھرا۔ ''اوہ..........!'' میں سمجھا۔'' سلطان بابا نے حکیم صاح
سے پوچھا'' کوئی تشویش کی بات تو نہیں ہے نا جناب..........؟'' حکیم صاحب کچھ ہچکچائے۔ ''مکمل بات
تفصیلی معائنے ہی سے پتا چل سکے گی.......... مختصراً اتنا بتا سکتا ہوں کہ بروقت دوا مل جانے کے باوجود
بلکہ خدانخواستہ کچھ زہریلے مادے ان کے خون میں پرورش پا چکے ہیں۔ میں اپنی سی کوشش تو ضرور کر رہا ہو
لیکن بہتر ہوگا کہ انہیں پہلی فرصت میں یہاں سے تیس میل دُور پہلے بڑے ساحلی شہر کے کسی اچھے ڈاکٹر کو
دکھا دیا جائے۔ میری حکمت میں جو اثر ہے، وہ سب فی سبیل اللہ آپ لوگوں کے لیے حاضر ہے لیکن زیادہ د
کھینچیے گا۔'' حکیم صاحب اپنی دوائی کی ایک اور خوراک پلانے کے بعد اور ہمارے ذہنوں میں اتھل پتھ
مچانے کے بعد اپنی دواؤں کی صندوقچی اُٹھا کر چلتے بنے۔ سلطان بابا اپنی ساری مصروفیات چھوڑ کر بس میری
میں پڑ چکے تھے۔ دوپہر تک تو وہ مجھ سے باقاعدہ کچھ خفا سے بھی تھے کہ میں نے انہیں پہلے یہ سب کیوں نہ
بتایا۔ مجبوراً ظہر کے بعد مجھے زبردستی اُن کے سامنے مسجد ہی میں صف پر چوکڑی مار کر بیٹھنا پڑ گیا۔ ''میں آ
سفر کھوٹا نہیں کرنا چاہتا تھا۔ بس اس لیے خاموش رہا۔ آپ بے فکر رہیں میں جلد تندرست ہو جاؤں گا۔
لیکن اگر آپ اسی طرح رُوٹھے رہے تو میں واقعی پورا مریض بن کر بستر پر پڑ جاؤں گا۔'' میرا حربہ کارگر رہا
وہ دھیرے سے مسکرا دیئے۔ ''بہت ضدی ہو۔ لیکن اب ہم یہاں سے تب ہی آگے سفر کریں گے۔ جب
بالکل ٹھیک ہو جاؤ گے۔'' اور پھر میرے ذہن میں بہت عرصے کا اٹکا سوال زبان سے پھسل ہی پڑا۔ ''ہم
منزلوں کی طرف سفر کرتے ہیں، اُن کا تعین آپ کیسے کرتے ہیں..........؟ مثلاً جبل پور، پھر کال گڑھ اور ا
مشرقی ساحل کی یہ مسجد...... سفر کا یہ نقشہ کون ترتیب دیتا ہے؟'' وہ کچھ دیر توقف کے بعد بولے۔''
اشارے مل جاتے ہیں۔ کبھی کسی حاجت مند دوست کا بلاوا آ جاتا ہے۔ کبھی وقت ملے اور میسر ہو تو نقشہ دیکھ
اُمید ہے تمہیں سمجھ آ جائے گی۔'' حسبِ معمول میرے ذہن کی کچھ گرہیں کھلیں، پر کچھ نئی گرہیں مزید پڑ گئیں

میں نے تہیہ کر لیا کہ کہیں سے بھی نقشہ میسر ہوا تو اپنے آج تک کے سفر کا راستہ جوڑ کر ضرور دیکھوں گا۔ میری
حالت شام تک وقفے وقفے سے کئی مرتبہ بگڑتی گئی اور عصر کے بعد تو گرمی اور حبس سے میرا دم اس قدر گھٹنے لگا
کہ میں گھبرا کر ٹیلے سے نیچے ساحل کی طرف چلا آیا۔ سامنے ہی اشرف نیلی اور زرد دھاریوں والی بڑی سی
پتنگ ہوا میں بلند کیے دوڑ رہا تھا۔ پتنگ کو ڈور کی ڈھیل ملی تو وہ ہواؤں میں بلند ہوتی گئی۔ میں بہت دیر تک
ڈور، پتنگ اور آسمان کا یہ کھیل دیکھتا رہا۔ دفعتاً اشرف کے ہاتھ میں تھمی کچی ڈور کو ایک جھٹکا لگا اور پتنگ آسمان
میں ڈولنے لگی۔ ڈور ٹوٹ چکی تھی۔ اشرف بہت دیر تک ساحل کے ساتھ ساتھ اپنی پتنگ کو دوبارہ پکڑنے کے
لیے دوڑتا رہا لیکن کٹی پتنگیں اپنے مالک کے ہاتھ بھلا کب آتی ہیں۔ انہیں تو آسمان چھونے کی خواہش مزید اور
مزید اُونچا اُڑا لے جاتی ہے۔ اشرف کی پتنگ بھی ساحل کی ہوا کے سنگ بادلوں سے پرے جا چکی تھی۔ کچھ ہی
دیر میں اشرف منہ بسورتا ہوا میرے قریب سے گزرا تو میں نے اُس کا ہاتھ پکڑ لیا۔ ''کیا ہوا؟ کٹ گئی
پتنگ.....؟'' ''ہاں آج پہلی بار میں نے اتنی اُونچی اڑائی تھی پر......'' اشرف ابھی تک افسردہ تھا۔ ''کوئی بات
نہیں۔ دراصل تمہاری پتنگ بادلوں کو پسند آ گئی تھی۔ سو ان کا دل بھی چاہا کہ وہ اس سے کھیلیں۔ لہٰذا تمہاری
پتنگ وہاں چلی گئی۔'' اشرف کچھ حیران ہوا۔ ''اچھا...... کیا بادل بھی پتنگ اُڑاتے ہیں؟'' میں مسکرایا۔ ''ہاں،
بادل ہی تو پتنگوں کے سب سے اچھے دوست ہوتے ہیں۔ تب ہی تو پتنگیں اُن سے باتیں کرنے کے لیے اتنا
اُونچا اُڑتی ہیں۔'' اشرف کے چہرے پر چھایا تکدر دُور ہونے لگا۔ ''اچھا، پھر تو کوئی بات نہیں۔ بادل تو مجھے بھی
بہت اچھے لگتے ہیں۔ میرے بھی دوست ہیں۔'' میرا جی چاہا کہ میں اُس سے کہوں کہ اپنے اندر یہ بادلوں اور
پتنگوں کی دوستی سدا زندہ رکھنا۔ اشرف اپنی دُھن میں بولے چلا جا رہا تھا۔ ''میں بڑی گاڑی والے صاحب
سے کہوں گا وہ مجھے ایک نئی پتنگ لا دیں گے۔ فکر کی کوئی بات نہیں۔'' ''یہ بڑی گاڑی والے صاحب کون
ہیں؟'' اشرف نے میرے پوچھنے پر بتایا کہ ایک بہت بڑی سی گاڑی والے صاحب تقریباً ہر تیسرے چوتھے
دن ساحل پر شام کو کچھ دیر کے لیے آتے ہیں، کبھی کبھی اُن کے ساتھ شہر کی کوئی میم صاحب بھی ہوتی ہیں۔
دونوں کچھ دیر کے لیے دوسری جانب والے ٹیلے پر بیٹھ کر باتیں کرتے ہیں۔ چائے، کافی پیتے ہیں اور کبھی
کبھار اپنے ساتھ پتنگ اور ڈور بھی لاتے ہیں۔ یہ پتنگ بھی اُسی صاحب نے اشرف کو دی تھی۔ اچانک
میرے ذہن میں گزشتہ رات والی گاڑی کی بیک لائٹس چمکیں۔ ہوسکتا ہے یہ وہی صاحب ہوں جن کی تعریف
منا اشرف اس وقت زمین آسمان کے قلابے ملا رہا تھا۔ کچھ دیر میں سورج ڈھلنے لگا تو مرتضٰی صاحب مسجد
والے ٹیلے پر کھڑے ہو کر اشرف کو آوازیں دینے لگے۔ اشرف ابھی مجھے اپنے جگری دوست جانو کی کہانی مزید
سنانا چاہتا تھا کہ کس طرح وہ دونوں ہیڈ ماسٹر صاحب سے نظر بچا کر کبھی کبھی آدھی چھٹی کے وقت بھی ساحل پر
سیپیاں اور گھونگے جمع کرنے آ جاتے تھے۔ لیکن اپنے بابا کی مستقل پکار سن کر اُسے بادل نخواستہ اُٹھ کر جانا ہی
پڑا۔ میں بھی مغرب کی اذان سن کر اُوپر مسجد میں چلا آیا۔

عشاء کے بعد گزشتہ روز کی طرح مرتضیٰ صاحب کچھ دیر ہمارے ساتھ بیٹھے رہے۔ درمیان میں
صاحب بھی چکر لگا گئے تھے۔ نہ جانے ہر بار وہ میری نبض دیکھتے ہوئے میرے چہرے پر کون سی اَن
تحریر پڑھنے کی کوشش کرتے رہے تھے۔ مجھے یوں لگا کہ جیسے ہر بار وہ کچھ کہتے کہتے رُک سے جاتے
رات بہت دیر تک سلطان بابا میرے سرہانے بیٹھے رہے۔ میرا جسم اندر سے بُری طرح جل رہا تھا۔ بے
اتنی بڑھی کہ میں بہت دیر تک اِدھر اُدھر سر پٹختا رہا پھر نہ جانے کس پہر میری آنکھ لگ گئی۔ بس مجھے اتنا ہی یا
کہ سلطان بابا دھیرے سے میرے سرہانے سے اُٹھ کر حجرے میں اپنے کمرے کی جانب بڑھ گئے۔ پھر
ذہن تاریکیوں میں ڈوبتا چلا گیا۔ اور پھر مجھے یوں محسوس ہوا کوئی بالٹی بھر بھر کر کھارا نمک ملا پانی میرے چہ
پر پھینک رہا ہو۔ تیسرے تھپیڑے پر میں نے کسمساتے ہوئے آنکھیں کھولیں تو سر پر حجرے کی چھت کی
کھلا آسمان دیکھ کر چند لمحے تو میں سٹپٹا ہی گیا۔ اور پھر پانی کی ایک تیز لہر نے میرے پہلے سے بھیگے ہوئے
مزید بھگو دیا۔ میں گھبرا کر اُٹھ بیٹھا، صبح کا اُجالا پھیل چکا تھا اور میں اس وقت حجرے کے بجائے ساحل پر
ریت میں سنا ہوا تر بتر سا بیٹھا ہوا تھا۔ یا خدا......! میں یہاں کیسے پہنچا......؟ ابھی رات کو تو میں ا
کمرے میں ہذیانی حالت میں اپنے بستر میں کسمسا رہا تھا پھر یہ ساحل، یہ کھلی فضا......؟ میں ابھی حیر
کے پہلے شدید جھٹکے ہی سے باہر نہیں نکل پایا تھا کہ اچانک دُور سے کچھ لوگ ہجوم کی صورت میں مجھے اپنی جا
بڑھتے نظر آئے۔ ان کے ہیولے دھیرے دھیرے دھندلی شبیہوں سے واضح خاکوں میں تبدیل ہوئے تو
سے آگے باوردی پولیس والوں کی ایک ٹولی نظر آئی۔ پھر ایک سپاہی کی نظر مجھ پر پڑی اور وہ مجھے دیکھتے ہی
سے چلایا۔

"وہ رہا قاتل جناب......!" پھر کوئی زور سے گرجا۔ "پکڑو...... پکڑو...... قاتل جانے
پائے۔" سب پولیس والے میری جانب دوڑے۔

قاتل

میں ہکا بکا سا یوں ہی اپنی جگہ جما بیٹھا رہا اور کچھ ہی دیر میں پولیس والے میرے سر پر پہنچ گئے۔ ان میں
ایک نے لپک کر میری کلائی مضبوطی سے تھام لی۔ عقب سے چند اور حوالدار بھی نمودار ہو گئے اور پھر ایک
گرجا "کون ہو تم...... اور اس وقت یہاں ساحل پر کیا کر رہے ہو؟" "میں عبداللہ ہوں۔ سامنے والی چھوٹی
ڑی پر واقع مسجد میں رہتا ہوں۔" ایک سپاہی میرے ہاتھ کو زور سے جھٹکا دے کر بولا "یہ جھوٹ بول رہا ہے
ب۔ لاش کے قریب جو قدموں کے نشان ہیں، وہ سیدھے یہاں آ کر ختم ہوتے ہیں۔ یہی اس لڑکی کا قاتل
۔" میرے ذہن میں جھماکے سے ہونے لگے۔ یہ لوگ کس لڑکی کی لاش کا ذکر کر رہے تھے۔ اور میرے
وں کے نشان وہاں تک کیسے پہنچے۔ یہ سب کیا ہو رہا تھا۔ کچھ ہی دیر میں ساری بستی ساحل کے گرد جمع ہو چکی
۔ افسر کے حکم پر مجھے ہتھکڑی پہنا دی گئی اور پھر تقریباً گھسیٹتے ہوئے جائے وقوعہ تک لے جایا گیا۔ کچھ پولیس
لے زمین پر چونے سے ایک دائرہ لگائے کھڑے تھے۔ درمیان میں سفید چادر کے نیچے ایک آڑا ترچھا جسم
ہوا تھا۔ چادر کے نیچے بھی جسم کے زاویوں کے متوازی سفید چونے کی لکیریں جھانک رہی تھیں۔ دفعتاً زور
ہوا کے جھونکے سے جسم کے چہرے سے چادر ہٹ گئی۔ تیئس، چوبیس سال کی ایک معصوم سی لڑکی آنکھیں
ے پڑی تھی۔ چہرے پر چند گہری خراشوں کے علاوہ اور کوئی ایسی نشانی نہیں تھی کہ جسے دیکھ کر کوئی یہ اندازہ
سکے کہ وہ اپنی سانسیں ہار چکی ہے۔ اس وقت بھی وہ اتنے قریب سے بھی گہری نیند میں سوئی ہوئی ہی لگ
ھی جیسے ابھی پٹ سے آنکھیں کھول دے گی۔ میں ابھی تک پوری طرح اپنے حواسوں میں نہیں تھا۔ چند
بعد ہی سامنے سے مرتضیٰ صاحب اور سلطان بابا پریشانی کے عالم میں لمبے لمبے ڈگ بھرتے آتے دکھائی
ئے۔ میرے ہاتھوں میں ہتھکڑیاں دیکھ کر سلطان بابا کو جیسے کچھ ہونے لگا۔ وہ لپک کر میرے قریب آئے اور
ے ہاتھ ٹٹول کر کہنے لگے "یہ ہتھکڑیاں کیسے عبداللہ میاں۔ یہ سب کیا ماجرا ہے؟" اتنے میں ایک سرکاری
ساحل پر نمودار ہوئی اور سارے پولیس والے ہوشیار اور مؤدب ہو گئے۔ انہوں نے جلدی سے لوگوں کو
اُدھر ہٹایا۔ "اے ہٹو، ایک طرف ہو جاؤ۔ ایس۔ پی صاحب آ رہے ہیں۔" ایس۔ پی کے قریب آتے ہی
پولیس والوں نے کھٹا کھٹ سیلوٹ کیے۔ افسر نے جواباً سر ہلایا اور میری طرف چلا آیا۔ اور غور سے میری
دیکھ کر بولا "ہونہہ...... تو یہ ہے وہ لڑکا؟" سلطان بابا نے کھنکار کر ایس۔ پی کو اپنی جانب متوجہ کیا۔ "کیا
کیا ہے عبداللہ میاں نے...... آپ نے اسے ہتھکڑیاں کیوں لگا رکھی ہیں؟" افسر نے غور سے سلطان بابا کو

دیکھا ''یہ آپ کا بیٹا ہے؟'' ''بیٹے سے کچھ بڑھ کر ہی ہے میاں...... رشتے صرف خون کے ہی تو نہیں ہو
ایس۔ پی نے غور سے بابا کو دیکھا ''خوب...... اور آپ کون ہیں؟'' ''ہم دونوں ہی مسافر ہیں۔ اک
راستے کے۔ فی الحال چند دن کے لیے پہاڑی ٹیلے کی اُوپر والی مسجد میں بسیرا ہے، پھر آگے بڑھ جائیں
میاں۔'' افسر نے گہری سانس لی۔ لیکن فی الحال شاید ایسا ممکن نہ ہو۔ اس لڑکے پر خون کا شک ہے
بظاہر دکھائی دینے والے تمام شواہد بھی اس کے خلاف جاتے ہیں۔ اس لیے ہم اسے گرفتار کر کے لے جا
ہیں۔ ہاں، البتہ آپ میری تسلی کے لیے صرف اتنا بتا دیں کہ آپ کے بیان کے مطابق اگر آپ لوگ اُو
مسجد کے حجرے میں مقیم ہیں تو پھر یہ لڑکا اتنی صبح سویرے یہاں ساحل پر کیا کر رہا تھا؟'' سلطان بابا
سانس لیا ''میں نہیں جانتا، کیوں کہ میں رات کو عبداللہ کو حجرے ہی میں سوتا چھوڑ گیا تھا۔'' ایس پی نے چو
سلطان بابا کو دیکھا۔ ''مجھے خوشی ہے کہ آپ نے اس مشکل مرحلے پر بھی سچ کا دامن نہیں چھوڑا۔ لیکن آپ
سچ عبداللہ کو ہماری نظر میں مزید مشکوک بناتا ہے۔ بہتر ہوگا آپ کسی اچھے وکیل سے رابطہ کر لیں۔'' پولیس
نے اپنے کارندوں کو اشارہ کیا اور وہ لوگوں کے درمیان سے مجھے دھکیلتے ہوئے پولیس کی جیپ کی طرف
بڑھے۔ مرتضٰی صاحب اتنے پریشان تھے کہ اُن سے ایک لفظ بھی نہیں بولا گیا۔ میں نے چلتے ہوئے پل
سلطان بابا کو کچھ کہنے کی کوشش کی لیکن میرے سارے لفظ نہ جانے کہاں کھو چکے تھے۔ بھیڑ میں کھڑ
صاحب کی نظریں مجھ سے ملیں اور مجھے لگا کہ اُن کے اندر جانے کتنے طوفان اُمڈ رہے ہیں لیکن وہ پولیس
سے کچھ بول نہیں پا رہے۔ جیپ میں بیٹھتے ہوئے میری نظر آخری بار اُس معصوم چہرے پر پڑی، جس کے
داغ اپنے ماتھے پر سجائے میں پولیس کے گھیرے میں ایک ان جانے سفر پر روانہ ہو رہا تھا۔ کیا میرا جنون
اپنی آخری حدیں بھی پار کرنے کو تھا۔ بستی والے آپس میں چہ میگوئیاں کر رہے تھے۔ ریت اُڑاتی جیپ
سے ساحل سے دُور ہوتی گئی اور کچھ ہی دیر میں سارا منظر دھندلا گیا۔

تقریباً دس بارہ کلومیٹر کے بعد ایک خستہ حال سی پرانی عمارت نظر آئی جس پر برسوں پہلے کیا گیا پلا
جگہ جگہ سے اُڑ چکا تھا۔ عمارت کے گیٹ پر پرانے سے ٹین کا ایک زنگ آلود بورڈ جھول رہا تھا، جس پر
بغور دیکھنے پر بھی بمشکل نظر آتے تھے۔ میں صرف اتنا ہی پڑھ پایا ''پولیس تھانہ، تحصیل ماہی۔'' اور ہم
جیپ تھانے کے پھاٹک سے اندر داخل ہو گئی۔ ایس۔ پی کے وقوعہ پر پہنچنے سے پہلے، جس تھانے دار
سے بات کی تھی، وہ یہاں کا ایس ایچ او تھا۔ مجھے تھانے دار کے کمرے میں لے جا کر دیوار کے قریب
رہنے کو کہا گیا۔ پتا چلا کہ ایس۔ پی صاحب ہیڈ کوارٹر یعنی شہر والے دفتر میں بیٹھتے ہیں اور یہاں صرف
کی اطلاع پر پہنچے ہیں، کیوں کہ مرنے والی شاید خود بہت اہم تھی یا پھر اُس کا تعلق شہر کے بہت اہم لوگوں
تھا۔ ورنہ عام حالات میں ایسے مقدمات خود تھانے دار ہی نپٹا دیا کرتے ہیں۔ عجیب بات یہ تھی میں
واقعے کے دوران ذہنی طور پر بالکل سُن اور یوں بے فکر اور لاتعلق سا تھا جیسے پولیس قتل کے الزام میں

ں...... کسی بیگانے کو پکڑ کر تھانے لائی ہے اور میں کسی فلم کے پردے پر یہ سب مناظر دیکھ رہا ہوں۔ کچھ ہی
یں ایس پی صاحب بھی کمرے میں آ گئے اور تھانے دار اور چند مؤدب حوالدار اُن کے آس پاس اکڑ کر
ڑے ہو گئے ہیں۔ میں نے پہلی بار ایس پی کے سینے پر لگی چھوٹی سی نام کی تختی پڑھی۔ اُن کا نام رحمٰن تھا۔
پی نے میز پر پڑی سگریٹ کی ڈبیا میں سے ایک سگریٹ نکالا اور ہونٹوں میں داب کر ماچس کے لیے نظر
ائی۔ تھانے دار نے جلدی سے بڑھ کر سگریٹ سلگا دیا۔ انہوں نے ایک زوردار کش لے کر دھوئیں کا مرغولہ
میں بکھیرا اور دھوئیں کی اس نیلگوں چادر سے پرے اپنی گھورتی نگاہیں مجھ پر گاڑ دیں۔ ''ہونہہ...... تو
اللہ نام ہے تمہارا۔ اس سے پہلے کہاں رہتے تھے؟'' میں نے مختصراً انہیں تفصیل بتائی۔ کتنا پڑھے لکھے ہو؟
مطلب ہے مدرسے کی کون سی سند تک پڑھا ہے تم نے اب تک؟'' ''جی مدرسے کی تو کوئی سند نہیں ہے
ے پاس۔ ابھی کچا طالب علم ہوں۔'' میرا جواب سن کر انہیں ذرا حیرت ہوئی کیوں کہ شاید میری صاف
لگو سے وہ مجھے دین کا بہت پرانا طالب علم سمجھ بیٹھے تھے۔ ''اچھا یہ بتاؤ تم رات کو ساحل پر کیا کرنے گئے
جس لڑکی کی لاش کے پاس تمہارے قدموں کے نشان ملے ہیں تم نے اُسے پہلی بار کب دیکھا
''میں نے پہلی بار اُسے آج صبح ہی دیکھا ہے، جب چند لمحوں کے لیے اُس کے چہرے سے کپڑا ہٹ گیا
مجھے یہ بھی یاد نہیں کہ میں رات اپنے حجرے سے ساحل تک کیسے پہنچا اور میرے قدموں کے نشان ریت پر
رہ گئے؟'' تھانے دار سے صبر نہیں ہو سکا اور وہ کڑک کر بولا۔ ''کیوں، کیا تم کو نیند میں چلنے کی عادت
سیدھی طرح سے بتاتے ہو یا پھر؟'' ایس پی نے ہاتھ اُٹھا کر تھانے دار کو چپ رہنے کا اشارہ کیا۔ پھر خود
ل فضا میں بکھیرتے ہوئے کہا۔ ''دیکھو۔ میں نے ابھی تک روایتی پولیس والے حربوں سے خود کو روک رکھا
دراصل مجھے لڑکی کے پوسٹ مارٹم کا انتظار ہے۔ شام تک شہر سے رپورٹ آ جائے تو میں کسی نتیجے پر پہنچ کر
ئی فیصلہ کروں گا، لیکن تب تک تمہارے لیے یہی بہتر ہے کہ تم ہم سے تعاون کرو۔ بعد میں اگر مجھے یہ پتا
تم نے کوئی غلط بیانی کی ہے تو تمہارے حق میں بہت بُرا ہوگا۔'' ''میں نے اب تک آپ سے کوئی جھوٹ
بولا۔ نہ ہی مستقبل میں میرا ایسا کوئی ارادہ ہے۔ آپ اپنی تفتیش مکمل کریں۔ اگر میں گناہ گار ہوں تو بھی
کے اختیار میں ہوں۔ جو سزا مقرر ہوگی، مجھے قبول ہے۔'' رحمٰن صاحب کچھ دیر تک میری آنکھوں میں نہ
کیا تلاش کرتے رہے۔ اس لمحے مجھے احساس ہوا کہ اصل پولیس والے کی نظر کس قدر گہری اور کتنی چبھتی
ہوتی ہے۔ تب ہی تو انہیں آنکھوں کے راستے رُوح میں جھانک لینے کا فن آتا ہے۔ اتنے میں ایک سپاہی
کر بتایا کہ بستی کے چند بزرگ اور حکیم صاحب اُن سے ملنا چاہتے ہیں۔ ایس پی نے انہیں دوسرے
ے میں بٹھانے کو کہا اور مجھے وہیں کھڑا رہنے کا حکم دے کر دوسرے کمرے میں چلے گئے۔ صرف ایک
کو میری نگرانی پر مامور رہنے دیا گیا۔ البتہ میرے ہاتھ اب بھی ہتھکڑی سے بندھے ہوئے تھے۔ کھڑے
سے میرے پاؤں شل ہونے لگے۔ جانے کتنی دیر یونہی گزر گئی۔ پھر اچانک وہی لاوا میرے خون میں پھوٹا

اور میری نسوں میں چنگاریاں بھر گیا۔ سپاہی نے پہلے حیرت سے میری پھولتی سانسوں اور بگڑتی حالت کو
اور پھر مجھے ڈولتے دیکھ کر وہ باہر کی جانب بھاگا۔ مجھے یوں لگا کہ سامنے والی پیلی دیوار پر کچھ عجیب
عفریت نما سائے اُبھر کر میری جانب بڑھ رہے ہوں اور پھر چاروں طرف اندھیرا چھا گیا۔ جانے کتنی د
بعد جب میرے حواس بحال ہوئے تو حکیم صاحب دھیرے دھیرے میرے گال تھپتھپا رہے تھے۔ اُس
وقت حوالات کے سنگی سِل نما چبوترے پر لیٹا ہوا تھا اور میرے آس پاس سلطان بابا کے علاوہ ایک ڈا
ایس پی صاحب بھی موجود تھے۔ حوالات کے چھوٹے سے روشن دان سے اندر آئی دھوپ کے زاویے اور
رنگت سے پتا چل رہا تھا کہ سورج ڈھلنے کو ہے۔ گویا میری زندگی سے پھر چند گھنٹے کچھ اس طرح س
پاؤں نکل گئے تھے کہ مجھے خبر بھی نہ ہو سکی۔ سلطان بابا نے مجھے بتایا تھا کہ روزِ قیامت جب ہم دوبارہ
جائیں گے تو ہمیں یوں لگے گا جیسے ہم صرف دو گھڑی کی زندگی بتا کر آخرت تک پہنچے ہیں۔ پچھلے چند
سے میری زندگی کے کئی طویل گھنٹے بھی یونہی دو پل کی طرح میری بے ہوشی کے دوران بیت جاتے تھے
جب میں دوبارہ حواس میں آتا تھا تو مجھے بالکل اُسی طرح محسوس ہوتا تھا، جیسے میں نے ابھی دو پل کے
آنکھیں موندی تھیں۔ مجھے ہوش میں آتا دیکھ کر ڈاکٹر نے مجھ سے پوچھا ''اب کیسی طبیعت ہے تمہاری
اُٹھ بیٹھا۔ بہتر ہوں۔ بس سر میں شدید درد ہے۔''

''ہوں...... تمہارا بلڈ پریشر انتہائی خطرناک حد تک بلند ہو گیا تھا۔ بلڈ پریشر سمجھتے ہو۔ فشارِ خون
و باؤ؟'' ''جی سمجھ گیا......'' رحمٰن صاحب غور سے مجھے دیکھ رہے تھے۔ سگریٹ حسبِ معمول اُن کی اُنگلیو
درمیان سلگ کر راکھ ہو رہا تھا۔ ''تمہیں یہ بیماری کب سے ہے؟'' میں نے حیرت سے سلطان بابا کو
دیکھا، کیوں کہ مجھے سمجھ نہیں آیا کہ وہ کس بیماری کا ذکر کر رہے تھے۔ ڈاکٹر نے میری نبض تھامی
(Tetanus) کا علاج تو بروقت ہوا لگتا ہے۔ ٹیکوں کے نشان تو ابھی تک واضح ہیں۔ خدا کرے کہ یہ
خدشات کے مطابق (Rabies) ریبیز کا کیس نہ ہو۔ لیکن علامات تو سبھی موجود ہیں۔'' حکیم صاحب
کہنے کی کوشش کی جناب یہ جنون کا قصہ ہے۔ میرا مطلب ہے ہماری طب کی زبان میں اسے ''سگ
'' بھی کہتے ہیں۔ جب یہ دورہ پڑتا ہے تو انسان اپنے حواس میں نہیں رہتا۔ کسی نئی دنیا میں پہنچ جاتا
اسے ہیولے دکھائی دینے لگتے ہیں اور کچھ دیر کے لیے اُس کی یادداشت کی سلیٹ مٹ جاتی ہے۔ یعنی
کو حکیم کی یہ فاضلانہ تقریر شاید کچھ پسند نہیں آئی وہ ہاتھ جھٹک کر بولا ''ہاں ہاں...... یہی ساری علاما
ہیں ریبیز کی بھی۔ لیکن میں نے آج تک ریبیز کو زندہ بچتے ہوئے نہیں دیکھا۔ جب کہ یہ نوجوان تو ا
گزر جانے کے باوجود چل پھر رہا ہے۔'' بحث طول پکڑنے لگی تو ایس پی کو مداخلت کرنی پڑی۔ انہوں
سخت لہجے میں دونوں کو تنبیہ کی کہ میرے خون کے نمونے شہر کی لیبارٹری کو بھجوا دیے گئے ہیں
رپورٹ آنے ہی پر کوئی رائے دی جا سکتی ہے۔ فی الحال اس بحث کا کوئی فائدہ نہیں۔ شاید طب

پیتھی (Allopathy) ٹرین کی دو ایسی پٹریاں ہیں، جو ساری عمر ساتھ ساتھ چلتی رہتی ہیں اور جن کی منزل
ایک ہوتی ہے لیکن وہ کبھی مل نہیں پاتیں۔ سلطان بابا اس سارے عرصے میں چپ چاپ بیٹھے مجھے دیکھتے
رہے۔ حوالات میں اندھیرا ہونے لگا تو ایک سنتری نے بیرونی طاق میں رکھا دیا جلا دیا، جو سلاخوں سے پرے
اس طرح بنایا گیا تھا کہ اس کی روشنی تو حوالات تک پہنچ رہی تھی لیکن وہ قیدی کی دست برد سے پرے رہتا تھا۔
تھوڑی دیر میں باقی لوگ باہر نکل گئے اور صرف میں اور سلاخوں کے پار بیٹھے سلطان بابا حوالات میں باقی رہ
گئے۔ انہوں نے میرا ہاتھ اپنے ہاتھ میں تھام لیا۔ اُن کی آواز کچھ بھرائی ہوئی سی تھی۔ ''یہ کیسا مقدر لکھوا کر لائے
ہو میاں۔ کبھی کبھی تو میں خود بھی خوف زدہ ہو جاتا ہوں کہ کہیں کوئی مستقل جنوں ہی تمہاری تقدیر نہ ہو۔'' میں
نے ان کا ہاتھ تھپتھپایا ''آپ خود ہی تو کہتے ہیں کہ دیوانے سے کوئی پرسش نہیں، تو پھر دیوانگی تو نعمت ہوئی نا۔
فرزانگی کے عذاب سے تو جان چھوٹے گی۔ بس، یہ دعا کریں کہ میری یہ دیوانگی، یہ جنوں کسی کے لیے
باعث نقصان نہ ہو۔'' اتنے میں سپاہی نے آکر اطلاع دی کہ قیدی کو باقاعدہ ''لاک اپ'' میں بند کرنے کا
وقت ہو گیا ہے، لہٰذا ملاقات ختم کی جائے۔

کچھ ہی دیر میں اس خستہ حوالات کی سلاخوں پر بڑا سا لوہے کا تالا ڈال کر اور دروازے کو مقفل کر کے
مجھے ''لاک اپ'' بنا دیا گیا۔ سلطان بابا کو میں نے بمشکل بستی واپس جانے پر مجبور کیا۔ ورنہ وہ وہیں تھانے کے
آس پاس رات گزارنے کی دُھن میں تھے۔ ایس پی صاحب کی مہربانی سے مجھے وہ کھانا کھانے کی اجازت
دے دی گئی، جو مرتضیٰ صاحب اپنے گھر سے بنا کر لائے تھے۔ تھانے دار نے مجھے بتایا کہ رحمٰن صاحب واپس
جا چکے ہیں اور اب وہ صبح آئیں گے اور کل صبح ہی مجھے ریمانڈ کے لیے باقاعدہ کسی عدالت کے روبرو پیش
کیا جائے گا۔ تھانے میں اب باقاعدہ مجھے مریض سمجھ لیا گیا تھا، لہٰذا عملے کا رویہ صبح سے کافی بہتر تھا۔ کچھ ہی دیر
میں صرف رات کی ڈیوٹی والے تین چار سپاہی تھانے میں باقی رہ گئے اور عمارت سنسان ہو گئی۔ بس میں، میرا
جنوں اور یہ تاریک قفس باقی رہ گئے۔ کس سے گلہ کرتا کہ جنوں کا تو واسطہ ہی سدا سے قفس تھا۔ میں تو وہ
عجب دیوانہ تھا، جو ناصح کو اپنے ناخن بڑھ جانے کی دہائی بھی نہیں دے سکتا تھا۔ میں نے وہیں بیٹھے بیٹھے
ٹیک کر دیوار کے ساتھ ٹیک لگا لی اور صبح سے ہوئے اب تک کے واقعات کا از سرِ نو جائزہ لینے لگا۔ اب تک
کی کڑیاں کچھ یوں جڑتی تھیں کہ کال گڑھ کے بے زبان دشمنوں کا زہر میرے خون میں شامل ہو کر اسے بھی
زہر کر چکا تھا اور اب میرے اندر اپنی بھیڑیوں کی درندگی اور وحشت خون بن کر دوڑ رہی تھی، جو مجھے دن کے
کسی بھی لمحے میں خود سے بیگانہ کر سکتی تھی۔ پہلی رات فجر کے بعد مجھ پر جنوں کا پہلا طویل دورہ پڑا۔ لیکن اس
وقت خوش قسمتی سے میں حجرے میں سلطان بابا کے سامنے ہی موجود تھا، لہٰذا فوراً حکیم صاحب کو بلوا لیا گیا اور
ان کی میرے حلق میں ٹپکائی گئی دوا نے شاید میرا کچھ بھرم رکھ لیا۔ لیکن دوسری رات میرا جنوں مجھے گھسیٹ کر
گھر سے باہر لے آیا۔ نہ جانے وہ معصوم کون تھی، جو ساحل پر لاش کی صورت موجود تھی اور کون جانے کہ واقعی

وہ میرے ہی ہاتھوں اس حال کو پہنچی ہو؟ کیوں کہ مجھے نہ تو کچھ یاد رہتا تھا اور نہ ہی ایسی حالت میں، میرا
اپنے قابو میں ہوتا تھا۔ لیکن وہ کون تھی، چہرے اور لباس سے تو پڑھی لکھی اور کسی بڑے گھر کی دکھائی دے
تھی۔ پھر اتنی رات کو اس ویرانے میں کیا کرنے آئی تھی؟ اور اگر میں نے ہی اُس کی جان لی تھی تو کیا وہ
تنہا آئی تھی۔ نہ جانے ایسے کتنے سوالوں کو سنپولیے تھے، جو مجھے رات بھر ڈستے رہے۔

رات پل پل کر کے سرکتی رہی اور کھلے روشن دان سے ریت کے ذرے اُڑ اُڑ کے میرے چہرے، ا
اور سر پر گل پاشی کرتے رہے۔ ہاں سچ ہے، دیوانوں کے لیے تو یہ خاک بھی گل جیسی ہوتی ہے اور جو جو
جس قدر خاک آلود ہو، اُتنا ہی گل زار ہوتا ہے۔ فجر کے بعد ایک سنتری چھوٹی سی چینک میں چائے اور سلو
ایک چھوٹی سی گلاسی لیے نمودار ہوا۔ "لے بھئی مولوی، چائے پی لی۔ بھئی مجھے تو یقین نہیں آتا کہ یہ خون تیر
ہاتھوں ہوا ہے، لیکن باقی سب کہتے ہیں کہ تجھے پاگل پن کے دورے پڑتے ہیں اور اِسی دورے کے دورا
نے اس لڑکی کی جان لے لی۔ اب اللہ جانے سچ کیا ہے......؟" میں نے سنتری سے پوچھا۔ "وہ لڑکی کو ا
جس کے قتل کا الزام میرے سر ہے؟" سنتری جو خود بھی میرے سامنے سلاخوں کے پار اسٹول پر چا
دوسری گلاسی لے کر بیٹھ چکا تھا۔ اُس نے اپنا ماتھا مسلا۔ "کیا بھلا سا نام تھا اس بے چا
کا......ہاں......لیلیٰ......یہی نام تھا۔ سنا ہے کسی بہت بڑی کمپنی میں کام کرتی تھی اور اُسی کے مالک ریحان
منگیتر بھی تھی۔ ویسے ریحان کا نام یہاں سبھی جانتے ہیں۔ اس پورے علاقے کا سب سے بڑا رئیس ہے
وہاں شہر میں اس کی بیسیوں فیکٹریاں ہیں اور وہ خود بھی شہر میں اپنے محل نما بنگلے میں رہتا ہے۔ گورنر اور وزرا
کے ہاں شام کی چائے پر دعوت ملنا اپنے لیے فخر کی بات سمجھتے ہیں۔ تبھی تو ہمارے ایس پی صاحب بھی اطلا
ملتے ہی دوڑے چلے آئے تھے۔ اس لڑکی کے قتل نے جانے کتنوں کی نیندیں اُڑا دی ہیں۔" میں نے سنتری
ٹٹولا "لیکن وہ شہر سے اتنی دُور ویرانے میں کیا کرنے آئی تھیں۔ وہ بھی تنہا۔" "پتا نہیں۔ سنا ہے اُس کی
ریحان صاحب کی شادی میں بس تین دن ہی باقی رہ گئے تھے۔ ویسے بھی بستی کے لوگوں نے پہلے بھی
دونوں کو ساحل پر گھومتے دیکھا تھا۔ شاید شور شرابے اور رش سے گھبرا کر چلے آئے ہوں۔" سنتری کی بات
ہی میرے ذہن میں اشرف کی بات گونجی۔ اُس نے بھی تو کسی میم صاحبہ اور صاحب کا ذکر کیا تھا، جو وہاں
آتے جاتے تھے اور جس نے ننھے اشرف کو پتنگ بھی اُڑانے کے لیے دی تھی۔ کہیں یہ وہی صاحب او
صاحب تو نہیں؟ سنتری نے بات جاری رکھی۔ "ویسے تو پوسٹ مارٹم کی رپورٹ سے کل شام ہی یہ پتا چ
تھا کہ لڑکی کی موت بلندی سے نیچے گرنے سے ہوئی ہے۔ لیکن اُس کے گلے پر بھی خراشیں ہیں، جن
چلتا ہے کہ اوپر پہاڑی پر کسی نے اس کا گلا گھونٹنے کی کوشش کی اور شاید اسی دھینگا مشتی میں وہ نیچے گر گئی
اُسے دھکا دے دیا گیا۔ بہرحال، جو بھی ہوا، بہت بُرا ہوا۔ اس بے چاری نے تو شاید اپنی سہاگ کی مہندی
اپنے ہاتھوں میں رچانے کے لیے گیلی کر رکھی ہو۔ تین دن بعد ہی تو اس کی رُخصتی تھی۔" سنتری کی بات

را دل ڈوب سا گیا۔ کاش یہ جرم مجھ سے سرزد نہ ہوا ہو۔ باہر دھوپ نکل آئی تھی۔ سنتری برتن اُٹھا کر واپس جا
چکا تھا۔ میرے چہرے پر بھی سلاخوں سے چھن کر آتی دھوپ نے سلاخیں سی بنا دی تھیں۔ چہرے کی ہی کیا بات
تھی، اس وقت تو خود میرے سارے وجود میں جانے ایسی کتنی سلاخیں گڑی ہوئی تھیں۔"

کچھ دیر میں باہر کچھ ہلچل ہوئی۔ شاید کچھ گاڑیوں کے رُکنے کی آوازیں بھی اُبھریں اور کچھ لوگوں کی
باتوں کی آواز آنے لگی۔ صبح سویرے جس سنتری نے مجھے چائے لا کر دی تھی وہ تیز تیز چلتا ہوا میری طرف آیا۔
"چلو حافظ جی......تمہاری ملاقات آئی ہے۔" میں نے چونک کر اُسے دیکھا۔ اگر بستی سے سلطان بابا یا کوئی اور
ملنے آیا ہوتا تو اُسے سیدھا حوالات کی طرف لایا جاتا۔ میں نے سنتری سے پوچھا "مجھ سے ملنے کون آیا ہے؟"
سنتری نے حوالات کا تالا کھولا۔ "ریحان صاحب آئے ہیں۔" میرے ذہن میں ایک چھناکا ہوا......
ریحان......اُس لڑکی کا منگیتر......؟" میں آہستہ قدموں سے چلتا ہوا تھانے دار کے کمرے میں داخل ہو گیا۔
کوئی شخص نفیس سا سوٹ پہنے منہ موڑے کمرے میں کھڑا تھا۔ میرے قدموں کی آہٹ کے باوجود اُس نے
پلٹ کر میری جانب نہیں دیکھا۔ میں ہلکے سے کھنکارا۔ ریحان نامی شخص دھیرے دھیرے پلٹا۔ ہم دونوں کی
نظریں ملیں اور میں اپنی جگہ جیسے جم کر رہ گیا۔

قفس اور جنوں

کچھ دیر تک ہم دونوں یوں ہی ایک دوسرے کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے دیکھتے رہے۔ میرے سا
اس وقت وہ شخص کھڑا تھا، جس کی محبت کے قتل کا الزام میرے سر تھا۔ میں نے اپنی زندگی میں اتنے نفیس
سجے ہوئے لوگ کم ہی دیکھے تھے۔ بہترین تراش خراش کا سوٹ، ٹائی، لف لنکس، کوٹ اور پتلون کی کریز
کر نہایت سلیقے سے بنائی گئی کریز اور امپورٹڈ چمکتے ہوئے جوتے۔ کبھی میں بھی لندن کے ہیرالڈز اسٹور سے
ہر دوسرا پیراہن خریدا کرتا تھا۔ اس وقت ریحان کے سرمئی سوٹ کی جیب پر بھی وہی مخصوص چھوٹا مو
جگمگا رہا تھا، لیکن اُس کا چہرہ اُسی قدر تاریک تھا۔ مجھے تو اس بات پر بھی حیرت ہوئی کہ جس شخص کی محبت
ابھی چوبیس گھنٹے بھی نہ ہوئے ہوں، اُسے اتنا نفیس لباس پہننے اور شیو بنانے کا دھیان بھی کیسے رہ سکتا
ریحان کے ہاتھ میں ہوانا کا ایک قیمتی سگار تھا، جس کی میٹھی سی خوشبو کمرے میں چاروں طرف پھیل چکی
اس تمام تر اہتمام کے باوجود اس کی حالت ابتر لگ رہی تھی۔ کلین شیو چہرہ، جس پر نسوانیت کی نازک سی
دِکھتی تھی، کس قدر ڈھلکا ہوا تھا اور آنکھوں کے گرد حلقے بتا رہے تھے کہ وہ گزشتہ کئی راتوں سے سو نہیں پا
کچھ دیر تک میری طرف دیکھتا رہا۔ "تو تم ہو عبداللہ......" میں چپ رہا "مجھے بتایا گیا ہے کہ تم کسی ا
بیماری کا شکار ہو؟" "مجھے بھی یہی بتایا گیا ہے، لیکن اگر آپ یقین کر سکتے ہیں تو کم از کم اس بات پر یقین
کہ مجھے کچھ یاد نہیں ہے اور مجھے آپ کی منگیتر کی موت پر از حد دکھ ہوا ہے۔" ریحان کچھ کھویا کھویا سا
تھا جیسے صدمے سے اُس کے حواس ابھی تک شل تھے۔ وہ اس طرح بولا جیسے کوئی اپنے آپ سے بڑ
کرتا ہے۔ "جسے جانا تھا، وہ تو تنہا چھوڑ کر چلی گئی۔ اب یہ کس کے جنوں کا شاخسانہ ہے، اس بحث سے
حاصل۔ میری دنیا تو اُجڑ گئی۔"

اتنے میں باہر کسی سرکاری جیپ کے ہوٹر کی آواز گونجی اور چند لمحوں کے بعد ایس پی رحمٰن صاحب ا
سے پولیس والی ٹوپی اُتارتے ہوئے جلدی میں اندر داخل ہوئے "معافی چاہتا ہوں ریحان صاح
راستے میں گاڑی کا انجن گرم ہو گیا تھا۔ کچھ دیر رُکنا پڑا۔" ریحان کا لہجہ بدستور دھیما تھا۔ "اُس ا
نے پیغام بھیجا تھا میرے لیے۔" "اوہ ہاں...... آپ کو زحمت دینے کے لیے معذرت۔ میں جانتا ہوں
اس وقت کس کرب سے گزر رہے ہیں، لیکن سرکاری فرائض کی ادائیگی کبھی کبھی ہمیں پتھر بننے پر مجبور
ہے۔ دراصل آپ کو جائے وقوعہ پر ملی کچھ چیزیں دکھانا تھیں۔ اُن کی شناخت اور پولیس کو مطلوب کچھ

لیے آپ کو میرے ساتھ جائے واردات تک چلنا ہوگا۔" ریحان اب تھانے دار کے کمرے میں پڑی کرسی
ھ چکا تھا۔ جس کی ادھوری جھلک میں یہاں حوالات کی سلاخوں سے دیکھ سکتا تھا۔ تھانے دار کے کمرے کا
زہ لکڑی کی چوکھٹ سے اُدھڑا ہوا تھا اور چوکھٹے پر پڑی چق بھی جگہ جگہ سے اُدھڑی ہوئی تھی۔ انہی
ے خانوں میں سے ایک مستطیل خانہ مجھے اس وقت سامنے بیٹھے سگار پیتے ریحان کے چہرے کی نامکمل
دکھا رہا تھا۔ پتا نہیں وہ ہمیشہ یونہی کھویا کھویا رہتا تھا یا پھر اس حادثے نے اُس کی یہ حالت کر دی تھی۔
پی کی آواز گونجی "آپ کے خیال میں لیلیٰ اتنی رات گئے اس ویرانے میں اکیلے کیوں گئی ہوگی؟" "وہ ہمارا
یدہ تفریحی مقام تھا۔ میں اور لیلیٰ اکثر وہاں آتے تھے۔ لیلیٰ کو پتنگ اُڑانے کا بہت شوق تھا اور شہر کی
ڑ اور ہجوم میں یہ اُس کے لیے ممکن نہیں تھا، لہٰذا ہم اکثر چھٹی منانے وہاں چلے جاتے تھے۔ کمپنی نے لیلیٰ
ی گاڑی بھی دے رکھی تھی۔ ہوسکتا ہے دل گھبرایا ہو تو اکیلی ہی اس جانب نکل گئی ہو۔ پہلے بھی جب کبھی
خالف سمتوں سے یہاں پہنچنا ہوتا تھا تو میں لیلیٰ کو کہہ دیتا تھا اور وہ بآسانی وہاں تک آ جاتی تھی۔ البتہ
کو تنہا آنے کا یہ پہلا واقعہ تھا۔" رحمٰن صاحب نے ہنکارا بھرا "لیکن حیرت انگیز بات یہ ہے کہ واردات
قام سے ہمیں بیک وقت دو گاڑیوں کے ٹائروں کے نشانات ملے ہیں۔ پہلی گاڑی تو وہی لیکسز (Lexus)
جو لیلیٰ کے استعمال میں تھی، اور جائے واردات ہی پر کھڑی تھی، لیکن وہاں ایک دوسرے گاڑی بھی آئی
تھی، جس کے واپس جانے کے نشانات بھی پکی سڑک تک ملے ہیں۔ یہ کوئی چھوٹی گاڑی، کار یا جیپ بھی
ہے۔" ریحان کے چہرے پر حیرت کے آثار نمودار ہوئے "لیکن جہاں تک میں جانتا ہوں، لیلیٰ کی
دوست یا جاننے والے کے پاس کوئی چھوٹی گاڑی نہیں ہے۔" "یہ بھی تو ہوسکتا ہے کہ وہ چھوٹی گاڑی بھی
شام وہاں آئی ہو، لیکن لیلیٰ کی گاڑی آنے سے پہلے ہی چلی گئی ہو۔ وہ ایک تفریحی مقام بھی ہے اور شہر
ک ہواخوری کے لیے وہاں آتے رہتے ہیں۔" "کئی بار جب میں اور لیلیٰ وہاں آتے تھے تو ہم سے پہلے ہی
خاندان، کوئی جوڑا یا منچلے نوجوان وہاں پکنک مناتے ہوئے ملتے تھے۔ ایسی صورت میں ہم آگے بڑھ
تھے۔"

رحمٰن صاحب نے بھی اپنا سگریٹ سلگایا۔ "ہاں...... ہم اس زاویے سے بھی دیکھ رہے ہیں کہ شاید وہ
گاڑی لیلیٰ کی گاڑی سے پہلے وہاں سے چلی گئی ہو۔ میرا عملہ بستی والوں کے بیانات لے رہا ہے، لیکن
ے ایک تو وہ پوائنٹ بستی سے کچھ فاصلے پر ہے اور پھر ایسی جگہ ہے کہ وہاں عموماً لوگوں کی نظر نہیں جاتی۔
بستی کے لوگ سرِ شام ہی خود کو گھروں میں بند کر لینے اور عشاء کے فوراً بعد سو جانے کے بھی عادی
جب کہ لیلیٰ کی موت کا وقت رات بارہ بجے کے بعد کا ہے۔ بہرحال، فی الحال تو تمام اشارے اُسی
نا کی طرف اشارہ کر رہے ہیں، جو پہلے ہی ہماری حراست میں ہے۔ میرا خیال ہے ہمیں چلنا چاہیے۔
تیز ہو رہی ہے۔"

رحمٰن صاحب اور ریحان کمرے سے باہر نکلے۔ ریحان کی نظر مجھ سے ملی۔ مجھے اس جوان رعنا
اور ضبط پر اس لمحے بے حد رشک آیا۔ جانے اُس کے اندر اس وقت کتنے طوفان مچل رہے ہوں
چہرے پر سمندر جیسا سکوت طاری تھا۔ اُن دونوں کے جانے کے بعد میں پلٹا ہی تھا کہ باہر ایک دم
اور سپاہی ایک ملنگ نما مجذوب شخص کو پکڑ کر کھینچتے ہوئے لائے اور اُسے بھی حوالات میں دھکیل کر
ملنگ غصے میں اول فول بکتا رہا اور سپاہی اپنی بولی بولتے رہے۔ پتا چلا کہ ملنگ اس سے پہلے بھی لوگوں
یا پتھر مار کر زخمی کر چکا تھا لیکن اُسے جھاڑ جھپٹ کے بعد چھوڑ دیا جاتا تھا۔ پر آج تو اس نے حد ہی کر
مار مار کر سارے علاقے کے گھروں کے شیشے توڑ ڈالے۔ تھانے دار ایس پی صاحب کے ساتھ جائے
کی طرف نکل چکا تھا۔ لہٰذا طے پایا کہ اُس کی واپسی تک ملنگ کو حوالات ہی میں قید رکھا جائے۔ مجھ
جھکتا وہیں سلاخوں کے پاس چوکڑی مار کر بیٹھ گیا۔ پھر اُس کی نظر مجھ پر پڑی۔ میں دیوار کے ساتھ ٹیک
بیٹھا تھا۔ ملنگ کو ایک جھٹکا سا لگا ''تو...... تو یہاں کیا کر رہا ہے......؟'' میں گڑبڑا سا گیا۔ ''میں
قیدی ہوں۔'' ملنگ نے زور کا قہقہہ لگایا۔ ''قیدی...... ہونہہ...... تو صرف اپنی خواہشوں کا قیدی ہے۔
تو تو نے خود اپنی قسمت میں لکھوائی ہیں۔'' میں حیرت سے اسے دیکھتا رہا۔ چند لمحے پولیس والوں کو
گالیاں دینے والا مجذوب اس وقت بالکل نارمل لگ رہا تھا۔ اتنے میں چائے والا سنتری سلاخوں
سے گزرا اور ہنس کر بولا ''اس کی باتوں میں نہ آنا عبداللہ۔ یہ تو ہے ہی سدا کا مجنوں۔ گھڑی میں تولہ
میں ماشہ'' کتنی عجیب بات تھی۔ اس وقت حوالات میں دو ہی قیدی بند تھے، ان میں سے ایک مجنوں تو
دیوانہ۔ دفعتاً ملنگ اپنی جگہ سے اچھل کر بالکل میرے سامنے آکر بیٹھ گیا اور براہ راست میری آ
جھانکتے ہوئے بولا ''یہ تو مجھے کسی خونی کی آنکھیں لگتی ہیں۔ سچ بتا، کس کا خون کر کے آیا ہے یہاں......
زور سے چونکا گویا اس ملنگ کو بھی میرے فسانے کی خبر ہو چکی تھی۔ اچانک ملنگ نے زور سے میرا ہا
''سچ بتا......؟ کیوں مارا اسے...... تو اور کتنے خون کرے گا......؟'' میں چپ رہا۔ ملنگ بالکل ہی جنو
''تو کیا سمجھتا ہے...... یوں دربدر بھٹکنے سے تو اسے پالے گا۔ نہیں، کبھی نہیں۔ تیرا مقدر ہی یہ سدا کا
ہے۔ تو یونہی سر پٹک پٹک کر مر جائے گا، لیکن جب تک اپنے من میں نہیں جھانکے گا، تب تک تیرا یہ
نہیں ہوگا۔ کبھی یہ سلاخیں تیرا مقدر بنیں گی اور کبھی جنوں۔ کبھی کتے تجھ پر لپکیں گے اور کبھی ا
بھنبھوڑیں گے۔ ترس آتا ہے مجھے تجھ پر۔ عورت کا عشق تو نبھا نہیں پایا۔ اُس کے عشق کی گرد بھی کیا
صرف نام ہی عبداللہ رکھ لیا ہے۔ عمل کوڑی بھر کا بھی نہیں۔'' مجذوب نہ جانے کیا کچھ کہے جا رہا تھا
اندر بیک وقت نہ جانے کتنی آندھیاں، کتنے جھکڑ چل رہے تھے۔ وہ ملنگ ضرور میرے بارے میں
جانتا تھا۔ مجھے گم صم بیٹھا دیکھ کر وہ زور سے چلایا ''تو ایسے نہیں مانے گا...... نہ مان...... کھاتا رہ یونہی
ٹھوکریں۔ ایک روز یونہی سولی چڑھ جائے گا۔ نہ ہی عورت تیرے ہاتھ آئے گی اور نہ خدا۔'' ملنگ مجھ

دوبارہ دور سلاخوں کے پاس جا کر بیٹھ گیا۔ اور اُس نے اپنے ہونٹ جیسے سی لیے۔ میری حالت پھر سے
بگڑنے لگی۔ وہی چنگاری میرے دماغ سے نکلی اور میرے سارے جسم کو جھلسا گئی۔ سامنے بیٹھا مجذوب ایک
بھیڑیے کی شکل اختیار کر کے مجھ پر لپکا۔ میرے منہ سے ایک چیخ نکلی اور میں نے اس حملے کو روکنے کے لیے
فضا میں بلند کر دئے۔

مجھے ہوش آیا تو منظر بدل چکا تھا۔ میں کسی اسپتال کی چار دیواری میں تھا اور آس پاس بہت سے ڈاکٹر
آلات لئے میرا معائنہ کر رہے تھے۔ مجھے آنکھیں کھولتا دیکھ، سب ہی نے مجھ پر سوالات کی بوچھاڑ
دی۔ ''تم ٹھیک تو ہو...... تمہیں بخار تو نہیں رہتا، ہر وقت تھکن تو محسوس نہیں ہوتی۔ سر میں دھماکے سے
تے ہیں؟'' سانس لینے میں دشواری ہوتی۔ کھانا ٹھیک سے نگلا جاتا ہے کہ نہیں......؟ ہاتھ پاؤں شل تو نہیں
جاتے اچانک؟ میں نے بمشکل اپنی کیفیت بیان کی کہ میں اس دورے کے دوران اپنے حواس ہی میں کب
ہوں جو اتنا کچھ یاد رکھ سکوں، پھر ایک سینئر ڈاکٹر نے نوجوان ڈاکٹروں کو ڈانٹا اور کمرے کی روشنیاں مدہم
نے کو کہا۔ پھر وہ دھیرے دھیرے مجھ سے بات کرنے لگا، لیکن اس کی باتوں کا دائرہ بھی اچانک دکھائی
دینے والے ہیولوں، بے یقینی، پُرتشدد رویے اور فالج کی کیفیات کے گرد ہی گھومتا رہا۔ اتنے میں باہر سے کسی
نے آکر بتایا ایس۔ پی رحمٰن پوچھ رہے ہیں کہ کیا قیدی کو آج جیل وارڈ ہی میں رات گزارنی ہوگی یا وہ
واپس جیل لے جا سکتے ہیں۔ سینئر ڈاکٹر نے مجھے اپنے پیچھے آنے کا اشارہ کیا اور ہم ایک لمبی راہ داری
ہو کر ان کے کمرے تک پہنچ گئے۔ جہاں پہلے سے رحمٰن صاحب تھانے دار سمیت ہمارے منتظر تھے۔ ڈاکٹر
مجھے بھی کرسی پر بیٹھنے کا اشارہ کیا، لیکن میں کھڑا ہی رہا۔ قید کے اپنے بھی کچھ آداب ہوتے ہیں اور شاید
صرف قید یا قیدی ہونے کی تھی ہی نہیں۔ یہ قواعد وضوابط ہی تو ہیں جو ہمیں ہر جگہ قیدی بنائے رکھتے ہیں۔
نے سچ ہی کہا تھا کہ ''ہم بظاہر آزاد ہوتے ہیں، لیکن تمام عمر ان دیکھی زنجیروں میں جکڑے رہتے ہیں۔''
صاحب نے ڈاکٹر سے میری بیماری کی نوعیت کے بارے میں پوچھا۔ ڈاکٹر صاحب انگریزی میں بولے
عجیب سی بات لگتی ہے لیکن سائنس اور ایلوپیتھی کی دنیا میں ہر دن ایک نئی کھوج کا دن ہوتا ہے۔ ہم
سینکڑوں پرانی بیماریوں کا علاج دریافت کرتے ہیں تو ہر پل کوئی نئی بیماری ایک نیا چیلنج بن کر ہمارے
آکھڑی ہوتی ہے اور بیماری بھی کیا۔ یہ تو دراصل ہمارے خون میں موجود مختلف مرکبات اور مادوں کی
بگڑنے کا ایک نام ہے۔ ساری زندگی، یہ دنیا اور یہ ساری کائنات ایک ترتیب ہی کا تو مظہر ہے۔ انسانی
کے اندر ہمہ وقت ایک بے حد پیچیدہ نظام ایک خاص ترتیب میں چل رہا ہے۔ جس میں اس نظام کے تحت
لے مادوں کی مدت، اوقات اور بناوٹ خود بھی ایک خاص ترتیب اور نظام کے تحت ہوتی ہے۔ ان
میں کسی بھی چیز کی کمی بیشی یا ملاوٹ ایسی ہی کسی حالت کا پیش خیمہ بن جاتی ہے، جسے ہم اپنی زبان میں
کہتے ہیں۔ اس نوجوان کے خون میں بہنے والے مادوں میں بھی حیران کن طور پر چند ایسے زہریلے

مرکب شامل ملے ہیں جو عام طور پر کسی درندے کے خون میں ملتے ہیں۔ اِسے کتے کے کاٹے کی مکمل
بھی ماضی قریب میں دی جا چکی ہے۔ اینٹی ٹیٹنیس ٹیکے بھی لگ چکے ہیں، لیکن پھر بھی نہ جانے یہ کیسا
جواب تک باقی ہے۔ میرے لئے یہ میڈیکل ہسٹری میں ایک نئی دریافت ہے۔۔۔۔ اسے ریبیز بھی
پھر بھی یہ بار بار کے دورے خطرناک علامت ہیں۔ مجھے ڈر ہے کہ اگر جلد ہی ہم اس بیماری کی تہ تک نہ
اس نوجوان کا اعصابی نظام مکمل طور پر مفلوج ہو جائے گا، جس کا نتیجہ فالج یا پھر مکمل دیوانگی کی صورت
نکل سکتا ہے۔" میرے ذہن میں فوراً ملنگ کی دھمکی گونجی کہ نہ مجھے خدا ملے گا نہ وصال صنم...... میں
ڈاکٹر سے پوچھ بیٹھا "میرے پاس کتنا وقت باقی ہے ڈاکٹر صاحب......" ڈاکٹر سمیت رحمٰن صاحب او
بھی اچھل پڑے۔ سینئر ڈاکٹر نے یہ ساری گفتگو انگریزی میں شاید اس لیے کی تھی کہ وہ مریض کے سا
کی نوعیت بتا کر اُسے مایوس نہیں کرنا چاہتے تھے، لیکن میرا سوال سن کر اُن تینوں کو ہی یہ اندازہ ہو گیا
ساری گفتگو سمجھ چکا ہوں۔ ڈاکٹر نے پھر انگریزی میں پوچھا "تم انگریزی جانتے ہو" میں نے اردو م
دیا "جی کچھ شدھ بدھ ہے، اس زبان سے میری۔ آپ برائے مہربانی میرے سوال کا جواب دیں۔ کہ
پن میں اور کتنا عرصہ باقی ہے میرے پاس......؟ رحمٰن صاحب غور سے میری طرف دیکھ رہے تھے۔ ڈ
جلدی سے نفی میں سر ہلایا "دیکھو نوجوان...... ڈاکٹر کبھی مایوس نہیں ہوتا۔ تم جوان ہو، صحت مند ہو
تمہارے معائنے کے دوران آج یہ بات بھی پتا چلی ہے کہ تم بے پناہ قوت ارادی کے مالک ہو۔ مجھے
میں اور تم مل کر اس بیماری کو بھی ہرا دیں گے۔ بس اپنا یقین مت کھونے دینا۔ آدھی جنگ یقین اور حو
جیتی جاتی ہے۔ تمہیں کچھ نہیں ہوگا۔ ریلیکس"

ایک اچھے طبیب کی طرح سینئر ڈاکٹر میرا سوال ٹال گئے۔ انہوں نے ایس۔ پی صاحب کو اجاز
دی کہ وہ مجھے اپنے ساتھ لے جا سکتے ہیں، لیکن اب مجھے لگا تار معائنے کے لئے شہر کے اس بڑے ا
لانا ہوگا۔ ہم اسپتال سے باہر نکلے تو جیپ کے قریب کھڑے دو سپاہی جلدی سے ہتھکڑی لے کر میر
لپکے لیکن رحمٰن صاحب نے ہاتھ اُٹھا کر انہیں روک دیا "نہیں...... اس کی ضرورت نہیں...... عبداللہ
گاڑی میں تھانے لے جا رہا ہوں۔ تم لوگ تھانے دار صاحب کے ساتھ ہماری گاڑی کے
رہو۔" حوالدار نے کھٹ سے سلیوٹ کر کے سر ہلایا "بہتر جناب" اور رحمٰن صاحب مجھے لیے اپنی سرکا
کی جانب بڑھ گئے۔ اسپتال سے باہر نکل کر مجھے احساس ہوا کہ یہ ساحلی شہر بھی میرے شہر کی طر
جدید تھا۔ شاید ساحل پر بسنے والے شہروں میں بہت سی مماثلتیں ہوتی ہیں۔ کچھ ہی دیر میں ہم جگم
چھوڑ کر مضافات میں نکل آئے۔ ہمارے داہنی جانب کچھ فاصلے پر سمندر ٹھاٹھیں مارتا سڑک کے
دوڑتا چلا آ رہا تھا۔ شاید یہی ساحلی سڑک سیدھی "تحصیل ماہی" کے تھانے تک جاتی تھی۔ مجھے یاد آ
صاحب نے شہر سے بستی کا فاصلہ تقریباً 30 کلومیٹر بتایا تھا۔ رحمٰن صاحب خود ہی گاڑی ڈرائیو کر ر

ڈرائیور اور گارڈ جیپ کے پچھلے کھلے حصے میں بیٹھے ہوئے تھے۔ میں ڈرائیونگ سیٹ کے ساتھ والی
پر گم صم بیٹھا، اندھیرے میں سمندر کی سفید لہروں کو کناروں سے ٹکرا کر فنا ہوتے ہوئے دیکھ رہا تھا۔ ہر
کا انجام "فنا" ہی تو ہے۔ میری کہانی بھی خاتمے کے قریب ہی تھی شاید۔ رحمٰن صاحب نے سگریٹ
میں دبایا۔ ڈرائیور نے جلدی سے لائٹر دکھا کر ان کا سگریٹ سلگایا اور دوبارہ پیچھے ہو کر بیٹھ گیا۔ وہ میری
دیکھے بنا بولے "اُس دن جب میں نے تم سے تمہاری تعلیم کے بارے میں پوچھا تو تم نے ٹھیک طرح
بتایا کیوں نہیں؟" "آپ نے مدرسے کی سند کے بارے میں پوچھا تھا اور میرے پاس واقعی مدرسے
کی سند نہیں ہے۔" رحمٰن صاحب ہنس پڑے۔ "اچھا تو اب بتا دو، تمہارے پاس کون سی سند ہے؟
یزی ادب میں ایم اے کیا ہے میں نے......" وہ اُچھل ہی تو پڑے۔ "واقعی......؟ تو پھر اتنا پڑھ لکھ کر ان
کی خاک کیوں چھان رہے ہو، کوئی اچھی ملازمت کیوں نہیں کی تم نے۔" میں نے بات ٹالنے کی غرض
"اِسے بھی میری ایک ملازمت ہی سمجھیں۔ ملازمت صرف تنخواہ پانے کے لیے ہی تو نہیں کی
رحمٰن صاحب نے چونک کر میری جانب دیکھا اور مجھے ایک بار پھر اپنے لفظوں کے بے وقت چناؤ اور
اس طرح اچانک زبان سے پھسل جانے پر خود پر شدید غصہ آیا لیکن تیر ایک بار پھر کمان سے نکل چکا
خوب...... میں تو آج تک ملازمت کو صرف تنخواہ پانے کے ذرائع میں سے ایک سمجھتا رہا۔ تم اگر مناسب
اپنے بارے میں مجھے کچھ بتاؤ۔ لیکن اُسے زبردستی ہرگز نہ سمجھنا۔ جی چاہے تو بتا دو۔" "میری گزارش
یہ حکم کسی اور وقت کے لیے اٹھا رکھیے۔ فی الحال میں ایک ممکنہ مجرم کی حیثیت میں آپ کا قیدی ہوں اور
ن بہت جگہوں پر بٹا ہوا ہے۔ مجھے اپنے رہنما بزرگ کی بھی فکر ستائے جا رہی ہے۔ جانے وہ کیسے ہوں
ان کی طبیعت یہاں آنے سے پہلے ہی کچھ ٹھیک نہیں تھی۔" رحمٰن صاحب نے دھواں اُگلا "وہ بزرگ بھی
طرح ادھوری باتیں کرتے ہیں۔ بہرحال اسپتال آنے سے پہلے میں بستی میں ہی تھا تفتیش کے
ری اُن سے بھی ملاقات ہوئی تھی اور میں نے تمہارے بارے میں تسلی دی تھی انہیں۔" میں نے تشکر
دل سے ان کی جانب دیکھا۔ "شکریہ...... آپ ایک مختلف پولیس والے ہیں۔ رحمٰن صاحب ہنس
یہ لقب ہے یا الزام۔ چلو یہ بھی قبول ہے۔ تم جانتے ہو، آج بستی کے ایک بچے نے ایسا بیان دیا ہے کہ
ہوا تو پورے کیس کا رُخ ہی بدل جائے گا۔ تم جس مسجد میں مقیم ہو۔ وہاں کے پیش امام کے بیٹے نے
بتایا ہے کہ اس نے قتل کی رات اسی پہاڑی ٹیلے پر ایک دوسری عورت کو بھی جاتے ہوئے دیکھا تھا۔
ورت کسی چھوٹی گاڑی میں سوار تھی۔ بچہ ابھی چھوٹا ہے اُس لیے زیادہ جزئیات نہیں بتا سکا۔ لیکن اس کا
ہے کہ وہ اپنی میم صاحبہ کی گاڑی ٹیلے کی طرف جاتی دیکھ کر بستی سے نکل کر اس جانب بھاگا تو اس نے
ا میں اس دوسری گاڑی کو بھی اس ٹیلے کی جانب جاتے دیکھا۔ لیکن اُسی لمحے مسجد سے اُس کے باپ
ر اُسے آواز دے کر واپس بلا لیا اور ڈانٹا کہ وہ مغرب کے بعد اندھیرے میں گھر سے کیوں نکلا ہے۔

بچے نے باپ کے ڈر سے اس وقت اُسے یہ نہیں بتایا کہ اس کی میم صاحب ٹیلے پر گئی ہیں اور ان کے پیچھے
نے ایک دوسرے گاڑی بھی جاتے دیکھی ہے۔ جسے کوئی اور عورت چلا رہی تھی۔ پیش امام صاحب بچے
لے آئے اور آج جب ہم بیانات لینے کے لیے گئے تو اس بات کا پتہ چلا۔" ایس پی صاحب ضرور اثر
بات کر رہے تھ۔ لیکن یہ دوسری عورت کون تھی؟ میں اور رحمٰن صاحب دونوں ہی اس سوچ میں گم تھے کہ
کا گیٹ آپہنچا۔

ابھی میں ایس۔ پی صاحب کے ساتھ گاڑی سے اُتر کر تھانے کے برآمدے تک ہی پہنچا تھا کہ
تھانے کا محرر بھاگتا ہوا باہر آیا۔ اس کے ہاتھ میں ایک لفافہ تھا۔ وہ جلدی سے سلیوٹ کر کے بولا"
پوسٹ مارٹم کی مکمل رپورٹ آگئی ہے۔ لڑکی کے چہرے، شانے اور کمر پر جو کھرونچیں اور خراشیں آئی تھیں
اس رپورٹ کے مطابق کسی درندے کے پنجوں کے نشانات تھے۔" محرر کی بات سن کر ماحول پر ایک
طاری ہوگیا۔ رحمٰن صاحب نے یوں مایوسی سے میری جانب دیکھا، جیسے اُن کا کچھ دیر پہلے جلا، اُمید کا
ایک جھونکے ہی سے بجھ گیا ہو۔ میں نے گھبرا کر اپنے ہاتھ کے پنجوں پر نظر ڈالی۔ مجھے یوں لگا جیسے
ناخنوں سے تازہ خون ٹپک رہا ہو۔

لہو کا لباس

رات دھیرے دھیرے بیت رہی تھی۔ میں حوالات میں بیٹھا چھوٹے سے روشن دان کی تنگ سلاخوں کی
ے اپنے حصے کے چاند کو مستطیل ٹکڑوں میں بٹا ہوا دیکھ رہا تھا۔ کاش ان قید خانوں میں ایسے روشن دان
ئے جاتے، جہاں سے کم از کم مجھ جیسے سیاہ مقدر قیدی اپنے دوست، چاند تاروں سے تو ملاقات کر لیتے۔ کیا
بد پورے جسم کے ساتھ ساتھ ہمارے نظر، سوچ اور نظریے کو بھی قید کرنے کا ایک مکمل انتظام ہوتی ہے۔ میں
، حوالات میں آتے ہی اپنے ہم ذرد سنتری سے ملنگ کے بارے میں پوچھا۔ سنتری اسماعیل ہنس کر بولا" وہ
، مجنوں...... اُسے تو شام ہی کو ایس۔ پی صاحب نے رہا کرنے کا حکم دے دیا تھا۔" آج شام جب
ا۔ پی صاحب تھانے آئے تو وہ بڑے ادب سے اُن سے بولا،" جناب میرا کام یہاں ختم ہوگیا۔ آپ
زت دیں تو میں کوچ کر جاؤں۔" صاحب بہت ہنسے اور انہوں نے اُسے آزاد کر دیا۔ میں مایوس ہوگیا۔
نے اسماعیل سے درخواست کی" اسماعیل...... تم میرا ایک کام کرو گے؟" اسماعیل جلدی سے بولا" ہاں
...... ضرور...... کیوں نہیں۔"" کیا تم کل صبح کہیں سے اُس ملنگ کو یہاں بلوا سکتے ہو۔ میں اُس سے ملنا چاہتا
ں۔ وہ مجھ سے کچھ ضروری بات کرنا چاہتا تھا، لیکن تب میں اپنے ہوش و حواس میں نہیں تھا۔ کیا تم اُسے مجھ
ے بلوا سکتے ہو؟" حافظ جی یہ کس چکر میں پڑ گئے ہو۔ وہ تو سدا کا دیوانہ ہے۔ اُس کی باتوں میں نہ آنا۔" میں
نے سنتری کی منت کی کہ دیوانہ تو شاید میں بھی ہوں، تو کیا وہ ایک دیوانے کی ملاقات، دوسرے دیوانے سے
نہ کروائے گا۔ جانے اس وقت میرا دل اتنا بوجھل کیوں ہو رہا تھا کہ میری آنکھیں بھی نم ہوگئیں۔ اسماعیل
ہ دم گھبرا سا گیا" ارے ارے...... یہ کیا...... نہ عبداللہ...... نہ...... ایسے نہیں روتے...... تم تو بہت بہادر
ے ہو۔ یوں دل چھوٹا نہیں کرتے۔ میں کل صبح اُسے ضرور کہیں سے بھی تمہارے لیے ڈھونڈ کر پکڑ لاؤں گا۔
لو اب آنکھیں پونچھ لو۔" وہ مجھے کسی بزرگ کی طرح دیر تک سمجھاتا رہا۔ پتا نہیں، کبھی کبھی ہم جی کھول کر رونا
ہتے ہیں، تو وہ ہی ہم سے اتنی زیادہ دور کیوں ہوتا ہے، جس کو بھگونے کے لیے ہمارے یہ آنسو بہہ رہے
ہوتے ہیں۔ اس رات مجھے زہرا کی بہت ٹوٹ کر یاد آئی۔ میں نے دل میں عہد کر لیا کہ کل صبح سلطان بابا سے
کہہ کر زہرہ کو پیغام ضرور بھیجوں گا کہ وہ کسی بھی طرح یہاں آکر مجھ سے ایک بار مل جائے۔ میں ایک بار اپنے
مکمل ہوش و حواس میں اُس سے ملنا چاہتا تھا۔ نہ جانے پھر کبھی مکمل فرزانگی نصیب ہوگی یا نہیں۔ ڈاکٹر کی
باتوں سے آج مجھے احساس ہو چلا تھا کہ میرے پاس کچھ زیادہ وقت نہیں ہے۔ میرے ذہن میں بار بار اُس

مجذوب کی یہ پیشین گوئی گونج رہی تھی کہ ''نہ تو تجھے دنیا کا عشق نصیب ہوگا اور نہ تو مالک کی محبت کا حق
ٹھہرے گا۔'' پتا نہیں کیوں، لیکن وہ مجذوب میرے اندر سے جیسے زندگی کی آخری رمق، اُمید کا آخری قطرہ
نچوڑ کر لے گیا تھا۔ کیا میرا یہ سفر یونہی لاحاصل ہی چلا جائے گا؟ کیا واقعی میرے حصے میں نہ تو عشق مجازی
چنگاری آئے گی اور نہ ہی عشق حقیقی کی مکمل بھڑکتی آگ...... کیا میں یونہی خواہ مخواہ اِدھر اُدھر سر پٹک رہا تھا؟
سوچوں میں نہ جانے کب صبح ہوگئی۔ فجر کی نماز پڑھتے ہی ایک بار پھر میرا پورا جسم جلنے لگا۔ بڑی مشکل سے
میں نے خود کو اپنا سر سلاخوں سے ٹکرانے سے روکے رکھا، ورنہ میرے سر میں شدید درد کے جو دھماکے ہو رہے
تھے، اُن کا فوری حل مجھے بس یہی نظر آرہا تھا کہ اپنا سر اس زور سے دیوار یا سلاخوں پر دے ماروں کہ وہ ٹکڑے
ٹکڑے ہو جائے اور اس میں جو بھی مادہ، اس درد کا باعث ہے، وہ بہہ جائے۔ جانے کتنی دیر میں اپنے ہاتھ
پاؤں یونہی جکڑے بیٹھا رہا، حتیٰ کہ میری ہاتھ پیر کی اُنگلیاں مُڑ کر تقریباً چُنج ہی گئیں۔ اِسی اثناء میں اسماعیل
چائے لیے حوالات کی طرف آتا دکھائی دیا۔ میری حالت دیکھ کر وہ گھبرا گیا اور جلدی سے میری جانب دوڑا
عبداللہ...... یہ کیا ہو رہا ہے تمہیں......'' میں نے بمشکل اپنے لب کھولے۔ ''کچھ نہیں...... تم بس جا کر اُ
ڈھونڈ لاؤ۔ اس سے پہلے کہ میرا ہوش جواب دے جائے۔ تم اُسے لے آؤ......'' اسماعیل اُلٹے پاؤں
بھاگا۔ میں نے تہیہ کر رکھا تھا کہ آج اس جنوں کو خود پر تب تک حاوی نہیں ہونے دوں گا، جب تک مجھے
کچھ سوالوں کے جواب نہیں مل جاتے۔ میرا جی چاہ رہا تھا کہ میں خود اپنے ہی ماس میں اپنے دانت گاڑ دوں
جبڑے کی اینٹھن نے مجھے اس قدر مجبور کیا کہ میں نے زمین پر ریت میں پڑا لکڑی کا ایک چھوٹا سا ٹکڑا اُٹھا
اسے اپنے دانتوں کے درمیان اس زور سے جکڑ لیا کہ چند لمحوں بعد ہی وہ کڑک سے ٹوٹ کر گر گیا۔ کچھ دیر
میں اسماعیل دوڑتا ہوا واپس آیا اور اُس نے بتایا کہ وہ بازار میں چاروں طرف بھاگ بھاگ کر تھک گیا، لیکن
ملنگ دوبارہ اُسے کہیں نظر نہیں آیا، حالانکہ وہ عام طور پر اُسی بازار میں کسی نہ کسی دکان یا ہوٹل کے باہر تھڑے
چبوترے پر پڑا نظر آتا تھا۔ آج تو لوگوں نے بھی اسے نہیں دیکھا تھا۔ میری حالت تب تک قدرے سنبھل
تھی۔ لیکن میرا سارا جسم پسینے سے تر تھا اور میں ہولے ہولے کانپ رہا تھا۔ شاید مجھے پھر سے بخار ہو رہا
اسماعیل جلدی سے تھانے دار کے کمرے سے ایک موٹی سی کھیس نما چادر اُٹھا لایا، جسے میں نے اچھی طرح
جسم کے گرد لپیٹ لیا۔ اسماعیل دُکھ بھری نظروں سے میری طرف دیکھتا رہا ''یہ روگ کہاں سے لگا لیا اپنی
کو بابو...... ابھی تو تمہارے کھیلنے کھانے کے دن ہیں۔'' پھر اچانک ہی جیسے اُسے کوئی ضروری بات یاد
''ارے ہاں، رات کو یہاں سے جانے کے بعد مجھے ایک بات یاد آئی، سوچا تھا صبح آکر تمہیں بتاؤں
یہاں پہنچتے ہی تمہیں دیکھ کر سب بھول گیا۔ وہ دیوانہ جب حوالات میں تمہاری طبیعت خراب ہونے کے
رہ گیا تھا، تب بار بار تمہیں خیالوں میں مخاطب کر کے بس ایک ہی بات کہے جا رہا تھا کہ ''اُس سے کہو
دیکھے...... مشرق کو دیکھے۔'' جانے مشرق میں کیا ہے؟ میں نے چونک کر اسماعیل کو دیکھا۔ حوالات کی

دروازہ مغرب کی جانب کھلتے تھے۔ میں جہاں قید تھا، وہاں مشرق کی جانب صرف ایک سپاٹ دیوار تھی اور
میں چھوٹا سا روشن دان تھا اور بس...... پھر بھی میں بہت دیر تک آنکھیں پھاڑے دیوار کی جانب اس اُمید
دیکھتا رہا کہ شاید مجھے وہاں کچھ نظر آجائے، لیکن سب بے سود ہی رہا۔

کچھ ہی دیر میں سلطان بابا اور مرتضیٰ صاحب مجھ سے ملنے کے لیے آگئے۔ سلطان بابا دو دن ہی میں
برسوں کے بیمار اور نڈھال سے نظر آنے لگے تھے۔ وہ ابھی کال گڑھ والے حادثے سے ٹھیک طرح سنبھل نہیں
پائے تھے کہ یہ نئی افتاد آن پڑی تھی۔ کاش ہم شیخ صاحب کے ہاں کچھ روز اور ٹھہر جاتے تو اُن کی حالت بہتر ہو
جاتی لیکن یہ سب اگر ہمارے ہی بس میں ہوتا تو پھر یہ ''کاش'' لفظ ہماری لغت میں کہاں سے آتا؟ مرتضیٰ
صاحب مجھ سے اِدھر اُدھر کی باتیں کرتے رہے لیکن سلطان بابا چُپ چاپ بس میری جانب دیکھتے رہے۔
آخر کار مجھے ہی ان سے پوچھنا پڑا ''آپ کچھ کہتے کیوں نہیں...... اس طرح چپ رہیں گے تو میں اور بھی
پریشان ہو جاؤں گا۔ کچھ بات کیجیے۔'' ''کیا کہوں میاں...... سوچتا ہوں تمہارا یہ امتحان کب ختم ہوگا۔ اتنی کڑی
آزمائش تو شاید ہی کسی نے جھیلی ہو۔ لگتا ہے اس بار خود مجھ سے بھی کوئی سرا چھوٹ رہا ہے۔ کچھ سمجھ میں نہیں
آتا۔'' میں نے مختصر لفظوں میں انہیں ملنگ کی ساری بات بتا دی۔ وہ بہت دیر تک سر جھکائے بیٹھے رہے اور پھر
گہری سانس لے کر بولے ''وہ اب شاید کسی کو دوبارہ نظر نہ آئے۔ اگر اُس کا مقصد اشارہ دینا تھا تو وہ دے کر
چلا گیا۔ اس کا کام واقعی ختم ہوا۔'' میں چاہ کر بھی اُن سے یہ نہیں پوچھ سکا کہ اگر اُس کی تنبیہہ سچ ثابت ہوئی تو
پھر انجام کیا ہوگا۔ میں نے دبے لفظوں میں انہیں زہرا کو پیغام بھیجنے کا کہا۔ وہ بس سر ہلا کر رہ گئے۔ اتنے میں
باہر ہلچل سی مچی۔ پتا چلا کہ ایس پی صاحب شہر سے روانہ ہو چکے ہیں اور اب چند لمحوں میں ان کی آمد متوقع
ہے۔ اس چھوٹے سے تھانے کے لیے بھی یہ ایک اَن ہونی تھی۔ عام حالات میں ایس پی جیسا بڑا افسر شاید
سال میں ایک آدھ بار ہی کسی معائنے کے لیے یہاں آیا ہوگا، لیکن ریحان صاحب کے حکومت میں اثر و رسوخ
کی وجہ سے اس تھانے کے در و دیوار گزشتہ تین دنوں سے یہ ساری گہما گہمی دیکھ رہے تھے۔ اہل کاروں کی
مہینوں پرانی وردیوں کو روز کلف لگا کر چمکایا جا رہا تھا۔ تھانے کے در و دیوار اور احاطے کی صبح و شام دو بار صفائی
ہو رہی تھی اور کچھ زیادہ صحت مند سنتری اپنی توند کو چھپانے کے لیے بیلٹ کو اس کے آخری حلقے سے آگے کچھ
نئے سوراخ کر کے اور بیلٹ کا فیتہ سانس گھٹنے کی حد تک کس کر تھانے آنے لگے تھے۔ بکل قلعی سے جگمگا رہے
تھے اور جوتے پالش سے چمکنے لگے تھے۔ ہفتوں کی بڑھی حجامت روزانہ بننے لگی تھی اور سارے رنگروٹ صبح
سویرے اپنی گردن پر موٹی مشین پھروا کر اور سارے بال اُڑا کر آنے لگے تھے۔ کچھ ہی دیر میں ایس۔ پی
صاحب تیزی سے تھانے میں داخل ہوئے۔ تھانے دار نے سلطان بابا اور مرتضیٰ صاحب کو پہلے ہی برآمدے
میں بٹھا دیا تھا۔ آج ایس پی کا رُخ خلافِ معمول سیدھا حوالات کی جانب تھا۔ وہ سلاخوں کے قریب آکر
بڑبڑائے ہوئے لہجے میں بولے ''آئی جی نصیر صاحب سے تمہارا کیا رشتہ ہے؟'' میں نے چونک کر انہیں دیکھا

"کوئی رشتہ نہیں ہے، لیکن بہت مہربان ہیں وہ میرے۔" رحمٰن صاحب پشیمانی سے بولے "عجیب لڑکے ہو بھی۔ تم نے اتنے دن سے مجھے بتایا کیوں نہیں کہ تم...... میرا مطلب ہے تم کم از کم کوئی اشارہ ہی دے دیتے۔" میرے منہ سے اچانک بے اختیار ایک تلخ بات نکل گئی "کیا ایسا کوئی اشارہ دینے سے میرے جرم کی نوعیت بدل جاتی......؟" وہ چونکے "نہیں...... لیکن شاید میں اتنا شرمندہ نہ ہوتا جتنا آج صبح اُن کے فون کے بعد ہوا۔" لیکن میں نے تو اُن سے کوئی رابطہ نہیں کیا۔ یہ بات تو آپ خود بھی اچھی طرح سے جانتے ہیں۔" "ہاں، جانتا ہوں، لیکن شاید تمہارے بزرگ نے اُن سے رابطہ کیا ہے۔ کیا وہ ابھی تک نہیں آئے۔" تھانے دار نے جلدی سے ایس پی صاحب کو بتایا کہ اس نے ایس پی کے معائنے کی وجہ سے میرے دونوں ملاقاتیوں کو پچھلے برآمدے میں بٹھا رکھا ہے۔ رحمٰن صاحب نے جلدی سے انہیں اندر لانے کو کہا۔ تھانے دار خود بھاگا گیا۔ کچھ ہی دیر میں ہم چاروں تھانیدار کے کمرے میں بیٹھے ہوئے تھے۔ رحمٰن صاحب بہت اُلجھے ہوئے دکھائی دے رہے تھے۔ "یقین جانیں۔ یہ میری زندگی کا پہلا کیس ہے اور پہلا موقع ہے کہ میں ایک ہی دن میں کئی کئی بار حیرت کے اتنے شدید جھٹکوں سے دوچار ہوا ہوں۔ آپ لوگ پہلے ہی نصیر صاحب سے اپنا ناتا بتا دیتے۔ وہ میرے نہایت قابل احترام اُستاد ہیں۔ میں نے اکیڈمی میں اُنہی کی سرپرستی میں ٹریننگ لی تھی۔ آج میں جو کچھ بھی ہوں، اُنہی کی وجہ سے ہوں۔ اور آج صبح سویرے جب اُن کی کال آئی تو یقین جانیے، میں دل ہی دل میں بہت نادم ہوا۔ اس تمام عرصے میں میرے کسی بھی برتاؤ سے آپ کو جو بھی کوفت ہوئی ہو، میں اس سب کے لیے معذرت خواہ ہوں۔ سلطان بابا بولے "آپ نے کچھ بھی ایسا برتاؤ نہیں کیا جو آپ کے فرض کے دائرے سے باہر ہو اور پھر سچ تو یہ ہے کہ اگر عبداللہ میاں کی حالت اتنی خراب نہ ہوتی تو شاید نصیر صاحب تک میری عرض داشت کبھی نہ جاتی۔ اس جیسے نہ جانے اور کتنے الزام کتنے کلنک لگنا ابھی باقی ہیں۔ کہاں ہر بار نصیر صاحب کو زحمت دیتے پھریں گے ہم، لیکن اس بار معاملہ کچھ اور تھا لہٰذا انہیں درمیان میں لانا ہی پڑا۔ اُمید ہے آپ اس سفارش کا بُرا نہیں مانیں گے۔" رحمٰن صاحب گڑبڑا کر بولے "نہیں...... ہرگز نہیں...... یقین جانیے یہ سب میرے لیے بہت عجیب ہے۔ اتنا اختیار رکھنے کے باوجود اگر کوئی اتنی تکلیف جھیلے تو اُسے سچائی کی دوسری سند کی ضرورت ہی کہاں باقی رہتی ہے۔ آپ میں سے کوئی بھی ذاتی مچلکہ بھر کر عبداللہ کو ضمانت پر لے جا سکتا ہے۔ ہاں، بس اتنا خیال رکھنا ہوگا کہ جب تک تفتیش مکمل نہیں ہو جاتی اسے علاقے ہی میں موجود رہنا ہوگا۔ میں ذاتی مچلکے کے تکلف میں بھی نہ پڑتا کہ نصیر صاحب کی ضمانت میرے لیے دنیا کی کسی بھی ضمانت سے بڑھ کر ہے، لیکن آپ جانتے ہیں، سرکاری قواعد وضوابط بھی میرے پاؤں کی بہت سی زنجیروں میں سے ایک ہیں۔"

مرتضیٰ صاحب نے وہیں بیٹھے بیٹھے بستی کے پیش امام کی حیثیت سے ایک مچلکہ بھر دیا اور اس پر اپنے دستخط اور انگوٹھے کی مہر ثبت کر دی۔ جاتے جاتے رحمٰن صاحب نے ایک اور خبر سنائی کہ لڑکی کے چہرے اور جسم

پر خراشوں اور ناخن کے کھرونچوں کے جو نشانات تھے، وہ میرے خون اور گزشتہ شام لیے گئے میرے ناخنوں کے مواد سے مماثلت نہیں رکھتے۔ گویا فی الحال میں ایک فوری نوعیت کے شک سے پھر باہر نکل چکا تھا۔ انہوں نے یہ بھی بتایا کہ اشرف نے جو کچا پکا حلیہ اُس دوسری عورت کا بتایا تھا، اُس کا خاکہ تیار کرنے کی کوشش بھی جاری ہے، لیکن چونکہ ایک بچے کی یادداشت اور منظر نگاری بہرحال اتنی پختہ نہیں ہو سکتی تھی لہٰذا ابھی کچھ مشکلات کا سامنا تھا۔ لیکن رحمٰن صاحب پُراُمید تھے کہ پولیس جلد درست خطوط پر کیس کی تفتیش شروع کر دے گی۔ وہ ہمیں رُخصت کرنے خود تھانے کے صحن تک آئے اور سلطان بابا کے لاکھ انکار کے باوجود اپنے ڈرائیور کو ہدایت کی کہ وہ ہمیں بستی چھوڑ آئے۔ شاید اس ہدایت کے پیچھے کہیں نہ کہیں اُن کی یہ خواہش بھی کارفرما تھی کہ بستی سے مجھے ہتھکڑیاں لگا کر گرفتار کر کے لاتے وقت بستی والوں کی نظر میں میرے مجموعی تاثر میں جو بگاڑ پیدا ہوا تھا، اس کی کچھ تلافی تو ممکن ہو۔ ہم انسان ہوتے ہی اتنے ظاہر پرست ہیں کہ ہماری عزت اور ذلت کے پیمانے اسی قدر سطحی اور ناپائیدار بن جاتے ہیں۔ اس لحاظ سے رحمٰن صاحب کا یہ کلیہ سولہ آنے درست ثابت ہوا اور ہمیں ایس۔ پی کی گاڑی سے اُترتے دیکھ کر بستی والوں کے دل میں اگر کوئی رہا سہا شک باقی بھی تھا، تو جاتا رہا۔ ویسے بھی یہ سیدھے سادے مچھیروں کی بستی تھی اور یہاں کے لوگ رشتوں کے معاملے میں زیادہ بھاؤ تاؤ کے قائل نہیں تھے۔

اشرف کو اسکول سے آتے ہی جب یہ پتا چلا کہ میں واپس آ گیا ہوں تو وہ دوڑتا ہوا مسجد آ پہنچا۔ میں مسجد سے ذرا فاصلے پر کھجور کے تین چار جڑے ہوئے درختوں کے جھنڈ تلے بیٹھا ہوا تھا۔ اشرف مجھے کچھ بتانے کے لیے بے چین تھا، لیکن ابھی کچھ دیر پہلے ہی ظہر کی نماز ختم ہوئی تھی اور دو چار نمازی مجھ سے ملنے کے لیے کچھ دیر رُک گئے تھے، لہٰذا اُن کے جانے تک اشرف ریت میں گھروندے بنانے کا کھیل کھیلتا رہا اور پھر جیسے ہی آخری نمازی مجھ سے رُخصت ہوا وہ جلدی سے لپک کر میرے قریب آ گیا۔ "پتا ہے...... کل وہ پتنگ والے صاحب آئے تھے شام کو وہاں۔ میرے لیے بہت سی پتنگیں بھی لائے تھے۔ پر میں نے چھپ کر دیکھا تھا۔ وہ رو رہے تھے اُس جگہ بیٹھ کر۔" میرے دل پر ایک گھونسا سا لگا۔ اُس بدنصیب کو تو اب تمام عمر رونا تھا۔ "اور پتا ہے...... وہ زور زور سے کسی کو کہہ رہے تھے کہ تم نے اچھا نہیں کیا...... یہ تم نے اچھا نہیں کیا...... پر طالب جی...... وہاں تو کوئی تھا ہی نہیں۔" میں زور سے چونکا۔ اشرف مجھے طالب اور سلطان بابا کو بڑے مولوی جی کہتا تھا۔ لیکن آخر یہ ریحان کس سے خود کلامی کر رہا تھا۔ کس نے، کیا اچھا نہیں کیا۔ میں نے اشرف کو زیادہ کریدا تو مجھے اتنا سمجھ میں آیا کہ ریحان عموماً جب بھی وہاں تنہا آتا تھا تو خود کلامی ضرور کرتا تھا۔ دنیا کے زیادہ تر بڑے اور کامیاب انسان اندرونی طور پر شدید تنہائی کا شکار ہوتے ہیں۔ کیوں کہ اُن کے آس پاس عملہ تو سینکڑوں اور ہزاروں میں ہوتا ہے لیکن ایک دوست کی کمی انہیں سدا پریشان کرتی رہتی ہے، اُن میں سے بہت سے اس خود کلامی کے مرض کا شکار ہو جاتے ہیں۔ شاید ریحان کے ساتھ بھی یہی مسئلہ تھا۔ شام تک دو چار مرتبہ میری

طبیعت بگڑی اور پھر سنبھل بھی گئی، لیکن اس دھوپ چھاؤں کے کھیل نے مجھے نڈھال کر ڈالا، لہٰذا مغرب کے بعد میں کچھ دیر کے لیے مسجد کے حجرے میں جا کر لیٹ گیا۔ اس دوران سلطان بابا لگاتار مجھے سادہ پانی پر کچھ دم کر کے پلاتے رہے اور میرے اندر کی جلن کو اس پانی سے قدرے سکون بھی ملتا رہا۔ درمیان میں حکیم صاحب بھی آئے تھے اور انہوں نے بڑی عجیب سی بات بتائی کہ کچھ گھاؤ اور کچھ زخم بظاہر بھر جانے کے باوجود اس خاص مدت میں ایک بار پھر ٹیس پکڑ لیتے ہیں، جب وہ تاریخیں اور وہی خاص وقت پلٹتا ہے، جس میں ماضی میں ہم نے وہ زخم یا چوٹ کھائی ہوتی ہے۔ ان میں کچھ زخم سہ ماہی، ششماہی اور کچھ تو سال بھر کے بعد بھی دوبارہ ہرے نہ بھی ہوں، تب بھی اپنی پوری کسک اور بے چینی کے ساتھ پلٹتے ہیں۔ اُن کے اس کلیے کی رُو سے مجھے پچھلے ماہ انہی تاریخوں میں یہ زہریلے گھاؤ لگے تھے اور کتوں کا زہر میرے جسم میں پھیلا تھا۔ بروقت ملی دوا اور ویکسین کے ٹیکوں نے وقتی طور پر میری جان تو بچالی لیکن ان درندوں کے خون خوار جرثوں کا زہر میرے خون کے خلیوں ہی میں دوا اور ویکسین سے بچنے کے لیے اپنے ہی بنائے کسی حفاظتی خول میں جا کر چھپ گیا تھا اور اب ٹھیک اُسی وقت اور تاریخ کو تیس دن کا عرصہ گزرتے ہی وہ پھر سے میرے اعصابی نظام پر حملہ آور ہوا تھا۔ گویا اس زہر نے اپنے دائرے کو مکمل کرنے میں مہینے بھر کا عرصہ لیا تھا اور یہ حملے اب ہر ماہ انہی تاریخوں میں اور اِسی خاص وقت پر میرے اعصابی نظام کو تباہ کرنے کے لیے ہوتے رہیں گے۔ بظاہر ایلوپیتھی اور جدید طب میں اس کی وجہ اور مثال ڈاکٹروں کو ڈھونڈنے سے بھی نہ ملتی، پر بقول حکیم صاحب ان کی سات نسلیں حکمت ہی کے پیشے سے وابستہ رہی ہیں اور وہ اپنی پرانی حکمت کی کتابوں میں موجود مستند تفصیل پڑھنے کے بعد ہی اس نتیجے پر پہنچے ہیں۔ انہی سوچوں میں گم نہ جانے کس وقت میری آنکھ لگ گئی۔ کبھی کبھی ہماری نیند اس قدر بے چین اور کچی ہوتی ہے کہ ہم سوتے وقت بھی خود کو جاگتا ہوا محسوس کرتے ہیں اور کبھی کبھی تو بند آنکھوں کے پردے تلے بھی ہمیں اپنے آس پاس ہوتی حرکات کا ادراک ہوتا رہتا ہے۔ کچھ ایسی ہی کیفیت اس وقت میری بھی تھی۔ جانے وہ خواب تھا یا سراب...... لیکن میں نے اپنی بند آنکھوں کے پپوٹوں تلے ایک عورت کی شبیہہ بنتی محسوس کی۔ میں بے چینی سے کسمسایا، لیکن اُس عورت کی تصویر بنتی چلی گئی۔ عجیب سی سفاکی تھی اُس کے چہرے پر۔ مجھے یوں محسوس ہوا کہ میں نے پہلے بھی اُسے کہیں دیکھا ہے...... کہاں......؟ وہ بیک وقت میرے لیے بے حد اجنبی اور بہت شناسا چہرہ تھا۔ اور وہ عجیب سی سفاکی لیے میری جانب گھور رہی تھی۔ میری ریڑھ کی ہڈی میں ایک سرد لہر دوڑ گئی اور خوف کے مارے جھٹکے سے میری آنکھ کھل گئی۔

کچھ دیر تک تو مجھ سے حرکت بھی نہ ہو سکی۔ وہی عجیب سی کپکپی میرے سارے وجود پر طاری تھی۔ میں نے سنا تھا، ہم جس بات کا بوجھ اپنے ذہن پر لیے بستر پر جاتے ہیں، وہی واقعہ ٹھیک اُسی طرح ہمارے خواب میں وقوع پذیر ہوتا ہے۔ ایس پی صاحب کی زبانی جب سے ایک دوسری عورت کا اس قصے میں ذکر سنا تھا، تب سے شاید وہی عورت میرے حواس پر بھی سوار تھی۔ تبھی میں سوتے میں بھی اُس کے ہیولے کو دیکھ رہا تھا۔ اچانک

مجھے دور سے کسی چھوٹی گاڑی کے انجن کی آواز سنائی دی۔ ہوا کا رُخ بدلا اور آواز غائب ہو گئی۔ میں لپک کر حجرے سے باہر نکلا۔ دُور اُسی پہاڑی ٹیلے پر کسی گاڑی کی روشنیاں مجھے نظر آئیں۔ میرے قدموں میں جیسے بجلی سی بھر گئی اور میں اس جانب دوڑا۔ دُور سے میں نے کسی عورت کی پشت دیکھی۔ اس کی لمبی چوٹی کمر پر لہرا رہی تھی اور وہ سمندر کی جانب منہ کیے کھڑی تھی۔ گاڑی کی پارکنگ والی بتیاں ابھی تک روشن تھیں۔ میرے بھاگتے قدموں کی آواز پر وہ گھبرا کر پلٹی اور چند لمحوں کے لیے ملگجے سرخ اُجالے میں اُس کے چہرے پر میری نظر پڑی۔ مجھے سکتہ سا ہو گیا۔ یہ وہی عورت تھی، جسے کچھ دیر پہلے میں نے اپنے ذہن کے پردے پر دیکھا تھا۔

آدھا چہرہ

کچھ لمحے وہ مجھے اور میں اُسے یونہی آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھتے رہے۔ ٹیلے پر بہت اندھیرا تھا اور پر
منظر میں ساحل پر پھیلی چاند کی قدرتی روشنی اس چوٹی کو مزید تاریک بنا رہی تھی۔ اگر اس چھوٹی مارک ٹو کار کی
پارکنگ والی بتیاں روشن نہ ہوتیں تو میں اتنی دُور سے شاید اُس کا چہرہ بھی نہ دیکھ پاتا۔ گاڑی کے اردگرد روشنی کا
ایک سرخ ہالہ سا بنا ہوا تھا اور اسی ہالے میں مجھے اُس کے چہرے کی دھیمی سی لیکن بے حد سفاک جھلک نظر آئی
تھی۔ نہ جانے اُس چہرے میں ایسا کیا تھا کہ میرے ریڑھ کی ہڈی پر گردن کی پشت سے ہوتی ہوئی سرد پسینے کی
ایک لہر سی دوڑ گئی، میری غلطی یہ تھی کہ میں نے اُس کی جانب آتے ہوئے دوڑتے وقت اپنے قدموں کی چاپ
پر قابو نہ رکھ پایا تھا اور اسی آواز اُسے ہوشیار کر دیا تھا۔ وہ پل بھر میں ایک جھٹکے سے مڑی اور بجلی کی طرح گاڑی
میں بیٹھ کر گاڑی اسٹارٹ کر دی۔ میں زور سے چیخا ''میری بات سنیے...... رک جایئے۔'' لیکن وہ بھلا کہاں
رُکنے والی تھی۔ دوسرے ہی لمحے اُس کی گاڑی نے لمبا سا موڑ کاٹا اور فراٹے بھرتی ہوئی وہاں سے روانہ ہو گئی
اور جب تک میں گاڑی کے مقام تک پہنچا، وہ اندھیرے میں تحلیل ہو چکی تھی۔ بہت دیر تک تو میں اپنی پھولی
سانسوں پر قابو ہی نہیں پا سکا۔ گاڑی جا چکی تھی اور اب صرف اس کے پہیوں کے نشانات ہی وہاں باقی رہ گئے
تھے۔ یہ ٹھیک وہی جگہ تھی، جہاں سے پولیس کی تفتیش کے مطابق لیلیٰ نیچے گری تھی یا اُسے دھکا دیا گیا تھا۔ میں
نے آگے بڑھ کر چٹانوں کے نیچے جھانکا تا کہ میں وہ قاتل گہرائی دیکھ سکوں، جس نے ایک معصوم جان لی تھی
اچانک مجھے زوردار چکر آیا اور مجھے لگا کہ میں خود بھی چند لمحوں میں اسی گہرائی کا شکار ہو جاؤں گا لیکن بھلا ہو
قریب نکلی چٹان کے ایک پتھر کا جو لہراتے وقت میرے ہاتھ میں آ گیا اور میں اُسی کا سہارا لے کر زمین پر بیٹھ
گیا۔ مجھے کبھی بھی اُونچائی کے خوف (HeightPhobia) کا عارضہ لاحق نہیں رہا۔ لیکن آج میں نہ جانے
اُونچائی کیوں جھیل نہیں پا رہا تھا۔ میں اکثر خواب میں خود کو کسی اُونچی جگہ پر معلق یا پھر اُونچائی سے خود کو نیچے
گرتے ہوئے محسوس کرتا تھا اور ہر بار میری آنکھ کھل جاتی تھی۔ آج یوں لگا جیسے وہ خواب سچ ہونے کو تھا۔ مجھے
یاد آیا کہ اسپتال والے سینئر ڈاکٹر نے ریبیز کی ایک علامت ''اُونچائی کا خوف'' بھی بتائی تھی۔ میں نے آس
پاس نظر دوڑائی تو مشرق کی سمت میں کوئی چیز ریت میں پڑی چمکتی نظر آئی۔ میں نے اُسے اٹھایا تو سرخ رنگ
کی ایک پتلی نوک دار ہیل تھی۔ اوہ گویا وہ پُراسرار عورت اپنی جوتی کی ایڑی تڑوا کر جلدی میں یہیں چھوڑ گئی
تھی۔ اگلے روز ٹھیک اسی جگہ میں رحمٰن صاحب اور اُن کی ٹیم کے ہم راہ کھڑا تھا اور وہ سرخ جوتی کی ایڑی اب

رحمٰن صاحب کے ہاتھ میں تھی، جسے وہ اُلٹ پلٹ کر دیکھ رہے تھے۔ ''حیرت ہے...... اگر یہ وہی عورت تھی،
جس کی تلاش میں ہم دربدر بھٹک رہے ہیں تو پھر اس کی ہمت کی داد نہ دینا بھی زیادتی ہوگی اور میں یہ تسلیم
کرنے میں بھی کوئی عار محسوس نہیں کرتا کہ میں بھی روایتی پولیس والوں کی طرح تفتیش میں اُلجھ کر اور ہر طرف
جال بچھا کر مطمئن ہو گیا تھا۔ جب کہ سب سے اہم لیکن غیر متوقع جگہ پر ناکہ لگوانا بھول گیا۔ میرے ذہن میں
یہ بات کیوں نہیں آئی کہ اگر کوئی اور عورت بھی اس کیس کا مرکزی کردار ہے تو وہ واپس یہاں بھی آ سکتی ہے۔
ضرور اس جگہ میں کوئی خاص بات ہے، جو بظاہر ہمیں محسوس نہیں ہوئی، لیکن اس کی کیس کے باقی کرداروں کے
لیے کوئی نہ کوئی شدید جذباتی اہمیت ہے۔ اب شاید وہ دوبارہ یہاں نہ آئے، کیوں کہ وہ جان چکی ہے کہ وہ
لوگوں کی نظروں میں آ گئی ہے۔ لہٰذا اب ہمیں خود اس کے پیچھے جانا ہوگا۔'' رحمٰن صاحب نے گاڑی کا حلیہ اور
عورت کی شبیہہ کی تفصیلات مجھ سے کئی بار پوچھیں۔ نمبر میں نوٹ نہیں کر پایا تھا، کیوں کہ میرا فاصلہ گاڑی سے
بہت زیادہ تھا۔ البتہ گہرے نیلے یا سیاہ رنگ کی ایسی مارک ٹو گاڑیاں تو شہر میں نہ جانے کتنی ہوں گی۔ بہرحال،
رحمٰن صاحب کے نقطۂ نظر سے یہ کیس میں بڑی پیش رفت تھی اور شام ڈھلنے تک اس مقام والوں پر مختلف
پولیس والوں کا آنا جانا برقرار رہا۔

اس وقت بھی سورج ڈھلنے کے قریب میں دُور ریت پر بیٹھا تھانے دار کو اپنے محرر کو کچھ تفصیلات لکھواتے
ہوئے دیکھ رہا تھا، شاید وہ وقوعے کا نقشہ پھر سے بنا رہے تھے۔ تھانے دار کی آواز مجھ تک آ رہی تھی۔ محرر نے
کچھ غلط لکھ ڈالا۔ تھانے دار چلایا ''میں نے کہا تھا مشرق کی سمت سے نشانی ملی...... مشرق کی سمت سے...... سمجھ
نہیں آتا کیا......؟'' اور ٹھیک اُسی لمحے میرے کان میں اسماعیل سنتری کی آواز گونجی۔ ہاں اس نے بھی تو یہی
بتایا تھا کہ وہ مجذوب میرے لیے یہی پیغام چھوڑ گیا تھا کہ میں مشرق کی سمت دیکھوں، اور مجھے پہلی نشانی
مشرق ہی میں ملی تھی۔ جانے یہ سب کیا ہو رہا تھا۔ رات جب میں اُس عورت کو دیکھنے کے بعد واپس حجرے
میں پہنچا تو سلطان بابا میری تلاش میں نکلنے ہی والے تھے۔ میں نے انہیں اپنے خواب اور پھر اُس عورت کے
بارے میں بتایا کہ جس ہیولے کو چند لمحے پہلے میں نے بند آنکھوں کے پردے تلے دیکھا، وہی کچھ دیر بعد
میرے سامنے حقیقت بن کر کھڑا تھا۔ سلطان بابا میری بات ختم ہونے کے بعد بھی بہت دیر تک میری جانب
دیکھتے رہے۔ ''جانتے ہو...... یہ تمہارا پہلا الہام تھا۔ آج تک تمہیں جو کچھ نظر آتا رہا، وہ ماضی میں ہو چکا تھا اور
وہ کیا کہتی ہے سائنس کی ڈائی پولر تھیوری آف گریوٹی...... اس کے مطابق وہ سب صرف بنی ہوئی اور گزری
ہوئی تصویروں کے فریم ہوتے تھے، لیکن اب جو تم نے دیکھا وہ ماضی نہیں مستقبل تھا۔ لگتا ہے تمہاری ریاضت
قبول ہو رہی ہے عبداللہ میاں...... جیتے رہو۔'' مجھے دعا دیتے وقت اُن کی آنکھوں میں نمی اور میرے سر پر رکھا
ہاتھ لرز رہا تھا۔ میں انہی سوچوں میں گم تھا کہ تھانے دار اور محرر نے اپنا کام ختم کر لیا اور جاتے جاتے مجھ سے کہا
کہ میں آئندہ کوئی بھی غیر معمولی بات محسوس کروں تو فوراً بستی کے پوسٹ آفس سے ماہی تحصیل تھانے کے نمبر

پر فون کر کے بتا دوں۔ سورج ڈھلتے ہی سب عملہ وہاں سے رُخصت ہو گیا۔

اگلی صبح رحمٰن صاحب کا پیغام آ گیا کہ میں تھانے آ کر اُس عورت کا خاکہ بنوا دوں۔ میں بستی سے چلنے والی واحد قدیم سی بس میں سوار ہو کر تھانے پہنچا تو زیادہ تر عملہ تھانے دار سمیت کسی چھاپے پر گیا ہوا تھا۔ آسمان پر بادلوں کے چند ٹکڑے ان شریر بچوں کی طرح اِدھر اُدھر ڈول رہے تھے، جو اسکول سے بھاگ کر کھلیانوں اور میدانوں میں مٹرگشت کرتے پھرتے ہیں۔ خاکے بنانے والا فنکار اور محرر تھانے میں موجود تھے۔ محرر نے مجھے اپنی ہی کمرے میں بلا لیا۔ کمرہ کیا تھا چھوٹا سا کیبن تھا، جہاں ایک طرف میز پر ایک پرانا سا وائرلیس نظام اور ایک قدیم سا مٹیالے رنگ کا ٹیلی فون پڑا ہوا تھا، جس کے ڈائل کے اُوپر ایک چھوٹا سا زنگ آلود تالا لگا تھا۔ تالے کی حالت بتا رہی تھی کہ اس میں چابی گھمانے کے مواقع کم ہی آتے ہوں گے۔ محرر نے مجھے فنکار کے ساتھ بیٹھا دیا اور خود چائے کا کہنے کے لیے کمرے سے باہر چلا گیا۔ میں نے اُس رات اُس عورت کے چہرے کا صرف دایاں حصہ ہی دیکھا تھا، وہ بھی سرخ ملگجے اندھیرے میں، چہرے کا بایاں حصہ نقاب اور کم اندھیرے میں چھپا ہوا تھا، لہٰذا میں احتیاط سے سوچ سوچ کر مصور کو اُس عورت کے خدوخال اپنی یادداشت کے مطابق بتا رہا تھا، جسے وہ تیزی سے کاغذ پر پنسل کے ذریعے اسکیچ کی صورت میں اُتار رہا تھا۔ اچانک مصور نے اپنی جگہ سے ذرا حرکت کی اور پہلو بدل کر بیٹھ گیا۔ اس وقت وہ کمرے کی مشرقی سمت میں بیٹھا ہوا تھا۔ اُس کے ہٹتے ہی میں نے دیکھا، اُس کے پیچھے دیوار پر میخوں کی مدد سے جھولتا ہوا ملک کا ایک پرانا سا نقشہ لگا ہوا تھا۔ میں مصور کو تفصیلات بتاتے بتاتے بے خیالی میں نقشے میں اپنا شہر ڈھونڈنے لگا۔ اپنے شہر سے رحیم یار خان، رحمٰن آباد پھر جبل پور، کمال آباد اور پھر کال گڑھ اور اب یہ چھوٹی سی تحصیل ماہی...... میں نقشے پر خیالی اُنگلی سے اپنے سفر کی منزلوں کے نقطے جوڑتا رہا اور پھر اچانک ہی میرے ذہن میں ایک کوندا لپکا۔ میں نے جلدی میں تین بار پھر نقشے پر ان نقطوں کو جوڑا، سلطان بابا نے بھی مجھ سے یہی کہا تھا کہ وقت ملے تو میں نقشہ دیکھ لوں۔ مصور اپنے کام میں جتا ہوا تھا اُسے مجھ سے جتنی تفصیل مل سکتی تھی، میں اُسے بتا چکا تھا، میں نے زمین پر پڑے اُس کے کینوس کے تھیلے میں سے جھانکتی بہت سی رنگ برنگی پینسلوں میں سے ایک پینسل نکالی اور اس کی مدد سے اب تک کے اپنے سفر کے نقطوں کو جوڑا اور میری آنکھیں پھیلتی گئیں۔ ان نقطوں کو جوڑنے سے جو شکل اس مٹیالے نقشے پر میری رنگین پینسل نے بنائی تھی وہ پہلے الف اور پھر لہ تک آ کر رُک گئی تھی یعنی اگر مکمل جوڑا جاتا تو اللہ کا الہ بنتا تھا یعنی حرف ہ کی کمی تھی، جسے جوڑنے سے پورا ''اللہ'' کا نام بن جاتا۔ میرے دماغ میں جھکڑ سے چلنے لگے۔ سلطان بابا نے کہا تھا کہ انہیں ہمارے سفر کے راستوں اور منزلوں کے بارے میں کچھ اشارے ملتے ہیں۔ کیا قدرت میرے راستوں اور پڑاؤ کے مقامات کے ذریعے اپنا پورا نام لکھنا چاہتی ہے۔ تو کیا اب تک کا میرا یہ سارا سفر پہلے ہی سے طے شدہ تھا؟ کیا یہ سفر اُسی وقت طے ہو چکا تھا، جب عبداللہ نام کا یہ اعزاز ساحر کے نام کی جگہ میرے حصے میں لکھ دیا گیا تھا۔ مصور جانے کب سے خاکہ مکمل کر

کے اس انتظار میں تھا کہ میں دیوار کے نقشے سے ہٹ کر اُس کی تصویر کو دیکھ اپنا حتمی فیصلہ سناؤں، لیکن اس وقت میرے حواس میرے قابو ہی میں کب تھے۔ محرر کب کا چائے رکھ کر جا چکا تھا، جواب پانی ہو چکی تھی۔ میں نے خاکے پر نظر ڈالی۔ مصور اصل چہرے سے بہت قریب تھا۔ میں نے اُس سے درخواست کی کہ وہ ایسا ہی ایک خاکہ میرے لیے بھی بنا دے۔ مصور نے بنا کسی پس و پیش کے ہو بہو ویسا ہی دوسرا خاکہ بنا کر میرے حوالے کر دیا اور ایک بار پھر اس آدھے چہرے کے خاکے نے مجھے سوچنے پر مجبور کر دیا کہ میری اُس عورت سے پہلے بھی کہیں نہ کہیں ملاقات ہو چکی ہے۔ کاش میں اُسے بروقت پہچان پاتا۔

میرے بستی پہنچتے پہنچتے عصر کا وقت بس نکلنے کو تھا۔ نماز پڑھ کر جب میں مسجد سے باہر آیا تو دُور آسمان پر میں نے دھانی رنگ کی ایک پتنگ اُڑتے ہوئے دیکھی۔ نیچے ساحل پر اشرف اپنے دوستوں کے ساتھ خوشی سے سرشار پتنگ کو ڈھیل دیئے جا رہا تھا اور اُس کی دھانی پتنگ، دُور آسمان میں اتنی بلند ہو چکی تھی، جہاں سے اس کے اُوپر کا ہلکا نیلا آسمان بھی دھانی رنگ اختیار کرتا جا رہا تھا۔ میں نے چونک کر دُور ٹیلے کی جانب دیکھا جہاں ریحان کی گاڑی کھڑی نظر آئی۔ مجھے تھانے دار نے بتایا تھا کہ ٹھیک اِسی رنگ اور ماڈل کی دوسری گاڑی ریحان نے لیلیٰ کو بھی کمپنی کی طرف سے دے رکھی تھی۔ ریحان حسب معمول سمندر کی طرف چہرہ کیے گم صم سا بیٹھا تھا۔ آج اُس کے ساتھ اُس کا پرانا ڈرائیور بھی موجود تھا۔ اُس ڈرائیور کو میں پہلے بھی ریحان کے ساتھ پہلی والی ملاقات کے روز دیکھ چکا تھا، جو پینسٹھ سے ستر برس کے پیٹے کا ایک سنجیدہ اور کم گو شخص تھا۔ دل چسپ بات یہ تھی کہ میں اپنی زندگی میں اب تک جتنے بھی ڈرائیوروں سے ملا تھا وہ گفتگو کے معاملے میں دو انتہاؤں پر تھے۔ یا تو بے انتہا باتونی یا پھر انتہائی خاموش...... ریحان میرے قدموں کی آہٹ سن کر پلٹا ''...... تم ہو...... مجھے رحمٰن صاحب نے بتایا تھا کہ تمہیں ضمانت پر رہا کر دیا گیا ہے۔ چلو اچھا ہوا...... پولیس کی غلط فہمی دُور ہو گئی......'' میں نے غور سے ریحان کی طرف دیکھا ''مجھے پولیس کی کبھی اتنی پرواہ رہی بھی نہیں، کیا آپ کا دل بھی میری طرف سے صاف ہو گیا ہے۔'' ریحان اُسی طرح خلا میں گھورتا رہا۔ ''جو خود اپنی ذات سے بدگمان ہو، اُسے بھلا اوروں سے بدگمانی کا موقع ہی کب ملتا ہے۔ مجھے تم سے کوئی شکایت نہیں ہے۔'' ریحان کے انداز سے لگتا تھا کہ وہ اس موضوع پر بات نہیں کرنا چاہتا، بلکہ اُسے اپنی تنہائی میں مداخلت بھی شاید پسند نہیں آئی تھی۔ اتنے میں اُس کا ڈرائیور گاڑی سے نکل کر ہمارے قریب آ گیا اور ریحان سے بولا ''چھوٹے صاحب...... سورج ڈھلنے والا ہے، ہماری واپسی کا وقت ہو گیا ہے۔'' ریحان کی آواز درشت تھی۔ ''تم دیر میں چلتے ہیں......'' لیکن میری حیرت بڑھ گئی، جب ڈرائیور نے دوبارہ اصرار کیا۔ ''نہیں چھوٹے صاحب...... سورج ڈھل جائے گا...... ہمیں ابھی روانہ ہو جانا چاہیے......'' ریحان نے کڑی نظروں سے ڈرائیور کو دیکھا لیکن بادل نخواستہ اُس نے اپنی گاڑی کی جانب قدم بڑھا دیئے۔ ایک ڈرائیور کی ہدایت پر ریحان کا یوں بنا چوں چرا اس کے چل دینا مجھے عجیب سا لگا اور پھر سورج ڈھل جانے میں ایسی کیا بات تھی۔ ایسی

ہدایات تو عام طور پر چھوٹے بچوں کے لیے ہوتی ہیں کہ شام ڈھلنے سے پہلے گھر لوٹ آنا، جب کہ ریحان کے بارے میں مجھے جتنا کچھ پتا چلا تھا اس اعتبار سے تو وہ اپنے گھر میں تنہا رہتا تھا۔ ماں باپ عرصہ پہلے چکے تھے اور وہ اکلوتا تھا، لہٰذا اُس کا گھر میں انتظار کرنے والا کوئی بھی نہیں تھا۔ ایک لیلیٰ تھی، جو اُس میں بہار بن کر آنے سے پہلے ہی پت جھڑ کی نذر ہو چکی تھی۔ پھر گھر واپس لوٹنے کی یہ جلدی کیوں؟ اپنے آپ ہی سے سوال کر کے خود ہی ان کے جواب تلاش کرتا رہا۔ سورج ڈھلنے کا تعلق اندھیرے سے تو کیا ریحان تاریکی سے خوف کے کسی اسرار میں مبتلا تھا۔ میرا جی چاہا کہ میں ریحان کے پیچھے جا کر دیکھو وہ اس وقت اپنے گھر ہی گیا ہے یا اُس کی کوئی اور مصروفیت ہے؟ عشاء کے بعد مرتضیٰ صاحب میر سلطان بابا کے لیے گھر کا بنا ہوا کچھ میٹھا لے کر آئے تو اشرف بھی اُن کے ساتھ تھا۔ میں نے اشرف کو ا اور ہم دونوں برآمدے میں بیٹھ گئے اور میں نے اِدھر اُدھر کی باتوں کے دوران اُس سے پوچھا کہ کیا پتنگ والے صاحب کبھی شام ڈھلنے کے بعد بھی ساحل کی طرف آئے ہیں۔ اشرف نے کچھ دیر سوچا ا میں سر ہلایا۔ ''نہیں ناں...... وہ تو میم صاحبہ کو بھی کبھی دیر تک وہاں نہیں رہنے دیتے تھے، حالانکہ کہ میرے کئی مرتبہ میم صاحب نے اُن کو بولا بھی تھا کہ ہم رات کو پتنگ اُڑائیں گے اور اپنی پتنگ ستاروں تک جائیں گے، لیکن صاحب کبھی رات تک رُکتے ہی نہیں تھے۔'' میں نے مصور کا بنا ہوا خاکہ اشرف کو دکھا اُس رات تم نے اسی عورت کو پہاڑی پر آتے دیکھا تھا۔'' اشرف نے جلدی سے اثبات میں سر ہلا ہاں...... یہی تو تھی۔ بہت تیز گاڑی چلا رہی تھی۔'' کچھ گتھیاں ایک جانب سے اُلجھ رہی ہوتی ہیں تو د سرے سے ان کی گرہیں کھل بھی رہی ہوتی ہیں۔

اگلی صبح میں نے پوسٹ آفس سے تھانے فون کر کے رحمٰن صاحب کے دفتر کا نمبر لیا اور انہیں فوراً گزارش کی کہ میں اُن سے ملنا چاہتا ہوں۔ انہوں نے مجھے تھانے پہنچنے کی ہدایت کی اور خود بھی دو وہاں پہنچ گئے۔ میں نے انہیں بتایا کہ سیئیر ڈاکٹر کی پیش گوئی کے مطابق میرے دوروں کی تعداد میں ا ان کے درمیانی وقفے میں روز بروز کمی ہو رہی ہے، لیکن میں چاہتا ہوں کہ میرے مکمل جنوں سے پہلے قتل کی گتھی سلجھ جائے اور اس کے لیے مجھے اُن کی کچھ مدد کی ضرورت ہے۔ رحمٰن صاحب نے چونک دیکھا ''لیکن تمہارا علاج بھی تو ساتھ ساتھ چل رہا ہے...... پھر تمہیں اتنا پختہ یقین کیوں ہے کہ تم مکمل منزل کو پہنچ کر ہی رہو گے......؟ بہر حال، میں ہر طرح کی مدد کے لیے حاضر ہوں...... اور یہی میرا ہے......'' ''نہیں...... میرے لیے فرض سے بڑھ کر آپ کا ایک اور احسان ہو گا۔ میں صرف اتنا چاہتا آپ میری اور ریحان کی ایک ملاقات کا بندوبست کروا دیں، لیکن ہماری ملاقات شام ڈھلنے کے چاہیے۔'' ریحان صاحب کو حیرت کا شدید جھٹکا لگا۔ ''لیکن شام ڈھلنے کے بعد ہی کیوں...... شاید بات کا علم نہیں کہ ریحان شام کے بعد کسی سے بھی ملاقات نہیں کرتا۔ پولیس کو بھی اُس نے ہمارے

ذریعے خاص ہدایت کر رکھی ہے کہ وہ مغرب کے بعد کسی شخص سے بھی نہیں ملتا، چاہے طوفان ہی کیوں نہ آجائے۔ ہم بھی اس سے زیادہ اصرار نہیں کر سکتے، کیوں کہ بڑا آدمی ہے اور اُس کی پہنچ بھی دُور تک ہے۔'' میں نے حیرت سے پوچھا ''لیکن کیا یہ بہت عجیب بات ہے...... ایک شخص مغرب ہوتے ہی دنیا کی نظر سے اوجھل ہو جاتا ہے۔ اگر ایسے میں کوئی ایمرجنسی ہو جائے تو اُس سے کیسے رابطہ ہو سکے گا۔'' ''ایمرجنسی کے لیے'' اُس کے ایک پرانے ڈرائیور کا فون نمبر موجود ہے، جو مغرب کے بعد ریحان کی تمام فون کالز اور پیغام وصول کرتا ہے۔ اصل میں یہ ڈرائیور ریحان کے باپ سیٹھ غیاث کے دور کا ہے اور یہی دنیا کا وہ واحد فرد ہے، جسے ریحان کا اعتماد حاصل ہے۔'' ''لیکن یہ معما کیسا ہے؟'' ''کچھ نہیں...... بڑے لوگوں کی بڑی باتیں۔ ویسے عام لوگوں میں یہی بات مشہور ہے کہ ریحان کو بچپن ہی سے اندھیرے کا کوئی خوف (Darkness Phobia) ہے۔ بڑے گھروں کے بچوں میں تنہائی کی وجہ سے ایسی نفسیاتی بیماریاں کچھ زیادہ اچنبھے کی بات نہیں ہوتیں۔ اور پھر آخر یہ اُس کی اپنی زندگی ہے۔ اُس کی مرضی کہ وہ اندھیرا ہونے کے بعد کسی سے ملے یا انکار کر دے۔ ہم اُس پر زبردستی بھی تو نہیں کر سکتے۔'' میں نے گہری سانس لی ''مطلب یہ کہ میرا ریحان سے مغرب کے بعد ملنا ممکن نہیں ہو گا۔'' ''میں کچھ وثوق سے نہیں کہہ سکتا۔ لیکن ماضی کے تجربات کو سامنے رکھتے ہوئے مجھے یہ بہت مشکل لگتا ہے۔'' ''اچھا آپ اتنا تو کر سکتے ہیں کہ مجھے شام ڈھلے اُس کے گھر تک پہنچا دیں یا مجھے اُس کا پتا دے دیں۔ میں اپنے طور پر اس سے ملنے کی کوشش کروں گا۔'' رحمٰن صاحب اب بھی کچھ مخمصے میں تھے۔ ''ہاں...... یہ کوئی بڑا مسئلہ نہیں ہے...... میرا عملہ تمہیں ریحان کے کوٹھی کے باہر پہنچا دے گا، لیکن میں اب بھی سمجھ نہیں پایا کہ تم اُس سے مغرب کے بعد کیوں ملنا چاہتے ہو۔ میں نے سنا ہے ریحان اپنی اس اندھیرے سے ڈرنے والی بیماری کے علاج کے لیے بیرون ملک کے بھی بہت سے چکر لگا چکا ہے اور وہاں کے اعلیٰ پائے کے معالجین سے بھی مشورہ کر چکا ہے، لیکن اُس کا مرض بڑھتا گیا۔ جوں جوں دوا کی، کے مصداق پھیلتا ہی چلا گیا۔ مجھے ڈر ہے تمہاری اس مداخلت پر وہ ناراض ہو کر تمہارے لیے مزید مسائل نہ کھڑے کر دے۔ یاد رکھو، تم ابھی تک ضمانت پر ہو۔ تمہیں مکمل رہائی نہیں ملی۔'' ''میں جانتا ہوں، لیکن پھر بھی میں یہ خطرہ مول لینا چاہوں گا۔ میں آپ کی سرکاری مجبوریاں اور ریحان کا اثر و رسوخ جانتا ہوں۔ اسی لیے خود اپنے طور پر ایک کوشش کر کے دیکھنا چاہتا ہوں۔'' رحمٰن صاحب نے ہنکارا بھرا اور ٹھیک تین گھنٹے بعد مغرب سے کچھ پہلے مجھے ایک عظیم الشان کوٹھی کے بہت بڑے سے گیٹ کے قریب اُتار کر پولیس کی جیپ خاموشی سے آگے بڑھ گئی۔

میں نے کچھ دیر توقف کیا اور پھر مغرب کی اذان ختم ہوتے ہی گیٹ پر لگی گھنٹی پر اُنگلی رکھ دی۔ کچھ دیر بعد اندر سے انٹر کام پر کسی کی آواز اُبھری ''کون ہے؟'' ''میں عبداللہ ہوں۔ مجھے ریحان صاحب سے ملنا ہے۔'' فوراً جواب ملا۔ ''وہ اس وقت کسی سے نہیں ملتے۔ آپ صبح آئیں۔'' انٹر کام پر کچھ دیر کے لیے گہری خاموشی طاری رہی۔ پھر کوئی تھکی تھکی سی آواز میں بولا ''ہاں بولو...... کیا بات کرنی ہے تمہیں؟'' یہ آواز میرے لیے اجنبی تھی۔ مجھے یوں لگا جیسے کوئی عورت ریحان کی آواز میں بولنے کی کوشش کر رہی ہو۔

رُوپ بہروپ

میں کچھ دیر تو اُس آواز کے اُتار چڑھاؤ ہی میں اُلجھا رہا۔ انٹرکام پر دوبارہ ذرا درشتی سے پوچھا گیا ''تم کچھ لیلیٰ کے بارے میں بتانے والے تھے؟'' ''جی...... لیکن آپ کون بول رہے ہیں؟ کیا میں ریحان صاحب بات کر سکتا ہوں......؟'' دوسری جانب سے جھنجھلاتی ہوئی تیز آواز اُبھری ''میں ریحان بول رہا ہوں، جلدی بولو تمہیں کیا کہنا ہے۔'' اس بار آواز واقعی ریحان ہی کی تھی۔ میں نے اپنی درخواست دہرائی۔ ''کیا میں آپ سے مل کر بات نہیں کر سکتا۔ آپ اپنے مہمانوں کو اس طرح دروازے ہی سے بات کر کے لوٹا دیتے ہیں؟'' دوسری جانب خاموشی چھا گئی۔ شاید انٹرکام رکھ دیا گیا تھا۔ کچھ ہی دیر میں گیٹ کے قریب قدموں کی چاپ اُبھری اور دربان نے گیٹ کھول دیا۔ دروازے کے بالکل سامنے اندر جاتی پکی سڑک کے دونوں طرف دُور تک خوب صورت بجلی کے کمان نما کھمبوں کی قطار سی چلی گئی تھی اور جن پر لٹکے چھوٹے چھوٹے فانوس یوں جل رہے تھے کہ انہوں نے دُودھیا روشنی کا ایک سیلاب سا بہا رکھا تھا۔ میں نے خاص طور پر یہ بات محسوس کی کہ کوٹھی میں چاروں طرف روشنی کا ایسا خاص انتظام کیا گیا تھا کہ ہر سُو چراغاں جیسی کیفیت تھی۔ میں نے جس شخص کے قدموں کی چاپ سنی تھی وہ ریحان کا وفادار ڈرائیور تھا، جس کے چہرے پر برہمی کے آثار صاف نظر آ رہے تھے۔ وہ مجھے دیکھ کر چونکا۔ لیکن پھر اپنے تاثرات چھپا کر بولا ''معذرت چاہتا ہوں، لیکن اس وقت چھوٹے صاحب کسی سے بھی نہیں ملتے، چاہے کچھ بھی ہو جائے۔'' ''چاہے کچھ بھی ہو جائے۔'' چاہے معاملہ کسی کی زندگی یا موت ہی کا کیوں نہ ہو۔'' ڈرائیور نے میری بات کے جواب میں دوبارہ سختی سے کہا ''ہاں چاہے کچھ بھی ہو جائے۔ لیکن ایسے موقعوں کے لیے میں ہمیشہ موجود رہتا ہوں۔ تم تو اُسی ساحلی مسجد کے طالب ہونا۔ تو تمہارا نام عبداللہ ہے۔ تمہیں جو بھی اطلاع دینی ہے، تم مجھے دے سکتے ہو۔'' ڈرائیور نے اپنی جیب سے چند بڑے نوٹ نکالے اور میرے ہاتھ میں تھما دیئے۔ شاید وہ یہی سمجھا تھا کہ میں ریحان کی حیثیت دیکھ کر کچھ پیسے بٹورنے کے لیے اتنی دُور آیا ہوں اور خاص اِسی مقصد کے لیے ریحان سے ملنا چاہتا ہوں۔ میں نے نوٹ دوبارہ ڈرائیور کے ہاتھ پکڑائے ''تم غلط سمجھ رہے ہو، مجھے جو بات کرنی ہے اس کا براہ راست تعلق ریحان صاحب سے ہی ہے۔ لیکن اگر وہ واقعی اس قدر مجبور ہیں کہ مجھ سے ملنے کے لیے دروازے تک بھی نہیں آ سکتے تو مجھے واپس پلٹ جانا چاہیے۔ ہاں البتہ ایک پیغام ضرور دے دینا کہ میں اُس عورت کے بارے میں کوئی بات کرنا چاہتا تھا، جو لیلیٰ کی موت کی رات پہاڑی ٹیلے پر آئی تھی۔'' میں اپنی بات ختم کر کے پلٹ گیا۔ لیکن میں

نے مُڑتے مُڑتے بھی ڈرائیور کے چہرے پر ایک رنگ سا آ کر گزرتے دیکھ لیا، حالانکہ میں نے صرف اشرف سے ہی اب تک اُس عورت کی قتل والی رات ٹیلے پر آمد کا سُنا تھا لیکن پھر بھی یہ صرف ایک اندھیرے میں چلایا ہوا تیر نہیں تھا، میرا وجدان نہ جانے کیوں مجھے بار بار اس بات کی طرف اشارہ کر رہا تھا کہ اُس پُراسرار عورت کا اس قتل سے ضرور کوئی ایسا تعلق تھا، جس کے دھاگے لیلیٰ اور ریحان کے ماضی سے جڑے ہوئے تھے۔ میں شہر سے ساحل کی طرف جانے والی آخری بس لے کر جب ساحل پر اُترا تو عشاء کی نماز ہو چکی تھی۔ جانے سے پہلے میں سلطان بابا کو بتا گیا تھا، پھر بھی وہ مسجد کے باہر مجھے اپنا انتظار کرتے ملے۔ مجھے دیکھ کر اُن کے چہرے پر بشاشت سی آ گئی۔ ''جانتے ہو میاں...... کسی اُستاد کے لیے زندگی کی سب سے بڑی خوشی کیا ہوتی ہے......؟'' میں اُن کا مُدعا سمجھ کر مسکرایا۔ ''جب وہ اپنے کسی نالائق شاگرد کو اپنے راستے پر قدم بڑھاتے ہوئے دیکھتا ہے۔ میری 'نالائق شاگرد' والی اصطلاح پر وہ بھی مُسکرا دیئے۔ کال گڑھ سے نکلنے کے بعد میری زیادہ تر کوشش یہی رہتی تھی کہ میں سلطان بابا کی طبیعت کے پیش نظر انہیں کم سے کم زحمت دوں۔ ڈاکٹروں نے بھی انہیں سختی سے آرام کی تلقین کی تھی اس لیے میں حتی الامکان اُن کے ذہن پر کسی بھی طرح کا بوجھ ڈالنے سے احتراز کرتا، لیکن آج ان کی بات سن کر نہ جانے مجھے ایسا کیوں محسوس ہوا کہ سلطان بابا خود بھی دانستہ مجھے اس معاملے میں اپنا وجدان آزمانے کا موقع دے رہے تھے۔ شاید میری تربیت کا عملی دور شروع ہو چکا تھا اور اب زندگی کی گرہیں مجھے خود کھولنا تھیں۔

اگلی صبح فجر کے بعد میں ساحل پر چہل قدمی کرنے چلا گیا۔ صبح کی اوس سے بھیگی ٹھنڈی ریت، پاؤں کے تلوؤں کو بہت بھلی لگ رہی تھی۔ مجھے حکیم صاحب نے کل ایک بار پھر گیلی ریت پر چلنے کا مشورہ دیا تھا۔ بقول اُن کے، یہ میرے کمزور اعصاب کے لیے بہت اچھا تھا۔ انہوں نے مجھے دھوپ اور گرمی سے بھی خود کو حتی الامکان بچانے کی ہدایت کی تھی۔ شاید جنون اور تپش کا آپس میں کچھ گہرا تعلق تھا۔ پھر سورج کا تانبا زمین پر بہنے کے چند لمحے بعد ہی، جب ابتدائی کرنیں شریر بچوں کی طرح آپس میں لڑتی جھگڑتی زمین کو سب سے پہلے چومنے کے لیے لپک رہی تھیں اور میں اپنی چہل قدمی ختم کر کے حجرے میں جانے کے لیے مسجد کی سیڑھیاں چڑھ ہی رہا تھا تو میں نے اچانک اپنے شام والے تیر کو ٹھیک نشانے پر لگتے دیکھا۔ دُور نیچے آتی کولتار کی سڑک پر سفید مرسڈیز دوڑتی ہوئی اُوپر پہاڑی کی جانب آ رہی تھی۔ یہ مرسڈیز میں کل شام ہی ریحان کے پورچ میں کھڑی دیکھ چکا تھا۔ شاید شہر کے اندرونی راستوں کے لیے وہ یہی کار استعمال کرتا ہوگا۔ گاڑی چند لمحوں میں مسجد کے باہر ریت کے بڑے میدان میں پہنچ کر رُک گئی اور اس میں سے ریحان کا ڈرائیور برآمد ہوا۔ وہ تنہا آیا تھا۔ ''چھوٹے صاحب تم سے کل شام نہ ملنے پر معذرت خواہ ہیں۔ انہوں نے مجھے تمہیں لینے کے لیے بھیجا ہے۔ تم چاہو تو ناشتا وہیں چل کر کر لینا۔'' سلطان بابا گاڑی کی آواز سن کر صحن ہی میں نکل آئے تھے۔ میں نے اُن کی جانب دیکھا۔ انہوں نے رضامندی کے اظہار میں دھیرے سے سر ہلایا۔ ڈرائیور کا نام

یعقوب تھا اور وہ راستہ بھر بالکل خاموش رہا۔ میں نے بھی کوئی بات کرنے کی کوشش نہیں کی۔ جب ہم کوٹھی کے گیٹ سے اندر داخل ہو رہے تھے تو دربان نے بتایا کہ ریحان صاحب کوٹھی کے پچھلے حصے میں بنے گالف کورس میں میرا انتظار کر رہے ہیں۔ یہ ایکڑوں پر پھیلی ہوئی جدید وضع کی کوٹھی تھی، جس کے اندر ہی گھاس کے اتنے وسیع لان تھے کہ ایک بہت بڑے گھاس کے قطعے کو گالف کے کھیل کے لیے مخصوص کر دیا گیا تھا۔ ہمارے گھر میں پاپا نے بھی فارم ہاؤس کے پیچھے ایک چھوٹا سا گالف کورس بنا رکھا تھا لیکن مجھے کبھی بھی اس دھیمے سے کھیل کی سمجھ نہیں آئی تھی۔ یعقوب کے ساتھ گاڑی سے اُتر کر پچھلی جانب جاتے ہوئے میں نے ٹینس کورٹ اور باسکٹ بال کے پختہ میدان بھی بنے دیکھے۔ شاید ریحان اپنے تمام کھیلوں کے شوق گھر ہی میں پورے کر لیتا تھا۔ گھر کے اندر ہی ایک مصنوعی ندی بھی بنائی گئی تھی، جس پر بنا پل پار کرتے ہی دُور بڑی بڑی سبز چھتریوں کے نیچے ریحان اور دو افراد کا عملہ مجھے نظر آیا۔ جو ریحان کے گالف والی چھڑیوں کا بیگ اور گیند وغیرہ تھامے کھڑے تھے۔ ریحان نے ریت کے ایک چھوٹے سے مصنوعی ڈھیر کے پیچھے پڑی گیند کو بہت احتیاط سے تاک کر چھڑی کی ضرب لگا کر اُچھالا اور گیند کچھ دُور ایک چھوٹی سی ڈھلوان پر بنے ایک سفید گول سوراخ میں غائب ہو گئی۔ عملے نے ستائشی جملوں سے اپنے صاحب کی پذیرائی کی۔ مجھے دیکھ کر ریحان نے چھڑی عملے کے حوالے کی اور اپنے ہاتھوں پر پہنے چھوٹے سفید دستانے بھی یکے بعد دیگرے اُتار دیئے۔ عملہ اِدھر اُدھر ہو گیا اور ڈرائیور یعقوب بھی ایک خاص مقام پر آ کر رُک گیا۔ میں دھیرے دھیرے چلتا ہوا ریحان کے قریب پہنچا۔ اُس کے سفید کرمچ جوتے گھاس پر عجیب سی آواز پیدا کر رہے تھے۔ اُس نے میز پر پڑے جوس کے گلاس کے اُوپر سے پلاسٹک کا کور اُتارا۔ ''ناشتہ کرو گے......؟'' ''نہیں...... میں ناشتے میں صرف ایک کپ چائے لیتا ہوں، ساتھ میں رات کی باسی روٹی کا کوئی بچا ٹکڑا۔'' ریحان نے جوس کا ایک لمبا سا گھونٹ اپنے حلق سے نیچے اُتارا اور قریب پڑی رس بھری کی پلیٹ سے ایک تازہ رس بھری اُٹھا کر اپنے منہ میں رکھی۔ وہ حسبِ معمول کھویا کھویا سا تھا۔ جیسے مجھ سے نہیں، مجھ سے پرے کھڑے کسی شخص سے بات کر رہا ہو۔ ''کیا مذہب کے لیے یہ جوگ لازمی ہوتا ہے؟ میں یعقوب کی کل کی پیسوں والی حرکت پر معذرت چاہتا ہوں۔ مجھے رحمٰن صاحب نے بتایا تھا کہ تم کسی اچھے گھرانے سے تعلق رکھتے ہو۔ وہ تمہیں کچھ اور سمجھ رہا تھا۔ کل تم کچھ اہم بات بتانا چاہتے تھے۔ تم چاہو تو ہم کھل کر بات کر سکتے ہیں۔'' ریحان نے اپنے اندر کی بے چینی کو اپنے سرد رویے سے بخوبی ڈھانپ رکھا تھا۔ لیکن اس کے لہجے کی لرزش کو میں صاف محسوس کر سکتا تھا۔ شاید لیلیٰ اس کی ایسی کمزوری تھی، جس کا ذکر آتے ہی وہ خود اپنے بنائے پہرے پھلانگ کر اپنے خول سے باہر نکلنے کی کوشش کرتا تھا، لیکن عمر بھر کی پروئی خار دار تاروں کو کاٹنا اتنا آسان نہیں ہوتا۔ میں نے غور سے اُس کے ہاتھوں کی خفیف لرزش کو دیکھا۔ ''آپ نے یہی بات گزشتہ شام کیوں نہیں سنی......؟ میں لیلیٰ کے آخری لمحات کا واحد عینی شاہد ہوں۔ میری ذہنی حالت بھی کچھ ایسی بہتر نہیں کہ میں تمام باریکیوں کو ٹھیک طرح سے اپنے ذہن میں جمع رکھ

اس لیے میں شام ڈھلے آپ کے دروازے تک آیا تھا۔'' ریحان نے اپنے لہجے کی تلخی کو چھپانے کی وشش کی۔ ''تمہیں ایک چھوٹی سی بات سمجھ کیوں نہیں آتی کہ میں شام ڈھلنے کے بعد کسی سے ملاقات نہیں میرے کاروباری حلقے میں بھی سب ہی کو یہ بات پتا ہے اور میں اپنے معمول کے خلاف کبھی نہیں ''کیا میں اس کی وجہ جان سکتا ہوں؟'' ریحان کی آواز بلند ہوگئی ''نہیں...... میں اپنے ذاتی معاملات پر ڑا پسند نہیں کرتا۔ بہتر ہوگا تم بھی اس موضوع پر دوبارہ بات نہ کرو۔'' میں نے واپسی کے لیے قدم ے۔ ''بہتر ہے...... اگر ہم دونوں کے درمیان اعتماد کا اسی قدر فقدان ہے تو پھر میری یہاں موجودگی بھی تی ہے۔'' ریحان نے مجھے آواز دی، ''سنو...... تم...... تم...... سمجھنے کی کوشش کیوں نہیں کرتے۔ سب ہی نہیں کہ اس کا تعلق میرے بچپن کے ایک خوف سے ہے۔ میں انتہائی کوشش کر رہا ہوں کہ میں کسی طرح ہتر یا پر قابو پا سکوں...... لیکن فی الحال میرے لیے اس موضوع پر بات کرنا بھی نہایت تکلیف دہ ثابت ہوتا امید ہے اب تم مزید اصرار نہیں کرو گے۔'' میں نے پلٹ کر اُس کی جانب دیکھا۔ اس وقت روئے زمین سے زیادہ مجبور انسان شاید اور کوئی نہ ہوگا۔ اُس نے اپنی بات جاری رکھی۔ ''یقین جانو، کل جب سے تمہارا پیغام ملا کہ تم لیلیٰ کی آخری سانسوں کے شاہد ہو اور مجھے اُس کے بارے میں کچھ بتانا چاہتے ہو تو میں ی بھر سو نہیں پایا۔ تم نہیں جانتے کہ یہ محبت کس قدر ظالم اور جابر جذبہ ہوتا ہے۔ چاہے، اب وہ اس دنیا میں ہا ہی لیکن اُس سے متعلق ہر ذکر، ہر یاد میرے لیے پہلے سے کہیں قیمتی ہوگئی ہے۔ میں اپنی ساری دولت ے کر بھی اُس سے جڑی چھوٹی سے چھوٹی بات، ہر یاد اپنے دل کی پٹاری میں بند کر لینا چاہتا ہوں۔ میں جانتا ہ تمہیں روپے پیسے یا کسی صلے کی حرص نہیں ہے لیکن میں تمہیں دل سے نکلی دعا کا خزانہ تو دے سکتا ہ۔ کاش تم نے کبھی کسی سے محبت کی ہوتی تو آج میرے دل کا حال جان پاتے۔'' ریحان اپنی بات ختم کر کے ہانپنے لگا، جیسے نہ جانے کتنی دُور سے دوڑ کر آیا ہو۔ تو اب نوبت یہ آ گئی تھی کہ لوگ میرے حلیے کو دیکھ کر حبت کی دہائی دینے لگے تھے۔ بہر حال، ریحان نے لیلیٰ کے لیے اپنے جذبات کھول کر بیان کر دیئے ۔ مجھے اُس کے لہجے میں کوئی کھوٹ محسوس نہیں ہوا۔ ویسے بھی محبت کرنے والے اپنے اندر کوئی کھوٹ کیسے کتے ہیں۔ محبت ہمارے اندر اتنی جگہ ہی کہاں رہنے دیتی ہے کہ کوئی اور جذبہ پنپ سکے؟ محبت ہمیں اندر ر دیتی ہے، مکمل کر دیتی ہے۔ ریحان بھی اندر سے مکمل تھا۔ لیلیٰ کی محبت نے اُس کے اندر کسی چھل کپٹ کا الی ہی نہیں چھوڑا تھا۔ پھر اُس کی آنکھوں میں یہ خوف کیسا تھا۔ یہ اذیت کیسی تھی، جو اُسے اپنا در داندر ے رکھنے پر مجبور کر رہی تھی۔ میں پلٹ کر چند قدم آگے بڑھا اور ریحان کے بالکل قریب جا کھڑا ہو۔ ''لیلیٰ مجھ سے صرف ایک ہی جملہ کہا تھا۔ اس کے بعد وہ اپنی سانسیں ہار گئی......'' ریحان نے تڑپ کر میرے ں کاندھے اتنی زور سے پکڑ لیے کہ اُس کی اُنگلیاں میرے شانوں میں پیوست ہونے لگیں۔ ''کیا...... لیلیٰ نے کیا کہا تھا...... مجھے بتاؤ...... خدا کے لیے مجھ سے کچھ نہ چھپاؤ......'' اور ٹھیک یہی وہ لمحہ تھا جب

میرے ذہن میں بیک وقت بہت سے جھماکے ہوئے۔ مجھے آنکھیں پڑھنے کا دعویٰ کبھی نہ تھا لیکن
آنکھوں نے میرے اندر نہ جانے ایک ہی پل میں کتنی بصارتیں بھر دیں۔ شاید قدرت بیک وقت مجھ سے
فرزانگی چھین بھی رہی تھی اور میرے اندر دیوانگی کے ساتھ ساتھ ایک اَن جانی روشنی بھی کسی درز سے
کر آ رہی تھی۔ میں دھیرے سے بولا "لیلیٰ نے مجھ سے صرف اتنا کہا تھا کہ میں نے اُسے معاف کیا۔"
کے سر پر جیسے کسی نے وزنی ہتھوڑے سے حملہ کر دیا ہو۔ وہ اپنا سر تھام کر وہیں کرسی پر گر گیا۔
یعقوب کے ساکت وجود میں بے چینی سے حرکت پیدا ہوئی، لیکن شاید اُس کی حد وہیں تک تھی۔
پھر اپنی جگہ جم کر رہ گیا۔ ریحان کے چہرے پر کئی رنگ آ کر گزر گئے اور اُس کے ماتھے پر پسینے کی
جلدی نمودار ہوئیں، جیسے کوئی کسی گیلے اسپنج کو دبا دے۔ پھر جب وہ بولا تو اُس کی آواز لرز رہی تھی "
......وہ کس کو معاف کرنے کی بات کر رہی تھی......" "یہ تو میں نہیں جانتا۔ شاید اُسی اَن جان عورت کو،
رات پہاڑی طرف جاتے ہوئے دیکھا گیا تھا۔" ریحان بالکل ہی چُپ ہو گیا۔ میرے مزید وہاں
رہنے کا کوئی فائدہ نہیں تھا کیوں کہ میں جانتا تھا کہ اب ریحان کو لیلیٰ کی یادوں کی بارات کو ڈولی چڑھانے
گھنٹوں لگ جائیں گے۔ میں نے یعقوب سے کہا کہ وہ اپنے صاحب کا خیال رکھے، میں بس لے کر
جاؤں گا۔ واپسی پر آتے ہوئے میں تھانہ ماہی کے اسٹاپ پر اُتر گیا۔ اسماعیل سنتری کے پاس کچھ دیر بیٹھ کر
واپس بستی آ گیا۔ جانے اُس دن گرمی ہی کچھ زیادہ تھی یا پھر خود میرا ہی دم، جس سے گھٹا جا رہا تھا۔
عجیب سی بے چینی چاروں طرف سے مجھے گھیر رہی تھی، جو مجھے ہمیشہ یہ احساس دلاتی رہتی تھی کہ کچھ
ہونے کو ہے۔ شام تک میں بالکل ہی نڈھال ہو چکا تھا۔ مجھے سلطان بابا نے بتایا تھا کہ پیش گوئی،
وجدان کا خود بہت بڑا بوجھ ہوتا ہے۔ منوں اور ٹنوں جیسا وزنی اور ہمارے کومل انسانی وجود پر ایسے لمحات
گراں اور بھاری گزرتے ہیں تو کیا میرے شانوں کو بھی اس وجدان کا بھاری وزن توڑ رہا تھا۔ آج
رات تھی، لہٰذا ساحل پر اور پہاڑی ٹیلے پر غیر معمولی چہل قدمی تھی۔ کافی خاندان چھوٹے بچوں سمیت
سیر کو آئے ہوئے تھے۔ مغرب سر پر آ گئی تھی لیکن ابھی تک کافی لوگ ساحل کی اس ویران پٹی کے
گرد بکھرے ہوئے تھے۔ نماز کے بعد میرے اندر کی بے چینی نے مجھے ستایا تو میں ٹیلے کی چوٹی کی جانب
گیا۔ ملگجا اندھیر چھایا ہوا تھا۔ لوگ اِدھر اُدھر فاصلے پر ٹولیوں میں بیٹھے ہنس بول رہے تھے، مشروبات
تھے، اپنے بچوں کے ساتھ دل بہلا رہے تھے۔ میں اُن سب سے ذرا ہٹ کر بیٹھ گیا اور دُور پہاڑی سے
جھاگ اُڑاتے سمندر کو دیکھنے لگا۔ وہی سمندر، جس کے دوسرے کنارے پر زہرا رہتی تھی۔ جانے
بابا نے اُسے میرا پیغام بھیجا ہوگا یا نہیں۔ میرے اندر زہرا کو براہ راست مخاطب کرنے کی جھجک آج بھی
اوّل کی طرح موجود تھی۔ اندھیرا بڑھ رہا تھا۔ اچانک مجھے کسی نے پشت پر موجود ٹیلے کے پیچھے سے
سے آواز دی "عبداللہ......" میں چونک کر پلٹا، لیکن اندھیرے کی وجہ سے مجھے کوئی نظر نہیں آیا۔ میں

کر پھر سے سمندر کی جانب متوجہ ہوا۔ اس بار آواز زیادہ واضح تھی۔ "عبداللہ۔" عجیب سی کرخت، لیکن نسوانی
آواز کے تعاقب میں، میں نے ایک بار پھر اندھیرے میں آنکھیں پھاڑ کر دیکھنے کی کوشش کی اور پھر اگلے ہی
لمحے میرے سارے جسم کا خون ایک ہی پل میں میری نسوں میں جم گیا۔ اپنا آدھا چہرہ سُرخ پلو میں چھپائے
اور اپنے وجود کو ایک بڑی سی چادر میں ڈھکے وہ چٹان کی آڑ میں کھڑی تھی۔ ہاں...... یہ وہی تھی، جسے اُس رات
میں نے اس جگہ اپنی سرخ سینڈل کی ایڑی ٹوٹی چھوڑ کر بھاگتے ہوئے دیکھا تھا۔ یہ وہی عورت تھی جس کی
تلاش میں پولیس در بدر بھٹک رہی تھی اور جسے لیلیٰ کے قتل کی رات چوٹی کی جانب آتے ہوئے دیکھا گیا تھا۔ وہ
اس طرح چھپ کر کھڑی تھی کہ کچھ دُور موجود ایک خاندان کو اس بات کی بھنک بھی نہیں پڑ سکتی تھی کہ وہاں کوئی
اور موجود ہو سکتا ہے۔ ویسے بھی اندھیرا گہرا ہو چکا تھا اور ہماری باتوں کی آواز بھی بمشکل ہی وہاں تک پہنچتی۔
میرے حواس ابھی تک جامد تھے۔ "تم اُس روز بھاگ کیوں گئی تھی......؟" وہ غرائی "میرے پاس ان باتوں
کے لیے وقت نہیں ہے۔ میں صرف تمہیں یہ کہنے کے لیے آئی ہوں کہ ریحان سے دُور رہو۔ تمہارا اس معاملے
سے کوئی تعلق نہیں۔ اس لیے خود کو مصیبت میں نہ ڈالو، ورنہ جہاں ایک جان گئی ہے، وہاں دوسری بھی جا سکتی
ہے۔" میں نے گہرا سانس لیا "تو میرا شک صحیح ہے۔ لیلیٰ کی موت تمہارے ہاتھوں ہوئی ہے۔" وہ دبی آواز
میں چلائی۔ نہ جانے مجھے ایسا کیوں لگا، جیسے وہ آواز بگاڑ کر بول رہی ہے۔ "تم اپنے کام سے کام رکھو
مولوی......اور تم نے ریحان سے جھوٹ کیوں بولا کہ اُس رات لیلیٰ نے تم سے کوئی بات کی تھی۔ میں اسی ٹیلے پر
موجود تھی جب وہ نیچے گری تھی۔ اس وقت نیچے کوئی نہیں تھا۔ میں نے اُسے نہیں مارا۔ لیکن اگر وہ میرے اور
ریحان کے درمیان آنے سے باز نہ آتی تو میں واقعی اسے ختم کر دیتی۔ اُس کی آواز میں اس قدر سفا کی تھی کہ
میں اندر تک لرز کر رہ گیا۔ اُس نے آج بھی اپنا آدھا چہرہ پوری طرح ڈھک رکھا تھا۔ لیکن نہ جانے کیوں مجھے
اس کی شخصیت میں کسی بڑی کمی کا احساس ہو رہا تھا۔ وہ ایک بار پھر غرائی "میں تمہیں آج آخری بار تنبیہہ کرنے
آئی ہوں کہ اگر تم نے دوبارہ ریحان کے دل میں اس منحوس لیلیٰ کی محبت جگانے کی کوشش کی تو اگلا نمبر تمہارا ہی
ہوگا۔" اچانک تین چار بچے اپنی گیند کے پیچھے پیچھے چوٹی کی جانب دوڑے اور ان کی مائیں انہیں روکنے کے
لیے اُن کی طرف لپکیں۔ جونہی چند لوگ ہمارے درمیان حائل ہوئے اور ایک لمحے کے لیے میری توجہ ہٹی تو میں
نے نظر اُٹھا کر دیکھا تو وہ کسی چھلاوے کی طرح وہاں سے غائب ہو چکی تھی۔ میں فوراً بھاگ کر چٹان کے پیچھے
پہنچا۔ مجھے دُور اندھیرے میں ایک ہیولا تیزی سے دوڑتے ہوئے اُس جانب بڑھتا نظر آیا، جہاں کچھ لوگوں کی
گاڑیاں پارک تھی۔ ہم دونوں کے درمیان فاصلہ بڑھتا جا رہا تھا۔ میں جلدی میں اُس کی جانب دوڑا۔ آج وہ
کسی دوسری گاڑی میں آئی تھی۔ شاید اُسے پولیس کے پہرے کا اندازہ ہو گیا تھا، لیکن وہ شاطر تھی۔ اُس نے
ساحل پر آنے کے لیے ہفتے کی شام کا انتخاب کیا تھا، جب ویک اینڈ منانے کے لیے شہر کے بہت سے
گھرانے اس پوائنٹ کا رُخ کرتے تھے۔ وہ گاڑی میں بیٹھ کر گاڑی اسٹارٹ کر چکی تھی۔ چند ہی لمحوں میں اُس

کی گاڑی فراٹے بھرنے لگی۔ دفعتاً مجھے اندھیرے میں ٹھوکر لگی اور میں منہ کے بل ریت پر گر گیا۔ اُٹھتے وقت
میری نظر ریت میں دھنسی ایک چھوٹی سی چیز پر پڑی اور میری آنکھیں پتھر ہو گئیں۔ میں وہیں ڈھے گیا۔ میں
جان چکا تھا کہ وہ عورت کون تھی۔

ہم زاد

اُس رات میں ایک پل کے لیے بھی پلک نہیں جھپکا پایا۔ زندگی کے کتنے زاویے اور محبت نامی اس
ت کے کتنے رُخ ہو سکتے ہیں۔ شاید یہ بتانا ہم میں سے کسی کے لیے بھی ممکن نہیں ہے۔ کم از کم میں نے تو
یہ سوچ کر آخری صفحہ پلٹا کہ شاید یہ باب بند ہوا، ٹھیک اُسی لمحے خود کو پھر سے پہلے صفحے پر پایا۔ اگلی صبح
ڈاک خانہ کھلتے ہی سب سے پہلا فون رحمٰن صاحب کو کیا اور پھر ٹھیک ایک گھنٹے بعد میں تھانہ ماہی میں
سامنے بیٹھا تھا۔ میری بات سن کر اُن کی آنکھیں پھیلتی چلی گئیں۔ حسبِ معمول اُن کا چہرہ سگریٹ کے
ئیں کے پار دھند میں ڈوبا نظر آرہا تھا۔ "تم جانتے ہو، تم جس جگہ مجھے رات کو چھاپہ مارنے کا کہہ رہے
ں ان میں با قاعدہ اجازت لے کر جانے کے لیے بھی نہ جانے کتنے ایوانوں کی گھنٹیاں ہلانا پڑتی ہیں۔
ے سے اجازت ملنا تو دُور، اس بات کا ذکر کرتے ہی سخت سست سنا کر تبادلہ کر دیا جائے گا۔" "لیکن آپ
ئے عرصے کی نوکری میں چند افسرانِ بالا تو ایسے ہوں گے، جن پر آپ کا بھرم اور اعتماد قائم ہوگا۔ کیا آپ
کی مدد کے لیے نہیں پکار سکتے۔ آپ بہر حال اپنا فرض ہی تو پورا کریں گے یا پھر محکمہ آپ کو صرف وہاں
الی کی اجازت دیتا ہے جہاں کارروائی کرنے سے کسی ایوان کی گھنٹی نہ ہلتی ہو۔" رحمٰن صاحب نے ایک
ش لے کر سگریٹ ایش ٹرے میں مسل دیا۔ "بات تلخ ہے، لیکن سچ یہی ہے کہ ہماری اَن دیکھی حدیں
کا سے مقرر ہیں۔" وہ کچھ دیر کسی گہری سوچ میں گم رہے اور پھر ایک لمبی سانس لے کر بولے "ٹھیک ہے
ئے یہ جوا بھی کھیل لیتے ہیں۔ مجھے تمہارے وجدان پر بھروسا کرنے کے علاوہ دوسرا کوئی راستہ سجھائی بھی
ے رہا۔ لیکن اتنا یاد رکھنا کہ میرے پاس غلطی کی کوئی گنجائش نہیں۔ اگر ہاتھ ذرا سا بھی ترچھا پڑا تو حکام کو
فارغ کرنے میں چوبیس گھنٹوں سے بھی کم وقت لگے گا اور ایسی صورت میں، میں بھی تمہاری ہی مسجد کے
ے میں اپنا بستر ڈالوں گا۔" انہوں نے چند فون نمبر گھمائے اور پھر شام ڈھلتے ہی ہم کچھ ضروری نفری کے
حویلی منزل کے دروازے پر موجود تھے۔ ممکنہ مزاحمت کے بعد دروازہ کھلوا لیا گیا۔ رحمٰن صاحب نے اپنے
ہدایت کر دی تھی کہ جب تک وہ خود کسی سے بات کرنے کا نہ کہیں، تب تک کسی بڑی سے بڑی شخصیت کا
فون انہیں منتقل نہ کیا جائے۔ گھر میں عجیب سناٹا جاری تھا۔ ہم تیزی سے آگے بڑھے تو مرکزی عمارت
دروازے کو مقفل پایا۔ رحمٰن صاحب کے اشارے پر دو مضبوط جسم کے سپاہیوں نے کافی مشقت کے بعد
توڑ ڈالا۔ اندرونی جانب سے دو تین سہمے ہوئے نوکر اور خدام نکلے، جو باورچی خانے کے دروازے سے

باہر نکلنے کی تگ و دو میں تھے۔ انہیں اطمینان دلوایا گیا کہ کوتوالی کو اُن سے کوئی سروکار نہیں۔ اُوپر کی منزل کے کمرے کھلے پڑے تھے۔ مجھے ایک پردے کے پیچھے سے دو گھنگھرؤں کی جوڑیاں بھی جھلکتی نظر آئیں۔ ایک چھوٹا سا ہال تھا، جہاں طبلہ اور ہارمونیم سلیقے سے پڑے تھے۔ شاید یہاں رقص کی مشق کی جاتی ہو۔ اس گھر میں داخل ہونے سے لے کر اب تک لگاتار رحمٰن صاحب کے ڈرائیور، گارڈز، تھانے دار اور دیگر کے دستی وائرلیس سیٹ (واکی ٹاکی) پر درجنوں پیغام وصول ہو چکے تھے۔ جس میں رحمٰن صاحب کو اعلیٰ حکام، شہر کے کمشنر اور آئی جی وغیرہ کی طرف سے مسلسل ہدایت کی جا رہی تھیں کہ وہ جہاں بھی ہوں اپنا مشن ختم کر کے فوراً ہیڈ کوارٹر رپورٹ کریں۔ رفتہ رفتہ یہ پیغام دھمکیوں کی صورت اختیار کر گئے لیکن ایس پی صاحب آخری کشتی بھی جلا کر نکلے تھے۔ پولیس کے جوان مختلف دروازوں کو دھکیلتے جا رہے تھے۔ اور ہر کمرہ ہوا، نفیس ساز و سامان سے آراستہ اور بہترین آرائش کا شاہکار تھا۔ کمروں کی کلر اسکیم پر بھی بہت دھیان تھا۔ لیکن سبھی کمرے خالی تھے اور پھر آخری کمرہ بند ملا۔ رحمٰن صاحب نے اندر موجود فرد کو تنبیہہ کی کہ کھول دیا جائے ورنہ وہ اسے توڑ دیں گے۔ اندر سے آواز اُبھری "تھوڑا انتظار کریں......" کچھ دیر بعد کے تھکے قدم گھسٹنے کی آواز آئی اور دروازہ کھل گیا۔ زنانہ کپڑے اور کاسمیٹکس اِدھر اُدھر بکھرے پڑے، کمرے کی ڈریسنگ ٹیبل پر دنیا کی بہترین کمپنیوں کا میک اپ کا سامان سجا ہوا تھا۔ ایک پردے کے پیچھے مجھے وہ سرخ سینڈل بھی جھانکتے ہوئے نظر آ گئے، جن کی ایک ایڑی اس وقت پولیس کی تحویل میں تھی۔ عورت دروازہ کھولنے کے بعد کمرے میں اندھیرا کر کے دیوار کے ساتھ دبک کر بیٹھ گئی تھی۔ رحمٰن صاحب کے اشارے پر عملے کے کسی فرد نے کمرے کی بتی جلائی تو پہلے ہماری نظر کمرے کے سامان اور پھر اس سکڑے وجود پر پڑی۔ رحمٰن صاحب نے کڑک کر اُسے کھڑا ہونے کو کہا تو گھٹنوں میں چھپا ایک چہرہ دھیرے دھیرے اُٹھا اور پولیس کا سارا عملہ رحمٰن صاحب سمیت ہکا بکا رہ گیا۔ عورت کے بھیس میں ہمارے سامنے ریحان تھا۔ اور اُس کی حالت نہایت ابتر تھی۔

آگے کی کہانی زیادہ پیچیدہ نہیں تھی۔ رحمٰن صاحب نے حتی الامکان کوشش کی تھی کہ اخبار اور میڈیا تک اس چھاپے کی خبر نہ پہنچے لیکن پھر بھی صبح کے تمام اخبارات کی شہ سرخی ملک کے بڑے صنعت کار ریحان کی منگیتر کو قتل کرنے کے الزام میں گرفتاری ہی کی تھی۔ ایک رات پہلے جب میں اُس عورت کا پیچھا کرتے گر پڑا تھا۔ تب نیچے ریت میں مجھے سفید کریچ کے جوتوں کا ایک سول نظر آیا تھا۔ یہ اُن ہی جوتوں میں ایک کا سول تھا، جو میں اُسی صبح ریحان کو گالف کورس میں پہنے ہوئے دیکھ چکا تھا۔ ریحان گرفتار ہوا تو رات نہایت بے چین رہا اور اپنا وجود چھپانے کی کوشش کرتا رہا۔ اُس کا برتاؤ بھی بہت عجیب تھا۔ کبھی وہ نسوانی آواز میں پولیس کے عملے کو سنگین نتائج کی دھمکیاں دیتا تو کبھی اُن کی منت کرتا کہ اُسے واپس جانے دیا جائے کہ گھر میں "ریحان" اکیلا گھبرا رہا ہوگا۔

نے رحمٰن صاحب سے خصوصی درخواست کی تھی کہ اس کی یہ حالت عام نہ ہونے پائے اور ہمیں ہر ریحان کا پردہ رکھنا ہوگا۔ اگلی صبح تک ریحان بالکل لاتعلق ہو چکا تھا اور ہر سوال کے جواب میں صرف گھورتا رہتا۔ اُس نے صبح ہی اقرار کر لیا کہ "وہ لیلیٰ کو مارنا نہیں چاہتی تھی" لیکن ہاتھا پائی کے دوران پاؤں پھسلا اور وہ اُونچائی سے گر گئی۔ ریحان کے بیان سے لگتا تھا جیسے وہ کسی تیسری ہستی کے بارے نا دے رہا ہو لیکن "وہ" کون تھی جو ریحان کے اندر سالوں سے بسیرا کیے بیٹھی تھی۔ یہ وہ معما تھا جس کا نفسیات دانوں کی سات رُکنی ٹیم پورے پانچ دن بعد لگا پائی۔

کا آغاز ریحان کے بچپن سے ہوا۔ منہ میں سونے کا چمچ لے کر پیدا ہونے والا ریحان ماں باپ وں کا تارا تھا۔ اکلوتا ہونے کی وجہ سے ماں کبھی اُسے بیٹے کا پیار دیتی اور کبھی بیٹی کا سنگھار کر کے اُس کھیلتی۔ لیکن منتوں مرادوں کے بعد پیدا ہونے والے بچے کو گھر سے باہر کم ہی نکالا جاتا۔ پھر نہ جانے ریحان کے باپ غیاث الدین کی زندگی میں ایک کنول نامی لڑکی، جو اُس کی پرانی سیکرٹری کی جگہ صرف کے لیے آئی تھی، داخل ہو گئی اور دھیرے دھیرے اُس کے دل و دماغ ہی پر نہیں، پورے کاروبار پر ہوتی چلی گئی۔ غیاث کا اپنی بیوی سے آئے دن جھگڑا رہنے لگا اور چار سالہ ریحان پردوں کے پیچھے چھپا ماں باپ کو چیخ چیخ کر لڑتے ہوئے دیکھ کر روتا رہتا۔ بات اتنی بڑھی کہ غیاث اپنی بیوی پر ہاتھ بھی اُٹھانے ایک دن تو ریحان نے اپنے باپ کو اپنی ماں کا گلا دبانے کی کوشش کرتے ہوئے بھی دیکھ لیا۔ بات کورٹ تک چلی گئی اور ریحان کی ماں کو اُس کے والدین آ کر اپنے ساتھ لے گئے۔ ریحان کو اُس کے باپ نے نہیں دیا اور معصوم ریحان اپنے گھر کے پورچ میں کھڑا روتے ہوئے اپنی ماں کو نانا کی کار میں پچھلی ہمیشہ کے لیے جاتے ہوئے دیکھتا رہا۔ پلٹ پلٹ کر دیکھتی ہوئی ماں کی آنکھوں سے ٹپکے آخری دو آنسو کے لیے ریحان کی رُوح کو بھگو گئے۔ شاید پہلی مرتبہ اُسی دن اُس کے اندر کی شخصیت دو حصوں میں تقسیم جس میں سے ایک حصہ ریحان کے پاس رہ گیا اور دوسرا حصہ ہمیشہ کے لیے اُس کی ماں کے ساتھ ہو گیا۔

باپ نے ننھے، ریحان کو درختوں اور پردوں کے پیچھے چھپ کر اپنی ماں کے لیے روتے ہوئے دیکھا تو ڈرائیور ایوب کو ہدایت کی کہ اُس کے دفتر سے واپس آنے تک وہی ریحان کے بہلنے کا کچھ سامان سے۔ ڈرائیور کو اور تو کچھ نہ سوجھی، وہ اداس ریحان کو لیے بنگلے کے پیچھے اپنے سرونٹ کوارٹر میں لے جہاں اس کی بیوی اور چھ بیٹیاں ہر ممکن کوشش کرتیں کہ اُن کے صاحب کے لاڈلے کا دل بہلا رہے۔ کے کھیل زیادہ تر وہی ہوتے، گڑیا اور گڈے کی شادی، کوکلا چھپاکی، ہنڈکلیا بنانا یا پھر ایک دوسرے کو نیل پالش اور سرخی سے سنوارنا۔ سو، ریحان بھی انہی مشغلوں میں گم ہوتا گیا۔ تیسرے ماہ ریحان کی سگی طلاق بھیجنے کے ساتھ ہی اُس کا باپ غیاث، کنول کو ریحان کی سوتیلی ماں کے روپ میں گھر لے آیا۔

کنول نے دو چار دن غیاث الدین کو دکھانے کے لیے ریحان سے جھوٹا پیار جتایا لیکن جلد ہی وہ اس ناٹک
اُوب ہوگئی اور ریحان اُسے کانٹے کی طرح کھٹکنے لگا۔ بات صرف سوتیلے پن کی حد تک ہوتی تو بھی کوئی
ریحان کی موجودگی کا کڑوا گھونٹ پی ہی لیتی لیکن کچھ عرصے بعد غیاث الدین کی فیکٹری کا نوجوان منیجر
غیر موجودگی میں کسی نہ کسی بہانے کوٹھی کے چکر لگانے لگا تو ایسے میں کنول کو ریحان کی گھر میں موجودگی
ایسے میں یا تو ریحان کو اُوپر اُس کے کمرے میں ڈانٹ ڈپٹ کر کے بند کر دیا جاتا یا پھر کوٹھی کے پچھواڑے
دیا جاتا کہ وہ جا کر یعقوب کی بیٹیوں سے کھیلے۔ اس تمام احتیاط کے باوجود ریحان کی سوتیلی ماں اس
طریقوں سے ڈراتی رہتی اور اُسے سیڑھیوں سے جڑے کمرے کے نیچے والے تہ خانے میں بند کرنے کی
دیتی تاکہ وہ اپنے باپ کی رات گئے واپسی پر منیجر کی آمد کا ذکر نہ کرے۔ ایسے موقعوں پر اگر یعقوب کی گھر
اور بچیاں کہیں گئیں ہوتیں تو ریحان اپنے کمرے میں بند ہی گڑیا اور گڈے کا کھیل کھیلتا رہتا۔ پھر اُس کے
کہیں سے لپ اسٹک لگ گئی تو وہ اپنی باجیوں کی طرح ہونٹوں پر سرخی لگانے میں مگن رہتا۔ رفتہ رفتہ اُس
آنکھوں میں کاجل بھرنا اور نیل پالش لگانا بھی سیکھ لیا۔ پھر ایک دن اُسے سوتیلی ماں کی ڈریسنگ ٹیبل پر
اپ کے سامان کی پوری کٹ ہی نظر آگئی تو وہ چپکے سے وہ بھی اپنے کمرے میں اُٹھا لایا اور کئی دن تک
شیڈز سے اپنا چہرہ رنگین کرتا رہا۔ بدقسمتی سے اُس کی یہ چوری جلد ہی پکڑی گئی اور اُس کی ماں، نے، جو
پر اس کٹ کی گمشدگی پر کئی دن سے برس رہی تھی، ریحان کو میک اپ استعمال کرتے پکڑ لیا۔ سوتیلی ماں
اس دن عروج پر تھا اور اُس نے سزا کے طور پر ننھے ریحان کو اُس کی زندگی کا سب سے بڑا خوف اُسی تہ
میں قید کر کے بخش دیا جس تہ خانے کے ذکر ہی سے ریحان بھاگ کر اپنے کمرے کی الماری کے پیچھے
جاتا تھا۔ وہ دو گھنٹے اُس تاریک تہ خانے میں ریحان نے کس طرح روتے، سسکتے اور ڈر سے کانپتے گزارے
اس کا احساس صرف وہی کر سکتے ہیں، جن کی اپنی کوئی اولاد ہو۔ اس تہ خانے کی دیواروں پر اُس روز اندھیرے
میں ریحان نے اتنے عجیب و غریب ہیولے بنتے اور مٹتے دیکھے کہ اُس دن اُس کی اپنی شخصیت ہی ایک
بن کر رہ گئی۔ شام کو باپ کے آنے سے پہلے سوتیلی ماں ریحان کے جسم کو تہ خانے سے باہر کھینچ لائی لیکن
کی رُوح وہیں اندھیرے میں بھٹکتی رہ گئی۔ اس رات کے بعد سے اندھیرا ریحان کو ڈسنے لگا اور وہ سونے
بھی کمرے کی تمام بتیاں جلائے رکھنے کا عادی ہوگیا۔ ایسے میں کمرے میں پڑا آئینہ ریحان کا سب سے
دوست بنتا گیا۔ ریحان کو میک اپ کا شوق تو اپنی باجیوں سے پہلے ہی مل چکا تھا اب اس تنہائی کو دُور
کے لیے اور اپنے راتوں کے خوف کو مٹانے کے لیے اُس نے اپنے ہی کمرے میں ایک دوسری دنیا آباد کر لی
تھی، کیوں کہ اُس کے باپ کو اتنی فرصت تھی نہیں کہ وہ اپنے خوف زدہ بیٹے کے پاس دو گھڑی بیٹھ کر
باتیں ہی کر لیتا یا اُسے لوری سنا کر سلا دیتا۔ ایسے میں ریحان نے اپنے خوف کو لوری دینے والی خود ایجاد
رات گئے جب سارے گھر کی بتیاں بجھ جاتیں تو وہ چپکے سے اُٹھ کر ڈریسنگ ٹیبل کے آئینے کے سامنے

تا اور اِدھر اُدھر سے چرائی سُرخی اور غازہ اپنے چہرے پر مل کر اپنے آدھے چہرے کا میک اپ کرتا۔ پھر یہی
دھا چہرہ اُس کی ماں، بہن، دوست، سب ہی کچھ بن جاتا۔ داہنی حصے والی عورت ریحان سے باتیں کرتی،
ے کہانیاں اور لطیفے سناتی اور چہرے کے بائیں حصے والا ریحان خوش ہوتا، ہنستا اور اپنے چہرے کے داہنے
ے سے وہ سب کہتا، جو وہ اپنی سگی ماں کو بتانا چاہتا تھا۔ اس کا طریقہ کار یہ ہوتا کہ ریحان کو جب عورت سے
ت کرنی ہوتی تو وہ اپنے چہرے کا بایاں حصہ جو بنا میک اپ سادہ رہتا، اُسے آئینے کے رُخ پر رکھتا اور سوال
رتا، ضد کرتا، کہانیاں اور لوریاں سننے کی فرمائش کرتا اور پھر جواب کے لیے، چہرے کا دایاں حصہ ایسے رُخ پر
ئینے کو دکھاتا کہ صرف وہ مہربان عورت ہی اُسے شیشے میں جھانکتی نظر آتی جو ریحان کی سب ضدیں، ہر فرمائش
ری کرتی اور پھر جب رات نصف سے بھی زیادہ بیت جاتی تو ریحان کی دوست، ماں، بہن اور ہمدرد اُسے
ب اچھی سی لوری سناتی۔ وہ لوری، جو ریحان اپنی سگی ماں سے سنا کرتا تھا اور پھر آخر کار ریحان کو نیند آجاتی۔
ں تمام عرصے میں ریحان کے کمرے کا دروازہ اندر سے مقفل رہتا اور صبح تب ہی کھلتا، جب وہ عورت ریحان
ا ماتھا چوم کر اگلی شام تک کے لیے رُخصت ہو جاتی۔ اب ریحان کو باقی دنیا سے شدید بے زاریت اور نفرت
سوس ہونے لگی تھی۔ بس ایک یعقوب اور اُس کا گھرانہ ہی تھا، جہاں کچھ دیر کے لیے ریحان کا دل لگ پاتا
ا۔ لیکن اب وہاں سے بھی ریحان سرِ شام ہی بھاگنے کی کرتا کیوں کہ اندھیرا ہوتے ہی اُس کی پیاری اور
ربان دوست نے جو آنا ہوتا تھا۔

وہاں ریحان کی سوتیلی ماں کنول نے بھی ایک ہی بار بڑا ہاتھ مارنے کا منصوبہ بنایا اور ایک صبح جب گھر
ے مکین اُٹھے تو تمام تجوریوں اور زیورات سمیت بینک بیلنس کو صاف پایا۔ اس دن کے بعد سے کنول اور
یکٹری کے منیجر کی کبھی کوئی خبر نہیں ملی۔ ریحان کا باپ اس صدمے سے سنبھل نہیں پایا۔ بات صرف پیسے کی
وتی تو وہ ایک سال ہی میں کھوئے ہوئے مال سے تین گنا زیادہ کمانے کی صلاحیت رکھتا تھا، لیکن اُسے بستر پر
ال دینے والا صدمہ بے وفائی کا تھا۔ رفتہ رفتہ جب باتیں کھلنے لگیں تو پتا چلا کہ کنول نے یہ سارا منصوبہ ہی
پنے چاہنے والے فیکٹری منیجر کی وساطت سے بنایا تھا اور اُس کی شادی سے لے کر اب تک ہر بات پہلے سے
ے منصوبے کے تحت طے شدہ تھی۔ ریحان کا باپ دوبارہ بستر سے نہیں اُٹھ سکا اور پندرہ سالہ ریحان کو اپنے
فادار ڈرائیور کی سپردگی میں دے کر ہمیشہ کے لیے آنکھیں موند گیا۔ اس دوران ریحان کی سگی ماں کو بھی تلاش
رنے کی بہت کوشش کی گئی مگر سب بے سود۔ یعقوب نے نمک کا حق ادا تو کیا۔ لیکن اب ریحان جوان ہو رہا
ھا اور اُس نے اپنے گرد اتنا مضبوط خول بنا رکھا تھا کہ اُس کے دل کی بات کسی تک پہنچنا محال تھا۔ آخر کار،
یعقوب کی سب سے چھوٹی بیٹی بھی اپنے گھر سدھار گئی اور یعقوب کی بیوی کی موت کے بعد ریحان کی زندگی کا
آخری روشن دان بھی ہمیشہ کے لیے بند ہوگیا۔ لیکن یعقوب کی بیوی مرتے مرتے اپنے شوہر کو اس کے چھوٹے
صاحب کے اندر پلتی دو الگ شخصیات کا حال دے گئی کیوں کہ اس نے بھی ایک ماں کی طرح ہی ریحان کو پالا

تھا اور وہ گزشتہ کئی مہینوں سے ریحان کی سرِ شام شروع ہو جانے والی بے چینی محسوس کر رہی تھی۔ یعقوب زیادہ پڑھا لکھا تو نہیں تھا لیکن زمانہ شناس ضرور تھا۔ وہ سمجھ گیا کہ ریحان اپنے اندر پلتی اس عورت کے ساتھ اتنی دُور آ چکا ہے کہ اب اُس کی واپسی بہت مشکل ہے۔ ریحان نے شام کے بعد خود کو دنیا سے بالکل کاٹ دیا اور دنیا میں اب صرف یعقوب ہی وہ واحد فرد تھا، جسے پتا تھا کہ شام ڈھلنے کے بعد ریحان، ریحان نہیں رہتا، اُس کے اندر کی عورت باہر نکل آتی ہے۔ دل چسپ بات یہ تھی کہ ریحان کے اندر کی عورت کی عمر، ریحان کے بڑھنے کے ساتھ ساتھ گھٹتی گئی۔ بچپن میں وہ اُس کی ماں تھی، لڑکپن میں دوست اور ہم درد اور جوانی میں وہ باقاعدہ ایک محبوبہ کے حقوق حاصل کر چکی تھی۔ دن میں اگر عملے کی کسی لڑکی سے ریحان دو گھڑی رُک کر بات کر لیتا یا کوئی ریحان کی شان دار شخصیت کو نظر بھر کر دیکھ لیتی تو شام کو کمرے میں آنے کے بعد جب ریحان آئینے کے سامنے بیٹھتا تو اُس کی رُوح کی قابض باقاعدہ اُس سے لڑتی، جھگڑتی اور رُوٹھ جاتی۔ دونوں کے درمیان مکالمے کی صورت کچھ یوں بنتی کہ ریحان بائیں جانب چہرے کی اوٹ سے اُس سے پوچھتا "آج کچھ چپ سی ہو۔ کوئی ناراضی ہے کیا۔" داہنا میک اپ زدہ حصہ منہ بنا کر کہتا "تمھیں اس سے کیا؟ تمھیں تو اُس پھلجڑی شائستہ کے نخرے اُٹھانے سے ہی فرصت نہیں۔" ریحان اُسے مناتا "اوہو...... اب جانے بھی دو۔ وہ نئی اکاؤنٹینٹ ہے۔ کچھ رہنمائی کی ضرورت تھی اُسے۔ سو، میں نے بتا دیا، ورنہ تم تو جانتی ہو کہ......" فوراً وہ پلٹ کر آئینے پر قابض ہو جاتی اور غصے سے کہتی "ہاں ہاں...... تین چار ہزار کے عملے میں سے اُسے اور کوئی نہیں ملا تھا، اپنی اُلجھن دُور کرنے کے لیے۔ میں سب جانتی ہوں، ان عورتوں کے چلتر...... ٹھیک ہے اگر تمھیں اُس کی اتنی فکر ہے تو پھر جاؤ۔ اُسی کی رہنمائی کرو۔ میرے پاس کیا لینے آئے ہو؟" ریحان بے بس ہو جاتا "اوہ...... تم پھر رُوٹھ گئیں۔ اچھا بابا...... پکا وعدہ...... آئندہ کسی سے، کوئی کام کی بات بھی نہیں کروں گا۔ چلو اب ناراضی ختم کر دو، ورنہ میں کھانا نہیں کھاؤں گا۔" جواباً نیم رضامندی کا اظہار بھی مصنوعی غصے سے کیا جاتا۔ "خوب جانتی ہو میں یہ سب بہانے، تمھیں پتا ہے نا کہ میں تمھیں بھوکا سوتے نہیں دیکھ سکتی۔ تب ہی مجھے اتنا ستاتے ہو۔ اچھا چلو اب منہ نہ بسورو۔ اُٹھ کر کھا لو۔" ریحان خوش ہو کر مسکرا دیتا اور وقتی طور پر جھگڑا ختم ہو جاتا۔ لیکن پھر چند دن بعد ایسی کوئی بات ہو جاتی اور پھر رات گئے تک یہی تکرار چلتی رہتی۔ عام دنیا کے لیے ریحان اندھیرے کے خوف کا ایک عام مریض تھا اور اُس کے کاروباری حلقے میں سب ہی اس بات کو ذہنی طور پر تسلیم کر چکے تھے کہ ریحان صرف دن کے اُجالے کا ساتھی ہے۔ ریحان نے کبھی دوستیاں اور رشتے پالے ہی نہیں تھے، جو اُس کی پُرسکون زندگی میں کسی قسم کی ہلچل مچاتے۔ وہ ہمیشہ سے تنہائی پسند تھا اور تنہائی ہی اُس کی سب سے بڑی رفیق تھی۔ لیکن پھر لیلیٰ نام کی ایک معصوم سی لڑکی اُس کے عملے میں حادثاتی طور پر شامل ہوئی اور ریحان کی زندگی اتھل پتھل سی ہونے لگی۔ لیلیٰ ریحان کی فرم کے سینئر ڈرافٹس مین کی بیٹی تھی، جو اپنے باپ کی علالت کی وجہ سے یونیورسٹی کی تعلیم ادھوری چھوڑ کر اپنے باپ کا کام سنبھالنے کے لیے صرف دو ماہ کے عارضی معاہدے پر

کمپنی میں رکھی گئی تھی۔ لیکن شاید یہی دو ماہ ریحان کے اندر وہ اَچھوتا احساس جگانے کے لیے کافی تھے، جس سے وہ عمر بھر انجان رہا تھا۔ پہلے پہل تو خود ریحان کو بھی سمجھ نہیں آیا کہ وہ کیوں اس کومل سی لڑکی کے اپنے آفس میں آنے پر ایک انجانی سی خوشی محسوس کرتا ہے۔ زندگی میں پہلی بار اُس نے اپنی رات کی راز داں اور اپنے اندر کی عورت سے بھی کوئی بات چھپانے کی کوشش کی۔ ریحان ویسے بھی اپنے اسٹاف سے بہت کم بات کرتا تھا اور خواتین تو اُس کے دفتر سے سات در پرے ہی گزرا کرتی تھیں لیکن لیلیٰ میں نہ جانے ایسی کون سی کشش تھی، جو ریحان کو اُس کی جانب کھینچے لے جا رہی تھی۔ شاید اُس کا عام لڑکیوں کی طرح ریحان کے اردگرد چکر نہ کاٹنا ہی ریحان کو بھا گیا تھا۔ لیکن اُس کے اندر والی سے یہ راز بھلا کہاں چھپ پاتا۔ اس رات پہلی بار ریحان کا آئینے میں بیٹھی اپنی اس ہم زاد سے جھگڑا ہوا۔ وہ اتنا بگڑی کہ اُس نے کمرے کا سارا کانچ توڑ ڈالا۔ کوٹھی میں اپنے سرونٹ کوارٹرز میں پڑے نوکر حیرت اور خوف سے اپنے صاحب کے کمرے میں اس عجیب و غریب شور شرابے کی دُور سے آتی آوازیں سنتے رہے، کیوں کہ انھیں شام کے بعد صاحب کے کمرے کی طرف جانے کی نہ تو اجازت تھی اور نہ ہی وہ کوٹھی کے اندرونی حصے میں پاؤں دھر سکتے تھے۔ صرف یعقوب ہی تھا جو ایسے موقعوں پر اندر جا کر کوئی پیغام دے سکتا تھا۔ عموماً نصف شب کے بعد کوٹھی سے گھنگھروؤں کی جھنکار بھی سنائی دیتی تھی۔ لیکن اس رات کچھ عجیب سا سناٹا طاری رہا۔ ریحان اپنی ہم زاد کے اپنے اندر جنم لینے کے بعد زندگی میں پہلی بار اُس رات بھوکا سویا تھا۔ اگلی صبح دفتر پہنچتے ہی شدید غصے کے عالم میں اُس نے انٹرکام پر لیلیٰ کو اپنے دفتر میں آنے کو کہا۔ لیلیٰ دفتر میں داخل ہوئی تو اس کی چیخ نکلتے نکلتے رہ گئی۔

آدھا جنوں، آدھا فراق

ریحان شدید اذیت کے عالم میں جیسے خود اپنے آپ سے ہی لڑتے ہوئے نڈھال ہو کر اس طرح کرسی پر ڈھلکا ہوا تھا کہ اُس کا سر میز کے کونے پر اٹک گیا تھا۔ فوراً کمپنی کے ماہر ڈاکٹروں کی ٹیم کو طلب کیا گیا۔ معالج خاص نے اسے شدید ذہنی تناؤ کا نتیجہ قرار دیا۔ ساتھ ہی اُسے سختی سے یہ تاکید بھی کر دی گئی کہ وہ اگلے ایک ہفتے تک کسی دفتری کام یا فائل کو ہاتھ تک نہیں لگائے گا۔ لیکن ریحان بھلا کب ماننے والا تھا۔ اُسے اپنے کام سے جنون کی حد تک لگاؤ تھا اور درحقیقت یہ کام ہی تو تھا، جو ریحان کے دن کے آٹھ دس گھنٹے گزارنے میں اُس کی مدد کرتا تھا۔ مجبوراً ہیڈ آفس کے جنرل منیجر کو ریحان کا کام گھر ہی پر بھجوانے کا انتظام کرنا پڑا۔ جنرل منیجر ریحان کے باپ کے وفاداروں میں سے ایک تھا اور ریحان کو اُس کی مانتے ہی بنی۔ یہی وہ سات دن تھے، جب لیلیٰ ریحان کے حواس پر پوری طرح چھا گئی۔ ریحان کے اندر کا معصوم، سہما سا بچہ، جس نے اپنی ماں کو روتے ہوئے، خود سے دور جاتے دیکھ کر ہمیشہ کے لیے کوئی اوٹ ڈھونڈ لی تھی۔ لیلیٰ کو دیکھتے ہی چھم سے باہر نکل آتا۔ زندگی میں پہلی بار ریحان کے ہونٹوں پر دھیمی سی مسکراہٹ نظر آنے لگی اور اُس کا دل بھی چاہنے لگا کہ وہ اپنے اندر کی معصوم سی خواہشیں اور باتیں کسی سے بانٹے۔ لیکن یہ ساری خوشی اور سرشاری صرف سورج ڈھلنے سے پہلے تک ہی رہتی اور جب شام ڈھلے ریحان خود کو اپنے کمرے میں بند کر لیتا تو پھر وہی طوفان آ جاتا۔ وہی اُس کی ہم زاد کے شکوے، طعنے اور جھگڑے۔ اب تو وہ ریحان کے منانے سے بھی نہیں مانتی تھی۔ اُس کا بس ایک ہی تقاضا ہوتا کہ ریحان کسی بھی طرح لیلیٰ کو کمپنی سے باہر نکال پھینکے۔ ریحان اُس کے سامنے عذر تراش تراش کر تھک جاتا، لیکن وہ روٹھی رہتی اور ریحان سے لڑتی رہتی کہ ریحان اب اُس سے اتنا پیار نہیں کرتا، جتنا لیلیٰ کے آنے سے پہلے کرتا تھا۔ اُس کی ہم زاد کو لیلیٰ سے شدید نفرت ہونے لگی تھی اور پھر جب ریحان کو ڈاکٹروں نے گھر پر مکمل آرام کا مشورہ دیا اور لیلیٰ دفتر کے کچھ اہل کاروں کے ساتھ ضروری فائلوں پر دستخط کروانے کوٹھی بھی آنے لگی، تب تو سمجھو بھونچال ہی آ گیا۔ ہم زاد نے ریحان سے بات چیت بند کر دی اور پورے تین دن تک ریحان کی بھرپور منت سماجت کے باوجود بھی چپ سادھے بیٹھی آئینے سے ریحان کو تکتی رہی۔ ریحان کی حالت ان تین دنوں میں مزید بگڑ گئی، کیوں کہ وہ ساری ساری رات اُسے منانے کے لیے روتا رہتا۔ پھر جب ریحان نے اُس سے آخر کار یہ وعدہ کر لیا کہ وہ جلد ہی لیلیٰ کو خود سے دُور کر دے گا، تب وہ ذرا مانی۔ لیکن تب تک لیلیٰ خود ریحان کی اُلجھی اُلجھی، خاموش اور کسی حد تک شرمیلی سی شخصیت کے آگے دل ہار بیٹھی تھی۔ وہ گھنٹوں اپنے شیشے کے کیبن کے بالکل سامنے راہ داری میں، دوسری جانب موجود ریحان کے آفس کے کانچ کی دیوار سے پرے اُسے مختلف کاموں میں اُلجھا ہوا دیکھتی رہتی۔ اُسے یہ کھویا کھویا سا، اپنے آپ سے باتیں کرتا اور نہایت شائستہ اور نفیس عادات و اطوار والا نوجوان کسی اور ہی دنیا کا فرد دکھائی دیتا۔ اِسی قربت کا نتیجہ یہ ہوا کہ جس وقت ریحان اپنے اندر چلتے اس شدید نفسیاتی ہیجان کا سامنا کرتے کرتے ٹوٹ کر بکھرنے کے بالکل قریب تھا ٹھیک اُسی وقت لیلیٰ نے آ کر اُسے تھام لیا اور وہ ریحان، جو لیلیٰ کو نوکری سے فارغ کرنے کا لیٹر تیار کروائے بیٹھا تھا، اُسے اپنی زندگی کا ہم سفر بننے کا پیام دے بیٹھا۔ لیلیٰ کی تو جیسے کائنات ہی مکمل ہو گئی۔ لیکن جیسے جیسے دن گزرتے گئے، لیلیٰ کی اُلجھنیں بڑھتی گئیں۔ کبھی کبھی اچانک ہی بیٹھے بٹھائے ریحان کا رویہ بالکل ہی تبدیل ہو جاتا۔ کبھی کبھار جب وہ صبح اپنی سرخ انگارہ آنکھیں لیے دیر سے دفتر پہنچتا تو بالکل ہی ہتھے سے اکھڑا ہوتا۔ ایسے میں اُس کا برتاؤ لیلیٰ سے بالکل اجنبیوں والا ہو جاتا۔ اُس بے چاری کو کیا پتا کہ رات بھر اُس کا ہم نفس کس کس عذاب سے گزر کر صبح کی سیڑھی پھلانگ کر اُس تک پہنچا ہے۔ لیلیٰ شروع میں اُسے کام کے بوجھ اور ریحان کی ازلی تنہائی پسندی کا شاخسانہ ہی سمجھتی رہی، لیکن رفتہ رفتہ بات بننے کی بجائے بگڑتی چلی گئی۔ ان دونوں کی بحث، خاص طور پر اُس وقت طول پکڑ لیتی، جب لیلیٰ ریحان کو شام ڈھلنے کے بعد کہیں آؤٹنگ کے لیے لے جانے کی ضد کر بیٹھتی اُس کا اصرار کچھ بے جا بھی تو نہ ہوتا، کیوں کہ سارا دن تو ریحان دفتر کے کاموں اور میٹنگز ہی میں اُلجھا رہتا۔ بس، گھڑی دو گھڑی کے لیے دوپہر کے کھانے یا شام کی چائے پر ان دونوں کی ملاقات ہو پاتی۔ وہ بھی تمام دفتر کے عملے کے سامنے۔ اب بھلا ایسے موقعے پر کوئی دل کی بات کیسے کی جا سکتی تھی، حالانکہ تمام عملے کو بھی ریحان اور لیلیٰ کے مستقبل میں ہونے والے رشتے کے بارے میں خبر تھی اور درحقیقت سب ہی اس بات سے خوش بھی تھے، کیوں کہ ریحان نے اپنے باپ کے نقشِ قدم پر چلتے ہوئے ہمیشہ اپنے تمام عملے کی ہر ضرورت کا خیال رکھتا تھا لیکن پھر بھی لیلیٰ کو ریحان سے کچھ ایسے لمحوں کی ہمیشہ ہی تمنا رہی، جب صرف وہ اور ریحان ہوں اور وہ دل کی ہر بات بنا کسی جھجک کے کہہ سکے۔
لیکن شام ہوتے ہی ریحان کے اندر جیسے تمام جہان کی بے چینیاں سی بھر جاتی تھیں۔ عصر کے بعد تو وہ اپنے کئی کام ادھورے چھوڑ کر ہی گھر واپسی کی تیاریاں شروع کر دیتا۔ ایسے میں یعقوب بھی ٹھیک وقت پر پہنچ جاتا اور آج تک کبھی کسی نے اُسے لیٹ ہوتے یا ناغہ کرتے نہیں دیکھا تھا۔ لیلیٰ انٹر کام پر یا میٹنگ کے دوران مختلف کاغذوں پر لکھ لکھ کر تھک جاتی، مگر ریحان کا دل کبھی نہ پسیجتا۔ لیلیٰ کو بھی ریحان کے بچپن کے خوف کی کچھ خبر پہنچ گئی تھی اور وہ دل سے چاہتی تھی کہ وہ ریحان کی اس خوف کے جال سے نکلنے میں مدد کرے، مگر شام کا ریحان اُس کے لیے بالکل اجنبی ہوتا تھا۔ ایک آدھ بار اُس نے جب ریحان کو زبردستی روکنے کی کوشش کی بھی تو ریحان نے اُسے بُری طرح جھڑک دیا۔ پھر بھی لیلیٰ کے دل میں کہیں نہ کہیں یہ اُمید ضرور دیا جلائے رکھتی تھی کہ وہ شادی کے بعد ریحان کے دل میں چھپا ہر خوف اپنی محبت سے مٹا دے گی۔ مسئلہ یہ تھا کہ ریحان شام

کے بعد بہت ضروری فون بھی اٹینڈ نہیں کرتا تھا۔ ایک بار لیلیٰ اندھیرا ہونے کے بعد ریحان کی کوٹھی کے گرد تک بھی جا پہنچی، مگر اُس کے لاکھ سر پٹخنے پر بھی دربان نے اُسے اندر آنے کی اجازت نہیں دی۔ اُلٹا اگلی صبح ریحان لیلیٰ پر بُری طرح برس پڑا کہ وہاں کے انتہائی منع کرنے کے باوجود شام ڈھلنے کے بعد اُس کی چوکھٹ پر کیوں آئی۔ لیلیٰ اپنے آنسو روک نہیں پائی اور بھاگتی ہوئی اپنے کیبن میں واپس چلی گئی۔

دو تین روز تک دونوں میں بات چیت بند رہی اور ان تین راتوں میں ریحان کی ہم زاد نے جی بھر کے ریحان کے لاڈ اُٹھائے۔ اسے اُس کی پسندیدہ شاعری سنائی۔ رقص کر کے اُس کا دل بہلایا اور اُس سے بہت سے گلے شکوے بھی کیے کہ وہ بچپن سے ریحان کی ہم زاد اور ہم نفس رہی ہے اور ہر مشکل اور کرب میں اُس نے ریحان کا ساتھ دیا، لیکن جب اُسے ریحان کی ضرورت پڑی تو ریحان اُس سے منہ موڑ کر کسی اور کی زلفوں کا اسیر ہو گیا۔ اُس نے ریحان سے وعدہ کیا کہ وہ پہلی فرصت میں لیلیٰ کے رشتے سے چھٹکارا پا کر دوبارہ اپنی ساتھی کے پاس آ جائے گا۔ لیکن ریحان تین دن تک ہی یہ وعدہ نبھا پایا اور چوتھے دن جب خود لیلیٰ نے اُس کے سامنے آ کر ہاتھ جوڑ دیئے تو دونوں ہی مسکرا دیئے۔ اس رات پہلی مرتبہ ریحان کی ہم زاد نے اُس سے فرمائش کی کہ وہ بھی ریحان کی پسند سے ملنا چاہتی ہے۔ لہٰذا ریحان اُسے رات کو کہیں مدعو کرے۔ ریحان نے سختی سے انکار کر دیا کہ جب تک شادی نہ ہو جائے، یہ راز راز ہی رہنا چاہیے۔ لیکن ہم زاد کی تکرار بھی طول پکڑتی گئی۔ ہم زاد کا سب سے بڑا مسئلہ یہ تھا کہ اُس کا راج صرف سورج نکلنے تک ہی قائم رہتا تھا۔ اور اُجالا ہوتے ہی اُسے ریحان کی رُوح کو آزاد کرنا پڑتا تھا۔ پھر سورج نکلنے سے لے کر سورج ڈھلنے تک ریحان کے دل و دماغ پر صرف لیلیٰ ہی کا قبضہ ہوتا تھا۔ اس لیے ہم زاد دن میں بھی ریحان کے اعصاب تک پہنچنے کا راستہ ڈھونڈنے لگی۔ پھر لیلیٰ خود بھی ریحان کی نفسیاتی پیچیدگیاں دُور کرنے کی آس میں گاہے بگاہے اُسے شام ڈھلنے کے بعد ملنے پر مجبور کرتی رہتی تھی۔ رات کو ہم زاد اُسے بڑھاوا دیتی "اگر وہ تم سے رات کو ملنا چاہتی ہے تو اس میں حرج ہی کیا ہے۔ میں تو کہتی ہوں کہ تم مجھے بھی اُس سے جلد از جلد ملوا دو۔ آخر شادی کی پہلی رات بھی تو مجھے ہی اُس کا استقبال کرنا ہے۔ تو کیا یہ بہتر نہیں کہ میں پہلے ہی اُس سے دوستی کر لوں۔ کہیں پہلی رات وہ مجھے تمہارے کمرے میں دیکھ کر بالکل ہی نہ گھبرا جائے اور تمہارا راز سب کے سامنے فاش نہ کر دے۔" کبھی کبھی تو ریحان ان دونوں کی ضد اور تکرار کے سامنے بالکل ہی لاجواب ہو جاتا اور اُسے لگتا کہ اُس کے اندر پلتی وہ عورت، اُس کی ہم زاد ٹھیک ہی تو کہتی ہے۔ لیلیٰ کو اس راز سے پہلے ہی آگاہ کر دینا چاہیے کہ یہ اُس کا حق بھی تو تھا۔ آخر دل اور دماغ کی جنگ میں ہمیشہ کی طرح جیت دل نادان ہی کی ہوئی اور ریحان نے پہلی اور آخری مرتبہ لیلیٰ سے شام کے بعد ملنے کی ہامی بھر لی۔ اس روز لیلیٰ کی خوشی کا کوئی ٹھکانہ نہیں تھا۔ اُس کا دل چاہتا تھا کہ آسمان کے خیمے کی زمین سے بندھی گرہیں کھول کر پورا آسمان اوڑھنی کی جگہ اپنے سر پر اوڑھ لے۔ سارا دن وہ ہواؤں میں اُڑتی رہی۔ بات بے بات خود ہی مسکاتی رہی۔ شام کو اُس نے ریحان کی پسندیدہ سفید ساڑھی پہن کر

بالوں میں گجرا لگایا اور اپنی کالی آنکھوں میں محبوب کی دید کی آس لیے ساحل کی اس پٹی کی طرف اُسی گاڑی میں خود ہی ڈرائیو کرتی ہوئی چل دی، جس کی پہاڑی کے ٹیلے پر آج مغرب کے بعد ریحان نے اُس سے ملنے کا وعدہ کیا تھا۔ وہ ریحان کے ساتھ دن میں پہلے بھی کئی مرتبہ ڈرائیو پر اس جگہ آ چکی تھی۔ اُسے وہاں پتنگ اُڑانا بہت پسند تھا اور آج بھی وہ اپنے ساتھ بہت سی پتنگیں لے کر جا رہی تھی۔ اُس نے سوچا تھا کہ آج وہ رات دیر تک ریحان کے ساتھ مل کر پتنگیں اُڑائے گی اور اُسے اتنا اُونچا کر دے گی کہ اُس کی پتنگ اُس کے اور ریحان کے ملن کے ستارے کو چھو کر لوٹے گی۔ جب تک لیلیٰ پہاڑی ٹیلے پر پہنچی، تب تک شام ڈھل چکی تھی اور مغرب کے وقت کا جھٹ پٹا چاروں طرف پھیل چکا تھا۔ ریحان ابھی تک وہاں نہیں پہنچا تھا۔ لیلیٰ اپنی گاڑی سے نکل کر پہاڑی کے سرے تک چلی گئی اور وہاں کھڑے کھڑے اُس نے دُور سے کسی گاڑی کی ہیڈ لائٹس چمکتی دیکھیں، وہ خوش ہو گئی کہ ریحان آ رہا ہے لیکن جب گاڑی کچھ قریب پہنچی تو وہ مایوس ہو گئی۔ یہ تو کوئی چھوٹی گاڑی تھی لیکن وہ گاڑی تو اُسی طرف آ رہی تھی۔ لیلیٰ کچھ دیر گاڑی کو پہاڑی پر چڑھتے دیکھتی رہی، پھر اُس کی توجہ دوبارہ سمندر کی طرف ہو گئی، جو آج نہ جانے اتنا بھپرا ہوا کیوں لگ رہا تھا۔ گاڑی نہ جانے کب لیلیٰ کی گاڑی کے پیچھے آ کر پارک ہو گئی اور لیلیٰ تب چونکی، جب دھیرے سے کسی نے اُس کا نام لیا۔ وہ آواز کتنی اپنی اور کتنی اجنبی بھی تھی۔ لیلیٰ نے اندھیرے میں کسی لمبی عورت کو پلو نکالے کچھ دُور کھڑے دیکھا۔ چہرہ واضح نہیں تھا۔ لیلیٰ کچھ ڈر سی گئی۔ "جی...... آپ کون؟" اور پھر وہ عورت قریب آ گئی۔ لیلیٰ کے منہ سے زوردار چیخ نکل گئی۔ اُس کے سامنے ریحان اپنے آدھے چہرے پر میک اپ کیے، آدھی عورت کے روپ میں کھڑا تھا۔ لیلیٰ سہم کر کئی قدم پیچھے ہٹ گئی۔ اُس نے لرزتے ہوئے لہجے میں ریحان سے پوچھا کہ یہ کیسا بے ہودہ مذاق ہے اور ریحان نے اتنا بھیانک حلیہ کیوں بنا رکھا ہے۔ بائیں جانب والے آدھے سادے چہرے والا ریحان رُخ موڑ کر بولا کہ لیلیٰ کو ڈرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ آج وہ اُسے اپنی زندگی کی سب سے بڑی سچائی سے ملوانا چاہتا ہے۔ اس کے اندر پلتی آدھی عورت اور آدھا مرد...... یہی اس کی تقسیم شدہ شخصیت کی حقیقت ہے اور اگر وہ ریحان کو اس کے اندر کی عورت سمیت اپنانے کا حوصلہ رکھتی ہے، تب ہی اس نازک بندھن کی گرہ باندھنے کی سوچے، کیوں کہ ریحان کی دہری شخصیت اس اندھیرے میں پلنے والے وجود کے بنا ادھوری ہے۔ لیلیٰ تب تک پہلے صدمے سے کچھ سنبھل چکی تھی اور اُسے کچھ کچھ بات سمجھ میں آنے لگی تھی۔ اُس نے چلا کر ریحان سے کہا، یہ سب اس کا وہم ہے اور خود اُس کی اپنی خود ساختہ پرچھائیں ہے۔ ایسی کسی عورت کا کوئی وجود نہیں ہے اور ریحان نے اپنی ساری زندگی ایک سائے کے ساتھ برباد کر دی ہے، لیکن اب بھی وقت ہے، اگر وہ لیلیٰ کا ساتھ دے تو وہ دونوں مل کر اس عفریت کی پرچھائیں پر قابو پا سکتے ہیں۔ یہ سُنتے ہی چہرے کے دائیں جانب والی بگڑ گئی اور غرا کر بولی کہ "وہ بہت دیر سے لیلیٰ کی یہ بکواس برداشت کر رہی ہے۔ لیکن اب اگر اُس نے، اُس کے ریحان کو چھیننے کی کوشش کی تو انجام بہت بُرا ہو گا، کیوں کہ اُسے پہلے دن ہی سے لیلیٰ سے شدید نفرت

ہے۔ لہٰذا لیلیٰ کے لیے بہتر یہی ہے کہ وہ چپ چاپ یہاں سے چلی جائے اور دوبارہ کبھی پلٹ کر اس طرف کا رُخ نہ کرے۔'' لیلیٰ ریحان کو ایک بدلی ہوئی آواز میں چلاّتے دیکھ کر ایک بار پھر لرز گئی۔ اُس نے ریحان کے آگے ہاتھ جوڑے کہ سارا کھیل صرف اور صرف قوت ارادی کا ہے اور اگر آج ریحان نے اپنے اندر کی طاقت سے اس عورت سے اپنے وجود سے باہر نہ نکال پھینکا تو شاید پھر ساری زندگی وہ اس کے چنگل سے چھٹکارا نہ پا سکے۔ اب صورت حال کچھ یوں تھی کہ ریحان، لیلیٰ کی منت سماجت کر کے اُسے روکنے کی کوشش کر رہا تھا جب کہ اُس کے اندر کی ہم زاد لیلیٰ کو دھتکار رہی تھی، اس پر چلاّ رہی تھی اور اُسے ریحان کی زندگی سے ہمیشہ کے لیے نکل جانے کا حکم دے رہی تھی۔ لیلیٰ کبھی ریحان کے آگے روتی اور کبھی اُس کی ہم زاد سے لڑتی۔ اسی کش مکش میں نہ جانے کب اور کیسے لیلیٰ پیچھے ہٹتے ہٹتے پہاڑی کی نوک تک جا پہنچی۔ اُس کی سوت نے اُسے تھپڑ مارا اور دھکا دیا۔ ریحان والی بائیں طرف نے لپک کر لیلیٰ کا ہاتھ تھامنے کی کوشش کی، لیکن تب تک لیلیٰ کا توازن بگڑ چکا تھا۔ فضا میں ایک زوردار چیخ گونجی اور چند لمحوں کے لیے لیلیٰ کی سفید ساڑھی کا پلو گہرائی کے خلا میں لہرایا اور پھر ایک زوردار ''دھپ'' کی آواز کے ساتھ سناٹا چھا گیا۔ نیچے ساحل پر موجود ایک آدھ آوارہ کتے کے بھونکنے کی آواز آئی، جیسے وہ گرنے والے کی طرف لپکا ہو۔ ریحان تڑپ کر لیلیٰ کے پیچھے جانے کے لیے گہرائی کی طرف دوڑا، لیکن ہم زاد نے اُسے زبردستی روکا اور جھاڑا کہ نیچے کسی شخص کا ہیولا نظر آ رہا ہے، شاید کوئی اس طرف آ رہا ہے۔ یہی وہ وقت تھا، جب میں ہذیان کے عالم میں حجرے سے نکل کر ساحل کی طرف نکل گیا تھا۔ مجھے اس طرف آتے دیکھ کر وہ زبردستی ریحان کو وہاں سے لے گئی۔

اگلی صبح ریحان کو پتا چلا کہ لیلیٰ کے قتل کے الزام میں عبداللہ نامی ایک نوجوان گرفتار ہو چکا ہے۔ ریحان کا دماغ اس وقت لیلیٰ کی موت کی وجہ سے سُن ہو چکا تھا اور اُس کی ساری مزاحمت دم توڑ چکی تھی۔ اس وقت اُس کی تمام ڈوریں اُسی ہم زاد کے ہاتھ میں تھیں، جو اُسے یہ کہہ کر ڈراتی رہی کہ اگر ریحان نے پولیس کو حقیقت بتا دی تو وہ ہمیشہ کے لیے اپنی آدھی شخصیت سے بھی ہاتھ دھو بیٹھے گا۔ لیلیٰ تو پہلے ہی اُس کا ساتھ چھوڑ کر جا چکی تھی۔ پھر ایک شام وہی عبداللہ نامی نوجوان اُس کے دروازے پر یہ پیغام لے کر آیا کہ اُس نے لیلیٰ کی آخری سرگوشی سنی ہے۔ ریحان اُس وقت اُس سے ملاقات تو نہیں کر پایا، لیکن اُس رات اپنی ہم زاد سے اُس کی شدید تلخ کلامی ہوئی اور ریحان نے اُس پر لیلیٰ کی قاتل ہونے کا الزام لگایا اور یہ بھی کہا کہ لیلیٰ اُونچائی سے گرنے کے بعد بھی زندہ تھی تب ہی اُس نے مسجد کے اُس طالب کو پیغام دیا۔ اگر ریحان موقع پر نیچے جاتا تو شاید وہ لیلیٰ کی جان بچا لیتا۔ پھر ہم زاد کے منع کرنے کے باوجود ریحان نے صبح سویرے اپنے ڈرائیور کو بھیج کر عبداللہ کو اپنی کوٹھی بلوا لیا اور عبداللہ نے جب اُسے یہ بتایا کہ لیلیٰ نے اپنی سانسیں رُکنے سے پہلے اُس عورت کو معاف کرنے کا پیغام دیا تھا تو خود ریحان کو اپنی سانسیں ڈوبتی ہوئی محسوس ہوئیں۔ اُس روز شام سے پہلے وہ یہ تہیہ کر چکا تھا کہ وہ اگلے روز پولیس کو جا کر اپنا بیان ریکارڈ کروا دے گا لیکن شام ہوتے ہی اُس کی رُوح کی قابض

نے حکم دیا کہ چل کر اُس عینی گواہ کو دھمکایا جائے۔ ریحان کی ہم زاد کو عبداللہ نامی نوجوان کا کوٹھی آنا اور یوں ریحان کے دل میں دبی چنگاری کو ہوا دے کر لیلیٰ کی یادیں ابھارنا بھی بالکل پسند نہیں آیا تھا۔ اسی لیے وہ اُس رات ساحلی چوٹی پر اُس کے پیچھے آئی تھی۔ ریحان ابھی تک صبح سے گالف کے لباس ہی میں تھا اور اس کا اپنا من بالکل نہیں چاہ رہا تھا کہ وہ ساحل پر جائے کیوں کہ وہاں اُسے لیلیٰ کی یاد ستاتی تھی۔ اسی کش مکش میں وہ چلا تو گیا لیکن اپنے سفید کرچ کے جوتے تبدیل کرنا بھول گیا یا شاید یہ اُس کے آدھے مردانہ حصے کا انوکھا احتجاج تھا۔ بہرحال، یہی جوتے اُس کی گرفتاری کا سبب بن گئے۔ لیکن پولیس ابھی تک مخمصے میں تھی کہ وہ ریحان ہی کو پکڑ لائے ہیں یا کسی اجنبی کو......

ماہر نفسیات نے ریحان کی کہانی ختم کر کے چند لمحے کی خاموشی اختیار کر لی۔ ہم سب اس وقت رحمٰن صاحب کے کمرے میں موجود تھے، جہاں گزشتہ پانچ گھنٹوں سے یہ بریفنگ چل رہی تھی۔ کمرے میں گمبھیر سناٹا طاری تھا۔ پولیس کی تاریخ میں یہ ایک ایسا انوکھا کیس تھا، جس نے اُن سب کے دماغوں کی چولیں ہلا دی تھیں۔ ریحان کو اس وقت پولیس کے پہرے میں اسپتال کے نفسیاتی وارڈ میں منتقل کیا جا چکا تھا، جہاں اُس کی حالت شام کے بعد انتہائی ابتر بتائی جاتی تھی۔ ملک کے بڑے اور مشہور نفسیات دان اور معالج اس بحث میں الجھے ہوئے تھے کہ کیا یہ تقسیم شدہ شخصیت (split personality) کا کیس ہے یا پھر دُہری شخصیت کا تضاد (multiple personality disorder) ہے۔ سچ ہے کہ انسانی نفسیات ایک ایسا گھنا جنگل ہے، جس میں اگر ریحان جیسے کسی شخص کا معصوم بچپن کھو جائے تو پھر وہ ڈھونڈے نہیں ملتا۔ یہ انسان بھی کس قدر پیچیدہ مخلوق ہے۔ انسانی ذہن کی بھول بھلیوں کا پہلا ادراک مجھے وہیں پہلی بار ہوا اور مجھے خود اپنے آپ سے بھی شدید خوف محسوس ہونے لگا۔ کیوں کہ میں بھی تو جانے انجانے میں اسی نفسیاتی اور اعصابی نظام کے خاتمے کی طرف بڑھ رہا تھا۔ میری رگوں میں پھیلتے زہر کا انجام بھی تو آخر کار ایک مکمل دیوانگی ہی بیان کیا جا رہا تھا۔

بریفنگ ختم ہونے کے بعد جب معالجین رحمٰن صاحب کے کمرے سے نکل گئے تو میں نے بھی اُن سے رخصت چاہی تو انہوں نے مجھے کچھ دیر رُکنے کا کہا۔ پھر سگریٹ سلگا کر بولے، ''تم کون ہو؟'' میں اُن کا سوال سُن کر حیرت زدہ سا رہ گیا۔ ''میں عبداللہ ہوں...... آپ جانتے ہیں......'' ''نہیں...... میں وہ جاننا چاہتا ہوں، جو اب تک نہیں جانتا۔ بہت سے سوال ہیں میرے ذہن میں، مگر میں انہیں ترتیب نہیں دے پا رہا...... لیکن اتنا مجھے یقین ہے کہ تم کچھ اور ہو...... اوروں سے کچھ سوا...... کچھ الگ۔'' میں نے بات ٹالی ''آپ کا وہم ہے۔ میں باقی سب ہی کی طرح ہوں۔ بلکہ شاید اُن سے بہت کم، بہت عام......'' لیکن انہوں نے میری بات سنی ہی نہیں ''ساری تفتیشی ٹیم اس پُراسرار عورت کی کھوج میں تو تھی لیکن ہم میں سے کسی کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ وہ ریحان ہی کی دوسری شبیہ ہو گی۔ میں نہیں مان سکتا کہ یہ صرف تمہارے اندازوں کی کاریگری تھی کہ تم نے ریحان سے شام کے بعد ملنے کی خواہش ظاہر کی اور پھر دھاگے سے دھاگا جوڑتا

گیا اور سبھی کڑیاں آپس میں یوں ملتی گئیں کہ آج لیلیٰ کا پورا کیس ایک کھلی کتاب کی طرح ہمارے سامنے ہے
اب تم ہی کہو، میں اسے کیا کہوں......؟" کچھ دیر چپ رہا" آپ اسے وجدان کہہ لیں یا الہام...... سچ یہ ہے
کہ میں صرف ریحان کے اندھیرے سے خوف کی کہانی سن کر ہی اُس کے گھر گیا تھا۔ اور نہ جانے کیوں
پہلے دن ہی سے اس عورت کی شبیہہ میں کچھ ایسا اسرار جھلکتا نظر آیا کہ مجھے اس کا تعلق لیلیٰ کی موت سے
محسوس ہوا۔ میں خود بھی یہ بات تب ہی جان پایا کہ ریحان ہی وہ عورت ہے، جب میں نے اُس کے جو
سول ساحل پر پایا۔ شاید قدرت کچھ راستے خاص میرے لیے ہی کھولتی گئی اور آپ کا کیس حل ہوتا گیا۔"
میں میز پر پڑے فون کی گھنٹی بج اُٹھی۔ رحمان صاحب نے فون اُٹھایا۔ دوسری جانب سے کسی نے کچھ کہا
صاحب نے جلدی سے کہا "ٹھیک ہے...... ہم ابھی وہاں پہنچتے ہیں۔" انہوں نے فون رکھ کر میری جا
دیکھا، "ریحان اپنے حواس میں آچکا ہے اور وہ تم سے ابھی ملنا چاہتا ہے۔"

گلابی دھند

ٹھیک آدھے گھنٹے کے بعد ہم شہر کے سب سے بڑے اسپتال کے مرکزی دروازے کے قریب پہنچ چکے
تھے۔ سامنے کچھ بھیڑ تھی اور راستہ بند تھا۔ پتا چلا کہ کوئی مریض دم توڑ گیا ہے اور اُس کی میت لے جائی جا رہی
ہے۔ قریبی عزیز، چند رفقا، اور آس پاس کے چند راہ گیر کاندھا دینے کے لیے جلدی سے آگے بڑھے۔ مجھے
لگا جیسے انسان اپنی پوری زندگی میں بس اتنا ہی کماتا ہے جتنے لوگ اُس کے جنازے کو کاندھا دینے اور اُس
کے آخری سفر میں چار قدم ساتھ چلنے کے لیے موجود ہوتے ہیں۔ باقی سب ضائع جاتا ہے۔ انسان کا سب
سے بڑا نفع خود "انسان" ہی ہوتا ہے اور یہی وہ سب سے قیمتی سرمایہ ہے، جسے وہ اپنی زندگی کے دوران مختلف
ادوار میں نقصان کی صورت میں کھو دیتا ہے۔ کیسے کیسے بیش قیمت لوگ ہمارے ہاتھوں سے پھسل جاتے ہیں۔
یہ بے رحم "وقت" کیسے ڈاکا مارتا ہے کہ ہمیں خبر تک نہیں ہوتی اور کوئی ہمارے درمیان سے ہمیشہ کے لیے
اُٹھ کر چل دیتا ہے اور اُس کے بعد صرف یادیں، پچھتاوے اور افسوس باقی رہ جاتا ہے۔ میں انہی سوچوں میں
گم تھا کہ رحمان صاحب کی جیپ نے ایک لمبا سا موڑ کاٹا اور ہم اسپتال کی مرکزی راہ داری کے بالکل سامنے
والے پورچ میں پہنچ گئے۔ رحمٰن صاحب نے میرے کاندھے پر ہاتھ رکھا "جاؤ...... جا کر اُس سے مل
لو......"۔ "آپ نہیں آئیں گے میرے ساتھ؟" "نہیں...... اس وقت وہ صرف تم سے ملنا چاہتا
ہے۔ میری موجودگی میں وہ کھل کر بات نہیں کر پائے گا۔" میں سامنے کھڑے مستعد اور چاق چوبند سپاہی کے
ساتھ مختلف راہ داریوں سے ہوتا ہوا نفسیاتی اور اعصابی مریضوں کے لیے مخصوص کمروں تک جا پہنچا۔ سپاہی
نے 13 نمبر کمرے کی طرف اشارہ کیا، جس کے باہر پہلے ہی دو پولیس کے محافظ پہرہ دے رہے تھے۔ میں
دروازہ کھول کر اندر داخل ہوا تو کمرہ بالکل یخ بستہ ہو رہا تھا۔ شاید کمرے کے مرکزی ٹھنڈا کرنے کے نظام کو
اس کے آخری درجے پر رکھا گیا تھا۔ کمرے میں فرنیچر کے نام پر صرف پلاسٹک کی دو کرسیاں پڑی تھیں اور
اسے کمرے سے زیادہ بیرک کہنا مناسب ہوتا، کیوں کہ چوکور کی بجائے مستطیل ساخت کی دیواریں دُور تک
بڑھ گئی تھیں۔ فرش پر بے داغ سفید ٹائلز لگے ہوئے تھے اور ریحان سامنے والی دیوار کے ساتھ ٹیک لگائے
زمین پر بیٹھا ہوا تھا۔ کمرے میں روشنی کا انتظام کچھ اس طرح تھا کہ آنکھوں کو مانوس ہوتے کچھ وقت لگتا تھا۔
آہٹ سن کر ریحان نے سر اُٹھایا۔ لیکن یہ...... یہ تو وہ ریحان نہیں تھا، جسے میں جانتا تھا، وہ ریحان تو بے حد سجا
سنورا، نہایت نفیس اور نازک سا تھا، جب کہ میرے سامنے بیٹھا شخص آنکھوں کے گرد گہرے کالے حلقے لیے،

چہرے پر برسوں کی تھکن، بال اُلجھے ہوئے اور کئی دن کی بڑھی شیو کے ساتھ بیٹھا تھا۔ میں نے کبھی پہلے والے ریحان کے چہرے یا لباس پر شکن نہیں دیکھی تھی، لیکن اس ریحان کے لباس اور چہرے پر اتنی زیادہ شکنیں تھیں کہ یوں لگتا تھا جیسے زندگی نے عمر بھر کی ''بے شکنی'' کا حساب لے لیا ہو۔ کچھ دیر کے لیے میں اُس کی یہ حالت دیکھ کر دروازے ہی پر جما رہ گیا۔ پھر ریحان ہی نے ابتدا کی ''تم آ گئے عبداللہ......'' میں تمہارا ہی انتظار کر رہا تھا......'' میں اُس کی جانب بڑھا ''یہ تم نے اپنی کیا حالت بنا رکھی ہے......وہ تمہیں اگر اس طرح دیکھتی تو اُسے کتنا دکھ ہوتا......'' ریحان نے ایک گہری سی سانس لی ''جب سارے شہر کے آئینے ہی ٹوٹ جائیں تو بننے سنورنے سے کیا فائدہ......؟ میں نے تم سے معافی مانگنے کے لیے آج تمہیں یہاں بلایا ہے۔ میں نے اپنی پوری زندگی میں دانستہ کبھی کسی کو ذرہ برابر بھی تکلیف نہیں پہنچائی، لیکن میری وجہ سے تمہیں بے حد اذیت اُٹھانی پڑی تمہیں ہتھکڑیاں لگائی گئیں، شدید بیماری کے عالم میں تمہیں اس تندور نما حوالات میں راتیں کاٹنی پڑیں۔ ہو سکے تو مجھے معاف کر دو۔ میں یہ سب نہیں چاہتا تھا لیکن یقین جانو میں بے اختیار تھا۔'' میں نے ریحان کا ہاتھ پکڑ لیا۔ ''معذرت غیروں کے درمیان ہوتی ہے اور پھر میرے ساتھ جو کچھ بھی ہوا، وہ میرا نصیب تھا لیکن اگر معافی ہی کسی اذیت کا مداوا ہے تو تم مجھے معاف کر دو، کیوں کہ تمہاری گرفتاری میرے وجدان کا شاخسانہ ہے اور میں خود کہیں نہ کہیں اپنے آپ کو بھی مجرم گردانتا ہوں۔'' ریحان تڑپ سا گیا۔ ''نہیں...... بالکل نہیں ...... جسے تم گرفتاری کہتے ہو، اصل میں یہ میری پہلی رہائی ہے۔ میری ٹوٹی پھوٹی اور اندر سے کئی حصوں میں تقسیم شخصیت کے اتنے ریزے ہو چکے ہیں کہ اب ان کی کرچیاں چننا بھی میرے لیے ممکن نہیں رہا تھا۔ میری رُوح کی قابض نے میرا سب کچھ لوٹ لیا اور اس کا واحد علاج اسے پابند سلاسل کرنا ہی تھا۔ وہ ابھی تک میرے وجود پر اپنے پنجے گاڑے ہوئے ہے اور میری راتوں کا اندھیرا اب بھی اتنا ہی خوف ناک ہے۔ کاش تم میری زندگی میں لیلیٰ کی موت سے قبل آئے ہوتے تو شاید میری ساری جمع پونجی نہ لٹتی۔ کاش......'' بولتے بولتے ریحان کی آواز بھرا گئی اور شدید ضبط کے باوجود اس کی معصوم آنکھوں سے دو آنسو ٹپک پڑے۔ آنسو کیا تھے، تیزاب کی دو بوندیں تھیں، جو میرے دل کی پوری کائنات کو پل بھر میں جلا کر خاکستر کر گئیں۔ ہم انسان کتنے بے بس، کتنے معذور ہوتے ہیں کہ صرف زبانی ہمدردی کے علاوہ کسی اپنے کا غم تک اپنے اندر اُتار کر اس کا بوجھ بھی ہلکا نہیں کر سکتے۔ میں نے آگے بڑھ کر اُس کے ہاتھ تھام لیے۔ مجھے یوں لگا کہ میرے سامنے بیٹھ کر رونے والا ریحان نہیں، کوئی سات آٹھ سالہ بچہ ہے، جس کا سب سے پیارا کھلونا، کوئی اِسی کے سامنے توڑ کر چلا گیا اور وہ کچھ بھی نہیں کر پایا۔ میں نے ریحان کی آنکھوں میں جھانکا۔ ''میری ایک بات مانو گے ریحان......؟'' معصوم سے بھولے بچے نے سر اُٹھا کر گردن ہلائی۔ میں نے اُس کے ہاتھ مزید مضبوطی سے تھام لیے۔ ''جب میں یہاں سے چلا جاؤں تو تنہائی میں خوب زور زور سے چیخ چیخ کر رونا......اتنا رونا کہ یہ فلک پھٹ جائے اور اس آسمان سے پرے کی گلابی دُھند میں تمہیں تمہاری لیلیٰ کا چہرہ دکھائی دینے لگے۔ مجھے

[نا] ہے، تمہارے آنسو اس دُھند کو چیر کر اُس تک ضرور پہنچیں گے۔ پھر اُس سے جی بھر کر باتیں کرنا۔ مجھے [نا] ہے، وہ اب بھی مسکرا کر تم سے بات کرلے گی۔'' ریحان نے پھر اثبات میں سر ہلایا۔ اُس کی آنکھوں [سے] بہتا پانی مسلسل میری ہتھیلیوں کی پشت کو بھگو رہا تھا۔ زمانے کے لیے وہ ایک قاتل تھا، لیکن کیا کبھی کسی نے معصوم قاتل بھی دیکھا ہوگا۔ مجھے کچھ یاد آیا۔ ''اور ہاں...... مجھے تم سے اپنے ایک اور جھوٹ کی معافی بھی [مانگنی] ہے۔ میں نے تمہیں لیلیٰ کے آخری جملے کے بارے میں جو بات کہی تھی۔ وہ صرف اُس پُراسرار عورت کا [کھ]وج لگانے کے لیے میری ذہنی اختراع تھی پتا نہیں، کیوں اور کب میرے ذہن میں وہ بات آئی اور میں نے [ک]ہہ دی۔ مجھے اپنے اس جھوٹ پر بے حد شرمندگی ہے۔'' ریحان کی آنکھوں میں حیرت تھی۔ ''لیکن تم نے تو [کو]ئی جھوٹ نہیں بولا۔ میں نے خود اُس رات نیچے جھانک کر دیکھا تھا، تم لیلیٰ کے گرتے ہی چند لمحوں بعد اُس [کے] قریب پہنچ گئے تھے۔ اور ٹھیک اُس کے سرہانے بیٹھے ہوئے تھے۔ ضرور لیلیٰ نے تم سے کچھ بات کی ہوگی مگر [تم] اپنی دگرگوں ذہنی حالت کی وجہ سے یاد نہیں رکھ پائے۔'' اب حیران ہونے کی باری میری تھی۔ میرا ذہن [س]ائیں سائیں کرنے لگا۔ تو گویا میری زبان سے جو لفظ ادا ہوئے تھے، وہ میرے ذہن میں ٹھیک اُسی وقت [آ]ئے تھے، جب میں ریحان سے اُس کے گھر گالف کورس میں ملا تھا۔ لیلیٰ کی زبان سے ادا ہوئے وہ لفظ [می]رے سوئے ہوئے ذہن کی کسی دراز میں بند رہ گئے تھے اور صبح جب مجھے پولیس نے ساحل سے گرفتار کیا تو [می]رے جنوں کا وہ دور حسب معمول میری یاد سے محو ہو گیا۔ لیکن جب ریحان میرے سامنے آیا تو یاد کی کھڑکی [سے] لیلیٰ کا وہ جملہ ہوکے ایک جھونکے کی طرح آیا اور میری زبان سے ادا ہو گیا۔ مجھے انسانی ذہن کی بھول [بھ]لیوں اور اس کے کرشموں سے ایک بار پھر خوف محسوس ہونے لگا۔ جانے کتنے شعبدے جانے، کتنے عفریت [ا]س چھٹانک بھر کے ذہن میں چھپے بیٹھے رہتے ہیں۔ اس ذہن کی موجودگی میں شاید ہر انسان ایک چلتا پھرتا [آت]ش فشاں ہی تو ہوتا ہے، جو کسی بھی وقت دھماکے سے پھٹ سکتا ہے۔ ریحان کی اس حالت کا ذمہ دار بھی [صر]ف اور صرف یہ ذہن ہی تھا۔

میں بہت دیر تک ریحان کے آنسو پونچھتا رہا۔ کاش اُس کے اندر بیٹھی وہ قابض قاتلہ میری رسائی میں [ہوتی] تو میں اس کو تصرف کے لیے اپنا ناکارہ وجود پیش کر دیتا کہ یہ جسم بوسیدہ تو اب خود دیوانگی کی راہ پر گام زن [ہے۔] ریحان نے مجھے بتایا کہ فی الحال نفسیات دانوں اور ڈاکٹروں نے اُس کی ہم زاد سے اُس کی جان چھڑانے [کے] لیے نیند کو بطور ڈھال استعمال کرنے کا فیصلہ کیا ہے اور سرِ شام ہی اندھیرا ہونے سے قبل ریحان کے جسم [میں] ایک خاص مقدار میں نیند کی دوا تحلیل کر دی جاتی ہے اور مغرب سے لے کر صبح دیر گئے تک ریحان سویا رہتا [ہے۔] لیکن بقول ریحان، اُسے ڈر تھا کہ یہ ترکیب زیادہ عرصہ چل نہیں پائے گی، کیوں کہ وہ بہت پہلے خود بھی [یہ] آزما چکا تھا۔ شروع شروع میں تو اُسے نیند آ جاتی تھی لیکن پھر رفتہ رفتہ بے چینی شروع ہونے لگی اور چند [دنوں] بعد تو وہ اس کے خوابوں پر بھی قابض ہوتی گئی۔ نتیجتاً ریحان کو دورے پڑنے لگے اور اُسے نیند کی دوا ترک

کر دینی پڑی۔ اور پھر میں اس وقت اپنا ضبط کھو ہی بیٹھا، جب ریحان نے مجھ سے یہ پوچھا کہ ''کیا میں
اُسے ایک قاتل سمجھتا ہوں اور کیا میں کبھی ریحان کے لیے دعا کروں گا......؟'' میں جواب دیتے ہوئے
کہ میری اور میری دعاؤں کی کیا اوقات ہے۔ ہاں البتہ اگر اُوپر والے کے سامنے ہاتھ پھیلا کر اور گڑگڑا کر
مانگنے ہی کو دعا کہا جاتا ہے تو میں یہ مشق ریحان کی گرفتاری سے بھی پہلے سے کر رہا ہوں۔ کہ ''یا مالک......
انسان کو صبر دے، سکون دے اور ہمت عطا کر......'' میں بہت دیر سے ریحان کے ساتھ بیٹھا تھا اور مجھے باہر
کے گزرتے وقت کی اطلاع صرف روشن دان سے چھنتی دھوپ کے مختلف زاویوں ہی سے مل رہی تھی۔ دھیرے
دھیرے شام قریب آرہی تھی۔ میں نے نماز بھی ریحان کے کمرے ہی میں ایک صاف چادر بچھا کر ادا کی اور
ریحان سے بھی کہا کہ وہ نماز کی پابندی کی کوشش کیا کرے۔ ریحان نے مجھے بتایا کہ بچپن میں یعقوب ڈرائیور
کے ساتھ وہ ہمیشہ جمعہ اور عید کی نماز کے لیے ضرور جاتا تھا۔ یعقوب کی بیوی، جو ریحان کی رُوحانی ماں کے
برابر تھی، اُس نے اُسے نماز اور سورتیں یاد کروائیں تھیں لیکن پھر دھیرے دھیرے وہ سب بھولتا گیا۔ میں نے
اُسے یقین دلایا کہ چاہے وہ مذہب کو بھلا بیٹھا ہو، لیکن مذہب اُسے کبھی نہیں بھولے گا اور جس دن ریحان
باوضو ہو کر جائے نماز پر کھڑا ہوگا، اُسے خود بخود سب یاد آجائے گا۔ خود میرے ساتھ بھی تو یہی ہو چکا تھا۔
مذہب ہمارے اندر آتی جاتی سانس کی طرح زندہ رہتا ہے۔ جب ہم سانس لینا نہیں بھولتے اور کوئی ہمیں
سانس لینا سکھاتا بھی نہیں تو پھر مذہب ہمیں کیسے بھول سکتا ہے۔ بس، کچھ طریقہ کار سیکھنے کے لیے کبھی کسی رہبر
اور کبھی ماحول کی ضرورت پڑتی رہتی ہے۔

عصر کے فوراً بعد ریحان کی دوا کا وقت ہونے لگا اور میرے جانے کی خبر سن کر نہ جانے وہ کیوں ایک
ہی بہت بے چین سا ہو گیا۔ شاید میں اُس کی عمر بھر میں اُس کا واحد دوست تھا، جس کے ساتھ اس نے صبح
شام تک کا وقت گزارا اور اپنے دل کی اتنی بہت سی انمول باتیں بانٹی تھیں۔ اُس نے میرا ہاتھ پکڑ کر عجیب
درد بھرے لہجے میں التجا کی ''پھر آؤ گے نا عبداللہ......؟'' ''ہاں......ضرور......کیوں نہیں......اور اُس دن
صرف تمہاری لیلیٰ کی بات کریں گے۔ پتنگوں کی باتیں، دھانی آسمان اور نیلی ڈور کی باتیں...... جھاگ اُڑاتے
سمندر اور دودھیا بادلوں کی باتیں......ٹھیک ہے نا......؟'' وہ بہت خوش ہو کر بولا ''ہاں......بالکل ٹھیک
ہے......لیکن پکا......تم آؤ گے نا......ہاں......بالکل پکا......'' میں نے مسکرا کر اُس کا ہاتھ تھپتھپایا اور
نرس نے ریحان کے بازو میں نیند کی دوا انجیکٹ کر دی۔ میں ریحان کی پلکیں بوجھل ہونے تک وہیں اُس کے
سرہانے بیٹھا رہا۔ نیند کی سرمئی پری نے دھیرے دھیرے اپنے پنکھ اُس کے بوجھل پپوٹوں پر پھیرنا شروع کر
دیئے۔ ریحان کی پلکیں بھاری ہونے لگیں، لیکن سوتے سوتے بھی آج اُس کے ہونٹوں پر ایک معصوم اور دلکش
سی مسکان موجود تھی۔ مجھے یقین تھا کہ آج کی رات اُس کی زندگی کی سب سے پُرسکون نیند کی رات ہوگی۔
نیند کا یہ مکمل خزانہ آج کل ہم سب میں سے کسی کا بھی نصیب نہیں ہے۔ ہم سو تو جاتے ہیں مگر بنا نیند کے۔

ریحان کے سو جانے کے بعد بھی بہت دیر تک وہیں گم صم سا بیٹھا رہا۔ میری بھیگی پلکیں مجھ سے بہت سے
سوال کرتی رہیں مگر آج بھی میرا دامن جوابوں سے خالی تھا۔

رات بہت دیر سے میں ساحلی مسجد کے قریب بس سے اُترا تو ایک نئی پریشانی میرے انتظار میں مسجد کے
باہر ٹہل رہی تھی۔ مرتضیٰ صاحب مجھے آتا دیکھ کر تیزی سے میری جانب بڑھے اور انہوں نے بتایا کہ مغرب
کی نماز کے بعد اچانک سلطان بابا کی طبیعت بگڑ گئی تھی۔ فوری طور پر بستی کے حکیم کو لایا گیا، مگر معاملہ اُس کی پہنچ
سے دُور کا تھا۔ لہٰذا بستی والوں نے شہر کے ڈاکٹر کا انتظام کیا۔ میرے آنے سے کچھ دیر پہلے ہی ڈاکٹر واپس جا
چکا تھا۔ میں لپک کر حجرے میں پہنچا تو سلطان بابا نیند میں تھے۔ پتا چلا کہ ڈاکٹر نے عارضی طور پر کوئی دوا اور نیند
کا ٹیکا لگا تو دیا ہے لیکن اس نے ساتھ ہی ساتھ یہ تاکید بھی کی ہے کہ پہلی فرصت میں صبح سلطان بابا کو شہر کے
کسی بڑے ڈاکٹر کو دکھا دیا جائے۔

میں ساری رات وہیں بابا کے سرہانے ہی بیٹھا رہا اور اس ہمدرد اور بزرگ مخلص کے چہرے کو دیکھتا
رہا۔ چند مہینوں ہی میں میری زندگی کیا سے کیا ہو کر رہ گئی تھی۔ شاید اسی کو کایا پلٹ کہتے ہیں۔ لیکن کتنی عجیب
بات تھی کہ اس پوری راہ میں میں نے زہرا کے علاوہ کوئی اور خوشی نہیں دیکھی تھی۔ ساحر کی زندگی جتنی ہموار تھی،
عبداللہ کی زندگی اُسی قدر دشوار اور ہچکولوں سے بھری ہوئی تھی۔ کبھی کبھی تو مجھے یوں محسوس ہوتا تھا کہ جس
جذبے کو ہم نے خوشی کا نام دے رکھا ہے وہ کہیں بھی اپنا وجود نہیں رکھتا۔ شاید کسی غم کا نہ ہونا ہی اصل میں خوشی
ہے۔ ورنہ سب طرف غم ہی غم ہوتا ہے۔ حسب معمول فجر کے وقت سلطان بابا کی آنکھیں میکانکی انداز میں
کھل گئیں۔ ہمارے ذہن میں لگے الارم کلاک کی سوئیاں سوتے میں بھی بالکل ٹھیک کام کرتی ہیں۔ میں نے
انہیں آنکھیں کھولتے دیکھ کر اُن سے پوچھا ''آپ مجھے کیوں اتنا ستاتے ہیں......؟'' سلطان بابا کے نحیف
چہرے پر ہلکی سی مسکان آگئی۔ ''ستایا تو اپنوں ہی کو جاتا ہے میاں اور پھر جسے عبداللہ جیسا تیماردار میسر ہو وہ بار
بار بیمار نہ پڑے تو اور کیا کرے؟'' میں نے منت سماجت کر کے انہیں کم سے کم حرکت کرنے پر آمادہ کیا تو
انہوں نے وضو کے بعد بیٹھ کر اشاروں سے نماز ادا کی۔ سورج نکلتے ہی میں نے رحمٰن صاحب کو فون کر کے کسی
سواری کا بندوبست کرنے کی درخواست کی اور ٹھیک پونے گھنٹے بعد ایک بڑی سی آرام دہ کار سمیت وہ خود مسجد
کے باہر موجود تھے۔ ہم نے سفر کے دوران بھی اس بات کی حتی الامکان کوشش کی کہ سلطان بابا کے جسم کو راستے
کے ہچکولوں سے بچایا جائے، کیوں کہ رات والے ڈاکٹر کی بھی یہی ہدایت تھی۔

شہر کے بڑے اسپتال کے ڈاکٹر نے سلطان بابا کو معائنے کے دوران ہی اسپتال میں داخل کرنے کی
ہدایت کر دی۔ میں اور رحمٰن صاحب راہداری ہی میں موجود تھے، جب ڈاکٹر صاحب مریض کے معائنے
والے کمرے سے باہر نکلے۔ ہم دونوں اُن کی جانب لپکے۔ ڈاکٹر نے ایک گہری سانس لی۔ ''ان بزرگ کو
ابھی قریب میں کوئی سر کی شدید چوٹ لگی ہے شاید۔'' ''جی......کچھ حادثہ ہو گیا تھا۔'' ڈاکٹر نے سر ہلایا ''تو میرا

اندازہ درست تھا۔ کچھ پیچیدگی ہوگئی ہے۔ لیکن میں حتمی رائے تب ہی دوں گا، جب ان کے تمام معائنوں کی رپورٹ میرے پاس آجائے گی...... اللہ خیر کرے گا۔" ڈاکٹر میرا کاندھا تھپتھپا کر آگے بڑھ گیا۔ سلطان بابا کو فوری نگہداشت کے شعبے میں منتقل کر دیا گیا اور پھر سے وہی شیشے کی نلکیاں اور بوتلیں اُن کے جسم سے چپکا دی گئیں، جن سے انہیں شدید چڑ تھی۔ رحمان صاحب بھی بہت دیر تک میرے ساتھ ہی شیشے کی دیوار سے پرے کمرے میں لیٹے سلطان بابا کو دیکھتے رہے۔ پھر انہیں کوئی ضروری فون آیا تو وہ مجھ سے معذرت کر کے اپنے دفتر کی جانب روانہ ہوگئے۔ میں وہیں بیٹھا رہا۔ وقت جب اُڑنے پر آئے تو پر لگا کر اُڑتا ہے اور جب رینگنے پر آئے تو یوں ایک ایک صدی کر کے سرکتا ہے کہ ہم ایک ہی جگہ بیٹھے بیٹھے کئی جنم گزار دیتے ہیں۔ میں نے بھی نہ جانے اس لکڑی کی بنچ پر بیٹھے کتنے جنم پھر سے جی کر فنا کر دیئے۔ ڈاکٹروں کی نہ جانے کتنی ٹولیاں اندر آتی جاتی رہیں اور سلطان بابا کا معائنہ جاری رہا۔ نہ جانے کب پھر سے رات ہوئی اور پھر سویرا بھی ہوگیا۔ درمیان میں دو مرتبہ رحمٰن صاحب کا فون بھی آیا۔ میں دو رات پہلے ریحان سے ملنے کا وعدہ کر کے آیا تھا لیکن آج دوسرا دن چڑھ آنے کے باوجود یہاں سے ہل بھی نہیں سکا تھا۔ جانے ہم انسان کس بل بوتے پر ایسے وعدے اور اتنے بڑے بڑے دعوے کر لیتے ہیں۔ ہمارے پاس تو ایک پل کا اختیار بھی نہیں ہوتا۔

پھر سہ پہر ڈھلنے کے بعد تھکے تھکے سے رحمٰن صاحب بھی آگئے۔ میں نے اُن سے ریحان کی طبیعت کے بارے میں پوچھا تو وہ ہوں ہاں کر کے ٹال گئے۔ میں بے چین ہوگیا اور اُن کی منت کی کہ مجھ سے کچھ نہ چھپائیں۔ آخر رحمٰن صاحب نے ہتھیار ڈال کر مجھے وہ اَن ہونی بھی سنا دی، جس کا خدشہ شاید میرے اندر بہت پہلے سے کہیں بیٹھا ڈنک مار رہا تھا۔ رحمٰن صاحب نے بتایا کہ ریحان اس رات بے حد پُرسکون نیند سویا تھا اور اُٹھنے کے بعد بھی وہ بہت پُرسکون رہا۔ لیکن سہ پہر کے بعد اُس کے اندر عجیب سی بے چینی کے آثار پیدا ہونے لگے۔ فوراً کمرے کی کھڑکیاں کھول دی گئیں تاکہ اُسے دن ہونے کا احساس ہوتا رہے مگر وہ بے چینی سے اِدھر اُدھر سر پٹختا رہا۔ شاید اُس کا وجود اندر سے چیخ رہا تھا اور برسوں سے اُس کے اندر پلتی دوہری شخصیت کو جب لگا تار کئی راتوں تک اپنے اظہار کا موقع نہیں مل پایا تو اُس نے ریحان کے اعصاب اُکھیڑنا شروع کر دیئے تھے۔ ماہر نفسیات کے کہنے پر شام سے پہلے ہی کھڑکیوں کے پردے گرا کر ریحان کے کمرے میں ایک ڈریسنگ ٹیبل اور میک اپ کا کچھ سامان پہنچا دیا گیا اور کمرہ باہر سے بند کر دیا گیا، لیکن کچھ ہی دیر میں ریحان نے سنگھار میز کے آئینے کو ایک ہی ضرب سے کرچی کرچی کر دیا اور سنگھار کا سارا سامان اُٹھا کر دیوار پر دے مارا۔ اسپتال کے عملے نے فوراً ریحان کو قابو کرنے کی کوشش کی، لیکن اُس کا جنوں بڑھتا ہی گیا اور نصف شب تک وہ خرد کی آخری حد بھی پار کر چکا تھا۔ مجبوراً اُسے بجلی کے جھٹکے دیئے گئے لیکن ریحان جس گلابی دُھند کے پار جا چکا تھا، وہاں سے واپس نہ لوٹ پایا۔ اگلی صبح اسپتال کی راہ داریاں اُس کے دیوانہ وار قہقہوں سے گونج رہی تھیں اور پھر کچھ ہی دیر میں لوگوں کو کسی معصوم بچے کے رونے کی آواز سنائی دیتی۔ وہ معصوم بچہ، جس کی

پیاری ماں کو لوگ اُس سے چھین کر لے جا رہے ہوں اور وہ رو رو کر اپنی ماں سے پوچھ رہا ہو کہ اب اُسے رات کو لوری کون سنائے گی، کون صبح اُس کے بال سنوارے گی اور کون اُسے ہنس کر اپنے سینے سے لگائے گی۔ میرا دل پھٹنے لگا اور مجھے یوں لگا کہ ریحان کے ساتھ ساتھ میں بھی اسی گلابی دُھند کے پار جا رہا ہوں۔

''ہوش والوں کو خبر کیا......''

ریحان نے ہمیشہ کے لیے اپنا ناتا اس ہوش کی دنیا سے توڑ لیا تھا، جہاں اُس جیسے نازک احساس وال
کے لیے ذی ہوش خود دیوانہ تھا۔ یہ دنیا ویسے بھی اس کے کام کی نہیں تھی، جہاں کانچ کا من رکھنے والوں کو ہر
پتھروں کا سامنا رہتا ہے۔ اس شام جب سلطان بابا نے تین دن کی بے چینی کے بعد ذرا دیر کے لیے غنودگی کی
چادر اوڑھی تو میں رحمٰن صاحب کے ساتھ کچھ دیر کے لیے ریحان کو دیکھنے کے لیے گیا۔ آہنی سلاخوں سے
پرے ایک ایسے کمرے میں، جس کی دیواروں کو اندر سے چکنے اسٹیل سے ڈھک دیا گیا تھا اور جس کی اُون
چھت کے اندر صرف ایک بلب کے جلنے کے لیے جگہ چھوڑی گئی تھی۔ ریحان گھٹنوں میں سر دیئے بیٹھا تھا۔
ہماری آہٹ سن کر اس نے سر اُٹھایا اور کسی بچے کی طرح خوف زدہ ہو گیا اور پھر جلدی سے ہماری جانب سے
پیٹھ موڑ کر بیٹھ گیا لیکن اچانک ہی جیسے اُسے کچھ یاد آیا اور وہ جلدی سے بھاگ کر سلاخوں کے قریب آ گیا
رحمٰن صاحب کی طرف دیکھ کر کہنے لگا ''میری امی کب آئیں گی......؟'' رحمٰن صاحب نے جھوٹی مسکراہ
لبوں پر سجائی۔ ''تمہاری امی جلد آ جائیں گی شرط یہ ہے کہ تم روؤ گے نہیں، نہ ہی یہاں کے عملے کو تنگ کرو گے۔
ریحان خوش ہو گیا۔ ''ٹھیک ہے...... پکا؟'' رحمٰن صاحب نے اُس کی پھیلی ہوئی ہتھیلی پر اپنا ہاتھ رکھ دیا۔ ''بالکل
پکا......'' وہ فوراً جا کر اپنی جگہ پر یوں باادب بیٹھ گیا، جیسے کوئی بہت تمیز دار بچہ اپنی ماں کے حکم کے مطابق
جگہ بیٹھ کر اس کا انتظار کرتا ہے۔ مجھ سے پھر وہاں ٹھہرا نہیں گیا۔ کتنا نازک ہوتا ہے یہ انسان، کتنا کومل،
ملائم احساس والا...... پھر بدل کیسے جاتا ہے۔ مکاریاں، فریب، چال بازیاں، دشمنیاں، حسد، برائیاں،
کینہ پروری، چوری، جھوٹ، خیانت اور دغا بازیاں کیسے سیکھ لیتا ہے؟ اگر جنوں انسان کو پھر سے ریحان
طرح معصوم بنانے کے عمل ہی کا نام ہے تو اے کاش قدرت سب ہی ہوش مندوں کو مجنوں کر دے اور پھر
کسی نے ٹھیک ہی کہا ہے کہ ہوش والے بھلا جنوں کی حکایت کو کیا جانیں، بے خودی کی لذت تو صرف دیوانو
ہی کا انعام ہے۔ یہ نادان ہوش والے تو بس ساہوکار کی طرح لین دین اور نفع و نقصان کے پھیرے میں پڑ
رہتے ہیں لیکن ایک دن انہیں بھی سب کچھ یہیں چھوڑ کر دیوانوں کے ساتھ ہی کوچ کرنا پڑتا ہے۔

میں واپس اسپتال تو آ گیا تھا لیکن اپنے دل کا ایک ٹکڑا وہیں ریحان کے پاس ہی چھوڑ آیا تھا۔ خود
اپنی حالت بھی نہایت ابتر ہوتی جا رہی تھی۔ رگوں میں سلگتی چنگاریاں وقفے وقفے سے ایک بھڑکتا شعلہ
میرے پورے سراپے کو جھلسا رہی تھیں لیکن میں ضبط کیے بیٹھا رہا۔ میں ایسے موقع پر ڈاکٹروں کی توجہ اپنی جا

ل کروا کر سلطان بابا کے سامنے سے ہٹنا نہیں چاہتا تھا۔ لیکن یہ جبر میں نے رات بھر خود پر اس طرح جھیلا
ہ میرا سارا بدن بخار میں پھنک رہا تھا۔ بالآخر صبح ڈاکٹروں نے سلطان بابا کے معائنوں کے حتمی نتائج
کے بعد یہ اعلان کر دیا کہ انہیں جس جدید علاج کی ضرورت ہے، وہ ملک کے صرف دو شہروں میں
ب ہے، جس میں ایک میرا اپنا شہر بھی شامل تھا۔ لیکن مسئلہ یہ تھا کہ یہاں سے ہمارے شہر کے لیے ہفتے بھر
رف ایک جہاز اُڑتا تھا اور بدقسمتی سے آج وہی دن تھا اور اُڑان کا وقت بھی نکل چکا تھا۔ زمینی راستے سے
والی سلطان بابا کی حالت نہیں تھی اور ٹرین تک پہنچنے کے لیے کم از کم یہاں سے دو دن کا زمینی سفر درکار
پھر نہ جانے رحمٰن صاحب کے ذہن میں کیا خیال آیا۔ انہوں نے دو چار فون گھمائے اور گھنٹے بھر بعد ہی آ
مژدہ سنایا کہ شہر کی بندرگاہ پر ایک بہت بڑا غیر ملکی بحری جہاز آ کر لگا اور ٹھیک چھ گھنٹے بعد اُس کی روانگی
حمٰن صاحب نے ہمارے لیے دو فرسٹ کلاس کے کیبن مختص کروا لیے تھے۔ ہمیں یہ بحری جہاز آج سے
پانچویں دن شہر کی بندرگاہ پر اُتار دیتا۔ بقول رحمٰن صاحب یہاں بیٹھے رہنے سے بہتر تھا کہ ہم اپنی منزل
جانب چل پڑتے کیوں کہ سات دن بعد بھی اگر موسم یا کسی دوسری انہونی کی وجہ سے ہم سے اگلی فلائٹ بھی
اتی تو مزید دیر بھی ہو سکتی تھی۔ میں نے اُن کا شکریہ ادا کرنا چاہا تو انہوں نے زور سے میرا کاندھا تھپتھپایا
رے ساتھ سامان سمیٹنے میں مشغول ہو گئے۔

جب ہم بندرگاہ پہنچے تو وہ عظیم الشان نیلے رنگ کا بحری جہاز جس کی سات منزلیں تو دُور ہی سے گنی جا سکتی
کسی فوج کے فاتح سپہ سالار کی طرح سینہ تانے لنگر انداز تھا۔ جہاز پر سنہری اور سفید حروف میں بڑا بڑا
بالانا کا لکھا ہوا تھا اور اطالوی نژاد عملہ عرشے پر اور نیچے سیڑھیوں پر کھڑا آنے والے مہمانوں کا استقبال کر رہا
اس بحری جہاز کو دیکھتے ہی مجھے اِسی جیسے ایک دیوہیکل سفینے کے ڈوبنے کا واقعہ یاد آ گیا، جس سے جڑی
نی کی ایک لافانی داستان کو لوگوں نے پردے پر بھی بے حد سراہا تھا۔ رحمٰن صاحب کے عملے نے ایمبولینس
اُتار کر اسٹریچر پر لیٹے سلطان بابا کو نہایت احتیاط سے مشین کے ذریعے اوپر جہاز پر پہنچا دیا۔ جہاز کے
ہونے ایک زوردار ہنکارا اُبھرا اور میں نے رحمٰن صاحب کی جانب الوداعی ہاتھ بڑھا دیا۔ انہوں نے میرا
کھینچ کر مجھے اپنے سینے سے لگا لیا اور بولے ''زندگی رہی تو تم سے ملاقات ضرور ہو گی۔ میں جانتا ہوں تم نے
طان بابا کی حالت کے پیشِ نظر اپنی تکلیف ہم سب سے چھپائے رکھی، لیکن تم اسے میرا حکم سمجھ لو یا درخواست
پنے شہر پہنچتے ہی سب سے پہلے اپنا چیک اپ بھی ضرور کراؤ گے۔ تمہارے یہاں کے معالج تمہارے لیے
فکر مند ہیں۔ انہیں ابھی تک تمہاری بیماری بھی ٹھیک طرح سے سمجھ نہیں آئی اور تمہیں یوں درمیان میں ہی
چھوڑ کر جانا پڑ رہا ہے......'' میں نے اُن سے وعدہ کیا کہ میں اُن کے حکم کی تعمیل ضرور کروں گا۔ وہ تب تک
بندرگاہ کی میلوں پھیلی سلیب پر کھڑے رہے، جب تک جہاز لہریں اُچھالتا اور کسی مست ہاتھی کی طرح
گہرے پانیوں میں نہیں نکل آیا۔

جہاز نے جس وقت لنگر اُٹھایا تھا اس وقت عصر کا وقت تھا اور اب مغرب بھی ڈھل چکی تھی۔ میں سلیم بابا کو اُن کے کیبن میں دوا کھلا کر، کمبل اوڑھا کر باہر عرشے پر نکل آیا۔ کھلے سمندر میں سورج ڈوبنے کے بعد بہت دیر تک شفق کی لالی برقرار رہتی ہے۔ ابھی کچھ دیر پہلے جب سورج غروب ہونے سے پہلے سمندر کے ساتھ اپنی آخری جنگ لڑ رہا تھا، تب اُس کی سنہری کرنوں نے اُفق تا اُفق لہروں کو اپنا سونا سونپ کے درخواست کی کہ آج وہ سورج کو نہ ڈبوئے...... لیکن سمندر بھلا کب کسی کی سنتا ہے، جوان معصوم کرنوں کی مانتا۔ نتیجتاً ازل سے جاری اس لڑائی میں ایک بار پھر شام ڈھلے سورج کو ہتھیار ڈالنا ہی پڑے اور سمندر ایک بار پھر جیت گیا۔

میں جانے کتنی دیر عرشے پر لوہے کی ریلنگ کے پاس کھڑا لہروں کو سمندر کی جیت کا جشن مناتے دیکھتا رہا۔ اچانک پیچھے سے کسی کے کھنکارنے کی آواز سنائی دی۔ چونک کر پلٹا تو احرام باندھے کوئی عازم کھڑا تھا۔ مجھے یاد آیا کہ بندرگاہ پر جہاز میں سوار ہوتے، میری نظر عازمین حج کی ایک ٹولی پر بھی پڑی تھی۔ وہ راہِ حق کا مسافر مجھے دیکھ کر مسکرایا ''کہیں بہت دُور کھوئے ہوئے لگ رہے تھے۔ میں نے سوچا کہیں سمندر کا جادو تمہیں کھینچ نہ لے...... اس لیے مخل ہو گیا۔ معافی چاہتا ہوں۔'' میں بھی دھیرے سے مسکرایا۔ ''میرے اندر بیک وقت نہ جانے ایسے کتنے سمندر ٹھاٹھیں مارتے رہتے ہیں، اس کا جادو ٹونا میرے لیے نیا نہیں۔'' ''بہت خوب...... کوئی لمبا سفر درپیش ہے؟ اور وہ بزرگ اب کیسے ہیں، جو تمہارے ہم سفر ہیں۔ میں نے جہاز پر سوار ہوتے وقت انہیں تمہارے ساتھ دیکھا تھا۔'' ''جی وہ آرام کر رہے ہیں۔ طبیعت کچھ مضمحل ہے اُن کی۔ ہم اگلی بڑی بندرگاہ پر اُتر جائیں گے۔ وہی میرا شہر اور ہماری منزل بھی ہے۔'' اُس نے باآواز بلند کہا ''انشاء اللہ......''

کچھ دیر ہم دونوں پہاڑ جیسی لہروں کو نیچے جہاز کے پیندے سے ٹکرا کر فنا ہوتے دیکھتے رہے۔ پھر میں نے ہی آداب تکلم کو ملحوظ خاطر رکھتے ہوئے بات جوڑی ''البتہ آپ کا سفر کافی طویل ہے۔ کتنے عرصے میں پہنچ جائیں گے اُس کے گھر......؟؟'' ''شاید چودہ پندرہ دن لگیں گے۔ لیکن سچ تو یہی ہے کہ یہی پندرہ دن پچپن سالہ زندگی کا حاصل ہیں۔ تم نے حج کیا ہے......؟؟'' ''نہیں...... مجھے فی الحال یہ سعادت نصیب نہیں ہوئی...... اور سچ تو یہ ہے کہ مجھے ابھی تک یہ بہت ہمت اور حوصلے کا کام لگتا ہے۔ جانے میرا ظرف اس قابل بھی ہو پائے گا یا نہیں۔'' وہ ہنس دیئے ''سب بلاوے کی بات ہے میاں...... بلاوا آجائے تو لمحوں میں انسان کا اندر تیار ہو جاتا ہے۔ خود میرا بھی حال تم سے کچھ مختلف نہیں تھا۔ مجھے لگتا تھا کہ میں کبھی اس سفر کے لیے نکل ہی نہیں پاؤں گا۔ لیکن جب بات بننے لگی تو یوں بنی کہ جیسے بس اسی سفر کے انتظار میں ہی تو میری ساری عمر کٹی ہے۔''

کافی دلچسپ انسان تھے۔ اُن کا نام حبیب البشر تھا۔ تیسری منزل پر چند دوسرے ایشیائی باشندوں کے ساتھ اُن کا مشترکہ کیبن تھا۔ وہ کافی دیر میرے ساتھ عرشے پر کھڑے باتیں کرتے رہے، اُنہوں نے بتایا کہ وہ [illegible] سال پہلے نیویارک میں کاروبار کرتے تھے اور مذہب سے اُن کا دُور دُور تک کوئی واسطہ یا رابطہ نہیں تھا۔ میں نے بے خیالی ہی میں پوچھ لیا۔ ''آپ نیویارک میں کیا کرتے تھے؟'' ''میرا ڈانس کلب تھا وہاں۔ ویک اینڈ

پارٹی اور فنکشن کا اہتمام کروایا کرتا تھا میں۔'' جواب سن کر میں زور سے چونکا۔ وہ میری کیفیت بھانپ گئے۔ میں نے معذرت کی کہ خواہ مخواہ اُن کی نجی زندگی کو کریدا۔ وہ ہنس دیئے۔ ''ایسی کوئی بات نہیں میاں...... میں نے کہا نا کہ میں چودہ پندرہ سال کی عمر میں امریکا منتقل ہو گیا تھا، لہٰذا میرا اسلام سے برائے نام رشتہ بھی قائم نہ رہ سکا۔ پھر ایک دن کچھ لوگ میری زندگی میں آئے اور میری راہیں بدلتی گئیں۔'' وہ دُور اُفق کے پار کچھ دیکھتے ہوئے کھو سے گئے۔ اُنہوں نے بتایا کہ اُس روز نیویارک میں پیدل چلنے کا دن منایا جا رہا تھا لہٰذا لوگ قریبی مقامات تک پیدل چل کر جا رہے تھے۔ سڑکوں پر کسی میلے یا تہوار جیسی بھیڑ تھی۔ نوجوان حبیب بھی ہلکی ہلکی گرتی برف میں سردی سے بچتے ہاتھ اوور کوٹ کی جیب میں ڈالے، سیٹی پر کوئی مشہور دُھن گنگناتا، کلب کی جانب جا رہا تھا۔ آسمان کے تیور بتا رہے تھے کہ کسی بھی وقت برف باری تیز ہو سکتی ہے۔ لہٰذا لوگوں کے قدموں میں تیزی آ رہی تھی۔ تیز سرد ہوا کے تھپیڑے لباس کے اندر داخل ہو کر جسم کے پار نکلے جاتے تھے۔ حبیب قریبی چوراہے کے سگنل پر پہنچا تو بتی سرخ تھی۔ اچانک پیچھے سے کسی نے پکارا۔ ''نوجوان''...... کیا تم دو لمحوں کے لیے ہماری بات سن سکتے ہو؟'' حبیب چونک کر پلٹا۔ پیچھے پانچ باریش بزرگوں کی ایک ٹولی کھڑی تھی۔ ''جی فرمایئے......'' ''کیا تم ہمیں اپنے قیمتی وقت میں سے صرف دس منٹ دے سکتے ہو، اللہ کے لیے......''

حبیب سمجھا کہ وہ کوئی چندہ اکٹھا کر رہے ہیں۔ اُس نے جیب میں ہاتھ ڈالا تو بزرگ اُس کا مقصد سمجھ کر مسکرائے ''نہیں...... پیسہ نہیں...... صرف وقت...... اور وہ بھی دس منٹ......'' ''لیکن میرے پاس اتنا وقت نہیں ہے اور پھر نیویارک جیسے شہر میں آپ کو کوئی بھی دس منٹ نہیں دے گا۔ یہاں وقت ہی سب سے زیادہ قیمتی چیز ہے۔'' ''تب ہی تو ہم نے کہا کہ اپنا قیمتی وقت دے سکتے ہو۔ اُس اللہ کے نام پر، جس نے تمہیں پیدا کیا اور اتنی اچھی صورت دی اور آرام وہ زندگی عطا کی۔ ہم تم سے تمہارے دس منٹ مانگنے کے لیے سات سمندر پار سے آئے ہیں۔ اور یہاں سب سے ہمارا بس اتنا ہی مطالبہ ہے لیکن اب تک زیادہ تر دھتکار ہی ملی ہے۔'' حبیب نے کچھ دیر سوچا اور پھر نہ جانے کیوں اُس کا دل پسیج گیا۔ ''ٹھیک ہے...... لیکن صرف دس منٹ...... ایک سیکنڈ بھی زیادہ نہیں، کیوں کہ مجھے اپنے کلب پہنچنا ہے اور ایک بہت ضروری شو کا اہتمام کرنا ہے۔'' سگنل کھل چکا تھا۔ باریش ٹولی حبیب کو سامنے ہی شیشوں کے بڑے بڑے دروازوں والے ایک کیفے میں لے گئی۔ برف باری تیز ہو چکی تھی۔ سڑک پار کرتے ہوئے لوگوں کے قدموں کے نشان برف پر بننے شروع ہو چکے تھے۔ حبیب نے کیفے میں داخل ہو کر سر کے بالوں میں جمی برف کو جھاڑا۔ انہوں نے کھڑکی کے سامنے والی میز سنبھال لی۔ ایک بزرگ نے بیگ میں سے ایک کتاب نکالی اور اس کی تلاوت کی۔ ساتھ بیٹھے دوسرے بزرگ نے ترجمہ سنایا ''تو تم اپنے رب کی کون کون سی نعمتوں کو جھٹلاؤ گے......؟'' تلاوت جاری رہی اور ترجمہ ہوتا رہا۔ ٹھیک ساڑھے نو منٹ بعد بزرگ نے تلاوت بند کر دی۔ ''دس منٹ پورے ہونے کو ہیں۔ تمہارا بہت شکریہ کہ تم نے اپنے وقت میں سے دس منٹ اللہ کے نام کر دیئے۔ جزاک اللہ......'' لیکن

حبیب ابھی سیر نہیں ہوا تھا۔ ''کیا آپ میرے لیے پانچ منٹ مزید یہ کتاب پڑھ سکتے ہیں...... میں اپنا وقت کور کرنے کے لیے زیرِ زمین ٹرین پکڑ لوں گا۔'' بزرگ نے بنا کچھ کہے پھر سے کتاب کھولی اور مزید پانچ منٹ تلاوت کی۔ حبیب نے گھڑی دیکھی ''اگر میں اپنے عملے کو موبائل کے ذریعے ایک پیغام بھیج دوں تو وہ میرے پہنچنے تک کچھ انتظامات شروع کر سکیں گے۔ اس صورت میں میرے پاس مزید پندرہ منٹ بچ سکتے ہیں۔ اگر آپ لوگوں کی کوئی اور مصروفیت نہ ہو تو میں مزید سُننا چاہوں گا۔'' پندرہ منٹ مزید تلاوت ہوتی رہی۔ لیکن حبیب اب بھی کچھ بے چین سا تھا۔ طے یہ ہوا کہ وہ اپنا شو ختم کر کے رات دس بجے دوبارہ اس کیفے میں آئے گا اور پوری سورۃ دوبارہ سنے گا۔ وہ رات بھی آ گئی اور نصف شب تک تلاوت بھی ہوتی رہی لیکن معاملہ اب بھی وہی تھا۔ حبیب کی تشنگی...... پھر طے یہ ہوا کہ حبیب اتوار کے روز جماعت کے ساتھ مین ہٹن کے علاقے میں پورا ایک دن گزارے گا۔ وہ دن بھی گزر گیا۔ حبیب نے ہچکچاتے ہوئے بزرگ سے پوچھا کہ یہ پوری کتاب اور یہ پورا پیغام سننے کے لیے اُسے ان لوگوں کے ساتھ کتنا وقت بتانا ہوگا؟ کیوں کہ تین دن تو وہ کسی نہ کسی طرح نکال ہی لے گا۔ بزرگ نے کہا ''جزاک اللہ'' اور تین دن کے لیے حبیب البشر اُن کے ساتھ ہو لیا۔ پھر تین سے دس اور دس سے بات چالیس دنوں تک جا پہنچی اور جب چالیس دن کے بعد حبیب گھر پہنچا تو وہ حبیب نہ تھا، جسے اُس کی گلی نمبر 128 والے لوگ جانتے تھے۔ ڈانس کلب دھیرے دھیرے کافی کے کیفے میں تبدیل ہو گیا، جس کے باہر لگا بڑا سا بورڈ دُور سے لوگوں کو نظر آ جاتا تھا۔ جس پر لکھا تھا ''یہاں شراب فروخت نہیں کی جاتی۔'' زندگی کا پہیہ گھومتا رہا اور اپنے وقت میں سے دیئے گئے دس منٹوں نے حبیب کو کچھ ایسا خراج ادا کیا کہ وہ خود اُن لوگوں کا سربراہ بن گیا، جو لوگوں سے اللہ کے لیے چند منٹ طلب کرنے دنیا بھر میں گھومتے پھرتے ہیں۔ پھر ایک دن حبیب چند لوگوں کے ساتھ مشرقی ساحل والے اپنے آبائی شہر میں اُترا اور پھر یہیں کا ہو کر رہ گیا۔ حبیب صاحب اپنی کہانی سنا کر خاموش ہو گئے۔ بیس برس کا جمع پانی اُن کی آنکھوں سے نکل کر سمندر کے نمک کو مزید نمکین کرنے کے لیے بے تاب ہو رہا تھا۔ بقول اُن کے، بیس برس بعد آخر کار اُن کا وہاں سے بلاوا آ ہی گیا تھا، جہاں جا کر وہ ماتھا ٹیک کر تب تک نہ اُٹھتے، جب تک انہیں اپنے پچھلے ہر گناہ کی معافی کا یقین نہیں ہو جاتا۔ وہ یہ شکوہ بھی کرنے جا رہے تھے کہ وہ پُراسرار بندے جو عمر کے چونتیسویں سال میں نیو یارک کے ایک چوراہے پر اُن سے ملے تھے وہ انہیں پہلے کیوں نہیں ملے......؟ وہ اس کے پیارے حبیب ﷺ کے روضے کی جالی سے اپنی جبیں ٹکا کر تب تک رونا چاہتے تھے، جب تک اُن کی آنکھوں کا پانی بھی آبِ زم زم کی طرح میٹھا نہ ہو جائے...... میں عقیدت سے اس انسان کی طلب کو محسوس کرتا رہا۔ سمندر کی لہریں اب بپھرتی جا رہی ہیں۔ اندھیرا ہو چکا تھا۔ نچلی منزل پر اوّل درجے کے مہمانوں کے ریسٹورنٹ کی گھنٹی بج چکی تھی اور اندر سے پیانو کی ہلکی سی موسیقی کی تانیں باہر عرشے تک بھی پہنچ رہی تھیں۔ حبیب صاحب تیسری منزل کے مہمان تھے، لہٰذا انہیں اُسی ریسٹوران میں کھانا کھانے جانا تھا۔ میری مجبوری یہ تھی کہ رحمٰن صاحب نے بنا، مجھ

سے پوچھے ہی جہاز کے سب سے اعلیٰ حصے کے ٹکٹ کروا لیے تھے۔ مجھے جہاز کا اطالوی عملہ دو مرتبہ آ کر یاد دہانی کروا چکا تھا کہ کھانا نیچے ریستوران میں چن دیا گیا ہے۔ حبیب صاحب بھی نیچے جانے کے لیے پلٹے۔ اچانک میں اُن سے پوچھ بیٹھا ''کیا وہاں پہنچنے تک میں آپ کو یاد رہ پاؤں گا؟ میرا مطلب ہے کہ کیا آپ میرے لیے اُس کے گھر کے سامنے کھڑے ہو کر دعا مانگ سکتے ہیں اور اُس جالی کے سامنے بھی، اگر آپ کو یاد رہے تو......؟'' حبیب صاحب تڑپ کر پلٹے ''ہاں ضرور...... کیوں نہیں...... یہ بھی بھلا کوئی پوچھنے کی بات ہے۔ کوئی خاص دعا کروانی ہے تو وہ بھی بتا دو......'' میں کچھ دیر خاموش رہا ''ہاں...... بہت خاص...... دعا بھی کیا ہے، بس ایک پیغام ہے کہ آپ نے اسے صرف چالیس دن میں پا لیا، میں چالیس صدیاں بھی ریاضت کرنے کو تیار ہوں، بس مجھے مکمل دیوانہ کرنے سے پہلے ایک بار چند لمحوں کے لیے فرزانگی عطا کر دے۔ وہ فرزانگی، جو میری آنکھوں پر پڑے سب پردے اُٹھا دے۔'' جانے حبیب صاحب کو میری بات سمجھ بھی آئی کہ نہیں۔ وہ کچھ دیر نم آنکھوں سے میری جانب دیکھتے رہے۔ پھر دھیرے سے بولے ''انشاء اللہ......''

میں اُن سے رخصت ہو کر نیچے ریستوران میں پہنچا تو کھانا لگایا جا چکا تھا۔ خوب صورت سفید اور نیلی وردیوں میں چاق چوبند بیرے اور دیگر عملہ مہمانوں کی خدمت میں مشغول تھا۔ ایک جانب پیانو پر ایک خوش گلو دوشیزہ بیٹھی کسی اطالوی اوپیرا کا کوئی مشہور گیت بجانے کے ساتھ دِھیمے سُروں میں گنگنا بھی رہی تھی۔ سارے ہال میں غیر ملکی مسافر ہی نظر آ رہے تھے۔ میں نے اپنی پلیٹ میں تھوڑا سا سلاد اور اناناس کی چند قاشیں رکھیں اور ایک اندھیرے گوشے کی طرف قدم بڑھائے ہی تھے کہ سامنے سے آتی ایک غیر ملکی خاتون سے، جو اپنی چار پانچ سالہ بچی کو پکڑنے کے لیے لپک ہی رہی تھیں، زور سے ٹکرا گیا۔ میری پلیٹ سے سلاد اُن کے لباس اور پھر زمین پر بکھر گیا۔ اُن کا پارہ ایک دم ہی آسمان کو چھو گیا اور انہوں نے بنا میری معذرت سُنے انگریزی میں مجھے بے نقط سنانا شروع کر دیں، حالانکہ غلطی بھی اُن ہی کی تھی۔ میرے سادہ سے شلوار کرتے کی وجہ سے شاید وہ مجھے بھی نچلے عملے ہی کا کوئی رُکن سمجھی تھیں اور پھر پورا ہال ہماری جانب متوجہ ہو چکا تھا۔ ''جانے کہاں کہاں سے آ جاتے ہیں احمق لوگ۔ جنہیں ریستوران کے آداب کی بھی تمیز نہیں۔ میرے سارے لباس کا بیڑہ غرق کر دیا۔ اس آدمی کو کس نے ہال میں آنے دیا ہے۔ میری کپتان سے بات کرواؤ ابھی......'' وہ بنا وقفے کے چلائے جا رہی تھیں۔ میں چپ چاپ کھڑا اپنی وضاحت پیش کرنے کا انتظار کر رہا تھا کہ اچانک جہاز کی ایک اٹینڈنٹ بدحواس سی میری جانب دوڑتی ہوئی آئی ''وہ جو بزرگ آپ کے ساتھ تھے...... اُن کی حالت بگڑ رہی ہے......''

کاسابلانکا

یہ سنتے ہی میں اُس عورت کو چیختا چلاتا چھوڑ کر اپنے کیبن کی جانب لپکا، وہاں پہلے ہی سے جہاز کی طبّی ٹیم کے مستند ڈاکٹر موجود تھے۔ سلطان بابا کو آکسیجن لگائی جا چکی تھی اور ان کی سانس رُک رُک کر چل رہی تھی۔ میں نے گھبرا کر ڈاکٹر سے پوچھا کہ ''کیا ماجرا ہے؟'' ڈاکٹر نے سلطان بابا کی نبض سے ہاتھ اُٹھایا۔ ''عام طور پر بوڑھے افراد کو سمندری بخار (Sea sickness) ہو جاتا ہے۔ ایسے میں متلی، چکر آنا یا دل گھبرانا معمول کی بات ہے، لیکن چونکہ یہ بزرگ پہلے ہی سے بیمار چلے آرہے تھے، لہٰذا دونوں وجوہ نے مل کر ان کے نظامِ تنفس کو ایک دھچکا دیا ہے۔ بہر حال...... ہم نے آکسیجن لگا دی ہے۔ ہمارے عملے کی نرس ساتھ والے کیبن ہی میں رات بھر موجود رہے گی۔ اگر آپ ذرا سی بھی غیر معمولی بات محسوس کریں تو فوراً اُسے طلب کر سکتے ہیں۔ شب بخیر......'' فرانسیسی ڈاکٹر انگریزی میں مجھے تسلی دے کر وہاں سے رُخصت ہو گیا۔ نرس بھی اطالوی تھی۔ اُس نے مجھے خود کار گھنٹی کا ریموٹ پکڑا دیا کہ ضرورت پڑنے پر میں صرف یہ بٹن دبا دوں تو وہ حاضر ہو جائے گی۔ میں نے سلطان بابا کے بستر کے بالکل سامنے پڑی آرام کرسی سنبھالی اور کیبن کی روشنیاں مدھم کر کے کرسی پر کمر ٹکالی۔ جانے کتنی دیر میں آکسیجن سلنڈر کے ساتھ جڑی شیشے کی نلکی میں پانی کے بلبلے بن کر ختم ہوتے دیکھتا رہا۔ ہماری زندگی بھی تو فقط پانی کا ایک بلبلہ ہی ہے۔ یہاں بنا...... وہاں ختم...... جانے رات کا وہ کون سا پہر تھا کہ کیبن کے دروازے پر ہلکی سی دستک ہوئی۔ پہلے تو میں اسے اپنا وہم سمجھا لیکن دوسری مرتبہ دستک کی آواز واضح تھی۔ میں نے اُٹھ کر دروازہ کھولا تو راہ داری میں رات کے کھانے کے لباس (ڈنر سوٹ) میں ایک وجیہہ شخص، باریک سا خوب صورت نظر کا چشمہ لگائے کھڑا تھا۔ اُس نے میری جانب ہاتھ بڑھایا۔ ''اس وقت زحمت دینے کی معافی چاہتا ہوں، مجھے راحیل کہتے ہیں۔'' میں نے اُس کا ہاتھ تھام لیا۔ ''میں عبداللہ ہوں۔ کہیے آپ کی کیا خدمت کر سکتا ہوں۔'' وہ کچھ ہچکچایا۔ ''دراصل میں تم سے معذرت کرنے آیا ہوں۔ ڈائننگ ہال میں تم پر بلاوجہ چلّانے والی میری بیوی نتاشا تھی۔ میں جانتا ہوں کہ غلطی تمہاری نہیں تھی، لیکن اُس نے تمہاری بہت بے عزتی کی۔ اُس کی طرف سے میں معافی مانگتا ہوں۔ میں نے تمہارے چہرے سے اندازہ لگا لیا تھا کہ تم ایشیائی ہو اور پھر جب میں نے جہاز کے عملے سے تمہارے کوائف پوچھے تو پتا چلا کہ تم میرے ہم وطن بھی ہو۔ میں در حقیقت تم سے بے حد شرمندہ ہوں۔'' میں نے انہیں تسلی دی۔ ''بھول جائیے۔ مجھے آپ سے کوئی گلہ نہیں ہے۔'' ''نہیں...... یہ بھولنے والی بات نہیں ہے، لیکن نتاشا خود شدید ڈپریشن کا شکار ہے اور

نے جانے کس بات کا غصہ تم پر اُتار دیا، ورنہ وہ عمومی طور پر نہایت شائستہ اطوار کی خاتون ہے۔'' میں نے ان کا تاسف کم کرنے کی ایک اور کوشش کی۔ ''آپ اپنے دل پر کوئی بوجھ نہ لیں، یقین کریں میں ڈائننگ ہال سے نکلنے سے پہلے ہی سب فراموش کر چکا تھا۔ دراصل میں کچھ پریشانی میں مبتلا ہوں، اس لیے مجھے جلدی وہاں سے نکلنا پڑا۔'' ''ہاں مجھے پتا چلا ہے۔ اب کیسے ہیں وہ بزرگ؟'' ''کچھ بہتر ہیں۔ یہ انہی کا کیبن ہے، میرا کیبن ساتھ والا ہے۔'' اتنے میں عملے کی ایک اٹینڈنٹ ہمارے قریب آئی اور مؤدب انداز میں راحیل صاحب سے مخاطب ہوئی۔ ''جناب آپ نے فرسٹ کلاس کے ایگزیکٹو سویٹ کے لیے حکم دیا تھا، لیکن معلومات کرنے پر پتا چلا ہے کہ اس وقت کوئی بھی رائل یا ایگزیکٹو کیبن خالی نہیں ہے، لہٰذا ہم معذرت خواہ ہیں۔ البتہ اگر آپ پسند کریں تو چوتھی منزل پر ایک دوسرے درجے کا کیبن فی الوقت میسر ہے۔ آپ کہیں تو آج رات کے لیے بک کر دیا جائے۔'' راحیل صاحب نے اثبات میں سر ہلایا۔ ''ٹھیک ہے، جیسا آپ مناسب سمجھیں۔'' اطالوی لہجے میں انگریزی بولنے والی اٹینڈنٹ سر ہلا کر آگے بڑھ گئی۔ میں نے راحیل صاحب سے پوچھا۔ ''کیا آپ کو جگہ کا مسئلہ درپیش ہے۔ اگر ایسا ہے تو آپ رات میرے کیبن میں بھی گزار سکتے ہیں۔ میں ویسے بھی رات بھر اپنے ہم سفر کے کمرے میں گزاروں گا۔ انہیں میری تیمارداری کی ضرورت ہے۔'' راحیل صاحب ہچکچا سے گئے۔ ''نہیں نہیں...... کچھ انتظام ہو جائے گا، آپ کیوں تکلیف اُٹھاتے ہیں۔'' لیکن میں نے اصرار کر کے اپنے کیبن کی چابی اُن کے حوالے کر دی۔ اور خود سلطان بابا کے کیبن میں چلا آیا۔ رات کے آخری پہر مجھے یوں محسوس ہوا جیسے میرے ساتھ والے کیبن میں کچھ تیز لہجے میں بحث کی آوازیں ابھری ہوں، لیکن میں نے دانستہ راہ داری میں نکلنے سے گریز کیا۔ مجھے اندازہ ہو گیا تھا کہ میاں بیوی میں کچھ ان بن چل رہی ہے، لہٰذا بہتر یہی تھا کہ میں انہیں اپنے معاملات سلجھانے کا موقع دوں۔ صبح تک سلطان بابا نے دو مرتبہ آنکھیں کھولیں اور دونوں مرتبہ مجھے جا کر سونے کا اشارہ کیا، لیکن وہ میرے جواب سے بھی خوب واقف تھے۔ صبح کے بعد اُن کی نیند کچھ پُرسکون ہوئی تو میں باہر نکل آیا۔ ٹھیک اُسی وقت راحیل صاحب بھی ناشتے کے لیے ڈائننگ ہال کی طرف نکل رہے تھے۔ مجھے دیکھ کر تیزی سے میری طرف بڑھے۔ ''رات میں ٹھیک طرح سے تمہارا شکریہ بھی ادا نہیں کر سکا۔ نتاشا نے مجھے آدھی رات کو ڈھونڈ لیا تھا۔ دراصل ہمارے درمیان تمہارے معاملے پر ہی کچھ اَن بن ہو گئی تھی، اس لیے میں اپنا کیبن چھوڑ کر چلا آیا تھا۔ پہلے تو وہ میرے اُن سے یوں چلے آنے پر بہت ناراض ہوئی اور پھر جب میں نے اُسے یہ بتایا کہ میں اس وقت اُسی نوجوان کے کیبن میں ہوں، جسے اُس نے بھرے ہال میں سخت سست سنائی تھی، تو وہ بہت دیر تک تو کچھ بول ہی نہیں سکی، اتنا شرمندہ میں نے اُسے کبھی نہیں دیکھا۔ میں رات ہی اپنے کیبن واپس لوٹ گیا تھا۔ بہر حال، تمہارا شکریہ۔'' انہوں نے کیبن کی چابی میرے ہاتھ پر رکھ دی۔ اور مجھے اپنے ساتھ ناشتے کے لیے چلنے کی دعوت دی۔ میں نے اُن سے کہا کہ میں لباس تبدیل کر کے نیچے ہال میں اُن سے ملوں گا۔ کبھی کبھی نیم گرم پانی

کا ایک طویل شاور ہماری رگوں سے تھکن یوں نچوڑ لیتا ہے، جیسے گیلی ریت پر لکھے کسی نام کو سمندر کی ایک
لہر اپنے ساتھ بہا لے جاتی ہے۔ میں نیچے ڈائننگ ہال پہنچا تو کھڑکیوں کے پردے ہٹائے جا چکے تھے اور
آسمان پر ہلکے بادلوں سے چھن کر آتی دھوپ نے ہال کے چاروں طرف لکڑی کے چکنے فرش پر دھوپ
درجنوں کھڑکیاں سی بنا رکھی تھیں۔ میں ابھی بیٹھنے کے لیے کوئی مناسب جگہ تلاش کر ہی رہا تھا کہ راحیل صاحب
نے آواز دی۔ "یہیں آجاؤ نوجوان...... ہماری میز پر ایک کرسی خالی ہے......" لیکن میں نے دُور ہی سے
ہلا کر اُن کا شکریہ ادا کیا اور عرشے کے جانب کھلتی ایک کھڑکی کے قریب پڑی میز پر اپنے دلیہ کا پیالہ رکھ
تب ہی میں نے نتاشا کو میز سے اُٹھ کر اپنی جانب آتے دیکھا۔ وہ تیس بتیس سال کی ایک دل کش خاتون
تھیں۔ سلیقے سے کٹے ہوئے سنہرے بال، جو فلیپر سے میچنگ اسکارف سے بندھے ہوئے تھے۔ میں نے
انہیں آج دوسری مرتبہ دیکھا تھا اور دونوں ہی مرتبہ جانے کیوں مجھے اُن کے چہرے کے ایک زاویے سے
کے ساحر کی پسندیدہ ہالی وڈ آرٹسٹ کیتھرین زیٹا جونز کی جھلک بہت واضح محسوس ہوئی تھی۔ وہ ٹوٹی پھوٹی اُردو
میں اجازت لے کر میرے سامنے والی کرسی پر بیٹھ گئیں۔ کل رات راحیل صاحب بھی مجھ سے اُردو میں
بات کر رہے تھے لیکن نتاشا کو اُردو میں اپنے لفظ جوڑنے کے لیے کافی مشقت کرنا پڑ رہی تھی۔ میں نے کچھ
انہیں یہ "ناکام کوشش" کرنے دی اور پھر دھیرے سے اُن سے انگریزی میں کہا کہ وہ چاہیں تو اب یہ کوشش
ترک کر کے مجھ سے انگلش میں بات کر سکتی ہیں۔ کچھ دیر کے لیے تو وہ بھونچکا سی رہ گئیں اور پھر انتہائی ندامت
سے بولیں۔ "اوہ...... تو تم انگلش بول لیتے ہو، لیکن مجھے راحیل نے تو بتایا تھا کہ...... پھر تو میں مزید نادم ہوں
کیوں کہ تم نے میری گزشتہ رات کی ساری گفتگو سمجھ لی ہوگی۔ پتا نہیں مجھے کیا ہو گیا تھا۔ میں کبھی کسی پر
طرح نہیں چلائی۔" میں مسکرایا۔ "چلیں یہ اعزاز میری قسمت میں لکھا تھا، ورنہ عام طور پر بے چارے شوہر
نصیب ہوتا ہے۔" میری بات سن کر وہ ہنس پڑی اور اُن کے چہرے پر چھایا ہوا تکدر کم ہو گیا۔ "ویسے تم عجیب
لڑکے ہو، جس عورت نے تمھیں یوں سر بازار رُسوا کیا، اُسی کے شوہر کو تم نے رات گزارنے کے لیے اپنا کیبن
پیش کر دیا۔ کیوں؟......" میں نے اُن سے بھی وہی کہا جو رات کو راحیل صاحب سے کہہ چکا تھا کہ وہ یہ سب فر
اموش کر دیں۔ ہماری میز کے بالکل ساتھ والی میز پر ایک نو بیاہتا انگریز جوڑا ناشتہ کر رہا تھا۔ پتا نہیں کس بات
پر لڑکے نے لڑکی سے بہت پیار سے پوچھا۔ "سچ کہو، تم میرے ساتھ خوش تو ہو نا۔" لڑکی نے ہنستے ہوئے زور
سے "ہاں" کہا اور وہ دونوں ہنس پڑے۔ قریب ہونے کی وجہ سے اُن کی ساری گفتگو ہم تک پہنچ رہی تھی۔ نتاشا
مسکرائی۔ "کتنی عجیب بات ہے برسوں سے یہ سوال عورت سے تب ہی کیا جاتا ہے، جب اُس کے پاس
'ہاں' کہنے کے علاوہ کوئی اور چارہ نہیں ہوتا۔" "ظاہر ہے، کون بے وقوف شوہر ہوگا، جو اپنی بیوی کو پیٹتے ہوئے
یہ سوال کرے گا؟" میری بات سن کر وہ پھر زور سے ہنس پڑیں، لیکن اُن کی اداس آنکھیں کچھ اور ہی فسانہ
رہی تھیں۔ میں نے اُن سے معذرت کی کہ کل رات میری وجہ سے راحیل صاحب کا اُن سے جھگڑا ہوا۔ وہ

بولیں "نہیں نہیں..... ایسی کوئی بات نہیں..... تم صرف ایک بہانہ بنے، ورنہ ہمارے درمیان بہت دن
سے سب کچھ ختم ہو چکا ہے۔ اگلی بندرگاہ پر اُتر کر ہم قانونی طور پر ایک دوسرے سے جُدا ہو جائیں
گے۔" میرے اندر جیسے ایک چھناکا سا ہوا۔ یہ بات میرے لیے کچھ اتنی ہی غیر متوقع تھی۔ وہ شاید میری
حالت بھانپ گئیں۔ "شاید میں نے تمھیں دھچکا پہنچایا۔ مجھے افسوس ہے۔ مگر سچ یہی ہے۔ ہمارے درمیان
جمود طاری ہو رہا تھا اور شاید جمود محبت کی موت ہے، لیکن المیہ یہ ہے کہ محبت کو جمود سے بچانا بھی ہمارے اختیار
میں نہیں ہوتا، بالکل اُسی طرح جیسے محبت کا ہو جانا ہمارے بس سے باہر ہوتا ہے۔" میں نے چونک کر اُن کی
جانب دیکھا۔ مشرق کی عورت جس بات کو چھپانے کے لیے زندگی بھر چپ رہتی ہے، مغرب کی عورت نے
وہ حقیقت کتنی آسانی سے بیان کر دی تھی۔ میں چپ رہنا چاہتا تھا لیکن پھر وہی آداب گفتگو کی زنجیر آڑے
آ گئی۔ "ہمارے مشرق میں ہزاروں لاکھوں محبتیں ایسے جمود کا شکار ہونے کے باوجود صرف ایک بندھن کی
حرمت کی خاطر اپنی طبعی موت کا انتظار کرتی رہتی ہیں۔ جانے یہ اُن کی خوش قسمتی ہے یا حرمان نصیبی۔ لیکن شاید
ہر رشتہ کبھی نہ کبھی ایسی قربانی ضرور مانگتا ہے۔" وہ اپنی پلیٹ میں رکھے آملیٹ کو کانٹے سے اِدھر اُدھر دھکیلتی
رہیں، لیکن اُن کا دھیان کسی اور جانب تھا۔ "جانتی ہوں، ساری بات شاید اختیار کی ہے۔ کاش میں بھی
تمہارے مشرق کی عورت کی طرح بہت سی باتوں پر اختیار رکھنے کے باوجود بے اختیار ہوتی۔" میں نے تردید
مناسب نہیں سمجھی۔ ناشتے کے بعد میں بہت دیر تک سلطان بابا کے کیبن میں اُن کے سرہانے بیٹھا رہا۔ انہیں
اب بھی خود سے زیادہ میری فکر کھائے جا رہی تھی اور وہ مختلف بہانوں سے مجھ سے وعدہ لیتے رہے کہ میں شہر
پہنچتے ہی خود کو کم از کم ایک ہفتے کے لیے ڈاکٹروں کے حوالے کر دوں گا۔ شہر کا ذکر آنے پر ایک دم ہی میرے
ذہن اُس پری کا تصور اُبھر آیا، جو اس سارے فسانے کی بنیاد تھی۔ جانے میں اُس کا سامنا کیسے کر پاؤں گا۔
میری سانسیں تو اُس کے تصور سے ہی تھمنے لگتی تھیں۔ اتنے عرصے بعد اُسے اپنے سامنے دیکھ کر جانے میرا
کیا حال ہوگا۔ میں جہاز پر سوار ہونے سے قبل ہی رحمٰن صاحب کے ذریعے اپنے گھر واپسی کی اطلاع کروا
چکا تھا اور یقیناً مما پاپا نے زہرا کو بھی میری آمد کی اطلاع دے دی ہوگی۔ جہاز کے بندرگاہ میں لنگر انداز ہونے
میں ابھی تین دن باقی تھے، لیکن مجھے ان لمحوں میں کچھ ایسا محسوس ہونے لگا تھا کہ کبھی کبھی انتظار خود وصل کی
لذت کی صورت اختیار کر لیتا ہے۔ لیکن اس کیفیت کا اندازہ صرف وہی لوگ لگا سکتے ہیں، جو خود کسی طویل
ریاضت سے گزر کر اپنی منزل کو بالکل سامنے پا کر بھی خود کو سوَیا ہونے تک روکے رکھتے ہیں۔ میں بھی عرشے
پر بچھی نیلی بان سے بنی آرام کرسیوں میں سے ایک پر بیٹھا دور اُس اُفق کو دیکھ رہا تھا، جس سے پرے وہ زہرہ
جبین رہتی تھی، اور انتظار کی اُسی لذت کو محسوس کر رہا تھا، جو کسی کسی کا مقدر ہوتی ہے۔ اتنے میں مجھے اپنے عقب
سے نتاشا کی آواز سنائی دی۔ "کیا میں مخل ہو سکتی ہوں؟" میں جلدی سے سنبھل کر بیٹھ گیا۔ وہ بھی میرے
ساتھ والی کرسی پر بیٹھ گئیں۔ راحیل صاحب کہیں نظر نہیں آ رہے تھے۔ نتاشا نے بات شروع کی۔ "تم نے کبھی

محسوس کیا، ہماری زندگی کی ننانوے فی صد ضروریات کسی نہ کسی تخلیق کار کے ذہن کی مرہونِ منت ہیں۔ سوئی سے لے کر بحری جہاز تک، کوئی بھی ایجاد اُٹھالو، انسان نے انسان کی سہولت کے لیے، کیا کچھ نہیں کیا۔ بس ایک زیادتی ہوگئی کہ ان سب آسائشوں کے حصول کو کاغذ کے چند ٹکڑوں سے منسلک کر دیا، جسے ہم آج کل پیسہ کہتے ہیں۔ ٹھیک کہہ رہی ہیں آپ.....اور شاید جہاں سے پیسے کا عمل دخل شروع ہوتا ہے، وہیں سے تخلیق کے عمل کا خاتمہ شروع ہو جاتا ہے۔ ویسے میں نے کہیں پڑھا تھا کہ تخلیق یا creativity خود کو غلطیاں کرنے کی اجازت دینے کا دوسرا نام ہے جب کہ 'آرٹ' انہی غلطیوں میں سے کسی ایک کو جاری رکھنے کو کہتے ہیں۔'' نتاشا نے غور سے میری جانب دیکھا۔ ''ایک بات کہوں اگر بُرا نہ مانو تو.....تمہارا یہ حلیہ اور تمھاری باتیں آپس میں بالکل میچ نہیں کرتیں۔ یہ کیا معما ہے؟'' میں مسکرایا۔ ''اگر میں آپ سے کہوں کہ یہ باتیں مجھے یہ حلیہ اختیار کرنے کے بعد ہی سمجھ میں آئی ہیں تو آپ مزید اُلجھ نہ جائیں.....آپ مجھے یہ بتائیں کہ کیا آپ کے اور راحیل صاحب کے درمیان صلح کی کوئی گنجائش نہیں؟ میں نے انہیں ایک بے حد نفیس انسان پایا ہے اور یقیناً وہ آپ سے شدید محبت بھی کرتے ہیں۔'' نتاشا نے گہرا سانس لیا۔ ''صلح وہاں ہوتی ہے، جہاں جھگڑے کی کوئی بنیادی وجہ بھی ہو۔ اور یہ بھی سچ ہے کہ راحیل جیسا عمدہ اور نفیس انسان بڑی مشکل سے میسر ہوتا ہے۔ مجھے اُس کی محبت پر کوئی شک نہیں ہے، لیکن ان سب باتوں کے باوجود یہ بھی سچ ہے کہ ہم دونوں جدا ہو رہے ہیں۔ ہماری بیٹی عینی ابھی بہت چھوٹی ہے، لہٰذا ہم یہ بھی طے کر چکے ہیں کہ وہ شروع میں کچھ عرصہ میرے ساتھ رہے گی اور پھر جب وہ کوئی فیصلہ کرنے کے قابل ہو جائے گی تو آخری چناؤ اُس کے ہاتھ ہی میں ہوگا۔'' نتاشا نے جتنی بار اپنا گھر ٹوٹنے کا ذکر کیا تھا میں نے اُن کی آنکھوں میں ایک خاص دُکھ کی لہر محسوس کی تھی۔ مشرق ہو یا مغرب، رشتے ٹوٹنے کی چبھن شاید یکساں ہوتی ہے۔ ''میں جانتا ہوں شاید یہ بہت ذاتی سوال ہوگا، لیکن کیا میں اس جُدائی کی وجہ جان سکتا ہوں؟'' نتاشا نے کچھ دیر توقف کیا پھر اُن کی آواز یوں سنائی دی جیسے وہ ساحلوں سے پرے بیٹھی ہوں۔ ''وفا.....ہماری جُدائی کا سبب وفا ہے۔'' میں نے چونک کر اُس کی جانب دیکھا۔ لیکن چپ رہ کر انہیں خود کو مجتمع کرنے کا موقع فراہم کیا۔ ''جو بات میں تمہیں اب بتانے جا رہی ہوں، جانے اس کے بعد تمہارے دل میں میرے لیے رتی برابر بھی عزت رہے گی یا نہیں۔ ہمارے مغرب میں آپس میں ہم آہنگی نہ ہونے پر گھروں کا ٹوٹ جانا ایسی کوئی معیوب بات نہیں رہی۔ بلکہ اب تو کسی بندھن کے تکلف ہی کو ترک کر دیا گیا ہے۔ لیکن میں نے ایک مشرقی مرد سے محبت کے بعد شادی کی تھی اور اس کی ہر روایت کو اپنے سینے سے لگا کر رکھنے کی قسم بھی کھائی تھی۔ پھر نہ جانے یہ تیسری 'درانداز محبت' کہاں سے ہمارے درمیان کی دیوار بنتی گئی۔ مجھے اُمید ہے تم مجھے دیگر لوگوں کی طرح ایک بے راہ رو مغربی عورت نہیں سمجھو گے۔ سچ یہ ہے کہ میری وفا مجھے اجازت نہیں دیتی کہ میں راحیل کے ساتھ رہتے ہوئے اپنی سوچوں کے دروازے کسی اور کے تصور پر وا کروں۔ میں نے اُسی لمحے راحیل کو بتا دیا تھا کہ شاید میں کسی اور کی کشش کا شکار ہو رہی ہوں۔ اور یہ راحیل ہی

ظرف ہے کہ اُس نے آٹھ سالہ رفاقت اور شدید محبت کے باوجود فیصلہ میرے اُوپر چھوڑ دیا۔ ہم دونوں
ں میں 'تجدیدِ وفا' کے قائل نہیں ہیں ......اور پھر وہ وفا ہی کیا، جسے 'تجدید' کی ضرورت پڑ جائے۔ میں
ہوں کہ جب محبت فرسودہ ہو کر دامن چھڑانا چاہتی ہے، تب وفا اُس کے سامنے سینہ تان کر کھڑی ہو جاتی
محبت کو اس کا راستہ بدلنے نہیں دیتی۔ ننانوے فیصد کیسز میں جیت وفا ہی کی ہوتی ہے۔ لیکن افسوس میرا
100 واں سوال تھا۔'' میں چپ کر کے نتاشا کی بات سنتا رہا۔ انہیں اپنا دل کا غبار ہلکا کرنے کے لیے کسی
سامع کی ضرورت شاید بہت عرصے سے تھی۔ اُن کی کہانی بھی ہر محبت کی کہانی کی طرح اُن کی پہلی
سے شروع ہوتی تھی۔ راحیل اور نتاشا کی ملاقات پیرس کی ایک نمائش میں ہوئی تھی۔ جہاں راحیل
ن سے اپنے ادارے کے ملبوسات کی تشہیر کے لیے آیا ہوا تھا۔ راحیل کی شاندار شخصیت، متانت اور سمجھ
کے امتزاج نے جلد ہی مشکل پسند اور سچی نتاشا کے دل میں گھر کر لیا۔ خود نتاشا اٹلی سے فیشن ڈیزائننگ
رس کے لیے پیرس آئی ہوئی تھی، دو چار ملاقاتوں ہی میں سارے پیمان بندھ چکے تھے تو راحیل نے اپنے
والوں سے فون پر نتاشا کی بات کروائی، کیوں کہ وہ اپنی ماں کی اجازت کے بغیر کوئی قدم نہیں اُٹھانا چاہتا
ماں نے بیٹے کی آواز میں جھلکتی خوشی کو مستقل کرنے کا عندیہ دے ڈالا اور نتاشا راحیل کی ہوگئی۔ دونوں کا
ایسا تھا کہ انہیں فرانس اور پیرس ہی سب سے زیادہ جچتا تھا، لہٰذا رہائش وہیں رکھی گئی۔ اُن کی اکلوتی بیٹی عینی
پیدائش بھی پیرس ہی میں ہوئی۔ سات سال یوں پر لگا کر اُڑ گئے کہ دونوں کو پتا ہی نہیں چلا۔ ہاں بس،
میں کبھی ہنستے کھیلتے اختلاف ہوا بھی تو صرف اس بات پر کہ راحیل محبت کے حصول کو ہی محبت کی معراج
تھا، جب کہ نتاشا اس حاصل پن کو صرف ایک ابتدا۔ وہ محبت میں جنوں کے سرد ہونے کو منافقت کے طور
تی اور نہیں شاید راحیل سے کچھ چوک ہوگئی اور فرہاد اُن کی زندگیوں میں داخل ہو گیا۔ فرہاد ایک ایرانی
ر، جس کی تصویروں کی نمائش پیرس کی ایک بہت بڑی آرٹ گیلری میں لگی ہوئی تھی اور نتاشا کے لاکھ
کے باوجود راحیل نے گھر پر عینی کے ساتھ کھیلنے کو ترجیح دی۔ جب کہ اس سے قبل راحیل اور نتاشا ایک
ہر تقریب میں نہ صرف شرکت کرتے بلکہ واپس آ کر ہفتوں ان فن پاروں پر بحث کر کے اپنے خیالات
ٹا کرتے تھے، لیکن اس بار نتاشا کو مجبوراً تنہا ہی نمائش دیکھنے جانا پڑا۔ شاید کچھ 'ان ہونیاں' سدا ہی سے
تاک میں ہوتی ہیں۔ وہ تصویریں بھی کچھ یوں ہی تھیں۔ ایک حادثے کی طرح اچانک اور فن کا ایک
شاہکار، نتاشا پینٹنگز میں کچھ ایسی کھوئی کہ خود اپنا آپ ہی بھولتی چلی گئی۔ کتنا درد، کتنی پیاس، کیسی گہری
گی ہر تصویر میں، رُوح میں سے رُوح نچوڑ لینے والی تاثیر لیے ان رنگوں نے گیلری میں سب ہی لوگوں کو
ت کر رکھا تھا۔ اور پھر نتاشا کی نظر فرہاد پر پڑی۔ وہ کسی شخص کو اپنی کسی تصویر کا عنوان بتا رہا تھا۔ ''کھوج
اس تصویر کا عنوان کھوج ہے.....لاحاصل کی کھوج.....یوں سمجھ لیں کہ جیسے کوئی اپنے کسی نہایت عزیز اور
ہارے کے لیے چھلنی میں بھر کر پانی لے جانے کی ایک ناکام کوشش کر رہا ہو جو اُسی کے سامنے شدید پیاس

سے دم توڑ رہا ہو یا میدانِ جنگ میں پیاس سے تڑپتے، جان دیتے سپہ سالار کے لیے اُس کے کسی وفادار کا اپنی ہتھیلیوں کے پیالے میں دو گھونٹ پانی لے کر بھاگنا...... بس کچھ ایسا ہی بیان کرنے کی کوشش کی میں نے اس تصویر میں......'' نتاشا خاموشی سے فرہاد کی بات سنتی رہی۔ اور یہی وہ ابتدا تھی، جس کی انتہا میرے سامنے کاسابلانکا کے عرشے پر موجود تھی۔ شروع کے چند ہفتے تو نتاشا کو سمجھ نہیں آیا کہ یہ کشش فرہاد کے فن کی ہے یا شخصیت کی۔ وہ راحیل کو بھی اگلے ہفتے نمائش دکھانے لے گئی اور راحیل نے بھی فرہاد کے فن کو خوب سراہا۔ خود فرہاد اس بات سے ہمیشہ بے خبر رہا کہ انجانے میں وہ کسی کے اندر ہونے والی کتنی بڑی ٹوٹ پھوٹ کا ذمہ دار ہے، کیوں کہ نتاشا نے کبھی اُسے کچھ بتایا ہی نہیں تھا۔ نتاشا اس لیے بھی شدید اُلجھن میں تھی کیوں کہ اس کے پاس بظاہر ایک اور محبت میں مبتلا ہونے کی کوئی وجہ بھی تو نہیں۔ لیکن کیا کبھی محبت کو کسی وجہ کی ضرورت رہی ہے؟ کیا محبت کسی عمر کی مرہون منت ہوتی ہے؟ نہیں..... دل کوئی نہ کوئی بہانہ ڈھونڈ ہی لیتا ہے..... کہ دل کب کسی کا دوست ہوا ہے..........

''ایک محبت اور سہی''

سراپا عشق ہوں میں، اب بکھر جاؤں تو بہتر ہے
جدھر جاتے ہیں یہ بادل، اُدھر جاؤں تو بہتر ہے
یہ دل کہتا ہے تیرے شہر میں کچھ دن ٹھہر جاؤں
مگر حالات کہتے ہیں کہ گھر جاؤں تو بہتر ہے
یہاں ہے کون میرا جو مجھے اپنا بھی سمجھے گا
میں کوشش کر کے اب خود بھی سنور جاؤں تو بہتر ہے

نتاشا کے حالات سنورنے کے بجائے بگڑتے ہی چلے گئے، حالانکہ وہ صرف دو مرتبہ ہی فرہاد کی آرٹ ...ری میں گئی تھی۔ پہلی مرتبہ تنہا اور دوسری بار راحیل کے ساتھ اور اس کے بعد اُس نے کئی ہفتے دوبارہ اُس ...ب کا رُخ بھی نہیں کیا۔ اُسے راحیل، اپنی بیٹی اور اپنی پُرسکون زندگی ہاتھوں سے پھسلتی نظر آنے لگی۔ یہ ...ت ہمارے دلوں پر تب ہی شب خون کیوں مارتی ہے، جب ہم اس کے وار سے بالکل غافل ہو جاتے ہیں، ...ہی جرم ہمارے مشرق میں کسی عورت سے سرزد ہوا ہوتا تو طوفان آ جاتا۔ پھر چاہے وہ نتاشا کی طرح یک ...ہ اور بنا اظہار والا جذبہ ہی کیوں نہ ہوتا لیکن ایک مکمل بربادی عورت کا مقدر ہوتی۔ لیکن یہ پیرس تھا اور نتاشا ...ک اطالوی نژاد فرانسیسی شہری۔ پھر بھی راحیل کے اندر اپنی پرانی اقدار گہری جڑوں تک موجود تھیں۔ اور پھر ...ے اب بھی نتاشا سے شدید محبت تھی۔ وہ چاہتا تو چیختا چلاتا، اُسے بے وفائی کے طعنے دیتا، ہاتھ پکڑ کر گھر سے ...بھی کر سکتا تھا۔ لیکن اُس نے ایسا کچھ نہیں کیا۔ اور پھر وہ محبت ہی کیا، جو دوسرے کے پلٹ جانے پر اپنی ...ت ہی کھو دے۔ اپنا وقار، اپنی گریس ختم کر دے۔ راحیل نے ٹھیک اس ڈوبتے جہاز کے کپتان جیسا بھرم ...رکھا۔ جس کے سامنے اُس کی متاعِ حیات قطرہ قطرہ کر کے ڈوب رہی ہو، لیکن وہ آخری مسافر کو بھی ...نے کی خاطر عرشے پر آخری وقت تک سینہ تانے کھڑا رہے اور جہاز سے بندھی آخری کشتی کے سمندر میں ...نے کے بعد جہاز کے ساتھ ہی غرقاب ہو جائے۔ نتاشا نے بھی مغربی معاشرے کی ایک آزاد عورت ہونے ...باوجود اپنی گم گشتہ محبت کی حرمت قائم رکھی اور آخری وقت تک فرہاد کو اپنے دل و دماغ میں چلتی جنگ کے ...ے میں کچھ نہیں بتایا تاوقتیکہ اُس نے راحیل سے ہر بات بانٹ نہ لی۔ راحیل کو نتاشا کے اس آخری کڑوے

سچ پر بھی مان تھا، لیکن وہ یہ بھی جانتا تھا کہ وہ اپنی آنکھوں کے سامنے اپنی دنیا لٹتے ہوئے زیادہ دیر نہیں پائے گا۔ اُس نے نتاشا سے آخری فیصلہ کرنے کا کہا۔ نتاشا خود بھی راحیل کو یوں لمحہ بہ لمحہ ٹوٹتے نہیں دیکھ سکتی تھی۔ سو، اُس نے خود ہی اپنی فردِ جرم پڑھ کر سنائی اور خود ہی اپنی سزا بھی طے کر دی۔ عمر بھر کی جُدائی کی۔ جب کوئی جج کسی کو عمر قید کی سزا سناتا ہے تو وہ اصل میں ملزم کو اُس کے پیاروں سے عمر بھر کی جُدائی کی سزا دے رہا ہوتا ہے۔ سو، نتاشا نے بھی اپنے لیے اک نئے طرز کی ''عمر قید'' چن لی تھی۔ راحیل نے نتاشا سے بھی پوچھا کہ کیوپڈ کے وار کا شکار اگر نتاشا کا دل ہوا تھا اور جُرم کی سرزدگی بھی اُسی کے دل کے سر ہے تو پھر راحیل کو بھی کیوں مل رہی ہے۔ شاید دلوں کے جرم ہی ایسے ہوتے ہیں کہ کرتا کوئی اور بھرتا کوئی ہے.........دلچسپ بات یہ ہے کہ اس کہانی کے تیسرے مرکزی کردار فرہاد کو ابھی تک اس بات کی خبر نہیں تھی کہ وہ کتنی زندگیوں میں طوفان کا باعث بن رہا تھا۔ حالانکہ اب اُس کی نتاشا سے اچھی خاصی پہچان ہو چکی تھی، وہ اس کے تمام خاندان سے بھی مل چکا تھا لیکن نتاشا نے راحیل کے کہنے پر بھی اپنے دل کا حال فرہاد پر ظاہر نہیں کیا۔ اُس نے اپنے دل کو سزا دینے کے لیے ایک عجیب جوا کھیلنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ اُس کا ظرف اسے اس بات کی اجازت نہیں دیتا تھا کہ وہ راحیل کی ہوتے ہوئے فرہاد کے سامنے دل کے لٹ جانے کی دہائی دے۔ پھر اگر کسی وجہ سے فرہاد ہی اُسے ٹھکرا دے تو پھر سے روتی دھوتی راحیل کی زندگی میں واپس آ جائے۔ لہٰذا اُس نے آخری کشتی جلا کر تخت یا تختے کا فیصلہ کرنے کی ٹھان لی تھی۔ اُس نے راحیل کو بھی سختی سے منع کر دیا تھا کہ جب تک وہ علیحدہ نہ ہو جائیں، تب تک فرہاد کو اس بات کی بھنک بھی نہیں پڑنی چاہیے کہ اُن کی علیحدگی کا سبب خود اُسی ''مردِ مغرور'' کے ہاتھ سے کینوس پر پھینکے گئے چند رنگ کے چھینٹے ہیں۔ بظاہر ناممکن نظر آنے والی ایسی داستانیں صرف مغرب ہی میں جنم لے سکتی ہیں، کیوں کہ ہمارے ہاں کسی مرد کا ایک کے بعد دوسری پھر تیسری محبت میں ''مبتلا'' ہو جانا تو عام سی بات سمجھی جاتی ہے مگر عورت بے چاری اپنے خواب میں سایۂ عکس سے پرے بھی اگر کسی غیر کی شبیہہ دیکھ لے تو گھبرا کر خود ہی اُٹھ بیٹھتی ہے۔ مشرق میں وفا کے پلڑے کا سارا بوجھ عورت ہی کو پورا کرنا پڑتا ہے کیوں کہ یہاں کا مرد اُس ترازو میں تلتا ہی نہیں۔ لیکن نتاشا نے مغرب میں ہوتے ہوئے بھی اپنی وفا کا ایک معیار قائم رکھنے کی یہ انوکھی کوشش ضرور کی۔ وہ نہیں جانتی تھی کہ راحیل سے علیحدہ ہونے کے بعد فرہاد اُسے اپنائے گا یا اُس کی ساری داستان کو ایک قہقہے میں ختم کر دے گا۔ کیوں کہ یہ جوا تو صرف نتاشا ہی نے اپنی زندگی کے ساتھ کھیلا تھا۔ فرہاد کی وفا اور محبت تو کبھی اس کھیل سے مشروط ہی نہیں تھی۔ راحیل نتاشا کے اس پاگل پن سے کبھی کبھار اتنا بکھر جاتا کہ اُس کا جی چاہتا کہ وہ ہاتھ پکڑ کر اُسے فرہاد کی آرٹ گیلری چھوڑ آئے تا کہ نتاشا یہ اندھی چال چلنے سے پہلے صرف ایک بار اپنے پتے ضرور دیکھ لے کہ کہیں مات ہی تو اس بازی کا مقدر نہیں؟ لیکن بالآخر راحیل ہی کو ہتھیار ڈالنے پڑے۔ وہاں اُس کی ماں کی طبیعت پاکستان میں مسلسل بگڑتی جا رہی تھی اور اُس کی شدید خواہش تھی کہ ایک بار اپنی بہو اور پوتی سے مل لے،

لیکن نتاشا شادی کے بعد سے اب تک راحیل کے وطن نہیں جا پائی تھی۔ لہٰذا راحیل نے اُس سے اس آخری ''ہمدردی'' کی درخواست کی اور طے پایا کہ راحیل کی ماں سے ملاقات کے بعد خاموشی سے وہ دونوں جُدا ہو جائیں گے اور اس کی خبر راحیل کی بوڑھی ماں کو کبھی نہیں ہو پائے گی، کیوں کہ وہ یہی سمجھتی رہے گی کہ اُس کا بیٹا اور بہو خوشی خوشی اپنے گھر لوٹ گئے ہیں۔

نتاشا کی عجیب داستان کا اختتام ابھی باقی تھا لیکن میں اُس رات لمحہ بھر کے لیے بھی آنکھ نہیں جھپک سکا۔ کیا محبت دوبارہ بھی ہماری زندگیوں میں پلٹتی ہے، وفا کیا ہے اور اس کی حدیں کہاں تک مقرر ہیں۔ ہم اپنی زندگی میں جس محبت کے حصول کے لیے پاگل ہوتے ہیں، اپنے دل کے کواڑ دوسرے پر ہمیشہ کے لیے بند کر لیتے ہیں، کیا وہی ہماری ''آخری محبت'' ہوتی ہے۔ کیا ''محبت'' اور ''وفا'' کے معیار بھی ہماری معاشرتی اقدار کے تابع ہوتے ہیں؟ اور ہم صرف انہی کی پیروی ہی کو ان جذبوں کے پرکھنے کا اصل پیمانہ تو نہیں سمجھ بیٹھے۔ جانے اس ''محبت'' نامی معمے کی کتنی پرتیں، کتنے پہلو اور کتنے زاویے مزید ایسے تھے جن سے میرا پالا پڑنا ابھی باقی تھا۔ رات پھر سلطان بابا بے حد بے چین رہے اور بار بار اُن کی آنکھ کھلتی رہی۔ مجھے اُن کی طرف سے بے حد تشویش تھی اور میں اس پریشانی میں کئی مرتبہ خود اپنی دوائیں لینا بھی بھول جاتا تھا۔ حالانکہ مجھے ڈاکٹروں نے سختی سے تاکید کی تھی کہ اپنے شہر پہنچنے تک مجھے ہر حال میں ان دواؤں کا استعمال جاری رکھنا ہوگا۔ ورنہ سمندر کے سفر میں میری طبیعت مزید بگڑنے کا احتمال بھی ہو سکتا ہے۔ میرے دوروں کا دورانیہ ویسے بھی اب طویل تر ہونے لگا تھا۔ اُس رات بھی کئی مرتبہ میری رگوں میں جیسے مکمل اندھیرا سا چھانے لگتا اور کئی مرتبہ مجھے اپنا سر جھٹک کر اُٹھ کے ٹہلنا پڑا۔ نتیجتاً صبح میری طبیعت نہایت بوجھل تھی اور سر درد سے پھٹ رہا تھا۔ لہٰذا میں اپنے کیبن ہی میں پڑا رہا۔ سلطان بابا کے کمرے میں نرس اُن کی دواؤں کا چارٹ بنا رہی تھی۔ کچھ دیر میں میرے کیبن کے دروازے پر ہلکی سی دستک ہوئی۔ دروازہ کھولا تو سامنے راحیل صاحب کھڑے تھے۔ ''میں مخل تو نہیں ہوا، دراصل تمہیں ناشتے پر ڈائننگ ہال میں نہیں دیکھا تو تشویش ہوئی۔'' ''جی۔۔۔ میری طبیعت کچھ بوجھل تھی اس وجہ سے نیچے نہیں آ سکا۔'' انہوں نے فوراً میری نبض دیکھی اور تیز بخار کا خدشہ ظاہر کیا۔ میں نے انہیں بتایا کہ میں دوا لے چکا تھا۔ اُنہوں نے تجویز دی کہ مجھے اس حال میں بند کمرے کے بجائے عرشے پر کھلی فضا میں رہنا چاہیے تا کہ صبح کی ٹھنڈی ہوا میں میرے تپتے جسم کو کچھ راحت مل سکے۔ کچھ دیر بعد ہم دونوں جہاز کے ڈیک والے حصے میں لکڑی کے پتلے تختوں سے ایک اُونچے پلیٹ فارم نما عرشے پر کھڑے تھے۔ آس پاس سفید وردی پر نیلی لکیر والی مخصوص ٹوپی پہنے جہاز کا عملہ صفائی کر رہا تھا اور سیلز مین اطالوی زبان میں کوئی گیت گنگنا رہے تھے۔ راحیل صاحب نے دُور بنتی لہروں کو دیکھتے ہوئے مجھ سے پوچھا۔ ''جانتے ہو یہ ملاح اس اطالوی گیت میں کیا گنگنا رہے ہیں؟'' میں نے سوالیہ نگاہوں سے اُن کی طرف دیکھا۔ ''یہ کہہ رہے ہیں کہ بادبان اُونچے کر لو۔ پتوار اور تیز چلاؤ، کیوں کہ ایک بڑا طوفان ہماری تاک میں ہے۔۔۔ ہمارا ساحل

دُور ہے اور کپتان کی محبوب پھول لیے اس کا انتظار کر رہی ہے۔'' ''آپ کو اطالوی آتی ہے؟''
''ہاں۔۔۔کچھ عرصہ رہا ہوں وہاں۔۔۔نتاشا کے گھر والوں کے سامنے بہت پاپڑ بیلنے پڑے تھے مجھے
وہاں کی بہت سی رسمیں اب بھی ہم سے ملتی جلتی ہیں۔'' میں نے غور سے اُن کی طرف دیکھا۔ ''کیا بادبان
اُونچے کرنے اور چپّو تیز چلانے سے طوفانوں سے بچا جاسکتا ہے؟'' انہوں نے چونک کر میری جانب
دیکھا۔شاید وہ میرا اشارہ سمجھ گئے تھے۔ ''نہیں۔۔۔طوفان تو آکر ہی رہتے ہیں۔لیکن طوفانوں کے ڈر سے
سمندروں کو ویران بھی تو نہیں چھوڑا جاسکتا اور پھر جن کی ناؤ ہی میں چھید ہو جائے انہیں طوفانوں سے کیا
گلہ......گر ڈوبنا ہی مقدر ہے تو پھر سکون سے بنا کسی آواز کے کیوں نہ ڈوبا جائے۔شور مچا کے اور واویلا کر کے
سمندر کا تقدس پامال کرنے سے کیا فائدہ؟ میں اُن کے چہرے ہی سے اُن کے اندر اُٹھتے طوفانوں کی ایک
جھلک دیکھ سکتا تھا۔ میں نے انہیں پھر ٹٹولا'' آپ اتنی آسانی سے کیسے ہار مان سکتے ہیں۔جو ڈوبنے کا حوصلہ
رکھتے ہیں وہ طوفانوں کا رُخ بھی تو موڑ سکتے ہیں۔'' وہ مسکرائے۔کتنی گھائل مسکراہٹ تھی۔ ''وہ جس معاشرے
میں پلی بڑھی ہے، وہاں محبت کا ہو جانا حادثہ تو ہوسکتا ہے، جرم نہیں۔اور محبت جرم تب بنتی ہے جب وہ اپنے
ساتھ احساسِ جرم لے کر آئے۔۔۔اور پھر یہ دلوں کے سودے ہیں۔یہاں ڈوبنے والے ہی فاتح قرار
پاتے ہیں۔اس کے دل میں بال آجانے سے میری محبت پر کوئی فرق پڑے تو پھر یہ محبت نہیں ''سوداگری''
ہوئی۔میں صرف اپنے احساس کے ساتھ بھی تو ہمیشہ زندہ رہ سکتا ہوں۔جانتے ہو، محبت جتنی پرانی ہوتی ہے،
اُتنی ہی خون میں سرایت کرتی جاتی ہے۔کوئی بھی نئی محبت، پچھلی محبت کا خون میں بسا یہ زہر نچوڑ نہیں سکتی۔''
پھر آپ خون میں سرایت کی ہوئی اس محبت کو اتنا بڑا جوا کھیلنے کی اجازت کیسے دے سکتے ہیں؟ آپ پاکستان
میں رہ جائیں گے اور وہاں فرانس میں فرہاد انہیں قبول نہیں کرے گا یا ان کے اتنے بڑے قدم اُٹھانے
صرف افسوس کا اظہار کر کے اپنی زندگی میں پھر مگن ہو جائے گا۔ہوسکتا ہے اُسے پہلے سے کسی اور سے محبت
ہو۔محبت بھلا کب کسی کا انتظار کرتی ہے؟'' میرا لہجہ شاید جذبات کی وجہ سے کچھ زیادہ تلخ اور بلند ہو گیا تو
تب ہی ہمارے پاس سے گزرتی ایک بوڑھی خاتون مسافر نے اپنے کالے جالی دار ہیٹ کے نیچے سے ہم
خشمگیں سی نگاہ ڈالی۔راحیل صاحب کچھ دیر چپ رہے۔'' جوا نتاشا نے کھیلا ہے۔لیکن بازی میں نے بچھا
ہے۔میں اپنی ہم سفر کو اُس کی زندگی کے سب سے مشکل سفر میں تنہا کیسے چھوڑ سکتا ہوں۔دو دن بعد ہم جہ
بندرگاہ پر اُتر رہے ہیں وہاں فرہاد پہلے سے موجود ہوگا۔'' میرے پاؤں تلے سے جیسے کسی نے عرشے کا تختہ
لیا اور مجھے یوں لگا جیسے میں دھڑام سے سمندر میں جا گرا ہوں۔راحیل صاحب میری کیفیت سے بے خبر مجھ
تفصیل بتاتے رہے کہ کس طرح پیرس میں جب وہ نتاشا کی ضد کے آگے ہار مان گئے اور انہوں نے اُ
آزاد کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا، تب انہوں نے نتاشا کی سب سے قریبی دوست سونیا سے رابطہ کیا۔سونیا، نتا
کی کلاس فیلو بھی رہ چکی تھی، لہٰذا راحیل اور نتاشا کی علیحدگی کا سن کر وہ خود حیرت زدہ رہ گئی۔وہ نتاشا سے

ہی تھی، مگر راحیل نے بڑی مشکل سے اُسے اس بات پر آمادہ کیا کہ وہ یہ خبر کسی طریقے سے فرہاد تک پہنچا
ے کہ راحیل اور نتاشا آپس کی اَن بن اور ذہنی ہم آہنگی نہ ہونے کی وجہ سے علیحدہ ہو رہے ہیں۔راحیل نے
ونیا کو سختی سے تاکید کی کہ نتاشا کا بھرم کبھی نہ ٹوٹنے پائے اور فرہاد کو ذرا سا بھی شک نہیں ہونا چاہیے کہ نتاشا
احیل سے کیوں جُدا ہو رہی ہے۔سونیا کو فرہاد کے سامنے یہ ظاہر کرنا تھا کہ وہ اپنی عزیز از جان سہیلی کے
لیے بہت پریشان ہے اور وہ چاہتی ہے کہ اگر فرہاد پر پہلے سے کسی وعدے یا رشتے کا بوجھ نہیں ہے تو وہ نتاشا کو
پنالے۔راحیل نے سونیا کو یہ پیغام دے کر فرہاد کے پاس تو بھیج دیا لیکن خود انگاروں پر لوٹتا رہا۔دنیا میں بھلا
کون ہوگا، جو کسی لٹیرے کو خود مدعو کرے کہ ''آؤ اور میری متاعِ حیات لوٹ کر چلتے بنو۔''

دوسرے دن جب سونیا نے راحیل کو آکر یہ بتایا کہ پہلے پہلے تو فرہاد اُن کی جُدائی کے صدمے سے
سنبھل ہی نہیں پایا کیوں کہ وہ نتاشا کے پورے خاندان سے واقف تھا اور اُسے ایک فرد کی حیثیت دی جاتی
تھی۔پھر اُس نے سونیا سے التجا کی کہ کیا وہ نتاشا کی ذاتی زندگی میں دخل دے کر اُسے سمجھا سکتا ہے۔لیکن
جب سونیا نے اُسے نتاشا کے بھرم کی قسم دی تو اُس نے سونیا کو بتایا کہ وہ ہمیشہ راحیل کی قسمت پر رشک کرتا آیا
ہے کیوں کہ نتاشا جیسی ہم سفر قسمت والوں ہی کو ملتی ہے اور اُس نے سونیا سے کہا کہ وہ نتاشا کو اپنانا اپنے لیے
ایک اعزاز سے کم نہیں سمجھتا۔یہ سب سن کر راحیل کا دل آخری بار دھڑک کر جیسے بند ہو گیا۔شاید کہیں دُور اُس
کے دل میں اب بھی یہ اُمید تھی کہ فرہاد نتاشا کو کسی وجہ سے اپنا نہ پائے مگر اب تو کہانی ہی ختم ہو چکی تھی۔نتاشا کو
اس واردات کی خبر نہیں تھی کہ فرہاد کو سونیا نے پہلے ہی جہاز کے ذریعے ہمارے شہر بھیج دیا ہے اور راحیل اُسے
بندرگاہ ہی پر الوداع کہہ دے گا۔البتہ ماں سے کیا بہانہ کرنا ہے، وہ بعد کی بات تھی۔دنیا کا سب سے مشکل کام
اید اپنی محبت کو خود اپنے دل میں پل پل مرتے دیکھنا ہے اور اس سے بھی مشکل خود اسی محبت کی لاش کو اپنے
ں میں دفن کرنا ہے۔میرے سامنے اس وقت ایک ایسا ہی شخص کھڑا تھا، جو اپنی محبت کے لیے اپنے دل میں
لڑھا کھود چکا تھا اور اب صرف اُسے دفنانے کا انتظار کر رہا تھا۔مغرب سے کچھ دیر پہلے حبیب البشر صاحب
ے بھی ملاقات ہوئی اور انہوں نے بتایا کہ اُن کے ساتھ جانے والے سبھی حاجیوں سے انہوں نے میرے
لیے دعا کرنے کا وعدہ لیا ہے۔انہیں شاید جہاز کے طبی مشن سے میری ناسازیِ طبیعت کا بھی پتہ چل گیا تھا۔وہ
بہت دیر میرے ساتھ عرشے پر بیٹھے رہے۔

عشاء کے بعد جب اُن کے جانے کا وقت ہوا تو مجھے اُوپر والے چوبی ڈیک پر جہاز کے آخری ریلنگ
کے پاس نتاشا نظر آئی۔عام طور پر جہاز کا عملہ کسی مسافر کو مغرب کے بعد اتنی اُونچائی پر کھڑے رہنے کی
اجازت نہیں دیتا، کیوں کہ کوئی بھی بڑی لہر انسان کا توازن بگاڑ کر اُسے بیچ سمندر میں پھینک سکتی ہے۔ایک
لمحے کے لیے تو خود نتاشا کے ارادے بھی مجھے کچھ بدلے سے نظر آئے۔میں جلدی سے سیڑھیاں چڑھ کر اُوپر
اُن کے قریب پہنچا۔میرے قدموں کی آہٹ پر وہ پلٹیں ''کہیں آپ نے کسی شارک مچھلی کے ساتھ ڈنر کا وعدہ

تو نہیں کر رکھا؟'' وہ مسکرائیں ''نہیں! میری شارک مچھلیوں سے کبھی اچھی سلام دُعا نہیں رہی......'' ہم
دونوں کچھ دیر خاموش کھڑے لہروں کو گنتے رہے۔ پھر انہوں نے مجھ سے ایک عجیب سا سوال کر ڈالا ''تم نے
کبھی کسی سے محبت کی ہے عبداللہ؟'' ''نہیں...... میں ابھی محبت کے ''م'' اور عشق کے ''عین'' تک بھی نہیں پہنچ
پایا اور پھر سچ یہ ہے کہ آپ سے ملنے کے بعد تو مجھے اپنے جذبے کو پھر سے دریافت کرنے کی ضرورت محسوس ہو
رہی ہے۔'' اُن کی آنکھوں میں حیرت تھی۔ ''کیوں؟'' میں نے غور سے اُن کی طرف دیکھا'' آپ سے ملنے
کے بعد میں نے یہ جان لیا ہے کہ ہماری محبتوں کا کوئی اختتام نہیں ہوتا، شاید محبت کی بقا صرف اس کے لاحاصل
رہنے ہی میں ہے۔ جسے پالیا جائے، شاید وہ محبت نہیں رہتی، ورنہ انسان کا دل اس معراج کو پالینے کے بعد پھر
سے خاک میں کیوں لوٹتا؟ رشتوں کے نیلے بھنور بھی جب محبت کی سنہری کمند کو نئی فصیلوں پر اٹکنے سے نہیں
روک پاتے تو پھر ہم ایک نیا کلیہ کیوں نہ ایجاد کر لیں؟'' نتاشا کی آواز کھوئی کھوئی سی تھی۔'' کیسا کلیہ؟'' میں
نے مُڑ کر دیکھا۔ ''یہی کہ ہم اپنی زندگی کی سب سے پہلی اور شدید محبت کو اس شرط سے متصل نہیں رکھ سکتے کہ
خود ہم بھی اس کے لیے آخری محبت ہی ثابت ہوں گے۔ بلکہ ہمیں یہ گنجائش بھی رکھنی ہوگی کہ خود ہمارا دل بھی
پلٹ سکتا ہے۔ تو پھر ایسی پلٹ جانے والی چیز کے لیے سر دھڑ کی بازی لگانا کہاں کی دانش مندی ہے۔ آپ نے
اچھا کیا کہ مجھے ایک نئی راہ دکھا دی۔'' نتاشا کی آواز میں بے چینی تھی ''لیکن یہ ضروری تو نہیں کہ جو واردات
میرے دل کے ساتھ ہوئی ہے، وہ سب ہی کے ساتھ ہو۔ تم اپنے نظریہ کیوں بدل رہے ہو۔ یہ صرف میری
بدبختی بھی تو ہو سکتی ہے۔'' میں نے آخری وار کر دیا ''تو پھر اس بات کی کیا ضمانت ہے کہ یہ سیاہ نصیبی پھر سے
اپنے آپ کو نہیں دہرائے گی؟'' ''کیا مطلب؟'' ''مطلب یہ کہ جس راستے پر آپ چل رہی ہیں وہ تو سدا کا
بے نشان و منزل ہے۔ کل تک راحیل آپ کی پہلی محبت تھے۔ آپ کا ہر خواب اُن سے وابستہ تھا۔ لیکن آج
آپ کو اپنا من فرہاد کی جانب کھنچتا محسوس ہوا ہے۔ ایک اجنبی آپ کے سارے خوابوں پر قابض ہو بیٹھا۔ تو پھر
اس بات کی کیا ضمانت ہے کہ کل یہ من اپنے دھاگے کہیں اور نہیں اُلجھا بیٹھے گا؟'' نتاشا کو ایک جھٹکا سا لگا۔
''لیکن تم......؟'' ''میں صرف اتنا سمجھ پایا ہوں کہ بات اگر دل کے اختیار پر چلنے کی ہے تو پھر ہمارا ایک شاعر
صدیوں پہلے کہہ گیا تھا کہ 'دل پر زور نہیں'...... آپ جس ماحول میں پلی بڑھی ہیں، اُس معاشرے میں انسان کی
آخری سانس تک، ایسے دل کش ہیولے اُس کا دل کھینچنے کے لیے اُس کے آس پاس بھٹکتے رہتے ہیں۔ کبھی کوئی
فلم اسٹار، کبھی کوئی کھلاڑی، کبھی کوئی سنگر...... تو پھر آپ کے کلیے کے حساب سے ایک پل کا سکون ملنا بھی محال
ہوگا۔ انسان کی ذات اندر سے جن سینکڑوں، ہزاروں خانوں میں بٹی ہوئی ہے دوسرا کوئی بھی ایک انسان ان
سب خانوں کے خلا کو بھرنے کی صلاحیت ہرگز نہیں رکھتا۔ یہ کسی فرد واحد کے لیے ممکن ہی نہیں۔ ہم خود بھی کسی
دوسرے کے بنائے ہوئے ہیولے کا صرف پندرہ یا بیس فی صد ہی پورا کر پاتے ہیں۔ اِسی لیے ہم ان مشہور
لوگوں (سیلیبریٹیز) میں اپنے من کے بنائے خاکے کی خوبیاں تلاش کرتے رہتے ہیں۔ کیا کبھی آپ نے

ل کے من کے ہیولے کو ٹٹولا ہے۔ ہو سکتا ہے۔ خود آپ بھی اس کے اندر کی شبیہ کا صرف پانچ فی صد ہی
رتی ہوں۔'' نتاشا نے چونک کر میری جانب دیکھا ''لیکن راحیل نے کبھی اس بات کا ذکر نہیں کیا، ورنہ
کر دیں اُس کے من کے اندر موجود ہر تصویر کو اُس کے سامنے لا کھڑا کرتی۔ میں اُس کے لیے کچھ بھی کر
ہوں۔'' ''کتنی تصویریں جمع کر پاتیں آپ......؟ اور کیا انسان ساری زندگی انہی سرابوں کے پیچھے بھاگتے
زار دے۔ اور آخر میں خود ایک ہیولہ بن کر رہ جائے۔ کہا یہی مقدر ہے ہم مجبور اور بے کسی انسانوں کا۔
یں زندگی تو صرف ایک ملتی ہے مگر خواہشیں ہزار صدیوں کے وزن جتنی۔'' نتاشا کی طرف سے بہت دیر تک
وشی چھائی رہی۔ پھر جب وہ بولی تو آواز سمندر کے اندر سے آتی محسوس ہوئی۔ ''پھر ان ہزار صدی کی
ہشوں کا کیا ہوا؟ دل پر قفل کیسے لگایا جائے؟'' میں نے اُن کی جانب دیکھا ''اگر اس دل نے ہمارے ساتھ
حاصل کو خاص سے عام کرنے کا کھیل رچایا ہوا ہے تو پھر ہمیں بھی اس کے لیے کسی ایک کو ہمیشہ کے لیے ''لا
مل'' رکھ چھوڑنا چاہیے تا کہ وہی ''لاحاصل'' اس کی آخری چاہت ثابت ہو۔ ہم اگر کسی ضدی بچے کی طرح
دل کی ہر بات مانتے گئے اور اس کی پسند کا ہر کھلونا اس کی جھولی میں ڈالتے رہے تو پھر یہ بھی اُسی بچے کی
رح چند دن کھیل کر اس کھلونے کو پرانا کر دے گا یا دل بھر گیا تو توڑ دے گا اور پھر سے کسی نئے کھولنے کے
لیے مچلنے لگے گا۔ تو کیوں نہ اسے ہمیشہ کے لیے ایک کھلونے کی آس ہی میں منتظر چھوڑ دیا جائے...... تا کہ وہ
یشہ کے لیے اس کے لیے 'خاص' رہے۔

میں نتاشا کو سوچوں کے بھنور میں چھوڑ کر نیچے کیبن میں چلا آیا۔ اگلی شام جہاز بندرگاہ پر لنگر انداز ہونے
کے لیے اپنی رفتار دھیمی کر چکا تھا۔ میرے سامنے وہی ساحل باہیں کھولے کھڑا تھا، جس کی ایک درگاہ پر نظر آئی
یک جھلک اور جلوے نے میری زندگی بدل کر رکھ دی تھی۔ دُور سے میں نے مما اور پپا کو میز بانوں والے حصے
کی جالی کے پرے دیکھا۔ اُن کی نظر ابھی مجھ پر نہیں پڑی تھی۔ بھیڑ بہت زیادہ تھی۔ لیکن مجھے زہرا کا دھانی
آنچل تو ہمیشہ پہلی نظر میں نہار جاتا تھا مگر کیوں آج ابھی تک میری نظر اُسے ڈھونڈ نہیں پائی تھی۔ جہاز بندرگاہ پر
لگ گیا۔ ہم سب ایک ایک کر کے سیڑھیاں اُتر کر زمین پر قدم رکھتے گئے۔ راحیل کے بعد اُس کی بچی عینی اور
پھر نتاشا نے آخری سیڑھی کو الوداع کہا۔ دفعتاً نتاشا کی نظر کچھ فاصلے پر کھڑے ایک سجے سنورے شخص پر پڑی
اور اُس کے قدم زمین میں گڑ کر رہ گئے۔ میرے دل نے دھڑک کر مجھ سے کہا ''فرہاد......''

آخری محبت

میں نے بھی نتاشا کی نظروں کی تعاقب میں نگاہ ڈالی۔ وہ یقیناً فرہاد تھا۔ اُس کے انداز میں جو ایک خاص لاپروائی تھی اور اُس کے سفید لباس پر جچتی نیلی پی کیپ اُسے دُور ہی سے کوئی مصور بتا رہی تھی۔ یہ سب ہی تخلیقی کاموں سے تعلق رکھنے والے ایک جیسے ہی کیوں ہوتے ہیں۔ وہ عمر میں نتاشا سے کچھ کم دکھائی دے رہا تھا۔ نتاشا ابھی تک شاک کی کیفیت سے نہیں نکل پائی تھی۔ وہ بس اتنا ہی کہہ سکی "فرہاد...... تم...... یہاں......؟" فرہاد مسکراتے ہوئے اُس کی جانب بڑھا "ہاں مجھے سونیا سے پتا چلا کہ تم پاکستان آ رہی ہو۔ اتفاق سے میری بھی ایک تصویری نمائش ہے، اسی شہر کی آرٹ گیلری میں۔ سوچا تمہیں سرپرائز دے کر حیران کر دوں۔" نتاشا ابھی تک کسی خواب کی کیفیت میں تھی۔ راحیل کی آنکھیں نم ہونے کو تھیں، مگر وہ ضبط کیے کھڑا رہا۔ میں نے آگے بڑھ کر نتاشا سے کہا "چلیں...... آپ کا کام آسان ہو گیا۔ لوگوں کو خواب دیکھنے کے لیے رات بھر آنکھیں بند کر کے نیند کا محتاج ہونا پڑتا ہے، جب کہ آپ کا خواب خود چل کر آپ کے پاس آ گیا ہے۔ میرا مشورہ تو یہی ہے کہ اب اپنے سپنے کے ساتھ ہی لوٹ جائیں۔ خوابوں کو جینے میں دیر نہیں کرنی چاہیے۔ کیوں کہ سہانے خوابوں کی عمر بہت کم ہوتی ہے۔" اتنے میں راحیل نے بھی تائید کی "عبداللہ ٹھیک کہہ رہا ہے نتاشا! میں اپنی ماں کو کسی دھوکے میں نہیں رکھنا چاہتا۔ تم یہاں تک میرے ساتھ آئیں میرے لیے اتنا ہی بہت ہے۔ اب یہاں سے آگے ہمارے راستے جُدا ہیں۔" نتاشا شاید سمجھ گئی تھی کہ فرہاد کی یہاں آمد کے پیچھے کیا مقصد کارفرما ہے۔ اُس کے بدن پر جیسے ایک لرزہ سا طاری تھا۔ وہ کسی پتے کی طرح کانپ رہی تھی اور اپنی لرزاہٹ چھپانے کی کوشش میں اُس کا وجود مزید ریت ہوا جا رہا تھا۔ راحیل نے عینی کا ہاتھ پکڑا اور مخالف سمت میں قدم اُٹھائے۔ عینی نے حیرت سے اپنی ماں کو وہیں جمے دیکھا اور پھر اُسے جاتے جاتے آواز دی۔ "مما......" نتاشا کو جیسے ایک جھٹکا سا لگا اور وہ جلدی سے پلٹ کر چلائی "رُک جاؤ راحیل......" راحیل کے قدم جم گئے، لیکن اُس نے پلٹ کر نہیں دیکھا۔ نتاشا تیزی سے میری جانب بڑھی "کل رات تم نے ٹھیک کہا تھا۔ دل جیسے ضدی بچے کی بات سنی جائے تو ہماری محبتوں کا کبھی اختتام نہ ہو۔ تو پھر کیوں نہ کسی ایک کو اپنی 'آخری محبت' بنا لیا جائے۔ میرے رشتوں کے نیلے بھنور نے آج ہمیشہ کے لیے وہ سنہری کمند توڑ ڈالی ہے، جو آس پاس بکھرے ہزاروں دل کش ہیولوں کی فصیل پر ہر بار اپنی کنڈی اٹکا بیٹھتی ہے۔ میں پیرس واپس جانے سے پہلے تم سے ملنے ضرور آؤں گی عبداللہ۔ اس 'تجدید وفا' کا شکریہ ادا کرنے کے لیے۔ لیکن تم بھی مجھ سے ایک وعدہ کرو کہ اپنا نظریہ کبھی نہیں بدلو گے۔ کیوں کہ آج سے میرا بھی یہی نظریہ ہے اور میں یہ پیغام ہر محبت کرنے والے تک ضرور پہنچاؤں گی۔" میں نے مسکرا کر اس نئی نتاشا کو دیکھا۔ "ہر محبت آخری محبت ہوتی ہے اور آخری محبت بن کر ہی نازل ہوتی ہے۔ ایسا نہ ہوتا تو شاید ہم کبھی محبت میں مبتلا ہی نہ ہو پاتے۔ محبت سورج کی کرنوں کی طرح درزوں سے چھن کر ہمارا آس پاس منور کر سکتی ہے، مگر محبت کو کسی بھی شرط سے متصل کرنے کی ضرورت نہیں ہوتی۔ بندھن اور رشتے خود محبت کے آخری ہونے کی ضمانت بن جاتے ہیں۔ محبت کے ہزاروں سورج ہیں، مگر ہمیں بس اپنے حصے کے ایک آفتاب ہی کی روشنی سمیٹنی ہوتی ہے۔ لیکن سورج کی طرح چمکنے کے لیے پہلے اس کی طرح جلنا بھی سیکھنا پڑتا ہے۔ آج آپ بھی تپ کر کندن بن چکی ہیں۔ جائیے...... آپ کی محبت کا سورج آپ کا انتظار کر رہا ہے۔" نتاشا نے میرے ہاتھ کے اشارے کے تعاقب میں دُور کھڑے راحیل کی جانب دیکھا۔ فرہاد کو سنانے کے لیے اس بار میں نے انگریزی میں بات کی تھی۔ نتاشا پلٹنے سے پہلے فرہاد کی طرف بڑھی۔ "تمہارا بہت شکریہ فرہاد کہ تم میرا استقبال کرنے کے لیے یہاں تک آئے، لیکن ابھی مجھے جانا ہے، راحیل کے ساتھ۔ ہاں البتہ، اپنی نمائش کا دعوت نامہ ضرور بھیجنا۔ میں، راحیل اور عینی نمائش دیکھنے ضرور آئیں گے اور تم سے اچھی سی ٹریٹ بھی لیں گے۔ یہ وعدہ رہا۔" نتاشا نے اپنی بھیگی آنکھیں پونچھیں اور فرہاد کو یوں ہی ہکا بکا چھوڑ کر راحیل کے سنگ آگے بڑھ گئی۔ کافی دُور جا کر اُس نے پلٹ کر میری جانب دیکھ کر ہاتھ ہلایا۔ راحیل صاحب نے بھی پلٹ کر میری جانب دیکھا۔ اُن کی ایک نگاہ ہی سارا خراج ادا کرنے کے لیے کافی تھی اور پھر اگلے لمحے وہ تینوں بندرگاہ کی بھیڑ میں غائب ہو چکے تھے۔ فرہاد بھی تھکے تھکے قدموں سے پلٹ گیا۔ اُسے اپنی محبت کے سورج کے لیے ابھی کچھ اور آسمان چھاننا باقی تھے۔ میں سلطان بابا کے لیے آئے کرین اسٹریچر کے ذریعے انہیں لے کر نیچے اُترا ہی تھا کہ پپا کی ہمیشہ کی طرح زندگی سے بھرپور آواز سنائی دی۔ "ساحر...... ہم یہاں ہیں......" پپا کے ساتھ مما بھی کھڑی تھیں لیکن اُن کی آواز اُن کے بہتے آنسو پہلے ہی گھونٹ چکے تھے۔ میں لپک کر اُن کے قریب پہنچا اور پھر ہم تینوں ہی ایک دوسرے کو چپ کراتے کراتے رو رہے تھے۔ میں قریباً چھ ماہ کے بعد اُن سے مل رہا تھا اور مما بار بار میرا چہرہ اپنے ہاتھوں سے یوں ٹٹول کر دیکھ رہی تھیں، جیسے انہیں اب تک یقین نہ آ رہا ہو کہ میں واقعی اُن کے سامنے کھڑا ہوں۔ یہ مائیں سدا سے اولاد کے معاملے میں اتنی بے یقین کیوں ہوتی ہیں۔ اتنی دیر میں ایمبولینس بھی بندرگاہ کے مرکزی داخلے سے ہوتی ہوئی مقررہ جگہ تک پہنچ چکی تھی۔ ڈاکٹروں کی یہی ہدایت تھی کہ اب مزید کوئی دیر کیے بنا سلطان بابا کو بڑے اسپتال پہنچا دیا جائے۔ میری آنکھیں بار بار میزبانوں کی گیلری کی طرف اُٹھ رہی تھیں۔ جتنی دیر میں سلطان بابا کو ایمبولینس میں منتقل کیا گیا، تب تک میں شاید سینکڑوں بار اُس جانب دیکھ چکا تھا، جہاں سے اس دل فریں کو آنا تھا۔ لیکن وہ راستہ اتنے زیادہ ہجوم کے باوجود میرے لیے سنسان ہی رہا۔ مما پپا دونوں میری بے چینی بہت اچھی طرح بھانپ چکے تھے، لیکن نہ جانے کیوں دونوں ہی چپ سے تھے۔ بالآخر میں نے مما

سے پوچھا ہی لیا کہ زہرا کیوں نہیں آئی؟ مما نے بتایا کہ انہوں نے میرے آنے کی خبر اُسی دن زہرا کے گھر والوں تک پہنچا دی تھی، جس دن انہیں پتا چلا تھا۔ پھر بھی زہرا میرے استقبال کو نہیں آئی...... کیوں؟؟

سلطان بابا کو اسپتال لے جاتے ہوئے بھی میرے اندر خود ہی سوال اُٹھتے رہے اور میرا نادان دل خود ہی ان وسوسوں کے جواب اور جواز تراشتا رہا۔ ہوسکتا ہے، اُسے ٹھیک خبر ہی نہ ملی ہو۔ یا ہوسکتا ہے وہ کہیں بھیڑ ہی میں پھنس کر رہ گئی ہو۔ یہ بڑے شہروں کا ٹریفک بھی تو کسی عذاب سے کم نہیں ہوتا۔ یا پھر یہ بھی تو ہوسکتا ہے کہ وہ ہمارے بندرگاہ سے نکلتے ہی وہاں پہنچ گئی ہو۔ ہم بھی تو سلطان بابا کی وجہ سے وہاں زیادہ دیر ٹھہر نہیں پائے تھے۔ وہ آئی ہوگی اور مجھے وہاں نہ پا کر کتنی پریشان ہوئی ہوگی۔ میرا ذہن کسی ایک خدشے کا سر اُبھارتا تو میرا سودائی دل اس کے سو عذر تراش کر میرے سامنے رکھ دیتا۔ محبت ہمیں کتنے بہانے بنانا سکھا دیتی ہے۔ بندرگاہ سے نکلنے سے پہلے میں خاص طور پر عرشے پر کھڑے حبیب البشر صاحب سے ملنے کے لیے اُوپر گیا۔ وہ مجھے بہت دیر تک گلے لگائے تھپکتے رہے اور میرے شانے اُن کی پلکوں سے نم ہوتے رہے۔ آتے وقت انہوں نے میرا ہاتھ تھام لیا اور دھیرے سے بولے "ہم اگر اس کی جانب ایک قدم بڑھاتے ہیں تو وہ ہماری جانب ستر قدم آتا ہے۔ یقین جانو، تم اُس کے بہت قریب ہو۔ میں جتنی بار بھی اُس کے گھر پر نگاہ ڈالوں گا میرے دل سے تمہارے لیے دعا ضرور نکلے گی اور مجھے یقین ہے ایک دن تمہاری کھوج ضرور اپنے انجام کو پہنچے گی۔" میں اپنے خیالات سے تب چونکا جب ایمبولینس اسپتال کے "انتہائی نگہداشت" کے شعبے کی پارکنگ میں جا کر رُک گئی۔ مما پپا بھی اپنی گاڑی میں ہمارے ساتھ ہی پہنچ چکے تھے اور اگلے چند لمحوں میں ہم سلطان بابا کو علیحدہ کمرے میں منتقل کر چکے تھے۔ جہاں ڈاکٹروں کی ایک پوری ٹیم ہماری منتظر تھی۔ سلطان بابا نے غنودگی کے عالم میں ایک دو بار مجھ پر نگاہ ڈالی اور پھر دواؤں کے اثر تلے اُن کی پلکیں جھکتی چلی گئیں۔ ہمیں بڑے معالج کی ہدایت پر باہر انتظار کرنے کا کہا گیا۔ پاپا چاہتے تھے کہ میں کچھ دیر کے لیے گھر سے تازہ دم ہو آؤں، تب تک وہ اسپتال میں ٹھہرتے لیکن میں نے منع کر دیا اور ہم دونوں نے تقریباً زبردستی مما کو گھر واپس بھیجا، کیوں کہ انہیں اسپتال کے ماحول اور اردگرد ہوتی انہونیوں سے ہمیشہ ہی خوف آتا تھا۔ میں نے اُن سے وعدہ کیا کہ سلطان بابا کی طبیعت سنبھلتے ہی میں کچھ دیر کے لیے گھر ضرور آؤں گا اور پھر ہم سب رات کا کھانا ایک ساتھ کھائیں گے۔ وہ بادل نخواستہ چھوٹے چھوٹے قدم اُٹھاتیں وہاں سے چلی تو گئیں، لیکن تقریباً ہر قدم ہی پر مڑ کر انہوں نے مجھ سے میرے عہد کی تجدید ضرور چاہی۔ دنیا کا کوئی بھی فرد اپنے ماں باپ کا قرض نہیں چکا سکتا۔ یہ وہ سودا ہے، جو سود در سود ہر پل بڑھتا ہی چلا جاتا ہے اور شاید اس جہان کا یہ واحد اُدھار ہے جس کی ادائیگی کیے بنا ہی ہم سب یکے بعد دیگرے الوداع کہتے جاتے ہیں۔

مما کے جانے کے بعد میں نے کافی وقفے سے مناسب الفاظ میں پپا کو اپنی بیماری کے بارے میں بتا دیا اور میری توقع کے مطابق وہ میرے لاکھ سہل انداز اور تسلی کے باوجود ایک دم ہی گھبرا سے گئے۔ اگر سلطان بابا

ی طبیعت کا خیال نہ ہوتا تو وہ اُسی وقت مجھے بھی اسی اسپتال میں داخل کروا دیتے۔ پھر بھی جب تک میں نے ن سے وعدہ نہیں کر لیا کہ اگلی صبح سب سے پہلے میں اپنے تمام معائنے خود انہی کی نگرانی میں کرواؤں گا، تب تک وہ چین سے نہیں بیٹھے اور راہ داری ہی میں ٹہلتے رہے۔ مجھے اس بات پر حیرت تھی کہ جب تک میں اپنے گھر میں تھا اور مما پپا کے لاڈلے کے طور پر اُن کے ساتھ زندگی گزار رہا تھا، تب تک مجھے کبھی پپا کے اندر سلطان بابا جیسی بزرگانہ جھلک نظر نہیں آئی تھی، لیکن آج میرے سامنے ماتھے پر بل ڈالے، بڑبڑاتے اور مجھے ڈانٹتے ہوئے ٹہلنے والا یہ شخص مجھے اپنا پپا سے زیادہ اپنا بزرگ دوست لگ رہا تھا۔ مجھے یہ احساس بھی ہوا کہ بزرگی کا تعلق صرف انسان کی عمر بڑھنے سے نہیں ہوتا۔ نہ ہی صرف عقل و دانش اس کی وجہ ہوتی ہے۔ "بزرگ" کچھ اس سے بڑھ کر، کچھ سوا ہوتا ہے۔ پپا ہی نے مجھے میرے جگری دوست کاشف کے بارے میں بتایا کہ وہ ان دنوں کسی کاروبار کے سلسلے میں لندن گیا ہوا ہے۔ وہ میرے اندر کی بے چینی سے خوب واقف تھے، لہٰذا مختلف بہانوں سے میرا دھیان بٹانے کی کوشش کرتے رہے۔ لیکن میرے ذہن کی جو کنڈی اس زہرا جبیں کی پلک کے خم میں اٹک چکی تھی، اُسے شام ڈھلے تک اُس کی مسلسل غیر موجودگی کے تمام جواز بھربھرے ہوتے نظر آئے۔ اگر کسی وجہ سے وہ بندرگاہ پر میرے استقبال کے لیے نہیں پہنچ سکی، تو پھر بھی اب تک اُسے مجھ تک پہنچ جانا چاہیے تھا۔ مجھے اپنے شہر میں اُترے سات گھنٹے ہو چکے تھے لیکن اُس کی طرف سے کوئی پیام، کوئی رقعہ، کوئی سندیس تک موصول نہیں ہوا تھا۔ دفعتاً میرے ذہن میں تحصیل ماہی کے مجذوب کی آواز گونجی "جا...... تجھے خدا ملے گا، نہ ہی وصال صنم......" میں نے بے چینی سے پہلو بدلا۔ ٹھیک اُسی لمحے سلطان بابا کے کمرے کا دروازہ کھلا اور سب ہی ڈاکٹر ایک ایک کر کے باہر نکل آئے۔ میں لپک کر اُن کے سربراہ کے پاس پہنچا۔ وہ کچھ فکر مند سے تھے "آپ اُن سے مل سکتے ہیں...... لیکن دھیان رہے کہ انہیں آرام کی زیادہ ضرورت ہے۔ سر پر گہری چوٹ لگنے کے بعد مسلسل آرام نہ کرنے کی وجہ سے رفتہ رفتہ پیچیدگیاں پیدا ہوتی چلی گئی ہیں۔ بہر حال مایوسی کفر ہے...... ہمیں ایک آدھ دن ہی میں بڑا آپریشن کرنا ہوگا۔" میرا دل ڈوب سا گیا۔ میں اور پپا کمرے میں داخل ہوئے تو آہٹ سن کر بابا نے آنکھیں کھولیں اور مسکرائے۔ لیکن اُن کی آواز میں نقاہت نمایاں تھی۔ "تم نے پھر ایک بار اپنی ضد پوری کر لی نا میاں...... اب یہ ڈاکٹر دن رات تمہیں ڈراتے رہیں گے، حالانکہ ان کے ہاتھ میں شفا تو ہوسکتی ہے، لیکن 'جزا' نہیں۔ قضا اور جزا کا اختیار صرف اُس کے پاس ہے۔ جتنی سانسیں لکھوا کر لائے ہیں وہ تو بہر حال کاٹنی ہی ہیں۔" میں نے اُن کا ہاتھ تھام لیا۔ "بات اگر سانسوں کی گنتی کی ہے تو پھر مجھے وہ کلیہ بھی آج بتا ہی دیں، جس کے ذریعے میں اپنی باقی ماندہ سانسیں بھی آپ کے حساب میں منتقل کروا سکوں۔" انہوں نے میری بھیگی پلکیں پونچھیں۔ "زندگی صرف سانسوں ہی میں نہیں بانٹی جاتی۔ تم نہیں جانتے تم مجھے کتنی زندگی دے چکے ہو اور ہمیشہ یاد رکھنا، زندگی ہمیشہ سانسوں ہی سے منسلک نہیں ہوتی۔ ایک سفر ختم ہوگا تو دوسرا شروع ہو جائے گا۔" پپا نے دھیرے سے میرے کاندھے کو دبا کر مجھے یہ احساس دلایا کہ مجھے سلطان بابا

کو آرام کا موقع دینا چاہیے۔ میری آنکھیں بہتی رہیں۔ جانے ہم اپنے سب سے زیادہ عزیز رشتوں سے ہمیشہ یہ توقع کیوں لگا بیٹھتے ہیں کہ وہ ہم سے کبھی جدا نہیں ہوں گے۔ میرا دل اور ذہن کسی طور پر بھی تسلیم کرنے کو تیار نہیں تھا کہ وہ "بزرگ دانش" بھی باقی سب کی طرح ایک دن اپنی پلکیں موند کر گہری نیند کی چادر اوڑھ کر چلتے بنیں گے۔

عشاء کے بعد رات کی ڈیوٹی والی نرس نے ہمیں یاد دلایا کہ اسپتال کے قوانین کے مطابق کوئی ایک تیماردار ہی وہاں رات گزار سکتا ہے اور وہ بھی سلطان بابا کے کمرے سے ملحقہ گیسٹ روم میں۔ مجھے مما سے کیا گیا وعدہ بھی یاد تھا۔ سو، میں سلطان بابا کو آرام کرتا چھوڑ کر کچھ دیر کے لیے پپا کے ساتھ گھر چلا آیا۔ وہی مانوس دیواریں، وہی جانی پہچانی سی خوشبو...... وہی مما کی اپنی اپنی سی نوکروں کو ڈانٹنے کی آوازیں، وہی دیواروں سے لپٹی بیلیں۔ شاید اگلی زندگی میں جسے جنت سے بھی بڑھ کر کسی کو کچھ عطا کرنے کا فیصلہ ہوا تو اُسے واپس اپنے ہی گھر بھیج دیا جائے گا۔ میرا کمرہ بھی بالکل اُسی طرح "بکھرا" ہوا تھا جیسے میں اپنی عادت کے مطابق اُسے چھوڑ کر گیا تھا۔ شاید مما نے میرے جانے کے بعد کسی کو میرے کمرے میں داخلے کی اجازت ہی نہیں دی ہوگی۔ میرے پرفیومز، سی ڈیز، سن گلاسز، سوٹس، میوزک سسٹم اور ذاتی تھیٹر...... سبھی کچھ ویسا ہی تو تھا۔ حتیٰ کہ میرے کف لنکس اور ٹائی پنز بھی اُسی طرح اپنی جگہ پر پڑی تھیں۔ ایک پل کے لیے تو مجھے ایسا لگا کہ جیسے میں صرف تھوڑی دیر کے لیے اپنا کمرہ چھوڑ کر دوست کے پاس گیا تھا اور ہمیشہ کی طرح آوارہ گردی کر کے واپس لوٹ آیا ہوں۔ میں نے اپنے کمرے کے فون سے زہرا کے گھر کا نمبر ڈائل کیا اور دوسری طرف بجتی ہر گھنٹی پر میرے دل کی دھڑکن اتھل پتھل ہونے لگی۔ مجھے یوں لگا جیسے وہ گھنٹی دوسری جانب کے فون کی بجائے میرے اپنے من مندر میں بج رہی ہو۔ لیکن بہت دیر بجنے کے باوجود دوسری جانب سے فون نہیں اُٹھایا گیا۔ زہرا موبائل استعمال نہیں کرتی تھی اور اس ایک رابطہ نمبر کے علاوہ میرے پاس دوسرا کوئی اور نمبر بھی نہیں تھا۔

کھانے کے دوران بھی میرا دھیان اُسی جانب اٹکا رہا۔ مما نے آج کھانے پر پچھلے تمام مہینوں کی کسر ایک ہی بار نکالنے کی ٹھان رکھی تھی۔ مجبوراً مجھے اُن کا ہاتھ پکڑ کر زبردستی اپنے پاس بٹھانا پڑا۔ مجھے سوچوں میں ڈوبا دیکھ کر پپا نے تجویز پیش کی کہ ہم تینوں کھانے کے بعد کچھ دیر کے لیے زہرا کی طرف سے بھی ہو آتے ہیں۔ لیکن مجھے اس وقت وہاں جانا کچھ معیوب سا لگا اور پھر ویسے بھی مجھے واپس اسپتال پہنچنا تھا۔ اور پھر اس سے پہلے کہ پپا مزید اصرار کرتے، اچانک فون کی گھنٹی بج اُٹھی۔ میں اندر تک جھنجھنا اُٹھا۔ لیکن دوسری جانب کی بات سنتے ہی مما کے چہرے کا رنگ بدل گیا۔ "کیا...... اوہ...... اچھا...... جی جی...... لیکن کس اسپتال میں...... اچھا ٹھیک ہے......" مما نے فون رکھا اور اپنی سانس درست کرنے کی کوشش کی "زہرا کی گاڑی تلے کوئی شخص آ گیا ہے۔" میرے ہاتھ سے نوالہ پلیٹ میں گر گیا۔ مما نے جلدی میں بتایا کہ زہرا کا ڈرائیور ٹھیک وقت پر اُسے بندرگاہ لانے کے لیے نہیں پہنچا تو اُس نے خود ہی اپنی گاڑی ڈرائیو کرنے کا فیصلہ کر لیا اور اپنی

ماں کے لاکھ منع کرنے کے باوجود وہ گھر سے خود ہی گاڑی لے کر نکل پڑی۔ کچھ ہی دیر بعد ڈرائیور بھی پہنچ گیا اُسے بھی زہرا کے پیچھے دوسری گاڑی دے کر بھیج دیا گیا اور پھر بندرگاہ سے تھوڑے فاصلے پر ایک جگہ ہجوم دیکھ کر ڈرائیور نے بریک لگائی اور پھر اپنی مالکن کی گاڑی کے گرد خون بکھرا دیکھ کر اُس کے تو ہوش ہی گم ہو گئے۔ پتا چلا کہ کوئی موٹر سائیکل سوار زہرا کی گاڑی تلے آ گیا ہے۔ نوجوان کی نبضیں ابھی چل رہی تھیں۔ لہٰذا لوگوں کے چیخنے چلانے کے باوجود ڈرائیور نے اُسے اپنی گاڑی میں ڈالا اور زہرا سمیت اُسے لے کر قریبی اسپتال کی طرف گاڑی بھگا دی۔ یہ فون وہیں سے زہرا کے والد نے کیا تھا۔ جب زہرا گھر سے نکلی تھی، تب تک وہ اپنے دفتر سے واپس نہیں لوٹے تھے اور پھر جب گھر پہنچے تو اس افتاد کا سنتے ہی وہ زہرا کی اماں کو لے کر فوراً اسپتال کے لیے روانہ ہو گئے۔ ہیوی بائیک پر سوار نوجوان کسی اُونچے گھرانے کا چشم و چراغ تھا اور دوسری جانب کے لوگ بھی وہاں پہنچ چکے تھے۔ زہرا کے ابا نے پپا اور مجھ سے بھی وہاں آنے کی درخواست کی تھی، کیوں کہ معاملہ پولیس کا تھا۔ نہ جانے غلطی کس کی تھی، لیکن مما کے بقول زہرا کے ابا کی آواز سے شدید پریشانی جھلک رہی تھی۔ میرے دل سے بے اختیار صدا نکلی کہ "یا میرے مولا...... اُس گھائل کو اپنی امان میں رکھنا۔" ابھی ہم نے گھر سے نکلنے کے لیے قدم اُٹھائے ہی تھے کہ ایک بار پھر فون کی گھنٹی بج اُٹھی اور اس مرتبہ میں نے لرزتے ہاتھوں سے ریسیور اٹھایا۔ دوسری جانب سلطان بابا کے وہ سینئر معالج تھے، جنہیں میں خاص طور پر اپنے گھر کا فون نمبر دے کر آیا تھا کہ کسی بھی ایمرجنسی کی صورت میں مجھے فون پر اطلاع دے سکیں۔ میں صرف اتنا ہی سن سکا کہ سلطان بابا کی سانسیں اُلجھنے لگی تھیں، لہٰذا انہیں پھر سے آکسیجن پر منتقل کر دیا گیا ہے اور وہ غنودگی میں کئی بار میرا پوچھ چکے ہیں۔ میں ریسیور رکھ کر باہر کی جانب لپکا، جہاں مما پپا پہلے ہی گاڑی میں بیٹھ چکے تھے۔ دونوں طرف ہی کچھ ایسی صورت حال تھی کہ سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ پہلے کس طرف کو نکلا جائے۔ میں نے پپا کو زہرا لوگوں کی جانب جانے کا کہا اور خود دوسری گاڑی میں سلطان بابا کی جانب روانہ ہونے کا ارادہ کیا۔ ڈرائیور جلدی میں گیراج سے گاڑی نکال کر ابھی پورچ تک پہنچا ہی تھا کہ میری رگوں میں پھر سے ہی اندھیرا چھانے لگا۔ میں نے زور سے اپنے سر کو جھٹکا، لیکن میری بصارت سے رنگ غائب ہوتے گئے اور میرے سر میں دھماکے سے ہونے لگے۔ ذہن میں جیل کی قید کے دوران کیے گئے معائنے والے بڑے ڈاکٹر کے الفاظ پھر سے گونجے۔ "کوئی بھی شدید پریشانی یا اچانک خوشی کی خبر ان کے اعصاب کو جھنجھوڑ کر اس نظام کو متحرک کر سکتی ہے جو آگے چل کر کسی بھی بڑے اعصابی حملے کی بنیاد بن سکتا ہے۔" افسوس وہ نظام متحرک ہوا بھی تو کس گھڑی، جب چاروں طرف سے مصائب میرا گھیراؤ کر چکے تھے۔ میں زور سے لہرایا اور گاڑی کے بونٹ کا سہارا لینے کی کوشش کی۔ میری حالت دیکھ کر پپا تیزی سے میری جانب بڑھے۔ "ساحر...... خود کو سنبھالو بیٹا......" لیکن میں شاید بہت پہلے سنبھلنے کے مقام سے آگے گزر آیا تھا۔ میری ڈوبتی آنکھوں اور بند ہوتی پلکوں نے مما کو چیختے ہوئے میری جانب بڑھتے دیکھا۔ لیکن میری سماعتیں آس پاس کے شور سے بے نیاز

ہو چکی تھیں۔ دوسرے ہی لمحے میں پپا کی بانہوں میں جھول رہا تھا۔ پھر نہ جانے میں ہوش میں تھا یا کوئی بر
تھا۔ ایمبولینس کی گھومتی سرخ بتی، شور مچاتی سڑک، کسی غیر ملکی اسپتال کی ہمارے شہر میں موجود کڑی کا سا
بورڈ، سفید گاؤن پہنے اور میرے اسٹریچر کے ساتھ بھاگتے ڈاکٹر، بدحواس سی نرسیں، آپریشن تھیٹر کی ایک چھ
سے جلنے والی گول فانوس نما روشنیاں، کچھ چمکتے اوزار، خون کے چھینٹے، درد، کسک، بوجھل پن، میری کنپٹی
بائیں جانب کسی انتہائی تیز نشتر کی نوک کی چبھن اور پھر جلد سے گزر کر ماس کے اندر تک کاٹ کا احساس.....ا
پھر وہی سرخ اندھیرا.....کئی صدیوں کے بعد میری سماعت میں کچھ ہلکی سی سرگوشیاں گونجیں......ہمیں افسو
ہے......آپ کے بیٹے کے بچنے کی اُمید بہت کم ہے۔ البتہ آپ اگر چانس لینا چاہیں تو اسے فوراً لندن کے
ویل اسپتال تک پہنچانے کی کوشش کریں۔ وہاں ڈاکٹر البرٹ ہی واحد ماہر اعصابی امراض ہیں، جو شاید ا
کچھ کر سکتے ہیں۔" پھر مما کے رونے کی آواز، ایئرپورٹ ٹرمنل کے مخصوص اعلانات، ہوائی جہاز کے پہیوں
رن وے پر رگڑ سے اُڑتی چنگاریاں، اور پھر ایک ملائم آواز" ہم لندن کے ہیتھرو ایئرپورٹ پر آپ کو خوش آمد
کہتے ہیں۔"

"من کی دیوار"

عجب جنون مسافت میں گھر سے نکلا تھا
خبر نہیں کہ یہ سورج کدھر سے نکلا تھا
یہ کون پھر سے مجھے راستوں میں چھوڑ گیا
ابھی ابھی تو عذاب سفر سے نکلا تھا
یہ تیر دل میں مگر بےسبب نہیں اُترا
کوئی تو حرف لب چارہ گر سے نکلا تھا
میں رات ٹوٹ کے رویا تو چین سے سویا
کہ دل کا زہر مری چشم تر سے نکلا تھا
وہ قیس اب جسے مجنوں پکارتے ہیں فراز
تیری طرح کوئی دیوانہ گھر سے نکلا تھا......

سچ تو یہی ہے کہ میں خود ہی اپنی راہ کی سب سے بڑی دیوار تھا۔ میرے ہوش و حواس تب میرا ساتھ چھوڑ گئے، جب دو چار ہاتھ ہی اُس بام کی منڈیر چھونے کو رہ گئے تھے، جس پر میری قسمت کا واحد چاند چمک رہا تھا۔ لیکن چکور کی قسمت میں بھلا چاند کو پانا کب ممکن ہوا ہے۔ اس کا مقدر تو صرف اُسے چھونے کی خواہش میں اُڑتے جانا ہے۔ اُونچا اور اُونچا تر، حتیٰ کہ اُس کی سانسیں رُکنے لگیں، دم گھٹنے لگے اور پھر بے دم ہو کر فلک سے زمین پر نیست و نابود ہونے کے لیے ایک آخری قلابازی اور پھر سب ختم......شاید میرا خاتمہ بھی قریب تھا۔ جھپکتی گھڑیوں کے چند لمحے مجھے ایک بہت بڑی سی شیشے کی کھڑکی دکھاتے، جس کے کانچ پر پھسلتی بوندوں سے پرے مجھے ایک دریا رواں دکھائی دیتا۔ میں اس دریا کو پہلے بھی دیکھ چکا تھا۔ بلکہ کئی کئی گھنٹے میں نے اس کے کنارے بچھے بینچوں پر اس سے باتیں کرتے گزارے تھے۔ ہاں......شاید یہ دریائے ٹیمز ہی تھا۔ میں اس کی بھی لہروں کی خاموش سرگوشیوں سے اچھی طرح واقف تھا۔ پھر کچھ وقفوں سے دھیرے دھیرے میرے ہونٹوں میں حرکت ہونے لگی۔ شاید نصف صدی بعد میں اپنی بوجھل پلکیں اُٹھانے میں کامیاب ہوا اور سب سے

پہلے جو شبیہ میری بصارت کے سامنے دھیرے دھیرے متعارف ہوئی، وہ اپنے پورے جسم اور سر کو ایک چادر سے اچھی طرح ڈھانپے جانماز پر سجدہ میں پڑی ہوئی میری ماں کی تھی۔ ہاں...... وہ مما ہی تھیں، جن کی جبیں نے ماتھا ٹیکنا سیکھ ہی لیا تھا۔ اولاد کی محبت میں کتنی طاقت ہوتی ہے، اس کا ایک دوسرا مظاہرہ کھڑکی کے قریب بیٹھے تسبیح کے دانے گراتے اپنے والد کی صورت مجھے نظر آیا۔ محبت چاہے کیسی بھی ہو، سجدہ کرنا سکھا ہی دیتی ہے۔ میری پلکیں اُٹھتی دیکھ کر پپا کے ہاتھ سے تسبیح گر گئی اور وہ باہر کی جانب لپکے۔ مما بھی وہیں جانماز پر جمی رہ گئیں اور آنکھیں بند ہونے سے پہلے میں نے ایک غیر ملکی ڈاکٹر کو چند معاونوں کے ساتھ تیزی سے اپنے کمرے میں داخل ہوتے دیکھا۔

دوسری بار جب میرے حواس جاگے تو میں نے کیلنڈر پر مزید تین ہندسے سے بڑھتے ہوئے دیکھے اور مجھے احساس ہوا کہ میں پورے پندرہ دن تک اس سوتی جاگتی حالت میں بنا جیے گزار چکا ہوں۔ ہم لندن کے روز ویل اسپتال کے انتہائی نگہداشت کے اعصابی حصے میں موجود تھے اور میرے گرد ڈاکٹروں کا ایک ہجوم جمع تھا، جو اپنی اپنی بولیاں بول رہے تھے اور پھر ایک معمر ڈاکٹر کی آمد پر سب چپ ہو گئے۔ اُس نے اپنا تعارف کروایا "ہیلو لڑکے...... میرا نام البرٹ ہے ڈاکٹر البرٹ۔ تمہیں نئی زندگی کی جانب پہلا قدم مبارک ہو۔" مجھ سے جواب میں کچھ بولا نہیں گیا۔ میں پپا سے سلطان بابا کے بارے میں پوچھنا چاہتا تھا لیکن میری زبان تالو سے جیسے چپک کر رہ گئی تھی۔ شدید پیاس کا احساس میرے حلق میں کانٹے چبھو گیا۔ ڈاکٹر البرٹ کو شاید میری کیفیت کی کچھ خبر تھی۔ "تمہیں کچھ عرصہ احتیاط کرنی ہوگی۔ اس وقت پانی کی ایک بوند بھی تمہارے لیے زہر ثابت ہو سکتی ہے۔ میں نے اپنی زندگی میں ریبیز کا ایسا کیس آج تک کبھی نہیں دیکھا۔ تمہارا موت کے منہ سے واپس لوٹ آنا میرے لیے ایک معجزے سے کم نہیں۔" وہ میرے گال تھپتھپا کر پلٹ گئے۔ چند گھنٹے بعد جب میں لکنت کے ساتھ بولنے کے قابل ہوا تو میں نے پہلا سوال بابا کے متعلق ہی کیا۔ پپا نے مجھے بتایا کہ ہمارے ملک سے روانہ ہوتے وقت وہ تقریباً کومے میں تھے اور ڈاکٹر اپنی سی پوری کوشش کر رہے ہیں۔ نہ جانے کیوں مگر مجھے پپا کی بات ادھوری سی لگی۔ لیکن میں خود اس وقت کچھ ایسی معذوری کے عالم میں بستر پر پڑا تھا کہ خود اُٹھ کر اور دو قدم چل کر پاکستان فون بھی نہیں ملا سکتا تھا۔ کتنی عجیب بات تھی کہ جن لمحوں میں، میں ہوش کی سرحد سے پار تھا، تب سلطان بابا بھی دنیا والوں کے نزدیک بے ہوش پڑے تھے۔ لیکن مجھے ایسا کیوں لگ رہا تھا کہ جیسے اس تمام بے ہوشی کے دوران بھی میرا اُن سے مسلسل رابطہ تھا۔ میں اپنے بستر پر چپ چاپ لیٹا کھڑکی سے باہر دریائے ٹیمز کی رواں لہروں میں ضم ہو کر فنا ہوتی بوندوں کا کھیل دیکھ رہا تھا۔ پانی اپنے اندر پانی کو کتنی آسانی سے جذب کر لیتا ہے۔ شاید ساری بات (میڈیم) عنصر کی ہوتی ہے۔ ہر عنصر اپنے ہم جنس کو اتنی ہی آسانی سے قبول کرتا ہے گویا ہم انسانوں کا میڈیم بھی اس دنیا سے کچھ سوا ہی ہوتا ہوگا، کیوں کہ ہم اپنی ساری زندگی اس جہاں میں کاٹ کر بھی اس سے کتنے اجنبی رہتے ہیں، کتنے جُدا اور کتنے الگ سے۔ کہیں

ا میڈیم وہی تو نہیں، جہاں سے ہمیں نکالا گیا تھا؟ اچانک میری نظر کمرے کی دیوار پر لگے پتلے سے اسکرین ٹی وی پر پڑی، جو بند آواز کے ساتھ چل رہا تھا۔ پپا وقت گزاری کے لیے مختلف چینلز بدل رہے تھے اور پھر لمحے کے لیے ٹی وی کے پردے پر وہ منظر گزرا، جس نے میرے وجود کے اندر جیسے ایک کرنٹ سا دوڑا پپا تب تک تین چار مزید چینل گزار چکے تھے۔ میں نے جلدی سے انہیں آواز دے کر پھر سے چینل پلٹنے کو ہا۔ وہ میری حالت دیکھ کر کچھ پریشان سے ہو گئے اور انہوں نے جلدی سے چینل پلٹ دیا۔ میں نے جلدی ہاتھ اُٹھا کر انہیں رُکنے کو کہا۔ ہاں...... یہی وہ چینل تھا۔ حجاج آخری مناسک حج ادا کرنے کے بعد میدان ں جمع ہو کر دعا کے لیے ہاتھ اُٹھا چکے تھے۔ مجھے یوں لگا جیسے ان میں سے ہر ہاتھ حبیب البشر صاحب ہی کا ہ۔ میں نے جلدی سے اپنے چارٹ پر نظر ڈالی۔ میرے ہوش میں آنے کا وقت ٹھیک وہی تھا، جب حبیب صاحب کی پہلی نظر اُس کے گھر پر پڑی تھی۔ ٹھیک چار دن پہلے...... جب حجاج پہلی مرتبہ حرم میں داخل ہوئے اور جب دل زندگی میں پہلی مرتبہ کسی خشک پتے کی طرح لرز کر چند گھڑیوں کے لیے رُک گیا ہوگا، جب پوری کائنات میں اپنے ایک مالک کے سامنے کھڑے ہونے کا احساس مساموں سے پسینے کی صورت بہا ہوگا اور جب رواں رواں سجدے میں جھک کر رو پڑا ہوگا۔ تب وہ لمحہ تھا، جب میں نے اپنی آنکھیں کھولی تھیں۔ یہاں مغرب میں ڈاکٹر اب ساری عمر سر کھپاتے رہیں گے کہ یہ اَن ہونی کیسے ممکن ہوئی۔ جس بیماری کو وہ لاعلاج قرار دے کر میرے لیے ساری عمر مدہوشی یا جنون کے عالم میں مبتلا رہنے کا اعلان بہت پہلے کر چکے تھے، ایک میں اس کے آثار کیسے مٹنے لگے۔ یہاں مغرب میں ایسے واقعات پر فوراً ایک لیبل لگا دیا جاتا ہے۔ Mirac (معجزہ)...... اور لوگ چند دن بعد سب کچھ بھلا کر پھر سے زندگی کی دوڑ میں شامل ہو جاتے ہیں۔ ب ان نادانوں کو کون سمجھائے کہ "سانس کی آمد و رفت" سے بڑا بھی کیا کوئی "معجزہ" ہوگا اس دور کا؟ اُس کے گھر سے ہزاروں میل دُور بیٹھ کر بھی جب اُس کے حضور مانگی گئی دعا پلک جھپکنے سے پہلے اُس کی بارگاہ میں پہنچ جاتی ہے تو پھر اُس کی چوکھٹ کو چومتے ہوئے ماتھے کی سرسراہٹیں وہاں تک پہنچنے میں بھلا کیا وقت لیتی ہوں گی؟ ڈاکٹر البرٹ کی ٹیم کو یہ بات کبھی سمجھ نہیں آئے گی۔ اس کی تشخیص کے مطابق ریبیز کے کچھ جرثومے ایسے بھی ہوتے ہیں جو صحیح وقت پر ویکسین دیئے جانے کے باوجود عین موقعے پر اپنے آپ کو کسی سیپ نما چادر میں چھپا کر خود پر کوئی "جھوٹا خول" چڑھا لیتے ہیں لہٰذا ویکسین کے خلیے اُسے پہچان نہیں پاتے اور اُس کا اثر ختم ہونے کے بعد یہ زہریلے جراثیم اپنی قلعہ نما پناہ گاہوں سے باہر نکلتے ہیں اور دوا کے بچے کھچے اور دم توڑتے خلیوں پر ایک تازہ دم فوج کی طرح حملہ کر کے اعصاب پر قابض ہو جاتے ہیں۔ البرٹ کی تشخیص کے مطابق جب مجھے لندن کے روز ویل اسپتال لایا گیا تھا، تب میرے تقریباً 90 فی صد اعصاب پر وہ زہریلی فوج اپنا قبضہ کر چکی تھی اور ایسے مریضوں کا زندگی کی طرف لوٹنا یا پھر اپنے اعصاب ہی کو واپس پالینا تقریباً ناممکن ہو جاتا ہے۔ لیکن اُن کے سامنے ایک ایسا مریض موجود تھا، جس کے تھکے ہوئے اور قریب المرگ اعصاب کے چند

آخری سپاہی اُس پوری فوج کا مقابلہ کر کے یہ آخری جنگ جیت چکے تھے۔ میرے کمزور اعصاب کی فصیل
ٹکا میرے ذہن کا قلعہ مفتوح ہونے سے بچا لیا گیا۔ لیکن جدید ایلوپیتھی اور سائنس اس معمے کو کبھی نہیں
پائے گی۔ سچ ہے، انسان سدا سے خسارے میں ہے۔ سدا کا کوتاہ نظر ہے۔ اپنے سامنے روزانہ سورج نکلتے اور
چاند تارے ڈوبتے دیکھ کر بھی اُسے یقین نہیں آتا۔ یہ پانی سے بھرے بادل، یہ ہوائیں، یہ روشنی، یہ پہاڑ، یہ
آسمان...... بھلا اور کیا نشانی باقی رہ جاتی ہے اپنے اندر بیٹھے ''دلیل کے سوداگر'' کو مطمئن کرنے کے لیے......؟
لیکن میرے اندر پھیلتی بے چینی کی وجہ کچھ اور ہی تھی۔ پندرہ دن سے زہرا سے مما پپا کا کوئی رابطہ نہیں تھا۔ ایک
بار اُس کا فون آیا بھی تو بس چند لمحوں کے لیے۔ پپا ایسی باتوں پر زیادہ دھیان نہیں دیتے تھے، لیکن مما کچھ کھٹکی
ہوئی سی لگتی تھیں، جیسے زہرا کا ایسی حالت میں مجھ سے لاتعلق رہنا انہیں پسند نہ آیا ہو...... تب ہی شام کو میرے
حلق میں سوپ کے چھوٹے چمچ اُنڈیلتے ہوئے اُن کا لہجہ کچھ تلخ ہو گیا۔ ''کون بے وقوف ہو گی، جو موت کے
منہ میں جانے والے کو الوداع کہنے ایئر پورٹ پر آئے گی یا اُس کا انتظار کرے گی......'' پپا نے نظروں نظروں
میں مما کو ڈانٹا۔ وہ بڑبڑا کر چپ ہو گئیں، لیکن میرے ذہن میں کئی سوال کلبلانے لگے۔ وہ میری حالت جانے
کے باوجود ایئر پورٹ تک کیوں نہیں آئی؟ اور اگر کوئی مجبوری بھی تھی، تب بھی وہ ایک بار فون کر کے میری
خیریت تو پوچھ سکتی تھی۔ کہتے ہیں محبت وسوسوں کا آئینہ ہوتی ہے۔ جس زاویے سے بھی اس کا عکس دیکھیں کوئی
نیا وسوسہ کچھ الگ ہی خدشہ سر اُٹھاتا ہے۔ ایک پل پہلے مل کر جانے والا محبوب بھی موڑ مڑتے ہوئے آخری بار
پلٹ کر نہ دیکھے تو دیوانوں کی دنیا اتھل پتھل ہونے لگتی ہے کہ جانے کیا ہو گیا؟ کہیں وہ رُوٹھ تو نہیں گیا۔ کوئی
بات بُری تو نہیں لگ گئی اُسے......؟ اور پھر اگلی ملاقات تک سارا چین وسکون غارت ہو جاتا ہے۔ کچھ ایسا ہی
حال میرا بھی تھا لیکن میں کتنا بے بس تھا کہ اپنی مرضی سے قدم بھی نہیں اُٹھا سکتا تھا۔ کبھی کبھی مجھے اس انسانی
جسم کی لاچاری پر بے حد غصہ آتا تھا۔ ہمارے جسم کو ہماری سوچ جیسی پرواز کیوں نہیں عطا کی گئی؟ ایسا ہوتا تو
میں اُڑ کر اُس بے پروا کے در پر جا پہنچتا کہ اس تغافل کی وجہ تو بتا دے؟ مجھے سلطان بابا کی فکر بھی گھن کی طرح
کھائے جا رہی تھی۔ جانے وہ کس حال میں ہوں گے؟ عجیب بات یہ تھی کہ جب میں بے ہوش تھا، خود کو اُن
کے بے حد قریب محسوس کرتا تھا، لیکن جب سے میں دنیا والوں کے لیے ہوش میں آیا تھا، اس خرد نے انہیں مجھ
سے جیسے چھین لیا تھا۔ کیا یہ ممکن ہے کہ جب ہم اپنے عزیز ترین رشتوں سے جسمانی طور پر دُور ہوں تو ہمارے
اندر موجود کوئی غیر مرئی نظام ہمیں رُوحانی طور پر ان کے قریب تر کر دیتا ہو؟

میں ابھی تک چلنے پھرنے کے قابل نہیں تھا، لیکن تین دن بعد ڈاکٹر البرٹ کی ہدایت پر مجھے ایک نرس
بیساکھی اور وہیل چیئر کی مدد سے اسپتال کی اندرونی حدود میں واقع، باغیچوں یا نہر کے کنارے مختصر سیر کے لیے
لے جانے لگی۔ یہ اسپتال دریائے ٹیمز کے بالکل کنارے اور ایک چوڑی سڑک سے ملحق تھا۔ میں جانے کتنی بار
اس سڑک سے گزرا ہوں گا، کیوں کہ لندن کی زرد شام کے سب رنگ اس سڑک پر بکھرے پتوں کی صورت، ہر

مجھے اپنی طرف کھینچ لیتے تھے۔ لیکن میں نے یہ کبھی نہیں سوچا تھا کہ میں کسی دن اس شکستہ بدن کے ساتھ
رک کی دیوار سے پرے اسپتال میں یوں بے بس اور لاچار بھی پڑا ملوں گا؟ ہماری زندگی میں کون سا
ہم پر کس وقت، کس صورت میں کھلے گا، یہ ہم اگر پہلے جان جائیں تو شاید بہت سے مقامات سے کبھی
دوستی بھی نہ ہو پائے۔ اس روز بھی میں وہیل چیئر پہ بیٹھا اسپتال کے وسیع گھاس کے میدان میں
ے سرخ اور زرد پتوں کی چادر پر سفید برف کے ننھے ستاروں کو اپنے موتی ٹانکتے ہوئے دیکھ کر کچھ ایسی
چوں میں گم تھا۔ موسم کی پہلی برف باری لندن کے در و دیوار کو سفیدے کی ململ سے ڈھک رہی تھی۔
برف گرتی ہے وہاں کے لوگ جانتے ہوں گے کہ پہلی برف کی کوری چادر زمین کو یوں ڈھانپتی ہے، جیسے
ماں اپنی بیٹی کے داغوں پر سفید مرہم لگاتی ہے۔ اس کی بدصورتی چھپانے کے لیے اُسے سفید نور کی اوڑھنی
ادیتی ہے۔ جب برف کے سفید گالوں نے میرے بالوں میں جمع ہو کر میرے ماتھے پر میرے سیاہ مقدر کی
وں کی تلاش شروع کی تو نرس نے میرے منع کرنے کے باوجود وہیل چیئر کو جلدی سے آگے دھکیلا اور ٹھیک
لمحے مجھے اپنے کاندھے پر کسی کے ہاتھ کا نرم دباؤ محسوس ہوا، میں نے نظریں اُٹھائی۔ گیروے رنگ کا چولا
ہاتھوں میں آہنی کڑے ڈالے اور سر پر عام گول ٹوپی کی گولائی سے نصف ایک چھوٹی سی سفید ٹوپی پہنے
پکی عمر کا شخص بالکل میرے ساتھ کھڑا تھا۔ اس کی پوری شخصیت ہی میں ایک عجیب سی چکا چوند تھی۔ جیسے
تپتی دوپہر کا سوا نیزے پر کھڑا سورج، جس پر کبھی نگاہ ٹک نہیں پاتی۔ خاص طور پر اس کی آنکھیں...... کس
چبھن تھی اُس کی نظر میں۔ میں ایک پل ہی میں لہولہان سا ہو گیا۔ ''مجھے یہاں سب گرو کے نام سے جانتے
۔ ویسے میرا نام پارکر گولڈ مین ہے اور میں آسٹریلین نژاد یہودی ہوں۔'' مجھے لگا تمہیں ابدی سکون کی
ن ہے لڑکے...... نرس گرو نامی اس پُراسرار شخص کو دیکھ کر مؤدب سی ہو گئی تھی۔ جس کا مطلب یہ تھا کہ وہ
ل اسپتال کے عملے کے لیے اجنبی نہیں تھا۔ گرو نے میرے ماتھے پر اپنی دو اُنگلیاں رکھیں اور منہ ہی منہ میں
جانے کیا بڑبڑانے لگا۔ مجھے یوں لگا جیسے گرم دہکتے الاؤ میں کسی نے برف کی دو سلاخیں گاڑ دی ہوں۔ اتنے
ما مما نے دوسری منزل پر موجود میرے کمرے کی کھڑکی سے جھانکا اور زور سے بولیں ''ساحر برف باری
روع ہو چکی ہے...... فوراً اندر آ جاؤ۔'' وہ جانتی تھیں کہ میں گھنٹوں بیٹھ کر آسمان سے اس نور کی برسات کو دیکھتا
وں، تب بھی میرا دل نہیں بھرے گا۔ گرو نے مسکرا کر ہمارا راستہ چھوڑ دیا۔ لیکن وہ دو آنکھیں ساری رات نیند
میں بھی مجھے اپنی پلکوں کے پیچھے چبھتی رہیں۔

صبح ہوئی تو دودھیا برف، لندن کے سب گناہوں پر پردہ ڈال چکی تھی۔ باہر بہتا دریائے ٹیمز اور دُور نظر
آ ویسٹ منسٹر کا پل بھی برف سے بنا سانچا لگ رہے تھے۔ کیا دنیا کا کوئی بھی دوسرا نظارہ کسی برفیلی صبح سے
بارہ سحر زدہ اور مبہوت کر دینے والا ہو سکتا ہے۔ جانے کیوں مجھے ایسی ہر برفیلی صبح کے بعد اپنی رُوح پھر سے
بر نیا جنم لیتی ہوئی محسوس ہوتی تھی۔ میں کھڑکی کے قریب پڑی آرام کرسی پر ادھ لیٹا باہر بنے نور کے مجسموں

کو دیکھ رہا تھا کہ اچانک کمرے کا دروازہ کھلا اور گرو اپنے مخصوص حلیے میں دستک دے کر اندر داخل ہوا۔ مما اسے دیکھ کر ڈر ہی گئیں۔ اُس نے شستہ انگریزی میں سب سے معذرت کی کہ وہ صرف میری خیریت دریافت کرنے آیا ہے۔ پاپا اُس کا مدعا سمجھ کر اپنی جگہ سے اُٹھے اور مما کو بھی باہر آنے کا اشارہ کیا۔ مما مجھے اس شخص کے ساتھ اکیلا نہیں چھوڑنا چاہتی تھیں لیکن پپا نے اپنی آدھی زندگی اسی ماحول میں گزاری تھی اور وہ یہاں کے آداب سے واقف تھے، لہٰذا بادل نخواستہ مما کو بھی ساتھ ہی اُٹھنا پڑا۔ گرو نے غور سے میری جانب دیکھا ''مسلمان ہو......؟'' میرے منہ سے بے اختیار نکلا ''الحمدللہ......'' گرو چونک سا گیا۔ خود مجھے اپنی اس بے ساختگی پر حیرت ہوئی۔ مجھے یہ انداز افتخار پہلے تو کبھی نہیں سوجھا تھا۔ شاید اُس کے سوال ہی میں کچھ ایسا پوشیدہ تھا کہ میرے اندر سے خود بہ خود یہ آواز باہر نکل آئی ''کیا نام ہے تمہارا؟'' ''عبداللہ۔'' کچھ دیر تک میں کھڑکی سے باہر اور وہ میرے چہرے پر نہ جانے کیا تلاش کرتا رہا۔ ''پورے روز ویل اسپتال میں تمہارے عجیب ترین مرض اور پھر عجیب ترین شفا کا چرچا ہے۔ یہاں کے ڈاکٹر اسے حسب معمول کسی معجزے سے تعبیر کر رہے ہیں، لیکن میں جانتا ہوں کہ آج کل معجزے اتنی آسانی سے رُونما نہیں ہوتے، ان کے پیچھے ضرور کچھ راز پوشیدہ ہوتے ہیں۔ کیا تم مجھے وہ راز بتاؤ گے......؟'' میں نے چونک کر اُس کی جانب دیکھا۔ لگی لپٹی رکھے بغیر اُس نے اپنے دل کی بات پہلی باقاعدہ ملاقات ہی میں میرے سامنے رکھ دی تھی۔ جانے کیوں اس لمحے مجھے وہ شخص بہت خطرناک محسوس ہوا۔ میں نے پہلی مرتبہ اُس کی آنکھوں میں براہ راست جھانکا ''معجزے ناقابل بیان ہوتے ہیں اور بات اگر راز کی ہے تو پھر وہ راز ہی کیا جو افشاء ہو جائے......'' گرو نے بے چینی سے پہلو بدلا ''ٹھیک کہا تم نے......راز کا واسطہ اخفا سے ہے۔ لیکن یہ معاملہ انسان کی بھلائی کا ہے۔ ہو سکتا ہے تمہارے افشا سے کسی دوسرے مریض کی حالت سدھرنے کی ترکیب بھی ہو جائے......'' میں نے پلٹ کر اُسے دیکھا۔ شاید یہ میرا وہم ہی ہو، لیکن مجھے یوں لگا کہ اُس کی آنکھیں ہر لمحہ مجھے تسخیر کرنے کی کوشش میں مصروف ہیں۔ ''بات اگر کسی کی بھلائی کی ہے تو پھر جان لو کہ میری رُوح پر صرف دُعا کا معجزہ رُونما ہوا ہے۔ ہزاروں میل دُور بیٹھے کسی شخص کے اُٹھے ہاتھوں کے پیالے میں میری مسیحائی کا تبرک ڈال دیا گیا۔ دعائیں تو میرے لیے میرے اپنوں نے بھی بہت مانگی ہوں گی، لیکن کچھ اعجاز اجنبیوں کے حصے آتے ہیں۔ بس، اتنا سا افسانہ ہے میرا......'' گرو غور سے میری جانب دیکھتا رہا، جیسے اُسے میری بات کا یقین تو ہو لیکن نصف۔ لیکن اُس نے مجھ سے مزید بحث نہیں کی اور کچھ دیر بیٹھنے کے بعد چلا گیا۔ اگلے چوبیس گھنٹوں میں مجھے اُس کے بارے میں بہت کچھ پتا چل چکا تھا۔ مغرب میں آج کل لوگوں کا رُجحان رُوحانی علاج کی طرف بہت بڑھ چکا ہے۔ باقاعدہ رُوحانی علاج کے کلینک کھل چکے ہیں۔ جہاں لوگ اپنے بے چین من اور رُوح کی کسک دُور کرنے کی نیت سے آتے تھے۔ گرو بھی یہاں کا ایک ویسا ہی رُوحانی مسیحا تھا جسے اسپتال کے بعض مریضوں کی خصوصی درخواست پر مختلف اوقات میں رُوحانی سیشن کرنے کے لیے خاص دعوت دی جاتی تھی۔ پارکر نام کا یہ یہودی اپنی شفا کے

ہاں بہت مقبول بھی تھا اور بھٹکی رُوحوں کے ستائے جسم اس کا بہت احترام کرتے تھے۔ اُس کا یہ حلیہ اور نام کا لقب اُس کے ہندوستان کے ایک دورے کے بعد کے عطا کردہ تھے، جب اُس نے وہاں بہت وں کا کھڑے کھڑے علاج کر کے اُن کی رُوحوں کو سکون بخشا تھا۔ لیکن نہ جانے میرے ساتھ یہ اُلٹ یوں تھا کہ وہ جتنی بار بھی میرے سامنے آیا تھا، میری رُوح میں بیک وقت کئی کانٹے چبھو گیا تھا۔ لیکن ؟ کیا نگاہوں کی طرح رُوحیں بھی آپس میں کچھ بھید بھاؤ رکھتی ہیں؟ ہاں...... بظاہر یہ رُوح کی ناپسندیدگی لہ ہی لگتا تھا۔ کیوں کہ اُس کی ظاہری شخصیت عام لوگوں کے لیے بے حد پرکشش تھی۔ میں مما پپا کے سلطان بابا کی خیریت تو کسی نہ کسی طور پر دریافت کروا ہی لیتا تھا، لیکن زہرا کی خبر ملنا محال ہوتا جا رہا تھا۔ ایک آدھ بار میرے کمرے ہی سے زہرا کے گھر بھی فون ملا کر دیکھا لیکن زیادہ تر اُس کے گھر کے سے ہی بات ہو سکی۔ ایک بار زہرا کی اماں نے فون اُٹھایا بھی تو پتا چلا کہ زہرا گھر پر نہیں ہے۔ مما نے ہو کر فون کرنا ہی چھوڑ دیا۔ لیکن میں اپنے دل کا کیا کرتا۔ جو دن کسی نہ کسی طور گزار ہی لیتا تھا مگر شام ہی جانے کہاں سے سارے جہاں کی بے چینیاں اس کے مٹھی بھر وجود کے چار خانوں میں در آتی کاش ہمارا دل بھی ان ٹیلی فونوں کی طرح یادوں کے لیے خاص نمبر اور ڈائل کا محتاج ہوتا اور جب تک نمبر نہ گھمایا جاتا، تب تک یاد کی گھنٹی بھی نہ بجتی۔ یہ قدرت بھی ہمارے ساتھ کیسے عجیب کھیل کھیلتی ہے بطوں کو آزاد چھوڑنا چاہیے تھا، انہیں ٹیلی فون جیسی ایجادوں میں قید کر دیا اور جن بے لگام جذبوں کو یں بند کر کے رکھنا لازمی تھا، انہیں دل جیسی بے پروا سلطنت کے حوالے کر ڈالا۔ مگر تقدیر کو گلہ پھر بھی ہم انسانوں ہی سے رہتا تھا۔

رات ڈھل رہی تھی اور میں گھنٹوں کروٹیں بدلنے کے باوجود نیند سے کوسوں دُور تھا۔ تنگ آ کر وہیل چیئر یعے کھڑکی کے پاس آ بیٹھا اور باہر گرتی برف اور درختوں کی آپس میں ہوتی سرگوشیاں سننے لگا۔ برف ل سوکھی ٹہنیوں سے گلہ کر رہے تھے کہ ابھی تو وہ انہیں خود سے لپٹائے بیٹھی ہیں، لیکن بہار آتے ہی جب نے کھلیں گے تو وہ ان سے ناتا توڑ لیں گی اور ٹہنیاں بے وفا محبوب کی طرح ان سے کبھی پورے نہ والے عہد و پیماں کر رہی تھیں۔ اچانک میری نظر برف میں جے ایک وجود پر پڑی جو یوگا کے کسی آسن کو رتی برف میں کھڑا تھا۔ وہ گرو تھا۔ گرو کی آنکھیں کھلیں اور تیر کی طرح میری نظروں میں گڑ گئیں۔ یوں مجھے اُس کی آنکھوں میں شدید غصے کی جھلک نظر آئی۔ گرو نے مجھے نیچے آنے کا اشارہ کیا۔ میں کسی کی طرح پلٹا۔ مجھے لگا میں خود پر اختیار کھو بیٹھا ہوں۔

پہلی قیامت

میں نے ہپناٹزم کے بارے میں آج تک جتنا کچھ سنا تھا، اس کے تمام آثار میں اپنے وجود پر اس
محسوس کرسکتا تھا۔ لیکن پھر بھی میرے ذہن کا کوئی ایک حصہ ایسا ضرور تھا جو ابھی تک جاگ رہا تھا۔ تب
جب برف کی چادر پر اپنی موٹرائزڈ وہیل چیئر کے پہیوں کے نشان ثبت کرتا ہوا نیچے گھاس کے برف
میدان میں گرو کے قریب پہنچا تب بھی سوچ سکتا تھا اور یہ سب محسوس کرسکتا تھا۔ گرو کچھ دیر تک فاتحانہ
میں مجھے دیکھتا رہا، جیسے کہہ رہا ہو کہ "دیکھا...... کیسے کچے دھاگے سے بندھے چلے آئے......" لیکن اگلے
ہی میری زبان سے نکلے سوال نے اُس کی نظر کا سارا غرور چکنا چور کر دیا۔ "کیا تم ہپناٹزم بھی جانتے ہو......
گرو کے چہرے پر کئی رنگ آ کر گزر گئے۔ "کیا مطلب...... یعنی کہ تم...... تم یہ سب کچھ محسوس کر
ہو......؟" میں نے ایک گہرا سانس لیا۔ "ہاں میرا وجود تمہاری نظر کے اثر میں یہاں نیچے تک خود کو دھکیل
ہے لیکن میں اب بھی جاگ رہا ہوں۔" آسمان سے برستی برف ہمارے وجود ڈھانپ رہی تھی۔ رات کے
جب آسمان سے برف گرتی ہے تو برف کی اپنی ایک خاص روشنی ہوتی ہے، جیسے صفر سے بھی کہیں کم طاقت
والے بہت سے دُودھیا بلب آس پاس جل رہے ہوں۔ میں اور گرو بھی ایسی ہی مدہم روشنی میں رات
سرکتے پہروں کو اپنی جھولی میں جمع کر رہے تھے۔ گرو مزید بے چین ہو گیا۔ "میں پہلے ہی سے دن سے محسوس
کر رہا ہوں کہ تمہاری رُوح میرا تسلط قبول کرنے میں شدید مزاحمت کر رہی ہے۔ کوئی ہے، جو تمہارے اندر
کر تمہاری حفاظت کرتا ہے، وہی تمہاری طاقت ہے۔ لیکن میں نے کبھی ہار نہیں مانی۔ وقت آ گیا ہے کہ تم
مجھے بتا دو کہ کس ہستی کا سایا ہے تم پر......؟" میں اپنے آپ کو اندر سے انتہائی مضمحل محسوس کر رہا تھا۔ "تم
ے وجود پر تو شاید کبھی اپنا تسلط قائم کر بھی لو، لیکن میری رُوح کے کواڑ صرف چند مخصوص دستکوں ہی پر
ہیں۔" گرو کچھ دیر نظروں ہی نظروں میں مجھے تولتا رہا۔ "ٹھیک ہے، تو پھر کچھ لو اور کچھ دو کی بنیاد پر سودا ہو گا
مجھے اپنا راز دو گے اور بدلے میں تمہیں کچھ ایسا بتا جاؤں گا کہ تمہاری عاقبت سنور جائے گی بولو منظور ہے؟"
حال میں بھی میرے ہونٹوں پر ایک نامکمل اور زخمی سی مُسکراہٹ پھیل گئی۔ "اگر میری عاقبت کا سنورنا اور
تقدیر نے تمہارے ذمہ ہی لگا چھوڑا ہے تو ٹھیک ہے۔ ایک سودا اور سہی......" اتنے میں ہم پر رات والی
شفٹ کے خاتمے کے بعد واپس جاتی کسی نرس کی نظر پڑ گئی اور وہ جلدی سے شور مچاتے ہوئے میری طرف
دوڑی اور جلدی سے میرے برف سے بھرے وجود کو وہیل چیئر سمیت دھکیلتی ہوئی اندر راہ داری کی جانب

ٹی۔ گرو وہیں برف میں کھڑا ہمیں دیکھتا رہا۔ بعد میں مجھے اُس پکی عمر کی ہیڈ نرس کا نام اسٹاف ایمی معلوم ہوا۔ صبح
ب وہ میرا معمول کا چیک اپ کرنے آئی تو کافی خفا معلوم ہو رہی تھی۔ مما پپا رات کو میرے کمرے سے ملحق
کمرے میں ہوتے تھے لہٰذا انہیں گزشتہ رات کی واردات کی خبر نہیں ہو سکی۔ میں نے نظروں نظروں میں ایمی کو
نع کیا کہ وہ میرے رات بھر برف اوڑھنے کا ذکر نہ کرے۔ وہ ناراض ناراض سی، تھرمامیٹر دیکھتے ہوئے
بولی۔ "تمہیں بخار ہو گیا۔ اب تمہیں ڈانٹ پڑنی چاہیے۔" مما پپا دُور بیٹھے ناشتا کر رہے تھے۔ میں نے مسکرا کر
اُن کی طرف دیکھا۔ "یہ فریضہ مما ہر دو گھنٹے بعد ادا کرتی رہتی ہیں۔ کیا آپ کو نہیں لگتا کہ ہمارے معمولات میں
تھوڑی بہت تبدیلی ضروری ہے۔" وہ بھی ہنس پڑی۔ "باتیں خوب بنا لیتے ہو۔ تم رات کو اُس عجیب شخص کے سا
تھ کون سی بحث کر رہے تھے؟" "کون......؟ وہ گرو......؟ وہ میرے ساتھ کوئی سودا کرنا چاہتا تھا۔" ایمی کے
چہرے پر پریشانی کے آثار تھے۔ "دیکھو، میری مانو تو اُس شخص سے دُور ہی رہو۔ پتا نہیں اسپتال والوں نے
اُسے اتنا سر پر کیوں چڑھا رکھا ہے۔ میرا بس چلے تو اُس کا یہاں داخلہ ہی بند کر دوں۔" ایمی، گرو سے کافی بد
دل دکھائی دیتی تھی۔ "میں نے سنا تھا کہ نرس ہر ذی رُوح کے لیے ایک نرم دل رکھنے والی ہستی کا نام ہوتا ہے،
لیکن آپ تو گرو کے لیے کافی تلخ جذبات رکھتی ہیں، ایسا کیوں؟" ایمی نے اِدھر اُدھر دیکھا۔ "دیکھو لڑکے! میں
تمہیں پوری بات نہیں بتا سکتی، بس اتنا جان لو کہ وہ ایک 'صیہونی' ہے۔ دراصل......" ابھی ایمی نے بات
شروع ہی کی تھی کہ ڈاکٹر البرٹ اپنے دو معاونین کے ساتھ کمرے میں داخل ہوئے اور ایمی جلدی سے سامان
کی ٹرے اُٹھا کر چل پڑی۔ میں اخبارات اور ٹی وی پر روزانہ کئی بار صیہونیت اور صیہونی کی اصطلاح سنتا اور
پڑھتا رہتا تھا، لیکن مجھے ابھی تک اس لفظ کے اصل معنی نہیں آتے تھے۔ شام تک میں اِسی ادھیڑ بن میں رہا کہ
ایمی مجھ سے کیا بات کرنا چاہتی تھی۔ شام ڈھلنے سے کچھ دیر قبل آسمان پر جڑے بادلوں میں سے کسی ایک شریر
جوڑے نے کچھ دیر کے لیے، اپنے ایک دوسرے سے بندھے ہاتھ کھول دیئے، تو چند لمحوں کے لیے فلک پر کسا
اُودے بادلوں کا خیمہ ایک جانب سے کھل گیا۔ اور مٹھی بھر آسمان جھلکنے لگا۔ ٹھیک اُسی لمحے سورج کے نصف پیا
لے نے مسکرا کر زمین سے چھیڑ خانی کی اور اس کی الوداعی کرنیں نیچے بچھی برف پر کچھ اس طرح پڑیں، جیسے
بچپن میں ہمارے محلّے میں گولے گنڈے والا سفید دُودھیا برف کے گولے پر نارنجی رنگ کا شربت اُنڈیلتا تھا۔
میرا اس وقت شدت سے جی چاہا کہ میں کسی اُونچی عمارت سے سارے لندن کا نظارہ کروں۔ مجھے یقین تھا کہ
اس وقت پورا لندن سورج مکھی کے کسی پھول کی طرح دمک رہا ہو گا...... زرد لندن کی نارنجی بہتی زمین اور جما
ہوا دریائے ٹیمز، وہی شام اور وہی زہرہ کی یاد کا پھندا، جو ڈھلتے سورج کے ساتھ ساتھ یوں کسا جاتا تھا، جیسے
گیلی بان کی رسی خشک ہونے پر سکڑتی جاتی ہے۔ سورج چند لمحوں کے لیے جھلک دکھلا کر پھر سے گہرے بادلوں
کے پیچھے جا کر چھپ گیا۔

برف باری کے بعد ہونے والی شام عام شاموں سے کہیں زیادہ اُداس، بوجھل اور تھکا دینے والی ہوتی

ہے۔ ایسے میں جن کے دل دار اُن کے قریب بستے ہیں، وہ گرم چمنیوں کے سامنے بھاپ اُڑاتی کافی کے مگ لیے، کشادہ کھڑکیوں کے کانچ سے پرے درختوں کو برف سے بوجھل شاخوں کو سجدے کرتے ہوئے دیکھتے ہیں۔ لیکن میں تنہا اپنے کمرے کی کھڑکی سے باہر ٹینز کی سرگوشیاں سن رہا تھا۔ تب ہی گرو دروازے پر ہلکی سے دستک دے کر اندر داخل ہوا۔ مما اور پپا کو میں نے آج زبردستی لندن کے مشہور ویمبلے تھیٹر میں بہت عرصے سے لگاتار چلنے والا شیکسپیئر کا ڈراما میکبتھ (Mecbith) دیکھنے کے لیے بھیج دیا تھا۔ میں جانتا تھا کہ ایک زمانے میں پپا لندن کا تھیٹر دیکھنے کے لیے خصوصی طور پر یہاں آیا کرتے تھے، لیکن میری پریشانی کی وجہ سے وہ آج لندن میں موجود ہوتے ہوئے بھی باہر نہیں نکل پا رہے تھے۔ گرو نے میرا حال چال پوچھنے کے بعد پھر سے وہی سوال دُہرایا۔ لیکن آج میرے پاس بھی اُس کے لیے ایک سوال موجود تھا۔ ''مجھے یہ سمجھ میں نہیں آرہا کہ میرے ہوش میں لوٹ آنے کا واقعہ تمہارے لیے اتنا اہم کیوں ہے۔ ایسے درجنوں واقعات تمہارے آس پاس روزانہ ہوتے ہوں گے، پھر بھی ایک شفا تمہارے لیے معجزہ کیوں بن کر رہ گئی ہے......؟'' ''اس لیے کہ میرا علم کہتا تھا کہ تم کبھی اپنے حواس میں واپس نہیں آؤ گے۔ تمہارے علم میں شاید یہ بات نہ ہو، مگر سچ یہ ہے کہ جب تم کومے میں تھے، تب مجھے ڈاکٹر البرٹ نے تمہارے رُوحانی علاج کے لیے خصوصی طور پر تین مرتبہ آئی سی یو میں بلایا تھا۔ تمہاری بے ہوشی میں بھی ایک عجیب سی بے چینی تھی۔ اور میں نے گھنٹوں تمہارے سرہانے تنہا کھڑے ہو کر تمہاری رُوح میں جھانکنے کی کوشش کی اور ہر مرتبہ مجھے یہی جواب ملا کہ تمہاری واپسی کے تمام راستے بند کر دیے گئے ہیں۔ یہی بات میں نے تمام عملے کو بھی منتقل کر دی تھی، لیکن انہوں نے باعثِ مصلحت تمہارے والدین سے یہ بات چھپائے رکھی، حالانکہ مجھے بلانے سے پہلے خود ان کی تمام تر جدید طب تمہاری عجیب وغریب بیماری کے سامنے ہتھیار ڈال چکی تھی، لیکن ایک ہی رات میں یہ ساری کایا پلٹ کیسے ہو گئی۔ میں ابھی تک شدید حیرت کا شکار ہوں۔'' میں غور سے گرو کو دیکھتا رہا۔ بظاہر سیدھا سادا نظر آنے والا شخص اندر سے کتنا گہرا تھا، اس کا اندازہ لگانا میرے لیے بہت مشکل ہوتا جا رہا تھا، لیکن ایک بات تو طے تھی کہ خود اُس کے پاس بھی کوئی ایسا علم ضرور تھا، جو اُسے چین سے بیٹھنے نہیں دیتا تھا۔ میں نے اِس بار اُسے تفصیل سے پانی کے جہاز کا سا بلا نکا، میں حبیب البشر صاحب سے ہونے والی ملاقات سے لے کر دس ذی الحج کے دن پہلی بار کچھ دیر کے لیے اپنے حواس میں آنے تک کے تمام واقعات سنا دیے۔ گرو کی آنکھوں میں کبھی حیرت، کبھی بے چینی اور کبھی بے یقینی کی لہریں وقفے وقفے سے جنم لیتی رہیں۔ شاید کہیں بہت گہرائی میں اپنے اندر خود کو یقین دلانے میں اُسے بہت مشکل ہو رہی تھی۔ میری بات ختم ہونے کے بعد بھی وہ بہت دیر تک خاموش بیٹھا رہا۔ ''تمہاری کہانی میں اب بھی بہت سی باتیں میرے لیے وضاحت طلب ہیں، لیکن میرے پاس یقین کرنے کے علاوہ کوئی چارہ بھی نہیں۔ کیوں کہ ایک بات تو طے ہے کہ تم کچھ 'خاص' ہو۔'' میں مسکرایا۔ ''میں تمہاری بے چینی کی وجہ سمجھ سکتا ہوں۔ اگر یہی دُعا کوئی میرے لیے یروشلم میں مانگتا تو شاید تم اتنے بے یقین نہ ہوتے......'' حالانکہ

ں نے یہ بات کسی خاص نقطۂ نظر یا طنزیہ لہجے میں نہیں کی تھی۔ میرا مقصد صرف دو مقدس مقامات کے لیے پنے اپنے جذبات کا زاویہ بیان کرنا تھا۔ لیکن گرو یوں اُچھلا، جیسے اُسے کسی بچھو نے ڈنک مار دیا ہو۔ وہ شدید ے میں بولا۔ ''تو گویا تم مجھے چیلنج کر رہے ہو۔ تم جانتے ہو آج زمانے بھر میں تم لوگوں کی ناکامی اور رُسوائی کی یادی وجہ کیا ہے۔ یہی کہ تم لوگ بولتے زیادہ اور عمل کم کرتے ہو۔ لیکن آج میں تمہیں عملی طور پر ایک مظاہرہ لھانا چاہتا ہوں۔ شرط یہ ہے کہ تمہیں کچھ دیر کے لیے اپنے ذہن اور حواس پر میرا تسلط قبول کرنا ہوگا۔'' میں نے حیرت سے گرو کی طرف دیکھا ''لیکن یہ کیسے ہوگا؟'' ''کوئی پیچیدہ بات نہیں ہے۔ رات کو سونے سے قبل پنے دماغ کو سُست چھوڑ دینا اور میرا تصور اپنے ذہن میں تواتر سے دہراتے رہنا۔ جیسے تم مجھے اپنے اعصاب کے ذریعے مدعو کر رہے ہو۔ لیکن یاد رہے کہ تمہیں ٹھیک رات بارہ بجے سو جانا ہوگا۔'' میں نے گرو کو ٹٹولا۔ 'کیا تم پھر سے مجھ پہ ہپنا ٹائز کرنا چاہتے ہو، یا پھر ٹیلی پیتھی کا سہارا لو گے......'' گرو کچھ جھنجھلا سا گیا۔ ''جنہیں پنے چاہنے والوں کی دعاؤں اور خدا پر اتنا کامل یقین ہو...... انہیں ان ہپنا ٹزم یا ٹیلی پیتھی جیسے معمولی شعبدوں ے نہیں ڈرنا چاہیے......'' گرو میرے اندر کے ساحر کو جگا چکا تھا۔ اب مزید کسی دلیل یا وضاحت کی گنجائش باقی ہیں رہ گئی تھی۔ مما پپا کے واپس لوٹنے سے قبل میں اپنے کمرے کی ساری بتیاں بجھا کر بستر پر لیٹ چکا تھا۔ مما نے دھیرے سے کمرے میں جھانکا اور پھر میرا کمبل دُرست کر کے آہستگی سے پلٹ گئیں۔ میری نظریں گھڑی ی سیکنڈ کی سوئی کے ساتھ ساتھ سفر کرتے ہوئے بارہ کے ہندسے تک پہنچ گئیں۔ میں نے گرو کی ہدایت کے طابق اپنے ذہن کو بالکل آزاد چھوڑ رکھا تھا اور میری بار بار بند ہوتی پلکوں تلے گرو کی شبیہ وقفے وقفے سے بھرتی رہی۔ اور پھر ٹھیک بارہ بجے میری مکمل غنودگی سے پہلے میرے ذہن میں گرو کی وہ چبھتی آنکھیں بُری رح کھٹکنے لگیں۔ اور پھر مجھے یوں محسوس ہونے لگا، جیسے میں گرو کی آنکھوں ہی سے سارا منظر دیکھ رہا ہوں۔ وہ ک بہت بڑا سا ہال تھا، جس کی اُونچی دیواروں پر درجنوں وسیع روشن دانوں سے برف میں چٹکی چاندنی کی لکوں روشنی اس طرح اندر آرہی تھی کہ لکڑی کے پتلے تختوں سے بنے فرش پر چوکور نیلی روشنی کے مستطیل ٹکڑوں ے ایک دائرہ سا بن گیا تھا۔ دائرے کے درمیان میں یہودیوں کے مقدس نشان، داؤد کا ستارہ (David Star) بنا ہوا تھا، جس کے گرد دائرے میں گرو سمیت تیرہ لوگ اپنے سر، چہرے اور جسم کو بڑے بڑے کالے ڑوں سے ڈھکے ہوئے مؤدب کھڑے تھے۔ ان میں سے ہر ایک کے ہاتھ میں ایک چاندی کا پیالہ تھا، جس ں کی بھیڑ کا خون بھرا ہوا تھا۔ نیچے زمین پر بنے ہوئے ستارے کو میں نے غور سے دیکھا تو وہ باقاعدہ دھات ی پتلی نالیوں کو جوڑ کر بنایا گیا تھا۔ گرو نے دھیرے سے زیرِ لب عبرانی زبان میں کوئی آیت پڑھی۔ یوں لگتا ، جیسے وہ سب جس تقریب کے لیے یہاں جمع ہوئے ہیں، اُس کا وقت پورا ہونے کو ہے۔ گرو نے عبرانی بان میں زور زور سے قوم یہود پر مبعوث ہونے والے پیغمبروں کے عبرانی نام دہرانا شروع کر دیے۔ ''میکا 'عاموس، یرمیاہ، جون، یوحنا......'' پھر سب سے پہلے گرو اور پھر اُس کی تقلید میں باقی سب چغہ پوشوں نے

اپنے اپنے پیالے کا خون زمین میں کھدے آہنی داؤدی ستارے کے بالائی کونے میں اُنڈیل دیا۔ خون تیزی سے چھ کونوں کی جانب یوں دوڑا کہ ترتیب وار پہلے کونے سے دوسرا کونا، پھر تیسرا اور پھر چوتھا۔ مجھے احساس ہوا کہ زمین میں ستارہ کھود کر اُس میں چکنا فولاد اس طرح بھر گیا ہے کہ کسی بھی سیال مادے کو بہنے میں کوئی دقت نہ ہو۔ اور ستارے کو خاص طور پر اس طرح ڈھلان کی ایک سمت دی گئی ہے کہ اس کی ہموار فولادی نالیوں میں اُنڈیلا جانے والا مائع پہلے کونے سے ہوتا ہوا ترتیب وار اور یکے بعد دیگرے باقی پانچ کونوں تک یوں بہتا ہے کہ چھٹا کونا چھوتے ہی داؤدی ستارہ مکمل ہو جائے۔ لیکن آج نہ جانے کیا بات تھی کہ نالیوں میں بہایا جانے والا خون رُک رُک کر آگے بڑھ رہا تھا، جیسے کوئی اَن دیکھی رُکاوٹ اس کی راہ میں مزاحم ہو۔ سب ہی چغہ پوشوں نے بے چینی سے ایک دوسرے کی طرف دیکھا اور پھر جیسے گرو کو اِس مزاحمت کی وجہ سمجھ آ گئی۔ اُس نے زیرلب کچھ پڑھ کر ایک جھٹکے سے آنکھیں بند کر لیں اور ٹھیک اُسی لمحے میرے ذہن کے چلتی وہ فلم بھی ایک دم یوں غائب ہو گئی، جیسے کسی سینما کی اسکرین پر ریل کا فیتہ ٹوٹ جانے سے سب کچھ پل بھر میں مٹ جاتا ہے۔ یا کسی ٹی وی کا پردہ بجلی جانے سے ایک چمک کے بعد سیاہ پڑ جاتا ہے۔ گرو کی آنکھیں بند ہوتے ہی کھٹ سے میری آنکھ کھل گئی۔ باہر ہوتی طرف باری اور شدید ٹھنڈ کے باوجود میرا جسم پسینے سے تر تھا۔ کچھ دیر تو مجھے سمجھ ہی نہیں آیا کہ میں پہلے عالم خواب میں تھا یا اب کوئی خواب دیکھ رہا ہوں؟ باہر گرتی برف کے گالوں کا حجم اور ان کی رفتار، دونوں ہی زیادتی کی جانب مائل تھے۔ بارش کے موسم اور برف باری میں یہی ایک بنیادی فرق ہوتا ہے۔ بارش بے صبری ہوتی ہے، چیختی چلاتی، شور مچاتی، سارے آنگن کو سر پر اُٹھا لینے والی، جب کہ برف صابر ہوتی ہے، خاموشی اور سکون سے برسنے والی۔ ایک سکوت سا طاری کر کے مبہوت کر دینے والی...... مجھے اس لمحے نہ جانے ایسا کیوں لگا کہ بارش اگر ''عاشق'' ہے تو برف ''معشوق''...... کہ دونوں کا مزاج خود اُن کی درجہ بندی کا آئینہ ہے۔ رفتہ رفتہ صبح کا سپیدہ نمودار ہونے لگا۔ ایسا لگتا تھا جیسے میرے کمرے کی کھڑکی کے شیشوں پر کوئی تازہ سفید قلعی پھیر گیا ہو۔ مما پپا سے پہلے امی نے میرے کمرے میں جھانکا۔ ''لندن کی خوبصورت برفیلی صبح بخیر......'' میں مسکرایا۔ ''ڈاکٹر البرٹ جانتے ہیں کہ مسیحا گری کی ابتدا خوبصورت لفظوں اور ایک بھرپور مسکراہٹ سے ہوتی ہے۔ اور اس کے لیے انہوں نے ٹیم بھی خوب چنی ہے۔'' امی بھی ہنس دی۔ اس کے انداز سے لگتا تھا کہ وہ مجھ سے کوئی بہت ضروری بات کرنا چاہتی ہے، لیکن پہلے مما پھر پپا اور پھر ڈاکٹر البرٹ کی آمد نے اُس کا مقصد پورا نہیں ہونے دیا۔ ڈاکٹر البرٹ نے میرے معائنے کے بعد اطمینان سے سر ہلایا۔ ''بہترین...... لگتا ہے تم نے بہت جلد ہمیں الوداع کہنے کی تیاری کر رکھی ہے نوجوان...... اِسے جاری رکھو۔'' امی وہاں کچھ دیر مزید رکنا چاہتی تھی، لیکن البرٹ نے کمرے سے نکلتے وقت کچھ کام بتائے، مجبوراً اُسے بھی ڈاکٹر کے ساتھ ہی وہاں سے جانا پڑا۔ انہیں نکلے ہوئے ابھی دو منٹ بھی نہیں ہوئے ہوں گے کہ گرو اپنے مخصوص حلیے میں کمرے میں داخل ہوا۔ مما کی تیوریاں چڑھنے سے پہلے ہی میں نے پپا کو نظروں نظروں میں

دوسرے کمرے میں لے جانے کی درخواست کی۔ پپا نے مسکرا کر پائپ کا ایک بھرپور کش لیا اور کسی ے مما کو وہاں سے لے کر اُٹھ گئے۔ گرو نے بات جوڑنے میں دیر نہیں کی۔ ''کیا مجھے گزشتہ رات کی دُہرانے کی ضرورت ہے، یا ہم اگلی بات کریں؟'' ''تو گویا رات میں نے جو کچھ بھی دیکھا، وہ خواب نہیں رو کا کوئی شعبدہ تھا۔ اس لمحے مجھے شدت سے سلطان بابا کی یاد آئی۔ اگر وہ مہینوں میری اتنی سخت تربیت نہ تے تو آج میں گرو کے اس پہلے حملے ہی میں چاروں خانے چت ہو چکا ہوتا، لیکن میں یاقوتِ سے لے کر ت تک جانے ایسی کتنی انہونیاں جھیل چکا تھا۔ اطمینان سے تکیے سے ٹیک لگا کر گرو کو دیکھتا رہا۔ ا...... میں نے رات کو وہ سب کچھ دیکھا، جو تم مجھے دکھانا چاہتے تھے۔ لیکن مجھے یہ بات سمجھ نہیں آئی کہ تم چانک چلتی ہوئی فلم کی ریل کیوں کاٹ دی؟'' اب چونکنے کی باری گرو کی تھی۔ ''گویا تم سمجھ گئے تھے کہ نے جان بوجھ کر تم سے اپنا ذہنی رابطہ ختم کر دیا تھا۔ دراصل تمہاری وہاں موجودگی سے ہماری عبادت میں پڑ رہا تھا۔'' ''لیکن میں تو یہیں تھا...... اپنے کمرے میں......'' گرو مسلسل مجھے گھور رہا تھا۔ ''اس کمرے میں تمہارا جسم موجود تھا، لیکن تم اتنے خطرناک ہو کہ تمہاری صرف میرے ذہن میں موجودگی بھی ہماری ت میں رُکاوٹ کا باعث بن رہی تھی۔ اِسی لیے مجھے تم سے رابطہ توڑنا پڑا۔'' گرو نے مجھے بتایا کہ رات جو میں نے اپنے ذہن کے پردے پر چلتے ہوئے دیکھی، اُسے قدیم عبرانی زبان میں ''مقدس بہاؤ'' اور بزی میں ''پوراوور'' (Pour over) کہتے ہیں۔ صدیوں پہلے قوم یہود کے تیرہ معزز خاندانوں کے راہ بھیڑ کی مقدس قربانی کے بعد تبرک کے طور پر بھیڑ کا خون سات دن تک اپنے گھر کے دروازے پر لگا کر تے تھے اور پھر ساتویں دن ایک بہت بڑے جشن کی صورت میں اس رسم کا خاتمہ ہوتا تھا۔ بقول گرو قدامت یہودیوں میں یہ رسم اب بھی کسی نہ کسی صورت موجود تھی۔ اور کل رات میں نے جو منظر دیکھا، وہ دراصل ویں دن کے خاتمے پر اُسی پوراوور کی رسم کی اختتامی تقریب تھی۔ جس وقت گرو سرگوشی میں مجھے یہ ساری بلات بتا رہا تھا، تب امی نے دوبار وقفوں سے میرے کمرے میں جھانکا اور نظروں نظروں میں کسی ناراض ل کی طرح ڈانٹا کہ میں اُس کے منع کرنے کے باوجود، کیوں اس شخص کے ساتھ دوبارہ بات کر رہا ا؟ وہ مما سے بہت چھوٹی تھی، لیکن نہ جانے کیوں اس لمحے مجھے اُس میں مما ہی کی جھلک دکھائی دی۔ شاید لائے بزرگیت'' سب ہی جگہ یکساں ہوتی ہے۔ اب میں امی کو کیا بتاتا کہ اسکول اور کالج میں بھی مجھے ہمیشہ سے زیادہ تجسس اور بات کرنے کی خواہش اُسی بچے سے ہوتی، جس سے بات کرنے یا کھیلنے سے مجھے مما کیا کرتی تھیں۔ لیکن امی کو مجھے باقاعدہ ڈانٹنے کا موقع سہ پہر کی چائے کے بعد ہی مل سکا۔ جب مما اور پپا ئے کے لیے نیچے جا چکے تھے۔ ''لڑکے...... میں نے تمہیں منع کیا تھا نا، اس گرو کے ساتھ بات کرنے ے؟'' مجھے اُس کے انداز پر ہنسی آ گئی۔ ''آخر آپ اُس شخص سے اس قدر خفا کیوں ہیں؟ بظاہر تو مجھے وہ کافی ا لکھا اور شائستہ اطوار کا دکھتا ہے......'' امی کو غصہ آ گیا۔ ''اس کا یہی علم نہ جانے کتنے گھروں کے بچوں کی

زندگی برباد کر چکا ہے۔ میں ڈرتی ہوں، کہیں وہ اپنا سحر تم پر بھی نہ آزما بیٹھے......'' گویا ایمی کو بھی گرو کے کمالات
کی کچھ خبر تھی۔ اُس نے جلدی میں مجھے بتایا کہ آج کل لندن کے اعلیٰ طبقے میں گرو کا کافی اثر و رسوخ ہے
اس نے ایک بہت مہنگے علاقے میں اپنا نروانا ہاؤس (Nirvana House) بھی بنا رکھا ہے، جہاں وہ ہر ہفتہ
اپنے درجنوں پیروکاروں کو سکون حاصل کرنے کے گر بتاتا ہے۔ ان ہی نوجوان شیدائیوں میں ایمی کا اپنا بھائی
پیٹر بھی شامل تھا، جو بقول ایمی گرو سے ملنے کے بعد باقاعدہ اُس کا غلام ہو کر رہ گیا تھا۔ اور اپنا گھر بار چھوڑ کر
اب سارا دن گرو کی خدمت ہی میں لگا رہتا تھا۔ ایمی مجھے ابھی اتنا ہی بتا پائی تھی کہ باہر کی راہ داری کے اسپیکر
کسی ایمرجنسی کے لیے ایمی کا نام پکارا جانے لگا۔ ایمی کو جلدی میں جانا پڑا۔ باہر سہ پہر تک تھمی برف باری پھر
سے ہلکے گالوں کی صورت آغاز کی تیاری کر رہی تھی۔ گرو جاتے وقت مجھے شام 5 بجے نیچے نہر کی جانب آنے کا
کہہ کر گیا تھا، لیکن مجھے اپنی مددگار نرس کو منانے میں بہت دیر لگی کہ وہ مجھے کچھ دیر کے لیے کھلی ہوا میں لے
جائے۔ میں نیچے پہنچا تو مجھے دُور سے گرو اپنے لمبے جوتوں سمیت برف کے میدان میں لمبے لمبے ڈگ بھرتا ہوا
جانب آتے نظر آیا۔ اُس کا حلیہ بتا رہا تھا کہ وہ بہت دیر سے برف میں کھڑا میرا انتظار کر رہا ہے۔ نرس کچھ فاصلے
پر رُک گئی۔ گرو نے میرے قریب پہنچ کر میری وہیل چیئر پر اپنی چھتری تان لی۔ ''اچھا ہوا تم آگئے۔ میرا تم سے
وعدہ تھا کہ میں تمہیں ایک ایسا راز بتاؤں گا، جسے پانے کے لیے دنیا صدیوں سے انتظار کر رہی ہے۔'' میں نے
اپنی پلک پر برف کے ایک موٹے گالے کی نمی محسوس کی۔ ''میں سننے کے لیے تیار ہوں......'' گرو نے عجب
سے لہجے میں سرگوشی کی۔ ''تو پھر سنو...... میں جانتا ہوں کہ وہ دن، جسے تم مسلمان روزِ حساب کہتے ہو...... اور
جس ''قیامت'' کا انتظار یہ زمانہ ازل سے کر رہا ہے...... مجھے خبر ہے کہ وہ 'قیامت' کب آئے گی......؟''

21 دسمبر 2012ء

میں گرو سے باقی کسی بھی بات کی توقع کر سکتا تھا لیکن اُس نے قیامت کا ذکر چھیڑ کر مجھے چونکا ہی دیا
یا مطلب......؟'' ''مطلب یہ کہ میں تمہیں قیامت کی صحیح تاریخ بتا سکتا ہوں، کیوں کہ میرے حساب سے
مت آنے کی تمام نشانیاں ظہور پذیر ہو چکی ہیں۔'' برف ہمارے چاروں طرف یخ بستہ قلعے کی فصلیں کھڑی
ر رہی تھی۔ سرد ہوا نے میرے جسم کو کاٹنا شروع کر دیا تھا۔ ''تم کن نشانیوں کی بات کر رہے ہو؟'' ''لاتعداد
انیاں ہیں۔ جن میں سے بیشتر کا ذکر ایک ذہین نجومی 'ناسٹراڈیمس' صدیوں قبل کر چکا ہے مثلاً چار فولادی
روں کا عظمت کے دو میناروں سے ٹکرانا (نائن الیون)، یہودیوں کو اپنی مادرِ ملت (اسرائیل) کا واپس ملنا،
ری دنیا پر یہود کا قبضہ ہونا (ڈالر اور بینک سودی نظام) وغیرہ وغیرہ۔ اب بس ایک آخری نشانی باقی ہے۔
لیم دجال کی آمد اور یہود کی آخری فتح اور میرے عمل کے مطابق یہ سمندروں میں بہت پہلے ہو چکی ہے۔ اب
رف لدگشت کے مقام پر اُن کا ظہور باقی ہے اور پھر قیامت اٹل ہے......'' میں گم صم سا گرو کی یہ ساری بحث
نتا رہا۔ اب مجھے ایمی کے کہے ہوئے لفظ 'صیہونی'' کی اصل تشریح سمجھ آ رہی تھی۔ مجھے یاد آیا کہ ایک بار جبل
میں سلطان بابا نے بھی قیامت کے آثار اور اُس کی واضح نشانیوں کے بارے میں بہت تفصیل سے بتایا تھا
ن ہمارے عقیدے کے مطابق ابھی حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا ظہور باقی تھا اور گرو جس فتح کو یہود کی آخری
بتا رہا تھا وہ دراصل ہمارے ایمان کی فتح کا وقت تھا۔ مجھے اس لمحے اُس آخری لڑائی کا نام بھی یاد آ گیا جسے
ود'' آرما گیڈون'' (Armageddon) کے نام سے یاد کرتے تھے اور جس میں ایک فوج کے اسّی
(جھنڈے) بتائے جاتے تھے۔ برف باری تیز ہو چکی تھی اور گرو کا پورا جسم برف سے ڈھک چکا تھا۔ اُس
نے مجھ پر تانی ہوئی چھتری کو زور سے جھٹکا، جو برف کے بوجھ کی وجہ سے تقریباً چٹخنے ہی والی تھی۔ چھتری ہٹتے
برف کے موٹے گالوں نے میرے بالوں میں چاندی بھر دی۔ میں نے غور سے گرو کی چبھتی آنکھوں میں
انکا۔ ''کیا ہے وہ تاریخ؟'' گرو دریائے ٹیمز سے بھی پرے خلا میں برستی برف کے ستاروں کے پار کسی اَن
بھی مخلوق کو دیکھتے ہوئے بولا ''21 دسمبر 2012'' کیا۔ اتنی جلدی؟ یعنی صرف تین سال بعد،'' ہاں میرا علم
ی کہتا ہے۔ اور یہی وہ پیغام ہے جو میں اپنے سب ہی چاہنے والوں میں عام کر رہا ہوں کہ آنے والے وقت
تیاری کر لو، وقت بہت کم ہے۔'' گرو واپس پلٹا اور ٹخنوں سے ذرا اُونچی پڑی برف میں اپنے قدموں کے
ثان بناتا برف کی دُھند میں کہیں غائب ہو گیا، لیکن میرے وجود کے اندر جو دُھند چھوڑ گیا تھا، وہ اس باہر کے

کہرے سے کہیں زیادہ گہری تھی۔

مجھے اُس لمحے سلطان بابا کی شدت سے یاد آئی۔ ساری رات یہی سوچتے ہوئے گزر گئی کہ یہ نئی جنگ اُن کے بنا میں کیسے لڑپاؤں گا۔ پھر نہ جانے کس پہر کچھ دیر کے لیے میری آنکھ لگی تو نیند میں بھی میرے خوابوں کو اس گہری سفید دُھند نے ڈھانپ رکھا تھا اور پھر اچانک اِسی دُھند میں سے دُودھیا سفید لباس پہنے چھوٹے چھوٹے قدم اُٹھاتے لبوں پر وہی اپنی ازلی اور مخصوص مسکراہٹ سجائے سلطان بابا نمودار ہوتے چلے گئے۔

"کیوں میاں! پھر اُلجھا بیٹھے اپنے دھاگے کہیں......؟" مجھے شدید حیرانی کے ساتھ بے پایاں خوشی کا احساس بھی ہو رہا تھا۔ "آپ کہاں رہ گئے تھے مجھے یہاں تنہا چھوڑ کر۔ آپ جانتے ہیں ایک قدم بھی آپ کے بنا اُٹھانا دوبھر ہو جاتا ہے میرا......؟" وہ میرے قریب آ کر کھڑے ہو گئے۔ "موجودگی صرف جسمانی ہی تو نہیں ہوتی۔ اور پھر اب تمہاری تربیت مکمل ہونے کو ہے۔ اب تمہیں تنہا فیصلے کرنے کی عادت ڈالنا ہوگی ساحر میاں......" میں شدید پریشان ہو کر بولا "آپ آج یہ کیسی باتیں کر رہے ہیں کیا آپ کہیں جا رہے ہیں......؟"

"سب ہی کو جانا ہے، کوئی پہلے اور کوئی بعد میں۔ سب ہی اسی رستے کے مسافر ہیں۔ لیکن یاد رہے کہ جانے والوں کے ساتھ کاروبارِ زندگی رُک نہیں جاتا اور پھر جب جسم دُور ہو جائیں تو رُوحیں مزید قریب ہو جاتی ہیں۔ عبداللہ کو خود کو سلطان کا جانشین ثابت کرنا ہوگا۔ جیتے رہو۔" سلطان بابا نہ جانے اچانک ہی اُس دُھند میں کہاں کھو گئے اور میری آنکھ کھل گئی۔ یہ کیسا خواب تھا۔ میرا دل اتنی زور سے دھڑک رہا تھا، جیسے ابھی پسلیوں کا کمزور پنجر توڑ کر باہر نکل آئے گا۔ فجر کا وقت ہو رہا تھا۔ میں ایک جھٹکے سے اُٹھ بیٹھا۔ میری یادداشت میں دریائے ٹیمز یا ویسٹ منسٹر پل کے علاقے میں کوئی بہت بڑی مسجد نہیں آ رہی تھی، لیکن میرے کانوں میں اذان کی واضح آواز پہنچ رہی تھی۔ بے خیالی میں وہیل چیئر کے بجائے بستر کے قریب رکھی اسٹیل کی بیساکھیاں تھام کر کھڑا ہو گیا۔ میرے ذہن میں اس وقت صرف وضو کر کے فجر کی نماز ادا کرنے کا خیال سمایا ہوا تھا۔ بہت دیر بعد مجھے خیال آیا کہ میرے بے جان قدم اور مفلوج ٹانگیں آج میرا بوجھ سنبھالنے کے قابل ہو چکی ہیں۔ چاہے بیساکھی کا سہارا اب بھی درکار تھا، مگر یہ بیساکھیاں ڈاکٹر البرٹ نے دو روز قبل صرف ناپ لینے کے لیے منگوائی تھیں اور اُن کی تشخیص کے مطابق مجھے ابھی اپنے قدموں پر بوجھ ڈالنے کے لیے مزید کئی ہفتے درکار تھے۔ بقول ایمی، جب اُس نے البرٹ کو صبح کے معائنے سے قبل اُن کے دفتر میں یہ خبر سنائی تو اُن کے ہاتھ میں پکڑا اسٹیتھ گر گیا اور وہ بھاگتے ہوئے میرے کمرے میں پہنچ گئے۔ "کیا تم نے ہمیں مستقل حیرت زدہ کرنے کا منصوبہ بنا رکھا ہے نوجوان......؟" ڈاکٹر البرٹ بہت دیر تک اپنی ٹیم کے ساتھ میرے مختلف ٹیسٹ اور معائنے کرتے رہے۔ "ناقابلِ یقین...... اگر یہ صرف قوتِ ارادی کا کمال ہے تو پھر مجھے کہنا پڑے گا کہ تم آہن سے بھی کہیں بڑھ کر مضبوط اعصاب کے مالک ہو۔" مما پاپا بھی بے حد خوش تھے۔ لیکن میرا دھیان ابھی تک رات والے خواب میں اُلجھا ہوا تھا۔ دل بار بار ڈوبا جاتا تھا لہٰذا ڈاکٹروں کے جاتے ہی میں نے اپنے سامنے پاپا

کے ہسپتال کا نمبر ملانے کا کہا، جہاں سلطان بابا داخل تھے۔ وہاں کے بڑے ڈاکٹر کی بات سن کر میرا انک گیا۔ انہوں نے بتایا کہ کل رات سلطان بابا کی طبیعت بہت خراب ہونے لگی تو انہیں مصنوعی کے لیے آکسیجن پر منتقل کر دیا گیا ہے۔ میرا بس نہیں چل رہا تھا کہ میں کسی طرح اُڑ کر واپس اپنے شہر پہنچ مجھے سلطان بابا نے ہمیشہ یہی سبق دیا تھا کہ دنیا میں سب سے زیادہ فانی یہ انسانی جسم ہی ہوتا ہے اور خاتمہ ہی اصل زندگی کی ابتدا ہے۔ لیکن ہم انسانوں کو ازل سے ابد تک اِسی فانی جسم کی محبت ہی میں مبتلا یا ہے۔ ہم اس کی جدائی کسی صورت برداشت نہیں کر سکتے، پھر چاہے وہ جسم ہمارا اپنا ہو یا پھر ہمارے کسی ...... سب کچھ جانتے ہوئے بھی کسی کو کھو دینے کا احساس ہی ہماری سانسیں گھونٹنا شروع کر دیتا ہے۔ زندگی بھر جی کر بھی جینے کا ظرف تو خود میں پیدا کر نہیں پاتا، تو پھر ایک "اجنبی موت" کو گلے لگانے کا کہاں سے لائے گا۔ مجھے جب ڈاکٹر البرٹ نے یہ بتایا کہ فی الحال میں ہوائی سفر کے قابل نہیں تو مجھے بے بسی پر شدید غصہ آیا اور چند لمحوں کے لیے جانے مجھے ایسا کیوں لگا کہ دراصل ہمارا یہ جسم خود ہماری راہ ب سے بڑی رُکاوٹ ہے۔ میں اِسی خیال میں بیساکھیاں ٹیکتا شیشے کی چھت اور شفاف دیواروں والی راہداری میں نکل آیا، جو ایک لمبی سی سرنگ یا ٹیوب کی مانند بہت دُور تک پھیلی ہوئی تھی اور جس کی دیواروں یک جانب بہت سے زرد رنگ کے پلاسٹک کے بنچ نما تختے درجنوں کی تعداد میں جڑے ہوئے تھے۔ ہسپتال کے مریض باہر موسم کی دست برد سے محفوظ رہتے ہوئے تختوں پر بیٹھ کر باہر ہوتی بارش، برف یا دنوں کی دھوپ کا مزا لے سکتے تھے لیکن اس وقت شیشے کی چھت اور کانچ کی دیواروں کے پرے کا ہر منظر میا تھا۔

تب ہی میری نظر سامنے سے آتے گرو پر پڑی۔ مجھے دیکھتے ہی اُس کی آنکھوں میں چمک لہرائی۔ "میں یں ہی ڈھونڈ رہا تھا۔ تو تم نے ایک بار پھر یہاں سب کو چونکا ہی دیا۔ تمہارے اندر جو بھی چھپا ہے۔ اُسے ساتھ ہی سب پر ظاہر کیوں نہیں کر دیتے؟ یہ کھیل کیوں کھیل رہے ہو؟" گرو کافی غصے میں لگ رہا تھا۔ نہ نے اُس نے اپنے اندر یہ رقابت کیوں پال رکھی تھی۔ لیکن آج میں پہلے ہی سلطان بابا کی وجہ سے شدید ذہنی ؤ کا شکار تھا لہٰذا بہتر یہی سمجھا تھا کہ اُسے کوئی جواب دیئے بنا ہی آگے بڑھ جاؤں۔ لیکن دو قدم ہی آگے ھا تھا کہ پیچھے سے گرو کی آواز نے پھر میرے قدم جکڑ لیے۔ "کیوں خود پر سے بھروسا اُٹھ گیا ہے یا پھر اپنے حانی اُستاد کی ناکامی کا ڈر ہے......؟" مجھے یوں لگا جیسے عبداللہ کے وجود کا ہر بند کواڑ توڑتے ہوئے ساحر باہر ل کر گرو کے سامنے آ کر کھڑا ہو گیا ہے۔ میں نے بڑی مشکل سے اپنی بلند ہوتی آواز کو دھیما رکھنے کی کوشش "تم میں اور مجھ میں یہی بنیادی فرق ہے۔ تم جسے شعبدہ سمجھتے ہو، وہ میرے لیے ایک معجزہ ہے۔ تم جس ہنر پانے کے لیے جانے کتنی صدیوں سے سرگرداں ہو میرے نزدیک وہ دعا کی صورت پل بھر میں قبول ہو سکتا ہ بات صرف یقین کی ہے۔ اٹل یقین...... لیکن افسوس تم نے سب کچھ سیکھ کر بھی یقین کرنا نہیں سیکھا......

اور شاید اِسی لیے تم اس قدر خوف زدہ ہو......'' گرو میری بات سن کر دھیرے سے مسکرایا ''نہیں...... میں ک
سے خوف زدہ نہیں ہوں۔ میں نے ابدیت کا راز پالیا ہے۔ پھر مجھے بھلا کیسا خوف؟ ڈرنے کی ضرورت تو
جیسوں کو ہے، جنہیں آنے والے خطرے کا ادراک ہوتے ہوئے بھی کبوتر کی طرح آنکھیں موند لینے
عادت ہے۔'' میں نے غور سے گرو کی طرف دیکھا۔ ''مجھے صاف صاف کہو تم چاہتے کیا ہو......؟'' گرو
چہرے کا تناؤ بڑھتا جا رہا تھا۔ ''میں صرف اتنا چاہتا ہوں کہ تم اپنی شخصیت کے گرد لپٹے یہ سارے نقا
اُتار دو۔ پہلے پہل تو میں واقعی تمہیں کوئی چھوٹا موٹا شعبدے باز ہی سمجھا تھا لیکن اُس رات عبادت کے دورا
جب تم نے ہم سب کا ارتقا توڑنے کی کوشش کی، تب مجھے سنجیدگی سے تمہارے بارے میں سوچنا پڑا۔ تم ا
واقعی 'اس' ابدی راہ کے مسافر ہو تو مجھ سے نہ چھپاؤ۔ میں تمہیں منزل تک پہنچانے کا وعدہ کرتا ہوں۔'' گرو
باتیں حسب معمول اُس کی شخصیت کی طرح اُلجھی ہوئی تھیں لیکن آج میں نے اُسے ٹٹولنے کا حتمی فیصلہ کر
تھا۔ ''اور اس ابدی منزل کو پانے کے لیے مجھے کیا کرنا ہوگا؟ ظاہر ہے تم یہ سب کسی صلے کی اُمید ہی م
کرو گے۔'' گرو مجھے راستے پر آتا دیکھ کر مطمئن سا ہو گیا۔ ''تمہاری ذہانت پر مجھے پہلے بھی کوئی شبہ نہیں تو
لیکن بے فکر رہو، مجھے تم سے کوئی دنیاوی صلہ نہیں چاہیے، میرا مقصد مقدس ترین ہے۔ دراصل ہمارا مشن ہی د
کے اعلیٰ دماغوں کو اپنے ساتھ شامل کرنا ہے اور پھر تم تو یوں بھی میرے لیے بہت قیمتی ہو، کیوں کہ تمہارے پا
دوسروں سے کچھ سوا ہے۔ تم اگر میرے دائرے میں شامل ہو جاؤ تو میں تم سے 'ابدی سکون' کا وعدہ کرتا ہوں
وہی ابدی سکون جس کی تلاش میں دنیا کا ہر ذی رُوح ازل سے بھٹک رہا ہے اور ابد تک سرگرداں ہی رہے گا
بولو منظور ہے میری پیش کش......؟'' گرو اُمید طلب نظروں سے میری جانب دیکھ رہا تھا۔ اب میری سمجھ م
بات کچھ کچھ آنے لگی تھی۔ گرو چاہتا تھا کہ میں اُس کے گروہ میں شامل ہو کر اُس کے نظریے کا پرچار کروں
میری دن بدن تیزی سے بہتر ہوتی حالت کو وہ اب بھی میرے کسی خاص علم یا شعبدے سے محمول کر رہا تھا۔ ا
مجھے پہلے ہی بتا چکی تھی کہ گرو اپنی رہائش گاہ ہی پر باقاعدہ ایسی محافل کا انعقاد کرواتا تھا، جہاں اُس کی شخصیت
اور تعلیمات سے متاثر طبقہ حاضر ہو کر وہ صرف اُسے سنتا اور سراہتا بلکہ اس کے گروہ کے رُکن باقاعدگی سے گر
کی رُوحانی تعلیمات کا پرچار بھی کرتے اور لوگوں کو اپنی جماعت میں شمولیت کی دعوت بھی دیتے تھے۔ اس
لیے گرو کے فدائین کی تعداد میں روز بہ روز اضافہ ہو رہا تھا، لیکن گروہ کا اصل نظریہ آخر کیا تھا؟ یہ بات ابھی تک
میرے لیے ایک معمار ہی تھی۔ اتنا تو میں جان چکا تھا کہ اُسے کامل یقین تھا کہ 21 دسمبر 2012ء کو قیامت بر
ہونے والی ہے اور بظاہر وہ اپنی تعلیمات کے ذریعے آس پاس کے لوگوں اور خاص طور پر نوجوان نسل کو آنے
والے وقت کے لیے تیاری کا سبق دیتا تھا، لیکن نہ جانے کیوں مجھے ایک زاویے سے بہت آسان اور سادہ
دکھائی دینے والی گرو کی یہ مہم بے حد پیچیدہ اور پُراسرار دکھائی دے رہی تھی۔ یہاں مغرب کو لوگوں کو اپنے
نظریات کے پرچار کی کھلی آزادی تھی تاوقتیکہ کسی کا نظریہ ریاست کے قوانین سے نہ ٹکرائے، اس لیے لندن

ہائیڈ پارک میں تقریباً روزانہ ہی بھانت بھانت کی بولیاں سنائی دیتی تھیں۔ کوئی دنیا سے مشینوں کے خاتمے
کی مہم چلا رہا ہے تو کسی کو چاند پر بکنے والے پلاٹوں سے اختلاف تھا، کوئی ہم جنس پرستوں کا پیشوا تھا تو کوئی
دنیا سے ویزا پابندی کے خاتمے کے لیے بھوک ہڑتال کیے بیٹھا رہتا تھا۔ ایسے میں گرو اگر کھلے عام اپنے
نظریے کا پرچار کر رہا تھا تو یہ کوئی انہونی نہ تھی۔ میں نے تو لندن میں ایسے گروہ بھی دیکھے تھے جو حکومت
سے علانیہ اجتماعی خودکشی'' کو جائز قرار دینے کے لیے قانونی جنگ شروع کرنے کی تیاری میں تھے۔ اس لحاظ
سے لندن کے معاشرے میں گرو کی ''تعلیمات'' کو خاصی عزت کی نگاہ سے دیکھنے والوں کو بھی کمی نہ تھی۔ ایک
طبقہ ایسا بھی تھا، جس نے گرو کو باقاعدہ ''رُوحانی دیوتا'' کا درجہ دے رکھا تھا اور انہی سرپھروں میں ایمی
کا بھائی پیٹر بھی شامل تھا۔

باہر گرتی برف کے گالے بڑے ہو گئے تھے اور ایسے میں اگر کوئی دُور سے مجھے اور گرو کو اس شیشے کی
ٹیوب میں کھڑا دیکھتا تو اُسے یہ جگمگاتی بقعہ نور بنی راہ داری بالکل ایسے ہی دکھائی دیتی، جیسے برف سے
دودھیا سمندر میں روشنیوں سے بھرا کوئی لشکارہ تیر رہا ہو۔ راہ داری کی اندرونی حدت کی وجہ سے شیشے کی
ں اور بیضوی چھت پر برف جم نہیں پا رہی تھی اور مستقل پگھل کر یوں بہہ رہی تھی، جیسے ہم کسی شیشے کے
ں بند گہرے دریا میں ڈوب رہے ہوں۔ اتنے میں اچانک اسپیکر پر ڈاکٹر البرٹ کی آواز گونجی۔ وہ گرو کو
ریض کی درخواست پر 'ریکی' کے لیے خصوصی کمرہ نمبر 137 میں طلب کر رہے تھے، کیوں کہ یہ گرو کے
کے دورے کے مخصوص اوقات تھے۔ سو، اُس نے ایک لمبی سی سانس لی۔ ''مجھے تمہارے جواب کا
رہے گا۔ مجھے اُمید ہے تم اس 'سچ کے سفر' میں میرا ساتھ دینے سے انکار نہیں کرو گے۔'' وہ اپنی بات ختم
، لمبے لمبے ڈگ بھرتا وہاں سے آگے بڑھ گیا۔ شام تک میرا ذہن گرو کی شخصیت کی بھول بھلیوں میں اُلجھا
جانے اس بار قدرت کو میرا کون سا امتحان مقصود تھا۔ مجھے اپنی کوئی پروا نہیں تھی، لیکن میں اس اجنبی دیس
اپنے والدین کو مزید کسی نئی اُلجھن میں نہیں ڈالنا چاہتا تھا۔ پہلے ہی وہ دونوں میری وجہ سے انتہائی پریشان
ن میرے چاہنے اور نہ چاہنے سے بھلا کیا فرق پڑتا تھا۔ کبھی کبھی تو مجھے یوں لگتا تھا جیسے کاتب تقدیر نے
قسمت کی سیاہی کچھ زیادہ گاڑھی بنا ڈالی تھی۔ شام ہوتے ہی زہرا کی یاد کا پھندا پھر سے میری شہ رگ
گھونٹنے کے لیے اپنے بل کسنے لگا۔ ہمارے تھکے ہوئے بے دم پھیپھڑے اپنا پورا زور لگا کر تازہ ہوا کی ایک
اپنے اندر اُتارنے کے لیے بے تابی سے پھڑپھڑاتے ہیں لیکن عشق کی ڈالی ہوئی خاک ہمارے سانس
کے تمام راستے پہلے ہی مسدود کر چکی ہوتی ہے۔ ایسے میں انسان جتنا بے چین ہو کر ایڑیاں رگڑتا ہے، اُتنی
ہی اُسے اذیت ہوتی ہے۔ جان رُک رُک کر نکلتی ہے۔ ایسے میں فدا ہونے کا بہترین کلیہ یہی ہے کہ
سانس لینے کی اور دم کھینچنے کی ہر کوشش ترک کر دی جائے اور محبت کو اپنی رگوں سے زندگی نچوڑ کی اجازت دے
دی جائے۔ سو میں نے بھی زہرا کی یاد کے پھندے کو اپنی شہ رگ کے ساتھ بے حد مضبوطی سے لپٹنے دیا۔ شاید

میرا مقدر یہی یادوں کی امر بیل تھی، کیوں کہ جس کی ذات سے ان یادوں کی ڈور بندھی تھی، وہ تو نہ جانے
جا چھپی تھی۔ وسوسے محبت کا آئینہ ہوتے ہیں، میری چاہت بھی انہی وسوسوں کے عکس کا شکار ہو رہی تھی۔
کہتا ہے کہ محبت دنیا کا مضبوط ترین جذبہ ہے۔ میں نے شروع سے لے کر آخر تک اسے تارِ عنکبوت ہی پایا۔
بدنامیاں، رُسوائیاں، ناکامیاں، درد، تڑپ، کسک اور جلن ہی عاشقوں کا سدا سے مقدر ہے اور لندن کی
کالی سیاہ رات جیسی نہ جانے کتنی سیاہ راتیں اس مقدر کو رونے کے لیے اپنی زلفیں کھولے ہم جیسوں کا انتظار
کرتی ہیں۔ مجھے بھی ایسی ہی ایک اور رات جھیلنا ابھی باقی تھا۔

اگلی صبح ایمی میری دواؤں کی فہرست مکمل کرنے کے لیے آئی تو اُس کے چہرے پر معمول کی رونق
سے بہت کم تھی۔ کچھ چہرے اتنے روشن ہوتے ہیں کہ ہلکا دھیما پن بھی اُن کی پوری شخصیت کو بجھا کر رکھ دیتا
ہے۔ کچھ ایسا ہی معاملہ ایمی کے ساتھ بھی تھا۔ میرے بے حد اصرار پر وہ رندھی ہوئی آواز میں صرف اتنا
بتا پائی کہ اُس کے چھوٹے بھائی پیٹر کو گزشتہ رات خون کی دو بوتلیں چڑھائی گئی ہیں، کیوں کہ وہ گزشتہ کئی دنوں
سے چوری چھپے کسی "مقدس عبادت" کے لیے اپنے جسم سے تھوڑا تھوڑا کر کے خون بہاتا رہا تھا۔ میری نظروں
کے سامنے ایک لمحے ہی میں گرو کا عبادت خانہ اور 'پوراوا' کی رسم کا منظر کوندے کی طرح لپک کر رہ گیا۔
میں نے ایمی کے سامنے اس ذکر سے گریز کیا۔ وہ پہلے ہی بڑی مشکل سے اپنی آنکھوں کو چھلکنے سے روکے
ہوئے تھی۔ وہ کام ختم کر کے پلٹ کر جانے لگی تو میں نے اُس کا ہاتھ تھام لیا۔ "میری کوئی بہن نہیں ہے
ہے بڑی بہن ماں کی غیر موجودگی میں ڈانٹنے کے تمام فرائض بخوبی ادا کرتی ہے۔ کیا آپ وہ جگہ پُر کر
میری مما کا ہاتھ بٹانے کی زحمت کریں گی۔ ویسے بھی اب مما...... مجھے ٹھیک طرح سے ڈانٹ بھی نہیں سکتیں
جلد ہی تھک جاتی ہیں۔" میرا وار کارگر رہا اور ایمی کا چہرہ پھر سے جگمگا سا گیا۔ "بے فکر رہو میں اس منصب
خود کفیل ہوں۔ اچھا ہے پیٹر کو بھی تمہاری بدولت کچھ رعایت مل جائے گی، ورنہ بچپن سے اب تک ڈانٹ
انعام کا اکیلا حق دار تھا۔ آج سے عبداللہ بھی اس فہرست میں شامل ہو گیا ہے۔" ایمی جتنی اداس آئی تھی اتنی
خوش اور مسکراتی ہوئی واپس پلٹ گئی۔ جاتے جاتے میں اُس سے یہ وعدہ لینا نہیں بھولا کہ وہ پہلی فرصت
کسی بھی طرح میری پیٹر سے ایک ملاقات ضرور کروائے گی۔ سلطان بابا سے ملاقات کے بعد میری زندگی
جتنے بھی واقعات رُونما ہو چکے تھے، اُن سب کا کوئی ایک خاص مقصد ضرور رہا تھا۔ آج ایمی سے ملاقات
بعد مجھے گرو سے ملنے کا مقصد بھی کچھ کچھ سمجھ میں آنے لگا تھا۔ گرو مما کی آنکھوں میں اپنے لیے ناپسندیدہ
جذبات محسوس کر چکا تھا لہٰذا اب اُس کی یہی کوشش ہوتی تھی کہ وہ اُن کی غیر موجودگی میں ہی مجھ سے ملا
کرے۔ لیکن اس شام پہلی مرتبہ میں خود اُسے تلاش کرنے کے لیے چہل قدمی کے بہانے اپنے کمرے
نکل آیا تھا۔ مجھے ان بیساکھیوں کے سہارے چلنا اور لوگوں کی ہمدردی بھری نظروں کو جھیلنا بہت دشوار
لیکن شاید یہ بھی قدرت کا میرے لیے ایک سبق ہی تو تھا۔ لاچارگی، بے بسی اور انسان نامی اس کم ظرف

کو اپنی اوقات سکھانے کا سبق۔ میرے بس میں ہوتا تو میں دنیا کے تمام انسانوں کو ایک مرتبہ کچھ روز کے لیے
بیساکھیوں کے سہارے چلنا لازمی قرار دے دیتا، تاکہ یہ کمزور حافظے والی مخلوق جب بھی اکڑ کر اس زمین پر
چلنے کی کوشش کرتی تو اُسے اُس کی حیثیت یاد دلائی جا سکتی۔

آج لندن میں بہت دنوں بعد کچھ دیر کے لیے شام کا سورج جھلکا تھا۔ زمین پر جب سورج کی شریر
کرنیں چھم سے گرتیں تو کچھ دیر کے لیے برف بھی گدگدا سی جاتی اور روشنی کی ایک خیرہ کن چمک سے آنکھیں
چندھیا سی جاتی تھیں۔ ہسپتال کے مرکزی احاطے میں کسی نے برف سے مدر میری کا مجسمہ تراشا ہوا تھا، پاس
ہی برف میں راستہ بنانے والی مشین پکی اینٹوں والی روش سے برف ہٹا رہی تھی۔ تب ہی مجھے ایمی ایک سترہ،
اٹھارہ سالہ لڑکے کے ساتھ اپنی جانب بڑھتی نظر آئی۔ لڑکے کی حالت کافی ابتر دکھائی دے رہی تھی اور وہ
سارے راستے ایمی سے کسی بات پر اُلجھتا ہوا بڑھا چلا آ رہا تھا۔ ایمی نے مجھے دیکھ کر ہاتھ ہلایا اور قریب پہنچ کر
تعارفی کلمات کہے۔ "پیٹر...... یہ ہے عبداللہ...... تمہارا بڑا بھائی۔" پیٹر نے بے دلی سے میرا بڑھا ہوا ہاتھ تھام
لیا۔ "ہیلو بڑے بھائی! مجھے تمہارا نام پسند آیا۔" میں مسکرایا۔ "تمہیں پسند ہے تو تم بھی رکھ لو۔ پیٹر عبداللہ کے
بارے میں کیا خیال ہے؟" پیٹر ہنس دیا۔ "میں نے سنا تھا کہ مشرق بڑا سخی ہے، آج دیکھ بھی لیا۔" میں نے بات
جوڑی "ہاں...... اگر سخاوت صرف نام بانٹنے سے ہی پوری ہو جاتی ہو تو مجھ جیسے بخیل بھی سخی ہو جاتے
ہیں۔" اس بار پیٹر اپنے قہقہے کو روک نہیں پایا۔ ایمی نے شاید بڑے عرصے بعد اپنے ماں جائے کے ہونٹوں پر یہ
جادو دیکھا تھا۔ وہ رو پڑی۔ پیٹر نے شکوہ کیا۔ "دیکھو نا! میں روؤں تو یہ روتی ہے اور میں ہنسوں تو مزید رو پڑتی
ہے۔ اس کا علاج کیا جائے۔" میں خاموشی سے کھڑا بہن بھائی کی یہ انمول تکرار سنتا رہا۔ پھر پیٹر مجھ سے دوبارہ
ملنے کا وعدہ کر کے پلٹ گیا۔ جاتے جاتے اُس نے ایمی سے کہا کہ وہ رات دیر سے گھر لوٹے گا، کیوں کہ اُسے
کسی خاص تقریب میں جانا ہے۔ ایمی کی بڑبڑاہٹ سے مجھے اندازہ ہو گیا کہ یہ خاص تقریب ضرور گرو سے
متعلق تھی۔ ایمی کو رُخصت کر کے میں پلٹا ہی تھا کہ مجھے گرو اپنے سامنے کھڑا دکھائی دیا۔ کچھ دیر تک وہ میری
آنکھوں میں جھانکتا رہا۔ "پھر تم نے کیا فیصلہ کیا؟" "میں نے تمہاری پیش کش پر کافی غور کے بعد یہ فیصلہ کیا
ہے کہ کسی نتیجے پر پہنچنے سے قبل مجھے تمہارا پیغام سن لینا چاہیے۔ تو کیا تم آج رات مجھے اپنی عبادت کی تقریب
میں مدعو کر سکتے ہو؟" گرو نے چونک کر میری طرف دیکھا۔

صیہونی

شاید گرو مجھ سے ایسی توقع نہیں کر سکتا تھا کہ میں خود، اس کے ہاں ہونے والی کسی مذہبی تقریب میں شرکت کی فرمائش کر بیٹھوں گا۔ لیکن اُسے اپنے جذبات اور تاثرات کو چھپانا خوب آتا تھا۔ لہٰذا اگلے لمحے وہ خود پر قابو پا چکا تھا۔ ''ہاں ضرور، کیوں نہیں۔ آج نہیں، تو کل تمہیں وہاں آنا ہی تھا، تو پھر آج ہی سہی۔ لیکن تم اسپتال سے چھٹی کیسے لو گے...... اور پھر تمہارے والدین...... وہ شاید تمہیں کبھی بھی یوں تنہا میرے ساتھ نہ جانے دیں۔'' ''والدین کی تم پروا نہ کرو۔ میں انہیں منالوں گا۔ البتہ اسپتال سے باہر لے جانے کی ذمہ داری تمہاری ہے۔ تمہیں ڈاکٹر البرٹ سے میرے لیے خصوصی مختصر چھٹی لینا ہوگی۔ کہہ دینا کہ تم مجھے اپنے رُوحانی علاج کے کسی سیشن میں لے جانا چاہتے ہو، جو میری بیماری کو دُور کرنے میں فائدہ مند ثابت ہو سکتا ہے۔'' گرو مسکرایا۔ ''ٹھیک ہے، تو طے رہا کہ ہم رات ٹھیک نو بجے یہاں سے روانہ ہوں گے۔ تم تیار رہنا۔''

ہمیشہ کی طرح ایک بار پھر پاپا اس آڑے وقت میں میرے کام آئے۔ نہ جانے انہوں نے کس طرح مما سے مجھے گرو کے ساتھ باہر جانے کی اجازت دلوائی۔ میں گرو کی گاڑی میں اسپتال سے باہر نکلا تو سارے راستے یہی سوچتا رہا کہ لوگ ماں کے رشتے کے بارے میں ہمیشہ بہت کچھ کہتے اور لکھتے رہے ہیں، کاش کوئی باپ بیٹے کے اس انوکھے اور خوب صورت رشتے کو بھی کبھی اُس طرح بیان کرے۔ ابھی رات زیادہ نہیں ڈھلی تھی، لیکن قدامت پسند لندن کی سڑکیں سونے کی تیاری شروع کر چکی تھیں۔ سڑکوں کے کنارے پر جمع کیے ہوئے برف کے ڈھیر سرد ہوا کی وجہ سے جم چکے تھے اور سنٹرل لندن کی خاموش گلیوں میں کہیں کہیں بے گھر بنجارے لوہے کے بڑے ڈرمز میں آگ سلگا کر اس کے گرد کھڑے ہاتھ اور جسم تاپ رہے تھے۔ جدید لندن کی طرف سے آتی گاڑیوں میں زندگی ابھی جاگ کر انگڑائی لیتی محسوس ہو رہی تھی۔ خوب صورت چہروں، خوشبوؤں، کلونز اور ملبوسات کے ہجوم تیزی سے شہر کے ڈسکوز، اوپرا تھیٹرز اور کلبوں کی جانب رواں دواں تھے۔ جہاں فجر کے اُجالے تک سب ہی کو مدہوش رہنا تھا، رقص کرنا تھا اور اپنے جیسے انسانوں کی دنیا کو کھو جانا تھا۔ اس رنگ و خوشبو کے سیلاب میں کون یقین کرتا کہ اسی دنیا میں کال گڑھ اور تحصیل ماہی جیسے اندھیرے قطعے بھی موجود ہیں جہاں چراغوں کا تیل پوری طرح شام ڈھلنے سے پہلے ہی ختم ہو جاتا ہے۔ جہاں رات اتنی لمبی ہوتی ہے کہ ستارے بھی تھک کر بجھ جاتے ہیں۔ میرے ذہن میں تب ہی ایک عجیب سا خیال آیا کہ کیا اگلے جہاں میں ان اندھیری راتوں اور ان روشن اُجالوں کی بنیاد پر بھی کوئی فرق، کوئی امتیاز برتا جائے گا؟ کوئی صلہ دیا

ے گا یا نہیں...... کیا وہاں کے اور یہاں کے گناہ گار ایک ہی سزا پائیں گے اور کیا جزا کاروں کو ایک ہی سی لے گی؟ میں انہیں سوچوں میں گم تھا کہ گرو کے ڈرائیور نے ایک طویل احاطے میں گاڑی موڑ لی۔ گرو خود لینے نہیں آیا تھا۔ اُسے اچانک کوئی مصروفیت درپیش ہو گئی تھی۔ گاڑی رُکتے ہی ایک خادم کی معیت میں ایک بڑے سے ہال کی بالکونی میں پہنچا دیا گیا۔ ہال اور بالکونی پہلے سے کھچا کھچ بھرے ہوئے تھے۔ پتا چلا آج گرو کا لیکچر ہے۔ اس کے بعد وہ یہیں اسٹیج پر لوگوں کا رُوحانی علاج بھی کرے گا۔ مجھے تیسری رو میں ہوئے پیٹر کی ایک جھلک بھی دکھائی دے گئی۔ کچھ ہی دیر میں گرو اپنے مخصوص چغے میں اسٹیج پر نمودار ہوا تو یں مکمل خاموشی طاری ہو گئی۔ وہ کچھ دیر تک آنکھیں بند کیے کھڑا رہا، پھر اُس نے یونہی آنکھیں موندے ے ہال سے گزارش کی کہ سب لوگ ابدی سکون کے لیے ایک منٹ تک آنکھیں بند کر کے دل کی گہرائی دعا کریں۔ سب کے ساتھ میری آنکھیں بھی میکانکی انداز میں بند ہو گئیں اور ٹھیک اُسی لمحے میری بند وں کے پردے کے پیچھے گرو کی شبیہہ مسکرائی ''خوش آمدید''۔ میں نے چونک کر آنکھیں کھول دیں۔ گرو طرح آنکھیں موندے اسٹیج پر کھڑا تھا۔ جانے کیوں، پر ایک لمحے کے لیے میرا دل زور سے دھڑکا۔ اس بار مقابل ٹیلی پیتھی کے ہتھیار سے لیس تھا اور میں بالکل تہی دامن۔ ہال میں زیادہ تر تعداد اُن لوگوں کی تھی رو کی شہرت سن کر پہلی مرتبہ اُس کے اس ہفتہ وار رُوحانی درس میں شامل ہونے آئے تھے۔ گرو کے چاق ند شاگرد ہال کے انتظامات کا جائزہ لے رہے تھے۔ علاج کے لیے آنے والوں کی نشستیں علیحدہ لگائی گئی ں۔ کچھ دیر میں باقی تمام ہال کی روشنیاں مدھم کر دی گئیں اور صرف اسٹیج پر کھڑے گرو کے گرد نور کا ایک ہالہ کے دائرے کی صورت میں باقی رہنے دیا گیا۔ گرو کو لوگوں کو مسحور کرنے کا فن بخوبی آتا تھا۔ سب ہی لوگوں ل ارتکاز اب اسٹیج کی جانب ہو چکا تھا۔ میں نے اُس لمحے محسوس کیا کہ اس جدید دنیا کے سب سے ترقی شہروں کی فہرست میں سے ایک شہر، لندن بھی ایسے باسیوں سے خالی نہیں، جنہیں رُوح کی پیاس ایسی ال پر کھینچ لاتی ہے، جہاں رُوحانیت اور توہم پرستی کے درمیان بہت معمولی سا فرق رہ جاتا ہے۔ شاید ان جس قدر زیادہ سائنسی ترقی کرتا جاتا ہے، اُس کی رُوحانی پیاس بھی اُسی قدر بڑھتی جاتی ہے۔ ایسے ل میں گرو جیسے لوگوں کی کامیابی اور تعظیم سو فی صد یقینی ہوتی ہے، کیوں کہ اس جدید معاشرے کے ترقی یافتہ سب کچھ پا لینے کے باوجود بھی کسی رُوحانی مسیحا کی تلاش میں دربدر بھٹک رہے ہوتے ہیں۔

گرو نے اپنے درس کا آغاز عبرانی زبان میں چند دعاؤں کے ساتھ کیا ''قسم ہے مجھے اُس خدائے عظیم و کی جس نے ہمارے اکابر پر کبھی من و سلویٰ برسائی تھی، جو موسیٰ سے کلام کرتا تھا اور جس نے ہمیں عظیم تر جس نے ہمارے لیے بارہ چشمے تفویض کیے اور فرعون سے مقابلے کو سمندر پھاڑ کر راستہ بنایا۔ اُسی رب م یہ دنیا بہت عارضی اور جلد مٹ جانے والی ہے۔ سو، میرا یہ پیغام ہے، جہاں تک پہنچے کہ آؤ ہم سب مل اُس اگلے جہاں کی تیاری کر لیں۔ کوئی شک نہیں کہ ہمارے رب نے ہمیں یہاں اس دنیا میں بھی عظیم پیدا

کیا ہے اور وہاں بھی وہ اپنے لاڈلے بندوں کے ساتھ خصوصی برتاؤ کرے گا۔ شرط صرف اتنی ہے کہ ہم اُس کا محبوب بندہ ثابت کریں اور اس ابدی سکون کی دعوت کو دیگر بے چین لوگوں تک پہنچائیں جنہیں تلاش ہے مگر وہ ابھی تک سچ کو جان نہیں پائے۔'' گرو کافی دیر تک مختلف حوالے اور ترغیبات دے کر لوگوں اپنے حلقے میں شامل ہونے کی دعوت دیتا رہا اور پھر اُس نے اپنے درس کا اختتام بھی چند عبرانی آیات ساتھ ہی کیا۔ ہال میں ابھی تک ملگجا اندھیرا اور مکمل سکون چھایا ہوا تھا۔ اچانک میری نظر اُن بڑے بڑے دانوں پر پڑی، جہاں سے برف باری شروع ہونے سے پہلے کا سرخ انگارہ آسمان پر جھلک رہا تھا۔ او چھت پر بنے داؤدی ستارے کو دیکھتے ہی میرے ذہن میں جھماکا سا ہوا۔ یہ تو وہی ہال تھا، جہاں ''مو بہاؤ'' کی رسم ادا کی گئی تھی۔ میں نے بے چینی سے زمین پر کھدے آہنی ڈیوڈ اسٹار کو ڈھونڈنے کے لیے دوڑائی لیکن فرش پر اس وقت لکڑی کی نشستیں بچھی ہوئی تھیں اور ان پر بیٹھے لوگ محویت سے گرو کی بات رہے تھے۔ درس کے بعد رُوحانی علاج کا سلسلہ شروع ہوا اور ایک یہودی عورت ترتیب وار نام پکار کر مریضوں کو یکے بعد دیگرے اسٹیج پر بلانے لگی۔ مریض بدحال اور نڈھال حالت میں اسٹیج کی سیڑھیاں چڑھتے جاتے۔ ان میں سے کئی وہیل چیئر اور بعض دوسروں کے سہارے گرو کے سامنے جا کر کھڑے ہو جاتے۔ گرو اُن سے نام پوچھ کر مرض کی نوعیت معلوم کرتا اور پھر اپنے داہنے ہاتھ کی دو اُنگلیاں مریض کے ماتھے پر رکھ کر منہ ہی منہ میں کچھ پڑھ کر مریض کے سر پر پھونک مار دیتا۔ نہ جانے اس طلسماتی لمس اور پھونک میں کیا اثر ہوتا کہ مریض ایک لمحے کے لیے بالکل ہی بے سُدھ ہو کر وہیں جھول جاتا، جسے سنبھالنے کے لیے آس پاس دو خادم پہلے تیار کھڑے تھے، اور پھر چند لمحوں پر بعد جب اُسے ہوش آتا تو وہ بالکل ہشاش بشاش اپنے پیروں پر چل کر واپس اپنی نشست پر آبیٹھتا۔ ہر بار مریض کے ہوش میں آنے اور ٹھیک ہونے پر پورے ہال میں داد و تحسین کا طوفان سا اُمڈ آتا۔ عورتوں نے تو باقاعدہ رونا شروع کر دیا تھا اور نوجوان طبقہ زور زور سے چلا کر گرو سے مسیحائی کا درخواست گزار تھا۔ میں حیرت سے گنگ بیٹھا یہ سب کچھ دیکھ رہا تھا۔ اچانک گرو نے ہاتھ اُٹھایا اور پورا ہال یک دم یوں خاموش ہو گیا، جیسے وہاں کبھی کوئی ذی رُوح موجود ہی نہیں تھا۔ گرو کا اشارہ میری طرف تھا ''عبداللہ...... میرے دوست...... تم بھی یہاں نیچے آجاؤ۔ میں تمہاری بے یقینی کو یقین میں بدلنا چاہتا ہوں۔'' سب ہی کی نظریں مجھ پر گڑ گئیں اور میرے تمام جسم میں چیونٹیاں سی رینگنے لگیں۔ میرے پاس انکار کا کوئی موقع نہیں تھا۔ گرو کا یہ حملہ میرے لیے اتنا اچانک اور غیر متوقع تھا کہ چند لمحوں کے لیے میرا ذہن جیسے سُن ہو کر رہ گیا۔ ہوش تب آیا جب میں اپنی بیساکھیاں ٹیکتے ہوئے گرو کے سامنے اسٹیج پر جا کھڑا ہوا۔ گرو نے غور سے میری جانب دیکھا ''اپنے دل سے ہر شک و شبے کو نکال دو میرے دوست۔ یاد رہے کہ دائمی علاج صرف میرے رب کی دسترس میں ہے۔ میں صرف رُوح کو پاک کرنے کی دعا کر سکتا ہوں اور اس دعا کا اثر صرف اُن پر ہوتا ہے جو آئندہ کے لیے اپنی رُوح کو کسی گناہ سے پراگندہ نہ کرنے کا عہد کر کے میرے پاس آئے

لیکن اگر اُن کے دل میں کوئی چور ہو تو میری یہ دُعا بھی چند لمحوں بعد اپنا اثر کھو بیٹھتی ہے۔ لہٰذا تم بھی عہد کہ ہمیشہ اپنی رُوح کو پاک رکھو گے۔'' گرو کی آواز برقی مائک کے ذریعے پورے ہال میں پھیل رہی تھی سب ہی دم سادھے ہم دونوں کو ایک دوسرے کے مقابل کھڑا دیکھ رہے تھے۔ شاید میرے انداز میں ت کی لہر کو اُن سب ہی نے محسوس کر لیا تھا۔ جانے کیوں، مگر جتنی بار بھی میرا گرو سے سامنا ہوا تھا میں نے ے اندر سے کچھ منفی لہریں نکلتی محسوس کی تھیں، حالانکہ اب تک کی ہر ملاقات میں اُس نے کچھ نہ کچھ ایسا ضرور یا کیا تھا، جسے دیکھ یا سُن کر عام انسان خود کو صرف سحر زدہ ہی محسوس کر پاتا۔ لیکن میرے اندر کوئی ایسی قوت و تھی، جو مجھے گرو سے دُور دھکیلتی رہتی تھی۔ وہی قوت اس وقت اسٹیج پر اُس کے سامنے کھڑے ہونے کے ود بھی مجھے بار بار خبردار کر رہی تھی کہ مجھے اپنا آپ اُس کے حوالے نہیں کرنا چاہیے۔ لیکن اُس نے مجھے کچھ نے کا موقع ہی نہیں دیا اور اگلے ہی لمحے اُس کی شہادت کی اُنگلی سمیت دو اُنگلیاں میرے ماتھے میں جیسے اعدہ پیوست ہو چکی تھیں۔ گرو کے لب تیزی سے ہل رہے تھے اور ایک پل ہی میں مجھے یوں محسوس ہوا جیسے رے ماتھے کے مرکز سے ایک ٹھنڈے پانی کا چشمہ پھوٹ پڑا ہو۔ آب حیات نے میری نس نس میں ٹھنڈ، تازگی اور خمار آلود سکون کی ایک لہر سی دوڑا دی تھی۔ میں نے اس مدہوشی سے بچنے کے لیے اپنے قدم زور ے زمین پر جمانے کی کوشش کی، لیکن اگلے ہی لمحے میں کسی مخمور شرابی کی طرح لڑکھڑایا اور میرے ہاتھ سے اکھیاں چھوٹ گئیں۔ گرنے سے پہلے مجھے بھی دوسرے لوگوں کی طرح تھام لیا گیا اور اس کے بعد نشست ک پہنچائے جانے کے مرحلے سے لے کر واپس اسپتال آنے تک میں جیسے ایک خواب کے عالم میں مدہوش ا رہا۔ مجھے یوں لگ رہا تھا کہ جیسے میرے جسم میں سُن کرنے والے بہت سے ٹیکے بیک وقت پیوست کر یے گئے ہوں۔

میری یہ کیفیت اگلی صبح تک برقرار رہی۔ گھنٹوں نیم گرم پانی کے شاور کے نیچے کھڑے ہونے کے بعد ہیں جا کر میرے حواس کچھ بحال ہوئے۔ مما نے جب چوتھی بار دروازہ دھڑ دھڑا کر مجھے ناشتا ٹھنڈا ہونے کی ائی دی، تب میں باہر نکلا۔ اور تب ہی میری نظر دروازے سے باہر کھڑے پیٹر پر پڑی، جو ہاتھوں میں گلدستہ لیے بے چین سا کھڑا تھا۔ میں نے اُسے اندر آنے کا اشارہ کیا۔ مما ہم دونوں کو کافی کے مگ تھما کر دوسرے مرے کی طرف بڑھ گئیں۔ پیٹر اُن کے جاتے ہی جلدی سے بولا ''بڑے بھائی، تم نے بتایا ہی نہیں کہ تم بھی رو کے معتقد ہو۔ میں تو کل رات تمہیں وہاں دیکھ کر حیران رہ گیا تھا۔ تم اب کیسا محسوس کر رہے ہو؟'' میں نے سکرا کر پیٹر کو دیکھا ''ٹیلی پیتھی اور ہپناٹزم کے اتنے شدید وار کے اثر سے نکلنے میں وقت تو لگتا ہے۔'' پیٹر کو ا جھٹکا لگا۔ ''گویا تم بھی......؟ ابھی بھی ایسی باتیں کرتی ہے۔ جانے تم لوگوں کو گرو کی رُوحانی طاقتوں پر قین کیوں نہیں آتا۔'' میں نے غور سے پیٹر کی جانب دیکھا۔ ''یقین ایک ایسا سودا ہے، جسے دلیل کی تلوار سے نہیں کیا جاسکتا۔ ہم یا تو یقین کرتے ہیں یا پھر نہیں...... تم اپنے یقین کے ساتھ خوش رہو اور مجھے میری بے یقینی

کے ساتھ جینے دو...... جانتے ہو، کامل یقین بھی کسی دولت کی طرح ہوتا ہے اور یہ خزانہ کم خوش نصیبوں کو
نصیب ہوتا ہے۔ تمہیں تمہاری دولت مبارک، ہمیں ہماری غریبی۔" پیٹر میری بات سُن کر ہنس پڑا "مجھے تمہاری
یہی بات سب سے اچھی لگتی ہے عبداللہ۔ تم ایمی کی طرح مجھ پر اپنی مرضی مسلط نہیں کرتے۔ مجھے یقین ہے کہ تم
بھی جلد ہی گرو کو اپنا اُستاد مان لوگے۔ وہ زبردست انسان ہے۔" "میرا تم سے وعدہ ہے کہ میں گرو کی عظمت
تسلیم کرلوں گا، لیکن تمہیں بھی ایک وعدہ کرنا ہوگا۔ اگر زندگی میں تمہیں کسی لمحے بھی ایسا محسوس ہوا کہ تم نے جو
راہ چنی ہے، وہ منزل کی طرف نہیں جاتی، تو تم ایمی کا فیصلہ تسلیم کر کے اپنی تعلیم مکمل کرو گے اور ایمی کے خواب
پورے کرو گے۔" پیٹر نے خوش دلی سے میرا بڑھا ہوا ہاتھ تھام لیا۔ "چلو وعدہ رہا...... پکا وعدہ۔" ٹھیک اُسی
لمحے ایمی دواؤں کی ٹرے دھکیلتی ہوئی کمرے میں داخل ہوئی اور پیٹر کو دیکھ کر بولی "چلو بچے، ڈاکٹر البرٹ کے
راؤنڈ کا وقت ہونے والا ہے۔ تمہارے کہنے پر میں تمہیں یہاں لے تو آئی ہوں، لیکن اسپتال کے نظم کا خیال
رکھنا بھی میرا فرض ہے۔" پیٹر مجھ سے ہاتھ ملا کر وہاں سے اُٹھ گیا۔ ایمی نے بھیگی پلکوں کے ساتھ میرا شکریہ ادا
کیا۔ "آج سالوں بعد پیٹر نے خود کسی سے ملنے کی فرمائش کی۔ جانے کیوں۔ پر اب مجھے یقین ہونے لگا ہے
کہ میرا پیٹر بہت جلد گھر واپس لوٹ آئے گا۔" میرا دل اندر سے لرز سا گیا اور بس ایک ہی صدا نکلی کہ یا اللہ اس
معصوم بہن کے یقین کی لاج رکھنا۔ میں نے گزشتہ روز ایمی سے یہودیوں کے بارے میں لکھی گئی چند اہم
کتابیں لانے کو کہا تھا۔ ایمی نے دو کتابیں میرے حوالے کیں۔ "تمہاری فہرست میں موجود کچھ کتابیں لندن
کے کسی بھی بک اسٹور سے نہیں مل پائیں، لیکن میں نے ہالینڈ میں اپنی ایک دوست کو ای میل کی ہے وہ جلد ہی
وہاں سے کتابیں ڈھونڈ نکالے گی۔ میں جانتی ہوں، تم ان کے بارے میں کیوں جاننا چاہتے ہو۔ چاہو تو میں
تمہاری کچھ مدد کرسکتی ہوں۔ میں یہود کے بارے میں یہودیوں سے بھی زیادہ جانتی ہوں۔" میں نے چونک کر
ایمی کو دیکھا۔ "وہ کیسے......؟" ایمی نے گہرا سانس لیا "کیوں کہ میری سگی ماں ایک یہودن تھی۔" میرے ہاتھ
سے کتابیں گرتے گرتے بچیں۔ "ہاں، بہت کم لوگ یہ بات جانتے ہیں کہ میری ماں قوم یہود سے تھی۔ میرا
باپ سادہ لوح عیسائی تھا۔ لیکن میری ماں کی زندگی برباد کرنے والا بھی ایک صیہونی ہی تھا۔ تم اُس دن
صیہونیت کے بارے میں پوچھ رہے تھے نا۔ تو سنو، یہ سچ ہے کہ ہر صیہونی یہودی ہوتا ہے لیکن یہ بھی ایک
حقیقت ہے کہ ہر یہودی صیہونی نہیں ہوتا۔ بس، یوں سمجھ لو کہ قوم یہود کا وہ شدت پسند طبقہ، جو اپنے نظریے اور
مقصد کے حصول کے لیے ہر ناجائز کو جائز سمجھتا ہے اور اس کے لیے پوری دنیا کا امن برباد کرنے پر تل جاتا
ہے، اُسے صیہونی کہا جاتا ہے۔" ایمی بولتی رہی اور میں دم سادھے بیٹھا سُنتا رہا۔ ایمی نے مجھے بتایا کہ اُن کی
زندگی بہت پُرسکون تھی۔ جب وہ اپنے ماں باپ اور چھوٹے بھائی پیٹر کے ساتھ لندن کے مضافات میں رہتی
تھی۔ ایمی تب اپنے اسکول کی نویں جماعت کی ذہن طالبہ تھی۔ اُس کا باپ مضافات میں موجود ایک فیکٹری
میں فائر مین کا کام کرتا تھا۔ سب کچھ ٹھیک تھا، تاوقتیکہ اُن کے قصبے میں جم نامی وہ یہودی اسکول ٹیچر آیا، جس کی
[illegible]

اور آخر کار اپنے شوہر سے طلاق لے کر اَن جانے سفر پر ایسی روانہ ہوئی کہ پھر ایک روز اُس کی موت کی
واپس آئی۔ ایمی کا باپ اس صدمے سے کبھی سنبھل نہ پایا اور دو سال کے اندر اندر وہ بھی اپنی شریک
کے پیچھے ابدی سفر پر روانہ ہوگیا۔ ایمی کو اپنی تعلیم ادھوری چھوڑ کر نرسنگ کا شعبہ اختیار کرنا پڑا۔ لیکن سب
ختم ہونے کے باوجود اُس کے دل سے صیہونیت اور اُس صیہونی جم کے خلاف نفرت کبھی ختم نہ ہو پائی۔ وہ
لمحے تک اِسی کھوج میں رہی کہ آخر اُس ٹیچر کی تعلیمات میں ایسا کیا سحر تھا کہ اُس کی ماں کی مامتا اور وفا
اُسے نہ روک پائی۔ ایمی کی یہی کھوج اُسے اس حادثے والی جگہ پر لے گئی، جہاں اُس کی ماں ایک کار
ایکسیڈنٹ میں ماری گئی تھی، تب ہی ایمی کے ہاتھ بیت المقدس کی عمارت کے وہ نقشے لگ گئے، جو ایمی کی ماں
اپنے پرانے کپڑوں کے صندوق میں چھپا کر رکھے تھے۔ اُس وقت ایمی پر یہ انکشاف ہوا کہ اُس کی ماں
صیہونیوں کے کسی ایسے گروہ کی آلۂ کار بن چکی تھی، جو مقدس ہیکل سلیمانی کی تلاش میں بیت المقدس کے گرد
کھدائی کا منصوبہ بنا رہا تھا۔ ایمی نے پیٹر سے چھپا کر وہ نقشے تو گھر آتے ہی جلا دیئے، لیکن اپنے دل میں جلتی
نفرت کا الاؤ کبھی بُجھا نہیں پائی۔ وہ آج تک صیہونیت ہی کو اپنی ماں کا قاتل سمجھتی، اِسی لیے پیٹر کو اپنی نظروں
کے سامنے پھر سے اُسی جال کا شکار ہوتے نہیں دیکھ سکتی تھی۔ ایمی اپنی بات ختم کر کے باوجود ضبط کے رو پڑی
"تم نہیں جانتے عبداللہ۔ کم سنی میں ماں باپ کی جدائی کا دُکھ کیا ہوتا ہے۔ میں اُسے بھی تقدیر سمجھ کر صبر کرلیتی
لیکن وہ کون سی بہن ہوگی، جو اپنے سگے بھائی کو یوں پل پل مرتے دیکھ سکے۔ پیٹر کا جسم پچھلے تین ماہ میں گھل سا
گیا ہے۔ ڈاکٹر کہتے ہیں کہ سرخ خلیے ختم ہو رہے ہیں اور جسم میں تازہ خون نہیں بن رہا۔ اس لیے ہر پندرہ دن
بعد اُسے تازہ خون کی بوتلیں لگائی جاتی ہیں۔ رہی سہی کسر اُس گرو نے پوری کر دی ہے۔ پیٹر آج بھی یہی
سمجھتا ہے کہ وہ گرو کے رُوحانی علاج کی طاقت سے ٹھیک ہو جائے گا، جب کہ حقیقت یہ ہے کہ گرو سے کئی
سیشن کروانے کے باوجود اُس کی طبیعت روز بروز بگڑتی ہی جا رہی ہے۔" ایمی پھوٹ پھوٹ کر رو رہی تھی۔ اور
میں اُسے تسلی کے دو لفظ بھی ٹھیک طرح سے نہیں بول پا رہا تھا۔ اس رات میں نے ایک عجیب سا خواب دیکھا
کہ میں بیت المقدس کے باہر کھڑا ہوں، جہاں یہودیوں نے ایک لمبی سی خندق کھود رکھی ہے اور وہ زمانہ قدیم
کے مسلمانوں کو آگے بڑھنے سے روک رہے ہیں۔ لوگ قبلۂ اول میں داخل ہو کر عبادت کرنا چاہتے ہیں لیکن
یہودی ہجوم انہیں درخت کی لمبی لمبی شاخوں سے مار کر دھکیل رہا ہے۔ ایسے میں میری نظر سلطان بابا پر پڑتی
ہے، جو مجھے آگے بڑھنے کا اشارہ کرتے ہیں اور نہ جانے میں کس طرح خندق کے آخری کونے تک پہنچ جاتا
ہوں۔ مجھے آگے بڑھتا دیکھ کر ہجوم بھی وہی راستہ اختیار کرتا ہے اور مسلمان عبادت کے لیے بیت المقدس کے
دالان تک پہنچ جاتے ہیں۔ پھر اچانک کسی کھٹکے سے میری آنکھ کھل گئی۔

کمرے میں گھپ اندھیرا ہونے کے باوجود نہ جانے مجھے ایسا کیوں محسوس ہوا، جیسے کوئی آنکھ مسلسل میری
نگرانی کر رہی ہو۔ کھڑکی سے باہر دریائے ٹیمز کا جما ہوا یخ پانی آسمان سے گرتی برف کی ہلکی پھوار کے ساتھ
ملے ہوئے سرگوشیاں کر رہا تھا۔ پھر مجھے نیند نہیں آئی اور میں نے ایمی کی لائی کتابوں کے صفحے پلٹنے شروع کر

دیئے اور صبح کا اُجالا پھیلنے تک مجھے قوم یہود کے بارے میں جو کچھ پتا چلا اس کا خلاصہ یہ تھا کہ کبھی یہ قوم واقع خدا کی محبوب ترین قوموں میں سے تھی۔ لیکن رفتہ رفتہ اپنے اعمال کی وجہ سے ہر اعزاز سے محروم ہوتی گئی۔ حضرت سلیمان علیہ اسلام سے لے کر حضرت موسیٰ علیہ السلام تک اس قوم کی ناشکری اور بد عہدیوں کی ایک لمبی داستان ہے۔ حتیٰ کہ اس نے اپنے نبیوں کو بھی قتل کرنے سے بھی دریغ نہیں کیا اور زکریا علیہ السلام، یوح (جون) اور میکھا پاہ کا خون ناحق اسی قوم کے سر ہے۔ پھر حضرت موسیٰ علیہ السلام کی مسلسل نافرمانیاں او ناشکرے پن سے لے کر حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو مصلوب کروانے کی سازش تک ہر موقعے پر خود اس قوم نے خدا کے غضب کو دعوت دی اور آخر کار ان سے نبوت اور وطن چھین کر قدرت نے ان کی سزا پر مہر لگا دی۔ یہ قو در بدر ہوئی، زمانے بھر کی لعنت اور پھٹکار اس کا مقدر بنی، لیکن اس نے پھر بھی اپنے اعمال نہ بدلے اور سو خوری کی شکل میں خدا سے جنگ جاری رکھی، جو آج تک جاری ہے۔ رفتہ رفتہ سود کے ذریعے انہوں نے دن کی معاشیات کو اپنے قبضے میں لے کر مختلف سلطنتوں کو آپس میں لڑانا شروع کیا اور پھر ایک وقت یہ بھی آیا جب دنیا کی عظیم طاقتیں (سُپر پاورز) ان کے پنجہ سود تلے دبی ان کی اُنگلیوں پر ناچ رہی ہیں۔ رفتہ رفتہ ان یہودیوں میں سے ایک انتہا پسند طبقہ اُبھرتا گیا، جو بعد میں صیہونی کہلائے اور جن کے اندر نبوت چھننے اور وطن ہونے کا غصہ انتقام میں بدلتا گیا اور انہوں نے قبلہ اوّل کو ڈھانے کی ناپاک سازشیں شروع کر دیں او نبوت کی جگہ دجال کو اپنا آخری مسیحا مان کر اُس کی آمد کی تیاریاں شروع کر دیں، جو بقول اُن کے، اُن کی آخری فتح کا باعث ہوگا۔ مسلمانوں سے ان کی بنیادی نفرت کی ایک وجہ ہمیشہ یہ بھی رہی کہ مسلم عقیدے کے مطابق حضرت عیسیٰ علیہ السلام ہی اصلی مسیحا ثابت ہوں گے، جو دجال کو قتل کر کے اس دنیا میں امن قائم کریں گے۔ مذہبی عقیدے سے قطع نظر یہ قوم بے حد منظم، متحد اور ذہین بھی اور ہے۔ اصل یہود اسلام کی سچائی اور عظمت سے واقف ہونے کے باوجود فطرتاً سازشی ہونے کی وجہ سے اسے کبھی دل سے تسلیم نہیں کر پائے، اور کہیں نہ کہیں ان اب بھی اسلام ہی کو اپنی بربادی کی اصل وجہ گردانتے ہیں اور مسلمانوں کو زک پہنچانے کے کسی موقعے سے نہیں چوکتے۔ جب کہ انہی یہودیوں میں آج بھی ایک ایسا معتدل طبقہ موجود ہے، جو صیہونیت کو یہودیت کے لیے ایک گالی سے کم نہیں سمجھتا، لیکن ایسے یہود کی تعداد آٹے میں نمک سے بھی کہیں کم ہے۔

میں نے کتاب کا آخری صفحہ پلٹا تو نسبتاً صاف آسمان سے سورج اپنی پہلی جھلک دکھلا چکا تھا۔ میرا سر بے حد بھاری ہو رہا تھا۔ میں نے گرم پانی کا شاور لینے کے ارادے سے اُٹھنا چاہا، تب ہی میرے کمرے کا دروازہ ایک جھٹکے سے کھلا اور دروازے کے بیچوں بیچ مجھے گرو کا تمتماتا ہوا چہرہ دکھائی دیا۔ کچھ دیر تک ہم دونوں ایک دوسرے کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے چپ چاپ کھڑے رہے۔ پھر گرو ہی نے سانپ جیسی پھنکار کی آواز میں اس خاموشی کو توڑا۔

”کیا تم کبھی بیت المقدس گئے ہو......؟“

آخری مسیحا

مجھے یوں لگا، جیسے وہ رات بھر میرے اندر کو پڑھتا رہا ہو۔ میں نے گرو کا سوال سن کر جانے کیوں اثبات میں سر ہلا دیا۔ ”ہاں، میں گزشتہ رات خواب میں بیت المقدس میں تھا۔“ گرو نے گہری سی سانس لی، وہ کچھ ...رب سا لگ رہا تھا۔ ”تم......آخر کون ہو تم؟“ میں پلٹا۔ ”یقین جانو میں خود اِسی سوال کی کھوج میں یہاں پہنچا ہوں، لیکن کل رات ایک جواب تو مجھے زندگی نے دے ہی دیا ہے اور وہ یہ کہ تمہارا اور میرا راستہ جدا ...تم 21 دسمبر 2012ء کو جس قیامت کی آمد کی تیاریاں کر رہے ہو میرے نزدیک وہ سراب ہے۔ تمہارا ...ی مسیحا کوئی اور......اور میرا نجات دہندہ کوئی اور ہے۔“ گرو نے اطمینان سے میری بات سنی۔ پھر تاسف بولا ”تو آخر تم بھی اُس مذہبی تعصب کا شکار ہو ہی گئے، جو ہر مسلمان کا خاصہ ہے۔ جانے کیوں میں تمہیں ...وں سے کچھ الگ سمجھ بیٹھا تھا۔ یاد رکھو کہ ہم دونوں ایک ہی خدا کے ماننے والے ہیں۔“ اچانک گرو کی نظر ...بستر کے ساتھ جڑی چھوٹی سی میز پر پڑی، جہاں ابھی تک ایمی کی لائی کتابیں رکھی تھیں۔ گرو کے ہونٹوں ...ب طنزیہ سی مسکراہٹ پھیل گئی۔ ”جانتے ہو تم میں اور مجھ میں کیا فرق ہے۔ میں نے تمہیں اپنے خدا کی ...طت سے جانا ہے، جب کہ تم مجھے ابھی تک ان کتابوں میں ڈھونڈ رہے ہو۔ جس دن مجھے جاننے کے لیے ...خدا کی رسی ہلاؤ گے۔ سارے پردے آنکھوں کے سامنے سے ہٹ جائیں گے۔“ گرو اپنی بات ختم کر پلٹا اور پھر رُک گیا۔ ”اور ہاں، مقدس دجال کا ظہور ہو چکا ہے اور تم دیکھنا کہ قیامت بھی اپنی مقررہ تاریخ پر ...ے گی۔ میں اپنے رب سے دعا کرتا ہوں کہ اُس وقت تم فائدہ پانے والوں کے ساتھ رہو۔“ گرو پلٹ کر چلا لیکن میرے لیے اَن گنت سوالوں کا بھنڈارا پیچھے چھوڑ گیا۔ میں جانتا تھا کہ میں اور میرا عقیدہ ہی سچ، لیکن ...مجھے پورا اطمینان کیوں نہیں سونپ رہا تھا۔ کوئی ایک چیز ایسی تھی، جو میرے بہت قریب ہوتے ہوئے بھی ...آنکھوں سے ابھی تک اوجھل تھی، لیکن کیا......؟ میں شام تک سر پنختا رہا، لیکن وہ سادہ سا کلیہ میرے ذہن ...انہ بیٹھ سکا۔ گرو ٹھیک ہی تو کہتا تھا کہ ہم دونوں ایک ہی خدا کے ماننے والے ہیں تو پھر اس نے اپنے خدا کی ...طت سے میری حقیقت اتنی جلدی کیسے جان لی تھی، جب کہ میں ابھی تک مکمل اندھیرے میں تھا۔ شام ...تے ہی میرے اندر کی بے چینی اتنی بڑھ گئی کہ میں مما پپا سے ضد کر کے تنہا اپنی بیساکھیاں ٹیکتا باہر برف سے ...میدان میں چلا آیا۔ کچھ درختوں پر ابھی تک خزاں کی نشانی کے طور پر زرد پتوں کے سوکھے ہار جھول رہے ...، شاید خزاں کا واسطہ بھی موت کی طرح رگوں سے زندگی نچوڑ لینے سے ہوتا ہے۔ میں اپنی زندگی سے

نچڑے ہوئے پتوں کے ڈھیر تلے دبے ایک چوبی بینچ کو جھاڑ کر اس پر بیٹھ گیا۔ سرد ہوا میرے منہ سے نکلتی سانس کو بھاپ میں تبدیل کر رہی تھی، لیکن میرے دل سے جو دھواں اُٹھ رہا تھا اُس کی شاید کسی کو خبر نہیں تھی۔ شاید عصر کی اذان تھی، جس کی آواز کہیں دُور مضافات سے ہوا کے دوش پر ایک سرسراہٹ کی طرح میرے کانوں سے ٹکرائی۔ میرے کان خود بخود اپنی تمام تر سماعتوں کو جگا کر فضا میں گم ہوتی اس آواز کے تعاقب میں کھڑے ہو گئے۔ ابھی کچھ دن پہلے ہی میں نے کہیں پڑھا یا سنا تھا کہ اذان دنیا کی وہ واحد آواز ہے، جو دن رات کے چوبیس گھنٹوں، تمام وقت، دنیا کے کسی نہ کسی گوشے میں گونج رہی ہوتی ہے۔ مؤذن کی آواز میں عجیب سماں تھا، جو میں اتنی دُور بیٹھ کر بھی اس سرگوشی نما صدا میں محسوس کر سکتا تھا۔ ''**اشھد ان محمد رسول الله**... **اشھد ان محمد رسول الله**......'' اور تب ہی میرے ذہن میں پہلا جھماکا ہوا، پھر دوسرا اور پھر تیسرا۔ مجھے یوں لگا، جیسے میرے ذہن میں بارود کے کسی ڈھیر کو فیتہ دکھا دیا گیا ہو۔ ہاں یہی تو تھا وہ کھلا راز، حیرت ہے اتنے سامنے کی بات مجھے اتنی دیر سے کیوں سمجھ میں آئی؟ جھگڑا خدا کا تو کبھی تھا ہی نہیں کہ خدا تو ازل سے ہم سب کا ایک ہی ہے۔ فرق تو پیارے نبی ﷺ کی آمد کا ہے۔ اسلام تو ہمیشہ کے لیے اور ہمیشہ کے لیے نازل ہوا تھا۔ آدم علیہ السلام سے لے کر حضور ﷺ تک ہر مذہب اسلام ہی کی ایک شکل تھی۔ ہاں مگر آخری نبی الزماں ﷺ کی نبوت کا طرہ امتیاز مسلمانوں کے حصے میں آیا اور یہی یہود کی ہم سے منافرت کی بنیادی وجہ تھی۔ صدیوں تک یہ تاج یہود کے پاس رہا اور اللہ انہیں اُن کی بے تحاشا نافرمانیوں کے باوجود نبیوں کی فرمائش پر معاف کرتا رہا، لیکن پھر یہ امتیاز ان سے آخر کار چھن گیا۔ چودہ صدیاں گزرنے کے باوجود آج بھی یہود کہیں نہ کہیں مسلمانوں کو ہی اس ذلت کا سبب سمجھتے ہیں۔ اس عرصے میں انہوں نے دھوکے سے اپنے لیے ایک زمین کا ٹکڑا تو حاصل کر لیا، لیکن اپنا قبلہ وہ ہمیشہ کے لیے کھو چکے تھے۔ اور ہمارے قبلے کو کبھی انہوں نے دل سے تسلیم نہیں کیا۔ اچانک ہی میرا جسم ناتواں اس احساس سے لرزنے لگا کہ میں آخری نبی ﷺ کا اُمتی ہوں جس کے لیے اس ساری دنیا کا بکھیڑا اکھڑا کیا گیا ہے۔ میری آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو گرنے لگے کہ میں کس قدر بد نصیب ہوں کہ خود اپنی ہی عظمت سے بے بہرہ ہوں۔ ایک عالم ہماری عظمت و بڑائی سے واقف ہونے کی بنیاد پر بھیڑیوں کی طرح ہماری بوٹیوں کو نوچنے کے لیے ہمارے درپے ہے اور ہم خود کو تھالی میں سجا کر انہیں پیش کر رہے ہیں۔ گرو ٹھیک ہی تو کہہ رہا تھا۔ میرا اور اُس کا بھلا کیا مقابلہ۔ اُس نے ہم سے سچی دشمنی نبھائی۔ وہ ہماری نفرت میں علم کے کتنے سمندر پی گیا اور میں جو مذہب کی محبت کا دعویٰ دار تھا، میں نے کیا سیکھا؟ صرف چھ کلمے اور پانچ نمازیں...... کیا بس اتنا ہی تھا میرا دین......؟ صرف ایک سال پہلے تک میں اِسی لندن کے کلبز اور ڈسکوز میں بھٹکتا پھرتا تھا اور آج سال بعد اللہ کے اتنے نیک بندوں کی صحبت کے بعد بھی میں کیا تھا۔ دَر دَر بھٹکتا ہوا ایک بھکاری...... وہ تلاش ہی کیا، جو آپ کو اندر سے مومن نہ کر سکے، انسان کے ضمیر کو پاک نہ کر سکے۔ کیا میں اُس نبی آخر الزماں ﷺ کے اُمتی ہونے کے اعزاز کا حق دار تھا؟ نہیں، ہر گز نہیں

وہ یہودی، جو خدا کی محبت کے بل، اپنی ساری زندگی ایک مقصد کے سپرد کر چکا ہے اور ایک میں، جسے خدا کی محبت پانے کے لیے اُس کے نبی ﷺ کی محبت کا سادہ اور آسان کلیہ بتا کر، خدا نے ساری کائنات اس اُمتی کے قدموں پر دینے وعدہ کیا ہے، جو صرف اس کلیے ہی کو شرط بنا لے۔ مگر مجھ جیسے اور نہ جانے کتنے کم نصیب ہوں گے، جو صرف زبانی ہی اس محبت کا دعویٰ کرتے ہوں گے۔ میں جتنا سوچتا جاتا، آنکھوں سے آنسوؤں کی جھڑی بہتی جاتی اور پھر کچھ دیر بعد ہی آسمان سے گرتی برف کو میرے آنسو زمین پر جمنے سے قبل ہی دھونے لگے۔ کاش میرے من کے گناہ بھی اس برف کی طرح اتنی ہی آسانی سے دُھل پاتے۔ پھر نہ جانے کب ایمی میری تلاش میں اس طرف آ نکلی اور کب وہ مجھے میرے شکستہ وجود سمیت، سمیٹ کر میرے کمرے تک لے آئی۔ میری حالت کے پیش نظر کسی نے مجھ سے کوئی سوال نہیں کیا مگر اگلی صبح ایک اور خبر میرے حواس معطل کرنے کے لیے تیار تھی۔ دراصل گزشتہ روز ہی خبر سنانے کے لیے مجھے تلاش کرتی ہوئی اسپتال کے احاطے میں آئی تھی، لیکن مجھے اس حال دیکھ کر خاموش ہو گئی تھی۔ اُس نے مجھے بتایا کہ گرو اس ہفتے کے درس کے بعد یروشلم اور فلسطین کے دورے کے لیے روانہ ہو رہا ہے اور پیٹر نے یہ تہیہ کر لیا ہے کہ وہ بھی گرو کے وفد کے ساتھ ضرور اس ''مقدس سفر'' پر جائے گا، جب کہ پیٹر کی اپنی حالت اس بیماری کی وجہ سے پہلے ہی بے حد خراب تھی۔ ایمی کو ڈر تھا کہ وہ اس بار گرو کے ساتھ چل پڑنے کے بعد اپنے بھائی کی صورت دوبارہ کبھی نہیں دیکھے گی۔ برسوں پہلے ٹھیک اِسی طرح ایک روز اُس کی ماں بھی اپنا سب کچھ تیاگ کر کسی مقدس فریضے کی انجام دہی کے لیے گھر سے نکلی تھی اور پھر کبھی نہیں لوٹی۔ ایمی کو سو فی صد یقین تھا کہ گرو بھی اپنے ساتھ جانے والے سب ہی نوجوانوں کو کسی اسرائیلی مشنری کے حوالے کر دے گا، جہاں سے آج تک کسی کی واپسی نہیں ہوئی۔ ایمی اپنی بات ختم کر کے آنکھیں پونچھتی ہوئی وہاں سے چلی گئی۔ خلاف توقع گرو نے دو دن سے کوئی رابطہ نہیں کیا تھا۔ شاید وہ اپنے سفر کی تیاری میں مشغول تھا۔ شام تک میری طبیعت بے حد نڈھال ہو گئی، لیکن میں چپ چاپ بستر پر آنکھیں بند کیے پڑا رہا۔ کبھی کبھی جب انسان کا ٹوٹ کر بکھرنے کو جی چاہے لیکن اُسے اپنوں کی دل جمعی کی خاطر خود کو سمیٹے رکھنا پڑے تو زندگی کتنی مشکل ہو جاتی ہے۔

اچانک بند پلکوں کے عقب سے مجھے گرو کی آواز سنائی دی ''کیا تم میرے بارے میں سوچ رہے ہو؟'' میں نے چونک کر آنکھیں کھول دیں۔ وہ میرے سامنے ہی دروازہ کھولے کھڑا تھا۔ کمرے میں مغرب سے پہلے کا اداس اندھیرا چھایا ہوا تھا۔ مما پپا شاید مجھے سوتا سمجھ کر باہر چہل قدمی کے لیے نکل چکے تھے۔ حسب معمول گرو کی آنکھوں میں وہی جیت لینے والی چمک اور ہونٹوں پر فتح کا غرور لیے ہلکی سی مسکراہٹ۔ میں نے پہلی مرتبہ گرو سے درخواست کی ''کیا تم میری ایک بات مان سکتے ہو؟ پیٹر بہت بیمار ہے، اُسے اپنے ساتھ مت لے جاؤ۔'' گرو زور سے ہنسا ''تمہارے لبوں پر یہ عاجزانہ درخواست کچھ جچتی نہیں۔ جنہیں قدرت کے عزیز ہونے کا غرور ہو وہ گزارشات نہیں کرتے، حکم دیا کرتے ہیں۔'' میں گرو کا یہ طنز بھی جھیل گیا۔ ''شاید میں کبھی خود

کو حکم دینے کا اہل ثابت نہ کر سکوں۔ تمہیں اپنی اس جنگ کے لیے اور بہت سے جان نثار مل جائیں گے۔ اِر معصوم لڑکے کو بخشش دو۔ وہ اپنی کمزور بہن کا آخری سہارا ہے۔" گرو کو جیسے میری بے بسی دیکھ کر لطف آ رہا تھا۔ "ٹھیک ہے۔ تو پھر ایک سودا کرتے ہیں۔ میں پیٹر کو منع کر دوں گا، لیکن اس کے بدلے تمہیں میرے ساتھ بیت المقدس چلنا ہوگا۔ بولو منظور ہے......؟" میرے اندر بیک وقت جیسے بہت سی پُر شور ہواؤں کے جھکڑ چلنے لگے۔ کچھ دیر تک کمرے میں خاموشی طاری رہی اور پھر میرے لب ہلے "ٹھیک ہے۔ مجھے تمہاری یہ شرط بھی منظور ہے۔ پیٹر کی جگہ میں تمہارے ساتھ چلوں گا۔" گرو کی آنکھوں میں ایک چمک سی لہرائی، لیکن ٹھیک اُسی وقت اُس کے عقب سے ایمی کی تیز آواز ابھری "نہیں، عبداللہ تمہارے ساتھ کہیں نہیں جائے گا۔ میں اپنے ایک بھائی کو بچانے کے لیے دوسرے کی قربانی نہیں دے سکتی۔ اگر پیٹر کی جدائی ہی میرا مقدر ہے تو یوں ہی سہی۔" گرو ایمی کی بے وقت مداخلت سے کچھ بدمزا دکھائی دے رہا تھا۔ "ٹھیک ہے، جیسی تم لوگوں کی مرضی!" وہ غصے سے مڑا اور واپسی کے لیے قدم اُٹھائے۔ میرے ذہن میں جیسے کوئی گھنٹی بجی۔ "رکو...... اگر بات اختیار کی ہی ہے تو واقعی تمہیں اس وقت پورا اختیار حاصل ہے۔ اور اس اختیار کا گھمنڈ بھی تمہارے انداز سے ظاہر ہے۔ تو پھر ایک بیمار اور کمزور لڑکے پر اپنی مرضی چلانے سے کیا حاصل......؟ اگر تمہیں پیٹر کو ساتھ لے جانا ہی ہے تو اُسے ٹھیک کر کے کیوں نہیں لے جاتے۔ تم تو مسیحا ہو، پھر اپنی اس مسیحائی کا اعجاز اپنے ایک چاہنے والے پر کیوں نہیں آزماتے۔ یا تمہاری ٹیلی پیتھی صرف لمحاتی اور کچھ دیر کے لیے مندمل کرنے کا ہنر ہی جانتی ہے۔ پیٹر کے جسم میں تازہ خون نہیں بن رہا۔ اس حالت میں وہ منزل پر پہنچنے سے قبل ہی اپنی سانسیں ہار جائے گا۔ اگر تم اُسے تندرست کر دو تو میں خود تمہارا بے دام غلام بن کر رہوں گا۔ بولو منظور ہے یہ سودا......؟" میری بات سن کر وہ سوداگر پلٹا۔ اُس کی آنکھوں سے شعلے نکل رہے تھے۔ "تو گویا تم مجھے للکار رہے ہو۔ تم شاید یہ بھول رہے ہو کہ سودا کرنے کا حق صرف فاتح کے پاس ہوتا ہے، اگر ہمت ہے تو لڑ کر فتح حاصل کرو اور پھر اپنی مرضی کے فیصلے صادر کرنا۔" گرو نے بڑی ہوشیاری سے پتے پلٹ کر میری جانب دیکھا۔ میں اس وقت ایک اپنی ہاری ہوئی فوج کا آخری اور تنہا بچا ہوا سپاہی تھا، جس کے سامنے جیتی ہوئی سپاہ کا سالار اپنے تمام ساتھیوں سمیت کھڑے ہو کر مذاق اُڑا رہا تھا، اُسے اُکسا رہا تھا کہ یا تو وہ گھٹنے ٹیک کر پوری فاتح فوج کے سامنے ناک رگڑ کر معافی مانگے یا پھر مرنے کے لیے تیار ہو جائے۔ ہارے ہوئے سپاہی نے کراہ کر اپنی تھکن سے چور پلکیں اُٹھائیں۔ فاتح سپہ سالار جیت کے نشے میں جنگ کا ایک بنیادی اُصول بھول گیا تھا کہ ہارے ہوئے کو اتنا ہی ہرانا چاہیے، جتنی اس میں ہارنے کی سکت ہو، کیوں کہ ہر شکست کی آخری حد سے پرے ایک نئی جنگ چھپی ہوتی ہے۔ پھر چاہے لڑنے والا وہ ایک آخری بچا ہوا گھائل سپاہی ہی کیوں نہ ہو اور چاہے انجام میں اس سپاہی کو اپنے گھائل جسم میں ہزاروں تیروں کے نئے شگاف ہی کیوں نہ ملیں، سپاہی وہ جنگ لڑتا ضرور ہے۔ میں نے بھی لڑنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ "ٹھیک ہے، اگر فتح صرف لڑ کر ہی ملتی ہے تو یونہی سہی۔ میں تیار ہوں۔" گرو

ہلسی ہنسا "اچھا...... تو پھر میدان بھی تم خود ہی منتخب کر لو۔ کل تمہیں یہ گلہ نہ ہو کہ گرو نے اپنے علاقے میں ہرا دیا۔" میں نے غور سے گرو کو دیکھا۔ "علاقہ بھی تمہارا ہی ہوگا اور مجھ سے ایسے کسی گلے کی کبھی توقع رکھنا۔ میں تو سدا ہی ہارتا آیا ہوں اور شکست کے تمام آداب سے اچھی طرح واقف ہوں۔ ہماری یہ جنگ ری اس آنے والے درس کے دور میں ہوگی۔ تمہارے ہی گھر پر۔" گرو نے چونک کر میری طرف دیکھا ہ، تو آخر بلی تھیلے سے باہر آ گئی۔ ویسے میں تمہاری ہمت کی داد ضرور دوں گا۔ ٹھیک ہے، مجھے اس مناظرے عوت قبول ہے۔ لیکن شرط اب بھی وہی ہے۔ ہار کی صورت میں تمہیں سدا کے لیے میری غلامی قبول کرنا ی۔" میں نے حتمی فیصلہ دے دیا۔ "ٹھیک ہے مجھے منظور ہے......" ایمی گنگ سی کھڑی میری اور گرو کی یہ ن رہی تھی۔ گرو کے کمرے سے نکلتے ہی چلا پڑی۔ "یہ تم نے کیا کیا لڑکے! وہ وہ بہت طاقت ور ہے اور تم ال۔ یہ کیسا سودا کر لیا تم نے؟" میں کھڑکی سے باہر دیکھتا رہا۔ "کچھ سودے تمام تر نقصان جان کر بھی طے نا پڑتے ہیں۔ دلوں کی سودوں کی طرح، سدا گھاٹے والے۔" ایمی بے بسی سے ہاتھ ملتی رہی۔ میں نے ے ہدایت کی کہ وہ گرو کے اگلے سیشن میں پیٹر کے ساتھ خود بھی درس والے ہال میں آئے۔ لیکن وہ ابھی تک چین تھی۔ "آخر تم کرنا کیا چاہتے ہو۔ کیا واقعی تمہارا گرو کے ساتھ باقاعدہ کوئی 'مناظرہ' کرنے کا ارادہ ......؟" میرا سر ابھی تک جھکا ہوا تھا۔ "میں نہیں جانتا کہ مناظرہ کسے کہتے ہیں۔ بلکہ میں نے اپنی پوری گی میں یہ لفظ بھی دو چار مرتبہ ہی سنا ہوگا۔ لیکن میں لڑے بنا ہار نہیں مان سکتا، کیوں کہ اب معاملہ صرف میری ت کا نہیں، بلکہ میرا ایمان، میرے عقیدے اور کامل یقین کا ہے۔ میں نے آج تک جو بھی اس ایمان سے ایا ہے، وہ ساری جمع پونجی لگا کر بھی مجھے یہ آخری داؤ کھیلنا ہی ہوگا۔" لیکن شاید قدرت کو میرا یہ آخری جوا بھی ل نہ تھا۔

اگلے روز مجھے ایمی نے بتایا کہ پیٹر کی طبیعت اچانک بگڑ گئی اور اُسے اِسی اسپتال کے انتقال خون والے ے کے وارڈ میں داخل کروا دیا گیا ہے۔ گرو کے رُوحانی درس میں ابھی تین دن باقی تھے، لیکن ایمی کی رپورٹ طابق پیٹر کی حالت سنبھلنے میں کئی ہفتے بھی لگ سکتے تھے۔ زیادہ تشویش کی بات یہ تھی کہ پیٹر اب بھی بضد تھا ہ وہ جیسے ہی چلنے پھرنے کے قابل ہوا، گرو کی ہمراہی اختیار کر لے گا۔ وقت تیزی سے گزر رہا تھا۔ یہ لمحے بھی ظالم ہوتے ہیں، جب ہم ان کے ٹلنے کی دعا کرتے ہیں تو یہ صدیوں میں ڈھل کر جنموں میں گھلتے ہیں اور ب ہم ان کے رُکنے کی آس لگائے بیٹھے ہوتے ہیں تب انہیں ہزاروں پر لگ جاتے ہیں۔ میرے نصیب کے پرواز کرنے لگے اور آخر کار وہ رات بھی آ پہنچی جس سے پرے کا سورج میرے اور گرو کے فیصلے کا اعلان کر آتا۔ مما اور پپا میری بے چینی دیکھ دیکھ کر مزید پریشان ہو رہے تھے۔ پاپا نے حسب معمول براہِ راست سوال کرنے کے بجائے صرف اتنا پوچھا کہ کیا وہ اور مما میرے لیے کچھ کر سکتے ہیں؟ میری آنکھیں ڈبڈبا گئیں۔ میں نے اُن کا اپنے کاندھے پر رکھا ہوا ہاتھ اپنے ہاتھ میں تھام لیا۔" میں ایک ایسی جنگ لڑنے جا

رہا ہوں، جس کی ہار یا جیت پر شاید میری پوری زندگی کا انحصار ہے۔ یہ جنگ ہی اس بات کا تعین کرے گی
میں اب تک درست راستے پر تھا یا غلط...... میرے مستقبل کا فیصلہ بھی اسی جنگ سے ہوگا۔ مگر افسوس مجھ
جنگل لڑنے کے لیے کوئی اوزار، کوئی ہتھیار میسر نہیں۔ مجھے خالی ہاتھ صرف اپنے یقین کے سہارے ہی یہ لڑائی
لڑنا ہوگی۔ مجھے آپ دونوں کی دعا کی ضرورت ہے۔ اور بس۔" پس منظر میں کھڑی مما میری بات سن کر
پڑیں۔ مائیں تو یوں بھی رونے کا بہانہ ڈھونڈتی ہیں کہ ان کا واسطہ خوشی سے کچھ کم ہی ہوتا ہے، مگر نہ جانے
کیوں اس پل میرے مضبوط پاپا بھی اپنے آنسو چھپا نہیں پائے۔ میں نے تڑپ کر انہیں گلے لگا لیا۔ جب کوئی
بیٹا اپنے باپ کو تسلی دینے کے لیے اپنے سینے سے لگاتا ہو تو رفوگری کا باقی ماندہ کام قدرت خود سنبھال لیتی
ہے۔ آنسوؤں کا سیلاب آتا ہے۔ آہوں، ہچکیوں کے طوفان گزرتے ہیں اور آخر کار دل کے غبار ڈھل جاتے
ہیں۔ پپا بھی مجھ سے اپنی بھیگی ہوئی آواز میں صرف اتنا ہی کہہ پائے "مجھے اپنے ساحر اور اس کے یقین پر خود
سے زیادہ بھروسا ہے اور میں جانتا ہوں کہ اس لڑائی میں اس کی جیت ہو یا ہار...... میرا بیٹا یہ جنگ اپنی پوری
قوت اور ایمان داری سے لڑے گا۔ میں جانتا ہوں کبھی کبھی ہار یا جیت سے بھی زیادہ اہم جنگ لڑنا ہوتا ہے۔"
پپا مجھے تھپکتے رہے۔ اس روز مجھے پتا چلا کہ جنگیں صرف ہتھیاروں ہی سے نہیں لڑی جاتیں۔ جنگ کا بنیادی
عنصر "حوصلہ" ہوتا ہے اور یہ ہمت و حوصلہ ہمیں ہمارے "اپنے" دیتے ہیں۔

رات دھیرے دھیرے ڈھل رہی تھی۔ باہر آسمان اور اندر کمرے میں میرا دل برسنے کو بے تاب تھے۔
آج کی رات میرے لیے بہت اہم تھی۔ اپنوں کے سامنے تو میں نے کسی طور بھرم قائم رکھ ہی لیا تھا مگر وہ اوپر
والا تو میرے من کی حالت جانتا تھا۔ سو میں نے کھڑکی کے قریب جائے نماز بچھالی اور پلکیں زمین پر بچھا کر
سجدے میں جس قدر گڑگڑا سکتا تھا، اس سے بھی کہیں بڑھ کر گڑگڑایا۔ "یا خدا...... تو جانتا ہے کہ میں تیری
کائنات کا سب سے حقیر ذرہ ہوں، لیکن میری کم ظرفی کی داستانیں آسمان سے بھی بلند ہیں۔ میری حقیقت
سے اور میرے دل میں چھپے ہر چور سے بس تو ہی واقف ہے۔ میرے گناہوں کی فہرست کتنی بھی طویل سہی،
تیری بے کراں رحمت سے کم ہے۔ سو، میری منافقت بھری توبہ و معافی کو یہ جانتے ہوئے بھی قبول فرما کہ توبہ
کرتے وقت بھی میرے دل کا چور مجھے تیری نافرمانی پر مستقل اُکساتا رہتا ہے۔ پھر بھی تجھے تیرے پیارے
نبی ﷺ کا واسطہ، میری لاج رکھنا۔ میرے عیبوں پر اور میری جہالت پر پردہ ڈالے رکھنا۔ میرے مولا! تیرا ہی
آسرا ہے، تو ہی عیبوں کا پردہ دار ہے۔ میری جھولی میں سو چھید ہیں، پھر بھی یہ جھولی تیرے سامنے پھیلی ہوئی
ہے۔ اسے بھر دے میرے مالک......" میں جس قدر گڑگڑاتا، آنکھوں سے آنسوؤں کی جھڑی اتنی ہی تیزی
سے بہتی۔ اُس روز مجھے احساس ہوا کہ مجھے تو دعا مانگنے کا سلیقہ بھی نہیں آتا۔ اور آتا بھی کیسے مجھے آج تک بنا
مانگے ہی سب کچھ جو ملتا رہا تھا۔ مجھے یہ بھی پتا چلا کہ دعا صرف لفظوں سے مانگنے کا نام نہیں۔ اللہ کے سامنے تو
ویسے ہی ہمارے بہترین لفظ کھو جاتے ہیں۔ ہم بس "غوں غاں" ہی کرتے رہ جاتے ہیں اور دعا کا وقت نکل

ہے۔ ہم بڑی تیاری سے دعاؤں کی فہرست ذہن میں ترتیب دے کر اُس کی بارگاہ میں حاضر ہوتے ہیں
لے ہی لمبے سب بھول بھال کر کسی چھوٹے بچے کی طرح صرف "میٹھا" مانگنے ہی پر اکتفا کیے رہتے ہیں۔
ینے والے کی وسعت ہے کہ وہ پھر بھی ہم بے زبانوں کو، نادانوں کو، صرف "میٹھے" کے لالچیوں کو سب کی
ت کے مطابق دیتا ہے، ورنہ سچ تو یہ ہے کہ ہماری طلب، کبھی اس قابل نہ تھی کہ ہمیں کچھ عطا کیا جاتا۔
میں بھی ساری رات ہڑکتا رہا لیکن ڈھنگ سے کچھ مانگ نہ سکا، حالانکہ دینے والے نے اپنے سب ہی
ں کے منہ کھول رکھے تھے۔ صبح لندن کا موسم بہت اداس تھا۔ برف کی تازہ جھڑی نے پرانے سفیدے پر
پھیر دی تھی۔ باسی برف پر جب تازہ برف کی چادر پڑتی ہے، تو یوں لگتا ہے جیسے پرانی رضائی پر نیا لحاف
ادیا گیا ہو۔ سہ پہر تک ایمی تین مرتبہ چکر لگا کر مایوسی سے سر ہلا گئی تھی۔ مطلب پیٹر کی حالت ابھی تک
ل نہیں پائی تھی۔ جانے کیوں، میرے دل میں ایک نئے خدشے کے سانپ نے پھن پھیلایا، کہیں گرو نے
جنگ شروع تو نہیں کر دی۔ شام کو جب میں گرو کی رہائش گاہ جانے کے لیے نکلنے لگا، تو مما اور پاپا پہلے سے
ی میں میرا انتظار کر رہے تھے۔ میں جانتا تھا کہ وہ کسی بھی صورت اپنے ساحر کو تنہا نہیں جانے دیں گے،
میں چپ ہی رہا۔ اندھیرا ہونے کے قریب ہم گرو کے ٹھکانے پر پہنچ چکے تھے۔ باہر میڈیا کے رپورٹرز، اور
ٹی وی چینلز کے مائیک دیکھ کر میرا ماتھا ٹھنکا۔ میں جانتا تھا کہ گرو اس موقع کی تشہیر سے نہیں چوکے گا۔
ایک بہترین موقع مل رہا تھا کہ وہ اسلام کے مقابلے میں اپنا عقیدہ اور مسلک کو فاتح ثابت کر کے
ں کے ذہن مزید تسخیر کر سکے۔ میں ہال میں داخل ہوا تو کھوے سے کھوا چل رہا تھا۔ کھچا کھچ بھرے ہوئے
ی ایک نشست بھی خالی نہیں تھی۔ لوگ دیواروں کے ساتھ، بالکنی میں اور نشستوں کے درمیان والی جگہ پر
ھرے پڑے تھے۔ کیمروں کے زاویے اور فلیش کی چکاچوند سے صاف ظاہر تھا کہ یہ سب کچھ ٹی وی سے
راست بھی نشر ہوگا۔ گرو پہلے سے اسٹیج پر مائیک سنبھالے کھڑا تھا۔ مجھے دیکھتے ہی اُس نے باآواز بلند
رف کروایا۔ "خواتین و حضرات...... آپ کی توجہ چاہتا ہوں۔ ہمیں جس شخصیت کا انتظار تھا وہ اب ہمارے
یان ہے۔" سارے ہال پر پل بھر کے لیے سناٹا سا چھا گیا اور سب ہی کی نظر میکانکی انداز میں میری طرف
گئی۔ مجھے اپنی ریڑھ کی ہڈی پر پسینے کی ایک بوند پھسلتی ہوئی محسوس ہوئی۔ قدموں کے نیچے سے زمین جیسے
سکنے لگی۔ مناظرہ شروع ہو چکا تھا۔

مناظرہ

دفعتاً مجھے احساس ہوا کہ آج خصوصی طور پر ہال میں ایک بہت بڑی اسکرین بھی لگائی گئی تھی جس ک
ذریعے ہال کے آخری کونے میں بیٹھا شخص بھی اسٹیج کا تمام منظر بخوبی دیکھ سکتا تھا۔ دو شخص میرا ہاتھ تھام کر م
بیساکھی سنبھالتے، مجھے اسٹیج پر لے گئے اور باقی دو نے مما اور پپا کی رہنمائی کی ذمہ داری سنبھال لی اور انہ
لے کر ہال کے نیلگوں اندھیرے میں نہ جانے کہاں گم ہوگئے۔ گرو نے ''عبداللہ'' کے نام سے میرا تعارف
کروایا۔ اسٹیج پر کیمروں کے فلیش کی چکاچوند اتنی زیادہ تھی کہ مجھے سامنے ہال میں بیٹھے ہجوم کا بس ایک دھند
سا خاکہ ہی دکھائی دے رہا تھا۔ گرو نے بات کا آغاز کیا۔ ''آج ہم یہاں ایک عظیم اور مقدس مقصد کی تکمی
کے لیے جمع ہوئے ہیں۔ ہمارے درمیان ایک ایسا شخص موجود ہے، جو میرے اور اپنے عقیدے کی جانچ ک
لیے یہاں تک آیا ہے۔ سچ اور جھوٹ کی کسوٹی پر پرکھے جانے سے قطع نظر اور کسی بھی فیصلے کے اعلان س
پہلے میں چاہتا ہوں کہ ہم سب اس شخص کی ہمت کا اعتراف کریں۔'' سارے ہال نے تالیاں بجا کر گرو ک
بات کی تائید کی۔ ہال میں داخل ہوتے وقت میں نے یہ محسوس کرلیا تھا کہ ناظرین میں زیادہ تر تعداد نوجوا
اور جوشیلے طبقے کی ہے، جو ذہنی طور پر پہلے ہی گرو کی فتح تسلیم کرچکے ہیں۔ بزرگ طبقہ، البتہ کچھ خاموش او
بے چین سا دکھائی دیتا تھا۔ گرو کی تقریر جاری تھی۔ ''ہم دنیا میں صرف مذہب اور عقیدے کے لیے وارد ہو
ہیں اور وقت رخصت یہی ہمارا زادراہ ہوتا ہے۔ میں اپنے گزشتہ کئی لیکچرز میں وقت کا پہیہ رک جانے ک
حقیقت بیان کرچکا ہوں۔ اور میرے عقیدے کے مطابق وہ گھڑی اب زیادہ دور نہیں، جو ہمارے لیے صد
اور سالوں کا وقفہ ہے۔ وہی وقت قدرت کے پہیے کے لیے بس ایک پل کی ساعت ہے۔'' گرو نے چھت
فانوس کی صورت لٹکے ہوئے داؤدی ستارے اور اس کے اطراف کھنچی دو نیلی لکیروں کی طرف اشارہ کیا۔ ''
مقدس نشان دو جڑی ہوئی مثلثوں اور دو لکیروں سے مل کر بنا ہے۔ اس میں اُوپر کی جانب اشارہ کرتی مثلث
اس خدائے بزرگ و برتر کی عظیم الشان بڑائی کا استعارہ ہے اور اُوپر والی نیلی لکیر آسمان پر خدا کی خدائی کو بیا
کرتی ہے، ٹھیک اِسی طرح نیچے کی جانب اشارہ کرتی مثلث اس ذات کا استعارہ ہے، جو آخر کار خداوند ک
مرضی سے زمین پر آخری مسیحا کی صورت میں وارد ہوگا اور ہمیشہ کے لیے خدا کا قانون نافذ کرے گا۔ اُلٹ
مثلث کے نیچے والی لکیر اس روئے ارض پر موجود سمندروں کا استعارہ ہے۔ جہاں میری معلومات کے مطابق
اس وقت وہ آخری مسیحا (دجال) وارد ہونے کے بعد خود کو دنیا کی نظر سے خفیہ رکھے ہوئے ہے۔'' بے خیا

میری نظر بھی گرو کی اُٹھی اُنگلی کے تعاقب میں اُٹھ گئی اور اچانک میرے ذہن میں ایک جھماکا ہوا۔ یہ تو
ذے پر بنی ہوئی شبیہہ تھی۔ ہاں، یہود کا جھنڈا۔ زندگی میں پہلی مرتبہ مجھے اس شبیہہ کی توجیہہ سمجھ میں آئی۔
و کی بات ختم ہو رہی تھی۔ ''میں ایک بار پھر آپ سب کو سچ کے سفر کی دعوت دیتا ہوں اور دعا کرتا ہوں کہ
ہم سب اس سفر کے لیے روانہ ہوں، تو عبداللہ ہمارا ہم سفر ہو۔'' تالیوں کی شدید گونج میں گرو اپنی بات ختم
کے پیچھے ہٹ گیا۔ کچھ دیر تو مجھے سمجھ ہی نہ آیا کہ اب مجھے دو قدم آگے بڑھ کر اپنا نقطۂ نظر پیش کرنا ہوگا اور
کے بعد اصل مناظرہ شروع ہوگا۔ ہال میں کچھ آوازے کسے گئے اور بوڑھوں نے میرے اپنی جگہ چپ
پ جے رہنے پر کھانس کر اپنی بے چینی کا اظہار کیا اور کوئی درمیانی نشستوں میں سے چلایا۔ ''آگے بڑھ کر
صفائی پیش کرو لڑکے...... ہم تمہیں سننے کے لیے یہاں جمع ہوئے ہیں۔'' تب میرا ماتھا ٹھنکا اور میں کچھ
ہ قہقہوں کی بازگشت میں قدم بڑھا کر مائیک کے قریب پہنچ گیا۔ میرے کھنکھارتے ہی ہال میں پھر سے
سناٹا چھا گیا۔ میری زبان لڑکھڑائی۔ ''میرا نام عبداللہ ہے اور میں نہیں جانتا کہ ایسی محفل کے تقاضے کیا
تے ہیں۔ میں تو ابھی تک اپنے نام کی لاج ہی نہیں رکھ پایا تو 'آداب مناظرہ' سے بھلا میری کیا واقفیت
ی۔ مذہب اور عقیدے کی سچائی کے لیے لڑنے والے تو بہت عظیم لوگ ہوتے ہوں گے۔ مجھ پر تو ابھی ٹھیک
رح سے منصب اور عقیدہ کھلا بھی نہیں، دَردَر کی ٹھوکریں کھاتا ہوا میں یہاں تک پہنچا ہوں اور میرا واحد اثاثہ
ج بھی صرف اور صرف میرا کامل یقین ہے۔ یقین اپنے مذہب پر، عقیدے پر اور اپنے خدا اور اُس کے
خری نبی ﷺ پر اور میرا ایمان ہے کہ وقت کا پہیہ تھمے گا اور ضرور تھمے گا، مگر ابھی اس گھڑی میں ذرا دیر باقی
ہے۔ میرا آخری مسیحا ابھی تک آسمانوں میں ہے اور وہ تب زمین پر بھیجا جائے گا، جب اُسے صلیب پر سے
ندہ اُٹھا لینے والا میرا مالک حکم دے گا۔ مجھے بھی اس آخری جنگ کا پورا یقین ہے، البتہ میرا فاتح کوئی اور
سیح) ہے۔ آسمانوں، زمینوں اور سمندروں کا مالک بس وہی میرا اللہ ہے، جو یہاں موجود ہر بندے کا
خدا ہے۔'' میں نے اپنی بات ختم کی تو پورے ہال میں ایک تالی کی گونج بھی نہیں تھی۔ پھر ایک کونے سے کسی
ٹص کا ہیولا اپنی جگہ سے کھڑا ہوا اور تالی بجنے کی آواز اُبھری۔ کوئی بھرائی ہوئی آواز میں زور سے بولا۔ ''جیتے
ہو ساحر، مجھے تم پر فخر ہے۔'' اور پھر پپا کی تالیوں کی آواز میں مما کے ہاتھ بھی شامل ہوگئے۔ کیا ہوا جو پورے
ل میں میرا ایک حمایتی بھی نہیں تھا۔ میرے اپنے، مجھے جنم دینے والے عظیم ترین ماں باپ تو تھے۔ کیمروں کا
رخ مما پپا کی طرف ہوگیا۔ ہال میں لگی اسکرین پر مجھے دونوں کی آنکھ سے بہتے آنسو صاف دکھائی دیے۔ میں
نے بڑی مشکل سے اپنی جلتی آنکھوں کو بہنے سے روکا۔ سپاہی جنگ میں رویا نہیں کرتے۔ ہال میں
ئر سرگوشیاں ہونے لگیں۔

گرو نے پہلے دور میں اپنا اثر کچھ زائل ہوتے دیکھا تو جلدی سے آگے بڑھا۔ ''اب میں عبداللہ کو
راہ راست دعوت دیتا ہوں کہ اگر اس کے پاس اپنے عقیدے کی سچائی کے حق میں کوئی بھی ثبوت، علم، معجزہ یا

کرشمہ ہے تو وہ پورے ہال کے سامنے پیش کرے۔ یا اگر وہ چاہے تو میں پہل کروں؟'' ہال میں موجود ہ
ہی افراد کی نظریں مجھ پر جم گئیں۔ ہال میں لگی اسکرین پر صرف میرے چہرے کو فوکس کیا جا رہا تھا۔ ''میں نے
پہلے ہی واضح کر دیا تھا کہ میں یہاں ثبوت یا کرشمے کے بنا، صرف اپنے یقین کے بل پر آیا ہوں اور اگر
میرا یقین سچا ہے تو اسے کسی معجزے یا کرامت کی ضرورت نہیں۔ میرے پاس کوئی مخصوص علم بھی نہیں، جس کے
ذریعے میں لوگوں کو مسحور کر سکوں۔ سچ تو یہ ہے کہ گرو نے رُوحانیات کی تعلیم کے دوران جتنا کچھ سیکھا ہے، مجھے
اس کا عشر عشیر بھی نہیں آتا۔ میں یہاں کسی سے مقابلے کے لیے نہیں آیا۔ بنا کسی ثبوت اور بنا کسی دستاویز
صرف اپنے عقیدے کی سچائی بیان کرنا ہی میرا مقصد ہے۔ لٰہذا میں پہلے گرو سے درخواست کروں گا کہ وہ تمام
حاضرین کے سامنے اپنے وسیع علم کا مظاہرہ کرے۔'' گرو نے فاتحانہ انداز میں یوں میری طرف دیکھا، جیسے
کہہ رہا ہو، ''تم نے تو لڑے بنا ہی آدھی بازی ہار دی۔'' ہال میں بھی جو لوگ کسی بڑے ''تماشے'' کی اُمید میں
گھروں سے نکل کر آئے تھے، سب ہی کے چہروں پر مایوسی اور بددلی سی چھانے لگی۔ ہال میں لگے کیمرے
اسکرین پر ناظرین کے تاثرات جھلکیوں کی صورت پیش کر رہے تھے۔ پھر گرو کے عملے نے مریضوں کے نام
اور اُن کی بیماریوں کی تفصیل فہرست سے پڑھنا شروع کی اور یکے بعد دیگرے مختلف مریض اسٹیج پر آ کر گرو کی
کرشماتی شفا سے فیض یاب ہونا شروع ہو گئے۔ لوگوں کی جبینوں سے گرو کی دو اُنگلیاں چھوتے ہی سارے درد،
کھنچاؤ اور تکالیف غائب ہو جاتیں۔ گرو نے مجھے پیش کش کی کہ اگر مجھے کسی قسم کا کوئی شک ہو تو آج کے دن
کے لیے خصوصی طور پر معالجین کی ایک ٹیم بھی طلب کی گئی ہے، جو یہیں اسٹیج پر دستی مشینیں لگا کر باقاعدہ مریضوں
کی طبیعت سنبھلنے سے پہلے اور بعد کی رپورٹ پیش کر کے میرے شبہات بھی دُور کر سکتی ہے، لیکن میں نے گرو
سے کہا کہ مجھے اُس کی مسیحا گری پر پورا یقین ہے۔ اسکرین ہر چند لمحے بعد مما اور پپا کے چہرے کے تاثرات
فوکس کر رہی تھی۔ دونوں کے چہروں پر مجھے رفتہ رفتہ شدید پریشانی کے آثار نمایاں ہوتے نظر آنے لگے تھے۔
دنیا کے کوئی بھی والدین اپنے نالائق ترین بچے کو بھی یوں بھری دنیا کے سامنے شکست کھاتا نہیں دیکھ سکتے
کیوں کہ ہر ماں کے لیے اُس کا بیٹا دُنیا کا سب سے بڑا فاتح اور ہر باپ کے لیے اُس کا لختِ جگر سب سے
زیادہ کامیاب ہوتا ہے۔ لیکن ہال کی لمحہ بہ لمحہ بدلتی صورت میرے والدین کو کچھ اور ہی آئینہ دکھا رہی تھی۔ ہال
کے بڑے بڑے روشن دانوں سے باہر برف کے گالے گرتے نظر آ رہے تھے۔ جب میں چھوٹا تھا، تو میں اور
میرے دوست کوئٹہ جیسے پہاڑی علاقوں میں گزارے اپنے بچپن کے دسمبر کے دوران، ان برفیلی شاموں میں
گھنٹوں سر جھوڑے بیٹھ کر یہ سوچا کرتے تھے کہ آخر اللہ میاں نے صرف ہمارے محلے پر برف برسانے کے
لیے کتنے فرشتوں کی ''ڈیوٹی'' لگا رکھی ہو گی اور فرشتے آخر کیسے اتنی بہت سی برف اکٹھی کر کے بوریوں میں بھر
بھر لاتے ہوں گے، اور پھر کسی بہت بڑی چھلنی سے چھان کر ہم پر گراتے ہوں گے۔ ہم ان دُودھیا بادلوں ہی
کو فرشتوں کی بوریاں سمجھتے تھے، جسے وہ اپنی پیٹھ پر لادے رات بھر آسمان پر ڈھویا کرتے تھے۔ جانے وہ

بچپن کے دوست اور وہ بادلوں کی بوریاں ڈھوتے معصوم فرشتے اب کہاں ہوں گے۔ میں اِسی سوچ میں
تھا کہ گرو کی آواز نے مجھے پھر سے اِسی ہال میں پہنچا دیا۔ وہ آخری مریض کو شفایاب کرنے کے بعد اب
میری طرف دیکھ رہا تھا۔ تب، عین اُسی وقت میں نے ایک اور فرشتے کو ہال میں داخل ہوتے دیکھا۔ وہ فرشتہ
بھی میرے لیے کچھ ڈھو کر لایا تھا اور میرے دل کی دھڑکن آج بھی اتنی ہی تیز ہو گئی، جتنی کبھی برف کے پہلے
گالے کو پلکوں پر ٹھہرانے سے ہوتی تھی۔ ہاں، وہ ایمی ہی تھی جو میری درخواست پر نہ جانے کس مشکل سے
وہیل چیئر پر بیٹھے پیٹر کو اتنی خراب طبیعت کے باوجود اس ہال تک لانے میں کامیاب ہو گئی تھی۔

ہال کے سناٹے میں وہیل چیئر کے پہیوں کی آواز گونجی تو سب ہی کی کیمروں کا رُخ پیٹر اور ایمی کی
طرف ہو گیا۔ گرو نے بھی چونک کہ ایمی کی جانب دیکھا اور جلدی سے عملے کو اُس کی مدد کا اشارہ کیا۔ چند لمحوں
میں ایمی، پیٹر سمیت اسٹیج پر موجود تھی۔ میرا دل کچھ ایسی تیزی سے دھڑک رہا تھا، جیسے ابھی پسلیوں کی دیوار توڑ
کر باہر نکل آئے گا۔ ہال میں پھر سے سرسراہٹیں ہونے لگیں۔ گرو کی سوالیہ نگاہیں مجھ پر گڑی تھیں۔ میرے
الفاظ تھے۔ ''میں گرو کے علم کا پہلے ہی اعتراف کر چکا ہوں۔ اور میرے پاس کوئی دلیل نہیں ہے، جس سے گرو
کے علم کی کسی ساخت یا قسم پر تبصرہ کروں، کیوں کہ اگر یہ ٹیلی پیتھی یا ہپناٹزم کی بھی کوئی شاخ ہے تو بہر حال
لوگ اس سے مستفید ہو رہے ہیں۔ میری گرو سے صرف اتنی درخواست ہے کہ وہ اس نڈھال لڑکے کو بھی
شفایاب کر دے، جس کے جسم میں تازہ خون بننا بند ہو چکا ہے۔ یہ گھائل لڑکا پیٹر خود گرو کا بہت بڑا پرستار اور
عقیدت مند ہے اور گرو کے ساتھ اس کے اگلے دورے پر جانے کا خواہش مند بھی ہے۔ مجھے اُمید ہے گرو میری یہ
درخواست رد نہیں کرے گا۔'' گرو کے چہرے پر پیٹر کے ہال میں آنے پر جو کرخت تاثر اُبھرا تھا، اب وہ ایک
مسکراہٹ میں تبدیل ہو چکا تھا۔ اُس نے مجھے یوں دیکھا جیسے بڑے بچوں کی کسی ''شرارت'' پر تنبیہہ کرنے
کے لیے دیکھتے ہیں۔ وہ بولا۔ ''میں عبداللہ کو پہلے بھی یہ بات کافی وضاحت کے ساتھ بتا چکا ہوں کہ
رُوحانیات، انسان کو ان بیماریوں سے شفایاب کرنے کا نام ہے، جو کسی رُوحانی پیچیدگی کی وجہ سے پیدا ہوتی
ہیں۔ ایسے میں بھی انسان بظاہر کسی طبی بیماری کا شکار تو نظر آتا ہے مثلاً درد، بخار، جسم کی معذوری، فالج کے
اثرات، دل کی بیماریاں، ذہنی کشیدگی، جگر کی پراگندگی، بصارت و سماعت کا متاثر ہونا یا پھر معدے کے امراض
وغیرہ، لیکن اصل میں ان تمام بیماریوں کی اصل وجہ انسان کے جسم کے اندر موجود رُوح کا گھائل ہونا یا رُوح کی
بیماری ہے۔ رُوحانی علم سے ہم ایسی ہی بیماریوں کا علاج کرتے ہی اور رُوح کے مندمل ہوتے ہیں جسم کی
بیماری خود بخود دُور ہو جاتی ہے، لیکن رُوحانی علاج کے ذریعے ہم خاص الخاص صرف جسمانی بیماریوں کو فوری
ٹھیک نہیں کر سکتے مثلاً اگر کوئی حادثہ، جسم سے چوٹ کی صورت میں خون بہنا، کسی جسمانی بیماری کی وجہ سے
ناکارہ اعضاء کی ٹوٹ پھوٹ۔ ایسی صورت میں پہلے مریض کو فوراً جسمانی طبی علاج کی طرف متوجہ کیا جاتا
ہے۔ ہاں، البتہ ایسی صورت میں رُوحانیات اپنا کردار ضرور ادا کرتی ہے۔ پیٹر کی بیماری بھی خاص ایک جسمانی

بیماری ہے، جس میں ہڈیوں کے گودے کے پورا کام نہ کرنے کی وجہ سے جسم میں سرخ خلیوں کی پیدا
ہونے کے قریب ہے۔ یہ بیماری بھی ایک چوٹ کا نتیجہ ہے اور پیٹر جانتا ہے کہ گزشتہ تین ماہ سے طبی علا
کہیں زیادہ اس کا دارومدار میرے رُوحانی علاج پر ہی ہے۔ آج بھی میں رُوحانی عمل کے ذریعے پیٹر کی
کو اس حد تک ضرور مندمل کر دوں گا کہ وہ اس ابتر حالت سے باہر نکل آئے اور پھر سے کچھ دن تک اپنی
بنا کسی رُوحانی درد اور تکلیف کے گزار سکے۔ ہاں البتہ اس کا طبی علاج جاری رہے تو مجھے اُمید ہے کہ پیٹر
اس بیماری سے چھٹکارا پا ہی لے گا۔'' گرو نے زیرِ لب کچھ پڑھنا شروع کیا اور وقفے وقفے سے اپنی دو
پیٹر کے ماتھے پر رکھ کر پھونکتا رہا۔ چند لمحوں بعد ہی پیٹر کی حالت میں بہتری کے آثار نمایاں ہونے لگے۔ ہا
میں لگی برقی اسکرین پر پیٹر کا چہرہ اور لرزتی، دھیرے دھیرے کھلتی پلکوں کا منظر واضح تھا۔ گرو اب اپنی آنکھ
بند کر کے مکمل ارتکاز کرتے ہوئے بنا لب ہلائے پیٹر کی رُوحانی مسیحاگری میں مشغول تھا۔ میں نے آج
جتنی مرتبہ پیٹر کو دیکھا تھا۔ جانے کیوں ہر مرتبہ وہ مجھے کسی سحر کے زیرِ اثر دکھائی دیا۔ ٹیلی پیتھی اور ہپناٹزم
جادو کی قسمیں ہیں۔ چند لمحوں میں گرو نے آنکھیں کھولیں اور پیٹر سے پوچھا۔ ''اب تم کیسا محسوس کر رہے
پیٹر......؟'' پیٹر مسکرایا۔ وہ اب مکمل ہوش میں آچکا تھا۔ ''میں پہلے سے بہت بہتر ہوں......'' ہال نے پُر
آواز سنتے ہی تالیوں کے شور سے آسمان سر پر اُٹھا لیا۔ گرو نے فاتحانہ انداز میں میری طرف دیکھا، جیسے ک
ہو ''تم مکمل ہار چکے ہو۔ لہٰذا اب ہتھیار ڈال دو۔'' میں نے طبی ماہرین کی ٹیم کو اشارہ کیا، جنہوں نے چند
میں پیٹر کی تمام تر جسمانی حالت کی رپورٹ بیان کر دی۔ اسکرین پر بھی وہی تفصیلات لفظوں کی صورت
نمایاں ہونے لگیں۔ پیٹر کو ابھی تک بخار تھا۔ اُس کے دل کی دھڑکن معمول سے کچھ زیادہ اور اُس کے خو
دباؤ بھی بڑھا ہوا تھا۔ ایک فوری معائنے کے ذریعے پیٹر کے جسم میں موجود تازہ سفید اور سرخ خلیوں کی
بھی بیان کر دی گئی، جو تازہ خون بناتے جسم کے مقابلے میں نہ ہونے کے برابر تھی۔ گرو کچھ حیرت اور ا
سے یہ ساری کارروائی دیکھتا رہا، لیکن چپ رہا۔

اب وہ آخری بازی کھیلنے کا وقت آچکا تھا، جو میرے یقین کی پہلی اور آخری بنیاد تھی اور جس کے عقب
کی دیواروں پر کھڑی ہو کر میں نے اپنی زندگی کا یہ سب سے بڑا جوا کھیلنے کا فیصلہ کیا تھا۔ میں نے آنکھ
کیں اور میرا دل زور سے جیسے آخری بار دھڑکا، اندر سے آخری فریاد اُبھری ''تیرا ہی آسرا ہے
مولا۔'' بس تیرا ہی توکل ہے۔ میرے اعمال کو نہ دیکھ، میرے دل میں چھپے کسی منافق اور چور سے در گز
میری ریاکاری اور عیبوں کو صرف نظر کر دے۔ میرے گناہوں کو نہ دیکھ، اپنی رحمت جلوہ گر کر، اپنی رحمت
صدقے، پیارے نبی ﷺ کی رحمت کے صدقے، میرے اُمتی ہونے کے صدقے اور اپنی اس عظیم
شفقت کے صدقے کہ جس کے آگے ساری کائنات کے تمام جرم اور گناہ مل کر بھی ریت کے ایک حقیر
جتنا وزن بھی نہیں رکھتے۔ بس، اُسی رحمت کی ایک جھلک دکھلا دے میرے مولا۔ آج تو ہی میرا پردہ

اپنے اس عاجز گناہ گار، عاصی، منافق اور ریاکار بندے کا پردہ رکھ لے، رحم کر میرے مولا...... رحم
''میرا ایک ہاتھ پیٹر کے سر پر تھا اور میری آنکھوں سے آنسوؤں کی جھڑی کسی تیز بارش کی طرح جاری
میں نے سحر کے توڑ کے لیے ہمیشہ سلطان بابا کو سورہ فاتحہ کے بعد چاروں قل پڑھتے ہوئے سنا تھا اور
نے مجھے بھی خصوصی طور پر یاد کرانے کے بعد ان چاروں قلوں کا ورد ہر امتحان میں جاری رکھنے کا حکم دیا تھا۔
ے لب تیزی سے اس وقت ہی یہ ورد دُہرا رہے تھے...... **قل یاایھا الکفرون...... قل ھو اللہ احد......**
عوذ برب الفلق...... قل اعوذ برب الناس...... جس تیزی سے میرے ہونٹ میرے دل کی آواز پر
ہے تھے، اتنی ہی تیزی سے میرا دل ڈوبتا جا رہا تھا۔ پیٹر کا جسم ابھی تک مختلف تاروں کے ذریعے ان
وں سے جڑا ہوا تھا، جو اس کی حالت کے پل پل کی خبر پورے ہال تک بذریعہ اسکرین پہنچا رہی تھیں۔ بند
وں کے پردے تلے مجھے کسی ڈاکٹر کے چلانے کی آواز آئی۔ ''پیٹر کا دل ڈوب رہا ہے...... اوہ میرے
......'' ہال میں سراسیمگی سی پھیل گئی، جسے میں بند آنکھوں کے پردے تلے بھی خوب محسوس کر سکتا تھا۔ کوئی
ت زور سے چلائی۔ ''اس لڑکے کو روکو، یہ پیٹر کو مار دے گا۔'' میرے لب مزید تیزی سے ہلنے لگے۔ پیٹر کی
یں اُکھڑنے لگیں۔ رُوح کے سفید اور کالے قابضوں کے درمیان جنگ شدید ہونے لگی۔ ایمی کے رونے
آوازیں میری سماعتیں شل کر رہی تھیں۔ اس کی ڈوبتی فریاد اُبھری۔ ''مجھے تم پر بھروسا ہے عبداللہ۔ میں نے
ا تم پر قربان کیا۔'' میرے جسم کے مساموں سے پسینہ یوں تیزی سے بہہ رہا تھا، جیسے تیز طوفان اور شدید
ب کے دوران پانی چھوٹے نکاسوں سے سارے بند توڑ کر بہتا ہے۔ پھر کوئی ڈاکٹر زور سے چیخا ''اوہ
ے خدا...... بند کرو یہ سب کچھ...... مگر...... ٹھہرو......'' میری گزارش جاری رہی۔ ''**قل یاایھا الکفرون**
'' ''ارے یہ لڑکا تو اُبھر رہا ہے......'' ''**قل ھو اللہ احد**......'' ''پیٹر کو جھٹکے لگ رہے ہیں......''
ل اعوذ برب الفلق'' ''پیٹر کا بخار کم ہو رہا ہے۔'' ''**قل اعوذ برب الناس**......'' ''پیٹر کا دل معمول پر
گیا ہے۔ اُسے ہوش آرہا ہے......'' میری التجا اور ہال کے ہجوم کی آوازیں آپس میں گڈمڈ ہونے لگیں اور پھر
ا زور سے چلائی...... ''یسوع مسیح کی قسم، پیٹر کے جسم میں سرخ خلیوں کی تعداد بڑھ رہی ہے۔'' میں نے بے
ہو کر آنکھیں کھول دیں۔

ہال پر سکتہ طاری تھا۔ سب ہی کی نظریں اسکرین پر مرکوز تھیں۔ جہاں پیٹر کی لحہ بہ لحہ بدلتی حالت کی
صیل جگمگا رہی تھی۔ پیٹر وہیل چیئر پر بیٹھا گہرے گہرے سانس لے رہا تھا۔ خود اس کا جسم بھی پسینے سے تر
ا گرو کو جیسے کوئی سانپ سونگھ گیا تھا۔ پھر سب سے پہلے ایمی کے ہاتھ ایک دوسرے سے ٹکرائے۔ وہ روتے
ئے بھی تالیاں پیٹ رہی تھی۔ دُور سے میری ماں نے مجھے پکارا...... ''عبداللہ......'' میں نے بھیگی پلکوں سے
ن کی جانب دیکھا۔ آج زندگی میں پہلی مرتبہ مما نے سلطان بابا کے دیئے ہوئے نام سے مجھے پکارا تھا۔ وہ خود
زار و قطار رو رہی تھیں۔ لیکن انہیں اور پاپا کو شاید اپنے آنسوؤں کا ادراک نہ تھا۔ مما نے دُور سے مجھے اپنی

آنکھیں پونچھنے کا اشارہ کیا، جیسے وہ مجھے رونے سے منع کر رہی ہوں مگر خود وہ دونوں بھی تو رو رہے تھے اور جب ماں روتی ہے تو دنیا کا کوئی بھی بیٹا اپنے آنسوؤں پر قابو نہیں رکھ سکتا۔ چاہے وہ دنیا کے لیے کتنا ہی بڑا اور بہادر کیوں نہ ہوں پھر رفتہ رفتہ ہال کے پچھلے کونوں سے لوگ کھڑے ہونے لگے۔ تالیاں بجنے لگیں اور پھر کچھ ہی دیر میں پورا ہال اس شور سے گونج رہا تھا۔ آج ایک بار پھر ایک انتہائی گناہ گار بندے کی التجا رد نہیں ہوئی تھی۔ میرے سارے گناہوں اور کم ظرفی کے باوجود اُس کی عظیم الشان رحمت نے جوش مارا تھا۔ ڈاکٹر دوڑ دوڑ کر پیٹر کا معائنہ کر رہے تھے۔ اور خود پیٹر بھی بھیگی پلکیں لیے حیرت زدہ سا گنگ کھڑا تھا۔ ایمی کبھی اُسے اپنے ساتھ لپٹاتی اور کبھی میرا سر اور ماتھا چومتی۔ مما سے رہا نہ گیا اور وہ دوڑ کر میرے پاس چلی آئیں۔ پپا بھی اُن کی تقلید میں اسٹیج پر چڑھ آئے تھے۔ ہال میں کان پڑی آواز سنائی نہیں دے رہی تھی۔ کیمروں کے زاویے، فلش کی چکا چوند، ٹی وی اور اخبار کے رپورٹرز کے بڑھتے مائیک، بیک وقت سینکڑوں سوال...... لیکن میرے پاس کوئی جواب نہیں تھا۔ میں اس قابل بھی کب تھا کہ کسی کو کوئی جواب دے سکتا۔ میں تو خود ایک سوال تھا...... سراپا سوال...... آج ایک بار پھر ثابت ہو گیا تھا کہ اُس کی رحمت ہمارے گناہوں سے متصل نہیں۔ بس، یقین کی حد لامحدود ہونی چاہیے۔ اور رحمت طلب کرتے لمحے دل کو اتنا ہی عاجز، پاک اور منافقت و ریا سے مبرا ہونا چاہیے۔ جتنا کسی معصوم بچے کا دل دعا کے لیے ہاتھ اُٹھاتے وقت ہوتا ہے۔ اگر مجھ جیسے نالی کے کیڑے کے لیے اُس کی رحمت کی یہ وسعت تھی تو پھر نیک اور پاک باز بندوں کے لیے یہ ابر کس قدر وسیع ہوگا۔ میری عقل اسے ناپنے سے عاجز تھی۔ میں نے ہاتھ اُٹھا کر بمشکل ہال کو خاموش رہنے کی التجا کی۔ کافی دیر بعد شور تھما، میری آنسوؤں سے لرزتی آواز اُبھری۔ "شروع اللہ کے نام سے، جو نہایت مہربان اور رحیم ہے۔ سب تعریفیں اُسی اللہ کے لیے ہیں، جو ہم سب کا مالک اور پالنے والا ہے۔ جس نے آج اپنے اس عاجز، گناہ گار اور ناکارہ انسان کی فریاد کی لاج رکھی۔ یہ کسی کی ہار ہے اور نہ کسی کی جیت۔ یہ تو بس ایک اشارہ ہے، فلاح کی جانب بڑھنے کا اشارہ...... خود اپنا راستہ طے کرنے کا اشارہ...... یہ کوئی معجزہ ہے نہ کوئی کرشمہ...... یہ بس اُس کی بے کراں رحمت کی چھوٹی سی ایک بوند ہے اور اُس کی نعمت ہمیں دن رات یوں تلاش کرتی ہے، جیسے اندھیرے کی تلاش میں روشنی کے جگنو...... اور یہ رحمت اور اُس کا کرم کسی ایک انسان کے جسم میں خون کے چند خلیے بڑھ جانے سے کہیں زیادہ اور عظیم تر ہے۔ میرا مذہب صرف سلامتی ہے اور سارے زمانوں کے لیے ہے۔ اور میرا پیغام آپ سب کے لیے، بس یہی رحمت ہے...... خدا ہم سب کو اس رحمت کا سایہ نصیب کرے۔" میں اپنی بات ختم کر کے مما، پپا اور ایمی کو لیے اسٹیج سے اُترا تو میرے باہر نکلنے کے تمام راستے مسدود ہو چکے تھے۔ ہجوم بے قابو ہو رہا تھا۔ میں نے اپنی روتی ہوئی ماں کا سر اپنے کاندھے سے لگا رکھا تھا۔ پپا لوگوں سے درخواست کر کے راستہ بنا رہے تھے۔ اچانک میں اور گرو آمنے سامنے آ گئے۔ اُس کی آنکھیں سرخ اور آواز دبی ہوئی تھی۔ "تم نے میری برسوں کی بنی ساکھ اور محنت برباد کر دی۔ آج تمہیں بتانا ہوگا کہ تم کون ہو......؟" میں نے

ہ اور حیرت سے اس گم راہ کو دیکھا، شاید دلوں کو آہنی پردوں سے ڈھک دیئے جانے کی ایک مثال میرے منے کھڑی تھی۔ گرو نے پھر اپنا سوال دہرایا، اس مرتبہ اس کا انداز ہیجانی تھی۔ "خدا کے لیے مجھے بتاؤ تم کون ......؟" میں نے ایک لمحے کا توقف کیا "عبداللہ۔ اللہ کا ایک بندہ......" گرو اپنی جگہ جما رہ گیا اور ہم اسے کر ہال سے باہر نکل آئے۔ باہر گرتی برف تیز ہو چکی تھی۔ لندن کی سڑکیں پھر سے دوبارہ برف سے ڈھک ی تھیں۔ چوراہوں پر میں نے بہت سے لوگوں کو اُونچی عمارتوں پر لگی برقی اسکرینوں کے نیچے کھڑے ہال ں ہوئی کارروائی پر بحث کرتے دیکھا۔ اسپتال میں پہنچنے سے پہلے شاید ہماری خبر پہنچ چکی تھی۔ اِسی لیے ڈاکٹر رٹ سمیت بہت سا عملہ استقبالیہ پر ہماری راہ تک رہا تھا۔ پاپا نے میری بیساکھیاں جانے کہاں پھینک دی یں اور میرا سارا بوجھ، اپنے جسم پر سنبھالے ہوئے تھے۔ ایمی کو جیسے پر سے لگے ہوئے تھے اور وہ بھاگ اگ کر سب کو ہدایات دے رہی تھی۔ ہمارے اپنے کمرے میں پہنچنے سے قبل ہی عملے کی ایک نرس تیزی سے لتی ہوئی میری جانب بڑھی۔ اُس کے ہاتھ میں ایک کاغذ تھا۔ "آپ کے ملک سے آپ کے لیے ضروری لس آیا ہے۔ اس پر ارجنٹ کی مہر بھی لگی ہوئی ہے۔" پپا نے جلدی سے کاغذ لے کر اس پر نظریں دوڑائیں۔ جس اسپتال میں سلطان بابا داخل ہیں، وہاں سے خبر آئی ہے کہ اُن کی حالت ابتر ہے۔ تمہیں جلد از جلد ملک اپس پہنچنے کی تاکید کی گئی ہے۔" میرا جسم بے جان سا ہونے لگا۔ میں نے پاپا سے التجا کی۔ "کل صبح کی فلائٹ ے میں واپس جانا چاہتا ہوں۔ اس بار میری التجا رد نہ کیجئے گا۔" پپا نے گہری سی سانس لی اور اگلے روز ہم اکٹر البرٹ کے ہزار منع کرنے کے باوجود ہیتھرو ائر پورٹ کے ٹرمینل پر موجود تھے۔ گاڑی سے اُترتے ہی ری پہلی نظر جس شخص پر پڑی وہ گرو تھا۔

ایک اور عبداللہ

میں گرو کو دیکھ کر چونکا، دُور کہیں پس منظر میں مجھے ایمی اور پیٹر کی جھلک دکھائی دی۔ مجھے الوداع کہنے کے لیے اسپتال کے سارے عملے سمیت ایک ہجوم بے کراں اس وقت ہیتھرو ایئرپورٹ پر موجود تھا۔ گرو میری جانب بڑھا۔ ''تم نے واپسی میں بہت جلدی دکھائی۔ میرا خیال تھا تم کچھ دن مزید لندن میں بتاؤ گے تاکہ اپنی فتح کا لطف لے سکو...... لیکن میری توقعات کے برعکس شاید تمہیں ہر فتح کے بعد آگے بڑھ جانے کی عادت ہے۔'' میں نے غور سے گرو کی جانب دیکھا۔ ''تم اپنے ہر گزرتے دن کو یونہی فتح اور شکست کے پیمانے پر جانچتے رہے تو زندگی بہت مشکل ہو جائے گی تمہارے لیے صرف جیت اور ہار سے بہت بڑھ کر ہے یہ حیات۔ وقت ملے تو کبھی سوچنا۔'' میں آگے بڑھنے لگا لیکن گرو کی ڈوبتی آواز نے میرے قدم پھر روک دیئے۔ ''میرے لیے میرے عقیدے کی فتح سے بڑھ کر اور کچھ نہیں ہے لڑکے۔ اور میں آج تمہیں یہی بتانے کے لیے یہاں آیا ہوں کہ میری اور تمہاری ایک آخری جنگ ابھی باقی ہے۔ اور جانتے ہو، یہ جنگ کہاں ہوگی یروشلم میں۔'' میں چونک کر پلٹا۔ ''یروشلم میں......؟'' ''ہاں، بیت المقدس میں۔ میرا گیان کہتا ہے کہ تم سے میری اگلی ملاقات فلسطین میں ہوگی۔'' جانے کیوں اس لمحے گرو کی آنکھوں میں مجھے اُس زخمی بھیڑیے کی ایک جھلک دکھائی دی، جس کے پنجوں سے عین اُس وقت شکار چھین لیا گیا ہو، جب وہ اپنی کچھار میں معصوم میمنے کو چیر پھاڑ کرنے کی تیاری میں ہو۔ اور تب ہی مجھے اپنے عقب سے میمنے کی آواز سنائی دی۔ ''عبداللہ...... تم لیٹ ہو رہے ہو مین۔'' پیٹر اور ایمی بھیڑ کو چیرتے ہوئے میرے قریب پہنچ چکے تھے۔ دُور مما پپا، ڈاکٹر البرٹ اور عملے سے رُخصت لے رہے تھے اور ڈاکٹر البرٹ اس آخری لمحے میں پپا کو میرے لیے برتی جانے والی ہدایات کی فہرست دہرانے میں مصروف تھے۔ ایمی کی سدا برسنے والی آنکھیں آج بھی بن بادل برسات لیے تیار کھڑی تھیں۔ جانے یہ بہنیں اتنا بہت سا نمکین پانی کیسے جمع رکھ لیتی ہیں ان کٹوروں میں۔ میں نے پیٹر کا کالر درست کیا۔ ''کیسے ہو کھلنڈرے لڑکے؟ اپنا بہت خیال رکھنا اور ایمی کا بھی۔'' پیٹر کی آواز مجھے کہیں دُور سے آتی محسوس ہوئی۔ ''وہ اب ایمی نہیں رہی، آمنہ بن چکی ہے۔'' مجھے یوں لگا، جیسے سارا ایئرپورٹ ہی پل بھر میں رنگ و نور کی بارات میں نہا سا گیا ہو۔ ''کیا......؟ آمنہ......'' میں ایمی کی جانب پلٹا۔ اُس کی آنکھیں برس رہی تھیں۔ ''ہاں عبداللہ! میں نے سچ کی وہ راہ پالی ہے، جس کی ایک جھلک تم نے گزشتہ رات پورے لندن کو دکھائی تھی۔ دعا کرنا میں ثابت قدم رہوں۔'' میں نے گرو کے چہرے پر کالی آندھی سی چلتی دیکھی۔ لیکن شاید

نے ابھی کچھ مزید اندھیرا اس کی تقدیر کے لیے بچا رکھا تھا۔ آمنہ نے پیٹر کا ہاتھ تھاما اور اُسے میرے ھڑا کر دیا۔ ''اور یہ رہا اس راستے کا ایک اور راہی۔ اس نے اپنے نام کا حق تمہارے لیے بچا رکھا ہے۔ اس کا نیا نام تجویز کردو۔ جو اس راہِ حق پر تاعمر اس کے ساتھ رہے۔'' مجھے یوں لگا جیسے میری رُوح روشنی ر دی گئی ہو۔ نور کے جھماکے میرے چہرے سے چھلک کر آس پاس کھڑے لوگوں کے چہروں پر بھی ہو رہے تھے۔ مجھے احساس ہو رہا تھا جیسے میری لندن آمد کا مقصد پورا ہو گیا۔ ہمارے گرد الوداع کہنے کی دائرہ نما بھیڑ بڑھتی جا رہی تھی اور لاؤنج میں لگے اسپیکر، ہمارے جہاز کی روانگی کا آخری اعلان نشر کر تھے۔ میں نے پیٹر کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں تھام لیا۔ گرو کے اندر کا کرب شدید بے چینی کی صورت، اُس کے سے جھلک رہا تھا۔ اُس کا بس چلتا تو وہ چند لمحوں کے لیے اپنی ٹیلی پیتھی کے ذریعے سارے ایئرپورٹ ائی اور سماعت سلب کر لیتا تاکہ وہ دلوں کے پلٹنے کی کرامت نہ دیکھ سکیں۔ لیکن آج گرو بے بس تھا کہ راتیں رُونما ہوں تو تدبیریں دھری رہ جاتی ہیں۔ پیٹر کی پلکیں بھیگ رہی تھیں۔ میں نے اپنی ہتھیلی سے ذب کی۔ ''آج میں پیٹر کو وہ نام دیتا ہوں، جس نے میری کایا پلٹ کر رکھ دی۔ عبداللہ...... پیٹر آج سے اللہ ہے۔'' سارا ایئرپورٹ تالیوں سے گونج اُٹھا۔ عبداللہ نے بڑھ کر مجھے گلے لگا لیا۔ میرے سامنے میرا نیا جنم کھڑا تھا۔ ایک عبداللہ لندن سے پلٹ رہا تھا اور دوسرا اپنے اندر ایمان کی روشنی لیے فرنگ و یہودی لوں کی طرف قدم بڑھا رہا تھا، جہاں اب اُس کے لیے قدم قدم پر گرو جیسے فتنوں کی سازشوں کا جال بچھا میں نے رن وے سے ٹیک آف کرتے جہاز کی کھڑکی سے آخری بار دُھند میں لپٹے لندن کو دیکھتے ہوئے عا کی کہ ''یا میرے اللہ! ان دونوں بہن بھائی کی ہر مشکل آسان کرنا۔''

ایئرہوسٹس نے اخبار میرے حوالے کیا اور میری ٹانگوں پر پڑا کمبل درست کر کے آگے بڑھ گئی۔ تب ہی نظریں انگریزی اخبار کی ایک ذیلی سرخی پر جیسے جم سی گئیں۔ ''فلسطینی مسلمانوں کا قبلۂ اول کے ہوتی غیر قانونی کھدائی کے خلاف یروشلم کی سڑکوں پر مظاہرہ......'' میں نے جلدی سے پوری خبر پر نظر ائی، جس کا خلاصہ کچھ یوں تھا کہ برسوں سے یہودی کسی نہ کسی بہانے بیت المقدس کے گرد کھدائی جاری ے ہوئے ہیں، جس کا واحد مقصد ''ہیکل سلیمانی'' کی تلاش تھی صیہونیوں کا ایک گروہ اس بات پر یقین رکھتا کہ ان کا مقدس ترین نشان یعنی 'ہیکل سلیمانی' اسی قبلۂ اوّل کے نیچے کہیں دفن ہے، لہٰذا اس تک پہنچنے کا بیت المقدس کی بنیادوں سے ہی ہو کر گزرتا ہے۔ اس تلاش کے لیے انہیں (نعوذ باللہ) بیت المقدس کو روری تھا۔ میرے ذہن میں گرو کی آواز گونجی ''میری اور تمہاری آخری ملاقات بیت المقدس میں ہو ۔'' جانے کیوں میں نے اس لمحے اپنی رگوں میں ایک عجیب سی بے چینی پھیلتی محسوس کی، اور پھر اس بے چینی ب تک میرا پیچھا نہیں چھوڑا، جب تک جہاز کے پہیوں نے میرے شہر کی زمین کو چھو نہیں لیا۔ ایئرپورٹ نکلتے ہی مجھے سلطان بابا کی فکر نے یوں گھیرا کہ دنیا کی ہر یاد جیسے ذہن سے محو سی ہوگئی۔ ہم ایئرپورٹ سے

سیدھے اسپتال پہنچے تو پتا چلا کہ سلطان بابا ابھی تک کومے میں ہیں۔ مما پپا جانتے تھے کہ میں اب اسپتال سے
ٹلنے والا نہیں، لہٰذا وہ میری ضرورت کا سامان لینے گھر روانہ ہو گئے۔ میرے قدم اب میرا بوجھ سہار سکتے تھے
لیکن کمزوری کی وجہ سے ڈاکٹر البرٹ نے مزید کچھ روز کے لیے مجھے بیساکھی کا سہارا لینے کی تاکید کی تھی۔ اس
لیے میری ایک بیساکھی اب بھی راہ داری میں پڑے بنچ کے ساتھ ہی ٹکی ہوئی تھی، جہاں میں پچھلے دو گھنٹوں
سے بیٹھا ڈاکٹروں کے سلطان بابا کے کمرے سے نکلنے کا انتظار کر رہا تھا۔ میرے بالکل سامنے والی دیوار پر
شیشے کی قدِ آدم کھڑکیوں کا سلسلہ اس طرح سے جڑا تھا کہ باہر پھیلتی ملگجی شام کے ڈیرے دھیرے دھیرے
طویل برآمدے میں بھی اُترتے محسوس ہو رہے تھے۔ کبھی کبھی شام کچھ اس طور ڈھلتی ہے کہ ہمیں اپنے
سمیت سب کچھ ڈوبتا ہوا محسوس ہوتا ہے۔ زوال چاہے بھرپور دن کا ہو یا پھر کسی بھی عروج کا، ہمیشہ اُداس
جاتا ہے۔ میں بھی اُس ڈھلتی شام میں اُداسی کا گہرا نیلا رنگ اپنی نسوں میں اُترتے محسوس کر رہا تھا۔ اچانک
مجھے باہر کی جانب بل کھاتی اسپتال کی مرکزی سڑک پر ایک شناسا چہرہ نظر آیا۔ کون تھا وہ؟ اچانک ذہن نے
دوسرا جھماکہ ہوا۔ "ارے...... یہ تو انور تھا۔ زہرا کی مرسڈیز کا ڈرائیور۔" میرے قدموں میں جیسے بجلی سی بھر
اور میں بیساکھی بھول بھال کر لڑکھڑاتے قدموں سے باہر کی جانب لپکا۔ ایک نرس میری دیوانگی دیکھ کر بوکھلا
گئی اور جلدی سے ہاتھوں میں پکڑی ٹرے ایک جانب رکھ کر میری بیساکھی میرے حوالے کرنے لگی۔ لیکن اُس
وقفے میں انور میری آنکھوں سے اوجھل ہو چکا تھا۔ میں اس نیم اندھیری سڑک پر دُور تک بیساکھی کے
تقریباً دوڑتا چلا گیا، لیکن آس پاس گزرتے چہروں میں مجھے انور کا چہرہ کہیں نظر نہ آیا۔ مجھے یقین تھا کہ میں
انور ہی کو دیکھا تھا۔ اچانک ذہن میں ایک نئے خیال نے گھنٹی بجائی اور میں جلدی سے اسپتال کی پارکنگ
جانب لپکا، لیکن شاید تقدیر ہمیشہ تدبیر سے دو قدم آگے چلتی ہے، اور میں تو سدا کا تقدیر کا مارا تھا۔ لہٰذا جس
میں زہرا کی کالی مرسڈیز کار کی تلاش میں پارکنگ میں مارا مارا بھٹک رہا تھا، میں نے انور کو سفید رنگ کی ایک
ایم ڈبلیو میں پارکنگ کے آخری گیٹ سے نکلتے دیکھا۔ میرا ہوا میں اُٹھا ہاتھ اُٹھا ہی رہ گیا، لیکن گاڑی مجھ
اتنی دُور تھی کہ میں صرف ہونٹ ہلا کر رہ گیا اور آواز کہیں اندر ہی گھٹ کر رہ گئی۔ شاید کار کی پچھلی نشست پر
نے کسی کا ہیولا بھی دیکھا، لیکن کون، شاید وہ زہرا ہی ہو گی۔ میری آنکھوں سے دو آنسو بے اختیار نکلے
پارکنگ کے چمکیلے فرش پر کہیں لڑھک گئے۔ جن آنسوؤں کی قسمت میں کسی دلبر کا شانہ نہیں ہوتا، وہ یونہی خاک
میں مل کر ہمیشہ کے لیے فنا ہو جاتے ہیں۔ کاش میں بھی کسی کی آنکھ کا ایسا ہی ایک فانی آنسو ہوتا۔ جس
کے لیے میں ساری دنیا کا سفر طے کر کے واپس یہاں تک پہنچا تھا، وہ آج بھی مجھ سے اتنی ہی دُور تھی،
میری پہلی نظر کی خطا والے لمحے میں تھی۔ لیکن ایسی کیا وجہ ہو سکتی تھی کہ جس نے اُس کو میری خبر لینے سے
روکے رکھا۔ کہیں مما کے خدشات سچ تو نہیں تھے۔ ایک دیوانے ہوتے مجنوں کے لیے کون اپنی عمر برباد کر
کو تیار ہو گا۔ فرزانگی کا یہی تقاضا ہو گا کہ خاموشی سے اپنا دامن چھڑا لیا جائے۔ اور پھر یہاں سے لندن جا

وقت تو میری معذوری اور بیساکھیوں کے سہارے کا بھی سارا زمانہ شاہد تھا۔ دیوانے کو تو چلتے پھرتے بھی
برداشت کرنا مشکل ہوتا ہے۔ سو مجنوں اگر بیساکھیوں پر اپنا وجود گھسیٹتا پھرتا ہو تو پھر کسی بھی ہوش مند کو اپنے قدم
روک ہی لینے چاہئیں۔ لیکن کیا میری زہرا بھی ایسی ہی تھی۔ وہ صرف ایک بار مجھے اشارہ تو کرتی، میں خود اپنا
بوسیدہ جسم لے کر ہمیشہ کے لیے اُس کی دنیا سے دُور چلا جاتا۔ آخر، اُس نے ساحر کو اتنا کمزور کیوں جانا۔ جب
میں اپنی ہر سانس اُس کے نام کر چکا تھا، تو پھر خود اپنے ہاتھوں سے اپنا دم گھونٹنے میں بھلا مجھے کیا مشکل ہوتی۔
صرف ایک بار...... بس ایک بار وہ اپنے ابرو گرا کر اشارہ تو کرتی، میں جس قدر سوچتا رہا، اُسی قدر میرے اندر
کی اُلجھی ڈوریں مزید اُلجھتی گئیں۔ جب تک میں واپس سلطان بابا کے کمرے کے باہر والے برآمدے تک
پہنچا، تب تک رات اسپتال کے در و دیوار پر پوری طرح اپنی سیاہی مل چکی تھی۔ ہم انسان کتنے بھولے ہوتے
ہیں۔ روشنی کے چند فانوس اور برقی قمقمے جلا کر اور ان کی نامکمل روشنی کے دائروں میں بیٹھ کر یہ تصور کر لیتے
ہیں کہ ہم نے "رات" کو شکست دے دی۔ ہم کبھی نہیں سمجھ پاتے کہ رات تو ازل سے ہے اور ابد تک رہے
گی۔ تو بھلا ازل کو کیسی شکست۔ میرے اندر کی رات بھی ازلی تھی۔ میرے اندر کے اندھیرے بھی سدا کے
لیے تھے۔ اچانک ایک ڈاکٹر کی آواز اس اندھیرے میں کسی جگنو کی طرح لپکی۔ "آپ کے مریض کو ہوش
آ رہا ہے، جلدی کریں۔ یہ ہوش کا وقفہ نہایت عارضی بھی ہو سکتا ہے" میں تیزی سے اُٹھا۔ میری بیساکھی چکنے
فرش پر پھسلی اور میں گرتے گرتے بچا۔

جس وقت میں سلطان بابا کے کمرے میں داخل ہوا، تب تک وہ اپنی پلکیں دھیرے دھیرے کھول چکے
تھے۔ میری بیساکھی پر اُن کی نظر پڑی تو اُن کی آنکھوں کا وضو ہو گیا۔ میں نے تڑپ کر اُن کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں
تھام لیا۔ "کیوں ستاتے ہیں آپ مجھے اتنا۔ جلدی سے ٹھیک کیوں نہیں ہو جاتے۔ عبداللہ بہت تھک گیا
ہے۔ اسے اور نہ رلائیں۔" انہیں چپ کراتے کراتے خود میری آنکھیں برسنے لگیں۔ سلطان بابا کو نقاہت کی
وجہ سے بولنا بھی محال ہو رہا تھا۔ اُن کی سرگوشی نما آواز اُبھری۔ کیا ہے میاں...... ؟ رلاتے بھی خود ہو اور الزام
بھی ہم ہی کو دیتے ہو۔ یاد رہے، جب جب جو جو ہونا ہے...... تب تب سو سو ہوتا ہے۔ تمھیں ابھی بہت سی
ذمہ داریوں کا بوجھ اُٹھانا ہے۔ ابھی سے عبداللہ تھک گیا تو پھر......" اُن کی آواز ڈوب سی گئی۔ میں جو اُن کے
سینے پر سر رکھے رو رہا تھا، گھبرا کر جلدی سے اُٹھ بیٹھا۔ اُن کی پلکیں بند ہو رہی تھیں۔ میں نے جلدی سے ڈاکٹر
کو پکارا۔

نرس دوڑتی ہوئی کمرے سے باہر نکل گئی۔ کچھ ہی دیر سلطان بابا کو پھر سے آکسیجن اور مختلف انجکشن اور
ڈرپ کے کینولاز سے لاد دیا گیا۔ میں بے بسی سے اپنے ہونٹ کاٹتا وہیں کمرے کے ایک کونے میں بے دم سا
بیٹھا یہ سب کچھ دیکھتا رہا۔ اگر ہماری رُوح ہی سب کچھ ہے، تو پھر ہمیں اس نازک اور خستہ جسم کے اندر قید
کیوں کر دیا گیا ہے۔ ہمیں رُوح کی صورت ہی کیوں نہیں بھیجا گیا، اس فانی دُنیا میں۔ یہ روز روز اپنوں کے

بچھڑنے اور اُن کے جسم کے تڑپنے کی تکلیف سے تو نجات مل جاتی ہمیں۔ یہ کیسی سزا دے دی تھی قدرت نے ہمیں اس جسم کی قید کی صورت میں۔ میں ساری رات سلطان بابا کو جسم کی قید کی یہ سزا بھگتتے دیکھتا رہا۔ اُن کی سانس رُک رُک کر اور کچھ اس اذیت سے سینے کے پنجرے سے نکل رہی تھی کہ خود مجھے اپنے پھیپھڑوں میں بیک وقت ہزاروں چھریاں کھبتی محسوس ہو رہی تھیں۔ کبھی کبھی حلق سے سانس بھی کچھ اس طور نکلتی ہے، جیسے جسم سے رُوح۔ شاید وہ رات میری زندگی کی سب سے بھاری رات تھی۔ صبح تک خود میری رُوح بھی نہ جانے کتنی بار، جسم سے نکل کر واپس اس قید خانے میں داخل ہوئی۔ صبح کا اُجالا پھیلنے تک سلطان بابا کی طبیعت ذرا سنبھلی تو میں بھی باہر برآمدے میں نکل آیا۔ مما پاپا ناشتا لیے میرا انتظار کر رہے تھے۔ میں نے سوالیہ نظروں سے مما کی طرف دیکھا۔ وہ میرا مدعا سمجھ گئیں، لیکن اُن کی نظر جھکتی چلی گئی۔ اور میں اُن کے کچھ کہے بنا ہی سمجھ گیا کہ اُن کا زہرا سے اب تک کوئی رابطہ نہیں ہو پایا۔ اب تو یہ سوال خود ایک بوجھ بنتا جا رہا تھا۔ میں نے انور کا ذکر نہیں کیا۔ ناشتا کیا کرنا تھا میں مما کے اصرار پر چائے کے کچھ گھونٹ حلق سے نیچے اُنڈیل کر وہیں برآمدے کے بیچ پر اُن کی گود میں سر رکھ کے لیٹ گیا اور نہ جانے کس پل میری آنکھ لگ گئی۔ یہ ماں کی گود بھی کس قدر نشیلی ہوتی ہے۔ اندر چاہے کتنا ہی بڑا درد کیوں نہ پل رہا ہو، تھپک تھپک کر بن بولوں والی میٹھی لوری سنا کر سلا ہی دیتی ہے اور یہ مائیں بھی اپنی گود میں سر رکھے اپنے لاڈلے کے لیے کیسی سنگ مرمر کی مورت بنے بیٹھی رہتی ہیں۔ مجال ہے ذرہ برابر بھی جنبش ہو جائے ان کے جامد وجود میں۔ میری ماں بھی یونہی اکڑی بیٹھی رہی، تب تک، جب تک میری پلکیں دھیرے دھیرے دوبارہ کھل نہیں گئیں۔

دوپہر ہو رہی تھی۔ میں جلدی سے اُٹھ بیٹھا۔ مما کے گالوں پر اُن کے بہتے آنسوؤں کی دھاریں اب بھی موجود تھیں۔ میں نے جلدی سے اُن کا چہرہ اپنے ہاتھوں میں تھام لیا'' آپ رو رہی تھیں۔ اتنی دیر ہو گئی مما۔ آپ نے مجھے جگایا کیوں نہیں......؟'' وہ مسکرا دیں۔''بڑی مشکل سے اپنے آنسو تمہاری پلکوں پر گرنے سے روکے رکھے میں نے۔ میرا عبداللہ برسوں بعد میری گود میں سر رکھ کر سویا تھا، کیسے جگا دیتی......؟'' مما اب مجھے ساحر کی جگہ عبداللہ کے نام ہی سے پکارتی تھیں اور میں جانتا تھا کہ وہ اپنے سیاہ نصیب بیٹے کے کالے مقدروں پر آنسو بہا رہی تھیں۔ سلطان بابا اُسی طرح اپنے کمرے میں بے سدھ پڑے ہوئے تھے۔ میں شام سے ذرا پہلے کسی شکستہ اُمید کی آس لیے پارکنگ کی طرف جانے والی سڑک کے کنارے بچھے ایک بیچ پر آ کر بیٹھ گیا۔ بھکاریوں کو تو سدا راہ میں بیٹھے رہنا ہوتا ہے۔ چاہے بھیک کا سکہ کشکول میں پڑے یا خالی کشکول لے کر ہی رات گئے گھر واپس لوٹنا پڑے۔ میں بھی اپنے نصیب کا خالی کشکول لیے، تقدیر کی راہ پر بیٹھا اندر آنے والی ہر گاڑی کو اُسی نظر سے دیکھنے لگا، جیسے کوئی گداگر چمکتے سکوں کو دیکھتا ہے اور پھر میرے نصیب کا سکہ چمکا۔ میں ہیجانی انداز میں کھڑا ہو گیا۔ سفید بی ایم ڈبلیو نے لمبا سا موڑ کاٹا اور پارکنگ کی جانب بڑھی۔ میں تیزی سے سڑک کی جانب لپکا۔ جلدی میں بیساکھی مجھ سے چھوٹ گئی اور میں منہ کے بل ٹھیک اُسی گاڑی کے سامنے

گرا۔ کار نے زور کی بریک لگائی۔ ڈرائیور غصے میں بکتا جھکتا گاڑی سے اُترا۔''مرنے کا ارادہ ہے کیا؟''میں نے اپنا خاک آلود چہرہ اُوپر اُٹھایا۔''مار ہی ڈالو، لیکن دھیان رہے کہ پوری موت دینا۔ تڑپتے ہوئے نہ چھوڑ جانا......'' انور کو ایک زور کا جھٹکا لگا۔ وہ تڑپ کر میری جانب لپکا۔''ارے...... ساحر بابا...... آپ، یہ کیا حال بنا رکھا ہے۔ آپ نے......'' انور نے جلدی سے اپنی جیب سے رُومال نکال کر میرے چہرے کی خاک صاف کی۔ کاش قدرت ایسے رُومال بھی بنا دیتی جو ہمارے مقدروں پر پڑی گرد بھی جھاڑ سکتے۔ انور نے جلدی سے گاڑی ایک جانب پارک کی اور میرے قریب اُسی بیچ پر آ بیٹھا، جہاں میری بیساکھی پڑی ہوئی تھی۔ وہ رو پڑا''ساحر بابا...... یہ کیا......؟ آپ ابھی تک......؟''میری تلخی زبان پر آ ہی گئی''ہاں...... میں ابھی تک معذور ہوں...... کیا تم بھی اپنی مالکن کی طرح معذوروں سے کوئی واسطہ نہیں رکھتے؟'' انور نے جلدی سے اپنے ہاتھ جوڑے''میرے بچے آپ پر قربان ہوں ساحر بابا! ایسا کیوں کہا آپ نے......؟'' پھر نہ جانے کیوں وہ خود ہی کچھ کہتے کہتے چپ سا ہو گیا۔ شاید وہ میرا مدعا سمجھ گیا تھا۔''کیا آپ کی زہرا بی بی سے ملاقات نہیں ہوئی؟''میں روہانسا ہو گیا۔''نہیں انور...... تمہاری زہرا بی بی مجھ سے کہیں کھو گئی ہے۔ کیا تم مجھے اُس سے ایک بار ملوا سکتے ہو......؟'' انور کچھ دیر چپ رہا پھر اُس نے دھیمے لہجے میں مجھے بتایا کہ وہ اب زہرا کے ہاں نوکری نہیں کرتا۔ کسی ذاتی مجبوری کی وجہ سے اب وہ شہر کے معروف صنعت کار، کمال صاحب کے ہاں ڈرائیور تھا اور یہ سفید بی ایم ڈبلیو بھی اُنہی کی تھی۔ انور یہاں اپنے مالک کے کسی جاننے والے مریض کے لیے کھانا وغیرہ لے کر آتا تھا۔ مجھے نہ جانے ایسا کیوں لگا کہ انور مجھ سے کچھ چھپا رہا ہے۔ میں نے اُس سے زہرا کا پتا پوچھا۔ کیوں کہ اُس کے پرانے گھر پر سوائے نوکروں کے اور کوئی شخص موجود نہ تھا۔ انور نے جھجکتے ہوئے بتایا کہ زہرا کے ابا کا اسی شہر کے مضافات میں ایک اور بہت بڑا بنگلا ہے، جو سالوں سے بند پڑا تھا، لیکن کچھ عرصہ پہلے اچانک نہ جانے کس وجہ سے برسوں سے بند پڑے کواڑ کھول کر پھر سے تازہ قلعی پھروائی گئی اور سب ہی گھر والے وہاں منتقل ہو گئے۔ میں نے لمبی سی سانس لی، تب ہی زہرا کے پرانے گھر پر ہمارا فون اُٹھانے والا بھی کوئی نہیں بچا۔ انور کی آنکھیں بار بار چھلک جاتی تھیں۔ اُسے میرے ساحر سے عبداللہ بننے تک کا پورا احوال معلوم تھا اور یہ انور ہی تھا، جس کی گاڑی دیکھ کر میں پہلی مرتبہ درگاہ پر رُکا تھا۔ میں نے انور سے زہرا کے دوسرے گھر کا پتا پوچھا۔ وہ کچھ ہکلایا۔''آپ وہاں نہ جاؤ ساحر بابا...... میرا مطلب ہے پہلے آپ پوری طرح ٹھیک ہو جاؤ۔ پھر جانا۔ ابھی آپ کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔''میں نے غور سے انور کو دیکھا''تم جانتے ہو انور، میرا جنون اُس مقام پر ہے، جہاں مجھے منزل تک پہنچنے کے لیے راستوں کی ضرورت نہیں پڑتی۔ میں جس راستے پر بھی چلوں وہ راستہ خود مجھے زہرا کی چوکھٹ پر پہنچا دے گا۔ تم اگر مجھے آزمانا چاہتے ہو تو یونہی سہی۔'' میں جانے کے لیے اُٹھ کھڑا ہوا۔ انور نے لپک کر میرا ہاتھ پکڑ لیا۔''ساحر بابا...... میں آپ کو بھی خوب جانتا ہوں اور آپ کی دیوانگی کو بھی۔ میں نے آپ کی نظر کی تپش سے سخت فولاد کو پگھلتے دیکھا ہے۔ لیکن میری آپ

سے التجا ہے کہ ابھی وہاں نہ جاؤ، جہاں تک میری معلومات ہیں، اس ماہ زہرا بی بی کی منگنی کی تیاری ہے
پر...... خرم میاں اِسی شہر کے ایک بڑے رئیس کی اکلوتی اولاد ہیں۔ میں آپ سے منت کرتا ہوں، آپ وہاں نہ
جائیں۔ اِسی میں شاید سب کی بھلائی ہے"۔ انور نہ جانے اور کیا کچھ کہتا رہا لیکن میرے کانوں میں وہ پہلے ہی
ایک ایسا پگھلا سیسہ اُنڈیل چکا تھا کہ جس کے بعد میری سماعتوں کو اور کچھ سننے کا چارا ہی نہ تھا میں وہیں کا وہیں
ڈھے گیا۔

جانشین

جاتے جاتے انور میری حالت کے پیش نظر مجھے زہرا کے دوسرے مکان کا پتہ دے گیا بلکہ اُس نے مجھ
سے وعدہ کیا کہ وہ خود مجھے وہاں لے کر جائے گا لیکن اب بھلا میرا وہاں کیا کام تھا۔ میرا ہم سفر تو اپنی راہ بدل
چکا تھا، پھر وہاں جا کر اُس کی راہ کھوٹی کرنے سے بھلا کیا فائدہ۔ پتا نہیں کیوں لیکن مجھے ہمیشہ سے اپنی وفا کی
دہائیاں دینے والے بہت بُرے لگتے تھے۔ جیسے وہ اپنے کسی اَن مول جذبے کی توہین کر رہے ہوں۔ وہ وفا ہی
کیا، جسے رُو کر اور دہائی دے کر بیان کرنا پڑے۔ اگر دنیا کا بازار ہی کھوٹا ہے تو پھر اپنے وفا کے چمکتے سکے کی بے
قدری کرنا فضول ہی تو ٹھہرا۔ بے وفائی کی سولی چڑھنا ہی مقدر ہو تو پھر خاموشی سے چپ چاپ یہ پھندا اپنے
گلے میں ڈال لینا چاہیے۔ چیخ و پکار کر کے اور زمانے بھر کو اپنی رُسوائی کا تماشا دکھا کر خود کو کم ظرف ثابت کرنا
مجھے کبھی گوارہ نہ تھا لیکن یہ دل...... ہاں...... یہ دل ہی تو ہمیں عرش سے فرش پر لا پھینکتا ہے۔ ہماری خودداری،
ہماری...... ہمارا سب کچھ، اِسی دل کے پاس ہی تو گروی پڑا رہتا ہے۔ تب ہی یہ ہماری انا اور خودداری کے سودے
سر بازار کرتا پھرتا ہے۔ ایک لمحہ پہلے ہم جس ارادے کا اٹل فیصلہ کر کے سکون کا ایک سانس بھی پوری طرح نہیں
لے پاتے کہ دوسرے ہی لمحے یہ ہمارا فیصلہ بدل دیتا ہے۔ ہمیں پھر سے اُسی بے چینی اور اُسی تڑپ کی تنگی
گھاٹیوں کے جنگل میں لا پھینکتا ہے، جہاں پل پل مرنا ہی ہمارا مقدر ٹھہرتا ہے۔ ہم لوگوں کی اور خود اپنی نظر میں
گرتے چلے جاتے ہیں۔ بار بار فیصلے بدلتے ہیں، ارادے باندھتے ہیں، پھر توڑ دیتے ہیں، لیکن کچھ حاصل
نہیں ہوتا۔ خود اپنا آپ بیچ کر بھی ہم اس دلبر کو جیت نہیں سکتے، جس کے لیے ہم اپنے اس دشمن دل کے ہاتھوں
اپنی ذلت بھگت رہے ہوتے ہیں۔ میں بھی پوری رات اُسی عذاب سے گزرتا رہا۔ ایک پل میں مجھے یوں
محسوس ہوتا ہے کہ آج کے بعد مجھے کبھی زہرا کی چوکھٹ کا رُخ نہیں کرنا چاہیے، پھر دوسرے ہی پل میرا دل کوئی
...ہرا پتا پھینک دیتا۔ 'نہیں، ضرور اُس کی کوئی مجبوری ہوئی ہوگی۔ ورنہ وہ ایسی تو نہ تھی۔" میں پھر تڑپ کر
کروٹ بدلتا۔ "تو کیا مجھے ایک آخری بار اُس سے مل کر سب سوالوں کے جواب نہیں مانگ لینے چاہییں......؟
نہیں، اُسے تمہاری اتنی فکر ہوتی، تو وہ خود آ کر تم سے اپنی مجبوری بیان کر دیتی۔ اب خبردار جو تم نے اُس جانب کا
رُخ بھی کیا تو......" اِسی ادھیڑ بن میں ساری رات گزر گئی لیکن بعض مرتبہ ہمارے رات کے اندھیرے میں کیے
گئے فیصلے دن کے اُجالے کے ساتھ ہی اُس تاریکی کی طرح غائب ہو جاتے ہیں، جو صرف رات کا خاصہ ہوتی
ہے۔ رات ہمیں بہت بہادر بنا دیتی ہے اور دن پھر سے ہمارے نازک دل کو مسل کر خوف، خدشات اور

وسوسوں سے بھر دیتا ہے۔ اس کش مکش کا نتیجہ یہ نکلا کہ مجھے شدید تیز بخار نے آگھیرا۔ میں ابھی تک سلطان بابا کے کمرے سے ملحق ملاقاتیوں کے کمرے ہی میں لیٹا ہوا تھا۔ پپا نے میری بگڑی حالت دیکھی تو دوڑ کر ڈاکٹر کو بلا لائے۔ مما ٹھنڈی پٹیاں میری پیشانی پر رکھ کر نہ جانے کیا پڑھ پڑھ کر پھونکتی گئیں۔ یہ مائیں بھی کتنی بھولی ہوتی ہیں۔ انہیں اتنی خبر بھی نہیں ہوتی کہ انہیں اپنی اولاد کے لیے کسی خاص وظیفے کی ضرورت بھلا کب ہوتی ہے۔ وہ تو بس خالی پھونک ہی ماردیں تو اُن کی محبت کی معجزاتی تاثیر اولاد کے لیے کافی ہوتی ہے۔ ڈاکٹروں نے فیصلہ کیا کہ اگر شام تک میرا بخار نہ اُترا تو مجھے بھی اسپتال میں داخل کرلیا جائے گا۔ شام تک میری حالت تو کیا سنبھلتی، البتہ سلطان بابا کی سانسیں پھر اُکھڑنے لگیں اور پھر میں نے کچھ شناسا چہروں کو اسپتال کی راہداری میں چلتے دیکھا۔ ارے...... یہ تو سب سے آگے حاکم بابا تھے، پھر مولوی خضر، پھر عامر، ہاں، وہی پہلا عبداللہ جس نے اپنی گدی مجھے سونپی تھی اور پھر آخر میں نعمان...... وہ جسے میں عبداللہ کے لقب کے ساتھ ساحل والی درگاہ کا انتظام سونپ کر آیا تھا اور بھی کچھ لوگ تھے، لیکن میں اُن کے نورانی چہروں میں اپنی پہچان کی کوئی شبیہ تلاش نہیں کر پایا۔ وہ سب لوگ چلتے ہوئے میرے بستر کے گرد جمع ہوگئے۔ حاکم بابا نے میرا ہاتھ تھام لیا ''میرے جوگی کا سفر ابھی ختم نہیں ہوا شاید...... کیا سب ہی بازیاں تم ہی مار جاؤ گے میاں۔'' میں نے اُٹھنے کی کوشش کی، لیکن پہلے عبداللہ نے میرا کاندھا دبا کر مجھے لیٹے رہنے کا اشارہ کیا۔ میری آواز میں نقاہت تھی۔ ''آپ سب ایک ساتھ...... یہاں کیسے......؟'' ''ہمیں سلطان بابا نے یاد کیا تھا۔ اُن کے حکم کی تعمیل میں آئے ہیں۔'' میں نے حیرت سے اُن سب کی طرف دیکھا ''لیکن سلطان بابا تو...... میرا مطلب ہے کہ کیا حکم......؟'' مولوی خضر نے مسکرا کر میری جانب دیکھا ''اب بھی وہی سوال کرنے کی عادت...... ہم سلطان بابا کو لے جانے آئے ہیں۔ وہ حجاز مقدس کی زیارت کو جانا چاہتے ہیں۔ ہم سب انہیں رُخصت کرنے آئے ہیں۔'' میں تڑپ کر اُٹھ بیٹھا۔ ''حجاز مقدس۔ لیکن وہ تو بہت بیمار ہیں، وہ اتنا لمبا سفر کیسے کریں گے؟'' حاکم بابا نے مجھے یوں دیکھا جیسے کوئی بزرگ کسی ضدی بچے کو دیکھتا ہے اور پھر انہوں نے میرے سر کو یوں تھپتھپایا جیسے کہہ رہے ہوں کہ ''فکر نہ کرو بچے، سب ٹھیک ہو جائے گا۔'' نہ جانے اُن کے ہاتھوں میں کیسا جادو تھا کہ میں پل بھر ہی میں مدہوش سا ہوگیا۔ مجھ پر غنودگی کا شدید حملہ ہوا اور پلکیں بوجھل ہو کر خود بخود گرتی چلی گئیں۔ تب ہی مجھے یوں لگا جیسے کوئی ہولے ہولے میرا شانہ ہلا رہا ہو۔ پھر مجھے دُور کہیں سے پاپا کی آواز سنائی دی'' آنکھیں کھولو بیٹا۔ دیکھو شام ڈھل رہی ہے۔'' میں نے نقاہت کے بوجھ تلے دبے پپوٹوں کو دھیرے دھیرے کھولا۔ میرا جسم پسینے سے تر تھا، مطلب بخار اُتر چکا تھا، لیکن وہ جو کچھ میں ابھی چند لمحوں پہلے محسوس کر رہا تھا، وہ سب کیا صرف ایک خواب تھا۔

میں نے جلدی سے اِدھر اُدھر کمرے میں نظر دوڑائی، لیکن وہاں نہ تو مولوی خضر موجود تھے اور نہ ہی حاکم بابا...... باقی سب لوگ بھی نہ جانے کہاں چلے گئے تھے۔ میں نے پاس بیٹھی مما سے پوچھا کہ ''کیا ابھی کچھ دیر

پہلے یہاں ساحلی درگاہ سے کچھ ملاقاتی آئے تھے......؟'' مما نے نفی میں سر ہلا دیا۔ مجھے کچھ سمجھ نہیں آیا کہ یہ کیسا خواب تھا۔ اتنے میں نرس نے آ کر بتایا کہ سلطان بابا کی بے ہوشی کا وقفہ کچھ دیر کے لیے پھر ٹوٹ گیا ہے۔ میں لپک کر اُن کے بستر کے قریب پہنچا مجھے دیکھ کر وہ دھیمے سے مسکرائے۔ میں نے اُن کے اشارے پر اپنا کان اُن کے ہونٹوں کے قریب کر دیا اُن کی آواز بمشکل مجھ تک پہنچ رہی تھی۔ ''ساحر میاں! اب عارضی جدائی کا وقت ہو چلا ہے۔ میں اپنے حواس کی آخری حد سے پہلے حجاز کے سفر پر جانا چاہتا ہوں۔ میں نے حاکم اور خضر کو پیغام بھیج دیا ہے۔ بس، اب تم بھی مجھے رُخصت کر دو۔'' میری بدحواسی فزوں تر ہوگئی۔ ''یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں۔ آپ اس حالت میں کیسے جا سکتے ہیں۔ اور پھر جانا طے ہی ہے تو میں بھی آپ کے ساتھ ہی جاؤں گا۔ جہاں سلطان بابا، وہیں عبداللہ۔ آپ نے اکیلے سفر کا تصور بھی کیسے کر لیا؟'' اُن کی مسکراہٹ گہری، لیکن آواز دُور ہوتی گئی۔ ''عبداللہ بھلا سلطان سے کب جُدا ہوا ہے۔ لیکن تمہیں یہاں ابھی میرے بہت سے اُدھورے کام سر انجام دینا ہیں، لہٰذا تمہارا یہیں رُکنا ضروری ہے۔ اور یاد رہے، ثابت قدم رہنا۔ وقت کی آندھی اپنا آخری زور ضرور لگائے گی تمہارے قدم اُکھاڑنے کی کوشش بھرپور کرے گی، مگر تمہیں جمے رہنا ہوگا۔ یہی میرا آخری حکم ہے۔'' میں نے اپنے آنسو روکنے کی کوشش کی لیکن پھر بھی اُن کی ہتھیلیوں کی پشت بھیگتی چلی گئی۔ ''لیکن میں یہاں اکیلا کیسے رہ پاؤں گا۔ مجھے تو ابھی ٹھیک سے چلنا بھی نہیں آتا اور آپ مجھے براہِ راست دوڑ کے میدان میں دھکیلے جا رہے ہیں۔ میں ٹوٹ جاؤں گا آپ کے بنا......'' اُن کی آواز ٹوٹ کر اُبھر رہی تھی۔ ''کوئی کبھی کسی کے ساتھ ہمیشہ نہیں رہتا ساحر میاں۔ ہم سب کو ایک نہ ایک دن جدا ہو جانا ہے۔ لیکن اطمینان رکھو، یہ جدائی صرف اس خاکی جسم کی جدائی ہوگی۔ سلطان بابا ہمیشہ تمہارے آس پاس موجود رہے گا۔ اب مسکرا کر میری طرف دیکھو ایک بار۔ تم نے سلطان کو بھی اپنے سحر کے حصار میں لے ہی لیا میاں۔ واقعی پکے ساحر ہو۔'' میں اُن کے لبوں پر مسکراہٹ دیکھ کر خود بھی اُن کی دل جوئی کے لیے مسکرا دیا۔ انہوں نے اپنا لرزتا ہاتھ میرے سر پر رکھا اور پھر غنودگی میں ڈوبتے گئے۔ مجھے کچھ سمجھ نہیں آرہا تھا کہ یہ سب کیا ہو رہا ہے؟ سلطان بابا نے حجاز جانے کی جس خواہش کا اظہار کیا تھا اُن کی وہ تمنا کیسے پوری ہوگی۔ اور سلطان بابا یہ جدائی کی بات بار بار کیوں کر رہے تھے؟ انہی اُلجھنوں میں گھرے جانے کب صبح کا سورج بھی نمودار ہوگیا۔ صبح اُن کا معائنہ کرنے والے ڈاکٹروں کی ٹیم کے چہرے پر مایوسی کے اثرات میں صاف طور پر محسوس کر سکتا تھا۔ مجھے اُسی ہجوم میں کسی ڈاکٹر کی سرگوشی سنائی دی۔ ''صرف دماغ ہی کام کر رہا ہے، باقی تمام اعضاء تقریباً کام چھوڑ چکے۔'' میرا جی چاہا کہ میں اس شخص کا گریبان پکڑ لوں اور چیخ چیخ کر پورے اسپتال سے کہوں کہ یہ سب جھوٹ ہے۔ ابھی چند گھنٹے پہلے ہی تو انہوں نے مجھ سے بات کی تھی۔ میں نے خود اپنے ہاتھوں اُن کے منہ میں پانی ٹپکایا تھا۔ پھر یہ ڈاکٹر کیا اناپ شناپ بولے جا رہا تھا۔ اچانک ایک دوسرا ڈاکٹر ہاتھ میں ایک کاغذ لیے کمرے میں نمودار ہوا۔ ''سعودیہ اسپتال کا فیکس آ گیا ہے، ڈاکٹر حیات بن حبیب نے مریض کو حجاز منتقل کرنے کی

اجازت دے دی ہے۔اب ان کے علاج کی آخری اُمید بس ڈاکٹر حیات ہی ہیں۔لیکن مسئلہ یہ ہے کہ اجازت نامے پر دستخط کون کرے گا؟ ان کا کوئی قریبی عزیز بھی تو نہیں ہے آس پاس۔" سب کی نظر میری جانب اُٹھ گئی۔ مجھے سمجھ نہیں آیا کہ سلطان بابا کی تمنا پوری ہونے پر ہنسوں یا اُن کے جدا ہونے پر زور زور سے روؤں۔ جانے ڈاکٹر حیات بن حبیب کون تھے اور اُن کا سلطان بابا کی بیماری سے کیا تعلق تھا۔لیکن اتنا تو صاف ظاہر تھا کہ سلطان بابا نے اپنے حجاز کے سفر کی تیاری مکمل کر لی تھی۔ میں نے اجازت نامے پر اُن کے شاگرد کے طور پر دستخط کر دیئے اور ضمانت نامہ بھی بھر دیا کہ کسی بھی اَن ہونی کی ذمہ داری میری ہوگی۔ یہ نادان طبیب کیا جانیں کہ جو اَن ہونی ہونی تھی، وہ تو ہونے جا رہی تھی۔ میرے جسم سے جیسے میری رُوح جدا ہو رہی تھی۔ سلطان بابا کے چہرے پر کومے کی حالت میں بھی ایسا سکون آمیز تاثر تھا، جیسے گہری نیند سو رہے ہوں۔ایک بار میرے جی میں آیا کہ اُن سے کیا وعدہ توڑ دوں اور اُن کی حکم عدولی کرتے ہوئے، میں بھی اُسی جہاز پر سوار ہو جاؤں، جو ابھی کچھ دیر بعد انہیں لے کر حجاز کی مقدس سرزمین کے لیے روانہ ہونے والا تھا۔لیکن ایمبولینس سے اُترتے ہی میرے دل کا یہ چور بھی پکڑا گیا۔

مریضوں کے لیے بنائی گئی خصوصی راہ داری جو اسٹریچر سمیت مریض کو سیدھا رن وے تک لے کر جاتی تھی، اس کے سرے پر مجھے حاکم بابا اور مولوی خضر سمیت اپنے پرانے سب ہی ساتھی انتظار کرتے ہوئے دکھائی دیئے۔اب مجھے ان باتوں پر حیرت نہیں ہوتی تھی۔ شاید رفتہ رفتہ میں خود بھی اِسی غیر مرئی نظام کا حصہ بنتا جا رہا تھا، جو سلطان بابا کے اردگرد اور اُن کے معتقدین کے درمیان رابطے کا ذریعہ تھا۔تب ہی مجھے پتا چلا کہ حاکم بابا اس سفر میں سلطان بابا کے ہم سفر ہوں گے۔کتنا بے بس تھا میں اس لمحے۔ مجھے یوں محسوس ہو رہا تھا کہ بیماری تو صرف ایک بہانہ ہے۔سلطان بابا نے خُدا کے گھر کی زیارت کرنی تھی اور بس...... وہ جانتے تھے کہ میں انہیں اکیلے کہیں نہیں جانے دوں گا، لہٰذا انہوں نے چپ سادھ کر میری ضد کا راستہ ہی بند کر ڈالا تھا۔ حاکم بابا بہت دیر تک مجھے سینے سے لگا کر تھپکتے رہے۔ کچھ سفر آغاز ہی سے اپنا انجام بیان کر دیتے ہیں۔ مجھے بھی یوں محسوس ہو رہا تھا کہ میرے علاوہ وہاں موجود سب ہی لوگ اس انجام سے واقف ہیں۔صرف ایک میں ہی ہوں ان سب میں ایسا کم ظرف تھا جسے کچھ سجھائی نہیں دے رہا تھا۔ کچھ دیر بعد میں فضا میں ہوائی جہاز کو بلند ہوتے ہوئے دیکھ رہا تھا۔ جانے کیوں میرے دل سے ایک خاموش صدا نکلی......"الوداع......" کبھی کبھی ہماری زندگی میں اچانک ہی کچھ ایسے خلا پیدا ہو جاتے ہیں کہ ہمیں خود اپنا آپ ہوا میں معلق نظر آتا ہے، کچھ ایسی ہی میری بھی صورت حال تھی۔ مولوی خضر نے مجھے مشورہ دیا کہ میں رات گزارنے کے لیے گھر چلا جاؤں اور جی چاہے تو صبح ساحل والی پرانی درگاہ پر آ جاؤں۔

گھر کے گیٹ سے اندر داخل ہوتے ہی نہ جانے کیوں اسی پرانے ساحر کی یاد نے شدت سے آ گھیرا۔ شاید اس یاد کے پیچھے بھی زہرا کی سلگتی یادوں کے انگاروں کی آنچ اور حدت موجود تھی۔ مجھے ساحر اس لیے بھی

...وہ جھپٹ کر چھین لینے کا عادی تھا، جب کہ اس کے برعکس عبداللہ خود اپنی دنیا لٹتے دیکھ کر بھی ہونٹ ...ٹھا تھا۔آج اگر وہ پرانا ساحر ہوتا تو کسی کیا مجال تھی کہ وہ یوں اطمینان سے اُس کی محبت کو چھین کر لے ...وہ زہرا کے محل کی چوکھٹ پر جا بیٹھتا اور اپنی قضا یا پھر زہرا کا ہاتھ، کوئی ایک سوغات لے کر ہی واپس ...لیکن یہ کیسا المیہ تھا کہ سلطان بابا نے میرے اندر کے ساحر کی تمام گرہیں عبداللہ نام کی عاجزی سے باندھ ...ں۔جب ہم مجبور اور لاچار انسان بہت زیادہ بے بس ہو جاتے ہیں تو ہمارا جھگڑا، ہمارے خدا سے شروع ...ہے۔ہمیں اپنے گزشتہ تمام گناہ جائز لگنے لگتے ہیں اور ہمارے دل میں کہیں دُور یہ خواہش انگڑائیاں ...ہے کہ ہمارا خدا بھی ہمیں اُسی طرح منا لے، جس طرح کسی بے جا ضد پر رات کو کھانا کھائے بغیر سو ...ہماری ماں مناتی ہے۔ بالوں میں اُنگلیاں پھیر کر، کبھی گدگدا کر اور کبھی رُو کر...... میں بھی اپنے خدا سے ...سا بنا کھانا کھائے بستر پر جا کر لیٹ گیا۔ جب انتقام لینے کے لیے کوئی ہستی میسر نہ ہو پھر انسان خود ...پ سے انتقام لینے پر مجبور ہو جاتا ہے۔اور میں تو خود ہی اپنے آپ کا سب سے بڑا دشمن تھا۔ مجھے بھلا ...ور دشمن کی ضرورت ہی کب تھی، لہٰذا میں خود ہی اپنی رُوح کو غم، دُکھ اور جلن کی برچھیاں گھونپتا، نہ جانے ...نیند کی وادی میں پہنچ گیا۔تب ہی مجھے یوں لگا جیسے سلطان بابا میرے پلکیں موندنے کے انتظار ہی میں ...پتلیوں کے پیچھے کہیں چھپے بیٹھے تھے۔اُن کا لباس سفید اور تسبیح کا رنگ دُودھیا تھا۔دُور پس منظر میں سبز ...ی ہلکی سی پرچھائیں دکھائی دے رہی تھی۔ سلطان بابا کے چہرے پر خلاف معمول بے حد تازگی اور ...ت کے آثار نمایاں تھے۔انہوں نے تر و تازہ لہجے میں مجھے اُسی طرح چھیڑ کر مخاطب کیا جو اس دنیا میں بس ...اخاصہ تھا۔" کیوں میاں! تمہاری خدا سے ضد کی عادت نہ گئی۔کبھی دو گھڑی کے لیے اپنے اندر کی اس ...ور وک بھی لیا کرو۔ کیوں خود کو ہر پل لہولہان کیے رکھتے ہو۔" میرے لہجے میں شکوہ تھا" آپ کو اس سے ...؟ آپ تو مجھے تنہا چھوڑ گئے نا...... یہ جانتے ہوئے بھی کہ میں اس راہ پر آپ کا ہاتھ پکڑے بنا ایک قدم ...گے نہیں چل سکتا۔ پھر بھی آپ مجھے یوں ہی درمیان بھی بھٹکتا چھوڑ کر چل دیئے۔" سلطان بابا دھیرے ...رائے۔" پرندے کو پرواز سکھانے کے لیے اُس کے اپنے شہپر کو بھی ایک مرتبہ اُسے چوٹی سے نیچے پھینکنا ...تا ہے۔ یہ اس نوزائیدہ کے پر کھولنے کے لیے ضروری ہوتا ہے۔ مخالف ہوا کا دباؤ، تیزی سے قریب آتی ...، زمین کی کشش اور آندھی جیسی چنگھاڑتی آوازیں اس شاہین بچے کو اپنے پنکھ پھڑپھڑانے پر مجبور کر ہی ...با۔" میں گڑگڑایا" لیکن میرے پر تو پہلے ہی کسی کے ناکام عشق نے کاٹ دیئے ہیں۔ مجھے پرواز کا سبق ...لا گئے آپ۔ میری اُڑان تو بھرنے سے پہلے ہی کسی کی زہریلی محبت نے گھونٹ دی ہے۔اب میرا مقدر ...چوٹی سے نیچے کی جانب جھانکتی قاتل چٹانوں سے ٹکرا کر پاش پاش ہو جانا ہے۔فنا ہی میرا مقدر ہے، ...افسوس کہ میری تباہی کا یہ منظر دیکھنے کے لیے آپ یہاں نہیں ہیں۔ کم از کم مجھے آخری کندھا تو دے ...۔" میری آواز خلا میں بھٹک کر واپس آ گئی اور اگلے ہی لمحے میری آنکھ کھل گئی۔ پھر پوری رات میں

کروٹیں ہی بدلتا رہا۔

شاید وہ فجر سے ذرا پہلے کی کوئی ساعت تھی، جب کسی نے گھبرائے ہوئے لہجے میں میرے کمر
دروازہ دھڑ دھڑایا۔ میں نے ہڑ بڑا کر جلدی سے دروازہ کھولا تو مما اور پپا دونوں ہی تاریک چہرے لیے با
موجود تھے۔ میری سانسیں اٹکنے لگیں۔ "کیا ہوا......؟" مما نے کچھ کہنے کی کوشش کی لیکن اُن کی آواز اندر
گھٹ گئی اور وہ رونے لگیں" میں نے پپا کو پکڑ کر جھنجھوڑا...... "خدا کے لیے کچھ تو بولیں......" پاپا نے میر
کاندھے زور سے تھام لیے۔ "ابھی ابھی درگاہ سے مولوی خضر کا پیغام آیا ہے، سلطان بابا اب ہمارے درمیا
نہیں رہے......" میری سماعتیں شل ہو گئیں۔ اس کے بعد پپا نہ جانے کیا بولتے رہے مجھے صرف اُن کے لب
ہلتے ہوئے محسوس ہوئے۔ شاید میں وہیں گھٹنوں کے بل زمین پر گر بھی گیا تھا اور شاید نیچے ڈھتے د
دروازے کی چوکھٹ میرے سر سے ٹکرائی بھی تھی کیوں کہ میں نے مما کو جلدی سے اپنا دوپٹہ پھاڑ کر سر پر
باندھتے محسوس کیا، لیکن کیا میری نسوں میں ابھی خون کی روانی باقی تھی اور کیا میری سانس ابھی چل رہی تھی
میری بصارت کا ہر رنگ ابھی قائم تھا۔ اگر ایسا تھا تو پھر میں واقعی بڑا "کم ظرف" تھا۔ عقیدت اور محبت کا تقا
تو یہ تھا کہ میرے حواس بھی ٹھیک اُسی لمحے ہمیشہ کے لیے معطل ہو جاتے، جس لمحے میں نے پپا سے وہ لفظ
تھے۔ لیکن حیف مجھ پر کہ میں اب بھی پپا کو زور زور سے چلاتے ہوئے سن رہا تھا۔ "ساحر ہوش میں آؤ۔ مول
خضر نے ظہر کے بعد درگاہ پر سلطان بابا کی غائبانہ نمازہ جنازہ کا پیغام بھیجا ہے اور تمہارے لیے خاص حکم
وہاں پہنچنے کا۔ شاید یہ بھی سلطان بابا ہی کی کوئی آخری خواہش ہو۔" لیکن میں اس وقت کسی حکم کی تعمیل کے قا
ہی کہاں تھا۔ پتا نہیں کب سورج چڑھا اور کب پاپا مجھے دو نوکروں کی مدد سے سنبھالے اپنی گاڑی میں درگاہ
جانب روانہ ہوئے۔ کچھ انہونیاں ایسی ہوتی ہیں، جو ہمیں صاف نظر آتے ہوئے بھی در پیش آنے کے بعد
ہی بڑا اعصابی جھٹکا دے جاتی ہیں، جیسے کہ ہم ان کی حقیقت سے بالکل ہی بے خبر ہوں۔ میں کہیں نہ کہیں
بات سلطان بابا کے حجاز کے سفر پر روانہ ہونے سے پہلے ہی جانتا تھا کہ شاید یہ اُن کا آخری سفر ہے، لیکن اُن
قضا کی خبر نے میرے اندر سب ہی کچھ ختم کر کے رکھ دیا تھا۔ حیرت کی بات یہ تھی کہ اُن کی رُخصتی کا ٹھیک د
وقت تھا جس وقت وہ میرے خواب میں مجھ سے ہم کلام تھے۔ میرے ذہن میں اُن کی بات گونجی۔ "یاد ر
یہ جدائی صرف اس خاکی جسم کی دُوری ہو گی۔" لیکن میرے لیے تو اب بھی یہ جسم ہی سب کچھ تھا۔ میں ا
رُوح کی حدوں تک پہنچا ہی کب تھا۔ ہم درگاہ پہنچے تو حاکم بابا کے علاوہ باقی سب لوگ موجود تھے۔ جانے
کس نے صحن میں وہیں بٹھا دیا جہاں میں کبھی سلطان بابا کے سامنے دو زانو ہو کر بیٹھا کرتا تھا۔ مجھے تو اب
جانب وہی نظر آ رہے تھے، پھر یہ لوگ اُن کی جدائی پر اس قدر افسردہ کیوں بیٹھے تھے۔ مجھے مولوی خضر کی آو
کہیں دُور سے آتی ہوئی محسوس ہوئی "سوگ صرف تین دن کا ہوتا ہے......" "سوگ......" میں نے حیرت
اُن کی جانب دیکھا "کیسا سوگ......؟ آج یہ سب کیسی بہکی بہکی باتیں کر رہے تھے۔" ظہر کی نماز شروع ہوئی

سی نے مجھے بھی صف میں لا کھڑا کیا اور پھر فرض نماز کے بعد غائبانہ نماز جنازہ کی نیت بھی باندھ لی گئی۔ کبھی
سی نے زندوں کی نماز جنازہ بھی پڑھی ہے؟ نماز کے بعد درگاہ کے لوگوں کے علاوہ باقی سب لوگ تتر بتر ہو
ئے۔ مجھ سے پہلے اور بعد والے عبداللہ، مولوی خضر اور کچھ انجان لوگ سر جوڑے پتا نہیں کیا باتیں کر رہے
تھے۔ پپا میرے قریب ہی خاموش سے بیٹھے تھے۔ آج پہلی مرتبہ مجھے اس درگاہ سے وحشت ہو رہی تھی۔ جانے
ون بتا رہا تھا کہ سلطان بابا کی وصیت کے مطابق انہیں مکہ کی سرزمین کے حوالے کر دیا گیا ہے۔ میرا جی چاہ
ہا تھا کہ پپا سے کہوں کہ آج رات ہی ٹکٹ کروا لیں۔ میں بابا کے پاس سعودیہ جانا چاہتا ہوں۔ عصر کے بعد
ولوی خضر نے حجرے سے ایک کاغذ منگوایا اور دھیرے سے بولے "سلطان بابا کی وصیت پڑھنے کی اجازت
ہوں گا۔" پھر مولوی خضر دھیرے دھیرے سلطان بابا کی استعمال کی چیزوں کو اُن کی وصیت کے مطابق
نٹتے گئے۔ کسی کے حصے میں تسبیح آئی تو کسی کو اُن کا جانماز ملا۔ کوئی لباس اور لاٹھی کا حق دار ٹھہرا، میرے لیے
کچھ نہ بچا۔ مولوی خضر نے وصیت ختم کی...... "اور اب میں آخر میں سلطان بابا کی وصیت کے مطابق اُن کے
انشین کا اعلان کرنا چاہوں گا۔ سلطان بابا نے اپنا جانشین اُسے مقرر کیا ہے جو اُن کے مطابق سب سے زیادہ
ں اعزاز کا حق دار ہے اور وہ ہیں ساحر میاں...... سلطان بابا کے عبداللہ......" میرے ہاتھ سے تسبیح گر گئی۔

فریفتہ

کچھ لمحوں کے لیے مجھے لگا، جیسے اس ساحلی درگاہ کے آس پاس کا تمام شور بالکل ساکت ہو گیا ہو۔ لہریں اپنی اپنی جگہ تھم کر رُک گئیں اور فضا میں تیرتے پرندے بھی جامد و معلق ہو گئے۔ میں تو خود اپنی ذات کا جانشین بننے کے قابل نہیں تھا، پھر یہ مولوی خضر کیا کہہ گئے تھے؟ ضرور انہیں وصیت نامہ پڑھتے، نظر کا کوئی دھوکا ہوا ہوگا۔ وہ بھی تو شدید غم کے عالم میں تھے۔ اور غم میں انسان کے سامنے لکھی تحریر کے لفظ اکثر آپس میں گڈمڈ ہو جاتے ہیں، لیکن وہ سب خاموش بیٹھے میری جانب یوں دیکھ رہے تھے، جیسے اُن کا فریضہ تمام ہوا اور اب جو بھی کہنا ہے، مجھے کہنا ہے۔ پر میرے پاس لفظ ہی کہاں بچے تھے؟ میری تمام لغت تو سلطان بابا اپنے ساتھ ہی لے گئے تھے اور اب بھلا مجھے الفاظ اور قوت گویائی کی ضرورت ہی کب تھی۔ جن کے لیے اظہار کا یہ ذریعہ، یہ فن گفتگو میرے اندر پنپ رہا تھا، وہ دونوں ہی مجھے چھوڑ کر جا چکے تھے۔ کبھی کبھی جب زبان تالو سے چپکی رہنا چاہیے اور لوگ آپ کو کچھ کہنے پر مجبور کریں، تو یہ لفظ بھی کتنا بڑا بوجھ بن جاتے ہیں۔ میں نے بھی یہ بوجھ ڈھونے کی ہر ممکن سعی کی، لیکن ہونٹوں سے الفاظ تو نہ نکل پائے، البتہ آنکھوں سے دو موٹے آنسو نکل کر درگاہ کے چکنے فرش پر سجدہ ریزہ ہو گئے۔ مولوی خضر جلدی سے میری جانب لپکے ”ارے...... یہ کیا عبداللہ میاں...... یہ آنسو......؟“ بس پھر کیا تھا۔ سیلاب کا راستہ روکنے والے سب ہی بند خس و خاشاک کی طرح بہہ گئے۔ میں یوں بلک بلک کر رو رہا تھا، جیسے کوئی معصوم بچہ میلے میں اپنوں سے بچھڑ کر تب روتا ہے، جب شام ڈھلنے لگتی ہے۔ آس پاس کے تمام جھولے اور ٹھیلے سنسان ہو جاتے ہیں اور دھیرے دھیرے چھاتا اندھیرا اُسے ڈرانے لگتا ہے۔ درگاہ پر بھی شام ڈھل رہی تھی اور میری آنکھوں کا ساون ٹوٹ کر برس رہا تھا۔ مجھے چپ کراتے کراتے سب ہی نڈھال ہونے لگے اور پپا تو باقاعدہ خود بھی رو پڑے۔ شاید ہم انسانوں کے آنسوؤں کا کچھ باہمی رشتہ ضرور ہوتا ہے۔ تب ہی ہم اکثر کسی دوسرے کو روتا دیکھ کر خود بھی رو پڑتے ہیں۔ اور کبھی کبھی تو ہمارا رونا اُن دوسرے باوقار اور سنجیدہ طبع لوگوں کے لیے بھی ایک نعمت ثابت ہوتا ہے، جو دوسروں کے سامنے رونے میں پہل سے ہچکچاتے ہیں۔ میری حالت کے پیش نظر کسی نے مجھ سے کوئی دوسرا سوال نہیں کیا۔ مغرب کے بعد پپا نے مولوی خضر سے مجھے گھر لے جانے کی اجازت طلب کی۔ مولوی خضر نے میری جانب یوں دیکھا جیسے وہ مجھ سے میری رائے جاننا چاہتے ہوں، لیکن اب مجھے زمان و مکان سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ میں پتھر ہو چکا تھا اور پتھر کو اس بات سے کیا غرض کہ وہ کسی درگاہ کی دیوار میں جڑا رہے یا پھر کسی مکان کی طاق

ہیں...... البتہ پپا اس کلیے سے بہت اچھی طرح واقف تھے کہ غم سے عارضی فرار کا بہترین ذریعہ نیند ہے۔ سو، انہوں نے گھر پہنچتے ہی نہ جانے کسی بہانے، مجھے نیند کی کوئی دوا پلا دی۔ لیکن وہ یہ بات بھول گئے کہ اب نیند میرے لیے دوسری بیداری بن چکی تھی۔ ایک جہاں کی طرف سے آنکھیں بند ہونے لگتیں، تو دوسرا جہاں نظروں کے سامنے کھل جاتا تھا، لہٰذا...... آنکھیں بند کرتے ہی میری رُوح کے بند کواڑ کھلنے لگے۔ میں نے خود کو کسی میلاد کی محفل میں پایا۔ سب ہی چپ چاپ ورد میں مشغول تھے۔ میری آنکھیں سلطان بابا کو ڈھونڈتی رہیں، پر وہ مجھے وہاں کہیں نظر نہیں آئے۔ میں نے قریب بیٹھے ایک بزرگ سے اُن کے بارے میں پوچھا، تو انہوں نے ہونٹوں پر اُنگلی رکھ کر خاموش رہنے کا اشارہ کیا اور مجھ پر ہلکی سی سرزنش بھری نظر بھی ڈالی۔ میں نہیں جانتا تھا کہ وہ سب لوگ کیا پڑھ رہے ہیں، لیکن میں بھی اُن ہی کے ساتھ فرش پر بچھی چٹائی پر بیٹھ گیا اور خود بھی باقی سب حاضرین کی تقلید میں آنکھیں بند کر لیں۔ ٹھیک اُسی لمحے میری آنکھ کھل گئی۔ باہر دن چڑھ کر اُترنے کے قریب تھا۔ شاید عصر سے کچھ پہلے کا وقت ہوگا۔ میں ہڑبڑا کر اُٹھ بیٹھا۔ گویا میں پوری رات اور سارا دن سوتا رہا۔ عام طور پر میں قضا نمازوں کو بھی بہت پابندی سے ادا کرتا تھا، لیکن اس روز نہ جانے کیوں عصر کی فرض نماز میں بھی میرا دھیان کسی اور جانب ہی بٹا رہا۔ مجھے یاد نہیں پڑتا تھا کہ میں نے آج تک اپنی ایک بھی نماز مکمل خشوع و خضوع کے ساتھ ادا کی ہو۔ ہر بار کوئی سودا ذہن میں سمایا ہی رہا۔ کبھی نفس اور کبھی جنس...... بس اتنا ہی محدود دائرہ تھا میرا۔ پھر مغرب ہوئی اور پھر عشاء، لیکن میں اپنے کمرے ہی میں بند رہا۔ مما تین چار بار کمرے میں جھانک کر واپس چلی گئیں، لیکن مجھے باہر نکلنے کا سوچ کر ہی وحشت ہونے لگتی تھی۔

شاید وہ تیسرا دن تھا، جب میرے بعد والا عبداللہ (نعمان) مجھے لینے کے لیے آن پہنچا۔ مولوی خضر نے بلاوا بھیجا تھا۔ میں درگاہ نہیں جانا چاہتا تھا، مگر مولوی خضر کی بات ٹالی بھی نہیں جا سکتی تھی۔ میں چپ چاپ درگاہ چلا آیا۔ صحن میں بہت سے لوگوں کا ہجوم اکٹھا تھا۔ سب ہی میری آمد پر یوں چونکے اور مجھ سے کچھ ایسا خاص برتاؤ کیا گیا کہ مجھے اُلجھن سی ہونے لگی۔ خدا خدا کر کے عصر کے بعد دعا ہوئی تو کچھ تنہائی میسر آئی۔ میں ڈھلتی دھوپ کے ایک شریر، لیکن نامکمل ٹکڑے میں دیوار کی منڈیر کے قریب آ کر بیٹھ گیا۔ شاید دھوپ بھی زندگی کی علامت ہوتی ہے، تب ہی وہ ہم سے اس قدر جلد رُوٹھ جاتی ہے، خاص طور پر عصر کے بعد کی دھوپ تو کچھ یوں لپکتی جھجکتی ہماری آنکھوں سے اوجھل ہوتی ہے، جیسے اس نے شام کے اندھیرے سے کچھ وعدے جوڑ رکھے ہوں، کچھ قسمیں باندھ رکھی ہوں۔ میں بھی اسی عصر کے بعد کی دھوپ کو گاؤں کی اس الہڑ کی طرح تیزی سے پلٹتے ہوئے دیکھ رہا تھا، جسے کنویں کی منڈیر پر پانی بھرنے کے بہانے اپنے محبوب کے انتظار میں شام پڑ گئی ہو۔ اس کے محبوب کے گھوڑے کی ٹاپیں کنویں تک آتی پگ ڈنڈی پر نہ گونجی ہوں اور اب وہ بے چاری اس سوچ میں تیز قدموں سے گھر لوٹ رہی ہو کہ گھر کے آنگن میں ٹہلتے بابل کو یوں اندھیرے تک باہر رہنے کا کیا جواز بتائے گی۔ میں نہ جانے کہاں کھویا ہوا تھا کہ قریب ہی کسی کے ہلکے سے کھانسنے کی آواز سنائی دی۔ ”مخل

ہونے کی معذرت چاہتا ہوں...... لیکن میں نے سوچا کہ گھر واپس پلٹنے سے پہلے آپ سے دعا لیتا جاؤں۔'' میں
نے چونک کر نظریں اُٹھائیں۔ مناسب قیمتی لباس میں ایک ادھیڑ عمر شخص مؤدب سا سر جھکائے میرے قریب
کھڑا تھا۔ اُس کے چہرے پر چیچک کے ہلکے سے داغ تھے اور ماتھے سے بال کافی حد تک اُڑے ہوئے تھے۔
گہرا سانولا رنگ اور چھوٹی چھوٹی سی تیز آنکھیں۔ میں نے اپنی بے زاری چھپانے کی کوشش کی اور مولوی خضر
کی جانب اشارہ کیا، جو صحن میں موجود زائرین میں نیاز بٹوانے میں مشغول تھے۔ ''آپ اُن صاحب سے مل
یں۔ وہ میرے اُستاد بھی ہیں اور وہی اس وقت سب سے معمر اور قابل احترام شخصیت ہیں۔ وہ
آپ کے لیے ضرور دعا کریں گے، میں کسی کو دعا دینے کے قابل نہیں۔ مجھے تو خود آپ کی دعاؤں کی ضرورت
ہے۔'' وہ شخص اپنی جگہ جما رہا۔ ''جی...... میں پہلے اُن ہی مولانا کے پاس گیا تھا، لیکن انہوں نے ہی مجھے آپ
کے پاس بھیجا ہے۔ دیکھیے، آپ مجھے ٹالیے گا نہیں۔ میں بڑی دُور سے یہاں تک آیا ہوں۔'' میں نے حیرت
سے پہلے اُسے اور پھر مولوی خضر کی جانب دیکھا۔ بھلا انہوں نے یہ ذمہ داری مجھ پر کیوں ڈالی۔ بہر حال، مجھے
وہ شخص ٹلتا نظر نہیں آ رہا تھا۔ مجبوراً میں نے اُس سے پوچھا ''آپ ضد کرتے ہیں تو یوں ہی سہی، لیکن آپ کے
لیے کیا دعا کروں، کوئی خاص حاجت......؟'' وہ شخص کچھ ہچکچایا ''کچھ عجیب سی بات ہے، لیکن اب بے چینی انتہا
کو پہنچ چکی ہے۔ ہر جگہ کی ڈھول چاٹ چکا۔ اب آخر کار کسی نے اس درگاہ کا پتا دیا ہے کہ یہاں میرا مسئلہ ضرور
حل ہو جائے گا۔'' میں نے دل میں سوچا کہ جس ہستی پر خدا کا یہ خاص کرم تھا، وہ تو خود اُس کی جانب پلٹ
چکی۔ اب کون بھلا وہ دعائے خاص کرے گا تمہارے لیے۔ کچھ دیر خاموشی طاری رہی۔ پھر اُس نے اپنا گلا تر
کیا اور بمشکل بولا ''میرا مرض بڑا عجیب ہے جناب۔ میں 'فریفتہ' ہوں۔'' میں نے حیرت سے اُس کی جانب
دیکھا۔ ''جی......؟'' وہ گڑبڑا کر بولا۔ ''میرا مطلب ہے میں 'فریفتہ صفت' ہوں۔'' ''میں اب بھی نہیں سمجھا۔''
اُس نے ایک گہری سی سانس لی۔ ''جی مجھے اندازہ ہے۔ دراصل یہ بات ہی اتنی اُلجھی ہوئی ہے کہ میں کبھی کسی
کو ٹھیک طرح سے سمجھا نہیں پایا۔ میرا نام بختیار ہے، لیکن میری 'بخت' سے کبھی یاری نہیں رہی۔ ہوش سنبھالا تو
متوسط طبقے کے ایک خاندان کا عام سا بچہ تھا، نین نقش بھی عام سے تھے، لیکن تب یہ چیچک کے داغ میرے
چہرے کی زینت نہیں بنے تھے۔ یہ جوانی کا تحفہ ہے۔ البتہ رنگ تب بھی سانولا ہی تھا۔ میری طرح کے
ہزاروں لاکھوں بچے اس ملک کے گھرانوں میں پل بھر میں بڑھ کر جوان ہو جاتے ہیں اور اپنی ڈگر پر چل
پڑتے ہیں۔ بے حد اور شدید حساسیت بھی شاید ہی کبھی کسی کی راہ کی دیوار بنی ہو یا شاید متوسط طبقے کے شب و
روز ایسے بچوں سے خود بخود حساسیت چھین لیتے ہیں لیکن قدرت نے میرے اندر کچھ اور ہی جذبے دہکا رکھے
تھے۔ بے حد شرمیلا ہونے کے باوجود میں قدرت کی ہر خوب صورتی کو پوری طرح محسوس کر سکتا تھا۔ نویں
دسویں جماعت میں ٹوٹے پھوٹے شعر بھی کہنا شروع کر دیئے اور پھر انٹر کے بعد مجھے ایک عجیب سا ادراک ہوا
کہ مجھے عورت کی خوب صورتی اپنی جانب عام انسانوں سے کئی درجے زیادہ کھینچتی اور اور متاثر کرتی ہے۔ میرا

صورت چہروں کے اردگرد گھنٹوں منڈلانے کے لیے مچل مچل جاتا تھا۔ لیکن المیہ یہ تھا کہ میری حد
م، بلکہ کسی حد تک بھدّی شخصیت کے لیے میری ہم عمر لڑکیوں اور آس پاس کی دیگر خواتین کے دل میں
نہیں تھی۔ لڑکیاں پیٹھ پیچھے مجھ پر ہنستیں اور میری بُردباری اور باوقار بنے رہنے کی کوششوں پر آوازے
تے۔ کالج ختم ہوا اور یونیورسٹی کا دور شروع ہوا، تو میں بزم ادب کا منتظم منتخب ہو گیا۔ تب تک میری
کے برعکس میری شاعری کافی نکھر چکی تھی۔ اُردو شعبے میں میری کافی دھاک بیٹھ گئی تھی اور جونیئر لڑکیاں
لفظوں کی وجہ سے میرا احترام بھی کرنے لگی تھی۔ لیکن یہ ساری عزت میرے شعروں کی مرہون منت
خود میرا وجود اُن کے سامنے کوئی معنی نہیں رکھتا تھا۔

جیسے جیسے دن گزرتے گئے، میرے اندر چاہے جانے کی خواہش امر بیل کی طرح پھیلتی چلی گئی، لیکن پوری
ٹی میں کوئی بھی ایسی لڑکی نہ تھی، جس نے کبھی نظر بھر کر بھی میری جانب دیکھا ہو۔ ان ہی میں میری کلاس
لالہ بھی تھی۔ یونیورسٹی کی سب سے خوب صورت لڑکی۔ جس کی ایک جھلک پانے کے لیے اعلیٰ طبقے کے
ہی لڑکے اپنی بڑی بڑی گاڑیوں میں صبح سویرے اُس کی راہ میں پلکیں بچھائے اور ہاتھ باندھے کھڑے
تھے۔ میرا دل بھی گل لالہ کے لیے اِسی شدت سے دھڑکتا تھا، لیکن اُسے متاثر کرنے کے لیے کچھ بھی تو
تھا میرے پاس، نہ شکل و صورت، نہ روپیہ پیسہ اور نہ ہی کوئی منفرد اور بھرپور صلاحیت۔ بدقسمتی سے اُسے
ادب کی محفلوں سے بھی کچھ خاص لگاؤ نہیں تھا، لہٰذا یونیورسٹی کے چار سالوں میں چار مرتبہ بھی میری اُس
بات نہیں ہو پائی۔ لیکن میرا وحشی دل مزید وحشی ہوتا گیا اور نتیجتاً مجھے جاگتے میں بھی خواب دیکھتے رہنے کی
پڑ گئی۔ میرے خواب عموماً کچھ اس طرح کے ہوتے کہ میرے اردگرد خوب صورت چہروں کا جمگھٹا ہے اور
ن سب کی نظروں میں محبوب ہوں۔ کبھی میں خود کو کسی انتہائی شعلہ بیان مقرر کے روپ میں دیکھتا، جو
ٹی کے اسٹیج پر سارے ہال کو انقلابی تقریروں سے گرما رہا ہے، تو کبھی پوری محفل لُوٹ لینے والا موسیقار یا
ربن جاتا اور کبھی فوجی یا سپاہی، جو سب کا ہیرو ہوتا۔ لیکن میری ہر مہم جوئی کا انعام صرف مہ رُخوں کا کوئی
ٹ ہوتا۔ میرے خوابوں میں خوب صورت خواتین مجھ سے صرف چند لفظ سننے کے لیے مری جاتیں اور
سب پر ایک نگاہ غلط ڈال کر مسکراتا ہوا محفل سے گزر جاتا۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ میں کبھی کسی ایک چہرے
ایک گل رُخ کے لیے ہیرو نہ بنتا، بلکہ بیک وقت کئی نازنینائیں میری مدح سرائی میں مشغول رہتیں۔ لیکن
تو پھر خواب ہوتے ہیں۔ میں جب ان خوابوں کے سحر سے باہر نکلتا تو میری عام سی شخصیت میرا منہ
تا۔ ادیب اور مصنف عورت کی کم صورتی اور اُس سے متعلق المیوں کا ذکر تو اپنے افسانوں میں بارہا کرتے
لیکن کسی مرد کی کم تر شخصیت اور اس سے جڑے دُکھوں کو آج تک کسی نے بیان کرنے کی زحمت نہیں کی۔
ر بھی کیسا...... مجھ جیسا ''فریفتہ صفت''...... جسے ہر لمحہ کسی پری رُخ کے عارض پر پھیلتے گلال کے گلابی پن
ضرورت رہتی تھی۔ یاد رہے کہ میں بدکردار ہرگز نہ تھا۔ مجھے تو بس خوب صورتی کے ایک احساس کی ضرورت

تھی، جو ہر لمحہ میرے چار سُو پھیلا رہے۔ شاید میرے اندر محبوب بننے کی تمنا اپنی آخری حدوں سے بھی
کہیں آگے بڑھ چکی تھی۔ پر افسوس، میں کبھی کسی کا محبوب نہ بن سکا۔ میں ہمیشہ ان تقاریب میں سب سے پہلے
پہنچ جاتا، جہاں کسی بھی اچھے چہرے کی ایک جھلک نظر آنے کی بھی اُمید ہوتی۔ بظاہر میں لاپرواہ سا بنا اس محفل
میں ٹہلتا رہتا، پر میری نظریں اپنا مخصوص طواف جاری رکھتیں۔ مجھے ہر دم یہی خوش فہمی گھیرے رکھتی کہ محفل کا
سب سے حسین چہرہ میری کسی بات سے متاثر ضرور ہوگا اور قدرت میرے لیے ایسا کوئی موقع ضرور تراشے گی
جب خود اُس مہ جبیں کے گھر والے مجھے اپنے ہاں کسی تقریب میں مدعو کریں گے۔ شاید کوئی مجھے اُردو شاعری
میں مدد کے لیے شام کی چائے پر بلالے...... لیکن افسوس میرا کوئی خواب پورا نہ ہوسکا اور آخر کار گھر والوں کی
پسند سے میری شادی ہوگئی۔ میں کسی کا محبوب بننے سے پہلے ہی شوہر بن گیا۔ میری بیوی ایک سادہ اور نیک
دل عورت تھی۔ پر، وہ بھی مجھے محبوب کے درجے پر فائز ہی نہ کرسکی۔ شادی کے ایک سال بعد جب میں پہلی بار
اُس کے ساتھ چند دن اس کے گاؤں میں رہنے کے لیے گیا، تو یہ چیچک کے داغوں کا تحفہ میرا منتظر تھا۔ بیماری
کے بعد میرا دل کچھ یوں اچاٹ ہوا کہ میں نے روزگار کے لیے دبئی جانے کے لیے ہاتھ پاؤں مارنا شروع
کردیئے۔ شاید اس کوشش کے پیچھے بھی کہیں میری فریفتگی ہی کا دخل تھا۔ مجھے اُمید تھی کہ پیسہ ہاتھ آنے کے
بعد میں ضرور چاہا جاؤں گا۔ میں نے سن رکھا تھا کہ پیسہ مرد کی تمام بدصورتیاں چھپالیتا ہے۔ دس سال میں
دن رات بھلا کر دبئی کے ریگ زاروں میں اپنا پسینہ بہایا اور جب میں واپس ملک لوٹا تو ایک رئیس تھا
میں نے آتے ہی شہر کی مختلف سماجی سرگرمیوں میں دل کھول کر پیسہ خرچ کیا اور پھر چند ہفتوں ہی میں، میں کئی
ادبی و سماجی تنظیموں کا اعزازی صدر بن چکا تھا۔ شہر کی کوئی تقریب میری شرکت کے بغیر مکمل نہیں ہوتی تھی، لیکن
میرا مسئلہ اب بھی اپنی جگہ قائم تھا۔ میں معاشرے میں زبردستی کی عزت تو کسی نہ کسی طور کما چکا تھا، لیکن محبت کی
ایک نظر اب بھی میری واحد تلاش تھی۔ میں اپنی ساری دولت دے کر بھی صرف اس ایک ستائش بھری نظر کا
طالب تھا، جو مجھے چند لمحوں کے لیے ہی محبوبیت کے مقام تک پہنچادیتی۔ میں ہوائی جہاز کا سفر اس اُمید پر کرتا
کہ شاید میری ساتھ والی نشست پر کوئی حسینہ بیٹھی مل جائے۔ شاید کوئی ایئر ہوسٹس ہی میری طرف نظر بھر کے
دیکھ لے۔ اسپتال میں نزلے زکام کے لیے بھی بہترین کمرہ مخصوص کروالیتا کہ شاید میری طبیب یا نرس ہی وہ
چہرہ ہوں جس کے التفات کے انتظار میں میری ساری عمر کٹ گئی۔ میں جان بوجھ کر اپنے اردگرد کسی نہ کسی
بہانے حسین چہروں کا جمگھٹا لگائے رکھتا، مگر کبھی بھی اپنے دل کے اندر کسی پائل کی نازک جھنکار سنائی نہ دی۔
کچھ میرے قریب بھی آئیں، مگر وہ صرف روپے کی پجارنیں نکلیں...... میرا پیسہ بھی میری ادھوری اور بدصورت
شخصیت کو مکمل نہ کرسکا۔ میں سدا سانولی ہی رہا، کبھی ساجن نہ بن سکا۔ اور آج زندگی کی 68 خزائیں جھیلنے کے
بعد بھی میں یہاں اس دعا کی اُمید میں کھڑا ہوں، جو میرے وحشی من کو سکون کا ایک لمحہ ہی نصیب کردے۔ میں
بے حد نڈھال ہوں۔ میرے قدم تھک کر شل ہوچکے ہیں۔ اب یہ "فریفتہ پن" میری جان کا روگ بن

چکا ہے۔ یہ دنیا، بدصورت لوگوں کے لیے بڑی بدصورت جگہ ہے جناب۔ کبھی کبھی سوچتا ہوں کہ اگر قدرت
نے میرا من اتنا کومل ہی بنانا تھا، تو میری شخصیت کو بھی اتنا ہی شگفتہ کیوں نہ بنایا......؟ قدرت نے میرے وجود
کے سب ہی تاروں کو اگر سر اور موسیقی کی مدھر تانوں سے جوڑ کر کرنسوں میں عجب ہیجان خیز خواب دیکھنے کی
صلاحیت پیدا کر ہی دی تھی، تو پھر بے ڈھنگی شخصیت کا تال میل بھی کیوں درست نہ کردیا۔ سچ تو یہ ہے کہ میری
تباہی میں، دل کے ساتھ ساتھ میری سماعت کا بھی برابر کا قصور ہے۔ جانے یہ میلوڈی ایک ہی لمحے میں میرے
اندر سب کچھ اتھل پتھل کیسے کردیتی ہے۔ میں پل بھر میں مکروہ بھکاری سے حسین شہزادہ بن جاتا ہوں۔ ساری
قدرت میرے سامنے دوزانو ہوجاتی ہے۔ پریاں رقص کرتی ہیں اور میرے روم روم سے فریفتگی جھلکنے لگ جاتی
ہے۔ آپ ضرور مجھے کوئی دیوانہ ہی سمجھ رہے ہوں گے، لیکن یقین کریں کہ میں نے ابھی اپنی دیوانگی کا دس فی
صد بھی آپ کو نہیں سنایا۔ میں اپنے اندر کے پرستان اور باہر کی بے رحم اور کانٹوں بھری دنیا کے درمیان پس کر
رہ گیا ہوں۔ میں اپنے اندر راجا اِندر اور باہر صرف ایک شودر رہوں، جس کے لیے کسی نازنین کے دل میں کوئی
جگہ نہیں......" بختیار اپنی بات ختم کرکے یوں ہانپنے لگا، جیسے میلوں دوڑ کر آیا ہو۔ سچ ہے، یہ تھکن تو ساری زندگی
کی تھی۔ اندھیرا ڈھل چکا تھا اور بختیار کی آنکھوں میں جھلکنے والے دو آنسو اس لمحے مجھے ان دو بے مراد چراغوں
کی طرح دکھائی دیئے، جو کسی گم نام کے ویران مزار پر، کوئی ترس کھا کر جلا گیا ہو۔ میرا جی چاہا کہ میں اس تھکے
ہوئے معصوم اور اندر سے بے انتہا خوب صورت شخص کے آنسو پونچھ کر اُسے بتاؤں کہ اس دنیا میں کون ہے، جو
فریفتہ نہیں ہے۔ کوئی عورت پر فریفتہ ہے تو کوئی جاہ و حشم پر، کسی کو دولت کی فریفتگی ہے تو کوئی سونے کے محلوں
پر شیدا ہے۔ شاید انسان پیدا ہی "فریفتہ صفت" ہوتا ہے۔ پھر جن کی ظاہری صورت اور شخصیت دنیا کے معیار
پر پوری اُترتی ہے انہیں تو اپنی فریفتگی کا صلہ مل جاتا ہے اور کچھ بختیار جیسے سیاہ نصیب بھی ہوتے ہیں جو اس
تڑپ اور کسک کی کانٹوں بھری خلش اور لاحاصل پن کے ساتھ ہی پوری زندگی جیتے ہیں۔ میں نے مزید کچھ
کہے بنا دعا کے لیے ہاتھ تو اُٹھا دیئے۔ لیکن سچ یہ ہے کہ میری پاس دعا کے لیے لفظ تھے ہی نہیں۔ شاید کچھ
دعاؤں کے لیے لفظ ضروری نہیں ہوتے۔

بختیار نے پلٹنے سے پہلے مجھ سے کہا کہ وہ اگلے ہفتے دوبارہ یہاں آئے گا۔ اُس کے جاتے ہی مجھے مما
درگاہ کی سیڑھیاں چڑھ کر اندر آتی ہوئی دکھائی دیں۔ شاید وہ زیادہ دیر ہونے کی وجہ سے خود ہی میرے اور پپا
کے پیچھے یہاں تک چلی آئی تھی۔ لیکن نہ جانے کیوں آج مجھے اُن کا زرد چہرہ کچھ اور ہی داستان سناتا ہوا دکھائی
دے رہا تھا۔ پپا بھی میرے گھٹنوں کے قریب آ بیٹھے۔ شاید وہ بھی مما کے مضطرب چہرے کی کوئی تحریر پڑھ چکے
تھے۔ بہت دیر کے بعد وہ کچھ بولنے کی ہمت جمع کرپائیں۔ "ساحر...... آج میری زہرا سے ملاقات ہوئی
تھی......" کوئی اور وقت ہوتا تو شاید اتنا سن کر ہی میرا دم نکل جاتا، لیکن آج میرے لہجے میں ایک عجیب سی بے
گانگی تھی۔ "اچھا......؟" مما کچھ دیر چپ رہی، پھر انہوں نے بتایا کہ وہ زہرا کی پرانی ہمسائی کو خصوصی تاکید

کر چکی تھیں کہ جب بھی زہرا کے گھر والے یا وہ خود اپنے پرانے گھر کسی بھی کام سے آئیں تو مما کو ضرور اطلاع کر دی جائے۔ یہ بات بھی ہمسائی ہی نے مما کو بتائی تھی کہ زہرا کے گھر والے اپنے کچھ ضروری سامان سمیت کچھ عرصے سے کہیں اور منتقل ہو چکے ہیں۔ آج شام اچانک ہی مما کو اس ہمسائی کا فون آ گیا کہ اُس نے ابھی ابھی ڈرائیور سمیت زہرا کی گاڑی کو اُن کے بنگلے میں داخل ہوتے دیکھا ہے۔ مما ایک لمحے کی تاخیر کیے بنا گھر سے نکل پڑیں اور جب وہ وہاں پہنچیں تو زہرا واپسی کے لیے گاڑی میں بیٹھ چکی تھی۔ مما کو دیکھ کر اس کے چہرے پر ایک رنگ آ کر گزر گیا، لیکن وہ پوری تعظیم سے اُن سے ملی۔ البتہ مما کے تمام سوالوں کے جواب میں وہ صرف اتنا ہی کہہ پائی کہ ساحر کو اُس کا بس ایک پیغام پہنچا دیا جائے کہ "شاید قدرت کو ہمارا ملن منظور نہیں۔ اور وہ قدرت کا یہ فیصلہ منظور کر چکی ہے۔ سو، بہتر ہوگا کہ ساحر بھی اس اَن ہونی کو تسلیم کر لے۔ شاید یہی ہمارا نصیب تھا۔" لوگ کتنی آسانی سے اپنا کیا دھرا نصیب اور قدرت کی سیاہی سے جوڑ دیتے ہیں؟ مما اُس کے سامنے بہت روئیں اور گڑگڑائیں کہ وہ بس ایک بار ہی مجھ سے مل لے تاکہ ساحر کے وحشی من کو کچھ تو سکون نصیب ہو، لیکن زہرا نے بھیگی آنکھوں سمیت مما کی یہ درخواست بھی نامنظور کر دی۔ میرا جی چاہا کہ میں مما کو اُس کی بے رُخی کی اصل وجہ بھی بتا دوں کہ اُس کے ہاتھوں میں کسی اور کے نام کی مہندی رچنے والی ہے، لہٰذا اُسے اب ہمارے بے رنگ آنسوؤں سے بھلا کیا غرض ہو سکتی ہے؟ مما اپنی بات ختم کر کے پھوٹ پھوٹ کر رو پڑیں اور میں یوں ہی اپنی جگہ ساکت بیٹھا رہا۔ مجھے یوں لگا، پل بھر میں زہرا نے مجھے بھی بختیار بنا کر رکھ دیا ہے۔ میں ایک لمحے ہی میں شہزادے سے مکروہ بھکاری بن گیا ہوں اور ساری دنیا مجھے حقارت کی نظر سے دیکھ کر قہقہے لگا رہی ہے۔ میں نے پپا کے کوٹ کی جیب میں اٹکا پین نکالا اور قریب پڑے ایک کاغذ پر اپنی زندگی کی پہلی تحریک کا عنوان لکھ ڈالا۔ "جب تمہیں مجھ سے نفرت ہو جائے......" پتا نہیں یہ نظم تھی، نثر تھی، یا پھر صرف چند بھٹکے ہوئے خیالات، لیکن میں لکھتا چلا گیا۔

سنو......تمہاری وفا پہ مجھ کو......

یوں تو پورا یقین ہے......

پر......زمانے کے وار کا کچھ بھروسا نہیں ہے

سو گر کبھی ایسا ہو جائے.........اور تمہیں مجھ سے نفرت ہو جائے.........

تو ان راہوں سے نفرت نہ کرنا.........جن پر کبھی ہم اک ساتھ چلے تھے

کہ کسی کے قدموں کی بے ثباتی سے.........بھلا ان بل کھاتی راہوں کو کیا راستہ؟

ان نظاروں سے نفرت مت کرنا.........جو ہم نے کبھی اک ساتھ دیکھے تھے

کہ کسی کے وجود کی بدہیئت ویرانی سے.........بھلا ان خوبصورت نظاروں کو کیا واسطہ؟

ان باتوں سے نفرت مت کرنا.........جو کبھی ہم نے تنہائی میں کی تھیں

کہ کسی کی بے توازن شخصیت کی کڑواہٹ.........بھلا اُن میٹھی باتوں کا کیا سابقہ.........؟

ان خوابوں سے نفرت مت کرنا.........جو ہم نے کبھی ایک ساتھ مل کر دیکھے تھے

کہ کسی "پیکرِ بدنصیب" کے گھناؤنے پن سے.........بھلا اُن روشن تعبیروں کا کیا رابطہ.........؟

بس مجھ ہی سے نفرت کرنا.........کہ میری رُوح کی سیاہی سے ہی.........چار سو یہ اندھیرا ہے.........

میری بدصورتی کی وجہ سے ہی.........دنیا کا ہر رنگ پھیکا ہے.........ہر راہ بے راہ ہے.........

ہر نظارہ مکروہ ہے.........ہر خواب سراب ہے.........

بس مجھ سے ہی نفرت کرنا.........کہ صرف میں.........اور بس میں ہی تھا.........تمہاری اس نفرت اہل ہوں"

ساحر

میں نے کاغذ لفافے میں ڈالا اور اس پر زہرا کا پتا لکھ کر پپا کی جانب بڑھا دیا۔ "اس پر زہرا کا پتا لکھا ہوا۔ ایک اور احسان کر دیں مجھ پر، گھر واپسی پر یہ لفافہ اُس کے گھر دیتے جائیے گا.........آج اس نے کا اختتام بھی ہو ہی جائے تو اچھا ہے........." مما پپا کے چہرے سفید پڑ گئے۔

''جب تمہیں مجھ سے نفرت ہو جائے''

پھر یوں ہوا کہ میں نے دن اور رات کا حساب رکھنا چھوڑ دیا۔ موسم میرے لیے بے معنی ہو گئے اور میر
زمان و مکاں کی قید سے آزاد ہوتا گیا۔ جہاں ٹھہر جاتا، گھنٹوں کھڑا رہتا، اور جہاں بیٹھ جاتا، وہاں تب تک خاک
سے جُڑا رہتا، جب تک کوئی مجھے ہاتھ سے پکڑ کر اُٹھا نہ لے جاتا۔ مجھے آئینہ دیکھے نہ جانے کتنا زمانہ بیت چکا تھا
لوگ مجھے مجذوب کہہ کر پکارنے لگے۔ یہ عشق بھی ہمارے ساتھ کیسے کیسے کھیل کھیلتا ہے۔ کیا صرف ہوش و حوا
چھن جانے ہی سے کوئی مجذوب بن جاتا ہے یا پھر شاید سبھی مجذوب کسی نہ کسی ناکام عشق کی بھٹی سے تپ ک
نکلتے ہوں گے۔ درگاہ پر مولوی خضر ہی میرے ساتھ باقی رہ گئے۔ سب اپنی اپنی تعیناتی کی منزل کی جانب
پلٹ چکے تھے۔ لیکن سلطان بابا جاتے جاتے جان نشینی کا جو طوق میرے گلے میں ڈال گئے تھے، وہ اب بھ
میرے پیروں کی زنجیر بنا ہوا تھا، ورنہ شاید میں کب کا کسی ویرانے کی جانب کوچ کر چکا ہوتا، کیوں کہ اب می
اِن انسانوں کی محفل میں گزارہ بہت مشکل ہوتا جا رہا تھا۔ میں جتنا لوگوں سے دامن بچانے کی کوشش کرتا، ا
ہی مجھے اُن کا سامنا کرنا پڑتا۔ شاید ان مزاروں پر ''پہلو تہی'' انسان کو مزید مُعتبر بنا دیتی ہے۔ اُس رات پپا می
خط لے کر زہرا کے در تک پہنچے تو بہت دیر انتظار کے بعد اندر سے کوئی نوکر برآمد ہوا۔ پپا نے اُس سے زہرا
پوچھا تو پتا چلا کہ وہ اپنے ماں باپ کے ساتھ گھر پر موجود ہے۔ پپا نے اُسے میرا رقعہ دے کر زہرا تک پہنچا۔
کی درخواست کی اور خود پلٹ کر گاڑی میں واپسی کے لیے جا بیٹھے۔ جب اُن کی گاڑی زہرا کی حویلی کو مڑ۔
والی سڑک کے موڑ تک پہنچی تو انہوں نے حویلی کے اندر پورچ میں سے تیزی سے کسی کو حویلی کے پھاٹک ک
جانب آتے دیکھا تھا لیکن میری التجا کو مدِنظر رکھتے ہوئے انہوں نے زہرا کے گھرانے کے کسی بھی فرد سے برا
راست رابطہ کرنے سے اجتناب برتا، حالانکہ انہیں فاصلہ ہونے کے باوجود یہ گمان ہوا تھا کہ باہر لپک کر آ۔
والی زہرا ہی تھی۔ یہ وہی رات تھی، جب میرے ماں باپ کی زبانی آخری بار میری سماعتوں میں زہرا کے نامَ
امرت اُنڈیلا گیا تھا۔ اس کے بعد صرف کڑواہٹ ہی میرا نصیب تھی۔ میں اپنے خوابوں میں سلطان بابا
انتظار کرتا، مختلف محفلوں اور ویرانوں میں بھٹکتا رہتا، لیکن وہ مجھے نہ ملتے۔ ہاں البتہ اُن کے پیغام کبھی کبھار مجھ
تک کسی وسیلے سے پہنچ جایا کرتے۔ کئی بار اُن کے ہاتھ کے لکھے پُرانے اوراق مجھے حجرے میں یا درگاہ کے کس
اور کونے میں پڑے مل جاتے۔ وہ بظاہر تو اُن کی موت سے پہلے کی یادداشتیں تھیں، مگر دوسری یا تیسری مرتب
پڑھنے پر مجھے اپنے حال سے مطابق کچھ نہ کچھ اشارہ ضرور مل جاتا تھا۔ کبھی کبھی تو مجھے یوں محسوس ہوتا کہ کچ

پرانی تاریخوں کے باوجود تازہ لکھے ہوئے ہوتے۔ اُس روز بھی مجھے درگاہ کے کے حجرے کی پرانی
ں کے پیچھے سے صفائی کے دوران ایک ایسا ہی رقعہ دُھول اور کالک میں اٹا ملا۔ میں نے اُسے جھاڑ کر
کیا اور اُس کی شکستہ تحریر کو پڑھنے کی کوشش کرنے لگا ''جب جب جو جو ہونا ہے...... تب تب سو سو......''
چھ مٹی ہوئی تھی اور کچھ کالک کی سیاہی سے سیاہ ہو چکی تھی۔ مجھے الجھن ہونے لگی۔ میں نے بہت دفعہ
ن بابا کو مختلف رُقعہ نما کاغذوں پر کچھ لکھتے ہوئے دیکھا تھا، لیکن یہ کاغذیوں ایک ایک کر کے بعد میں مجھے
لتے جائیں گے، یہ میں نے کبھی نہیں سوچا تھا۔ ورنہ میں اُسی وقت یہ تمام پرچیاں سینت سینت کر سنبھال
میں تو آخری وقت تک یہی سمجھتا رہا کہ وہ ان پرچیوں پر مختلف احکامات لکھ کر بانٹ دیتے ہوں گے۔
نے کاغذ کی گرد کو پھر سے پھونک مار کر جھاڑا اور جو حصہ پڑھے جانے کے قابل تھا، اس کا ربط جوڑنے کی
ں کی ''عصر کا وقت اہم ہے...... کہ اُس کی قسم کھائی گئی ہے...... دھیان رہے...... سائل نہ چوکے......''
تنا ہی سمجھ آیا۔ کیا عصر کے وقت کوئی خاص واقعہ ظہور پذیر ہونے والا تھا؟ اور یہ کس سائل کا ذکر ہو رہا تھا۔
ی طرح میں اپنے ذہن میں بہت سے سوالات لیے خود ہی سے اُلجھتا، درگاہ کے صحن میں آ بیٹھا۔ مولوی
چند سائلوں میں گھرے بیٹھے تھے۔ میں نے انہیں کبھی لوگوں سے اُکتاتے ہوئے نہیں دیکھا تھا۔ وہ کہتے
کہ ہم رزق کی طرح اپنے نصیب کے بندے بھی اُوپر سے لکھوا کر لاتے ہیں۔ سو جسے قدرت نے ہم تک
دیا، وہ ضرور کچھ مقصد لے کر ہی آیا ہوگا۔ مگر میں سوچتا تھا کہ میرے نصیب میں تو بس میرا قاتل ہی لکھا تھا،
قدرت نے اُسے میری فنا کے لیے ہی اس درگاہ پر بھیجا تھا۔

عصر کی نماز ختم ہوئی۔ ابھی مولوی خضر نے دُعا کے لیے ہاتھ اُٹھائے ہی تھے کہ دو افراد جلدی سے دُعا
ے بنا ہی اُٹھ کر چل دیئے اور ٹھیک اُسی لمحے دو اشخاص درگاہ کے مسجد والے حصے میں داخل ہوئے اور مولوی
لو دُعا کے لیے ہاتھ اُٹھائے دیکھ کر جلدی سے صف کے آخر میں بیٹھ گئے اور پھر سب نمازیوں کے ساتھ ہی
ں نے دُعا کر لی۔ دُعا کے خاتمے کے بعد اُٹھ کر اپنی عصر کی نماز ادا کرنے لگے۔ باقی نمازیوں کے جانے
بعد مولوی خضر نے مجھ سے پوچھا۔ ''کیوں میاں، دیکھا تم نے محنت کس کے حصے میں آئی اور انعام کسے
...؟'' میں نے کچھ نہ سمجھتے ہوئے اُن کی جانب دیکھا۔ وہ دھیرے سے مسکرائے۔ ''دُعا کو عبادت کا مغز کہا
ہے۔ شاید ہمیں عبادت کا حکم بھی کہیں اسی دُعا مانگنے کی فضیلت عطا کرنے کی نیت سے دیا گیا ہوگا۔ وہ جو
شخاص نماز پڑھ کر بنا دُعا مانگے اُٹھ کر چلے گئے، انہوں نے اپنے حصے کی مشقت تو کر لی پر انعام لیے بنا ہی
ادیئے، اور وہ دو، جو اپنی جماعت تو قضا کر بیٹھے تھے، لیکن عین وقت پر پہنچ کر دُعا میں شامل ہو گئے، انہوں
محنت تو نہیں کی، لیکن قدرت نے انعام اُن کے حصے میں لکھ رکھا تھا۔ سو، انہیں دُعا میں اپنا حصہ مانگنے کا
نع مل گیا اور کون جانے کہ یہی وہ خاص وقت دُعا ہو، جس میں دُعائیں ساتویں عرش پر سنی جاتی ہیں......''
ی خضر ٹھیک ہی تو کہہ رہے تھے، ساری عمر سجدے میں پڑے رہنے سے کیا فائدہ، جب وہ سجدہ ہی قضا ہو

جائے، جس میں رب سے اُسے مانگنا تھا...... میں بھی شاید وہ سجدہ قضا کر چکا تھا اور پھر میری قضاؤں کی تو گنتی
بھی اب محال تھی۔ میں تو اپنی ساری دنیا قضا کر چکا تھا اور اب دین بھی مجھ سے دھیرے دھیرے قضا ہو رہا تھا۔
تحصیل ماہی کے مجذوب کی پیش گوئی پوری ہو رہی تھی، لیکن خود میرے ہاتھ میں بھلا میرا کوئی فیصلہ کب تھا۔
عصر کے بعد مولوی خضر حجرے میں کچھ دیر آرام کے لیے چلے گئے، اور میں پھر سے اپنے وجود کی گرہیں کھولنے
کی ناکام کوشش کرنے درگاہ کے صحن میں آ کر بیٹھ گیا۔ چند لمحوں بعد کسی اُونچے گھرانے کی ایک عورت اپنے
ڈرائیور اور دو خادماؤں سمیت درگاہ کے احاطے میں داخل ہوئی۔ اُس کے چہرے سے پریشانی صاف جھلک
رہی تھی۔ اُس نے درگاہ میں داخل ہوتے ہی اِدھر اُدھر کسی کی تلاش میں نظریں دوڑائیں اور پھر تیزی سے میری
جانب بڑھی۔ ''سنو لڑکے! یہاں کے بزرگ بابا کہاں ہیں......؟'' شاید وہ مولوی خضر کے بارے میں پوچھ
رہی تھی۔ ''وہ آرام کر رہے ہیں۔ آپ مجھے بتایئے، کیا خدمت کر سکتا ہوں میں آپ کی......؟'' وہ کچھ ہچکچائی
''تم...... میرا مطلب ہے تم تو...... اچھا ٹھیک ہے۔ تم یہ نذر اور نیاز درگاہ پر چڑھا دو اور اپنے بزرگ سے
درخواست کرو کہ وہ چند لمحوں کے لیے میرے ساتھ نیچے سیڑھیوں تک چلے آئیں۔ دراصل میں اپنے بیٹے کے
لیے خصوصی دُعا کروانا چاہتی ہوں۔ وہ یہاں تک نہیں آ سکتا۔'' مجھے لگا کہ بڑے گھر کی کوئی مجبور ماں اپنے
لاڈلے کے لیے دُعا کروانے آئی ہے، جو ماں کی خواہش کے باوجود اپنے قدموں کو زحمت دے کر درگاہ کی
سیڑھیاں نہیں چڑھنا چاہتا۔ کبھی میں خود بھی تو ایسا ہی تھا۔ مما مجھے پکارتی رہ جاتیں لیکن اگر میرا کہیں جانے کا
موڈ نہ ہوتا تو میں کان لپیٹے پڑا رہتا۔ میں مولوی خضر کو بے آرام نہیں کرنا چاہتا تھا، لیکن وہ خاتون کسی بزرگ ہی
کی تلاش میں یہاں تک آئی تھیں۔ کچھ دیر میں مولوی خضر بھی باہر نکل آئے۔ خاتون نے اپنا مدعا پھر سے بیان
کیا۔ مولوی خضر نے میری جانب دیکھا اور اُن کو بتایا ''یہ عبداللہ میاں ہیں۔ یہی اب درگاہ کے متولی ہیں۔
بہر حال، آپ کہتی ہیں تو میں بھی آپ کے ساتھ نیچے چلتا ہوں۔'' عورت کے چہرے پر حیرت کے تاثرات
اُبھرے ''تو یہ عبداللہ ہے؟'' میں درگاہ کی سیڑھیوں کے پاس آ کر ٹھہر گیا، کیوں کہ میں چاہتا تھا کہ سائل کی
خواہش کے مطابق مولوی خضر ہی اُس لڑکے کے لیے دُعا کریں۔ کیوں کہ یہ اُن کے اعتماد اور یقین کا معاملہ تھا
اور دُعا بنا کامل یقین کب اپنا اثر دکھاتی ہے۔ لیکن مولوی خضر جب چند سیڑھیاں نیچے اُتر چکے اور انہوں نے
مجھے ہم قدم نہیں پایا تو وہ بھی ٹھٹک کر رُک گئے ''عبداللہ میاں...... آپ نہیں آئیں گے میرے ساتھ ان
صاحبزادے کو دُعا دینے......؟'' مجبوراً مجھے بھی قدم بڑھانا پڑے۔ نیچے نئے سال کے ماڈل کی ایک چمکتی دمکتی
کار کھڑی تھی اور ایک نوجوان لڑکا کانوں میں ہیڈ فون لگائے کسی نغمے کی دُھن پر اپنی اُنگلیوں کی تال ملانے کی
کوشش کر رہا تھا، جو اس وقت گاڑی کے اسٹیئرنگ کو پکڑے ہوئے تھیں۔ اُس نے ایک مسکراتی نگاہ پہلے اپنی
ماں اور پھر ہم دونوں پر ڈالی لیکن وہ گاڑی ہی میں بیٹھا رہا۔ خاتون نے ہمارا تعارف کروایا۔ ''شہزاد بیٹا......
بزرگ تمہیں دُعا دینے آئے ہیں اور یہ نوجوان اس درگاہ کا متولی ہے......'' شہزاد مسکرایا ''واہ...... کیا بات ہے؟

کیا۔ آج کل درگاہوں پر بھی نئے لڑکے سی ایس ایس یا اس قسم کا کوئی دوسرا مقابلے کا امتحان پاس کر کے آنے
لگے ہیں۔ آئی مین، ہی از کوائٹ ینگ فار اینی سچ پلیس مام۔'' ماں نے بیٹے کو گھور کر تنبیہ کی۔ مولوی خضر نے
بنا کچھ کہے، وہیں کار کے قریب کھڑے کھڑے شہزاد کے لیے دُعا کی اور ہم دونوں نے آمین کہہ کر اپنے چہرے
پر ہاتھ پھیر لیا۔ شہزاد اب بھی اپنی جگہ کار میں جما بیٹھا ہوا تھا۔ ہم نے واپسی کے لیے قدم بڑھائے تو ماں نے
ممنونیت سے ہمیں دُعا دی۔ میرے ہونٹوں پر مسکراہٹ آ گئی۔ جو ماں ہمیں دُعا دے رہی تھیں وہ اپنے بیٹے
کے لیے دُعا کروانے اتنی دُور چلی آئی تھی۔ ان ماؤں کو اولاد کے معاملے میں اپنی دُعاؤں پر اک ذرا سا اعتماد
بھی کیوں نہیں ہوتا۔ کسی ماں کی دُعا سے بڑھ کر کسی بھی درگاہ کے مجاور، متولی یا بزرگ کی دُعا بھلا کیا ہو گی؟
ہمارے مڑتے وقت لڑکے نے اپنی ماں سے انگریزی میں کہا ''آپ نے خواہ مخواہ اتنی دُور آ کر اپنا اور میرا وقت
ضائع کیا۔ اس بوڑھے اور اس لڑکے کو تو خود دُعا کی ضرورت ہے، ورنہ یہ دونوں یہاں اس ویرانے میں نہ
پڑے ہوتے۔'' میں سنی اَن سنی کر کے آگے بڑھ جانا چاہتا تھا، لیکن خلاف معمول اور خلاف توقع نہ جانے مولوی
خضر کیوں رُک گئے اور انہوں نے شدھ انگریزی میں شہزاد کو جواب دیا۔ ''دُعا کی ضرورت کسے نہیں ہوتی۔ کوئی
دُعا کی محبت میں یہاں وہاں بھٹکتا ہے اور کسی کو محبت کی دُعا کے لیے اِن ویرانوں تک آنا پڑتا ہے۔ اللہ سب کی
سنتا ہے، میری دُعا ہے کہ وہ تمہاری بھی سنے۔''

ہم شہزاد اور اُس کی ماں کو ہکا بکا چھوڑ کر اُوپر درگاہ میں چلے آئے۔ جانے کیوں مولوی خضر مجھے کسی گہری
سوچ میں ڈوبے نظر آئے، لیکن میں نے حسب عادت انہیں کریدنا مناسب نہیں سمجھا۔ مغرب کے بعد میرے
اندر وہی اک عجیب سی بے چینی سرایت کرنے لگی، جو اب شاید میری زندگی کا حصہ بنتی جا رہی تھی۔ لیکن آج
بہت دنوں کے بعد زہرا کی یاد کا وہ مستقل کانٹا سرِ شام ہی ٹیس دینے لگا تھا، جسے میں عموماً ساری دنیا کے
سو جانے کے بعد رات کی تنہائی میں اپنے دل کے پھپھولے پھوڑنے کے لیے نشتر کے طور پر استعمال کرتا تھا۔
بے اختیار رونا آ گیا اور نہ جانے کب حجرے کی دیوار سے ٹیک لگائے میری آنکھ لگ گئی۔ نیند میں بھی میں روتا
ہی رہا۔ ماں کے پیٹ میں بچہ گھٹنوں سے سر جوڑے دنیا میں آنے کا انتظار کرتا ہے۔ کہتے ہیں، جسم کا یہی آسن
انسان کو فطرت سے سب سے زیادہ قریب رکھتا ہے۔ کچھ لوگ ساری عمر نیند میں گھٹنے سینے کی جانب موڑے
رکھتے ہیں۔ میں بھی اس وقت گھٹنوں میں سر دیئے بیٹھا رُو رہا تھا، تبھی مجھے اپنے سر کے اُوپر کسی کے ہاتھ کا
مانوس شفقت بھرا لمس محسوس ہوا۔ میں نے سر اُٹھایا۔ وہ سلطان بابا تھے۔ ہاں...... وہی تو تھے، لیکن میں تو اُن
سے رُوٹھا ہوا تھا۔ اس لیے سلام کر کے چپ چاپ اپنے آنسو اپنی ہتھیلیوں سے صاف کر کے رُوٹھا سا بیٹھا رہا۔
اُن کے ہونٹوں پر وہی دھیمی سی مخصوص مسکراہٹ سجی ہوئی تھی ''یہ کیا ساحر میاں؟ اپنے سلطان بابا سے بات بھی
نہیں کرو گے کیا۔ اور یہ کیا حال بنا رکھا ہے تم نے اپنا۔ یہود سے اتنی بڑی جنگ جیتنے والا بھی کبھی روتا ہے کیا؟''
میں نے اُن کی جانب شکایت بھری نظر ڈالی ''آپ جانتے ہیں آپ کے بنا میری ہر جیت، ہار ہے۔ اور جانے

آپ نے مجھ سے اتنی توقعات کیوں وابستہ کرلیں ہیں۔ اتنا مضبوط نہیں ہوں میں۔ ٹوٹ کر ریزہ ریزہ ہو چکا ہوں۔ مت ڈالیں اتنے بڑے امتحان میں مجھے۔'' میں پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا، انہوں نے میرا ہاتھ تھام لیا۔ ''منزل کے اتنے قریب پہنچ کر پلٹ جاؤ گے......؟ واپسی کا رستہ اس ڈگر سے کہیں زیادہ طویل ہے، جو سیدھی تمہاری منزل مقصود تک جاتی ہے۔'' اب میں انہیں کیا بتاتا کہ محبت کے سفینے عموماً اپنے ساحلوں کے قریب ہی غرق ہوتے ہیں۔ میری ناؤ تو زہرا کے جاتے ہی ڈوب چکی تھی اور میں لہروں سے لڑنے کی ہر کوشش بھی ترک کر چکا تھا۔ اب تو بس سمندر کی تہ میں جا لیٹنا باقی تھا۔ وہاں کی ریت، سیپیاں اور گھونگھے ساحر کا انتظار کر رہے تھے۔ سلطان بابا نے میرا ہاتھ میرے ہی دل پر رکھ دیا۔'' جو لوگ یہاں سے سوچتے اور فیصلے کرتے ہیں انہیں زیادہ مخمصے نہیں ستاتے۔ اور ہاں، یاد رہے کہ ہمارے راستے پہلے سے مقرر ہیں۔ ہمیں بس قدم بڑھانے کی ضرورت ہوتی ہے۔ کل تمہارے قدم بھی تمہارے مقررہ رستے پر اُٹھ ہی جائیں گے۔'' مجھے یوں محسوس ہوا، جیسے سلطان بابا کے ہاتھ سے کوئی قوت آمیز حرارت میرے ہاتھوں سے ہوتی ہوئی، جسم میں منتقل ہو گئی ہے۔ میں نے چونک کر آنکھیں کھول دیں۔ میں وہیں درگاہ کی منڈیر کے پاس گھٹنے جوڑے بیٹھا ہوا تھا اور میری آنکھوں سے بہتے آنسوؤں کی لکیریں اب بھی میرے گالوں پر جمی ہوئی تھیں۔ میرا دایاں ہاتھ ٹھیک اسی جگہ میرے دل پر اب بھی اُسی طرح جما ہوا تھا، جیسے سلطان بابا اُسے رکھ گئے تھے۔ رات ابھی نصف سے زیادہ باقی تھی اور اس سے کہیں زیادہ باقی میرے اندر کی گرہیں تھیں۔ رات تو شاید کچھ دیر بعد بیت ہی جاتی تھی، لیکن یہ گرہیں کھلنے کے لیے نہ جانے کتنی صدیاں درکار تھیں۔

صبح ہوئی تو میرا سر درد سے پھٹا جا رہا تھا۔ میرا دل چاہ رہا تھا کہ میں آنکھیں بند کیے حجرے میں پڑا رہوں کیوں کہ مجھے سورج کی کرنیں برچھیوں کی طرح چبھ رہی تھیں۔ شاید ساڑھے دس کے قریب کا وقت تھا، جب مجھے صحن سے مولوی خضر کی آواز سنائی دی۔ وہ مجھے بلا رہے تھے۔ مجھے کچھ حیرت ہوئی کیوں کہ فجر کی نماز کے بعد خود انہوں نے ہی مجھے حجرے میں آرام کرنے کا مشورہ دیا تھا، کیوں کہ وہ میری سوجی ہوئی آنکھوں سے میری ابتر حالت کا اندازہ لگا چکے تھے۔ اُن کی دوسری آواز کے ساتھ ہی میں حجرے سے باہر نکل آیا۔ صحن میں وہی گزشتہ روز والی خاتون شدید پریشان سا چہرہ لیے کھڑی نظر آئیں۔ مولوی خضر میری جانب بڑھے'' عبداللہ میاں...... یہ بی بی اپنی ایک پریشانی لے کر آئی ہیں۔ کل تم نے ان کے بیٹے کے لیے میرے ساتھ دُعا کی تھی نا۔ آج پھر اس لڑکے کی طبیعت بہت خراب ہے، اتنی زیادہ کہ وہ چل کر یہاں تک آ بھی نہیں سکتا۔ یہ بی بی اس لیے پریشان ہیں کہ کل ان کے بیٹے نے کچھ اُلٹا سیدھا کہہ دیا تھا تو کہیں یہ اُسی کہے کی سزا تو نہیں مل اُسے۔ میں کافی دیر سے انہیں یہی سمجھانے کی کوشش کر رہا ہوں کہ فقیروں کے پاس سوائے دُعا کے اور کوئی نذرانہ نہیں ہوتا۔ بد دُعا نام کا کوئی بھی سکہ ہمارے کشکول میں کہاں، لیکن انہیں اطمینان نہیں ہو رہا۔ تم ایسا کرو کہ ذرا دیر کے لیے اِن کے ساتھ اِن کے گھر ہو آؤ۔ یہ پڑھا ہوا پانی اُس نوجوان کو پلا دینا۔ انشا اللہ افاقہ

ہوگا۔'' مولوی خضر نے پانی کی بوتل میرے ہاتھ میں تھما دی۔ میں کچھ کہہ نہیں پایا۔ کوئی بات تو خلاف معمول ضرور تھی، ورنہ مولوی خضر مجھے اس بخار نما کیفیت میں کبھی اس عورت کے ساتھ جانے کا نہ کہتے، حالانکہ نہ جانے کیوں میں اندر سے وہاں جانے کے لیے راضی نہیں تھا۔ شہزاد کا متوقع برتاؤ بھی میرے پیش نظر تھا، لیکن میں صرف تعمیل کرنا جانتا تھا، لہٰذا پانی کی بوتل اُٹھائے چپ چاپ نیچے کھڑی گاڑی میں ڈرائیور کے ساتھ بیٹھ گیا۔ شہر کے مضافات کے آس پاس ہی ایک بہت بڑی سی محل نما کوٹھی میں گاڑی داخل ہوئی، تو مکینوں کی نفاست کا اندازہ بڑے باغیچے کی نہایت عمدگی سے تراشی باڑھ ہی سے ہوگیا۔ پورچ میں کچھ اور گاڑیاں بھی موجود تھیں۔ ہم مختلف راہ داریوں سے ہوتے ہوئے ایک نفیس سی خواب گاہ میں داخل ہوگئے۔ سامنے بستر پر شہزاد جسم پر ایک بڑا سا لحاف ڈالے پڑا، بخار میں تپ رہا تھا۔ مجھ پر نظر پڑتے ہی اُس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔ ''ہے یو اینگری مین! مجھے اُمید نہیں تھی کہ تم ممی کے ساتھ آؤ گے۔ کل جب میں نے تم لوگوں کو ڈی گریڈ کرنے کی حماقت کی تھی، مجھے اُسی وقت تمہارے چہرے کے تاثرات سے اندازہ ہوگیا تھا کہ تم بھی میری بات سمجھ گئے ہو۔ لیکن میری توقع کے برعکس جواب تمہارے بزرگ کی طرف سے آیا۔ ہوسکے تو میری معذرت قبول کر لو۔ دراصل اس بیماری نے مجھے بے حد چڑچڑا بنا دیا ہے۔'' میں نے بات ٹالنے کی کوشش کی۔ ''بھول جاؤ سب کچھ...... یہ پانی پی لو...... انشا اللہ افاقہ ہوگا......'' شہزاد نے بے دلی سے پانی کا گھونٹ بھرا۔ ''تمہیں سچ بتاؤں...... مجھے ان باتوں پر بالکل یقین نہیں۔ میں بس ممی کی وجہ سے......'' شہزاد کی ماں نے گھور کر اپنے بیٹے کو تنبیہ کی۔ شہزاد بادل نخواستہ پانی پی گیا۔ ماں مجھ سے بولی ''بیٹا تم اس کی باتوں پر دھیان نہ دو۔ یہ تو سدا کا پگلا ہے۔ تم اپنا عمل پورا کرو۔ میں تمہارے لیے چائے کا کہہ کر ابھی آئی۔'' میں نے جلدی سے انہیں روکا نہیں نہیں۔ چائے کی ضرورت نہیں...... اور مجھے کوئی ایسا خاص عمل نہیں کرنا۔ بس مولوی خضر کی ہدایت کے مطابق چند دُعائیں پڑھنی ہیں۔ آپ کسی تکلف میں نہ پڑیں۔ مجھے جلد واپس لوٹنا ہے۔'' لیکن مائیں بھلا کب کسی کی سنتی ہیں۔ سو، وہ بھی میری سنے بغیر مسکراتی ہوئی کمرے سے باہر نکل گئیں۔ شہزاد اپنی تمام تر زندہ دلی کے باوجود خاصی تکلیف میں دکھائی دے رہا تھا۔ وہ تمام بات چیت کے دوران لیٹا ہی رہا۔ میں نے دُعا کے لیے ہاتھ اُٹھائے تو وہ مجھے غور سے دیکھ رہا تھا۔ دُعا ختم ہونے کے بعد اُس کا سوال ہونٹوں پر آ ہی گیا۔ ''کیا تمہیں اپنی دُعا پر پورا یقین ہے......؟'' میں نے غور سے اُسے دیکھا'' جب تک دُعا کے لیے ہاتھ اُٹھتے نہیں، تب تک میں بھی اُتنا ہی بے یقین رہتا ہوں، جتنے تم اس وقت ہو۔ لیکن ہاتھ آسمان کی جانب اُٹھنے کے بعد نہ جانے کہاں سے اتنا یقین میرے اندر بھر جاتا ہے کہ ہاتھ گرنے سے پہلے سارا جہاں اپنی ان دو جڑی ہتھیلیوں کے پیالے میں پڑا نظر آتا ہے۔ کبھی موقع ملے تو تم بھی آزمانا۔ یقین خود بخود تمہارے اندر کی خالی درزیں بھر دے گا۔ ویسے تمہیں ہوا کیا ہے، کوئی خاص بیماری......؟'' شہزاد نے ایک لمبی اور ٹھنڈی آہ بھری'' کہتے ہیں جس کو عشق...... خلل ہے دماغ کا...... بس یوں سمجھ لو کہ یہی خلل دماغ کی چولیں ہلا گیا ہے۔ کچھ ایسا ہی سودا میرے

من میں بھی سما گیا ہے۔ بولو...... ہے کوئی دُعا تمہارے پاس اس خلل کو رفع کرنے کے لیے......؟'' میں نے چونک کر شہزاد کو دیکھا۔ تو گویا یہ مرض یہاں بھی اپنی جڑیں پھیلا چکا ہے۔ میرا جی چاہا کہ میں شہزاد کو منع کر دوں کہ اس راستے پر قدم نہ بڑھائے۔ جتنی جلدی ہو سکے، واپس پلٹ آئے، ورنہ محبت کی اِن بل کھاتی پگ ڈنڈیوں پر واپسی کے راستوں میں گھنے جنگل اُگ آتے ہیں۔ دُکھ کی امر بیل عاشق کے قدم آگے بڑھتے ہی پیچھے یوں تیزی سے ان ٹیڑھے میڑھے راستوں سے لپٹتی ہے کہ پھر کوئی مڑنا بھی چاہے تو واپسی کا کوئی راستہ سُجھائی نہیں دیتا۔ درد اور غم کے عفریت ان گھنے جنگلوں میں سر شام ہی املتاس کے پیڑوں سے نیچے اُتر آتے ہیں اور واپسی کے بھٹکتے معصوم مسافروں کو چیر پھاڑ کر کھا جاتے ہیں۔ محبت کے راستے پر آگے بھی موت ہے اور پیچھے بھی فنا۔ محبت وہ خونی جزیرہ ہے، جو اپنے باسیوں کے لیے پل بھر میں اُس برفیلے گلیشیئر میں تبدیل ہو جاتا ہے، جو اپنے ساحل سے کٹ کر گہرے سمندر میں بہہ چکا ہے اور اب دھیرے دھیرے گھل کر خود بھی پانی میں تبدیل ہو رہا ہے۔ اس جزیرے پر بسنے والوں کے لیے ایک ایک انچ کر کے پاؤں دھرنے کی جگہ ختم ہوتی جاتی ہے اور آخر کار سبھی ڈوب جاتے ہیں۔ ایک دوسرے سے لپٹے چیختے چلاتے، روتے، سسکیاں بھرتے، کسی برباد ہوتے ٹائی ٹینک کی طرح......

میں جانے کن سوچوں میں گم تھا کہ شہزاد کی ممی کے کھنکارنے کی آواز سن کر پھر سے حال میں پہنچ گیا۔ وہ جانے کب کی چائے کی ٹرالی دھکیلتی خادمہ کے ساتھ واپس آ چکی تھیں۔ شہزاد نے مُسکراتے ہوئے اپنا سوال دُہرایا۔ ''کن خیالوں میں کھو گئے۔ میں نے کہا تھا نا کہ عشق لا علاج ہوتا ہے۔ اس جرثومے کا علاج دنیا کی کوئی بھی سائنس آج تک نہیں ڈھونڈ پائی۔ تم بھی اپنے رُوحانی علاج کی حدیں آزما دیکھو۔'' شہزاد کی ماں نے پھر اُسے ٹوکا ''شیری! تم باز نہیں آؤ گے نا۔ کیوں مہمان کو زِچ کر رہے ہو۔ یہ صرف تمہارے لیے اتنی دُور سے یہاں تک آیا ہے۔'' خادمہ نے چائے کی پیالی مجھے پیش کی، لیکن خلاف توقع شہزاد نے چائے پینے سے گریز کیا۔ میں نے جلدی میں دو چار گھونٹ حلق سے نیچے اُنڈیلے اور واپسی کے لیے اُٹھ کھڑا ہوا۔ شہزاد نے لیٹے لیٹے ہاتھ بڑھایا۔ ''پھر کب ملاقات ہو گی پیر جی......'' میں جانتا تھا کہ ''پیر جی'' کی اصطلاح صرف اُس نے الوداعی لمحات کو خوش گوار بنانے کے لیے گھڑی تھی۔ ''جلد ہو گی، لیکن پہلے تمہارے اس خلل کی کوئی ترکیب تو ڈھونڈ نکالوں حالانکہ یہ تو وہ عارضہ ہے کہ جس کے طبیب بھی بعض اوقات اس جرثومے کے زہر کا شکار ہو کر مجنوں بنے پھرتے ہیں۔ کبھی کبھی محبت چھوت کی طرح اپنا اثر چھوڑتی ہے۔ سو، پہلے میں اس کا اینٹی وائرس ڈھونڈ لوں، پھر تم سے تفصیلی ملاقات ہو گی۔'' شہزاد کی ممی حیرت سے ہم دونوں کے درمیان ہوتی اس گفتگو کو سن رہی تھیں، مسکرا کر بولیں۔ ''اس کے لیے تمہیں کوئی اینٹی وائرس ڈھونڈنے کی ضرورت نہیں ہے بیٹا۔ یہ پہلے ہی محبت کی جنگ جیت چکا ہے۔ جانے اس کے دل سے یہ بے معنی خدشات کیوں نہیں نکلتے۔ اگلے ماہ ہی تو اس کی زندگی کی سب سے بڑی خوشی ہمارے آنگن میں بہار بن کر اُترنے والی ہے۔ میں نے تمہیں بتایا تھا نا، میرا

ا سدا کا پگلا ہے۔'' شہزاد نے مسکرا کر اپنی ماں کو دیکھا اور تکیے کے نیچے سے ایک تصویر نکالی اور دھیرے ے جیسے اپنے آپ سے بولا...... ''اُن کے دیکھنے سے جو آ جاتی ہے منہ پر رونق......'' ماں نے ہنس کر بیٹے ے تصویر لی اور فخر سے اپنے بیٹے کی پسند پر نظر ڈالی اور پھر مجھ سے بولیں...... ''بیٹا! اپنے بزرگ سے کہیے ا کہ میرے بیٹے کی خوشیوں کے لیے بھی دُعا کریں۔ میں خود کسی دن اپنی ہونے والی بہو کو لے کر درگاہ ؤں گی......''

میں نے سلام کر کے واپسی کے لیے قدم بڑھائے اور مڑتے مڑتے میری پھسلتی سی نظر ماں کے ہاتھوں ں پکڑی بہو کی تصویر پر پڑ گئیں۔ میرے ذہن میں قیامت کا دھماکا ہوا اور زمین شق ہو گئی۔ میں چکرا کر زمین ر پڑا لیکن گرتے گرتے بھی میری زخمی نگاہ شہزاد کی ماں کے ہاتھ میں پکڑی زہرا کی تصویر پر ہی جمی رہی۔ ں...... وہ زہرا ہی تھی...... جو کبھی میری تھی۔

''دوسرا رقیب''

جانے میں کتنی دیر اپنے حواس سے بیگانہ رہا۔ جب ہوش آیا تو شہزاد کی ماں اور گھر کے نوکر پریشانی کے عالم میں میرے اطراف کھڑے تھے۔ میں بوکھلا کر کھڑا ہو گیا۔ سب نے مجھے روکنے کی بہت کوشش کی کہ طبیعت سنبھل جانے تک میں وہیں آرام کرلوں، لیکن میں نے بمشکل اُن سب کو یقین دلایا کہ ایسے دورے میرے لیے معمول کی بات ہیں اور اب میں بالکل ٹھیک ہوں، لہٰذا میرا درگاہ پہنچنا ضروری ہے کہ وہاں کی بہت سی ذمہ داریاں میری راہ تک رہی ہیں۔ میرے جسم کی لرزش ابھی تک قدموں کی لڑکھڑاہٹ سے ظاہر تھی۔ مجھے پتا ہی نہیں چلا کہ میں کب گاڑی میں بیٹھا اور کب ڈرائیور نے مجھے درگاہ کی سیڑھیوں کے قریب لا کر اُتار دیا۔ میں نے پہلی سیڑھی پر قدم رکھا تو مجھے زہرا کے پرانے ڈرائیور کی بات یاد آئی۔ اُس نے تو زہرا کے ہونے والے ہم سفر کا نام خرم بتایا تھا۔ تو پھر یہ شہزاد......؟ میں فوراً واپس پلٹا۔ ڈرائیور تب تک گاڑی موڑ چکا تھا۔ میں نے اُسے ہاتھ کے اشارے سے روکا ''یہ جو لڑکا بیمار تھا...... اُس کا پورا نام کیا ہے......؟'' ڈرائیور چونکا ''کون...... چھوٹے صاحب۔ ان کا نام شہزاد ہے......خرم شہزاد......'' ڈرائیور نے گاڑی آگے بڑھا دی اور میں جیسے صدیوں پیچھے کا سفر ایک ہی پل میں طے کر گیا۔ کیا ہاتھ آیا میرے......؟ میں تو آج بھی اُتنا ہی تہی دامن تھا۔ میں جب تک درگاہ کی سیڑھیاں چڑھ کر اُوپر صحن تک پہنچا، تب تک میرا جسم باقاعدہ کانپنا شروع کر چکا تھا۔ وہ تو اچھا ہوا کہ مولوی خضر حجرے میں تھے، ورنہ بوکھلا ہی جاتے۔ میں بمشکل خود کو کسی طرح گھسیٹ کر درگاہ کی منڈیر تک جا پہنچا اور وہیں ٹیک لگا کر گر سا گیا۔ کچھ ہونیاں ایسی بھی ہوتی ہیں، جو بالکل کسی انہونی کی طرح ہم پر وارد ہوتی ہیں۔ مجھے تقریباً ایک ماہ پہلے ہی یہ خبر مل چکی تھی کہ زہرا کسی اور کی ہونے والی ہے لیکن اس کے باوجود یہ خبر میرے حواس پر آج اُسی طرح بجلی بن کر گری، جیسے مجھے آج ہی اس بات کی آگہی ہوئی ہو۔ شاید انسان کی فطرت ہی میں آخری لمحے تک طوفان ٹل جانے کی اُمید کہیں نہ کہیں باقی رہتی ہے، لیکن جن طوفانوں کو آنا ہوتا ہے...... وہ آ کر ہی رہتے ہیں۔ میری زندگی کا سب سے بڑا طوفان بھی آ چکا تھا اور کیسی بے بسی تھی کہ مجھے تو کوئی سائبان بھی میسر نہیں تھا یا طوفان شاید اُن کے لیے ہی طوفان کہلاتا ہے، جو مجھ جیسے بے سائبان ہوتے ہیں۔ ساری رات میں یوں ہی درگاہ کی دیوار سے ٹیک لگائے ہڑکتا رہا اور صبح میری آنکھوں سے پوری رات کی بہتی شبنم درگاہ کی زمین پر کہرے کے موتیوں کی صورت چمک رہی تھی۔ لیکن میرا نصیب وہی سدا کا ماندہ، مدہم اور کالک زدہ تھا۔ مجھے جس کی مسیحائی کے لیے چنا گیا تھا، وہ خود میرا ہی رقیب تھا۔ عاشق تو

اپنے رقیب کے خلاف تعویذ گنڈے کروانے کے لیے عاملوں کے در کی خاک چھانتے پھرتے ہیں اور ایک میں تھا کہ جسے مقدر خود اپنے رقیب کے در پر لے آیا تھا کہ جا اپنے دامن میں بچا آخری اُمید کا گلاب بھی اپنے رقیب کے حوالے کر دے اور اُس کی جھولی میں بھرے سبھی کانٹے اپنے جگر میں پرو کر لہولہان اور خالی ہاتھ واپس لوٹ جا۔ سو میں خالی ہاتھ درگاہ کے صحن میں دُھول میں اٹا بیٹھا تھا، دُھوپ نے درگاہ کی منڈیر کا ماتھا چوما تو مولوی خضر حجرے سے باہر نکل آئے۔ میں نے اپنی آواز میں چھپے طوفان دبانے کی کوشش کی'' آپ جانتے تھے کہ خرم شہزاد ہی زہرا کا ہونے والا جیون ساتھی ہے، پھر آپ نے مجھے وہاں کیوں بھیجا اُس کی تیمارداری کے لیے......؟ کیا آپ کو بھی عبداللہ کو بار بار تپتی آگ میں جھونکنا بہت بھاتا ہے۔ ایک ہی بار مجھے بھسم کیوں نہیں کر دیا جاتا ہے۔ یہ روز روز کے سلگتے داغ میری رُوح کو کب تک سہنا ہوں گے......؟'' شاید میرا لہجہ کچھ زیادہ تلخ ہوتا گیا لیکن مولوی خضر حسب عادت چپ چاپ سر جھکائے سنتے رہے۔ مجھے پتا ہی نہیں چلا کہ کب بولتے بولتے میرا گلا رُندھ گیا اور ازل سے بھیگی پلکیں پھر سے نم ہونے لگیں۔ مولوی خضر نے دھیرے سے سر اُٹھایا اور میرا ہاتھ تھام کر کچھ دیر تک لفظ جوڑتے رہے۔ ''یقین جانو، عبداللہ میاں...... میرے بس میں ہوتا تو یہ ساری آگ اپنے مقدر کے پیالے میں بھر لیتا لیکن تمہاری رُوح پر مزید کوئی ضرب نہ پڑنے دیتا۔ پر ہم دوسروں کے نصیب مول پاتے تو بات ہی کیا تھی۔ بس، اتنا سمجھ لو کہ سب پہلے سے طے شدہ ہوتا ہے۔ اور ہم شدید خواہش رکھنے کے باوجود کبھی دُعا کی کنجی سے بھی کچھ بند تالے کھول نہیں پاتے......'' مولوی خضر یونہی چپ چاپ بیٹھے کافی دیر تک میرا ہاتھ تھپکتے رہے۔ کبھی کبھی خاموشی ہی بہترین گفتگو ہوتی ہے۔ لفظ ہلکے پڑنے لگتے ہیں۔ شاید اس لیے کہ خاموشی اور سکوت قدرت کے عطیات میں سے ایک ہیں اور لفظ اور بولی انسان کی اپنی ایجاد۔ سو، میں اور مولوی خضر بھی سکوت میں خاموشی کی آہٹوں اور سرگوشیوں والی بولی بولتے اور سنتے رہے لیکن ہمارے لب ساکت ہی رہے۔

سہ پہر کے بعد مولوی خضر کو چند زائرین نے آ گھیرا تو میرا جی گھبرانے لگا اور میں نے خود کو درگاہ کی سیڑھیوں سے کچھ فاصلے پر واقع بازار میں گم کرنے کا تہیہ کر کے باہر کی جانب قدم بڑھائے۔ بعض اوقات اجنبی ہجوم بھی ذہن کی اُلجھی گرہیں اٹکانے میں بہت معاون ثابت ہوتا ہے۔ لیکن ابھی میرے قدم تیسری سیڑھی ہی پر تھے کہ میں نے خرم کی ماں کو درگاہ کی جانب بڑھتے دیکھا۔ اُن کا ڈرائیور بھی اُن کے پیچھے چلا آ رہا تھا، جس کے ہاتھ میں پھلوں کی چند ٹوکریاں بھی دکھائی دے رہی تھیں۔ خاتون کی نظر مجھ پر پڑی تو وہ جلدی سے میری جانب بڑھیں ''عبداللہ...... تم کہیں جا رہے ہو بیٹا......؟'' میں رُک گیا۔ ''جی...... بس ذرا دل گھبرا رہا تھا، سوچا کچھ دیر ٹہل آؤں......'' انہوں نے جلدی سے میرے ماتھے پر ہاتھ رکھا ''اوہ...... تمہیں تو بہت تیز بخار ہے۔ ایسی حالت میں تمہیں آرام کرنا چاہیے۔'' میرے منہ سے نکلتے نکلتے رہ گیا کہ ''اب اسی حالت میں مجھے آرام ملتا ہے۔'' لیکن اچھا ہوا کہ میرے لب سلے ہی رہے۔ مجبوراً مجھے اُن کے ساتھ ہی درگاہ واپس لوٹنا

پڑا۔ آج وہ بہت خوش نظر آ رہی تھیں، انہوں نے خصوصی طور پر مولوی خضر کا شکریہ ادا کیا کہ خرم کی حالت اب بہت بہتر ہے اور یہ سب اُن کے بقول اس ''کرشماتی پانی'' کا اثر تھا، جو میں گزشتہ روز خرم کو پلا کر آیا تھا۔ مولوی خضر مسکرا کر بولے ''اللہ کے کلام میں بڑی طاقت ہے بی بی۔ اس میں ہمارا کوئی کمال نہیں۔ میں نے تو بس اُس خالق کے لازوال کلام کی چند آیات پڑھ کر اس پانی پر پھونکی تھیں۔ اور یہ عمل آپ خود اپنے گھر میں بھی کر سکتی ہیں۔ میں آپ کو چند مخصوص آیات لکھ کر دے دوں گا۔ آپ روزانہ شام کو مغرب سے پہلے اپنے بیٹے کو پانی دم کر کے پلا دیا کریں۔ اللہ شفا دے گا۔'' خرم کی والدہ میری جانب مڑیں۔ ''وہ تمہیں بھی یاد کر رہا تھا بیٹا۔ جب کبھی وقت ملے تو ہماری طرف ضرور چکر لگانا۔ مجھے خوشی ہوگی۔'' میں صرف سر ہلا کر رہ گیا۔ پھر نہ جانے کیوں اُن کی آواز بھرّا سی گئی ''ہمارے پاس خوشیوں کی ویسے بھی بہت کمی ہے۔ میں تو بس اب اُس دن کے انتظار میں جی رہی ہوں جب زہرا خرم شہزاد کی دلہن بن کر ہمارے گھر کی رونق بنے گی۔ مجھے یقین ہے اُس دن میرے پگلے بیٹے کے ہونٹوں پر سدا قائم رہنے والی مسکان اُبھرے گی اور اُس کی زندگی کا ہر درد ہر غم ہمیشہ کے لیے مٹ جائے گا۔'' زہرا کا نام سنتے ہی میرے آس پاس وہی تیز آندھیاں چلنے لگیں، جو ہمیشہ مجھے ایک کمزور تنکے کی طرح اُڑا لے جاتی تھیں۔ خرم کی والدہ سچ ہی تو کہہ رہی تھیں۔ جسے زہرا نصیب ہو جائے، پھر بھلا اُسے کسی اور چاندنی کی ضرورت کہاں......؟ کبھی وہ میرے مقدر کا چاند تھی، جسے میں نے پا کر کھو دیا تھا۔ کچھ آنگن سدا سونے بھی تو رہتے ہیں۔ اُن کے نصیب کی چاندنی کسی اور کی منڈیر پر چٹک جاتی ہے۔ تقدیر کے گھنے کالے سائے پیپل کے پیڑ سے لپٹ کر اُس آنگن تک روشنی کی ایک نیلی کرن بھی نہیں پہنچنے دیتے اور پھر مجھے مقدر سے گلہ کرنے کا حق بھی کب تھا۔ زہرا تو جبل پور میں لاریب کی حویلی ہی میں، مجھے اپنی رُوح سونپنے کا عندیہ دے چکی تھی، لیکن میں ہی اُسے انتظار کی صلیب پر مصلوب کر کے آگے بڑھ گیا تھا۔ مجھے تو اُسی وقت سلطان بابا نے اجازت دے دی تھی کہ میرے سفر کا پہلا پڑاؤ آ چکا لہٰذا میں چاہوں تو زہرا کا ہاتھ تھام کر واپس پلٹ سکتا ہوں۔ میں نے تبھی اپنا نصیب کیوں نہیں سمیٹ لیا۔ نصیب بھی تو دستر خوان پر بچھے رزق کی طرح ہوتا ہے، اُسے زیادہ دیر انتظار کروایا جائے تو اُس کی بے حرمتی ہوتی ہے۔ مقدر رُوٹھ جاتے ہیں، کسی اور کی تقدیر بن جاتے ہیں۔ لیکن میں بھلا کب ناشکرا تھا؟ میرے دل میں اگر کچھ بھرم تھے تو وہ بھی بلاوجہ کے تو نہیں تھے۔ زہرا کے انتظار کا بھرم، میری واپسی تک اُس کی مخمل پلکوں کو اپنی راہ میں بچھے دیکھنے کا بھرم، اپنی اس برباد محبت پر اعتماد کا بھرم، لیکن بھرم تو بس ٹوٹ جانے کے لیے ہی قائم ہوا کرتے ہیں۔ کتنی عجیب بات ہے کہ یہ آبگینے جیسے نازک بھرم اپنے دل کے اندر پالتے تو ہم خود ہیں، لیکن ان کے ٹوٹنے کی دہائی ہم اوروں کو دیتے پھرتے ہیں۔ میرا پاگل دل بھی اپنے بھرم کی شکست کا بار زہرا پر ڈالنے کے جواز ڈھونڈ رہا تھا، لیکن اب میں اپنے اس ''نادان دوست'' کے بہکاوے میں آنے والا نہیں تھا۔ زہرا اگر میرا انتظار نہیں کر پائی تو کیا ہوا۔ اُس نے کبھی ایک بار مجھے اپنی رُوح سونپی تھی۔ کیا یہ ایک اعزاز ہی میرے پورے جنم کے لیے کافی نہیں تھا، تو پھر میرا یہ دیوانہ پن ختم

کیوں نہیں ہو جاتا۔ میری کومل رُوح کے پرزے یوں پارہ پارہ ہو کر فضا میں کیوں تحلیل ہوئے جا رہے تھے۔ آخر ہم انسان اپنے نصیب کے لمحے جی کر بھی پل پل کیوں مرتے رہتے ہیں۔ مقدر ہمارا ظرف اتنا وسیع کیوں نہیں کر دیتا کہ ہم اپنی تمام عمر اُس ایک جاوداں پل ہی میں گزار دیں، جو کبھی ہمارا نصیب تھا۔ ہم یادیں سمیٹنے کی دُھن میں اتنی دُور کیوں چلے آتے ہیں کہ پھر واپسی کے خیال ہی سے ہمارا دم گھٹنے لگتا ہے؟ خرم کی والدہ نہ جانے کیا کچھ کہتی رہیں اور میں اُن کے مستقبل کے سنہرے سپنوں کی داستان میں اپنا آج جلتے دیکھتا رہا۔ شاید محبت کی پیاس بھی پانی کی پیاس جیسی ہی ہوتی ہے۔ ہر بار سیر ہو چکنے کے بعد پھر سے پلٹ آنے والی پیاس۔ یہ تو اچھا ہوا کہ مولوی خضر وہاں موجود تھے اور وہ خاتون کی ہاں میں ہاں ملاتے رہے، ورنہ میں تو بس گنگ ہی بیٹھا رہا۔ وہ نہ جانے کب میرے سر پر ہاتھ پھیر کر، دُعا دے کر چل دیں اور مجھے پتا بھی نہیں چلا۔

رات تک میرا جسم شدید بخار میں پھنکنے لگا۔ بات صرف جسم تک ہی محدود ہوتی تو میرا یہ جسم ایسے کئی عذاب بیک وقت جھیلنے کی سکت رکھتا تھا، لیکن یہ حدت تو میری رُوح کے ریشوں کو بھی جھلسا رہی تھی۔ دل کچھ اس عجب انداز میں دھڑک رہا تھا، جیسے اپنی گنتی کی دھڑکنیں اس رات پوری کر کے ہی دم لے گا اور پھر اگلی صبح جب اس بے چینی کا عروج میرے زوال کا اختتامی باب لکھنے کے قریب ہی تھا کہ اچانک پھر اُسی بادِ نسیم کے معطر اور یخ جھونکے نے میرے تن من کو جھنجھوڑ کر رکھ دیا۔ یہ تو وہی مانوس خوشبو تھی، جو اُس ہستی قاتل سے منسوب تھی، جس کے ہاتھوں پر میرے خون کے متبادل مہندی کا رنگ سجنے کو تیار تھا۔ ہاں، یہ تو وہی مانوس ہوا تھی، جو زہرا کی آمد سے منسوب تھی۔ میں اُس وقت صحن میں آنکھیں موندے پڑا تھا اور مولوی خضر میرے ماتھے پر ٹھنڈے پانی میں بھگو کر پٹیاں رکھ رہے تھے۔ میں نے پٹ سے آنکھیں کھول دیں اور کراہتے ہوئے اُٹھ بیٹھا۔ مولوی خضر ''ارے...... ارے'' ہی کرتے رہ گئے، لیکن میری نظریں درگاہ کے صحن میں داخلی دروازے پر جم کر رہ گئیں۔ مولوی خضر نے بھی میری نگاہوں کے تعاقب میں نظر ڈالی، لیکن داخلی راستہ تو سنسان پڑا تھا۔ مولوی خضر نے حیرت سے میری جانب دیکھا ''کیا ہوا میاں...... کس کی راہ دیکھ رہے ہو......؟'' میرے منہ سے بے اختیار نکل گیا۔ ''وہ...... جس کی راہ کی دُھول بننا میرا مقدر ٹھہر چکا ہے۔'' مولوی خضر نے دوبارہ دروازے کی جانب دیکھا۔ ''لیکن وہاں تو کوئی نہیں ہے میاں......'' میرے دل نے آج تک پہلے کبھی اُس کی آمد کی جھوٹی گواہی نہیں دی تھی۔ لیکن آج درگاہ کا سنسان دروازہ میرا یہ بچا کھچا اور آخری مان بھی توڑ دینا چاہتا تھا۔ میری نظر پتھر ہونے لگی اور میری آنکھ کا جھرنا بہنے لگا اور تبھی میری دھندلائی ہوئی نگاہ نے خرم کی والدہ کی اوٹ میں اُس چاند کو نمودار ہوتے دیکھا۔ میرا دل اس زور سے دھڑکا کہ جیسے سینے کا پنجر توڑ کر باہر نکل آئے گا۔ ہاں!...... وہ زہرا ہی تھی۔ وہی سیاہ لباس میں ملبوس۔ ویسے ہی جیسے پانیوں پر تیرتی ہوئی را
ہنسی۔ میری آنکھوں کی پتلیاں ساکت ہو گئیں۔ بصارت کا مقصد پورا ہو گیا۔ اب جو کچھ بھی تھا، اضافی تھا
زہرا کی رنگت میں پیلاہٹ کی جھلک نمایاں تھی۔ مجھے یوں لگا کہ سارے ساحل پر سرسوں اُگ آئی ہو۔ یا پھ

درگاہ ہی پر کسی نے ہلدی کی پوری پرات اُلٹ دی تھی۔ وہی پلکوں کی مسلسل لرزش، وہ نظریں جھکائے خرم کی والدہ کے پیچھے مجھ سے صرف چند قدم کے فاصلے پر کھڑی تھی، لیکن کبھی کبھی چند قدم بھی صدیوں کا فاصلہ بن جاتے ہیں۔ یا شاید ہمارا دُوری کو ناپنے کا پیمانہ ہی سدا سے غلط ہے۔ دُوریوں کا بھلا فاصلوں سے کیا واسطہ۔ ٹھیک اُسی لمحے مجھے اس دنیا میں بولی جانے والی تمام زبانوں اور اُن کی تمام لغات کے محدود ہونے کے احساس نے آگھیرا۔ ہمارے لفظ اور ہماری بولیاں صرف اور صرف ظاہری جذبوں اور احساسات ہی کو بیان کر پاتی ہیں۔ جسم سے جسم کے فاصلے کو ''دُوری'' کہتے ہیں لیکن رُوح سے رُوح کے فاصلے کو کیا کہا جائے۔ جو جسم کو جلائے وہ ''آگ'' کہلاتی ہے، لیکن جو رُوح کو جھلسائے اُسے کیا نام دیا جائے۔ جو بولی زبان سے ادا ہو اُسے ''لفظ'' کہتے ہیں، لیکن جو بن بولے اور بن سنے ہی رُوح کو جھنجھوڑ جائے اُس بولی کو کیا کہیں۔ میں بھی اپنے سامنے سر جھکائے کھڑی زہرا کی رُوح سے کچھ ایسی ہی بولی بول رہا تھا۔ وہ رُوح جو کبھی میری ملکیت تھی، لیکن آج کسی پرائے کے تصرف کے بوجھ تلے دبی نظر آرہی تھی۔ خرم کی والدہ مولوی خضر سے باتوں میں مشغول تھیں۔ ''آپ ہی اسے سمجھائیں مولوی صاحب...... یہ تو یہاں آنے کے لیے کبھی راضی ہی نہ ہوتیں اگر خرم ضد نہ کرتا۔ بڑی مشکل سے اسے یہاں لائی ہوں۔ خرم کی طبیعت ٹھیک ہوتی تو وہ بھی ضرور آتا۔ لیکن آج آپ میری ہونے والی بہو اور بیٹے کے لیے کچھ ایسی دُعا کریں کہ ان کے آنے والی زندگی سے غم اور تکلیف کے سائے ہمیشہ کے لیے دُور ہو جائیں۔ ہم نے بہت غم دیکھے ہیں مولوی صاحب۔ اب اگر خوشی مل رہی ہے تو دُعا کریں کہ وہ بھی پوری اور بھرپور ملے۔'' مولوی خضر ہلکے سے بولے ''بی بی میری اللہ سے یہی دُعا ہے کہ وہ آپ کے سارے خاندان کو ہمیشہ اپنی حفظ وامان میں رکھے اور آپ کے ساتھ سب خیر ہی کا معاملہ رہے۔ بس، اتنا جان لیں کہ خوشی نام کے جذبے کا بنیادی عنصر ہی اس کی کم یابی سے ہے۔ جو سدا کے لیے ہو وہ ''خوشی'' نہیں رہتی، معمول بن جاتی ہے۔'' مولوی خضر نے دُعا کے لیے ہاتھ اُٹھا دیئے لیکن میرے ہاتھ گرے ہی رہے۔ میری دُعاؤں میں اتنا ہی اثر ہوتا تو آج وہ کسی اور کی نہ ہوتی۔ میرے کانوں میں خرم کی والدہ کی بات کی بازگشت گونجتی رہی۔ ''یہ تو یہاں کبھی نہ آتی اگر خرم ضد نہ کرتا......'' گویا آج کا یہ پھیرا بھی میرے مقدر کی دین نہیں بلکہ اُس رقیب کی دی ہوئی خیرات تھا۔ مولوی خضر نے دُعا ختم کر کے زہرا کے سر پر ہاتھ پھیرا۔ ''سدا سکھی رہو......'' خرم کی والدہ واپسی کے لیے پلٹتے پلٹتے رُک گئیں۔ ''ارے ہاں عبداللہ بیٹا! وہ تمہیں بہت یاد کرتا ہے۔ اُس کی بہت کم لوگوں سے اتنی جلدی بنی ہوگی۔ تم بھی ہمارے ساتھ گھر چلو نا۔ خرم تمہیں دیکھ کر بہت خوش ہوگا۔ شام سے پہلے ڈرائیور تمہیں واپس چھوڑ جائے گا......'' مجھ سے کوئی جواب نہیں بن پایا۔ مولوی خضر نے جلدی سے بات بنائی ''عبداللہ میاں ضرور آپ کے ساتھ چلے چلتے، لیکن آج تو انہیں بخار نے بُری طرح سے گھیر رکھا ہے۔ طبیعت کچھ سنبھل جائے تو میں خود لے کر آؤں گا آپ کے دولت خانے پر......'' جانے یہ میرا وہم تھا، کوئی سراب تھا یا میری خوش فہمی کہ جس وقت مولوی خضر نے میری بیماری کا ذکر کیا تو اُس بے رحم کی جھکی

ں کی جھالر میں ارتعاش کی اک لہر سی پیدا ہوئی تھی۔ خرم کی والدہ میرے بخار کا سن کر پریشان ہوگئیں اور ں نے جلدی سے بڑھ کر میرے ماتھے کو چھوا ''ہاں بخار تو بڑا تیز ہے۔ عبداللہ تم باقاعدگی سے اپنا علاج ں نہیں کراتے۔ آخر یہ کیسا روگ ہے......؟'' اور یہی وہ لمحہ تھا جب شدید ضبط کے باوجود میری زبان پھسل ئی۔ ''وفا کا روگ ہے مجھے...... آپ دُعا کریں کہ قدرت مجھے بھی بے وفائی کا مرہم عطا کرے۔'' خاتون ، حیرت سے میری جانب دیکھا اور میں اس شکاری کی طرح پچھتایا، جس سے کمان سیدھی کرنے کے دوران تیر پھسل جائے اور وہ اندھا تیر کسی بے گناہ کی جان کے درپے ہو جائے۔ میری زبان سے پھسلے تیر نے بھی ں کانچ کی شہزادی کے کورے من کو داغ دیا تھا۔ لمحہ بھر کو زہرا کی پلکیں اُٹھیں اور میرا سارا جہاں ڈھے گیا۔ ِی کہانی کا آغاز بھی اِسی درگاہ سے اور زہرا کی اُٹھی اک ایسی ہی نگاہ سے ہوا تھا اور میرا انجام بھی وہی ایک تھی۔ پھر نہ جانے کب خرم کی والدہ نے مولوی خضر سے اجازت طلب کی اور کب وہ دونوں درگاہ سے واپس ٹ گئیں، مجھے کچھ خبر نہ ہوسکی۔ میں وہیں درگاہ کے صحن میں بکھرے پتوں کی مانند پڑا رہا اور ساحل کی ہوا ے نوحے پڑھتی رہی۔ مغرب کے قریب مولوی خضر نے زبردستی میرا ہاتھ تھام کر مجھے بیٹھا دیا اور کہیں سے کمبل لا کر میرے لرزتے جسم پر ڈھک دیا، پر رُوح کی لرزش کا کیا علاج......؟ اتنے میں میرے قریب ہی موں کی آہٹ اُبھری اور شام کے ملگجے اندھیرے میں کوئی سایہ میرے قریب آ کر رُک گیا۔ مجھ میں گردن ٹھا کر دیکھنے کی ہمت بھی باقی نہیں تھی۔ پھر کسی نے اچانک بڑھ کر میرے ہاتھ تھام کر اپنے ہونٹوں سے لگا یے۔ میں نے چہرہ پہچاننے کی کوشش کی۔ وہ بختیار تھا۔ ہاں...... وہی ''فریفتہ نصیب'' بختیار...... لیکن آج اس ے چہرے پر ایک خاص چمک نظر آرہی تھی، اس کا لہجہ ممنونیت سے بھرپور تھا۔ ''آپ کی ایک دُعا نے میری دگی بدل دی...... مجھے ازل کے صحرا سے نکال کر اُمید کے ایک ایسے نخلستان میں پہنچا دیا، جہاں میں نے سب لیا ہے۔ میں آپ کا شکریہ کیسے ادا کروں؟'' میں نے سوالیہ نظر سے اُس کی جانب دیکھا۔ بختیار نے ہیجان میز خوشی کے ساتھ بتایا کہ آخر کار اُسے پوری کائنات کھوجنے کے بعد وہ اک نگاہ میسر ہو ہی گئی، جو صرف اور رف اُس کی مدح سرائی میں اُٹھی اور پھر اُسی کے لیے جھک گئی تھی۔ بختیار کے بقول وہ ایک مجسمہ ساز تھی، ن کے ادارے کا سالانہ چندہ بختیار کے ہاں سے ہی جاتا تھا۔ کچھ دن پہلے ادارے نے اُس کے مجسموں کی ائش کا اہتمام کیا تو بختیار کو بھی بطور مہمان خصوصی وہاں مدعو کیا گیا اور تبھی بختیار کو یہ احساس ہوا کہ وہ اس سین مجسمہ ساز، سائرہ کی طرف کھنچا چلا جا رہا ہے، لیکن یہ تو بختیار کے لیے معمول کی بات تھی۔ پوری زندگی وہ ی فریفتہ پن ہی کا تو شکار رہا تھا۔ لیکن یہ معاملہ تب ''خلافِ معمول'' تک جا پہنچا، جب سائرہ نے بختیار کی بانی اپنے فن کی تعریف سن کر شرماتے اور کچھ جھجکتے ہوئے بختیار کے چہرے کا مجسمہ بنانے کی اجازت طلب کر ا۔ بختیار حیرت زدہ سا رہ گیا لیکن وہ اس معصوم خواہش کو چاہتے ہوئے بھی رد نہ کر سکا۔ سائرہ بختیار کی صروفیات کے پیشِ نظر اُس کے گھر ہی پر روزانہ ایک گھنٹے کے لیے آنے لگی اور بختیار کی اپنی ذاتی آرٹ گیلری

ہی میں اُس نے کچی مٹی اور کلکے سے بختیار کا بت تراشنا شروع کر دیا۔ تب زندگی میں پہلی بار بختیار کی جھلستی رُوح پر ٹھنڈے پانی کے چند چھینٹے پڑے، جب سائرہ نے اُسے یہ بتایا کہ وہ بختیار کی سوچ، خیالات اور شاعری سے بے حد متاثر ہوئی ہے اور اِسی لیے اُس نے زندگی میں پہلی بار اتنی جرأت کی ہے کہ خود کسی سے فرمائش کر کے اُس کا مجسمہ گوندھے۔ آخر کار بختیار کے چہرے کا مجسمہ تیار ہو گیا اور بختیار کے بقول اُس نے آج تک کبھی اپنے آپ پر پیار آتا محسوس نہیں کیا تھا لیکن سائرہ کے کمال فن نے اُسے بھی اتنا حسین کر دیا کہ خود بختیار کئی گھنٹے اپنے چہرے کے زاویئے اور خط سراہتا رہا۔ بختیار کا یہ ماننا تھا کہ یہ سب میری دُعا کی قبولیت کی وجہ سے ہوا ہے، ورنہ سائرہ اُس کے اندر چھپے خوب صورت انسان کے چہرے کو یوں نہ گوندھ پاتی۔ میں نے بختیار کی جانب دیکھا۔ ''کاش میں اتنا معتبر ہوتا کہ میری دُعائیں بھی قبولیت کا شرف پاتیں۔ بہر حال، مجھے اس بات کی خوشی ہے کہ آپ کا خواب پورا ہو گیا۔'' بختیار کچھ ہچکچایا۔ ''ہاں، مگر ابھی ایک اُلجھن باقی ہے۔ اُمید ہے کہ آپ آج بھی میرے حق میں دعا کریں گے۔'' میں نے چونک کر بختیار کو دیکھا'' کیسی اُلجھن......؟'' بختیار نے نظریں چرائیں۔'' آپ یہ دُعا کریں کہ قدرت کبھی سائرہ کی بینائی نہ لوٹائے......''
میرے اندر ایک زور دار چھناکا ہوا اور میری رگوں اور نسوں میں وہ سب کانچ دُور تک پیوست ہو گیا۔ ''کیا......؟ کیا مطلب...... کیا سائرہ نابینا ہے...... مگر...... مگر ابھی تو آپ نے کہا تھا کہ قدرت نے آپ کو آپ کے حصے کی وہ ایک نظر بخش دی ہے، لیکن اگر سائرہ دیکھ ہی نہیں سکتی تو پھر......؟'' بختیار نے عجیب سی نظروں سے میری جانب دیکھا'' ہاں...... یہ سچ ہے کہ مجھے ایسا ہی محسوس ہوا تھا اور یہ بھی سچ ہے کہ سائرہ نابینا ہے۔ لیکن کیا ضروری ہے کہ نظر کا واسطہ صرف بینائی ہی سے ہو......؟'' میں نے چونک کر بختیار کو دیکھا۔ بہت بڑی بات کہہ گیا تھا وہ۔ واقعی، ضروری تو نہیں کہ بختیار کے مقدر میں صرف ''بینا نظر'' ہی لکھی ہو؟ بختیار نے اپنی بات جاری رکھی۔'' وہ اپنی اُنگلیوں سے چھو کر دیکھتی ہے۔ قسمت نے اُس کی اُنگلیوں کی پوروں میں اُس کی بصارت چھپا رکھی ہے۔ میرے چہرے کا مجسمہ بھی اُس نے اپنی پوروں کی بینائی سے چھو کر اور محسوس کر کے گوندھا تھا۔ تب ہی اس مجسمے کے چہرے پر کوئی داغ نہیں تھا۔ کوئی سلوٹ کوئی بدنما زاویہ نہیں تھا۔ مجھے اُسی شام یہ احساس بھی ہوا کہ کبھی کبھی مجھ جیسے بدہیئتوں کے لیے بصارت بھی کس قدر بڑا عذاب بن جاتی ہے۔ کاش میں بھی سائرہ کی طرح نابینا ہوتا اور قدرت میری اُنگلیوں کی پوروں کو بھی سائرہ جیسی خوب صورت بینائی عطا کر دیتی...... کاش......'' بختیار بولے جا رہا تھا اور اُس کی آنکھوں سے آنسو رواں تھے۔ میرے سامنے ایک ایسا شخص بیٹھا، جو اپنی محبوب کے لیے سدا کی بے بصیرتی کی بددُعا لینے کے لیے یہاں تک آیا تھا، کیوں کہ اُسے خوف تھا کہ بینائی لوٹ آنے کے بعد اُس کے نصیب کی نظر ہمیشہ کے لیے پلٹ جائے گی۔ پھر سے وہی نفرت اُس کا مقدر ہو گی، جو جنم سے اب تک اُس کی رُوح کو چھلنی کرتی آئی ہے۔ لیکن ستم یہ تھا کہ ڈاکٹروں کے حساب سے سائرہ کی نظر واپس آ سکتی تھی۔ بات صرف اُس کے جوڑ کے خلیے والی پتلیوں کے ملنے تک کی تھی۔

بختیار یہ چاہتا تھا کہ یہ وقفہ بختیار کی موت سے پہلے تک کبھی مکمل نہ ہو۔ بختیار جانتا تھا کہ اُس کی یہ خواہش ید خود غرضی کے زمرے میں شمار کی جائے گی لیکن وہ بے بس تھا۔ شاید زندگی میں ہم سب کبھی نہ کبھی ایسی خود ی کا شکار ہو ہی جاتے ہیں۔ بختیار نے مجھے خاموش بیٹھے دیکھ کر جلدی سے میرے ہاتھ تھام لیے۔'' آپ ے لیے دُعا کریں گے نا...... دیکھیں میں بڑی اُمید لے کر آپ کے پاس آیا ہوں۔ مجھے مایوس نہ بھیجئے گا ں......'' '' آپ نے ٹھیک کہا...... نظر کا بھلا بینائی سے کیا واسطہ......؟ اور یہ بھی سچ ہے کہ کبھی بینا وہ نظر نہیں ہتے، تو پھر ہم دونوں مل کر یہ دُعا کیوں نہ کریں کہ خدا سائرہ کو بینائی کے ساتھ ساتھ آپ کے مقدر کی وہ ایک ر بھی عطا کر دے۔'' وہ بے چین سا ہو گیا'' بات صرف میری نہیں ہے۔ ہماری بصارت کی دنیا سائرہ کی وں والی دنیا کے مقابلے میں انتہائی بدصورت ہے۔ یہاں صرف میں ہی بدنما نہیں۔ وہ یہ سب برداشت ہں کر پائے گی۔'' میں نے ایک گہرا سانس لیا۔'' ٹھیک ہے...... لیکن دُعائیں عرش پار کر جائیں تو پھر واپس یں پلٹا کرتیں۔ اس لیے دُعا مانگتے ہوئے بہت احتیاط کی ضرورت ہوتی ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ آپ کل شام ک دوبارہ سوچ لیں۔ اگر پھر بھی آپ کا یہی فیصلہ رہا تو ہم دونوں مل کر اللہ کے دربار میں اس بددُعا کی عرضی ی ڈال دیں گے۔'' اچانک میرے عقب سے وہی رُوح کھینچ لینے والی ملائم سی آواز اُبھری'' اگر بددُعا ہی کسی یا نصیب کی دنیا کو بدلنے کا ایک واحد ذریعہ ہے تو ایک بددُعا میرے حق میں بھی فرما دیجیے۔''

میں تڑپ کر پلٹا...... درگاہ کے دروازے کے قریب زہرا کھڑی تھی۔

تارِ عنکبوت

ہاں...... وہ زہرا ہی تھی۔ اگر بختیار میرے سامنے نہ بیٹھا ہوتا تو میں اسے ایک خواب ہی سمجھتا۔ لیکن وہ تعبیر تھی۔ میرے نہ سہی...... کسی اور کے خوابوں ہی کی سہی...... لیکن زہرا یوں شام ڈھلے اور اس طرح اکیلے یہاں......؟ میں اپنی جگہ جم سا گیا۔ بختیار کی آنکھوں میں بھی حیرت کی جھلک تھی۔ اُس نے ایک جانب ہو کر زہرا کے لیے جگہ خالی کی اور زہرا میرے سامنے آ کر بیٹھ گئی۔ اُس کی نظریں جھکی ہوئی تھیں اور آج بھی پلکوں کی وہی "لرزشِ بے کراں" میرے اندر کی دنیا اتھل پتھل کر رہی تھی۔ کچھ دیر کے لیے کائنات تھم سی گئی اور پھر اُس کے لب ہلے "خرم کی امی آپ کا نیچے گاڑی میں انتظار کر رہی ہیں۔ خرم بھی اُن کے ساتھ ہیں۔ وہ اُوپر تک نہیں آ سکتے اس لیے......" میرے اندر زور کا جھکڑ چلا اور میرے دل کی ڈالی پر بچا آخری پتا بھی ٹوٹ کر خاک میں جا ملا۔ گویا اب میرا نصیب بھی میرا رقیب لکھے گا۔ میں نے بختیار سے معذرت طلب کی، لیکن میرا لہجہ نہ چاہتے ہوئے بھی تلخ ہوتا چلا گیا "معافی چاہتا ہوں...... مجھے کچھ دیر کے لیے درگاہ سے باہر جانا ہوگا۔ آپ تو بد دعا لینے کے لیے خود یہاں تک چل کر آتے ہیں لیکن کچھ لوگوں کو دعا بھی اپنے دروازے پر درکار ہوتی ہے۔ وہ خود اُٹھ کر کسی کے در پر نہیں آتے۔ اپنا اپنا مقدر ہوتا ہے۔" زہرا نے میری بات کا گھاؤ محسوس کر کے بھی اپنی نظر جھکائے رکھی۔ بختیار جو حیرت سے ہم دونوں کی جانب دیکھ رہا تھا، کچھ ہڑبڑا سا گیا "جی جی...... ضرور کیوں نہیں...... میں پھر کسی وقت حاضر ہو جاؤں گا۔ آپ سائل کی سن لیں......" "جانے ہم دونوں میں سے سائل کون ہے اور سوالی کون......؟" بختیار میری بات سن کر اُٹھتے اُٹھتے ایک بار پھر ٹھٹھک گیا اور پھر موقعے کی نزاکت سمجھتے ہوئے سلام کر کے وہاں سے چل دیا۔ میں اور زہرا درگاہ کے صحن میں اکیلے رہ گئے۔ زہرا کی لرزتی پلکیں کچھ نم سی ہونے لگیں۔ میں نے اُسے چلنے کا اشارہ کیا "چلیں...... میں حاضر ہوں۔" میں نے قدم آگے بڑھائے۔ زہرا کی آواز نے میرا تعاقب کیا "سنیں......" میں رُک گیا، لیکن پلٹ کر اُسے نہیں دیکھا کہ میں جانتا تھا کہ یہ وہ طلسم ہے، جو پلٹ کر دیکھنے والوں کو پتھر کا بنا دیتا ہے۔ "میں آپ سے معافی نہیں مانگوں گی، کیوں کہ کچھ جرم اپنی سزا خود اپنے آپ ہوتے ہیں۔ میرے بس میں ہوتا تو میں کبھی آپ کے سامنے دوبارہ نہ آتی۔ لیکن ساری بات ہی اختیار کی ہے۔ بس اتنا جان لیں کہ میں بے اختیار اور مجبور تھی۔" کاش وہ اتنی سی وضاحت بھی نہ کرتی۔ جانے ہم ہمیشہ اُنہی ہستیوں کے سامنے اپنا سارا ضبط کیوں کھو بیٹھتے ہیں، جن کے سامنے ہمیں ضبط کی سب سے زیادہ ضرورت ہوتی ہے۔ میں بھی ایک لمحے کے لیے اپنا سارا ضبط کھو بیٹھا اور

پ کر پلٹا، وہ سر جھکائے اپنا کانپتا وجود سنبھالنے کی کوشش کر رہی تھی۔ "کم از کم آپ کی زبان سے یہ مجبوری حیلہ بہت عجیب لگتا ہے۔ میں نے آپ سے کوئی وضاحت طلب نہیں کی، نہ ہی آپ کو اپنے دل پر کسی قسم کا بھ لیے رکھنے کی ضرورت ہے۔ میں سمجھ سکتا ہوں لڑکیاں اپنے مستقبل کے بارے میں کافی محتاط ہوتی ہیں۔ بے میں اگر انہیں کسی معذوری کے قریب تر دیوانے اور کسی شہزادے / امیر زادے کے درمیان کسی ایک کا چناؤ رنا ہو تو فیصلہ وہی ہوگا جو آپ نے کیا۔ ساری عمر کے لیے کسی معذور کی بیساکھیاں بننے سے بہتر ہے کسی مبوط شانے کا سہارا بن کر زندگی گزار دی جائے۔ مجھے اس فیصلے پر آپ سے کوئی گلہ نہیں ہے۔" میں نے اپنی ش کے سبھی تیر خالی کر دینے کے بعد دوبارہ قدم آگے بڑھائے ہی تھے کہ پیچھے سے دم توڑتے گھائل کی خری ڈوبتی آواز سنائی دی "آپ کو حق ہے مجھ سے نفرت کرنے کا۔ سب مقدر کے کھیل ہیں۔ گھر سے چلتے ےئ میں نے کچھ سطریں لکھی تھیں، وقت ملے تو انہیں پڑھ لیجیے گا۔" زہرا نے اپنے ہاتھ میں پکڑا، ایک تہ شدہ رق میرے حوالے کر دیا اور آگے بڑھ گئی۔ میں اُس سے یہ بھی نہ کہہ پایا کہ "نفرت" محبت کا سب سے طرناک روپ ہوتا ہے اور شاید محبت سے بھی کہیں زیادہ خالص اور سچا روپ۔ میں درگاہ کی سیڑھیاں اُتر کر ہرا کے نقشِ قدم پر چلتا ہوا جب نیچے پہنچا تو مجھے دیکھ کر خرم کی والدہ جلدی سے گاڑی سے نیچے اُتر آئیں، یکن خرم حسبِ معمول گاڑی ہی میں بیٹھا رہا۔ آج بھی وہ ڈرائیور کے ساتھ ڈرائیونگ سیٹ کے مقابل والی نشست پر بیٹھا تھا۔ اُس کے چہرے سے آج پیلاہٹ جھلک رہی تھی۔ مجھے دیکھ کر وہ مسکرایا "بڑے مغرور ہو یرے مسیحا۔ آخر مجھے ہی یہاں تک آنا پڑا۔" خرم کی ماں نے میرے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے گھور کر اپنے بیٹے کی تنبیہ کی۔ "شہزاد...... تمیز سے......" تب میں نے پہلی مرتبہ نوٹ کیا کہ خرم کی امی جب بہت پریشان یا سنجیدہ ہوتیں تو خرم کو شہزاد بلاتی تھیں۔ "میرے پاس غرور کے قابل کچھ نہیں ہے۔ سب مان، سارے غرور ٹوٹ کر چکنا چور ہو چکے ہیں۔ میں تو اب بس خاک کا ایک ڈھیر ہوں۔ غرور اور فخر کے گہنے تو آپ جیسوں پر سجتے ہیں، جنہیں ایک کائنات میسر ہے۔ اپنا نصیب تو بس داغ ہی ہیں۔" خرم نے چونک کر میری آنکھوں میں جھانکا "سوری...... میرا مقصد تمہارا دل دُکھانا نہیں تھا عبداللہ، اور سچ تو یہ ہے کہ میری کائنات میں بس ایک ہی قابلِ فخر گہنا ہے۔ میرے پاس بھی بس ایک غرور ہی تو باقی بچا ہے۔ جس سے میری ساری کائنات منور ہے۔" خرم نے مسکرا کر زہرا کی جانب دیکھا۔ وہ جو کبھی میرا مان تھی، آج کسی اور کا غرور تھی۔ اس دنیا میں تخت لٹتے اور تاج بدلتے کب دیر لگتی ہے۔ کل کے بادشاہ آج کے بھکاری بنے پھرتے ہیں۔ مجھے اچانک یاد آیا کہ مولوی خضر نے خرم کے لیے سہ پہر کو پانی پر دم کر کے رکھ چھوڑا تھا۔ میں نے خرم کی والدہ سے کہا کہ وہ خرم کو اُوپر درگاہ ہی پر لے چلیں تاکہ مولوی صاحب ہی اُس کو وہ پانی بھی پلا دیں۔ لیکن مجھے یہ دیکھ کر کچھ عجیب سا لگا کہ میری بات سنتے ہی اُن کے چہرے پر ایک عجیب سا تردّد چھا گیا۔ انہیں ہچکچاتے دیکھ کر میں نے خرم سے کہا کہ دو گھڑی کے لیے وہ میرے ساتھ درگاہ کے حجرے تک آ جائے تاکہ مولوی خضر سے بھی اُس کی ملاقات ہو

جائے۔ خرم بھی کسی سوچ میں پڑ گیا، جیسے میں نے کوئی بہت ہی مشکل سوال پوچھ لیا ہو۔ زہرا کے چہرے پر بھی کئی رنگ آ کر گزر گئے۔ کچھ دیر کے لیے وہ تینوں خاموشی سے ایک دوسرے کی جانب دیکھتے رہے۔ پھر خرم نے جیسے کوئی فیصلہ کر لیا اور اس کے چہرے کی مخصوص مسکراہٹ لوٹ آئی ''اچھا چلو...... آج ہم بھی یہ معرکہ سر کر ہی لیتے ہیں، ورنہ تم یہی سوچو گے کہ یہ کیسا مغرور اور سر پھرا امیر زادہ ہے، جو خود اپنے مطلب کے لیے بھی دو قدم چل کر اُوپر نہیں آ سکتا۔'' خرم نے اپنے ڈرائیور کی جانب دیکھا، جو جلدی سے گاڑی سے اُتر کر خرم کے دروازے کی جانب بڑھ گیا لیکن خرم کا دروازہ کھولنے سے پہلے اُس نے گاڑی کا پچھلا دروازہ کھول کر کوئی چیز نکالی اور پھر خرم کی نشست والا دروازہ کھول دیا۔ میرے وجود کے اندر ایک زوردار دھماکا ہوا اور کچھ دیر کے لیے ارد گرد گھٹا ٹوپ اندھیرا چھا گیا۔ ڈرائیور کے ہاتھ میں دو بیساکھیاں تھیں اور گاڑی میں بیٹھے خرم کی دونوں ٹانگیں گھٹنوں سے نیچے مصنوعی تھیں۔ ڈرائیور نے سہارا دے کر خرم کو گاڑی سے باہر نکالا اور بیساکھیاں اُسے تھما دیں۔ خرم نے کچھ لڑکھڑا کر پہلا قدم اُٹھایا۔ میں سوچنے سمجھنے سمیت اپنے تمام حواس کھو چکا تھا۔ گویا خرم اپنی اس معذوری کی وجہ سے آج تک کبھی گاڑی سے نیچے نہیں اُترا تھا۔ میں نے گاڑی کا دروازہ بند ہونے سے پہلے کار کے کلچ اور ایکسیلیٹر کا وہ مخصوص خودکار نظام بھی دیکھ لیا، جو خاص طور پر معذور افراد کی گاڑیوں میں نصب کیا جاتا ہے۔ خرم نے ڈگمگاتے ہوئے دوسرا قدم اٹھایا اور ڈرائیور کے سہارے پہلی سیڑھی پر پاؤں رکھا۔ اتنے میں اُوپر سے مولوی خضر کی گھبرائی ہوئی سے آواز سنائی دی۔ ''ارے میاں...... تم وہیں رُکو میں نیچے آ رہا ہوں۔'' مولوی خضر ہاتھ میں پانی کی بوتل لیے جلدی جلدی سیڑھیاں اُتر کر نیچے آ گئے اور انہوں نے وہیں کھڑے کھڑے خرم کو چند گھونٹ پانی پلا دیا، جو ان دو قدموں کے سفر ہی میں بُری طرح ہانپنے لگا تھا۔ میں ویسے ہی اپنی جگہ بت بنا کھڑا رہ گیا۔ خرم نے مسکرا کر میری جانب دیکھا ''میں نے کہا تھا نا...... میرے پاس فخر کرنے کی بس ایک ہی وجہ رہ گئی ہے لیکن یقین مانو، یہ آخری مان اور بھرم ہی اس ایک زندگی کو کنارے لگانے کے لیے کافی ہے۔'' ڈرائیور نے خرم کو پھر سے سہارا دے کر گاڑی کے اندر بیٹھا دیا۔ خرم کی والدہ اپنے آنسو چھپانے کی ناکام کوشش کرتی نظر آئیں۔ زہرا ویسے ہی سر جھکائے اپنا پیلا چہرہ چھپاتی کار کی پچھلی نشست پر جا کر بیٹھ گئی۔ مولوی خضر نے خرم کے سر پر ہاتھ پھیرا اور میری جانب دیکھ کر دھیرے سے کھانسے، میں جیسے کسی خواب کے اثر سے نکل کر ہوش کی دنیا میں پہنچ گیا۔ لیکن تب تک خرم کا ڈرائیور گاڑی کے انجن کو بیدار کر چکا تھا۔ میرا ہاتھ ہوا میں اُٹھا رہ گیا اور خرم کی گاڑی آگے بڑھ گئی۔ میں گاڑی کے پچھلے پہیوں کی رگڑ سے فضا میں اُڑتی ریت کے ساتھ دُھول ہوتا چلا گیا۔ میں جانتا تھا کہ مولوی خضر نے مجھے خرم کو الوداع کہنے کے لیے کھنکار کر ہوش میں لانے کی کوشش کی تھی کہ تہذیب اور آداب کا یہی تقاضا تھا لیکن خرم کی معذوری دیکھنے کے بعد میں اپنے حواس میں تھا ہی کب......؟ کاش دنیا کے سبھی دیوانوں کے ماتھے پر قدرت ہوش چھینتے ہی کوئی واضح مہر ثبت کر دیتی تو کتنا اچھا ہوتا۔ اُن کی جبیں پر پڑے داغ کو دیکھ کر ہی دوسرا اُن سے کسی ادب آداب یا تہذیب کی کوئی اُمید

رکھتا۔ نہ جانے میں کس طرح لرزتے قدموں کو سنبھالتا واپس درگاہ کے صحن تک پہنچا۔

آج سمندر کی لہروں کی بھی آپس میں کوئی جنگ چل رہی تھی شاید...... اِسی لیے ان کے چنگھاڑنے لڑنے کی آوازیں درگاہ کے اندر بھی سنائی دے رہی تھیں۔ لیکن اس شور سے کئی گنا زیادہ شور اس وقت خود میرے وجود کے سمندر میں اُٹھ رہا تھا۔ سماعتیں معطل کر دینے والا شور۔ شاید بہت شدید اور حدوں کو پار کر جانے والا شور بھی خاموشی ہی کی ایک قسم بن جاتا ہے۔ ایسی ہی کسی لرزتی خاموشی کی ساعت میں میں نے اپنے کانپتے ہاتھوں سے زہرا کا دیا ہوا کاغذ کھولا۔ میں زہرا کی تحریر کو خط کہہ کر اس کی توہین نہیں کرنا چاہتا تھا۔ ضروری تو نہیں کہ ہر نامہ ''خط'' ہی ہو، یا ہر ''خط'' کسی کی تحریر ہی سے جڑا ہوا؟ کچھ تعلق خط سے بڑھ کر بھی تو ہوتے ہیں اور کچھ ''خط'' لفظوں کے محتاج نہیں ہوتے۔ آنسوؤں سے بھیگی میری دھندلی نگاہ ان سیاہ موتیوں پر پھسلنے سے پہلے تعظیم کے تمام تقاضے پورے کرنا نہیں بھولی۔ وہی دل میں اُتر جانے والی تحریر اور وہی انداز تکلم۔ کون کہتا ہے کہ ثبات صرف اک تغیر کو ہے......؟ اور بھی کچھ ایسا ہے کہ جس کی دل کشی سدا قائم رہنے والی ہے۔ میں نے بمشکل اپنی نظر کاغذ پر جمائی۔ ''میں جانتی ہوں کہ اب میرا کوئی بھی لفظ آپ کے زخموں کا مرہم نہ ہو سکے گا۔ شاید کچھ لوگ پیدا ہی سدا زخم دینے کے لیے ہوتے ہیں۔ میری آرزو تھی کہ میں آپ کی راہ میں پھول بچھاؤں، لیکن اپنے مقدر کے کانٹے بھی آپ کے راستے میں پرو دوں گی، ایسا بھلا کب سوچا تھا......؟ آپ کی ہر بدگمانی جائز ہے اور اگر میرا اور آپ کا دوبارہ سامنا نہ ہوتا تو شاید میں انہی بدگمانیوں کے تپتے سائے تلے اپنی باقی تمام زندگی گزار دیتی، کیوں کہ کبھی کبھی یہ بدگمانی ہی کسی کے جینے کا سہارا بن جاتی ہے۔ آپ کا مجھ سے بدگمان رہنا ہی خود آپ کے لیے بہتر تھا، لیکن میری بے بسی کی انتہا دیکھیے کہ میں اپنے حق میں کسی کی عمر بھر کی بدگمانی کی حق دار بھی نہیں رہی۔'' میری نظریں تیزی سے خط کے منظر نامے کو اپنے ذہن کے پردے پر منتقل کرنے لگیں۔

زہرا کی کہانی ٹھیک اُسی دن سے شروع ہوتی تھی، جس دن میری داستان کا اختتام لکھا تھا۔ اُس دن ''کاسابلانکا'' کو زہرا کے شہر اُسی ساحل پر لنگر انداز ہونا تھا، جہاں اُس کی ساحر سے پہلی ملاقات ہوئی تھی۔ زہرا کو ساحر کا پیغام مل چکا تھا کہ وہ زہرا کو بندرگاہ کے ساحل پر پہلا قدم دھرتے ہی اپنے سامنے دیکھنا چاہتا ہے کہ یہی تو وہ ساحل تھا جہاں ساحر کے دل نے آخری بار لنگر انداز ہو کر زہرا کے قدموں میں ڈیرہ ڈال دیا تھا۔ ساحر کو سفر پر نکلے آج چھ مہینے پورے ہو رہے تھے اور یہ بات صرف زہرا کا دل ہی جانتا تھا کہ اُس نے یہ چھ ماہ کس طرح پل پل کر کے کاٹے تھے۔ لیکن آج کا دن کاٹے نہیں کٹ رہا تھا۔ جہاز سہ پہر کو لنگر انداز ہونے والا تھا مگر کبھی کبھی یہ دن اتنا طویل کیوں ہو جاتا ہے کہ اس کا پہلا پہر ہی سال ہا سال کی طرح ڈھلتا ہے۔ زہرا بھی بمشکل دوسرے پہر تک انتظار کی سولی پر خود کو ٹانگ سکی اور پھر دوپہر کو آنے والے ڈرائیور کا انتظار کیے بغیر ہی اس نے گاڑی نکالی اور بندرگاہ جانے والی سڑک پر ڈال دی۔ وہ اپنی دُھن میں اتنی سرشار تھی کہ اُسے اس بات کی خبر بھی نہ ہوئی کہ روزانہ کی طرح ایک سپورٹس بائیک پر بیٹھا ہیلمٹ پوش اُس کی گاڑی

کے پیچھے چل پڑا ہے۔ سیاہ رنگ کا ہیلمٹ پہنے یہ نوجوان گزشتہ چند روز سے زہرا کے گھر کے آس پاس ہی منڈلاتا رہتا تھا اور جیسے ہی زہرا ڈرائیور وغیرہ کے ساتھ کسی بھی مقصد سے گھر سے باہر نکلتی تو وہ اُس وقت تک زہرا کی گاڑی کا طواف جاری رکھتا، جب تک وہ واپس گھر نہیں پہنچ جاتی۔ زہرا سے پہلے زہرا کے ڈرائیور نے یہ بات محسوس کرلی تھی اور اُس نے ایک آدھ بار رُک کر موٹر سائیکل سوار سے یہ پوچھنے کی کوشش بھی کی کہ وہ کیوں گاڑی کا پیچھا کر رہا ہے۔ لیکن ڈرائیور کے گاڑی سے اُترتے ہی وہ ہیوی بائیک ایک زور دار ایکسلیٹر کے ساتھ فراٹے بھرتی ہوئی آگے بڑھ جاتی تھی۔ ڈرائیور نے زہرا کی توجہ بھی اس جانب مبذول کروائی، اُلجھن تو زہرا کو بھی ہوئی مگر اُس نے ڈرائیور کو یہ بات گھر میں کسی کو بھی بتانے سے منع کر دیا کیوں کہ وہ نہیں چاہتی تھی کہ اُس کے والدین بلاوجہ پریشان ہوں۔ ہاں البتہ زہرا نے خود گھر سے نکلنا کم کر دیا اور اگر کسی اشد ضرورت سے گھر سے باہر جانا بھی پڑتا، تو وہ دن کے اُجالے ہی میں کام نمٹا کر جلد از جلد واپس گھر پہنچنے کی کرتی، لیکن اُس روز ساحر کے آنے کی خوشی میں وہ تمام احتیاطیں بھلا بیٹھی اور اُسے ہوش تب آیا، جب اُس نے ایک قدرے ویران سڑک پر اُسی نیلے رنگ کی ہیوی سپورٹس بائیک کو اپنی گاڑی کے تعاقب میں آتے دیکھا۔ زہرا کے ہاتھ پاؤں پھولنے لگے کیوں کہ وہ نہایت معمولی سی رفتار کے ساتھ گاڑی چلانے کی عادی تھی اور اُسے تیز رفتاری کا بالکل بھی تجربہ نہیں تھا، جب کہ اس وقت وہ بائیک سوار اُس کی گاڑی کے پچھلے بمپر سے بالکل چھوتے ہوئے اپنی بائیک کی رفتار بڑھاتا چلا آ رہا تھا۔ زہرا نے بھی بوکھلا کر گاڑی کی رفتار بڑھا دی۔ مگر فاصلہ بڑھنے کے بجائے مزید کم ہوتا چلا گیا۔ زہرا کا پاؤں ایکسلیٹر پر دبتا چلا گیا اور مرسڈیز کا بھرپور طاقت ور انجن اپنے وحشی زور کے بل پر بے قابو ہونے لگا اور پھر جب ایک مصروف سڑک پر موڑ کاٹتے ہی اچانک اشارہ سرخ ہو گیا تو زہرا سے گاڑی سنبھالنا مشکل تر ہو گیا۔ عجلت میں لگائی گئی بریک نے مرسڈیز کے چاروں پہیے تو تارکول کی سڑک پر پیوست کر دیئے لیکن گاڑی کی بقیہ باڈی اس اچانک جھٹکے کی وجہ سے بُری طرح جھول کر گھومی اور پیچھے سے آتی ہیوی بائیک زور دار آواز کے ساتھ گھومتی ہوئی گاڑی کے دروازے والی طرف سے ٹکرائی۔ موٹر سائیکل سوار اس طرح ہوا میں اُچھلا جیسے کسی توپ سے نکلا کوئی گولا اور فضا میں قلابازیاں کھاتا، گاڑی کے اُوپر سے ہوتا ہوا، دوسری جانب سڑک پر دھم سے گر کر بے سدھ ہو گیا۔ لیکن آنکھیں بند ہونے سے پہلے اُس نے بائیں جانب سے ایک کار کو تیزی سے اپنی جانب بڑھتے دیکھ لیا تھا۔ سوار نے کسمسا کر اپنا وجود بچانے کی ایک آخری کوشش کے طور پر کروٹ بدلنے کی کوشش کی لیکن کار رُکتے رُکتے بھی اس کی گھائل ٹانگوں کو روند گئی۔ فضا میں خون کے چند چھینٹے اُڑے اور زہرا جس کا سر جھٹکے کی وجہ سے زور دار طریقے سے اسٹیئرنگ سے ٹکرا چکا تھا یہ سب دیکھ کر وہیں بیٹھے بیٹھے ڈھے گئی اور جب اُسے ہوش آیا تو رات آدھی سے زیادہ بیت چکی تھی اور وہ شہر کے معروف ہسپتال کے آئی سی یو میں اپنے پریشان والدین اور ڈاکٹروں کے ہجوم میں گھری ہوئی تھی۔ اُس کے ذہن میں پہلا خیال یہی آیا کہ ساحر کا جہاز بندرگاہ پر لنگر انداز ہوا ہوگا اور جب ساحر نے

کو وہاں اپنے استقبال کے لیے نہیں پایا ہوگا، تو وہ کتنا پریشان ہوا ہوگا۔ ضرور ساحر نے زہرا کے گھر پر بھی
طے کی کوشش کی ہوگی، لیکن گھر پر نوکروں کے سوا اور کون تھا، جو اُسے کوئی تسلی بخش جواب ہی دے پاتا۔ زہرا
ڈاکٹروں سے پہلا سوال اُس سپورٹس بائیک والے گھائل کے بارے میں پوچھا لیکن جواب میں اُسے
کا انجیکشن ملا اور زہرا اپنے سر میں اُٹھتی ٹیسوں سمیت پھر سے غافل ہو گئی۔ شاید یہ ٹھیک وہی لمحہ تھا، جب
ری جانب ساحر اپنے حواس کھو رہا تھا اور پھر جب تک دو دن بعد زہرا کے ہوش سنبھلے، تب تک ساحر اپنے
ں کے آخری دورے سے گزر کر لندن کے لیے پرواز کر چکا تھا۔ لیکن زہرا کے المیے کا آخرا بھی لکھا جانا باقی
۔ ایک نئی قیامت اسی ہسپتال کے ایک کمرے میں اُس کا انتظار کر رہی تھی، جہاں اُس کی گاڑی سے ٹکرا کر
نے والا موٹر سائیکل سوار موت و زندگی کے اس دوراہے پر کھڑا تھا، جہاں سے کچھ کم خوش نصیب ہی واپس
تے ہیں اور یہ دیکھ کر تو زہرا کی رُوح ہی اُس کے بدن سے نکل گئی کہ اس نوجوان کی دونوں ٹانگیں گھٹنوں سے
پے غائب تھیں۔ کار نے اس بُری طرح سے انہیں کچل ڈالا تھا کہ ڈاکٹروں کے پاس اور کوئی چارہ ہی نہیں تھا۔
ا سا مزید انتظار سارے جسم میں زہر پھیلنے کے باعث بن سکتا تھا۔ نوجوان کا نام خرم شہزاد تھا اور اُس کے
ہال سے والدین بھی وہیں موجود تھے۔ زہرا تو ٹھیک طرح سے انہیں آداب بھی نہیں کہہ پائی۔ پولیس کی
ندائی تفتیش کے مطابق بظاہر یہ ایک خطرناک ایکسیڈنٹ کا کیس تھا، جس میں سراسر غلطی زہرا کی تیز رفتاری
ہرا چانک بریک تھی لیکن خرم کے والد نے پولیس کو ایف آئی آر درج کرنے سے روک دیا تھا۔ وہ خود بھی شہر
ے بڑے متمول تھے اور براہِ راست زہرا کے والد حاجی مقبول کو نہ جاننے کے باوجود، وہ اُن کے بڑے خاندان
رُتبے سے واقف تھے۔ خرم نے بھی پہلی مرتبہ ہوش میں آتے ہی پولیس کو یہی بیان دیا تھا کہ غلطی زہرا کی
ہیں تھی، وہ خود ہی نہایت تیز رفتار کا عادی تھا۔ زہرا کے والدین کو بھی اچھی طرح اس بات کا اندازہ تھا کہ اگر
رم کا خاندان جذبات میں آ کر زہرا کے خلاف کوئی شکایت درج کرا دیتا تو انہیں اپنی بیٹی کی بے گناہی ثابت
کرنے کے لیے کتنی بھاری قیمت ادا کرنی پڑتی اور معاشرہ کس کس انداز میں انہیں اپنے تیروں کا نشانہ بناتا،
لیکن یہ اُن کی بھی خوش قسمتی تھی کہ اُن کا پالا ظرف والوں سے پڑا تھا۔ ہاں مگر گلے کے ظرف کا بوجھ اُٹھانا بھی
صرف ظرف والوں ہی کا خاصہ ہے۔ جبھی تو زہرا کے والدین بھی گزشتہ تین روز سے خرم کے پرائیویٹ وارڈ
کے دروازے سے لگے کھڑے تھے مگر جن کا جوان بیٹا عمر بھر کے لیے معذور ہو چکا ہو اُن کا دُکھ کوئی کیا
اپے......؟ خود خرم کی اپنی دنیا ہمیشہ کے لیے لٹ چکی تھی، وہ تیز رفتار کا دل دادہ اور زندگی سے بھی ایک قدم
آگے چلنے کا عادی تھا، مگر وقت نے ایسا وار کیا کہ وہ اپنے قدم ہی کھو بیٹھا۔ مگر آفرین ہے اُس کی زندہ دلی اور
مت پر کہ اُس نے اپنے والدین کی اکلوتی اولاد ہونے کا خوب حق ادا کیا اور اپنے ہونٹوں کی ازلی مسکراہٹ کو
لوں سے جُدا نہیں ہونے دیا، کیوں کہ وہ جانتا تھا کہ اگر وہ ٹوٹ گیا تو پھر اُس کے ماں باپ کی کرچیاں بھی
کوئی نہیں سنبھال پائے گا۔ لیکن ابھی کسی اور کے من آئینے میں دراڑ آنا باقی تھا۔ قدرت جب زندگیاں بدلنے

کا فیصلہ کر لیتی ہے تو پھر ہر دعا بددعا میں تبدیل ہونے لگتی ہے۔ خرم نے پہلی تنہائی پاتے ہی زہرا کو بتا دیا کہ وہ
پچھلے کئی ہفتوں سے صرف زہرا کی ایک جھلک دیکھنے کے لیے پہروں اُس کی کوٹھی کے چکر کاٹتا رہا ہے۔ خرم
نے زہرا کو پہلی مرتبہ کتابوں کی ایک بڑی نمائش میں غالب اور میر میں گھرے دیکھا اور بس دیکھتا ہی رہ گیا۔
زہرا کا نقاب سے جھلکتا خیرہ کن حسن اُس کے دل پر بجلی کی چمک کی طرح کوندا اور پل بھر میں ہی سب بھسم کر
گیا۔ لیکن کون جانتا تھا کہ خرم کی اُس پہلی نظر کا انجام اُس کی ازلی معذوری کی صورت نکلے گا۔ خرم کی حالت
حادثے کے دن سے لے کر اب تک بنتی بگڑتی رہی تھی۔ خون کے حد سے زیادہ اخراج اور پھر ایک طویل
آپریشن نے اُس کی رگوں سے جان کھینچنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی۔ لیکن زہرا کو دیکھتے ہی اُس کے اندر پھر
سے جینے کی خواہش جاگ اُٹھتی تھی اور پھر ایسے ہی ایک لمحے میں جب نبضیں ڈوبنے لگتی ہیں خرم نے زہرا سے
اُس کا سدا کا ساتھ مانگ لیا۔ فیصلہ کرنے کی آزادی بہرحال زہرا کو میسر تھی اور خرم نے ''نہ'' کا حق بھی اُسے
تفویض کر دیا تھا، لیکن کبھی کبھی یہ حق اور یہ ''اختیار'' خود انسان کے لیے سب سے بڑی زنجیر بن جاتا ہے۔ زہرا
ابھی خرم کو یہ بتا بھی نہیں پائی تھی کہ اُس کی رُوح پہلے ہی ساحر کی راہ میں پلکیں بچھائے منتظر ہے کیوں کہ خرم کی
بنتی بگڑتی حالت کو قرار نہ تھا۔ زہرا نے خود کو گھر میں بند کر لیا۔ خرم کی معذوری ہی زہرا کی سب سے بڑی مجبوری
بنتی چلی گئی، کیوں کہ وہ اب بھی کہیں نہ کہیں اُس کی اس حالت کا ذمہ دار خود ہی کو سمجھتی تھی حالانکہ کہ خرم نے خود
اپنے والدین سے بارہا یہ بات کہی تھی کہ اپنی اس معذوری کے بعد وہ خود کو کسی طور بھی زہرا کے قابل نہیں سمجھتا
اور زہرا کے انکار کا اُسے صدمہ ضرور ہو گا پر اچنبھا نہیں۔ کیوں کہ دنیا کی کوئی بھی لڑکی عمر بھر کے لیے کسی معذور
کی بیساکھیاں بننا پسند نہیں کرے گی۔ زہرا تک خرم کے یہ خیالات بھی خرم کی ماں کے وسیلے ہی سے پہنچے اور
زہرا یہ چاہتی تھی کہ وہ خرم کو اُنہی کے ذریعے یہ پیغام پہنچائے کہ اُس کی ''نہ'' کی وجہ خرم کی معذوری نہیں کوئی
''اور'' ہے۔ لیکن کچھ پیغام ہمیشہ ہونٹوں میں دبے اور کچھ باتیں ہمیشہ اَن کہی رہ جاتی ہیں۔ اس سے پہلے کہ
زہرا انہیں کچھ بتا پاتی، خرم کی ماں نے اُس کی تازہ طبی رپورٹ زہرا کے سامنے رکھ دی جس میں واضح درج تھا
کہ خرم کی پوری صحت یابی اب دوا سے زیادہ اُس کی قوت ارادی پر منحصر ہے اور خرم کی ماں کو یہ پتا تھا کہ اُس کا
بیٹا اب زندگی کی طرف تبھی لوٹ پائے گا، جب اُسے دوسرے کنارے پر زہرا اپنا انتظار کرتی ملے گی، ورنہ خرم
کا بخار اب اُس کی سانس کے ساتھ ہی ٹوٹے گا۔ خرم کا پیغام آئے آج ساتواں دن تھا اور اتنے ہی دن خرم کو
مسلسل اور لگاتار حرارت ہونے کو آئے تھے۔ ابھی زہرا اسی شش و پنج میں تھی کہ ہسپتال سے خرم کی والدہ کے
لیے جلد پہنچنے کا پیغام آ گیا کیوں کہ خرم کی سانس پھر سے اُکھڑنے لگی تھی۔ وہ سب بھاگم بھاگ ہسپتال پہنچے تو
اس ابتر حالت میں بھی زہرا کو اپنے سامنے دیکھ کر خرم کے ہونٹوں پر مسکراہٹ آ گئی۔ کمرے سے نکلتے ہی خرم کی
ماں سسک پڑی اور اُس نے زہرا کے سامنے باقاعدہ ہاتھ جوڑ دیے۔ زہرا نے روتے ہوئے اُن کے جڑے
ہاتھ کھول کر اپنے مقدر کے سبھی دروازے ہمیشہ کے لیے بند کر دیے۔ زہرا کے والدین کے ہاتھ تو حادثے

والے دن ہی سے بندھے ہوئے تھے لیکن زہرا نے اپنے گھر والوں کے سامنے واحد شرط یہی رکھی کہ ماضی کے
سنہری دھاگوں سے ناتا توڑنے کے لیے شہر والی کوٹھی چھوڑ کر مضافات والی حویلی میں بسیرا ڈالا جائے۔ پرانے
گھر کے نوکروں کو بھی تاکید کر دی گئی کہ نئے ٹھکانے کی اطلاع کسی کو نہ دی جائے۔ زہرا کے سامنے دو ہی
راستے تھے کہ ساحر کو یہ سب بتا کر اُس کے جنوں کو دیوانگی کی آخری حد تک پہنچا دے یا پھر خاموشی سے سب کچھ
سہہ کر ساحر کے ٹھیک ہو کر پلٹ آنے تک خود کو کہیں چھپا لے۔ بدگمانیوں کو اس حد تک ہوا دے کہ ہلکی آنچ
بھڑکتی ہوئی آگ میں بدل جائے اور ساحر سے ہر رشتہ جل کر بھسم ہو جائے۔ زہرا نے دوسرا راستہ اختیار کیا کہ
اس میں اُسے سب کا بھلا نظر آیا۔ لیکن نصیب تدبیر سے ہمیشہ ایک قدم آگے کی چال چلتا ہے کہ زہرا کا سامنا
ایک بار پھر ساحر سے ہونا بھی تو اسی مقدر نے طے کیا تھا۔'' میں نے لرزتے ہاتھوں سے زہرا کا خط تہہ کیا۔ مجھے
خبر ہی نہیں ہوئی کہ کب آسمان نے میرے آنسو دھونے کے لیے اپنی بوندوں کی بوچھاڑ شروع کر دی۔ میں
برستی بارش میں درگاہ کے صحن میں بیٹھا بھیگتا رہا اور زہرا کی تحریر کے لفظ دُھل کر صحن میں بہتے چلے گئے۔'' کاش
میرے نصیب کی تحریر بھی اتنی ہی کچی ہوتی کہ میرے آنسوؤں سے دُھل جاتی۔ میرے ذہن میں پھر اُسی
مجذوب کی پیش گوئی گونجی ''تجھے خدا ہی ملے گا...... نہ وصالِ صنم......''

دُھندلے اُجالے، اُجلے اندھیرے

زہرا کی تحریر نے ایک ہی پل میں میرے اندر کی ساری دنیا تلپٹ کر دی۔ سیدھ میں تو پہلے بھی کچھ نہ تھا مگر اس کاغذ نے رہا سہا بھی سب اُلٹ دیا۔ کبھی کبھی انسان کی برسوں کی ریاضت بھی بس ایک لمحے کی نذر ہو جاتی ہے، دل پلٹ جاتے ہیں اور ہمیں اس وقت تک کا سب کیا دھرا محض ایک بے مقصد مشق لگنے لگتا ہے۔ شاید انسانی سوچ میں آج تک جتنے بھی انقلابات رُونما ہوئے ہیں، وہ سب اِسی ایک لمحے کی کایا پلٹ کا کرشمہ ہیں۔ پھر کون طوفان سے لڑ کر ساحل تک پہنچے اور کون بدنصیب اس لمحے کا شکار ہو کر پُرسکون ساحل سے پیچھا چھڑا کر خود کو بپھرتے طوفانوں کے حوالے کر جائے، اپنی اپنی قسمت۔ میرا دل بھی پلٹ گیا۔ ایک لمحے میں میرے اندر یہ سوال شدت سے اُبھرا کہ آخر اس بے مقصد سفر کا حاصل کیا تھا۔ کیا قدرت نے یہ سارا کھیل زہرا کو خرم سے ملانے کے لیے کھیلا؟ کیا میرا کردار اس کہانی میں بس اس قدر تھا۔ میں نے زہرا کی تحریر کا آخری صفحہ پلٹا اور تب ہی اندر سے ایک تہ شدہ رقعہ گر پڑا۔ شاید کوئی اہم بات باقی رہ گئی تھی، جسے الگ سے لکھا گیا تھا۔ میں نے اُسی بے خیالی میں رقعے کی تہ کھولی اور اندر لکھی تحریر نے میری رُوح کا آخری ریشہ بھی ادھیڑ دیا۔ یہ وہی نظم تھی، جو میں نے پاپا کے ہاتھ زہرا کو بھیجی تھی۔ میری نظر ڈبڈبانے لگی "جب تمہیں مجھ سے نفرت ہو جائے......" نظم میری اپنی، لیکن تحریر زہرا کی تھی۔ اُس نے دوبارہ وہی سطریں مجھے لکھ بھیجی تھیں۔ "سنو...... تمہاری وفا پہ مجھ کو...... یوں تو پورا یقین ہے...... مگر......" میرے اندر کا شور بڑھتا گیا...... "سو، گر تمہیں مجھ سے نفرت ہو جائے تو اُن راہوں سے نفرت نہ کرنا، جن پر کبھی ہم ساتھ مل کر چلے تھے......" تیز ہوا کا ایک جھونکا میری آنکھ سے بہتے آنسو کا رستہ بدل گیا......؟ "ان باتوں سے نفرت نہ کرنا جو کبھی ہم نے تنہائی میں کی تھیں...... اُن خوابوں سے نفرت مت کرنا...... جو کبھی ہم نے ساتھ مل کر دیکھے تھے......" مجھے ایک دم ہی وہ سب ہی تیر یاد آ گئے، جو میں نے یکے بعد دیگرے زہرا کے کومل وجود میں پیوست کر دیئے تھے "بس مجھ سے...... اور صرف مجھ سے نفرت کرنا...... کہ صرف میں...... اور بس میں ہی...... تمہاری اس نفرت کے قابل ہوں......" "نفرت......" چار حرفی یہ چھوٹا سا لفظ اپنے اندر کتنی کاٹ، کتنے گھاؤ، کتنی جلن اور کتنی چبھن چھپائے رکھتا ہے، اس کا ادراک مجھے ٹھیک اُسی لمحے ہوا تھا۔ لیکن نفرت، زہرا سے نفرت...... یہ اُس نے کیسے سوچ لیا......؟ وہ تو میرے خون میں رنگ بن کر بہتی تھی، تو کیا کوئی خود سے بھی نفرت کر سکتا ہے۔ جن کے اپنے سپنے سچ نہیں ہوتے، وہ دوسروں کے خوابوں کو تعبیر دینے کا فریضہ انجام نہ دیں تو پھر بھلا اور کیا کریں۔ زہرا بھی تو یہی کر رہی تھی لیکن میرے

خواب، اُن کی تعبیر کیا ہوئی۔ سچ ہے کہ تعبیریں بھی ہر کسی کا مقدر نہیں ہوتیں۔ ساری رات میں برستی بارش میں زہرا کی تحریر اپنے ہاتھ میں لیے گم صم بیٹھا رہا۔ تیز بارشیں کاغذ کی تحریر تو دھو ڈالتی ہیں، مگر مقدر کے لکھے بھلا بہتے پانیوں سے کب دُھلے ہیں۔ اگلی صبح کی پہلی اُجلی کرن کے ساتھ ہی بختیار اپنے چہرے پر زمانے بھر کے اندھیرے سجائے درگاہ کے احاطے میں داخل ہوا۔ اُس کا انداز ہیجانی تھا "میں نے آپ سے کہا تھا نا کہ آپ کسی جھمیلے میں پڑے بنا ہی میرے لیے دُعا کر ڈالیں۔ آپ نے دیر کر دی اور جانتے ہیں اب کسی نے سائرہ کی آنکھوں میں بصارت پانے کا خواب بھر دیا ہے۔" میں نے چونک کر بختیار کی جانب دیکھا، لیکن میں اُسے یہ کہہ نہیں پایا کہ کون جانے کہ یہ "دیر" بھی قدرت نے کسی اور کے لیے طے کر رکھی ہو۔ اور بختیار صرف ایک مہرہ ہو۔ سائرہ کی کہانی کو انجام کے قریب لانے کا ایک بہانہ ہو۔ بختیار اپنی دُھن میں بولتا رہا۔ اُس نے مجھے بتایا کہ کوئی اور نوجوان مجسمہ ساز ہے، جو آج کل بڑی تن دہی سے سائرہ کی بے بینا آنکھوں کے لیے کسی جڑواں تپلی کی تلاش میں سرگرداں ہے اور اُس کا آج کل زیادہ تر وقت سائرہ کی آرٹ گیلری ہی میں گزرتا ہے۔ وہ جوان ہے۔ خوبصورت اور متاثر کن شخصیت کا مالک ہے۔ اور دن بدن سائرہ کے بہت قریب ہوتا جا رہا ہے۔ بختیار کی پریشانی اُس کے چہرے سے واضح تھی۔ وہ جانتا تھا کہ آج یا کل سائرہ کو اُس کی بصارت واپس مل ہی جائے گی اور تب وہ اپنے حصے کی اُس نظر کو کھو دے گا، جو عمر بھر کی کھوج کے بعد اُس کا مقدر بنی ہے۔ میری اپنی حالت، رات بھر بارش میں بھیگتے رہنے کے بعد اس وقت تک اتنی دگرگوں ہو چکی تھی کہ مجبوراً مجھے بختیار سے معذرت کرنی پڑی کہ ہم اس ملاقات کو کسی اور وقت پر ٹال رکھیں تو اُس کی بڑی مہربانی ہوگی۔ وہ خود بھی میری آنکھوں کی سرخی دیکھ کر پریشان ہو گیا اور اگلے دن آنے کا وعدہ کر کے واپس پلٹ گیا۔

شام تک میرا جی اس بُری طرح گھبرانے لگا کہ میرے لیے درگاہ میں ٹکے رہنا ناممکن ہو گیا اور پھر جب میرے حواس کچھ بحال ہوئے تو میں نے خود کو ساحل کی نم ریت پر چلتے پایا۔ مجھ سے کچھ فاصلے پر چند بچے بیٹھے ریت کے گھروندے بنانے کا کھیل کھیل رہے تھے، اس بات سے بے خبر کہ جہاں وہ بیٹھے ہیں وہاں کچھ ہی دیر میں سمندر کی لہریں آگے بڑھ کر اُن کے گھروندوں کو اپنے ساتھ بہا لے جائیں گی۔ پھر مجھے ایک عجیب سا خیال آیا کہ بنانے والے کو بنانے سے کام اور اُجاڑنے والے کو اپنے فرض سے سروکار ہوتا ہے۔ جو بنتا ہے اُسے اُجڑ ہی جانا ہوتا ہے، وقت کی کمی یا زیادتی تو بس اضافی ہے۔ اچانک دائیں جانب سے کچھ آوازے کسے جانے اور پھر کسی کی غصے سے بھری ڈانٹ ڈپٹ اور دھتکار کی آوازیں سنائی دیں۔ دُور ایک ٹیلے کے پاس کچھ بچے کسی عمر رسیدہ شخص کو شاید اُس کے عجیب و غریب حلیے کی وجہ سے تنگ کر رہے تھے۔ اور وہ بوڑھا انہی کی طرف دیکھتے ہوئے بکتا جھکتا چلا آ رہا تھا۔ اُس کا چہرہ اُسی شرارتی ہجوم کی طرف تھا لہٰذا چلتے ہوئے اُسے ایک زوردار ٹھوکر لگی اور وہ گر پڑا۔ عقب سے زوردار قہقہے بلند ہوئے اور میں تیزی سے اُس فقیر کو اُٹھانے کے لیے آگے بڑھا۔ میں نے ہاتھ آگے بڑھایا لیکن ایک گرج دار آواز آئی "ہٹ جا میرے سامنے سے...... جو خ

گرے ہوں، وہ دوسروں کو سہارا بھلا کیا دیں گے......؟'' بوڑھے کا چہرہ گرنے کی وجہ سے ریت اور مٹی سے لت پت تھا۔ اُس نے زور سے اپنی درازلٹوں کو جھاڑا اور مجھے یوں لگا کہ زمانے بھر کی گرد سے میرا وجود اَٹ گیا ہے۔ یہ تو وہی مجذوب تھا، جو مجھے تھانہ ماہی کی حوالات میں ملا تھا، لیکن میں اُسے یہاں اپنے شہر کے ساحل پر یوں پالوں گا، یہ تو میرے گمان کی آخری حدوں سے بھی پرے کی سوچ تھی۔ میری لڑکھڑاتی زبان سے بس اتنا ہی نکل سکا'' آپ...... یہاں...... کیسے......؟'' مجذوب نے بے نیازی سے قدم آگے بڑھائے'' فقیروں کے لیے زمین کبھی تنگ نہیں پڑتی۔ تیرے لیے اگر شاندار بحری جہاز بھیجا گیا تھا، تو کوئی ٹوٹی کشتی میرے لیے بھی تو آسکتی ہے۔'' میں نے جلدی سے اُس کے قدموں سے قدم ملانے کی کوشش کی۔'' آپ ہمیشہ آدھی بات کہہ کر کہاں غائب ہو جاتے ہیں۔ آج میں آپ کو کہیں نہیں جانے دوں گا، چاہے کچھ بھی ہو جائے......'' میں نے قدم بڑھا کر مجذوب کا راستہ روک لیا۔ ایک لمحے کو مجھے یوں لگا کہ شدید غصے کے عالم میں وہ زمین سے کوئی پتھر اُٹھا کر مجھے دے مارے گا۔ وہ جونہی غصے سے زمین پر جھکا، میں نے کسی متوقع گھاؤ کی اُمید میں آنکھیں سختی سے میچ لیں۔ لیکن وہ ہنس پڑا'' تو کیا سمجھتا ہے تیری یہ ضد تجھے پار لگا دے گی۔ کبھی نہیں۔ ضد چھوڑ کر عاجز بن جا۔ عشق میں ضد نہیں چلتی۔'' '' میرے پاس ضد کرنے کے لیے بچا ہی کیا ہے......؟'' میرے جواب پر مجذوب پھر سے غصے میں آگیا۔'' بس، یہی تو تیری ضد ہے۔ جو تیرا ہے ہی نہیں، اُسے اپنا سمجھنے کی زبردستی نہ کر۔ کب سے خاک چھان رہا ہے، ان درگاہوں اور ویرانوں کی۔ تجھے سمجھاتے سمجھاتے وہ اللہ کا بندہ بھی رُخصت ہوا، پر تیری عقل میں یہ بات نہ آئی۔'' مجھے ایک جھٹکا سا لگا، وہ ضرور سلطان بابا کی بات کر رہا تھا۔ میں اپنی آواز کو اُونچا ہونے سے نہیں روک پایا۔'' ہاں، انہوں نے بھی مجھے تنہا چھوڑ دیا۔ اگر میری ناؤ کھینا ہی تھی تو یوں بیچ بھنور میں تنہا تو نہ چھوڑتے۔ اب میں کہاں جاؤں......؟'' مجذوب نے مجھے ڈانٹا۔'' لڑکے! جو جتنی سانسیں لکھوا کر لاتا ہے، وہ اُتنا ہی جیتا ہے۔ مجھے، تجھے، ہم سب کو واپس جانا ہے۔ اُس کا وقت پورا ہو گیا تھا، وہ چلا گیا۔ یاد رکھ، یہاں سب فانی ہے۔'' میرے اندر کا شور پھر سے باہر کو اُمڈ آیا۔'' ٹھیک ہے، تو پھر آپ میری فنا کی دُعا تو کر سکتے ہیں۔ جب راستے ہی اتنے دُھندلے ہو گئے، تو پھر منزل کی توقع بھی کیوں رکھوں؟'' مجذوب نے غور سے میری آنکھوں میں جھانکا...... '' فنا تو تو کب کا ہو چکا۔ چل، اب میرا رستہ کھوٹا نہ کر۔ ابھی بہت کام ادھورے پڑے ہیں۔'' میرا جی چاہا کہ میں چیخ چیخ کے روؤں۔ اتنا بے بس ولاچار، میں نے خود کو آج تک کبھی محسوس نہیں کیا تھا۔ میں مجذوب کے راستے سے ہٹ گیا، لیکن شدید ضبط کے باوجود میری آنکھ سے ایک آنسو ٹپک کر زمین کو بنجر کر گیا۔ مجذوب قدم اُٹھا چکا تھا، لیکن میری بھیگی آنکھیں دیکھ کر یک دم نہ جانے اُسے کیا ہوا اور وہ تیزی سے پلٹا'' روتا کیوں ہے پگلے، پہلے ہی تیرے آنسوؤں نے چاروں طرف آگ لگا رکھی ہے۔ اب اور کس کس کو جلائے گا......؟'' پتا نہیں اس کے لہجے میں ایسی کیا بات تھی کہ پھر میں اپنی رُوح سے چھلکتے اس نمکین سمندر پر مزید کوئی بند نہ باندھ سکا اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا اور کچھ دیر پہلے پتھر بنا وہ مجذوب اب

ے یوں چپ کرا رہا تھا جیسے کوئی کسی چھوٹے بچے کو بہلانے کی کوشش کرتا ہے۔ آس پاس سے گزرتے لوگ
رت سے یہ تماشا دیکھ رہے تھے کہ ایک پروانہ کسی دیوانے کے آنسو پونچھ رہا ہے۔ شاید لوگوں کو یہ پہچاننے
ں دشواری ہو رہی ہوگی کہ ہم دونوں میں سے قیس کون ہے اور فرہاد کون......؟'' میں نے کہا تھا نا، تو بہت
ںدی ہے۔ اچھا ٹھیک ہے۔ جانے سے پہلے تجھ سے ایک ملاقات ضرور ہوگی۔ اب واپس چلا جا۔ وہ بزرگ
نا تیری راہ تکتا ہوگا اور ایک بات یاد رکھنا۔ تو جس خدا کو ان درگاہوں اور ویرانوں میں ڈھونڈتا پھرتا ہے، وہ
برے اندر موجود ہے۔ تیری شہ رگ سے بھی زیادہ قریب۔ ان پتھر کی بے جان عمارتوں سے نکل اور خود کو
ریافت کر...... تیری اسی دریافت کے لیے سلطان نے تجھے یہاں سے نکالا اور اپنے ساتھ لیے در بدر کی
ٹھوکریں کھائیں۔ پر تو آخر کار پھر وہیں آٹھہرا، جہاں سے چلا تھا......'' میں ہکا بکا اپنی جگہ کھڑا رہ گیا اور مجذوب
پنی ہی دُھن میں نہ جانے کیا بڑبڑاتے ہوئے آگے بڑھ گیا۔

ذہن میں نہ جانے کتنے سوالات کی قطار لیے جب میں درگاہ پہنچا'' تو مولوی خضر پریشان سے، میری
تلاش میں نکلنے ہی کو تھے۔'' کہاں رہ گئے تھے میاں! شام ڈھلے لوٹے ہو''۔ '' کون جانے، واپس لوٹا بھی ہوں
یا پھر خود بھی اس شام کے ساتھ کہیں ڈھل آیا ہوں۔'' مولوی خضر چونکے'' کوئی خاص بات......؟'' میں نے
انہیں مجذوب سے ملاقات کا تمام احوال سنا دیا اور یہ بھی بتایا کہ یہ میری پہلی ملاقات نہیں تھی۔ مولوی خضر بہت
دیر تک کسی گہری سوچ میں ڈوبے رہے۔ مجبوراً مجھے ہی یہ سکوت توڑنا پڑا۔'' بتائیں نا، ان درگاہوں کا اسرار کیا
ہے؟ ہمارا ٹھکانہ زیادہ تر یہیں کیوں طے ہے......؟ اور رہبانیت کی حدیں کہاں سے شروع ہوتی ہے۔ ہم ان
ویرانوں میں رہ کر خدا سے دُور ہو رہے ہیں یا اُسے پا رہے ہوتے ہیں......؟'' مولوی خضر کچھ دیر تک میرے
چہرے پر جیسے کچھ ٹٹولتے رہے۔

'' رہبانیت کی حد وہاں سے شروع ہوتی ہے، جب تنہائی کی مکڑی دل کی دیواروں پر خود پسندی کے جال
بُننا شروع کر دیتی ہے۔ انسان حقوق العباد سے بیگانہ ہوتا چلا جاتا ہے۔ خدا کو پانے کی چاہ میں، اُس کے
بندوں کو کھونا شروع کر دیتا ہے۔ سارا فیض خود اکٹھا کر لینا چاہتا ہے، جب کہ اللہ کی مخلوق کو بے فیض رکھتا ہے۔
ایک ایسا پھل دار درخت بن جاتا ہے، جس کے ثمر سے عام شخص بے بہرہ رہتا ہے۔ مگر اس کے برعکس تمہاری
ساری تربیت حقوق العباد کی ادائیگی کی اوّلیت کو سامنے رکھ کر کی گئی ہے۔ وہ مجذوب نہیں تھا۔ وہ اللہ کے انتہائی
قریبی بندوں میں سے کوئی ایک ہوگا، جو اتنی بڑی بات کہہ گیا۔ ہاں یہ سچ ہے کہ یہ درگاہیں اگر مستند ہوں تو بس
اللہ کے نیک بندوں کی آرام گاہیں ہوتی ہیں۔ کسی کی تقدیر بدلنے کا اعجاز بھلا کسی مقبرے کو کہاں......؟ تقدیر
صرف دُعا سے بدل سکتی ہے اور کون جانے کہ ان درگاہوں پر مانگی گئی وہ دُعائیں جو قبولیت کا شرف پا گئیں وہ
اُس کامل یقین کا انعام ہوں، جو دُعا مانگتے وقت سائل کے دل میں ٹھاٹھیں مار رہا ہوتا ہے۔ یہ بھی سچ ہے کہ خدا
ویرانوں میں رہ کر دل کے زیادہ قریب ہوتا ہے، نہ ہجوم میں دل سے دُور...... وہ ہر حال میں ہماری دھڑکن کی

طرح ہمارے اندر موجود رہتا ہے......'' میرے اندر مچلتے سوال باہر آنے لگے...... ''تو پھر میں اُسے اپنی شہ رگ سے زیادہ قریب کیوں نہیں محسوس کرتا۔ مجھے اُسے محسوس کرنے کے لیے یوں در بدر کی خاک کیوں چھاننا پڑ رہی ہے......؟ کیا یہ میرے اندر کے ایمان کی کمزوری ہے۔'' ''نہیں میاں! یہ درجہ بندی تو بس وہی جانتا ہے۔ سب ہی کے لیے کوئی نہ کوئی رستہ مقرر ہے۔ تمہارا راستہ زہرا کے گھر کی پگ ڈنڈی سے ہو کر گزرا ہے تو یہ بھی اُسی کی مرضی ہے۔ بس، اتنا جان لو کہ اگر عشق مجازی کی ناکامی رہبانیت کی پہلی سیڑھی بن سکتی ہے تو قدرت چاہے تو یہ ناکامی کسی کی کایا بھی پلٹ سکتی ہے۔'' مولوی خضر جاتے جاتے رُک گئے اور پلٹ کر بولے۔ ''تمہارے آخری سوال کا جواب مجھ پر اُدھار رہا۔ ہم اپنی درگاہوں اور ویرانوں میں ٹھکانہ کیوں کرتے ہیں، وقت آنے پر حقیقت بھی تم پر کھل جائے گی...... اور آج مجھے وہ وقت بہت قریب دکھائی دے رہا ہے۔'' وہ میرے سر پر ہاتھ پھیر کر آگے بڑھ گئے اور میں ساری رات اسی ادھیڑ بن میں مبتلا رہا کہ میں زہرا کی تلاش میں عشق حقیقی کی راہ پر چل پڑا تھا یا اللہ کی راہ سے بھٹک کر دنیاوی محبتوں کے جال میں اُلجھتا چلا جا رہا تھا۔ میرے اندر کے ساحر اور عبداللہ میں ایک عجیب سی جنگ چھڑ گئی تھی۔ ساحر، عبداللہ کو دوغلے پن کا طعنہ دیتا تھا کہ بظاہر اللہ کی راہ کھوجنے والا اب بھی اُسی محبت کی کھوج میں در بدر ہے، جس محبت نے ساحر سے اُس کی شناخت چھین کر اُسے عبداللہ بننے پر مجبور کر دیا تھا اور عبداللہ کو ساحر سے یہ گلہ رہتا کہ وہ بار بار سامنے آ کر عبداللہ کی راہ کھوٹی کر جاتا ہے۔ اگر ساحر کو زہرا نہیں ملی تو اس میں عبداللہ کا کیا قصور......؟ گر ساحر، زہرا کو نہ پا سکا تو اب انتقاماً عبداللہ کے راستے میں کانٹے تو نہ بچھائے......

صبح تک میرے اندر کی یہ جنگ اتنی شدت اختیار کر گئی کہ مجھے یوں لگنے لگا کہ میرے اندرون اور دنیا میں بٹی ہوئی یہ دُہری شخصیت کٹ کر دو حصوں میں دائیں بائیں گر جائے گی۔ آخر کار، جیت ساحر کی ہی ہوئی اور طے پا گیا کہ اس دنیا میں قدم رکھنے کا واحد مقصد اگر زہرا کی محبت کا حصول تھا تو یہ کمند تو لب بام ہی ٹوٹ چکی لہٰذا اب عبداللہ کو میرے اندر سے رُخصت ہو جانا چاہیے۔ کیوں کہ اگر اس سال بھر سے زائد کے عرصے میں بھی وہ عبداللہ میرے اندر کے ساحر کی جگہ نہیں لے سکا تو اب اُسے ساحر کو آزاد چھوڑ دینا چاہیے۔ ٹھیک ہے ساحر، زہرا کو نہیں پا سکا مگر عبداللہ بھی تو زہرا کی چاہت کو ساحر کے دل سے نہیں مٹا پایا۔ ''مات'' اگر ساحر کے عشق مجازی کا مقدر بنی تو ''جیت'' عبداللہ کے عشق حقیقی کا نصیب بھی نہیں بن پائی۔ میرے دل میں یہ احساس پوری طرح جڑ پکڑ چکا تھا کہ میرا عشق مجازی اور عشق حقیقی دونوں ہی ایک دوسرے کی راہ کا کانٹا بن چکے ہیں۔ اور دونوں کی بیک وقت موجودگی اب میرے اندر کے طوفانوں کو کبھی تھمنے نہیں دے گی۔ زہرا کا نام کسی اور سے جڑنے کو تھا مگر میرا یہ پاگل دل اب بھی اپنی ضد پر اڑا ہوا تھا۔ اس سے پہلے کہ میرا یہ جنوں اس عفت مآب کی کسی رُسوائی کا سبب بنے مجھے اس شہر ہی سے کہیں دُور چلے جانا چاہیے کیوں کہ میرے دل کا معاملہ زیادہ دیر تک ان دنیا والوں سے چھپا نہیں رہ سکتا تھا اور یہ ظاہر پرست دنیا تو بس تیروں سے چھلنی کرنا ہی جانتی ہے۔

میرے ذہن میں ابھی سے آنے والے وقت کی صدائیں گونجنے لگیں۔ ''ذرا دیکھو تو...... ان درگاہوں کی آڑ
میں یہ کیسا کھیل کھیلا جا رہا ہے......'' ''ہونہہ! حلیہ تو بڑا مذہبی بنا رکھا ہے اور دل کے اندر کتنا بڑا چور چھپائے بیٹھا
ہے۔'' ''توبہ ہے بھئی، ان جیسے لوگوں ہی نے مذہب کا نام بدنام کر رکھا ہے۔'' ''یہ شخص تو نرا کافر ہے۔ ماتھے
پر محراب سجائے ایک لڑکی کے عشق میں دیوانہ بنا پھرتا ہے۔'' ''اِسے تو سنگسار کر دینا چاہیے...... یہ ایمان کے
دائرے سے خارج ہو چکا ہے۔'' میں نے گھبرا کر اپنے کانوں پر ہاتھ رکھ کر اپنی سماعتیں سلب کر لینا چاہیں
لیکن کان بند کر لینے سے رُوح کی سماعت بھلا کب چوکتی ہے۔ میں نے آسمان پر شکوہ بھری نظر ڈالی کہ یا ت
میرے اندر اپنی محبت کو اس قدر بھر دے کہ دنیا کی سبھی محبتیں چھلک کر باہر جا گریں اور یا پھر میرے ادھورے
مجازی عشق کو مکمل جنون میں بدل دے تاکہ خود کو بھی بھول جاؤں۔ مجھے دو دھاری تلوار پر نہ چلا میرے رب ج
بھی بخشنا ہے، پورا بخش دے۔ آدھے مذہب اور آدھی دنیا میں سے کسی ایک تو مکمل کر دے۔ ورنہ یہ آدھ
جنوں اور آدھا فراق مجھے ریزہ ریزہ کر ڈالے گا۔ صبح کی پہلی کرن کے ساتھ ہی میں یہ فیصلہ کر چکا تھا کہ مجھے
اپنے اندر کے ساحر کی موجودگی میں اپنے بقیہ نصف کے حق دار، عبداللہ سے یہ منافقت کا کھیل اب ختم کر د
چاہیے۔ مجھے مولوی خضر کو اپنے فیصلے سے آگاہ کر کے سلطان بابا کی جانشینی کا تاج اور درگاہ کی ذمہ داری کس
اور کے حوالے کرنے کی درخواست کر کے خود پہلی فرصت میں یہاں سے نکل جانا چاہیے۔ میری بدنصیبی کی ان
یہ تھی کہ نہ میں ساحر رہا اور نہ ہی عبداللہ بن سکا۔ عبداللہ کے لقب نے مجھے پورا ساحر نہ رہنے دیا اور زہرا کی محبت
نے مجھے مکمل عبداللہ نہ بننے دیا۔ لیکن میں ابھی تک اس سوال کا جواب نہیں ڈھونڈ پایا تھا کہ ہم عشق مجازی
آنچ اپنے دل میں قائم رکھتے ہوئے بھی عشق حقیقی کو کیوں نہیں پا سکتے۔ بیک وقت دونوں حدوں کو اپنے د
میں محسوس کرنے والا دنیا کی نظر میں منافق اور گناہ گار ہی کیوں ٹھہرتا ہے، جب کہ دونوں ہی معاملوں
اختیار کا حق کسی اور کے پاس ہے اور مجھ جیسا کمزور انسان تو مکمل بے بس ہوتا ہے۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ
اختیار رکھتے ہوئے بھی اس اختیار سے نابلد ہوتے ہیں، ورنہ قدرت کبھی کسی ناکردہ جرم کی سزا تو نہیں دیت
جانے میں مزید کتنی دیر خود ہی کو اُدھیڑتا رہتا، اگر بختیار کی آواز میرے خیالات کا تسلسل توڑ نہ دیتی۔ ''کہ
کھوئے ہوئے ہیں جناب! دخل اندازی کی معذرت چاہتا ہوں......'' سچ یہ ہے کہ اس وقت بختیار کی آمد
کسی غیبی امداد سے کم نہیں لگی۔ کبھی کبھی جب ہم خود اپنا سامنا کرنے سے بھی اُکتا سے جاتے ہیں، تب ا
میں کسی تیسرے آئینے کی موجودگی ہمیں خود اپنی شبیہہ سے چھٹکارا دلا جاتی ہے۔ لیکن خود بختیار کا کانچ
کرچی کرچی محسوس ہو رہا تھا۔ اُس نے نہایت پریشانی اور دُکھی دل سے مجھے بتایا کہ آخر کار اُس نوجوان مج
ساز نے سائرہ کی جڑاؤ آنکھ کی پتلی ڈھونڈ لی ہے اور اِسی ہفتے وہ سائرہ کا آپریشن کروانے کا منصوبہ بھی
ہے۔ سائرہ بھی بصارت پانے کے خیال سے بے حد خوش ہے اور پل پل گن کے دن کاٹ رہی ہے۔ اُ
اس بات کی سب سے زیادہ خوشی ہے کہ وہ آنکھیں ملنے کے بعد اپنے محسن اور مربی بختیار کو بھی دیکھ سک

جس نے اُس کے فن کو ملک بھر میں پھیلانے کی ٹھان رکھی تھی، لیکن خود بختیار کی نیندیں اُڑ چکی تھیں۔ اُسے یقین تھا کہ اُس کی صورت دیکھتے ہی سائرہ کی نظر پلٹ جائے گی اور وہ اپنے نوجوان رفیق کے ساتھ مل کر اُسی طرح اُس کا تمسخر اُڑائے گی، جیسے آج تک باقی ساری دنیا اُڑاتی رہی ہے۔ میں نے تحمل سے اُس کی ساری بات سنی۔ ''مجھے افسوس ہے اب میں آپ کی کوئی مدد نہیں کر سکتا۔ میں نے درگاہ چھوڑ دینے کا فیصلہ کر لیا ہے لہٰذا اگر میری دُعا میں خدا نے کوئی تاثیر رکھی بھی تھی تو وہ اس فیصلے کے ساتھ ہی ختم ہو جانی چاہیے۔'' بختیار ہکا بکا سا رہ گیا۔ ''یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں؟ منزل پہ پہنچ کر پھر سے رختِ سفر کیوں باندھ رہے ہیں؟ ایسا نہ کریں خدارا'' میں نے ایک گہری سانس لی'' کچھ لوگوں کا مقدر سدا مسافت ہی رہتا ہے۔ اُن کے نصیب میں منزل کا سکون نہیں ہوتا۔ وہ بھی آپ کی طرح سدا 'فریفتہ' ہی رہتے ہیں۔ مجھے بھی اپنی اس فریفتگی کے ساتھ پھر سے دنیا کی اس بے چین بھیڑ میں کھو جانا ہے۔'' جانے کیوں میری بات سن کر بختیار کی آنکھوں میں نمی سی تیر گئی، اُس نے میرا ہاتھ تھام لیا'' کاش میں آپ کے لیے کچھ کر سکتا، لیکن میں تو خود بھکاری ہوں۔ اور آج آپ سے ایک آخری دُعا کی بھیک مانگنے آیا تھا۔ کیا آپ جاتے جاتے میرے حق میں ایک آخری دُعا بھی نہیں کریں گے......؟'' میں نے ہتھیار ڈال دیئے۔ ''مجھے آج ہی پتا چلا ہے کہ دُعا صرف انسان کے اپنے کامل یقین سے پوری ہوتی ہے، لیکن آپ کہتے ہیں تو یونہی سہی......'' میں نے ہاتھ فضا میں بلند کیے اور بختیار کی طرف دیکھا۔ وہ نظریں چرا کر بولا'' آپ دُعا کریں کہ میرا رقیب مر جائے......'' میرے اندر ایک دھماکا سا ہوا اور میرے ہاتھ نیچے گر گئے۔ ''یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں۔ میں کسی کی موت کی دُعا کیسے کر سکتا ہوں؟'' بختیار روہانسا ہو گیا۔ ''تو پھر آپ یہ دُعا کریں کہ سائرہ کو بصارت ملنے سے پہلے میں مر جاؤں۔ آپ نہیں جانتے، رقیب لفظ کی دھار ہی کسی دل جلے کے جگر کو پار کرنے کو کافی ہے۔ رقیب سے بڑا دشمن کوئی نہیں۔ نہ ہی رقابت سے بڑا کوئی دوسرا عذاب ہے۔'' میں چونک گیا۔ میری نظر میں خرم کا چہرہ گھوم گیا۔ میں بختیار کو کیا بتاتا کہ اس زہر کی کڑواہٹ سے آشنا، مجھ سے زیادہ بھلا اور کون ہوگا۔ مولوی خضر کے ہمارے طرف چلے آنے کی وجہ سے بختیار زیادہ دیر تک وہاں ٹک نہیں پایا، لیکن جاتے جاتے بھی اُس نے اشارے سے مجھے یاد دہانی کروا دی کہ مجھے اُس کے لیے کوئی ''منت'' مانگنی ہے۔ مولوی خضر نے اس کے پلٹتے ہی مسکرا کر میری جانب دیکھا۔ ''گویا تمہاری دُعا کی تاثیر پر لوگوں کو اعتبار ہونے لگا ہے۔'' میں نے اُن کی آنکھوں میں جھانکا'' کیا آپ بھی یہی سمجھتے ہیں کہ وہ میری دُعا سن لے گا۔ جب کہ خود آپ ہی نے مجھے بتایا کہ ان جگہوں پر مانگی گئی زیادہ تر دُعائیں خود سائل کے کامل یقین کی بنیاد پر قبول ہو جاتی ہیں۔ پھر ہم یہاں آکر دُعا کے لیے فریاد کرنے والوں کو براہِ راست یہ کلیہ کیوں نہیں سکھا دیتے کہ اِسی اعتماد کے ساتھ وہ اپنی چوکھٹ پر بھی ہاتھ اُٹھا کر گڑگڑائیں گے تو خدا اُن کی ضرور سنے گا۔ اس میں ہم جیسوں کا یا ان درگاہوں کا کوئی کمال نہیں ہے۔'' ''ٹھیک کہتے ہو میاں...... لیکن اگر ایک شخص اتنی دُور چل کر، اس اُمید میں یہاں تک پہنچا ہے کہ تم اُس کے لیے دو گھڑی ہاتھ اُٹھا کر اللہ

ے دُعا مانگ لوگے تو ایسی دُعا میں بھلا کیا حرج ہے؟ ہو سکتا ہے اللہ ہم گناہ گاروں کی صرف اس لیے سن لے ہ اُس کا ایک مجبور بندہ دُعا کی آس میں اتنی دُور چل کر آیا ہے۔ کون جانے اُس کی دُعا کی قبولیت گھر بیٹھے نہ ھی ہو۔ یہاں تک چل کر آنے کی سعی کے بعد ہی لکھی ہو۔ اور کبھی کبھی خدا اپنے کسی خاص بندے کی دُعا میں بھی ڈال دیتا ہے۔ ہو سکتا ہے، عبداللہ میاں بھی اُنہی خاص بندوں میں سے ایک ہوں۔'' مولوی خضر میرا سر تھپتھپا کر مسکراتے ہوئے ظہر کی نماز کے لیے چل دیئے۔ ''دفعتاً مجھے درگاہ کے دروازے کے پاس سے مجذوب کی آواز سنائی دی'' اپنی رُخصت کا وقت ہو گیا ہے لڑکے! تجھ سے ملنے کا وعدہ کیا تھا۔ سو، آ گیا ہوں۔'' میں جلدی سے باہر نکلا تو وہ سیڑھیوں سے پرے کھڑا تھا'' آپ کہاں جا رہے ہیں؟'' اُس نے سر جھٹکا'' سب ہی کو ایک دن جانا ہے، تو بھی تو جا رہا ہے......'' میں چونکا، وہ اپنی دُھن میں بولتا رہا۔ ''بس ایک بات یاد رکھ، لڑنا چھوڑ دے۔ کوئی فائدہ نہیں۔ صرف اپنا ماتھا ہی پھوڑے گا اور کچھ نہیں۔'' میں نے زخمی نگاہ اُٹھائی'' اپنی پیشانی کی پرواہ نہیں ہے مجھے۔ ہاں اس گھاؤ سے اُڑتے خون کے چھینٹے کسی کے اُجلے دامن کو داغ دار نہ کر دیں، بس اس بات کا ڈر ہے۔ اِسی لیے جا رہا ہوں۔'' مجذوب نے غور سے مجھے دیکھا، اتنا بُزدل دکھائی تو نہیں دیتا۔ تو تو دُوسروں کو بھسم کرنے والوں میں سے تھا، پھر خود جل کر راکھ کیسے ہو گیا؟'' ''میں تو سدا کا 'راکھ' تھا۔ پتا نہیں، یہاں کے لوگوں نے مجھے چنگاری کیسے مان لیا......؟'' میری کپکپاتی آواز نے جانے اُس پر کیسا اثر کیا کہ وہ جلال میں آ گیا'' تو کہہ تو ابھی فیصلہ کرا دوں، تجھے دنیا چاہیے نا...... جا میرے مالک نے آج سے دنیا تیرے نام کر دی۔ وہ تجھے مل جائے گی، لیکن اب کی بار چوکا تو پھر کبھی فریاد نہ کرنا۔ وہ تجھ سے صرف ایک بد دُعا کی دُوری پر ہے۔ تجھے اُوپر والے سے یہی گلہ تھا نا کہ اُس نے تجھے آدھا دین اور آدھی دُنیا کیوں دی۔ جا...... آج سے تیری دنیا پوری کر دی گئی ہے۔ اب آگے تیری اپنی ہمت ہے۔'' مجذوب ایک جھٹکے سے مڑا اور مزید کچھ کہے بنا لمبے لمبے ڈگ بھرتا وہاں سے چلا گیا۔

ایک لمحے کو مجھے یوں لگا جیسے مجھ سے سب قضا ہو گیا ہو۔ میں بوجھل قدموں سے درگاہ لوٹ آیا، جہاں مولوی خضر پریشانی کے عالم میں ٹہل رہے تھے۔ مجھے دیکھتے ہی وہ میری جانب لپکے'' خرم کے گھر سے پیغام آیا تھا میاں! اُس کی حالت گزشتہ رات سے کافی ابتر ہے۔ جانے اُس کے ذہن میں یہ بات کیوں سما گئی ہے کہ وہ اگر صحت یاب ہوگا تو صرف تمہاری مسیحائی سے۔ میرا خیال ہے تمہیں وہاں جانا چاہیے۔'' میرے ذہن میں مجذوب کی آواز گونجی'' وہ صرف ایک بد دُعا کی دُوری پر ہے......'' میرا ذہن سائیں سائیں کرنے لگا۔ اچانک درگاہ کے دروازے سے خرم کی ماں بوکھلائی ہوئی سی اندر داخل ہوئیں۔ جانے کیوں اُن کی حالت دیکھ کر میں پہلی مرتبہ خوف زدہ ہو گیا۔ خرم کی والدہ میری جانب لپکیں۔ '' جلدی چلو، عبداللہ بیٹا...... خرم کی سانسیں اکھڑ رہی ہیں۔ میرے بچے کو اب صرف تم ہی بچا سکتے ہو۔'' میری نظر مولوی خضر کی نظر سے ٹکرائی۔ مجھے یوں لگا، مجذوب کی پیش گوئی پوری ہونے کا وقت آ پہنچا ہے۔

"کبھی کسی کو مکمل جہاں نہیں ملتا"

خرم کے گھر کی جانب جاتے ہوئے، تمام راستے مجھے مجذوب کی کہی باتوں کی بازگشت نے گھیر رکھا اور پھر خرم کے سرہانے زہرا کو کھڑے دیکھ کر میرا دم اٹکنے لگا۔ اُس کی موجودگی میں تو اکثر میں سانس لینا بھی بھول جاتا تھا۔ کسی بیمار کے لیے دعا کیا خاک کر پاتا؟ جانے کس مشکل سے میں نے اپنے حواس یک جا کیے۔ خرم کی حالت واقعی بہت خراب تھی۔ پتا چلا طبی تشخیص کے مطابق حادثے کے بعد اگرچہ خرم کو فوری طور پر آپریشن تھیٹر پہنچا دیا گیا تھا، لیکن تمام احتیاط کے باوجود، جسم میں پھیلتا زہر اپنا اثر دکھا دیا گیا۔ شاید یہی وجہ تھی کہ دونوں ٹانگیں کٹنے کے باوجود خرم دن بدن نڈھال ہوتا گیا اور اس کا ہر چوبیس گھنٹے بعد پلٹنے والا بخار اب دن رات مستقل اُس کا وجود پھُنکتا رہتا تھا۔ ڈاکٹر اپنی سی تمام کوششیں کر چکے تھے۔ اُن کی آخری اُمید بیرون ملک سے منگوائی گئی ایک خاص ویکسین تھی، جو اگلی شام کے ہوائی جہاز سے لائی جا رہی تھی۔ لیکن خود خرم اپنی ہر اُمید تیاگ چکا تھا۔ اس تمام عرصے میں اُس کے جلتے بدن اور سلگتی رُوح کو اگر چند لمحے کی ٹھنڈک نصیب ہوئی تھی تو وہ صرف درگاہ سے آئے، پڑھے ہوئے پانی کی مہربانی تھی۔ مولوی خضر کی بتائی ہوئی وہی چند مخصوص آیات پڑھ کر میں نے پانی کے گلاس پر پھونک دیں اور خرم نے بے تابی سے وہ پانی حلق سے نیچے اُتار لیا۔ کچھ پل کے لیے اُس کی انگارہ سانسوں کو قرار سا مل گیا۔ میں بغور اُس کی حالت دیکھتا رہا۔ اُس نے میرا ہاتھ تھام لیا۔

"میں نے سنا ہے تمہاری دعا میں بڑی تاثیر ہے عبداللہ...... تم میرے لیے دعا کرو گے نا؟" "تمہاری جینے کی خواہش ہی تمہاری سب سے بڑی دعا ہے خرم۔ کسی بھی دعا سے کہیں زیادہ تمہاری اپنی قوت ارادی پر بھروسے کی ضرورت ہے۔" اُس نے سر جھٹکا "نہیں...... مسیحا کو عام طور پر اپنی مسیحائی کا اعجاز کم ہی ہوتا ہے۔ میں جب بھی تمہیں دیکھتا ہوں، مجھے ایسا لگتا ہے کہ تم دُور کہیں میری رُوح سے جڑے ہو۔ کچھ ناتا تو تم سے ایسا ضرور ہے جس نے مجھے یہ احساس بخشا ہے کہ میرے درد کی ہر دوا بس تمہارے پاس ہے۔ میں جانتا ہوں کہ اگر اس بار بھی تم نے میری مسیحائی نہیں کی، تو میں مر جاؤں گا۔" خرم کی بات سن کر اُس کی ماں رو پڑی۔ میری نظر اُٹھی اور زہرا کی ڈبڈبائی نظر کا سارا ترش نمک میرے حلق میں اُنڈیل گئی، پھر مجھ سے وہاں نہیں ٹھہرا گیا اور میں چپ چاپ باہر نکل آیا۔ درگاہ تک واپس پہنچتے پہنچتے رات ڈھل چکی تھی۔ مولوی خضر میرے انتظار میں صحن کے چوبارے پر بیٹھے تسبیح پڑھ رہے تھے۔ "کہو میاں، کچھ آرام آیا تمہارے مریض کو......؟" "آپ بھی وہی بات کہہ رہے ہیں۔ میں دوبارہ خرم کے گھر نہیں جاؤں گا۔ آخر اُن سب لوگوں کو یہ بات کیوں سمجھ نہیں آتی کہ میں

ی کے لیے کچھ نہیں کر سکتا۔ کیا میں اور کیا میری دعا۔ آپ خوب جانتے ہیں۔" مولوی خضر نے غور سے میری
ب دیکھا "جیسے تمہاری مرضی میاں! لیکن یاد رہے، کبھی کبھی دعا نہ دینے کا مطلب بددعا دینا بھی ہو جاتا
ہے۔" میں اپنی جگہ جم سا گیا۔ مجذوب نے بھی تو یہی کہا تھا کہ زہرا مجھ سے صرف ایک بددعا کی دُوری پر ہے۔
نہیں، یہ وہی بددعا تو نہیں۔ یہ کیسا ستم ہے کہ قدرت نے میرے رقیب کے نصیب کی آخری دعا میرے حصے
ں رکھ چھوڑی تھی۔ اور اس دعا کی قبولیت کی پہلی اور آخری شرط میرے خلوص سے متصل کر دی گئی تھی۔ بھلا
وئی اپنے رقیب کے لیے بھی پوری شدت اور کامل خلوص کے ساتھ دعا مانگ سکتا ہے؟ میں وہیں درگاہ کے
بوترے پر ہاتھوں کا تکیہ بنا کر لیٹ گیا اور جانے کب آسمان پر اپنے مقدر کا دُھندلا ستارہ ڈھونڈتے
ھونڈتے میری آنکھ لگ گئی۔ خواب میں پھر وہی گہری دُھند تھی اور وہی اک نیا دُھندلا جہاں بانہیں
پھیلائے میرا انتظار کر رہا تھا۔ لیکن میں خواب میں بھی درگاہ کے صحن میں ملزم بنا کھڑا تھا اور میری فردِ جرم پڑھ کر
نائی جا رہی تھی "یہی ہے وہ سیاہ نصیب، جس نے درگاہ کے مجاور کے روپ میں محبت جیسے گناہ کبیرہ کا ارتکاب
یا ہے۔ اس کا حلیہ تو بظاہر شرعی ہے لیکن اس کا اندر شدید آلودہ اور کالک زدہ ہے۔ بظاہر خدا کی تلاش میں
رگرداں، مگر اصل میں اپنے محبوب کی چاہت میں دربدر ہے۔ یہ نیک لوگوں کی صحبت میں رہتے ہوئے اور
یسی مقدس چار دیواریوں کے بیچ بھی بس اُسی ایک چہرہ کو سوچتا رہتا ہے۔ اسے اس کے رہبر نے زمانے کے
ب ہی سرد و گرم سے آشنا کرنے کی بھرپور کوشش کی، مگر اس کا من پھر بھی اُسی ایک عشق سے اٹا رہا۔ اس کا دل
بھی پوری طرح پاک نہ ہو پایا اور یہ جہاں بھی گیا، وہاں دین کی تبلیغ کے برعکس اپنی محبت کی ترویج ہی کرتا رہا۔
تو بولو، ایسے گناہ گار نے جرم کی سزا کیا ہونی چاہیے؟" سارا مجمع چلانے لگا "اسے سنگسار کر دو۔ اسے مار ڈالو۔"
چاروں طرف سے مجھ پر پتھروں کی بارش شروع ہو گئی۔ میں گھٹنوں کے بل گر گیا اور دونوں ہاتھ اُٹھا کر خود کو
پتھروں سے بچانے کی کوشش کرتا رہا۔ "ٹھہرو، مجھے مت مارو...... میں نے کبھی پاک ہونے کا دعویٰ نہیں کیا۔
ب جانتے ہیں کہ میں تو بس اپنی محبت کی تلاش میں بھٹکتے ہوئے اس دنیا تک پہنچا تھا اور مجھے اُسی محبت کو
پانے کے دعوے کے ساتھ اس چوکھٹ کو پار کرایا گیا تھا۔ میں نے اس تمام سفر میں کبھی 'اعلان بزرگیت' نہیں
کیا، پھر مجھ سے پاکیٔ داماں کا تقاضا اور اُمید کیوں......؟ اگر اس تمام سفر میں میرے دل سے اس گناہ محبت کے
داغوں کو کھرچا نہ جا سکا تو اس قدر واویلا کیوں؟ ایک 'بے اختیار' کو سزا کیوں؟" میں یوں ہی چلاتا رہا اور تب ہی
اچانک میری آنکھ کھل گئی۔

سویرا ہونے کو تھا۔ کاش، کوئی سورج ایسا بھی اُبھرتا جو دلوں کے اندھیرے دُور کر پاتا۔ دن چڑھے بختیار بھی آ پہنچا۔ جانے کیوں آج اُسے دیکھ کر مجھے یوں محسوس ہوتا تھا، جیسے میں آئینہ دیکھ رہا ہوں۔ اُس نے آتے ہی دوبارہ اپنا سوال دہرایا۔ "آپ نے کیا فیصلہ کیا......؟" میں نے اُس سے پوچھ لیا "کیا محبت خودغرض بھی ہو سکتی ہے؟ میں نے تو سنا تھا کہ محبت صرف قربان ہونا جانتی ہے۔ محبت صرف خود لٹ جانے کا نام ہے۔"

بختیار میری بات مکمل ہونے سے پہلے ہی چلا اُٹھا۔ ”سب جھوٹ ہے۔ یہ سب بزدلوں کی پھیلائی ہوئی باتیں ہیں۔ محبت تو بس جیت لینے کا نام ہے۔ جو ہار جائیں، صرف وہی لٹ جانے کی دہائی دیتے پھرتے ہیں اور میری ایک بات ہمیشہ یاد رکھیے گا، جو اپنی محبت ہار جائے، اُسے جینے کا کوئی حق نہیں ...... کہ محبت کے بنا بھی تو صرف فنا ہی اس کا نصیب ہے۔ میں ساری عمر روز مرتا آیا ہوں۔ اب اگر چند پل جینے کا موقع مل رہا ہے تو میں اُسے کسی رقیب کی بھینٹ کیوں چڑھ جانے دوں۔ کچھ لوگوں کے لیے قدرت کی جھولی میں صرف ایک ہی موقع باقی ہوتا ہے اور میں یہ آخری موقع کسی کمزور جذباتی لمحے کی نذر ہو کر برباد نہیں کر سکتا۔ ہر بار نصیب مجھ ہی سے قربانی کیوں مانگے۔ اس بار قربانی میرے رقیب کو دینی ہوگی۔“ بختیار اپنی دُھن میں نہ جانے کچھ بولتا رہا اور میرے اندر جھکڑ سے چلنے لگے۔ ہاں، ٹھیک ہی تو ہے۔ ہر بار قربانی ہمارا مقدر ہی کیوں......؟ کہیں خرم کی یہ بیماری میرے لیے بھی قدرت کے کشکول میں بچا ہوا آخری موقع تو نہیں؟ اور اگر اس کا انجام اسی بیماری کے ہاتھوں لکھ دیا گیا ہے تو پھر میری دعا کی کیا حیثیت باقی رہ جاتی ہے؟ بختیار اب بھی پُر اُمید نگاہوں سے میری جانب دیکھ رہا تھا۔ میں نے دعا کے لیے ہاتھ اُٹھا دیے۔ بختیار پر شادی مرگ جیسی کیفیت طاری ہوگئی، جیسے واقعی میری دعا ہی اُس کی محبت کے حصول کا آخری ذریعہ ہو۔ کاش محبتیں صرف دعاؤں سے حاصل ہو سکتیں، تو آج سارے زمانے میں کوئی نامراد نہ ہوتا۔ میں نے دعا ختم کر کے چہرے پر ہاتھ پھیرا تو بختیار سے رہا نہ گیا۔

”آپ نے میرے لیے کیا مانگا۔“ مجھے اپنی آواز خود اجنبی سی لگی۔ ”میں نے اللہ سے تمہارے رقیب کی قربانی مانگی ہے...... اگر تمہاری محبت کا انجام تم دونوں میں سے کسی ایک کی قربانی ہی سے وابستہ ہے تو میں نے خدا سے التجا کی ہے کہ اس بار ایثار کا یہ پہاڑ تمہارے رقیب کے کاندھوں پر رکھ دے۔“ بختیار اس چھوٹے بچے کی طرح خوش ہوگیا، جو پرانا کھلونا ٹوٹ جانے پر کسی نئے کھلونے کے بہلاوے میں آ کر رونا بھول جاتا ہے لیکن میں اپنے اُس پاگل دل کا کیا کرتا، جو آخری بازی مات ہو جانے کے بعد بھی کسی ضدی بچے کی طرح مچل رہا تھا اور کسی بہلاوے میں آنے کے لیے تیار نہ تھا۔ آج شام مجھے خرم کو نئی ویکسین کا ٹیکا لگائے جانے سے پہلے مغرب سے قبل اُس کے لیے دعا کرنے جانا تھا، لیکن میرے دل اور دماغ کی جنگ سہ پہر تک اتنی شدت اختیار کر گئی کہ جسم بخار میں تپنے لگا۔ میرا دماغ مجھے خرم کے گھر جانے سے روکتا رہا اور دل اس بھرم کی دہائی دیتا رہا، جو خرم اور اُس کی ماں کو مجھ پر تھا، لیکن کیا دنیا کا کوئی بھی بھرم کوئی بھی مان اتنا اہم ہو سکتا تھا کہ جس کی خاطر میں زہرا کھو دیتا۔ اس کش مکش نے عصر سے پہلے ہی میری رگوں میں انگارے بھر دیئے اور جب میں لڑکھڑاتا ہوا اپنی جگہ سے اُٹھا تو صحن میں وضو کرتے مولوی خضر میری حالت دیکھ کر فوراً میری جانب دوڑے۔ میرے ماتھے کو چھونے اور اُن کی تشویش بھرے لہجے میں کچھ بڑبڑانے کی حد تک تو میرے حواس نے ساتھ دیا اور پھر چراغوں میں روشنی نہ رہی۔ مجھے ہوش تب آیا، جب میں نے اپنے ماتھے پر برف میں بھگوئی پٹیوں کی ٹھنڈک محسوس کی۔ میں درگاہ کے حجرے میں تھا اور کھڑکی سے باہر رات کی تاریکی پھیل چکی تھی۔ میں نے ہڑبڑا کر

اُٹھنے کی کوشش کی تو مولوی خضر نے مجھے روک دیا ”لیٹے رہو میاں، ابھی تمہاری حالت سنبھلی نہیں ہے۔“ میں کسمسایا۔ ”لیکن......“ مولوی خضر میرا مدعا سمجھ گئے۔ ”اس کام کے لیے اب دیر ہو چکی۔ خرم کی والدہ تمہیں مغرب سے پہلے لینے کے لیے آئی تھیں لیکن تم اُس وقت ہذیانی حالت میں نہ جانے کیا کچھ بول رہے تھے۔ تمہاری حالت دیکھ کر تو وہ خود گھبرا گئیں اور پھر اُنہی کا ڈرائیور یہاں ڈاکٹر کو بھی لے کر آیا تھا۔“ میں نے بوکھلا کر مولوی خضر کی جانب دیکھا۔ ”میں کچھ زیادہ ہذیان تو نہیں“ ”نہیں ...... وہ کچھ نہیں سمجھیں ...... انہیں خرم کی پریشانی میں کچھ یاد ہی کب تھا۔ بہر حال، وہ نامراد ہی واپس لوٹ گئیں کہ شاید اُن کے بیٹے کی قسمت میں دعا نہیں۔“ میں نے تھک کر تکیے سے سر ٹکا دیا۔ کچھ فیصلے قدرت خود اپنے ہاتھ سے لے لیتی ہے، کیوں کہ ہم کمزور انسانوں کا ظرف ان کا بوجھ برداشت نہیں کر پاتا۔ لیکن پھر بھی نہ جانے کیوں، میرا دل بہت زور زور سے دھڑک رہا تھا۔ جیسے پھر سے کوئی اَن ہونی میرے تعاقب میں ہو۔ مولوی خضر میری اندرونی کش مکش بھانپ گئے۔ ”خود سے اتنا نہ لڑا کرو عبداللہ میاں! دل پھٹ جائے گا تمہارا۔ سب اُوپر والے پر چھوڑ دو۔“ لیکن کاش، یہ کلیہ میرا دل بھی سمجھ پاتا۔ جب تک ہوش رہے، ہم خود ہی سے تو لڑتے رہتے ہیں۔ تب ہی قدرت ہم پر رحم کھا کر ہمیں کچھ دیر کے لیے ہوش و حواس سے بیگانہ کر دیتی ہے۔ کسی کو نیند کی صورت اور کسی کو بے ہوشی کی شکل میں سکون بخش دیتی ہے۔ میں بھی شدید بخار کے زیرِ اثر تھک ہار کر پلکیں موند بیٹھا۔ جانے رات کے کس پہر مجھے درگاہ کے باہر چند گاڑیوں کے رُکنے کی آواز آئی اور پھر غنودگی کے عالم میں مجھے یوں محسوس ہوا، جیسے مولوی خضر حجرے سے نکل کر باہر گئے ہوں۔ کچھ قدموں کی چاپ اُبھری اور پھر کچھ دیر کے لیے سناٹا چھا گیا۔ میرا ذہن پھر سے تاریکیوں میں ڈوبنے لگا اور پھر کسی نے دھیرے سے میرا نام پکارا ”ساحر۔“ مجھے یوں لگا جیسے کوئی روشنی کی تیز کرن اندھیرے سمندر کا سینہ چیرتی ہوئی گہرے پانیوں کو کاٹتی، میرے دل و دماغ کو منور کر گئی ہو۔ اُس آواز کو میں لاکھوں کروڑوں کے ہجوم میں پہچان سکتا تھا۔ یہ زہرا کی آواز تھی۔ میں نے کچھ اس طرح ڈرتے ڈرتے آنکھیں کھولیں جیسے پلکوں کی ذرا سی تیز حرکت سے یہ سنہرا سپنا ٹوٹ نہ جائے۔ وہ میرے سرہانے کھڑی تھی ...... ہاں ...... وہ زہرا ہی تھی۔ کچھ دیر کے لیے زمان و مکان کی ہر حرکت رُک سی گئی۔ میری نظر اُس کی بھیگی نظر سے ٹکرائی اور مقصدِ حیات تمام ہوا۔ اس کے یاقوت لب پھر سے ہلے۔ ”ساحر...... آپ ٹھیک تو ہیں......؟“ میں اُسے کیا جواب دیتا۔ میں اُس کے سامنے ہوتا ہی کب تھا۔ اُس کی موجودگی تو ہمیشہ میرا اپنا آپ مٹا کر رکھ دیتی تھی۔ میرے سامنے اور خود مجھ میں بس وہ ہی وہ باقی رہ جاتی تھی۔ لیکن اُس کی نظر ڈبڈبائی ہوئی کیوں تھی۔ اُس کے قریب ہی مولوی خضر بھی نہایت پریشان سے کھڑے تھے اور حجرے سے باہر درگاہ کے صحن میں بھی کسی عورت کی دبی دبی سی رونے کی آواز آ رہی تھی۔ میرا دل زور سے دھڑکا۔ کہیں وہ اَن ہونی پیش تو نہیں آ گئی۔ مولوی خضر کی لرزتی آواز نے مجھے پھر سے ہوش کی دنیا میں پہنچا دیا۔ ”عبداللہ میاں...... زہرا بی بی تمہیں لینے کے لیے آئی ہیں۔ خرم کی حالت بہت بگڑ گئی ہے۔ اُمید اپنے آخری دم پر ہے۔

باہر صحن میں خرم کے والدین بھی موجود ہیں۔ میں انہیں تمہاری شدید ناساز طبیعت کے بارے میں بتا چکا ہوں۔ اب فیصلہ تمہارے ہاتھ میں ہے۔'' مولوی خضر اپنی بات ختم کر کے مجھ سے نظریں ملائے بنا حجرے سے باہر نکل گئے۔ کیا آپ نے کبھی شدید پیاس سے دم توڑتے ایسے کسی بدنصیب گھائل کو دیکھا ہے، جو اپنے ہاتھوں کے کٹورے میں پانی کی بچی ہوئی، آخری چند بوندوں سے اپنے لب تر کرنے والا ہو اور تب ہی کوئی دوسرا اُس سے وہ پانی مانگ لے۔ میں نے اُسی جاں بہ لب بدنصیب کی نظر سے زہرا کی جانب دیکھا۔ اُس کی لرزتی پلکیں جھکی ہوئی تھیں اور آنسو گرنے کو تھے۔ قاتل کا تقاضا تھا کہ مقتول خود اپنے ہاتھوں سے خنجر کی چمکتی دھار کو اپنے جگر کے پار کرے اور شرط یہ تھی کہ لبوں کی مسکان بھی نہ ٹوٹنے پائے۔ میں نے اُٹھنے کی کوشش کی، لیکن کراہ کر رہ گیا۔ زہرا کپکپاتی آواز میں بولی ''آپ اس حالت میں سفر نہیں کر پائیں گے۔ میں اُن سے کہتی ہوں کہ......'' ''رُک جائیے...... قیدی اگر تختہ دار تک نہ جا سکے تو پھانسی ملتوی نہیں ہو جاتی۔ میں آپ لوگوں کے ساتھ چلنے کو تیار ہوں۔'' اندر سے آتی ہوئی آہٹوں کی آواز سن کر خرم کے والدین بھی مولوی خضر کے ساتھ حجرے میں آ گئے۔ نہ جانے کس طرح میں مولوی خضر کے شانے کا سہارا لے کر نیچے کھڑی گاڑی تک پہنچا۔ مولوی خضر بھی میرے ساتھ ہی پچھلی سیٹ پر مجھے لٹا کر سہارا دینے کے لیے بیٹھ گئے اور میں آنکھیں بند کیے اپنی ہستی کو سمیٹے پڑا رہا۔ جب کہ میں جانتا تھا کہ یہ راہ رقیب کے گھر کو جاتی ہے اور مجھے وہاں پہنچ کر سدا کے لیے بکھر جانا ہے۔ پتا نہیں، یہ کیسا امتحان تھا۔ خرم کے دل میں یہ بات کیوں گڑ گئی تھی کہ اُسے میری دعا ہی سے مسیحائی نصیب ہوگی۔ یہ کیسا بھید تھا جو کھلتا نہیں تھا۔

گھر میں داخل ہوتے ہی مجھے خرم کی خواب گاہ میں پہنچا دیا گیا۔ خرم کی سانسیں اُکھڑ رہی تھیں اور اُس کا چہرہ سورج مکھی کے پھول جیسا زرد پڑ چکا تھا۔ صاف لگ رہا تھا کہ وہ اپنے آخری دموں پر ہے۔ خرم کے سرہانے پڑی چھوٹی میز پر درآمد شدہ ویکسین کے خالی خول (وائل) پڑے ہوئے تھے۔ مطلب یہ کہ اُسے دوا دی جا چکی تھی، تو پھر اُس کی نبض کیوں ڈوب رہی تھی۔ میں نے گھبرا کر اُس کے پریشان کھڑے والدین کی طرف دیکھا۔ ''دیکھیں میں آپ لوگوں کے کہنے پر یہاں تک آ گیا ہوں اور اُوپر والے کی بارگاہ میں اپنی دعا کی عرضی بھی ڈال دوں گا، لیکن میری آپ لوگوں سے اب بھی یہی درخواست ہے کہ آپ مزید دیر نہ کریں۔ خرم کو فوراً پہلی اڑان سے بیرون ملک لے جائیں۔ دعا کے ساتھ مناسب دوا بھی بہت ضروری ہے۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ جب تک میری دعا کا بھرم ٹوٹے، تب تک بہت دیر ہو چکی ہو۔'' خرم کے والد نے ایک گہری سانس بھری ''تم ٹھیک کہہ رہے ہو بیٹا، اور سچ تو یہ ہے کہ مجھے پہلے بھی ان باتوں پر اعتبار نہیں تھا، بلکہ میں تو اکثر خرم کی ماں سے لڑ پڑتا تھا کہ اس جدید سائنسی دور میں ان احمقانہ باتوں پر بھلا کون یقین کرے گا لیکن پھر خرم کے معاملے میں ہر وہ بات غلط ثابت ہوتی گئی جسے ہماری ظاہری سائنس صدیوں پہلے ثابت کر چکی ہے۔ اس کا آخری نمونہ آج شام ہی ہم سب نے دیکھا ہے۔ خرم کی حالت کے پیش نظر میں نے خود ہی دنیا کی سب سے بہترین

ویکسین اور تمام قابل ڈاکٹروں کی ٹیم بلوائی تھی لیکن سر شام دی جانے والی دوا کا اثر بھی تمہارے سامنے ہی ہے۔ اس لیے آج میں نے بھی خرم کی والدہ کے یقین کے سامنے ہتھیار ڈال دیئے ہیں۔ اُسے بہت پہلے کسی مجذوب نے یہ پیش گوئی کر دی تھی کہ اگر خرم کی صحت یابی مقدور ہے تو اس کا ذریعہ صرف اور صرف تمہاری دعا ہے۔ پورے خلوص اور سچے دل سے مانگی گئی ایک دعا ہی خرم کی نجات ہے۔'' مجھے سارا کمرہ گھومتا ہوا محسوس ہوا۔ یہ کس مجذوب کا ذکر ہو رہا تھا۔ میرے دعا کے لیے اُٹھتے ہاتھ پھر سے نیچے گر گئے۔ ''مجذوب......'' خرم کی والدہ جلدی سے آگے بڑھیں۔ ''ہاں...... وہ مجذوب وہیں ساحل پر ہی ملا تھا۔ ہم خرم کو گھمانے کے لیے ساحل کی سیر کو گئے تھے، وہیں ایک ٹوٹی دیوار کے پاس وہ مجذوب ریت اور مٹی میں اٹا بیٹھا تھا۔ اُس نے خرم کو دیکھتے ہی بنا اُس کی بیماری یا تکلیف جانے بغیر فوراً کہہ دیا تھا کہ تیری شفا درگاہ میں بیٹھے عبداللہ کی دعا ہی سے ہوگی۔ ورنہ نہیں۔ حالانکہ اُس وقت خرم گاڑی ہی میں بیٹھا تھا اور اس مجذوب نے اس کی ظاہری حالت بھی نہیں دیکھی تھی۔'' میری آواز خود میرے لیے اجنبی تھی۔ یہ کب کی بات ہے۔ آپ پہلی مرتبہ کب اُس مجذوب سے ملی تھیں؟'' ''یہ اُسی دن کی بات ہے، جب ہم پہلی مرتبہ درگاہ آئے تھے۔ اُس دن کے بعد وہ مجذوب بھی دکھائی نہیں دیا۔'' میرے وجود میں بیک وقت بہت سی سوئیاں گڑ گئیں، تو گویا یہ کھیل بہت پرانا ہے۔ میں تو بس اُس شطرنج کی بساط کا ایک معمولی سا مہرہ تھا، جو قدرت نے خرم کی زندگی اور صحت یابی کے لیے بچھا رکھی تھی۔ ایک لمحے کے لیے میرے ذہن میں سمائی کہ سب کچھ یونہی چھوڑ چھاڑ، وہاں سے نکل جاؤں، لیکن ٹھیک اُسی لمحے خرم نے ایک ہچکی سی لی اور اُس کے جسم کو ایک جھٹکا لگا۔ مولوی خضر نے اپنی آنکھیں بند کر کے تسبیح ختم کر دی۔ خرم کی ماں کی آنسو بھری نگاہیں، اب بھی مجھ پر جمی ہوئی تھیں۔ میرے اندر عبداللہ کی آواز گونجی ''اگر ساحر کے اس تمام سفر کا حاصل یہاں اس بیمار کے سرہانے آ کر ایک دعا پر ہی ختم ہونا ہے تو پھر اپنی اس تمام تربیت کو بے مقصد نہ جانے دو۔ ساحر نے عبداللہ سے جُدائی کا فیصلہ کر ہی لیا ہے تو جاتے جاتے عبداللہ کا یہ آخری قرض بھی ادا کرتے جاؤ۔'' میں نے آنکھیں بند کر لیں اور اپنے ہاتھ فضا میں بلند کر لیے۔ ''یا اللہ! آج پھر تیرے سامنے وہی کم ظرف، گناہ گار، کمزور اور ناشکرا بندہ ہاتھ جوڑے حاضر ہے۔ تو نے ان لوگوں کے دل میں اگر میری دعا کا یقین کامل پیدا کیا ہے تو اب تو ہی اس دعا کا پردہ رکھ لے۔ یا میرے اللہ...... میرے دل کے چور اور میری دعا کی بے توقیری اور میرے خلوص اور سچائی کی کمی پر نہ جا۔ تو میری کم ظرفی اور میرے اندر کے گناہوں سے بخوبی واقف ہے۔ تجھے تیرے پیارے حبیب صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم کا واسطہ، تجھے اس ستر ماؤں سے زیادہ محبت کا واسطہ کہ خاص اپنی رحمت کے صدقے اس مجبور ماں کی بھی سن لے جو اپنے معذور بیٹے کی صحت یابی کے لیے یہاں وہاں سر ٹکراتی پھرتی ہے۔ اس محفل میں موجود اپنے سب سے عزیز بندے کی التجا کے صدقے مجھ جیسے عاصی کی دعا سن لے اور اس نوجوان کی بیماری دُور فرما کر اسے شفا عطا کر دے۔ میں جانتا ہوں کہ آج اس وقت بھی، یہ دعا مانگتے وقت بھی میرے اندر کے دنیا پرست اور گناہوں سے لتھڑے انسان کی

تمام خامیاں اور کمزوریاں اپنے عروج پر ہیں اور میری اس دعا میں قبولیت لائق ایک احساس بھی شامل نہیں لیکن تیری رحمت اور تیری لازوال عطا کسی جذبے کی محتاج نہیں۔ ہمیں تیرا رحم چاہیے۔ تیرا فضل چاہیے، میرے مولا۔" میں دل ہی دل میں گڑگڑاتا رہا اور آنکھوں سے آنسو ٹپ ٹپ گرتے رہے، پھر نہ جانے کتنی دیر بعد مولوی خضر کے ہاتھ کا دباؤ اپنے کاندھے پر محسوس کر کے میں نے آنکھیں کھول دیں۔ خرم کا رنگ بدستور زرد تھا۔ مولوی خضر نے پلٹ کر خرم کے والدین سے رُخصت طلب کی۔

ہمارے درگاہ پہنچتے پہنچتے سویرا جھلکنے لگا۔ میرا بخار ایک بار پھر زور پکڑ چکا تھا۔ فجر کی نماز کے بعد مولوی خضر نے مجھے حجرے میں آرام کی تلقین کی اور پھر کمرے سے نکلتے نکلتے انہیں جانے کیا ہوا کہ ایک بار پھر پلٹ کر میری جانب آ گئے اور اچانک مجھے اپنے سینے سے لگا لیا "مجھے تم پر فخر ہے میاں! میں تمہاری حالت سے بہ خوبی واقف ہوں۔ آج تم نے سلطان بابا کی شاگردی کا حق ادا کر دیا ہے۔ ایسا ظرف تو بس، عبداللہ، ہی کا خاصہ ہو سکتا ہے۔ جیتے رہو، آباد رہو۔" مولوی خضر میرے سر پر ہاتھ پھیر کر باہر نکل گئے اور میں اس ہارے ہوئے جواری کی طرح بستر پر ڈھے گیا، جو اپنی آخری جمع پونجی جانتے بوجھتے خود ایسے داؤ کی بھینٹ چڑھا آیا ہو، جس بازی کی مات کا اُسے پہلے ہی سے یقین ہو۔ میں آنکھیں بند کیے حجرے ہی میں پڑا رہا، حتیٰ کہ صبح کی تیز کرنوں نے حجرے کی کھڑکی سے دھوپ کی شکل اختیار کر کے میرے تاریک وجود پر روشنی کی ایک مستطیل چادر سی تان لی۔ دن چڑھے باہر سے مولوی خضر کی آواز اُبھری "میاں! جاگ رہے ہو تو بختیار صاحب کو تمہارے پاس اندر بھیج دوں۔ وہ کافی دیر سے بیٹھے تمہارا انتظار کر رہے ہیں۔" میں نے قریب پڑا کھیس شانوں پر ڈالا اور خود ہی باہر نکل آیا۔ بختیار کی نظر میرے چہرے پر پڑی تو وہ لپک کر میرے قریب آ گیا اور پریشانی سے بولا "یہ آپ نے اپنی کیا حالت بنا لی ہے۔ ایک ہی دن میں برسوں کے بیمار دکھائی دینے لگے ہیں۔" "ہاں...... شاید کچھ مرض ایک رات ہی میں برسوں کا فاصلہ طے کر جاتے ہیں۔ لیکن آج ماشاءاللہ آپ کا چہرہ خلافِ معمول بہت کھلا ہوا لگتا ہے۔ آپ کی منت پوری ہو گئی ہے۔" بختیار نے فرطِ عقیدت سے میرا ہاتھ تھام لیا۔ "یہ سب آپ کی دعا کی بدولت ہوا ہے۔ اب کوئی مجھ سے میرے حصے کی نظر نہیں چھین پائے گا۔ سائرہ نے آپریشن کروانے سے انکار کر دیا ہے۔" میں نے چونک کر بختیار کو دیکھا "کیا......؟ اُس نے ایسا کیوں کیا۔ اُسے تو بصارت کی شدید خواہش تھی نا......؟" "پتا نہیں۔ آپ شاید اسے میری شدید خود غرضی ہی سمجھیں، لیکن میں سمجھتا ہوں محبت سے زیادہ خود غرض جذبہ اس دنیا میں کوئی اور ہو گا بھی نہیں۔ اور پھر وہ محبت ہی کیا، جو خود اپنے لیے خود غرض نہ ہو۔ دراصل میں اس بات سے اس قدر پریشان تھا کہ جب سائرہ نے مجھ سے یہ پوچھا کہ میں آج کل اتنا کھویا کھویا کیوں رہتا ہوں تو میں اُس کے سامنے خود پر قابو نہ رکھ سکا اور رُو پڑا۔ وہ پریشان ہو گئی اور مجھے اسے بتانا ہی پڑا کہ میں اس بات سے خوف زدہ ہوں کہ بصارت ملنے کے بعد میں سائرہ کو کھو دوں گا، کیوں کہ میں انتہائی بدصورت ہوں۔ یہ سن کر تو وہ پہلے ہکا بکا سی رہ گئی اور پھر وہ بھی رُو پڑی کہ میں نے

اُس کی عقیدت کو اتنا ناتواں کیسے جانا۔ اُسے تو میرے اندر کے آدمی سے سروکار تھا۔ وہ بہت دیر روتی رہی اور پھر اُس نے فیصلہ کر لیا کہ وہ کبھی بصارت کا آپریشن نہیں کروائے گی۔ اسے وہ نظر نہیں چاہیے جو میرے بقول اُس سے میرے حصے کی نظر چھین لے جائے گی۔ اس کے اس فیصلے نے جانے کیوں پر مجھے بہت رلایا۔ میں اور سائرہ بہت دیر تک روتے رہے۔ لیکن شاید وہ ہم دونوں کے آخری آنسو تھے۔" بختیار نہ جانے کیا اور کیا کچھ بتاتا رہا مگر میرا ذہن کہیں اور ہی اٹک گیا تھا۔ محبت کو شاید اتنا ہی معصوم اور اتنا ہی خود غرض ہونا چاہیے تھا۔ مجھے بختیار پر رشک آ رہا تھا کہ اس کے اندر پلنے والی محبت وقت پڑنے پر خود غرض ہونا بھی جانتی ہے۔ کبھی کبھی ایسی خود غرضی بھی کسی نعمت سے کم نہیں ہوتی۔ بختیار کے جانے کے بعد بھی میں وہیں درگاہ کی دیوار کے ساتھ ٹیک لگائے بیٹھا رہا۔ حتیٰ کہ شام ڈھلنے لگی۔ اس دوران مولوی خضر نہ جانے کتنی بار کسی نہ کسی بہانے درگاہ کی سیڑھیوں تک جا کر واپس پلٹتے رہے۔ میں جانتا تھا انہیں کس نتیجے کا انتظار ہے۔ آخر کار مغرب سے کچھ دیر قبل درگاہ کے باہر چند گاڑیوں کے رُکنے کی آواز سنائی دی اور مولوی خضر تیزی سے حجرے سے باہر نکلے۔ چند لمحوں بعد خرم کے والدین اپنے کئی نوکروں سمیت ڈھیر ساری نذر اور نیاز لیے درگاہ کے دروازے سے اندر داخل ہوئے۔ اُن کے چہرے خوشی سے دمک رہے تھے۔ پتا چلا کہ فجر ہونے سے پہلے ہی خرم کی حالت سدھرنے لگی تھی اور دوپہر تک اُس کا بخار ٹوٹ چکا تھا۔ ڈاکٹر اسے درآمد شدہ ویکسین کا اثر سمجھتے تھے۔ لیکن خرم کے والدین کے نزدیک یہ دعا کا کرشمہ تھا۔ اور یہ ساری کہانی لکھنے والا لکھاری وہی ایک مجذوب تھا، جو پہلے مجھے اور پھر خرم کی ماں کو ملا تھا۔ کتنا شان دار پلاٹ بنایا تھا اُس نے۔ بہرحال، وجہ جو بھی رہی ہو، خرم کے والدین کی خوشی چھپائے نہیں چھپ رہی تھی۔ ماں کا بس نہیں چل رہا تھا کہ وہ کس طرح میری ساری بلائیں اپنے سر لے لے۔ "اب میں بہت جلد اپنے خرم کے سر پر سہرا سجاؤں گی اور آپ سب کو آنا ہو گا۔ اور عبداللہ تم بھی تو میرے بیٹے ہو نا، تو تمہیں خرم کا شہ بالا بننا ہو گا۔ ٹھیک ہے نا، دیکھو، میں کوئی بہانہ نہیں سنوں گی۔" وہ نہ جانے کیا کچھ کہتی رہیں اور میں اپنی جگہ پتھر بنا کھڑا رہا۔ جانے یہ شہنائی اور ماتم کا رشتہ کتنا پرانا ہے۔ اُن کے لہجے میں شہنائی کی گونج تھی اور میری خاموشی میں ماتم رقصاں تھے۔ اُن کے جانے کے بعد میں مولوی خضر کی جانب پلٹا۔ "میں نے واپسی کا فیصلہ کر لیا ہے۔ شاید یہی میرے سفر کا آخری پڑاؤ تھا۔ آپ درگاہ کے لیے کسی نئے عبداللہ کو منتخب کر لیں۔" میری آواز آنسوؤں سے رُندھ سی گئی۔

مولوی خضر نے آگے بڑھ کر مجھے گلے لگا لیا "ٹھیک ہے اگر یہی رضائے خداوندی ہے تو یونہی سہی، مگر ایک آدھ دن تو ٹھہر جاؤ۔ جب تک میں بھی درگاہ کے انتظامات کسی کے سپرد کرنے کے قابل ہو جاؤں گا۔" "جو آپ کا حکم۔" میں واپس پلٹ کر حجرے کی طرف بڑھا۔ "اور ہاں عبداللہ! تمہارا آخری سوال اُدھار تھا مجھ پر۔ تم نے پوچھا تھا کہ ہمارا بسیرا ان درگاہوں اور ویرانوں ہی میں کیوں کر ہے، جب کہ خدا کی خدائی کو تو شہ رگ سے بھی قریب بیان کیا گیا ہے۔ ہاں، یہ سچ ہے کہ خدا ہماری شہ رگ سے بھی زیادہ نزدیک رہتا ہے۔ اُس

کی کھوج میں ہمیں کسی بھی درگاہ، ویرانے میں بھٹکنے کی قطعاً ضرورت نہیں۔ تمہیں آج ایک اور بھید بھی بتانا ضروری ہوگیا ہے۔ میں ...... حاکم بابا، سلطان بابا اور تم ...... ہم سب ان درگاہوں پر اس لیے ہیں کیوں کہ ہماری تعیناتی کی جگہ یہی مقرر کی گئی ہے لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ شہروں، قصبوں اور دیہات میں کوئی اور عبداللہ، حاکم یا سلطان تعینات نہیں۔ میں نے تمہیں بتایا تھا کہ ایک غیر مرئی نظام رائج اور متحرک ہے۔ تم اتنا عرصہ خدا کی تلاش میں نہیں بلکہ اُسی خدا کے حکم سے بھٹک رہے تھے، تمہارا خدا تو اس تمام سفر میں تمہارے ساتھ ہی تھا۔ درگاہ سے پھانسی گھاٹ، پھر یا قوط، جبل پور، کال گڑھ اور تحصیل ماہی سے لے کر لندن اور واپسی تک کے تمام سفر کا کوئی ایک مقصد ضرور تھا۔ جانتے ہو وہ مقصد کیا تھا، تم سے ''خدا کا تعارف ......، اُس کے بندوں کے ذریعے۔ اُس کے نظام اور اُس کی قدرت کے ذریعے۔ مجھے خوشی ہے کہ تم نے اس تعارف کو بخوبی نبھایا۔ تم نے واپسی کا فیصلہ کیا ہے تو یہ بھی اُسی کی مرضی ہے۔ بس اتنا یاد رہے کہ وہ ہر جگہ، ہر پل تمہارے ساتھ تھا، ساتھ ہے ...... اور ہمیشہ ساتھ رہے گا۔'' مولوی خضر پلٹ کر چل دیئے اور میں وہیں چبوترے پر ڈھے سا گیا۔ وہ اگر میری شہ رگ سے بھی زیادہ قریب ہے تو پھر مجھے مل کیوں نہیں جاتا۔ سوچتے سوچتے میں نیند کی وادی میں پہنچ گیا، لیکن جسے میں نیند سمجھتا تھا۔ کیا واقعی وہ نیند تھی، میں تو اکثر نیند میں جاگنے سے زیادہ بیدار رہتا تھا۔

مجھے آج تک یہ معما ہی سمجھ نہیں آیا تھا کہ میں جاگتے ہوئے سوتا ہوں یا سوتے ہوئے جاگ رہا ہوتا ہوں۔ اور پھر صدیوں بعد مجھے اپنے شانے پر وہی مہربان لمس محسوس ہوا جس کی تلاش میں نہ جانے کب سے میں اپنے خوابوں میں بھٹک رہا تھا۔ ہاں! وہ سلطان بابا ہی تھے۔ وہی ملیح سی مسکراہٹ، وہی مہرباں احساس۔ میں رو پڑا ''کہاں چلے گئے ہیں آپ ...... آپ کو میری ذرہ برابر بھی پرواہ نہیں ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ آپ عبداللہ سے پیار ہی نہیں کرتے۔'' وہ مسکائے ''اچھا تو گویا عبداللہ اپنے سلطان بابا سے رُوٹھ گیا ہے، لیکن میرا ساحر تو مجھ سے خفا نہیں نا۔ وہ تو مجھ سے بات کرے گا؟'' ''آپ جانتے ہیں کہ عبداللہ اور ساحر کی یہ تفریق مجھے کاٹ ڈالے گی۔ پھر آپ نے میرے اندر کے عبداللہ کو کیوں جگا دیا اور اگر عبداللہ کی حیات اتنی ہی ضروری تھی تو پھر ساحر کو پوری طرح ختم کیوں نہیں کر دیا گیا؟'' ''تمہیں ایسا لگتا ہے کہ عبداللہ یا ساحر میں سے کسی ایک کی فنا ہی دوسرے کی بقا کے لیے ضروری ہے۔ یہاں پر سب ہی کے اندر آدھا ساحر اور آدھا عبداللہ بستا ہے۔ کاملیت تو شاید صرف پیغمبر کا نصیب ہوتی ہے۔'' میں سسک پڑا ''تو پھر یہ دنیا والے ہم جیسے گناہ گاروں سے کاملیت کی توقع کیوں کرتے ہیں؟ کیا وہ یہ نہیں جانتے کہ دل پر کسی کا زور نہیں۔'' سلطان بابا پھر سے مسکرائے ''بس ...... اتنی سی بات ہے۔ اپنی محبت پر شرمندہ ہو؟ مرد و زن کی آپسی کشش فطرت کی طے کردہ ہے۔ میں، تم ...... ہم سب ہی ایسے ہی کسی معاشرتی رشتے کی پیداوار اور نتیجہ ہیں۔ ہاں البتہ مذہب نے ایسے بندھن کی حدود مقرر کر رکھی ہیں۔ محرم اور غیر محرم کی شرعی پابندی بھی طے شدہ ہے۔ ان حدود کے اندر رہتے ہوئے اگر کوئی رشتہ طے ہوتا ہے تو اس میں شرمندگی کی کوئی بات نہیں۔ مذہب کا کوئی بھی کلیہ یہ نہیں کہتا کہ کسی درگاہ کے مجاور یا متولی کی

شرعی حدود میں رہتے ہوئے اپنی پسند کی شادی نہیں ہوسکتی۔ دنیا کا کیا ہے میاں، رہبانیت سے بچو گے تو دنیا پرستی کا الزام لگائے گی اور دنیاداری سے دامن چھڑاؤ گے تو رہبانیت کا داغ تمہارے ماتھے پر سجا دے گی۔ ویسے بھی مذہب اللہ کی رضامندی کے لیے اپنایا جاتا ہے، نہ کہ دنیا والوں کی خوشنودی کے لیے۔ بس حقوق العباد کا دامن ہاتھ سے نہ چھوٹنے پائے۔ اور ہاں، عبداللہ کو یہ بات سدا یاد رکھنی ہوگی کہ رشتے اور جوڑیاں آسمانوں پر بنتی ہیں۔ سو، تمہارے نصیب کا جوڑ تم تک پہنچ کر رہے گا۔ اور جو تمہارا مقدر نہیں، اس پر کبھی افسوس نہ کرنا۔'' سلطان بابا کی آواز دھیرے دھیرے دُھند میں کھوگئی۔ اور پھر اچانک میری آنکھ کھل گئی۔ میں نے سلطان بابا سے سنا تھا کہ قدرت نے نیند اور خواب کو بھی پیغام رسانی کے ذریعوں میں سے ''ایک'' مقرر کر رکھا ہے، تو گویا مجھے بھی آخری پیغام پہنچا دیا گیا تھا۔ ہمیشہ اپنے نصیب پر متشکر رہنے کا پیغام۔ چاہے وہ نصیب بنا زہرا ہی کے میرا مقدر کیوں نہ ہو۔

اگلی صبح مولوی خضر مجھے بہت مصروف دکھائی دیئے۔ شاید وہ تمام انتظامات کو حتمی شکل دے رہے تھے۔ سہ پہر تک میرے بعد والا عبداللہ، نعمان بھی درگاہ پہنچ گیا، لیکن ابھی سب کو کسی اور کی سواری کا بھی انتظار تھا۔ میں صبح سے درگاہ کے صحن میں بیٹھا ان در و دیوار کو تک رہا تھا، جن سے شناسائی اب صدیوں پرانی لگتی تھی۔ ان دیواروں نے یہاں مجھے ساحر سے عبداللہ تک کا سفر طے کرتے دیکھا تھا اور آج وہ اس عبداللہ کی واپسی کا سفر بھی دیکھ رہی تھیں۔ تقدیریں کیسے پلٹ جاتی ہیں، یہ کوئی نہیں جان سکا۔ اور پھر عصر کے وقت وہ سواری بھی آ پہنچی جس کا سب ہی کو انتظار تھا۔ وہ درگاہ کے صحن میں داخل ہوئے تو میں گھبرا کر کھڑا ہوگیا۔ ہاں، وہ حاکم بابا ہی تھے، اپنے مخصوص جلال اور غیض و غیظ کے ساتھ۔ لیکن آج اُن کے لبوں پر ایک عجیب ہی مسکراہٹ تھی۔ میں نے انہیں سلام کیا تو مجھے گلے لگا لیا۔ ''کیوں بھئی نوجوان ...... واپس چل دیئے۔ تم نے تو ہمیں یاد نہیں کیا۔ پر دیکھو ...... ہم خود تمہیں رُخصت کرنے یہاں چلے آئے۔'' میں خاموش رہا لیکن نہ جانے کیوں محسوس ہو رہا تھا کہ حاکم بابا نے اب سلطان بابا کے فرائض سنبھال لیے ہیں کیوں کہ اُن کا ہدایات دینے کا انداز اور اُن کی ہر معاملے پر گہری نظر اس بات کو ظاہر کر رہی تھی کہ اب وہ بطور سلطان تعینات ہو چکے ہیں۔ عصر کے بعد میں نے سب سے رُخصت چاہی، کیوں کہ میں مما اور پپا کو پہلے ہی اطلاع کر چکا تھا اور اُن کی آمد کسی بھی وقت متوقع تھی۔ ہمیشہ کی طرح یہ وداع بھی میرے لیے کسی خنجر کی دھار کی طرح تھا۔ رُوح میں پیوست ہونے والی دھار ...... حاکم بابا دھیرے سے مسکرائے ''جب جب جو جو ہونا ہے ...... تب تب سو سو ہوتا ہے۔'' ''جا رہے ہو میاں! چلو ٹھیک ہے، تمہارا استقبال کرنے والے بھی آ پہنچے ہیں۔ اور ہاں ...... گھر پہنچ کر اس رقعے کو کھول کر پڑھ لینا۔'' انہوں نے خاکی رنگ کا ایک لفافہ میری قمیص کی جیب میں ڈال دیا۔ یہ وہی لفافہ تھا، جس کے بارے میں مولوی خضر نے گزشتہ شام مجھ سے ذکر کیا تھا۔ میں تو حاکم بابا کے منہ سے سلطان بابا کا مخصوص جملہ سن کر ہی اپنی جگہ سن سا کھڑا تھا کہ اچانک عقب سے مما کی آواز اُبھری ''ہم آ گئے ہیں بیٹا ......'' میں نے

میکانکی انداز میں گردن گھمائی اور پھر مما پپا کے ساتھ وہیل چیئر پر بیٹھے خرم اور اُس کے والدین کو ساتھ کھڑے دیکھ کر میں اپنے سارے الفاظ کھو بیٹھا۔ ''آپ سب یہاں ......؟'' تب خرم نے اپنی وہیل چیئر دھکیلی اور میرے قریب آ گیا۔ اُس کی پلکیں بھیگ رہی تھیں۔ ''واہ میرے مسیحا! ساری مسیحائی کا اعجاز خود ہی سمیٹ لینا چاہتے ہو کیا؟ ویسے داد دینی پڑے گی تمہارے حوصلے کی۔ تمہاری جگہ میں ہوتا تو شاید کسی مرحلے پر میرا ظرف جواب دے ہی جاتا، لیکن تم شاید یہ بھول گئے کہ احسان جب حد سے بڑھ جائیں تو اُن کا بوجھ اگلے کو توڑ ڈالتا ہے۔ تم نے بھی مجھے توڑ ڈالا ساحر۔'' خرم کے منہ سے اپنا پہلا نام سن کر مجھے زوردار جھٹکا لگا اور میں نے مما پپا کو شکایت بھری نظر سے دیکھا۔ میں نے انہیں زہرا کے رشتے کے بارے میں بتاتے وقت سختی سے تلقین کی تھی کہ وہ کسی بھی حال میں خرم یا اُس کے والدین پر یہ بھید ہرگز نہیں کھولیں گے، لیکن شاید اس بار اُن میں سے کوئی ایک اپنا وعدہ نہیں نبھا پایا تھا۔ خرم میری نظروں کا مفہوم سمجھ گیا۔ ''نہیں ...... تمہارے والدین میں سے کسی نے مجھے تمہارا اصلی نام نہیں بتایا۔ تمہاری اور اُن کی مٹی جو مشترک ہے۔ شاید یہ راز مجھ پر بھی کبھی نہ کھلتا۔ اگر کل سہ پہر یہ تحریر میرے ہاتھ نہ لگتی۔'' خرم نے اپنے ہاتھ میں پکڑا کوئی کاغذ لہرایا اور میرے جسم سے رہی سہی جان بھی پرواز کر گئی۔ یہ تو وہی نظم تھی، جو میں نے پپا کے ہاتھ زہرا کو لکھ بھیجی تھی۔ خرم نے کاغذ کھولا اور زیرِ لب دہرایا۔ ''جب تمہیں مجھ سے نفرت ہو جائے ......'' پھر خرم نے کاغذ پلٹا اور آخر میں بے خیالی میں لکھے گئے، میرے نام پر اپنی اُنگلی رکھ دی۔ ''یہ نظم تمہاری ہے نا ساحر...... اتنا درد سہنا تمہارا خاصہ ہی ہو سکتا ہے۔ بولو ساحر ...... چپ کیوں ہو، جواب دو مجھے......'' میں خاموشی سے سر جھکائے کھڑا رہا۔ پتا یہ چلا کہ کل جب دوپہر کے وقت خرم کا بخار ٹوٹ گیا تو کئی دنوں کی اکتاہٹ آمیز تھکن اُتارنے کے لیے اُس نے اپنی ماں باپ سے کھلی فضا میں نکلنے کی ضد کی، لیکن خرم کے والدین کو منت پوری ہونے کی نیاز چڑھانے کے لیے درگاہ آنا تھا لہٰذا طے یہ پایا کہ راستے میں خرم کو کچھ دیر کے لیے زہرا کی حویلی میں اُتار دیا جائے تاکہ وہ زہرا کے والدین سے بھی ملاقات کر لے۔ خرم کا اُردو ادب سے ویسے تو کبھی کوئی خاص شغف نہیں رہا تھا لیکن اُس نے محسوس کیا تھا کہ اُردو ادب زہرا کی شخصیت کا حصہ اور خاص طور پر نظم اور غزل تو اُس کی کمزوری ہے، لہٰذا اُس نے زہرا کی غیر موجودگی میں، یونہی بے خیالی میں کوئی کلیات اُٹھالی اور تب ہی اُس کے اندر سے یہ کاغذ اُس کی گود میں جا گرا۔ خرم نے جیسے ہی تحریر ختم کر کے آخر میں لکھا نام پڑھا، تب ہی زہرا کمرے میں داخل ہوئی اور خرم نے اُس سے پوچھ لیا کہ یہ ''ساحر'' کون ہے؟ یہ سوال زہرا کے لیے اس لمحے اس قدر اچانک اور ناگہانی تھا کہ وہ جواب میں کچھ نہ کہہ سکی۔ اُس کے چہرے کے بدلتے رنگ نے خرم کے تجسس کو مہمیز دی اور ایک ایسی بات، جسے عام حالات میں کوئی بھی چھوٹا سا بہانہ کر کے ٹالا جا سکتا تھا، بڑھتی چلی گئی۔ زہرا نے خرم سے التجا کی کہ اس بات کو یہیں ختم کر دیا جائے۔ مناسب وقت آنے پر وہ خود خرم کو ساحر کے بارے میں بتا دے گی۔ لیکن اگر بات ختم ہی ہونا تھی، تو شروع کیوں ہوتی۔ خرم وہ کتاب ہی کیوں اُٹھاتا، جس میں میری نظم رکھی تھی۔ خرم نے کوئی دوسری

کتاب کیوں نہ اُٹھائی؟ کچھ مسودے قدرت صرف خالص لمحوں کے لیے ہی لکھ رکھتی ہے۔ وہ بھی شاید ایک ایسا ہی پل تھا۔ آخر کار زہرا کا صبر جواب دے گیا اور اُس نے خرم کو بتا دیا کہ ساحر وہی عبداللہ ہے، جو گزشتہ رات خرم کی مسیحائی کے لیے اپنی شدید ابتر حالت کے باوجود اُس کے سرہانے کھڑا دعا مانگ رہا تھا۔ خرم کے حواس جواب دے گئے اور زہرا نے شروع سے لے کر آخر تک کی داستان جب ختم کی تو تب تک خرم اپنے ہی آنسوؤں میں بھیگ چکا تھا۔ وہ رات اُس کی زندگی کی سب سے طویل رات ثابت ہوئی اور صبح کا اُجالا ہونے سے پہلے وہ اس فیصلے پر پہنچ گیا، جس کے نتیجے میں آج وہ اپنے والدین سمیت میرے سامنے موجود تھا۔ خرم نے ہاتھ بڑھا کر میرا ہاتھ تھام لیا۔ ''میں اس کرب کا مداوا تو نہیں کر سکتا، جس سے تم ہر پل گزرتے آئے ہو۔ لیکن یقین جانو...... کل سے میرے گھر میں بھی کسی کو ایک کروٹ آرام نصیب نہیں ہوا۔ شاید ہم سب تمہارے مجرم ہیں۔'' میں نے جلدی سے خرم کی آنکھیں پونچھیں ''ایسا کیوں کہہ رہے ہو، قدرت کا یہی فیصلہ تھا۔'' خرم کی والدہ آگے بڑھیں ''نہیں ...... خرم کی طرح تم بھی میرے بیٹے ہو عبداللہ اور دنیا کی کوئی ماں اپنی اولاد میں فرق نہیں رکھتی۔ زہرا تمہاری امانت تھی اور ہمیشہ تمہاری ہی رہے گی۔ بس، فرق صرف اتنا ہے کہ پہلے میرے گھر سے خرم کی بارات جانی تھی اور اب عبداللہ کی جائے گی اور یہ حق میں تمہاری مما سے پہلے ہی مانگ چکی ہوں۔ اب تم اپنی اس ماں کو انکار نہ کرنا۔'' انہوں نے اپنے آنسو چھپاتے ہوئے میرے سر پر ہاتھ پھیرا۔ مما پپا میرے دائیں بائیں یوں کھڑے تھے، جیسے بچپن میں مجھے گرنے سے بچانے کے لیے میری پہلی بائیسکل کے ساتھ ساتھ چلتے تھے۔ مجھے کچھ سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ پل بھر میں یہ سب کیا سے کیا ہو گیا تھا۔ میں نے تو جانے کب سے اپنے رُوٹھے ہوئے مقدر سے دوستی کر لی تھی۔ لیکن قدرت یوں اچانک مجھ پر اتنی مہربان ہو جائے گی۔ زہرا کا نام پھر سے میرے نام کے ساتھ جڑ جائے گا۔ کہیں میں کوئی خواب تو نہیں دیکھ رہا تھا؟ پپا نے میری نظروں کا مفہوم جان لیا۔ ''زہرا ہمارے ساتھ نہیں آئی بیٹا...... وہ نیچے ساحل پر ہی رُک گئی تھی۔ اُس نے اپنے ہر فیصلے کو تمہارے فیصلے سے مشروط کر رکھا ہے۔ وہ کہہ رہی تھی کہ آج تک اُس نے جتنے بھی فیصلے کیے ہیں وہ سب کہیں نہ کہیں تمہارے لیے کسی درد کا باعث رہے ہیں لہٰذا اب یہ فیصلہ تمہیں کرنا ہے کہ کیا تم آج بھی زہرا کا ساتھ چاہتے ہو۔'' خرم نے مجھے جھنجھورا...... ''جاؤ عبداللہ...... دیر نہ کرو۔ اس بار اپنی تقدیر کو چوکنے نہ دینا۔ بہت زخم کھا لیے تم نے۔ بہت گھائل ہو چکے تم...... جاؤ تمہارا مرہم تمہارا انتظار کر رہا ہے۔ کہیں پھر دیر نہ ہو جائے......''

میں ابھی تک وہیں اپنی جگہ پر جما کھڑا تھا کہ اس بار حاکم بابا کی آواز میرے کانوں سے ٹکرائی۔ ''بے شک اللہ اپنے بندے کے لیے جو چنتا ہے، وہی اُس کا بہترین نصیب ہے۔ جاؤ عبداللہ...... تمہارا پہلا امتحان آج ختم ہوا۔ اگر تم اپنے قدموں سے چل کر اللہ کے اس بندے خرم کے لیے دعا کرنے نہ جاتے تو شاید یہ نتیجہ کچھ اور ہوتا۔ اس مجذوب نے تمہیں بددعا کے امتحان میں بھی اسی اللہ کی مرضی سے ڈالا اور آج اگر تم سرخرو

کھڑے ہو تو یہ بھی اُسی کی رضا ہے۔ جاؤ، تمہارا مقدر تمہارا انتظار کر رہا ہے۔'' حاکم بابا کی گرج دار آواز نے جیسے مجھے پھر سے ہوش کی دنیا میں پہنچا دیا۔ میں تیزی سے باہر کی جانب لپکا۔ پیچھے مولوی خضر کی آواز سنائی دی ''ہم سے رُخصت ہو کر الوداع تو کہتے جاؤ میاں...... جانے پھر کب ملاقات ہو......؟'' میں تڑپ کر پلٹا اور تیزی سے مولوی خضر کے پاس پہنچ کر اُن کے ہاتھ تھام لیے۔ ''آپ ایسا کیوں کہہ رہے ہیں۔ میری رُخصت کے فیصلے کے پیچھے بھی تو زہرا کے نام کا تقدس برقرار رکھنے کی آرزو ہی کارفرما تھی۔ میں آپ سب کو چھوڑ کر اب نہیں جاؤں گا۔'' حاکم بابا بولے۔ ''جانا تو طے ہو چکا ہے لڑکے......اور تمہاری خواہش پر ہی یہ سارا انتظام کیا گیا ہے......'' میں اُن کی بات سن کر روہانسا ہو گیا۔ مجھے یوں لگ رہا تھا، جیسے مجھے میرے ہی گھر سے بے دخل کیا جا رہا ہو۔ پھر نہ جانے کیوں ان سب ہی بزرگوں کے چہرے پر ایک عجیب سی مسکراہٹ پھیل گئی۔ حاکم بابا بولے۔ ''مولوی صاحب...... بہت ستایا آپ کے شاگرد کو۔ اب اسے اپنا فیصلہ سنا دیں۔'' مولوی خضر نے میری جانب مسکرا کر دیکھا۔ ''عبداللہ میاں......تمہارا فیصلہ تو جانے کب سے اس خالی لفافے میں لکھ کر بند کر دیا گیا تھا، وہی لفافہ جواب تمہاری جیب میں موجود ہے۔ تم چاہو تو اسے کھول کر پڑھ سکتے ہو......'' میں نے کچھ نہ سمجھتے ہوئے عجلت میں اپنی جیب سے وہ لفافہ نکالا اور تیزی سے اس پر لگی مہر کھولی۔ اندر سے ویسی ہی کاغذ کی ایک سفید پرچی نکلی، جیسی مجھے پہلی مرتبہ عبداللہ کے نام سے درگاہ میں تعینات ہونے پر ملی تھی۔ میں نے لرزتے ہاتھوں سے پرچی کھولی تو اس میں میرے ہی شہر کا نام لکھا ہوا تھا۔ صرف ایک نام......اور کچھ نہیں۔ میں نے حیرت سے مولوی خضر اور حاکم بابا کو دیکھا۔ وہ دھیرے سے مسکرائے۔ ''تمہیں تمہارے ہی شہر میں تعینات کر دیا گیا ہے عبداللہ......تمہارے فیصلے سے بہت پہلے یہ فیصلہ ہو چکا تھا......'' میں اپنی آواز سے چھلکتی خوشی چھپا نہیں پایا۔ ''گویا میں اب بھی عبداللہ ہوں...... مجھے بے دخل نہیں کیا جا رہا......؟'' مولوی خضر نے میرے شانے پر اپنا ہاتھ رکھ دیا۔ ''قدرت کے کیے گئے فیصلوں سے بے دخلی کا اختیار صرف قدرت ہی کو حاصل ہے۔ میں نے تمہیں بتایا تھا کہ عبداللہ صرف درگاہوں اور ویرانوں ہی میں نہیں...... زمین کے ہر خطے میں موجود ہے۔ بس یوں سمجھ لو کہ تمہارا ایک شعبے سے دوسرے شعبے میں تبادلہ ہو گیا ہے، البتہ تمہارا کام اب بھی وہی ہے۔ اللہ کے بندوں کو حتی المقدور خدمت اور اللہ کی بندگی اور یہ دونوں فرائض تم اپنے گھر میں اپنے والدین کے ساتھ رہتے ہوئے بھی انجام دے سکتے ہو۔ تمہارے مقدر کے بندے وہاں بھی تم تک پہنچ جائیں گے اور تم سے جو ہو سکے، اُن کے لیے ضرور کرنا۔ جاؤ اور مصیبت زدہ لوگوں کی خدمت میں جت جاؤ تاوقتیکہ تمہیں تمہاری کسی نئی تعیناتی کا مراسلہ مل جائے۔ ہم تمہاری کسی بھی مدد کے لیے ہمیشہ موجود رہیں گے......'' حاکم بابا، مولوی خضر اور نعمان (عبداللہ) نے فرداً فرداً مجھے گلے لگا کر رخصت کیا اور میں لڑکھڑاتے قدموں سے تنہا ہی ساحل کی جانب چل پڑا۔ مما پپا، خرم اور اُس کے والدین جان بوجھ کر ایک خاص مقام پر رُک گئے اور میں لرزتی دھڑکن لیے ڈُور ڈوبتے سورج کے پیش نظر میں، اپنی ہی سوچوں میں گم کھڑی زہرا کے قریب پہنچ کر کچھ

ے فاصلے پر رُک گیا۔ کہتے ہیں کچھ لمحے ایسے بھی وارد ہوتے ہیں جن کا انتظار خود ''وقت'' کرتا ہے۔ ے قدموں کی آہٹ سن کر اُس ''ماہ تاب منتظر'' کی پلکیں اُٹھیں اور پس منظر میں ڈوبتا سورج یک لخت پڑ گیا۔ پتا نہیں، زندگی اس پل شروع ہوئی تھی یا میری فنا کے بعد بھی میری نبض چل رہی تھیں۔ میں نیند تھا یا میرا سب سے خوب صورت خواب کھلی آنکھوں، میرے سامنے سج گیا تھا۔ زمین بہنے لگی تھی یا سمندر ت ہو گیا تھا۔ سورج کی آخری کرنیں زہرا کے کانوں کی بالیوں سے منعکس ہو کر اُس کے چہرے کو دمکا رہی ں۔ یا یہ زہرا کے چہرے کا نور تھا جو ان کرنوں کو مزید اُجال رہا تھا۔ ہم دنوں چپ کھڑے رہے۔ سمندر کی ں نے ہماری خاموشی کی زبان کو ایک دوسرے تک منتقل کرنے کا فریضہ اپنے سر لے لیا۔ آس پاس سرسراتی نے اَن کہے لفظوں کو معنی پہنانا شروع کر دیئے۔ زہرا کی آنکھوں نے کہا۔ ''آپ آ گئے ساحر...... میں کب آپ کی راہ دیکھ رہی تھی......'' میں نے بند لبوں سے جواب دیا...... ''میں تو سدا آپ کے ساتھ تھا......آپ راہ کی دھول بن کر...... کبھی منزل نہ بننے والی راہوں کی دُھول۔'' اُس کی گھنیری پلکیں تڑپ کر جھپکیں ں......آپ میری راہوں کی دُھول بن کر نہیں، میری آنکھوں کے کاجل کی طرح میرے ساتھ تھے۔ میں راہ بھی چلتی، میری منزل کا راستہ آپ ہی سے ہو کر گزرتا۔ کبھی کبھی منزلیں راستہ بھی تو بن جاتی ہیں۔'' ہم ں بظاہر خاموش کھڑے تھے۔ گفتگو اضافی بن چکی تھی اور ہماری آنکھوں میں جھلملاتے سمندر کا عکس ہماری پلکوں سے جھلک رہا تھا۔ کوئی ہمیں دُور سے یوں کھڑے دیکھتا تو اُسے یہی لگتا کہ شاید ہم دونوں کے پاس کے لیے کوئی بات باقی نہیں رہی۔ مگر یہ ہونٹوں اور زبان کی بولی سننے اور بولنے والے ظاہر پرست بھلا ی کی باتیں کیا جانیں؟ زمانہ آج تک لوگوں کے طرز تکلم اور تخاطب کی خوبصورتی کی مثالیں دیتا آیا ہے، لوئی نہیں جانتا کہ کچھ لوگ جب محو سماعت ہوں تو بھی کمال خوب صورت لگتے ہیں، جیسے ٹھیک اُس لمحے وہ ں پری۔ اور سماعت کا واسطہ صرف کان سے تو نہیں ہوتا، کبھی کبھی کسی کی آنکھیں، جھکتی پلکیں، جبیں پر پسینے ندیں، لرزتے بند لب اور کسی کی خم کھائی زلف کا بل بھی تو ہماری اَن کہی کو پوری طرح سن رہا ہوتا ہے۔ ور زہرا بھی اس وقت مجسم سماعت تھے، ہر اُس اقرار، ہر اُس پیمان کے لیے، جو ہم نے لبوں سے ادا نہیں پھر بھی ہم دونوں نے سن لیا۔ اتنے میں دُور ٹیلے سے مما کی لہروں کے دوش پر آتی آواز سنائی دی۔ '' ند...... دیر ہو رہی ہے بیٹا...... چلو گھر چلیں......۔ میں نے زہرا سے کہا......'' چلیں سب لوگ ہمارا انتظار ہے ہیں......'' اس ناز آفرین نے پہلا قدم اُٹھایا، لیکن میں رُک گیا۔ لیکن یہ جان کر اپنے قدم بڑھایئے گا راللہ کی مسافتیں ابھی باقی ہیں۔ راستے دشوار اور منزلیں سراب ہیں...... تھک تو نہیں جائیں گی......؟'' یرے سے مسکرائی۔ ''ڈرا رہے یا تنبیہ کر رہے ہیں......'' میں بھی مسکا دیا۔ ''صرف اپنے نصیب کی بلیوں سے آگاہ کر رہا ہوں۔'' تب زندگی میں پہلی مرتبہ، زہرا نے بس اک لمحے کے لیے میری آنکھوں مانگا اور میں پہلی بار پتھر نہیں ہوا۔ ''اب جو عبداللہ کی راہ ہے...... وہی زہرا کا رستہ ہے...... جب مقدر جڑ

جائیں تو نصیب کی گرہیں اپنے آپ کھل جاتی ہیں۔آپ زہرا کو ہمیشہ ثابت قدم پائیں گے۔"

دُور سمندر کے اس پار اُفق پر سورج ڈوب رہا تھا۔ میں نے قدم بڑھا دیئے اور زہرا میرے پیچھے چل پڑی۔ میرے نقش پا پر اپنے نازک قدم دھرتی...... پہلی مرتبہ عبداللہ اور زہرا کو ایک ساتھ اس ڈگر پر چلتے دیکھ لہریں مسکرائیں اور ڈوبتے سورج نے کہا۔"نئی مسافتیں...... نئے سفر اور نیا ہم سفر مبارک ہو دوست...... آنے والی سحر کے ساتھ اک نئے آسمان کا سلام...... اور اس ڈھلتی شام کی جانب سے تمہیں الوداع...... الوداع عبداللہ...... الوداع......"

(ختم شد)